ظاہری وباطنی اصلاح کا بہترین ذریعہ

مجموعہ

تالیفاتِ مصلح الامۃ

عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ

ناشر
مکتبہ اشرفیہ
محمد علی روڈ، ممبئی ۳ فون: ۲۳۴۷۳۱۰۹

قال اللہ تعالیٰ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ

اور

علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الیواقیت والجواہر میں لکھا ہے کہ
مشائخ کی وفات کے بعد طالبین کی اصلاح کے سلسلہ میں ان حضرات کی تصانیف بھی
انکی قائم مقام ہوا کرتی ہیں — بناءً علیہ

مجموعہ تالیفاتِ مُصلح الامّۃ

عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ

حصہ اوّل

ناشر
مکتبہ اشرفیہ
۳۶ محمد علی روڈ، بمبئی ۳/

احمد حسین لکھنوی الہ آباد

فہرست مضامین

مجموعۂ تالیفاتِ مصلح الامۃ

حصۂ اوّل

۷۸۶

فہرست مضامین

مجموعۂ تالیفات مصلح الامۃ

حصّہ دوم

مرتبہ: عبدالرحمٰن جامی عفی عنہ

فہرست مضامین

تالیفات مصلح الامۃ

حصہ سوم

مرتب عبدالرحمٰن جامی

شوال المکرم ۹۶ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

پیش نظر کتاب کوئی جدید یا مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ مصلح الامۃ عارف باللہ حضرت مولانا و مرشدنا شاہ وصی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ کی تالیفات قدیمہ ہی کا ایک جدید مجموعہ ہے جیسا کہ اسکے نام سے بھی ظاہر ہے۔

حضرتؒ کی تالیفات علیحدہ علیحدہ مختلف مقامات سے شائع ہوئیں اور ہاتھوں ہاتھ ختم ہوگئیں اس سے اندازہ ہوا کہ الحمدللہ امت حاضرہ کو حضرت اقدسؒ کا طرز اصلاح پسند ہوا۔ اور اللہ کے نیک بندوں نے انکو اپنے درد کا درماں پایا اور طالبین راہ مولیٰ نے حضرت قدس اللہ سرہ کی زبان فیض ترجمان سے نکلی ہوئی معرفت حق اور محبت نبی برحق (صلی اللہ علیہ وسلم) کی باتوں کو اپنے قلبی طمانینت اور روحانی سکون کا سامان جانا۔

طالبین کی طلب اور رسائل کی افادیت اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے بعض مخلصین کو یہ خیال ہوا کہ حضرتؒ کی تمام تصانیف کو معرفت حق ہی کے سائز پر یکجا شائع کیا جائے تاکہ کتابت کی شکایت۔ سائز کی عدم یکسانیت کی الجھن۔ نایابی کا غم اور فی الجملہ اغلاط کا گلہ ختم ہو جائے۔ چنانچہ جملہ تالیفات کو چار حصوں میں شائع کرنا تجویز ہوا ہے جس کا حصہ اول آپ کے سامنے ہے۔ یہ صرف ۲۰ رسالوں کا مجموعہ ہے جن کی فہرست صفحہ گذشتہ پر درج ہے۔

اس کے فوراً ہی بعد انشاء اللہ تعالیٰ حصہ دوم بھی منظر عام پر آرہا ہے وہ بھی اسی قدر ضخیم ہوگا مگر وہ صرف ۱۴ کتب کا مجموعہ ہوگا۔ پھر حصہ سوم بھی طبع ہوگا۔ لیکن ابھی اس میں قدرے تاخیر ہے۔ اور اس مجموعہ میں ۸ کتابیں ہوں گی۔ اور اس کے حصہ چہارم انشاء اللہ تعالیٰ۔ امید ہے کہ ہمارے اس اقدام کو ناظرین بنظر استحسان دیکھیں گے۔ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے حضرتؒ کی جملہ تصانیف کو ہر وقت پاس رہنے کی آسان صورت پیدا فرمادی۔ اب اسکے نفع کو بھی عام و تام فرمائے۔

والسلام طالب دعا

عبدالرحمٰن جامی عفی عنہ دسمبر ۱۹۷۴ء الہ آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اصلاحی مضمون"

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

دیکھا جاتا ہے کہ آج مدارس کی کمی نہیں ہے. گاؤں گاؤں مدرسے کھلے ہیں. ہر ہر بستی میں اہل علم موجود ہیں. اسکا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ علم عام ہوتا عمل عام ہوتا لوگوں کے دینی اور دنیوی حالات درست ہوتے لیکن باوجود اس کے لوگوں میں دین کا نام نہیں ہے. کوئی بستی ٹھیک نہیں ہے اور یہی نہیں کہ دین درست نہیں دنیا بھی برباد ہی ہے اور عام حالت یہی ہے. اور یہ حالت روز بروز بڑھتی ہی چلی جارہی ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

میری سمجھ میں اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ اول تو ایسے مصلحین جو کتاب وسنت پر قوم کے حالات کو مطابق کرنے کی اہلیت اور فکر رکھتے ہوں نہیں ہیں اور جنہیں یہ بات ہوتی ہے دہی جانتا ہے کہ قوم کتنی اپنے مرکز سے ہٹی ہوئی ہے اور انکو کتنا بُعد اپنے مرکز سے ہوگیا ہے اور انکو کس طرح سے مرکز کے قریب کیا جاسکتا ہے اور یہ کام کتنا دشوار ہے اور اسمیں کس قدر اہمیت ہے اور اس میں صرف علم کی ضرورت ہی یا عمل کی بھی اور اگر عمل کی ضرورت ہے تو صرف ظاہری یا باطنی بھی اور اگر باطنی بھی درکار ہے تو ناقص یا کامل، یہ چیزیں اہلیت ہی سے معلوم ہوسکتی ہیں ورنہ صرف صوری وظاہری نماز و روزہ کو لوگ دین سمجھتے ہیں اور ہر ایک کے پاس دین کی ایک ناتمام حقیقت موجود ہوتی ہے جس کو وہ کل دین سمجھتا ہے. بس انکی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسے کہ اندھوں کے پاس کوئی ہاتھی آگیا تھا جس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے سب نے اپنی اپنی تحقیق بگھاری جس کا ہاتھ اُس کی دُم پر پڑا اس نے کہا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے مورچھل. اور دوسرے نے اسکے کان ٹٹول کر کہا کہ نہیں ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے سوپ، اور جس نے اسکی

پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اس نے کہا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے تخت، اور ایک نے اُس کے پیر پکڑ پائے تو کہا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے کھمبا۔

دیکھئے اندھا پن بھی کتنی بُری بلا ہے کہ اتنا بڑا صحیح وسالم ہاتھی کتنے ناتمام جزوں میں تقسیم ہوگیا۔ اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

اشقیارا دیدۂ بینا نبود نیک و بد در دیدشاں یکساں نمود

یعنی اشقیاء کے لئے چشم بینا نہیں تھی اس لئے نیک وبد دونوں انکی نگاہوں میں یکساں معلوم ہوتے تھے۔

ہمسری با انبیاء برداشتند اولیا را ہمچو خود پنداشتند

چنانچہ انبیاء علیہم السلام کیساتھ برابری کا دعویٰ کرتے تھے اور اولیا کو بھی اپنی ہی طرح سمجھتے تھے۔

پس جس طرح ان اندھوں نے ہاتھی کے صرف ایک ہی عضو کو لیا اور اسی پر کل کا حکم لگا دیا جو صحیح نہ تھا اسی طرح آج دین کے بارے میں لوگوں کا حال ہے کہ اُس کی حقیقت سے تو ہیں ناآشنا اور بعض ظاہری چیزوں کو لے کر اسی کو کل دین سمجھتے ہیں اور جو اصلی دین کی راہ دکھاتے ہیں انکی نہیں سنتے بلکہ اُنکی مخالفت پر آمادہ ہوجاتے ہیں اسکا سبب اُن کا اصلی راہ کو چھوڑ دینا ہوتا ہے اور اپنی بداعمالیوں اور قلبی امراض میں ابتلا اور انہماک سبب بنتا ہے۔ اصلی راہ کو چھوڑنے کا۔ اور جب اصل راہ کو چھوڑ چکتے ہیں تو اسکے بعد پھر صحیح راہ پر لگنا انکے لئے نہایت دشوار ہوتا ہے اور یہی نہیں کہ اس پر آنا نہیں چاہتے بلکہ جو لوگ انکے سامنے اصل دین پیش کرتے ہیں ان سے انھیں نفرت اور ان کی باتوں سے وحشت ہونے لگتی ہے اور اس کے مصداق ہوجاتے ہیں کہ ؎

ناصحا مت کر نصیحت دل مرا گھبرائے ہے میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

اصلی راہ دکھانے والے چونکہ کم ہیں اس لئے یہ گمراہی بڑھتی جا رہی ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر کہیں کوئی اللہ کا بندہ کچھ کام کرنے والا ہوا بھی تو عوام کو انکا جہل انکی تعلیم کے اثر کو قبول کرنے سے مانع ہوتا ہے یہ اپنے جہل کو مرض ہی نہیں سمجھتے اور اس کو دور کرنا ہی نہیں چاہتے۔ جیسے عالم علم کو کمال سمجھتا ہے یہ جہل کو کمال سمجھتے ہیں اور اپنے جہل میں عناد کی حد تک پہونچ جاتے ہیں اور ارباب جہل وعناد کی تقلید فطرت کو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اصلاحی مضمون"

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم

دیکھا جاتا ہے کہ آج مدارس کی کمی نہیں ہے۔ گاؤں گاؤں مدرسے کھلے ہیں۔ ہر ہر بستی میں اہل علم موجود ہیں۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ علم عام ہوتا عمل عام ہوتا لوگوں کے دینی اور دنیوی حالات درست ہوتے لیکن باوجود اس کے لوگوں میں دین کا نام نہیں ہے۔ کوئی بستی ٹھیک نہیں ہے اور یہی نہیں کہ دین درست نہیں دنیا بھی برباد ہی ہے اور عام حالت یہی ہے۔ اور یہ حالت روز بروز بڑھتی ہی چلی جارہی ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

میری سمجھ میں اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ اول تو ایسے مصلحین جو کتاب وسنت پر قوم کے حالات کو مطابق کرنے کی اہلیت اور فکر رکھتے ہوں نہیں ہیں اور جنہیں یہ بات ہوتی ہے وہی جانتا ہے کہ قوم کتنی اپنے مرکز سے ہٹی ہوئی ہے اور انکو کتنا بعد اپنے مرکز سے ہوگیا ہے اور انکو کس طرح سے مرکز کے قریب کیا جاسکتا ہے اور یہ کام کتنا دشوار ہے اور اسمیں کس قدر اہمیت ہے اور اس میں صرف علم کی ضرورت ہی یا عمل کی بھی اور اگر عمل کی ضرورت ہے تو صرف ظاہری یا باطنی بھی اور اگر باطنی بھی درکار ہے تو ناقص یا کامل، یہ چیزیں اہلیت ہی سے معلوم ہوسکتی ہیں ورنہ صرف صوری وظاہری نماز وروزہ کو لوگ دین سمجھتے ہیں اور ہر ایک کے پاس دین کی ایک ناتمام حقیقت موجود ہوتی ہے جس کو وہ کل دین سمجھتا ہے۔ پس انکی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسے کہ اندھوں کے پاس کوئی ہاتھی آگیا تھا جس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے سب نے اپنی اپنی تحقیق بگھاری جس کا ہاتھ اُس کی دُم پر پڑا اس نے کہا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے مورچھل، اور دوسرے نے اسکے کان ٹٹول کر کہا کہ نہیں ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے سوپ، اور جس نے اسکی

بیٹھ پر ہاتھ پھیرا اس نے کہا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے تخت، اور ایک نے اس کے پیر پکڑ پائے تو کہا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے کھمبا۔

دیکھئے اندھا پن بھی کتنی بری بلا ہے کہ اتنا بڑا صحیح وسالم ہاتھی کتنے ناتمام جزؤں میں تقسیم ہوگیا۔ اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

اشقیا را دیدۂ بینا نہ بود نیک و بد در دیدشاں یکساں نمود

یعنی اشقیاء کے لئے چشم بینا نہیں تھی اس لئے نیک و بد دونوں انکی نگاہوں میں یکساں معلوم ہوتے تھے۔

ہمسری با انبیاء برداشتند اولیا را ہمچو خود پنداشتند

چنانچہ انبیاء علیہم السلام کیساتھ برابری کا دعویٰ کرتے تھے اور اولیا کو بھی اپنی ہی طرح سمجھتے تھے۔

پس جس طرح ان اندھوں نے ہاتھی کے صرف ایک ہی عضو کو لیا اور اسی پر کل کا حکم لگا دیا جو صحیح نہ تھا اسی طرح آج دین کے بارے میں لوگوں کا حال ہے کہ اس کی حقیقت سے تو ہیں ناآشنا اور بعض ظاہری چیزوں کو لے کر اسی کو کل دین سمجھتے ہیں اور جو اصلی دین کی راہ دکھاتے ہیں انکی نہیں سنتے بلکہ انکی مخالفت پر آمادہ ہوجاتے ہیں انکا سبب ان کا اصلی راہ کو چھوڑ دینا ہوتا ہے اور اپنی بداعمالیوں اور قلبی امراض میں ابتلا اور انہماک سبب بنتا ہے اصلی راہ کو چھوڑنے کا۔ اور جب اصل راہ کو چھوڑ چکتے ہیں تو اسکے بعد پھر صحیح راہ پر لگنا انکے لئے نہایت دشوار ہوتا ہے اور یہی نہیں کہ اس پر آنا نہیں چاہتے بلکہ جو لوگ انکے سامنے اصل دین پیش کرتے ہیں ان سے انھیں نفرت اور ان کی باتوں سے وحشت ہونے لگتی ہے اور اس کے مصداق ہوجاتے ہیں کہ ؎

ناصحا مت کر نصیحت دل مرا گھبرائے ہے میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

اصلی راہ دکھانے والے چونکہ کم ہیں اس لئے یہ گمراہی بڑھتی جارہی ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر کہیں کوئی اللہ کا بندہ کچھ کام کرنے والا ہوا بھی تو عوام کو انکا جہل انکی تعلیم کے اثر کو قبول کرنے سے مانع ہوتا ہے یہ اپنے جہل کو مرض ہی نہیں سمجھتے اور اس کو دور کرنا ہی نہیں چاہتے۔ جیسے عالم علم کو کمال سمجھتا ہے یہ جہل کو کمال سمجھتے ہیں اور اپنے جہل میں عناد کی حد تک پہونچ جاتے ہیں اور ارباب جہل و عناد کی تقلید فطرت کو

فاسد کر دیتی ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی اہل علم کے کہنے کے مطابق راستہ نہیں چلتا تو قوم کے جو سردار ہوتے ہیں جو اپنے ہوائے نفسانی کی پیروی کرتے ہیں اور احکام الٰہی کی بالکل پرا نہیں کرتے ان کے چھوٹے انکی تقلید کرتے ہیں چھوٹے اور بڑے دونوں فاسد الاخلاق اور فاسد الطبیعۃ ہوجاتے ہیں اس حالت پر پہونچ کر علماء کا کہنا کیسے سُن سکتے ہیں۔ اصلاح بالکل ختم ہوجاتی ہے۔

اس جہل کے نتائج اور ثمرات میں سے یہ ہے کہ آج جاہلوں میں کبر استنکاف اور عار وغیرہ وہ تمام امراض پیدا ہوگئے ہیں جو کسی زمانہ میں کفار کے اندر موجود تھے اور جس طرح سے انھوں نے اپنی انھیں بداخلاقیوں کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ اور انکا انکار کیا اسی طرح جہلا بھی اپنی انھیں صفات بد کی وجہ سے عالم دین اور عالم شریعت کا مقابلہ کرتے ہیں اور یہ حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ ہے اور یہ سمجھتے بھی نہیں کہ ہم یہاں تک پہونچ گئے ہیں کیا اس حالت میں ایمان سالم ہے؛ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ غلط ہے؛ کیا آج مسلمانوں کے عوام میں یہ چیزیں موجود نہیں ہیں؛ اور کیا یہ بات ٹھکرا دینے کی ہے؛ اور اس آواز کی طرف التفات نہ کرنا انصاف و دیانت ہے؟

میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ اسکا سبب اُنکا اصلی راہ چھوڑ دینا ہوتا ہے اور اپنی بداعمالیوں اور قلبی امراض میں ابتلا اور انہماک۔ سبب ہوتا ہے اصلی راہ کو چھوڑنے کا۔ ان بداعمالیوں اور قلبی امراض میں حُبّ دنیا کا استیلاء قلوب پر (اسطرح سے کہ اسمیں دوسرے کی گنجائش بھی باقی نہ رہے) یہ بھی داخل ہے۔

محبت کی یہ خاصیت ہے کہ اسمیں محبوب کے علاوہ دوسرے کی گنجایش باقی نہیں رہ جاتی جس کو ذرا بصیرت سے حصہ ملا ہے وہ ان کے حالات میں غور کرکے یہ سمجھ سکتا ہے کہ اسی حُب دنیا کے استیلاء نے انکو آخرت سے بالکل بیگانہ بنا دیا ہے کہ اسکی ان کے قلوب میں گنجائش ہی باقی نہیں رہی انمیں یہ ہمت باقی نہیں رہ گئی کہ دنیا کے ساتھ آخرت کا تعلق باقی رکھ سکیں اسقدر دَنِی الہمت و پست حوصلہ ہو گئے ہیں۔

یہ علو ہمتی کی بات ہے کہ دنیا کے ساتھ آخرت کا تعلق بھی قائم و باقی رکھا جائے اور اسکے حقوق میں کسی قسم کی کمی نہ ہونے دیجائے کہ عظیم کے سامنے حقیر کی حیثیت ہی کیا ہے اسکا مقتضا یہ تھا کہ دنیا کا تذکرہ ہی انکے دل میں نہ ہوتا کہ آخرت کریم ہے اور دُنیا لئیم،

آخرت اس دل میں آنا نہیں چاہتی جس دل میں دنیا ہو کیونکہ یہ کریم ہے اور کریم لئیم کے یہاں نہیں جاتا۔ یہ بزرگوں کا ارشاد ہے۔

آخرت باقی ہے اور دائم ہے اور دنیا فانی اور زائل ہے فانی اور باقی میں نسبت ہی کیا ہے؟ ان میں تو ایسی نسبت بھی نہیں ہے کہ دریا میں سوئی ڈالنے سے اس میں پانی کا جو قطرہ لگ جائے اس کو جو نسبت دریا کے ساتھ ہے دنیا کو آخرت کے ساتھ یہ نسبت بھی نہیں کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی اور قطرہ سمندر دونوں کے دونوں فانی ہیں اور فانی کو فانی کے ساتھ تو کچھ نسبت ہوتی بھی ہے اور یہاں ایک فانی ہے دوسری باقی اس لئے یہاں تو وہ نسبت بھی نہیں اور جب یہ نسبت نہیں ہے تو یہ کہا جائے گا کہ یہاں موجود اور معدوم کی نسبت ہے یعنی ایک موجود ہے دوسری معدوم۔

اب کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس نسبت کو نہ سمجھا جائے ایک تو دُنیا قلیل پھر اس کی عمر کے مقابلہ میں آدمی کی عمر اقل قلیل۔ لہذا اسکے تمتعات بھی اس دُنیا میں جو ہیں وہ بھی اقل قلیل ہیں تو اس تمتع پر نظر کر کے تمتعات آخرت کو نظر انداز کر دینا کس قدر ضعف ایمان ہے۔

فکر آخرت جو مومن کے دل میں ہوتی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے عصائے موسیٰ علیہ السلام کہ اس نے ساحرین کے سب عصا کو یکدم نگل لیا تھا اور اس کے آگے سب ختم ہو گئے تھے۔

اسی طرح مومن کے قلب میں جب فکر آخرت پیدا ہو جاتی ہے تو دنیا کے سب ہموم و غموم اس کے قلب کے آس پاس بھی نہیں آنے پاتے اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

آسکے غیر مرے خانۂ دل میں کیسے
کہ خیالِ رخ دلدار ہے درباں اپنا

یہ فکر لوازم ایمان سے ہے اب خیال فرمائیے کہ ایسا شخص کیسے دُنیا میں منہمک ہو سکتا ہے اور کیسے اس کے شہوات و لذات کو ترجیح دے سکتا ہے؟ اب جو ترجیح ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ فکر آخرت دل میں نہیں ہے اور نہ اس کو پیدا کرنا چاہتے ہیں اسی وجہ سے کسی کام کے نہیں رہ گئے۔ خدا کی نظر

اعتبار سے ساقط ہوگئے۔ دنیا بھی چاہتے ہیں تو وہ بھی نہیں ملتی کیونکہ انھوں نے اپنے خدا کو ناراض کر لیا ہے جس کے قبضہ میں دُنیا اور آخرت دونوں ہے۔ اور مومن جب آخرت کو چھوڑتا ہے تو اس کی دُنیا بھی چلی جاتی ہے اور خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہوجاتا ہے۔

بس اب اسی پر کلام کو ختم کرتا ہوں کہ آخرت باقی ہے اسکا بیان کما حقہ تو وہی ذات کر سکتی ہے جو باقی ہے۔ فانی سے اسکا کیا ذکر ہوسکے۔

ختم شد

(نصیحت)

فرمایا کہ اب اتنے دنوں کے بعد اس بڑھاپے میں جب کہ کسی چیز کی تحصیل کا وقت باقی نہیں رہا یہ بات سمجھ میں آئی کہ انسان کو کسی کمال کی تحصیل سے جو چیز مانع ہوتی ہے وہ اس کا کبر و عار ہے کیونکہ یہی چیز اس کو کسی کامل کے آگے جھکنے سے منع کرتی ہے، ورنہ ہر ہی زمانہ میں اہل کمال رہتے ہیں جن سے کمال حاصل کیا جاسکتا ہے مگر اسی عار و استکبار کی بنا پر ان کے سامنے جھکتے نہیں اس لئے کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا کورے کے کورے ہی رہ جاتے ہیں۔ آدمی جب اپنی خودی و تکبر کو چھوڑتا ہے تب کچھ حاصل ہوتا ہے ع ہر کجا پستیست آب آنجا رود

میں حضرات اہل علم کو خصوصاً اس جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ آج علماء اور طلباء کو کوئی کمال جو نہیں حاصل ہو رہا ہے تو اس کی وجہ یہی ان کا عار اور تکبر ہے، یہی ان کی راہ مارے رہتا ہے اس کو اگر سمجھ لیں اور ہمت کر کے اس کو ترک کر دیں تو کمال کے درجہ کو پہونچ سکتے ہیں چنانچہ جن لوگوں کو کمال حاصل ہوا ہے وہ اپنے کو مٹانے اور کسی کے آگے خود کو گرانے اور اپنے کبر و عار کو ختم کرنے ہی سے حاصل ہوا ہے!

وما توفیقی الا باللہ

وصی اللہ عفی عنہ

فوائد الصحبۃ

از افادات

مصلح الامۃ عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فوائد الصحبۃ

اہلِ کمال کی صحبت کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا بیان حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب اخبار الاخیار کے مقدمہ میں اسطرح کیا ہے فرماتے ہیں کہ :-

اما بعد فقیر حقیر اضعف عباد اللہ القوی الباری عبدالحق بن سیف الدین الترک الدہلوی البخاری معروض می گرداند کہ بر ارباب الباب و اصحاب ابصار کہ زمرۂ اہلِ خبرت و اعتبار اند محقق و مقرر است کہ مؤثر ترین حالات بلکہ افضل عبادات مصاحبت اہل کمال و مجالست مقربان درگاہ ذوالجلال است زیرا کہ بمشاہدۂ استقامت احوال ایشان سالک را ہمتے دست دہد کہ تحمل اعبای عبادت و برداشت مشاقِ ریاضت کہ لازم سلوک ایں طریق است آسان شود بلکہ بمعائنۂ جمال ایشان نورے در دل افتد کہ ظلمت ریب و ارتیاب کہ علت بُعد و حجاب است

بعد حمد وصلوٰۃ کے فقیر حقیر اللہ قوی و باری کا یہ نحیف ترین بندہ عبدالحق بن سیف الدین ترک دہلوی بخاری عرض پرداز ہے کہ تمام اُن ارباب فہم اور ارباب بصیرت کے نزدیک جن کا شمار باخبر اور قابلِ اعتبار ہستیوں میں کیا جاتا ہے یہ امر محقق اور مسلّم ہے کہ موثر ترین حالات بلکہ افضل ترین عبادات، اہل اللہ کی صحبت، اور مقربانِ خدا کی ہمنشینی ہے اسلئے کہ ان حضرات کی استقامت اور انکے ثبات و استقلال کو دیکھ کر سالک کے اندر بھی ایک قوت اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے عبادت کا تعب اور ریاضت کی مشقت کا برداشت کرنا جو کہ اس طریق پر چلنے کے لئے لازم ہے اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے بلکہ ان حضرات کے جمال کے مشاہدے سے اسکے قلب میں ایک نور پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے شکوک

زائل گردد۔ شبہات کی تاریکیاں کہ در اصل وہی بعد و حجاب ہوتی ہیں اسکے قلب سے زائل ہوجاتی ہیں۔ (اخبار الاخیار صہ)

دیکھئے یہاں حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے مصاحبت اہل کمال کو افضل عبادت فرمایا ہے اور اس کی دلیل بھی بیان فرمائی ہے (یعنی یہ کہ سالک کے قلب میں اُن حضرات کے ثبات واستقامت کو دیکھ کر ہمت و قوت اور انکے جمال کی زیارت سے ایک نور پیدا ہوجاتا ہے پس ہمت کے سبب سے تو اُس سے عبادت و ریاضت کی دشواریاں دور ہوجاتی ہیں اور نور کی وجہ سے اس کے دل سے شک وشبہات کی تاریکیاں کافور ہوجاتی ہیں اور جب آدمی کے قلب میں ہمت اور نور پڑگیا تو پھر اس کے بعد خدا تعالیٰ کا راستہ اس کے لئے بالکل روشن اور آسان ہوجاتا ہے۔ از ناقل) جو بالکل صحیح ہے لیکن میں اسکی ایک اور دلیل بیان کرتا ہوں سنئے :۔

اہل کمال کی مصاحبت اسلئے افضل عبادت ہے کہ یہ مصاحبت و مجالست موجب جذب ہے اور یہ جذب (جو کسی کامل کے واسطے سے ہو) باتفاق صوفیہ رحمہم اللہ عبادات کے جذب سے افضل ہے کیونکہ تحفۃ السالکین ترجمہ ارشاد الطالبین مصنفہ قاضی ثناء اللہ صاحبؒ پانی پتی میں ہے کہ " قرب الٰہی کا سبب جذب ہے (یعنی خدا تعالیٰ کا اپنے بندہ کو کھینچ لینا) جذب کبھی بلا واسطے کے ہوتا ہے اس کو اجتبا کہتے ہیں اور اکثر کسی امر کے توسط سے ہوتا ہے اور وہ متوسط بحکم استقراء دو چیزیں ہوسکتی ہیں۔

ایک عبادت (جو جذب اس کے واسطے سے ہوتا ہے اس کو ثمرۂ عبادت کہتے ہیں) دوسری انسان کامل کی صحبت (اور جو جذب اس کے توسط سے ہوتا ہے اس کو تاثیر شیخ کہتے ہیں) یہ تاثیر، تاثیر عبادت سے بڑھ کر ہے لہذا جو جذب شیخ کامل کے توسط سے ہوتا ہے وہ بڑھا ہوا ہوتا ہے اس جذب سے جو کہ عبادات کے واسطہ سے ہوتا ہے کیونکہ عبادت کے ذریعہ انسان کسی ایک مقام پر پہنچکر رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ فرشتوں کے باب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ اور شیخ کامل سے جو جذب ملتا ہے وہ ترقی در ترقی دیتا ہے۔ یہانتک کہ شیخ کے مقام تک پہنچا سکتا ہے۔

نیز تحفۃ السالکین میں مشائخ کی تاثیر کے بیان میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ :۔

مسئلہ :۔ ناقصوں کو ولایت حاصل نہیں ہوتی مگر کاملوں کی تاثیر صحبت سے کیونکہ مرف

ہذا انکی عبادات، ولایت کا ثمرہ نہیں لاسکتیں جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے. جذب مطلق یعنی اجتبا انکے حق میں خدا تعالیٰ کے ساتھ مناسبت نہ رکھنے کے باعث متصور نہیں ہے اس لئے حق سبحانہ تعالیٰ سے حصول فیض عوام الناس کے حق میں متصور نہیں ہے مگر کسی ایسے شخص کے توسط سے جو باطن میں خدا سے اور ظاہر میں بندوں سے مناسبت رکھتا ہو اور وہ (متوسط) اللہ کا رسول یا اُسکا نائب ہے۔ انتہیٰ کلامہ (تحفۃ السالکین)

اور اہل کمال کی مصاحبت اسلئے بھی ضروری ہے کہ وہ موجب ہے محبت کی اور محبت موجب ہے تمام احکام شرعیہ کے اتباع کا۔ محبت خود بھی فرض ہے اور تمام فرائض و واجبات وغیرہ کا ذریعہ بھی ہے۔

اور محبت الٰہی کی فرضیت کی تصریح علمائے ظاہر نے بھی کی ہے. چنانچہ صاحب فتح الباری نے بخاری شریف کی حدیث ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ الحدیث کی شرح کرتے ہوئے فائدہ کے تحت لکھا ہے کہ:-

ومحبۃ اللہ تعالیٰ علی قسمین فرض و ندب. فالفرض المحبۃ التی تبعث علی امتثال اوامرہ والانتہاء عن معاصیہ والرضا بما یقدرہ فمن وقع فی معصیۃ من فعل محرم او ترك واجب فلتقصیرہ فی محبۃ اللہ حیث قدم ھوی نفسہ. (فتح الباری ص۱۴۷)

اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے دو درجے ہیں فرض اور مستحب پس فرض تو وہ محبت ہے جو اللہ تعالیٰ کے اوامر کے امتثال اور اس کے معاصی سے اجتناب اور اس کی تقدیر پر راضی رہنے پر انسان کو اُبھارے اور آمادہ کرے لہذا جو شخص بھی کوئی گناہ کرتا ہے خواہ محرمات میں سے کسی کا ارتکاب کرکے یا واجبات میں سے کسی کو ترک کرکے تو یہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہی کی کمی کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ اس طور پر کہ اس نے اپنی خواہش کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر مقدم کرلیا (اور یہ بدون محبت کی کمی کے نہیں ہوسکتا)۔

صاحب فتح الباری کے کلام سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی محبت کا ایک درجہ فرض ہے اور یہ امر تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ محبت اہل محبت ہی سے حاصل ہوتی ہے. یعنی اسکا محل اہل اللہ کا سینہ ہے سفینہ نہیں ہے. اسی کی بابت کہا جاتا ہے کہ بزرگوں سے یہ سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے اور اسکے حصول کا طریق صحبت ہی ہے اس سے اس کی ضرورت کا اندازہ لگالیجئے کہ

تاثیر صحبت کے متعلق مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

تو ہمی دانی کہ قربِ اولیا　　　صد کرامت دارد و کارد کیا

نیز مثنوی ہی کا ایک بہت معروف شعر اور ہے ؎

یک زمانے صحبتے با اولیا　　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

آج تو اس شعر کو لوگ مجمع میں پڑھتے ہوئے گھبراتے ہیں اور اگر کسی اہل علم سے اس کے معنی دریافت کئے جائیں تو وہ کسی تاویل کے بعد ہی اسکا مفہوم واضح کر سکے گا حالانکہ محققین کا کلام اس پر دال ہے کہ یہ شعر اپنے مضمون میں عین حقیقت ہے اور اس میں کسی توجیہ و تاویل کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔

اس شعر کا مطلب بیان کرتے ہوئے بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "یک زمانہ" سے مراد ایک مخصوص ساعۃ ہے یعنی جس کو کسی بزرگ کی مصاحبت اس خاص وقت میں میسر ہو جائے تو وہ اس کے لئے بلاشبہہ صد سالہ طاعتِ بے ریا سے بہتر ہے کیونکہ اسمیں تو اسکا کام ہی بن جائے گا۔ یہی مطلب ہے حضرت مولانا گنگوہیؒ کی اس عبارت کا کہ "ولایت نظری کے یہ معنی ہیں کہ بعض وقت بدون اختیار عارف کے ایسا...... آجاتا ہے کہ عارف کی نظر میں اور توجہ میں اثر ہوتا ہے جس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس پر ایک اثر پڑتا ہے جس سے وہ ملون ہو جاتا ہے مثل آفتاب کے کہ جب وہ نمایاں ہوتا ہے تو ہر شئے پر اس کی شعاع ہوتی ہے مگر جو طبع مصفیٰ قابل ہوتی ہے تو...... انوار کا عکس آتا ہے اور نہیں تو حرارت کا اثر ہوتا ہے اسمیں بھی تفاوت استعداد ہے۔ آئینہ پر نور زیادہ ہوتا ہے اور عاج پر کم۔ پتھر پر گرمی زیادہ اور گارے پر کم۔ علیٰ ہذا۔"

(مکتوبات رشیدیہ صفحہ ۵۹)

لیکن ایک دوسرے مقام پر خود حضرت گنگوہیؒ نے ہی تصریح کی ہے کہ شیخ سے مرید کو ایمان اور فرائض ملتے ہیں مگر اس جگہ کسی خاص ساعۃ کی قید نہیں ہے۔ بلکہ مطلق تاثیر صحبت کا بیان کیا ہے۔ مکتوبات صفحہ ۱ میں ہے کہ شیخ عبد القدوس گنگوہی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ "اصل یہ ہے کہ شیخ مرید کو لیجاتا ہے اور فضل یہ ہے کہ مرید شیخ کو لیجاوے پدر مفلس کو اگرچہ زکوٰۃ درست نہیں مگر صدقہ نافلہ جائز ہے علیٰ ہذا" اصل اور فرائض تو مرید سے شیخ کو ملنا محال ہے مگر ترقی حالات ملنا عجب نہیں۔ انتہیٰ کلامہ

اسی طرح تحفۃ السالکین ترجمہ ارشاد الطالبین میں حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

العزلۃ خیر من جلیس السوء والجلیس الصالح خیر من العزلۃ۔ یعنی گوشہ نشینی بُرے ہم نشین سے اچھی ہے اور نیک ہم نشین گوشہ نشینی سے اچھا ہے جاہلوں اور فاسقوں اور ان لوگوں کی صحبت اور ہم نشینی جو دنیا میں مستغرق رہتے ہیں۔ کارخانۂ باطن کو خراب کر دیتی ہے خصوصاً مبتدی صوفیوں کے حق میں سخت مضر ہے جیسا کہ تھوڑے سے پانی کو نجاست پلید کر دیتی ہے صوفیوں اور صاحب دلوں اور ولیوں کی ہم نشینی وصحبت اللہ کے ذکر و عبادت سے بھی زیادہ مفید ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہا کرتے تھے اجلس بنا نومن ساعۃ یعنی ہمارے پاس بیٹھو تاکہ ہم آپس میں ایمان تازہ کر لیا کریں۔

اسی طرح اخبار الاخیار میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ فرمود "صحبت نیکاں بہ از کار نیک وصحبت بداں بدتر از کار بد" یعنی نیک صحبت نیک اعمال سے بہتر ہے اور بُری صحبت بُرے افعال سے بدتر ہے۔ اس سے معلوم یہ ہوا کہ یہ مسئلہ جس طرح نقول صوفیہ سے ثابت ہے اسی طرح عقلی بھی ہے۔ کیونکہ نیکی فرع ہے نیک کی جس طرح بدی فرع ہے بد کی۔ یعنی نیکی جب بھی کسی کو حاصل ہوگی تو کسی نیک ہی سے حاصل ہوگی۔ اس طرح کہ صحبت کی برکت سے پہلے وہ خود نیک ہوا ہوگا اسکے بعد اسکو نیکی یعنی طاعت کی توفیق ہوئی ہوگی۔ یہی حال بدی کا ہے کہ انسان اولاً بد ہوتا ہے بُروں کی صحبت سے پھر جب وہ بد ہو لیتا ہے تو اُس سے اور بھی طرح طرح کی بُرائیاں (معاصی) صادر ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ جس فرد یا جماعت کو نیک اور مرد صالح دیکھینگے تو تحقیق کرنے پر ضرور انکا تعلق کسی نہ کسی مرد صالح سے پائیں گے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کسی کو ذکر کی یا دوام ذکر کی توفیق ہوتی ہے وہ اس کی کسی بزرگ سے صحبت یا دوام صحبت کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اسی طرح شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل میں صحبت کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ پانچویں شرط یہ ہے کہ بیعت لینے والا مرشد کامل کی صحبت میں رہا ہو اور ان سے ادب سیکھا ہو زمانہ دراز تک ان سے باطنی نور اور اطمینان حاصل کیا ہو اور یہ یعنی صحبت کاملین اس واسطے شرط ہوئی کہ عادت الٰہی یوں ہی جاری ہوئی ہے کہ مراد

نہیں ملتی جب تک کہ مراد پانے والوں کو نہ دیکھے جیسے انسان کو علم نہیں حاصل ہوتا مگر علماء کی صحبت سے۔ اور اسی قیاس پر ہیں اور پیشے جیسے آہنگری بدون صحبت آہنگر کے یا نجاری[۵۸] بدون صحبت نجار کے نہیں آتی"۔

مترجم لکھتے ہیں کہ مولانا (شاہ ولی اللہ صاحبؒ) نے یہاں یہ بیان فرمایا ہے کہ جریان سنۃ اللہ کا بھید یہ ہے کہ انسان اسی نہج پر مخلوق ہوا ہے کہ یہ کمالات کو حاصل نہیں کرسکتا بدون اپنے ابناء جنس کی شارکت اور معاونت کے بخلاف اور حیوانات کے کہ ان کے کمالات پیدائشی ہیں اور کسبی نہایت کمتر۔ چنانچہ تیرنا حیوانات میں پیدائشی کمال ہے اور انسان کو بغیر سیکھے نہیں آتا (انتہیٰ کلام المحشی)۔

(شفاء العلیل ص۲۱)

ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کلک کا قلم استعمال فرماتے تھے جب اسکو بنوانے کی ضرورت ہوتی تو دوسروں سے بنواتے تھے اور اسی موقعہ پر اکثر فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو میں نے قلم بنانا استاد سے نہیں سیکھا اس لئے مجھے خود بنانا نہ آسکا۔

میں کہتا ہوں کہ صحبت کاملین کو افضل العبادت کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دنیا میں جب کبھی ہدایت ہوئی ہے تو ہمیشہ کسی نبی یا نائب نبی (یعنی کسی ولی) ہی کی بدولت ہوئی ہے کیونکہ عبادت کے عبادت ہونے کے لئے علم کی ضرورت ہوتی ہے اور علم حاصل ہوتا ہے صحبت کامل اور اُستاد سے پس جب عبادت کا عبادت ہونا ہی صحبت کامل پر موقوف ہوا تو صحبت کامل بھی افضل العبادت ہوئی صحبت کامل نہ ہو تو دنیا میں عبادت کا نہ علم رہ جائے نہ عمل۔

حضرت اقدس شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر باعمل سکھانے والے نہ ہوتے تو محض کتب فقہ کو دیکھ کر لوگوں میں ساری نماز تو درکنار اُس کے ایک رُکن مثلاً رکوع ہی کے بارے میں نہ جانے کتنا اختلاف ہوتا۔ کوئی کہتا کہ رکوع یوں ہونا چاہیئے۔ کوئی کہتا کہ نہیں بلکہ یوں ہونا چاہیئے آج جو اُمت رکوع و سجود کی کیفیت وغیرہ میں باہم متفق ہے تو یہ سب علماء اور کاملین کی صحبت ہی کی برکت ہے۔

حاصل یہ کہ اسی مختصر سے بیان سے آپکو مصاحبت کامل کی ضرورت اور اسکی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا۔ پس اسی سے سمجھ لیجئے کہ آج عوام جو محروم ہیں اس کی یہی وجہ ہے

[۵۸] بڑھئی کا کام۔

کہ جو چیز اس درجہ ضروری بلکہ انکے لئے حصول دین کا موقوف علیہ تھی لوگ اسی کے منکر ہو رہے ہیں عام طور پر لوگوں کو علماء عاملین اور مشائخ کاملین سے وحشت اور اعراض ہے مگر اللہ والوں سے دور رہ کر بھلا کوئی شخص کیونکر فلاح پا سکتا ہے جب کہ خود اللہ تعالیٰ نے صحبت صلحاء کی ضرورت بیان فرمادی ہے ارشاد ہے :۔

یَا اَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ٥ یعنی صادقین کی صحبت اختیار کرو تب ہی تقویٰ پا سکوگے۔

نیز تحفۃ السالکین میں ہے کہ :۔

مسئلہ :۔ پیغمبروں کے بھیجنے سے اصل مدعا یہی تاثیر صحبت ہے۔ کیونکہ فقہ اور عقائد کے مسئلے ملائکہ سے بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں جیسا کہ جبرئیلؑ کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

ھٰذَا جِبْرَئِیْلُ جَاءَکُمْ لِیُعَلِّمَکُمْ دِیْنَکُمْ ۔ یعنی یہ جبرئیل ہیں جو تمہارے پاس اس لئے آئے ہیں کہ تمہیں تمہارا دین سکھائیں اسلئے ثابت ہوا کہ مناسبت تامہ ہی پر تاثیر صحبت موقوف ہے جس کا ثمرہ ولایت ہے اور اسی لئے پیغمبر نوع انسانی میں سے آئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

لَقَدْ جَاءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ بیشک تمہارے پاس رسول آئے تمہاری جنس سے اور فرمایا لَوْ کَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰئِکَۃٌ یَّمْشُوْنَ الاٰیۃ۔ (تحفہ ص۳۵)

مسئلہ :۔ صرف ریاضت بغیر تاثیر صحبت کے نفس کی برائیاں دور کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتی اور انبیاء جن کو بالاصالت کمالات ولایت اور کمالات نبوت حاصل ہیں انکی صحبت کی تاثیر اور نیک لوگوں کی صحبت کی تاثیر (جو تبعاً کمالات نبوت رکھتے ہیں جیسے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) رذائل نفس دور کرنے کے لیے اور نیز ولایت حاصل کرنے کے لئے کافی ہیں لیکن نہ اتنی جلدی کہ دو ایک صحبتیں کافی ہوں بلکہ بڑی مدت میں۔ دوسرے اولیاء کی تاثیر صحبت مرید کی ریاضت کے بغیر کافی نہیں ہو سکتی۔ اگر فقط جذب کسی ولی سے حاصل ہوا ہو تو بلا ریاضت اور سلوک کے ہوتا ہے۔ (ص۳۵)

مسئلہ :۔ جذب الٰہی جو انبیاء علیہم السّلام کے واسطہ کے بغیر ہوتا ہے وہ خالص اجتباء ہے اور ایسے ہی وہ جو انبیاء علیہم السلام کے واسطے سے ہے اور جو اولیاء کے واسطے سے ہے

وہ خالص ہدایت ہے جو نیابت پر موقوف ہے اور جو ارباب کمالات نبوت یعنی اصحاب رضی اللہ عنہم یا دوسرے لوگوں کے واسطے سے ہو وہ ایسا اجتباء ہے کہ جس میں ہدایت کی بو ہے یا ایسی ہدایت ہے جس میں اجتباء کی بو ہے۔ پہلی قسم کو مرادیت اور دوسری قسم کو مریدیت کہنا مناسب ہے۔ اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اجتباء کرتا ہے۔ یعنی بلا کوشش کے انتخاب فرما لیتا ہے اور جو رجوع کرتا ہے اس کو ہدایت کرتا ہے۔ (تحفہ ص۳)

نیز تحفۃ السالکین میں عبادات کی برکات کے بیان میں ہے کہ :-

مشائخ نے کہا ہے کہ ناقص کی عبادت سے صرف اس قدر قرب حاصل ہوتا ہے کہ اگر بالفرض کوئی شخص پچاس ہزار سال عبادت کرے تو اولیاء کے ادنیٰ درجہ کو پہونچے گا اور رتبۂ ولایت پاوے گا۔

خدائے تعالیٰ کا یہ قول گویا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ ۝ یعنی فرشتے اور جبرئیلؑ ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتے ہیں۔ اور چونکہ دنیا کی ساری عمر بھی اس قدر نہیں ہوتی اس لئے ولایت کا حصول صرف ریاضت اور مجاہدہ سے متصور نہیں ہو سکتا۔ مولانا روم رحمہ اللہ فرماتے ہیں ؎

سیر زاہد ہر شبے یک روزہ راہ — سیر عارف یک دمے تا تخت شاہ

اسلئے واضح رہے کہ مشائخ جو مریدوں کو ریاضت و مجاہدہ کا حکم دیتے ہیں اس سے مقصود تصفیۂ عناصر اور تزکیۂ نفس ہے نہ کہ حصول قرب۔ بلکہ تصفیہ اور تزکیہ بھی صرف عبادت سے نہیں ہوتا جب تک کہ صحبت مشائخ کی تاثیر اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔

(تحفہ ص۳۲)

نیز علماء نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جو شخص بزرگوں کی صحبت کی دولت سے محروم ہو اسکو چاہیئے کہ وہ ان حضرات کے حالات ملفوظات انکے قصص و حکایات کا مطالعہ کرے کیونکہ ان حضرات کا کلام بھی تاثیر میں انکی صحبت ہی کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اخبار الاخیار کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ :-

بعد از حرمانِ دولتِ صحبتِ کاملان و اور کاملین کی صحبت کی دولت اور عارفین کی زیار

مشاہدہ جمال عارفان استماع اخبار و تتبع آثار ایشان در ہمت فسر بائی و در ظلمت زدائی ہماں تاثیر دارد کہ صحبت و مجالست بلکہ ایں نیز نوعے از صحبت است کہ جمال وقت در دے' از غبار کدورت بشری و حجاب صورت عنصری مصفیٰ است ، صفائے حسن عقیدت از مشاہدہ عادات و اطلاع بر زلات منزہ و معرّا۔ (اخبار الاخیار)

کی نعمت سے محروم ہونے کی حالت میں ان حضرات کے اقوال و حکایات کا سننا اور انکے حالات کا تتبع کرنا بھی سالک کی ہمت کو بڑھانے اور اسکے قلب سے ظلمت کو دور کرنے میں وہی تاثیر رکھتا ہے جو ان کی صحبت اور ہم نشینی رکھتی ہے بلکہ یہ بھی ایک قسم کی صحبت ہی ہے (وہ بھی ایسی کہ) وقت اور شکل کا جمال' بشری کدورتوں کے غبار اور صورت عنصری کے حجاب سے بالکل صاف ہوتا ہے اور حسن عقیدت کی صفائی طبعی امور کے مشاہدہ نیز ان کی لغزشوں پر اطلاع پانے سے منزہ ہوتی ہے۔

یعنی جسمانی مصاحبت میں تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سالک کے لئے کسی بزرگ کی بشریت اور اس کی انسانی کمزوریاں حصول فیض کے لئے اس طالب کے حق میں حجاب بن سکتی ہیں یا بعض طبعی امور یا انکی کوئی لغزش دیکھ کر سالک کی عقیدت میں تغیر ہوسکتا ہے لیکن ان کے حالات اور قصص میں تو صرف ان کے جمال و کمال ہی کا پہلو ہوگا لہذا اسکا نافع ہونا اور احتمال ضرر سے خالی ہونا ظاہر ہے۔

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ بزرگوں کے حالات اور ان کے مقالات کا سننا اور دیکھنا بھی گویا ان کی صحبت ہی میں بیٹھنا ہے اور تاثیر کی رو سے صحبت کا نعم البدل ہے۔

جس طرح یہاں سے بزرگوں اور کاملین کے کلام کا مثل انکی صحبت کے نافع ہونا معلوم ہوا اسی طرح سمجھئے کہ بُروں کی صحبت کا (مانند ان کے کلام کے) بھی اثر دوسروں پر بُرا ہی پڑتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنی گفتگو کیسے ہی عمدہ اور خوشنما پیرایہ میں کیوں نہ پیش کریں مگر صاحب ذوق پر اس کی تلخی مخفی نہیں رہتی۔ چنانچہ مولانا رومؒ نے وزیر خادع کے قصہ میں بیان فرمایا ہے کہ :۔

ہاں مشو مغرور زاں گفت نکو ۔۔۔ زانکہ باشد صد بدی در زیر او
ہرکہ باشد زشت گفتش زشت داں ۔۔۔ ہرچہ گوید مردہ آنرا نیست جاں
گفت انساں پارۂ انساں بود ۔۔۔ پارۂ از ناں یقیں ہم ناں بود

(مولانا رومؒ بطور نصیحت کے فرماتے ہیں) کہ

ایسے مکاروں کے ظاہری کلام دلپسند پر فریفتہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ اس کے باطن میں صد ہا خرابیاں ہوتی ہیں جو شخص خود اخلاق ذمیمہ رکھتا ہوگا اسکا کلام ضرور بُرا اثر رکھے گا اور مردہ دل جو کہے گا اس میں بھی جان یعنی تاثیر نہ ہوگی۔ کیونکہ انسان کا کلام مثل جزوِ انسان کے ہے (تابع ہونے میں پس جیسا متکلم ہوگا ویسا ہی اس کا کلام بھی ہوگا) جس طرح مردہ کا ٹکڑا ردی ہوتا ہے۔ (کلید مثنوی ص۸۵ ج۱)

حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ نے شرح وصیت نامہ (شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ) میں صحبت کاملین کو کبریت احمر فرمایا ہے

چنانچہ لکھتے ہیں کہ:-

شرع وعقل حاکم است کہ دفع ضرر از جلب منفعت اہم ومقصود باید داشت پس جائیکہ احتمال ضرر باشد از آنجا باید گریخت وشخصے کہ او متقی دریافتہ شود باوے صحبت داشتن ودست در دست او دادن قباحتے ندارد واحتمال ضرر آنجا مفقود است فائدہ از او رسد یا نہ رسد پس اگر صحبتش تاثیر کند وآں تاثیر نزد علماء ظاہر وباطن معتبر باشد صحبت ایں چنیں مرد کبریت احمر داند وغنیمت شمارد واگر صحبتش تاثیر ندارد یا آں تاثیر نزد اکابر معتبر نیست حسن ظن باآں شخص داشتہ صحبت او را ترک دہد واز جائے دیگر راہ خدا طلب کند کہ مقصود خداست نہ آں مرد۔

(حاشیہ بالا بد منہ)

شرع اور عقل ہر دو کا فیصلہ ہے کہ دفع ضرر (یعنی نقصان کے دفع کرنے) کو جلب منفعت (نفع کے حاصل کرنے) سے زیادہ اہم اور مقصود سمجھنا چاہئے لہذا جس جگہ ضرر کا احتمال ہو وہاں سے دور بھاگنا چاہئے اور جو شخص بظاہر متقی معلوم ہوتا ہو اسکی صحبت میں بیٹھنے اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے (کیونکہ) وہاں ضرر کا احتمال (تو بہرحال) نہیں ہے خواہ اس سے اسکو فائدہ بھی پہونچے یا نہ پہنچے پس اگر اسکی صحبت مؤثر ہو اور وہ تاثیر علماء ظاہر وباطن کے نزدیک معتبر بھی ہو تو ایسے شخص کی صحبت کو کبریت احمر (اکسیر) سمجھنا چاہئے اور ایسا غنیمت شمار کرنا چاہئے اور اگر اسکی صحبت مؤثر نہ ہو یا وہ تاثیر اکابر کے نزدیک معتبر نہ ہو تو اس شخص سے حسن ظن رکھتے ہوئے اسکی صحبت کو ترک کر دینا چاہئے اور خدا کا راستہ کسی اور جگہ سے تلاش کرنا چاہئے۔ کیونکہ مقصود حق تعالیٰ ہے نہ کہ وہ شخص۔

آگے تاثیر معتبرہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :-

وتاثیرے کہ اکابر آں را معتبر داشتہ اند آنست کہ در صحبتش حالے پیدا شود کہ دل از دنیا سرد شود و محبت خدا و دوستاں خدا و اعمال صالحہ و توفیق حسنات و اجتناب و بیزاری از سیئات دست دہد و از صحبتش بمقتضائے "اذا رُءوا ذُکِرَ اللّٰہ" خدا یاد آید و دوام حضور حاصل گردد و در یاد الٰہی اطمینان و جمعیت دست دہد و ہر قدر کہ اعمال صالحہ کند نسبتے و حالتے کہ ازاں بزرگ رسیدہ است در آں قوت بیند و ہر قدر کہ از معصیت پدید آید تنگ دلی و بے آرامی او را در گیرد و نسبتے و حالتے کہ ازاں بزرگ او را رسیدہ بود نقصان پذیرد و قال علیہ السلام اذا سرتک حسنتک و ساءتک سیئتک فانت مومن کنایت از ہمیں اطمینان و تنگی است۔

(حاشیہ بالا بدمنہ ص۱۷۳)

اور جس تاثیر کو اکابر نے معتبر قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ ان بزرگ کی صحبت میں بیٹھنے کی وجہ سے (سالک میں) ایک ایسا حال پیدا ہو جائے کہ (جس کی وجہ سے) دل دنیا سے سرد ہو جائے اور اللہ تعالیٰ نیز اللہ والوں اور اعمال صالحہ سے محبت ہو جائے۔ نیز نیکیوں کے کرنے کی اور گناہوں سے نفرت پیدا ہو جانے کی اور اس سے بچنے کی توفیق ہو جائے اور انکی صحبت سے بمقتضائے حدیث انکو دیکھ کر اللہ تعالیٰ انکو یاد آئے اور دائمی حضور نصیب ہو اور حق تعالیٰ کی یاد میں محبت اور طمانیت محسوس ہو اور جس قدر کہ اعمال صالحہ کرتا جائے تو اس نسبت میں جو اس بزرگ سے اس کو حاصل ہوئی ہے قوت مشاہدہ کرے اور جس قدر کہ اس سے معاصی کا صدور ہو اس کی وجہ سے اسکا دل تنگ ہو اور اپنے اندر ایک بیکلی محسوس کرے اور اس نسبت و حالت میں جو ان بزرگ (کی صحبت) سے اس کو حاصل ہوئی ہے کمی ہونے لگے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں کہ جب اپنی نیکیوں سے تم کو خوشی اور اطمینان حاصل ہو اور اپنی برائی سے تم خود تنگی محسوس کرو اور تم کو اس سے تکلیف پہونچے تو سمجھو کہ تم مومن ہو۔ اسی اطمینان اور تنگی کی طرف اشارہ ہے۔

اسی طرح تحفۃ السالکین ترجمہ ارشاد الطالبین میں ثبوت ولایت اور اسکے متعلقات کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :-

چوتھی دلیل :- یہ ہے کہ بیشمار لوگوں کی ایک جماعت جن کا جھوٹ پر متفق ہونا عقل محال سمجھتی ہے اور وہ اس قسم کی جماعت ہے کہ اسکا ہر ایک فرد بشر تقویٰ و علم کے

باعث ایسا درجہ رکھتا ہے کہ اس پر جھوٹ کی تہمت لگانا جائز نہیں ہے زبان قلم سے اور قلمِ زبان سے خبر دیتی ہے کہ ہم کو مشائخ کی صحبت کی وجہ سے جن کی صحبت کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتا ہے عقائد حقہ اور فقہ کے سوا جن سے وہ انکی صحبت سے پیشتر بھی بہرہ یاب تھے۔ باطن میں ایک نئی حالت پیدا ہوگئی ہے اور اس حاصل شدہ حالت سے ان کے دل میں خدا اور خدا کے دوستوں سے محبت اور اعمالِ صالحہ کا شوق اور نیکیوں کی توفیق اور سچے اعتقادات اور زیادہ راسخ ہوگئے ہیں یہی حالت ہے جس کو کمال کہنا چاہئے اور یہی حالت بہت سے کمال کی موجب ہے۔ (تحفۃ السالکین صلا)

اس سے بھی صحبت اہل کمال کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح مولانا رومؒ کے ذیل کے اشعار بھی ضرورت صحبت اہل کمال کی بیّن دلیل ہے ؎

روئے ہر یک می نگر می دار پاس بو کہ گردی تو ز خدمت روشناس
دیدن دانا عبادت ایں بود فتح ابوابِ سعادت ایں بود

یعنی اوپر کے شعر میں جو اہل اللہ کی قسمیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک کی زیارت کیا کرو اور ادب کا لحاظ رکھا کرو۔ شاید انکی خدمت کی برکت سے تم کو بھی اہل حق اور اہل باطل کی روشناسی کا سلیقہ ہو جائے۔

آگے فرماتے ہیں کہ یہ جو منقول ہے کہ عالم کا دیکھنا عبادت ہے اس عالم سے بھی اہل اللہ مراد ہیں ان ہی کا دیکھنا عبادت اور ان ہی کی خدمت سے ابوابِ سعادت مفتوح ہوتے ہیں۔ (کلید مثنوی ص۶۲)

ایک اور مقام پر مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

در قضائے عرصہ آں پاک جاں تنگ آمد عرصہ ہفت آسماں
گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ است من نگنجم ہیچ در بالا و پست
در زمین و آسمان و عرش نیز من نگنجم ایں یقیں داں اے عزیز
در دلِ مومن بگنجم اے عجب گر مرا جوئی دراں دلہا طلب

یعنی وسعتِ میدان روح پاک کے مقابلہ میں ساتوں آسمان کا میدان تنگ ہے (یعنی آدم علیہ السلام میں کمالات روحانی تھے اور روح میں بڑی وسعت ہے جس کی وجہ سے اسکا مجرد ہونا اور صفات میں حق تعالیٰ سے مناسبت ہونا ہے۔ بخلاف آسمان کے کہ اولاً تو اس میں

یہ روح مجرد نہیں پھر باری تعالیٰ کے ساتھ جو منزہ ہیں اتنی مناسبت نہیں اسلئے اُس قدر وسعت کمالات کی نہ ہوگی آگے اس کی تائید ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے (یعنی حدیث قدسی ہے) کہ میں کہیں بالا و پست میں نہیں سما سکتا ہوں یعنی نہ زمین نہ آسمان میں بلکہ عرش میں بھی نہیں سما سکتا اس کو یقین سمجھو مگر عجب بات ہے کہ مومن کے قلب میں سما جاتا ہوں۔ (کما قیل فی ہذا المعنی)

در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جا کردۂ — یہ تو حسنت نہ گنجد در زمین و آسماں

(از ناقل)

لہذا اگر تو مجھ کو طلب کرنا چاہتا ہے تو ان کاملین کے قلوب میں طلب کر، مراد یہ ہے کہ ان سے فیض باطنی حاصل کرو تو وہی کمالات محبت و معرفت وغیرہ تم میں پیدا ہو جائیں گے اور یہی وصول الی اللہ ہے۔ وقال فی موضع آخر ؎

ہست رنجوری من — ہست معذور یش ز رنجوری من

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا — گو نشیند در حضورِ اولیا

از حضورِ اولیاء گر بگسلی — تو ہلاکی زانکہ جزو بی کلی

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

جملہ دانایاں ہمیں گفتہ ہمیں — ہست دانا رحمۃ للعالمین

گر انارے می خری خنداں بخر — تا دہد خندہ ز دانہ او خبر

اے مبارک خندہ اش کو از دہاں — بنماید دل چو دُر از دُرج جان

اوپر کمال باطن حاصل کرنے کا طریقہ بتلایا تھا کہ اولیاء اللہ کی خدمت و صحبت اختیار کرنا چاہئے۔ اب اولیاء اللہ کی شناخت بتلاتے ہیں اور مدعیان مزورہ سے بچاتے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ تمام داناؤں کا یہی قول ہے کہ اگر انار خریدنا ہو تو کھلا ہوا دیکھ کر خریدو تاکہ اسکا خندہ اس کے دانے کا حال بتلادے اور یہ بیچ میں کہہ دیا کہ واقعی دانا آدمی بھی لوگوں کے حق میں موجب رحمت ہوتا ہے پھر انار کا ذکر فرماتے ہیں کہ اس کا خندہ بھی کیسا مبارک ہوتا ہے کہ اپنے دہن سے (یعنی باہر سے) اپنا دل (یعنی دانہ) جو مشابہ موتی کے ہے دکھلا دیتا ہے اور دہن سے نظر آنا ایسا ہے جیسے صندوقچہ جالی سے نظر آرہا ہو۔

اسی طرح سے عارفین نے کہ رحمت الٰہی ہیں فرمایا ہے کہ اگر پیر بناؤ تو اس کی شناخت کرو کہ اسکے انوار و برکات باطنی ظاہر میں نمایاں ہوتے ہیں یعنی ان میں اخلاق حمیدہ وصفات مرضیہ ہوں اور ان کی صحبت میں بیٹھ کر قلب میں حلاوت ولایت و نور و سرور و جمعیت و سکون و محبت الٰہی و بے رغبتی دنیا معلوم ہوتے ہیں کما قال اللہ تعالیٰ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ وقال علیہ السلام اِذَا رُءُوْا ذُکِرَ اللّٰہُ اور چونکہ بعض مکار اور مدعی بھی تبکلف اخلاق حمیدہ اختیار کرتے ہیں اسلئے امتیاز کا طریقہ بتلاتے ہیں اور ان کو لالہ سے تشبیہ دیتے ہیں ؎

نامبارک خندہ آں لالہ بود　　کز دہانِ او سوادِ دل نمود

یعنی بے برکت لالہ کا خنداں ہونا ہے کہ اس کے دہن ہی سے دل کی سیاہی نظر آتی ہے اسی طرح گو مدعی تبکلف اخلاق وافعال حمیدہ اختیار کرتے ہیں مگر چونکہ اس میں اخلاص نہیں ہوتا ہے اس لئے اس کا اثر طالب کے قلب پر نور و سرور نہیں ہوتا بلکہ وحشت و ظلمت اور پراگندگی قلب پر معلوم ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اوصاف حمیدہ و برکات قلبیہ سے کاملیت کی پہچان ہو سکتی ہے۔ آگے ان کی صحبت کے برکات بتلاتے ہیں ؎

نارِ خنداں باغ را خنداں کند　　صحبت مردانت از مرداں کند
یک زمانے صحبتے با اولیا　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
گر تو سنگ خارہ و مرمر شوی　　چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

یعنی جس طرح انار خنداں تمام باغ کو رونق دار و پر بہار کر دیتا ہے اسی طرح مردانِ خدا کی صحبت تم کو مردِ خدا بنا دیتی ہے۔ تھوڑی دیر تمہارا اولیاء اللہ کے پاس بیٹھ جانا صد سالہ طاعتِ بے ریا سے بہتر ہوتا ہے۔ اگر تم سنگ خارہ یا سنگ مرمر بھی (یعنی ناقص) ہوگے مگر صاحب دل کی صحبت میں پہونچ جاؤگے تو گوہر (یعنی کامل) بن جاؤگے۔ ؎

مہر پاکاں درمیانِ جاں نشاں　　دل مدہ الا بمہرِ دل خوشاں
کوئے نومیدی مرو کامیدہاست　　سوئے تاریکی مرو خورشیدہاست
دل ترا در کوئے اہل دل کشد　　تن ترا در حبس آب و گل کشد

اُس لئے پاک لوگوں کی محبت کو دل میں جگہ دینی چاہئے (مگر ہر شخص پر فریفتہ مت ہوجانا بلکہ) جو لوگ نیک باطن ہیں انہیں کی محبت کرنا (اور یہ سمجھنا کہ ایسے کامل کہاں ہیں پھر کس کے پاس جائیں یہ تو ناامیدی کی بات ہے اور) ناامیدی کی راہ مت چلو کیونکہ خدائے تعالیٰ کے فضل سے بہت امیدیں ہیں (اور اللہ تعالیٰ کاملین کو ہر زمانہ میں پیدا کرتے رہتے ہیں) ظلمت یعنی مدعیان مزور کی طرف مت جاؤ۔ خورشید یعنی منور باطن لوگ موجود ہیں تمہارا دل تم کو ان اہلِ دل کے پاس پہنچاوے گا اور (طلب میں کاہلی مت کرو) یہ جسم تم کو زندان آب و گل یعنی لذات نفسانیہ کی طرف کھینچے گا (جس کا انجام بُرا ہوگا) ؎

ہیں غذائے دل بدہ از ہمدمے رو بجو اقبال را از مقبلے
دست زن در ذیل صاحب دولتے تاز افضالش بیابی رفعتے
صحبتِ صالح ترا صالح کند صحبتِ طالح ترا طالح کند

(یعنی ہم تم کو متنبہ کرتے ہیں کہ دل کو اس کی غذا یعنی محبت و معرفت کسی ہمدل سے کر دینا چاہئے اور اقبال کو کسی صاحبِ اقبال سے لینا چاہئے اور کسی صاحبِ دولت یعنی صاحبِ باطن کا دامن ہاتھ میں لانا چاہئے تاکہ اس کی عنایات سے تم کو رفعت باطنی حاصل ہوجائے کیونکہ صحبت ہی وہ تاثیر ہے کہ صالح کی صحبت تم کو صالح بنادیتی ہے۔ اسی طرح طالح (بدبخت) کی صحبت تم کو طالح بنادیتی ہے۔

(کلید مثنوی دفتر اول صفحہ ۱۴۱)

میرے خیال میں ضرورت (صحبت) کا اثبات ہوگیا اس لئے اب میں اس کو ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ علم و عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

ختم شد

رسالہ

تلاش مرشد

از افادات

مصلح الامۃ عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تلاش مُرشد

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اللہ تعالیٰ کی طلب اس دار دنیا میں ایمان کے لوازم سے ہے جس قدر ایمان ہوگا اسی قدر یہ طلب ہوگی اور جس طرح سے یہ طلب ایمان کے لوازم سے ہے اسی طرح حیرانی و سرگرانی بھی طلب کے لوازم سے ہے۔

چنانچہ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی کی ایک تفسیر اسی حیرانی سے بھی کی گئی ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے اور اس کو صوفیاء اپنے کلام میں حیرت سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ حیرت محمود ہے۔ ان حضرات کے یہاں حیرت کی دو قسمیں ہیں ایک محمود ہے اور ایک مذموم، حیرت محمود تو یہی ہے جو بیان ہوئی اور مذموم یہ ہے کہ انسان کو محبوب کی طلب سے غفلت ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ راستہ کو چھوڑ دیتا ہے اور راستہ کو چھوڑ دینے کے لئے حیرانی و سرگردانی لازم ہے، اسی کے سبب وہ حیران رہتا ہے، یہ حیرانی مذموم ہے اور کل دنیا داروں کو حاصل ہوتی ہے بلکہ انکے لازم حال رہتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ اپنے مستقل مرکز یعنی اللہ تعالیٰ سے ہٹ جاتے ہیں اور پھر انکا کوئی مستقل مرکز نہیں رہ جاتا۔ یہی سبب بنتا ہے انکی حیرانی و پریشانی کا کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

رہے نہ دل کے لئے کوئی مستقل مرکز　　　یہی ہے عقل تو دل اس سے دور ہی اچھا

اور ایک حیرانی اللہ تعالیٰ کی طلب میں ہوتی ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام، مومنین اور صالحین کو حاصل ہوتی ہے کیونکہ ادھر کا راستہ اس قدر وسیع ہے کہ یہ حضرات اس میں حیران رہ جاتے ہیں اور یہ حیرانی کیوں نہ ہو یہ راہ بھی تو کس کی ہے؟ یہ محبوب حقیقی کی راہ ہے! اس راہ میں جب کسی کو ذرا سی بھی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو بس وہ حیران رہ جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض بعض اسی مرتبہ میں

مجذوب ہو جاتے ہیں بس اسی حیرانی میں کبھی ان حضرات سے بظاہر کچھ خلاف اور خطا کا صدور بھی ہو جاتا ہے لیکن یہ مذموم نہیں۔

چنانچہ حضرت امیر خسروؒ جو حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ ؎

حیراں شدہ ام در آرزویت　　اے چشم جہانیاں بسویت

(میں تیری آرزو میں حیران ہو گیا ہوں۔ اے وہ ذات کہ دنیا کی نظریں تیری ہی جانب لگی ہوئی ہیں)۔

ما ایم و تحیر و خموشی　　آفاق ہمہ بگفت گویت

(ہم ہیں اور حیرانی و خموشی ہے اور سارا جہاں تیری گفتگو کر رہا ہے)

خسرو بکمند تو اسیر است　　بیچارہ کجا رود ز کویت

(خسرو تیری کمند میں قید ہے۔ یہ بیچارہ تیری گلی کو چھوڑ کر کہاں جائے)

اور مولانا رومؒ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

کاملاں کز سر تحقیق آگہند　　بیخود و حیران و مست و والہند

نے چنیں حیراں کہ پشتش سوئے اوست　　بل چنیں حیراں کہ غرق مست دوست

یعنی کاملین جو کہ راز حقیقت سے آگاہ ہیں وہ تو ہر معاملہ قدرت و حکمت کو دیکھ دیکھ کر خواہ وہ خود ان کے ساتھ پیش آویں یا دوسروں میں معائنہ کریں۔ ہر وقت حیران و مست رہتے ہیں لیکن ایسے شخص کی طرح حیران نہیں ہیں جس کی پشت دوست کی طرف ہو یعنی حق تعالیٰ سے غافل و محجوب ہو بلکہ وہ ایسے حیران ہیں کہ علوم الٰہیہ میں مستغرق اور مست ہیں۔

مطلب یہ کہ ان کی حیرت مذمومہ نہیں بلکہ محمودہ ہے۔ اس کے بعد حیرت محمودہ کے دو مرتبے بتلاتے ہیں ! ؎

آں یکے را روی او شد سوئے دوست　　ویں یکے را روی او خود روی اوست

(یعنی ایک حیرت زدہ وہ ہے کہ اس کی توجہ دوست (حضرت حق) کی طرف ہے دوسرا وہ ہے کہ اس کی توجہ عین دوست کی توجہ ہے۔)

اب اس حیرانی کے اسباب کا بیان کرنا کچھ آسان نہیں یہ وہ حیرانی ہے جو محبوب حقیقی کی طرف سے پیش آتی ہے اور ہر ایک کو اس کے حال کے مناسب پیش آتی ہے وہ غنی ہیں طالب سے بھی

اور طالبین کی طلب سے بھی، اس لئے اپنے طالبین سے بھی غنا ظاہر کرتے ہیں اب جبکہ محبوب ہی غنا ظاہر کرے تو ایک طالب و محب بیچارہ کیا کرے اور کہاں جائے حیران و ششدر رہ جاتا ہے اور بالکل اسکا مصداق ہو جاتا ہے کہ ؎

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی   بازار خویش و آتش ما تیز می کنی

اور اس وقت زبان حال و قال سے کہتا ہے کہ ؎

اشاهد من اهوى بغير وسيلة   فيلحقني شان اضل طريقا

يؤجج نارا ثم يطفئ برشة   لذاك تراني محرقا وغريقا

(یعنی میں اپنے محبوب کو بغیر کسی وسیلہ کے براہ راست دیکھتا ہوں تو مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ میں راستہ بھٹک جاتا ہوں وہ محبوب دل کی آگ بھڑکاتا ہے اور پھر اس پر چھینٹے ڈال کر بجھاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جس کی بنا پر تم مجھ کو آگ میں جلتا ہوا اور پانی میں ڈوبا ہوا دیکھتے ہو۔ ۱۲ احقر رومی)

اور اسی حال میں کہتا ہے کہ ؎

باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل   اب کہاں لیجا کے بٹھلائیں ایسے دیوانے کو ہم

اور محبوب کے لئے تو یہ بے نیازی لازم ہے جیسے عشاق کے لئے نیاز و طلب لازم ہے وہ اپنے عشاق کا اسی میں امتحان کرتے ہیں ؎

مزہ آتا ہے انکو چھیڑنے میں اپنے عاشق کے   کبھی مسرور کرتے ہیں کبھی رنجور کرتے ہیں

کسی نے خوب کہا ہے ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے   بے نیازی تری عادت ہی سہی

یہی وجہ ہے جو سالکین کو قبض بسط پیش آتا ہے۔ جب حیرانی اس طریق کے لوازم سے ہے تو ہر طالب میں اسکا کم و بیش ہونا لازم ہے اسی لئے کسی طالب کو کوئی اصول یا طریقہ جب سکھایا جائیگا تو بصیرت حاصل ہونے سے پہلے کسی اصول پر دہ رہیگا نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہی اس کے شامل حال ہو جائے اور وہ اپنے طلب کے امتحان میں کامیاب ہو جائے اسمیں سب سے زیادہ مفید چیز ان حضرات کا اتباع ہے جو ان حالات سے گذر چکے ہیں جو لوگ ان گھاٹیوں سے پار ہو چکے ہیں وہی دوسروں کو ان گھاٹیوں سے نکال سکتے ہیں اور انھیں سے کچھ راستہ مل سکتا ہے۔ لیکن شامت اعمال سے آج اہل اللہ ہی پر اعتماد نہیں رہا اس واسطے کہ اس (جماعت) میں بہت سے

ایسے لوگ داخل ہوگئے ہیں جن سے لوگوں کا اعتماد اُٹھ چکا ہے اس کی وجہ سے اب وہ کسی کا بھی اعتماد نہیں کرتے۔

ہماری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ زمانہ بد دینی کا ہے (اول تو لوگوں کو دین کا خیال ہی نہیں اور) اگر کسی کو کچھ خیال ہوا بھی تو وہ اہل اللہ اور بزرگ کے انتخاب ہی میں حیران و پریشان رہ جاتا ہے اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کس کے پاس جائے اور کس کے پاس نہ جائے اور اسمیں وہ کسی قدر معذور بھی ہے۔ لہذا اب اس حال میں بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ جس کی راہ میں قدم رکھنا چاہتا ہے اسی سے التجا کرے اور اپنی کوشش پر بالکل اعتماد نہ کرے کیونکہ اب اس زمانہ میں جب کہ رہبر اور رہزن باہم مخلوط ہوگئے ہیں تو کس پر اعتماد کیا جائے اور کس کا اعتبار کیا جائے۔ لہذا اب طریق یہ ہے کہ وہ دعا جو "سمجھ بوجھ" کے حاشیہ پر درج ہے اس پر عمل کرے جس کا حاصل یہ ہے کہ جناب باری میں صدق و خلوص کیساتھ خوب الحاح وزاری کرے اور دو ایک بار نہیں بلکہ ایک مدت تک اس کا معمول رکھے۔

وہ دُعا یہ ہے:۔

کہ اے معبود برحق اے مرے رب — کوئی بندہ جو ہو تیرا مقرب
بس اس عاصی کو تو اس سے ملادے — جمالِ پاک تو اس کا دکھادے
کہ میں صحبت سے اسکے بہرہ ور ہوں — وسیلہ سے بس اس کے تجھ کو پاؤں

انشاء اللہ تعالیٰ مطلوب حقیقی اپنے طالب کی مدد فرمائیں گے اور اس کی طلب کو ضائع نہ فرمائیں گے، کوئی اللہ کا بندہ اس کو مل ہی جائیگا۔ عادۃ اللہ ایسی ہی جاری ہے اس سے بڑھ کر اور اس سے بہتر اس زمانہ میں طالبین حق کے لئے اور کوئی طریقہ بے غل وغش نہیں ہے کیونکہ بزرگان دین نے اور طریقے بھی لکھے ہیں مگر اس میں طالبین کو کچھ اشکال ہوجاتا ہے کچھ تو بصیرت کی کمی کی وجہ سے اور کچھ طلب کی کمی کی وجہ سے۔

باقی یہ طریقہ جو ابھی میں نے بتایا ہے سمجھ بوجھ کے بتایا ہے اور یہ طریقہ اللہ تعالیٰ سے استخارے کا ہے جو کہ ایسے اُمور میں مسنون ہے چونکہ اس میں کامیابی کا وعدہ ہے لہذا انشاء اللہ کامیابی یقینی ہے۔

اس مناجات کی یہ جو تاثیر بیان کی گئی کہ کسی بزرگ تک پہنچنے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ نکل

آویگا اور کسی اللہ کے بندے سے ملاقات ہو ہی جائے گی۔ تو اس کے متعلق ایک واقعہ سُنئے!

ہمارے قبلہ و کعبہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ نے حضرت حاجی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ایک بزرگ کے ہاتھ میں دیدیا جس سے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سمجھا کہ اشارہ اس طرف فرمایا جارہا ہے کہ ان سے بیعت ہو۔ اس سے آپ کو اس کا علم تو ہو گیا کہ مجھ کو ان سے استفادہ کرنا چاہئے لیکن ان بزرگ کا پتہ و نشان کچھ معلوم نہ ہوا کہ کہاں ہیں اور کون ہیں۔ قریب ہیں یا دور ہیں۔ ایک بار حضرت کا جلال آباد جانا ہوا وہاں کوئی بزرگ تھے۔ جو حضوری کہلاتے تھے (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انھیں زیارت ہوتی تھی) ان سے اس خواب کا ذکر کیا انھوں نے فرمایا کہ ذرا لوہاری تو جاؤ اور وہاں جاکر تو دیکھو وہاں ایک بزرگ رہتے تھے جو بچوں کو قرآن شریف وغیرہ پڑھاتے تھے اور عام طور پر لوگوں کو ان کی جانب کوئی توجہ نہ تھی۔ حضرت حاجی صاحب رحؒ لوہاری تشریف لے گئے جاکر دیکھا تو بعینہٖ وہی شکل پائی جو خواب میں دیکھی تھی۔ بس دیکھ کر قدموں پر گر پڑے اور ابھی حضرت حاجی صاحب نے کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ حضرت میانجی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میاں خواب و خیال کا کیا اعتبار ہے حضرت قبلہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نہیں حضرت بیعت فرمالیجئے فرمایا اچھا جاؤ وضو کر کے آؤ۔ اس کے بعد بیعت فرمالیا۔ اسی طرح اس مناجات کی تاثیر کا دوسرا واقعہ سنئے:۔

ایک صاحب تھے محمد قاسم نیا نگری جو پہلے ایک شیخ محمد امیر علی صاحب سے بیعت تھے لیکن ان سے طریق کا کچھ نفع نہ ہوا تھا کہ وہ بزرگ کہیں لاپتہ ہو گئے تھے اس لئے وہ کسی دوسرے شیخ کے جویا ہوئے۔ چنانچہ وہ اپنا واقعہ خود لکھتے ہیں کہ چند رسالہ علم سلوک کے مثل القول الجمیل ترجمہ شفاء العلیل و معمولات مظہریہ و تفہیم بوجھ اس عاجز کے مطالعہ میں آئے ان کے مطالعہ سے کچھ طبیعت پر ایک طرح کی ہوس شوق پیدا ہوئی اور جب مطلب معلوم نہ ہوتا تو دل گھبرانے لگتا اور جو دعا حاشیہ سمجھ بوجھ اور متن میں سات مرتبہ سورہ الحمد و چند ابیات التجا بجناب باری تعالیٰ کے درج ہیں ایک مدت تک معمول رکھا اس مناجات کی یہ تاثیر ہوئی کہ جو محبت قلبی و روحی حضرت فضیلت پناہ، حقیقت آگاہ کرامات دستگاہ

امام السالکین پیشوائے عارفین جناب مولانا و مرشدنا مولوی حافظ حاجی محمد یعقوب صاحب ادام اللہ فیضہم و برکاتہم سے تھی اب اثر اس کا ہونے لگا اور جوش محبت حضرت ممدوح دل بیتاب پر بڑھنے لگا۔ یہاں تک غلبہ محبت کا ہوا کہ جناب مولانا صاحب ممدوح بغیر دیکھے بھالے میری آنکھوں کے سامنے رونق افروز ہوتے تھے اور کئی مرتبہ عالم رویا میں زیارت و قدمبوسی حاصل ہوئی۔ (مکتوبات یعقوبیہ ص)

اس کے بعد ایک حدیث ملی اسمیں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ راوی نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ کسی جلیس صالح (نیک ہمنشیں) سے ملاقات ہو تو انکی ملاقات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے ہوئی۔

چنانچہ ترمذی شریف کی حدیث ہے حضرت حریث بن قبیصہ رضی اللہ عنہٗ جو راوی حدیث ہیں وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب میں مدینہ منورہ حاضر ہوا تو میں نے یہ دعا کی کہ یا اللہ مجھے کوئی جلیس صالح عطا فرما۔ چنانچہ میری ملاقات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہٗ سے ہوئی میں نے ان سے کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ مجھے کوئی جلیس صالح عطا فرما تو آپ مجھ سے ملے ہیں لہذا مجھے کوئی حدیث سنائیے جسے آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو شاید کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس سے نفع عطا فرمائیں اس پر انھوں نے یہ حدیث سنائی۔ فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قیامت کے دن بندے کے اعمال میں سب سے پہلے جس کا حساب ہوگا وہ اس کی نماز ہوگی۔ اگر یہ درست ہو گئی تو وہ شخص کامیاب ہو گیا اور جس کا نماز کا حساب صاف نہ ہوا تو وہ خائب و خاسر ہوا، پھر اگر اس کے فریضے میں کچھ کمی ہوگی تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دیکھو میرے بندے کے پاس کوئی نفل عبادت بھی ہے اگر ہوئی تو اس سے اس کے فریضہ کی تکمیل کر دی جائے گی پھر اس کے بقیہ اعمال بھی اسی طور پر ہوں گے۔

دیکھئے ان واقعات سے معلوم ہوا کہ جس کو جہاں سے کسی دولت کا حصول اور جس سے استفادہ لکھا ہوتا ہے تو منجانب اللہ غیب سے اس کے ذرائع بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ طالبین کو اس بات کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے بس اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے اسی سے کامیابی ہوتی ہے۔ باقی یہ خیال کرنا کہ دنیا بزرگوں سے خالی ہو چکی ہے اور اب اہل اللہ اور کاملین موجود ہی نہیں ہیں یہ تو بہت ہی برا خیال ہے اور صحیح بھی نہیں ہے۔ اسلئے کہ اہل اللہ

ہر زمانہ میں رہے ہیں اور رہیں گے گو کم رہیں، مگر دنیا کبھی ان سے خالی نہ رہیگی۔ فرق یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں زیادہ ہوتے تھے اور اب کم ہوتے ہیں۔

پس جب کسی کا اہل اللہ میں سے ہونا ثابت ہو جائے گا تو اسکا معاملہ اور اسکی عظمت ضروری ہوگی اور اس طریق میں جس طرح اعتقاد ضروری ہے کہ بدون اس کے نفع نہیں ہوتا اسی طرح کسی کامل کے انکار سے نقصان اور ضرر بھی ہوتا ہے۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ کہیں کسی شیخ کے یہاں جانے سے پہلے اس کی عظمت اور اسکا اعتقاد اپنے قلب میں خوب راسخ کرے تب جائے۔ کیونکہ تحقیق کا محل ابتدا ہی میں ہے کسی کو علیٰ وجہ البصیرت ماننے میں اگر کچھ زمانہ بھی لگ جائے تو کچھ حرج نہیں۔ بعض لوگوں نے شیخ کے پاس جانے سے پہلے دس دس برس صرف کردیے۔ لیکن جب دلیل اور برہان سے کسی کو مان لے تو پھر اپنی تحقیق کو بالائے طاق رکھدے اور تقلید اختیار کرے اور اس کے سامنے پامال ہو جائے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انسان کو انتخاب شیخ کے باب میں تو محقق ہونا چاہئے اور پھر اسکے بعد اس کی تقلید کرنی چاہئے۔ آج لوگوں نے ان دونوں باتوں کو ترک کردیا ہے اول تحقیق نہیں کرتے۔ جہاں تحقیق سے کام لینا چاہئے تھا اور جب تقلید کا وقت ہوتا ہے تو وہاں تحقیق شروع کردیتے ہیں۔

غرض جس طرح اسکا ایک طریقہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ہے اسی طرح اسکا ایک دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کا صادق ہونا اسکے نزدیک مسلم ہو ان سے دریافت کرے اور جب کوئی صادق کسی کی تصدیق کرے اور اس پر اپنا قلب بھی مطمئن ہو جائے تو پھر اسکے بعد اس کا ماننا ضروری ہے کیونکہ شہادت میں شاہد کے عادل ہونے کا تو لحاظ کیا جائے گا لیکن کسی عادل شاہد کی شہادت کے بعد پھر اسکے خلاف نہیں جا سکتا ورنہ تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ شہادت کوئی چیز ہی نہ ہوئی اسکے دروازہ کا بند کرنا لازم آئیگا۔ حالانکہ دین ودنیا کے کتنے معاملات ہیں کہ جو شہادت سے متعلق ہیں۔ حقوق کا ثبوت شہادت سے ہوتا ہے۔ رویت ہلال میں شہادت عدل کا اعتبار ہے اور اس کی وجہ سے صیام وفطر کا تحقق ہوتا ہے۔ پھر جب تمام امور میں شہادت معتبر ہے تو پھر شیخ کے انتخاب کے معاملہ ہی میں کیوں اسکا اعتبار ساقط کردیا گیا ہے۔

آج لوگوں سے جب یہ کہا جاتا ہے کہ کسی اہل اللہ کی شناخت اگر تم کو از خود حاصل نہیں ہوتی

تو دوسرے نیک لوگوں سے اسکا حال معلوم کرو اور انکی شہادت پر عمل کرو، تو اس سے بڑھ کتے ہیں میرے خیال میں اسکا منشا جہل ہے۔ حاصل یہ کہ شہادت کے بعد پھر اس کا ماننا ضروری ہے اب اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہے اور اس کے نصیب میں ہے تو اس سے اسے فائدہ پہونچیگا ورنہ چونکہ وہ شیخ صادق ہے وہ خود ہی کہدیگا کہ تم فلاں کے یہاں جاؤ تمھارا حصہ یہاں نہیں ہے۔ چنانچہ ہر زمانہ میں بزرگان دین نے ایسا ہی کیا ہے۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے کہ ایک بزرگ تھے مولانا محمد جان صاحبؒ جبل ابو قبیس پر رہتے تھے میں نے انکی زیارت کی ہے وہ کہتے تھے کہ میں اور تمھارے دادا پیر حاجی عبد الرحیم صاحب دونوں پہلے مولانا عبد الباری صاحب امروہی کے پاس گئے۔ ایک روز، مثنوی کے مطالعہ سے ان پر کوئی خاص کیفیت طاری تھی کہ مجھ سے فرمایا کہ تمھارا حصہ مولانا غلام علی صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ہے وہاں چلے جاؤ یہاں تم کو فائدہ نہ ہوگا، اور حاجی عبد الرحیم کو اپنے پاس رکھ لیا۔

اسی طرح ایک اور واقعہ ایک اور بزرگ کا ہے کہ انکی وفات کے بعد جب انکے صاحبزادے مسند خلافت پر بیٹھے تو شیخ کے بڑے بڑے مریدین تھے انکو ان صاحبزادے کی صغر سنی کی وجہ سے ان سے اخذ فیض میں کچھ عار سی محسوس ہوئی۔ چنانچہ وہ لوگ اسی زمانہ میں ایک دوسرے بزرگ تھے ان کے پاس چلے گئے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں وہیں جاؤ۔ تم لوگوں کا حصہ وہیں ہے اس کے بعد آئے اور نفع ہوا۔

اسی سلسلہ کا ایک واقعہ اور سنئے۔ کانپور میں ایک بزرگ تھے مولوی غلام حسین صاحب میں بھی ان سے ملا ہوں اچھے بزرگ تھے وہ اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ میں کہ معظمہ میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کے لئے حاضر ہوتا تھا لیکن کہ معظمہ میں ایک بزرگ ملے اور وہ کہتے تھے کہ میں دیکھتا ہوں کہ حضرت حاجی صاحب اپنی نسبت کا القا تمھارے اوپر کرتے ہیں لیکن فلاں بزرگ نقشبندی سلسلہ کے آکر اس کو روک دیتے ہیں (مطلب یہ تھا کہ تم کو نفع اس سلسلہ سے پہونچے گا)۔

لہٰذا طالب کو چاہئے کہ جب کوئی صادق کسی کی بابت شہادت دے جس پر کہ اپنا قلب بھی مطمئن ہو جائے تو اس کے یہاں جائے اور عظمت و ارادت کے ساتھ جائے اور اپنے ارادت میں صادق ہو ۵

در ارادت باش صادق اے فرید تا بیابی گنج عرفاں را کلید
بے رفیقی ہر کہ شد در راہِ عشق عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

(یعنی اے فرید تم ارادت و عقیدت میں سچے بنو تاکہ گنج عرفاں کی کنجی حاصل کر لو. جو شخص عشق کی راہ میں ساتھی کے بغیر رہا تو اس کی عمر گذر جائے گی عشق سے آگاہ نہ ہوگا۔
۱۲- رومی)

عراقی میں بھی ارادت. اور ارادت میں بھی بصیرت تو اصل چیز ہے اور یہی کلید کامیابی ہے۔

اسی طرح شیخ کو بھی لازم ہے کہ اگر اسکا حصہ اسکے یہاں نہیں ہے تو صاف کہدے کہ تم فلاں جگہ جاؤ اور فلاں سے طریق اخذ کرو اور جو کوئی سچا ہوگا تو وہ یہ کہہ بھی دیگا. کیونکہ اسکا مقصود کام ہوتا ہے اپنا نام کرنا نہیں ہوتا۔

میں محکم برہان اور روشن دلائل پیش کر رہا ہوں اس پر کہ اہل اللہ کے تلاش کرنے کا طریقہ کیا ہے اور اس کی جو دلیل بیان کی گئی ہے وہ ایسی مستحکم ہے کہ کوئی رد اور انکار نہیں کر سکتا۔

مشائخ نے اس مضمون پر بسیط کلام فرمایا ہے جس طرح سے کہ تصوف کے اور دوسرے مضامین و مسائل پر کلام کیا ہے اسی طرح اس پر بھی مفصل بحث فرمائی ہے اور اس کو کسی کی عقل یا رائے پر موقوف نہیں رکھا اور نہ صرف اس زمانہ میں بلکہ پہلے بھی اور ہر زمانہ میں اکابر فن نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور ہمیشہ سے اس پر کلام کرتے چلے آئے ہیں باقی میں نے اس وقت جو مختصر سا کلام کیا ہے وہ بھی بہت کافی وافی ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ ایک مسلم الثبوت عالم، بالغ نظر مفسر، مستند محدث، بلند پایہ فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عارف کامل صوفی اور حضرت مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ بھی تھے۔ اپنے لاجواب رسالہ تصوف ارشاد الطالبین میں اسی سلسلہ کا ایک عامۃ الورود شبہہ اور اس کا محققانہ جواب تحریر فرماتے ہیں:-

(ہم اس کے اردو ترجمہ سے قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ضروری عبارتیں اس سلسلہ کی نقل کرتے ہیں:-

فائدہ۔ یاد رکھو (خدا تم کو سعادت بخشے) کہ خرق عادات، ولایت کے لوازم سے نہیں۔ بعض اولیاء اللہ اور مقربان درگاہ الٰہی ایسے بھی ہیں جن سے خرق عادات ظاہر نہیں ہوئے۔ چنانچہ اکثر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خرق عادات مروی نہیں ہوا۔ حالانکہ ادنیٰ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیگر اولیاء اللہ سے افضل ہیں۔ (چند سطور کے بعد) اور صاحب عوارف فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو خوارق دیتا ہے اور دوسروں کو نہیں دیتا اور وہ صاحب خوارق سے افضل ہوتے ہیں اور خرق عادات ذکر قلب اور اس کی تجدید سے مرتبہ میں کم ہے۔ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری نے فرمایا ہے کہ عارفوں کی فراست، طالبوں کی استعداد اور اولیاء کے مقامات دریافت کرنے میں مطلق ہے اور اہل ریاضت کی فراست، صوریں اور ان اشیاء کے حالات دریافت کرنے میں مخصوص ہے جو اس کی نظر سے غائب ہیں چونکہ اکثر مخلوق دُنیا میں مشغول ہیں اور خدا سے بے تعلق ہیں تو ان کے دل غائب اشیاء کے احوال معلوم کرنے کی طرف زیادہ مائل ہیں اور اس کو بہت عمدہ جانتے ہیں۔ یہ لوگ اہل عرفان اور حقیقت کے کشف سے کوئی کام نہیں رکھتے اور کہتے ہیں کہ اگر یہ لوگ اہل اللہ ہوتے تو غیب کے حالات سے خبردار ہوتے جب اتنی خبر ان کو نہیں تو دوسری باتیں ان کو کیا معلوم ہوں گی۔

اسی طرح منافق لوگ سید المرسلین کے حق میں کہتے تھے۔ ایسے کمینے لوگ ان فاسد خیالات کے باعث دوستان خدا کی برکات سے محروم رہتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کے بارے میں غیرت رکھتا ہے کہ ان کو اپنے سوا کسی اور کی طرف مشغول نہیں ہونے دیتا (چار سطور کے بعد) اگر کوئی کہے کہ اگر خوارق عادات ولایت کی شرط نہ ہوں تو کیونکر یہ معلوم کیا جاسکے کہ یہ ولی اللہ ہیں۔ حضرت مجدد رضی اللہ عنہ نے اس بات کے دو جواب دئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ولی کی ولایت کو معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ولایت خدا سے ایک نسبت ہے کوئی اس سے مطلع ہو یا نہ ہو۔ اکثر اولیاء اللہ خود اپنی ولایت سے مطلع نہیں ہیں دوسروں کا کیا ذکر ہے۔ موت کے بعد اسکا ثمرہ دیکھیں گے۔

خوارق کی ضرورت دراصل انبیاء کو ہے جو مخلوق کو دعوت دیتے ہیں۔ ضروری ہے

کہ وہ مخلوق پر اپنی نبوت ظاہر کریں اور ثبوت مہیا کریں۔ اولیا جو دعوت کرتے ہیں تو اپنے پیغمبر کی شریعت کی ہی دعوت دیتے ہیں۔ اس پیغمبر کا معجزہ اس دعوت کے لئے کافی ہے۔ علماء و فقہاء ظاہر شرع کی دعوت دیتے ہیں اور اولیاء مریدوں کو پہلے ظاہر شریعت کے بجالانے کی دعوت دیتے ہیں پھر ان کو ذکر سکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اپنے اوقات یاد الٰہی میں صرف کیا کرو تاکہ ذکر الٰہی غالب ہوجائے اور خدا کے سوا کسی دوسرے کا خیال دل میں نہ رہے اور اس دعوت میں کرامت کی ضرورت نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ مرید رشید جوں جوں اپنے حالات میں تغیر دیکھتا ہے اپنی ہی ذات میں اس کو پیر کی کرامت لحظہ بہ لحظہ نظر آتی ہے جو مردہ دل کو زندہ کرکے مشاہدہ اور مکاشفہ سے سرفراز کردیتا ہے۔ مردہ کا زندہ کردینا عوام کے نزدیک ایک عمدہ کام ہے اور خواص کے نزدیک روح اور قلب کا زندہ ہونا معتبر ہے۔ پس کرامت مرید کی نظر میں موجود ہے اور عوام کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ (ص ۱۲ و ۱۳)

تمام شد

رسالہ

عاقبۃ الانکار

ازافادات

مصلح الاُمّۃ عارِف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

امابعد دینی تعلیم کا چرچا ایک عرصہ سے ختم ہوچکا ہے اسوقت مسلمان نہ تو اپنے بچوں کو دین پڑھاتے اور سکھاتے ہیں اور نہ خود ہی حاصل کرتے ہیں اسکا لازمی نتیجہ یہی نکلا اور نکلنا چاہیئے بھی تھا کہ مسلمانوں میں دینی معلومات ختم ہوتی جارہی ہیں اسوقت مسلمان دین کی معمولی معمولی باتوں سے بیخبر ہیں اور جب وہ ضروری اور موٹی موٹی باتوں سے ناواقف ہیں تو پھر علماء اور مشائخ کے ادب سے کس طرح واقف ہوسکتے ہیں چنانچہ انکو اسکا مطلقاً علم نہیں کہ علماء ومشائخ کے بھی کچھ آداب ہیں یا نہیں اور انکے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے اور اگر کچھ معلوم بھی ہے تو یہ کہ علماء ومشائخ کو نہایت درجہ وسیع الاخلاق اور نرم خو ہونا چاہیئے انکے ساتھ کیسا ہی معاملہ کیا جاوے انکی پیشانی پر بل نہ آنا چاہیئے. دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ انھوں نے اپنے سے متعلق آداب شرائط کو تو یاد نہ رکھا کہ خود انکو کیا اور کیسا ہونا چاہیئے بلکہ علماء اور مشائخ پر غلط نکتہ چینی کرنے کیلئے اور بیجا طور پر اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے وہ باتیں یاد کرلیں جو علماء ومشائخ سے متعلق تھیں اور انکی یہ حرکت کس درجہ مضحکہ خیز ہے کہ اپنا وہ سبق تو بھلادیا جس کو یاد رکھنا چاہیئے تھا اور علماء ومشائخ کے اس سبق کو یاد کرنے لگے جس کو یاد نہ رکھنا ہی مناسب تھا ؎

بھلا بیٹھے تم اپنا وہ سبق جو یاد رکھنا تھا   لگے رٹنے سبق اوروں کا جس کو بھول جانا تھا

کیونکہ جب نیچے کے درجات کا سبق ہی یاد نہیں ہے تو اوپر کے درجوں کا سبق کیا خاک سمجھ میں آئیگا لہذا اصل ضرورت اسکی ہے کہ ہم لوگ اپنا سبق ہی یاد کریں اور اس پر عمل کریں چنانچہ ہمارے حال پر شفقت ورحم فرماتے ہوئے مصلح الامۃ مرشدی ومولائی دامت برکاتہم نے ہم کو ہمارا سبق یاد دلایا ہے (جو آئندہ صفحات میں پیش ہے) اور ہم کو بتایا کہ مشائخ کے بھی کچھ آداب وحقوق ہیں منجملہ ان کے ایک حق یہ ہے کہ انکا انکار نہ کرے۔

احقر رومی غفرلہٗ
شعبان ۱۳۷۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عاقبۃ الانکار

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اما بعد۔ آج مشائخ کے یہاں لوگ جو آتے جاتے ہیں اور ان سے نفع بھی چاہتے ہیں اور جب نفع نہیں ہوتا تو انکی شکایت کرتے ہیں اور اس فائدہ نہ ہونے کی نسبت اکثر انھیں حضرات کی طرف کرتے ہیں اور اسکا سبب انکا ہی نقص سمجھتے ہیں۔

تو جاننا چاہئے کہ لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے بلکہ یہ مقبولان الٰہی سے بدگمانی اور ان کی شان میں بدزبانی ہے جو یقیناً ایک بدعت شنیعہ اور معصیت قطعیہ ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ آج ہم پر جو ادبار ہے اس کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک اور صالح بندوں پر اس قسم کا الزام رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ حضرات اس سے بالکل بری ہیں۔

ہم اس وقت اسی مسئلہ کے متعلق کچھ دلیل سے کہنا چاہتے ہیں کہ لوگ اس خیال میں کہاں تک حق بجانب ہیں اور کیا واقعی یہ مشائخ ہی کا قصور ہے یا خود انھیں لوگوں کی اپنی ہی کوتاہی اور نقص ہے جس کو انکا نفس اور شیطان شیخ کے آئینہ میں دکھاتا ہے۔ اس موقعہ پر اس حکایت کا بیان کرنا بے محل نہ ہوگا جو بخاری شریف کی شرح بہجۃ النفوس میں بعض محققین سے منقول ہے۔ وھی ھذہٖ

حکی عن بعض الفضلاء المحققین — بعض مشائخ محققین کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ

انہ اتاہ شخص یرید السلوک فادخلہ للخلوۃ و ترکہ ایاماً ثم دخل علیہ وقال لہٗ کیف ترٰی صورتی عندک فقال صورۃ خنزیر فقال الشیخ صدقت ثم ترکہ فی خلوتہٖ ایاماً ثم دخل علیہ و سألہ مثل الاولٰی فقال لہٗ صورۃ کلب ثم کذلک الی ان قال لہٗ صورۃ القمر لیلۃ کما لہ فقال لہٗ صدقت آلاٰن کمل حالک وحینئذٍ اخرجہ من الخلوۃ۔ (بہجۃ النفوس صفحہ ۱۷ج ۱)

ان کے پاس کوئی شخص سلوک کے ارادے سے آیا شیخ نے اس کو خلوت میں رہنے کا حکم فرمایا۔ اور اسکو اسی حال پر کچھ دنوں رکھا پھر (ایک دن شیخ) اس کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ اپنے نزدیک میری صورت کیسی پاتے ہو اس نے کہا جیسے سور کی شیخ نے کہا ٹھیک کہتے ہو اور بدستور اسکو خلوت میں رکھا پھر کچھ دنوں کے بعد اسکے پاس گئے اور وہی پہلا سوال کیا (یعنی مجھ کو کیسا دیکھتے ہو) اس نے جواب دیا کہ آپ (اب) مجھے کتے کی شکل میں نظر آرہے ہیں۔ الغرض اسی طرح شیخ اس سے وقتاً فوقتاً دریافت فرماتے رہے اور وہ ہر بار مختلف جواب دیتا رہا یہاں تک کہ اس نے آخر میں یہ کہا کہ میں آپکو ایسا دیکھ رہا ہوں جیسا چودھویں رات کا چاند۔ شیخ نے یہ سن کر فرمایا کہ ہاں اب تمہارا حال درست ہوا ہے اور پھر اس کو خلوت سے باہر نکلنے کا حکم فرمادیا۔

دیکھئے اس حکایت سے معلوم ہوا کہ مرید کو اپنی ہی شکل شیخ کے آئینہ میں نظر آتی ہے وہ بزرگ تو اول دن سے بزرگ کامل تھے مگر یہ سب تطورات (تبدیلیاں) اس مرید ہی کے تھے جنھیں وہ شیخ کی جانب منسوب کر رہا تھا۔ جوں جوں اس کی اصلاح ہوتی گئی وہ حقیقت سے قریب تر ہوتا گیا۔

نیز مشائخ کے علاوہ آج بڑے بڑے علماء و فضلاء۔ فقہا اور محدثین موجود ہیں اور انکے پاس بھی ایک جماعت استفادہ اور استفاضہ کی غرض سے جمع رہتی ہے تو کیا ان پاس رہنے والوں میں سے ہر ایک فاضل و کامل ہی ہوکر نکلتا ہے ؟ مشاہدہ تو یہ ہے کہ ان فارغین میں سے کثرت سے نہ صرف قلیل و ناقص الاستعداد بلکہ فاقد الاستعداد ہی ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ کہا سکتا ہے کہ آج علماء کی جگہ جاہلوں نے لے لی ہے اور الا ماشاء اللہ کوئی ہی کوئی ان میں سے کام کا ہوتا ہے۔ جب علوم ظاہر میں یہ امر شاہد ہے تو کیا یہاں یہ کہنا صحیح ہے

کہ دراصل وہ فضلاء و محدثین ہی ناقص ہیں۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ اُن کا علم و فضل تو اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ یہ خامی اور کوتاہی پڑھنے والوں کی جانب سے ہے کہ انھوں نے ایسے علماء و فضلاء کو پاکر بھی کچھ سیکھا نہیں۔ جب یہاں یہ بات ہے اور سب کو تسلیم بھی ہے کہ بیشک علماء کا کوئی قصور نہیں تو پھر باطن کے معاملہ میں مشائخ ہی کیوں مورد الزام ٹھہرائے جاتے ہیں اور یہاں بھی یہی کیوں نہیں سمجھ لیا جاتا کہ شاید مریدین کا قصور ہو جس کی وجہ سے اُن کو نفع نہیں ہوتا اور شیخ اپنی جگہ پر کامل و مکمل سب کچھ ہے۔

کیا کسی شیخ کے کامل ہونے کی شرائط میں یہ بھی داخل ہے کہ اُس کے سب کے سب مریدین کامل ہوں؟ یہ تو واقع کے بھی بالکل خلاف ہے کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شیخ کامل ہو لیکن اُس کے پاس آنے جانے والے اپنی خرابیوں کے سبب اس کے فیض سے محروم ہوں دیکھئے اکمل الکاملین جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا زمانہ مبارک اور آپ کی صحبت پانے کے باوجود ابوجہل اور ابولہب جیسے لوگ محروم ہی رہے علیٰ ہذا منافقین بھی محروم رہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استفادہ کے لئے شرائط ہیں اور مستفید میں بھی اُن کا ہونا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ مفید میں۔ اور باطن تو بہت ہی زیادہ نازک چیز ہے۔ پس اس کی شرائط بھی بہت نازک ہیں باطنی فائدہ کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اپنے اندر اُس کی شرائط کی تحصیل کرے اور اس کے موانع کو مرتفع کرے تنہا شیخ ہی کامل ہو کر کیا کرلے گا اس کے لئے طالب کا بھی تو صادق و مخلص ہونا ضروری ہے اب اگر کوئی ان حضرات سے طریق کی شرائط کے ماتحت سیکھے ہی نہیں تو پھر اُس میں اُن کا کیا قصور؟

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس زمانہ میں آخر کیوں اس قدر خرابطہ ہو گیا ہے اور لوگوں سے کیوں عقل و فہم اس درجہ رخصت ہو چکی ہے کہ جس چیز کا خود اپنے روزمرہ کے ظاہری معاملات میں مشاہدہ اور اقرار ہے باطن میں اسی کا انکار ہے۔ نقص اور قصور تو اپنا ہوتا ہے اور اس کو مشائخ کے سر تھوپا جاتا ہے کیا یہ اس کا مصداق نہیں ہے کہ ؏

خود فراموشی کند تہمت دہد اسنادرا

اور کیا ایسا کرنا مشائخ کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی نہیں ہے اور اہل اللہ کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کر کے اللہ تعالیٰ سے فلاح کا طالب ہونا کہاں تک قرین قیاس ہے۔ اس کا فیصلہ آپ ہی پر چھوڑتا ہوں۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ بجائے اس کے کہ مشائخ پر اس قسم کا الزام رکھتے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے قصور کا اعتراف و اقرار کرتے اور مشائخ کا حد درجہ ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے نقص کو ان کے سامنے پیش کرتے اور اُن کے جملہ حقوق و آداب کی رعایت کرتے ہوئے باطنی فائدہ کی تمام شرائط اختیار کرتے اور اس کے تمام موانع سے اجتناب کرتے پھر اس کے بعد ان کی جانب سے کسی قسم کے فیض و نفع کے منتظر ہوتے تو البتہ حق بجانب ہوتے۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں تمام مشائخ اس میں مجھ سے یقیناً متفق ہوں گے اور میں ان سب کی نصرت کر رہا ہوں کیونکہ اس قسم کے آنے جانے والوں سے سارے ہی مشائخ نالاں ہونگے اور کوئی بھی ان سے خوش نہ ہوگا۔ کون یہ نہیں چاہتا کہ ہمارے مریدین اچھے ہوں اور ہم اللہ تعالیٰ کے یہاں سُرخرو ہوں مگر اس قسم کے لوگ انھیں چلنے نہیں دیتے ان کے خلاف طرح طرح کی باتیں بیان کر کے لوگوں کو ان کی جانب سے بہکاتے اور بدظن کرتے ہیں۔ اور اگر اس قسم کے کسی آنے جانے والے کو سمجھ کر یہ حضرات اس کے ساتھ کوئی معاملہ روا رکھتے ہیں یا اُن کو اپنے پاس سے نکالتے ہیں تو پھر یہی لوگ ان کو بداخلاق بھی کہتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

حاصل یہ کہ اس طریق میں جس طرح شیخ کامل کی طلب و تلاش ضروری ہے اسی طرح طالب میں ارادت و عقیدت خلوص و مناسبت بھی نہایت درجہ ضروری ہے جیسے بدون شیخ کامل کے اس راہ کو قطع نہیں کرسکتے اسی طرح باوجود موجود ہونے شیخ کامل کے بھی اپنی عدم ارادت و عقیدت و عدم خلوص و عدم مناسبت سے بھی حرماں لازم ہے۔ شیوخ کاملین نے جس طرح طریق میں شیخ کامل کو تجویز کیا تھا اسی طرح طالب میں ارادت اور لوازم ارادت کو بھی شرط قرار دیا ہے چنانچہ حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب قدس اللہ تعالیٰ سرّہٗ العزیز خلف الرشید و خلیفہ ارشد حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ السامی جو کہ اپنے وقت کے ایک نہایت مسلم و مستند بزرگ اور اکابر طریق میں سے گزرے ہیں مکتوبات معصومیہ دفتر سوم مکتوب صد و بیست دیکم میں ارقام فرماتے ہیں کہ:-

پس باعث توقف سالک و سد راہ او دریں طریق ہیچ نہ شد غیر از سستیٔ طالب طلب صادق کہ در صحبت کامل افتد و شرائط طلب کہ اکابر قرار دادہ اند بجا آرد امید است کہ البتہ واصل گردد۔ (مکتوبات معصومیہ ص۱۵۶ جلد ۳)

پس سالک کے توقف کا سبب اور اس طریق میں اس کے لئے سد راہ سوا طالب کی سستی کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ جو طالب صادق کہ کسی کامل کی صحبت اختیار کرے اور طلب کی وہ تمام شرائط جنھیں اکابر طریق نے معتبر قرار دیا ہے بجالائے تو امید ہے کہ وہ ضرور واصل ہو جائے گا۔

اگر طالب میں لوازم طلب و ارادت نہ ہوں تو یہ حضرات اس کو طالب ہی نہیں کہتے۔ بلکہ بوالہوس کہتے ہیں جیسا کہ حضرت مولینا مولوی محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک مکتوب میں جو آپ نے منشی محمد قاسم صاحب کے نام لکھا تھا حضرت عارف شیرازیؒ کا یہ شعر نقل فرمایا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص بوالہوس کہلاتا ہے وہ شعر یہ ہے ؎

سعدیا کنگرۂ عشق بلند است بلند   دست ہر بوالہوس آنجا بہ فضولے نہ رسد

(سعدی عشق کا کنگرہ بلند اور بہت بلند ہے۔ جھوٹے عاشق کا ہاتھ وہاں تک بیکار نہیں پہنچ سکتا۔ ۱۲ رومی) (مکتوبات یعقوبیہ صلا)

نیز حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے رسالہ قصد السبیل میں طالب کی شان اور طلب کے لوازم کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے فرماتے ہیں کہ "(سالک) توبہ کے ساتھ آئندہ کے لئے بھی یہ عزم رکھے کہ اللہ و رسول کی اطاعت میں گو نفس کو کتنی ہی ناگواری اور گو مال کا یا جان کا کتنا ہی بڑا ضرر ہو اور گو کوئی نفسانی دنیوی مصلحت کیسی ہی فوت ہوتی ہو اور گو خلق کتنی ہی ملامت کرے برداشت کریں گے اور اللہ و رسول کی اطاعت ہاتھ سے نہ دیں گے اگر اتنی ہمت نہیں ہے تو وہ طالب حق نہیں ہے بلکہ وہ بوالہوس ہے کیوں کہ یہ طالب کی تو یہ شان ہوتی ہے ؎

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشیؔ   بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہ منزل لیلیٰؔ کہ خطر ہاست بجاں   شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

اب ہم اکابر طریق کے نقول اور ان کی تصریحات پیش کرتے ہیں تاکہ اس کا یقین ہو جائے کہ منکر کے لئے حرمان و خذلان لازم ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ طالب راہ حق کے لئے طریق میں

ع اے دل بہتر تو یہی ہے کہ مے گلگوں سے تو خراب ہو جائے اور بغیر خزانہ و دولت کے قارون سے زیادہ تو شان والا ہو جائے۔

ع لیلیٰ کی راہ میں جس میں کہ ہزاروں خطرے جان کو ہیں پہلے قدم کی شرط یہی ہے کہ تو مجنوں ہو جائے۔ ۱۲ سعدی

کیا کیا امور ضروری ہیں اور شیخ کامل کی طلب و تلاش کا کیا طریقہ ہے اور طریق کے کیا شرائط اور اصول ہیں؟ چنانچہ اس طریق میں تو انکار کا تو گزر ہی نہیں۔ اس کے متعلق حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہ العزیز اپنے مکتوبات میں ارقام فرماتے ہیں کہ:۔

اگر آنجا انکار بود حرمان عظیم باشد کہ منکر بجائے نہ رسد جز مخذول و مطرود نبود صاحب عوارف می گوید" من انکر ھم ضلّ و اعتدیٰ" ومصدق اگرچہ بدرجۂ ایشاں نہ امید است کہ تصدیق ہا کہ در خدمت وصحبت ایشاں آرد او را بکمال مرداں رساند و عارف سبحان گرداند۔ (السنۃ الجلیہ ص۵۴)

اگر وہاں انکار ہوگا تو حرمان عظیم ہوگا کیوں کہ منکر شخص کو کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا وہ تو سوا مخذول اور مطرود ہونے کے کچھ اور پا ہی نہیں سکتا صاحب عوارف المعارف فرماتے ہیں کہ جس شخص نے ان حضرات (اولیاء اللہ) کا انکار کیا تو وہ گمراہ ہوا اور اس نے حد سے تجاوز کیا اور ان حضرات کی تصدیق کرنے والا اگرچہ ان کے درجہ کو نہ پہونچے تاہم اُمید ہے کہ ان حضرات کی خدمت میں وصحبت میں جس تصدیق کو لے کر وہ آیا ہے وہی اُس کو درجۂ کمال تک پہنچا دے اور اللہ تعالیٰ سبحانہٗ کا عارف بنا دے۔

اور علما نے بھی بیان فرمایا ہے کہ غیر مصدق ترقی سے بھی بالکل محروم رہتا ہے چنانچہ مجمع البحار میں ہے کہ:۔

لا یقنع بدرجۃ من الدرجات إلا احد الرجلین اما غیر مصدق لتلك النعمۃ الخطیرۃ او سفیۃ لا یھتدی للتجارۃ المربحۃ۔ (مجمع البحار ص۶۴ ج ۱)

کسی ایک ہی درجہ کو لے کر دیگر درجات سے قناعت صرف دو ہی شخص کر سکتے ہیں ایک تو جو اس نعمت عظیمہ کا مصدق ہی نہ ہو اور دوسرا وہ جو احمق ہو کہ سود مند تجارت کا طریقہ ہی نہ جانتا ہو۔

(راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت دامت برکاتہم فرمایا کرتے ہیں کہ یہ اما غیر مصدق او سفیہ کہنا بطور مانعۃ الخلو کے ہے یعنی اس ایک درجہ پر قناعت کرنے والے شخص میں ان دونوں باتوں میں سے ایک نہ ایک کا ہونا ضروری ہے وہ ان دونوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ باقی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شخص میں دونوں وصف جمع ہوں یعنی وہ غیر مصدق بھی ہو اور سفیہ بھی ہو۔ ناقل عفی عنہ)

نیز اکابر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح انکار سبب حرمان ہوتا ہے اسی طرح نفاق اور مشائخ کے ساتھ بے ادبی و گستاخی بھی اس طریق میں سد راہ ہے جیسا کہ تحفۃ السالکین میں حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں:۔

حضرت ایشان (یعنی حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ اپنے) پیر بزرگوار حضرت سید نور محمد بدایونی رضی اللہ عنہ کے متعلق نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنے آپ کو آنحضرت کے مریدوں میں سے کہتا تھا۔ ایک دن اس شخص نے بدبختی میں آکر آنحضرت کے حضور میں سخت بے ادبی کی اور بہت برا بھلا کہا۔ جس کے جواب میں آپ نے کچھ نہ فرمایا۔ دوسرے دن وہ شخص حاضر ہوا تاکہ آنحضرت سے توجہ و استفادہ حاصل کرے میں نے چاہا کہ اس کو سزا دوں۔ آنحضرت نے مجھ کو منع کیا اور اس شخص پر اسی طرح متوجہ ہوئے جس طرح دوسرے مخلصوں پر توجہ فرمائی تھی فقیر اس بات سے بہت تنگدل ہوا اور اس کو تمام مخلصوں کے برابر سمجھنے کے باعث آنجناب کی خدمت میں ملتمس ہوا تو فرمایا مرزا صاحب اگر میں اس کی سرزنش اور ملامت کرتا اور توجہ نہ دیتا تو مجھ سے اللہ تعالیٰ پوچھتا کہ میں نے تیرے سینے میں ایک نور امانت رکھا تھا اور میرے بندوں میں سے ایک اس نور کو طلب کرنے آیا تو نے اس کو کیوں محروم رکھا تو اس وقت میں کیا یہ جواب دیتا۔ کہ الٰہی اس آدمی نے مجھ کو گالی دی تھی اس لئے میں نے محروم رکھا۔ اور کیا یہ جواب مقبول ہوتا۔ کچھ مدت تک میں تنگدلی کے ساتھ خاموش رہا تو تھوڑے دنوں کے بعد آنجناب نے فرمایا کہ اے بچہ اگرچہ میں نے اس کو مخلصوں کی طرح توجہ دی ہے مگر حق تعالیٰ منافق کو کب مخلص کے برابر جانتا ہے واللہ یعلم المفسد من المصلح کام کی حقیقت خدا کے ہاتھ ...... میں ہے فیض صرف مخلص اور مؤدب دوستوں کو پہنچتا ہے اس قصہ ہی کی مثال ہے کہ عبد اللہ بن ابی بن سلول منافق کے جنازہ کے لئے جس نے بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی کی تھی اسکے بیٹے نے جو مومن مخلص تھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں التجا کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے نماز جنازہ پڑھیں اور اس کے لئے بخشش کی دعا مانگیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ کے لئے کھڑے ہو گئے مگر حضرت عمرؓ مانع ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ وہی شخص ہے جس نے فلاں روز ایسا کہا ویسا کہا اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

اِن تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لھم (یعنی اگر آپ ستر بار بھی منافقوں کیلئے

مغفرت طلب کریں تو پھر بھی اللہ تعالیٰ ہرگز ان کو نہیں بخشے گا۔) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کا قول نہ سنا اور فرمایا کہ میں اس کے لئے ستر دفعہ سے بھی زیادہ بخشش طلب کروں گا۔ آخرالامر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی نماز جنازہ پڑھی اور اس منافق کے حق میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی استغفار قبول نہ کی اور آیت نازل ہوئی:۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ (یعنی منافقوں میں سے کسی کے لئے کبھی نماز جنازہ نہ پڑھئے اور اس کی قبر پر مت کھڑے ہوجیے۔ پھر ایک اور آیت نازل ہوئی اَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ یعنی آپ منافقین کے لئے استغفار کیجئے یا نہ کیجئے حق تعالیٰ اُن کو ہرگز نہیں بخشے گا اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی منافق کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی۔ (تحفۃ السالکین ص ۳۰، ۳۱)

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ نفع کے لئے اخلاص شرط ہے فیض صرف مخلص کو ہوتا ہے اور منافق و بے ادب بزرگوں کے فیض سے محروم رہتا ہے۔

نیز علماء کی تصریحات ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مشائخ کی بے ادبی اور گستاخی موجب حرمان ہے اسی طرح ان کے سامنے تکبر و انانیت اور خودبینی بھی اس طریق میں ایک بڑا مانع ہے چنانچہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حکایت بیان فرمائی ہے اور اُس کی سرخی ہی یہ قائم فرمائی ہے کہ حکایت اندر محرومی خویشتن بیناں، جس کے تحت یہ واقعہ بیان فرمایا ہے کہ:۔

یکے در نجوم اندکے دست داشت ولیک از تکبر سرمست داشت

ایک شخص علم نجوم میں کچھ تھوڑا سا دخل رکھتا تھا لیکن تکبر کی وجہ سے مخمور و سرمست تھا

سوئے کوشیار آمد از راہ دور دلے پُر ارادت سرے پُر غرور

دور دراز (کا راستہ طے کر کے) کوشیار کے پاس آیا لیکن حال یہ تھا کہ دل میں تو ارادت تھی اور سر پُر غرور تھا

ع۵:۔ اصل کتاب فارسی ارشاد الطالبین میں بھی اسی طرح ہے غالباً یہ سہو کاتب ہے ورنہ تو دوسری آیت سورۂ منافقون میں ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ الآیۃ۔ ۱۲ عیسیٰ

خردمند ازو دیدہ در دو ختے یکش حرف خدمت نیاموختے

وہ مرد عقلمند اس کی جانب سے اپنی توجہ ہٹائے ہوئے تھا چنانچہ ایک حرف بھی اس کو نہیں سکھلایا

چو بے بہرہ عزم سفر کردہ باز بدو گفت دانائے گردن فراز

بالآخر جب اس بے بہرہ نے واپسی قصد کیا تو اس سے اونچی گردن والے عقلمند (یعنی ہوشیار) کہا

تو خود را گماں بردہ پُر خرد انائے کہ پر شد دگر چوں بُرد

کہ تو نے چونکہ اپنے کو عاقل و کامل سمجھ رکھا تھا (اسلئے بے بہرہ واپس ہو رہا ہے کیونکہ) جو برتن بھرا ہوا ہو دوبارہ کیونکر بھرا جا سکتا ہے

ز دعوے تہی آئے تا پر شوی تو از خود پری زاں تہی میروی

جا دعوی سے خالی ہو کر آ تا کہ تو بھرا جا سکے اور چونکہ تو اس وقت خود پہلے سے پُر ہے اسلئے خالی جا رہا ہے

ز ہستی در آفاق سعدی صفت تہی گرد و باز آئے پر معرفت

اپنی ہستی سے دنیا میں سعدی کے مانند خالی ہو جا تو پھر اس کے بعد تو معرفت سے پُر ہو کر آئے گا

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ جس ارادت میں آمیزش کبر و خود بینی کی ہو وہ صحیح ارادت ہی نہیں ہے جو اہل طریق کے نزدیک مدار فیض ہے پس ایسی ناقص ارادت کا ثمرہ بھی محرومی ہی ہے جیسا کہ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ ؎

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد ہر کہ خود را دید او محروم شد

یعنی جس شخص نے خدمت کی وہ مخدوم ہوا اور جو خود بینی میں پڑ گیا وہ محروم رہا

اس سے معلوم ہوا کہ خادم ہی ایک دن مخدوم بھی ہو جاتا ہے پس مخدوم ہونے کا طریقہ یہی ہے کہ انسان پہلے خادم بنے پھر وہ خدمت ہی اس کو مخدومیت کے مرتبہ پر پہنچا دے گی۔ اسی کو حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں کہ ؎

ہر آنکس کہ گردن بفرمان نہد بسے بر نیاید کہ فرماں دہد

(جو شخص خدا کے حکم پر گردن جھکا دیگا تو زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ وہ خود حکم دینے لگیگا)

اس سے معلوم ہوا کہ فرمانروائی فرمانبرداری کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ یہی حال اور دوسرے کمالات کا ہے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ آج جو طالب ہے کل کو وہی مطلوب ہوگا، محب ہے تو محبوب ہو جائے گا، قابل ہے تو مقبول ہو جائے گا، اگر عاشق ہے تو کل کو وہی معشوق ہو جائے گا۔ مرید ہے تو مراد ہو جائے گا۔

اسی طرح علمائے فن نے یہ بھی تصریح فرما دی ہے کہ طالب کو راہ حق کی طلب میں کیا کرنا چاہئے

چنانچہ شیخ العرب والعجم سیدنا ومولانا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ سے ایک دن ایک شخص نے سوال کیا کہ طالب راہ حق کو کیا کیا ضرورت ہے فرمایا کہ اول طالب شئی کو لازم ہے کہ وہ حقیقت و ماہیت شے مطلوبہ دریافت کرے تاکہ رغبت اس کے حاصل کرنے کی دل میں پیدا ہو پس جو شخص کہ ارادہ کرے کہ صوفیوں کے طریق (وراہ حق) پر چلے اولاً ماہیت و حقیقت و غایت تصوف (کہ راہ حق ہے) معلوم کرے بعد ازاں ان کے اعتقادات وآداب ظاہری و باطنی کو سمجھے خصوصاً اطلاقات کو کہ ان کے حال و قال و تصنیفات میں آتے ہیں جانے اور خاص خاص اصطلاحات کہ ان کے کلمات میں پائی جاتی ہیں ان سے واقف ہو تاکہ وہ تابعداری ان کے افعال و اقوال و احوال کی کرسکے کیوں کہ کثرت مدعیان کذاب سے حال محققان باصواب مجہول ہو کر فساد واقع ہوتا ہے

(از امداد المشتاق ص۳۲)

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ ہر زمانہ میں محققان باصواب کے ساتھ مدعیان کذاب بھی بکثرت موجود رہے ہیں اور طالب اگر ان کے پہچاننے میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ غلطی میں پڑ جاتا ہے جس کا نتیجہ فساد کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اس لئے طالب کے لئے لازم ہے کہ تجویز شیخ میں غایت درجہ اہتمام کرے تاکہ دھوکہ نہ ہو۔

علماء نے فن کی کتابوں میں پیر کے تلاش کرنے کا طریقہ بھی بیان کر دیا ہے چنانچہ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جن کو حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی قدس سرہٗ بیہقی وقت فرمایا کرتے تھے اپنی مشہور کتاب ارشاد الطالبین میں ارقام فرماتے ہیں کہ جب کمالات باطنی کا طلب کرنا واجبات سے ہے تو پھر ایسے پیر کا تلاش کرنا ضروری ہے جو کامل بھی ہو اور کامل بنا دینے والا بھی ہو کیوں کہ ایسے پیر کے سلسلہ کے بغیر خدا تک رسائی نہایت قلیل اور بہت نادر ہے مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

نفس را نکشد بغیر از ظل پیر دامن آں نفس کش محکم بگیر

(نفس کو بس شیخ ہی مار سکتا ہے لہٰذا اس نفس کش کے دامن کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو۔ ناقل)

پیر کامل کے تلاش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اکثر درویشوں سے ملاقات کرتا رہے اور کسی کا انکار اور عیب جوئی نہ کرے لیکن خود بہت سے تجسس اور تامل بغیر بیعت نہ کرے (تحفۃ السالکین ص۴۳)

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ لوگ بزرگوں کے پاس جب جائیں تو ان کا انکار اور عیب جوئی نہ کریں اور آج لوگ اسی پہلی ہی منزل میں ناکام ہو جاتے ہیں یعنی یہ کہ سچے مشائخ کی خدمت میں اگر

پہنچ بھی جاتے ہیں تو ان کا ادب و احترام جیسا کہ اہل طریق کے نزدیک معتبر ہے نہیں کرتے اس لئے محروم رہتے ہیں۔ حضرت حافظ شیرازیؒ تو ایسے شخص کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ مشائخ کی صحبت کے لائق ہی نہیں ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ : ؎

حافظا علم و ادب ورز کہ در مجلس شاہ ہر کرا نیست ادب لائق صحبت نبود

(یعنی اے حافظ تم علم و ادب سیکھو اس لئے کہ بادشاہ کی مجلس میں بیٹھنے کے قابل ہی وہ شخص نہیں جسکو ادب نہیں ہے)

حضرت ابو علی دقاق فرماتے ہیں کہ جو شخص بدون ادب کے بادشاہ کا ہم نشین ہوگا تو اس کی اس جہالت کا انجام ایک نہ ایک دن اس کے قتل کی شکل میں نمودار ہوگا (کیوں کہ ادب نہ ہونے کی وجہ سے کبھی نہ کبھی اس سے ضرور ایسی کوئی بے ادبی صادر ہو جائے گی جو بادشاہ کے خلاف مزاج ہوگی اور وہ اس کی وجہ سے اس کو قتل کرا دے گا۔) رسالہ قشیریہ۔

ادب دنیا میں بڑی چیز ہے اور ہر ایک کا ادب اس کے شایان شان ہوا کرتا ہے چنانچہ ایک ادب ہوتا ہے حق تعالیٰ کا اور ان کے احکام (اوامر و نواہی) کا جس کے متعلق حضرت سعید بن مسیبؓ فرماتے ہیں کہ :۔

من لم یعرف ما للہ عزوجل علیہ فی نفسہ ولم یتأدب بامرہ ونھیہ کان من الادب فی عزلۃ۔ (قشیریہ)

جس شخص نے یہ بھی نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ کے اس کے نفس پر بھی کیا حقوق ہیں اور حق تعالیٰ کے اوامر اور نواہی ہی کے ادا سے متادب نہ ہوا تو ایسا شخص تو ادب سے گویا بالکل ہی کنارہ کش ہی ہے۔ (یعنی ادب سے بالکل کورا ہے)

اسی طرح ایک ادب ہوتا ہے اہل اللہ کا جس کے متعلق حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ جب مرید ادب ترک کر دے تو وہ جہاں سے آیا ہے وہیں واپس ہو جائے گا (یعنی شیخ کے فیض سے بالکل محروم رہ کر اس کے پاس سے بے نیل مرام واپس جائے گا۔ اور شیخ نوری فرماتے ہیں کہ :۔

من لم یتأدب للوقت فوقتہ مقت (یعنی جس شخص نے وقتی آداب ہی نہیں سیکھے تو سمجھ لو کہ اس کا سارا وقت مقت یعنی ناراضگی ہی میں گذر رہا ہے) بزرگوں کے پاس جانا تو بہت ہی آسان ہے لیکن ان کا حسن ادب نہایت ہی دشوار امر ہے اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے جو موفق من اللہ ہو چنانچہ اس کے متعلق مولانا رومؒ رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں ایک مستقل سرخی قائم فرمائی ہے فرماتے ہیں کہ :۔

"از خداوند ولی التوفیق درخواست توفیق رعایت ادب در ہمہ حال و بیان کردن وخامت

وضع رہا ہے بے ادبی۔" اور اس کے بعد فرماتے ہیں ؎

از خدا جوئیم توفیق ادب   بے ادب محروم گشت از فضل رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد   بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

(ہم خدا تعالیٰ سے ادب کی توفیق طلب کرتے ہیں کیونکہ بے ادب شخص حق تعالیٰ کے فضل سے محروم رہتا ہے۔ بے ادب انسان خود اپنا ہی نقصان نہیں کرتا بلکہ ساری دنیا میں اس کی بے ادبی سے آگ لگ جاتی ہے۔ ۱۲ ناقل)

یہاں اس مقام کے مناسب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا وہ کلام نقل کر دیں جسے انھوں نے اپنی کتاب فتاوی حدیثیہ میں بیان فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ پر کس قسم کے لوگ اعتراض کرتے ہیں اور ان کے اعتراض کے وجوہ اور خود ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔ وھذا النص:۔

وكثير من النفوس التي يراد بها عدم التوفيق اذا رأت من استاذ شدة في التربية تنفر عنه وترميه بالقبائح والنقائص ما هو عنه بريء وليحذر الموفق من ذلك فان النفس لا تريد الا هلاك صاحبها لا يطيعها في الاعتراض على شيخه وان راه على ادنى حال حيث امكنه ان يخرج افعاله على تاويل صحيح ومقصد مقبول شرعاً.

ومن فتح باب التاويل للمشائخ واغضى عن احوالهم ووكل امرهم الى الله تعالى واعتنى بحال نفسه وجاهدها بحسب طاقته فانه يرجى له الوصول الى مقاصده والظفر بمراده في السر والعلانية في اسرع زمن ومن فتح باب الاعتراض على المشائخ والنظر في افعالهم والبحث عنها فان ذلك علامة حرمانه وسوء عاقبته وانه لا يفلح.

(رسائل ابن عابدین ص ۲۸۹ ج ۲)

اور بہت سے وہ نفوس جن سے عدم توفیق کا ارادہ کیا جاتا ہے (یعنی جو بے توفیقے ہوتے ہیں) جب کہ وہ اپنے شیخ سے تربیت کے باب میں کچھ سختی دیکھتے ہیں تو ان کے یہاں سے بھاگ نکلتے ہیں اور ایسے ایسے عیوب اور نقائص کا ان پر الزام لگاتے ہیں جن سے

وہ بالکل بری ہوتے ہیں اور موفق شخص کو تو اس قسم کے امور سے بہت ڈرنا اور خوف کرنا چاہئے کیوں کہ نفس تو اپنے صاحب کو ہلاک ہی کرنا چاہتا ہے (پس) اپنے شیخ پر اعتراض کے بارے میں تو (ہرگز) اس کی اطاعت نہیں کرنی چاہئے اور اگر اس کو کسی ادنیٰ حال پر دیکھے بھی تو جہاں تک ہوسکے اس کے افعال کو کسی صحیح محمل پر اور ایسے مقصد پر محمول کرے جو شرعاً مقبول ہو۔ اور جس شخص نے مشائخ کے لئے تاویل کا دروازہ کھولا اور ان کے احوال سے چشم پوشی کی اور ان کے معاملے کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیا اور خود اپنے نفس کی فکر میں لگا رہا اور حسب طاقت اس کے ساتھ مجاہدہ کرتا رہا تو ایسے شخص کے لئے بہت ہی تھوڑے زمانہ میں اپنے مقصد کی وصولیابی اور ظاہر و باطن میں اپنی مراد کے پالینے کی امید کی جاتی ہے اور (برخلاف اس کے) جس شخص نے مشائخ پر اعتراض کا دروازہ کھولا اور ان کے افعال و احوال پر (مخالفانہ و معاندانہ) نظر کی اور اس کی جستجو میں پڑا تو یہ اس کی محرومی کی علامت اور اس کے سوء عاقبت کی نشانی ہے اور ایسا شخص کبھی بھی فلاح نہیں پاسکتا۔

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ مشائخ پر اعتراض اور انکار وہی شخص کیا کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلوب التوفیق ہوتا ہے اور منشا اس کے انکار کا یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص اپنی خواہشات نفس کو تو اچھا سمجھتا ہے اور اس پر راضی رہتا ہے اور ان حضرات کی تعلیم و تربیت کو (جو کہ عین شفقت پر ہوا کرتی ہے) سخت جانتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس شخص نے مشائخ کے افعال کی تاویل کی اور اپنے نفس کے مجاہدہ اور اس کی اصلاح میں لگا رہا وہ اس طریق میں بہت جلد کامیاب ہوتا ہے۔ بخلاف اس شخص کے کہ جس نے ان پر اعتراض کا دروازہ کھولا اور اپنے کو دیکھنے کے بجائے انھیں حضرات کے افعال کے ادھیڑبن میں لگا رہا تو یہ اس کے عدم فلاح حرمان اور (العیاذ باللہ) سوءِ خاتمہ کی علامت ہے۔

چنانچہ آج دیکھا بھی یہی جاتا ہے کہ کسی شخص پر اعتراض اور انکار وہی کرتا ہے جس کو اس کے یہاں سے کچھ ملا نہیں ہوتا اور یہ آج کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ لوگوں کی یہ عادت قدیمہ ہے چنانچہ امام غزالیؒ نے اس پر قرآن شریف کی اس آیت سے استدلال کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ نہایت عمدہ استدلال ہے فرماتے ہیں کہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ یعنی اور جب ان لوگوں کو قرآن سے ہدایت نصیب نہ ہوئی تو یہی کہیں گے کہ یہ قدیمی جھوٹ ہے۔ یعنی جب کفار مکہ کو قرآن کریم سے کوئی ہدایت نہ ملی تو بجائے اس کے کہ اس کو اپنا نقص سمجھتے کیوں کہ:-

یاراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست — در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

اور سے اس کے احسان تو ہیں عام شہیدی سب پر — تجھ سے بیا حسد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

اور سے گر نہ بیند بروز شپرہ چشم — چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

برعکس اس کے قرآن کریم کے متعلق کہنے لگے کہ ھٰذا افک قدیم (یہ تو قدیمی جھوٹ ہے)

یہی حال لوگوں کا آج مشائخ کے ساتھ ہے کہ جب اپنی خامیوں کی بنا پر اُن سے فیض نہیں پاتے تو یا تو سرے سے انکار ہی کر دیتے ہیں اور یا کوئی نہ کوئی عیب ان میں لگا دیتے ہیں جس طرح کہ لومڑی انگور کے خوشے پر بہت کچھ اچھلی کودی مگر جب اس کو نہ حاصل کر سکی تو یہ کہکر واپس ہوئی کہ نگوڑے انگور ہی کھٹے ہیں اور میں تو اس قسم کے لوگوں کی ایک اور مثال بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ ایک عورت اپنے شوہر کی بالکل معتقد نہیں تھی حالانکہ وہ تھے ولی کامل۔ ایک دفعہ رات کو وہ اڑے اور اپنے محلہ کی طرف سے نکلے چنانچہ سب نے دیکھا ان کی بیوی نے بھی دیکھا صبح کو بیوی نے ان سے کہا کہ تم تو ناحق اپنے کو ولی کہتے ہو، ولی تو رات ہم نے دیکھا ہے کہ ہوا پر اُڑے جا رہے تھے انھوں نے پوچھا کہ اچھا وہ بزرگ تھے کہا، ہاں، پھر پوچھا سچ بتاؤ کہ وہ ولی تھے؟ کہا اس میں بھی کوئی شک ہے جب اس سے اچھی طرح سے اقرار کرالیا تو کہا کہ جانتی بھی ہو وہ بزرگ کون تھے؛ وہ میں ہی تھا یہ سن کر اُس نے کہا کہ اچھا تم تھے، جب ہی ٹیڑھے ٹیڑھے اڑ رہے تھے۔

دیکھا آپ نے جو کسی کا معتقد نہیں ہوتا اس کے لئے انکار کے بہت سے طریقے ہیں کچھ نہ بن پڑا تو یہی عیب لگا دیا کہ ٹیڑھے ٹیڑھے اُڑ رہے تھے۔

جاننا چاہئے کہ جس طرح سے یہ طریق قدیم ہے اور مشائخ محققین ہمیشہ اور ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں اسی طرح سے ہر زمانہ میں ان حضرات سے دو جماعتوں کا تعلق رہا ہے۔ ان کے ماننے والے بھی ہوئے ہیں اور مخالف بھی ہوئے ہیں۔ لوگوں نے اُن کی تصدیق بھی کی ہے اور کسی کسی نے انکار بھی کیا ہے غرض ان کے ساتھ یہ تصدیق و انکار کا سلسلہ برابر رہا ہے۔ اور جب کہ دونوں قسم کے لوگ موجود رہے تو توان مشائخ نے ان دونوں جماعتوں کے ساتھ مختلف برتاؤ بھی کیا ہے۔ یعنی مخلص اور مصدق کو تو قریب کیا ہے اور منکر و منافق کو اپنے یہاں سے نکالا اور دور کیا ہے بلکہ اگر ان کو ذرا سا شبہ اس امر کا ہوا ہے کہ یہ شخص ان کو حقیر سمجھ رہا ہے تو اس سے بات تک کرنا گوارا نہیں کیا گیا ہے۔ اس بارے میں مشائخ کے بیشمار واقعات معتبر کتابوں میں موجود ہیں لیکن ہم یہاں صرف چند واقعات تصوف کی معتبر کتاب رسالہ قشیریہ سے (جو امام ابوالقاسم عبدالکریم القشیری الشافعی نیشاپوری کی مشہور و

معروف تصنیف ہے) ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ ان لوگوں کو جو مشائخ سے اپنی بداخلاقی کے باوجود اخلاق کا مطالبہ کرتے ہیں اور ان کے دارو گیر تنبیہ اور اخراج کو (جو کہ حقیقۃً اخراج نہیں ہوتا بلکہ شرائط داخلہ کی تحصیل کی جانب ملتفت کرنا ہوتا ہے) بداخلاقی سے تعبیر کرتے ہیں فی الجملہ مشائخ مصلحین کے طرز کا علم ہو جائے اور وہ یہ جان لیں کہ یہ کوئی نیا طریقہ نہیں ہے بلکہ ہمیشہ اور ہر زمانہ میں بزرگوں کا اس پر عمل رہا ہے۔ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ افسوس اس زمانہ میں پہلے جیسے بزرگ رہے نہیں ورنہ ان منکرین کی خوب قلعی کھلتی اور جو لوگ اس زمانہ میں کچھ کام کرنا بھی چاہتے ہیں تو وہ بیچارے انھیں منکرین کے ڈر سے کچھ کہتے نہیں کہ یہ لوگ الٹے انھیں حضرات کو بداخلاق کہہ کر بدنام کریں گے۔

صاحب رسالہ قشیریہ باب حفظ قلوب المشائخ وترک الخلاف علیھم میں شیخ کی مخالفت اور انکار کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:۔

سمعت الاستاذ ابا علی الدقاق رحمۃ اللہ علیہ یقول بدء کل فرقۃ المخالفۃ یعنی بہ ان من خالف شیخہ لم یبق علی طریقتہ وانقطعت العلقۃ بینھما وان جمعتھما البقعۃ فمن صحب شیخاً من الشیوخ ثم اعترض علیہ بقلبہ فقد نقض عھد الصحبۃ ووجبت علیہ توبۃ علی ان الشیوخ قالوا حقوق الاستاذین لا توبۃ عنھا۔

(قشیریہ ص ۱۶۵)

میں نے اپنے استاد حضرت ابو علی دقاقؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر فرقت کی ابتدا مخالفت سے ہوا کرتی ہے یعنی جس شخص نے اپنے شیخ کی مخالفت کی تو وہ اس کے طریقے پر باقی نہیں رہ گیا اور ان دونوں کے درمیان جو رشتہ ہے وہ منقطع ہوگیا اگرچہ (اس کے بعد) وہ دونوں ایک ہی جگہ پر رہیں اس لئے جو شخص بھی مشائخ میں سے کسی شیخ کی خدمت میں رہا پھر اس پر اپنے قلب سے اعتراض بھی کر دیا تو اس نے عہد صحبت فسخ کر دیا اور اس پر توبہ کرنا واجب اور ضروری ہے۔ اگرچہ مشائخ نے یہ بھی فرمایا ہے مشائخ کے حقوق (تلفی) کی توبہ ہی نہیں ہے۔

پھر آگے امام نے انکار اور اعتراض کے بہت سے واقعات ذکر کئے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔ "میں نے استاد ابو علیؒ سے سنا فرماتے تھے کہ سہل بن عبد اللہ نے ایک شخص کی بزرگی کی تعریف کی جو کہ بصرہ میں روٹی کے پکانے کا کام کرتے تھے، اس تعریف کو سہل بن عبد اللہ کے اصحاب میں سے ایک شخص نے سنا اور سن کر ان کی زیارت کا مشتاق ہوا چنانچہ ملاقات کے لئے چلا یہاں تک

کہ بصرہ پہونچ کر اس طباخ کی دوکان پر پہنچا اور ان بزرگ کو دیکھا کہ وہ (تنور میں) روٹی پکا رہے ہیں اور جیسا کہ نان بائیوں کی عادت ہوتی ہے اپنے داڑھی پر ایک کپڑا باندھے ہوئے ہیں (یہ دیکھ کر) اس شخص نے اپنے دل میں کہا کہ اگر یہ ولی ہوتے تو ان کے بال بغیر نقاب کے بھی نہ جلتے (اس طور پر دل میں اُنکا انکار کر کے) پھر ان کو سلام کیا اور ان سے کچھ دریافت کیا ان بزرگ نے فرمایا اے شخص تو نے مجھ کو حقیر جانا ہے پس تجھ کو میرے کلام سے کچھ نفع نہ ہوگا یہ کہا اور (اس کے علاوہ) اس سے کوئی بات کرنا پسند نہ کیا۔

دیکھا آپ نے یہ حضرات منکر کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ فرماتے تھے۔ نیز اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ منکر شخص بزرگوں کے فیض سے اور انکے نفع سے محروم رہتا ہے۔

اسی کتاب میں ایک دوسرا واقعہ یہ نقل فرماتے ہیں کہ:۔

"میں نے شیخ ابو عبدالرحمٰن سلمی کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ عبدالرحمٰن رازی نے ابوعثمان حیری سے سنا کہ وہ محمد بن فضل بلخی کا وصف بیان فرما رہے ہیں اور ان کی تعریف کر رہے ہیں۔ یہ سن کر (عبدالرحمٰن رازی) کو محمد بن فضل کی ملاقات کا اشتیاق ہوا چنانچہ ان کی زیارت کے لئے گئے لیکن محمد بن فضل کے متعلق جیسا اعتقاد (ان کی تعریف وغیرہ سن کر) لے گئے قلب میں ان کو دیکھ کر اس درجہ وقعت نہ ہوئی جب ابوعثمان حیری کے پاس لوٹ کر آئے تو انھوں نے پوچھا کہ تم نے ان کو کیسا پایا؟ ان سے بھی کہہ دیا کہ جیسا سمجھ کر گئے تھے ویسا نہیں پایا۔ یہ سن کر ابوعثمان نے کہا کہ بات یہ ہوئی ہوگی کہ تم نے ان کو حقیر سمجھا ہوگا اور (طریق کا یہ قاعدہ ہے کہ) کسی نے کسی کو نہیں حقیر سمجھا مگر یہ کہ اس کے فائدہ سے محروم کر دیا جاتا ہے (یعنی جو شخص کسی کو حقیر سمجھتا ہے وہ اس کے فیض سے محروم رہتا ہے) لہٰذا تم پھر ان کی خدمت میں جاؤ اور عظمت و احترام کے ساتھ جاؤ (پھر دیکھو کہ نفع ہوتا ہے یا نہیں) چنانچہ عبداللہ (یعنی وہی عبدالرحمٰن رازی) دوبارہ پھر (اس طریقے سے) گئے اور ان کی زیارت سے بہت نفع ہوا۔

دیکھئے اس واقعہ سے بھی معلوم ہوا کہ کسی بزرگ سے اخذ فیض کے لئے قلب میں ان کا ادب واحترام کا ہونا ضروری ہے بدون اس کے محرومی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

اس سلسلہ میں ایک بات یہ سمجھئے کہ علماء یہ جو فرماتے ہیں کہ اس طریق میں انکار کی گنجائش نہیں تو یہ بالکل صحیح ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ انکار کی نحوست ہی بہت بری ہوتی ہے جس طرح ایک طرف اس کا اثر منکر پر یہ ہوتا ہے کہ وہ قطعی محروم رہتا ہے اسی طرح بعض مرتبہ

اس کی وجہ سے خود شیخ پر بھی فیض بند ہو جاتا ہے جس کا اثر دوسرے مرید پر پڑتا ہے کہ وہ سب کے سب بھی فیض سے محروم ہو جاتے ہیں۔ روح المعانی میں ہے۔

وصحبۃ المنکر علی اولیاء اللہ تعالیٰ تورث نفقاً یصعب علی الخیاط رتقہ وتترخرقاً لیعیی الواعظ رقعہ

ومن الغریب مایحکی ان الجنید قدس سرہ جلس یوماً مع خاصۃ اصحابہ وقد اغلق باب المجلس حذراً من الاغیار وشرع وایذکرون اللہ تعالیٰ فلم یتم لھم الحضور ولا فتح لھم باب التجلی الذی یعھدونہ عند الذکر فتعجبوا من ذلک فقال الجنید ھل معکم منکر حرمنا بسببہ فقالوا لا ثم اجتھد وافی معرفۃ المانع فلم یجدوا الا نعلاً لمنکر فقال الجنید من ھھنا اوتینا فانظر یرحمک اللہ تعالیٰ اذا کان ھذا نعل المنکر فاظنک بہ اذ احضر بلحیتہ۔

(روح المعانی ص۹۴ جلد۱۰)

اور اولیاء اللہ کے منکر کی صحبت ایسی دریدگی اور پھٹن پیدا کر دیتی ہے جس کا رفو کرنا درزی کو بھی دشوار ہوتا ہے اور ایسا شگاف پیدا کر دیتی ہے جس میں واعظ بھی پیوند نہیں لگا سکتا۔

حکایات غریبہ میں سے ہے کہ حضرت جنید قدس سرہ ایک دن اپنے خواص اصحاب کے ہمراہ تشریف فرما تھے اور اپنے کو اغیار سے بچانے کے لئے مکان کا دروازہ بند کر کے اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول تھے لیکن جیسا حضور قلب اور جیسی تجلی کہ حسب معمول ذکر کے وقت ہوا کرتی تھی اس دن مفقود تھی۔

چنانچہ سب لوگوں کو اس پر تعجب ہوا (کہ آخر کیا بات ہے) اتنے میں حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ تم میں کوئی منکر شخص تو نہیں آگیا ہے جس کے سبب سے ہم آج محروم ہوئے ہیں لوگوں نے عرض کیا کہ نہیں حضرت کوئی منکر تو ہم میں معلوم نہیں ہوتا پھر سب کے سب مانع دریافت کرنے کی فکر میں لگے بالآخر کچھ نہ ملا بجز کسی منکر کے ایک پیر کے جوتے کے (جسے کوئی مرید غلطی سے بدل لایا تھا) حضرت جنیدؒ کو جب اس کا پتہ چلا تو فرمایا کہ بس معلوم ہوا اسی کی نحوست ہے اور یہی ہماری محرومی کا سبب ہے۔ بس اے مخاطب اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کرے دیکھ اور سبق لے کہ جب اتنا اثر صرف منکر کے ایک جوتے کا ہو سکتا ہے تو اگر کہیں خود کوئی منکر ہی اپنی ڈاڑھی سمیت (کسی شیخ کی مجلس میں) حاضر ہو جائے تو تمھارا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟ (کہ کیسی کچھ محرومی نہ ہوگی)۔

دیکھا آپ نے انکار کی نحوست کہ حضرت جنید جیسا ولی کامل جو اولیاء اللہ کے سردار اور اس

طائفہ کے امام گزرے ہیں جب ان پر فیض منکر کے ایک جوتے کے آجانے سے بند ہو سکتا ہے تو اور دوسرے مشائخ کے یہاں مسلّم منکر پہنچ کر کیا کچھ خلل اندازی نہ کرے گا۔ اسی لئے یہ حضرات مشائخ انکار سے بڑھتے اور منکر سے نفرت فرماتے ہیں اور اسی لئے طریق کا مسلّمہ اصول ہے کہ اس میں چوری زنا اور دیگر معصیت کی تو کھپت ہے مگر انکار کی کھپت نہیں (یعنی یہ سب معاصی تو بدعملی ہے اور بدعمل شخص اصلاح کے لئے طریق میں داخل ہو سکتا ہے لیکن انکار تو بداعتقادی ہے لہٰذا اس کی کھپت نہیں) ناقل ۱۲

جس طرح علماء باطن نے پیر تلاش کرنے کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔ اسی طرح یہ حضرات اس کو بھی بیان فرماتے ہیں کہ شیخ کے اندر کن کن اوصاف کا ہونا ضروری ہے جن کی رعایت کرتے ہوئے کسی کو شیخ تجویز کرنا چاہئے اس کے لئے ہم یہاں سید المفسرین حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب خلف عارف باللہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما کے رسالہ بیعت کی عبارت درج کرتے ہیں جس میں شاہ صاحب نے پہلے بیعت شریعت کی تعریف اور اس کی ضرورت بیان فرمائی ہے اور اس کے بعد شیخ کے اوصاف کا بیان کیا ہے چنانچہ ارقام فرماتے ہیں کہ:۔

اما بیعت شریعت پس حقیقتش آنکہ مرد عامی کہ عمر را در غفلت و معصیت گزاردہ ہر گاہ بریں خیال متنبہ می شود و ندامت می کشد و رجوع بر ان تقویٰ و طاعت می خواہد، حصول آں یعنی بدون تحکیم عالم متقی بر ظاہر و باطن خود در عادت منتظم نمی تواند شد چہ دیدن کتاب ہائے شریعت مانند مراجعت کتب طب است بیمار را بدون حصول ملکۂ طب و معالجہ بانیقدر اصلاح مزاج و دفع مرض دشوار است۔

بہرحال بیعت شریعت پس اس کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی عامی شخص جس نے کہ اپنی عمر کو غفلت اور معصیت کے کاموں میں صرف کی ہو جب اس کو اپنے اس حال پر تنبّہ ہوا (یعنی اس کے درستگی کا خیال آوے) اور (حالات گزشتہ) پر وہ نادم ہو کر تقویٰ اور طاعت کے کاموں کی جانب رجوع کرنا چاہے تو یہ چیز بدون کسی عالم کے جو ظاہراً اور باطناً متقی ہو اپنے اوپر حاکم بنائے ہوئے یوں ہی بطور خود عادتاً وقوع پذیر نہیں ہوا کرتی کیوں کہ شریعت کی کتابوں کا مطالعہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی طب کی کتاب کی مراجعت کی جائے (اور یہ سب جانتے ہیں کہ) بیمار کے لئے بغیر اس کے کہ اس کو طب میں اور معالجہ میں ملکہ اور مہارت نہ حاصل ہو محض اتنے سے مزاج کی اصلاح اور مرض کا دفع کر لینا بہت دشوار ہے۔

یہاں تک تو بیعت کی حقیقت اور اس کی ضرورت کا بیان تھا آگے انتخاب شیخ کے بارے میں ارشاد

فرماتے ہیں کہ۔

وہمچنیں بقول ہر عالمے عمل کردن موجب تحیر است کہ ہر یکے صحیح الفکر والحواس نمی باشد پس بنا بر ایں ضرورت مردے راکہ باوجود علم وتقویٰ دو صفت داشتہ باشد یکے عدم مساہلت و مداہنت در مقام امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ دوم شناختن آنچہ بحال طالب افضل واسہل است۔ پس ایں چنیں کس را اختیار کند و زمام امور خود را بدست او سپارد و متابعت او بر خود لازم گیرد تا مراد خود رسد۔ و ثمرہ ایں رسیدن است بہ نجات کلی در عقبیٰ و دخول او در جناب العلیٰ و تحصیل رضائے مولیٰ۔　(رسالہ بیعت صہ ۲۷)

اور اسی طرح ہر عالم کے قول پر عمل کرلینا تحیر اور پریشانی تشتت کا سبب ہے کیوں کہ ہر عالم بھی تو صحیح الفکر اور صحیح الحواس نہیں ہوا کرتا۔ لہذا اس ضرورت کے ماتحت (کسی کو اپنا شیخ اور مصلح مقتدا اور پیشوا بنانے کیلئے ایسے مرد کا انتخاب کرنا چاہئے کہ وہ علاوہ علم وتقویٰ (ان دو اوصاف کے) دو اور اوصاف سے متصف ہو ایک تو یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں تساہل اور مداہنت کو روا نہ رکھتا ہو دوسرے یہ کہ طالب کے مناسب حال اسہل اور افضل جو امور ہوں ان کی شناخت میں ماہر ہو۔ پس ایسے شخص کو اختیار کرے اور اپنے تمام امور کی لگام اس کے ہاتھ میں دیدے (یعنی باب اصلاح میں اسکو اپنے اوپر اختیار کلی دیدے اور اس کی اتباع کو اپنے اوپر لازم پکڑے تاکہ اپنی مراد کو پہونچے۔ اور اس پہنچنے کا ثمرہ اور نتیجہ آخرت میں نجات کلی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رسائی اور مولیٰ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔

علماء کی ان مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ مشائخ سے فیض اور فائدہ حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ انکار نہ ہو ان کی شان میں کسی قسم کی بے ادبی نہ کی گئی ہو اور ان کے یہاں کبر وغرور اور خود بینی وغیرہ لے کر نہ جائے ورنہ بجز محرومی و ناکامی کے اور کچھ حاصل نہیں اور جس طرح ان امور کا پایا جانا حصول نفع کے لئے شرط ہے اسی طرح مشائخ محققین نے یہ بھی تصریح فرمائی ہے کہ طریق میں داخل ہونے کے بعد بھی سالک کے لئے سلوک کے کچھ اصول ہیں کہ ان کی رعایت کرنے پر ہی وصول ممکن ہے ورنہ ان کے ضیاع کی وجہ سے محرومی لازم ہے چنانچہ صاحب رسالہ قشیریہ نے لکھا ہے کہ انما حرموا الوصول لتضییعہم الاصول۔ یعنی لوگ وصول الی اللہ سے اصول طریق کو ضائع کرنے کی وجہ سے محروم ہو گئے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ طریق کے اصول کیا ہیں تو اس موضوع پر میں نے حضرت شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ عمدہ کلام کسی کا نہیں دیکھا اس لئے ہم ان کی مشہور کتاب "منہج العمال" سے جو

انھیں کی ایک دوسری کتاب "کنز العمال" کی تلخیص ہے طریق کے وہ اصول جو اس میں بیان کئے گئے ہیں یہاں بعینہ درج کرتے ہیں۔ وھی ھذہ

منها اكل الحلال وهوا هم الاصول لان الحلال يثيب ثواب عبادة لم يفعله الشخص والحرام يبطل ثواب عبادة فعلها الشخص توضيحه شخص تعب في النهار بسبب الكسب الحلال وكانت له وظيفة عبادة في الليل ففاتت منه بسبب التعب فلا شك انه يعطى ثواب تلك العبادة ومن اكل الحرام اولبس الحرام فالغالب انه لا يوفق للطاعة وان وفق نادراً وقام الليل كله يصلي لا يقبل صلوٰته لانه لا يخلو عن رياء اوسمعة اوعجب فيبطل ثوابها وورد من اشترى ثوبا بعشرة دراهم وفيه درهم حرام لم يقبل الله له صلوٰة مادام عليه منه شئ رواه احمد عن عمرؓ قال ذوالنونؒ وجوه الحلال خمسة تجارة بالصدق وصناعة بالنصح وصيد البر والبحر والميراث حلال الاصل وهدية من موضع ترضاها و قال المهدیؒ اجمع العلماء على ان الحلال المطلق ما اخذ من يد الله تعالى بسقوط الوسائط۔

ومنها حسن الخلق۔ اعلم ان حسن الخلق هو معاملتك مع كل احد بما يسره الا فيما يخالف الشرع۔ ثم اعلم ان الاخلاق الحميدة كثيرة واصلها التواضع والبواقي تدور عليه والاخلاق الذميمة كثيرة واصلها التكبر والبواقي تدور عليه۔

ومنها مجانبة الاضداد وهو كل من ليس مقصده مقصدك۔

ومنها عدم الاغترار باحسان الله تعالى مع الاصرار على الذنوب كما ورد في الحديث اذا رأيت الله يعطى العبد من الدنيا ما يحب وهو يقيم على معاصيه فانما ذالك استدراج منه رواه احمد والطبراني والبيهقي عن عقبة بن عامر۔

وقال ابن عطاء خف من وجود احسانه اليك ودوام اساءتك معه ان يكون ذالك استدراجاً سنستدرجهم من حيث لا يعلمون وقال ايضاً من جهل المريد ان يسيئ الادب فتوخر العقوبة عنه فيقول لوكان

هذا اسوء ادب لقطع الامداد واوجب البعاد فقد قطع المدد من حيث لا يشعر ولو لم يكن لما منع المريد وقد يقام مقام البعد ولو لم يكن الا ان يخليك وما تريد۔ ومنها الزهد فى الدنيا۔ اعلم ان المانع الاكبر الذى منع السالكين عن السلوك حب الدنيا والآيات والاخبار فى بغض الدنيا كثيرة نقتصر منها على آية وحديث قال الله تعالى من كان يريد العاجلة عجلنا له فيها ما نشاء لمن نريد ثم جعلنا له جهنم يصلها مذموما مدحورا وورد فى الحديث حب الدنيا راس كل خطيئة۔

ومعرفة الدنيا اهم فربما يكون الشخص فقيرًا ليس عنده قوت يوم ولا ثوب غير ما يستر عورته وهو يظن انه فقير وهو من اهل الدنيا بعلامات وربما يكون الشخص ذا مال وامتعة وهو يظن انه من اهل الدنيا والحال انه ليس من اهل الدنيا بعلامات ذكرناها فيها ولبعض تفاصيل الزهد ومسائله مذكورة فى كتاب منهاج العابدين وفى مختصرات الاحياء وفى الجملة الدنيا مبغوضة الله والله تعالى محبوب السالك والمنافاة بين الضدين ظاهر فافهم۔ (منہج العال)

(طریق کے بہت سے اصول ہیں) ان کے منجملہ ایک اصل اکل حلال ہے اور وہ اہم الاصول ہے اس لئے کہ حلال (روزی) تو اس عبادت کا بھی ثواب دلا دیتی ہے جسے انسان کئے بھی نہیں ہوتا اور حرام کا حال یہ ہے کہ ایک انسان کے کی ہوئی عبادت کے ثواب کو بھی ختم کر دیتا ہے تشریح اس کی یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص ہے جو کہ دن میں کسب حلال کرنے کی وجہ سے تھک گیا اور شب میں کسی عبادت کے کرنے کا اس کا معمول تھا جو اس سے تعب کی وجہ سے فوت ہو گئی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کو اس عبادت کا ثواب ملے گا۔ اور (برخلاف اس کے) جو شخص حرام کھائے یا حرام پہنے تو اکثر تو یہی تو ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو طاعت کی توفیق ہی نہیں ہوتی اور شاذ و نادر توفیق ہوئی بھی اور ساری رات مثلاً کھڑا وہ نماز پڑھتا رہا تو اللہ تعالیٰ اس کی نماز کو قبول نہیں فرمائیں گے اس لئے کہ وہ خالی از ریا و نمود یا عجب نہ ہو گی پس اس کی وجہ سے اس کا ثواب برباد ہو جائے گا اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس شخص نے دس درہم کا کوئی کپڑا خریدا اور اس میں ایک درہم حرام آمدنی کا شامل ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی نمازیں اسوقت تک قبول نہ فرمائیں گے جبتک

کہ اس کے بدن پر کپڑے کا کوئی بھی حصہ موجود رہے گا۔ (اس روایت کو امام احمد نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیان فرمایا ہے) حضرت ذو النون رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ حلال آمدنی حاصل کرنے کے پانچ طریقے ہیں۔ سچائی کے ساتھ تجارت کرنا۔ خیر خواہی کے ساتھ کوئی پیشہ اور صنعت اختیار کرنا جنگل یا بحر میں شکار کرنا۔ اور میراث جب کہ اصل مورث کا مال حلال رہا ہو اور ایسی جگہ سے ہدیہ لینا جس کو پسند کرتا ہو۔ مہدی کہتے ہیں کہ علماء کا اجماع ہے کہ حلال مطلق وہ ہے جو بدون وسائط کے براہ راست اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں سے ملے۔

اور منجملہ ان اصول کے ایک حسن خلق ہے۔ سو پہلے یہ سمجھ لو کہ حسن خلق کہتے ہیں تمہارا معاملہ کرنا ہر شخص کے ساتھ ایسا عمل سے کہ وہ خوش ہو جائے بجز ان امور میں جو کہ خلاف شرع ہوں (کہ اس میں رضائے مولیٰ مقدم ہے) پھر یہ سمجھو کہ اخلاق حمیدہ یوں تو بکثرت ہیں لیکن اصل ان سب کی تواضع ہے اور بقیہ سب اسی پر دائر ہیں (اسی طرح) اخلاق مذمومہ بھی بہت ہیں اور ان سب کی اصل کبر ہے اور باقی سب اسی پر دائر ہوتے ہیں۔

اور منجملہ ان اصول کے اضداد یعنی ناجنس سے اجتناب کرنا ہے اور ناجنس وہ ہے کہ اس کا مقصد اور تمہارا مقصد ایک نہ ہو (آج سب سے زیادہ نقصان لوگوں کو اسی سے پہنچ رہا ہے) اور منجملہ ان اصول کے گناہوں پر اصرار کے باوجود اللہ تعالیٰ کے انعام و احسان کے مورد ہونے سے دھوکہ میں نہ پڑنا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب تم یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو باوجود اس کے کہ وہ معاصی پر قائم ہے، دنیا میں سے اسکی محبوبات عطا فرما رکھا ہے تو سمجھ لو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے استدراج یعنی ڈھیل اور اس کی ایک آزمائش ہے اس روایت کو حضرت عقبہ بن عامر سے احمد و طبرانی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

اور ابن عطاء نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اپنے اوپر برابر احسان ہونے اور اپنی جانب سے اللہ تعالیٰ کی دائمی معصیت ہونے سے خوف کرو مبادا وہ سب انعام اکرام استدراج ہو۔ (چنانچہ ارشاد ہے کہ) ہم ان کو بتدریج لئے جا رہے ہیں اس طور پر کہ ان کو خبر بھی نہیں، نیز وہ فرماتے ہیں کہ مرید کی جہالت سے ہے یہ بات کہ وہ تو بے ادبی کرے اور اس کی سزا موخر ہونے کی وجہ سے وہ یوں کہنے لگے کہ (یہ بے ادبی ہی نہیں کیونکہ اگر یہ بے ادبی ہوتی تو امداد منقطع ہو جاتی اور بعاد یعنی دوری لازم ہو جاتی (تو اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ) تحقیق مدد قطع ہو گئی ہے اور ایسی قطع ہوئی ہے کہ اس کو اس کا شعور بھی نہیں ہوا اور (اس کی دلیل یہ ہے کہ) اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو یہ شخص ترقی سے نہ روک دیا جاتا اور یہ (عدم ترقی) بھی قائم مقام بعد ہی کے ہے اگرچہ وہ اسی قدر ہو کہ تم کو

اور تمہارے ارادے کو چھوڑ دیا جائے کہ تم جانو اور تمہارا کام جانے اور منجملہ ان اصول کے دنیا سے بے رغبتی ہے سو جان رکھو کہ وہ مانع اکبر جس نے بہت سے سالکین کو روک دیا ہے حب دنیا ہے اور آیات و روایات دنیا کے مبغوض (عند اللہ) ہونے میں بکثرت ہیں ہم یہاں صرف ایک آیۃ اور ایک حدیث پر اکتفا کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص دنیا کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دے دیں گے پھر ہم اس کے لئے جہنم تجویز کریں گے وہ اس میں بدحال راندہ ہو کر داخل ہوگا۔

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

اور دنیا کی معرفت بھی ایک امر مبہم ہے کیوں کہ بسا اوقات ایک شخص فقیر ہوتا ہے (یہاں تک کہ) اس کے پاس ایک دن کا کھانا اور علاوہ ستر ڈھانکنے کے کپڑا تک نہیں ہوتا اور وہ خود بھی اپنے کو فقیر ہی سمجھتا ہے مگر ہوتا ہے وہ دنیادار (اس واسطے کہ وہ دل میں مال کی محبت رکھتا ہے) جس کی کچھ علامات ہیں۔ اسی طرح بسا اوقات ایک شخص مالدار اور ساز و سامان والا ہوتا ہے اور اپنے کو اہل دنیا میں سے سمجھتا ہے مگر وہ دنیادار نہیں ہوتا (اس واسطے کہ ...... مال کی محبت دل میں نہیں رکھتا) بعض ان علامات کی وجہ سے جن کو ہم نے اسی رسالہ میں ذکر کیا ہے۔ اور زہد کی کچھ تفصیل اور اسکے مسائل کتاب منہاج العابدین اور مختصر الاحیاء وغیرہ میں مذکور ہیں حاصل کلام یہ کہ دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہے اور اللہ تعالیٰ سالک کا محبوب ہے (پس دنیا گویا اپنے محبوب کی مبغوض ہوئی اور ظاہر ہے کہ محبوب کی مبغوض شئی خود کو بھی مبغوض ہی ہوگی کیوں کہ محبوب بھی محبوب ہو اور اس کا مبغوض بھی محبوب ہو (یہ تو اضداد کا جمع کرنا ہوا اور اضداد کا جمع کرنا محال ہوا کرتا ہے کیوں کہ) ضدین کے درمیان جو منافات ہوا کرتی ہے وہ بالکل ظاہر ہے خوب سمجھ لیجئے۔

طریق کے یہ سب اصول آپ کے سامنے ہیں۔ اب اس کا فیصلہ خود آپ ہی پر چھوڑتا ہوں کہ لوگوں کو مشائخ کے یہاں نفع نہیں تو اس کی وجہ کیا ہے۔ آیا یہ وجہ ہے کہ لوگ تو طریق کا حق اور مشائخ کے آداب کی پوری پوری رعایت کرتے ہیں مگر پھر بھی ان کو فائدہ نہیں ہوتا یا یہ کہ دراصل جو لوگ طریق میں داخل بھی ہوتے ہیں حقیقۃً وہ طریق میں داخل ہی نہیں ہوتے پھر جب لوگ خود ہی کچھ کام نہ کریں اور نہ طریق کا ان کے نزدیک کوئی طریقہ ہو اور نہ کوئی اصول تو عدم کامیابی کی شکایت کیا اور اس کے ذمہ دار مشائخ کیوں جب کہ یہ امر مسلم ہے کہ دین و دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا کام بے اصولی سے انجام نہیں پا سکتا

بلکہ ہر کام کے لئے کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں جن کی رعایت ضروری ہوا کرتی ہے پھر اس کلیہ سے آخر طریق ہی کیوں مستثنیٰ کر دیا گیا کہ اس کے لئے نہ کچھ اصول ہوں اور نہ آداب اسی۔ لئے میں کہا کرتا ہوں کہ آج لوگوں کے نزدیک تصوف کی بس یہ حیثیت ہے کہ ع "یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں الٹا سیدھا" پھر ان اصول خمسہ مذکورہ (یعنی اکل حلال حسن خلق۔ مجانبۃ الاضداد۔ عدم اغترار باحسان اللہ اور زہد فی الدنیا) سے قطع نظر کیجئے کہ ان کا نمبر تو طریق میں داخل ہونے کے بعد آتا ہے لیکن ان سب سے مقدم سالک کے لئے جو اصل ہے یعنی صدق طلب اس کا جائزہ لیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج کل کے سالکین میں یہ پہلی ہی شرط بھی غائب ہے حالانکہ اس کے متعلق رسالہ قشیریہ میں لکھا ہے کہ:۔

فاول قدم للمريد فی هذه الطريقة ينبغی ان يكون علی الصدق ليصح له البناء علی اصل صحيح فان الشيوخ قالوا انما حرموا الوصول لتضييعهم الاصول۔ (قشیریہ ص۱۹۷)

اس طریق میں مرید کا پہلا قدم صدق پر ہونا چاہئے تاکہ اس کو ایک اصل صحیح پر بنا قائم کرنا ممکن ہو سکے کیوں کہ مشائخ نے کہا ہے کہ لوگ وصول سے اس لئے محروم ہیں کہ انھوں نے اصول (طریق) کو ضائع کر دیا ہے۔

بہت سے طالبین جو مشائخ کی تلاش میں نکلتے ہیں اور جگہ جگہ جا کر مشائخ سے ملتے ہیں اور ان کو فیل کر کے چلے آتے ہیں خود وہ اس پہلی ہی شرط میں صفر ہیں۔ اور اگر بعضوں میں کچھ طلب بھی ہوتی ہے تو ناقص جس کی وجہ سے ان کو نفع کے بجائے کچھ نقصان ہی ہوتا ہے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

(جب پہلی ہی اینٹ طریق کی کج ہو گی تو اس پر قائم ہونے والی دیوار کا جو حشر ہوگا وہ ظاہر ہے)

گو یہ صحیح ہے کہ صدق دونوں ہی کی صفت ہے۔ شیخ کی بھی اور مرید کی بھی یعنی شیخ کو اللہ تعالیٰ کے رستے میں صادق ہونا چاہئے اور مرید کو بھی اپنی ارادت اور طلب میں صادق ہونا چاہئے مگر دیکھنا یہ ہے کہ مریدین مشائخ سے تو صدق کا مطالبہ کرتے ہیں اور خود اپنے کو بھول جاتے ہیں مشائخ میں تو صدق ضروری ہے لیکن مرید چاہے جیسا ہو جھوٹا ہو غیر طالب ہو یا غیر مخلص ہو۔ بہر حال اس کو طریق میں داخل ہی کر لیا جائے یہ آخر کیوں حالاں کہ کسی چیز کا دوسرے سے مطالبہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ انسان اسے خود اپنے اندر پیدا کر لے کیوں کہ دوسرے کے فعل پر تو اختیار نہیں لیکن اپنے اوپر تو اختیار ہوتا ہے پھر یہ لوگ اس سے کیوں مستثنیٰ ہونا چاہتے ہیں جب کہ مشائخ نے صدق ارادت ہی کو کلید کامیابی فرمایا ہے۔

در ارادت باش صادق اے فرید تا بیابی گنج عرفاں را کلید

(اے فرید ارادت و عقیدت میں سچے بنو تاکہ گنج عرفاں کی کنجی پا سکو ۔ ۱۲ رومی)

آج لوگ اس کلید کے بغیر ہی گنج عرفاں کا قفل کھولنا چاہتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے حاصل یہ کہ سالکین کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اپنے اندر صدق و خلوص پیدا کریں پھر اس کے بعد مشائخ میں اس کو تلاش کریں اور جب طریقہ سے کوئی کام کیا جائے گا مثلاً صدق و اخلاص کو لے کر مشائخ کی تلاش و جستجو کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ اپنے کسی نہ کسی بندے سے ملاقات کرا ہی دیں گے جس سے اس کا کام بن جائے گا ورنہ اگر بدون صدق اختیار کئے مشائخ کو تلاش کروگے تو اگر ساری عمر بھی تلاش کرتے رہوگے تب بھی کسی سچے سے تو بھینٹ ہوگی نہیں یوں تمہاری طلب کے موافق اسی طرح کا کوئی مل جائے تو مل جائے ، بلکہ قوی اندیشہ اس کا ہے کہ ایسا کرتے کرتے (یعنی ایک کے پاس گئے اور اس کا انکار کیا اسی طرح کرتے کرتے) یہی انکار ہی لازم حال ہو جائے اور پھر اس کے بعد کوئی ملے ہی نہیں ۔

یہ عدم صدق اور انکار جس کے متعلق تفصیل سے کلام کیا جا چکا ہے اس زمانہ میں ایک عام قلبی مرض ہو کر بزرگوں کے پاس آمد و رفت رکھنے والوں میں بکثرت پایا جاتا ہے لہٰذا جو لوگ کسی بزرگ سے نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے تو اس اصول کا لحاظ اور اہتمام نہایت ضروری ہے کیوں کہ آج اس بات میں لوگوں سے بہت زیادہ کوتاہی ہو رہی ہے جس کا منشا زیادہ تر طریق و اہل طریق کے آداب سے ناواقف ہونا ہے اور اسی ناواقفیت کا اثر ہے کہ بزرگوں کے یہاں لوگ آتے جاتے ہیں اور بعضے برسوں تک آتے جاتے ہیں مگر جہاں تھے وہیں کے وہیں رہتے ہیں ، بلکہ بعض لوگ تو ترقی معکوس کرتے ہیں ۔ تو وجہ اس کی یہی ہوتی ہے کہ وہ لوگ دراصل طلب ہی میں صادق نہیں ہوتے اور ارادت ہی میں غیر مخلص ہوتے ہیں جس کا ظہور کبھی کبھی کچھ مدت کے بعد ہوتا ہے ؂

تواں شناخت بیک روز در شمائل مرد کہ تا کجا است رسیدہ است پایگاہ علوم

یعنی انسان کے احوال میں سے اس کے علم کا اندازہ تو ایک روز میں سکتا ہے کہ مبلغ علم کتنا ہے ۔

ولے ز باطنش ایمن مباش و غرہ مشو کہ خبث نفس نہ گردد بسالہا معلوم

لیکن اس کے باطن سے دھوکا نہ کھانا چاہئے اور بے خوف نہ ہونا چاہئے کیوں کہ باطن کی خباثت سالہا سال معلوم نہیں ہوتی ۱۲ رومی

عدم صدق ارادت کا اثنا زبردست روگ خود اپنے اندر لئے ہوتے ہیں اور پھر اس پر مشائخ سے

نفع نہ ہونے کی شکایت کرتے ہیں۔ ایسے ہی موقع کے لئے کہا گیا ہے کہ "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے"۔

اسی سلسلہ میں آپ سے ایک بات اور بیان کرنا چاہتا ہوں جو کم از کم میرے لئے تو ایک عقدۂ لاینحل بن کے رہ گئی ہے باقی آپ حضرات کے نزدیک اس کا کوئی حل نکل سکے تو نکال لیجئے وہ یہ کہ لوگ مشائخ کے یہاں جاتے ہیں اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان کے معتقد ہیں اور ان حضرات کو کامل اور اپنے کو ناقص سمجھتے ہیں۔ پس ان کے پاس اپنا نقص دور کرنے کے لئے آتے ہیں لیکن مشائخ کے یہاں جاکر ان کے مخصوص معمولات میں بھی دخل دینے اور رائے لگانے سے باز نہیں رہتے حالاں کہ ان کو یہ سمجھنا چاہئے تھا کہ جب ہم خود ناقص ہیں تو کسی ناقص کی رائے کب معتبر ہے اور حسب قاعدہ عـہ "اسئے ؟ لعلیل علیل" ان کی رائے بھی ناقص ہوگی پس اس کا اعتبار ہی کیا مگر ان کا نقص ہی ان کو یہ سمجھنے نہیں دیتا اسی کے سبب رائے دیتے ہیں اور ان پر طرح طرح کے اعتراضات اور نکتہ چینیاں کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ان حضرات کا پاس اعتقاد تو کیا پاس ادب بھی ملحوظ نہیں ہے اور یہ لوگ اپنے کو کامل سمجھتے ہیں اور ان حضرات کو ناقص۔ اور ایک ناقص کی علامت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے کو کامل سمجھے اور کامل کو ناقص بتلائے کیوں کہ اپنے کو ناقص سمجھنا اور کسی کامل کو کامل سمجھنا تو نقص نہیں کمال کی بات ہے ؎

ہر کہ نقصِ خویش را دید و شناخت سوئے استکمال خود دو اسپہ تاخت

(جس شخص نے اپنے عیب کو دیکھا اور پہچان لیا تو اپنے کو کامل بنانے کے لئے دوہرے قدم چل پڑا۔ ۱۲ رومی)

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کے ان مختلف افعال میں کیوں کر تطبیق دی جائے نہ تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کو معتقد سمجھا جائے کیوں کہ اگر ایسا ہے تو اعتراض کیوں کرتے ہیں حالاں کہ جس کی عظمت اور احترام قلب میں ہو اس کے افعال میں نکیر کرنے کے کیا معنی اور اگر غیر معتقد مانا جائے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ پھر ان حضرات کے پاس یہ لوگ آتے کیوں ہیں۔ اور نہ زبان سے اور ظاہر سے اعتقاد کیوں ظاہر کرتے ہیں اور اگر یہ لوگ بطور خود کامل ہیں تو ان کو مشائخ کی حاجت ہی کیا ہے غرض کہ کوئی معقول بات سمجھ میں نہیں آتی اس قماش کے لوگ یہاں بھی آجاتے ہیں اور بجائے کچھ حاصل کرنے کے اپنا ہی کچھ فیض مجھے پہنچا جاتے ہیں (یعنی ایسی باتیں کر جاتے ہیں جن سے سخت ایذا ہوتی ہے)۔

عـہ بیمار کی رائے بھی بیمار ہوتی ہے۔ ۱۲ رومی

باقی رہا یہ سوال کہ آخر لوگوں کو اس زمانہ میں مشائخ سے یہ بداعتقادی کیوں ہے اور لوگ ان کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ ان کے معمولات پر نکتہ چینی اور ان کے حالات پر انکار و اعتراض کیوں کرتے ہیں! تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ لوگ مشائخ کے احوال کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں۔ (چنانچہ ان کو مشائخ سے اسی قسم کی شکایت ہوتی ہے کہ ان کا فلاں کام خلاف سنت ہے اور فلاں بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے خلاف ہے حالاں کہ ان مسکینوں کو نہ سنت کی ہوا لگی ہے اور نہ یہ خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے آشنا ہیں۔ پھر بھلا مشائخ میں ان اخلاق کو کیوں کر معلوم کر سکتے ہیں۔ ؎

تو نہ دیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبان مرغاں را

(تو نے کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو دیکھا نہیں تو پرندوں کی زبان تو بھلا کیا سمجھے گا۔ ۱۲ ردمی)

لیکن اپنے اقوال اور احوال پر ان کی نظر نہیں، نہ اس کا خیال کہ ہم کیسے ہیں اور نہ اس کی فکر کہ ہم کو کیسا ہونا چاہئے؟ اپنے حالات تو چاہے منافقین جیسے بنا رکھے ہوں لیکن مشائخ سے مطالبہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسے ہوں، بلکہ یہ کہ اخلاق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ہوں ــــ میں کہتا ہوں کہ خیر یہ تو صحیح ہے کہ مشائخ کو کامل نمونہ اور اعلیٰ درجہ کا متبع سنت ہونا چاہئے مگر آپ کو کیسا ہونا چاہئے کچھ اس کی بھی خبر ہے؟ حضرات صحابہ کرام رضی سے قطع نظر کیجئے لیکن کیا آج کل کے مرید بن پہلے زمانہ کے مریدوں ہی جیسے بھی ہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں ہیں تو پھر غور کیجئے کہ یہ مطالبہ کہاں تک انصاف پر مبنی ہے؟ مشائخ کا معاملہ تو ان پر چھوڑئیے کہ وہ جیسے کچھ ہوں گے اپنے فعل کے خود ذمہ دار اور خدائے تعالیٰ کے یہاں جواب دہ ہوں گے۔ لیکن آپ تو پہلے اپنے حالات کو خیر القرون کے حالات کے مطابق کر لیجئے۔

قلب میں تو عظمت کا نہ ہونا اور زبان و جوارح سے خوش کن اقوال و افعال کرنا کب دین میں داخل رہا ہے۔ قرآن و حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب امور شیوۂ منافقین تھے۔

عن قتادۃؓ قال بینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی غزوۃ الی تبوک وبین یدیہ اناس من المنافقین فقالوا ایرجو ھذا الرجل ان یفتح لہ قصور الشام وحصونھا ھیھات ھیھات فاطلع اللہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ذالک فقال صلی اللہ علیہ وسلم احبسوا علی ھؤلاء الرکب فاتاھم فقال قلتم کذا قلتم کذا قالوا یا نبی اللہ انما کنا نخوض ونلعب۔ (از بیان القرآن ص ۱۲۲ ج ۴)

حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اس اثنا میں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے لئے تشریف لئے جا رہے تھے اور آپ کے آگے منافقین کی ایک جماعت (بھی شرکت غزوہ کیلئے) جا رہی تھی ان لوگوں نے کہا کہ دیکھو تو بھلا یہ شخص بھی شام کے محلات اور قلعوں کے فتح کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے (معاذ اللہ) یہ تو نہایت ہی بعید اور قطعی ناممکن بات ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان کے اس قول پر (بذریعۂ وحی) مطلع فرما دیا آپ نے حکم دیا کہ اس جماعت کو ذرا روک تو لو اور اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ تم لوگوں نے ابھی ایسا کہا ہے؟ کہنے لگے کہ اے اللہ کے نبی ہم تو محض مشغلہ اور خوش طبعی (کے طور پر) کہہ رہے تھے۔

دیکھئے زبان پر کچھ ہے اور دل میں کچھ اور تھا۔ دل میں تو وہ تھا جو اپنے دوستوں میں کہہ رہے تھے (یعنی غائبانہ) ارجو ھذا الرجل جیسے الفاظ سے (معاذ اللہ) رسول اللہ صلی علیہ وسلم کو یاد کیا گیا تھا۔ مگر زبان پر اور سامنے آپ کو یا نبی اللہ کہا جا رہا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ظاہری اعتقاد اور باطنی بداعتقادی یہ منافق کی صفت ہے۔ آج مشائخ کے یہاں جانے والوں میں سے کتنے ہیں جو ظاہر کے مطابق اپنا باطن کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔

تصدیق جو آج بھی طریق کی شرط اول ہے ہر زمانہ میں اصل ہی رہی ہے۔ اسلام کی بھی اصل تصدیق ہے باقی دل تو تصدیق سے خالی ہو اور فقط اپنے ظاہر سے اپنے اعتقاد کا مدعی ہونا اور اس کی وجہ سے دوسروں پر اپنا امتیاز قائم کرنا ـــــ چنانچہ مشائخ کے یہاں بھی جا کر بس ان کو ہنس ہنس کر دیکھنا اور گردن ہلا ہلا کر ان کی باتوں کو سننا کب سے تصدیق شمار کی جانے لگی ہے اور طریق میں یہ امور کہاں سے داخل ہو گئے ہیں؟ کیا تصدیق دلی کے ہوتے ہوئے انکار و اعتراض کا بھی کوئی شائبہ پایا جا سکتا ہے اگر انکار یا اعتراض ہو تو سمجھ لیجئے کہ قلبی تصدیق ہی حاصل نہیں ہے اس پر حدیث شریف کا ایک واقعہ اور سن لیجئے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کسی غزوہ میں تشریف لئے گئے وہاں کسی شخص کی ایک اونٹنی گم ہو گئی لوگوں نے ہر چند تلاش کیا مگر نہیں ملی اس پر ایک منافق نے اعتراضاً اور انکاراً کہا کہ یہ تو اپنے کو اللہ کا نبی کہتے ہیں بتلا کیوں نہیں دیتے کہ وہ اونٹنی کہاں ہے؟ اس بات کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ بھائی میں اس کا دعویٰ کب کرتا ہوں کہ غیب کی سب باتوں کا مجھے علم ہے، اگر میں غیب دانی کا مدعی ہوتا تو مجھ سے اس قسم کی بات کہہ سکتے تھے لیکن میں تم کو خبر دیتا ہوں کہ وہ اونٹنی فلاں جھاڑی کے پاس کھڑی ہے، وہاں ایک خاردار درخت کے کانٹوں سے اس کی

مہار الجھ گئی ہے جس کی وجہ سے وہ وہیں ٹھہری ہوئی ہے۔ لوگ اس پتہ پر گئے تو جا کر دیکھا کہ جس طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا تھا ٹھیک اسی طرح سے وہ اونٹنی کھڑی ہوئی تھی اُسکو لے آئے یہ واقعہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک کا تھا، لیکن آج بھی ان منکرین اور معاندین کا مشائخ اہل حق کے ساتھ بالکل وہی برتاؤ ہے جو اس زمانہ میں منافقین کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، کہ انکار کرتے ہیں اور حقیقت حال اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیتے ہیں تب بھی تصدیق نہیں کرتے، میں تلاش میں تھا کہ اس واقعہ میں پھر اس منکر کا کیا حال ہوا اب بھی ایمان لایا کہ نہیں تو کسی کتاب میں دیکھا کہ پھر وہ ایمان لے آئے اور نفاق سے توبہ کر کے مخلص مسلمانوں میں سے ہو گئے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)۔

ایک وجہ تو مشائخ سے عدم نفع کی یہ تھی جو مذکور ہوئی، علاوہ اس کے ایک دوسری بڑی وجہ لوگوں کو ان حضرات سے فائدہ نہ پہنچنے کی یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں نے (بالخصوص اہل علم حضرات نے) یہ سمجھ رکھا ہے کہ تصوف کی تمام باتیں تو علماء و مشائخ نے کتابوں میں لکھ دی ہیں وہی ہمارے لئے کافی ہیں یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بس خود کتابوں کا مطالعہ کر کے سب کچھ معلوم کر سکتے ہیں، اب اس کے بعد ہمیں مشائخ کے یہاں جانے کی چنداں حاجت ہی نہیں ہے میں کہتا ہوں ...... کہ یہ وہ ضرر عظیم ہے جو آج لوگوں کو کتابوں سے پہونچا ہے حالانکہ یہاں ان حضرات نے اپنی کتابوں میں تصوف کے مسائل درج فرمائے ہیں وہیں اس کی بھی تصریح فرماتے ہیں کہ تصوف کی کتابیں شیخ کے لئے ہیں مرید کے لئے نہیں ہیں جس طرح سے کہ طب کی کتابیں طبیب کے لئے ہیں مریض کے لئے نہیں اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ بعض بعض حضرات نے تو اس کی بھی تصریح فرما دی ہے کہ ہماری ان کتابوں کو کوئی نااہل دیکھے نہیں۔

چنانچہ ان حضرات نے اپنی الگ اصطلاحات مقرر کیں جن کے پردہ میں کلام کیا اور یہ سب کچھ اسی لئے تھا تاکہ ہر کس و ناکس ان کے مطالعہ کی ہوس ہی نہ کرے مگر باوجود ان سب احتیاط و انتظامات کے لوگوں نے ان حضرات کی کتابوں کو دیکھا اور بہت سے لوگ تو محض کتابوں ہی کی وجہ سے شیخ بن گئے۔ اور ان کے اس فعل کا ضرر مشائخ اور مریدین دونوں ہی طبقوں کو پہنچا۔

مریدین کا ضرر تو ظاہر ہے کہ یہ ہوا کہ جب ایسے لوگ مدعی ہو گئے مشیخت کے اور شیخ ہو تے پہلے ہی شیخ بن بیٹھے، تو مرید بن کا پڑا ہی ہو گیا اور اب سوا ہلاکت کے ان کا انجام ہی کیا ہو سکتا ہے لیکن مشائخ کا ضرر یہ ہوا کہ لوگ ایسے ایسوں کو مسند مشیخت پر دیکھ کر ان سے بدظن ہو گئے جس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ لوگ عام مشائخ کے بلکہ طریق تک کے منکر ہو گئے۔ جس کے بعد اہل حق کو اپنا اعتبار قائم کرنا مشکل ہو گیا اور اس کی وجہ سے رشد و ہدایت اور اصلاح و تربیت کے باب میں جس درجہ ضیق اور رکاوٹ ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔

اسی طرح آج ایک وجہ مشائخ سے نفع نہ ہونے کی یہ ہے کہ لوگ اپنے اندر کیفیات کے پیدا ہونے نہ ہونے کا ذمہ دار شیخ کو سمجھتے ہیں، جو سراسر غلط اور باطل خیال ہے۔ کیوں کہ کیفیت پیدا ہونے کا ذمہ دار خود مرید ہی ہے شیخ نہیں اس لئے کہ امراض بدنی میں تو معالج اور ہوتا ہے اور معالج اور، مثلاً وہاں معالج مریض ہوتا ہے اور معالج طبیب لیکن طریق (یعنی اصلاح باطن) میں معالج اور معالج دونوں ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی انسان کا نفس ہی معالج ہوتا ہے اور وہی اپنا معالج بھی ہوتا ہے اور اس ایک ہی ذات کے معالج اور معالج ہونے فرق صرف اعتباری ہے یعنی نفس میں چونکہ دو قوتیں ہوتی ہیں فعلیہ اور انفعالیہ، پس اول کی رد سے تو وہ معالج ہوتا ہے اور ثانی کی رو سے وہی معالج ہوتا ہے اس مضمون کو حضرت حکیم الامۃ علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب "ظہور العدم بنور القدم" میں ایک مقام پر ضمناً بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ بطور مثال فرماتے ہیں کہ "جیسے اپنے نفس کے معالجات نفسانیہ میں معالج اور معالج کا تغائر ہے"۔ پھر اس کے کچھ دور بعد کسی کا قول نقل کیا ہے کہ:

ان الامر فیما نحن فیہ لیس کمانی المعالج والمعالج حیث یوخذ فی الاول حیثیۃ القوۃ الفعلیۃ وفی الثانی حیثیۃ القوۃ الانفعالیۃ۔ (ظہور العدم بنور القدم)

یعنی معاملہ اس بارے میں ویسا نہیں ہے جیسا کہ معالج اور معالج میں ہوتا ہے۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ معالجات نفس میں نفس ہی معالج ہوتا ہے اور نفس ہی معالج ہوتا ہے اس سے ثابت ہوا کہ معالجۂ نفس خود مرید ہی کے ذمہ ہے۔ رہا شیخ، تو اگر وہ صاحب تصرف ہے (اگرچہ شیخ کے لئے ایسا ہونا ضروری نہیں ہے) تو اپنے تصرف کے ذریعہ، ورنہ اپنی تعلیم و تربیت ہی کے ذریعہ جو طریقۂ علاج تلقین فرمائے یہ محض اس کا تبرع ہے۔ اصلاح کا اصل ذمہ دار مرید ہی ہے، احوال و کیفیات کی تحصیل کے لئے اسی کو کام کرنا ہوگا۔

آج طریق کے متعلق جہاں اور بہت سی جہالت اور غلط فہمی پائی جاتی ہیں انھیں کے منجملہ ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں نے نفع کا ذمہ دار شیخ کو قرار دے لیا ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ ان کی جہالت یا غلط فہمی نہیں ہے بلکہ یہ مریدین کی ہوشیاری ہے کہ خود تو کچھ کرنا دھرنا نہیں چاہتے اور چاہتے ہیں کہ بس پکا پکایا مل جائے اور ان کا یہ خیال بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ آج کل کے

آزاد خیال لڑکے بھی بس یہی چاہتے ہیں کہ نکمے اور کاہل ہو کر پڑے رہیں زیادہ سے زیادہ دوست احباب کے ساتھ رہ کر ادھر ادھر کی لغویات میں وقت گزاریں اور بوڑھے باپ کی کمائی کھاتے رہیں وہ کما کما کر ان کو دیا کریں اور یہ من مانا خرچ کیا کریں اور اگر اس نے کبھی کچھ کہدیا تو پھر اسکے پورے مخالف اور معاند ہو جاتے ہیں یہی حال آج کل کے مریدوں کا ہے کہ مشائخ سے نفع حاصل کرنا تو چاہتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ اگلے زمانہ کے مریدوں نے کیسے کیسے مجاہدے کئے ہیں، اور اپنے شیخ کے ساتھ کتنی عقیدت اور کیسی کچھ محبت کا ثبوت دیا ہے تب جا کر ان کو کچھ ملا ہے۔ اور یہ نفع میں تو ان کے شریک ہونا چاہتے ہیں مگر محنت او مجاہدہ میں دور رہنا چاہتے ہیں۔ اسی کو میں ہوشیاری کہتا ہوں۔ اب آپ چاہے اس کو ہوشیاری کہئے یا ناواقفیت بہر حال یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مرید کے احوال و کیفیات کا ذمہ دار شیخ ہے۔ کیفیات اور احوال اعمال و افعال کے تابع ہوتے ہیں، جیسا عمل ہوگا ویسا ہی نفع ہوگا۔ پس نفع حاصل کرنے کے لئے تو مرید ہی کو کام کرنا ہوگا، اسی کو بداخلاقیوں کو چھوڑنے کے لئے مجاہدہ بھی کرنا پڑے گا، اور اسی کو اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق اور محبت پیدا کرنے کیلئے ذکر و فکر کرنا ہوگا۔ باقی کرنا ورنا خاک نہیں اور اِدھر اُدھر کی بیکار باتیں بنانا اور بہانے اختیار کرنا اس سے کچھ نفع نہیں۔ دنیا اور آخرت میں کام آنے والی چیز اپنا حسن اخلاق اور حسن عمل ہے۔

اسی کو خواجہ صاحبؒ فرماتے ہیں ؎

کامیابی تو کام سے ہوگی ۔۔۔ نہ کہ حسنِ کلام سے ہوگی
فکر اور اہتمام سے ہوگی ۔۔۔ ذکر کے التزام سے ہوگی

و نعم ما قیل ؎

کار کن کار بگذر از گفتار ۔۔۔ کاندریں راہ کار باید کار

بس اب دعا پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ اللّٰھُمَّ ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ اللھم ارنا الاشیاء کما ھی اللھم اھدنا وسددنا (او کما قال مولٰینا الرومیؒ فی دعائہ ؎

لا تزغ قلبا ھدیت بالکرم ۔۔۔ واصرف السوء الذی خط القلم

یعنی اے اللہ جس قلب کو آپ نے محض اپنے فضل و کرم سے ہدایت سے نوازا ہو اب اس میں کھوٹ نہ آنے دیجئے۔ اور جس برائی پر تقدیر کا قلم چل چکا ہے اس کو ہم سے پھیر دیجئے۔

(۲۸ ربیع الاول ۱۳۷۵ھ یکشنبہ)

بزرگوں سے بغض رکھنا شقاوت کی علامت ہے

حکیم اجمیری صاحب نے عرض کیا کہ حضرتؒ کے حالات تو ایسے ہیں کہ اگر ان کو جانتے ہوئے کوئی شخص حضرت کا انکار کرتا ہے تو اس کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہئے کہ آخر باطن میں ایسی کونسی خامی ہے کہ ایسی ہستی کا انکار پیدا ہو رہا ہے۔

فرمایا کہ آپ کے اس بات کی دلیل ایک بہت بڑے بزرگ کے کلام سے پیش کرتا ہوں۔ سنئے فرماتے ہیں کہ ۔۔۔۔

"از جملہ آثار ایں مقام نزول قبول در قلوب صلحائے بنی آدم ست کہ اذا احب اللہ عبداً نادیٰ جبریل انی احب فلاناً فاحبہ، فیحبہ، جبریل ثم ینادی فی السماء الیٰ ان قال حتی یوضع لہ القبول فی الارض اشارت نیست بایں معنی۔ وحقیقت ایں قبولیت انعکاس وجاہت ایں صاحب کمال است در آئینۂ قلوب صافیہ سلیمہ۔ یعنی اس مقام قرب نوافل کے آثار کے منجملہ یہ بھی ہے کہ بنی آدم کے صلحاء کے قلوب میں ان حضرات کی مقبولیت جاگزیں ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس حدیث میں اسی امر کی جانب اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت فرماتا ہے تو جبریل سے کہتا ہے کہ میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو چنانچہ جبریلؑ بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر اس کے لئے آسمان میں بھی ندا کر دی جاتی ہے حدیث کے آخر میں ہے کہ یہاں تک کہ اس کی یہ مقبولیت روئے زمین پر اتار دی جاتی ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ قلوب صافیہ سلیمہ میں۔ اس صاحب کمال کی وجاہت اور اس کی عظمت منعکس ہو جاتی ہے یعنی ہر نیک شخص اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ آگے فرماتے ہیں کہ۔

پس ہر کہ از صلحاء او را می بیند یا باو مجالست مینماید یا بر حال و کمال او مطلع میشود البتہ از تہ دل او را دوست میدارد۔ وعلوم و اخبار او را از صمیم قلب مسلم می انگارد۔ وبلکہ بر اوضاع و اطوار او شیفتہ و فریفتہ میشود گو کہ ہماں اوضاع و اطوار در غیر آں یافتہ میشود کہ بسوی او کسی از اہل صلاح ادنی التفاتی نمی نماید۔ مدانی کہ مقصود ازیں کلام محبت ہمہ عوام بصاحب ایں مقام است چہ در حدیث وارد شدہ کہ انتم شہداء اللہ علی الارض۔ دیگر ظاہر ست کہ اہل شہادت

(بقیہ مضمون صفحہ ۸۶ پر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلصِّدْقُ یُنْجِی وَالْکِذْبُ یُھْلِکُ

اعتقاد وانکار

شیخ کامل عالم ربانی عارف باللہ حضرت مولانا الحاج شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ

حسب فرمائش

حکیم مولانا عزیز الرحمن صاحب پھلتی ثم المیرٹھی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

یہ ملفوظات عالم ربانی حضرت مولانا الحاج شاہ وصی اللہ صاحب کے ارشادات یومیہ میں سے ہیں، حضرت کی ذات محتاج تعارف نہیں، آپ کے سرچشمۂ رشد و ہدایت سے ہند و بیرون ہند دونوں فیضیاب ہیں۔

حضرت کی ذات والاصفات ان ہستیوں میں سے ہے جن کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل۔

ان حضرات کی تعظیم و تصدیق اہل طریق کا دستور العمل رہا ہے۔ اسی میں طالبین راہ کا نفع منحصر ہے۔ اسکے خلاف میں سراسر حرمان و ناکامی ہے اور خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ کا مصداق ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت والا کی ذات اقدس سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہونے کی توفیق عطا کریں۔

ناچیز

(حکیم) بُنیاد علی صدیقی

۲۷ ربیع ۲ سنہ ۱۳۸۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعتقاد و انکار

فرمایا کہ آج میرا ارادہ کچھ کہنے کا نہیں تھا۔ بلکہ خیال تھا کہ ان لوگوں سے کہدوں گا وہ کچھ بیان کر دیں گے۔ چنانچہ مضمون کل سنا دیا تھا۔ لیکن پھر یہ خیال ہوا کہ شاید یہ لوگ پوری ترجمانی نہ کر سکیں۔ بیان سے جو غرض ہے وہ حاصل نہ ہو اس لئے خود ہی بیان کرتا ہوں۔ سنئے۔ یہ کتاب ہے۔ التنبیہ الطربی اس میں حضرت تھانوی نے ایک فصل قائم کی ہے۔ اس بیان میں کہ جماعت صوفیہ اور علوم تصوف کے ساتھ کیا معاملہ رکھنا چاہیے۔ اس میں فرماتے ہیں کہ:۔

ابو عبد اللہ قرشی رحمہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص مقبول حق کی تنقیص کرے۔ اس کے قلب میں ایک زہر آلود تیر قہر کا لگتا ہے۔ اور وہ مرتا نہیں۔ یہاں تک کہ اس کے عقائد فاسد ہو جاتے ہیں۔ اور اس پر سوء خاتمہ کا اندیشہ ہوتا ہے" اس سے ثابت ہوا کہ اکابر کی تنقیص اور ان پر طعن کرنا نہایت خطرناک حالت ہے۔ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تو بیمار ہوں۔ تمہارے یہاں آگیا ہوں جو چاہے اعتراض کر لو۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں اور ہمارا قول تو شائد آپ کے یہاں معتبر بھی نہ ہو۔ اس لئے کہ آپ ہی کے زمانہ میں ہوں، یہ بزرگ فرما رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ جاؤ گے کہاں۔ قیامت میں یہ بھی ہوں گے تم بھی ہو گے۔ اور سنئے:۔

ایک دوسرے بزرگ ابو تراب نخشبی رحمہ فرماتے تھے کہ قلب جب اعراض عن اللہ کا خوگر ہو جاتا ہے۔ تو اولیاء اللہ کی غیبت اس کے لئے لازم حال ہو جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مقبولان حق پہ طعن و تشنیع علامت ہے ۔ اِعراض عَنِ الْحَقِّ کی اب آپ کا ذہن کچھ سننے اور سمجھنے کے قریب ہو گیا ہو تو کچھ اور کہوں۔ اچھا سنئے:-

رسالہ قشیریہ میں ایک واقعہ لکھا ہے اور عجیب واقعہ ہے اور حضرت مولیناؒ سے بھی اس کو سنا ہے کہ "سہل بن عبداللہؒ نے ایک شخص کے متعلق یہ بیان کیا کہ وہ خدا کے ولی ہیں۔ اور وہ بصرہ میں روٹی پکانے کا کام کرتے۔ ایک شخص نے سنا۔ زیارت کا مشتاق ہوا۔ چنانچہ بصرہ پہنچا اور اس خبّاز کی دوکان پر آیا۔ دیکھا تو وہ روٹی پکا رہے ہیں اور نان بائیوں کی عادت کے مطابق اپنی داڑھی پر ایک کپڑا باندھے ہوئے ہیں تاکہ داڑھی کا بال تنور کی آگ اور آنچ سے محفوظ رہے۔ انکو دیکھ کر اس شخص نے اپنے دل میں کہا کہ اگر یہ ولی ہوتے تو ان کے بال بغیر نقاب کے بھی نہ جلتے پہلے دل میں ان پر یہ اعتراض کر لیا تب ان کو سلام کیا اور ان سے کوئی بات پوچھی۔ انھوں نے جواب دیا۔ اے شخص تو نے مجھکو حقیر جانا۔ لہذا میرے کلام سے تجھکو نفع نہیں پہونچے گا۔ یہ کہہ کر اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا:-

دیکھا آپنے گئے تھے بزرگ سے ملنے کے لئے اور ایک بزرگ کی شہادت کے بعد۔ لیکن ان کی ظاہری صورت شکل اور عمل یعنی روٹی پکانا۔ چہرہ پر پسینہ۔ ہاتھوں میں آٹا اور کپڑوں پر دھواں وغیرہ کے آثار دیکھ کر بدعقیدہ ہو گئے۔ اور دل میں انکو حقیر سمجھنے لگے وہ کامل بزرگ تھے۔ خود ہی سزا دی کہ بے نیل مرام واپس کر دیا آج یہ لوگ بزرگوں کی تلاش کرتے ہیں مگر انکار کے ساتھ۔ تو ظاہر ہے کہ کوئی بزرگ اس طرح سے مل چکا۔ دل سے نہیں تلاش کرتے۔ محض بدن کے زور سے تلاش کر لینا چاہتے ہیں۔ کہتے ہوں گے کہ اب دل رہ کہاں گیا ہے۔ بدن ہی بدن تو ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کر لو پھر تلاش۔ اگر کوئی ہوا تو ناطقہ بند کر دے گا۔ اور پھر کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں اسی کی ضرورت ہے۔ آپ نے دیکھا اس زمانہ میں بھی مشائخ کے ساتھ اس قسم کی سوءِ ادبی لوگ کرتے تھے۔ اب یہ زمانہ تو خیر القرون سے بہت دور ہو گیا ہے۔ اس زمانہ میں بھی لوگ اس طرح سے بزرگوں کو تلاش کریں تو کیا عجب ہے۔

دینداروں کے ساتھ اہل دُنیا کا بھی معاملہ ہر جگہ دیکھا۔ چنانچہ اس بارہ میں ہر جگہ کے لوگوں کا ایک ہی خیال دیکھا۔ وطن میں لوگوں کو کچھ نصیحت کرتا تھا۔ نوجوان اور کم عمر کے جو لوگ تھے۔ وہی سُنتے تھے۔ چنانچہ کچھ نماز۔ روزہ شروع کیا تو اگر اپنے یہاں کے لوگوں کی شکایت کرتے تھے۔ کہ لوگ ہنستے ہیں ایک شخص کے متعلق کہا کہ وہ بہت ہی زیادہ استہزا کرتا ہے۔ ہم نے اُن لوگوں سے کہا کہ صبر کرو۔ لیکن جب یہ سلسلہ بند نہیں ہوا تو میں نے ایک دفعہ اُن کے پاس کہلا بھیجا کہ اس سے کہدو کہ ہماری اور تمھاری یہاں سے لے کر آخرت تک لڑائی ہے۔

بزرگوں نے ایسا ہی کیا ہے ایک بزرگ کلیر تشریف لے گئے۔ مسجد میں نماز کے لئے اگلی صف میں کھڑے ہوئے۔ لوگوں نے حقیر اور کمزور سمجھ کر دوسری صف میں کر دیا۔ اور اُن لوگوں نے دھکا دے کر تیسری صف میں کر دیا۔ اس طرح دھکے دیتے دیتے سب سے پیچھے کر دیا۔ بہت اذیت ہوئی۔ اور غصہ بھی آیا۔ جب نماز شروع ہوئی۔ اور امام نے سجدہ کیا اور سب نمازی سجدہ میں چلے گئے تو اُن بزرگ نے مسجد کو مخاطب کر کے کہا کہ تو کیوں کھڑی ہے تو بھی سجدہ کیوں نہیں کرتی۔ یہ کہنا تھا کہ مسجد گری اور سب لوگ دب کر مر گئے۔

منکروں اور بے ادبوں کے لئے ضرورت اسی چیز کی ہے۔ لیکن خدا نہ کرے کہ اس زمانہ میں کوئی ایسا کہنے والا ہو ورنہ تو لوگ ختم ہی ہو جائیں گے باقی کہہ یہ رہا ہوں کہ بزرگوں کا ادب اور احترام قلوب سے نکل گیا تھا اور وہ بغیر سزا کے قلب میں پیدا نہیں ہوتا۔ اسی سے کچھ ڈرتے ہیں جب میں نے اس شخص سے کہلایا کہ ہماری تمھاری یہاں سے لے کر آخرت تک کی لڑائی ہے تو اس سے ڈر گیا۔ اور ایک شخص کو ساتھ لے کر مجھ سے معافی مانگنے آیا اور یہ کہا یکہ کر لیا جائے۔ مگر پھر فوراً ہی کہا کہ چونکہ معافی کے لئے چل رہے ہیں۔ اس لئے پیدل ہی چلنا چاہیئے۔ مجھ سے ملا تو میں نے نرمی کا معاملہ کیا کہنے لگا کہ یہ صحیح ہے کہ میں چھیڑتا ہوں۔ لیکن آپ سے کہتا ہوں کہ میں تنہا اس کا مریض نہیں ہوں بہت سے لوگ ہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں یہ ٹھیک کہتے ہو۔ میں اس کو جانتا ہوں آج مسلمانوں کا یہی حال ہے بیٹھا بنیا کیا کرے اِس کوٹھی کا دھان اُس کوٹھی کرے۔

(یعنی جب دین سے تعلق نہیں رہے گا تو دینداروں کا احترام کب باقی رہیگا۔

اور مسلمان اپنا مشغلہ نماز۔ روزہ۔ ذکر اور تلاوت۔ بزرگوں کے حالات اور ملفوظات اور فکر آخرت اور اس کے لئے توشہ آخرت کے مشاغل کو ختم کر دیگا تو پھر اس کی غیبت اُس کی شکایت۔ بزرگان دین پر طعن اور تشنیع میں وقت نہ گزارے گا۔ تو اور کیا کرے گا۔ ابھی آپ کو بتایا ہے کہ جب قلب اعراض عن اللہ کا خوگر ہو جاتا ہے۔ تو اولیاء اللہ کی غیبت اُس کے شامل حال ہو جاتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ سے نسبت صحیح ہوتی ہے تو اولیاء اللہ کی توصیف و تعریف اور اُن کے حالات کا ذکر و تذکرہ یہ سب چیزیں انسان کے لئے لازم حال ہوتی ہیں۔

اسی بستی کا ایک اور واقعہ سُنئے:۔

ایک شخص نے میرے وعظ کے سُننے کے بعد دین داری اختیار کی۔ تو دوکان پر جب وہ گوشت وغیرہ لینے جاتا تو لوگ اُس کی دینداری پر طعنہ کرتے ہوئے دوکان دار سے کہتے کہ ان کو گوشت زیادہ دینا۔ یہ تہجد پڑھتے ہیں مجھے جب اُس کی اطلاع ہوئی۔ تو میں نے وعظ میں یہ کہنا شروع کیا کہ عالموں کو بلاؤ وعظ کہلاؤ اور جب کسی پر اثر ہوا اور وہ نماز وغیرہ پڑھنے لگے۔ تو دوکاندار سے کہو کہ ان کو گوشت زیادہ دو۔ یہ تہجد پڑھتے ہیں۔ اس طرح ایک جگہ کہا دو جگہ کہا۔ جب مسلسل کہنے لگا تب تو وہ لوگ بہت گھبرائے اور آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ کون ایسا کہتا ہے۔ اور جو لوگ ایسا کہتے تھے۔ جب اُن کو یہ معلوم ہوا کہ پوری بستی کے لوگوں کو یہ علم ہو گیا ہے کہ کچھ لوگ ایسا کہتے ہیں اور وہ لوگ ٹوہ میں ہیں کہ کون ایسا کہتا ہے لہٰذا سب کے سامنے اپنے آپ کو ذلت و رسوائی سے بچانے کے لئے انھوں نے کہنا چھوڑ دیا۔ اور صلح کرلی۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ لوگ اب نہیں کہتے تو میں نے بھی کہنا چھوڑ دیا:۔

ہر زمانہ میں لوگوں نے اپنے اپنے زمانہ کے اولیاء اللہ کا انکار کیا۔ اور اس کی وجہ سے محروم رہے۔ مکتوبات قدوسیہ میں ہے کہ "ہر یکے از اولیاء بر قدر علو درجۂ خویش در متابعت سید المرسلینؐ دمے و قدمے دارد کہ یکے بہ دیگرے

نرسد و فہم آں ادرا نبود۔ چنانچہ قرآن ناطق است وَ کَیْفَ تَصْبِرُ عَلٰی مَا لَمْ تُحِطْ بِہٖ خُبْرًا۔ اگر اجنب انکار بود حرمان عظیم باشد و منکر بجائے نہ رسد جز مخذول و مطرود نبود۔ و صاحب عوارف می گوید۔ من انکر ھم ضل واعتدیٰ۔ و مُصَدِّق اگرچہ بدرجۂ ایشان نرسیدہ است امید است کہ تصدیق ورا صحبت و خدمت ایشاں آرد۔ و ا ورا بجمال مرداں رساند و عارف سبحان گرداند۔

ترجمہ:۔ ہر ولی کو سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اتباع میں ایک خاص مقام حاصل ہوتا ہے۔ اور دوسرا وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ اس کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ کیسے صبر کروگے ایسے امور پر جن کی حقیقت سے تم واقف نہیں ہو۔ ایسے ہی ایسے مشائخ پر انکار کرنے سے بڑی محرومی ہوتی ہے۔ کیوں کہ منکر کسی مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا ہے۔ بجز رسوا اور ذلیل ہونے کے کچھ نہیں ہوتا۔ اور صاحب عوارف فرماتے ہیں۔ جس نے اولیاء اللہ کا انکار کیا وہ گمراہ ہوا اور اس نے حد سے تجاوز کیا۔ اور تصدیق کرنے والا۔ اگرچہ اُن کے درجہ تک نہیں پہنچتا تاہم امید ہے کہ وہ تصدیق جس کو کہ وہ ان کی خدمت میں لایا ہے وہ اس کو بزرگوں کے کمالات تک پہنچا دے اور حق تعالیٰ کا عارف بنا دے۔

دیکھئے فرما رہے ہیں کہ جن بزرگوں کو مرتبہ ملا ہوا ہے وہ سید المرسلینؐ کی متابعت کی وجہ سے ہے۔ قول میں بھی عمل میں بھی یا عملاً بھی اور ترغیباً بھی اور اس میں بزرگوں کے درجات مختلف ہیں۔ ایسا کہ اوپر کے درجہ تک نیچے والے کا پہنچنا تو کیا ہوتا وہ اس کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ یہ تو مشائخ کے حالات بیان فرما رہے ہیں۔ اب عوام الناس کا یہ حال ہے کہ بزرگوں کے مقامات سمجھنا تو کیا سمجھتے ہیں کہ ہم وہاں تک پہنچ جاتے ہیں میں کہتا ہوں کہ ضرور پہنچ جاتے۔ مگر دوسرے دروازے سے کیونکہ ان مقامات تک پہنچنے کا دروازہ تو متعین ہے جس سے آپ کو کوئی تعلق نہیں اور وہ دروازہ سے اتباعِ سنت کا

میندار سعدی کہ راہ صفا
تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

دیکھئے قطب العالم حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ نے کیسی عمدہ بات ہے

بیان فرمائی ہے کہ اتباع سنت کا درجہ اور اُس کا مقام بیان فرمایا ہے یہ سب علوم معاملہ کہلاتے ہیں۔ اور حضرت مجدد صاحبؒ بھی نہایت عمدہ باتیں بیان فرماتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر علوم مکاشفہ سے متعلق ہوتی ہیں۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جو صحابیت کے مقام پر پہنچے تو اپنی تصدیق ہی کی وجہ سے۔ اور منافقین جو ذلیل و خوار ہوئے تو وہ اپنے انکار کی وجہ سے اب محققین تو بزرگی کا معیار اتباع کو فرما رہے ہیں۔ اور اس زمانہ میں لوگوں کے نزدیک بزرگی کا معیار کچھ اور ہو گیا ہے اور منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ یہ خیال کرتے ہیں کہ غائب چیزوں کا علم اور کشف کا ہونا بزرگی کے لئے ضروری ہے چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ ارشاد الطالبین میں اس خیالِ فاسد کو رد کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ یہی حال منافقین کا تھا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

می گویند کہ اگر ہمہ از اہل اللہ می می بودند از احوال غیب خبردار باشندے چوں ایں قدر خبر ندارند پس دیگر چہ خواہند دریافت ایں چنیں منافقان ہم در حق سید المرسلینؐ می گفتند ایں سفیہاں بایں خیالات فاسدہ از برکات دوستان خدا محروم اند و نمی دانند کہ حق تعالیٰ دربارہ دوستانِ خود غیرت دارد کہ اوشاں را بغیر خود مشغول نمی کنند۔

شعر

من ندانم فاعلاتٌ فاعلات
شعر می گویم بہ از آب حیات
قافیہ اندیشم و دلدار من
گویدم مندیش جز دیدار من

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر اولیاء اللہ خدا کے محبوب بندے ہوتے تو غیب کی باتیں جانتے ہوتے اور جب ان دنیاوی باتوں کو نہیں جانتے تو پھر اور عالم بالا کی باتیں کہاں جان سکتے ہیں۔ اسی طرح منافقین بھی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں کہا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے ہی خیالاتِ فاسدہ (انکار و اعراض) کی وجہ سے دوستان خدا کی برکات سے محروم رہے اور انھوں نے اتنا بھی نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کے بارے میں غیرت رکھتا ہے اس طور پر کہ اُن کو اپنے غیر کی جانب مشغول نہیں کرتا اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

کہ میں فاعلات فاعلات نہیں جانتا یعنی اپنے اشعار کو مقررہ اوزان پر جانچتا نہیں پھر بھی

میرے اشعار ایسے ہوتے ہیں جو آب حیات سے بھی بڑھ کر ہیں اس لئے کہ جب میں قافیہ سوچتا ہوں تو میرا دلدار (اللہ تعالیٰ) کہتا ہے کہ بجز میرے دیدار کے اور تم اپنا دھیان کسی طرف نہ لگاؤ۔ (ہم ہی قافیہ وغیرہ سب ٹھیک کر دیں گے) تم تو صرف ہماری ہی طرف دھیان رکھو۔ اور یہ جو کہا کہ یہی معاملہ منافقین کا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کیساتھ تھا تو اس پر یہ واقعہ سنئے:۔

محمد بن عمر حضرت ابن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ اونٹوں کے درمیان سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ناقہ قصواء کہیں نکل بھاگی۔ مسلمان چاروں طرف اس کی تلاش کرنے لگے۔ اس پر زید بن صلتہ نے جو ایک منافق تھا۔ اور انصار کی ایک جماعت میں بیٹھا ہوا تھا۔ جن میں عبادہ بن بشر بن وقیسؓ اور اُسید بن حضیرؓ بھی تھے۔ یہ کہا کہ یہ لوگ چاروں طرف کہاں دوڑ رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ناقہ گم ہو گئی ہے۔ اسی کو تلاش کر رہے ہیں یہ سن کر اس نے کہا۔ کہ یہ تو نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس کے مقام کی اطلاع کیوں نہیں کر دیتے۔ قوم کو یہ بات بری لگی۔ سب نے کہا کہ اے اللہ کے دشمن خدا تجھے ہلاک کرے تو منافق ہو گیا۔ پھر حضرت اُسید بن حضیرؓ اس کی طرف بڑھے۔ اور کہا (سن) خدا کی قسم میں تو ابھی تیرے پیٹ میں نیزہ بھونک دیتا۔ لیکن رکاوٹ صرف اس بات کی ہے۔ کہ مجھے نہیں معلوم کہ میرا یہ اقدام رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے منشاء کے مطابق بھی ہو گا یا نہیں۔ لیکن تجھ سے یہ کہتا ہوں کہ جب تیرے نفس میں ایسی خیانت بھری ہوئی تھی۔ تو تو ہم لوگوں کے ساتھ نکلا ہی کیوں۔ اُس نے کہا کہ میں اس لئے نکل آیا۔ کہ متاع دنیا (مالِ غنیمت) طلب کروں۔ قسم خدا کی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو ہم کو ناقہ سے کہیں زیادہ عظیم الشان چیزوں کی خبر دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ آسمان تک کی باتیں بیان کرتے ہیں۔ (پھر اونٹنی کے بارے میں کیوں نہیں بتلا دیتے۔ جب کہ تم سب لوگ اسی کے لئے پریشان بھی ہو۔) تو سب لوگوں نے کہا۔ خدا کرے تجھ سے ہماری کبھی راہ و رسم نہ ہو اور ہم تم کبھی ایک سایہ میں جمع نہ ہوں۔ اگر ہم لوگ تیرے دل کی بات جانتے تو کبھی تجھے اپنے ساتھ نہ لاتے۔ یہ سن کر وہ کود اور مجمع سے نکل بھاگا۔ اس ڈر سے کہ لوگ مار نہ بیٹھیں

اور مال و اسباب چھین نہ لیں۔ وہ بھاگ کر سیدھا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپؐ کے اصحابؓ سے بچ کر آپ کی پناہ پکڑی۔ اُدھر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آئے۔ حضورؐ نے فرمایا (یہ منافق بھی سن رہا تھا) کہ منافقین میں سے ایک شخص نے یہ کہا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اونٹنی کھوگئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے مقام کی خبر نہ کردی۔ قسم ہے خدا کی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو ہم کو ناقہ سے کہیں بڑھ کر چیزوں کی خبریں دیا کرتے ہیں تو بھائی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو غیب کا علم تو ہے نہیں۔ مگر اللہ سبحانہ تعالیٰ نے مجھے اُس کے مقام کی خبر دے دی ہے۔ کہ وہ فلاں گھاٹی میں ہے۔ جو تمہارے آگے ہے اور اس کی مہار ایک درخت سے الجھ گئی ہے۔ وہ لوگ وہاں گئے۔ جہاں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا اور اس کو لے آئے اِس منافق نے دیکھا تو بہت نادم ہوا اور جلدی سے اُٹھ کر اپنے ساتھیوں کیطرف گیا۔ اس حال میں کہ اُس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے اور وہ سب لوگ اسی طرح بیٹھے تھے۔ کوئی شخص بھی ان میں سے مجلس سے نہ اُٹھا تھا۔ جب یہ اُن کے پاس پہنچا تو ان لوگوں نے کہا کہ (خبردار) اب ہمارے پاس نہ آنا۔ اس نے کہا مجھے کچھ کہنا ہے۔ یہ کہہ کر قریب گیا۔ اور کہا کہ میں اللہ کی قسم دیتا ہوں یہ بتاؤ کہ کیا تم میں سے کوئی شخص محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس گیا ہے۔ اور میری بات کی اُن کو اطلاع کی ہے۔ لوگوں نے کہا۔ نہیں۔ خدا کی قسم ہم تو اپنی جگہ سے اُٹھے بھی نہیں۔ اُس نے کہا کہ (بڑے تعجب کی بات ہے) میری کہی ہوئی بات قوم ہی کے پاس رہی یعنی اُن سے تجاوز نہیں ہوئی۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو بیان فرما دیا۔ پھر قوم کو خبر دی اس بات کی جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اور یہ بھی کہا کہ اب تک محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں شک میں تھا۔ اب گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اور یوں سمجھو کہ گویا آج میں مسلمان ہوا ہوں۔ لوگوں نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو۔ وہ تمہارے لئے استغفار کردیں گے۔ چنانچہ رسول اللہ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں گیا۔ اور آپ سے اپنے لئے استغفار طلب کیا اور اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔

بہر حال یہ معترض تو مسلمان ہو گئے۔ لیکن اہل انکار اسی قسم کا اعتراض انبیاء پر اور ان کے بعد اولیاء پر ہر زمانہ میں کرتے رہے ہیں، اس کی وجہ سے ان حضرات کو ایذا پہنچتی رہی اور یہ صبر کرتے رہے۔

قاضی صاحب ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لوگوں کی ایذا پر صبر فرمایا کرتے تھے۔ اور ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ میرے بھائی موسیٰؑ پر رحم فرمائے۔ وہ اس سے بہت زیادہ ایذا دئے گئے پھر بھی انھوں نے صبر ہی کیا پھر اس کے بعد قاضی صاحب نے اپنے شیخ حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ کا واقعہ بیان فرمایا کہ ایک شخص جو اپنے کو مرزا صاحب کے شیخ سید نور محمدؒ بدایونی کے مریدوں میں سے کہتا تھا۔ اس نے اپنی بدبختی سے ایک دن حضرت سید نور محمد صاحبؒ کی سخت بے ادبی کی اور انھیں بہت برا بھلا کہا حضرت نے جواب میں کچھ نہیں فرمایا اور دوسرے روز وہ شخص حضرت کے پاس آیا تاکہ ان سے توجہ لے اور استفاضہ حاصل کرے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے بہت ناگوار گزرا اور میں نے چاہا کہ اس کو سزا دوں۔ لیکن آنحضرت نے منع فرمایا اور اس شخص پر اسی طرح متوجہ ہوئے جس طرح دوسرے مخلصین پر توجہ فرماتے تھے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ فقیر اس حالت سے بہت تنگ دل ہوا اور اس کو دوسرے تمام مخلصین کے برابر کر دینے کی وجہ سے حضرت شیخ بدایونیؒ کی خدمت میں عرض گزار ہوا۔ (کہ حضرت آپ نے ایسا معاملہ کیوں کیا) فرمایا کہ مرزا صاحب! اگر میں اسے زجر و تنبیہ کرتا اور توجہ نہ دیتا اور حق تعالیٰ مجھ سے قیامت میں یہ سوال کرتا کہ میں نے تیرے سینے میں ایک نور ودیعت رکھا تھا اور میرے بندوں میں سے ایک شخص اس نور کا طالب ہو کر تیرے پاس گیا۔ تو نے اسے کیوں محروم رکھا تو اس وقت میرا کیا جواب ہوگا۔ کیا میں یہ کہہ سکتا تھا کہ اے رب اس نے مجھے گالی دی تھی۔ اس لئے اسے میں نے محروم رکھا۔ اور کیا میرا یہ جواب پسند اور مقبول ہوگا۔ (حضرت کا یہ جواب سن کر میں تھوڑی دیر تک تو تنگ دلی کے

ساتھ خاموش رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد حضرت نے خود ہی فرمایا کہ میاں صاحبزادے کس الجھن میں پڑے ہو۔ میں نے اس کو اگرچہ مخلصوں کی طرح توجہ دی ہے لیکن حق تعالیٰ کب مخلص اور منافق کو برابر رکھتا ہے۔ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کون مصلح ہے اور کون مفسد ہے۔ کام کی حقیقت خدا کے ہاتھ ہے۔ چنانچہ فیض مخلص دوستوں ہی کو پہونچتا ہے اور یہ قصہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ عبد اللہ بن اُبی بن سلول کا واقعہ ہے۔ کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان اقدس میں متعدد بار بے ادبی کی لیکن اس کے لڑکے حضرت عبد اللہ نے جو کہ مومن مخلص تھے۔ حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ اس کے جنازہ کی نماز پڑھائیں۔ اور اس کے لئے استغفار فرمائیں آپ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے حضرت عمرؓ نے روکا۔ اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ وہی شخص ہے جس نے فلاں دن ایسا کہا تھا اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی :۔

ان تستغفر لہم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لہم۔ آپ اگر منافقوں کے لئے ستر بار بھی استغفار کیجئے گا تو اللہ تعالیٰ انھیں نہ بخشے گا

بالآخر حضورؐ نے اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائی۔ اور مغفرت کی دعا بھی فرمائی مگر حق تعالیٰ نے قبول نہیں فرمائی اور یہ آیتہ نازل فرمائی۔

لَا تُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ۔ کسی منافق کی نماز جنازہ نہ پڑھیے اور نہ اُن کے قبر پر (دفن کفن کیلئے) کھڑے ہوجیے

ایک اور آیتہ نازل ہوئی۔

اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ۔ لن یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَهُمْ۔ "آپ منافقین کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں خدا ان کو ہرگز نہ بخشے گا" چنانچہ ان آیات کے نزول کے بعد پھر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کسی منافق کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ (ارشاد الطالبین صہ ۲)

یہ میں اعتقاد اور انکار کی بحث کر رہا ہوں۔ چونکہ مشائخ سے فائدہ اعتقاد سے ہوتا ہے اور اس کی زمانہ میں عموماً اور اس زمانہ میں خصوصاً بہت ہی کمی ہے۔ اس لئے میں نے اعتراض و انکار پر ذرا طویل کلام کیا ہے۔ کہ یہ بڑے ہی خسران کی چیز ہے اسی لئے

علماء نے شیخ کامل کی پہچان پر مفصل کلام کیا ہے۔

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ نے طریق تلاش پیر میں لکھا ہے کہ بزرگوں سے ملاقات کرتا رہے۔ لیکن کسی کا انکار عیب جوئی نہ کرے۔ مگر بدون تامل بسیار کسی سے بیعت بھی نہ کرے۔

انتخاب شیخ میں سب سے پہلی چیز جو لحاظ رکھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ استقامت شرع ہے کہ نہیں۔ چنانچہ جو شخص مستقیم الاحوال ہو اور پھر ولایت کا دعویٰ کرے اس کا دعوے صحیح ہے۔ لیکن دعویٰ پر دلیل بھی ہونی چاہیئے۔ چنانچہ اتباع شرع اور استقامت احوال کے ساتھ ساتھ خوارق دلیل ولایت بن سکتے ہیں۔ لیکن اقویٰ ترین دلیل وہ ہے جو حدیث میں آئی ہے۔ کہ اس کے دیکھنے سے خدا یاد آئے۔ اور قلب ماسوی اللہ سے سرد ہو جائے۔ لیکن اس قسم کی تاثیر کا احساس خواص تو ایک دو بار کی صحبت میں کر سکتے ہیں۔

لیکن عوام کے لئے کسی شیخ کی صحبت کی تاثیر کا اندازہ کرنا اول ہی دن دشوار ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے دوسرا طریقہ ہے وہ یہ کہ کسی عالم عادل عاقل سے دریافت کرے اور شیخ کی تاثیر کا حال معلوم کرے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ اہل علم سے سوال کرو۔ اگر تم کسی بات کو نہیں جانتے۔

اسی طرح حدیث شریف میں آیا ہے۔

اِنَّمَا شِفَاءُ الْعِیِّ السُّؤَالُ۔ مرض جہل کا علاج تو بس دوسرے سے پوچھنا ہے

لہٰذا اگر کوئی شخص کسی شیخ کے متعلق اس تاثیر کی شہادت دے اور وہ عادل بھی ہے یعنی جھوٹا نہیں ہے۔ اور نہ طالب جاہ و مال ہے اسی طرح سے عاقل بھی ہے کہ خطا اور حمق کے ساتھ بھی متہم نہیں ہے۔ تو اس کی تصدیق کرنی چاہیئے یہ تو ایک عادل کی شہادت کا حکم ہوا۔ اسی طرح اگر دو شخص گواہی دیں تو اور زیادہ غلبۂ ظن ہو جائے گا۔ اور اگر بکثرت لوگ اس بات کی گواہی دیں کہ روایت کا سلسلہ حد تواتر پہنچ جائے۔ پھر تو یقین ہی حاصل ہو جائے گا۔ لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ غلبۂ ظن بھی کافی ہے۔

دیکھئے علماء نے کسی چیز کو نہیں چھوڑا ہے۔ اس فن کو نہایت مرتب اور اور مہذب کر دیا ہے۔ لیکن یہ سب اصول کام کرنے والے کے لئے ہیں باقی جو کچھ کام کرنا ہی نہ چاہے اور کسی شیخ کے پاس یوں ہی جما رہے عقیدت تک اس سے درست نہ ہو تو اس طریقہ سے تو کبھی بھی کوئی کامیاب نہیں ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ عقیدت پر ایک اور قصہ سن لیجئے۔

حضرت ابراھیم خواصؒ فرماتے ہیں۔ کہ میں ایک دفعہ بغداد کی جامع مسجد میں مقیم تھا۔ وہاں میرے پاس سالکین کی ایک جماعت بھی موجود تھی اتنے میں ایک نوجوان نہایت حسین اور خوبصورت خوش پوشاک بہترین خوشبو لگائے ہوئے ہماری طرف آتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اپنے اصحاب سے کہا۔ کہ میرے قلب میں تو یہ بات آتی ہے کہ یہ یہودی ہے۔ سب نے میری اس بات کو ناپسند کیا۔ میں درمیان سے اٹھ کر چلا گیا۔ اور وہ جوان بھی چل دیا۔ لیکن پھر فوراً ہی واپس آیا اور ان سے پوچھا کہ شیخ نے ہمارے بارے میں کیا فرمایا ہے۔ سب لوگ اس کی ظاہری وجاہت سے مرعوب ہو کر خاموش رہے۔ لیکن جب ان سے اس نے پھر پوچھا کہ شیخ نے کیا فرمایا ہے۔ تو لوگوں نے کہا کہ وہ یہ فرما رہے تھے۔ کہ تم یہودی ہو۔ حضرت ابراھیمؒ کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ شخص میرے پاس آیا اور میرے ہاتھوں پر اپنا سر رکھ دیا۔ اور مسلمان ہو گیا۔ لوگوں نے اس سے اس کے اسلام کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہے۔ کہ صدیق کی فراست کبھی خطا نہیں کرتی۔ تو میں نے سوچا کہ مسلمانوں کے اندر دیکھنا چاہیئے۔ پھر میں نے غور کیا تو یہ سمجھ میں آیا کہ اگر صدیق مسلمانوں میں ہوتے ہیں تو پھر وہ گروہ صوفیا ہی میں ہوں گے۔ اس لئے کہ یہی لوگ خدا کی باتیں زیادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے تم پر اپنا حال ملتبس کیا۔ لیکن جب شیخ نے اپنی فراست سے مجھے تاڑ لیا۔ تو میں نے سمجھا کہ بلاشبہ یہ صدیق ہیں۔ چنانچہ یہی جوان بعد میں مشائخ کبار میں سے ہوا۔

یہ تو آپ نے مشائخ کے یہاں آنے جانے والوں کا حال دیکھا۔ اب یہ بھی سنئے۔ کہ علماء طریقت لکھتے ہیں کہ۔

الولی قد یکون مشهوراً ولکن لا یکون مفتوناً۔ (قشیریہ)

ولی جس طرح مخفی اور پوشیدہ ہوتا ہے اسی طرح کبھی مشہور بھی ہو جاتا ہے لیکن وہ مفتون نہیں ہوتا۔

اور مفتون نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی شہرت اس کے حق میں بھی بابرکت ہوتی ہے۔ اور دوسروں کو بھی اُس نفع پہنچتا ہے۔ جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ لوگوں میں اس کی شہرت اور آنے جانے والوں کی کثرت کی وجہ سے یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے معمولات اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں سست ہو جائے۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے کام میں بدستور لگا رہتا ہے۔ اور متبعین کی زیادتی کی وجہ سے اسکا عمل اور ثواب اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ جتنے لوگ اُس کی وجہ سے صحیح راستہ پکڑتے ہیں۔ ان سب کے اعمال کا ثواب اس کو بھی ملتا ہے اور اُسکا بابرکت ہونا ظاہر ہے۔ اور یہ برکت شہرت ہی کی وجہ سے اُسے ملی۔ لیکن کبھی اس کے خلاف بھی ہو جاتا ہے۔ کہ کوئی شخص مشہور ہوا۔ اور اس کی شہرت کے سبب عوام الناس نے اس کے تمام اوقات پر قابو پا لیا۔ اور اُس سے نفع تو کیا حاصل کرتے۔ اور اُس کے مقام تک تو کیا پہنچتے خود اسی کو اپنے مقام تک اتار لاتے ہیں۔

بزرگوں نے اس سلسلے میں عبرت کے عجیب و غریب واقعات بیان فرمائے ہیں۔ اور شیخ اکبرؒ نے تو یہ لکھا ہے۔ کہ

"وَقَدْ رَأَیْنَا شیوخاً سقطوا"

ہم نے بہت سے مشائخ کو دیکھا ہے کہ وہ مقام شیخت سے ساقط ہو گئے ہیں

— تمام شد —

عہ ارباب عقل و کیاست و اصحاب مروت و عدالت اند نہ ارباب غفلت و سفاہت و اصحاب فجور و وقاحت۔ بلکہ اگر نیک تامل کنی دریابی کہ محبت امثال ایں کرام خود شعار ایمان و محبت و علامتِ تقویٰ اوست۔ و ذٰلک ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب۔

وبغض اشباہ ایں عظام امارت نفاق مبغض و نشان شقاوت اوست کہ لا یحبہ الا مؤمن تقی ولا یبغضہ الا منافق تقی اشارتے بایں معنی رفتہ۔

(صراط المستقیم صـ۳۷)

یعنی پس صلحاء میں سے جو شخص بھی اس کو دیکھتا ہے یا اس کے پاس بیٹھتا ہے یا اس کے حال و کمال پر مطلع ہوتا ہے تو بلاشبہ تہ دل سے اس کو دوست رکھتا ہے اور اس کے علوم اور اس کی کہی ہوئی باتوں کو صمیم قلب سے تسلیم کرتا ہے۔ بلکہ یہاں تک ہوتا ہے کہ اس کی ہر چال ڈھال اور طور و طریقہ پر شیدا اور فریفتہ ہو جاتا ہے حالانکہ وہی چیزیں اگر کسی دوسرے کے اندر پائی جائیں تو اس جانب اس کو اصلا التفات نہیں ہوتا معلوم ہوا کہ اس کلام سے یہی بتلانا مقصود ہے کہ عوام کو ایسے شخص سے محبت تام ہو جاتی ہے کیونکہ اس کو اللہ والا جانتے ہیں اور حدیث شریف میں بھی ان کے بارے میں آیا ہے کہ ـــــ تم لوگ روئے زمین میں خدائی گواہ ہو اور یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ شاہد اور گواہ، عقلاء اور سمجھ دار اور اہل مروت اور ارباب عدالت ہی کو بنایا جاتا ہے۔ نہ کہ ارباب غفلت اور کم فہموں اور فاسق و فاجر اور بے شرموں کو۔ بلکہ اگر بغور دیکھو گے تو سمجھ لوگے کہ خود ایسی بزرگ ہستیوں کی محبت، شعار ایمان و محبت اور علامت تقویٰ ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ـــــ سن لو کہ جو شخص دین خداوندی کی یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو ان کا یہ لحاظ رکھنا خدا تعالیٰ سے دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے۔ اور ان جیسی مقتدر ہستیوں سے بغض و عناد رکھنا اور ان پر انکار و اعتراض کرنا اس شخص کے نفاق کی علامت اور اس کی شقاوت کی نشانی ہے کیونکہ حدیث شریف میں یہ جو آیا ہے کہ ان سے محبت نہیں کرے گا مگر مومن متقی۔ اور ان سے بغض نہیں رکھے گا مگر منافق شقی تو اس سے اس کی جانب بھی اشارہ نکلتا ہے۔

"اضافہ از ناقل"

عہ صفحہ ۷۰ کا بقیہ

عِلم کی ضرورت

از افادات

مُصلح الامّت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب
نور اللہ مرقدہ

رسالہ ہذا کے متعلق مُدیر صدق جدید کا

اظہارِ خیال

یہ ایک دینی و علمی مقالہ ہے جو مولانا شاہ وصی اللہ صاحب (خلیفہ حضرت تھانویؒ) نے قومی لائبریری الہ آباد کے افتتاحی جلسہ میں ارشاد فرمایا تھا۔ خلیفہ میں شیخ کا رنگ ہونا قدرتی سا ہے۔ چنانچہ اس مقالہ سے مواعظ اشرفی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ علم سے مولانا کی مراد قدرۃً علم دین ہی سے ہے اور مقالہ دیندار حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کے قابل ہے۔ البتہ اسکے صفحہ ۱۶ پر اس شعر ؎

علم رسمی سربسر قیل است و قال — نے از و کیفیتے حاصل نہ حال

کا جو انتساب حضرت رومیؒ کی طرف کیا گیا ہے۔ یہاں مولانا کو تسامح ہو گیا ہے۔ شعر رومیؒ کا نہیں شیخ بہاء الدین عاملی کی مثنوی نان و حلوا کا ہے۔

صدق جدید لکھنؤ

۱۱ر دسمبر ۵۹ء

پیشِ لفظ

دورِ حاضر میں نشر و اشاعت کی دشواریاں اسقدر بڑھ گئی ہیں کہ اُنکا پورا کرنا مشکل ہے۔ شکر ہے کہ ان حالات کے باوجود ادارہ انیس اُردو الہ آباد نے یہ مبارک قدم اُٹھایا ہے تاکہ نئی نسل اپنے ادبی و علمی شعور میں اضافہ کر سکے۔

مولانا شاہ وصی اللہ صاحب مدظلہ کے حالیہ علمی بلند پایہ مقالہ سے یہ مبارک سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ مولانا موصوف نے یہ مقالہ قومی لائبریری الہ آباد کے ہال میں بتاریخ ۲۵ر جنوری بوقت ۸ بجے صبح پڑھا جس نے نہ صرف یہ کہ حاضرین کو متاثر کیا بلکہ غور و فکر کے نئے گوشے بھی عطا کئے۔ اُمید ہے کہ جس خلوص نیت سے اس انجمن نے نشر و اشاعت کے اس سلسلہ کا آغاز کیا ہے اسی وسعت قلب سے ہمارے جذبات کی ہمت افزائی بھی کی جائے گی۔

سکریٹری نشر و اشاعت

ادارۂ انیس اُردو

۲۲۔ چوک۔ الہ آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

رسالہ نافعہ مسمٰی بہ

علم کی ضرورت

میں اپنے مضمون کی ابتدا اس حدیث شریف سے کرتا ہوں۔

"قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" انما الاعمال بالنیات وانما لامرئ مانوی فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ماھاجر الیہ۔ (متفق علیہ)

ترجمہ ۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر شخص کے لئے وہی ہے جیسی اس کی نیت ہو چنانچہ جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف ہے تو اس کی ہجرت واقعی اللہ اور رسول ہی کی جانب ہے باقی جس کی ہجرت دنیا کے لئے ہے تاکہ وہ اس کو مل جائے یا کسی عورت کے لئے جس سے وہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو ایسے شخص کی ہجرت (اللہ و رسول کی طرف نہیں ہے بلکہ) اسی کے لئے ہے جس کے لئے اس نے ہجرت کی ہے۔ (یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے)

قال اللہ تعالیٰ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم۔

وقال علیہ الصلوٰۃ والسلام اُغْدُ عالماً او متعلماً او مستمعاً او محباً ولا تکن الخامسۃ والخامسۃ ان یُبغض العِلمَ واھلَہٗ۔

حاضرین کرام! اس وقت میں نے آپ کے سامنے قرآن حکیم کی ایک آیت یعنی اللہ تعالیٰ کا ایک ارشاد۔ اور دو حدیثیں یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو فرمان پیش کئے ہیں۔

آیت کا ترجمہ یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ یہ فرما دیجئے کہ کیا برابر ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے۔ یہ استفہام انکاری ہے مطلب یہ ہوا کہ اہل علم اور غیر اہل علم دونوں برابر نہیں ہیں۔

اور پہلی حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ علم سے مراد یہاں علم دین ہے۔

اور دوسری حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ عالم ہو جاؤ یا متعلم بنو یا علم کی باتوں کے سننے والے رہو یا (کم از کم) اس کے محبین ہی میں سے ہو جاؤ اور پانچویں قسم مت ہونا اور وہ پانچویں قسم یہ ہے کہ علم اور اہل علم سے بغض اور عداوت رکھنے والا ہو جائے۔

آیت اور احادیث کا ترجمہ سن کر آپ نے یہ بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ میرا موضوع کلام "علم" ہے یعنی اسوقت میں علم کی ضرورت اور اس کی فضیلت کو ایک نئے عنوان سے بیان کرنا چاہتا ہوں اور چونکہ قاعدہ ہے کہ کُلُّ جَدِیدٍ لَذِیذٌ ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے اس لئے امید کرتا ہوں کہ آپ حضرات بھی اس سے محظوظ ہوں گے۔

علماء معقول فرماتے ہیں کہ علم کا مفہوم محتاج شرح و بیان نہیں ہے اس لئے کہ وہ نہایت ہی واضح بلکہ اجلیٰ بدیہیات میں سے ہے جس سے نہ صرف عاقل انسان ہی بلکہ بُلہ اور صبیان یعنی بچے اور نادان سب ہی واقف ہیں۔ لہذا جس طرح سے علم کا مفہوم بالکل واضح اور ظاہر ہے اسی طرح سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کی فضیلت اور اس کے رتبہ اور مقام سے بھی شاید ہی کوئی ناواقف ہوگا کیونکہ علم ایک نور اور روشنی ہے۔ جہل ظلمت اور تاریکی ہے۔ نور کا ظلمت سے افضل ہونا اور روشنی کا تاریکی سے بہتر ہونا کون نہیں جانتا؟

خیر علم کی یہ فضیلت تو آپ کی بارہا کی سنی سنائی ہوگی۔ اس لئے میں اس وقت آپ کے سامنے علم کی اہمیت کو ایک دوسرے ہی عنوان سے بیان کرتا ہوں لیکن اس سے پہلے آپ کے سامنے ایک اور چیز بھی پیش کرنا چاہتا ہوں جس کو چاہئے تو تمہید سمجھ لیجئے باقی آپ اس سے مانوس اور مالوف بھی ہیں اور اس کی بحث اس وقت دنیا کا ایک اہم ترین مسئلہ بھی بنا ہوا ہے۔ اور وہ ہے مال۔ علم کے ساتھ مال کا جوڑ شائد آپ کو ناپسند ہو لیکن میں نے ایک ضرورت سے اس کو لیا ہے اس لئے آپسے بھی

اس کی اجازت چاہتا ہوں۔ نیز یہ کہ عام طور پر تو یہی دیکھا جاتا ہے کہ آج تحصیل علم کی واحد غرض حصول مال ہی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس علم کا مآل اور انجام مال ہوتا ہے اس کی جانب تو لوگوں کی توجہ زیادہ ہوتی ہے اور جس علم سے مال نہیں ملتا چاہے اس سے مآل یعنی آخرت کیوں نہ درست اور رضائے الٰہی کیوں نہ حاصل ہو اس کی جانب رغبت کم کی جاتی ہے۔

بہر حال اس دنیا میں دونوں چیزوں کی ضرورت ہے اور یہ دونوں ہی چیزیں نہایت اہمیت رکھتی ہیں یعنی مال اور علم۔

مال کی دنیا میں کس قدر ضرورت ہے؟ یہ تو اظہر من الشمس ہے کیوں کہ انسان کے لئے مال قوام زندگی ہے اس کے بغیر دنیا کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ قال اللہ تعالیٰ۔ ولا تؤتوا السفھاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاماً ۰

اور یہ اس لئے کہ ہمارا کھانا پینا پہننا۔ مکان۔ اثاث البیت غرض کہ ہماری تمام ہی ضروریات زندگی کی تحصیل کا ذریعہ مال ہے۔ لہٰذا مال کی تو اس دنیا میں قدم قدم پر ضرورت ہے۔ اس کی ضرورت کا تو کوئی بھی منکر نہیں ہے نہ کوئی عالم اس کا انکار کرسکتا ہے اور نہ کوئی جاہل اس کا منکر ہوسکتا ہے حتیٰ کہ دین اور مذہب نے بھی اس کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے بلکہ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اسلام میں مال حاصل کرنے کی ترغیب موجود ہے تو غلط نہ ہوگا۔

یہاں میں چند روایات پیش کرتا ہوں جو میرے مدعا پر شاہد عدل ہیں۔ طوالت کے خیال سے الفاظ حدیث نہیں بیان کرتا بلکہ صرف ان کے ترجمہ پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) حضرت عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلوا بھیجا میں حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ کپڑے پہن کر اور ہتھیار سج کر آؤ۔ میں نے تعمیل حکم کی اور پھر حاضر ہوا اس وقت آپ وضو فرما رہے تھے پہلے تو آپ نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر فرمایا کہ اے عمرو! میرا یہ خیال ہے کہ تم کو ایک لشکر پر سردار بنا کر بھیجوں تاکہ اللہ تعالیٰ تمھیں مال غنیمت عطا فرمائیں اور خدا کرے تم صحیح وسالم رہو اور مجھے تمھارے لئے مال میں رغبت صالحہ ہے (یعنی میرا جی ہی چاہتا ہے کہ تمھارے پاس مال دیکھوں) حضرت عمرو کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں مال کی خاطر تو مسلمان ہوا نہیں ہوں۔ میں نے تو اسلام کی خاطر اسلام قبول کیا ہے اور اس لئے مسلمان ہوا ہوں کہ (دنیا و آخرت میں) آپ کی معیت مجھے نصیب رہے آپ نے فرمایا یا عمرو نعمّا بالمال الصالح للرجل الصالح یعنی اے عمرو!

انسان اگر نیک و صالح ہو اور مال بھی اس کو صالح و طیب ملے تو پھر "صالح شخص کے لئے صالح مال کیا ہی اچھی چیز ہے"

دیکھئے اسمیں مال حلال کی ترغیب موجود ہے۔

(۲) ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ من اخذ بحقہ فنعم المعونۃ ھو یعنی جو شخص اس مال کو اس کے حق کے ساتھ لے یعنی جائز طریقوں سے اس کو حاصل کرے اور صحیح مصرف میں اس کو صرف کرے تو یہ ایک اچھا معین اور عمدہ مددگار ہے۔

(۳) ایک اور حدیث سنئے۔ حضرت سعید بن جبیرؓ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں دنیا کو جو متاع غرور فرمایا گیا ہے تو یہ جب ہے کہ یہ طلب آخرت سے انسان کو روک دے لیکن اگر یہی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی جانب داعی ہو اور آخرت کا ذریعہ بنے تو پھر یہی نعم المتاع ونعم الوسیلۃ بھی ہے یعنی نہایت ہی عمدہ برتنے کی چیز اور بہت ہی خوب وسیلہ ہے۔ (روح پ۲۰ ص۱۶۰)

آپ کے سامنے میں نے مال کی محمودیت کو احادیث سے ثابت کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ بات بھی آپ کو نئی سی معلوم ہو اس لئے کہ دنیا اور مال کے متعلق مشہور تو یہی ہے کہ دین میں اُن کی مطلقاً گنجائش ہی نہیں ہے بلکہ یہ امور دین کے بالکل منافی ہیں۔ میں نے اسی غلط فہمی کے ازالہ کے لئے اس بحث کو کچھ طول بھی دیدیا ہے۔ اگر اس علمی مجلس میں آپ کی معلومات میں بھی اضافہ ہو جائے تو اس میں آپ کا حرج ہی کیا ہے۔

اب اس کے بعد یہ بھی سمجھ لیجئے کہ آخر یہ غلط فہمی ہوئی کہاں سے! بات یہ ہے کہ دین کے پیش نظر مقصودیت کے درجہ میں تو صرف آخرت ہے اور دنیا کی حیثیت دین کی نظروں میں صرف وسیلہ کی سی ہے تو اگر کسی نے دنیا سے ایسا تعلق رکھا جو کہ دین کے لئے معین ہو تو اس وقت یہ دنیا بھی نعم المعونۃ اور نعم المتاع ونعم الوسیلۃ۔ اور نعم المال الصالح للرجل الصالح کا مصداق ہوگی لیکن اگر کسی نے دنیا کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف اور آخرت سے دور کرنے والے طریق میں استعمال کیا تو بیشک اس دنیا کی تو مذمت ہی کی جائے گی اور اس سے احتراز کیا جائے گا جیسا کہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ:

ھی لین مسّھا قاتل سمّھا۔ یعنی یہ دنیا ایسی ہے کہ اس کا مس یعنی (مس) کا چھونا تو نرم ہے اور اس کا سّم یعنی اس کا زہر تو قاتل ہی ہے (مس اور سم کی لطافت ملاحظہ ہو)

اس میں تصریح ہے کہ مال اور دنیا میں دونوں ہی پہلو ہیں یعنی ایک حیثیت سے اگر یہ قابل مدح چیز ہے تو دوسرے اعتبار سے مستحق ذم بھی ہے۔ لیکن ذم کا اصل منشا اس کا سوء استعمال ہے ورنہ تو نفس دنیا کوئی قابل مذمت اور نفرت کی چیز نہیں ہے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ:۔

دنیا کی مذمت جو شریعت میں وارد ہے تو اس کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ وہ صرف ضرورۃً ہی آئی ہے ورنہ تو یہ ایک اچھی جگہ بھی ہے اس شخص کے لئے جو اس میں رہ کر اپنی آخرت کے لئے توشہ تیار کرے۔ (روح ص۸۵ ج۱۰) -

خیر یہ بحث تو درمیان میں آگئی تھی۔ میں بیان یہ کر رہا تھا کہ مال کی اس دنیا میں کسقدر ضرورت ہے اور ہماری دینوی زندگی میں اس کو کتنی اہمیت حاصل ہے جب یہ بات ذہن نشین ہوگئی تو اب سمجھئے کہ ایک اور چیز بھی ہے جس کا درجہ اس سے بھی بڑھا ہوا ہے اور اس کی اہمیت مال سے کہیں زیادہ ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ مال کے لئے بمنزلہ علت کے ہے تو بیجا نہ ہوگا سن لیجئے کہ وہ شے علم ہے۔

علم اگر نہ ہو تو انسان مال جیسی ضرورت کی چیز سے نفع ہی نہیں حاصل کرسکتا کیوں کہ علم نہ ہونے کی وجہ سے اوّل تو وہ اس کے اکتساب کے طریقوں سے ہی ناواقف رہے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مال کما ہی نہ سکے گا اور اس سے محروم رہے گا۔

اور اگر کسی طرح سے اس کو مال مل بھی گیا اور یہ جاہل ہوا تو اس کی حفاظت اس کے لئے آسان نہ ہوگی کیوں کہ اس کے لئے بھی علم درکار ہے لہٰذا انجام یہ ہوگا حاصل شدہ مال اور جمع کیا ہوا خزانہ اس کی جہالت کے نذر ہوکر ضائع اور ہلاک ہو جائے گا۔

اسی طرح سے اگر مال بالفرض ہوا اور کسی طرح سے اس کی حفاظت بھی کرلی گئی لیکن علم نہ ہونے کی وجہ سے اس کے مواقع استعمال، خرچ کی جگہ حدود انفاق سے ناواقف رہا تو بھی مال ایسے شخص کے حق میں وبال ہی ثابت ہوگا۔ کیوں کہ دنیا میں بھی یہ شخص ساری عمر بدنظمی اور بدانتظامی کا شکار رہے گا اور آخرت میں اس امانت کے ضیاع کی بازپرس ، اس سے الگ ہوگی۔

الغرض مال کے لئے اول بھی علم کی ضرورت ہے اور درمیان اور آخر میں بھی علم کی حاجت ہے اسی کو میں نے کہا تھا کہ علم مال کے لئے بمنزلہ علت کے ہے اور ان دونوں میں تعلق علت و معلول کا ہے۔ علم علت ہے اور مال اس کا معلول ہے اور علت بھی ایسی کہ معلول اپنے وجود کے علاوہ بقاء و قیام میں بھی جس کا محتاج ہو کیوں تحصیل مال میں بھی علم کی ضرورت ہے اور اسکے تحفظ

اور استعمال میں بھی علم کی حاجت ہے اور جس منزل میں بھی آدمی علم سے عاری اور خالی ہوگا مال یا تو اسکا ساتھ چھوڑ دے گا یا اس پر وبال ہو جائے گا۔

یہاں پر ایک بات اور سن لیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو پیدا فرمایا تو عام طور سے علت تخلیق "قدرت" کو سمجھا جاتا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ چونکہ قادر مطلق ہے اس لئے اپنی قدرت سے اس عالم کو وجود عطا فرمایا لیکن ارباب نظر جانتے ہیں کہ قدرت سے بھی مقدم ایک اور چیز ہے جو کہ منشا بنتی ہے استعمال قدرت کا اور وہ ہے حق تعالیٰ کا علم لہٰذا تخلیق کی علت قدرت سہی مگر علم اس کے لئے بمنزلہٗ عِلّۃُ العِلَل کے ہے اس لئے اس کا مقام قدرت سے بھی اقدم ہے۔ اسی طرح سے ممکنات میں دیکھئے کہ کوئی شخص کسی کو کھانے میں زہر دیدیتا ہے تو اس کھانے والے کو قدرت تو اس کی ہوتی ہے کہ اس کھانے ہی کو نہ کھائے لیکن علم نہ ہونے کی وجہ سے اس سے اپنی قدرت کا سوء استعمال ہو جاتا ہے۔

یہی حال مال کا بھی ہے کہ اگر آدمی میں علم نہیں ہے تو وہ مال کا بھی سوء استعمال کرے گا یعنی اس کے آمد و خرچ کے مواقع اور طریقوں سے جب ناواقف ہوگا تو کبھی دوسروں پر ظلم کر کے مال کو حاصل کرے گا۔ کبھی غیروں کی حق تلفی ہو جائے گی کبھی ناجائز ذرائع اختیار کرے گا اور کبھی بے محل اسکا استعمال کرے گا ــــ اور یہ سب چیزیں خلق و خالق سب کے نزدیک مذموم ہیں۔

اسی طرح کبھی یہ بھی ہوگا کہ علم نہ ہونے کی وجہ سے مال کو اس کے مرتبہ سے بڑھا دے گا مثلاً یہ کہ مال کی جگہ انسان کی جیب یا اس کا بکس ہے اور یہ اس کو اپنے دل میں رکھے گا جو کہ یقیناً حد سے تجاوز ہے ــــ یا مثلاً عقل کے نزدیک اس کی حیثیت خادم اور غلام کی سی ہے اور یہ شخص اسکو اپنا تابع رکھنے کے بجائے اس کو اپنے اوپر حاکم بنائے گا اور خود اس کا محکوم ہو جائے گا جو کہ صریح قلب موضوع ہے اور بالکل اس کا مصداق ہے کہ ؎

کان مملوکی فاضحیٰ مالکی　　　اِنَّ ھذا من اعاجیب الزمن

یعنی وہ تھا تو میرا مملوک لیکن ہو گیا میرا مالک یہ بھی اعجوبہ روزگار میں سے ہے اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص اپنے غلام پر عاشق ہو گیا تھا جب غلام کو اس امر کا احساس ہوا تو وہ ناز و انداز کرنے لگا اور اس کو پریشان کرنے لگا اس پر اس شخص نے کہا کہ ؎

کان مملوکی فاضحیٰ مالکی　　　ان ھذا من اعاجیب الزمن

یعنی دیکھو تو سہی یہ ظالم میرا مملوک تھا میں اس کا مالک تھا یہ میرا محکوم تھا میں اس کا حاکم تھا

لیکن اب یہ میرا حاکم اور مالک ہوگیا ہے اور میں اس کا محکوم و مملوک ہوگیا ہوں۔ یہ بھی کیسی عجیب بات ہے۔

اسی طرح مال بھی جو کہ تابع اور مملوک رکھنے کی چیز ہے انسان جب علم سے کورا ہوتا ہے تو اسے بھی اپنا حاکم بنا لیتا ہے اور خود اس کا تابع اور محکوم ہو جاتا ہے جیسا کہ ارباب بصیرت پر مخفی نہیں ہے۔

جانتے ہیں آپ کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ جہالت کا کرشمہ ہے آدمی جب کسی چیز کی حقیقی حدود اور اس کے صحیح مقام سے واقف ہوتا ہے تو پھر اس سے اس قسم کی بدعنوانیاں نہیں ہوتیں۔

غرض کہ مال جس کی شان یہ ہے کہ وہ عقل تک کو سرگشتہ کر دیتا ہے اگر اس کی درستی اور اصلاح کسی چیز سے ہو سکتی ہے تو وہ یہی علم ہے۔

مولانا روم رح اسی مضمون کو مثنوی میں بیان فرماتے ہیں کہ ؎

زر خرد را والہ و شیدا کند خاصہ مفلس را کہ خوش رسوا کند

یعنی مال عقل کو سرگشتہ اور شیفتہ کر دیتا ہے اور خصوصاً مفلس کو کہ اس کی تو بری گت بناتا ہے یعنی وہ بہت جلد حرص میں پھنس کر ذلیل و رسوا ہوتا ہے ـــــ آگے فرماتے ہیں کہ ؎

زر اگرچہ عقل می آرد ولیک مرد عاقل باید اوراں نیک

یعنی گو مال و زر عقل کو بھی بڑھاتا ہے مگر اس سے ہر شخص کی عقل نہیں بڑھتی بلکہ اسکے لئے بڑے عاقل کی ضرورت ہے جو کہ مال کو اچھے موقع پر صرف کرے اور اپنے دین کا معین و خادم اس کو بنا سکے اور یہ بدون علم کے نہیں ہو سکتا۔

دیکھئے اس سے بھی معلوم ہوا کہ مال کا نفع گو از دیاد عقل ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو بدون علم کے میسر نہیں ہوتا۔

بس یہی بات میں اس وقت آپ سے کہنا چاہتا تھا کہ علم کی ضرورت اور اس کی فضیلت اس کی اہمیت اور اس کا مقام معلوم کرنا چاہتے ہیں تو اس نظر سے دیکھئے کہ آج کی دنیا میں مال کا جو درجہ ہے اور ہماری دنیوی زندگی میں اس کی جو حیثیت ہے ظاہر ہے تو اس مال کا حاصل کرنا۔ اس کا تحفظ اور بقا اور اس کا حسن استعمال بھی علم ہی پر موقوف ہے پھر جب علم اس قدر ضروری چیز (یعنی مال) کا موقوف علیہ اور علت ہوا تو خود اس کے مقام کا پوچھنا ہی کیا ہے۔

عقلی طور پر علم کا یہ مرتبہ جاننے کے بعد اب علم کا مقام دینی اعتبار سے بھی ملاحظہ فرمائیے دین میں دو چیزیں ہیں عبادت اور علم۔ آپ اس سے ناواقف نہ ہوں گے کہ قرآن حکیم میں جن اور انس کے پیدا کئے جانے کا مقصد ہی عبادت کو قرار دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ:۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ ہم نے جن اور انس کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ ہماری عبادت کریں۔

گویا دینی اعتبار سے یہ دنیا اور اس دنیا کی تمام چیزیں ہمارے جینے کے لئے ہیں اور جینا ہمارا عبادت کی خاطر ہے۔ ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرۃ دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے لیکن تمہاری پیدائش آخرت کے لئے۔

اسی مضمون کو حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است		تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

یعنی کھانا زندگی اور خدا کی یاد کرنے کے لئے ہے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمارا جینا صرف کھانے کے لئے ہے۔

دیکھئے دینی حیثیت سے "عبادت" کا مقام کس قدر بلند ہے لیکن جہاں یہ ہے وہیں یہ بھی ثابت ہے کہ "علم دین" کا مرتبہ "عبادت" سے بھی بڑھا ہوا ہے۔

دیکھئے تخلیق عالم کے بعد خلافتِ آدمؑ کا مسئلہ قرآن شریف میں مذکور ہے اس کی تفصیلات ملاحظہ کرنے کے بعد اس امر میں ذرا پوشیدگی نہیں رہ جاتی کہ خلافت کے باب میں حضرت آدمؑ کی ملائکہ پر ترجیح کا باعث جو امر بنا وہ ان کا علم ہی تھا چنانچہ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ میں تو تصریح ہی ہے کہ آدمؑ کے علم ہی نے ان کو مستحق خلافت ٹھہرایا یعنی صفت علم جو کہ قدرت پر بھی مقدم ہے جب آدم علیہ السّلام اس میں نائب حق ثابت ہو گئے تو پھر خلیفۃ اللہ فی الارض کے بھی وہی اہل قرار دے گئے۔

علم کی فضیلت اور اس کا صحیح مقام بیان کرنے کے سلسلہ میں جی چاہتا ہے کہ حضرت علامہ علی متقیؒ کا کلام آپ کے سامنے نقل کر دوں جو متعدد فوائد اور بیشتر معلومات پر مشتمل ہے۔ ان کی عبارت عربی ہے میں یہاں صرف اس کا ترجمہ پیش کرنا ہوں فرماتے ہیں کہ:۔

"محققین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اعمال میں سب سے افضل عمل وہ ہے جو آخرت میں کام آئے جنھیں قرآن کریم میں "باقیات صالحات" سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اور

حدیث شریف میں سات چیزوں سے انھیں شمار کیا ہے اور وہ یہ ہیں۔
تعلیم یعنی علم پڑھانا۔ نہر جاری کرنا۔ کنواں کھدوا دینا۔ پھل دار درخت لگانا۔ مسجد تعمیر کرانا۔ قرآن شریف کسی کو دینا۔ اور ولد صالح چھوڑ جانا۔ لیکن ان سب میں بڑھکر نشر علم ہے اس لئے کہ وہ باقی رہنے والی چیز ہے کیوں کہ درخت اور کنواں مثلاً کچھ مدت کے بعد ختم ہو جاتے ہیں اور علم کا اثر تا قیام قیامت باقی رہتا ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ:-
پھر اس نشر علم کے بہت سے طریقے ہیں مثلاً کسی کو پڑھا دیا اور اس طرح سے سلسلہ بہ سلسلہ علم چلتا رہا۔ یا کتابیں کسی ادارے میں وقف کر دیں یا کسی کو بطور عاریت کے استعمال کو دیں تو یہ سب بھی نشر علم میں داخل ہے۔ یا کتاب نہیں بلکہ کاغذ۔ قلم۔ دوات دے دیا یہ بھی اسی شمار میں ہے۔ اور سب سے عمدہ اس باب میں عوام الناس کی تعلیم ہے یا بچوں کو ابتدا سے پڑھانا تا آں کہ وہ تمام علوم و فنون کو حاصل کرکے فارغ ہو جائیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایک درخت لگائے جس میں سے خوب شاخیں پھوٹیں اور اس پر خوب پھل آویں چنانچہ کسی طالب علم کو کاغذ دینا ایسا ہے جیسے کہ اس کو ایک زمین ہبہ کر دی ہو۔ اور روشنائی کا دینا ایسا ہے جیسے اس کو بیج دیا اور قلم دینے کی مثال ایسی ہے جیسے اس کیلئے ہل وغیرہ کا انتظام کر دیا ہو۔
آگے حضرت علی متقیؒ فرماتے ہیں کہ:-
تعلیم اور تعلم کی فضیلت پر یہ حدیث بھی دال ہے کہ:-
جو عالم صرف نماز پڑھ لیتا ہو اور اس کے بعد علم کی مجلس میں بیٹھ کر لوگوں کو خیر اور بھلائی سکھلاتا ہو اس کی فضیلت اس عابد پر جو دن کو روزے رکھتا ہو اور رات کو نمازیں پڑھتا ہو ایسی ہے جیسی کہ میری فضیلت تم میں سے کسی ادنیٰ شخص پر ہے۔
اسی حدیث کی مناسبت سے درمیان میں ایک اور حدیث ترمذی شریف کی بھی سن لیجئے اور پھر اس کی شرح جو صاحب نفع قوت المغتذی نے بیان فرمائی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیے حدیث شریف میں ہے کہ۔

فضل العالم علی العابد کفضل القمر علی سائر الکواکب۔ (ترمذی شریف)
یعنی عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر۔
اس کے تحت نفع قوت المغتذی میں ہے کہ۔

قال البیضاوی العبادۃ کمال و نور لازم لذات عابد فلا یتخطاہ فاشبہ نور الکواکب والعلم کمال اوجب العالم شرفاً فی نفسہ و فضلاً یتعداہ لغیرہ فیستضئی بنورہ و یکمل بواسطتہ لکنہ کمال لیس للعالم من ذاتہ بل نور یتلقاہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلہ شبہ بالقمر۔

(نفع قوت المغتذی)

بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ عبادت انسان کا ایک ایسا کمال اور نور ہے جو کہ ذات عابد کے ساتھ لازم رہتا ہے اس سے تجاوز نہیں کرتا لہذا یہ ستاروں کے نور کے مشابہ ہے اور علم ایک ایسا کمال ہے جو خود عالم کے نفس میں شرف اور فضل پیدا کر دیتا ہے اور غیروں تک متعدی ہوتا ہے چنانچہ وہ غیر بھی اس عالم کے نور سے منور اور اس کے واسطے سے کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ علم چونکہ ایسا کمال نہیں جو عالم کا ذاتی ہو بلکہ یہ ایک نور ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ اور حاصل کیا جاتا ہے یعنی ان کی مشکوٰۃ نبوت سے ملتا ہے لہذا اس کو مشابہت قمر سے دی گئی ہے کہ اس کا نور بھی ذاتی نہیں ہے بلکہ شمس سے مستفاد ہے۔

قال الطیبی فلا تظن ان العالم المفضل عار عن عملہ ولا العابد عن علم بل ان علم ذلک غالب علی عملہ وعمل ذلک غالب علی علمہ ولذا جعل العلماء ورثۃ الانبیاء الذین فازوا بالحسنیین العلم والعمل وحازوا افضلیتین الکمال والتکمیل فہذہ طریقۃ العارفین باللہ وسبیل السائرین الی اللہ۔

(حوالہ الا)

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہاں جو عالم کو عابد پر ترجیح دی ہے گئی ہے تو یہ مت سمجھو کہ جس عالم کو فضیلت دی جارہی ہے وہ عمل سے بالکل ہی کورا ہے اور وہ عابد جس پر فضیلت دی جارہی وہ علم سے بالکل بے بہرہ ہے یہ بات نہیں ہے بلکہ اس عالم کا علم اس کے عمل پر غالب ہے اور اس عابد کا عمل اس کے علم پر غالب ہے۔ اسی لئے علماء جو ورثۃ الانبیاء

قرار دیئے گئے تو مراد اس سے وہ علماء ہیں جنھوں نے علم و عمل دونوں کو جمع کیا ہے اور کمال اور تکمیل دونوں فضیلتوں کے حامل ہوئے ہیں چنانچہ عارفین باللہ اور سالکین الی اللہ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ علم و عمل دونوں ہی کے جامع ہوتے ہیں۔

نیز یہ حضرات جب علم کا لفظ بولتے ہیں تو مراد ان کی اس سے علوم حقیقی ہوتے ہیں باقی رسمی اور رسائی علم کا ان حضرات کے یہاں کوئی درجہ نہیں ہے چنانچہ نفقہ فی الدین کی شرح میں یہی صاحب نفع قوت المغتذی لکھتے ہیں کہ:۔

قال التور بشتی حقیقة فقه فی الدین ما وقع بالقلب فظهر علی لسانه فافاد علماً واورث خشیة وتقویٰ واما ما یتدارسه المغرورية فانه بمعزل عن الرتبة العظمی لان محله لسانه دون قلبه۔

(ص۹۹ نفع قوت المغتذی)

علامہ تور بشتی فرماتے ہیں کہ فقہ فی الدین کی حقیقت وہ ہے جو قلب میں واقع ہو اور پھر زبان پر ظاہر ہو جس کا ثمرہ علم ہو اور جو خشیۃ اور تقویٰ پیدا کرے باقی یہ اہل غرور جو پڑھتے پڑھاتے ہیں تو اس مرتبہ عظمیٰ سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں کیوں کہ اس علم کا محل تو صرف زبان ہوتی ہے نہ کہ قلب۔

آگے حضرت علی متقی رح ان جہلا کی مذمت بیان فرماتے ہیں جن کو علم اور علماء سے عداوت ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عالم ہو جاؤ۔ متعلم ہو جاؤ۔ علم کے سننے والے ہو جاؤ۔ علم کو دوست رکھنے والے ہو جاؤ۔ بس ان چار جماعتوں میں سے جس میں سے چاہے ہو باقی پانچویں جماعت میں سے یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہونا جو علم اور اہل علم کے دشمن ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں نے بہت سے ایسے جاہلوں کو دیکھا ہے (جو کہ صوفی بن کر سلوک طریق الی اللہ کے مدعی ہیں حالاں کہ اس سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے) کہ تعلیم اور تعلم ہی کا انکار کرتے ہیں بلکہ اپنے لوگوں کو اس سے اس طرح روکتے ہیں گویا کہ ان کو علم اور اہل علم سے عداوت ہے اور مسکین یہ بھی نہیں جانتے کہ اس سے وہ اپنے ایمان ہی کو کچھ ضرر پہنچا رہے ہیں۔ اور لطف یہ کہ اپنی دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ آپ صاحب وحی اور معدن علم بھی تو تھے۔ اور اس کو بھی نہیں سمجھتے کہ جاہل اگر ذکر و شغل کرے گا

تو بعض مرتبہ اس کی وجہ سے اس کے قلب میں کچھ صفائی پیدا ہو جائے گی اور وہ محض اس سے دھوکے میں پڑ جائے گا اور بدون علم کے آفات نفس سے خود کو نہ بچا سکے گا نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنا حاصل شدہ سرمایہ ہی ضائع کر دے گا۔

اسی طرح سے بعض نادان علم کو قبیح سمجھ کر اس پر مشائخ کے اس مقولہ سے استدلال کرتے ہیں کہ العلم حجاب اللہ الاکبر۔ یعنی علم اللہ تعالیٰ سے قرب و وصال کے لئے ایک بہت بڑا حجاب اور مانع ہے۔ حالانکہ ظالم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ یہ قول کچھ ان کے موافق نہیں ہے بلکہ ان کے خلاف ہی پڑتا ہے اس لئے کہ اس شخص کی مثال جو علم کو اس لئے ترک کر دے کہ وہ حجاب اللہ اکبر ہے۔ ایسی ہی جیسے کوئی شخص کسی پہ عاشق ہوا اور اس کو یہ خبر ملے کہ اس کا محبوب پس دیوار ہے تو وہ یہ کہہ کر دیوار کی جانب التفات نہ کرے کہ یہ دیوار تو حجاب ہے اب آپ خود انصاف فرمائیے کہ اس سے بڑھ کر بھی احمق کوئی ہوگا کیوں کہ اگر عاشق صادق تھا تو اس پر واجب تھا کہ دیوار کو توڑ دیتا اور محبوب سے واصل ہو جاتا نہ یہ کہ دیوار کو دیکھ کر واپس آجائے اور محبوب ہی سے صبر کرے۔

ہاں علم حجاب بھی بنتا ہے مگر اس کے لئے جو اس کو تفاخر اور بڑائی کے لئے اور دنیا کی چند کوڑیوں کے لئے حاصل کرے۔

باقی جو شخص علوم دینیہ کو نہ حاصل کرے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی غائب شخص کی محبت کا دم بھرے ایسا غائب کہ اس تک رسائی کا ذریعہ اور طریقہ بھی یہ نہ جانتا ہو اور اور اسی درمیان میں وہ معشوق بھی کوئی خط بھیجے جس میں اپنے تک پہنچنے کی صورت کا بھی ذکر کرے اور یہ عاشق اس خط کو اٹھا کر پھینک دے اس کو پڑھے بھی نہیں اور یہ کہے کہ وصول محبوب میں یہ حجاب ہے تو بلاشبہ ایسے شخص کو یا تو احمق سمجھا جائے گا یا دعوائے محبت میں کاذب کہا جائے گا ہر عاقل کا یہی فیصلہ ہوگا (جب یہ ہے) تو اب سنئے کہ یہ قرآن اور حدیث اور علوم دینیہ بھی وصول الی اللہ کا طریقہ ہی بتلاتی ہیں لہٰذا طالب حق کے لئے ان کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ جو ان سے اعراض کرے وہ طالب ہی نہیں ہے۔

اور ہمارے شیخ معین الحق والدین (یعنی خواجہ اجمیری رح) قدس اللہ سرہٗ سے اس مقولہ کا مطلب پوچھا گیا کہ العلم حجاب اللہ الاکبر کا کیا مطلب ہے تو انھوں نے خوب بات فرمائی۔ فرمایا کہ یہ حجاب بمعنی آڑ اور پردہ کے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ لفظ ہے حجاب بمعنی دربان مطلب یہ ہے

کہ جس طرح سے شاہی دربار کے لئے دربان ہوتے ہیں جو کہ بادشاہ سے ملنے والوں کے لئے واسطہ اور ذریعہ بنتے ہیں اسی طرح سے علم کی بھی یہی شان ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ سے ملنے والوں کے لئے بمنزلہ دربان کے ہے بلکہ سب سے بڑا دربان، دربار الٰہی کا یہی علم ہے۔ انتہی کلامہ

(مجمع البحار صـ ۴۲۱ ج ۲)

ملاحظہ فرمایا آپ نے حضرت علی متقیؒ نے اس مختصر سے کلام میں کتنی اہم گتھیوں کو سلجھا دیا ہے۔ العلم حجاب اللہ الاکبر کا کیسا عمدہ مطلب بیان فرمایا۔ حاصل اسکا یہی ہے کہ فی نفسہ علم تو نہایت ہی اچھی اور محمود چیز ہے البتہ اس کو آدمی اپنے سوء استعمال یا اسمیں دوسری اغراض کی آمیزش کر کے حجاب بنا لیتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اسی کو یوں سمجھئے کہ علم محمود ہے لہذا یہ کسی مذموم شئے کا ذریعہ کیوں کر بن سکتا ہے؟ البتہ اس میں کسی جہت سے نقص پیدا ہو جائے یا ابھی وہ رسم سے بڑھ کر حقیقت تک نہ پہنچا تو بیشک اس پر برے آثار بھی مرتب ہو سکتے ہیں یہ قصور پھر بھی علم کا نہ ہوگا بلکہ اسکے نقص کا ہوگا یا یوں کہئے کہ اس جہل کا ہوگا جو ابھی دور نہیں ہوا ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کبھی علم سبب بنتا ہے تکبر کا میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ اس لئے کہ علم بالخصوص علم دین تو خیر ہی خیر ہے اس لئے وہ کسی شر کا سبب اور ذریعہ کیسے بن سکتا ہے؟ لہذا اہل علم میں جو تکبر دیکھا جاتا ہے میرے نزدیک اس کا منشاء اُن کا علم نہیں ہے بلکہ جہل ہے یعنی ان کا علم ابھی ناقص ہے پس جو حصہ کہ علم کا ابھی اُن کو حاصل نہیں ہوا ہے وہی سبب ہے اس رذیلۂ بد کا نہ کہ علم کا وہ حصہ جو ان کو حاصل ہے۔ اور میں اس کی یہ مثال دیتا ہوں کہ جیسے دو شاخیں فرض کیجئے ایک ان میں سے میوہ سے بھری ہوئی ہے اور دوسری نصف خالی ہے اور نصف بھری ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جو شاخ کہ میوہ سے لدی اور بھری ہے وہ اس نصف خالی والی سے زیادہ نیچے جھک جائے گی اور خالی والی اوپر کو اٹھی ہوگی اس میں رفعت ہوگی تو اب آپ اس کم میوہ والی کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے ترفع کا سبب اس کا پھل ہے یہ نہیں بلکہ اس کے ترفع کا سبب اس کا نقص ہے یعنی اس کا آدھا حصہ چونکہ خالی ہے اس لئے وہ اوپر کو اٹھی ہوئی ہے ورنہ اگر یہ بھی کہیں پوری بھری ہوتی تو اول کی طرح یہ بھی زمین بوس ہوتی۔

اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ جس اہل علم میں آپ تکبر دیکھ رہے ہیں اس کا سبب اس کا علم

نہیں ہے۔ علم نے تو اپنا پورا کام کیا کہ اس کو بہت کچھ سنوار دیا نہ پڑھتا تو اور بھی خراب ہو جاتا مگر اب بھی یہ رذیلہ جو موجود ہے تو اس لئے کہ اس کا علم ہنوز کامل نہیں ہے ناقص ہے پس اس کے علو کا سبب اس کا غلو ہے

اب دین کا علم چونکہ کبھی ناقص بھی ہوتا ہے اور کبھی یہ اغراض دنیویہ کے لئے پڑھا جاتا ہے اس لئے اس کی حیثیت رسم سے زیادہ نہیں ہوتی اسی لئے اہل حقیقت کے کلام میں کہیں کہیں علم کی مذمت آجاتی ہے مثلاً مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ:۔

علم رسمی سربسر قیل است وقال کہ از وی کیفیتے حاصل نہ حال

اور فرماتے ہیں کہ۔

جملہ اوراق وکتب درنار کن سینہ را با نور حق گلزار کن

اس کا یہی مطلب ہے جو ابھی بیان کیا گیا ہے۔

ورنہ تو علم یا اسباب علم کی فضیلت کا کوئی منکر نہیں ابھی آپ نے علی متقیؒ کے کلام میں سنا کہ آلات علم کی کیسی کچھ اہمیت اور عظمت بیان فرمائی ہے اور بات بھی یہی ہے کہ جب علم کی فضیلت مسلم ہو گئی تو ظاہر ہے کہ اس کے جو ذرائع ہیں ان سب کی اہمیت بھی اس سے ثابت ہو جائے گی کیونکہ الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہٖ یہی وجہ ہے کہ علم کے ساتھ ساتھ تعلم متعلم اور آلات علم سب معظم و محترم اور قابل اہتمام ہوتے ہیں۔

پھر آلات علم میں سے سب سے زیادہ مہتم بالشان چیز کتابیں ہیں کیونکہ یہی ذریعہ بنتی ہیں علم سیکھنے کا بھی اور اس کے باقی اور یاد رہنے کا بھی۔

اب ظاہر ہے کہ اگر وہ کتب دنیوی علوم کا ذریعہ ہیں تو ان سے علوم دنیوی حاصل ہوں گے اور اگر دینی کتب ہیں تو ان سے علم دین حاصل ہوگا۔ غرض علم دنیا کا ہو یا دین کا اس کے تحصیل کا ذریعہ اور اہم ذریعہ کتابیں بھی ہیں اور یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کیونکہ اگر کتابیں نہ ہوتیں تو زبانی لوگ کتنی باتوں کو محفوظ رکھ سکتے۔ پھر اگر کوئی بدخواہ درمیاں میں کسی موقع پر بھی ان میں تصرف کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا اور اس طرح سے کوئی بھی مسئلہ خواہ دین کا ہو یا دنیا کا قطع و برید اور محو و اثبات سے مامون اور محفوظ نہ رہ سکتا تھا نتیجہ یہ ہوتا کہ علوم پرسے اعتبار اٹھ جاتا اور اختلاف کا دور دورہ ہو جاتا۔

اس لئے ان حضرات کا یہ احسان عظیم ہے جنھوں نے کہ علوم کو کتابوں میں مدون کر دیا کہ

اب اس کی وجہ سے وہ گویا سربمہر ہو کر بالکل محفوظ ہو گئے۔

دیکھئے! آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف فرما نہیں ہیں لیکن ہم آج بھی آپ کے ایک ایک قول اور فعل اور آپ کی جملہ تعلیمات سے جو واقف ہو سکتے ہیں تو یہ کتاب ہی کی برکت ہے۔

اسی طرح سے قرآن شریف کو اس عالم میں نازل ہوئے ساڑھے تیرہ سو برس سے زائد کا زمانہ گزر گیا لیکن آج بھی ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ کون سی سورت مکہ میں نازل ہوئی اور کونسی مدینہ میں کون سی آیت رات کو نازل ہوئی اور کون سی دن میں کون سی خلوت میں اتری اور کون سی جلوت میں یہ کیوں کر؟ یہ فیض بھی کتابوں ہی کا ہے۔

اسی طرح سے آج سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ اور خواجہ اجمیریؒ بھی موجود نہیں ہیں۔

نیز رومی و غزالی۔ جنید و شبلی۔ سعدی و حافظ بھی اب دنیا میں نہیں رہ گئے ہیں نیز بقراط و سقراط۔ بوعلی اور فارابی بھی نہیں رہے مگر آج بھی ہم کو ان سب کے حالات ملفوظات انتظام سلطنت، کلام اور تحقیقات کا جو پتہ ہے تو وہ کتابوں ہی کی بدولت تو ہے۔

الغرض علم کی عظمت اور اہمیت کے ساتھ ساتھ کتابوں کی اہمیت اور ضرورت ناگزیر ہے۔ اب اگر اس کے خلاف کوئی مضمون کسی محقق کا مشہور ہے تو وہ ماؤل ہے۔

مثال کے طور پر اکبر الہ آبادی مرحوم کا ایک شعر نقل کرتا ہوں اور پھر اپنی فہم کے مطابق اس کی توجیہ کر کے اس کا مطلب بھی بیان کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ ؎

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

بہت ہی مشہور شعر ہے اور زبان زد خاص و عام ہے لیکن اگر آپ اس کے ظاہری لفظوں سے جو مطلب و مفہوم ہوتے ہیں اس کو لیجئے گا تو کتابوں کی اہمیت اور عظمت کا جو قصر ابھی آپ نے تعمیر کیا ہے وہ یکسر منہدم ہو جاتا ہے کیوں کہ بظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دین پیدا ہونے کا ذریعہ ایک اور صرف ایک ہے اور وہ ہے بزرگوں کی نظر۔

اور اس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ پھر تو کتابوں کے یہ ذخیرے کتب خانے۔ دارالمطالعے اور مدارس وغیرہ یہ سب چیزیں بالکل بیکار اور معطل محض ہو جاتی ہیں کیوں کہ دین پیدا کرنے میں جب ان کو کچھ دخل ہی نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ کوئی ان کی جانب توجہ کیوں کرے اور کسی دبند کیلئے

ان امور میں خوشی کا کون سا پہلو رہ جاتا ہے؟

اس غلط فہمی کے پیش نظر اس کلام میں تاویل کی ضرورت پیش آئی۔

میں نے اس کو یوں سمجھا ہے کہ ایک دین ہے اور ایک تدین ہے دین تو کتابوں میں ہی ہے جیسا کہ ظاہر ہے کہ حدیث کا علم حدیث شریف کی کتابوں میں ہے اور فقہی مسائل کا علم فقہ کی کتابوں میں ہے، تفسیر کا علم تفسیر کی کتابوں میں ہے۔ لغت کا علم، لغت کی کتابوں میں ہے یہ تو "دین" سے متعلق عرض ہے۔

باقی تدین یعنی دین کا عملی طور پر عامل کے اندر آجانا یہ متدین کی صحبت سے ہوتا ہے۔ متدین اس کو کہتے ہیں جو دین کو اپنے اندر عملی طور پر پیدا کرے تو یہ تدین بغیر متدین کے نہیں ہو سکتا۔ تدین کتاب کی صفت نہیں ہے متدین کی صفت ہے۔

پس قائل نے یہاں دین کا لفظ جو استعمال کیا ہے وہ اپنے ظاہر پر نہیں ہے بلکہ تدین کے معنی میں ہے اب اس کے بعد یہ کلام ایک درجہ میں صحیح بھی ہے۔

قائل کا یہ کہنا ہے کہ باوجود علم اور کتب کی کثرت کے دین جو لوگوں میں نہیں ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ دین (تدین) کتاب سے حاصل کرنا چاہتے ہیں حالاں کہ یہ (یعنی تدین) دیندار (یعنی متدین) سے حاصل کرنے کی چیز ہے اور یہ صحیح ہے۔ اور میں یہاں اتنی بات اور کہتا ہوں کہ تدین تو متدین کی صفت ہے ہی دین کا صحیح علم بھی کتاب سے نہیں آسکتا ہمارے استاد حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ محض کتاب دیکھ کر کسی کو رکوع کرنا بھی نہیں آسکتا۔

صرف کتاب سے لوگ اس کو عمل میں لاتے تو سخت اختلاف ہوتا کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا لیکن حد کے اندر سخت اختلاف ہوتا اب تعامل امت سے یہ سب چیزیں آسان ہو گئی ہیں۔

کتاب کی ضرورت مسلم ہے۔ کتاب میں قانون ہوتا ہے اور اس کا علم قانون داں کو ہوتا ہے تدین تو بجائے خود رہا صحیح علم کسی کتاب یا قانون کا اس کے عالم کے پاس ہوتا ہے اس لئے نہ کتاب سے استغنا ہو سکتا ہے اور نہ اہل علم سے۔

کتاب سے تو اس لئے ہم مستغنی نہیں ہو سکتے کہ علوم مدون اور منضبط جو ہیں تو وہ کتابوں ہی میں ہیں اور عالم سے اس لئے مستغنی نہیں ہیں کہ علم کتاب کی صفت نہیں ہے بلکہ یہ عالم کی صفت ہے یعنی علم، عالم کا وصف ہے اس کے اندر ہوتا ہے اس لئے علم کی تحصیل کے لئے بھی

اہل علم کی صحبت اور علماء سے استفادہ ناگزیر ہے۔

میں نے مذکورہ بالا شعر کی جو توجیہ پیش کی ہے اس سے مقصد صرف یہ تھا کہ کہیں اس کو لوگ بے محل نہ استعمال کریں اور اس سے معاذ اللہ کتابوں کی عدم ضرورت اور عدم افادیت پر نہ استدلال کرنے لگ جائیں۔

لیکن اس توجیہ سے میری غرض یہ بھی نہیں ہے کہ کتاب ہی کو سب کچھ سمجھ لیا جائے اور اس کی وجہ سے لوگ اہل علم کی صحبت سے خود کو مستغنی تصور کرنے لگیں کیوں کہ یہ دونوں خیالات خالی از افراط و تفریط نہیں۔ اس لئے قابل اصلاح ہیں۔ صحیح اور اعدل الاقوال یہ ہے کہ ہم کتاب کے بھی محتاج ہیں اور علماء کے بھی چنانچہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کتابوں سے ایک مسئلہ مدتوں حل نہیں ہوتا اور کوئی اہل علم اس کو چند لفظوں میں حل کر دیتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ علم اہل علم کے اذہان میں جلا کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کی بصیرت میں بہت ہی زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے اور غیر اہل علم یا کم علم والے میں یہ بات نہیں ہوتی۔

اس پر دو واقعے سنئے۔

(۱) مشہور ہے کہ کسی بادشاہ نے خواب دیکھا کہ میری ایک ٹانگ مشرق میں ہے اور ایک مغرب میں۔ ایک جاہل معبّر نے اس کی یہ تعبیر دی کہ آپ کی ٹانگیں چیر دی جائیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہو گیا حالاں کہ علم تعبیر کی روشنی میں اس کا مطلب یہ بھی نکالا جا سکتا تھا کہ حدود سلطنت میں توسیع ہو جائے گی۔ یعنی مشرق سے مغرب تک کا مالک ہو جائے گا۔

اسی لئے خواب کی تعبیر کسی جاہل معبّر اور ایسے شخص سے نہیں دریافت کرنی چاہئے جو خیر خواہ نہ ہو۔

(۲) اسی طرح سے ایک اور بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ میرے سارے دانت گر گئے ہیں صبح کو معبّر سے اس کی تعبیر پوچھی اس نے کہا کہ حضور کا سارا خاندان حضور کے سامنے ختم ہو جائے گا۔ بادشاہ نے اس کو پسند نہیں کیا اور اس کو قتل کئے جانے کا حکم فرما دیا۔

پھر دوسرے معبّر کو بلوایا اور اس سے اس کی تعبیر پوچھی کہا حضور یہ نہایت مبارک خواب ہے "آنحضور کی عمر اپنے خاندان کے سب لوگوں سے زیادہ ہوگی"۔ بادشاہ اس سے خوش ہوا اور اسکو انعام دیا۔

دیکھئے یہ بات دونوں نے ایک ہی کہی تھی لیکن ایک کے ساتھ علم کی رہنمائی تھی اور دوسرے کے ساتھ جہل کی کارفرمائی۔

غرض ہم بلاشبہہ تحصیل علم کے باب میں کتابوں کے ساتھ ساتھ اہل علم اور علماء محققین کے بھی محتاج ہیں۔ اس کو خوب اچھی طرح سے سمجھ لیجئے تاکہ غلط فہمی نہ ہو۔

حاصل یہ کہ علم جب معزز۔ محترم۔ افضل اور اہم ہے تو اس کے توسط سے آلات علم اور کتب بھی اہم اور مہتم بالشان ہوں گی۔

لہذا علم کا پڑھنا پڑھانا جس طرح سے اہم خدمت سمجھی جاتی ہے اسی طرح سے طالبین علم کے لئے کتب کا وقف کر دینا عاریت پر دینا ان کی فراہمی اور اس سلسلہ میں ان کو ہر طرح کی سہولت بہم پہنچانا بھی اہم خدمت متصور ہو گی۔

دنیا میں علم دنیا کی بھی حاجت ہے اور علم دین کی تو دنیا اور آخرت دونوں ہی جگہ ضرورت ہے لہذا جس طرح سے دینی کتب کا ذخیرہ جمع کر دینا تاکہ اہل ضرورت بوقت حاجت اس سے منتفع ہوں، موجب اجر و ثواب ہے۔ اسی طرح سے علوم دنیوی اور حوائج زندگی سے متعلق کتب رسائل۔ اخبارات جرائد وغیرہ کا انتظام و اہتمام بھی بلاشبہہ ایک اہم خدمت ہے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت ایک دار المطالعہ کے تعارف کے سلسلہ میں آپ سب حضرات یہاں جمع ہوئے ہیں۔ لہذا میں اس مختصر سی گزارش کے بعد یہ کہہ کر کہ میں بھی اس مقصد میں آپ کا شریک ہوں اور اب اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر کے مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ آپ حضرات کی اس سعی میں اخلاص عطا فرمائے اور اس کو مقبول فرمائے۔

خدا کرے یہ ادارہ اپنے صحیح مقاصد کی اشاعت میں ہمیشہ سرگرم رہے اور اس میں روز افزوں ترقی ہو۔

اس کا ہر خادم دینی اور دنیوی سعادتوں کا حامل بنے اور اس کی تمام تر کوششیں بارآور ہوں۔

وما علینا الا البلاغ۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

برحمتک یا ارحم الراحمین

تحذیر العلماء

کامل

از افاضات

مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحذیر العلماء

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

بعد الحمد والصلوٰۃ بندہ ناچیز سراپا تقصیر عرض پرداز ہے کہ مسلمانوں کے عام طور پر تباہی و بربادی کے اسباب کیا ہیں ــــ؟

ممکن ہے اس بارے میں انظار و افکار مختلف ہوں مگر میرے نزدیک اس کا بڑا سبب علماء ومشائخ سے بداعتقادی ہے۔ یہ بداعتقادی جہاں تک پہنچا دے کم ہے یہ مرض جب عالمگیر ہوجاتا ہے تو علماء محققین ومشائخ معتبرین سے بھی عار واستنکاف ہونے لگتا ہے۔ ہوتا تو ہے استنکاف وعار اور اس کو نفس وشیطان مزین ومستحسن کر کے دلائل اس کے تیار کرلیتا ہے اور اس طرح سے اسکا استحسان نظر میں مستحکم ہوجاتا ہے پھر اپنے کو بداعتقاد وعدم اتباع میں معذور سمجھنے لگتا ہے اور اس طرح ایک فریق ان حضرات کا بن جاتا ہے اور دونوں جانب میں ایک خلیج نزاع وجدال کی وسیع ہوجاتی ہے جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہ مرض عالمگیر ہوگیا ہے اور کہیں پر علماء ومشائخ کا احترام باقی نہیں رہا ہے جب خواص پر اعتماد باقی نہیں رہا اس کا لازمی نتیجہ ہے فساد عوام۔ فساد دنیا، فساد دین۔ اور اس کا علاج صرف ایک شئے میں منحصر ہے علماء ومشائخ کا اعتقاد واعتماد اور اس کا لازمی نتیجہ ہے صلاح عوام اصلاح دنیا اصلاح دین۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علماء کا اپنے طبقہ میں بھی احترام باقی نہیں ہے یعنی ان کے طلباء وشاگرد ان کا احترام واعتقاد دل سے نہیں کرتے۔ وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ طلباء کو علم کا ذوق اساتذہ سے جیسا چاہئے نہیں ہوتا بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکثر طلباء نہایت بد استعداد ہوتے ہیں ذرا بھی کسی علم سے مس نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اساتذہ کی کیا قدر کرسکتے ہیں وہ ہرگز ان کے رتبہ کو پہچان نہیں سکتے جب کچھ ملا ہوتا تو پہچانتے۔ علیٰ ہذا خود علماء

علماء کا احترام نہیں کرتے تا بعوام چہ رسد۔

اسی طرح مشائخ کا اعتقاد ان کے مریدوں میں بھی کچھ نہیں بلکہ مریدین میں شاذ کوئی مرید سچا ہو یہ سلسلہ صرف رسمی و عرفی باقی رہ گیا ہے۔ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ مرید کو شیخ سے کچھ ملتا نہیں اور جب مرید کو شیخ سے کچھ ملے گا نہیں تو اس کے اعتقاد کا بھی اعتبار نہیں کسی مرید سے کسی نے پوچھا کہ شیخ سے تم کو کیا نفع ہوا۔ کہا جب گھڑے ہی میں نہ ہوگا تو گلاس میں کیا آوے گا۔ ایسے خالی لوگ اکثر بالمنا بد اعتقاد و منکر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ عوام کے بھی علماء سے بد اعتقاد ہونے کی ہے جن لوگوں سے دین کی اشاعت ہوئی نہایت ذلیل و خوار نظر آرہے ہیں عام طور پر لوگوں نے اس کو دنیا کمانے کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ اور یہ غلط بھی نہیں ہے، ہو بھی رہا ہے یہی۔ اب دین محض دنیا طلبی و جاہ طلبی کے لئے حاصل کیا جاتا ہے: تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا جب علماء نے یہ دیکھا کہ ہمارا احترام قوم میں باقی نہیں ہے تو وہ بھی الا ماشاء اللہ کھل کے دنیا طلبی کے اسباب اختیار کرنے لگے اور اپنے کو اس زمرے سے بالکل خارج کر دیا اور ذلت سے بچنے کے لئے دنیا طلبی اور روپیہ پیسہ کی تحصیل کو ضروری اور از بس ضروری خیال کر لیا اور اس طرح سے انسے اتفاق کر لیا اور ان کے فریق ہونے سے نکل گئے اور انھوں نے بھی ان سے صلح کر لی اور یہ صلح نہایت محکم اور استوار ہو گئی ہر ایک دوسرے سے شیر و شکر کی طرح رہنے لگا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا دروازہ ہی بند کر دیا انا للہ و انا الیہ راجعون یہ فساد لازم ہی نہیں بلکہ متعدی و متعدی ہو نارہا پھر ایسے علماء کے جو شاگرد ہوتے ہیں الولد سر لابیہ کے قاعدہ سے وہ بھی اس خیال کے شکار ہوتے ہیں پھر عوام میں بھی اس کا تعدیہ ہونا کیا بعید ہے۔ اس طرح سے یہ مرض عالمگیر ہو گیا۔

جب مرض کی تشخیص ہو گئی علاج کی بھی تعیین ہو گئی جب آدمی اپنی عزت خود نہ کرے گا دوسرے سے بھی نہ کرا سکے گا، جب علماء اپنے کو اس زمرہ سے نکال چکے ہیں پھر دوسروں پر کیسے ثابت کر سکتے ہیں کہ ہم عالم ہیں اور ہمارا احترام اس حیثیت سے لازم ہے۔ احترام کرانا دل سے کرانا آسان نہیں دوسرا شخص دلیل کا مطالبہ کرتا ہے اور دلیل پر نقض وارد کرتا ہے اور عاجز ہو جاتا ہے تب تسلیم کرتا ہے۔

ع یہ منزل عشق کی ہے اس میں آئے جس کا جی چاہے۔ لوہے کے چنے چبانے ہیں یہ مرتبہ لینا حلوائی کی دوکان نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے خرید لے۔ خلوص کا سودا ہے اور اہل خلوص اقل قلیل ہیں

اہل خلوص کو بھی اعتبار دلانا مشکل ہوگیا ہے اعتبار جب چلا جاتا ہے جلدی نہیں لوٹتا الزائل لایعود اسم تفضیل جس طرح لون سے نہیں آتا عیبؔ سے بھی نہیں آتا اس کے باوجود بھی ہم تبلیغ کے دلدادہ ہیں اور عوام سے دین کا مطالبہ کرتے ہیں اور ان میں اثر نہ ہونے سے تعجب کرتے ہیں اور دلگیر ہوتے ہیں اور اس کے اسباب میں جو ہمارے ہی اختیار کئے ہوئے ہیں اور اسی سے یہ نتائج بد ہیں غور نہیں کرتے۔ وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ کا یہی مصداق ہے اس مقام پر روح المعانی سے اسی کے مناسب مضمون نقل کرتا ہوں۔ وھو ھذا۔

ثم ان ھذا التوبیخ والتقریع وان کان خطابا لبنی اسرائیل الا انہ عام من حیث المعنی لکل واحد یأمر ولا یأتمر و یزجر ولا ینزجر ینادی الناس البدار البدار ویرضی لنفسہ التخلف والبوار یدعو الخلق الی الحق و ینفر عنہ وطالب العوام بالحقائق ولا یشم ریحھا منہ وھذا ھو الذی یبدأ بعذابہ قبل عبدۃ الاوثان و یعظم ما یلقی لوفور تقصیرہ یوم لا حاکم الا الملک الدیان وعن محمد بن واسع قال بلغنی ان اناسا من اھل الجنۃ اطلعوا علی ناس من اھل النار فقالوا لھم قد کنتم تامروننا لاشیاء وعملنا ھا فدخلنا الجنۃ قالوا کنا نأمرکم بھا ونخالف الی غیرھا۔

ترجمہ:۔ اس توبیخ و سرزنش کا بظاہر خطاب بنی اسرائیل کو ہے لیکن درحقیقت یہ ہر اس شخص کیلئے عام ہے جو دوسرے کو امر کرے اور خود نہ کرے اور لوگوں کو منادی کرے (البدار البدار) جلدی کرو جلدی کرو اور اپنے لئے تخلّف (پیچھے ہونا) اور بوار (ہلاکی) کو پسند کرے اور مخلوق کو حق کی طرف بلائے اور خود اس سے نفرت کرے اور عوام سے حقائق کا مطالبہ کرے اور خود حقائق کی بو نہ سونگھی ہو یہی وہ شخص ہے کہ بت پرستوں کے عذاب سے قبل اس کو عذاب دیا جائے گا اور چونکہ اس کی تقصیر بڑی ہے اس لئے اس کی سزا بھی بڑی ملے گی جس دن کہ کوئی حاکم نہ ہوگا بجز ملک دیان کے (یعنی قیامت میں) محمد بن واسع سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے

عہ:۔ عیب سے مراد عیب ظاہری مطلب یہ کہ رذائل کے ساتھ ساتھ فضل کیسے جمع ہو سکتا ہے۔

کہ جنت کے کچھ لوگ بعض اہل نار کو دیکھ کر ان سے کہیں گے کہ تم لوگوں نے ہمیں کچھ باتیں بتائی تھیں جن پر عمل کرکے ہم جنت میں داخل ہو گئے اور تم یہاں کیوں ہو۔ وہ لوگ جواب دیں گے کہ جن باتوں کا ہم تم کو حکم کرتے تھے خود اس کے خلاف کرتے تھے۔ اس لئے ہمارا یہ حشر ہوا۔

روح المعانی ص ۲۲۷ ج ۱

اسی مضمون کی تائید سیدنا حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے وظائف المرشد المعلم کے بیان میں فرماتے ہیں:۔

الوظیفۃ الثامنۃ ان یکون المعلم عاملاً بعلمہ فلا یکذب قولہ فعلہ لان العلم یدرک بالبصائر والعمل یدرک بالابصار وارباب الابصار اکثر فاذا خالف العمل العلم منع الرشد وکل من تناول شیئاً وقال للناس لاتتناولوہ فانہ سم مھلک سخر الناس بہ واتھموہ وزاد حرصھم علیہ فیقولون لولا انہ اطیب الاشیاء والذھا لما کان یستاثر بہ ومثل المعلم المرشد من المسترشدین مثل النقش من الطین والظل من العود فکیف ینقش الطین بما لا نقش فیہ ومتی استوی الظل والعود اعوج واذا اعوج العود اعوج الظل ولذلک قیل فی المعنی ؎

لا تنہ عن خلق وتاتی مثلہ　　عار علیک اذا فعلت عظیم

وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ ولذالک کان وزر العالم فی معاصیہ اکبر من وزر الجاھل اذ یزل بزلتہ عالم ویقتدون بہ ومن سن سنۃ سیئۃ فعلیہ وزرھا ووزر من عمل بھا ولذلک قال علی رضی اللہ تعالی عنہ قصم ظھری رجلان عالم متھتک وجاھل متنسک فالجاھل یغر الناس بتنسکہ والعالم یغرھم بتھتکہ واللہ اعلم بالصواب۔

ترجمہ:۔ معلم کا آٹھواں وظیفہ یہ ہے کہ اپنے علم پر عامل ہو اس کا فعل اس کے قول کی تکذیب نہ کرے اس لئے کہ علم کا ادراک تو باطنی آنکھ سے ہوتا ہے اور عمل کا ظاہری آنکھ سے اور ظاہری آنکھ والے

بہ نسبت باطنی کے زیادہ ہیں تو ہو سکتا ہے کہ علم کا ادراک نہ ہو اور بے عملی کا ادراک ہو جائے پس اگر عمل علم کے خلاف ہوگا تو ہدایت سے مانع ہوگا اور جو شخص خود تو کوئی کام کرے اور لوگوں سے کہے کہ تم نہ کرو تو یہ سم قاتل ہے لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے اور اس کو متہم گردانیں گے اور اس چیز کے کرنے پر ان کی حرص زیادہ ہوگی یہ خیال کرتے ہوئے اگر یہ کوئی پسندیدہ اور اچھی چیز نہ ہوتی تو وہ خود کیوں کرتا اور مثال ہدایت کرنے والے معلم اور اس سے ہدایت حاصل کرنیوالوں کی ایسی ہے جیسے نقش اور مٹی اور سایہ اور لکڑی پس گندھی ہوئی مٹی کو کیوں کر منقش کیا جا سکتا ہے ایسے سانچے سے جس میں نقش نہ ہو اور سایہ کیسے سیدھا ہو سکتا ہے جب کہ لکڑی ہی ٹیڑھی ہو جب لکڑی ٹیڑھی ہوگی ظاہر ہے کہ سایہ بھی ٹیڑھا ہوگا اور اسی معنی میں یہ شعر ہے۔ (ترجمہ) ایسا نہ کرو کہ ایک بات سے دوسروں کو منع کرو اور خود اسے کرو اگر ایسا کیا تو تمہارے لئے یہ بڑی شرم کی بات ہے) اور حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ کیا غضب ہے کہ کہتے ہو لوگوں کو نیک کام کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے اسی واسطے عالم کا گناہ اس کے گناہوں میں جاہل کے گناہوں سے بڑا ہے کیوں کہ اس کی لغزش سے ایک دنیا کو لغزش ہو جاتی ہے اور لوگ اس کی اقتدا کرتے ہیں (اور حدیث شریف میں ہے کہ) جو شخص کوئی برا طریقہ ایجاد کرے تو اس پر اپنا وبال بھی ہوگا اور ان لوگوں کا بھی وبال ہوگا جن لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے اسی واسطے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے کہ میری کمر دو آدمیوں نے توڑ رکھی ہے۔ ایک وہ عالم جو حکم شرعی کی پردہ دری کرتا ہو یا بحرمتی و ہتک کرتا ہو اور دوسرا وہ جاہل جو عبادت گزار ہو۔ اس لئے کہ لوگ اس کی عبادت سے دھوکے میں پڑیں گے اور عالم اس لئے کہ اپنی بےعملی سے لوگوں کو دھوکے میں ڈالے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

علمائے محققین کی ان تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ تبلیغ کے موثر ہونے کے لئے مبلغ کا چند اوصاف سے متصف ہونا بھی ضروری ہے اور اگر واعظ ان سے کورا یا روحانی امراض میں سے اس میں کوئی مرض موجود رہا تو نہ صرف یہ کہ اس سے فائدہ نہیں ہوگا بلکہ کبھی اس کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔ عالم بے عمل کو اگرچہ وعظ کہنا جائز ہے لیکن لوگوں کو اس کے پند و نصیحت سے کچھ زیادہ اثر نہ ہوگا بلکہ احتمال ہے کہ الٹا اثر پڑے اس لئے کہ ایسا عالم یعاقب علی فسقہ (اپنے فسق پر عتاب کیا جائیگا) کا مصداق ہے جس طرح کہ ثوب مغصوب میں نماز اگرچہ درست ہے لیکن مصلی یعاقب علی معصیتہ۔ (نمازی اپنی معصیت پر باز پرس کیا جائے گا)

امام غزالی رحمۃ اللہ اپنی کتاب بدایہ میں اپنے ہمعصر علماء اسلام کا حال بیان فرماتے ہیں:۔

قد مرض العلماء فی هذه الاعصار مرضا عسر علیهم علاج انفسهم لان الداء المهلك هو حب الدنيا قد غلب ذالك على العلماء واضطروا الى الكف عن تحذير الخلق من الدنيا لئلا تنكشف فضيحتهم فاصطلحوا على الاقبال على الدنيا وتجازب لها والتكالب عليها واشتغل الاطباء (العلماء) بفنون الاغواء فليتهم اذا لم يصلحوا لم يفسدوا وليتهم سكتوا ما نطقوا بل صار كل واحد كانه صخرة فى فم الوادى لا هى شرب ولا تترك الماء شربه غيره۔

(بدایہ للغزالی ص۱۱۶)

ترجمہ:۔ بلاشبہ علماء اس زمانہ میں ایسے مریض ہوگئے ...... ہیں کہ ان پر خود ان کا علاج دشوار ہو رہا ہے اس لئے کہ حب دنیا جو ایک مہلک بیماری ہے خود علماء پر مسلط ہوگئی ہے اور اس کی وجہ سے عوام کو بھی دنیا طلبی سے روکنے کا ان کو منہ نہیں رہ گیا ہے اس لئے کہ اس سے خود ان کا پردہ فاش ہوتا ہے پس ان حضرات نے (لوگوں سے) دنیا طلبی اور اس کے لئے سعی کرنا اور اس پر کتوں کی طرح گرنے پر صلح کرلی ہے اور خود طبیب ہی (یعنی یہی علماء) عوام کو طرح طرح سے بہکانے کے فن میں مشغول ہوگئے ہیں۔ پس اے کاش ان لوگوں نے اگر اصلاح نہ کی تھی تو فساد بھی نہ کرتے اور کاش جو کچھ ان لوگوں نے کہا اس سے خاموش ہی رہتے (افسوس کہ صرف یہی نہیں ہوا) بلکہ ان میں کا ہر ایک چشمہ کے منہ کا پتھر بن گیا کہ نہ خود اس سے پیتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو پینے دیتا ہے۔

صاحب روح المعانی نے بھی آیت وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً کی تفسیر بیان کرنے کے بعد اپنے معاصر علماء کا شکوہ اس طرح کیا ہے:۔

ولم اجد لهؤلاء مثلا من هذه الحيثية المشار اليها بقوله سبحانه وان يظهروا الاية الا اناسا متزيين بزى العلماء وليسوا منهم ولا قلامة ظفر فانهم مع حسبى الله وكفى على هذا الطرز فرفعهم الله لا قدر ادحطهم ولاحط عنهم وزرا۔ (روح المعانی پ۱۰ ص۵۰)

ترجمہ:۔ اور میں نہیں پاتا ان کفار کے لئے ان کے اس وصف میں جس کا کہ تذکرہ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے آیت وان یظھروا الآیۃ میں فرمایا ہے کہ کوئی مماثل بجز ان لوگوں کے جنھوں نے علماء کا لباس تو پہن رکھا ہے حالانکہ عالم نہیں ہیں (عالم ہونا تو بڑی بات ہے) وہ عالم کے ناخن کے کترنکی بھی حیثیت نہیں رکھتے کیوں کہ علماء حقہ تو میرے ساتھ ہیں اور اللہ مجھے کافی ہے اور اُن کے اس طرز پر بھی کافی ہے خدا ان (علماء سو) کو بڑھائے لیکن عزت میں نہیں اور ان کو گھٹائے مگر گناہ میں نہیں۔

علمائے حق اور علماء سو کی علامات بیان کرتے ہوئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں سنئے:۔

وقد ورد فی العلماء السوء تشدیدات عظیمۃ دلت علی انھم اشد الخلق عذابا یوم القیٰمۃ فمن المھمات العظیمۃ معرفۃ العلامات الفارقۃ بین علماء الدنیا وعلماء الآخرۃ ونعنی العلماء الدنیا و علماء السوء الذین قصدھم من العلم التنعم بالدنیا والتوصل الی الجاہ والمنزلۃ عند اھلھا۔ (احیاء العلوم للغزالی ص۶۳ ج۱)

ترجمہ:۔ اور (قرآن وحدیث) میں علماء سو کے بارے میں ایسی ایسی سخت وعیدیں آئی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز سب لوگوں سے زیادہ انھیں کو عذاب ہوگا لہٰذا ان علامات کا جاننا اشد ضروری ہوا جو علماء دنیا کو علماء آخرت سے جدا کرتی ہے اور ہماری مراد علماء دنیا سے وہ علماء سو ہیں جن کا مقصد اپنے علم (دین) سے محض دنیاوی راحت و آرام اور اسے جاہ طلبی کا ذریعہ بنانا ہے یا اس کے ذریعہ سے اہل جاہ کی نظروں میں وقیع بننا ہے۔

سُنئے طحطاوی علی الدر میں ہے:۔

شر الناس فاسق قرأ کتاب اللہ وتفقہ فی دین اللہ وبذل نفسہ لفاجر اذا نشطہ تفکہ بقرأتہ فیطبع اللہ علی قلب القاری والمستمع

(طحطاوی علی الدر ص۳۱ ج۱)

ترجمہ:۔ بدترین انسان وہ فاسق ہے جس نے اللہ کی کتاب پڑھی ہو اور اللہ کے دین کی خوب باتیں سیکھی ہوں لیکن اپنے نفس کو کسی فاجر کی خوشنودی میں صرف کیا ہو (یعنی مطمح نظر محض اس کی

خوشنودی رہی) جس وقت طبیعت میں ذرا نشاط ہوا تو کتاب اللہ تفکہ کے طور پر قراءت کرلی (یعنی عمل کے قصد سے نہیں محض تفریح کے طور پر) پس حق تعالیٰ ایسے پڑھنے والے اور سننے والوں کے قلب پر مہر لگادیتے ہیں (یعنی قراءت صرف لسان ہی تک محدود رہتی ہے قلب تک اس کا اثر نہیں پہنچتا۔)

اسی مضمون کی تائید حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھنے اور نہ پڑھنے والوں کی چند مثالیں بیان فرمائی ہیں روایت میں ہے کہ:۔

ومثل الفاجر وفی روایۃ المنافق الذی یقرأ القرآن کمثل ریحانۃ ریحھا طیب وطعمھا مرٌّ۔ (رواہ الشیخان)

ترجمہ:۔ مثال فاجر کی اور دوسری روایت کی رو سے مثال منافق کی جو قرآن پڑھتا ہو مانند ریحانہ کے ہے جس کی خوشبو اچھی ہے اور مزہ کڑوا ہے۔

کتاب الادب النبوی میں حدیث کے اس جز کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

وثالثھم فاجر او منافق لیس لہ من الایمان الا اسمہ ولا من الدین الا رسمہ یقراء القرآن ویجید حفظہ ویتقن طرقہ ویعرف قرأتہ وتوقیع الفاظہ ونغماتہ ولکن لا تجاوز التلاوۃ حنجرتہ ولا تعدو ترقوتہ فان بلوتہ تکشفت لک عن قلب اسود وفواد مظلم وخلق مر وعمل ضرو وھذا امثلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالریحانۃ وان شممت فرائحۃ ذکیۃ وان ذقت فمرارۃ کذالک ھذا یقراء القرآن تستریح بہ النفوس کما تستریح للروائح العطرۃ ولکن قلبہ ونفسہ منطویات علی السوء تذوق مرارتہ وتحس قذارتہ ان عاشرتہ او عاملتہ ومثل ھذا لا اثر للقرآن فی نفسہ لان فجورہ ونفاقہ ختم علی قلبہ فلا تؤثر نصیحتہ ولا ینجع

معہ موعظۃ۔

(الادب النبوی ص۲۴۵)

ترجمہ:۔ اور تیسرا ان قرآن پڑھنے والوں میں کا فاجر یا منافق ہے کہ جس میں محض نام کا ایمان ہو اور صرف رسمی دین کا ہو (یعنی حقیقی ایمان اور دین سے وہ خالی ہو) قرآن کو عمدہ آواز کے ساتھ پڑھتا ہو اس کے متعدد لہجوں اور قراءتوں سے بھی بخوبی واقف ہو اس کو الفاظ کی پختگی اور حسن ترنم کے ساتھ تلاوت کرتا ہو۔ لیکن اس کا یہ پڑھنا اس کے گلے اور حلق سے آگے نہ بڑھتا ہو اگر تم اس کے (باطن) کا جائزہ لوگے تو اس کا دل سیاہ پاؤ گے قلب تاریک دیکھوگے اخلاق کڑوے (برے) اور عمل ضرر رساں پاؤ گے ایسے شخص کی مثال رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ریحانہ (تلسی) کی سی دی ہے اگر تم اس کو سونگھو تو خوشبو نہایت ہی پاکیزہ لیکن اگر اس کو چکھو تو مزا سخت کڑوا۔ یہی حال اس شخص (منافق) کا ہے کہ اس کے قرآن پڑھنے سے لوگوں کو بڑا ہی لطف آتا ہے۔ جس طرح کہ عمدہ خوشبوؤں کے سونگھنے سے آیا کرتا ہے لیکن اس کے قلب اور نفس میں نہ جانے برائیاں موجود ہوتی ہیں جس کی کڑواہٹ اور نجاست تم اس کی معاشرت اور معاملات میں محسوس کرسکتے ہو اور اس جیسے انسان کے قرآن پڑھنے کا اثر خود اس کے نفس میں بھی نہیں ہوتا (تا بدیگراں چہ رسد) اس لئے کہ اس کا نفاق اور فجور اس کے دل پر مہر لگا دیتے ہیں پس اس وقت نہ کوئی نصیحت کارگر ہوتی ہے اور نہ کوئی وعظ نفع دیتا ہے۔ (اذا کان الطباع طباع سوء۔ فلا ادب یفید و لا ادیب)

اسی طرح حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بھی اس مضمون کی مؤید ہے جسے بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے:۔

عن حذیفۃؓ مرفوعاً اقرءوا القرآن بلحون العرب واصواتها وایاک ولحون اهل العشق ولحون اهل الكتابين وسيجئ بعدى قوم يرجعون بالقرأت ترجيع الغناء والنوح لا يجاوز حناجرهم مفتونةٌ قلوبهم وقلوب الذين يعجبهم شانهم۔

(رواہ بیہقی ورزین)

ترجمہ:۔ حضرت حذیفہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ قرآن کو عرب کے لہجہ اور طرز پر پڑھو

اور دیکھو خبردار اہل عشق اور اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے طریقہ پر قرآن مت پڑھنا میرے بعد ایک قوم آئے گی جو قرآن کو گانے اور نوحہ کے طور پر پڑھے گی (جو) ان کے حلق سے متجاوز نہ ہوگا (اور اس عمدہ قرأت کی وجہ سے) خود ان کے قلوب بھی فریب خوردہ ہوں گے اور ان لوگوں کے قلوب بھی جن کو اُن کا حال اچھا معلوم ہوگا۔

حاصل کلام یہ کہ اس زمانہ کے خواص ہوں یا عوام سب کے سب مہلک امراض میں مبتلا ہیں عوام کا حال تو یہ ہے کہ استرسل الناس فی اتباع الشہوات استرسال البھائم عام طور پر لوگ اتباع شہوات میں اس طرح چھوٹ کر پڑتے ہیں جیسے جانور (کھونٹے سے چھوٹ کر کھیت میں پڑ جاتا ہے) کہ کھیت کا چر کر ناس کر دیتا ہے اسی طرح یہ لوگ بھی شریعت کے قید و بند سے چھوٹ کر شہوات میں ہلاک ہو گئے کہ شریعت مقدسہ کا عمل تو درکنار استحسان بھی نظر میں باقی نہیں رہا اور خواص میں وہ مرض عام ہو گیا ہے جس کا اندیشہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں فرمایا تھا۔

عن ابی ذر رضی اللہ عنہ اخوف ما اخاف علی امتی کل منافق علیم اللسان قال المناوی ای عالم بالعلم منطلق اللسان بہ لکنہ جاھل القلب والعمل فاسد العقیدۃ مغر للناس بشقاشقہ وتفصحہ وتقعرہ فی الکلام قال المحشی الآخر تحت قول کل منافق علیم اللسان ای منطلق اللسان فی العلوم والفصاحت خال القلب من العمل بہ انما خاف صلی اللہ علیہ وسلم من امتہ منہ لانہ لفھم العلم یقتدی بہ الناس فیضلھم۔

ترجمہ:۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ مجھے سب سے زیادہ خوف اپنی امت میں علیم اللسان منافق کا ہے علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مراد اس سے وہ شخص ہے جو علوم میں ماہر ہو اور اس میں اس کی زبان خوب چلتی ہو لیکن قلب اور عمل کے اعتبار سے وہ بالکل جاہل ہو اور عقیدہ بھی اس کا فاسد ہو مگر لوگوں کو اپنی زبان آوری و فصاحت بیانی اور کلام کی گہرائی سے مغالطے میں ڈال رکھا ہو۔ ایک دوسرے محشی نے کل منافق علیم اللسان کے تحت لکھا ہے کہ علوم فصاحت میں زبان چلانے والا ہو اور قلب اس کا خالی ہو اس پر عمل کرنے سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

اپنی امت میں اس شخص کا خوف اس لئے کیا کہ اس کے علوم میں ماہر ہونے کی وجہ سے لوگ اس کی اقتدا کریں گے۔ اور وہ لوگوں کو گمراہ کرے گا۔

حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شخص سے خوف فرماتے ہیں مفہوم حدیث میں غور کرنے سے اور اس کو اپنے اوپر منطبق کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج ہم میں بہت لوگ ایسے ہیں جو اس کے مصداق ہو رہے ہیں کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہم نے اپنی حالت ایسی بنائی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے خوف فرما رہے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

علوم (دینی) میں ماہر ہونے کے باوجود قلب و جوارح کا وظیفہ (یعنی خشیت و عمل) مفقود ہے اسی کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے ایک قسم کا نفاق اور بعض سلف نے نفاق فی العمل سے تعبیر فرمایا ہے یعنی یہی نفاق فی العمل ہے اور اس کا ضرر متعدی ہے کیوں کہ یہ شخص اپنے علوم کو (جو نکلے ہوئے ہیں ایک نفاق بھرے دل سے). دوسروں پر بھی ظاہر کرے گا۔ لہذا ان سب پر بھی اسی قسم کا اثر ہوگا یہی معنی ہیں متعدی ہونے کے بخلاف قاری قرآن کے جس کا تذکرہ حضرت حذیفہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ اس کا ضرر لازم ہی ہے کیوں کہ وہ شخص قرآن شریف زبان سے پڑھتا ہے اور اس کا اثر اسی کے دل پر نہیں ہوتا دوسروں کا اس میں کچھ نقصان نہیں ہے اور بے عمل عالم کو لوگ مخلص عالم سمجھتے ہوئے اس کے ہر قول و فعل کی تقلید شروع کر دیتے ہیں اور اس کی وجہ سے گمراہی میں پڑتے ہیں۔

میں اپنے دیرینہ اور مسلسل تجربہ کے بعد دیانۃً عرض کرتا ہوں (اور مجھ سے اس قول پر انشاء اللہ باز پرس نہ ہوگی) کہ اس وقت تقریباً سب ہی لوگ (کیا عوام اور کیا خواص) الا ماشاء اللہ مرض نفاق میں مبتلا ہیں لوگوں کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ زبان کے بہت اچھے اور دل کے بہت ہی برے قلوبھم قلوب الاعاجم والسنتھم السنۃ العرب والسنتھم احلی من السکر وقلوبھم امر من الذیاب ان روایات میں جن امور سے تحذیر تھی وہی واقع ہو رہے ہیں اسی کا شکوہ شیخ سعدیؒ اس طرح فرماتے ہیں۔ ہو دت اہل صفا چہ در روئے چہ در قفا نچناں کز پست عیب گیرند و در پیشت میرند ؎

در برابر چو گو سفند سلیم در قفا ہم چو گرگ مردم خوار

میں کہا کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں لوگوں کی قدح تو دل سے ہوا کرتی ہے لیکن مدح صرف

زبان سے ہوتی ہے آج وعظ و تبلیغ کے موثر نہ ہونے کا یہی (یعنی فقط لسانی تبلیغ بدون شرکت قلب) سب سے بڑا مانع ہے۔ خود سوچئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو منافقین تھے اگر ان میں سے کوئی دوسروں سے کہتا کہ نفاق بہت بری چیز ہے اس کو چھوڑ دو تو اس کا یہ پیغام نفاق کو کتنے دلوں سے اکھاڑ پھینکتا۔ اسی طرح آج جب کہ ہم طرح طرح کی بداعمالیوں اور بداخلاقیوں میں مبتلا ہیں اور دوسروں سے انھیں کے ترک کا مطالبہ ہے اب اس کا جیسا بھی اثر ہوگا ظاہر ہے ؎

ہر کسے ناصح برائے دیگراں ناصح خود یافتم کم در جہاں

ایک دوسری وجہ تبلیغ کے غیر نافع ہونے کی اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ علماء نے خدا کیلئے وعظ کہنا چھوڑ دیا ہے۔ اب وعظ سے مقصود مختلف قسم کے دنیوی اغراض ہیں۔

حالاں کہ درمختار میں لکھا ہے:۔

التذکیر علی المنابر للوعظ والاتعاظ سنۃ الانبیاء والمرسلین ولریاسۃ ومال وقبول عامۃ من ضلالۃ الیہود والنصاریٰ۔ (درمختار مع الشامی ص ۲۷۱ ج ۵)

ترجمہ:۔ پند و نصیحت کے لئے منبر پر وعظ کہنا تو انبیاء اور مرسلین کا طریقہ ہے لیکن جاہ و مال اور شہرت عامہ کے لئے ایسا کرنا منجملہ ضلالت یہود و نصاریٰ ہے۔

اس کا ماخذ یہ آیت ہے:۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔

ترجمہ:۔ اے ایمان والو اکثر احبار اور رہبان (یعنی یہود و نصاریٰ کے علماء و مشائخ و عوام) لوگوں کے مال کو نامشروع طریقے سے کھاتے اڑاتے ہیں (یعنی احکام حقہ کو پوشیدہ رکھ کر موافق مرضی عوام فتویٰ دے کر ان سے نذرانے لیتے ہیں) اور اس کی وجہ سے وہ اللہ کی راہ (یعنی دین اسلام سے (لوگوں کو) باز رکھتے ہیں۔

اس موقع پر یہ کہنا نہایت ہی برمحل ہوگا کہ نفاق جس کی قباحت قرآن و حدیث میں ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ نے اپنی کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر میں اہم و اعظم مقاصد قرآن میں سے اس نفاق کی بحث کو ایک اہم مقصد قرار دیا ہے۔

(کیوں کہ اہم مقصد قرآن مخاصمہ ان چار فرق باطلہ کا ہے (یہود و نصاریٰ، مشرکین منافقین) باوجود اس کے یہ چوتھی بحث اس زمانہ میں بالکل نظر انداز کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے مسلمان صرف عملی ہی نفاق میں نہیں بلکہ کثرت سے اعتقادی نفاق میں بھی مبتلا ہو گئے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے اس کے متعلق بھی الفوز الکبیر میں تحریر فرمایا ہے۔

ہیچ فرق نیست درمیان آنانکہ کلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیواسطہ شنیدہ و نفاق ورزیدند و درمیان آنانکہ الحال پیدا شدہ اند بطریق یقین محکم حکم شارع معلوم کردہ اند بعد ازاں بر ایثار خلاف آں اقدام می نمایند۔

ترجمہ:۔ کوئی فرق نہیں ہے ان لوگوں میں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات (آپ کی حیات میں) بلاواسطہ سُننے اور پھر نفاق اختیار کیا اور ان لوگوں میں جو آپ کے بعد پیدا ہوئے ہیں اور یقین محکم کے ساتھ حکم شارع کو معلوم کر کے اس کے خلاف کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔

(الفوز الکبیر صفحہ ۹)

چوں کہ لوگوں کو (نفاق) کی شناعت ہی معلوم نہیں اس لئے اس سے احتراز کی فکر بھی نہیں ہوتی۔ لہذا ضرورت ہے کہ لوگ اس کی حقیقت اور قباحت سے واقف ہوں تاکہ اپنے ایمان و عمل ہر دو کو نفاق کی آمیزش سے پاک و صاف کر کے ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا ہوں۔

نفاق کی حقیقت اور اقسام دریافت کرنے کے لئے آیۃ من آیات اللہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی عبارت درج کی جاتی ہے:۔

ویسمی مقابل الایمان الاول بالکفر واما مقابل الایمان الثانی فان کان تفویتاً للتصدیق وانما یکون الانقیاد بغلبۃ السیف فھو النفاق الاصلی والمنافق بھذا المعنی لافرق بینہ وبین الکافر فی الآخرۃ بل اَلْمُنَافِقُوْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وان کان مصدقا مفوتا لوظیفۃ الجوارح سمی فاسقا او مفوتا لوظیفۃ الجنان فھو المنافق بنفاق آخر وقد سماہ بعض السلف نفاق العمل۔

ذلک ان یغلب علیہ حجاب الطبع او الرسم او سوء المعرفۃ فیکون ممعناً فی محبۃ الدنیا والعشائر والاولاد فیدب فی قلبہ استبعاد المجازاۃ والاجتراء علی المعاصی من حیث لایدری وان کان معترفا بالنظر البرھانی بما ینبغی الاعتراف بہ او رأی الشدائد فی الاسلام فکرھہ او احب الکفار باعیانھم فصد ذالک عن اعلاء کلمۃ اللہ۔

(حجۃ اللہ البالغہ ص۱۶۳ ج ۱)

ترجمہ:۔ اور ایمان کے پہلے معنی کے لئے یعنی جس کے اوپر دنیوی احکام کا مدار ہو اس) کا مقابل کفر ہے اور دوسرے معنی (جس کے اوپر اخروی احکام کا مدار ہو اس) کے مقابل (کی تفصیل یہ ہے کہ) اگر تصدیق قلبی نہ حاصل ہو اور انقیاد ظاہری محض تلوار کے خوف سے ہو تو یہ نفاق اصلی ہے اور اس قسم کا نفاق رکھنے والا منافق اور (کھلم کھلا) کافر دونوں آخرت (کے عذاب دائمی) میں برابر ہیں بلکہ منافقین تو جہنم کے سب سے نیچے کے طبقے میں ہوں گے۔ اور اگر تصدیق تو حاصل ہے لیکن جوارح کا وظیفہ (اعمال) فوت کرنے والا ہے ایسے شخص کو فاسق کہا جاتا ہے اور اگر تصدیق کے ساتھ قلب کا وظیفہ (مثلاً خشوع وغیرہ) فوت کرنے والا ہے تو یہ بھی ایک قسم کا نفاق ہے اور اسی کو بعض سلف نے نفاق عملی کہا ہے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان پر طبیعت کا حجاب (عوارض طبعیۃ بشریہ) اور رسومات (رسم ورواج کی پابندی) اور حق تعالیٰ کی سوئے معرفت (شیطانی وساوس جو خلاف توحید ورسالت آویں اور نفس ان کو برا نہ سمجھے اور دفع نہ کرے اور نفس اس سے متصف ہو جائے) یہ چیزیں غالب آجاتی ہیں تو وہ شخص دنیا اور خاندان اور اولاد کی محبت میں اس طرح سے منہمک ہو جاتا ہے کہ آخرت کی جزا وسزا (کے عقیدے) کا استبعاد اور گناہوں پر جری ہونے کا خیال چیونٹی کی چال کی طرح (آہستہ آہستہ) اسکے قلب پر چلتا ہے اور اس کی اسے خبر تک نہیں ہوتی اگرچہ عقلی طور پر ان میں سے ضروری امور کا معترف بھی ہوتا ہے یا (کبھی یہ بھی صورت ہوتی ہے کہ) اسلام کے احکام کو سخت جان کر اسے برا سمجھنے لگتا ہے یا (کبھی یہ ہوتا ہے کہ) کسی خاص کافر سے محبت اور تعلق پیدا کر لیتا ہے جو اس کو اعلاء کلمۃ اللہ سے روک دیتا ہے۔

نیز حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفہیمات میں تحریر فرماتے ہیں:۔

السادس الکشف عن الملکات المتحجرۃ فی القلب مایبعث الرجل علی غمط الحق وفساد فی الارض والکلمۃ الجامعۃ فی النفاق انہ فنی فی ملکۃ رذیلۃ اعنی بذالک ان تکون الملکۃ راسخۃ فی قلبہ قلما صدر عنہ قول او فعل الا وھی البطانۃ فیہ والباعثۃ علیہ فقد تکون ھذہ الملکۃ بخلا وقد تکون شغلا بلذائذ الاطعمۃ ونقائس الالبسۃ والمنکح الشھی والمسکن الوضی وغیرھا وقد یکون حسداً وحقداً وبالجملۃ فلہ شعب کثیرۃ واشدھا ما اجتمع فیہ عدۃ من الرزائل فخلص منھا ھیئۃ وحدانیۃ فنی فیھا النفس وذکر فی الاحادیث والآیات ما فیہ غنا للمتبصر کالافساد فی الارض وصلۃ ما امر اللہ بہ ان یقطع والشح المطاع والھوی المتبع واعجاب کل ذی رای برایہ واذا خاصم فجر واذا عاھد غدر واذا احدث کذب والذین یبخلون ویأمرون الناس بالبخل والذین یؤذون المومنین بالمناجاۃ فیما بینھم والبذاء والفحش وغیرھا واکثر وجوہ النفاق وجوداً الفۃ الطبع بالمحسوسات ولا یتفطن ان وراءھا امر لیس شاکلتہ کشاکلتھا من الالھیات فیزیغ من التشبیہ ویتخذ من دون اللہ اربابا من المعادیات فلا یجد لھا بالاوان اقربھا فی مجاری العادات کما قص اللہ تعالیٰ علینا فی الحدیث الرجلین حیث قال احدھما مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِیْدَ ھٰذِہٖٓ اَبَدًا وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَۃَ قَآئِمَۃً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰی رَبِّیْ لَاَجِدَنَّ خَیْرًا مِّنْھَا مُنْقَلَبًا فلیس معناہ الانکار الجازم ولکن رسوخ الالف واستبعاد ھذہ الامور وان اقربھا فی مجاری العادات وبالجملۃ فصلوٰتہ ودعاؤہ وصدقہ وذکرہ امایقع کسائر العادات لایجد لھا بالا ولنشاطا واما الاتقاء مایعظم بھا الرجل فی اعین الناس وھی اقبح من الاولیٰ۔ (تفہیمات الٰہیہ ص۳۰۶)

ترجمہ:۔ بحث ششم یہ ہے کہ روکنا ان ملکات سے جو قلب میں پتھر کی طرح چمٹ گئے ہیں جو باعث ہوتے ہیں آدمی کو حق کی تحقیر اور فساد فی الارض پر۔ اور نفاق کے مفہوم کی جامع تعریف یہ ہے کہ انسان ملکۂ رذیلہ میں فنا ہو جائے۔ مطلب اس فنا ہو جانے کا یہ ہے کہ وہ ملکہ اس کے قلب میں اس طرح راسخ ہو جائے کہ اس سے کسی قول یا فعل کا صدور نہ ہوتا ہو مگر یہ کہ یہی ملکہ اس کا سبب اصلی اور باطنی اور باعث ہو اور وہ قول و فعل اس کی فرع ہو۔) پس کبھی تو وہ ملکہ بخل ہوتا ہے اور کبھی لذیذ کھانوں کی خواہش میں انہماک اور کبھی عمدہ عمدہ لباس اور دل پسند عورتیں اور پسندیدہ قیام گاہ وغیرہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی حسد و حقد بن کر سامنے آتا ہے حاصل کلام یہ کہ اس (نفاق) کی صورت یہ ہے کہ کسی انسان میں متعدد رذائل جمع ہوں اور ان کے مجموعہ سے ایک ہیئت وجدانی حاصل ہو جائے جس میں نفس فنا ہو جائے اور (نفاق کی شعب کثیرہ کی تفصیل کا بیان) حدیث و قرآن میں اس حد تک آچکا ہے ایک صاحب بصیرت کے لئے وہ بہت کافی ہے مثلاً زمین میں فساد مچانا جسے اللہ تعالیٰ نے قطع کرنے کو فرمایا ہے اسے جوڑنا بخل کی پیروی کرنا خواہشات نفسانی کا اتباع کرنا ہر رائے والے کا اپنی ہی رائے کو پسند کرنا اور مثلاً یہ کہ جب جھگڑا کرے فحش کلامی پر اتر آئے اور جب عہد کرے توڑ دے اور جب بات کرے جھوٹ بولے (قرآن شریف میں ہے کہ) اور وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کا حکم کرتے ہیں اور وہ لوگ جو مسلمانوں کو ایذا دیتے ہیں۔ یعنی آپس میں ان کے متعلق سرگوشی کرتے ہیں اور مثلاً گالی گلوچ کرنا اور فحش بکنا وغیرہ۔ اور نفاق کی قسموں میں سے کثیر الوقوع طبیعت کا محسوسات کے ساتھ مالوف ہونا ہے اسکے ہوتے ہوئے نفس باور نہیں کرتا کہ ان محسوسات کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہو سکتی ہے جو اس جیسی نہ ہو (مثلاً الٰہیات میں کی کوئی چیز لہٰذا ایسی طبیعت رکھنے والا انسان تشبیہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے (یعنی الٰہیات کو محسوسات کے ذریعہ سمجھنا چاہتا ہے) اور اللہ کے علاوہ دوسرے ارباب تجویز کر لیتا ہے یا مثلاً معاد کا کوئی مسئلہ کہ اس کے بھی (محسوس نہ کرنے کی وجہ سے ماننے میں کوئی رغبت نہیں پاتا اگرچہ رسم و رواج کے طور پر وہ اس کا اقرار کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دو شخصوں کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے ان میں سے ایک کہنے لگا کہ میرا تو خیال نہیں ہے کہ باغ کبھی بھی برباد ہو اور میں قیامت کو نہیں خیال کرتا کہ آدیگی اور اگر میں اپنے رب کے پاس پہنچایا گیا تو ضرور

اس باغ سے بہت زیادہ اچھی جگہ ملے گی۔ پس اس کے معنی یقینی انکار کے نہیں ہیں۔ لیکن ہاں محسوسات کا رسوخ اور ان امور کا مستبعد سمجھنا (انکار کا باعث بنا) اگرچہ اپنے رسم و رواج میں اس کا اقرار بھی کیا حاصل کلام یہ کہ ایسے شخص کی نماز اور دعا صدقہ اور ذکر وغیرہ یا تو واقع ہوتا ہے مثل دیگر امور عادیہ کے کہ وہ ان میں کوئی رغبت اور نشاط نہیں پاتا اور یا ان سے ان امور کا وقوع اس لئے ہوتا ہے کہ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی وجہ سے انسان لوگوں کی نگاہوں میں بُرا سمجھا جاتا ہے اور یہ شق پہلی سے زیادہ قبیح ہے۔

اور روح المعانی میں ہے کہ:۔

آیۃ المنافق ثلاث اذاحدث کذب واذا وعد اخلف و اذا اؤتمن خان ویستفاد عن الصحاح آیۃ اخری له اذاخاصم فجر واستشکل ذلك بان ھذہ الخصال قد توجد فی المسلم الذی لا شك فیه ولا شبهة تعتریه بل کثیر من علمائنا الیوم المتصفون باکثرھا اوبھا کلھا واجیب بان المعنی ان ھذہ الخصال نفاق وصاحبھا یشبه المنافقین فی التخلق بھا والمراد بقوله علیه الصلوٰۃ والسلام علی مافی بعض الروایات الصحیحة اربع من کن فیه کان منافقا خالصا انه کان شدید الشبه بالمنافقین لا انه کان منافقا حقیقة۔

(روح المعانی ص۱۲۹ ج ۱)

ترجمہ:۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں جب بات کہے جھوٹ بولے جب وعدہ کرے اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس کوئی چیز امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے اور صحاح میں اس کی ایک اور نشانی کا ذکر ہے وہ یہ کہ جب جھگڑا کرے تو فحش کلامی پر اتر آئے لیکن ان امور کے علامات (منافق ہونے پر) ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ ان علامات والے تو کافر تھے اور اب یہ عادتیں تو ایک ایسے مسلمان میں بھی پائی جاتی ہیں جس کے اسلام میں کوئی شک و شبہہ نہیں ہوتا اور (عام مسلمان تو درکنار) ہمارے زمانہ کے اکثر علماء ان میں سے اکثر کے ساتھ بلکہ سبھی کے ساتھ متصف ہیں اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ ساری عادتیں (چونکہ) نفاق کے عادات میں سے ہیں لہٰذا جسکے اندر

یہ بھی پائی جائیں گی۔ وہ ان کے ساتھ متصف ہونے میں منافقین کے مشابہ ہوگا (کہ جس طرح یہ منافق میں ہوا کرتی ہیں اس میں بھی ہیں) اسی طرح وہ جو بعض روایات میں آیا ہے کہ چار چیزیں ہیں جس کسی میں وہ (سب) ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا۔ اس سے بھی مراد یہ ہے کہ ایسا شخص شدید الشبہہ بالمنافقین ہے (یعنی منافقین سے بہت زیادہ مشابہ ہے) نہ کہ حقیقی منافق (یعنی کافر)

روح المعانی میں منافقین کی خصال کا مسلمان میں پائے جانے کا شبہہ اور اس کا جواب دیکھ کر میرا ایک عرصہ کا تردد مرتفع ہوا وہ یہ تھا کہ اکثر مسلمانوں میں (کیا عوام کیا خواص) دیکھتا تھا کہ یہی باتیں جن کو علامات نفاق کہا جا رہا ہے پائی جا رہی ہیں علامات و شرط کا پورے طریقے پر پایا جانا مشروط کے تحقق کا متقاضی ہوتا تھا لیکن نفس ایمان کا ان میں موجود ہونا اس حکم سے مانع ہوتا تھا خیال کرتا تھا کہ یا اللہ ایسے لوگوں کو کس میں شمار کیا جائے اور ان پر کیا حکم لگایا جائے اگر ان کو منافق کہا جائے تو کیوں کر کہا جائے جب کہ ایمان ان میں موجود ہے اور اگر مخلصین میں شمار کیا جائے تو کیسے جب کہ غیر مخلصین کے اوصاف سے متصف ہیں یہ ایک بڑا خلجان تھا جو درپیش تھا۔ جب کہ روح المعانی کی عبارت نظر سے گزری بڑی مسرت ہوئی۔ کہ مدت کی ایک گتھی سلجھ گئی ایسے لوگوں کا حکم معلوم ہو گیا یعنی یہ کہ وہ مسلمان ہونے کے باوجود شبیہہ المنافقین بلکہ شدید الشبہہ بالمنافقین ہیں اس سے اصلاح میں بہت مدد ملی کہ پہلے طبیعت جھجکتی تھی حکم معلوم کرنے کے سبب اب یہ خلجان جاتا رہا اطمینان ہو گیا۔ اور نفع بھی اس سے زیادہ دیکھ رہا ہوں۔

الغرض یہ بحث نہایت مشکل ہے اور علماء نے اس کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے مگر افسوس کہ ہماری غفلت نے ان مباحث سے آنکھ بند کر لی ہے میں سمجھتا ہوں کہ نفاق کی شاید ہی کوئی خصلت ہو جو ہم میں نہ ہو یہ ہم نے مانا کہ ہم منافق اعتقادی نہیں مگر منافقین کے خصال ہم میں موجود ہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی ان خصال پر لازمی ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیضاوی شریف میں نقل کیا ہے کہ آیت پہلی جو منافق کے بارے میں (وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ آمَنَّا الآیہ) اس کا شان نزول ابھی نہیں آیا بعد میں آئے گا اور یہ ظاہر ہے کہ اس وقت کے بارے میں یہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کثرت سے بعد میں لوگ اس کے مصداق ہوں گے کہ گویا اس کا مصداق آیا ہی نہیں حدیث میں ہے۔ ما امنہ الا منافق وما خافہ الا مؤمن اب نفاق کے لفظ کے گھبراتے ہیں حالاں کہ ظاہر و باطن رگ و پے میں یہ سرایت کئے ہوئے ہے اب جب مرض کو صحت سمجھے تو اصلاح کی کیا امید رہی۔

حضرات علماء کا کام یہ ہے کہ جو برا حال لوگوں پر غالب ہو اس کو سمجھ کر اس کی اہمیت پیدا کریں اور اس سے تحذیر کریں۔ اور اس پر سخت انکار کریں اور اس میں ملامت خلق کی پرواہ نہ کریں۔ امید ہے کہ چند روز میں بہت اہمیت اور برائی ان کی مستحضر ہو جائے گی جب برائی پیش نظر ہو جاتی ہے تو ترک آسان ہو جاتا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ علماء اس کی اہمیت دل سے پیدا کریں اور اس سے ڈریں اور لوگوں کو ڈرائیں۔ اس کا تعلق مخلوق کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور خالق کے ساتھ بھی جب اس کی اصلاح ہوگی دونوں ٹھیک ہو جائیں گے۔

امید ہے کہ میری سمع خراشی معاف کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ آمین۔ ثم آمین

دُعَاء

اللھم طھر قلبی من النفاق وعملی من الریاء ولسانی من الکذب وعینی من الخیانتہ فانک تعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضمیمہ

تحذیر العلماء عن خصال السفہاء

حامداً ومصلیاً ومسلماً "رسالہ تحذیر العلماء عن خصال السفہاء" جس کی تمہید میں مسلمانوں کی پستی کا سبب ان کی اخلاقی کمزوری بالخصوص نفاق عمل میں اُن کا عام ابتلا بتلایا گیا ہے کہ کم از کم علماء اگر اس طرف توجہ کریں کہ اپنی اخلاقی اصلاح کرکے متدین اور مخلص بن جائیں تو عام مسلمانوں کی اصلاح بسہولت ہو سکتی ہے۔

نفاق جس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نفاق اعتقادی جس کا درجہ کفر سے بھی بدتر ہے اور ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔

دوسری قسم نفاق عملی۔ یہ نفاق ایمان کے ساتھ جمع تو ہو سکتا ہے لیکن خلاف اخلاص ہونے کی وجہ سے یہ بھی نہایت مہلک اور خطرناک ہے (نفاق کی اس قسم میں نہایت غلط فہمی ہو رہی ہے) کہ نہ تنہا عوام بلکہ خواص بھی نفاق (منہی عنہ) کو صرف پہلی قسم میں منحصر سمجھتے ہیں اور دوسری قسم کے (خطرناک اور مہلک ہونے) سے عموماً بے خبر ہیں اس لئے اس میں ابتلا کے باوجود اپنے کو مخلص (و بے خطر) سمجھتے ہیں (اور) جب کہ مرض کا احساس ہی نہیں بلکہ اس کو صحت سمجھ بیٹھے ہیں تو اس کے علاج کی بھی فکر نہیں اس لئے یہ مرض باوجودیکہ قابل علاج تھا لیکن اس عدم احساس نے اس کو لاعلاج بنا دیا ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ایک حکیم اسی مضمون کو اس طرح بیان کرتا ہے ؎

کسی نے یہ بقراط سے جاکے پوچھا مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

اس لئے یہاں چند احادیث اور اقوال سلف سے نفاق کی دوسری قسم کے وجود اور اس کے مہلک ہونے کو ثابت کیا جاتا ہے جس کے بعد ہر ذی حس محسوس کرے گا کہ نفاق کی ایک قسم نفاق علمی بھی ہے اور یہ کہ فی زمانہ اس میں عوام بلکہ خواص عام طور پر مبتلا ہیں اور اس کے نفاق علمی کا انجام بد بتلاکر اس سے احتراز کی تدبیر بھی بتلائی جائے گی۔ امید ہے کہ اس کے مطالعے سے نفاق کی حیثیت منکشف ہو جائے گی اور اس کی قباحت اور شناعت ذہن نشین ہو کر بیخ و بن سے استیصال ہو جائے گا۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو مفید و نافع فرمائیں آمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نفاق کا مفہوم اور مصادیق

نفاق:- جس کا دوسرا نام پالیسی ہے۔ اور جس کو میں سکہ رائج الوقت کہا کرتا ہوں ایک قلبی مرض ہے اور اخلاص کی بالکل ضد اور مقابل ہے اس کی دو قسمیں ہیں کبھی تو یہ اعتقاد میں پایا جاتا ہے اور کبھی اس کی دست اندازی صرف عمل تک محدود ہوتی ہے عقائد اس سے محفوظ ہوتے ہیں یہ قسم نفاق کی ایمان کے ساتھ بھی جمع ہو سکتی ہے اور کمی بیشی کے اعتبار سے اس کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔

۱۔ نفاق کی دو قسموں کا ثبوت حدیث سے

امام احمد بن حنبلؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اقلب ایسا ہوتا ہے

جس میں ایمان کے ساتھ نفاق بھی موجود ہوتا ہے۔ وھو ہذا

عن ابی سعیدؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم القلوب اربعۃٌ قلب اجرد فیہ مثل السراج یزھر وقلب اغلف مربوط علیٰ غلافہ وقلب منکوس وقلب مصفح فاما قلب اجرد فقلب المومن سراجہ فیہ نورہ۔ واما قلب الاغلف فقلب الکافر واما المنکوس فقلب المنافق عرف ثم انکر واما قلب المصفح قلب فیہ ایمان ونفاق فمثل الایمان فیہ کمثل البقلۃ یمدھا الماء الطیب ومثل النفاق فیہ کمثل القرحۃ یمدھا القیح والدم فای المدتین غلبت علی الاخری غلبت علیہ۔ (مسند احمدؒ ۳ ص ۱۷)

ترجمہ:۔ حضرت ابو سعیدؓ سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ نے کہ (انسان کے) قلوب چار قسم کے ہوتے ہیں ایک قلب تو اجرد ہوتا ہے (یعنی بالکل چٹیل) غل اور غش سے پاک اور صاف لیکن اس میں چراغ جیسی کوئی شئے بھی (نہایت ہی) روشن اور چمکدار موجود ہوتی ہے اور ایک قلب اغلف ہوتا ہے (یعنی) غلاف سے ڈھکا ہوا۔ اور ایک قلب ہوتا ہے مصفح (آگے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم تفصیل فرماتے ہیں) بہر حال قلب اجرد تو یہ مومن کا قلب ہے اور اس کا چراغ تو اس کا نور ایمان ہے۔ اور قلب اغلف یہ کافر کا قلب ہے اور قلب منکوس یہ منافق کا قلب ہے کہ حق کو پہچانا اور پھر اس کے بعد منکر ہو گیا اور قلب مصفح پس یہ ایسا قلب ہے جس میں ایمان بھی ہے اور نفاق بھی ایمان کی مثال اس میں سبزہ کی سی ہے کہ عمدہ پانی جسے بڑھاتا ہے۔ اور نفاق کی مثال (جو) قلب میں (ہے) مانند پھوڑے کے ہے کہ جس میں پیپ اور خون کے ذریعہ سے ترقی ہوتی ہے اور ان ہر دو چیزوں میں سے جو ترقی کر کے غالب آجائے۔ اسی (کے اثر) کا غلبہ ہوگا اور انسان پر وہی وصف غالب ہوگا۔

دیکھئے اس حدیث میں تصریح ہے کہ ایک قلب ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس میں ایمان کے ساتھ نفاق بھی جمع ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان ہر دو میں باہم کشاکش جاری رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ایک وقت میں اچھی خاصی باتیں کرتا ہوتا ہے اعمال بھی ایمان کے تقاضے کے مطابق اسی سے واقع ہوتے ہیں لیکن وہی انسان ہے کہ دوسرے وقت بالکل اس کے خلاف عمل کا ارتکاب کرنے لگ جاتا ہے یہ کیا چیز ہے یہ انھیں دونوں وصفوں کی جنگ ہے کہ جو بھی ان میں سے غالب آتی ہے انسان پر بھی اس کا رنگ غالب ہو جاتا ہے آج مسلمانوں کے زیادہ تر

افراد کے قلوب اسی چوتھی قسم کے مصداق ہیں اور افسوس اس کا ہے کہ اس قسم کی باتوں کا کوئی بتانے والا بھی نہیں ہے۔

۲۔ نفاق کی دو قسموں کا ثبوت علامہ کرمانی کے بیان سے۔

یہی حاصل ہے علامہ ابن حجرؒ کی اس عبارت کا جسے انھوں نے فتح الباری شرح بخاری میں علامہ کرمانیؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں۔

والنفاق لغۃ مخالفۃ الباطن للظاھر فان کان فی اعتقاد الایمان فھو نفاق الکفر والا فھو نفاق العمل ویدخل فیہ الفعل والترک وتتفاوت مراتبہ۔

(فتح الباری ج ۱ ص ۶۷)

لغت میں نفاق کہتے ہیں باطن کا ظاہر کے خلاف ہونا۔ پس اگر تخالف اعتقاد ایمان میں ہے تب تو یہ نفاق کفر کے (مرادف ہے) ورنہ اس کا نام نفاق عمل ہے اس میں مامورات اور منہیات سب داخل ہیں اور اس کے مراتب (انسان میں اوصاف نفاق کے ایک یا متعدد موجود ہونے کی وجہ سے) مختلف ہوتے ہیں۔

۳۔ نفاق کی تقسیم کا اثبات خطابی کے قول سے۔

قال الخطابی النفاق ضربان احدھما ان یظھر صاحبہ الدین وھو مبطن الکفر وعلیہ کان فی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والآخر ترک المحافظۃ علی امور الدین سرًا ومراعاتھا علنًا وھذہ ایضًا یسمی نفاقًا کما جاء سباب المؤمن فسوق وقتالہ کفرٌ وانما کفر دون کفر وفسق دون فسق ونفاق دون نفاق۔ (فتح الملہم ج ۱ ص ۱۳۲)

ترجمہ:۔ خطابی فرماتے ہیں کہ نفاق کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ صاحب نفاق اظہار دین کا کرے اور درپردہ کفر میں مبتلا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسے ہی منافق تھے اور دوسری قسم یہ کہ درپردہ تو امور دین کی محافظت نہ کرے اور ظاہراً امور دین کی رعایت رکھے یہ بھی نفاق کہلاتا ہے

جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ مومن کے ساتھ بدزبانی کرنا کفر ہے اور ایک کفر ایک کفر سے کم۔ ایک فسق ایک فسق سے کم اور ایک نفاق ایک نفاق سے کم ہوتا ہے۔

۴۔ نفاق کی دوسری قسم کا عقلی ثبوت احیاء العلوم سے

کیا منافقین کا وجود اس زمانہ میں بھی ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ منافقین جن کی مذمت قرآن کریم میں بکثرت آئی ہے یہ ایک ایسی جماعت تھی جو زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھی نہ تو اس سے پہلے کبھی کوئی منافق ہوا اور نہ بعد میں یہ سلسلہ باقی رہا یہ خیال جتنا غلط ہے اس سے زیادہ تعجب خیز ہے حق تعالیٰ جل شانہ نے کتاب اللہ کو شروع ہی فرمایا ہے انسانوں کی تقسیم کے ساتھ کہ ایک قسم متقین کی بیان فرمائی ہے دوسری کافرین کی تیسری منافقین کی۔ عقل نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ قرآن کریم چونکہ قیامت تک کے لئے قانون الٰہی بن کر آیا ہے لہٰذا ہمیں جان لینا چاہئے کہ ہر زمانہ میں انسانوں کی تین قسمیں ہوں گی۔ کیوں کہ کسی چیز کے بارے میں دو ہی قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں ایک تو اس کے ماننے والے اور ایک نہ ماننے والے پھر ماننے والوں کی دو قسمیں ہوں گی یا تو دل و زبان ہر دو سے مانیں گے یا محض زبان سے ماننا ظاہر کریں گے دل میں انکار ہوگا نہ ماننے والے کو کافر دل و زبان سے ماننے والے کو مومن اور صرف ظاہری ماننے والے کو منافق کہا جائے گا۔ اب ہم اسی سوال کے جواب کے سلسلہ میں امام غزالیؒ کی کتاب احیاء العلوم کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ سنئے:۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم اکثر منافقی ھذہ الامۃ قراءھا۔

قال حذیفہ المنافقون الیوم اکثر منھم علی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم نکانوا اذذاک یخفونہ وھم الیوم یظھرونہ وھذا النفاق یضاد صدق الایمان وکمالہ وھو خفی فقد قیل للحسن البصری یقولون ان لا نفاق الیوم فقال یا اخی لو ھلک المنافقون لا ستوحشتم فی الطریق وقال ھو اوغیرہ لو نبتت للمنافقین اذناب ماقدرنا ان نطاء علی الارض باقدامنا۔

(ملخصاً من احیاء العلوم ص۱۳۴ ج ۱)

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس میری اُمت کے منافقین میں کے بیشتر لوگ (وہ ہوں گے) جو اس کے (علماء اور) قراء ہوں گے (اعاذنا اللہ منہ)

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ آج کل منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک سے کہیں زیادہ موجود ہیں (فرق یہ ہے) کہ وہ لوگ نفاق کو چھپاتے رہتے تھے (کیونکہ اس کے ظہور میں ذلت اور رسوائی تھی) اور یہ آج کل کے لوگ (اپنی ڈھٹائی کی وجہ سے) اسے ظاہر کرتے ہیں اور یہ نفاق صداقت ایمانی اور اس کے کمال کے خلاف ہے اور ایک مخفی شئے ہے۔ حضرت حسن بصریؒ سے کہا گیا ہے کہ لوگ تو کہتے ہیں کہ اب آج کل نفاق کا وجود ہی نہیں ہے۔ فرمایا کہ اے میرے بھائی (کون کہتا ہے) اگر منافقین (سب کے سب) ہلاک ہو جائیں تو تم آبادی میں راستہ چلنے ڈرو، اور وحشت کھاؤ (کیونکہ آبادی کی رونق ہی ختم ہو جائے گی) ہر طرف خالی خالی مکانات ہی نظر پڑیں گے جنھیں دیکھ کر ظاہر ہے کہ وحشت ہوگی انھیں (حسن بصریؒ) کا مقولہ ہے یا کسی اور کا ہے کہ اگر (بالفرض) منافقین کے دُم نکل آوے تو ہمارا روئے زمین پر قدم رکھنا دشوار ہو جائے (کیونکہ) یہ لوگ اس قدر کثرت سے موجود ہیں کہ کچھ جگہ تو خود گھیریں گے اور کچھ ان کی دُم گھیرے گی تو زمین کا کوئی حصہ خالی نہ ملے گا۔

۵۔ نفاق علمی کے وجود کا ثبوت شاہ ولی اللہؒ کی عبارت سے

(صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم تک نفاق سے ڈرا کرتے تھے۔)

مجدد عصر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے الخیر الکثیر میں تحریر فرمایا ہے کہ نفاق کی ایک قسم یہ ہے کہ انسان اپنے قلب و زبان سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتا ہو لیکن زبان و دل اور شرمگاہ وغیرہ سے معاصی کے ارتکاب کی وجہ سے اس کو خطیئات نے ہر چہار طرف سے گھیر رکھا ہو پس جس شخص کی یہ کیفیت ہو چکی ہو کہ وہ اپنے گناہوں میں بالکل فنا ہو گیا ہو یعنی گناہ کا ارتکاب اس کی سرشت اور طبیعت ثانیہ بن چکی ہو وہ منافق ہے (اور یہ نفاق وہ ہے) جو ایمان کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے اور حضرات صحابہؓ اسی نفاق سے ڈرا کرتے تھے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ ہیں:-

المنافق فی عرف الشرع یطلق علی معنیین الاول ھو المصدق بقلبہ ولسانہ

باللہ و برسولہ و قد احاطت بہ خطیئات من قبل اللسان والفرج والقلب و غیرھا وکل من احاطت بہ خطیئۃ ای فنی فیھا نوع فناء فھو المنافق بالمعنی الاول و ایاہ کانت الصحابۃ یخافون۔ (التخیر الکثیر ص۱۳۶)

ترجمہ: منافق کا شرعی اطلاق دو معنوں پر آتا ہے ایک یہ ہے کہ قلب و زبان سے اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرے اور زبان اور شرمگاہ اور قلب وغیرہ کی جانب سے (صادر ہونے والے) معاصی نے اس کا احاطہ کر رکھا ہو۔

پس جس شخص کے معاصی نے اس کا احاطہ کر لیا ہو یعنی جو شخص ان گناہوں میں ایک طرح پر بالکل فنا ہو گیا ہو وہ بھی ایک معنی کر منافق ہے اور اسی قسم کے نفاق سے صحابہ کرامؓ خوف فرماتے تھے۔

۶۔ نفاق کے وجود پر صحابہ کے خطرۂ نفاق سے استدلال

احیاء العلوم میں ہے کہ ابن ابی ملیکہؒ نے فرمایا کہ میں نے ایک سو تیس اور ایک روایت میں ہے کہ ایک سو پچاس اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا ہے کہ سب کے سب نفاق سے بہت ڈرا کرتے تھے اور یہ بھی کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت حذیفہ (صاحب سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی حضور کے رازداں) سے اپنے بارے میں دریافت فرماتے رہتے تھے کہ اے حذیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام منافقین میں تو نہیں شمار فرمایا ہے اس قسم کا نفاق رکھنے والا مسلمان صدیقین کے مراتب سے محروم اور ایک زمانہ تک جہنم کے عذاب سے مغموم ہوگا۔

۷۔ قباحت نفاق قرآن سے

اب میں علامہ شعرانیؒ کی ایک عبارت (کہ دراصل وہی محرک ہوئی اس ساری تحریر کی نقل کرتا ہوں۔ وہ اپنی کتاب المیزان میں نہایت ہی عجیب اور بہ مؤثر طرز سے بیان فرماتے ہیں۔

وقد ذم اللہ سبحانہ وتعالیٰ منافقی الکفار بنفاقھم زیادۃ علی حصول ذمھم بصفۃ کفرھم فی نحو قولہ تعالیٰ یٰاَیُّهَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ الخ

ومعلوم ان کل ما عابہ اللہ تعالیٰ علی الکفار فالمسلمون

ادنی بالتنزہ عما یقرب بہ من شبہ صورتہ۔

(المیزان للشعرانی)

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے ان کافرین کی جو منافق بھی تھے (یعنی کفر اور نفاق دونوں صفات سے متصف تھے ان کی) مزید مذمت ان کے وصف نفاق کے ساتھ کی ہے باوجودیکہ اپنے صفتِ کفر کے ذکر ہونے کی وجہ سے ان کی مذمت حاصل ہوچکی تھی۔ مثلاً اپنے اس قول میں فرماتے ہیں کہ اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو لوگ ڈوڑ دوڑ کر کفر میں گرتے ہیں آپ کو وہ مغموم نہ کریں خواہ وہ ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے منھ سے تو (جھوٹ موٹ) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کے دل یقین (یعنی ایمان) نہیں لائے۔ (دیکھئے اس آیت میں پہلے الذین یسارعون فی الکفر فرمایا اس سے معلوم ہوگیا کہ وہ لوگ کفر سے متصف ہیں مگر صرف اتنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ الذین قالوا آمنا بافواھھم الخ کہہ کر ان کی مذمت میں اضافہ فرمادیا یعنی نہ صرف یہ کہ وہ لوگ کافر ہیں بلکہ وصف نفاق کے ساتھ بھی متصف ہیں۔

اور یہ تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ جس وصف کو اللہ تعالیٰ نے کافروں تک کے لئے باعث عیب قرار دیا ہو (یعنی جو قبیح میں کفر سے بھی بڑھ کر ہو) اسی لئے تو مزید مذمت کا ذریعہ بنا مسلمانوں کا اس وصف سے اجتناب کرنا تو ضروری ہے ہی ان کو تو (اس) کے مشابہ بلکہ (اس کے کسی قریبی) وصف سے بھی دور رہنا چاہئے (اس لئے کہ جو صفت اس درجہ قبیح ہو کہ کسی بُرے کے لئے مزید قباحت کا باعث ہوسکے وہ کسی اچھے کے لئے جس درجہ قبیح ہوگی ظاہر ہے۔

یہی ایک بات آج اگر مسلمانوں کی سمجھ میں آجائے تو ان کی دینی غیرت اور فطری شرافت میں تحریک پیدا کردینے اور ان کو نفاق سے نفرت دلا کر کے اس کا قلع قمع کر دینے کے لئے بہت کافی ہے اور وہ یہ ہے کہ نفاق کافر کے لئے بھی عیب ہے تا بہ مسلمان چہ رسد۔

۸۔ نفاق کے مرض اور مذموم ہونے کا عقلی ثبوت۔

حاصل کلام یہ کہ جب ہم میں یہ مرض یقیناً موجود ہے تو اس کے ازالہ کی طرف خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ دین تو دین دنیا میں بھی اس وصف کی کھپت نہیں۔ اہل سلطنت اپنے مخالف اور معاند کے قیام کو گوارا کر لیتے ہیں اور ان سے چوکنے رہتے ہیں لیکن جو ظاہراً موافق ہو اور باطناً ان کا

مخالف اس کے وجود کو کسی طرح برداشت نہیں کیا جاتا۔ جب مخلوق اس صفت کو بری نظر سے دیکھتی ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ اس سے خوش ہوں گے اور اس کے رکھنے والوں کیساتھ رضا کا معاملہ فرمائیں گے اور کیا اس قسم کے افراد کی بہتات اور کثرت کے باوجود کوئی قوم کبھی فلاح پا سکتی ہے آج ہمارا حال تو یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ نے جن جن اوصاف کو ناپسند فرمایا تھا ایک ایک کر کے ہم ان سے متصف ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمیں بھی وہی کچھ ملے جو سچے مسلمانوں کو ملنا چاہیے بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے ؎

ایں خیال ست و محال ست و جنوں

۹۔ اخلاص اور نفاق کی علامت۔

منافق کو اپنے نفاق سے خوف نہیں ہوتا۔ امام غزالیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ نفاق سے بعید تر وہ شخص ہے جس کو اپنے متعلق نفاق کا ڈر لگا ہوا ہو اور اس سے قریب تر وہ شخص ہے جو اپنے تئیں یہ سمجھ رہا ہو کہ میں اس سے بری ہوں۔

وقال رجل لحذیفۃؓ اخاف اللہ ان اکون منافقا فقال لوکنت منافقا ماخفت النفاق ان المنافق قد امن من نفاق ما خافہ الا مؤمن وما امنہ الا منافق۔

ترجمہ:۔ حضرت حذیفہ سے کسی نے کہا کہ میں خدا سے ڈرتا ہوں اس بارے میں کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہوں انھوں نے جواب دیا کہ اگر تم منافق ہوتے تو تمھیں نفاق کا ڈر نہ ہوتا اس لئے کہ منافق کو اپنے نفاق سے امن ہوتا ہے۔

نفاق سے مومن ہی خوف زدہ ہوتا ہے۔ اور نفاق سے منافق ہی مامون ہوا کرتا ہے۔

۱۰۔ مرض نفاق کے تعدیہ کا ثبوت قرآن سے

صاحب روح المعانی نے آیت فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مرض کی جو تفسیر کی اس میں ہمارے سبق کے لئے کافی سامان موجود ہے۔ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:۔

المرض علی ماذهب الیه اهل اللغة حالة خارجة عن الطبع ضارة بالفعل ویطلق علی اثره وهو الالم وعلی الظلمة وعلی ضعف القلوب وفتورہ کما قال غیر واحد ویطلق مجازاً علی مایعرض المرء مما یخل بکمال نفسه کالبغضاء والغفلة وسوء العقیدة والحسد وغیرذالك من موانع الکمالات المشابهة لاختلال البدن من الملاذ المودیة الی الهلاك الروحانی الذی هو اعظم من الهلاك الجسمانی والمنقول عن ابن مسعود وابن عباس ومجاهد وقتادة وسائر السلف الصالح حمل المرض فی الاٰیة علی المعنی المجازی ولاشك ان القلوب المنافقین کانت ملاٰی من تلك الخبائث التی منعتهم مامتعتهم واصلتهم الی الدرك الاسفل من النار (روح المعانی ج ۱ ص ۱۳۸)

ترجمہ:۔ مرض اہل لغت کے نزدیک وہ حالت ہے جو انسان کی طبیعت سے تو خارج ہو مگر سرِ دست اس کو تکلیف اور اس کو نقصان پہنچا رہی ہو۔ مرض کے ایک معنیٰ ہیں اثر یعنی تکلیف کے اور ایک معنی آتے ہیں تاریکی کے اور ایک معنی ہیں قلب کے کمزوری اور سستی کے یہی معنی بہت سے لوگوں نے بیان کئے ہیں اور مجازی طور پر مرض ایسی حالت کو بھی کہتے ہیں جو انسان پر عارض ہو۔ اور اس کے روحانی کمالات و ترقی میں خلل انداز ہو جیسے غفلت بدعقیدگی اور حسد وغیرہ (وہ تمام اوصاف) جو مانع کمالات ہیں اور مشابہ ہیں امراض جسمانیہ کے اور مانع ہیں لذات روحانیہ سے اور ایسی ہلاکت روحانی کی طرف پہنچانے والے ہیں جو ہلاکت جسمانی سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ اور ابن عباس اور مجاہد اور قتادہ اور تمام صالحین سے منقول ہے کہ یہاں آیت میں یہی معنی مجازی مراد ہیں۔ اور بلاشبہہ ان منافقین کے قلوب ان خبیث امراض (روحانیہ) سے بھرے ہوئے تھے جنھوں نے آخر کار ان لوگوں کو روک ہی دیا۔ اس (نعمتِ اسلام) سے جن سے کہ روکنا چاہا تھا اور جو جہنم کے سب سے نیچے طبقہ میں انھیں پہنچا کر رہا۔

۱۱۔ انجام نفاق۔

امام غزالی رحمۃ اللہ نے نفاق کی دونوں قسموں کا انجام اور ان سے متصف ہونے

والوں کا حشر مطلوب بیان فرمایا ہے۔

النفاق نفاقان احدھما یخرج من الدین ویلحق بالکافرین ویسلك فی زمرۃ المخلدین فی النار والثانی یفضی بصاحبه الی النار مدۃ او ینقص درجات العلیین ویحط من رتبة الصدیقین۔

(احیاء العلوم ج ۱ ص ۱۳۷)

ترجمہ:۔ نفاق کی دو قسمیں ہیں ان میں سے ایک تو بالکل دین وایمان سے انسان کو خارج کر کے کافروں کے ساتھ ان کو ملحق کر دیتا ہے اور ان لوگوں کے زمرہ میں داخل کر دیتا ہے کہ جن کا انجام ابدالآباد جہنم ہے اور دوسری قسم اپنے سے متصف ہونے والے کو ایک مدت کے لئے جہنم رسید کر دیتی ہے۔ اور علیین کے درجہ سے اس کو کم اور صدیقین کے مرتبہ سے محروم بنا دیتی ہے۔

۱۲۔ عبرت باحوال منافقین۔

دیکھا آپ نے مفسرین نے غذا میں کن امور کو منافقین کا مرض قرار دیا ہے یہی بے توجہی بغض وعداوت کینہ حسد اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معاذ اللہ سوء عقیدت وہ چیزیں تھیں جو ملکہ بن کر ان کے قلوب میں اچھی طرح راسخ ہو چکی تھیں۔ انھیں صفات نے انھیں شک اور ریب میں مبتلا کر رکھا تھا جس میں یوماً فیوماً وہ بڑھتے ہی رہے یہی سب صفات تھیں جس کے مجموعہ کا نام نفاق تھا قرآن کریم میں ان آیات کے ذکر فرمانے سے صرف یہی غرض نہیں ہے کہ اگلے زمانے کے لوگوں کے حالات واوصاف بیان کر دئے جائیں اور بس بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہر زمانہ میں لوگ اپنے حالات کو اس کی آیات پر منطبق کریں اور اسی سے اپنے بارے میں خود کوئی فیصلہ کر لیا کریں۔ یہ امر مسلّم ہے کہ اس زمانے کے منافقین میں یہ اوصاف عقیدت کے درجہ میں تھے لیکن کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ آج ہم میں اکثر وبیشتر افراد ایسے موجود نہیں کہ جو اعتقادی نہ سہی عملی طور پر غفلت، بغض، حسد اور سوء عقیدت وغیرہ جملہ اوصاف سے متصف ہیں اگر یہ صحیح ہے تو بتائیے کہ ہم سے حق تعالیٰ کی ناراضگی کیوں نہ ہو اور ہم ان سے متصف ہوتے ہوئے لطف وکرم کے مورد کیسے ہو سکتے ہیں۔ راز اس میں یہ ہے کہ یہ سب اخلاق

کفار کے ہیں اور مومن کفار کے اخلاق اختیار کر کے ایمانی کمالات سے متصف نہیں ہو سکتا بلکہ محروم رہے گا ہاں اگر ہم بد اخلاقیوں کی اصلاح کر لیں اور صفت اخلاص کے ساتھ متصف ہو جائیں پھر کامیابی اور عزت ہمارے قدم چومے گی۔

۱۳۔ نفاق کا علاج۔

نفاق کی حقیقت آپ کو معلوم ہو چکی ہے یہ بھی آپ نے جان لیا کہ منافق کے متعلق اسلام میں کتنی زجر و توبیخ موجود ہے ایک جانب اس کو سامنے رکھئے اور ایک طرف اپنے افعال و اعمال پیش نظر رکھئے اور ان پر ان کا انطباق کیجئے۔ اور پھر خود ہی فیصلہ کیجئے کہ ہم میں یہ مرض موجود ہے یا نہیں اور ہمیں اپنے کو اس سے پاک کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر ہر دو سوال کا جواب ایجاب میں ہو تو وہ طریقہ معلوم کرنا چاہئے جس کے ذریعہ یہ مہلک مرض قلب سے دور ہو جائے جس کے دور ہونے ہی پر اس کی جگہ اخلاص آئے گا۔ نیتوں کی اصلاح ہو گی اور حسب ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات ہمارے اور دوسرے دینی اور دنیوی کام بھی درست ہو جائیں گے۔ اور پھر انشاء اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فلاح دارین نصیب ہو گی۔ یہی میرے نزدیک کام کا طریقہ ہے ورنہ اگر یہ اندر اندر یہ ناسور بڑھتا رہا اور ہم محض ظاہری مرہم پٹی کے دیتے رہے اور صرف ظاہری کی اصلاح پر قانع اور مطمئن رہے تو یہ نہ مفید ہے نہ عقل کے مطابق ہے۔

۱۴۔ اخلاص کے حصول کا طریقہ۔

رہا خلوص کے حصول کا طریقہ تو وہ یہ ہے کہ اہل اخلاص سے اس کو حاصل کیا جائے ان سے تعلق قائم کیا جائے اور ان کے اقوال و احوال کو برابر پیش نظر رکھا جائے ان کی صحبت میں کچھ دنوں رہا جائے ناممکن ہے کہ عزم کے بعد اس کا کوئی حصہ نصیب نہ ہو اہل اللہ کی صحبت میں بڑی تاثیر ہوتی ہے صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے اس کی تاثیر کو کس قدر دلکش انداز میں شیخ سعدیؒ نے بیان فرمایا ہے ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے　　رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری　　کہ از بوئے دل آویز تو مستم

بگفتا من گلے ناچیز بودم ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ترجمہ:۔ مجھے ایک دفعہ حمام میں خوشبودار مٹی (کا ایک ڈھیلا) اپنے ایک محبوب کے ہاتھ سے ملا میں نے اس سے پوچھا کہ اے مٹی تو مشک ہے یا عنبر ہے کیوں کہ میں تیری دل آویز خوشبو کی وجہ سے مست ہو گیا ہوں اس نے جواب دیا کہ میں ایک ذلیل مٹی ہوں ہاں البتہ کچھ دنوں پھول کی صحبت میں رہی ہوں اس ہمنشیں کے جمال کا اثر ہے (جو خوشبو مجھ سے آرہی ہے) ورنہ میری حقیقت تو وہی مٹی ہے۔ جو کہ میں ہوں۔

۱۵۔ دُعاء

اب اس دعاء پر تتمہ کو ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اس کو مقبول و نافع بنائے۔ آمین

اللھم طھر قلبی من النفاق وعلمی من الریاء ولسانی من الکذب وعینی من الخیانتہ فانک تعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

۲۶ ذی الحجہ ۸۲؁ھ فتح پور تال نرجا ضلع اعظم گڈھ

اضافہ **(میرے یہاں کا سب سے بڑا وظیفہ)** از ناقل

فرمایا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں تو بہت سے عالم اور پیر ایسے ہیں جو عوام الناس سے صلح کئے ہوئے ہیں یعنی ہم تو ان سے جو چاہتے ہیں کرا لیتے ہیں ہم کو ان کے مرید ہیں لیکن رائے وغیرہ میں وہی ہمارے تابع ہیں مگر یہ ایسے کیوں ہیں کہ ان کے یہاں ہماری بات بھی چلتی نہیں اور ہم ہی سے اتباع کا مطالبہ کیا جاتا ہے ہم مرید بھی ہیں اور اتباع بھی کریں ہدیہ بھی ہمیں دیں اور رائے بھی ہماری معتبر نہ ہو۔ اب تو آپ لوگوں کی بھی سمجھ میں آگیا ہوگا میرا جرم بھی اور آنے جانے والوں کی مجھ سے ناراضی کا سبب بھی۔

اور اس میں شک نہیں کہ عوام کی اس قسم کی جسارت میں خود ہمارا قصور ہے کیونکہ ہم لوگوں نے عوام کو کچھ کہنا سننا بالکل ہی ترک کر دیا ہے اسی سے تو قوم کا مزاج بگڑا جب دس کو وہ ایک رنگ میں دیکھتے ہیں اور ایک کو اس سے مختلف اور اپنے نفس کے بھی خلاف۔ تو ظاہر ہے کہ اس ایک کی بات وہ کیوں مانیں گے اور اس کو اجماع کے خلاف عمل کرنے پر کیوں نہ نشانۂ ملامت بنائیں گے۔

آج اگر سب کے سب علماء اور مشائخ اصلاح کا کام کرتے لوگوں سے اخلاص کا مطالبہ کرتے اور ان کی منافقانہ حرکات پر روک ٹوک کرتے اور انھیں کی بداخلاقیوں کا آئینہ ان کے سامنے رکھ دیتے جس میں وہ اپنی حقیقت دیکھ لیتے تو مجال تھی کہ کوئی جاہل کسی عالم کے بارے میں لب کشائی کی جرأت کرتا مگر جب ہم نے اپنے کو اس قابل ہی نہیں رکھا کہ لوگوں کو ہم پر اعتماد ہو اور ان کے دل میں ہماری عظمت قائم ہو۔ بلکہ ان کے محتاج ہی بنے رہے تو بھلا وہ کیوں ہماری اتباع کرنے لگے اسی مضمون کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ یوں بیان فرماتے تھے کہ یہاں بزرگی وزرگی تو تقسیم نہیں ہوتی بلکہ انسان بنایا جاتا ہے لہذا جس کو انسان بننا ہو وہ تو یہاں آوے اور جس کو بزرگ بننا ہے تو وہ کہیں اور جاوے۔

علیٰ ہذا میں بھی یہی کہتا ہوں کہ میرے یہاں کا سب سے بڑا وظیفہ اخلاص ہے اسے پیدا کیجیے یہ حاصل ہو جائے تو سمجھئے کہ سب کچھ حاصل ہو گیا اور اگر یہی نہیں ہوا تو سب کچھ حاصل ہونے پر بھی کچھ حاصل نہیں۔

(وصیۃ الاحسان صفحہ ۴۷)

لیس منا من لم یجل کبیرنا و یرحم صغیرنا و یعرف لعالمنا

جو ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کرے اور ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور ہمارے علماء کا حق نہ پہچانے وہ میری اُمّت میں سے نہیں ہے

رسالۂ نافعہ مسمّی بہ

توقیر العلماء

از افادات

مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا و مرشدنا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

ایک دن شرح فقہ اکبر مصنفہ حضرت ملّا علی قاریؒ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں اس کی فصل العلم والعلماء بھی نظر سے گزری۔ اس کے مسائل پڑھ کر بڑی عبرت ہوئی اور معاً یہ خیال ہوا کہ ایسے حالات تو ہر زمانہ میں پیش آتے ہیں بلکہ اس زمانہ میں زیادہ پیش آتے ہیں اور احکام نہ معلوم ہونے کی وجہ سے عوام سے اس باب میں بھی بڑی کوتاہیاں ہوتی ہیں۔

اس لئے جی چاہا کہ اس کا ترجمہ اور کسی قدر توضیح کر دی جائے تاکہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ان احکام سے واقفیت ہو اور پھر ان کے لئے عمل آسان ہو جائے

وما توفیقی الا باللہ

محرم الحرام ۱۳۷۹ھ

وصی اللہ عفی عنہ

۲۳۔ بخشی بازار (روشن باغ) الہ آباد ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

علماء شرع کا احترام و تأدب اور ترک ایذاء واجب ہے

علماء ربانی اور مشائخ حقانی کا ادب اور احترام شرعاً واجب ہے۔ نیز ان کی ہر قسم کی ایذاء سے جن کی شرعاً اجازت نہیں ہے بچنا ضروری ہے۔ جیسے عناد یا حسد کی وجہ سے ان کا انکار کرنا وغیرہ چنانچہ روح المعانی میں ہے کہ:۔

نعم من اتصف بصفات الاولیاء ظاهراً یجب تعظیمه واحترامه والتأدب معه والکف عن ایذائه بشیء من انواع الایذاء التی لا مسوغ لها شرعاً کالانکار علیه عناداً او حسداً۔ (روح المعانی ص۱۳۲ ج ۱۱)

ترجمہ:۔ ہاں جو شخص بظاہر اولیاء کی صفات سے متصف ہو تو اس کی بھی تعظیم و احترام اور اس کا ادب کرنا واجب ہے اور ہر اس نوع کی ایذاء رسانی سے رکنا ضروری ہے جس کی شرعاً اجازت نہ ہو۔ مثلاً محض عناد یا حسد کی وجہ اس کا انکار کرنا وغیرہ۔

عالم سے بلا کسی سبب ظاہری کے بغض رکھنا بوجہ اس کے کہ یہ مرادف ہے شریعت سے بغض رکھنے کے کفر ہے

فقہ اکبر جو امام ابو حنیفہؒ کی تصنیف ہے اس کی شرح، شرح فقہ اکبر جو ملا علی قاریؒ کی نہایت معتبر کتاب ہے اس میں علم اور علماء کی تعظیم کی ایک فصل قائم کی ہے اس میں ہے کہ:۔ خلاصہ میں ہے کہ جو شخص کسی عالم دین سے بغیر کسی سبب ظاہری کے بغض اور عداوت رکھے تو اس پر کفر کا اندیشہ ہے۔ آگے حضرت ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ــــ میں کہتا ہوں

کہ نہ صرف یہ کہ اندیشہ ہے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ کفر ہے۔

عالم دین سے بغض شریعت سے بغض ہے

اس لئے کہ جب بدون کسی ظاہری دینی یا دنیوی سبب کے کسی عالم سے بغض رکھا تو درحقیقت یہ اس کی ذات سے بغض نہیں ہے بلکہ شریعت سے بغض ہے (یعنی محض اس وجہ سے اس عالم سے عداوت ہے کہ وہ شریعت کی ترویج کرتا ہے اچھی باتوں کا حکم کرتا ہے اور بری باتوں سے لوگوں کو روکتا ہے) اور جو شخص شریعت کا انکار کرے وہ کافر ہے چہ جائیکہ اس سے بغض رکھے خلاصہ کی عبارت یہ ہے:۔

مِنْ اَبْغَضَ عَالِماً من غیر سبب ظاہر خیف علیہ الکفر۔ قلتُ الظاہر انہ یکفر لانہ اذا ابغض العالم من غیر سبب دنیوی اواخروی فیکون بغضہٗ لعلم الشریعۃ۔ ولا شک فی کفر من انکرہ فضلاً عمن ابغضہ۔ (شرح فقہ اکبر صـ۲۱۳)

ترجمہ:۔ جس شخص نے کسی عالم سے بغیر کسی سبب ظاہری کے بغض رکھا تو اس پر کفر کا اندیشہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ وہ کافر ہی ہو جاوے گا اس لئے کہ جب اس نے بلا کسی دینی یا دنیوی سبب کے کسی عالم سے بغض رکھا تو اس کا یہ بغض دراصل علم شریعت سے بغض ہوگا اور جو شخص کہ شریعت کا انکار کرے وہ تک کافر ہے چہ جائیکہ جو شخص اس سے (معاذ اللہ) بغض رکھے۔

عالم کا استخفاف انبیاء علیہم السلام کا استخفاف ہے!

فتاویٰ ظہیریہ میں ہے کہ کسی عالم نے لب کے بال کتروائے اس پر کسی شخص نے کہہ دیا کہ دیکھو تو کیسا برا معلوم ہو رہا ہے یا یہ کہا کہ "لب کتروانا اور عمامہ کے کنارے کو ٹھڈی کے نیچے سے باندھنا نہایت معیوب معلوم ہوتا ہے۔" تو یہ کہنے والا کافر ہو جائے گا اس لئے کہ یہ ایک عالم دین کا استخفاف ہے اور یہ کفر ہے۔ اس لئے کہ عالم کا استخفاف مستلزم ہے استخفاف انبیاء علیہم السلام کو کیونکہ علماء، انبیاء کے وارث ہوتے ہیں (پس) نائب کی اہانت منیب کی اہانت متصور ہوگی (ضرب الغلام اہانۃ المولیٰ) اور انبیاء علیہم السلام کی اہانت اور استخفاف کا کفر ہونا ظاہر ہے۔ پس قص شارب (لب کتروانا) جو کہ سب انبیاء کی سنت ہے اس کی تقبیح گویا انبیاء کی تقبیح ہوئی کیونکہ

یہ ان کی سنت ہے اور اس کی تقبیح کفر ہے۔

ظہیریہ کی عبارت جو ملا علی قاری رحؒ نے نقل فرمائی ہے یہ ہے۔

من قال لفقيه اخذ شاربه ما اعجب قبحاً او اشد قبحاً قص الشارب ولف طرف العمامة تحت الذقن يكفر لانه استخفاف الانبياء يعني وهو مستلزم لاستخفاف الانبياء وقص الشارب من سنن الانبياء فتقبيحه كفر (شرح فقہ اکبر ص۲۱۳)

ترجمہ:۔ جس نے کسی عالم سے اسکے لب کترائے ہوئے ہونے پر یہ کہا کہ بہت برا معلوم ہوتا ہے یا یہ کہا کہ لب کترانا اور عمامہ کو ٹھوڑی کے نیچے باندھنا بہت ہی برا معلوم ہوتا ہے تو کافر ہو جائے گا اس لئے کہ یہ علماء دین کا استخفاف ہے اور مستلزم ہے حضرات انبیاء علیہم السلام کے استخفاف کو اس لئے کہ علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں اور لب بنوانا بھی سنن انبیاء سے ہے لہذا اس کی تقبیح کفر ہوگی۔

معلم قرآن اور واعظ و مذکر بھی عالم دین ہیں اس لئے ان کی اہانت بھی کفر ہے

استاد نجم الدین کندی سمرقندیؒ سے منقول ہے کہ جو شخص بطور تمسخر یہ کے معلم کے ساتھ تشابہ اختیار کرے اور ہاتھ میں چھڑی لے کر بچوں کو مارے گویا معلم قرآن کا مذاق اڑا رہا ہے تو کافر ہو جائے گا اس لئے کہ معلم قرآن بھی منجملہ علمائے شریعت کے ہے لہذا قرآن یا معلم قرآن کا استہزاء کفر ہوگا۔

(شرح فقہ اکبر)

اور فتاویٰ ظہیریہ میں ہے کہ لوگ شراب کی مجلس میں ہیں۔ ایک شخص ان میں سے اونچی جگہ پر بیٹھ کر ہنسی مذاق کی باتیں کر رہا ہے اور مذکر کی نقل اتار رہا ہے اور خود بھی ہنستا ہے اور لوگ بھی ہنس رہے ہیں تو یہ سب لوگ کافر ہو جائیں گے اس لئے کہ مذکر اور واعظ بھی منجملہ علماء کے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے نائب ہیں لہذا ان کی بھی اہانت انبیاء کی اہانت ہوگی اس لئے کفر ہے۔

علماء کی مجلس کو گرجا یا اس کے مشابہ کسی چیز کی طرف نسبت کرنا کفر ہے!

خلاصۃ الفتاوی میں ہے کہ کوئی شخص کسی عالم کی مجلس علم سے واپس آیا تو دوسرے لوگوں نے کہا کہ یہ گرجے وغیرہ سے آرہا ہے تو یہ بھی کفر ہے۔ اس لئے کہ اس نے شریعت کی جگہ کو اور ایمان کے مقام کو کفر اور کافروں کی جگہ قرار دیا۔

(شرح فقہ اکبر)

عالم دین کی تحقیر بھی موجب کفر ہے

شرح فقہ اکبر میں ہے کہ جس شخص نے کسی عالم کو عویلم کہہ کر یا کسی علوی کو علیوی کہہ کر پکارا یعنی صیغہ تصغیر کے ساتھ تحقیراً کہا اور مقصود اس کا استخفاف ہے تو کافر ہو جائے گا۔

اسی طرح سے کسی شخص نے کسی عابد سے کہا کہ بیٹھو جی۔ بس کرو (بہت زیادہ عبادت نہ کرو جنت کے اس پار نکل جاؤ گے یا ایسا نہ ہو کہ کہیں جنت سے بھی آگے نکل جاؤ) ـــ تو کافر ہو جائے گا کیونکہ یہ اس عابد کا اور اس کی عبادت کا استہزاء اور مذاق اڑانا ہے۔

جواہر میں ہے کہ جس شخص نے کسی عالم کے بارے میں یہ کہا کہ اگر فلاں قبلہ یا جہت قبلہ بھی ہو جائے تو میں ان کی جانب توجہ نہیں کروں گا ـــ تو کافر ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس کا یہ فعل تو ابلیس کے فعل کی طرح ہے کہ وہ بھی سجدہ سے رکا تھا جب کہ آدم علیہ السّلام جہت قبلہ بنائے گئے تھے۔

اسی طرح سے جس شخص نے کسی صالح شخص سے یہ کہا کہ تم سے ملنا میرے نزدیک سور سے ملنا ہے تو اس پر کفر کا اندیشہ ہے جب کہ اس کے اور اس کے مابین کوئی دینی یا دنیوی جھگڑا نہ ہو۔

(شرح فقہ اکبر صـ۲۱۶)

عالم کی مجلس میں آواز بلند کرنا بھی منع ہے

ابوحیانؒ نے بیان کیا ہے کہ عالم کی موجودگی میں رفع صوت مکروہ ہے اور ایذا اور اہانت کے قصد سے ایسا کرنا بعید نہیں کہ حرام ہو۔ بالخصوص اس کے لئے جس کی ایذا اور اہانت حرام ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ حرمت کے مراتب اور درجات مختلف ہیں جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

(روح المعانی صفحہ ۱۲۰ ج ۲۶)

علماء اور کبراء کی تعظیم مامور بہ ہے

حضرت شعبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے ایک جنازہ کی نماز پڑھی جب وہ جانے لگے تو میں نے ان کی سواری (خچر) ان کے قریب کر دیا تاکہ آپ اس پر سوار ہو جائیں اتنے میں ابن عباسؓ آئے اور انھوں نے اس کی رکاب پکڑلی۔ حضرت زید نے فرمایا کہ اے ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو اس کو چھوڑ دیجئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ہم کو علماء اور کبراء کے ساتھ اسی طرح کی تعظیم و تکریم کا حکم دیا گیا ہے یہ سن کر حضرت زید بن ثابتؓ نے آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور کہا کہ ہم کو بھی اسی طرح سے حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنے نبی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے ساتھ تعظیم و توقیر کا برتاؤ کریں۔

(احیاء العلوم صفحہ ۵۴ ج ۱)

عالم کی تعظیم کا ایک عجیب واقعہ

اخلاق محسنی میں ہے کہ اسماعیل سامانی جو خراسان کا بادشاہ تھا اور بہت ساز و سامان والا تھا ایک دن ایک عالم کسی ضرورت سے اس کے پاس آئے۔ اس نے ان کی بہت زیادہ تعظیم و تکریم کی جب وہ واپس ہونے لگے تو سات قدم ان کے پیچھے مشایعت کیلئے چلا۔ رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ تشریف لائے ہیں، اور فرما رہے ہیں کہ اے اسماعیل! تو نے میری امت کے ایک عالم کی اتنی تعظیم و تکریم کی میں نے حق تعالیٰ سبحانہٗ سے دعا کی ہے کہ تجھ کو دونوں جہاں میں عزیز کرے اور تو نے

سات قدم جو ان کی مشایعت میں چلے ہیں تو میں نے دعا کی ہے کہ تیری نسل سات پشت تک بادشاہی کرے۔ اور یہ میری دونوں دعائیں تیرے حق میں قبول بھی ہو گئی ہیں۔

سبحان اللہ! دیکھا آپ نے ایک عالم دین کی تعظیم کا یہ دنیوی صلہ ہے جو اس بادشاہ کو ملا اور آخرت کے اجر کا تو پوچھنا ہی کیا۔

(اخلاق محسنی باب تواضع)

دوسرا واقعہ:۔ روح المعانی میں ہے کہ ابو عبیدؒ کے فضائل کے منجملہ یہ واقعہ شمار کیا جاتا ہے جو انھوں نے خود بیان کیا کہ "میں نے کبھی کسی عالم کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا یہاں تک کہ جب وہ اپنے وقت پر خود ہی باہر تشریف لائے تب میں نے ان سے ملاقات کی۔

تیسرا واقعہ:۔ حبر العلماء حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس قرآن شریف سیکھنے جایا کرتے تھے تو جب اُن کے مکان پر پہنچتے تو کنڈی کھٹکھٹاتے نہیں تھے بلکہ دروازہ ہی پر کھڑے رہتے یہاں تک کہ حضرت ابیؓ خود ہی باہر تشریف لاتے۔ حضرت ابیؓ کو ابن عباسؓ کا اس طرح سے انتظار کرنا شاق گزرتا ایک دن فرمایا کہ اے ابن عباس تم نے کنڈی کیوں نہ کھٹکھٹا دی ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ عالم اپنی قوم میں محترم اور معظم ہوتا ہے۔ (اس لئے میں نے کنڈی کھٹکھٹانے کو خلاف ادب سمجھا)

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ میں نے اس واقعہ کو اپنے بچپن میں کسی کتاب میں دیکھا تھا چنانچہ الحمد اللہ کہ میں نے بھی اپنے مشائخ کے ساتھ یہی عمل رکھا۔

فالحمد للہ تعالیٰ علیٰ ذالک۔

(روح المعانی ص ۱۳۱ ج ۲۶)

دین کا استہزاء کفر ہے!

محیط میں ہے کہ کوئی شخص اونچی جگہ پر بیٹھا عالم کی نقل کر رہا ہے اور لوگ آ آ کر بطور مذاق اور استہزاء کے اس سے مسائل دریافت کرتے ہیں پھر اس کو تکیہ وغیرہ سے مارتے ہیں اور پھر آپس میں خوب ہنستے ہیں تو اس حرکت کی وجہ سے سب کے سب کافر ہو گئے اس لئے کہ انھوں نے دین اور شرع کا استخفاف کیا

علم فقہ کی اہانت کفر ہے!

محیط میں ہے کہ کوئی عالم اپنی فقہ وغیرہ کی کتاب کسی شخص کی دوکان پر رکھ کر کہیں چلا گیا واپس آیا اور ادھر سے گزرا تو دوکاندار نے کہا کہ مولانا! آپ اپنی آری یہاں بھول گئے ہیں عالم نے کہا کہ تمہارے یہاں میں نے کتاب رکھی ہے آری تو نہیں رکھی۔ دوکاندار نے کہا کہ ارے ایک ہی بات ہے بڑھئی آری سے لکڑی کاٹتا ہے اور آپ لوگ اس کتاب سے لوگوں کا گلا کاٹتے ہیں یا ان کا حق کاٹتے ہیں۔ عالم نے امام فضلیؒ سے اس کی شکایت کی انھوں نے اس شخص کے قتل کیے جانے کا حکم دیا اس لئے کہ فقہ کی کتاب کا استخفاف کر کے وہ مرتد ہو گیا اور مرتد کی سزا قتل ہے۔

شریعت کی اہانت کفر ہے!

شرح فقہ اکبر میں ہے کہ جس شخص نے کہا کہ شرع وغیرہ سے مجھے کچھ فائدہ نہیں اور نہ میرے نزدیک وہ نافذ ہے۔ تو کافر ہو جائے گا۔

محیط میں ہے کہ کسی کے سامنے شریعت کا ذکر آیا اس کو سن کر اس نے قصداً اور تکلفاً ڈکار یا مکروہ قسم کی کوئی آواز نکالی جیسے کسی چیز کو برا اور مکروہ سمجھتے ہوئے آدمی منہ بناتا ہے اور آواز نکالتا ہے۔ اور کہا کہ یہ ہے شرع ـــــ تو کافر ہو جائے گا۔ کیونکہ اس نے شرع کی اہانت کی۔

ظہیریہ میں ہے کہ کسی شخص سے کہا گیا کہ اٹھو جاؤ یا آؤ چلیں مجلس علم میں اس پر اس نے کہا

کہ یہ لوگ جو باتیں بیان کرتے ہیں کون ان پر عمل کر سکتا ہے یا یہ کہا کہ مجھے علم دین کی مجلس سے کیا لینا ـــــ تو کافر ہو جائے گا

پہلا جواب تو اس لئے کفر ہے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ شخص تکلیف مالایطاق کا قائل ہے یعنی یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے امور کا بھی انسان کو مکلف بنایا ہے جو اس کی طاقت سے بالاتر ہوں حالانکہ نص قرآنی ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔

اور دوسرا جملہ اس وقت کفر ہے جب کہ اس کی مراد یہ ہو کہ علماء کی مجلس میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے چنانچہ جواہر میں ہے کہ اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ علماء جو بیان کرتے ہیں کون اس پر عمل کر سکتا ہے تو کافر ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس سے یا تو تکلیف مالایطاق لازم آتا ہے اور یا نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ علماء جو کچھ بیان فرماتے ہیں اس میں انبیاء علیہم السلام پر جھوٹ لگاتے ہیں اور اس کا کفر ہونا ظاہر ہے۔

نیز تتمہ میں ہے کہ جس شخص نے کسی سے کہا کہ علم دین کی مجلس میں نہ جاؤ اگر تم گئے تو تمھاری بیوی حرام ہو جائے گی یا اس کو طلاق پڑ جائے گی ـــــ تو کافر ہو جائے گا۔ مذاق کے طور پر کہا ہو یا واقعی کہا ہو۔

فتاوی صغریٰ میں ہے کہ اگر کسی نے کہا کہ ایک پیالہ ثرید کا علم سے بڑھ کر ہے تو کافر ہو جائے گا اس لئے کہ اس نے دین کا استخفاف کیا۔ اسی طرح سے اگر کسی نے فتویٰ کو زمین پر پھینک دیا بطور اہانت کے تو کافر ہو جائے گا۔

تتمہ میں ہے کہ جس شخص نے شریعت کی اہانت کی یا ان مسائل کی اہانت کی جن کی شریعت میں ضرورت پڑتی ہے تو کافر ہو جائے گا۔

اسی طرح جو شخص کسی کے تیمم کرنے پر ہنسا تو کافر ہو جائے گا۔ کیونکہ شریعت کے ایک مسئلہ کا استخفاف کیا۔

اسی طرح سے جس شخص نے کہا کہ نہ میں حلال جانوں نہ حرام اور اس کی مراد یہ ہے کہ ان دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے یا میں حرام کو بھی حلال اور حلال کو بھی حرام جانتا ہوں تو کافر ہو جائے گا۔ ہاں اگر یہ مراد ہو کہ میں جاہل اور ناواقف ہوں تو یہ کفر نہیں ہے۔

محیط میں ہے کہ کوئی عالم علم کی باتیں بیان کر رہا ہے یا حدیث صحیح روایت کر رہا ہے یعنی جو کہ ثابت ہے موضوع نہیں ہے اس پر کسی نے کہا ہے کہ یہ سب کچھ نہیں ہے مقصد اسکا رد کرنا ہے یا یہ کہا کہ یہ سب باتیں کیا کام آویں گی روپیہ پیسہ ہو تو خیر کام آوے یعنی ان سب میں مشغول ہونے کے بجائے روپیہ پیسہ ہی کمانے میں مشغول ہونا چاہیئے اس لئے کہ اس زمانہ میں جو قدر و منزلت روپیہ کی ہے وہ علم کی نہیں ہے ــــ تو کافر ہو جائے گا اس لئے کہ یہ معارضہ ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کہ اللہ کے لئے اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے اور مومنین ہی کے لئے عزت ہے۔ اور اس ارشاد کا کہ اللہ تعالیٰ ہی کا کلمہ بلند ہے۔

اسی طرح سے جس شخص نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے سے یہ کہا کہ میں علم حاصل کر کے کیا کروں گا یا میں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر کے کیا کروں گا۔ میں نے اپنے آپ کو جہنم میں ڈال رکھا ہے یا یہ کہا کہ میں نے تو اپنے آپ کو جہنم میں ڈال رکھا ہے یا یہ کہا کہ میں نے تو اپنے نفس کو دوزخ کے لئے تیار کیا ہے یا یہ کہا کہ میں نے اپنا تکیہ یا اپنی کہنی یا اپنا رخسارہ جہنم میں ڈال رکھا ہے تو کافر ہو جائیگا اسلئے کہ اس نے شریعت کی اہانت کی۔

ظہیریہ میں ہے کہ اگر کسی سے کہا کہ جب تم نے روپے لئے تھے اس وقت شرع وغیرہ کہاں تھی؟ تو اگر شریعت کا استخفاف کرتے ہوئے کہا ہے تو کافر ہو جائے گا۔

شرح فقہ اکبر میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ماموں رشید کے زمانۂ خلافت میں اس شخص کا دریافت کیا گیا جس نے کسی نوجوان کو قتل کر دیا ہو۔ مجیب نے جواب دیا کہ قاتل کے ذمہ ایک جوان باندی ہے جو ناز و انداز والی ہو۔ ماموں نے یہ جواب سن کر حکم دیا کہ مجیب کی گردن اڑا دی جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ کہا کہ یہ حکم شرع کے ساتھ استہزاء اور اس کے حکم کا مذاق اڑانا ہے اور یہ کفر ہے۔

اسی طرح تیمور کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن اس کی طبیعت کچھ افسردہ اور منقبض سی تھی اس لئے چپ چاپ سا تھا لوگ سوالات کرتے تھے اس کا جواب بھی نہ دیتا تھا۔ اتنے میں خوش طبعی کرنے والوں کی ایک جماعت اس کے پاس آئی۔ چنانچہ وہ لوگ آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگے۔ ایک شخص نے ان میں سے کہا کہ میں فلاں شہر کے قاضی کے یہاں گیا ہوا تھا اور رمضان شریف کا مہینہ شروع ہو چکا تھا تو میں نے اس سے کہا کہ اے شریعت کے حاکم

فلاں شخص نے رمضان کے روزوں کو کھالیا میرے پاس اس کے گواہ موجود ہیں۔ یہ سن کر ان قاضی صاحب نے فرمایا کہ کاش کوئی اور شخص نماز کو بھی کھا جاتا تو ہم ان دونوں سے چھٹکارا پا جاتے ______ اور یہ سب اس لئے کہا کہ امیر تیمور کو ہنسی آجائے اور اس کا قبض دور ہو جائے لیکن تیمور نے یہ سن کر کہا کہ ظالمو ہمکو ہنسی دل لگی کے لئے بس شریعت ہی ملی تھی؟ یہ کہا اور اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ اللہ تعالیٰ اس ذات پر رحم فرمادے جس نے دین اور شریعت کی تعظیم و توقیر کی اور اس کا بول بالا کیا۔ (شرح فقہ اکبر ص ۲۱۷)

توضیح

علماء کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ علماء دین کا احترام اور توقیر واجب ہے بلکہ ایمان کی علامت ہے اور ان کی اہانت اور استخفاف حرام بلکہ کفر ہے۔

علماء نے اس مسئلہ کے لئے اصول پھر جزئیات بیان فرمائے تاکہ لوگ ان سے بچیں اور اپنے ایمان کی حفاظت کریں۔ اور چونکہ علماء نے حالات کے مشاہدے کے بعد اس قسم کے امور کو بیان فرمایا ہے لہٰذا اس کی ضرورت بھی معلوم ہوئی چنانچہ آج ہم بھی دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے قلوب میں نہ دین کی وقعت باقی رہ گئی ہے اور نہ اہل دین کی۔ لوگ بالکل آزاد اور بیباک ہو گئے ہیں۔ بڑے سے بڑے عالم دین کی اہانت اور اس کی استخفاف ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اور یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اگر کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں تو یہ نہیں کہ دوسرے لوگ ان کو منع کریں اور ان کو سمجھائیں کہ یہ سب جہالت اور فتنہ و فساد کی باتیں ہیں اس لئے ان سے اجتناب کرنا چاہئے۔ بجائے اس کے ہوتا یہ ہے کہ سب کے سب عوام انھیں کے ساتھی اور ہمنوا ہو جاتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ اور انجام سے قطعی بے خبر ہوتے ہیں۔ نہ ان کو خدا تعالیٰ ہی کا خوف اس امر شنیع سے باز رکھتا ہے اور نہ مخلوق ہی سے یہ لوگ شرماتے ہیں کہ یہی خیال کریں کہ دین سے ہم کو حصہ ہی کیا ملا ہے کہ ہم کسی عالم دین کی شان کی کچھ کہنے سننے کی جراءت بھی کر سکیں اور ہماری کیا مجال کہ ہم جاہل ہو کر دین میں دخل دیں۔

غرض خلق و خالق کا لحاظ اور خیال کئے بغیر نیک لوگوں کی حتیٰ کہ عالم دین اور پیشوائے مذہب کی غیبت شکایت۔ ان سے بدظنی۔ ان کی شان میں بدزبانی اور بدکلامی۔ بلاوجہ ان سے بغض و حسد وغیرہ رکھنے کو اپنا شعار اور معمول بنا لیا ہے حالانکہ آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا کہ جو شخص کسی عالم دین سے بلا کسی سبب ظاہری کے بغض رکھے تو وہ دراصل شریعت سے بغض متصور ہو گا۔ اور یہ شخص کافر ہوگا

ہوسکتا ہے کہ جن کو ہم بُرا سمجھتے ہیں قیامت میں وہ اللہ کے ولی ثابت ہوں

ان مسکینوں کو نہ تو یہ سب باتیں ہی معلوم ہیں اور نہ کوئی ان کا بتانے والا ہے کہ تم یہ کیسا کر رہے ہو اور اے اللہ کے بندو کدھر جا رہے ہو۔ جب کہ علماء نے ان سب باتوں کو لکھا ہے۔ تو عقل کا تقاضا ہے کہ ایسے امور میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا جاوے کہیں ایسا نہ ہو کہ آج تم جن کو بُرا کہہ رہے ہو کل کو قیامت میں ان کو نائب رسول کے مقام پر فائز دیکھو اور ان کی اہانت اور تحقیر کرنے کی وجہ سے اپنا ایمان ہی غائب پاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ کیا خوف کا مقام نہیں ہے اور حسرت کی بات نہیں ہے کہ دنیا میں لوگ اپنے کو مسلمان سمجھ رہے ہیں اور ظاہری نماز و روزہ بھی جاری ہے لیکن علماء اور اولیاء کی شان میں گستاخی اور بدزبانی۔ ان کی توہین و تحقیر بھی کرتے رہتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ خدا کے سامنے پیشی ہو تو اپنے کیے پر ندامت ہو۔ لیکن یہ حقیقت ایسے وقت میں ظاہر ہوگی کہ اس وقت ندامت بھی نفع نہ دے گی

عمل سے زیادہ ایمان کا اہتمام کرنا چاہیے

اس لئے میں تم لوگوں سے یہی کہتا ہوں کہ اس وقت مسلمان بڑے ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں لہذا کسی دوسرے کو بُرا بھلا کہنے کے بجائے آدمی کو اپنے عمل کا جائزہ لینا چاہیے اور عمل سے زیادہ اہتمام ایمان کا کرنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنا ایمان ہی جہالت کی نذر کر دیں سن لیجئے ایمان بڑی دولت ہے اس کی قدر یہاں دنیا میں نہیں معلوم اس لیے کہ اس کا بازار آخرت ہے۔ چنانچہ عمل میں بالفرض اگر کچھ خامی اور کمی بھی رہی تو کام چل جائے گا لیکن ایمان کی کمی تو نہیں پوری کی جا سکتی اس لئے ایمان کی ہر وقت خیر منانی چاہیے اور اس کی حفاظت کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے۔

(اضافہ از ناقل)

فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ اپنی مشہور تالیف تنبیہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ بہت سے مسلمان ایسے ہیں کہ ان کے قبیح اور خبیث اعمال کی وجہ سے آخر عمر میں ان سے ایمان ہی سلب کر لیا جاتا ہے

اور وہ العیاذ باللہ کفر کی حالت میں اس دنیا سے جاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ تمھیں بتاؤ کہ اس سے بڑھ کر اور کون سی مصیبت ہوگی کہ ایک شخص کا نام ساری عمر تو مسلمانوں میں شمار رہا ہو اور قیامت میں وہ کافرین کی صف میں اٹھایا جائے یہ کس قدر حسرت کا مقام ہے اور یہ کوئی حسرت نہیں ہے کہ ایک شخص گرجے سے نکلے یا آتش پرست ہو اور اپنے مندر سے نکلے اور دوزخ میں داخل ہو جائے حسرت کا مقام تو یہ ہے کہ کوئی شخص مسجد سے نکلے اور جہنم میں داخل ہو جائے اور اور ایسا محرمات کے ارتکاب کی وجہ سے ہوا کرتا ہے جسے یہ شخص لوگوں سے پوشیدہ کئے ہوتا ہے چنانچہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ ان کے پاس لوگوں کے مال بطور امانت کے رکھے ہوتے ہیں اور وہ یوں خیال کرتے ہیں کہ اسے خرچ کر لوں پھر دوسرا اپنے پاس سے رکھ دونگا اور اس تصرف کی صاحب مال سے معافی مانگ لونگا۔ لیکن وقت آ جاتا ہے اور خصم کو راضی کئے بغیر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں اسی طرح سے بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ تنہائی میں بیوی سے لڑتے ہیں اور غصہ میں آکر اس کو طلاق دیدیتے ہیں پھر ہوش آنے پر یہ کہتے ہیں کہ میرے بال بچے ہیں کیسے اس عورت کو الگ کردوں چنانچہ اس سے حرام تعلقات قائم کئے رہتے ہیں اور کسی کو اس واقعہ کی اطلاع نہیں ہوتی اور اسی حال میں انکو موت آجاتی ہے پھر بعض مرتبہ بعض حالات کی وجہ سے ان سے ایمان ہی سلب ہو جاتا ہے لہذا اے میرے بھائی! اپنے حالات و معاملات کو موت آنے سے پہلے پہلے درست کر لو یعنی فوراً ان سے تائب ہو جاؤ اس لئے کہ تم کو کچھ خبر نہیں کہ کب موت آجائے اور یہ سمجھ لو کہ عمر قلیل ہے اور اس کے بعد حسرت طویل ہے۔ (تنبیہ الغافلین صفحہ ۱۴۹) راقم جامی

شریعت کا احترام اور علماء کا احترام دونوں لازم و ملزوم ہیں

اس زمانہ میں لوگوں میں بد دینی اور گمراہی جو عام ہوتی جارہی ہے اور شریعت کا احترام جو قلوب میں نہیں باقی رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء کا احترام دلوں میں نہیں ہے۔ شریعت کا احترام علماء کے احترام سے ہوتا ہے اسی طرح سے شریعت کے احترام سے علماء کا احترام ہوگا یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں ـــــ تو جب قلب میں علم دین اور علماء دین ہی کا احترام نہ ہوگا تو پھر اس قلب میں دین کی کیا عظمت رہ سکتی ہے اور اس کو دین کیسے حاصل ہو سکتا ہے

علماء ہی محافظ شریعت ہیں

آج جیسا کچھ بھی دین موجود ہے وہ علماء ہی کی وجہ سے ہے کیوں کہ اتنی بات تو آپ سب

لوگ جانتے ہیں کہ شریعت کی حفاظت ضروری ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور علماء ہی شریعت کے محافظ ہیں اور یہی لوگ اس خدمت کی وجہ سے نائب رسول ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی شریعت کے محافظ حضرات علماء ہی ہیں۔ دین کی حفاظت سب پر فرض تھی اس لئے کہ دین صرف علماء ہی کا نہیں ہے سب کا ہے۔ لیکن حفاظت اس کی علماء ہی فرمارہے ہیں اس لئے اس باب میں بھی ان کا اُمت پر احسان عظیم ہے۔ اس لحاظ سے بھی اُمت کے ذمہ لازم ہے کہ وہ ان کی تعظیم و توقیر کریں۔ اور سنئے:۔

حدیث میں ہے:۔ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل یعنی میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔ یعنی اُمت کے علاوہ کام کریں گے جو بنی اسرائیل میں انبیاء کرتے تھے۔ سبحان اللہ کیا شرف ہے علماء امت کا۔ اور جس طرح سے یہ شریعت قیامت تک باقی رہے گی۔ اسی طرح سے یہ علماء بھی رہیں گے اور دین حق کی خدمت کرتے رہیں گے پس انھیں سے دین بھی حاصل کرنا ہوگا مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

چونکہ شد خورشید و مارا کردہ داغ
چارہ نبود در مقامش جز چراغ

(یعنی جب کہ آفتاب غروب ہوگیا اور ہم کو اپنی جدائی کا داغ دے گیا تو اب اس کی جگہ بجز چراغ کے استعمال کے چارہ کار ہی کیا ہے۔)

چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب
بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب

(یعنی جب کہ گلاب کا پھول نہیں رہ گیا اور گلستاں ہی اُجڑ گیا تو اب اس کی خوشبو کہاں سے حاصل کریں؟ عرق گلاب سے)

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ جب آفتاب چھپ گیا اور اندھیرا ہوگیا تو سوائے چراغ کے اور روشنی کا ذریعہ ہی کیا ہوسکتا ہے۔ حالانکہ آفتاب اور چراغ میں کیا نسبت ہے؟ اسی طرح نبی اور عالم میں بھی کوئی نسبت نہیں مگر جس طرح احتیاج چراغ کی طرف رات میں ہوتی ہے اسی طرح علماء بھی محتاج الیہ ہیں جب انبیاء حضرات تشریف نہیں رکھتے۔

اسی طرح میں نے کہا ہے کہ علماء کا بڑا مرتبہ ہے اور ان کی اہانت شریعت کی اہانت ہے اور

اس سے کفر کا اندیشہ ہے۔ اس لئے ایمان کی حفاظت ضروری ہے۔

دین اور حاملین دین کی اہانت کا انجام

اور میں تو یہ سمجھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے دین کے حاملین ہی اہانت اور تحقیر کی وجہ سے آج مسلمانوں کو یہ روز بد دیکھنا پڑا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ عذاب ہے کہ عام طور سے یہ دیکھتا ہوں کہ لوگوں کی عقل اور فہم رخصت ہی ہو چکی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بالکلیہ ان کے نفس کے حوالہ فرما دیا ہے اور اپنی عون اور مدد ان سے روک لی ہے یہی وجہ ہے جو اس زمانہ میں لوگوں کے مزاج بگڑ گئے ہیں۔ اچھائی اور برائی میں تمیز نہیں ہے۔ بلکہ معاملہ برعکس ہو کر عیوب ہی کمالات معلوم ہوتے ہیں چنانچہ کذب۔ افترا۔ بہتان۔ غیبت۔ شکایت۔ بدزبانی۔ بدکلامی۔ سوء ظن۔ فتنہ و فساد۔ نفاق و اختلاف بغض و حسد یہ سب چیزیں پسند ہیں اور جو شخص کہ ان امور کا ساعی ہوتا ہے اس کی تعریف اور تائید کی جاتی ہے۔ برخلاف ان کے صدق۔ حسن ظن۔ اتفاق و اتحاد۔ احترام و اکرام اور ادب۔ فتنہ وغیرہ سے دور رہ کر دوسروں کو بھی دور رکھنا۔ اور اخلاص و اخلاق کا طریقہ بتانا ــــ یہ سب چیزیں ناپسند ہیں رہبر کو لوگ رہزن سمجھتے ہیں اور رہزن کو رہبر سمجھ رکھا ہے۔ فساد و صلاح۔ افساد و اصلاح اور مفسد و مصلح اور صالح و فاسد میں امتیاز نہیں رہ گیا ہے۔ اب یہ فہم کے سلب ہونے کی علامت نہیں تو اور کیا ہے!

اور جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کی نظر کرم اور رحمت سے گر جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شامل حال نہیں ہوتی تو سب سے پہلی جو چیز اس کو بطور سزا کے ملتی ہے وہ اس سے اس کے نور علم کا سلب ہو جانا ہے ؎

اذا لم یکن عونا من اللہ للفتی   فاولُ ما یجنی علیہ اجتہادُہٗ

جب کہ انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عون اور مدد ختم ہو جاتی ہے تو سب سے پہلی چیز جو اس کو نقصان پہنچاتی ہے وہ اس کا اجتہاد ہوتا ہے ــــ یہی وجہ ہے جو آج بصیرت سلب ہے صلاح و فساد میں امتیاز باقی نہیں رہ گیا ہے بلکہ فساد ہی نظر آتا ہے افساد ہی اصلاح معلوم ہوتی ہے ــــ انتہا یہ کہ دین اور ایمان جو نہایت ہی پاکیزہ چیزیں ہیں اب انھیں کو محل فساد بنایا جاتا ہے۔ یعنی فساد دینی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ہوتا تو یہ ہے سراسر فساد اور افساد لیکن نفسانیت اس کو دین کے رنگ میں پیش کرتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے ناواقف مسلمان اس کا شکار ہو جاتے ہیں اور ایسے وقت میں بجز

اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق و تائید کے حق سمجھنا آسان بھی نہیں رہ جاتا۔

بدقسمتی سے آج ہم اسی دور سے گزر رہے ہیں اور یہ سب کرشمے ہیں جہالت کے کیونکہ آدمی کو جب حدود شرع کا علم ہی نہ ہوگا تو کیا وہ کسی کو پہچانے گا۔ نہ عالم دین کو اور نہ دین کو حتیٰ کہ اپنے کو بھی نہ پہچانے گا پھر کیا کسی کا حق ادا کرے گا بلکہ اندیشہ ہے کہ ایمان بھی باقی نہ رہے اور محض اپنی جہالت کی وجہ سے ایسے لوگ مسلوب الایمان ہو کر (العیاذ باللہ) دنیا سے رخصت ہوں اور جب غبار چھٹے اس وقت ان کو معلوم ہو کہ ہم گھوڑے پر سوار تھے یا کسی اور سواری پر ؎

فسوف تری اذا انکشف الغبار

افرس تحت رجلك ام حمار

(عنقریب جب غبار دور ہوگا اس وقت تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر)

عوام کے اس برتاؤ کی وجہ اور اسکا علاج

عوام کی طرف سے علماء کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ جو ہوتا ہے تو اس کی اصل وجہ تو وہی ہے جو ابھی بیان کی گئی یعنی جہل۔ اس لئے اس کا علاج تو یہ ہے کہ لوگوں کو اسلامی اخلاق اور شریعت کے حدود کا علم پہنچایا جائے لیکن اس سلسلہ کے بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عوام کی ان باتوں کو سن کر علماء یہ خیال کرتے ہیں کہ کون ان جاہلوں کے منہ لگے۔ لہٰذا صبر ہی کرتے ہیں۔ اس میں تو شک نہیں کہ اس پر ان کو آخرت میں اجر ملے گا مگر یہ حضرات تو ایسا اپنی خوش اخلاقی کی بناء پر کرتے ہیں اور یہ جاہل اس سے یہ سمجھتا ہے کہ ہم نے ان لوگوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اس لئے آپ سے کہتا ہوں کہ ایسی صورت میں شرعی مسئلہ یہ ہے کہ صبر کر لینا بھی جائز ہے لیکن اگر کوئی شخص بدون تعدی (زیادتی) کے انتصار ہی چاہے (یعنی بدلہ لینا) تو یہ بھی جائز ہے بلکہ علماء نے فرمایا ہے کہ انتصار ہی ہے چنانچہ احکام القرآن میں آیت والذین اذا اصابھم البغی ھم ینتصرون کے تحت لکھتے ہیں کہ:۔

روی عن ابراھیم النخعی فی معنی الآیۃ قال کانوا یکرھون للمؤمنین ان یذلوا انفسھم فیجتری علیھم الفساق وقال السدی ھم ینتصرون معناہ ممن بغی علیھم من غیر ان یعتدوا علیھم۔ (احکام القرآن ص۳۸۶ ج ۳)

حضرت ابراہیم نخعی سے آیت کے یہ معنی منقول ہیں کہ مسلمانوں کے لئے وہ لوگ پسند نہیں کرتے تھے کہ اپنے نفسوں کو ذلیل کریں تاکہ فساق ان پر خوب دلیر ہو جائیں۔ سدی کہتے ہیں کہ ہم ینتصرون کے معنی

یہ ہیں کہ ان لوگوں سے بدلہ لیتے ہیں جوان پر ظلم کئے ہوتے ہیں بدون اسکے کہ ان پر زیادتی کریں اس پر حضرت ابوبکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں اور بہت سی جگہوں پر تو ہمارے لئے حقوق العباد کے سلسلہ میں عفو اور درگزر کرنے ہی کو مندوب فرمایا ہے چنانچہ فرمایا ہے کہ وان تعفوا اقرب للتقوی اور فرمایا کہ فمن تصدق بہ فھو کفارۃ لہ اور فرمایا کہ ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم۔ اور یہ سب آئتیں کچھ منسوخ بھی نہیں ہیں۔ لیکن حق تعالیٰ کا یہاں یہ ارشاد فرمانا کہ والذین اذا اصابھم البغی ھم ینتصرون اس کا ذکر استجابۃ اللہ اور اقامت صلوٰۃ کے بعد ہی متصلاً ہے اس لئے انتصار کی مدح اور فضیلت نکلی چنانچہ ابراہیم نخعیؒ نے جو فرمایا ہے کہ لوگ مومنین کے لئے یہ مکروہ سمجھتے تھے کہ اپنے کو ذلیل کریں تاکہ فساق و فجار کی جرات نہ بڑھے پس یہ انتصار کی فضیلت اس شخص کے مقابلے میں ہے جو تعدی کرے اور اس پر اصرار کرے اور جہاں نصوص میں عفو کا حکم اور ترغیب ہے تو وہ اس جگہ ہے کہ قصور کرنے والا اپنے کئے پر نادم ہوا اور آئندہ کے لئے اس کام کے ترک کا عزم کر چکا ہو۔

خاتمہ

اس وقت علماء اور شریعت کے احترام اور عظمت کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا تھا۔ الحمد للہ کہ اکابر کی تصریحات کی روشنی میں بیان کر چکا۔ اب آخر میں اس دعا پر مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین اور حاملین دین متین کی قدر و منزلت کے پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم کو دین کا وہ فہم بخشے جس سے ہم اُن کے حقوق کو سمجھ سکیں اور ان کو ادا کر سکیں۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ٥ وصلی اللہ تعالیٰ
علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین
برحمتک یا ارحم الراحمین

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلٰى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حالت پر نہیں رکھنا چاہتے جس پر تم لوگ اب ہو یہاں تک کہ ناپاک کو پاک سے (واقعات کے ذریعہ) ممیز نہ فرمادے ۱۲

الامر الفارق
بین
المخلص والمنافق

از افادات

مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب
نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مومن مخلص اور منافق میں باہم امتیاز ضروری ہے

قال اللہ تعالیٰ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۔

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ـــ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حالت پر رکھنا نہیں چاہتے جس پر تم اب تک ہو جب تک کہ ناپاک کو پاک سے متمیز نہ فرمادے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے امور غیبیہ پر تم کو مطلع نہیں کرتے ولیکن ہاں جس کو خود چاہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں، ان کو منتخب فرماتے ہیں۔ پس اب اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لے آؤ اور اگر تم ایمان لے آؤ اور پرہیز رکھو تم پھر تم کو اجر عظیم ملے۔

(بیان القرآن)

تفسیر آیت بالا

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مولانا تھانویؒ نے بیان القرآن میں یہ عنوان قائم فرمایا ہے کہ

"حکمت، شدائد بر مؤمنین در بعض احیان"

یعنی مؤمنین پر بعض مرتبہ جو شدائد واقع ہوتے ہیں اس میں کیا حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں۔ پھر اس کے تحت فرماتے ہیں کہ

"اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حالت (اختلاط و عدم امتیاز مخلصین و منافقین) پر

رکھنا نہیں چاہتے جس پر تم سب اب موجود ہو (بلکہ واقعات اور شدائد کا ہونا اس وقت تک ضروری ہے) جب تک کہ ناپاک (یعنی منافق) کو پاک (یعنی مومن مخلص) سے متمیز نہ فرما دے۔ اور یہ تمیز شدائد سے خوب ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور (اگر تم کو یہ وسوسہ ہو کہ بلا نزول شدائد بھی نزول وحی الی الرسول سے یہ تمیز سہل ہے کہ بتلا دیا جاتا فلاں فلاں منافق ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ (بمقتضائے حکمت) ایسے امور غیبیہ پر تم کو (بلا واسطہ وقوع حوادث وغیرہ) مطلع نہیں کرنا چاہتے ولیکن ہاں جس کو اس طرح مطلع کرنا خود چاہیں اور ایسے حضرات وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں ان کو (اس طرح مطلع کرنے کے لئے اپنے بندوں میں سے) منتخب فرما لیتے ہیں (اور تم پیغمبر ہو نہیں سو تم کو ہم اس طرح ایسے امور کی کیوں اطلاع دیدیں البتہ واقعات ایسے نازل فرماتے ہیں جس کے واسطہ سے بطور استدلال کے یہ تمیز ظاہر ہو جائے اور حکمتیں اسمیں گو بے شمار ہیں اور ان کی تفتیش کی ضرورت نہیں لیکن ظاہراً یہ حکمت بھی معلوم ہوتی ہے کہ صرف وحی سے معلوم ہونے سے ظاہری اختلاط تو رہتا اور غیر متجانسین کا اختلاط ظاہری سبب ہوتا ہے اکثر مفاسد کا اور اگر مسلمان اُن کو جدا کرنا چاہتے تو ان پر کوئی وجہ احتجاج کی نہ تھی وہ کہتے کہ ہم تو مخلصین ہیں بخلاف اس صورت کے کہ واقعات پیش آئے اور وہ نکل بھاگے۔ پھر خود ہی ان کا منھ نہ رہا کہ دعویٰ اخلاص کریں اور مفاسد اختلاط سے اس طرح نجات ہو گی۔

(بیان القرآن ص ۷۸ ج ۲)

تمیز کی نسبت خبیث کیجانب کئے جانیکی وجہ

حق تعالیٰ نے شروع میں تو یہ فرمایا کہ مَاكَانَ اللهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ یعنی مومنین کو ان کے حال پر نہ چھوڑیں گے لیکن اس کے بعد یہ فرمایا کہ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ یعنی یہاں تک کہ منافق مخلص سے ممتاز ہو جائے تمیز کی نسبت خبیث کی جانب فرمائی اس کے متعلق یہ سمجھئے کہ یہاں کلام اپنی انتہائی بلاغت کو پہنچا ہوا ہے۔ صاحب روح المعانی نے اس مقام پر بعض محققین کے حوالہ سے جو تقریر نقل فرمائی ہے اس کو حضرت مولانا تھانویؒ نے اپنی تفسیر کے منہیہ میں ذکر فرمایا ہے اور اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ۔

قلت دهو حری بان یکتب بسواد العین وقلم شعائها۔
(بیان القرآن)

ترجمہ:۔ یعنی یہ تقریر اسقدر عمدہ اور پسندیدہ ہے کہ حق تو اس کا یہ ہے کہ اس کے لکھنے کیلئے آنکھ کی شعاع کو قلم بنایا جاتا اور اس کی پتلی کو روشنائی

میں یہاں روح المعانی سے پہلے وہ تقریر نقل کرتا ہوں پھر اس کے بعد اسکی مزید توضیح بھی کروں گا۔

تقریر بعض محققین جو صاحب روح المعانی نے نقل فرمائی

وتعليق الميز بالخبيث مع ان المتبادر مما سبق من عدم ترك المومنين على الاختلاط تعليقه بهم وافرازهم عن المنافقين لما ان الميز الواقع بين الفريقين انما هو بالتصرف في المنافقين وتغييرهم من حال الى حال اخرى مع بقاء المومنين على ما كانوا عليه من اصل الايمان وان ظهر مزيد اخلاصهم لا بالتصرف فيهم وتغييرهم من حال الى حال مع بقاء المنافقين على ما هم عليه من الاستتار وانما لم ينسب عدم الترك اليهم لما انه مشعر بالاعتناء بشان من نسب اليه فان المتبادر منه عدم الترك على حالة غير ملائمة كما يشهد به الذوق السليم قاله بعض المحققين
(روح المعانی)

ترجمہ اور تمیز کا تعلق اور اسکی نسبت خبیث کے ساتھ کی حالانکہ ماقبل کے بیان یعنی مومنین کا اختلاط پر باقی نہ رہنے کا تقاضا یہ تھا کہ تمیز کا تعلق بھی مومنین ہی سے ہوتا اور انھیں کو منافقین سے جدا کیا جاتا۔ تو یہ اس لئے کہ تمیز جو کہ دونوں فریق کے مابین واقع ہوئی وہ منافقین ہی میں تصرف ہو کر ہوئی ہے اور انھیں کی حالت ایک سے دوسری ہوئی اور مومنین تو جس حال پر پہلے تھے یعنی اصل ایمان اسی پر بعد میں بھی رہے بلکہ ان کا اخلاص کچھ اور زیادہ ہی ہو گیا۔ اور یہ نہیں ہوا کہ مومنین میں تصرف ہوا ہو اور ان کا حال ایک سے دوسرا بدل گیا ہو اور منافقین اپنے پہلے ہی حال یعنی استتار پر باقی رہے ہوں، ایسا نہیں ہوا۔

اسی طرح سے عدم ترک کو منافقین کی جانب منسوب نہیں کیا اس لئے کہ اس سے اعتنا اور

اہتمام معلوم ہوتا اس کا جو اس کی جانب منسوب ہوتا کیونکہ ظاہر اس سے یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ باقی نہ رہنے دیں گے یعنی کسی ایسی حالت پر جو غیر مناسب ہو (اور یہ عین شفقت ہے جس کے مورد مؤمنین ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ منافقین) جیسا کہ صاحب ذوق سلیم پر مخفی نہیں ہے بعض محققین نے یہاں یہی تقریر فرمائی ہے۔

توضیح مقام

میں کہتا ہوں کہ بعض محققین کے ارشاد کا حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو یہ فرمایا کہ ماکان اللہ لیذر المؤمنین علیٰ ما انتم علیہ جس سے معلوم ہوا کہ مؤمنین کو ان کے موجودہ حال (یعنی حالت اختلاط) پر باقی رکھنا منظور نہیں لیکن اس کے بعد یہ فرمایا کہ حتیٰ یمیز الخبیث من الطیب یعنی یہاں تک کہ ناپاک کو پاک سے متمیز فرمادے۔ یہاں سباق کا تقاضا تھا کہ حتیٰ یمیز الطیب من الخبیث فرماتے تاکہ سیاق و سباق دونوں مطابق ہو جاتے تو یہاں سیاق جو مطابق سباق کے نہیں ہے اس کا نکتہ یہ ہے کہ دونوں فریق میں جب تمیز ہو جائے گی تو ظاہر ہے کہ ہر ایک دوسرے سے ممتاز ہو جائیں گے لیکن اس تمیز کی صورت یہ ہو گی کہ منافقین میں تصرف ہوگا۔ یعنی وہی ایک حال سے دوسرے حال پر منتقل ہو جائیں گے۔ یعنی پہلے اُن کا نفاق مستور تھا اب عیاں ہو جائے گا ایسا کہ اس کے بعد اب عوام الناس کے لئے بھی استدلال سے ان کی تمیز آسان ہو جائے گی اور مومنین میں کوئی تصرف نہ ہوگا وہ پہلے جس حال پر تھے ان شدائد و محن کے بعد بھی اسی حال پر قائم رہیں گے بلکہ ان کا اخلاص کچھ اور بڑھ ہی جائے گا تو چونکہ ذریعہ تمیز فی المنافقین بنا سلئے تمیز کی نسبت خبیث کی طرف کی گئی نہ طیب کی طرف تو اب چاہئے تھا کہ ماکان اللہ لیذر المؤمنین کی جگہ لیذر المنافقین فرماتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مؤمنین کی شان کا اعتنا مقصود ہے کہ اُن کو کسی حالت غیر ملائمہ پر نہیں چھوڑنا چاہتے اس لئے ان پر شفقت منظور ہے اس لئے اس اعتنا بالشان کے ظاہر کرنے کے لئے مؤمنین کا ذکر فرمایا اور منافقین کی طرف اعتنا نہیں ہے اسلئے ان کا ذکر متروک فرمایا۔

میں کہتا ہوں کہ بلا شبہ ان بعض محققین نے بڑی عمدہ بات بیان فرمائی اور حضرتؒ کا اس کے متعلق یہ فرمانا کہ یہ نکتہ آنکھ کی شعاع کے قلم اور پتلی کی روشنائی سے لکھے جانے کے

قابل ہے بالکل صحیح ہے اور میں بھی یہ کہتا ہوں کہ دل کو اس کے لکھنے کے لئے کاغذ بنانا چاہئے۔

تمثیل معقول بالمحسوس

غرض یہاں حتی یمیز الخبیث من الطیّب جو فرمایا تو اسکی محسوس مثال یہ ہے کہ دودھ سے مکھی نکال کر پھینک دی جاتی ہے اور کہتے ہیں کہ مکھی دودھ سے نکال کر پھینکدی گئی یہاں تمیز کے لئے اور نکالنے کی نسبت مکھی طرف کی گئی دودھ کی طرف نہیں، اگرچہ اسکا کچھ اثر دودھ پر بھی پڑجاتا ہے کہ اس میں بھی حرکت ہوجاتی ہے لیکن مقصود اس میں تصرف کرنا نہیں ہوتا ـــــ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ مومن مخلص اور منافق میں اختلاط کی وجہ سے جو تمیز باقی نہیں، یہ تمیز پیدا ہوجائے تو شدائد و مصائب اور آلام بھیجے جس سے مقصود تو منافقین میں تصرف کرنا تھا اور ان کی حالت میں تغیر کرنا تھا کہ وہ حالت اختلاط اور استتار سے اظہار اور امتیاز کی حالت کی طرف منتقل ہوجائے کہ حالت شدائد میں اس کی حالت دگرگوں ہوجاتی ہے بخلاف مومن مخلص کے کہ وہ ایک حالت پر رہتا ہے اور یہ تمیز استدلال و مشاہدہ اور واقعات سے خوب متعین ہوتی ہے۔ اور عام طور پر اس کو سمجھا جاتا ہے صرف وحی سے معلوم ہوسکتا تھا کہ فلاں فلاں منافق ہے۔ مگر ظاہری اختلاط اس صورت میں بھی رہتا اور غیر متجانسین کا اختلاط ظاہری، سبب ہوتا ہے اکثر مفاسد کا اور اگر مسلمان ان کو جدا کرنا چاہتے تو کوئی وجہ احتجاج کی نہ تھی کہ وہ منافق ہیں، اس کو تسلیم نہ کرتے، وہ کہتے کہ ہم مخلص ہیں: بخلاف اس صورت کے کہ واقعات پیش آئے اور کم ہمتی سے وہ نکل بھاگے۔ پھر خود ہی ان کا منہ نہیں رہا کہ دعویٰ اخلاص کریں اور اس طرح مفاسد اختلاط سے نجات ہوگئی۔

میں کہتا ہوں کہ آیت کی یہ تفسیر تو بہت دنوں سے ذہن میں تھی لیکن ان دنوں پھر جب یہ آیت نظر سے گزری اور اس پر حضرتؒ کا منہیہ دیکھا جس میں روح المعانی کے حوالہ سے بعض محققین کا قول نقل فرمایا ہے تو اس کو پڑھ کر بڑا ہی لطف آیا اور از سر نو یہ بات ذہن میں آئی کہ واقعی یہ مخلص اور منافق میں تمیز اور ہر ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنا شریعت کے اور قرآن کے اہم مقاصد سے ہے۔ تمیز مومنین کی منافقین سے اسی دار دنیا میں واقعات اور حوادث سے ہوجاتی ہے۔ اور جو تمیز کہ واقعات اور حوادث سے ہوتی ہے استدلالی بلکہ ظاہر و باہر

ہوتی ہے۔ بدیہی ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شیخ اپنے کسی مرید کی نسبت کچھ کہے تو گو اس کا یہ کہنا بھی دلیل ہے اور زبردست دلیل ہے مگر واقعات سے کسی شخص کی تکذیب ہو جائے تو یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے کہ اس میں کسی شخص کو کلام کی گنجائش باقی نہیں رہتی حتیٰ کہ اس کو بھی۔

مخلص اور منافق کے مابین یہ امتیاز کیوں ضروری ہے

اب چونکہ اس تمیز بین المخلص والمنافق کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سنت خداوندی ہے جس سے قیامت تک کے لئے ان دونوں فریق میں یہ تمیز ہوتی رہے گی۔ جیسا کہ مشاہد ہے اور سب کے لئے واجب العمل ہے خاص کر علماء اور مشائخ کے لئے یعنی ہر زمانہ میں خواص کو اور عوام کو بھی یہ چیز پیش آئے گی اور ان کو اسی طرح تمیز کرنا چاہئے یعنی اگر بصیرت کے ساتھ واقعات پڑنے کے بعد غور کیا جائے تو اپنے متعلقین اور دوست احباب اسی معیار پر پرکھے جاسکتے ہیں۔ اور یہ خلاف شرع نہیں ہے۔ ورنہ اختلاط کے مفاسد کا شکار رہنا لازمی ہے۔

واقعات ہی امتیاز کی کسوٹی ہوتے ہیں اس کی تائید حافظ شیرازیؒ کے کلام سے

پس یہ واقعات گویا ایک محک اور کسوٹی ہیں، جس کی وجہ سے صادق اور کاذب میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ یعنی کاذب ذلیل اور رسوا ہوتا ہے اور صادق اس سے مطمئن ہوتا ہے اور بشارت حاصل کرتا ہے۔ اسی کو حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بیغش باشد   اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد
خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں   تا سیہ روئے شود ہر کہ درو غش باشد

یعنی کیا اچھا ہو اگر امتحان کی کسوٹی درمیان میں آجائے تاکہ جس کے اندر کھوٹ ہو وہ سیہ رو ہو جائے۔

اور صوفی کا تمام تر نقد صاف اور بے میل کے نہیں ہوتا بہت سے خرقے (مراد اہل خرقہ) آگ میں ڈالے جانے کے قابل ہوتے ہیں۔

غش پر مشتمل ہونے کے سبب سے یہ کلام اس مضمون کے ادا میں بے نظیر ہے۔ اور آخر شعر تو گویا اسی آیت کی تفسیر ہے۔

مضمون بالا کی تائید امام غزالیؒ کے کلام سے

صادق اور کاذب میں امتیاز کرنے کے لئے حافظ شیرازیؒ نے جس طرح محک تجربہ کا ذکر فرمایا ہے، یعنی یہ کہ ہر شخص جو کہ دعویٰ اخلاص کرے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ حقیقۃً مخلص ہی ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ساتھ اس کا جو تعلق ہے وہ ابھی رسم سے متجاوز نہ ہوا ہو۔ یعنی قلبی اور دلی نہ ہو اس لئے کسوٹی پر اس کو کسنا چاہئے تاکہ امتیاز ہو جائے۔

اسی طرح سے اس مضمون کو امام غزالیؒ نے بھی احیاء العلوم میں کتاب آداب الالفۃ والاخوۃ والصحبۃ میں بیان فرمایا ہے جس کو میں اکثر بیان کرتا ہوں اور اپنے بعض رسالوں میں بھی اس کو لکھ دیا ہے۔ چنانچہ میرے ایک دوست نے امام غزالیؒ کے اس مضمون کو بہت پسند کیا خود وہ مجھ سے بیان کرتے تھے کہ میں نے اس کو پڑھے لکھے طبقہ اور عقلاء کے مجمع میں سنایا تو لوگوں نے اس بات کو بہت پسند کیا۔

چونکہ دیکھتا ہوں کہ لوگ امامؒ کے اس مضمون کو سراہ رہے ہیں اس لئے اس کو یہاں بھی بیان کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ

فاعلم ان عقدۃ الاخوۃ لم ینعقد بعد فی الباطن و انما الجاری بینکما مخالطۃ رسمیۃ لا وقع لہا فی العقل والدین۔ (احیاء العلوم ص۱۷۵)

ترجمہ:۔ جان لو کہ وہ عقد اخوت (یعنی دوستی کا تعلق) جو قلب سے ہو ابھی تک قائم ہی نہیں ہوا۔ تو تمہارے درمیان جو کچھ جاری ہے وہ محض ایک رسمی ہی میل جول ہے جس کا نہ تو عقل کے نزدیک کوئی اعتبار ہے اور نہ دین ہی میں اس کی کچھ وقعت ہے۔

اسی مضمون کی تائید شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کے بیان سے

امام غزالیؒ کا ارشاد تو آپ نے سنا اب شاہ عبد الحق محدث دہلویؒ نے آداب الصالحین میں حضرت علیؓ کا جو ارشاد نقل فرمایا ہے اس کو بھی سنئے فرماتے ہیں کہ

"اخوان الزمان جواسیس العیوب"

"یعنی اس زمانے کے دوست تو عیوب کے جاسوس ہیں" اور اُسکے بعد شاہ صاحبؒ خود فرماتے ہیں کہ اور جس کا تو امتحان نہ کرے اس پر اعتماد نہ کر اور تھوڑی سی ملاقات و ہمنشینی پر مغرور نہ ہو جب تک کہ معاملہ مکرر نہ پڑے حق امتحان کا یہ ہے کہ سب حالتوں میں آزمائے تو۔ حالت معزولی میں بھی۔ اور حکومت میں بھی۔ اور محتاجگی میں بھی اور غنا میں بھی۔ اور غضب میں بھی اور رضا میں بھی۔ اور حاضر میں بھی اور غائب میں بھی۔ اور عیش میں بھی اور سختی میں بھی۔ جب سب حالتوں میں یکساں ہو تو وہ قابل مصاحبت کے ہے۔

پس اگر ایسا آدمی پاوے تو، تو اگر بڑا ہے تو بجائے باپ کے جان اور اگر چھوٹا ہے تو بجائے بیٹے کے جان۔ اور اگر برابر ہے تو بھائی ٹھہرا اس کو ورنہ کنارہ کر اس سے نہ بھائی کسی کا ہو اور نہ باپ اور نہ بیٹا۔"

(ہادی الناظرین ص ۸۵)

حاصل کلام

حاصل ان تصریحات کا یہ ہوا کہ (۱) ہر شخص کے لئے مخلص اور منافق۔ صادق اور کاذب۔ دوست اور دشمن خبیث اور طیب پاک اور ناپاک۔ محب غیر محب احباب و اغیار میں امتیاز کرنا نہایت ضروری ہے (۲) اور اس تمیز کا سب سے بہتر ذریعہ اپنے ساتھ اس کے پیش آنے والے واقعات ہیں کہ وہی دراصل کسوٹی ہیں کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کی (۳) اور یہ امتیاز خلاف شرع نہیں ہے بلکہ عین منشا شریعت ہے (۴) اسی کے نہ ہونے کی صورت میں یعنی اختلاط کا ہونا اور مخلص و منافق کا باہم گڈمڈ رہنا ہی مفاسد کا سب سے بڑا سبب ہے۔

دعاء

بس اب اپنے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق اور اپنے دین کا فہم نصیب فرمائیں۔ آمین۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین ۝

وصی اللہ عفی عنہ

ماہ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ

بخشی بازار (روشن باغ) الہ آباد

اضافہ **(نصیحت مرشدؒ)** از ناقل

فرمایا کہ آپ لوگوں کو ایک نہایت ضروری بات بتاتا ہوں۔ اگر اس کے مطابق کوئی کام کریں گے تو زندگی بھی آرام سے گزار سکیں گے اور ممکن ہے کہ دو چار مخلص دوست بھی میسر ہو جائیں ورنہ بظاہر تو لوگ زیادہ جمع ہو جائیں گے کہ جنھیں میں منافق بھی آجائیں گے اور سب کام خراب ہو جائے گا۔ طریقہ یہ ہے کہ اس زمانے میں کسی کا اعتبار جلدی نہ کیجئے اور نہ کسی کو جلدی دوست اور راز داں بنائیے جب آپ اس طرح سے رہیں گے تو جو آپ ہی کے مسلک کا ہوگا وہی آپ سے ملے گا اور ایسے لوگ چند ہی ہوں گے باقی دوسرے لوگ علیٰحدہ ہو جائیں گے۔ اِس زمانہ میں کام اسی لئے تو نہیں ہو رہا ہے کہ لوگ شروع ہی سے زیادہ مجمع چاہتے ہیں جس میں غیر مخلصین بھی بھر جاتے ہیں اور وہی کام خراب کر دیتے ہیں ورنہ اگر دو چار ہی ساتھی پر قناعت کرکے لوگ کسی کام کو شروع کر دیں تو کچھ نہ کچھ کام ہو جائے کیونکہ مقصود کام ہے نہ کہ مجمع اور زیادہ مجمع لیکر ہوگا کیا لوگ مخلص ہوں چاہے تھوڑے ہوں یہی اچھا ہے اور کام کے لوگ تھوڑے ہی ہوا کرتے ہیں اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِیْلٌ مَّا ھُمْ۔ لیکن لوگوں کا یہ حال ہے کہتے ہیں کہ جب تک مجمع کثیر نہ ہو وعظ کہتے نہیں بنتا مضامین کی آمد ہی نہیں ہوتی یہ سب غلط ہے اخلاص کے منافی ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ایک صاحب کہتے تھے دیکھئے عورتوں کے مجمع میں بھی دو دو گھنٹے اور تین تین گھنٹے وعظ فرماتے ہیں حالانکہ یہ نہیں معلوم کہ وہ سُن بھی رہی ہیں یا سو گئی ہیں پردے کے اندر موجود بھی ہیں یا چلی گئی ہیں ایسی حالت میں وعظ کہنا واقعی بڑا مشکل کام ہے اور یہ بدون اخلاص کے ناممکن ہے اس سے معلوم ہوا کہ اخلاص ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے مخلص کا تو یہ حال ہوتا ہے ؎

کس بشنود یا نشنود من گفتگوے می کنم
اور ؎ حاصل آید یا نیاید آرزوے می کنم

(وصیۃ الاحسان صفحہ ۸)

تواصی بالصبر

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

رسالہ "الامر الفارق بین المخلص والمنافق" کا مضمون تو یہاں تک ختم ہوا آگے حضرت والا مدظلہ العالی کا ایک دوسرا رسالہ "تواصی بالصبر" ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس کے تالیف کا سبب یہ ہوا کہ جس زمانہ میں رسالۂ اولیٰ زیر تالیف تھا اسوقت یہاں اہل حق کو بعض ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جس سے ہر زمانہ میں اور ہر مقام پر علمائے حقانی اور عاملین بالسنتہ کو سابقہ پیش آتا ہی رہتا ہے اور پیش آنا ناگزیر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہر شخص میں تحمل کا مادہ تو ہوتا نہیں اس لئے اندیشہ ہوا کہ مبادا یہ شگوفہ مسلمانوں میں مزید اختلاف و نزاع کا سبب بن جائے چنانچہ حضرت والا دامت برکاتہم نے عام مسلمانوں کو عموماً اور اپنے متوسلین کو خصوصاً ایسے مواقع میں صبر و تحمل ہی کرنے کی ہدایت فرمائی اور اس سلسلہ میں ایک مختصر سا مضمون بھی تحریر فرمادیا تاکہ دوسرے لوگ بھی اس شرعی تعلیم پر عمل کر کے فتنہ و فساد سے بچ سکیں اور مسلمانوں میں تفریق کا سبب بننے سے براحل دور رہا کریں۔

"در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست"

والسلام۔

راقم ناشر عفی عنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

میں اپنے یہاں کے اور دیگر اضلاع کے تمام احباب بلکہ تمام اہل سلسلہ کی خدمت میں باادب یہ گزارش کرتا ہوں کہ وہ میرے اور میرے اکابر کی طرف سے کوئی جواب دہی نہ کریں کہ اس میں سوائے شور وشغب کے کوئی نتیجہ نہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ۝ (پ ۱۴)

ترجمہ:۔ اور اگر تم ان کی ایذاؤں پر صبر کرو تو وہ صبر کرنا صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے (کہ مخالف پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے اور دیکھنے والوں پر بھی اور آخرت میں موجب اجر عظیم ہے) اور آپ صبر کیجئے اور چونکہ آپ کا صبر کرنا خاص خدا ہی کی توفیق (خاص) سے ہے (اس لئے آپ تسلی رکھیں کہ صبر میں آپ کو دشواری نہ ہوگی) اور ان لوگوں کی مخالفت پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ مخالفت) میں تدبیر کیا کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو جئے (اس سے آپ کا کوئی ضرر نہ ہوگا کیونکہ آپ تقویٰ اور احسان کے ساتھ موصوف ہیں اور) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے (یعنی ان کا مدد و معاون ہوتا ہے) جو پرہیزگار ہوتے ہیں اور جو نیک کردار ہوتے ہیں۔ (بیان القرآن ص ۶۸)

ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدہم شیئا ان اللہ بما یعملون (پ ۴)

ترجمہ:۔ اور اگر تم استقلال اور تقویٰ کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکے گی (تم اس سے بے فکر رہو دنیا میں تو ان کو یہ ناکامی نصیب ہوگی اور آخرت میں

سزائے دوزخ ہوگی کیونکہ) بلاشبہہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر علمی احاطہ رکھتے ہیں کوئی عمل ہم سے مخفی نہیں اس لئے وہاں سزا سے بچنے کے لئے کسی حیلہ حوالہ کی گنجائش نہیں۔

(بیان القرآن ص۱۵)

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ

وان تصبروا وتتقوا فان ذلک من عزم الامور ○ (پ۴)

ترجمہ:۔ اور اگر تم صبر کروگے اور (خلاف شرع امور سے) پرہیز رکھوگے تو تمہارے لئے اچھا ہوگا کیونکہ) یہ (صبر و تقویٰ) تاکیدی احکام میں سے ہیں (اور تاکیدی احکام پر عمل کرنا ہی اچھا ہے)

اور فرماتے ہیں کہ:۔

ولمن صبر وغفر ان ذلک لمن عزم الامور ○ (پ۲۵)

ترجمہ:۔ اور جو شخص (دوسرے کے ظلم پر) صبر کرے اور معاف کردے یہ البتہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے (یعنی ایسا کرنا بہتر ہے اور اولو العزمی ہے)۔

(بیان القرآن ص۵۷)

اور فرماتے ہیں کہ:۔

ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم وما یلقّٰھا الا الذین صبروا وما یلقّٰھا الا ذوحظ عظیم ○ (پ۲۴)

ترجمہ:۔ آپ نیک برتاؤ سے (بدی کو) ٹال دیا کیجئے پھر یکایک (دیکھ لینا کہ) آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جاوے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے (یعنی بدی کی مکافات بدی سے کرنے میں تو عداوت بڑھتی ہے اور نیکی کرنے سے بشرط سلامت طبع عدو کی عداوت گھٹتی ہے حتیٰ کہ اکثر بالکل عداوت جاتی رہتی ہے اور اس امر میں مشابہ دوست کے ہوجاتا ہے گو دل سے دوست نہ ہو۔ اور یہ بات انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو (اخلاق کے اعتبار سے) بڑے مستقل مزاج ہیں اور یہ بات اس کو نصیب ہوتی ہے جو ثواب کے اعتبار سے بڑا صاحب نصیب ہے

(بیان القرآن ص۵۷)

اور فرماتے ہیں کہ:۔

ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ ومن یؤمن باللہ

یھد قلبہ (پ ۲۸)

ترجمہ:۔ کوئی مصیبت بدون خدا کے حکم کے نہیں آتی (اور یہ سمجھ کر صبر و رضا اختیار کرنا چاہئے) اور جو شخص اللہ پر پورا ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو صبر و رضا کی راہ دکھا دیتا ہے۔

(بیان القرآن ص۱۱/۱۲)

صبر کی فضیلت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے کلام سے

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ محدث دہلوی نے صبر کی فضیلت اور اس کے مفتاح الفرج ہونے کو تفہیمات الٰہیہ میں ایک عجیب ہی عنوان سے بیان فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

تفہیم

اعلم ان الجہاد لہ انواع من اعظمہا ھدایۃ الناس ظاھراً و باطناً و ناھیک من مفاخرہ ومناقبہ انہ ھو الذی بعث لہ الانبیاء قاطبۃ علیہم الصلوٰۃ والسلام وکل جہاد فیہ صبر ومعاناۃ شدۃ ثم النصر یکون بعد ذلک انا لننصر رسلنا۔

ترجمہ:۔ جان لو کہ جہاد کی بہت سی قسمیں ہیں اس کا سب سے بڑا درجہ یہ ہے کہ لوگوں کو ظاہراً اور باطناً ہدایت (یعنی اصلاح) کی جائے اور اس چیز کے فخر و منقبت کے لئے تمہیں یہی کافی ہے کہ یہی وہ چیز ہے جس کے لئے تمام حضرات انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے اور ہر جہاد ہی میں اولاً صبر کرنا اور مشقتیں برداشت کرنی پڑتی ہے پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی جانب سے مدد ضرور آتی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم اپنے انبیا کی مدد کریں گے اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے کہ ؎

گویند سنگ لعل شود در مقام صبر
آرے شود و لیک بخون جگر شود

(تفہیمات ص۱۰۳ ج۲)

لوگ بیان کرتے ہیں کہ پتھر جو لعل ہو جاتا ہے تو وہ صبر ہی کی بدولت کہ مدتوں آفتاب کی تمازت کو اپنے اوپر برداشت کرتا ہے میں کہتا ہوں کہ ہاں ہوتا تو ہے لیکن ایک زمانہ تک اس کو

خون دل بھی بننا پڑتا ہے۔

سبحان اللہ! صبر کی فضیلت کو کس عمدگی اور لطافت کے ساتھ اس شعر میں بیان فرمایا گیا ہے۔ جس قدر اس میں غور کیجئے گا لطف آئے گا۔ اسی کا ترجمہ کسی نے یوں کیا ہے اور خوب کیا ہے ؎

خون دل پینے کو اور لخت جگر کھانے کو
یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

یہاں موقع کے مناسب تو حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اتنی ہی عبارت پیش کرنی تھی لیکن اس کے بعد کا مضمون بھی چونکہ خالی از افادہ نہیں ہے اس لئے ہدیہ ناظرین ہے فرماتے ہیں کہ۔

واصحب الناس علی شرطتین احدھا قطع الطمع عنھم وعما فی ایدیھم ان شاء اللہ موصل الیك شیء مما یحتاج منه ولم تك ترقبه بلا عزم منك وثانیھا النصیحة والانبساط وحسن الخلق لكل احد سواء المتمول والفقیر وصاحب الجاہ والخامل مع عرفان منزلة كل احد منھم وكل من عاداك بعد ذلك فانما ھو خبیث النفس ظالم وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ○ (تفہیمات الٰہیہ ص ۱۰۴)

ترجمہ:۔ اور لوگوں کے ساتھ دو شرط کے ساتھ مصاحبت اختیار کرو ایک تو یہ کہ خود ان سے اور جو کچھ ان کے ہاتھوں میں ہے اس سے طمع قطع کر دو اور یہ سمجھ رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے جو نصیب مقدر فرما رکھا ہے وہ تو تم کو ان سے مل کر رہے گا تم اپنی جانب سے نہ اس کا ارادہ کرو اور نہ اس کے منتظر رہو اور دوسری چیز یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ نصیحۃ (خیر خواہی) اور انبساط اور حسن خلق کے ساتھ پیش آؤ خواہ وہ متمول ہو یا غریب و محتاج ہو۔ کوئی صاحب جاہ ہو یا گمنام و گوشہ نشین ہو۔ اور اس کے بعد بھی جو شخص تم سے دشمنی کرے وہ خبیث النفس ہے اور ظالم ہے اور عنقریب ان لوگوں کو معلوم ہو جاوے گا جنھوں نے ظلم کر رکھا ہے کہ کیسی جگہ انکو لوٹ کر جانا ہے۔

اسلاف کی کامیابی کا راز

ان نصوص خداوندی کے بعد اور کس مضمون اور کس چیز کی حاجت باقی رہ جاتی ہے۔

ہمارے اسلاف انھیں نصوص پر عمل کرکے کامیاب ہوئے ہیں ہمیں بھی کامیابی اسی طریقہ پر ہوسکتی ہے۔ حضرت رومیؒ ارشاد فرماتے ہیں ؎

خود چہ جائے جنگ وجدلِ نیک وبد کایں دلم از صلحہا ہم می رمد

(یعنی میرا دل تو صلح سے بھی بھاگتا ہے پھر بھلا کسی سے آویزش اور جنگ وجدال کا کیا سوال!)

حضرت مصلح الدین شیرازیؒ بوستاں میں بہلول دانا کا واقعہ بیان فرماتے ہیں ؎

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خو چو بگذشت بر عارف جنگ جو

(یعنی عمدہ خصلت والے بہلول دانا نے کیا اچھی بات کہی جس وقت کہ ان کا گزر ایک ایسے عارف پر ہوا جو لوگوں سے لڑ رہا تھا)

گر ایں مدعی دوست بشناختے بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

(یعنی اگر یہ مدعی معرفت دوست (یعنی حق تعالیٰ) کا عارف ہوتا تو دشمن سے لڑنے میں نہ مشغول ہوتا)

گر از ہستی حق خبر داشتے ہمہ خلق را نیست پنداشتے

(یعنی اگر اس کو حق تعالیٰ کے وجود کی خبر ہوتی تو تمام مخلوق کو ان کے مقابلہ میں نیست سمجھتا پھر کس سے لڑنا اور کیسا جھگڑا)

وقت کا ایک اہم فریضہ

علاوہ ان فرائض کے جو ہم پانچوں وقت ادا کرتے ہیں کچھ اور فرائض بھی حسب حاجت اور ضرورت انسان کے ذمہ لازمی اور ضروری ہو جاتے ہیں ان کو احکام وقتیہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

مثلاً جب بچہ بالغ ہوتا ہے اس پر خدا تعالیٰ کی جانب سے نماز روزہ فرض ہو جاتا ہے تو ان کے احکام سیکھنا اس پر ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے لڑکا یا لڑکی جب بالغ ہو جائے تو والدین کے ذمہ یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اس کا عقد کردیں اسی طرح سے کوئی شخص مثلاً مریض ہو جاتا ہے تو اس پر لازم ہوتا ہے کہ جلد علاج کی فکر کرے۔

اسی طرح اس وقت حاضر کا بھی ایک فریضہ جو ہم سب پر عائد ہوتا ہے اور ہم سب پر فرض ہے وہ یہ کہ ہم سب فساد سے بچیں اور دوسروں کو بھی اس سے بچائیں اس لئے میں

عام مسلمانوں کو عموماً اور حضرات علماء اور مشائخ کو خصوصاً اس فریضہ کی ادائیگی کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ آج ہم اپنے سارے اعمال سے فساد کے شکار ہو چکے ہیں اگر اس پر ہم خون کے آنسو بھی بہائیں تو نہایت کم ہے۔ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ کا ہمارا حال پورا پورا مصداق ہے۔

اس لئے میں کہتا ہوں کہ ــــ اس وقت کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ مسلمان فساد سے بچیں۔ عام ابتلاء اس وقت اسی کا ہے۔ گاؤں گاؤں شہر در شہر، اطراف و اکناف سب اسمیں مبتلا دیکھے جاتے ہیں اور فساد کے روکنے کی سب سے بڑی ذمہ داری علماء و مشائخ پر ہے۔ مذہبی حیثیت سے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ علماء اور مشائخ اس کے ذمہ دار ہیں یعنی اگر عوام کو اس سے نہیں روکیں گے تو ان سے قیامت میں سخت باز پرس ہوگی حق تعالیٰ نے قرآن شریف میں یہود و نصاریٰ کے احبار و رہبان کے ترک نہی عن المنکر پر سخت نکیر فرمائی ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَن قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (پ) (ان کو مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے اور حرام مال کھانے سے کیوں نہیں منع کرتے واقعی ان کی یہ عادت بری ہے) (بیان القرآن) اس لئے میں نے کہا ہے کہ علماء و مشائخ ذمہ دار ہیں اور اس پر ان سے باز پرس ہوگی ــــ میں نے یہ حکم جو بیان کیا ہے تو فساد کو روکنے کا بیان کیا ہے اور اگر یہی لوگ سبب بنیں فساد کا تو اس کا حکم اسی سے معلوم کر لیجئے اسوقت مسلمانوں کی حالت دیکھ کر گھبرا گھبرا کر طبیعت اس شعر کے پڑھنے کو چاہتی ہے کہ ؎

اے بے خبرا پردہ یثرب بخواب
خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

میں جو علماء کی ذمہ داری کے متعلق بیان کر رہا ہوں ایک بزرگ نے اس کی عجیب مثال بیان فرمائی، انھوں نے فرمایا کہ چوکیدار وہ ہے جو نہ خود چوری کرے اور نہ کسی اور کو کرنے دے۔ تو علماء کی مثال چوکیدار سے اس لئے دی تو ان کو بھی قابل احتراز امور سے خود بھی احتراز کرنا ضروری ہے اور دوسروں کو بھی منع کرنا ان پر واجب ہے ورنہ ان پر اس چوکیدار کی مثال صادق آئے گی جو خود بھی چور ہو اور دوسروں سے بھی چوری کرائے اور ظاہر ہے کہ یہ انکے منصب سے کس قدر بعید ہے۔

ختم شد

ادائے حقوق

قرض سے نجات پانیکا مسنون علاج

ازافادات

مصلح الامت حضرت مولانا مرشدنا شاہ وصی اللہ صاحب
نور اللہ مرقدہٗ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

امابعد

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من اخذ اموال الناس یرید اداءھا ادی اللہ عنہ ومن اخذھا یرید اتلافھا اتلفہ اللہ۔ (رواہ البخاری وابن ماجہ وغیرہ) (الادب النبوی ص۱۴۴)

حضرت ابوہریرۃؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص نے لوگوں کا مال لیا (بطور قرض کے) اور ارادہ رکھتا ہے کہ اسکو ادا کردیگا تو اللہ تعالیٰ اسکی جانب سے اس کو ادا فرمادیں گے اور جس شخص نے کسی کا مال اس ارادہ سے لیا کہ اسکو ہضم کرلے گا تو اللہ تعالیٰ اسی کو ختم اور تلف فرمادیں گے۔ (بخاری وابن ماجہ وغیرہ میں یہ روایت ہے)

صاحب ادب النبوی اس حدیث کی شرح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

من الناس من یقترض الاموال لحاجۃ من حاجہ عازماً علی ادائھا فی الموعد المضروب اوحین یقع فی یدہ مال فھذا یؤدی اللہ عنہ دیونہ فیفتح لہ من ابواب الرزق مالم یکن یحتسبہ مکافاۃ لہ علی نیتہ

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں سے اپنی کسی ضرورت پر قرض لیتے ہیں اور انکی یہ نیت ہوتی ہے کہ وقت مقررہ پر اسکو ادا کردینگے یا جب ان کے پاس روپیہ آجائے گا اسوقت دیدیں گے تو یہ ایسے لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ انکے قرض کا خود کفیل ہے وہ ادا کردیگا جس کی صورت یہ ہوگی کہ انکے لئے ایسے طور سے رزق و آمدنی کے دروازے کھول دیئے جائیں گے کہ اسکا انکو شان وگمان بھی نہ ہوگا اور یہ محض بدلہ ہوگا

الصالحة وعزمه المحمود على ان تلك الارادة اثرا فى اكتساب الرزق فانها لا تزال بصاحبها تدفعه الى تلمس ابواب المكاسب والبحث عن طرق المال حتى يهتدى اليها ويؤدى ديونه۔	انکی نیت صالح اور عزم محمود کا یعنی اسکا کہ انھوں نے ادائیگی کا ارادہ کیا تھا (نیت کی ایک برکت تو یہ ہوتی ہے) مزید یہ کہ انکے اس ارادہ کو کسب آمدنی میں بھی دخل عظیم ہے اس لئے کہ یہی عزم ادا انکو ذرائع آمدنی کے تلاش کرنے کی جانب اور مال کمانے کے طریقوں میں غور و تامل کرنے کی طرف مضطر کریگا تاآنکہ من جدّ وجدان کے سامنے کوئی نہ کوئی صورت آجائیگی اور انکا قرض ادا ہوجائے گا۔
ومثل هذا من يشترى من التجار طعامه وشرابه وحاجياته الاخرى و بضاعة يتجر فيها الى اجل وليس بيده ما يدفعه نقدا فان عزم على الاداء والوفاء يسر الله له المال حتى يوفى بما عاهد۔	اور اسی کی مانند وہ شخص بھی ہے جو تاجروں سے کھانے پینے کی اشیاء یا اور دوسری ضرورت کی چیزیں ادھار خریدے یا اس سے خود تجارت کرنے کے لئے سامان ایک وقت مقررہ تک کیلئے لے اور اسکے پاس نقد پیسہ قیمت ادا کرنیکے لئے موجود نہیں ہے تو اگر اس شخص کی نیت اور عزم ادا کرنے اور بیباق کرنیکی ہے تو اللہ تعالےٰ اسکے لئے مال کی تحصیل میں آسانی فرمادیگا یہاں تک کہ یہ اپنے وعدہ ادائیگی کو پورا کردیگا۔

یہاں تک تو حدیث شریف کے اول جزو کی شرح تھی یعنی یہ کہ جو شخص قرض لے اور اسوقت اسکی نیت بھی یہ ہو کہ میں اسکو ادا کرونگا تو اللہ تعالیٰ اسکی ادائیگی کا انتظام غیب سے فرمادیں گے اور اس کے عزم و ارادہ کی برکت سے انشاء اللہ تعالیٰ وہ باقی نہیں رہ جائے گا بلکہ ادا ہی ہوجائیگا۔ آگے حدیث شریف کے دوسرے جزو کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔

اما من استقرض او اشترى شيئا دينا او طلب الى الناس ان يودعوه اموالهم او استعار او استاجر عينا عازما على	بہرحال وہ شخص جس نے قرض لیا یا کوئی چیز کسی سے ادھار خریدی یا لوگوں سے کہا کہ میرے پاس اپنے اموال امانت رکھدو یا عاریت پر کوئی چیز لیا یا کسی چیز کو اجارہ اور کرایہ پر لیا اور نیت اور عزم اس کا ابھی سے یہ ہے کہ یکر مکر جاوےگا یا انکار کردیگا یا مقصد یہ ہے کہ ۔۔۔

الجحود والانکار والاتلاف	لوگوں کا مال لیکر اس کو تلف اور ہلاک کردے تو اسکو
والاهلاك فان الله تعالى	سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ خود اسکو ہی تلف اور ہلاک
يتلفه فيوقعه في خبث نيته	کردیگا جسکی صورت یہ ہوگی کہ مثلاً اس کو اسکی بدنیتی
وسوء طويته ويفتح له من	اور بدباطنی کے خبث کے وبال میں واقع کردیگا
النفقات ما يذهب بماله	اور اس پر خرچ کے اس قدر دروازے کھول
طارفه وتليده او يسلط	دیگا جو اسکا تمام مال جدید و قدیم ختم کر کے رکھدیگا
عليه من البلايا والمصائب	یا اس پر ایسی ایسی بلا اور مصیبتیں مثلاً مقدمہ وغیرہ
ما يستاصل ملكه او يرسل	مسلط کردے گا جو اس کے مال کا استیصال کردیگا
اليه جيشًا من الامراض	یا اسپر امراض مہلکہ اور مزمن بیماریوں کا ایسا لشکر بھیجدیگا
الفتاكة يعمل في نفسه	جو خود اسکو اور اسکے اہل و عیال کو ایسا کردیگا کہ سب کے
واهله وولده ما يحرمهم	سب لوگ دنیا کی لذت اور اسکی نعمتوں سے محروم ہی
لذة الحياة ونعيمها الى	ہوجائیں گے اور یہ سلسلہ عذاب کا جاکر ختم ہوگا آخرت
عذاب في الآخرة شديد	کے عذاب شدید پر یعنی دنیا میں جو کچھ ہوگا وہ اس معاملہ
وهل رايت اكرمك الله	سے کہیں کمتر ہوگا جو اس کے ساتھ آخرت میں ہوگا اور
من اغتنى وتنعم في مال	میں تم سے پوچھتا ہوں (اللہ تعالیٰ تمھیں مکرم بنائے) کہ تم نے
غيره المغصوب ولئن	کسی شخص کو بھی دیکھا ہو کہ وہ دوسروں کا مال غصب کرکے امیر بنگیا ہو اور
ضحكت له الدنيا اياما او	اگر کوئی بالفرض ایسا ہوا بھی ہو اور دنیا والے اسپر چند سال چند دن
سنين استهزاء به او	ہنسے بھی ہوں اور تمام انکی یہ ہنسی استہزاء اور استدراجاً ہوتی ہو لیکن عنقریب ہی
استدراجا له فهي كاشرة	ایسا بھی ہوا ہے کہ اسی دنیا نے اسپر اپنے غصے کے دانت دکھائے
له عن انيابها ثم تلتهمه	ہیں اور اسکو لقمہ بنالیا ہے یا کبھی ایسا بھی ہوا کہ اس پشت میں نہ سہی تو دوسری
التهامًا او تستلب ما كنز	تیسری پشت میں باپ دادا کا اس طرح سمیٹا ہوا مال لٹ گیا ہے
من اولاده واحفاده	اور ایسوں کی اولاد کوڑی کی محتاج ہوگئی ہے۔
استلابا.	
(قال تعالیٰ)	(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں)
فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا	سو یہ انکے گھر ہیں جو ویران پڑے ہیں انکے کفر کے

ظَلَمُوا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ

فالنية الصالحة والارادة الصادقة لها اثرها في كسب المال والهداية سبله والنية الخبيثة جائحة المال ومبددة الثروة والقاضية على صاحبها بالفقر والمتربة بل بالهلاك والخسار فلا تستدن الا عند الحاجة وان استدنت فاعزم على الوفاء ومهد لتنفيذ العزم بتذليل الاسباب والبحث عن مسالك المال وحذار ان تاخذ اموال الناس في صورة استدانة وطوية نفسك غصب وسرقة وانتهاب وخيانة فتكون غشاشا لمن اعانك بل تكون منافقا تبدى للناس غير ما تضمر ولا تنس قوله تعالى

سبب سے بلاشبہ اس میں بڑی عبرت ہے دانش مندوں کیلئے اور جو کچھ یہ ظالم لوگ کر رہے ہیں اس سے خدائے تعالیٰ کو بے خبر مت سمجھ ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے جس میں ان لوگوں کی نگاہیں پھٹی رہ جائیں گی۔

پس نیت صالح اور ارادۂ خالص کو کسب مال میں اور اس کے طرق کی جانب رہنمائی حاصل ہونے میں ایک خاص اثر اور دخل ہے اور بدنیتی مال کے حق میں ایک آفت ہے اور مالداری کو ختم کر دینے والی ہے اور یہ چیز بدنیت شخص کو فقیر بنا دیتی ہے اور اسکو خاک میں ملا کر رکھدیتی ہے بلکہ خسارہ اور ہلاکت میں اسکو ڈالدیتی ہے۔ لہٰذا خبردار اتم بلاضرورت کبھی قرض مت لینا اور اگر کبھی بالفرض لینا ہی پڑجاوے تو ادائیگی کا عزم ضرور رکھنا اور پھر اپنے عزم کو نافذ کرنے کے اسباب بھی اختیار کرنا اور مال حاصل ہونے کے جو ذرائع ہیں ان میں بھی غور و فکر کیا کرنا۔ اور خبردار ایسا ہرگز نہ کرنا کہ لوگوں کے مال پر قبضہ کرو تو قرض کی شکل میں اور دل میں تمھارے یہ ہو کہ اس مال کو غصب کرلوگے یا سرقہ کرلوگے یا لوٹ لوگے اور خیانت کرجاؤگے کیونکہ اس صورت میں تو تم دھوکہ باز ثابت ہوگے اپنے معین کے حق میں کہ اس نے تو اعانت کی اور تم خیانت کر رہے ہو بلکہ منافق کہلاؤگے کہ باطن کے خلاف ظاہر کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو نہ بھولو کہ فرماتے

إِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا

ہیں کہ اللہ تعالیٰ تم کو حکم کرتا ہے کہ امانات کو اسکے اہل کو ادا کر دو۔

صاحب الادب النبوی یہاں تک حدیث کے دونوں اجزاء کی تشریح کر چکنے کے بعد اب اخیر میں بطور ثمرہ اور نتیجہ کے حدیث سے جو سبق ملا ہے اس کا پھر مختصراً بیان کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

فالحديث يحض على الاخلاص في النية وعلى اداء الحقوق ويتوعد من يضمر الشر ويستلب الاموال بالطرق الخفية وانه ليؤذن اولئك التجار الذين يملئون مخازنهم بالبضاعات يشترونها لاجل وفي نيتهم ان يعلنوا الافلاس بعد ان تمتلئ جيوبهم يؤذنهم بالخسار والبوار بل يؤذنهم بحرب من الله لا قبل بها فليتقوا الله في اموال الناس ليرزقهم من حيث لم يحتسبوا ومن يتق الله يجعل له من امره يسرا

پس یہ حدیث نیت میں اخلاص پیدا کرنے پر ابھارتی ہے اور ادائے حقوق پر آمادہ کرتی ہے اور جو شخص کہ برائی دل میں رکھے اور لوگوں کے اموال کو پوشیدہ تدابیر سے حاصل کرے اسکو دھمکاتی ہے اور ان تاجروں کے متعلق انکا سوء صنیع بیان کرتی ہے جو کرتے یہ ہیں کہ اپنے خزانوں کو ادھار اور مقررہ وعدے پر خریدے ہوئے سامانوں سے بھر لیتے ہیں اور دل میں انکے یہ ہوتا ہے کہ جب مال جمع کر لیں گے اور جیب خوب بھر جائیگی تو دیوالیہ کا اعلان کر دیں گے انکے متعلق یہ حدیث خسارہ اور ہلاکت کا اعلان کرتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسی جنگ کے الٹی میٹم کی خبر دیتی ہے جس کے مقابلہ کی انکو طاقت نہ ہوگی۔ لہٰذا لوگوں کے مال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیئے تاکہ اللہ تعالیٰ ایسی جگہ سے رزق دیں کہ وہاں سے وہم و گمان بھی نہ ہو اور جو شخص کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکے معاملہ میں آسانی فرما دیتے ہیں

میں کہتا ہوں کہ دیکھئے علامہ عبدالعزیز خولی مصری نے تھوڑے سے لفظوں میں کیسا اچھا وعظ کہہ دیا آج کل اسی قسم کے مضامین بیان کرنے کی ضرورت ہے لیکن ابناء روزگار کا یہ حال ہے کہ اس قسم کی باتیں بیان ہی نہیں کرتے اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ چونکہ اصلاح کا کام کوئی آسان کام نہیں ہے اس لئے اگر لوگ اس حدیث کی شرح بیان بھی کرنا چاہیں تو شاید زیادہ بیان بھی نہ کر سکیں اس میں انکی زبان ہی نہ چلے گی یوں اور مضامین میں گھنٹوں تقریر کر سکتے

ہیں نگران پر کچھ نہیں۔

اس حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض لینے سے منع نہیں فرمایا بلکہ قرض لیتے وقت نیت کی تصحیح کی جانب متوجہ فرمایا ہے کہ انسان اُسوقت پختہ عزم کرے کہ اسکو فوراً ادا کردیگا جب ایسا کریگا تو اسکی اس نیت کی برکت سے اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شامل حال ہوجائیگی یعنی اسکی آمدنی کے ذرائع وسیع ہوجائیں گے اور ادائیگی کی صورت نکل آئیگی اور ایسے شخص کے مال میں برکت بھی ہوگی۔ اور برکت کے معنی بہجۃ النفوس میں یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ غیر ضروری امور در پیش ہی نہ آویں جس میں مال خرچ ہوجائے بلکہ ضروری موقع ہی پر مال صرف ہو اسکا نام بھی برکت ہے۔

اسکے برخلاف اگر قرض لیتے وقت یا اس کے بعد نیت خراب ہوگئی تو اللہ تعالےٰ اسکو اور اسکے مال کو تلف فرمادیں گے طرح طرح کے نئے نئے خرچ اسکے سامنے آویں گے کہیں مقدمہ کھڑا ہوجائے گا اور سب آمدنی وکیل و مختار اور اسٹامپ پر صرف ہوجائیگی یا کہیں کوئی بیماری ایسی لگ جائے گی کہ ساری کمائی حکیم وڈاکٹر اور دوا کی نذر ہوجائیگی اس کا نام بے برکتی ہے۔

لیکن اس قسم کے لوگ اسکو بجائے عیب کے کمال سمجھتے ہیں اور ہوتا تو ہے یہ سب وبال اور یہ لوگ ایسا کرکے اپنے کو ہوشیار بھی سمجھے جاتے ہیں حالانکہ مشاہدہ شاہد ہے کہ اسطرح سے جمع کی ہوئی رقم پھلتی پھولتی نہیں اگر ایک پشت کوئی اس سے منتفع بھی ہوا تو دوسری تیسری پشت پر اسکا اثر ضرور ہی پڑجاتا ہے اور باپ دادا کی اولاد کوڑیوں کی محتاج ہوجاتی ہے۔

قرض کی ادائیگی کیلئے فکر اور عزم نہایت ضروری ہے اور تجربہ ہے کہ جس پر فکر ادائیگی سوار ہوجاتا ہے اسکا قرض ادا بھی ہوجاتا ہے اور جن لوگوں کا قرض ادا نہیں ہوتا اسکی وجہ یہ ہے کہ دراصل انکو اسکی فکر ہی نہیں ہوتی۔

پھر ادائیگی کے لئے اسکا انتظار نہیں کرنا چاہیئے کہ جب زیادہ سی رقم ہوجائے تب ہی ادا کرے اس طرح سے کبھی ادا نہ ہوگا بلکہ جزئی طور پر جو کچھ بھی پاس موجود ہو اسکو ادا کردے پھر تھوڑا سا ہوا اسکو ادا کردے اسی طرح کرتے کرتے قرض میں کمی اور اسکی ہمت میں ترقی ہوتی ہی جائیگی یہاں تک ایکدن اس سے بالکلیہ نجات پاجائے گا۔

ایک بداخلاقی عام طور سے مدیون کی جانب سے یہ ہوتی ہے کہ وہ جب وقت پر ادا

نہیں کرپاتا تو وہ اُن سے بھاگنے اور منھ چھپانے لگتا ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے اسکو اور شبہ ہوجاتا ہے کہ شاید میرا مال مارنا چاہتا ہے اور اسکی وجہ سے تعلقات پر برا اثر پڑتا ہے القرض مقراض المحبۃ اسی اعتبار سے کہا گیا ہے بلکہ اسکو یہ چاہیئے کہ وعدہ پورا ہونے کے بعد اگر ادا نہ کرسکے تو اس سے معذرت خواہ ہو اور مزید مہلت مانگ لے اسمیں بھی گو دائن کو قدرے ناگواری ہوگی تاہم پہلی صورت سے تو اسکی برائی بہت کم ہے اور اگر بالفرض غصہ میں صاحب حق کچھ کلمات بھی کہدے تو مدیون کو اسے برداشت کرنا چاہیئے کیونکہ حدیث میں ہے "فان لصاحب الحق مقالاً" ۔ اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلم ۔

یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ ایسے نادھند ہوتے ہیں کہ باوجود قدرت اور استطاعت کے قرض ادا کرنا گویا جانتے ہی نہیں انکو یہ سمجھنا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "مطل الغنی ظلم" صاحب مال کا ٹال مٹول کرنا ظلم کی بات ہے ۔

لین دین کا زیادہ تر سابقہ چونکہ تاجروں کو پیش آتا ہے اور یہ لوگ بھی معاملات میں بے احتیاطی کرتے اسی لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ التجار ھم الفجار یعنی یہ تاجر لوگ (بالعموم) فاجر ہی ہوتے ہیں لیکن اسمیں رہتے ہوئے اگر کوئی اپنے آپ کو ان برائیوں سے جو عام تاجروں میں ہوتی ہیں بچالے جائے تو واقعی یہ اسکا غایت تقویٰ اور بڑا ہی کمال ہے اس لیئے انکا مرتبہ بھی زیادہ ہے چنانچہ ایسوں کے لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "تاجر صدوق امین قیامت میں انبیاء اور شہداء اور صالحین کے ساتھ ہونگے ۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ ادائے حقوق کے بارے میں آج مسلمانوں سے جو کوتاہی ہو رہی ہے وہ سب کو معلوم ہی ہے ۔ ذرائع آمدنی میں سے سب سے سہل اور آسان ذریعہ آج بھی قرض تھا لیکن اپنی بدعقلی اور کم فہمی کی وجہ سے مسلمانوں نے اسکو بھی اپنے اوپر بند کرلیا یعنی قرض کے سلسلے میں لوگوں نے صاحب حق کو ایسا دق اور پریشان کیا ہے کہ جس کے پاس سے ایک دفعہ قرض کے آتے ہیں وہ دوبارہ دینے کے لئے کان پکڑ لیتا ہے اس طرح سے اس باب کو بھی انھوں نے اپنے اوپر بند کرلیا ہے حالانکہ آدمی جب یہ سمجھتا ہے کہ آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے بجز ایک ذریعہ کے تو ایسی صورت میں تو اسکو اس ذریعہ کا بڑا ہی خیال اور لحاظ رکھنا چاہیئے کہ اسمیں کوئی گڑبڑی نہ ہونے پائے اور اسکے حقوق میں فرق نہ پڑنے

مگر اسکی بھی فکر نہیں۔
انسان کو ضرورت پیش آتی ہی ہے اور بعض مرتبہ وہ قرض لینے پر مجبور بھی ہو جاتا ہے
ایسی صورت میں کوئی اللہ کا بندہ ثواب کے خیال سے قرض دیدیتا ہے جس سے اُسکو
بھی ثواب ملتا ہے اور اسکا کام بھی چلتا ہے لیکن جب لوگ اپنا اعتبار ہی کھو دیں گے تو
اسکا انجام یہ ہوگا کہ انکی وجہ سے دوسرے نیک لوگوں کا بھی اعتبار چلا جائیگا ؎

چو از قومے یکے بیدانشی کرد نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

یہ کہہ رہا ہوں کہ یہی تو ایک ذریعہ مسلمانوں کے پاس آمدنی کا رہ گیا تھا مگر اس کو
بھی ان نادہندوں نے اپنے اوپر بلکہ سب کے اوپر بند کر دیا۔ ع

ہرچہ گیرد علتی علت شود

حالانکہ حدیث شریف سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرض لینا منع نہیں ہے بلکہ ضرورت پر
جائز ہے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی غایت شفقت علی الامۃ سے اسکی ادائیگی کا
طریقہ بھی بتا دیا جو کتنا سہل اور آسان ہے وہ یہ کہ جب ضرورت پر قرض لے تو اسی وقت
اسکی ادائیگی کی نیت اور پختہ عزم کرے اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی سبیل نکالدیں گے اب کون
سی مشکل بات ہے پھر لوگ ان تعلیمات رسولؐ پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ بات یہ ہے کہ
آدمی عمل اسوقت کر سکتا ہے جب اسکو کسی چیز کا علم ہو اور علم جب ہو کہ کوئی بیان کرے
اور اس زمانہ میں ان اصلاحی چیزوں کو بیان ہی نہیں کیا جاتا ہے
حالانکہ جس طرح سے لوگ آخر نماز روزہ کا ذکر کرتے ہیں تو لوگوں پر اسکا اثر ہوتا ہے
اور بہت سے اللہ کے بندے سن کر عمل بھی کرتے ہیں اسی طرح سے اگر اخلاق کا اور نفس
کی برائیوں کا بھی بیان کیا جائے تو ایسا نہیں ہے کہ کچھ لوگ بھی اسکی قدر کرنے والے اور
اس پر عمل کرنے والے نہ نکلیں۔
میں تو دیکھتا ہوں کہ لوگ ان مضامین کو بھی نہایت توجہ کے ساتھ سنتے ہیں اور
بہت سے لوگ عمل بھی کرتے ہیں مگر انکو بتایا ہی نہیں جاتا۔ لہٰذا اس زمانہ میں میرے نزدیک
اسی قسم کے مضامین کا بیان کیا جانا نہایت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ و رسولؐ سے بڑھکر اخلاقیات
کی تعلیم اور امت کی تربیت کون کر سکتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اگر ایک ارشاد
آدمی دل سے سمجھ لے تو ازالۂ مرض کیلئے کافی و وافی ہے۔

صاحب الادب النبوی نے اسی کتاب میں پانچویں حدیث علامات النفاق کا عنوان قائم کرکے یہ نقل فرمائی ہے کہ "اربع من کن فیہ کان منافقاً خالصاً (الحدیث) جس میں خیانت، کذب، غدر اور فجور فی الخصومۃ کو علامتِ نفاق فرمایا گیا ہے۔

ان صفات بد کے متعلق صاحب کتاب فرماتے ہیں:-

وحقاً انہا لکبائر موبقۃ وجرائم مردیۃ لا تصدر عن مومن ملأ ایمان قلبہ

یعنی حق یہ ہے کہ یہ سب ایسے کبائر ہیں جو ہلاک ہیں اور ایسے جرائم ہیں جو تباہ کر دینے والے ہیں اور انکا صدور کسی ایسے شخص سے کہ جس کے قلب میں ایمان بھرا ہوا ہو نہیں ہو سکتا۔

اسی حدیث کی شرح سے فارغ ہو کر آخر میں لکھتے ہیں کہ

والحدیث دعامۃ کبیرۃ من دعائم الاخلاق التی ترتکز علیہا عزۃ الامم وسعادتہا.

یعنی یہ حدیث اخلاق کے ان ستونوں میں سے ایک بڑا ستون ہے جن پر امم کی عزت اور سعادت قائم ہوتی ہے یعنی جسطرح ستون پر بنا قائم ہوتی ہے اور اسکے انہدام سے منہدم ہو جاتی ہے اسیطرح امم اور اقوام کی عزت دنیوی اور اسکی سعادت اخروی اسی پر قائم ہے اسکے خلاف میں دونوں منہدم نظر آرہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ خولی نے یہ دونوں باتیں نہایت ہی عمدہ بیان کی ہیں واقعی یہ حدیث ایسی ہی ہے لیکن میں نے جو حدیث ادائے حقوق سے متعلق ابھی بیان کی ہے وہ کچھ کم اہم نہیں ہے۔ آج عام طور سے مسلمان اسی قسم کی بدمعاملگی کے شکار ہیں کسی سے قرض لیکر نہ دینا تو معمولی سی بات ہے لوگ ایسا بھی کرتے ہیں جیسا کہ بیان کیا گیا کہ لیتے تو ہیں قرض کے نام سے اور دل میں انکے اسی وقت غصب، سرقہ، انتہاب اور خیانت کا خیال پوشیدہ رہتا ہے جو کہ عین نفاق ہے۔ قوم آج اپنی انھیں بداخلاقیوں کیوجہ سے ذلیل وخوار ہوتی جارہی ہے مگر کچھ احساس نہیں ہے مخلوق کے نزدیک بے اعتبار ہو گئی ہے اور دنیا و دین کی ہر قسم کی سعادتوں سے محروم ہو گئی ہے جس کا انجام یہ ہوا کہ گویا قوم ہی ختم ہو گئی کیونکہ کسی قوم کا وجود اسکے اخلاق ہی سے سمجھا جاتا ہے اور جس قوم میں اخلاق ہی نہ ہوں وہ کچھ بھی نہیں ہے ؎

وانما الامم بالاخلاق ما بقیت فان ہم ذہبت اخلاقہم ذہبوا

امتیں اور قوم اخلاق سے ہوا کرتی ہیں جب کسی قوم کے اخلاق ہی ختم ہو جائیں تو سمجھ لو کہ وہ قوم ہی ختم ہوچکی اسلئے علامہ خولیؒ کے ان اخیر کے جملوں کو میں یہاں بھی دہراتا ہوں کہ حدیث بھی اخلاق کے ستونوں میں سے ایک ایسا ستون ہے جس پر انکی عزت وسعادت کا دارومدار ہے ۔ اسی پر عمل نہ کرنے سے عزت وسعادت دونوں رخصت ہوگئی جب مسلمان اس پر عامل تھے تو عزت اور سعادت انکے قدم چومتی تھی اور جب سے کہ انھوں نے اسکو ترک کردیا عزت کی جگہ ذلت اور خواری لازم حال ہوگئی ہے ۔

اور اس حدیث کے متعلق یہ بھی کہتا ہوں کہ یہ سب باتیں کہ قرض لیکر نہ دے یا مال ہونے کے باوجود ٹال مٹول کرے یا ظاہر تو قرض کرے اور دل میں خیانت کو پوشیدہ رکھے یہ سب امور ایسے ہیں کہ اس شخص سے جسکا قلب ایمان سے بھرا ہوا ہو صادر ہی نہیں ہو سکتے ۔ سبحان اللہ کس قدر موثر کلام ہے ۔ واقعی اگر کسی کے اندر غیرت ایمانی اور قلب میں اسلام کی شرم ہو تو آدمی ان بداخلاقیوں کے پاس تک نہ پھٹکے ۔

اخیر میں ایک حدیث شریف اور اسکا ترجمہ بیان کرکے مضمون کو ختم کرتا ہوں وھو ھذا

عن حکیم بن حزام قال سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاعطانی ثم سألتہ فاعطانی ثم قال یا حکیم ان ھذا المال خضر حلو فمن اخذہ بسخاوۃ نفس بورک لہ فیہ ومن اخذہ باشراف نفس لم یبارک لہ فیہ وکان کالذی یاکل ولا یشبع والید العلیا خیر من الید السفلی قال حکیم فقلت یا رسول اللہ والذی بعثک بالحق لا ارزأ احداً بعدک شیئاً حتی افارق الدنیا

حضرت حکیم بن حزامؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مال کا سوال کیا تو آپ نے مجھے مرحمت فرمایا ۔ میں نے پھر سوال کیا آپ نے مزید عطا فرمایا ۔ اور فرمایا کہ دیکھو یہ مال بھی دیکھنے میں تو بہت سرسبز شاداب اور شیریں چیز ہے لہٰذا جو شخص اس کو سخاوت نفس (یعنی زہد) کے ساتھ لے تو اس میں اسکو برکت دی جاتی ہے اور جو شخص اسکو اشراف النفس (حرص) سے لیتا ہے تو اسکے ساتھ برکت نہیں کیجاتی اور یہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے کوئی شخص کھاتا چلا جائے اور پیٹ نہ بھرے اور (یاد رکھو) اوپر کا ہاتھ (یعنی دینے والا ہاتھ) نیچے کے ہاتھ (یعنی لینے والے ہاتھ) سے بہتر ہوتا ہے حکیم کہتے ہیں کہ

وکان ابو بکرؓ یدعو حکیما لیعطیہ العطاء فیابی ان یقبله منه شیئاً ثم ان عمرؓ دعاه لیعطیہ فابی ان یقبله فقال یا معشر المسلمین اشهدکم علی حکیم انی اعرض علیه حقه الذی قسم علیه فی هذا الفیئ فیابی ان یاخذه فلم یرزا حکیم احداً من الناس بعد النبی صلی الله علیه وسلم حتی توفی (متفق علیه)

میں نے یہ سن کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے آپکے بعد کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کروں گا مرتے دم تک چنانچہ ایسا ہی کیا حضرت ابو بکرؓ اپنے زمانے میں انکو بلاتے تھے عطیہ دینے کیلئے یہ اسکے لینے سے انکار کرتے تھے پھر حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں بلایا کہ کچھ دیدیں مگر نہیں لیا پھر حضرت عمرؓ نے لوگوں کو مخاطب کرکے کہا کہ اے لوگو! گواہ رہنا کہ میں نے حکیم کا حق جو مال غنیمت میں انکا ہوتا ہے انکو پیش کیا مگر انھوں نے اسکے لینے سے انکار کیا غرضیکہ حکیم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد پھر تا زندگی کسی سے سوال ہی نہیں کیا سبحان اللہ

دیکھئے! اس میں مال کے باب میں تربیت نبوی کا کتنا عمدہ نمونہ موجود ہے اللہ تعالیٰ توفیق عمل عطا فرمائے۔ آمین۔

ختم شد

ارتفاع الضیق

یعنی

دوستی اور عداوت کا شرعی معیار

از افادات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب
نور اللہ مرقدہ

مقدمہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

اما بعد۔ پیش نظر رسالہ مصلح الامت مرشدی ومولائی حضرت شاہ وصی اللہ صاحب دامت برکاتہم وعمت فیوضہم کی ایک تازہ تصنیف ہے جس میں صداقت وعداوت یعنی دوستی اور دشمنی کا شرعی اصول بیان کیا گیا ہے اور دلائل نقلیہ اور عقلیہ کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسی معیار کے نہ اختیار کرنے کی وجہ سے آج مسلمان گوناگوں دینی ودنیوی پریشانیوں میں مبتلا ہیں اور طرح طرح کے نقصانات کے شکار ہیں۔ اصلاح معاش اور معاد کیلئے اس دینی معیار کا برتنا بھی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

والسلام

عبدالرحمٰن جامی عفی عنہ

۲۳۔ روشن باغ۔ الہ آباد

۱۵ / شعبان المعظم ۱۳۷۸ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اما بعد ۔ ناظرین باتمکین کی خدمت میں عرض ہے کہ آج کل جو لوگ بزرگوں کے پاس آمد و رفت رکھتے ہیں اکثر ان لوگوں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں ایک ضیق اور تنگی پیش آتی ہے اور یہ ضیق بزرگوں ہی کو نہیں پیش آتی بلکہ ان آنے جانے والوں کو بھی پیش آتی ہے ۔ آنے والوں کو تو اس سبب سے پیش آتی ہے کہ ان کے ساتھ ان کے گمان کے موافق یہاں شاید معاملہ نہ کیا جاتا ہو اور بزرگوں کو اس سبب سے پیش آتی ہے کہ ان لوگوں کی نسبت یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جائے یعنی دوست ہیں تو دوستی کا برتاؤ کیا جائے ورنہ دوسرا برتاؤ کیا جائے ۔ اس ضیق کا سبب یہ ہوتا ہے کہ انکے آنے جانے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ معتقد اور محب ہیں لیکن معتقدین اور محبین کی باتیں نظر نہیں آتیں لہٰذا ان کا یہ آنا جانا صرف ایک رسمی ہی سا رہ جاتا ہے جسکی نہ تو عقل کے نزدیک کوئی وقعت ہے اور نہ دین ہی میں اسکا کچھ اعتبار ہے جیسا کہ امام غزالیؒ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں :۔

فاعلم ان عقد الاخوۃ لم ینعقد بعد فی الباطن وانما الجاری بینکما مخالطۃ رسمیۃ لا وقع لها فی العقل والدین (احیاء العلوم ص۱۴۹ ج۲)

جان لو اگر وہ عقد اخوت (یعنی دوستی کا تعلق) جو قلب سے نہ ہو تو تمہارے درمیان جو کچھ جاری ہے وہ محض ایک رسمی ہی میل جول ہے جس کا نہ تو عقل کے نزدیک کوئی اعتبار ہے اور نہ دین ہی میں اسکی کچھ وقعت ہے ۔

پس لوگوں کے ان حالات سے جو ضیق ہوتی ہے اسکی وجہ سے ملنے ملانے میں بجائے لطف کے ایک بدمزگی کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور میرا تو یہ خیال ہے کہ اس قسم کی ضیق اس زمانہ میں قریب قریب سبھی کو پیش آتی ہے چنانچہ میں ایک عرصہ تک اسکی جانب سے ایک تنگی میں مبتلا رہا

لیکن ایک حدیث نظر سے گزری اس سے الحمدللہ یہ مشکل حل ہوئی اور اسوقت سے ذہنی اوراعتقادی طور پر یہ ضیق رفع ہوئی اسلئے ارادہ ہوا کہ اسکو عام طور پر سب کو سمجھا دیا جائے چنانچہ وہ حدیث حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد ہے :۔

ان عبد اللہ بن عقبۃ قال سمعت عمر بن الخطابؓ یقول ان اناسا کانوا یوخذون بالوحی فی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وان الوحی قد انقطع وانما ناخذکم الان بما ظہر لنا من اعمالکم فمن اظہر لنا خیرا امناہ وقربناہ ولیس الینا من سریرتہ شئی اللہ یحاسب فی سریرتہ ومن اظہر لنا سوء لم نامنہ ولم نصدقہ وان قال ان سریرتہ حسنۃ۔

(بخاری شریف)

حضرت عبداللہ بن عقبہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں تو وحی کے ذریعہ لئے جاتے تھے (یعنی اسی کے مطابق انکے ساتھ معاملہ کیا جاتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ارشاد اور آپکا انکے ساتھ کوئی معاملہ فرمانا سب وحی ہی سے ہوتا تھا) اور اب وحی کا سلسلہ تو بند ہوچکا ہے لہٰذا اب ہم تم کو تمہارے ظاہری اعمال ہی سے لیں گے (یعنی اسی کے مطابق تمہارے ساتھ برتاؤ کریں گے مطلب یہ کہ اس زمانہ میں تو وحی کیوجہ سے مخلص مسلمان منافق سے ممتاز تھے اور وحی ان دونوں میں مابہ الامتیاز تھی اور اب ظاہری اعمال مابہ الامتیاز ہیں) پس جو شخص ہم سے خیر (یعنی ایمان اور عدالت) ظاہر کرے گا تو ہم اس سے مامون ہوں گے اور اسکو اپنا مقرب بنائیں گے اور اسکے باطن کی تحقیق ہمارے ذمہ نہیں ہے اللہ تعالیٰ اسکے باطن کا حساب فرمائینگے اور جو شخص ہم سے سوء (اور ایک روایت میں ہے شر اور قرینہ تقابل سے اس سے مراد غیر ایمان اور غیر عدالت ہوگا) ظاہر کریگا تو ہم اس سے مامون اور مطمئن نہ ہوں گے اور اسکی تصدیق نہ کریں گے اگرچہ وہ کہے کہ میرا باطن اچھا ہے

(ایک تو اس لئے کہ یہ خداع ہے نیز اس لئے کہ سریرہ تو اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے دوسرے اس لئے کہ اس کا ظاہر اسکا مکذب ہے باقی وہ فرق ضالہ باطلہ مثلاً آغا خانی یا قادیانی وغیرہ جو زبان سے اسلام کا دعوے کرتے ہیں لیکن انکے اقوال اور اعمال میں ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جو اسلام کے بالکل خلاف ہوتی ہیں بلکہ ان سے ضروریات دین کا انکار

ہو جاتا ہے تو علماء کا انکی تکفیر کرنا حضرت عمرؓ کے اس ارشاد کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس حدیث کے عین مطابق ہے اور یہ کسی کے سریرہ پر حکم لگانے کے قبیل سے بھی نہیں ہے کیونکہ جو آثار کفریہ یعنی اقوال اور افعال ان سے ظاہر ہوئے ہیں انہی کو لیا گیا ہے اور انکے ہوتے ہوئے دعویٰ اسلام کو قبول نہیں کیا گیا کہ اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ شر اور سوء کے ظہور کے بعد ہم تصدیق نہیں کریں گے اگرچہ وہ کہے کہ میرا باطن اچھا ہے۔ اور یہی مطلب ہے حضرت حذیفہؓ کے اس ارشاد کا جس میں ہے کہ "نفاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا اور اب یا تو کفر ہے یا ایمان ہے"۔ کیونکہ نفاق کا تعلق تو قلب سے ہے جس کا حال معلوم نہیں ہو سکتا لہٰذا اب ظاہری اقوال اور اعمال ہی کی بنا پر کسی کو مومن یا کافر سمجھیں گے)

دیکھا آپ نے حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد مخلص و منافق دوست و دشمن اور موافق و مخالف کے معیار میں کس قدر واضح ہے۔ مشائخ معتبرین کا عمل اسی پر رہا ہے کہ جب کسی سے کوئی عمل شر کا صدور ہو جاتا ہے تو اسی کو لیتے ہیں اور پھر اسکے خلاف نیت اور باطن کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتے جیسا کہ جب تک صدور اعمال خیر کا ہوتا رہے تو باطن کی تفتیش نہیں کرتے پس ان دونوں حالتوں میں یہ حضرات کس قدر پابند شریعت اور متبع سنت ہیں سبحان اللہ اس حدیث کی شرح میں صاحب فتح الباریؒ فرماتے ہیں کہ:-

وفی روایۃ ابی فراس عن عمرؓ عند الحاکم انا کنا نعرفکم اذ کان فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واذ الوحی ینزل واذ یأتینا من اخبارکم وفیہ ایضاً الا ومن یظھر منکم خیرا ظننا بہ خیراً واحببناہ علیہ ومن یظھر لنا شراً ظنناہ بہ شراً وابغضناہ علیہ سرائرکم فیما بینکم وبین ربکم (فتح الباری ج ۵)	حاکم نے ابوفراس کی روایت میں حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ ذکر کئے ہیں کہ "بیشک ہم تم لوگوں کو اس وقت پہچانتے تھے جبکہ ہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور وحی نازل ہوتی تھی اور تمہاری خبریں ہمکو ملتی رہتی تھیں اسی روایت میں ہے کہ سن لو! جو شخص تم میں سے خیر ظاہر کریگا تو ہم بھی اسکے ساتھ حسن ظن رکھیں گے اور اسکو مقرب بنائیں گے اور جو شخص ہم سے شر یعنی برائی ظاہر کریگا تو ہم بھی اسکے ساتھ گمان بد رکھیں گے اور اس سے بغض رکھیں گے، رہا باطن کا معاملہ تو تم جانو تمہارا رب جانے یہ تمہارے اور اسکے درمیان ہے۔

اس حدیث کے سب طرق کو جمع کرنے سے اور ان میں جو الفاظ وارد ہوئے ہیں اس سے یہ ضیق رفع ہو گئی اس طرح سے کہ اسمیں ایک فریق سے محبت رکھنے کو، اسکو مقرب بنانے کو، معتمد بنانے کو اور اسکے ساتھ حسن ظن رکھنے کو فرماتے ہیں اور دوسرے فریق سے بغض رکھنے کو، اسکی تصدیق نہ کرنے کو، اس سے مامون نہ ہونے کو اور اس سے سوء ظن رکھنے کو فرماتے ہیں اور اسکا مدار اسی کے ظاہری اعمال کو قرار دے رہے ہیں۔

پس اس حدیث میں ہر ایک کے ساتھ یکساں معاملہ رکھنے اور برتاؤ کرنے کو نہیں بتلایا گیا ہے بلکہ ہر ایک کے ساتھ اسکے حال کے مطابق معاملہ کرنے کو مامور بہ اور شرعی حکم بتایا گیا ہے اور یہ جو آج کل یکساں برتاؤ رکھنے کا معمول ہے اور اسی کو اخلاق شرعی سمجھتے ہیں یہ حدیث اس ذہنیت کا رد کر رہی ہے اور یہ تنگی جو بیان کر رہا ہوں بزرگوں ہی کو نہیں پیش آتی بلکہ تمام عوام و خواص بلکہ ہر شخص کو اس ظاہر و باطن اور لسان و قلب کے اختلاف کے دور میں پیش آ رہی ہے اور اس سے طرح طرح کے نقصانات کے سب شکار ہو رہے ہیں اور یہ کسی کے بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسکا سبب کیا ہے؟ میں بتلاتا ہوں کہ اسکا سبب یہی اختلاف ہے جو اوپر ذکر ہوا اور اس کا علاج اس حدیث میں ہے عمل کیجئے اور فائدہ دیکھئے ورنہ اس کے نتائج بد کے شکار رہیئے۔

اب فقہا نے جو اس حدیث سے استنباط کیا ہے اسکو سنیئے بخاریؒ اس حدیث کو باب الشهداء العدول وقول الله تعالیٰ واشهدوا ذوی عدل منكم ممن ترضون من الشهداء میں لائے ہیں جس سے یہ مسئلہ صاف ہو گیا کہ بعد انقطاع وحی ظاہری اعمال کی شہادت کافی ہوگی اور اسکے موافق عملدرآمد کیا جائے گا اور یہ کافی و وافی ہے اس کے وضوح کیلئے چند جزئیات فقہیہ بطور مثال کے بیان کرتا ہوں۔

وفی الملتقط صبی احتلم لا اقبل شهادته مالم اسئل عنه ولا بد ان یاتی بعد البلوغ بقدر ما یقع فی قلوب اهل مسجده ومحلته کما فی الغریب انه صالح

ملتقط میں (کسی کا قول نقل کیا ہے کہ لڑکا جو کہ بالغ ہوا ہے تو جب تک میں اسکے حالات دریافت نہ کرونگا اسکی شہادت قبول نہیں کروں گا اور بعد بلوغ کے بھی اتنی مدت توقف کرنا چاہیئے جتنے میں کہ اہل مسجد اور اسکے اہل محلہ کے قلوب میں اسکا صالح یا غیر صالح ہونا ظاہر ہو جائے اور یہی حکم مسافر کا بھی ہے یعنی کچھ دنوں

او غیرہ (بحر ج ۷) کے بعد ہی اسکا اعتبار کیا جائے گا۔

دیکھئے فقہا کے اس جزئیہ سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کا اعتبار اسوقت کیا جائے گا جبکہ اسکے ظاہری حالات سے قلوب میں اسکی اصلاح اور دینداری کا یقین قائم ہو جائے چنانچہ بالغ ہونے کے بعد ہی فوراً لڑکے کی گواہی نہیں قبول کیگئی بلکہ کچھ دنوں کے بعد جب اسکا نمازی ہونا، نیک ہونا اور فسق و فجور کی باتوں سے دور رہنا اچھی طرح ثابت ہوگیا تب اسکو قابل شہادت قرار دیا گیا۔

اور میرے خیال میں یہاں اس میں اتنی قید ضروری ہے وہ یہ کہ اہل محلہ اور اہل مسجد بھی متدین لوگ ہوں ورنہ انکا بھی اعتبار نہ ہوگا کیونکہ دیکھا جاتا ہے کہ آجکل بستی کی بستی اہل صلاح سے بغض و نفرت رکھتی ہے اور انکی غیبت اور عیب جوئی کرتی ہے اور میرے اس خیال کی تائید فقہا کے کلام سے ہوتی ہے بحر میں ہے کہ:-

وینبغی للقاضی ان یختار فی المسئلة عن الشهود من هو اخبر باحوال الناس و اکثرهم اختلاطاً بالناس مع عدالته عارفاً بما لا یکون جرحاً وما یکون جرحاً غیر تابع ولا فقیر کیلا یخدع بالمال فان لم یکن فی جیرانه ولا اهل سوقه من یثق به سال اهل محلته وان لم یجد فیهم ثقه اعتبر فیه تواتر الاخبار وخص فی بزازیه السوال من الاصدقاء	قاضی کو چاہیئے کہ شہود کے حالات دریافت کرنے کیلئے ایسے اشخاص کا انتخاب کرے جو لوگوں کے حالات سے باخبر ہوں اور انکے ساتھ زیادہ اٹھتے بیٹھتے ہوں اور ساتھ ہی ساتھ عادل بھی ہوں اور یہ جانتے ہوں کہ کن باتوں کے ہونے سے انسان عادل رہتا ہے اور کن امور کی وجہ سے اسکی عدالت ختم ہوجاتی ہے اور فقیر اور لالچی نہ ہوں تاکہ مال کے ذریعہ انکو دھوکا نہ دیا جاسکے پس اگر اسکے پڑوسیوں اور بازار کے ساتھیوں میں ایسے ثقہ لوگ ہوں تو پھر اسکے محلہ والوں سے دریافت کرے اور اگر ان میں بھی کوئی ثقہ نہ ہو تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ عام طور پر لوگ اسکو کیسا سمجھتے ہیں اور بزازیہ میں ہے کہ صرف اسکے دوست احباب سے اس کے حالات معلوم کئے جائیں گے۔
(بحر۔ ج ۵۔ ص ۴۴)	

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ کسی شخص کے پڑوسی یا بازار کے احباب ہو سکتا ہے کہ ثقہ

نہ ہوں اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی محلہ کا محلہ یا بستی کی بستی ایسے لوگوں سے خالی ہو جنکی شہادت شرعاً معتبر ہے اسی لئے میں نے کہا تھا کہ کسی شخص کے بارے میں اسکے اہل مسجد اور اہل محلہ کی شہادت اسی وقت معتبر ہے جبکہ یہ لوگ خود بھی ثقہ ہوں ورنہ ان سے نہ تحقیق کیجا دیگی بلکہ دوسرے ونکا انتخاب کیا جائے گا۔

آج ہم مسلمانوں کے حالات جو دیکھتے ہیں تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نہ صرف مسجد اور محلہ بلکہ بستی کی بستی اور قریہ کا قریہ ایسے ہی لوگوں سے بھرا ہوا ہے شرعاً جنکی شہادت مقبول نہیں اور مزید افسوس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں علم اور اہل علم کی کمی نہیں۔ گاؤں گاؤں مدرسے قائم ہیں لیکن عملی کساد بازاری کا یہ حال ہے کسی بستی سے ایسے دو چار آدمی بھی دستیاب نہیں ہوتے جو شرعی اصول پر ہلال و نکاح و دیگر معاملات میں شرعی شاہد بن سکیں۔ حالت تو یہ ہے لیکن اس پر ستم یہ ہے کہ آج کوئی عالم لوگوں سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمہاری گواہی معتبر نہیں ہے اور اگر کسی نے کہدیا تو پوری قوم اسکی مخالف ہو جاتی ہے اور اسکو برا بھلا کہنے کے درپے ہو جاتی ہے۔ ایک طرف تو قوم کی بدعملی کا یہ حال ہے مگر دوسری جانب انکے علماء سے تکبر کا بھی یہ حال ہے کہ انکی اصلاحی باتیں بھی انکو ناگوار اور ناپسند ہیں جہاں کسی عالم نے انکی جہالت پر انکو ٹوکا تو کہتے ہیں کہ دیکھئے صاحب! ہم کو کہتے ہیں ہم لوگوں نے کچھ پڑھا لکھا ہی نہیں بالکل جاہل ہیں اور فسق و فجور کا یہ حال ہے کہ ہماری شہادت بھی معتبر نہیں ہے۔ پھر بھی ہم کو کہتے ہیں۔ (نقل کفر کفر نباشد حضرت والا کا یہ مخصوص طرز ادا و طنز ملیح ہے) اور یہ کہتے ہیں کہ جاؤ جاؤ تم جیسے نہ معلوم کتنے عالم آئے اور ہم لوگوں کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے مگر ہم لوگوں نے انکو تو مانا نہیں پھر تم کو کس طرح سے مان لیں۔ (ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں کہ قوم کی (یا) سرکشی جو اس زمانہ میں علماء سے ہے اسکی کس قدر صحیح تصویر ہے زبان قال سے اگر کوئی نہ بھی کہے مگر اسکی زبانِ حال تو یقیناً ناطق ہے ناقل عفی عنہٗ)۔

میں پوچھتا ہوں کہ آج جاہل کا کسی عالم کے ساتھ اس قسم کا تکبر کرنا کیا جائز ہے؟ اگر نہیں تو پھر کیوں کیا جاتا ہے؟ عالم کو تو اللہ تعالیٰ نے وہ مرتبہ دیا ہے کہ فقہ کا مسئلہ ہے کہ عالم جس شخص کی جانب سے سکوت اختیار کریگا تو اسکا سکوت ہی اسکی تعدیل کے حکم میں ہوگا۔ بحر الرائق میں ہے کہ

ویکتفی بالسکوت من اھل العلم والصلاح سکوتہ تزکیۃ للشاھد (بحر۔ ج، ص)	اہل علم اور اہل صلاح کی جانب سے سکوت پر اکتفا کیا جائے گا اور انکا سکوت ہی شاہد کے حق میں تزکیہ شمار ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل صلاح و اہل علم کی کسی کی جرح و تعدیل سے سکوت اختیار کرنا ہی اسکی تعدیل اور توثیق کیلئے کافی ہے اور یہ دلیل بنے گی اسکی عدالت کی۔ فقہاء تو یہ کہتے ہیں اور اب یہ خربطہ ہو گیا ہے کہ جہلاء اپنے کو اہل جرح و تعدیل سمجھتے ہیں اور اپنے ہی سکوت کو دلیل قرار دیتے ہیں اہل علم و صلاح کی تعدیل و توثیق کی۔ ع۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

اور سنیئے!

قال محمد کم من رجل اقبل شھادتہ ولا اقبل تعدیلہ یعنی ان الشھادۃ علی الظواھر ولا کذلک التعدیل فیشرط لجوازھا شروط۔	امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ بہت سے آدمی ہیں کہ میں انکی شہادت تو قبول کرونگا لیکن انکی تعدیل نہ قبول کرونگا۔ یعنی شہادت ظاہر کے اعتبار سے ہوتی ہے بخلاف تعدیل کے۔ پھر شہادت کے جواز کیلئے چند شرائط ہیں۔
الاول ان تکون الشھادۃ عند قاض عدل عالم۔ الثانی ان تعرفہ وتختبرہ بالشرکۃ او معاملتہ او سفر۔ الثالث تعرف انہ ملازم للجماعۃ۔ الرابع ان یکون معروفا بصحۃ المعاملۃ فی الدینار والدرھم۔ الخامس ان یکون مؤد بالامانۃ السادس ان یکون صدوق اللسان۔ السابع اجتناب الکبائر الثامن ان تعلم منہ اجتناب الاصرار علی الصغائر وما یخل بالمروۃ	اول یہ کہ شہادت قاضی عادل عالم کے پاس ہو دوسرے یہ کہ اسکو پہچانے اور اسکا امتحان کیے ہو شرکت سے یا معاملہ سے یا سفر میں (ساتھ رہنے سے) تیسرے یہ کہ جماعت کا پابند ہو چوتھے یہ کہ روپیہ پیسہ کے معاملہ میں صحت معاملہ کے ساتھ معروف ہو پانچویں یہ کہ امانت کا ادا کرنے والا ہو۔ چھٹے یہ کہ زبان کا سچا ہو۔ ساتویں یہ کہ گناہ کبیرہ سے اجتناب کرتا ہو۔ آٹھویں یہ کہ گناہ صغیرہ پر اس کا اصرار نہ دیکھا جاتا ہو۔ نیز جو چیزیں کہ مروت میں مخل ہیں وہ نہ کرتا ہو

(بحر الرائق ص ج ۷)

دیکھیے یہاں امام محمدؒ نے شہادت کے صحیح اور معتبر ہونے کیلئے شاہد میں کتنے امور کے پائے جانے کو ضروری قرار دیا ہے اس سے اندازہ کیجئے کہ تعدیل جو کہ شہادت سے کہیں بڑھکر ہے اس میں کس قسم کے لوگوں کا قول معتبر ہوگا۔

نیز اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہد کی تحقیق حال کے طریقوں میں سے ایک طریقہ رفاقت سفر اور شرکت معاملہ بھی ہے اور پہلے گذر چکا ہے کہ جن لوگوں سے کسی کے حالات دریافت کئے جائیں گے ان میں سب سے مقدم اسکے پڑوسی ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ فقہائے نے یہ ساری باتیں جو بیان کی ہیں تو وہ سب کی سب احادیث اور آثار صحابہؓ سے ماخوذ ہیں۔ چنانچہ انھیں مذکورہ امور میں سے بعض کا ذکر حضرت عمرؓ کے اس واقعہ میں بھی ہے جسے امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں بیان فرمایا ہے۔ وھو ھذا

شھد عند عمرؓ شاھد فقال ائتنی بمن یعرفك فاتاہ برجل فاثنیٰ علیہ خیراً فقال لہ عمر انت جارہ الادنی الذی یعرف مدخلہ ومخرجہ قال لا فقال کنت رفیقہ فی السفر الذی یستدل بہ علی مکارم الاخلاق فقال لا قال فعاملتہ بالدینار والدرھم الذی یستبین بہ ورع الرجل قال لا قال اظنك رأیتہ قائما فی المسجد یھمھم بالقرآن یخفض راسہ طوراً ویرفعہ اخریٰ قال نعم فقال اذھب فلست تعرفہ وقال للرجل اذھب	حضرت عمرؓ کے پاس ایک شخص نے گواہی دی آپ نے فرمایا کہ جاؤ اپنے کسی پہچاننے والے کو لاؤ چنانچہ وہ ایک شخص کو لایا جس نے اسکی توثیق کی یہ شخص اچھا ہے حضرت عمرؓ نے اس مزکی سے پوچھا کہ تم کیا اسکے پڑوسی ہو جسکی وجہ سے اسکی نقل وحرکت سے واقف ہو اس نے کہا نہیں فرمایا اچھا تو پھر کیا کسی سفر میں تمھارا اسکا ساتھ رہا ہے کیونکہ اسکے ذریعہ سے بھی کسی کے اخلاق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اس نے کہا نہیں یہ بھی نہیں ہوا آپ نے فرمایا اچھا تو کیا اسکے ساتھ کبھی تمھارا روپے پیسے کا کوئی معاملہ ہوا ہے کہ اسکے ذریعہ سے بھی انسان کا تقویٰ معلوم کیا جاسکتا ہے اس نے کہا نہیں اسکا بھی اتفاق نہیں پڑا آپ نے فرمایا کہ اچھا تو پھر میرا یہ خیال ہے کہ تم نے اسکو کبھی مسجد میں کھڑے ہوکر قرآن شریف گنگناتے سنا ہوگا اس طور پر کہ کبھی سر کو نیچے جھکاتا ہوگا اور کبھی اوپر اٹھاتا ہوگا اس نے کہا جی ہاں یہی بات ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ تم اسکے پہچاننے والے نہیں ہو اور اس شخص سے کہا کہ

فائتنی بمن یعرفک (احیاء العلوم ج۲) جاؤ کسی دوسرے شخص کو لاؤ جو تم کو پہچانتا ہو دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ کسی شخص کی صحیح جانچ کیلئے اسکے ساتھ سفر یا معاملات وغیرہ کا تجربہ بھی ضروری ہے باقی صرف کسی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لینا تو اس زمانہ میں بھی توثیق و تعدیل کیلئے کافی نہ تھا تو پھر اس زمانہ میں جبکہ ظاہر و باطن کا اختلاف عام ہو گیا ہے محض اسکی وجہ سے کسی پر اعتماد کیسے کیا جا سکتا ہے آج اسی کے سبب سے بہت لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے۔

الغرض جس ضیق کے رفع کا میں نے شروع میں بیان کیا تھا اسکا خلاصہ عرض کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ:۔

"جن کی صداقت اور دوستی معلوم ہے ان سے صداقت کا معاملہ کرنا شرعاً ضروری ہے اور جنکی عداوت معلوم ہے دوستی کا برتاؤ ان کے ساتھ نہ کیا جائے گا مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی البتہ جائز ہے اور جن کا حال دوستی و دشمنی کا معلوم نہیں ہے تو خصوصی برتاؤ اور انکا اعتبار کر لینے کا انسان مکلف نہیں ہے یہی شرعی معیار ہے۔"

بزرگان دین کا تعامل بھی اسی پر معلوم ہوتا ہے چنانچہ شیخ مصلح الدین شیرازیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

وامش مدہ آنکہ بے نماز است | گرچہ دہنش ز فاقہ باز است
او فرض خدا نمی گزارد | از قرض تو نیز غم ندارد

یعنی اس شخص کو قرض مت دو جو کہ بے نمازی ہے اگرچہ اسکا منہ فاقہ کی وجہ سے کھلا ہوا ہو کیونکہ وہ جب خدا تعالیٰ کا فرض نہیں ادا کرتا تو اسکو تمہارے قرض کی کب فکر ہوگی۔ اسی طرح سے یہی حضرت شیرازیؒ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ:۔

؎ بطور مزاح کے فرمایا کہ فرض میں تو ایک ہی نقطہ ہے جب اسکو نہ ادا کیا تو قرض جسمیں دو نقطے ہیں اسکو بھلا کیا ادا کریگا۔ نیز شیخ کے اس شعر سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس میں بے رحمی کی تعلیم ہے کہ ایک شخص تو فاقہ سے مر رہا ہے اور شیخ اسکو قرض کی امداد بھی منع فرما رہے ہیں جواب یہ ہے کہ حضرت شیرازیؒ قرض دینے سے منع فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ یوں کہیگا کہ مجھے کچھ روپیہ دیدو میں فلاں وقت دیدونگا جو ایک وعدہ ہے تو جو شخص خدا تعالیٰ کا حق ادا نہ کرے وہ تمہارے وعدہ کا بھی پاس و لحاظ نہ کریگا لہٰذا اسکے وعدہ کا اعتبار کر کے اسکو قرض کے نام سے کچھ مت دینا باقی یوں بطور امداد و صدقہ کے بھی کچھ مت دو اسکی تو شیخ ممانعت فرما نہیں رہے ہیں صدقہ کے طور پر جتنا چاہیئے دیجئے مگر واپسی کی امید اور وعدہ پر اعتماد کر کے ایسے شخص کو دینا بلاشبہ حماقت ہے اور حزم کے خلاف ہے۔ ۱۲

ایک مرتبہ چند بزرگ سیر و سیاحت میں باہم متفق تھے اور رنج و راحت میں باہم ایک دوسرے کے شریک تھے مجھکو وہ لوگ پسند آئے میں نے چاہا کہ انکے ساتھ رہوں انھوں نے اپنی رفاقت میں مجھکو قبول نہ کیا اور اپنے ساتھ لینے سے صاف انکار کر دیا مجھے اسکا رنج ہوا میں نے ان سے اظہار کیا تو فرمایا کہ آپ رنج نہ کیجئے اور برا نہ مانئے ہم نے جو آپ کو شریک نہیں کیا اسکی ایک معقول وجہ ہے وہ یہ کہ ہم لوگ صاف دل کے ہیں چند روز ہوئے ایک شخص ہمارے ساتھ شریک سفر ہو گیا تھا اور ہم نے اسکو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک قلعہ کے نیچے ہم لوگ ٹھہرے ہوئے تھے ہمارے ایک ساتھی کا لوٹا اٹھایا ساتھی یہ سمجھے کہ استنجا وغیرہ کرنے جا رہا ہے اور وہ لے جا رہا تھا۔ پھر یہ کیا کہ قلعہ میں گھس کر ایک ڈبہ چرایا اور اور چلتا بنا۔ ہم لوگ ابھی سو ہی رہے تھے کہ اہل قلعہ آئے اور ہم لوگوں کو پکڑ کر قلعہ کے اندر لے گئے اور خوب مارا اسوقت یہ سمجھ میں آیا کہ اتنی سادہ لوحی ٹھیک نہیں ہے ہر شخص کا اعتبار کرنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ اسکا بھی اصول ہے اس لئے آپ کو شریک سفر نہیں کرتے۔

یہ قصہ گلستاں میں موجود ہے اس سے معلوم ہوا کہ سلف کے یہاں دوستی کا اور لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے کا بھی ایک اصول تھا اور یہ بے اصولی جو آج کل رائج ہو گئی ہے پہلے نہیں تھی۔

اسی لئے میں سب لوگوں کے لئے عموماً اور نیک لوگوں کیلئے خصوصاً اس زمانہ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ جلدی کسی کا اعتبار نہ کریں تاکہ اپنے کو ضرر سے محفوظ رکھ سکیں یہی چیز میں آج لوگوں کو سکھلانا چاہتا ہوں۔ اور اسی کا نام تیقظ۔ بیداری مغزی اور حزم ہے اور اسی کے فقدان کیوجہ سے آج مسلمان دین و دنیا کے خسران میں مبتلا ہیں کیونکہ یہ نیک لوگ دوسروں کی چکنی چپڑی باتوں میں بہت جلد آجاتے ہیں اور بعض مرتبہ اسکی وجہ سے انکو بڑے بڑے نقصانات برداشت کرنے پڑ جاتے ہیں اور اسکا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان نیک لوگوں کے پاس جہاں کوئی گیا بس اسکو یہ اپنا سمجھ لیتے ہیں اور پھر سب گفتنی ناگفتنی اس کے سامنے کہہ گذرتے ہیں حالانکہ ان آنے والوں میں سے بہت سے مخلص بھی نہیں ہوتے جو اس طرح کی باتوں کو گھر گھر پہونچا دیتے ہیں جس کے سبب طرح طرح کے فسادات رونما

ہوتے ہیں۔

لہٰذا میں آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ ہر شخص جو آپ کے پاس آجائے اسکو اپنا نہ سمجھ لیجئے اور اپنا بھید اور اپنی راز کی باتیں ہر ایک سے نہ کہدیا کیجئے اگر آپ اس میں کامیاب ہو جائیں گے تو یہ دنیا کی زندگی بھی راحت سے گذرے گی۔ آج دوست دشمن کی تمیز ہی تو اٹھ گئی ہے اسی لئے یہ تمام فتنے ہیں اسی لئے مولانا روم بھی فرماتے ہیں کہ ؎

دشمن ارچہ دوستانہ گویدت دام داں گرچہ ز دانہ گویدت

یعنی دشمن کتنے ہی دوستی کے انداز میں کیوں نہ کہے اسکی باتوں کو دام اور جال ہی سمجھو اگرچہ وہ تم کو دانہ کی خبر دے۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ بزرگوں نے کہا ہے کہ دشمنِ دانا نادان دوست سے بہتر ہے تو اس قسم کے لوگ بھی نادان دوست ہی ہیں اسی لئے میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں دوست اور دشمن کی تمیز نہایت ضروری ہے لیکن ہمارے پاس نہ آج دوستی کا کوئی معیار اور اصول رہ گیا ہے نہ دشمنی کا! عجب اندھا دھند اور خربطہ ہو گیا ہے حالانکہ ہمارے پاس اسکے اصول تھے مگر آج ہم ایسے ہو گئے ہیں گویا ہمارے پاس کچھ ہے ہی نہیں بات یہ ہے کہ جب ہم نے شریعت کو چھوڑا تو سب کچھ کھو دیا۔ معمولی معمولی چیزوں کی فہم اور عقل بھی ہم سے رخصت ہو گئی جس کا جی چاہے ہم کو دھوکا دیدے اور جو چاہے ہمارا نقصان کر دے آج ہم اپنے دوست اور دشمن تک کو پہچاننے سے قاصر ہیں۔

لہٰذا جب تک کہ ہم پھر شرعی اصول کی جانب رجوع نہیں کرینگے اور اس بارہ میں بھی شریعت سے تمسک کر کے جب تک کچھ نور بصیرت نہ پیدا کرینگے اسی طرح سے برابر نقصان ہی اٹھاتے رہیں گے اور دینی فلاح تو بڑی چیز ہے دنیا کی بھی فلاح سے محروم ہی رہیں گے

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک طالب کا تاثر بھی نقل کر دوں جنکو اسی مضمون کا کچھ حصہ لکھا گیا تھا اسکے جواب میں انھوں نے لکھا کہ:۔

"حکیمانہ معیار شناخت" (مراد یہی مضمون ہے) کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں اور الفاظ کہاں سے لاؤں حضرت والا نے پہاڑ جیسے بوجھ سے سبکدوش فرمادیا ہلکا پھلکا ہو گیا۔ دل خالی ہو گیا۔ غبار چھٹ گئے، امن اور چین سے ہوں نہ میں کسی کا نہ کوئی میرا ماضی پر غور کرتا ہوں اور حضرت والا کے معیار پر جب سے رکھتا ہوں

تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں مل رہا ہے جس کو (حقیقی معنوں میں) دوست کہہ سکوں۔ اور غضب تو یہ ہے کہ اس معیار تمیز پر اپنے حقیقی بھائی بھی خیرخواہ ثابت نہیں ہوئے۔ اس المناک حقیقت کا اظہار کرتا ہوں کہ اس حدیث گرامی کے پیش نظر میری ساری زندگی دوستوں سے بالکل خالی گذری ہے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

تعجب ہوا کہ یہ حدیث پہلے کیوں سننے میں نہیں آئی کسی اور مخلص ہمدرد نے اسے کیوں عام سطح پر پیش نہیں کیا، یہ معیار تو ایسا معیار ہے کہ اگر اہل اسلام اسے اپنا لیں تو ہر مقام پر دوست دشمن میں تمیز کر پائیں اور ملت کی داخلی و خارجی اور بین الاقوامی زندگی میں مشکلات کی در آمد بند ہو جائے۔

حضرتؒ کے الفاظ لفظ بہ لفظ درست ثابت ہوئے کہ اسے اپنائیے اور فائدہ اٹھائیے۔ واللہ العظیم مجھے تو اسی دن سے فائدہ شروع ہو گیا ہے۔ کھوٹا کھرا نظر آرہا ہے۔ دوست اور دشمن معلوم ہوتے جارہے ہیں۔ البتہ یہ بات آج ہی معلوم ہوئی کہ میری زندگی میں کسی مخلص اور حقیقی ندیم دوست کا کوئی وجود نہیں انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ بلکہ والدین نے بھی (جو سچ پوچھئے تو) حقیقی خیرخواہی نہیں فرمائی۔

حضرتؒ نے کامل خلوص اور ہمدردی سے عہد حاضر کے تقاضوں کا سیر حاصل جائزہ لے لیا ہے اور انکو ایسا چھانا پھٹکا ہے کہ ان کے اجزاء لا یتجزیٰ بھی الگ الگ ہو کر سامنے آگئے ہیں مثلاً یہی مسئلہ کہ زیر بیان ہے کبھی کسی سے سننے میں نہیں آیا۔"

بس اب اسی پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرما دیں۔ و اخر دعونا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

مضمون نمیمہ

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

قاموس کی شرح تاج العروس جو لغت کی نہایت ہی معروف و مشہور کتاب ہے اس میں نمیمہ کے یہ معنی بیان کئے ہیں

نم الحدیث نیماً ونمیمۃ بالوجہین اذا نقلہ وکذا نم بہ ونم علیہ ھو نقل الحدیث من قوم الیٰ قوم علیٰ جھۃ الافساد والشر

یعنی عربی زبان میں نمیمہ اسکو کہتے ہیں جو ایک جماعت کی بات دوسری جماعت سے نقل کیجائے۔ اور مقصد اس سے افساد اور شر ہو۔

قال ابوبکر عن ابی العباس النمام معناہ فی کلام العرب الذی لایمسک الاحادیث ولم یحفظھا۔ (تاج العروس ص جلد ۹)

ابوبکر نے ابوالعباس سے نقل کیا ہے کہ نمام کلام عرب میں ایسے شخص کو کہتے ہیں جو باتوں کو دل میں روک نہ سکے اور انکی حفاظت پر قادر نہ ہو۔

نمیمہ کی یہ تعریف جو صاحب تاج العروس نے کی ہے بہت عمدہ اور نہایت جامع ہے شرع میں بھی یہی معنی معتبر ہیں چنانچہ صاحب فتح الباری فرماتے ہیں۔

ولا یعد نمیمۃ مذمومۃ الا ان قصد بذالک الافساد المطلق۔

یعنی (کسی کی کوئی بات کسی کو پہونچانا) نمیمہ مذمومہ نہیں شمار ہوگا مگر اسوقت جبکہ اس سے اس کا مقصد فساد پھیلانا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ نمیمہ مذمومہ اسوقت شمار کیا جائے گا جب کہ پہونچانے والے کی نیت محض افساد ہو یا افساد کا ضرر اس سے پہونچتا ہو۔

اب قرآن وحدیث میں اسکی مذمت جو وارد ہے ہم یہاں وہ آیات واحادیث نقل کرتے ہیں۔ بڑا ہی اہم واقعہ اس آیت میں مذکور ہے جو ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے جو حرم

اور احتیاط کی بے نظیر مثال ہے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنْ جَاءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًا بِجَھَالَۃٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ ٥ وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ لَوْ یُطِیْعُکُمْ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَکَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ اُولٰئِکَ ھُمُ الرَّاشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَنِعْمَۃً وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ	اے ایمان والو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر نہ پہونچا دو پھر اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔ اور جان رکھو تم میں رسول اللہ ہیں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر تمہارا اس میں کہنا مانا کریں تو تم کو بڑی مضرت پہونچے لیکن اللہ تعالےٰ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اسکو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا اور کفر اور فسق اور عصیان سے تم کو نفرت دیدی ایسے لوگ خدائے تعالیٰ کے فضل و انعام سے راہ راست پر ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس آیت میں مومنین کو مخاطب فرما کر یہ امر فرمایا گیا ہے کہ جب کوئی فاسق کوئی خبر لادے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہے جس کے سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اور جب تک اس قصہ کو جسکی طرف آیت اشارہ کر رہی ہے معلوم نہ کیا جائیگا آیت کی تفسیر اور توضیح نہیں ہوسکے گی اسلئے ہم تفسیر مظہری سے اس آیت کا شان نزول اور واقعہ نقل کرتے ہیں کہ مقام کی خوب وضاحت ہو جائے وھو ہذا۔

ذکر البغوی ان الآیۃ نزلت فی ولید بن عقبۃ بن ابی معیط بعثہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الی بنی المصطلق مصدقا وکان بینہ و بینھم عداوۃ فی الجاھلیۃ فلما سمعہ القوم تلقوہ تعظیما لامر رسول اللّٰہ	بغوی کہتے ہیں کہ یہ آیت ولید بن عقبہ کے بارے میں نازل ہوئی جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی مصطلق کی جانب زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے بھیجا تھا اور ان میں اور ان لوگوں میں زمانۂ جاہلیت میں عداوت تھی قوم نے جب نکا آنا سنا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کی تعظیم

صلی اللہ علیہ وسلم فحدثہ الشیطان انہم یریدون قتلہ فهابهم فرجع من الطریق الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقال ان بنی المصطلق قد منعوا صدقاتہم و ارادوا قتلی وفی الروح بروایۃ اخر قد ترکوا الصلوٰۃ وارتدوا وکفروا باللہ تعالیٰ (انتہیٰ)

کرتے ہوئے استقبال کے لئے نکلے ادھر انکو شیطان نے یہ سمجھا دیا یہ لوگ تمھیں قتل کرنے کیلئے آرہے ہیں انکو اپنی جان کا اندیشہ ہوا اور راستہ ہی سے پھر حضور کیخدمت میں واپس ہوگئے اور آکر عرض کیا کہ بنی مصطلق نے زکواۃ روک لی اور مجھے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ اور روح المعانی میں ایک دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ انھوں نے نماز چھوڑ دی اور مرتد ہوگئے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا۔ (انتہیٰ)

فغضب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وهمّ ان یغزوهم فبلغ القوم رجوعہ فاتوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قالوا یا رسول اللہ لما سمعنا برسولک خرجنا نتلقاہ ونکرمہ ونؤدی الیہ ما قبلناہ من حق اللہ عزوجل فبدأ لہ الرجوع فخشینا انما ردہ من الطریق کتاب جاءمنک بغضب غضبتہ علینا وانا نعوذ باللہ من غضبہ وغضب رسولہ۔

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت غصہ آیا آپ نے ارادہ فرمایا کہ ان سے غزوہ کریں۔ ادھر قوم کو جب انکی واپسی کی اطلاع ملی تو حضور کیخدمت میں بھاگے ہوئے آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم نے جب آپکے فرستادہ کے متعلق سنا کہ وہ تشریف لا رہے ہیں تو ہم انکے استقبال اور اکرام کیلئے نکلے اور یہ ارادہ کیا کہ ہم نے جو اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنا قبول کیا ہے وہ انکو دیدیں کہ اس اثنا میں انھیں معلوم نہیں کیا خیال گزرا کہ وہ راستہ ہی سے واپس چلے آئے ہمیں اندیشہ ہوا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی کی جانب سے ہمارے اوپر خفگی کا کوئی خط آگیا ہے جسکی وجہ سے وہ واپس چلے گئے اور اللہ تعالیٰ کے غضب سے اور اللہ کے رسول کے غضب سے ہم پناہ مانگتے ہیں۔

قال البغوی فاتہمہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وبعث خالد بن الولید خفیۃ فی عسکر وامرہ ان یخفی علیہم وقال لہ انظر فان رأیت منہم ما یدل علیٰ ایمانہم فخذ منہم زکواۃ

بغوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں متہم سمجھا چنانچہ حضرت خالدؓ کو ایک لشکر کے ہمراہ پوشیدہ طور سے بھیجا اور ان سے فرمایا کہ ان سے اپنے آپ کو پوشیدہ ہی رکھنا اور انکی حرکات وسکنات کو دیکھتے رہنا اگر ایمان کے آثار معلوم ہوں تو اپنے کو ظاہر کر دینا اور انسے انکے اموال کی زکواۃ طلب کرنا اور اگر انکے خلاف

اموالھم وان لم ترذلك فاستعمل فیھم ما یستعمل فی الکفار ففعل ذلك خالد و اتاھم فسمع منھم اذان صلوٰۃ المغرب والعشاء واخذ صدقاتھم ولم یر فیھم الا الطاعۃ والخیر فانصرف الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واخبرہ الخبر فانزل اللہ تعالیٰ یا ایھا الذین امنوا ان جاءکم فاسق یعنی الولید بن عقبہ بنباء ای بخبر ارتداد القوم وتنکیر الفاسق والنباء لشیوع الحکم کانہ قال ای فاسق جاءکم بای نباء

دیکھنا تو جس چیز کا استعمال کفار کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے تم ان لوگوں میں بھی روا رکھنا (مراد یہ ہے کہ پھر ان سے جہاد کرنا) حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا شام کے وقت وہاں پہونچے سنا کہ اذان مغرب ہو رہی پھر عشاء کے وقت بھی اذان کی آواز آئی غرض ان لوگوں میں سوائے طاعت اور خیر کے کچھ نہیں پایا اس لئے ان سے زکوٰۃ وصول کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوٹ آئے اور صورتِ حال بیان کی اسپر یہ آیت نازل ہوئی۔ اے ایمان والو اگر تمھارے پاس کوئی فاسق یعنی ولید بن عقبہ خبر لائے یعنی ارتداد قوم کی خبر۔ اور فاسق اور نبار کا نکرہ لانا حکم کے شیوع کے لئے ہے گویا فرمایا کہ تمھارے پاس جو بھی فاسق کوئی بھی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو)۔

صاحب روح المعانی نے بھی اس روایت کو جسمیں کچھ زیادتی بھی ہے نقل فرمایا ہے جو نہایت ضروری اور مفید ہے اس لئے بعینہ اس روایت کو ہم بھی نقل کرتے ہیں۔ وہو ہذا۔

اخرج عبد بن حمید عن الحسنؓ قال اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم آت فقال یا نبی اللہ ان بنی فلان حیا من احیاء العرب وکان فی نفسہ علیھم شئ وکان حدیث عھد بالاسلام قد ترکوا الصلوٰۃ وارتدوا وکفروا باللہ تعالیٰ فلم یعجل رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ودعا خالد بن الولیدؓ

عبد ابن حمید نے حضرت حسنؓ سے تخریج کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی آنے والا آیا اور کہا کہ اے اللہ کے نبی فلاں قبیلہ کے لوگوں نے نماز پڑھنا چھوڑ دیا ہے اور مرتد ہو گئے ہیں اور کفر اختیار کر لیا ہے واقعہ یہ تھا کہ کہنے والے نو مسلم تھے اور اپنے دل میں اس قبیلہ سے کچھ رنجش رکھتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خبر کو سنکر تعجیل نہیں فرمائی بلکہ حضرت خالدؓ بن ولید کو بلایا اور انکو اس قوم کیطرف بھیجا اور یہ فرمایا کہ ان کو نماز کے وقت تاڑنا اگر واقعی ان لوگوں نے نماز کو ترک کر دیا ہے

فبعثه اليهم ثم قال ارمقهم	تو جو چاہنا کرنا ورنہ فیصلے میں جلدی نہ کرنا۔ حضرت
عند الصلوات فان كان	خالد ان لوگوں کے پاس غروب شمس کے وقت
القوم قد تركوا الصلوٰة	پہونچے اور چھپ گئے تاکہ نماز کی آواز سنیں
فشانك بهم و الا فلا تجعل	تو ان کو دیکھا کہ غروب کے بعد موذن کھڑا
عليهم فدنا منهم عند	ہوا اور اس نے اذان دی پھر نماز کھڑی ہوئی
غروب الشمس فكمن حتى	اور سب نے مغرب کی نماز پڑھی۔ حضرت
يسمع الصلوٰة فرمقهم فاذا	خالدؓ نے کہا میں تو ان کو نماز پڑھتا ہوا دیکھتا
هو بالموذن قد قام عند	ہوں شاید کہ ان لوگوں نے مغرب کے علاوہ
غروب الشمس فاذن ثم اقام	کوئی اور نماز پڑھنی ترک کر دی ہو۔ یہ خیال
الصلوٰة المغرب . فقال خالد	کر کے پھر چھپ رہے یہاں تک کہ جب رات
ما اراهم الا يصلون فلعلهم	طاری ہو گئی اور شفق غروب ہو گئی تو انکے
تركوا الصلوٰة غير هذه	موذن نے پھر اذان دی اور سب نے عشاء
ثم كمن حتى اذا جنح الليل	کی نماز پڑھی۔ حضرت خالدؓ کہتے ہیں کہ یہ
وغاب الشفق اذن موذن	لوگ شاید اور کوئی دوسری نماز چھوڑتے
فصلوا فقال لعلهم تركوا	ہوں گے اس لئے پھر چھپ رہے یہاں تک
صلوٰة اخرى فكمن اذا	کہ جب آدھی رات ہوئی تو حضرت خالدؓ اور
كان فى جوف الليل تقدم	آگے بڑھے یہاں تک گھوڑوں نے ان کے
حتى اطل الخيل بدورهم	گھروں کو گھیر لیا اس وقت دیکھا کہ قوم قرآن
فاذا القوم تعلموا اشيئا من	شریف سیکھ رہی ہے اور لوگ اس کو تہجد
القرآن فهم يتهجدون به	کی نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ پھر انکے پاس
من الليل و يقرؤنه ثم اتاهم	صبح کے وقت آئے دیکھا کہ جوں ہی صبح
عند الصبح فاذا الموذن	صادق ہوئی موذن نے فجر کی اذان دی اور
حين طلع الفجر قد اذن	اقامت ہوئی اور سب لوگوں نے جماعت
واقام فقاموا و صلوا فلما	سے نماز پڑھی جب نماز پڑھ کر لوٹے
انصرفوا واضاء لهم النهار	اور روشنی ہو چکی تو دیکھا کہ انکے گھروں

اذا ہم بنواصی الخیل فی دیارہم فقالوا ماھذا قالوا خالد بن ولید قالوا یا خالد ما شانک قال انتم واللہ شانی اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقیل لہ انکم ترکتم الصلواۃ وکفرتم باللہ تعالیٰ فجثوا یبکون فقالوا نعوذ باللہ تعالیٰ ان نکفر ابدا فصرف الخیل وردھا عنہم حتی اتی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وانزل اللہ تعالیٰ یا ایہا الذین امنوا الآیۃ ۔	میں گھوڑوں کی پیشانیاں چمک رہی ہیں آپس میں کہنے لگے یہ کیا ہے؟ ان لوگوں نے کہا یہ خالدؓ بن ولید ہیں قوم نے حضرت خالد سے پوچھا کہیے کیا معاملہ ہے؟ حضرت خالدؓ نے کہا خدا کی قسم اسوقت میرا معاملہ تمھیں لوگ ہو بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہونچی ہے کہ تم لوگوں نے نماز ترک کردی ہے اور کافر ہوگئے ہو، یہ سنکر سب آگر گر گئے اور رونے لگے اور کہا کہ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں ہم اس سے کہ کبھی بھی کافر ہوں یہ سنکر حضرت خالدؓ نے گھوڑا پھیر لیا اور فوج کو انکے پاس سے لوٹا لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیخدمت میں واپس آگئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (روح المعانی ص۱۳۲ ج۲۶)

اس واقعہ میں ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے ایک بات اپنے گمان سے بنی مصطلق کے بارے میں آکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہدی تھی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم انکی خبر کی تصدیق فرمالیتے اور تحقیق نہ فرماتے اور جہاد کیلئے لشکر روانہ فرمادیتے تو بتلائیے کتنا عظیم ضرر ہوتا اور کس قدر فساد ہوتا۔ مسلمانوں کی ایک جماعت تہس نہس ہوجاتی کتنے مسلمان قتل کردیئے جاتے اور یہ محض ایک جھوٹی خبر کے پہونچانے کی بنا پر ہوتا اور اسی کا نام نمیمہ ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ اسی بنا پر اللہ تعالےٰ نے آیت نازل فرمادی کہ بلا تحقیق کے ایسی خبروں پر عمل نہ کیا جائے۔

حضرت مولانا تھانویؒ نے اس آیت کی تفسیر کے تحت یہ سرخی ہی قائم فرمائی ہے کہ "نہی از عمل بالنمیمہ بلا تحقیق" اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں نمیمہ کا ذکر ہے اور نمیمہ پر بلا تحقیق کے عمل کرنے کی ممانعت ہے۔ حضرت مولانا قدس سرہٗ اگر یہاں یہ سرخی قائم نہ فرماتے تو ہمارے ذہن میں یہ بات بھی نہ آتی کہ اس آیت میں نمیمہ کا ذکر ہے کیونکہ ہم اس آیت سے بیش از بیش یہ سمجھتے کہ کوئی فاسق خبر لادے تو اسکی تحقیق ضروری ہے بغیر تحقیق

عمل نہیں کرنا چاہیئے مگر یہ تو کبھی بھی نہیں سمجھتے کہ فاسق کا ایسی خبر لانا جو خلاف واقعہ ہونے کے ساتھ ساتھ موجب فساد عظیم بھی ہے یہی قبیح ہے۔

اب ہم فاسق کی خبر کے قبول اور رد کے متعلق تحقیق لکھتے ہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ

ومن هنا امتنع طوائف من العلماء من قبول رواية مجهول الحال لاحتمال فسقه في نفس الامر وقبلها آخرون لانا انما امرنا بالتثبت عند خبر الفاسق وهذا ليس بمحقق الفسق لانه مجهول الحال۔ (تفسیر ابن کثیر ص۲۰۹ ج۴)

اور یہیں سے علماء کا ایک گروہ مجہول الحال کی روایت کے قبول کرنے سے رک گیا ہے اسلئے کہ احتمال ہے کہ وہ فی الواقع فاسق ہو اور دوسرے گروہ نے اسکی روایت کو قبول کیا ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم کو تثبت (تحقیق و توقف) کا جو حکم ہے تو اس فاسق کی خبر میں ہے جس کا فسق متحقق ہو اور یہ شخص چونکہ مجہول الحال ہے اسلئے اسکا فسق متحقق نہیں اسکی روایت قبول کیجائے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ فاسق اور اسی طرح مجہول الحال کی خبر کے قبول کرنے میں علماء کے دو قول ہیں ایک فریق یہ کہتا ہے کہ تحقیق سے پہلے قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا منع ہے۔ امام غزالیؒ مطلقاً تصدیق کو منع فرماتے ہیں اور اسکو مردود الشہادت کہتے ہیں اور یہ پہلے فریق سے ہیں جو مطلقاً قبول کو منع کرتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خبر کی طرف التفات نہ کرے یہ بھی جائز ہے اور اگر عمل کرنا ہو تو تحقیق ضروری ہے یہ اس آیت کے بارے میں علماء کے اقوال ہیں۔ احوط یہی ہے کہ معمولی خبروں کی طرف التفات نہ کرے جیسا کہ صاحب روح المعانی کے اشارہ سے معلوم ہوتا ہے۔ وہو ہذہ۔

قال الراغب لا يقال للخبر في الاصل نبأ حتى يكون ذا فائدة عظيمة يحصل به علم او غلبة ظن وقوله تعالى ان جاءكم فاسق بنبإ اذا كان الخبر شيئاً عظيماً له

امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ در اصل ہر خبر کو نبار نہیں کہتے۔ اس وقت نبار اس پر بولا جاتا ہے جب وہ کسی عظیم فائدہ پر مشتمل ہو اور اس سے یقین یا کم از کم غلبۂ ظن حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ان جاءکم فاسق بنباٍ اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ جب خبر اہم ہو اور

قد رفحقه ان يتوقف فيه وان علم او غلب صحته على الظن حتى يعاد النظر فيه ويتبين فضل تبين (روح المعانی)

اسکی عظمت ہو تو مناسب ہے کہ اس میں توقف کیا جائے اگرچہ یقین ہو جائے یا اسکی صحت کا غالب گمان ہو جائے تا اس میں نظر ثانی کیجا سکے اور اور خوب اچھی طرح تحقیق ہو جائے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی ایسی اہم خبر ہو کہ اس پر بلا تحقیق عمل کر لینے میں ضرر یا کوئی مفسدہ ہو تو ایسی خبر کی تحقیق اور اسمیں خوب غور و فکر ضروری ہے اور اگر خبر اس درجہ کی نہ ہو یعنی اسکی تحقیق نہ کرنے سے کوئی ضرر یا مفسدہ نہ پیدا ہوتا ہو اور نہ اسپر کوئی فائدہ ہی مرتب ہوتا ہو تو اسکی طرف اصلا التفات نہ کرنا ہی اسلم ہے ۔

جس طرح فاسق کی خبر میں قبل از عمل تحقیق ضروری ہے ویسے ہی جب کوئی عادل خبر دے اور قرائن کذب کے موجود ہوں تو بھی تحقیق ضروری ہے جیسا کہ قاضی ثناء اللہ صاحب نے لکھا ہے ۔

قلت والوليد بن عقبة كان صاحبا لرسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يكن فسقه ظاهرا قبل هذا الكذب المبنى على فساد ظنه واتهامه من كان له اعداء في الجاهلية فلعل المراد بالفاسق ههنا من لم يظهر صدقه وعدالته فيدخل فيه مستور الحال ايضاً او المراد بالفاسق من كان مخبراً الشئ يدل القرينة على كذبه وان كان المخبر ظاهر العدالة فان ارتداد بنى المصطلق

میں کہتا ہوں کہ ولید بن عقبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے اور انکا فسق اس کذب سے پہلے ظاہر نہ ہوا تھا جن کا منشا ان کا سوء ظن اور جو لوگ جاہلیت میں انکے دشمن رہ چکے تھے انھیں متہم قرار دینا تھا لہٰذا ہو سکتا ہے کہ فاسق سے مراد یہاں پر وہ شخص ہو جس کا صدق اور عدالت ظاہر نہ ہوئی ہو۔ لہٰذا اس حکم میں مستور الحال بھی داخل ہو جائے گا۔ یا فاسق سے مراد وہ شخص ہو جو ایسی چیز کی خبر دے رہا ہو کہ قرینہ اس کے کذب پر دال ہو اگرچہ مخبر ظاہر العدالۃ ہو (یہاں پر قرینہ یہ ہے کہ قوم بنی مصطلق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خوشی خوشی ایمان لانے اور احکام اسلام قبول کرنے کے

بعد ایمانہم عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طوعاً وقبولہم احکامہ ابعد احتمالاً من کذب الولید عمداً او زعماً فاسداً (تفسیر مظہری ص۴۲ ج۹)

بعد (یک لخت) مرتد قرار دینا اس سے کہیں زیادہ بعید ہے کہ ولید کو کاذب عمد قرار دیا جائے یا اپنے گمان فاسد کی بنا پر کاذب سمجھا جائے۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں صرف قرائن خارجیہ پر عمل نہیں کیا گیا واقعہ کی تحقیق کے لئے واحد عدل یا عدول بھیجے گئے انھوں نے پہلی خبر کو غلط قرار دیا انکے کہنے پر عمل ہوا اگر یہ واقعہ کو صحیح بتلاتے تو اس پر عمل ہوتا۔ اور آیت تو بعد میں نازل ہوئی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویب کے لئے اور یہ بتلایا گیا کہ آئندہ کوئی فاسق جس کے فسق پر دلائل قائم ہوں یا مستور الحال خبر دے تو اسکی تحقیق ضروری ہے اس کے بعد اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ آیت سے صحابی کا فاسق ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ رہا یہ کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا تو ان سے شیطان کے بہکانے سے غلطی ہوئی توبہ کے بعد وہ معاف ہوگئی صحابی سے بعید ہے کہ غلطی پر مصر رہیں اور اسکے خلاف پر عمل ہونے کے بعد بھی اپنی خبر کو سچی سمجھتے رہیں۔ اور ساری عمر میں ایک آدھ بار ایسا ہونا محل تعجب نہیں اور عدالت میں بھی یہ مخل نہیں ہے۔"

اب ایک اور بات لکھتا ہوں جسکی طرف صاحب روح المعانی کے کلام میں بھی اشارہ ہے وہ یہ کہ تبین کے معنی جس طرح تحقیق کرنے کے ہیں اسی طرح اسکے معنی تثبت یعنی جمے رہنے کے بھی آتے ہیں۔ چونکہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کی خلاف باتوں کو سنکر انسان طبعاً گھبرا کر تلملا جاتا ہے اور بے قابو ہو جاتا ہے اسی بنا پر بعض صحابہؓ بھی یہ خبر سنکر از خود رفتہ ہو گئے اور بنی مصطلق سے قتال کا ارادہ ظاہر کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قسم کی خبروں سے ایسے پریشان ہو کر بے قابو نہ ہو جایا کرو بلکہ ثابت قدم اور با حواس رہا کرو۔ روح المعانی کی عبارت یہ ہے۔

کانہ قیل یا ایہا الذین آمنوا تبینوا ان جاءکم فاسق ولا تکونوا امثال ہؤلاء من استفزہ النباء قبل تعرف صدقہ

گویا کہ کہا گیا کہ اے ایمان والو اگر کوئی فاسق تمہارے پاس آوے تو ثابت قدم رہو اور ان لوگوں جیسے نہ ہو جاؤ جنھیں خبر نے تحقق صدق سے پہلے ہی از خود رفتہ کردیا

ثم لا یقنعہ ذلک حتی یرید ان یستتبع رای من ھو المتبوع علی الاطلاق فیقع ھو وغیرہ فی العنت والارھاق۔

پھر ایسا شخص اس پر بس نہیں کرتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ جو متبوع علی الاطلاق ہے اسکی رائے کو بھی تابع بنائے پس وہ خود اور دوسرے لوگ سب مشقت اور دشواری میں پڑ جائیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سے تو شاذ ونادر اس قسم کی لغزشیں صادر ہوئیں مگر اب تو اس قسم کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں اور ہمیں ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جن سے ہمارا سکون کالعدم اور قلب پریشان ہو جاتا ہے مگر افسوس ہمارے علم پر کہ ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ زمانۂ رسالت آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں جب ایسے مواقع پیش آئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کا کیا حال ہوا اور کیا اثرات مرتب ہوئے ایسے حالات میں کونسی آیات نازل ہوئیں اور کیا تعلیمات دی گئیں اگر ہم لوگ قرآن و حدیث کی طرف توجہ کریں اور اسی طرح اسلاف کے حالات میں بھی غور کریں کہ انھوں نے اس قسم کے واقعات پیش آنے کے وقت کیا کیا تو ہمارا ہر واقعہ کے متعلق ہمیں شرعی لائحۂ عمل مل جائے اور اطمینان وسکون حاصل ہو جائے۔

ایک بات اور خوب سمجھ لیجئے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے (جن کا ہر ہر فرد ثقہ اور عادل ہے) جو اس قسم کی خطا اور لغزش کبھی صادر ہوئی تو اولاً تو وہ معصوم نہ تھے کہ خطا کا صدور ہی نہ ہو دوسرے یہ کہ وہ اس پر مستمر اور مصر نہ رہے بلکہ فوراً تائب ہو گئے اور اتنے سے عدالت ساقط نہیں ہوتی۔ نیز وہ خطائیں امت کے حق میں تو فضل ہی فضل ہیں اسلئے کہ وہ زمانہ وحی کا تھا کوئی بات سرزد ہوتی تو وحی آجاتی تھی جن سے ہمیشہ کیلئے حکم شرعی معلوم ہو جاتا تھا۔ اگر لغزشیں نہ ہوئی ہوتیں تو اب جب کہ عام طور پر لوگ ایسی غلطیوں میں مبتلا ہوتے ہیں انکا حکم معلوم کرنا چاہتے تو کیسے معلوم کرتے اور مرضیٔ الٰہی کے معلوم کرنے کا کیا ذریعہ ہوتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی لغزشوں اور خطاؤں میں امت کے لئے نہیں معلوم کتنے مصالح اور منافع ہیں لہٰذا ہمارا منہ نہیں ہے کہ ہم انھیں کچھ کہہ سکیں یا کوئی بات خلاف ادب زبان سے نکال سکیں۔

اس آیت کے علاوہ اور بھی قرآن پاک میں آیتیں ہیں جن میں نمیمہ کی مذمت و شناعت وارد ہے۔

قَالَ اللّٰہُ تعالیٰ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ و قال اللّٰہ تعالیٰ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ قيل انها كانت نمامة حمالة للحديث

یعنی فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ جو طعنہ دینے والا اور چغلیاں لگاتا پھرتا ہو، اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے حمالۃ الحطب ابولہب کی بیوی کے بارے میں ہے اسلئے کہ نمامہ تھی اور ادھر کی بات ادھر نقل کیا کرتی تھی۔

خصلت نمیمہ ایک نہایت مذموم اور مبغوض خصلت ہے قرآن و حدیث سے معلوم کرکے اکابر امت نے اس سے بہت تحذیر فرمائی ہے۔ قرآن شریف سے تو اسکی مذمت آپ سن چکے اب اسکے بعد چند احادیث بھی سنیے جن میں نمیمہ کی مذمت وارد ہے۔ وھو ھذا

قال صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا يدخل الجنة نمام و في حديث اخر لا يدخل الجنة قتات القتات هو نمام۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نمام جنت میں داخل نہیں ہوگا اور دوسری حدیث میں بجائے نمام کے قتات کا لفظ آیا ہے اور قتات نمام ہی کو کہتے ہیں۔

و قال ابوھریرۃؓ قال صلی اللّٰہ علیہ وسلم احبکم الی اللّٰہ احاسنکم اخلاقا الموطئون اکنافا الذین یالفون و یؤلفون و ان ابغضکم الی اللّٰہ المشاؤن بالنمیمہ المفرقون بین الاخوان الملتمسون للبرآء العثرات قال ابوذر قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من اشار بمسلم بکلمۃ یشنیہ بھا بغیر حق شانہ اللّٰہ بھا فی القیامۃ۔

حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں کے بہتر وہ لوگ ہیں جو از روئے اخلاق بہتر ہیں یعنی وہ لوگ جو کہ نرم خو ہیں جو خود بھی محبت و الفت لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں اور لوگ بھی انکے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے ہیں اور تم میں کے مبغوض تر وہ لوگ ہیں جو چغلیاں کرتے پھرتے اور بھائیوں کے آپس کے تعلقات میں تفریق ڈالتے رہتے ہیں اور جو لوگ ان سے محفوظ ہیں انکی لغزشوں کو تلاش کرتے ہیں۔ حضرت ابوذرؓ نے کہا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص نے کسی مسلمان کی طرف ایسی بات منسوب کی جو اسکو عیب لگاتی ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسکو عیب لگائے گا۔

روی کعب الاحبارؓ ان بنی اسرائیل اصابھم قحط فاستسقی موسیٰ علیہ السلام مرات فما سقوا فاوحی اللہ تعالیٰ الیہ انی لا استجیب لک و لمن معک فیکم نمام. وقد اصر علی النمیمۃ فقال موسیٰ یارب من ھو دلنی علیہ حتی اخرجہ من بیننا قال یا موسیٰ انھاکم عن النمیمۃ واکون نماما فتابوا جمیعا فسقوا۔	حضرت کعب احبارؓ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک دفعہ قحط پڑا، موسیٰ علیہ السلام نے چند مرتبہ بارش کیلئے دعا فرمائی پانی نہیں برسا اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ میں آپ کی اور آپکے ساتھیوں کی کسی دعا نہیں قبول کرونگا اسلئے کہ تمھارے اندر ایک چغل خور موجود ہے، جو نمیمہ پر مصر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا یارب وہ کون ہے؟ مجھے بتلا دیجئے تاکہ اسکو اپنے درمیان سے نکال دوں۔ فرمایا کہ تم کو تو نمیمہ سے منع کرتا ہوں اور خود نمام بنوں، پس سارے مجمع نے توبہ کی (اسمیں نمام بھی تھا۔ پھر بارش ہوئی۔

نمیمہ کی تعریف اہل لغت اور شرع کے کلام سے ہم بیان کر چکے ہیں مزید افادہ کیلئے امام غزالیؒ نے جو اسکی تعریف کی ہے اور حکمار کے اور مضامین جو اسکے متعلق انھوں نے بیان کئے ہیں وہ ما بعینہ مع ترجمہ کے نقل کرتے ہیں۔

(بیان حد النمیمۃ وما یجب فی ردھا)۔	(نمیمہ کی تعریف اور اسکے رد کے سلسلہ میں جو چیزیں واجب ہیں انکا بیان)۔
اعلم ان اسم النمیمۃ انما یطلق فی الاکثر علی من ینم قول الغیر الی المقول فیہ کما تقول فلان کان یتکلم فیک بکذا وکذا ولیست النمیمۃ مختصۃ بہ بل حدھا کشف ما یکرہ کشفہ سواء کرھہ المنقول عنہ او المنقول الیہ او کرھہ ثالث وسواء کان الکشف	جان لو کہ نمیمہ علی العموم اطلاق کیا جاتا ہے کسی شخص کے اس قول پر جس کو وہ مقول فیہ تک پہونچا دے جیسے کہ تم کہو کہ فلاں شخص تمھارے بارے میں ایسا ایسا کہتا تھا حالانکہ نمیمہ کچھ اسی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کی تعریف یہ ہے کہ کوئی شخص جس چیز کے کشف کو مکروہ سمجھے اس کو ظاہر کر دینا عام اس سے کہ منقول عنہ اس کو برا سمجھے یا منقول الیہ برا سمجھے یا کوئی تیسرا برا سمجھے عام اس سے کہ اظہار

بالقول او بالكتابة او بالرمز او بالايماء سواء كان المنقول من الاعمال او من الاقوال وسواء كان ذلك عيبا ونقصا في المنقول عنه اولم يكن بل حقيقة النميمة افشاء السر وهتك الستر عما يكره كشفه بل كل ماراه الانسان من احوال الناس فينبغي ان يسكت عنه الا ما في حكايته فائدة لمسلم اودفع لمعصية كما اذا رأى من يتناول مال غيره فعليه ان يشهد به مراعاة لحق المشهود عليه فاما اذا رآه يخفي مالا لنفسه وذكره فهو نميمة وافشاء للسر فان كان ما ينم به نقصا وعيبا في المحكي عنه كان قد جمع بين الغيبة والنميمة فالباعث على النميمة اما ارادة السوء للمحكي عنه او اظهار الحب للمحكي له او التفرج بالحديث والخوض في الفضول والباطل وكل من حملت اليه

اور کشف قول کے ساتھ ہو یا کتابت یا اشارہ و کنایہ کے ساتھ ہو نیز عام اس سے کہ جو چیز نقل کیگئی ہے وہ اعمال کے قبیل سے ہو یا اقوال کے اور عام اس سے کہ وہ بات جس کے متعلق ہے اسکے لئے عیب اور نقص ہو یا نہو۔ پس حقیقت نمیمہ کی کسی کے بھید کا ظاہر کر دینا اور جس چیز کے اظہار کو کوئی ناپسند کرتا ہو اسکی پردہ دری کر دینا ہے لہٰذا ہر وہ چیز احوال ناس میں سے جسے انسان دیکھے مناسب ہے کہ اس سے سکوت ہی اختیار کرے بجز اس چیز کے کہ جس کے بیان کرنے میں کسی مسلمان کا نفع ہو یا کسی معصیت کا دفع ہو جیسے کہ جب کوئی شخص کسی کو دیکھے کہ وہ غیر کا مال لے رہا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ گواہی دے اور یہ مشہود علیہ کے حق کی رعایت کی وجہ سے ہے بہرحال جب کسی کو یہ دیکھے کہ وہ اپنا مال چھپا رہا ہے اور اسکو ظاہر کر دیا تو یہ نمیمہ ہے اور افشاء راز ہے، اب اگر جس بات کی چغلی کھائی ہے وہ محکی عنہ کے لئے نقص اور عیب بھی ہو تو اس شخص نے غیبت اور نمیمہ دونوں کو جمع کر لیا۔ پس نمیمہ کا باعث یا تو محکی عنہ کے ساتھ برائی کا ارادہ ہوتا ہے یا محکی لہ سے اظہار محبت یا یونہی بات کی تفریح اور لغو اور باطل امور میں خوض اس کا سبب ہوتا ہے۔ ہر وہ شخص جس کو کوئی بات پہونچائی جائے یعنی اس سے کہا جائے کہ

النميمة وقيل له ان فلانا قال فيك كذا او فعل في حقك كذا او هو يريد في افساد امرك او في ممالاة عدوك او تقبيح حالك او ما يجري مجراه فعليه ستة امور الاول ان لا يصدقه لان النمام فاسق وهو مردود الشهادة قال الله تعالى يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ. الثاني ان ينهاه عن ذلك وينصح له ويقبح عليه فعله قال الله تعالى وامر بالمعروف وانه عن المنكر. الثالث ان يبغضه في الله تعالى فانه بغيض عند الله تعالى ويجب بغض من يبغضه الله تعالى الرابع ان لا تظن باخيك الغائب السوء بقول الله تعالى اجتنبوا كثيرا من الظن ان بعض الظن اثم. الخامس ان لا يحملك ما حكى لك على التجسس والبحث والتحقق اتباعا لقوله تعالى ولا تجسسوا

فلاں شخص تمہارے متعلق ایسا کہتا ہے یا تمہارے حق میں ایسا کیا ہے یا تمہارے معاملہ کے فاسد کرنے میں وہ کوشش کرتا ہے یا تمہارے دشمن کے مدد کرنے کی فکر میں ہے یا تمہارے حال کے خراب کرنے کی سعی کر رہا ہے یا اسیطرح کی کوئی اور بات پہونچائے تو اس منقول الیہ پر چھ چیزیں لازم ہیں اول تو یہ کہ اسکی تصدیق نہ کرے اسلئے کہ نمام فاسق ہوتا ہے اور فاسق مردود الشہادت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لائے تو اسکی تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کو نادانی سے ضرر پہونچادو۔ دوم یہ اسکو اس سے منع کرے اور اسکو نصیحت کرے اور اسکے اس فعل کی تقبیح کرے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے معروف کا حکم کیجئے اور منکر سے روکیئے۔ سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کیلئے اس سے بغض رکھے اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہے اور جس سے اللہ تعالیٰ بغض رکھے اس سے بغض رکھنا واجب ہے۔ چہارم یہ کہ اپنے اس غائب بھائی کے ساتھ سوء ظن نہ کرے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بہت سے گمانوں سے بچا کرو کیونکہ بعض ظن گناہ ہوتا ہے۔ پنجم یہ کہ اس نے تم سے جو کچھ بیان کیا ہے وہ تم کو تجسس اور بحث پر آمادہ نہ کرے تاکہ تم اس قول کی تحقیق کرلو اس لئے کہ تجسس منع ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "ولا تجسسوا"۔

السادس ان لا ترضى لنفسك ما نهيت النمام عنه ولا تحكى نميمة فتقول فلان قد حكى لى كذا وكذا فتكون به نماما ومغتابا وتكون قد اتيت ما عنه نهيت وقد روى عن عمر بن عبد العزيز رضى الله عنه انه دخل عليه رجل فذكر له عن رجل شيئاً فقال له عمر ان شئت نظرنا فى امرك فان كنت كاذبا فانت من اهل هذه الاٰية ان جاءكم فاسق بنباء وان كنت صادقا فانت من اهل هذه الاٰية همّاز مشاء بنميم وان شئت عفونا عنك فقال العفو يا امير المؤمنين لا اعود اليه ابداً وذكر ان حكيماً من الحكماء زاره بعض اخوانه فاخبره بخبر عن بعض اصدقائه فقال له الحكيم قد ابطأت فى الزيارة وأتيت بثلاث جنايات بغضت اخى الىّ وشغلت قلبى الفارغ واتهمت نفسك الامينة وروى ان سليمان

ششم یہ کہ اپنے نفس کیلئے اس چیز کو نا پسند کرو جس سے تم نے نمام کو منع کیا ہے۔ یعنی اب اس بات کو دوسرے سے نہ بیان کرنے لگو کہ یوں کہو کہ فلاں شخص نے مجھ سے ایسی ایسی بات بیان کی تھی کیونکہ اسکی وجہ سے تم بھی نمام اور مغتاب بن جاؤگے اور جس چیز سے منع کیا تھا اسی کے کرنیوالے ہو جاؤگے۔ عمر ابن عبد العزیز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انکے پاس ایک شخص آیا اور ان سے کسی شخص کی کوئی بات بیان کی حضرت عمر ابن عبد العزیزؓ نے اس سے کہا کہ اگر تم چاہو تو ہم تمھارے معاملہ میں غور کریں اگر تم جھوٹے نکلے تو اس آیت کے جو لوگ مصداق ہیں ان میں سے ہو جاؤگے یعنی ان جاءکم فاسق بنباء اور اگر تم سچے ثابت ہوئے تو اس آیت کے مصداق ہوگے هماز مشاء بنميم۔ اور اگر تم چاہو تو ہم تم کو معاف کردیں۔ اس نے کہا اے امیر المؤمنین مجھے معاف ہی فرما دیجئے اب میں کبھی ایسا نہ کروں گا بیان کیا گیا ہے کہ ایک حکیم سے اسکے ایک دوست نے ملاقات کی اور اسکے کسی دوست کے متعلق کوئی بات بیان کی حکیم نے اس سے کہا کہ ایک تو تم نے ملاقات میں بہت دیر کی اور دوسرے اسوقت تین جنایتیں کیں۔ میرے بھائی کو میری طرف مبغوض کردیا اور میرے فارغ قلب کو مشغول کردیا اور اپنے نفس امینہ کو متہم کردیا۔ مروی ہے کہ سلیمان ابن عبد الملک بیٹھے ہوئے

بن عبد الملك كان جالسًا و عنده الزهری فجاءه رجل فقال له سليمان بلغنی انك وقعت فی و قلت كذا و كذا فقال الرجل ما قلت فقال سليمان ان الذی اخبرنی صادق فقال له الزهری لا يكون النمام صادقا فقال سليمان صدقت ثم قال للرجل اذهب بسلام وقال الحسن من نم اليك نم عليك وهذا اشارة الی ان النمام ينبغی ان يبغض ولا يوثق بقوله ولا بصداقته وكيف لا يبغض وهو لا ينفك عن الكذب والغيبة والغدر والخيانة والغل والحسد والنفاق والافساد بين الناس والخديعة و هو ممن يسعیٰ فی قطع ما امر الله ان يوصل ويفسدون فی الارض وقال تعالیٰ انما السبيل علی الذين يظلمون الناس ويبغون فی الارض بغير الحق والنمام منهم۔ وقال صلی الله عليه وسلم ان من شرار الناس من

تھے اور انکے پاس زہری بھی موجود تھے اتنے میں سلیمان کے پاس ایک شخص آیا تو اس سے سلیمان نے کہا کہ مجھے یہ خبر پہونچی ہے کہ تم نے میری غیبت کی ہے اور ایسا ایسا کہا ہے اس شخص نے کہا کہ میں نے تو نہیں کہا سلیمان نے کہا کہ جس نے مجھے خبر دی ہے وہ سچا ہے تو زہری نے کہا کہ نمام صادق نہیں ہوتا سلیمان نے کہا آپ نے سچ فرمایا۔ پھر اس شخص سے کہا کہ سلامتی کے ساتھ چلے جاؤ۔ حسن فرماتے ہیں کہ جو شخص تمہاری طرف کوئی بات نقل کرے وہ تمہاری بات بھی دوسروں سے نقل کریگا اس سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ مناسب ہے کہ نمام سے بغض رکھا جائے اور اسکے قول کی توثیق نہ کیجائے اور اسکی دوستی پر اعتماد نہ کیا جائے اور اس سے بغض کیوں نہ رکھا جائے درانحالیکہ وہ کذب سے غدر اور خیانت سے غل اور حسد سے نفاق اور افساد بین الناس سے اور خدیعہ سے کسی وقت خالی نہیں ہوتا نیز وہ ان لوگوں میں سے ہے جو قطع کرتے ہیں ان چیزوں کو جسکے وصل کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور زمین میں فساد کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق دنیا میں سرکشی کرتے ہیں اور نمام انھیں میں سے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ لوگوں میں سب سے برا

اتقاه الناس لشره والنمام منهم
وقال لا يدخل الجنة قاطع
قيل القاطع بين الناس وهو
النمام وقيل قاطع الرحم وروى
عن علی رضی الله عنه ان رجلا
سعی اليه برجل فقال له يا
نحن نسأل عما قلت فان كنت
صادقا مقتناك وان كنت كاذبا
عاقبناك وان شئت اقلناك
فقال اقلنی يا امير المؤمنين
وقيل لمحمد بن كعب القرظی
ای خصال المؤمن اوضع له
فقال كثرة الكلام وافشاء السر
وقبول قول كل احد وقال رجل
لعبد الله بن عامر وكان امير
بلغنی ان فلانا اعلم الامير
انی ذكرته بسوء قال قد كان
ذلك قال فاخبرنی بما قال
لك حتی اظهر كذبه عندك
قال ما احب ان اشتم نفسی
بلسانی وحسبی ان لا اصدقه
فيما قال ولا اقطع عنك الوصال
ذكر السعاية عند بعض الصالحين
فقال ما ظنكم بقوم يحمد الصدق
من كل طائفة من الناس الا

وہ شخص ہے جس سے لوگ اسکے شر کیوجہ سے دور رہیں
اور نمام بھی انھیں میں سے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا ہے کہ جنت میں قاطع نہیں جائیگا کہا گیا کہ قاطع سے
مراد نمام ہی ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ قاطع رحم مراد ہے
حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص
نے انکے سامنے کسی کی چغلی کھائی آپ نے فرمایا کہ
اے شخص جو کچھ تو نے کہا ہم اسکی تحقیق کرتے ہیں
اگر تو سچا ثابت ہوا تو ہم تجھ سے ناراض ہونگے اور اگر
تو جھوٹا ثابت ہوا تو سزا دینگے اور اگر تو چاہے تو ہم تجھکو
معاف کر دیں اس نے عرض کیا کہ اے امیر المومنین مجھکو معاف
ہی فرما دیجئے۔ محمد بن کعب قرظی سے کہا گیا کہ مومن
کی خصلتوں میں کونسی ایسی خصلت ہے جو اسکو
بالکل گرا دینے والی ہے انھوں نے کہا کہ بہت زیادہ
بولنا، راز کا ظاہر کرنا اور ہر ایک کی بات مان لینا اور
ایک شخص نے عبد اللہ ابن عامر سے کہا جو کہ امیر تھے
مجھے یہ بات پہونچی ہے کہ فلاں شخص نے امیر کو یہ بات
پہونچائی ہے کہ میں نے اسکو برائی کے ساتھ یاد کیا
انھوں نے کہا کہ ہاں ایسا تو ہوا ہے اس شخص نے
کہا اچھا یہ تو بتائیے اس نے کیا کہا ہے تا کہ میں آپکے
سامنے اسکا غلط ہونا ظاہر کر دوں انھوں نے کہا کہ
مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اپنے آپکو خود اپنی زبان سے گالی دوں
اور مجھکو یہ کافی ہے کہ جو کچھ اس نے کہا ہے میں اسکی تصدیق
نہ کروں اور تجھ سے تعلق کو منقطع نہ کروں۔ بعض صالحین
کے سامنے سعایہ کا ذکر آیا کہ کیسا ہے انھوں نے کہا کہ تمھارا
اس قوم کے بارے میں کیا خیال ہے کہ جس کی جانب

منهم وقال مصعب بن الزبير نحن نرى ان قبول السعاية شر من السعاية لان السعاية دلالة والقبول اجازة وليس من دل على شئ فاخبر به كمن قبله واجازه فاتقوا الساعي فلو كان صادقا في قوله لكان لئيما في صدقه حيث لم يحفظ الحرمة ولم يستر العورة	سے سچائی جیسی چیز بھی مذموم ہو رہی ہے حالانکہ ہر قوم میں اسکو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ مصعب بن زبیر نے فرمایا کہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ سعایہ کا قبول کرنا سعایہ سے بھی بدتر ہے۔ اسلئے کہ سعایہ تو دلالت ہے اور اسکا قبول اجازت۔ اور نہیں ہے وہ شخص جس کو کوئی بات معلوم ہو بس اسکی خبر کر دے اس شخص کے مانند جو اسکو قبول کرے اور اجازت دیدے لہٰذا ساعی سے بچو اگر وہ اپنے قول میں سچا بھی ہوا تو اپنے صدق میں لئیم ہوگا اس طور پر کہ اس نے حرمت کی حفاظت نہیں کی اور عیب کو نہیں چھپایا

(احیاء العلوم ص۱۵۱ ج۳)

سب سے اہم بات جو ان حکایات سے مستنبط ہوتی ہے اسے بھی سمجھ لینا چاہیئے وہ یہ کہ عمل بالنمیمہ سے کیا مراد ہے امام غزالیؒ کی مذکورہ بالا عبارت میں جو دو حکایتیں سلیمان ابن عبدالملک اور عبداللہ ابن عامر کی گذری ہیں ان سے یہ بات نکلتی ہے کہ نمیمہ پر عمل کرنا یہ ہے کہ خبر لانے والے کی تصدیق کرے اور مقول فیہ سے انتقام لے یا اس سے قطع تعلق کرے اور اسکے خلاف کرنا یعنی نمام کی تصدیق نہ کرنا اور مقول فیہ سے قطع تعلق نہ کرنا یہی نمیمہ پر عمل نہ کرنا ہے۔ مگر محض خبر پہونچ جانے کیوجہ سے مقول فیہ متہم ہو گیا لہٰذا دفع تہمت کے لئے اس سے دریافت کر لینا جائز ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید ابن ارقمؓ کے خبر پہونچانے پر عبداللہ ابن ابی کو بلا کر دریافت فرمایا کہ تم نے ایسا کہا ہے اور اسکے انکار کرنے پر اسکی تصدیق فرمادی۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید بن ارقمؓ اور عبداللہ بن ابی منافق کے اس واقعہ کو مفصل بیان کر دیا جائے جس سے مضمون نمیمہ کے بعض گوشوں پر بھی روشنی پڑے گی نیز اور بہت سی مفید باتیں معلوم ہونگی۔ وھو ھٰذا۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ بخاری وغیرہ نے زید بن ارقم سے تخریج کیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے عبداللہ بن ابی کو اپنے اصحاب سے کہتے ہوئے سنا کہ "جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہیں ان پر خرچ مت کرو تاکہ وہ لوگ کھسک جائیں" اور یہ بھی

کہا کہ "جب ہم مدینہ لوٹ کر جائیں گے تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو نکال دے گا"
اس بات کو میں نے اپنے چچا سے بیان کیا انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان
کر دیا۔ مجھکو حضورؐ نے بلا بھیجا تو میں نے بھی آپ سے بیان کیا۔ اس پر حضورؐ نے عبداللہ
ابن ابی اور اسکے اصحاب کو بلوایا ان سبھوں نے قسم کھالی کہ ہم نے نہیں کہا اس پر
حضورؐ نے میری تکذیب فرمادی اور اسکی تصدیق کی اسکی وجہ سے مجھکو ایسا صدمہ پہونچا کہ
کبھی بھی ایسا نہیں پہونچا تھا۔ میرے چچا نے کہا تم نے نہیں ارادہ کیا مگر اس بات کا کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری تکذیب کریں اور تم سے ناخوش ہوں۔ پس اللہ تعالے
نے اذا جاءك المنافقون نازل فرمایا تو مجھکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا بھیجا اور
اس سورت کی تلاوت فرمائی پھر فرمایا بیشک اللہ تعالے نے تمھاری تصدیق فرمائی۔

اور محمد ابن اسحاق وغیرہ جو اہل سیر میں سے ہیں انھوں نے ذکر کیا ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہونچی کہ بنی مصطلق آپ سے جنگ کیلئے جمع
ہو رہے ہیں اور اسکے قائد حضورؐ کی زوجہ جویریہؓ کے والد حارث ابن ضرار ہیں پس جبکہ
حضورؐ نے ان لوگوں کے متعلق سنا تو مدینہ پر زید ابن حارثہ کو خلیفہ بنایا۔ یہ اس روایت
میں ہے جس کو محمد ابن عمر واور ابن سعد نے روایت کیا' اور ابن ہشام نے کہا ہے کہ
حضرت ابوذر غفاریؓ کو خلیفہ بنایا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور مسلمانوں نے تیس
گھوڑوں کو آگے کیا جن میں سے دس مہاجرین کے لئے تھے اور دو گھوڑے حضور اقدس
صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت سے منافقین بھی نکلے
اس غرض سے کہ متاع دنیا کو حاصل کریں۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات
بنی مصطلق سے انکے ایک چشمہ پر ہوئی جس کو مریسیع کہا جاتا تھا جو مقام قدید کے
پاس ساحل جاتے ہوئے راستہ میں پڑتا تھا۔

حارث نے لڑائی کی تیاری کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صف آرائی
فرمائی اور حضرت عمر بن خطابؓ سے فرمایا کہ لوگوں میں اعلان کردو کہ لا الہ الا اللہ کہیں
اسکے ذریعہ سے تم لوگ اپنے نفسوں اور اپنے اموال کو بچا لوگے۔ حضرت عمرؓ نے
اعلان کر دیا۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ بنی مصطلق نے اسکا جواب تیر اندازی کے ساتھ
دیا اور سب لوگ باہم ایک دوسرے میں گھس گئے اور قتال شروع ہو گیا اللہ تعالے

بنی مصطلق کو شکست دی ان میں بہت سے لوگ قتل ہوئے اور انکی اولاد اور مال اللہ تعالے نے آپکو غنیمت میں عطا فرمایا۔ اسی اثنا میں کہ لوگ ابھی چشمے ہی پر تھے کچھ لوگ اور آگئے، حضرت عمر بن خطاب رضؓ کے ساتھ انکا ایک اجیر تھا جو بنی غفار کا تھا اور جس کا نام جہجاہ بن سعید غفاری تھا وہ آپ کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر لیچل رہا تھا پس یہ جہجاہ اور سنان بن دبرہ جہنی جو کہ ابن عوف بن خزرج کا حلیف تھا اسی چشمہ پر باہم لڑ پڑے اور قتال کرنے لگے جہجاہ نے سنان پر ایک وار کیا جس سے خون بہ نکلا پس یہ سنان جہنی چیخا کہ اے انصار کی جماعت مدد کرو، ادہر غفاری بھی چلایا کہ اے مہاجرین کی جماعت مدد کو پہنچو۔ چنانچہ جہجاہ کی اعانت ایک مہاجر نے کی جس کا نام جعال تھا اس پر جانبین سے ایک ایک جماعت نکل آئی اور ہتھیار نکال لئے اور قریب تھا کہ ایک فتنۂ عظیم برپا ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور اس منظر کو دیکھکر فرمایا کہ یہ جاہلیت کا سا شور کیسا؟ آپ کو واقعہ کی اطلاع دی گئی تو آپؐ نے فرمایا مٹو چھوڑ دو اسکو یہ کھلا ہوا فتنہ ہے یعنی شرعاً مذموم ہے چاہیئے کہ انسان اپنے بھائی کی مدد کرے چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم یعنی اگر وہ ظالم ہو تو اسکو ظلم سے روک دے اسکی مدد کرنے والا ہو جائے گا اور اگر مظلوم ہے تو اس کی اعانت کرے پھر مہاجرین کی ایک جماعت نے عبادہ بن صامت رضؓ سے اور انصار کی ایک جماعت سے گفتگو کی تو انھوں نے سنان کو سمجھایا اس نے اپنا حق چھوڑ دیا۔ ادہر عبداللہ بن ابی بن سلول بیٹھا ہوا تھا اور اسکے پاس دس اشخاص منافقین موجود تھے جن میں مالک۔ سوید قاعس۔ اوس بن قبطی۔ زید بن صلت۔ عبداللہ بن بنیل اور معتب بن قشیر بھی تھے اور قوم میں زید بن ارقم جو ایک نوعمر لڑکے تھے یہ بھی موجود تھے ابن ابی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اب یہی کرو اسلئے کہ یہ لوگ ہم پر غالب آگئے ہیں اور ہمارے اس شہر میں انکی اکثریت ہے خدا کی قسم ہماری اور ان لوگوں کی مثال تو بالکل وہی ہے جو کسی کہنے والے نے کہا ہے کہ اپنے کتے کو خوب کھلا کھلا کر موٹا کرو تاکہ وہ ایک دن تمھیں کو کھا جائے، خدا کی قسم اگر ہم مدینہ پہونچے تو اسمیں سے عزیز ذلیل کو باہر نکال دیگا۔ عزیز سے اپنے کو مراد لیا اور ذلیل سے (معاذ اللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر اپنے قوم کے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ یہ تو تم لوگوں نے خود اپنے نفسوں کے ساتھ

کیا ہے تم نے خود ہی اپنے شہروں میں انکو داخل کر دیا اور اپنے اموال انکو تقسیم کر دیئے خدا کی قسم اگر تم لوگ جعال وغیرہ کو اپنا بچا ٹکڑا نہ دیتے تو آج یہ تمھاری گردنوں پر سوار نہ ہوتے بلکہ کسی اور جگہ منتقل ہو جاتے پس ان پر خرچ نہ کرو تاکہ یہ محمدؐ کے پاس سے کھسک جائیں یہ سنکر زید بن ارقمؓ نے کہا خدا کی قسم تو ہی ذلیل ہے حقیر ہے اور مبغوض ہے اپنے قوم میں۔ اور محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے عزت عطا فرمائی اور مسلمانوں کے قلوب میں آپ کی محبت رکھی۔ یہ سنکر عبد اللہ بن ابی بولا چپ رہو جی میں تو مذاق میں ایک بات کہہ رہا تھا۔ زید بن ارقمؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور آپ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے خبر دینے کو ناپسند فرمایا اور آپؐ کا چہرہ متغیر ہو گیا فرمایا کہ صاحبزادے جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو۔ انھوں نے کہا کہ نہیں، خدا کی قسم میں نے سنا ہے۔ آپ نے فرمایا شاید تم سے کچھ سننے میں غلطی ہو گئی ہو۔ انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ ایسا بھی نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا شاید تم کو شبہ ہو گیا ہو۔ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ایسا بھی نہیں ہوا۔ اور ہر لشکر میں ابن ابی کی بات مشہور ہو گئی اور لوگوں میں ہر جگہ یہی چرچا تھا ابن ابی نے ایسا ایسا کہا ہے۔ انصار کی ایک جماعت زید بن ارقمؓ کو ملامت کرنے لگی اور یہ کہا کہ تم نے اپنی قوم کے ایک سردار کی ذلت کا قصد کیا اور ان پر جھوٹ لگایا تم نے بہت برا کیا اور قطع رحمی کا باعث بنے۔ زید نے ان لوگوں سے بھی کہا کہ خدا کی قسم جو کچھ اس نے کہا اسکو میں نے خود سنا ہے۔ خدا کی قسم خزرج میں کوئی شخص عبد اللہ ابن ابی سے بڑھکر میرے والد کا دوست نہیں تھا تو اگر مجھے کچھ پاس ولحاظ ہوتا تو اپنے والد ہی کی دوستی کا ہوتا) لیکن یہ جملہ میں نے اپنے والد سے بھی سنا ہوتا تب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ضرور پہنچاتا مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ پر آیت نازل فرمائیں گے جس سے میرے کہے کی تصدیق ہو جائے گی۔ یہ سنکر حضرت عمرؓ بن خطاب نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجئے میں اس (منافق) کی گردن ماردوں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ عباد بن بشیر کو یا کہا کہ محمد بن مسلمہ کو حکم فرمائیے تاکہ اسکا سر آپ کے پاس لے آدیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا حال ہوگا اے عمرؓ جبکہ

لوگ آپس میں یہ گفتگو کریں گے کہ محمد اپنے اصحاب ہی کو قتل کر دیتے ہیں لیکن آپ نے اسی وقت کوچ کر دینے کا حکم فرمایا اور وہ ایسا وقت تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسوقت کوچ نہیں فرماتے تھے اس لئے کہ سخت گرمی تھی اور آپ کوچ ٹھنڈے وقت فرمایا کرتے تھے۔ لشکر کو آپ کے ارادہ کی اطلاع اسوقت ہوئی جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی پر جس کا نام قصویٰ ہے سوار ہو چکے تھے اسکے بعد لوگوں نے بھی کوچ کا سامان کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کو بلوا بھیجا، وہ حاضر ہوا آپ نے کہا یہ بات جو مجھ تک پہونچی ہے کیا تم ہی اسکے صاحب ہو؟ عبداللہ نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی میں نے ان باتوں میں سے کوئی بھی بات نہیں کہی زید رضؓ نے بالکل جھوٹ کہا۔ عبداللہ چونکہ اپنے قوم میں ایک شریف اور عظیم المرتبت شخص شمار ہوتا تھا اسلئے آپ کے انصاری صحابہ میں سے جو لوگ موجود تھے انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہو سکتا ہے زید کو اپنی بات میں کچھ غلط ہو گیا ہو اور جو کچھ اس نے (ابن ابی نے) کہا ہو وہ انکو یاد نہ رہا ہو اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو معذور قرار دیا اور انصار کی جانب سے حضرت زیدؓ کی عام طور سے تکذیب در ملامت ہونے لگی یہ دیکھکر حضرت زیدؓ کے چچا نے ان سے کہا بس تم یہی چاہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب لوگ تمہاری تکذیب کر دیں اور تمھیں جھڑکیں۔ زید بھی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے چچا کی یہ بات سنکر شرما گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہونے سے رکنے لگے جب حضورؐ جماعت کے سامنے سے گزرے تو سب سے پہلے جس نے آپ سے ملاقات کی وہ سعد بن عبادہ تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسید بن حضیر تھے چنانچہ ابن اسحٰق کی یہی رائے ہے انھوں نے کہا السلام علیک یا ایہا النبی ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ حضورؐ نے جواب میں فرمایا وعلیک ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے ایسے ناوقت سفر فرمایا کہ کبھی ایسے وقت سفر فرمانا معمول نہ تھا آپ نے فرمایا تمہارے صاحب نے کیا کہا ہے کچھ اسکی بھی خبر ہے؟ عرض کیا کون صاحب؟ فرمایا ابن ابی کا یہ گمان ہے کہ جب وہ مدینہ واپس جائے گا تو جو عزیز ہوگا وہاں سے ذلیل کو نکال دیگا۔ عرض کیا

یا رسول اللہ ٹھیک تو ہے انشاء اللہ آپ اسکو نکال دیں گے اور وہی ذلیل ہے اور آپ عزیز ہیں کیونکہ عزت اللہ کے لئے ہے آپ کے لئے ہے، اور مومنین کے لئے ہے۔
پھر عرض کیا یا رسول اللہ! اسکے ساتھ نرمی کا معاملہ فرمائیے اس لئے کہ جس وقت آپ کو اللہ تعالےٰ یہاں (مدینہ میں) لایا اسوقت اس کا یہ حال تھا کہ اسکی قوم اسکے لئے جواہرات کو پرو رہی تھی تاکہ اسکا تاج بنا کر اسکے سر پر رکھے اس کی تیاری میں ایک جوہر کی کسر تھی جو یوشع نامی یہودی کے پاس تھا (اور وہ اسکے دینے میں ٹال مٹول کر رہا تھا) اور قوم کو آزما رہا تھا اسلئے کہ یہ سمجھتا تھا کہ ان لوگوں کو اسکی حاجت ہے تو ضرور لیں گے (اس سبب سے ابھی تاج مکمل نہیں ہوا تھا) کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اسی حالت میں یہاں لے آیا پس اس نے نہیں خیال کیا مگر یہ کہ آپ نے گویا اس کا ملک ہی چھین لیا۔

ادہر عبداللہ ابن ابی کے لڑکے حضرت عبداللہ کو حضرت عمرؓ کا مقولہ پہونچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ جو کچھ آپ کو ابن ابی کے متعلق پہونچا ہے اسکے عوض اس کو قتل کریں تو مجھی کو حکم فرما دیجئے خدا کی قسم آپ کے اس مجلس سے اٹھنے کے پہلے پہلے اسکا سر حاضر خدمت کر دونگا۔ بخدا قبیلۂ خزرج کو یہ معلوم ہے کہ اسکے اندر مجھ سے زیادہ اپنے والدین کا فرماں بردار کوئی شخص نہیں ہوا ایں ہمہ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ میرے غیر کو اسکے قتل کا حکم فرمائیں گے تو میرے نفس کو یہ موقع ملیگا کہ میں کبھی اپنے باپ کے قاتل کو لوگوں میں چلتا پھرتا دیکھوں اور برداشت نہ کر سکوں اور مبادا کہ اسے قتل کر دوں تو نتیجہ یہ ہو کہ میں ایک مومن کو کافر کے عوض قتل کر کے داخل نار ہو جاؤں لہٰذا اسکا موقع ہی نہ آنے دیجئے باقی آپ کا معاف فرما دینا یہ کہیں زیادہ افضل و اعظم ہے

ے چنانچہ صاحب روح المعانی نے آیت وھموا بمالم ینالوا کے تحت اسی مضمون کی ایک حدیث نقل کی ہے ھذا نصہ عن ابی صالح انھم ارادوا ان یتوجوا عبد اللہ ابن ابی بتاج ویجعلوہ حکما ورئیسا بینھم وان لم یرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ص۲۲) ترجمہ (ابو صالح کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے عبداللہ ابن ابی کو تاج پہنانے کا ارادہ کیا تھا اور یہ ارادہ کیا تھا کہ اسکو اپنا حکم اور سردار بنالیں اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی نہ ہوں۔

یہ سنکر حضورؐ نے فرمایا کہ اے عبداللہ میں نے اسکے قتل کا ارادہ تو کیا نہیں اور نہ کسی کو اسکا حکم دیا اور ہمارے درمیان جب تک وہ رہیگا ہم اسکے ساتھ اچھا ہی برتاؤ کریں گے حضرت عبداللہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اس جھیل کے پاس بسنے والوں نے اتفاق کیا تھا کہ میرے باپ کو تاج پہنائیں کہ اسی اثنار میں اللہ تعالےٰ آپ کو لے آیا اسکو پست کردیا اور آپ کو رفعت عطا فرمائی (ایک تو یہ بات تھی) نیز اسکے ساتھ ایسے لوگ بھی تھے جو ان باتوں کا تذکرہ کرتے تھے جن میں اللہ تعالےٰ نے انھیں مغلوب کردیا تھا یہ اسباب باعث ہوئے اسکی اس بکواس کے)۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے ساتھ سارا دن چلتے رہے یہانتک کہ شام ہوگئی پھر ساری رات چلتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی پھر اس دن کے ابتدائی حصے میں چلتے رہے یہاں تک کہ دھوپ کی تکلیف ہونے لگی اسوقت آپ نے منزل کیا۔ بس لوگ تھکے تو تھے ہی زمین پر اترتے ہی لیٹے اور سو گئے۔ آپ نے یہ مسلسل سفر اسلئے فرمایا تاکہ لوگوں سے ان تاثرات کو ختم کردیں جو ابن ابی کے قول سے ان میں پیدا ہوگئے تھے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوچ فرمایا یہاں تک کہ حجاز کے ایک پانی پر اترے جو نقیع سے اوپر کی جانب واقع تھا جس کا نام بقعار تھا۔

مسلم نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جب مدینہ قریب ہوا تو بڑے زور کی ہوا چلی ایسی قریب

ع کہ اگر قوم جب اپنی ترنگ میں آتے ہیں تو اسی قسم کے ہفوات زبان سے نکالا کرتے ہیں اس کے متعلق صاحب فتح الباری لکھتے ہیں کہ اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طرز عمل اختیار فرمایا کہ صرف ابن ابی سے پوچھ لیا اور پھر قسم کھانے پر اسکا عذر قبول فرمالیا اس سے معلوم ہوا کہ قوم کے بڑے لوگوں کے اس قسم کے ہفوات پر مواخذہ نہیں کرنا چاہیئے تاکہ انکے اتباع کو اشتعال نہ ہو بلکہ صرف عتاب پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ مانصہ۔ وفی الحدیث من الفوائد ترک مواخذۃ کبراء القوم بالھفوات لئلا ینفر اتباعھم والاقتصار علی معاتباتھم وقبول اعذارھم وتصدیق ایمانھم وان کانت القرائن ترشد الی خلاف ذلک لما فی ذلک من التانیس والتالیف

تھا کہ سواری پر سوار انسان دفن ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ہوا کسی منافق کی موت کے لئے بھیجی گئی ہے۔ چنانچہ جب ہم مدینہ آئے تو معلوم ہوا کہ منافقین کے بڑے لوگوں میں سے ایک شخص مرگیا ہے۔ محمد بن عمرو کہتے ہیں کہ جب ان لوگوں میں آندھی آئی تب لوگوں نے کہا کہ یہ ہوا نہیں اٹھی ہے مگر کسی اہم واقعہ کی بنا پر جو مدینہ میں رونما ہوا۔ اور مدینہ میں انکے اولاد اور انکے بچے تھے اور ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور عیینہ بن حصین کے درمیان کوئی معاہدہ تھا جسکی مدت بھی قریب ختم کے تھی (اس لئے بھی لوگوں کو تشویش تھی)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا اسکی وجہ سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ مدینہ کی کوئی گلی ایسی نہیں ہے کہ جس میں کوئی فرشتہ حفاظت کیلئے موجود نہ ہو اور تمہارے پہنچنے سے پہلے کسی دشمن کی یہ مجال نہیں کہ اسمیں داخل ہو سکے لیکن بات یہ ہے کہ مدینہ میں جو ایک بڑا منافق تھا وہ مرگیا اسی لئے یہ ہوا چلی ہے اور منافقین کو اسکے مرنے کی وجہ سے سخت غم و غصہ تھا۔ اس منافق کا نام زید بن رفاعہ بن تابوت تھا جو اسی دن مرا تھا۔ یہ شخص منافقین کی جائے پناہ تھا۔ محمد بن عمرو حضرت جابرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ اتنی سخت ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں چلی تھی اور وہ زوال شمس تک چلتی رہی پھر شام کو بند ہوئی۔ اہل مدینہ کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ ہوا اس اللہ کے دشمن کے دفن ہونے تک چلتی ہوئی پائی اس کے بعد وہ ٹھہری۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ نے اس دن ابن ابی سے کہا کہ تمہارے دوست زید بن رفاعہ تو چل بسے اور اسکی موت سے اسلام اور اہل اسلام کی فتح ہوئی۔ اس نے کہا ہائے افسوس کیا ایسا ہوا ہے۔ اور یہ کہا کہ اے ابا ولید تمکو کس نے بتایا ہے انھوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خبر دی ہے کہ وہ ابھی ابھی مرا ہے یہ سنکر وہ بہت ہی رنجیدہ ہوا اور حزین و غمگین ہو کر چلا گیا۔ محمد بن عمرو حضرت ابن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ اونٹوں کے درمیان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ قصوی کہیں نکل بھاگی مسلمان چاروں طرف اسکو تلاش کرنے لگے۔ اس پر زید بن صلت نے جو ایک منافق تھا اور انصار کی ایک جماعت میں بیٹھا ہوا تھا جن میں عبادہ بن بشر بن وقش اور اسید بن حضیر بھی تھے، یہ کہا کہ یہ لوگ چاروں طرف کہاں دوڑ رہے ہیں لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ گم ہوگئی ہے اسی کو تلاش کر رہے ہیں۔ یہ سن کر کہا کہ

(یہ تو نبی ہیں) اللہ تعالیٰ انھیں اسکے مکان کی اطلاع کیوں نہیں کر دیتے۔ قوم کو یہ بات بُری لگی۔ سب نے کہا اے اللہ کے دشمن! خدا تجھکو ہلاک کرے تو منافق ہوگیا پھر حضرت اسید بن حضیرؓ اسکی طرف بڑھے اور کہا (سن) خدا کی قسم میں تو ابھی تیرے پیٹ میں نیزہ بھونک دیتا اے اللہ کے دشمن۔ لیکن رکاوٹ صرف اس بات کی ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ میرا یہ اقدام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشار کے مطابق بھی ہوگا یا نہیں لیکن تجھ سے یہ کہتا ہوں کہ جب تیرے نفس میں ایسی خباثت بھری ہوئی تھی تو تو ہم لوگوں کے ساتھ نکلا ہی کیوں؟ اس نے کہا کہ میں اسلئے آیا کہ متاع دنیا (مال غنیمت) طلب کروں۔ خدا کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ہم کو ناقہ سے کہیں زیادہ عظیم الشان چیزوں کی خبریں دیا کرتے ہیں چنانچہ آپ آسمان تک کی باتیں بیان فرماتے ہیں (پھر اونٹنی کے بارہ میں کیوں نہیں بتا دیتے جب کہ تم سب لوگ اسکے لئے پریشان بھی ہو) تو سب لوگوں نے کہا خدا کرے تجھ سے ہماری کبھی راہ و رسم نہ ہو اور ہم تم کبھی ایک سایہ میں جمع نہ ہوں۔ اگر ہم لوگ تیرے دل کی بات جانتے تو کبھی اپنے ساتھ تجھے نہ لاتے۔ یہ سنکر وہ کودا اور مجمع سے نکل بھاگا۔ اس ڈر سے کہ لوگ کہیں مار نہ بیٹھیں اور مال و اسباب چھین نہ لیں۔ بھاگ کر سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے اصحاب سے بچکر آپ کی پناہ پکڑلی۔ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیخدمت میں جبرئیل علیہ السلام وحی لیکر آئے، حضورؐ نے فرمایا درانحالیکہ یہ منافق بھی سن رہا تھا کہ منافقین میں سے ایک شخص نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کھوگئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی اسکے مقام کی خبر نہ کردی اور قسم ہے خدا کی محمدؐ تو ہم کو ناقہ سے کہیں بڑھکر چیزوں کی خبریں دیا کرتے ہیں تو (بھائی) اللہ کے سوا کسی کو غیب کا علم تو ہے نہیں مگر اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے مجھے اسکے مقام کی خبر دیدی ہے، یہ کہ وہ فلاں گھاٹی میں ہے جو تمہارے آگے ہے اور اسکی مہار ایک درخت سے الجھ گئی ہے لوگ وہاں گئے جہاں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا اور اسکو لے آئے۔ جب اسکو اس منافق نے دیکھا تو بہت نادم ہوا اور جلدی سے اپنے ساتھیوں کی طرف چلا اس حال میں کہ اسکے پیر لڑکھڑا

ف۔ مخلصین کا یہی طرز رہا ہے کہ جب اپنی جماعت میں کسی غیر مخلص کو گھسا ہوا پاتے تو چین نہیں ہوتے اور اس سے تبری کرتے

رہے تھے اور وہ سب لوگ اسی طرح بیٹھے تھے کوئی شخص بھی ان میں سے مجلس سے نہ اٹھا تھا جب یہ انکے پاس پہنچا توان لوگوں نے کہا کہ (خبردار) اب ہمارے پاس نہ آنا۔ اس نے کہا مجھے کچھ کہنا ہے۔ یہ کہکر قریب گیا اور کہا میں اللہ کی قسم دیتا ہوں یہ بتاؤ کہ کیا تم میں سے کوئی شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا ہے اور میری بات کی انکو اطلاع دی ہے۔ لوگوں نے کہا، نہیں خدا کی قسم ہم تو اپنی جگہ سے اٹھے بھی نہیں۔ اس نے کہا (بڑے تعجب کی بات ہے) میری کہی ہوئی بات قوم ہی کے پاس رہی (یعنی ان سے متجاوز نہیں ہوئی) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو بیان فرمادیا۔ پھر قوم کو خبر دی اس بات کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اور یہ بھی کہا کہ میں اب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں شک میں تھا اب گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور یوں سمجھو کہ گویا میں آج مسلمان ہوا ہوں۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو وہ تیرے لئے استغفار کر دیں گے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گیا اور آپ سے اپنے لئے استغفار طلب کیا۔ اور اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادی عقیق پر پہونچے تو عبداللہ ابن عبداللہ بن ابی آگے بڑھکر ہر سوار کا جائزہ لینے لگے یہاں تک کہ انکے باپ گذرے تو انکی سواری کو بٹھانے کیلئے اسکے اگلے پیر کو اپنے پاؤں سے روندنے لگے ان کے باپ نے کہا اسے کمینہ تو کیا چاہتا ہے؟ کہا خدا کی قسم آپ (مدینہ میں) داخل نہیں ہو سکتے جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیں۔ اور تو جان لے کہ کون عزیز ہے اور کون ذلیل۔ تو ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ پس جو لوگ مسلمانوں میں سے انکے پاس سے گزرتے تھے وہ تو سیدھے چلے جاتے تھے اور انکے علاوہ جو گزرتے تھے وہ کہتے تھے کہ اپنے باپ کے ساتھ یہ حرکت کرتے ہو؟ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا آپ نے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ عرض کیا گیا کہ عبداللہ ہیں جو اپنے باپ کو روکے ہیں تا آنکہ آپ اسکو داخلہ کی اجازت دیدیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ عبداللہ اپنے والد کی سواری کے اگلے پیر پر اپنا پیر رکھے ہوئے تھے اور ابن ابی کہہ رہا تھا واقعی میں بچوں سے بھی زیادہ ذلیل ہوں، واقعی میں عورتوں سے

بھی زیادہ ذلیل ہوں۔ یہ دیکھ کر حضور نے حضرت عبد اللہ سے فرمایا کہ اپنے باپ کو چھوڑ دو تب انھوں نے اسے چھوڑا (اور روح المعانی میں اسی واقعہ میں اتنا اور بھی نقل کیا ہے کہ عبد اللہ ابن عبد اللہ ابن ابی جو کہ ایک مخلص صحابی تھے اپنے باپ کے سامنے تلوار کھینچ کر کھڑے ہو گئے جس وقت کہ سب لوگ مدینہ میں داخل ہو رہے تھے اور یہ کہا کہ قسم خدا کی میں اس تلوار کو نیام میں نہیں رکھونگا جب تک کہ تو نہ کہہ لے کہ محمدؐ عزیز ہیں اور میں ذلیل ہوں چنانچہ اس کے پاس سے ہٹے نہیں یہاں تک کہ کہلوا لیا)

(روح المعانی ج ۱۰۲/۲۸)

محمد بن عمر، رافع بن خدیج سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں نے عبادہ بن صامت کو اس دن ابن ابی سے یہ کہتے ہوئے سنا قبل اس کے کہ اس بارے میں قرآن نازل ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو آپ تیرے لئے استغفار فرما دیں گے۔ حضرت عبادہ فرماتے ہیں کہ دیکھا میں نے اسکو کہ اپنے سر کو اعراض کرتے ہوئے موڑ رہا ہے عبادہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ تیرے اس طرح سر موڑنے کے بارے میں ضرور قرآن نازل فرمائیں گے جو نمازیں پڑھا جائے گا وہ کہتے ہیں کہ اسی اثناء میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی دن تشریف لیجا رہے تھے اور زید ابن ارقم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ پکڑنے کے لئے اپنی سواری کو آگے بڑھا رہے تھے کہ آپ پر وحی نازل ہونی شروع ہوئی، زید بن ارقم کہتے ہیں کہ اسکی پہچان اس سے ہوتی تھی کہ آپ پر سختی اور شدت کے آثار ظاہر ہوتے تھے اور آپکی پیشانی پر پسینہ آجاتا تھا اور آپ کی سواری کے اگلے پیر بوجھ کی وجہ سے مڑنے لگتے تھے۔ ان نشانیوں سے میں نے پہچان لیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے اور میں نے یہ توقع کی کہ اللہ تعالیٰ میرے صدق کو ظاہر فرما دیں گے۔ زید کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی کی شدتیں ختم ہو گئیں تو آپ نے میرے دونوں کان پکڑے میں اسوقت اپنی سواری پر بیٹھا ہوا تھا اپنی جگہ سے اٹھ پڑا آپ نے دونوں کانوں کو اپنی طرف کھینچا یہ فرماتے ہوئے کہ لڑکے تیرے کان نے ٹھیک سنا تھا اللہ تعالیٰ نے تیرے قول کی تصدیق فرما دی۔ چنانچہ سورۂ منافقین اول سے آخر تک تنہا ابن اُبی کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کے بعد ابن ابی جب کوئی بات کہتا تو اسی کی قوم اس سے عتاب کرتی اور مواخذہ

کرتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بن خطاب سے جس وقت کہ انکو منافقین کے یہ سب حالات معلوم ہوئے دریافت فرمایا کہ عمرؓ تم نے کیا دیکھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا خدا کی قسم میں تو جانتا ہی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کیلئے برکت ہے جو اس نے کہیں بڑی ہے۔ پس یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ سورۂ منافقین سفر میں نازل ہوئی آپ کے مدینہ تشریف آوری سے پہلے۔ اور بغوی کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو زید بن ارقمؓ نے کہا کہ میں رنج اور شرم کی وجہ سے گھر بیٹھ رہا پس اللہ تعالےٰ نے سورۂ منافقین نازل فرمائی جس میں زید کی تصدیق تھی اور عبداللہ ابن اُبی کی تکذیب۔ جب یہ سورہ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کا کان پکڑا اور فرمایا کہ اے زید! اللہ تعالےٰ نے تمہاری تصدیق فرمائی اور تمہارے کان نے سچ سنا تھا۔ رُواۃ کہتے ہیں کہ جب آیت نازل ہوئی اور عبداللہ ابن ابی کا کذب ظاہر ہو گیا تو اس سے کہا گیا کہ اے ابا حُباب تیرے بارے میں کیسی سخت آیت نازل ہوئی ہے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو وہ تیرے لئے استغفار فرما دیں گے تو اپنے سر کو تکبر کے ساتھ موڑا اور کہا کہ تم لوگوں نے مجھ سے کہا کہ میں ایمان لاؤں تو میں ایمان لایا پھر مجھ سے مال کی زکوٰۃ دینے کو کہا میں نے اسکو بھی کیا۔ بس اب یہی باقی رہ گیا ہے کہ میں محمد کو سجدہ کروں اس پر اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ الآیۃ اور جب ابن اُبی مدینہ میں داخل ہوا تو تھوڑے ہی دن رہا کہ بیمار ہوا اور مر گیا۔

فائدہ: بقول ابن اسحاق کے یہ واقعہ شعبان ۶ھ میں ہوا اور یہی قول خلیفہ بن خیاط اور طبری کا بھی ہے لیکن قتادہ اور عروہ کہتے ہیں کہ شعبان ۵ھ کا ہے۔ اور

ف۔ میں کہتا ہوں عبداللہ ابن اُبی سے جو کلمات صادر ہوئے جنکی بنا پر سورۂ منافقون نازل ہوئی اس میں تو سب کا اتفاق ہے کہ یہ واقعہ سفر ہی کا ہے باقی حضرت زید بن ارقمؓ کا کان پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ تیرے کان نے سچ سنا (اور ظاہر ہے کہ یہ سورۂ منافقون کے نزول کے بعد ہی فرمایا) تو اسمیں دو روایتوں کا اختلاف ہے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی سفر میں ہوا اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں پہنچکر ہوا۔

اور اسی واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جویریہؓ بنت حارث بن ابی ضرار سے نکاح فرمایا۔ محمد بن اسحاق۔ احمد ابوداؤد اور محمد بن عمر یہ سب حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتی ہیں کہ جویریہ ایک شیریں کلام عورت تھیں، نہایت حسین وجمیل انھیں جو بھی دیکھتا تھا فریفتہ ہو جاتا تھا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک چشمہ پر قیام کے وقت میرے پاس موجود تھے، جویریہؓ آپ کے پاس اپنی کتابت کے متعلق کچھ کہنے کے لئے آئیں پس خدا کی قسم جوں ہی میں نے انکو آتے دیکھا مجھے کھل گیا اور میں نے انکا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنا پسند نہیں کیا کیونکہ مجھے خیال ہوا کہ آپ بھی ان سے وہ چیز دیکھیں گے (یعنی انکا حسن وجمال) جو میں نے دیکھا ہے۔ انھوں نے آکر کہا یا رسول اللہ میں ایک مسلمان عورت ہوں، گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔ میرا نام جویریہ ہے۔ حارث بن ابی ضرار جو اپنی قوم کا سردار ہے اسکی لڑکی ہوں۔ مجھے جو کچھ پیش آیا وہ آپ پر مخفی نہیں چنانچہ ثابت بن قیس ابن شماس اور اسکے بھتیجے کے حصے میں پڑی تھی مگر اس نے اپنے بھتیجے سے کہہ کر مجھے اپنے لئے خاص کر لیا اور مدینہ میں قیام گزیں ہوں۔ اسنے مجھے مکاتب بنایا ہے اتنے مال پر کہ مجھے اسکی ادائگی کی طاقت نہیں اور اسکا ادا کرنا ضروری ہے اور انھوں نے ایک کثیر رقم اس لئے مجھ پر لادی کہ مجھے آپ سے توقع ہے لہٰذا میری مکاتبت میں میری اعانت فرمائیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس سے بڑھکر بات نہ کردوں؟ انھوں نے عرض کیا وہ کیا؟ آپؐ نے فرمایا تمھاری جانب سے بدل کتابت بھی ادا کردوں اور تم سے نکاح بھی کرلوں حضرت جویریہؓ نے کہا یا رسول اللہ اس سے بڑھکر کیا چیز ہے مجھے منظور ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس کو بلوا بھیجا اور ان سے جویریہؓ کو طلب کیا۔ ثابت نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں انکو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی کتابت کی رقم ادا فرمائی اور انکو آزاد کرا کے ان سے نکاح فرمالیا اور لوگوں کی طرف نکلے اس حال میں کہ بنی مصطلق کے سارے قیدی تقسیم کیے جا چکے تھے اور صحابہؓ انکی عورتوں سے انتفاع کے مالک ہو چکے تھے (جب مسلمانوں کو اس تقریب کا علم ہوا تو) سب نے کہا یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرال کے لوگ ہیں لہٰذا سب نے اپنے اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا اور کسی کے پاس انمیں سے کچھ نہیں رہا۔ حضرت عائشہؓ

کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جویریہؓ سے نکاح کرنے کے سبب سے سوگھرانے کی عورتیں آزاد ہوگئیں پس اپنی قوم کے حق میں ان سے بڑھکر عظیم البرکت کوئی عورت نہیں ہوئی۔ محمد بن عمر حرام بن ہشام بن عروہ سے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت جویریہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے تین دن قبل یہ (خواب) دیکھا تھا کہ گویا چاند یثرب سے چل کر میری گود میں آگیا ہے میں نے پسند نہیں کیا کہ اسکی اطلاع کسی کو دوں یہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ پھر جب ہم لوگ قید ہوگئے تو مجھے گمان ہوا کہ اب شاید اس خواب کی تعبیر ظاہر ہو۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آزاد کرایا اور مجھ سے نکاح فرمایا اس وقت بھی خدا کی قسم میں نے اپنی قوم کے بارے میں حضور سے کچھ نہیں کہا یہاں تک کہ مسلمانوں ہی نے خود انکو چھوڑ دیا اور مجھے یہ بات اپنے چچا کی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی سے معلوم ہوئی جب کہ وہ اس واقعہ کو مجھ سے بیان کر رہی تھی پس میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر حافظ بن عابد نے روایت کیا کہ حارث بن ابی ضرار یعنی جویریہؓ کے والد اپنی لڑکی کو چھڑانے کیلئے آئے جب مقام عقیق پر پہونچے تو اپنے ان اونٹوں پر ایک نظر ڈالی جن کو لڑکی کا فدیہ دینے کے لئے لا رہے تھے ان میں سے دو اونٹ جو نہایت عمدہ تھے انھیں دیکھکر جی بھر آیا (انکی جدائی گوارا نہ ہوئی) اس لئے عقیق کی گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی میں اسے چھپا دیا پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا اے محمد تمہارے پاس میری لڑکی ہے یہ اسکا فدیہ ہے (انھیں لیکر میری لڑکی واپس کردو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا اور وہ دونوں اونٹ کہاں ہیں جنھیں تم نے عقیق کی فلاں فلاں وادی میں چھپا رکھا ہے۔ حارث نے یہ سنکر کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ واقعی مجھے ان دونوں میں رغبت تھی اور اسکی اطلاع سوائے اللہ کے کسی کو نہ تھی یہ کہکر مسلمان ہوگئے۔ محمد بن عمر کہتے ہیں کہ ابو سعید کہتے تھے کہ ہمارے پاس انکی جماعت آئی۔ پس انھوں نے بچوں اور عورتوں کا فدیہ ادا اور اپنے وطن واپس چلے گئے۔

فائدہ: ماقبل میں جو قصہ بیان ہوا اس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو قتال سے پہلے اسلام کی دعوت دی اور شیخینؒ نے ابن عون سے روایت کیا ہے وہ کہتے

ہیں کہ میں نے نافع سے لکھکر دریافت کیا کہ کیا قتال سے پہلے دعوت اسلام ضروری ہے انھوں نے جواب دیا کہ یہ شروع اسلام میں تھا اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی مصطلق پر حملہ کیا اور ان لوگوں نے حملہ کا جواب دیا در اں حالیکہ انکے جانور پانی پی رہے تھے پس انکے لڑنے والے قتل کئے گئے اور انکے بچے قید کیے گئے۔ اور اس میں ہے کہ یہ حدیث مجھ سے عبداللہ ابن عمر نے بیان کی جو خود اس لشکر میں موجود تھے۔

ناظرین کرام نے ان روایات کو ملاحظہ فرمایا مزید افادہ کے لئے اس میں بیان کئے ہوئے فوائد مرتب طور پر اختصاراً پیش کرتا ہوں تاکہ ذہن نشین ہو جائے اور لائحہ عمل بنانا آسان ہو۔

یہ ساری روایتیں جو بیان ہوئیں جو سورۂ منافقون کے شان نزول سے متعلق تھیں ان سب کو یکجا کرکے اور اس طرح سے مرتب طور پر ملاحظہ کرنے کے بعد اب آپ کو بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ قرآن شریف سمجھنے کیلئے محض لفظی ترجمہ کافی نہیں ہے بلکہ کسی آیت کی تفسیر کیلئے حدیث کی روایات اور اسکے شان نزول کا علم بھی ضروری ہے ان سب کے جاننے کے بعد تفسیر کی دوسری ہی شان ہو جاتی ہے اور سمجھ میں آتا ہے کہ ترجمہ اور چیز ہے اور تفسیر اور چیز ہے۔ چنانچہ یہی سورۂ منافقوں ہی ہے کہ بہت دنوں سے سمجھتا تھا کہ ایک مخصوص شان رکھتی ہے اور عظیم واقعات پر مشتمل ہے لیکن اب تفسیر کی مراجعت سے معلوم ہوا کہ سبحان اللہ کیا عجیب وغریب سورۃ ہے اس سے متعلق روایات مذکورہ کے دیکھنے سے نفاق اور اخلاص کا مفہوم معلوم ہوا مخلص اور منافق کا مصداق سمجھ میں آیا اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی جاں نثاری اور جاں بازی اور منافقین کی کذب بیانی اور فتنہ پردازی کا مشاہدہ ہوا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن خلق آپ کا تحمل اور چشم پوشی، رعایت اور آپکے معجزات کی ایسی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ بس مومن کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت کی تصدیق میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نیز حضرات صحابہؓ کے حسن ادب اور پر از اخلاص اقوال اور افعال کا ایسا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے کہ انکے دیکھنے کے بعد انسان یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ واقعی حسن ادب تو حضرات صحابہؓ ہی کا حصہ تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت انھیں حضرات کو حاصل تھی

اور انھیں کا حوصلہ تھا کہ ہر موقع پر جادۂ اعتدال پر قائم رہے اور بڑے سے بڑا فتنہ بھی انکے قدم کو صراط مستقیم سے نہ ہٹا سکا۔ اس سورت کے متعلق تفصیلی روایات تو میں نے اوپر بیان کیا ہی ہے اب ان میں مومنین اور منافقین کی صفات یعنی ان کے اقوال اور افعال اور احوال الگ الگ ممتاز طریقہ پر ملاحظہ فرمائیے۔

دیکھئے غزوہ بنی مصطلق میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخلص مسلمانوں کو لیکر ان سے مقابلہ کیلئے تشریف لے گئے تو ساتھ ساتھ بہت سے منافقین بھی نکلے لیکن دونوں جماعتوں کی نیت میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ صحابہؓ اللہ ورسولؐ کے حکم کی اطاعت اور اعلاء کلمۃ اللہ اور تحصیل اجر آخرت کے لئے نکلے تھے لیکن منافقین کی نیت محض حطام دنیا تھی۔ چنانچہ سب سے پہلی چیز یعنی نیت ہی میں جب فتور تھا تو اسکا ثمرہ جیسا کچھ ہوگا معلوم ہے ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ رئیس المنافقین عبداللہ ابن اُبی نے اسی موقع پر اپنی جماعت میں بیٹھکر حضرات مہاجرین صحابہ کے متعلق (بلکہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق) کیسے کیسے سخت کلمات کہے ان پر انفاق سے لوگوں کو منع کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں اپنے کو عزیز کہا۔ بالآخر حضرت زیدؓ ابن ارقم رضی اللہ عنہ جو ایک مخلص صحابی تھے اور اسی مجلس میں موجود تھے انکو اسکے یہ اہانت آمیز کلمات برداشت نہیں ہوئے چنانچہ انھوں نے الٹ کر کہدیا کہ کم بخت تو ہی ذلیل ہے اور بے قدر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عزیز ہیں اور ہم سب کے محبوب ہیں اس پر عبداللہ نے کہا کہ اجی چپ رہو میں تو ہنسی مذاق کی باتیں کر رہا تھا۔ یہ ہے نفاق کہ اپنے مجمع میں ایک بات کہی اور جب یہ معلوم ہوا کہ کوئی غیر بھی تھا تو فوراً بات کو بدل دیا۔ چونکہ زید ابن ارقمؓ نوعمر صحابی تھے اس لئے ان سے تو مذاق ہی کی توجیہ کی لیکن جب یہی سوال اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کہ مجھے ایسی ایسی بات پہونچی ہے کیا تمھیں اسکے صاحب (کہنے والے ہو) تو قسم کھا گیا اور صاف انکار کر دیا اس سے معلوم ہوا کہ منافق انتہائی بزدل اور کم ہمت ہوتا ہے اور نفاق کیلئے یہ ضعف لازم ہے خلاصی کے لئے جھوٹ بول دینا جھوٹی قسم کھا لینا بات بنا دینا اسکے لئے کوئی بات ہی نہیں ہے

اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ ایک بات کہہ کر اسکو نبھادے جہاں ذرا سا اندیشہ اپنے جان و مال یا جاہ کا ہوا بس فوراً بھاگ نکلتا ہے اسکے اسی وصف کا بیان اس آیت میں ہے کہ یَحْسَبُوْنَ کُلَّ صَیْحَۃٍ عَلَیْھِمْ ھُمُ الْعَدُوُّ قَاتَلَھُمُ اللّٰہُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ۔ یعنی یہ ہر غل و پکار کو اپنے ہی اوپر خیال کرتے ہیں اور یہی لوگ دشمن ہیں آپ ان سے ہوشیار رہیئے۔

برخلاف اسکے مخلص کا معاملہ دیکھئے کہ زید بن ارقمؓ نے محض اپنی غیرتِ ایمانی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قلبی تعلق کی بناء پر اسکی اس بات کو آپ تک نقل کر دیا تو گو ابتداءً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا اور آپ کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا چنانچہ زید ابن ارقمؓ سے آپ نے جرح بھی فرمائی کہ تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو شاید تم سے سننے میں غلطی ہو گئی ہو شاید تمھیں کو وہم ہو گیا ہو۔ دیکھا آپ نے ایک مخلص صحابی نے ایک بات پہونچائی اور آپ نے اپنی بصیرت سے سمجھ لیا کہ بات صحیح ہے لیکن زید ابن ارقمؓ پر خفا ہوئے اور زجر فرمایا کہ تم نے کیوں اسکی بات پہونچائی۔ اب اس زمانہ میں اسپر کہیں عمل ہے کہ نمّام کے نمیمہ پر اسکو زجر کیا جائے۔ زجر تو درکنار اس سے خوش ہوتے ہیں اور وہ بھی اسکو ذریعۂ قربت سمجھتا ہے۔ چنانچہ اسی سنت کے ترک کا یہ وبال ہے کہ آج ہمارے ادارے، مراکز و مدارس سب فاسد ہو گئے، الا ماشاء اللہ۔ اسیطرح انصار کی ایک جماعت نے بھی نہایت شدت سے انپر نکیر اور ملامت کی مگر زید بن ارقمؓ نے چونکہ صدق و اخلاص سے یہ بات کہی تھی اس لئے اس سے بدلے نہیں یہی کہتے رہے کہ نہیں میں نے اسکو اپنے کانوں سے سنا ہے اور یہ بھی کہا کہ عبد اللہ ابن اُبی تو کس شمار میں ہے اگر اپنے باپ کی زبان سے بھی اس قسم کے کلمات سنتا تو ضرور پہونچاتا اور یہ بھی کہا کہ گو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری تکذیب فرمادی ہے لیکن مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ پر ضرور آیت نازل فرمادیں گے جس سے میری تصدیق ہو جائے گی۔ اس سے ایک مخلص کی دیانت، صداقت، حمایت اور سچی عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے جس کی منافقین کو ہوا بھی نہیں لگی ہوتی۔

نیز اسی واقعہ میں ایک دوسرے مخلص صحابی حضرت سعد بن عُبادہ یا اسید

ابن حضیر کا فہم اور موقع شناسی اور حدود کی رعایت ملاحظہ فرمائیے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناوقت کوچ فرمایا اور آپ کا گزر انکے پاس سے ہوا تو انھوں نے سلام کے بعد عرض کیا کہ حضورؐ یہ ناوقت سفر کیسا؟ خیریت تو ہے؟ آپ نے فرمایا سنا نہیں تمہارے صاحب نے کیا کہا۔ عرض کیا صاحب کون؟ فرمایا ابن ابی، اسکا یہ خیال ہے کہ مدینہ پہونچکر وہاں سے عزیز ذلیل کو نکال دیگا۔ اس پر حضرت سعدؓ نے جو عرض کیا وہ انکے حسن ادب اور فہم پر دال ہے۔ عرض کیا یا رسول اللہ بالکل ٹھیک ہے انشاء اللہ تعالےٰ آپ ہی اسکو نکال دینگے اور وہی ذلیل و خوار ہوگا کیونکہ عزت اللہ کے لئے ہے اور اسکے رسولؐ کیلئے ہے اور مومنین کیلئے ہے۔ حضرت سعد کا یہ مقولہ بارگاہ ایزدی میں ایسا مقبول ہوا کہ آیت انھیں الفاظ میں نازل ہوگئی۔ اسکے بعد انکی موقع شناسی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ اسکے ساتھ نرمی کا معاملہ فرمائیے۔ انھوں نے پہلے جو کچھ کہا تھا وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کا تقاضا تھا اور نرمی کرنے کے متعلق جو عرض کیا تو خلق خدا کے ساتھ غایت نصح اسکا منشا تھا کیونکہ یہ حضرات مخلص تھے فتنہ پسند نہیں تھے اسلئے واقعی صورت حال آپ کے سامنے پیش کر دیا کہ یہ اپنی قوم کا سردار تھا قوم اسکے سر پر تاج رکھنے ہی والی تھی اسکی تیاری میں صرف ایک موتی کی کسر تھی کہ اسی اثنا میں آپ مدینہ تشریف لے آئے جسکی وجہ سے اسکی ساری آرزو خاک میں مل گئی اور اسکا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا اور اس نے یہ سمجھا کہ گویا آپ نے اسکا ملک ہی چھین لیا اور اسکو یہ امر کھل گیا اس قلق اور ضیق کی وجہ سے کبھی کبھی ایک ٹیس سی اسکے دل میں اٹھتی ہے جس کی بنا پر اس قسم کی ہفوات اور بکواس اور بہکی بہکی باتیں اپنی زبان سے اپنی قوم کے سامنے کہنے لگتا ہے۔ اسلئے یا رسول اللہ اسکو معذور سمجھئے اور اسپر رحم فرمائیے اور نرمی کا معاملہ کیجئے۔

میں جب ان صحابی حضرت سعد ابن عبادہؓ کی اس گفتگو کو سوچتا ہوں تو نہیں کہہ سکتا مجھے کس قدر مسرت ہوتی ہے اور کہتا ہوں کہ اخلاص اسے کہتے ہیں اور مخلص ایسے ہوتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت اور آپکی محبت کا جو تقاضا تھا اسمیں بھی فرق نہیں آنے دیا اور نہایت خوش اسلوبی سے موقع کی ایک بات بھی خدمت اقدس میں پیش فرمادی۔ اور یہ بات کچھ انھیں کے ساتھ خاص نہ تھی صحابی میں سے

ہر مخلص صحابی کا یہی حال تھا چنانچہ عبداللہ ابن ابی کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا حال بھی آپ نے ملاحظہ فرمایا کس قدر جذبہ اور جوش کے ساتھ حضورؐ سے عرض کیا کہ ابن ابی کی ہفوات کے عوض اگر آپ اسکے قتل کا ارادہ رکھتے ہوں تو مجھی کو حکم دیجئے اس کام کو میں ہی انجام دونگا کہ اسکی نوبت ہی نہ آنے پائے کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو لوگوں میں چلتا پھرتا دیکھوں اور مجھے بربنائے بشریت اشتعال ہو جائے اور میں اسے قتل کر بیٹھوں تو ایک مومن کو ایک کافر کے بدلے قتل کر کے اپنا ٹھکانہ جہنم بناؤں۔ باقی آپ کا معاف فرما دینا کہیں افضل واحسن ہے اور آپ کے شایان شان ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ نہیں بھائی میرا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور جب تک وہ ہم میں رہے گا ہم اسکے ساتھ حسن عشرت ہی کا معاملہ کریں گے۔ یہاں بھی حضرت عبداللہ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حضورؐ کو نرم پاکر اپنے باپ کی طرف سے عذر پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضورؐ بات یہ ہے کہ قوم نے اسکو تاج پہنانے کا ارادہ کیا تھا اور انکا خیال تھا کہ اسکو اپنا امیر اور سردار بنائیں کہ اسی درمیان میں اللہ تعالےٰ آپکو یہاں لے آئے اور اسکو وضع فرما دیا اور آپکو رفعت بخشی جس سے اسکی جاہ کو دھکہ سا لگا اور اسکا نفس بھنا اٹھا مگر کر ہی کیا سکتا تھا کوئی طاقت تو تھی نہیں اسلئے اپنی بھڑاس کبھی کبھی اسی قسم کی بکواس سے نکال لیتا ہے۔ اسلئے وہ قابل رحم۔

عبداللہ ابن اُبی کا حال تو آپ نے سنا اب ایک اور منافق کا حال سنیئے! اس نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض ہی کیا تھا اس لئے کہ اعتراض اور انکار۔ طنز اور تمسخر یہ۔ فتنہ وفساد ہی انکا شیوہ تھا۔ اسی سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کھو گئی تھی مخلص صحابہ تو اسکی تلاش میں چاروں طرف حیران و پریشان تھے اور ایک منافق یہ سنکر کہتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو آسمان کی خبریں بتاتے ہیں اتنا نہیں بتا سکتے کہ اونٹنی کہاں موجود ہے۔

دیکھا آپ نے اخلاص ونفاق کا فرق کہ مخلص تو پریشان ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رنج وغم میں شریک ہے اور منافق کے پاس بس یہی وقت تھا اعتراض کرنیکا مگر اسکا انجام یہ ہوا کہ جس طرح ابن ابی کے ہفوات پر صحابہ کو اشتعال ہو گیا تھا اور اللہ تعالیٰ کو بھی اسکی یہ بات بُری لگی یہاں تک کہ اسکی عدم مغفرت کے متعلق آیت ہی نازل فرما دی اسیطرح

سے یہاں مخلصین کو تو اسکی یہ بات بری معلوم ہوئی اور سب نے کہا کہ اے اللہ کے دشمن تو تو منافق ہو گیا۔ اور حضرت اُسید ابن حضیرؓ بولے کہ تیرا یہ کلمہ ہمیں اس قدر ناگوار گذرا کہ اسکا جواب تو بس یہی تھا کہ نیزہ ابھی تیرے پیٹ میں بھونک دیتا مگر تردد صرف اس سے ہے کہ یہ نہیں معلوم کہ میرا یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے مطابق بھی ہوگا یا نہیں۔

علاوہ انکے اور مخلصین نے بھی اسکی ایسی لے دے کی کہ اس مجمع سے جان بچا کر بھاگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر پناہ لی۔ مجھے خیال ہوتا تھا معلوم نہیں اسکا انجام کیا ہوا بعد میں یہ مخلص ہوا یا نفاق ہی پر مر گیا۔ تو اس روایت میں ملا کہ نفاق سے توبہ کی اور مخلص ہو گئے اور واقعہ اسکا یہ ہوا کہ جیسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے حضورؐ پر وحی آئی اور حضور اپنے اصحاب سے یہ فرمانے لگے جس کو یہ بھی سن رہے تھے کہ ایک شخص میری بابت یہ کہتا ہے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، آسمان کی خبریں تو بتاتے ہیں اور زمین کی بات کہ ناقہ کہاں ہے کیوں نہیں بتا دیتے۔ تو بھائی! غیب کی بات تو سوا اللہ تعالیٰ کے کوئی جانتا نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے مطلع فرمایا ہے کہ وہ اونٹ فلاں وادی میں ہے اسکی مہار ایک درخت سے الجھ گئی ہے اسلئے وہ وہیں کھڑی ہے صحابہؓ فوراً اٹھے اور وہاں جا کر دیکھا تو اونٹنی کو اسی ہئیت میں پایا' اسکو لے آئے۔ یہ شخص یہ سب دیکھکر اپنے مجمع میں پھر واپس آیا اور لوگوں سے کہا کہ تم میں سے کس نے میری بات وہاں پہونچا دی سب نے انکار کیا کہ ہم تو یہاں سے اٹھے بھی نہیں۔ اس نے کہا تعجب ہے کہ آپ لوگوں میں سے کوئی وہاں گیا بھی نہیں اور میری بات کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو گیا چنانچہ میں وہاں سے آرہا ہوں، ایسا ایسا واقعہ پیش آیا۔ تو اے لوگو سنو آج صاف کہتا ہوں کہ میں اب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شک میں تھا اب گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آج دل سے مسلمان ہوتا ہوں انکا نام حضرت زید بن صلت تھا رضی اللہ عنہ' اسکے بعد حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے جرم کا اقرار کیا اور آپ سے مغفرت کی درخواست کی۔

اور سنئے! حضرت عبد اللہ ابن عبد اللہ ابن اُبی کے اخلاص و جاں نثاری کا

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ مدینہ کے قریب اپنے باپ کو باہر ہی روک لیا اور کہا کہ خدا کی قسم آپ کو مدینہ میں قدم نہیں رکھنے دونگا جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیدیں گے اور تجھے معلوم نہو جائے کہ ذلیل کون ہے اور عزیز کون ہے چنانچہ بعض روایتوں میں ہے کہ اپنے باپ کے سامنے تلوار کھینچکر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ خدا کی قسم اسکو نیام میں نہیں رکھونگا جب تک تو زبان سے اقرار نہ کرلے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم عزیز ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کا علم ہوا اور آپ اسکے پاس سے گزرے تو وہ یہی کہہ رہا تھا کہ واقعی میں بچوں سے بھی زیادہ ذلیل ہوں، واقعی میں عورتوں سے بھی زیادہ ذلیل ہوں یہ دیکھکر آپ نے عبداللہ سے فرمایا کہ اپنے باپ کو چھوڑ دو۔ اسی واقعہ میں ہے کہ جس وقت عبداللہ اپنے باپ کو روکے ہوئے تھے تو جو مخلص مسلمان پاس سے گزرتے وہ خاموشی سے گزر جاتے تھے کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ اسی قابل ہے لیکن دوسری قسم کے جو لوگ گزرتے تھے تو ابن ابی کی حمایت میں عبداللہ کو ڈانٹتے تھے کہ اپنے باپ کے ساتھ یہ حرکت کر رہے ہو! اب اس واقعہ میں حضرت عبداللہ کی جاں نثاری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچی عقیدت دیکھئے کہ آپ کے مقابلے میں باپ کی بھی پروا نہیں کی اور دوسرے لوگ جو مخلص نہیں تھے انکے سامنے ابن ابی کی حرمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زائد تھی کیونکہ ابن ابی کو تو ملامت نہیں کیا اور عبداللہ کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت فرمارہے تھے انکو نصیحت کرنے لگے حالانکہ ابن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں جو کلمات کہے تھے اسے سنکر مخلص کے سینوں میں ایک آگ سی لگ گئی تھی اور سب مسلمانوں کو انتہائی اشتعال تھا اور یہ بدبخت اتنا متکبر تھا کہ حضرت عبادہ بن صامت نے جب اس سے محض خیرخواہی کی بنا پر یہ کہا کہ ابھی سویرا ہے قبل اسکے کہ تیرے متعلق کوئی آیت نازل ہو تو حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو جا اور آپ سے مغفرت کی درخواست کر آپ دعا فرمائیں گے تیرا سب بگڑا کام بن جائے گا تو اسکے جواب میں غایت تکبر سے اپنے سر کو موڑ لیا یعنی جانا پسند نہیں کیا عبادہؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اللہ تیرے اس طرح سے منہ موڑنے کے بارے میں ضرور قرآن نازل فرمائیں گے جو نماز میں پڑھا جائے گا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جھلا کر کہا کہ تم لوگوں نے مجھ سے ایمان لانے کو کہا میں ایمان لایا پھر مجھ سے مال کی زکواۃ دینے کو کہا میں نے اسے

بھی کیا۔ اب کیا چاہتے ہو بس اب تو یہی باقی رہ گیا ہے کہ محمدؐ کو سجدہ کروں۔

دیکھئے حضرت زید بن صلت سے بھی لوگوں نے کہا تھا کہ حضورؐ کی خدمت میں جا کر اقرار جرم کر دا ور مغفرت کی درخواست کرو، چونکہ ان کے دل میں اخلاص آچکا تھا اسلئے اس بات کو مان لیا اور کامیاب ہوگئے اور وہی مشورہ ابن اُبی کو بھی لوگوں نے دیا تو اپنی شقاوتوں میں سے ایک اور کا بھی اضافہ کر لیا مگر نتیجہ اسکا وہی ہوا کہ پھر اس واقعہ کے بعد سے اپنی قوم سے بھی اسکا وقار ختم ہو گیا اور سب کی نظروں میں ذلیل خوار ہوا لوگ بیان کرتے ہیں کہ سورۂ منافقین کے نازل ہونے کے بعد ابن ابی جب کوئی بات کہتا تو اسی کی قوم اس سے مواخذہ کرتی۔ یہ حشر تو منافق کا ہوا اور مخلص کا مآل یہ ہوا کہ گو انھیں ابتداءً کچھ شرمندگی اور ندامت اٹھانی پڑی اور بعض لوگوں کے طعن و تشنیع سننے پڑے مگر اسکے بعد اللہ تعالےٰ نے سورۂ منافقین نازل فرما دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غایت محبت و شفقت کے ساتھ انکے کان کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے یہ فرمایا کہ صاحبزادے تم نے سچ کہا تھا اور تمھارے کان نے سچ سنا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے اسکی تصدیق فرما دی ہے اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت زید بن ارقمؓ کو اس وقت کیسی خوشی ہوئی ہوگی کہ اللہ بھی خوش رسول بھی ان سے راضی اور جملہ مخلصین کیلئے باعث رشک ہوگئے یہ صلہ انکے صدق و اخلاص کا ان کو اس دنیا میں ملا ولاجر الآخرۃ اکبر۔

اسی طرح سے ان روایات میں ایک روایت حضرت عائشہ کی بھی بیان کی گئی ہے جس میں انھوں نے حضرت جویریہ کے نکاح کا مفصل واقعہ بیان کیا ہے۔ آپ چونکہ ازواج مطہرات میں سے تھیں آپ کے اخلاص کا کیا پوچھنا اسلئے اس واقعہ میں جو حالات بھی پیش آئے اسکو صاف صاف بلا کم و کاست بیان فرمایا۔

چنانچہ شروع میں ہی فرماتی ہیں کہ جویریہ نہایت شیریں زبان اور حسین و جمیل عورت تھیں اپنی کتابت کے لئے گفتگو کرنے کیلئے آئیں پس خدا کی قسم جونہی میں نے انکو دیکھا تو انکا آنا مجھے کھل گیا اور میں نے پسند نہیں کیا کہ حضورؐ کے سامنے جائیں کیونکہ مجھے خیال ہوا کہ آپکی بھی نظر انکے حسن و جمال پر ضرور پڑیگی جسے میں نے دیکھا ہے یہاں تو انکے متعلق یہ کہہ رہی ہیں لیکن آگے فرما رہی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے نکاح فرما

مسلمانوں کی طرف نکلے تو حال یہ تھا کہ بنی مصطلق کے سارے قیدی مرد اور عورت غلام اور باندی بنا کر مسلمانوں میں تقسیم کئے جا چکے تھے لیکن صحابہ کو جب اس تقریب کا علم ہوا تو سب نے یہ کہا کہ اب تو یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرال کے لوگ ہیں انھیں ہم لوگ غلام اور باندی بنا کر کس طرح رکھ سکتے ہیں لہٰذا سب نے اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جویریہؓ سے نکاح کرنے کے سبب سو گھرانے کی عورتیں آزاد ہو گئیں پس اپنی قوم کے حق میں ان سے بڑھکر عظیم البرکت کوئی عورت نہیں ہوئی۔

دیکھا آپ نے یہ ہے اخلاص کہ پہلے جو کلمات ان کے حق میں کہے تھے اسکا منشا غیرت تھا جو عین تقاضائے فطرت تھا اور گو کوئی اسے ظاہر نہیں کیا کرتا لیکن حضرت عائشہ نے اسکو بھی ظاہر فرما دیا باقی اسکی وجہ سے کوئی بُرا اثر یا انکی طرف سے کینہ وحسد دل میں لیکر بیٹھ جائیں ایسا نہیں کیا بلکہ جب موقع انکی تعریف کا آیا تو دل کھول کر تعریف فرمائی کہ اپنے خاندان کے حق میں جتنی بارکت حضرت جویریہؓ ثابت ہوئیں ہم میں سے کوئی بھی نہیں ہوئی انسان میں جب تک انتہائی خلوص نہ ہو ایسے نازک تعلق والے کے متعلق اس قسم کے کلمات کہہ نہیں سکتا

جس طرح سے زید بن صلت کے واقعہ میں بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اونٹنی کے متعلق فرمایا کہ فلاں فلاں وادی میں ہے تو اس سے زید بہت متاثر ہوئے، چنانچہ یہی اخبار سبب بن گیا ان کے مخلص ہو جانے کا اسی طرح اس نوع کا ایک اور واقعہ اس سفر میں پیش آیا اور اسکی وجہ سے بھی حضرت جویریہؓ کے والد جو اب تک مسلمان نہ ہوئے تھے مشرف باسلام ہو گئے۔ مفصل واقعہ گزر گیا ہے حاصل اسکا یہ ہے کہ کہ انھوں نے اپنا دو اونٹ کسی وادی میں چھپا دیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ وہ دو اونٹ کہاں ہیں جنھیں تم نے وادی عقیق میں چھپا رکھا ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ واقعی میں نے ان دو اونٹوں سے محبت کی وجہ سے انھیں چھپا رکھا ہے لیکن یہ معاملہ تو یا میں جانتا تھا یا خدا جانتا تھا اور آپکو جو اسکی اطلاع ہو گئی ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی آپ اللہ تعالےٰ کے رسول ہیں اور یہ کہہ کر مسلمان ہو گئے۔

ان سب واقعات میں آپ نے مخلص اور منافق کے قول اور فعل اور حال کو

ایک دوسرے سے ممتاز طریقہ سے معلوم فرما لیا بس میں یہی چاہتا تھا کہ ہر ایک کی باتوں کو الگ الگ دکھاؤں

اب ایک اور بات جو بیان کرنا چاہتا ہوں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہیں وہ یہ کہ آپ جسے مخلص سمجھ لیتے تھے اسکے ساتھ دوسرے قسم کا برتاؤ کرتے تھے لیکن منافقین کے ساتھ تو آپنے خوش اخلاقی، تسامح، چشم پوشی، اعراض اور حسن عشرت کی انتہا ہی فرمادی ایسی کہ کوئی شخص قادر نہیں کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ اس خندہ پیشانی اور عالی ظرفی کے ساتھ پیش آسکے۔ مثلاً دیکھئے حضرت زید بن ارقمؓ نے عبداللہ ابن ابی کی ایک بات جو نہایت ہی سخت بات تھی آپ کو پہنچائی اس پر روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا چہرہ متغیر ہوگیا اور آپ نے اسکو پسند نہیں فرمایا اس لئے کہ اگر آپ ابھی اس بات پر ذرا سا بھی تاثر ظاہر فرما دیتے تو نہ معلوم کیا سے کیا ہو جاتا منافقین کا تو استیصال ہی ہو جاتا مگر نتیجہ اسکا اچھا نہ ہوتا' مشہور یہی ہوتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ ادھر صحابی مخلص تھے حضورؐ کے تنبیہ فرمانے اور اظہار ناراضگی کیوجہ سے انکی جانب سے بجز خیر کے اور کسی چیز کی توقع نہ تھی اسلئے انکو اپنا سمجھکر آپ نے ان سے تو ناخوشی ہی کا اظہار کیا لیکن عبداللہ ابن ابی سے بھی دریافت فرمایا کہ مجھے ایسی ایسی باتیں پہونچی ہیں کیا اسکے صاحب تم ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بصیرت اور فراست سے سمجھ رہے تھے کہ ضرور اس نے کہا ہے اسی لئے تو اس سے دریافت کیا دریافت اس لئے کیا کہ آپ کے نزدیک وہ متہم ہوچکا تھا اور تہمت اسکو کہتے ہیں کہ کوئی قرینہ کذب پر دلالت کرے بس آپ نے یہاں شرعی ثبوت نہونے کی وجہ سے یقین تو کیا نہیں کیا مگر چونکہ یہ صحابی عادل تھے اس لئے اول وہلہ میں حتمی طور پر تکذیب بھی نہیں فرمائی بلکہ کچھ سوالات کئے اور ابن اُبی کی طرف سے شبہ ہوگیا اس لئے اس سے دریافت فرمایا لیکن جب اس نے انکار کیا اور قسم کھا لیا تو بس پھر آپ نے معاملہ کو یک لخت ختم کر دیا آپ کے اسی طرز عمل کو دیکھکر علماء نے اس سے یہ مسئلہ مستنبط فرمایا کہ سرِ قوم کی ہفوات کی بنا پر ان سے مواخذہ نہیں کرنا چاہیئے صرف عتاب پر اقتصار کرنا چاہیئے اسلئے کہ مواخذہ کی وجہ سے انکے متبعین میں ایک برگشتگی سی پیدا ہو جائے گی اور انکے قسموں کی تصدیق کر لینی چاہیئے اگرچہ قرائن

اسکے خلاف کے قائم ہوں اسلئے کہ اسی میں انکی تانیس و تالیف ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسکے قسم کھا لینے کے بعد اس سے کچھ نہیں کہا۔ باقی اسکا معاملہ جو تیز ہوا تو آیات کے نازل ہو جانے کی وجہ سے کیوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسکے مجرم ہونے کی تصدیق فرمادی اور اسکے اقوال کو نقل فرمادیے تو اب اسکے صحیح ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ مگر جب زید بن ارقم نے عبد اللہ ابن ابی کا مقولہ آپ کو پہنچایا تو آپ نے فوراً اس پر عمل نہیں کیا بلکہ اسکی تحقیق فرمائی کہ خود انہیں سے فرمایا کہ جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو، تم سے سننے میں کچھ غلطی تو نہیں ہوگئی ہے؟ تمھیں اپنی بات میں کوئی شبہ تو نہیں ہوگیا ہے؟ ان سب کے جواب میں انھوں نے عرض کیا کہ نہیں یا رسول اللہ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا اسکے بعد آپ نے عبد اللہ ابن ابی سے نہایت نرمی سے پوچھا کہ مجھے کچھ کلمات پہونچے ہیں اسکے قائل تم تو نہیں ہو۔

دیکھئے بات کتنی سخت تھی اور آپ کا لہجہ کتنا نرم ہے اس سے بڑھکر آپ کے تحمل و ضبط کی کیا مثال ہو سکتی ہے آپ نے اپنے اس طرز عمل سے امت کو یہ تعلیم دی کہ اگر قوم سے اس قسم کی ہفوات (بکواس) کا صدور ہوتا ہی رہتا ہے ان سے شدت سے ساتھ مواخذہ نہیں کرنا چاہیئے تاکہ انکے متبعین برگشتہ نہ ہو جائیں بلکہ صرف لطیف معاتبہ پر اکتفا کرنا چاہیئے اور اگر وہ انکار کریں اور قسم کھائیں تو انکے ظاہر حال کی تصدیق کر لینی چاہیئے اور باطن کو خدا کے حوالہ کر دینا چاہیئے۔

نیز اسی معاملہ میں جب حضرت عمرؓ نے اسکی گردن مارنے کی اجازت چاہی تو آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ اس سزا کا مستحق نہیں ہے بلکہ یہ فرمایا کہ عمرؓ لوگ کیا کہیں گے یہی کہیں گے کہ محمد اپنے اصحاب ہی کو قتل کرا دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جرم تو شدید تھا لیکن اسکی یہ سزا مصلحت کے خلاف تھی اور گو آپ نے ایسے نازک معاملے کو بہت کچھ سنبھالا لیکن بات ایسی تھی کہ آن کی آن میں سارے لشکر میں پھیل گئی اور ہر شخص جوش سے بھر گیا اور بہت سے مخلصین ابن اُبی کے قتل کی گفتگو کرنے لگے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استنے بڑے مجمع کو خلاف مصلحت کسی اقدام کے کر بیٹھنے سے بچانے کیلئے ایک عجیب و غریب انتظام فرمایا وہ یہ کہ اس جگہ سے فوراً کوچ کرنے کا حکم فرمادیا لوگ انتظامات سفر میں مشغول ہو گئے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے ساتھ

سارا دن چلتے رہے حتیٰ کہ شام ہوگئی پھر ساری رات چلتے رہے یہاں تک صبح ہوگئی پھر دوپہر تک چلتے رہے جب دھوپ تیز ہوگئی تب منزل فرمایا لوگ تھکے تو تھے ہی سواریوں سے اترتے ہی لیٹے اور سو گئے اس طور پر آپ نے ایک عظیم فتنہ کو ٹال دیا اور جوش کا وقت گزار دیا۔

اسی سفر سے واپسی میں جب آپ مدینہ کے قریب ہوئے تو بڑی زور کی ہوا چلی صحابہؓ کے بال بچے مدینہ میں تھے بعض کفار سے معاہدے کی میعاد بھی ختم ہو رہی تھی اسلئے لوگوں کو تشویش تھی کہ کہیں ہماری عدم موجودگی میں ہمارے بچوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے اس پر آپ نے بطور پیشین گوئی کے فرمایا کہ مت گھبراؤ تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا اور سن لو کہ مدینہ کی کوئی گلی ایسی نہیں ہے جسمیں حفاظت کے لئے فرشتہ نہ مقرر کر دیا گیا ہو تمہارے پہنچنے سے پہلے کسی کی یہ مجال نہیں کہ اسمیں داخل ہو سکے۔ وہ تو ایک بڑا منافق مرگیا ہے جس کے لئے یہ ہوا چلی ہے۔

عبداللہ ابن اُبی کے لڑکے حضرت عبداللہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو نرمی فرمانے کے لئے عرض کیا جیسا کہ پہلے مفصل بیان ہو چکا ہے لیکن مدینہ کے قریب آکر پھر انھیں جوش آیا اور باپ کے مقولے کو یاد کر کے انھیں کی سواری کو جا روکا کہ جب تک حضورؐ اجازت نہیں دینگے آپ مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہ تو ان کا معاملہ تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جب وہاں سے گزر ہوا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا قصہ ہے لوگوں نے بتایا پس آپ نے عبداللہ سے فرمایا کہ چھوڑ دو بھائی اپنے باپ کو مدینہ جانے دو۔ اس سے آپ کی انتہائی کریم النفسی اور اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی انتہائی رعایت اور نہایت ہی نرم سلوک فرمانے کا حال معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت جویریہؓ کے نکاح کا بھی جو واقعہ پیش آیا اس میں وہ خود بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے تین دن قبل یہ خواب دیکھا تھا کہ گویا چاند یثرب سے چل کر میری گود میں آ گیا میں نے اس خواب کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔ میں کہتا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سے نکاح فرمانا کچھ انکے حسن و جمال کی بنا پر نہیں تھا بلکہ اسی وجہ سے ہوا کہ اس خواب کی تعبیر پوری ہوا اور خود حضرت جویریہؓ کو آپ کی نبوت کی مزید تصدیق ہو جائے اس طرح سے کہ انھوں نے

جو خواب دیکھا تھا اس کا ذکر کسی سے نہ کیا تھا اسکی تعبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پوری ہوئی۔

اسی طرح سے اسکے والد نے دو اونٹ جو چھپا دیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکی خبر دیدینا بھی آپ کا ایک معجزہ ہی تھا جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ فوراً مسلمان ہوگئے۔

دیکھئے! ان تمام واقعات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق کس قدر نمایاں ہے کہ آپؐ اتنے بڑے مخالف کے ساتھ کس قدر صبر اور تحمل اور خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آئے اور یہ تو آپؐ نے وعدہ فرما ہی لیا تھا کہ جب تک وہ ہم میں رہیگا ہم اسکے ساتھ حسن عشرت کا معاملہ کرینگے اسکو تو آپ نے پورا فرمایا ہی علاوہ اسکے ابن اُبی کے مرنے کے بعد بھی آپ نے اسکے ساتھ جو مراعات فرمائیں اسکا ذکر بھی احادیث میں آتا ہے چنانچہ بخاری شریف میں ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ جب عبداللہ ابن اُبی بن سلول کا انتقال ہوا اسکے لڑکے عبداللہ ابن عبداللہ جو کہ ایک مخلص صحابی تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ حضورؐ اپنا ایک کرتا مرحمت فرمائیں اسی میں اپنے باپ کو کفن دینا چاہتا ہوں، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک کرتہ مرحمت فرمایا پھر عبداللہ نے دوسری درخواست یہ کی کہ حضورؐ اسکے جنازے کی نماز پڑھا دیں اسپر حضورؐ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے لیکن حضرت عمرؓ اٹھے اور آپ کا کپڑا پکڑ لیا اور عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ اسکی نماز پڑھیئے گا اللہ تعالےٰ نے تو اسکی نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے انکا اشارہ حق تعالےٰ کے اس ارشاد کی طرف تھا ان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لھم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں مجھے اختیار دیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا ہے کہ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً وسازیدہ علی السبعین یعنی یہ فرمایا کہ اگر تم ستر دفعہ بھی طلب مغفرت کرو تو اللہ تعالیٰ انکو بخشنے والا نہیں تو کیا میں ستر سے زیادہ کروں گا حضرت عمرؓ نے کہا حضور یہ منافق ہے۔ ابن عمر کہتے ہیں کہ بہر حال آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی اسپر اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ولا تصل علی احد منھم مات ابدا ایک دوسری روایت میں خود حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب عبداللہ ابن

ابی کا انتقال ہوا تو حضور کو نماز جنازہ پڑھنے کے لئے بلایا گیا جونہی آپ کھڑے ہوئے میں آپ کے پاس کود کر پہنچا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ کیا آپ ابن اُبی کی نماز پڑھ رہے ہیں حالانکہ اس نے فلاں دن ایسا ایسا کہا ہے میں نے اسکے اقوال شمار کرائے حضورؐ مسکرائے اور فرمایا ہٹو مجھے چھوڑو جب میں نے مزید اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ ہٹو جی اگر میں جانتا ہوتا کہ اگر ستر سے زیادہ استغفار کرونگا تو اسکی مغفرت ہو جائیگی تو میں ضرور زائد بار کرتا حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ بالآخر حضورؐ نے اسکی نماز جنازہ پڑھائی اور لوٹ آئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ سورۂ برارت کی دو آیتیں نازل ہوئیں ولا تصل سے وھم فاسقون تک مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اپنی جرأت پر بڑا تعجب ہوا۔ علماء نے اس واقعہ کو موافقات عمرؓ میں سے شمار فرمایا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکے کفن کے لئے اپنا کرتا دینے کو منع نہیں فرمایا اور نماز کیلئے منع کیا تو اسکی وجہ یہ تھی اگر آپ کرتا دینے سے انکار فرماتے تو یہ آپ کے کرم کے خلاف تھا دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ آپنے اس کے ذریعہ سے اپنے چچا حضرت عباسؓ کا بدلہ اتارا تھا کہ جس وقت وہ بدر میں قید ہو کر آئے تھے تو ان کے بدن پر کوئی کپڑا نہیں تھا اور چونکہ وہ طویل قامت تھے اس لئے کسی کا کپڑا آپ کے بدن پر راست نہیں آتا تھا علاوہ ابن ابی کے کرتے کے بس اس نے آپ کو اپنا کرتا پہنا دیا تھا اسی کا بدلہ دینا آپ کو منظور تھا۔ حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ لوگوں میں آیت کے نزول کے بعد اس قمیص دینے کا چرچا ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میری قمیص اسکو کچھ نفع تھوڑے ہی دیگی خدا کی قسم میں نے تو اس امید پر اسکو قمیص دی ہے کہ شاید اللہ تعالےٰ ہزار سے کچھ زیادہ بنی خزرج کو اسلام کی توفیق عطا فرما دے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپکی امید پوری فرما دی۔ (روح المعانی ص ۱۳۱ پ ۱۰)

اسی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا اندازہ فرمایئے۔ بس اسی پر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں اللہ تعالےٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد والہ واصحابہ اجمعین

نعم الامیر علیٰ باب الفقیر

از افادات

مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

مقدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

حضرت عارف شیرازی سعدی قدس سرہٗ گلستاں باب ہفتم "جدال سعدی با مدعی دربیان تونگری و درویشی" کے خاتمہ پر فیصلہ فرماتے ہیں کہ

مقربان حضرت جل و علا تونگرانند درویش سیرت و درویشانند تونگرہمت ومہین تونگراں آنست کہ غم درویش خورد ومہین درویشاں آنکہ کم تونگراں راگیرد ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ۔

بزرگوں کے ایسے ارشادات وتعلیمات کو قرآن و حدیث سے مدلل کیا گیا ہے اور یہ ایک چھوٹا سا محققانہ رسالہ کراسہ اس باب میں جمع ہو گیا ہے۔ فللہ الحمد

ظہور الحسن غفرلہٗ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

ہم اس وقت ایک مسئلہ تمدنیہ کے متعلق جو تمدن کا بڑا زبردست اور اہم بلکہ تمام تمدنیات میں سب سے بڑھکر ہے اور عقلاء کے نزدیک مسلم اور ضروری بلکہ سب ضروریات سے بڑھ کر ضروری ہے اور جس پر دنیوی ترقی و تنزل کا دار و مدار بھی ہے اور اس قدر ضروری ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے بھی اپنی تعلیمات میں اس کو ضروری قرار دیا ہے، اور جب حضرات انبیاءؑ نے اس کو ضروری قرار دیا تو خدا تعالیٰ کی جانب سے اس کی ضرورت ثابت ہو گئی۔ شرائع نے بھی اس کو مطلقاً ممنوع نہیں فرمایا۔ البتہ اس میں کچھ قیود و شرائط لگائی ہیں۔ نصوص میں جہاں کہیں اس کا بیان ہے انھیں قیود و شرائط کا ذکر ہے۔ ہم اسی حیثیت سے اس پر کلام کرنا چاہتے ہیں۔ اب سنئے:۔

شریعت نے مال کی مذمت بھی کی ہے، اور مدح بھی، اور کسی شئے کی مذمت اور مدح اس کی ذات کی نہیں ہوا کرتی، بلکہ افعال اور اس کے اثرات کی ہوا کرتی ہے۔ شریعت میں جس طرح روبرو مدح کی ممانعت وارد ہے اسی طرح مدح بھی وارد ہے۔ چنانچہ وارد ہے اذمدح المومن فی وجہہ ربا الایمان فی قلبہ اس میں علماء نے تطبیق دی ہے کہ جہاں مدح سے فتنہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو وہاں منع ہے اور جہاں اندیشہ نہیں بلکہ مدح سے اس کے کمال میں ترقی ہوگی وہاں محمود ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جہاں مال کی مذمت ہے، یہ اس وقت ہے جبکہ اس سے ضرر ہو خواہ وقت اکتساب یا بعد اکتساب اور جہاں مدح ہے مثلاً نعم المؤنۃ ھو یا نعم المال الصالح للرجل الصالح جبکہ یہ دونوں ضرر اس پر مرتب نہ ہوں۔ یا یوں کہئے کہ مال طیب کو اس کے صحیح مصرف میں صرف کرنا یہ ممدوح ہے اور اگر مال طیب نہ ہو یا صحیح مصرف میں صرف نہ ہو یہ مذموم ہے۔ اس کے اہل کی مذمت یا مدح اس کی مذمت یا مدح پر مرتب ہے۔ قرآن شریف اور حدیث دونوں میں دونوں قسم کے لوگوں کا بیان ہے۔ اہل اموال اور اغنیاء کی مدح بھی ہے اور ان کی مذمت بھی ہے ان کو صادق بھی کہا گیا ہے اور برعکس بھی چنانچہ ملاحظہ ہو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۔	کچھ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو یا مغرب کو لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتب پر اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنیوالوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی کرتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنیوالے ہوں جب عہد کرلیں اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگدستی میں اور بیماری میں اور قتال میں، یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔ (بیان القرآن) ص ۸۹ ج ۱

نیز ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۔	پورے مؤمن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک نہیں کیا۔ اور اپنے مال وجان سے خدا کے رستہ میں محنت اٹھائی۔ یہ لوگ ہیں سچے۔ (بیان القرآن ص ۳۳ ج ۱۱)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں :-

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۔ الآیۃ	اے ایمان والو خرچ کیا کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیا ہے (بیان القرآن ص ۱۵۱ ج ۱)

نیز فرمایا ہے کہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ، یعنی تم خیر کامل کبھی حاصل نہ کرسکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ کروگے اور جو کچھ بھی خرچ

کرو اور اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں۔ نیز فرمایا کہ:۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ یعنی ان کے مال میں سوالی اور غیر سوالی کا حق تھا۔ ان آیات میں انفاق پر ترغیب ہے۔ اور دوسرے مقام پر مال کی حرص وطمع سے ترہیب بھی ہے چنانچہ ارشاد ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۔	اے ایمان والو اکثر احبار اور رُہبان لوگوں کے مال نامشروع طریقہ سے کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے باز رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرکے رکھتے ہیں اور انکو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو آپ ان کو ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سُنا دیجئے جو کہ اس روز واقع ہوگی کہ ان کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر اُن سے لوگوں کی پیشانیوں اور کروٹوں اور ان کی پشتوں کو داغ دیا جائیگا یہ وہ ہے جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کر کے رکھا تھا۔ سو اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔ (بیان القرآن ص۱۱۱)

اور حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن عاص رضؓ سے فرمایا کہ اے عمرو میں چاہتا ہوں کہ تم کو لشکر پر امیر بنا کر بھیجوں تاکہ اللہ تعالیٰ تم کو مال غنیمت سے مالا مال کردے۔ اور تمھیں سلامتی سے رکھے اور مجھے تمھارے لئے مال میں رغبت صالح ہے۔ حضرت عمرو بن عاص نے عرض کیا یا رسول اللہ میں مال کیلئے مسلمان نہیں ہوا ہوں بلکہ میں نے آپ کی معیت کی خاطر اور اسلام کی خاطر اسلام قبول کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا

یا عمرو نعما بالمال الصالح للرجل الصالح ۔	یعنی مال طیب صالح انسان کے لئے کیا ہی اچھی چیز ہے۔

ف۔ ان کو مال کی طلب نہیں تھی، اخلاص کامل تھا تو مال کی منفعت بیان فرمادی۔

اور ابن ماجہ میں ہے کہ:۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان	حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک میری امت

اناسا من امتی سیتفقھون فی الدین ویقرأون القراٰن یقولون ناتی الامراء فنصیب من دنیاھم ونعتزلھم بدیننا ولایکون ذلک کما لا یجتنی من القتاد الا الشوک کذلک لا یجتنی من قربھم الا قال محمد بن الصباح کانہ یعنی الخطایا (ابن ماجہ)	میں سے کچھ لوگ تفقہ فی الدین حاصل کریں گے اور قرآن پڑھیں گے اور کہیں گے کہ ہم امیروں کے پاس آتے ہیں پس ان کی دنیا سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور اپنے دین کو ان سے بچائے رکھتے ہیں حالانکہ ناممکن ہے جیسا کہ خاردار درخت سے نہیں حاصل کیا جاسکتا مگر کانٹا، اسی طرح ان امراء کے قرب سے نہیں حاصل کیجا سکتی مگر (محمد بن الصباح کہتے ہیں کہ الا کا مستثنیٰ ہے خطایا جس کا

حاصل یہ ہوا کہ ان کے قرب سے خطایا کو کسب کریں گے۔

ف ۔ اس حدیث میں پیشین گوئی ہے کہ دین میں تفقہ کرنے والے ایسے ہوں گے اور حیلے و بہانے بنا کر اپنے کو غیر مجرم قرار دیں گے۔ الحمد للہ کہ حضرت[1] رحمۃ اللہ کا معمول اسی حدیث کے مطابق تھا۔ نیز ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

تعوذوا باللہ من جب الحزن قالوا یارسول اللہ وماجب الحزن قال وادی جھنم یتعوذ منہ جھنم کل یوم اربع مائۃ مرۃ قیل یارسول اللہ ومن یدخل قال اعد للقراء المرائین باعمالھم وان من ابغض القراء الی اللہ الذین یزورون الامراء (ابن ماجۃ)	پناہ مانگو اللہ تعالیٰ سے جب حزن سے صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ جب حزن کیا چیز ہے۔ آپ نے فرمایا جہنم کی ایک وادی ہے جس سے جہنم روزانہ چار سو بار پناہ مانگتی ہے۔ دریافت کیا گیا کہ یارسول اللہ اسمیں کون داخل ہوگا آپ نے فرمایا کہ وہ ان قراء (علماء) کے لئے بنائی گئی ہے جو اپنے عمل میں ریاکار ہیں اور بیشک مبغوض ترین قراء اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو امیروں کی زیارت کرتے ہیں:
وقال المحشی قولہ یزورون الامراء ای من غیر ضرورۃ تلجئھم بھم بل طمعا فی مالھم وجاھھم ولذا قال بئس الفقیر علی باب الامیر ونعم الامیر علی باب الفقیر فان الاول	محشی کہتے ہیں کہ امیروں کی زیارت سے مراد وہ ہے جو بلا کسی شدید ضرورت کے ہو یعنی محض ان کے مال وجاہ میں طمع کی خاطر ہو، اسی واسطے فرمایا ہے کہ بُرا ہے وہ فقیر جو امیر کے دروازے پر ہو، اور کیا ہی اچھا ہے وہ امیر جو فقیر کے دروازے پر ہو اس لئے کہ اول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی طرف مائل ہے

[1] حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲ اور راقم کہتا ہے کہ ہمارے حضرت مصلح الامۃ کا بھی

مشعر بانہ متوجہ الی الدنیا والثانی بانہ متقرب الی الاٰخرۃ (مرقاۃ)	اور ثانی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ آخرت کا تقرب چاہتا ہے۔

جن روایتوں سے یہ معلوم ہوا کہ امراء کے پاس بلاضرورت آنا جانا خالی از ضرر نہیں، اسمیں اس سے ترہیب ہے، اسی طرح ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل دنیا کی مذمت فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ:-

تعس عبد الدینار وعبد الدرھم وعبد الخمیصہ ان اعطی رضی وان لم یعط سخط (مشکوٰۃ)	ہلاک ہو دینار کا بندہ اور درہم کا بندہ اور چادر (لباس) کا بندہ (وہ جو کہ) اگر دیا جائے تو راضی رہے اور نہ دیا جائے تو ناراض ہو۔

نیز اخذ مال کی ایک شرط یہ ہے کہ سخاوت نفس کے ساتھ اس کو قبول کیا جائے اشراف نفس نہ ہو جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے (اخذ المال بسخاوۃ النفس):

عن حکیم بن حزام قال سئلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاعطانی ثم سئلتہ فاعطانی ثم سئلتہ فاعطانی ثم قال یا حکیم ان ھذا المال خضرۃ حلوۃ فمن اخذہ بسخاوۃ نفس بورک لہ فیہ ومن اخذہ باشراف نفس لم یبارک لہ فیہ وکان کالذی یاکل ولا یشبع والید العلیا خیر من الید السفلیٰ (بخاری شریف)	حضرت حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے مجھے عطا فرمایا، پھر میں نے سوال کیا تو آپ نے عطا فرمایا، پھر میں نے سوال کیا تو پھر آپ نے عطا فرما کر فرمایا کہ اے حکیم (دیکھو) یہ مال بہت خوشنما اور شیریں (واقع ہوا) ہے لہذا جو اس کو سخاوۃ نفس (یعنی زہد) کے ساتھ قبول کریگا اس کے لئے تو اسمیں برکت دی جائیگی اور جو شخص اس کو اشراف نفس (یعنی توقع وانتظار) کے ساتھ لے گا تو اس کیلئے اسمیں برکت نہ دی جائیگی اور وہ شخص ایسا ہو جائیگا جو کھائے مگر بھوکے کا بھوکا رہ جائے اور (یہ خوب سمجھ لو کہ) اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔

ف - چونکہ انھوں نے بار بار مال کا سوال کیا تھا اس لئے سوال کی مذمت اور سوال کا سخائے نفس کے خلاف ہونا اور اس مال کا بے برکت ہونا اور حرص کا مزید ہونا وغیرہ بیان فرما کر اولو العزمی واستغنا کا سبق دیا۔

یوں تو وہ آیات وروایات بکثرت وارد ہیں جن میں انفاق کی ترغیب اور مال سے متعلق مفاسد سے ترہیب

ہے لیکن اوپر جن نصوص کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ہمارے مدعا پر کافی دلالت ہے۔ بالخصوص وہ حدیث جس میں سخاوۃ نفس کے ساتھ مال کے اخذ کو مشروط فرمایا ہے، اور اس طریق پر لینے کو خیر و برکت کا سبب قرار دیا ہے اور اشراف نفس کے ساتھ لینے کو سبب بے برکتی کا قرار دیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ یہ شخص ایسا ہو گا جیسے کوئی کھائے اور بھوکے کا بھوکا رہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کی عزت و احترام کو کس قدر محفوظ فرمایا اور یہ فرمایا کہ اس کی عزت اس سے بالاتر ہے کہ وہ ایسی خست و دنائت اختیار کرے۔ چنانچہ ارشاد ہے

لاینبغی للمؤمن ان یذل نفسہ۔ یعنی مومن کیلئے زیبا نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔

حدیث شریف سے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرچشمی اور استغنا کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں مفتاح السنۃ میں ہے کہ:۔

کتب عبدالعزیز بن مروان الی ابن عمر ان ارفع الیّ حاجتك فكتب اليه ابن عمر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول ان اليد العليا خير من اليد السفلىٰ وابدأ بمن تعول ولست اسئلك شيئًا ولا اردّ رزقًا رزقنيه الله منك۔ (مفتاح السنۃ صـ۳۹)

عبدالعزیز بن مروان نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لکھا کہ اپنی حاجات کو مجھ سے بیان فرمایا کیجئے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان کو اس کے جواب میں لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے اور یہ فرماتے تھے ان لوگوں سے ابتدا کرو جو تمہاری کفالت میں ہوں (لہٰذا) میں تم سے کسی چیز کا سوال نہ کروں گا۔ باقی اس رزق کو جسے اللہ تعالیٰ مجھے تمہارے ذریعہ سے دلائیں رد بھی نہ کروں گا۔

اس واقعہ سے حضرات صحابہؓ کے استغنا کا پتہ چلتا ہے۔ سبحان اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوبی ملاحظہ فرمائیے کہ ان کی کایا ہی پلٹ دی۔ اس استغنا کی کوئی انتہا ہے جو ان صحابی کو حاصل تھی۔ یہی حالت تمام کی ہو گئی تھی، توکل، قناعت، استغنا عن غیر اللہ کی دولت سے سب مشرف ہو گئے تھے، ایک طرف تو لوگوں کو حرص و طمع و دست نگری سے منع فرما کر سب کو غیور بنا دیا اور دوسری طرف اہل اموال کے لئے انفاق کے فضائل و برکات جو ان کو دونوں جہان میں ملنے والے تھے بیان فرمایا جس سے انفاق مال ان کے لئے نہایت سہل اور اس میں بطوع و رغبت کافی سے زیادہ حصہ لینے لگے اور اس کے مواقع تلاش کرنے لگے۔ ؎

جود محتاج است خواہد طالبے ہم چناں توبہ کہ خواہد تائبے

اور ان کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کو ایسے طریقہ سے خرچ کرنا چاہیئے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل ہو سکے اور یہ سمجھ میں آ گیا تھا کہ مال فتنہ کی چیز ہے اور اس سے پناہ انفاق میں منحصر ہے۔

اس مجموعی تعلیم کا یہ نتیجہ ہوا کہ امراء طالب اور غرباء مطلوب ہو گئے، امراء ان کے پیچھے پیچھے دوڑتے تھے اور یہ منہ نہ لگاتے تھے۔ یہ تماشا بھی کس قدر عجیب تھا کہ امیر غریب اور غریب امیر تھا۔

قرآن پاک میں تزہیدی مضامین اور نیز سنت میں بکثرت موجود ہیں سلف صالح اس پر عامل تھے اور نہایت سختی کے ساتھ عامل تھے اور ہر دور میں ایسے لوگوں کی کثرت تھی۔ ان کی تعلیمات و ارشادات کے برکات اوراق کتب میں موجود ہیں۔

سچے علماء اور مشائخ کا فرض رہا ہے کہ اس کی تفریق کرتے رہیں کہ ان کے زمرہ میں کون صادق ہے اور کون کاذب، اور اپنے لوگوں کو اہل مذمت سے (یعنی جن کی مذمت وارد ہے) بچاتے رہیں کہ وہ ضرر مال سے دنیا و عقبیٰ میں محفوظ رہیں، اور اس کے منافع دونوں جہان میں حاصل کرتے رہیں اور اولٰئک هم المفلحون کا مصداق بن جائیں۔

قرآن و حدیث پر عمل اور مشائخ کی مساعی کا نتیجہ اور خاص کر باب اموال میں ان کی سچی تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مال کی مطلوبیت و محبوبیت مسلمانوں کے دلوں سے نکل گئی اور اس کی محبت سے سب پاک صاف ہو گئے مسلمانوں کے پاس مال بہت ہوا مگر دل محبت سے خالی رہے۔ دل کھول کر اور اللہ کے لئے خرچ کیا۔ اور اللہ و رسول سے اپنی مدح کرالی۔

یہ دور بھی جو دور ضلالت اور دور الحاد و زندقہ کہلانے کا مستحق ہے مگر علماء ربانی اور مشائخ حقانی سے خالی نہیں رہا، ان کی خدمات منصۂ شہود پر جلوہ گر ہیں۔ سب کو معلوم ہیں مشاہد ہیں مگر اس وقت ہم حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ کی خدمات جلیلہ بالخصوص استغناء از اہل اموال و امراء خاص شان کی بیان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے تعلق اور اللہ تعالیٰ پر توکل جو اہل اللہ کاملین کی شان ہوا کرتی ہے ہویدا اور ظاہر و باہر تھی جو انکار کی گنجائش نہیں رکھتی، جو ان سے صحیح طور سے منتسب ہیں اور جنھوں نے خلوص کے ساتھ وہاں آمد و رفت رکھی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ حضرتؒ کا قدم اس میں کس قدر راسخ تھا اور زہد و قناعت، توکل میں سیر سلف صالحؒ کے نمونۂ کامل تھے۔ دنیا اور اہل دنیا ہیچ نظر آتے تھے۔ طبیعت نہایت غیور واقع ہوئی تھی اور اپنے متوسلین میں یہ غیرت دیکھنا چاہتے تھے۔ اور اس کے خلاف پر طبیعت کسی طرح راضی نہیں ہوتی تھی۔ یہ فطری امر بن گیا تھا

بلکہ علماء و مشائخ وعامۂ مومنین میں بھی اس کو چاہتے تھے اسی لئے ہدایا و تحائف کے باب میں بہت کچھ معمولات تھے۔ دین کی عزت اور اہل دین کی عزت نظروں میں پھرتی تھی اور چاہتے تھے کہ دین اور اہل دین معزز ہوں اہل دین مطلوب اور دوسرے طالب ہوں، ان کی تصانیف اس تعلیم سے مملو ہیں جس کا جی چاہے ملاحظہ فرمائے سر مو خلاف نہ پائے گا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا معمول جو ہدیہ کے متعلق تھا کہ ہر شخص کا ہدیہ قبول نہ فرماتے تھے بلکہ مخلص اور غیر مخلص میں فرق فرماتے تھے۔ مخلص صادق سے قبول فرماتے اور دوسروں سے نہیں۔ تو اس مسئلہ میں بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا معمول سنت سے ماخوذ تھا۔ چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاویٰ میں اس مسئلہ پر مفصل بحث لکھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس کا ہدیہ قبول فرماتے تھے۔ اور کس کا نہیں۔ اس کا اقتباس ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:۔

روایات دربارہ قبول ہدیہ متعارض ہیں۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان سے ہدیہ قبول فرمایا ہے اور بعض سے پتہ چلتا ہے کہ نہیں قبول فرمایا۔ علماء کے اقوال ان کی وجہ توفیق میں مختلف ہیں۔

چنانچہ ابو جعفر ہندوانی نے ان دونوں میں وجہ توفیق یہ بیان فرمائی کہ آپ نے اس شخص سے قبول نہیں فرمایا جس کے متعلق آپ کو یہ خیال ہوتا کہ یہ شخص یہ سمجھتا ہے کہ میری یہ ساری کوشش اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے نہیں بلکہ (معاذ اللہ) تحصیل مال کیلئے ہے اور اس قسم کے لوگوں کا ہدیہ اس زمانہ میں بھی قبول کرنا جائز نہیں ہے۔ اور جن روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہدایا مخالفین قبول فرماتے ہیں تو یہ وہاں تھا جہاں آپ یہ سمجھتے تھے کہ یہ شخص یہ جانتا ہے کہ میری مساعی صرف اس لئے ہیں کہ دین کا اعزاز ہو اور اعلاء کلمۃ اللہ ہو۔ آگے فرماتے ہیں کہ اور اس قسم کے لوگوں سے ہدیہ قبول کرنا آج بھی جائز ہے۔

اور بعض لوگوں نے ان کی تطبیق یوں دی ہے کہ آپ وہاں قبول فرماتے تھے، جہاں یہ سمجھتے تھے کہ اس کی وجہ سے اس کے ساتھ معاملہ میں نرمی اپنی صلابت اور عزت میں کمی کرنی پڑے گی، اور جہاں اس سے اطمینان ہوتا تھا قبول فرماتے تھے (امداد الفتاویٰ تتمہ رابعہ ص؟)

ف ۔ ہدایا کے قبول و رد میں کیا عمدہ اور ضروری تحقیق ہے حرز جان بنانے کے قابل ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سارے قواعد و ضوابط کی اصل یہی حدیث ہے۔

اب اس کے بعد ہم تتمیماً للفائدہ احیاء العلوم سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ بیان

فرمایا ہے اس کا کچھ اقتباس ذکر کرتے ہیں۔ بیان معنی اخوۃ فی اللہ کے ذیل میں فرماتے ہیں :-

الا انه یمتحن الحب بالمقابلة بحظوظ النفس

مگر یہ کہ محبت کا امتحان نفس کے حظوظ کے ساتھ مقابلہ کرنے ہی سے ہوا کرتا ہے (یعنی اگر محبت کل حظوظ نفس ترک کرادے تو محبت کامل ہے اور بعض حظوظ ترک کرائے بعض نہیں تو محبت ناقص ہے)

وقد یغلب [illegible] لا یبقی للنفس حظا الا فیما هو [illegible] المحبوب وعنه [illegible] قول من قال ؎

[illegible] غالب آجاتی ہے کہ نفس کے لئے کوئی دوسرا حظ [illegible] نہیں رہتا سوا اس کے کہ جس میں محبوب کا حظ ہو، اسی کو شاعر نے اس شعر میں ادا کیا ہے کہ:-

ارید وصاله ویرید هجری
فاترك ما ارید لما یرید

میں تو اس کے وصال کو چاہتا ہوں اور وہ میرے فراق کو چاہتا ہے
لہٰذا میں اپنے ارادہ کو اسکے ارادہ کی خاطر ترک کرتا ہوں

کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق
ترک کام خود گرفتم تا بر آید کام دوست

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از وغیر او تمنائے

وفیه من قال وما لجرح اذا ارضاکم الم وقد یکون الحب بحیث یترك به بعض الحظوظ دون بعض کما تسمح نفسه بان یشاطر محبوبه فی نصف ماله او فی ثلثه او فی عشره فمقادیر الاموال موازین المحبة اذ لا یعرف درجة المحبوب الا بمحبوب یترك فی مقابلته فمن استغرق الحب جمیع قلبه لم یبق له محبوب سواه فلا یمسك لنفسه شیئا مثل ابی بکر

اور اس قول میں بھی یہی مضمون ہے جو زخم کہ سلے محبوب تم کو راضی کرے وہ موجب الم نہیں اور کبھی محبت ایسی ہوتی ہے کہ اس کے سبب آدمی صرف بعض ہی حظوظ کو ترک کرتا ہے اور بعض کو نہیں مثلاً یہ کہ اس کا نفس اسپر راضی ہو کہ محبوب کو صرف اپنے آدھے مال یا تہائی یا اس کے دسویں حصہ میں شریک کریگا تو اموال کی مقدار محبت کی ترازو ہے (یعنی جتنی مقدار کہ محبوب کے لئے صرف کی اتنی ہی محبت ہے اس لئے کہ کسی محبوب کا درجہ اس کے مقابلہ میں کسی دوسری شئے کے ترک کرنے ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ جس شخص کے پورے قلب میں کسی کی محبت سما جائے اس کیلئے بجز اپنے محبوب کے کوئی دوسرا محبوب نہ رہ جائے گا پس وہ اپنے لئے کچھ بھی نہ رکھے گا مثلاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں کہ

الصدیق فانه لم یترك لنفسه اهلاً ولا مالاً فسلم ابنته التی هی قرۃ عینه وبذل جمیع ماله۔

آپ نے اپنے نفس کے لئے نہ اہل کو چھوڑا نہ مال کو حتیٰ کہ اپنی صاحبزادی کو جو کہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا اور اپنا سارا مال آپ کے لئے صرف کر دیا۔

ف ۔ لوگ اس واقعہ سے سبق لیں کہ مشائخ وعلماء کے لئے کیا کیا کہتے ہیں ؎

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

اور مرید کے لئے تو سچے اور جھوٹے ہونے کا خوب معیار اور بہترین کسوٹی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان اخوۃ میں حُب کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ اول یہ کہ کسی سے محبت اس کی ذات کی بنا پر ہو یعنی اس سے کسی دوسرے محبوب کا واسطہ سمجھ کر نہ محبت کرتا ہو دوسرے یہ کہ کسی سے اس لئے محبت ہو کہ وہ اس کے دیگر محبوبات ومطلوبات (دنیویہ) کا واسطہ بنتا ہے اس کے بعد تیسری قسم یہ بیان فرماتے ہیں :۔

القسم الثالث ان یحبه لا لذاته بل لغیرہ وذلك الغیر لیس راجعاً الی حظوظه فی الدنیا بل یرجع الی حظوظه فی الاٰخرۃ فهذا ایضاً لا غموض فیه ۔ وذلك کمن یحب استاذہ وشیخه لانه یتوسل به الی تحصیل العلم وتحسین العمل ومقصودہ من العلم والعمل الفوز فی الاٰخرۃ فهذا من جملة المحبین فی الله ۔ وکذلك من یحب تلمیذہ لانه یتلقف منه العلم وینال بواسطته رتبة التعلیم ویرقی الی درجة التعظیم

تیسری قسم یہ ہے کہ کسی سے انسان کو اس کی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی دوسری وجہ سے محبت ہو اور اس غیر کا مآل حظوظ دنیویہ نہ ہوں بلکہ حظوظ اخرویہ ہوں، پس اسمیں بھی کوئی پوشیدگی نہیں ہے۔

اور اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے کسی شخص کو اپنے استاذ یا شیخ سے محبت ہوتی ہے تو وہ اس لئے کہ وہ استاذ اس کے لئے تحصیل علم اور تحسین عمل کا ذریعہ ہوتا ہے اور اس کا مقصود علم سے آخرت کی کامیابی حاصل کرنا ہے لہٰذا یہ شخص بھی منجملہ محبین فی اللہ کے ہے۔

اور اسی طرح جو شخص اپنے شاگرد سے اس لئے محبت کرتا کہ وہ اس سے علم حاصل کرتا ہے اور یہ اس کی وجہ سے تعلیم کا مرتبہ حاصل کرتا ہے اور آسمانوں میں درجہ تعظیم کو پہنچتا ہے اسلئے

فی ملکوت السماء اذ قال عیسیٰ صلی اللہ علیہ وسلم من علم وعمل وعلّم فذلک یدعیٰ عظیما فی ملکوت السماء ولایتم التعلیم الا بمتعلم فھو اذاً آلۃ فی تحصیل ھذا الکمال فان احبہ لانہ آلۃ لہ اذ جعل صدرہ مزرعۃ لحرثہ الذی ھو سبب ترقیہ الیٰ رتبۃ التعظیم فی ملکوت السماء فھو محب فی اللہ۔ بل الذی یتصدق باموالہ للہ ویجمع الضیفان ویھیئ لھم الاطعمۃ اللذیذۃ الغریبۃ تقرباً الی اللہ فاحب طباخاً لحسن صنعتہ فی الطبخ فھو من جملۃ المحبین فی اللہ

کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جو شخص علم سیکھے اور عمل کرے اور دوسروں کو سکھلائے تو وہ آسمانوں میں عظیم کے (لقب) سے پکارا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ تعلیم بغیر متعلم کے نہیں ہوسکتی، پس طالب علم ہی اس کے لئے اس کمال کی تحصیل کا آلہ ہوا تو اگر اس سے اس لئے محبت کرتا ہے کہ وہ ذریعہ ہے کیونکہ اس نے اپنے سینہ کو اس کے لئے کھیتی قرار دے رکھا ہے جو کہ آسمانوں میں اس کے رتبہ عظیم تک پہونچنے کا ذریعہ ہے لہذا یہ محب فی اللہ سے ہے۔ بلکہ جو شخص اپنے اموال کو اللہ کے لئے صدقہ کرتا ہے اور مہمانوں کو جمع کرتا ہے اور ان کے لئے لذیذ کھانے تیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے پس باورچی سے محبت کرتا ہے اس کے اس صنعت میں اچھے ہونے کی وجہ سے پس وہ محبین فی اللہ ہے

دیکھئے حضرت امام تصریح فرماتے ہیں کہ باورچی سے محبت اس کے اچھے پکانے کی وجہ سے ہے مگر حب فی اللہ ہے۔ کیونکہ یہ بواسطہ تقرب الی اللہ ہے

وکذا لو احب من یتولیٰ لہ ایصال الصدقۃ الی المستحقین فقد احبہ فی اللہ

ایسے ہی جو شخص کسی کو ایصال صدقہ کا متولی کردے وہ اس سے محبت کرے تو یہ حب فی اللہ ہے۔

ف ۔ اس پر آج کل کے معترضین غور کریں۔

بل نزید علی ھذا ونقول اذا احب من یخدمہ بنفسہ فی غسل ثیابہ وکنس بیتہ وطبخ طعامہ ویفرغہ بذلک للعلم او العمل ولیس مقصودہ من استخدامہ فی ھذہ الا الفراغ

بلکہ ہم اس پر زیادتی کرکے کہتے ہیں جب کہ وہ دوست رکھے اس شخص کو جو اس کی خدمت کر رہا ہے اس کے کپڑے دھونے میں اور گھر کے جھاڑو دینے میں اور کھانا پکانے میں تاکہ اس کو علم وعمل کے لئے فارغ کردے اور مقصود اس کا ان اعمال میں اسکی خدمت کرنے سے اس کا عبادت کے لئے فارغ

للعبادۃ فھو محب اللہ ۔	کرنا ہے۔ پس وہ بھی محب فی اللہ ہے ۔

ف ۔ یہاں بھی ملاحظہ ہو اوپر کا فائدہ ۔

بل نزید علیہ ونقول اذا احب من ینفق علیہ من مالہ ویواسیہ بکسوتہ وطعامہ ومسکنہ وجمیع اغراضہ التی یقصدھا فی دنیاہ ومقصودہ من جملہ ذلک الفراغ للعلم والعمل المقرب الی اللہ فھو محب فی اللہ فقد کان جماعۃ من السلف تکفل بکفایتھم جماعۃ من اولی الثروۃ وکان المواسی والمواسیٰ جمیعاً من المتحابین فی اللہ	بلکہ ہم ترقی کرکے کہتے ہیں کہ دوست رکھے اس شخص کو جو اس پر مال خرچ کرتا ہے اور لباس سے اسکی مواسات کرتا ہے اور طعام سے اور مسکن سے اور تمام اغراض دنیوی سے اور مقصود اس کا اس تمام میں اس کا فارغ کرنا ہے علم اور عمل کے لئے جو مقرب الی اللہ ہے ۔ یہ بھی محب فی اللہ ہے ۔ ایک جماعت صاحب ثروت کی سلف کی کفالت کرتی تھی اور مواسی اور مواسیٰ دونوں متحابین فی اللہ ہیں ۔ (یعنی مخلص تھے) **ف** ۔ اس میں تو حد کر دی اب تو معترضین

چادر سے منہ چھپالیں ۔

بل نزید علیہ ونقول من نکح امرأۃ صالحۃ لیتحصن بھا عن وسواس الشیطان ویصون بھا دینہ اولیولد منھا لہ ولد صالح یدعولہ واحب زوجتہ لانھا اٰلۃ الیٰ ھذہ المقاصد الدینیۃ فھو محب اللہ (احیاء العلوم ص۱۶۳ ربع العادات)	بلکہ ہم اور زیادتی کرکے کہتے ہیں کہ جس شخص نے کسی نیک عورت سے نکاح کیا تاکہ اسکی وجہ سے شیطانی وساوس سے محفوظ رہے اور اس کے ذریعہ اپنے دین کو بچائے تاکہ اس سے اس کے لئے کوئی ولد صالح پیدا ہو جو اس کے لئے دعا کرے اور اپنی بیوی سے اس لئے محبت کرتا ہے کہ وہ اس کے لئے ان دینی مقاصد کی تحصیل کا ذریعہ ہے تو وہ بھی محب فی اللہ ہے

ف ۔ دیکھئے بیوی بھی حب فی اللہ سے خالی نہ رہی ۔ اس نے تو سب شبہات کا قلع قمع کر دیا ۔

بس اسی پر مضمون کو ختم کرتا ہوں ۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ ۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ

النعم علیٰ خیر الامم

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

النعم علیٰ خیرالامم

(اُمّتِ محمدیہؐ پر انعامات)

اللہ تعالیٰ نے امم سابقہ پر بہتیرے انعامات فرمائے ہیں جنکو بطور امتنان کے قرآن پاک میں جا بجا ذکر فرمایا ہے۔ منجملہ ان کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل پر جو انعامات فرمائے ہیں ان میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں بیان فرماکر اپنا احسان جتلایا ہے۔

کماقال اللہ تعالیٰ۔ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ○

(اور وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ رہائی دی ہم نے تم لوگوں کو (یعنی تمہارے آباء واجداد کو) متعلقین فرعون سے جو کہ تمہاری آزاری کے فکر میں لگے رہتے تھے گلے کاٹتے تھے تمہاری اولاد ذکور کے اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس واقعہ میں ایک بہت بڑا امتحان تھا تمہارے رب کی جانب سے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنے ایک خاص برتاؤ کو جسکو ان کے آباؤ اجداد کے ساتھ فرمایا تھا یاد دلایا ہے اور بطور امتنان کے ذکر فرمایا ہے۔ قصہ اس کا یوں ہوا کہ کاہنوں نے یہ پیشین گوئی کردی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جسکے ہاتھوں تیری سلطنت جاتی رہے گی اس لئے اس نے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرانا شروع کردیا اور چونکہ لڑکیوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا اس لئے ان سے کچھ تعرض نہیں کیا اور اسلئے بھی کہ ان سے طرح طرح کی خدمات لیتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس تکلیف ومصیبت سے تمکو نجات دیا۔ یہ کتنا بڑا اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرے مستقل احسان کا ذکر فرمارہے ہیں اور یاد کرنے کا حکم فرمارہے ہیں۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○

(یعنی اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ شق کردیا ہم نے تمہارے راستہ دینے کی وجہ سے دریائے شور کو پھر ہم نے ڈوبنے سے بچالیا) تمکو اور غرق کردیا متعلقین فرعون کو (مع فرعون کے) اور تم اس کا معاینہ کر رہے تھے۔

یہ قصہ اس وقت ہوا جبکہ موسیٰ علیہ السلام پیغمبر ہو گئے اور مدتوں فرعون کو سمجھاتے رہے جب کسی طرح نہ مانا تو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو خفیہ لیکر یہاں سے چلے جاؤ راستہ میں سمندر ملا اور اسی وقت فرعون مع لشکر کے آپہونچا حق تعالیٰ کے حکم سے دریا شق ہوگیا اور بنی اسرائیل کو راستہ مل گیا۔ یہ تو پار ہو گئے فرعون کے پہونچنے تک دریا اسی طرح رہا اور وہ بھی تعاقب کی غرض سے اندر گھس گیا اسوقت سب طرف سے پانی سمٹ کر دریا اپنے حال سابق پر ہوگیا۔ اور فرعون و فرعونی سب وہاں ہی ختم ہو گئے۔

تفسیر مظہری میں بنی اسرائیل کے نجات اور فرعون کے غرق کا قصہ تفصیل سے مذکور ہے اخیر قصہ یہ ہے کہ فرعون نے جب دریا کو پھٹا ہوا دیکھا (یعنی اس میں بارہ راستے بنے ہوئے دیکھے) تو اپنے لوگوں سے بطور فخر کے) کہنے لگا کہ یہ اس لئے ایسا ہے کہ اپنے بھاگے ہوئے غلاموں کو پکڑ لوں۔ فرعون ایک سیاہ گھوڑے پر سوار تھا اور فرعونیوں کے پاس صرف گھوڑے ہی تھے۔ کوئی گھوڑی نہ تھی حضرت جبرئیل علیہ السلام گھوڑی پر سوار ہوکر تشریف لائے اور دریا میں گھس گئے۔ فرعون کے گھوڑے نے جبرئیل علیہ السلام کی گھوڑی کی بو محسوس کرلی اور اس کے پیچھے دریا میں گھس گیا اور فرعونی جبرئیل علیہ السلام کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ اور فرعون کو اس کے کسی امر پر ذرا بھی قدرت و اختیار نہ تھا (کہ دریا میں جانے سے اپنے گھوڑے کو روک سکے۔ حالانکہ اپنے کو انا ربکم الاعلیٰ کہتا تھا اور خدائی کا دعویٰ کرتا تھا) حتیٰ کہ سب گھوڑے اس کے پیچھے دریا میں گھس گئے اور حضرت میکائیل علیہ السلام ایک گھوڑے پر سوار ہوکر فرعونیوں کے پیچھے پیچھے ہو لئے اور سب کو ہانکنے لگے اور یہ فرمانے لگے کہ چلو اپنے ساتھیوں سے مل جاؤ یہانتک کہ سب دریا میں داخل ہو گئے (جب سب کے سب دریا میں آگئے تو جو راستے بنی اسرائیل کے لئے بنے تھے برابر ہو گئے اور سب اسی دریا میں ڈوب کر مر گئے۔

حضرت والا نے فرمایا کہ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے اس قصہ کو یاد دلایا ہے کہ تم کو غرق کرنے سے بچا لیا اور تمہارے دشمن کو تمہارے سامنے غرق کر دیا۔ یہ کتنی بڑی نعمت اور مسرت کی چیز ہے۔ یہ بھی مستقل ایک احسان ہے اس لئے کہ اعداء کی ہلاکت اور تکلیف و مصیبت کو دیکھ کر قلب کو خوشی ہوتی ہے۔ نیز اور بہت سے احسانات و انعامات خاصہ کو یاد دلایا ہے تاکہ یہ لوگ ایمان اور اعمال صالحہ اختیار کریں۔

اب سنئے کہ کوئی بھی معجزہ اور کرامت اور انعام ایسا نہیں ہے جو پہلے انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کو دیا گیا ہو اور وہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور امت محمدیہ کو نہ دیا گیا ہو۔ آپ کو اپنے اکابر کی سیرت معلوم نہیں ہے اور نہ معلوم کرنے کی فکر ہے اس لئے جب ان آیات کی تلاوت کرتے ہیں تو ان احسانات کو بنی اسرائیل کے ساتھ خاص سمجھتے ہیں اور اپنے کو ان آیات کا مخاطب سمجھتے ہی نہیں تو بھلا کیا اثر لیں گے اور اپنے حالات پر کیسے مطابق کرینگے۔ حالانکہ قرآن شریف میں جتنی بھی آیات ہیں سب پر عمل کرنے اور اس سے اثر لینے کا قاری قرآن مکلف ہے۔

اسی طرح ہمارے اکابر اور متقدمین کے ساتھ جو انعامات من جانب اللہ ہوئے ہیں ان کو یاد کرنے اور مستحضر رکھنے کے ہم لوگ بھی مکلف ہیں۔ یہ کیسے روا ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل پر جو انعامات ہوئے ان کے یاد رکھنے کے وہ تو مامور ہوں اور امت محمدیہ کے ساتھ اسی قسم کے احسانات و انعامات ہوں تو یہ لوگ اس کے ممنون نہ ہوں۔

آپ لوگوں کے سامنے چند واقعات بیان کرتا ہوں جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ پر کس قدر انعامات فرمائے ہیں۔

سنئے۔ مسلمانوں کے واسطے ہر ہر موقع پر اس طرح تائیدات آسمانی ظہور پذیر ہوتی تھیں کہ غیر مسلم اقوام ان کو دیکھ کر متحیر رہ جاتے تھے۔ حضرت عقبہ کو ملک افریقہ کے مختلف سفروں میں ایک دفعہ ایک ایسے مقام پر قیام کا اتفاق ہو گیا جہاں پانی کا نام و نشان دور دور تک نہ تھا مسلمانوں کو پیاس کا غلبہ ہوا اور قریب تھا کہ سب کے سب ہلاک ہو جائیں۔ حضرت عقبہ نے یہ حالت دیکھی تو سخت مضطرب ہوئے اور سب سے بہتر تدبیر یعنی رجوع الی اللہ کی طرف جو مسلمانوں کی اصلی علامت و خصوصیت ہے متوجہ ہو گئے۔ دو رکعت نماز پڑھ کر بارگاہ خداوندی میں تضرع درازی سے دعا شروع

کی. آپ فارغ نہ ہوئے تھے کہ آپ کے گھوڑے نے سُم سے زمین کو کریدنا شروع کر دیا اور زمین کے اندر سے ایک صاف پتھر ظاہر ہوا جس میں سے فوراً پانی نکلنا شروع ہو گیا۔ حضرت عقبہ نے آواز بلند اسکی اطلاع لشکر کو دی۔ مسلمان چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور سب نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور گڈھے کھود کر پانی کو جمع کیا اس روز سے یہ مقام "ماء الفرس" کے نام سے موسوم ہو گیا۔

کہنے کے لئے تو یہ معمولی بات ہے کہ گھوڑے کے پیر مارنے سے زمین کے اندر سے چشمہ ظاہر ہو گیا لیکن جو لوگ ایمان راسخ رکھتے ہیں اور مذہب کے آثار و تاثیرات سے واقف ہیں جو اس بات پر ایمان لا چکے ہیں کہ اسباب کے احاطہ سے خارج بھی کوئی اور ایسی زبردست قوت ہے جسکے اشارہ پر اسباب حرکت کرتے ہیں۔ جو انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور خرق عادات کے ظہور کو ممکن الوقوع جانتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ واقعہ بالکل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزہ کے مشابہ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے :۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۝ (ترجمہ) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ (علیہ السلام) نے پانی کی دعا مانگی اپنی قوم کے واسطے اسپر ہم نے حکم دیا کہ اپنے اس عصا کو فلاں پتھر پہ مارو پس فوراً اس سے پھوٹ نکلے بارہ چشمے۔

فرق اتنا ہے کہ اس کا ظہور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ہوا اس لئے اسکو معجزہ کہتے ہیں اور اس کا ظہور حضرت عقبہ کی دعا سے ہوا جو نبی نہیں ہیں اسلئے اس کا نام کرامت ہو گیا۔

دوسرا واقعہ دریا کے خشک ہونے کا سنیئے :۔

دارین پر حملہ کرنے کے واسطے جہازوں اور کشتیوں کی ضرورت تھی اور مسلمانوں کے پاس اس قسم کا سامان بالکل نہ تھا۔ مگر حضرت علاء ایسے شخص نہ تھے جنکو سمندر کی ھیبتناک صورت ڈرا دیتی آپ نے لشکر اسلام کو جمع کر کے خطبہ پڑھا اور فرمایا کہ دشمنوں کی جماعتیں اور مغرورین کے گروہ اس خلیج دارین میں جمع ہو گئے ہیں تم لوگ خشک میدان میں خدائے تعالیٰ کی تائید اور امداد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو تم کو اسی قسم کی امداد اور تائید کی توقع دریا میں بھی رکھنی چاہیئے۔ تم سب دریا میں داخل ہو جاؤ اور دشمن پر حملہ کرو۔ مسلمانوں نے جواب دیا کہ دھنار میں جو تائید غیبی کا کرشمہ ہم دیکھ چکے ہیں

اس کے بعد ہم کسی چیز سے نہ ڈرینگے۔ اس گفتگو کے بعد حضرت علاؓ مع لشکر کے سمندر کے کنارے پر پہنچ گئے اور آپ مع لشکر کے یہ دعائیہ کلمات پڑھتے ہوئے سمندر میں داخل ہوگئے۔

یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ یَا کَرِیْمُ۔ یَا حَلِیْمُ۔ یَا اَحَدُ یَا صَمَدُ یَا حَیُّ یَا مُحْیِ الْمَوْتٰی یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ یَا رَبَّنَا۔

کوئی اونٹ پر سوار تھا کوئی گھوڑے پر کوئی خچر پر کوئی گدھے پر۔ اور بہت سے پیادہ پا تھے۔ سمندر کا پانی خشک ہوکر اسقدر رہ گیا کہ اونٹ اور گھوڑے کے صرف پیر بھیگتے تھے اسلامی لشکر ایسے راحت اور آرام سے ہولناک دریا کو طے کر رہا تھا گویا بھیگے ہوئے ریتے پر چل رہا ہے (جس پر چلنا نہایت ہی سہل ہوتا ہے) دارین میں کسی کو یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ مسلمان بغیر جہازوں اور کشتیوں کے اس طرح دریا کو پاپیادہ طے کر کے آپہنچیں گے۔ وہ غافل تھے مسلمان وہاں پہنچ گئے اور دارین مسخر ہوگیا۔ خدائے تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کی دعا کو قبول فرمایا اور دریا میں ان کے لئے سہل اور آرام دہ راستہ بنادیا۔ ابھی بے آب وگیاہ میدانوں میں غیبی تائیدوں کا کرشمہ دیکھ لیا تھا اس سے بڑھکر سمندر کو پایاب کر کے دکھلادیا کہ دین اسلام کے ساتھ تائید الٰہی بھی شامل ہے۔

اس قصہ میں سمندر کا خشک ہوجانا تو دیکھ لیا اب حشرات الارض اور سباع کی اطاعت صحابہ کے فرمان کی ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت عقبہ بن نافع فہری کو امیر معاویہؓ نے افریقہ کا عامل مقرر فرمایا اور حضرت عقبہ نے افریقہ کا اکثر حصہ کو فتح کر لیا۔ قوم بربر جو اصلی باشندے اس ملک کے تھے ان میں بہت سے قبائل مسلمان ہوگئے تھے اور وہ بھی حضرت عقبہؓ کے ساتھ ممالک افریقہ کی فتح میں شریک تھے لیکن مسلمانوں کے لئے کوئی مستقل چھاونی نہ تھی جس جگہ ان کا بالاستقلال قیام ہوتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جب امیر افریقہ وہاں سے فارغ ہوکر مصر کو واپس آتے تو مسلم بربر بھی مخالفوں کے ساتھ کھڑے ہوکر سب عہد وپیمان توڑ ڈالتے اور جو مسلمان وہاں موجود ہوتے ان کو تباہ کرنے میں کچھ کسر نہ رکھتے۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت عقبہ نے فرمایا کہ مناسب موقع پر چھاونی ڈال دیجائے جہاں ہر وقت عساکر اسلامیہ موجود رہیں اور غربی افریقہ کو ایک مستقل صوبہ قرار دیدیا جائے۔ لیکن اس غرض کے لئے جس موقع کو پسند فرمایا وہاں دلدل اور گنجان جنگل اور گھنے درخت تھے کہ آدمی یا بڑے جانور تو درکنار سانپوں کو بھی

ان درختوں سے ہو کر نکلنا دشوار تھا یہ جنگل درندوں اور ہر قسم کے موذی اور زہریلے جانوروں کا مسکن تھا۔ ایسی سرزمین میں آدمی کی بود و باش تو کیا گذرنا بھی خطرناک امر تھا۔ مگر صحابہ رضوان اللہ علیہم کا ہر ایک ارادہ باذن اللہ ہوتا تھا ان کے فعل میں مقبولیت کے آثار نمایاں ہوتے تھے وہ جو کچھ کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر کرتے تھے مسلمانوں نے اس جگہ کو قیامگاہ بنانے میں جو خطرے تھے ان کو ظاہر کیا حضرت عقبہؓ نے ان مصلحتوں کا اظہار فرمایا جو اس جگہ کو منتخب کرنے میں پیش نظر تھیں اہل اسلام کے نزدیک بھی مصلحتیں قابل لحاظ ثابت ہوئیں اور حضرت عقبہؓ کی رائے ان کو راجح معلوم ہوئی۔ اس لشکر میں اٹھارہ صحابی موجود تھے حضرت عقبہؓ امیر لشکر سب کو جمع فرما کر اس میدان میں لے گئے اور حشرات و سباع کو خطاب فرمایا۔

ایتھا الحشرات والسباع نحن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فارحلوا فانا نازلون۔ فمن وجدناہ بعدُ قتلناہ +

(ترجمہ) اے درندو اور موذی جانورو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اس جگہ آباد ہونا اور قیام کرنا چاہتے ہیں تم یہاں سے چلے جاؤ اور قیام کرنا چھوڑ دو اسکے بعد ہم جسکو دیکھیں گے قتل کر دینگے۔

یہاں پر حضرت والا نے فرمایا کہ۔ یہ بھی حضرت عقبہؓ کی بہت بڑی کرامت تھی کہ ان کی اس آواز کو اتنے زبردست طویل وعریض جنگل میں اللہ تعالیٰ نے ہر ہر درندے اور حشرات کے کانوں تک پہونچا دیا یہ بالکل اس واقعہ کے مشابہ ہے کہ بدر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی کنکری لیکر پھینکی اور اللہ تعالیٰ نے اسے تمام اعداء کی آنکھوں میں پہونچا دیا۔

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔ (ترجمہ) آپ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے وہ پھینکی۔

اور حضرت عقبہؓ کا یہ فرمانا کہ اس کے بعد ہم جسکو دیکھیں گے قتل کر دینگے اس کا یہ مطلب ہے کہ اسے حشرات و سباع چونکہ ہم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تم پر ہماری اطاعت لازم ہے۔ اسلئے تم چلے جاؤ اور اطاعت اختیار کرلو ورنہ تم باغی وحربی قرار دیئے جاؤ گے اور حربی سے قتال کا حکم ہے اس وجہ سے ہم تم کو قتل کریں گے) اس آواز میں معلوم نہیں کیا تاثیر تھی کہ سب حشرات اور درندوں میں ہلچل پڑ گئی وہ اسی وقت جلا وطن ہونے کے واسطے تیار ہو گئے جماعتیں کی جماعتیں وہاں سے نکلنی

شروع ہوگئیں شیر اپنے بچوں کو اٹھائے ہوئے بھیڑیئے اپنی اولاد کو لئے ہوئے۔ سانپ اپنی سپولیوں کو کمرے چمٹائے ہوئے نکلے چلے جاتے تھے۔ یہ ایک عجیب ہیبتناک و تعجب انگیز منظر تھا جو نہ اس سے قبل کہیں دیکھا گیا نہ کسی کے وہم و گمان میں تھا۔ یہ یقینی امر ہے کہ اس حالت میں جبکہ درندے اور سانپ وغیرہ اس طرح بکثرت پھیلے جاتے ہوں کوئی شخص قریب کھڑا بھی نہیں ہوسکتا چہ جائیکہ ہزاروں آدمی تماشائی اس حالت کو دیکھنے کیواسطے کھڑے ہوں۔ مگر سب جانتے تھے کہ اس وقت یہ کسی نہایت بڑے قاہر حکم کے مسخر اور تابع ہوئے جاتے ہیں دوسرے کو ان سے کیا اندیشہ ہوسکتا ہے۔ انکو اپنی جان بچانی بھاری پڑ رہی ہے اسلئے بے تکلف ہزاروں مخلوق تماشا دیکھ رہی تھی۔ قوم بربر جو اس ملک کے اصلی باشندے اور اس جنگل کی حالت اور خطرات سے بخوبی واقف تھے ان حالات کو اپنی آنکھ سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ کیا یہ بات ممکن تھی کہ حقانیت اسلام کی ایسی روشن دلیل کو دیکھنے کے بعد بھی وہ باطل پرستی پر قائم رہتے اسی وقت ہزارہا بربری صدق دل سے ایمان لے آئے اور اسلام کے حلقہ بگوش غلام بن گئے۔

(اشاعت اسلام)

اسکے علاوہ اور بہت سے واقعات جو حیرت انگیز و عبرتناک ہیں اور تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں۔ ان کی صحت پر دلائل قائم ہیں اب انکا وہی شخص انکار کرسکتا ہے جو تاریخ عالم پر بلا حجت و دلیل یک لخت پانی پھیرنیکے واسطے تیار ہو جائے۔ ان سب واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ دریا و حشرات الارض اور خونخوار درندوں و جانوروں پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی حکومت تھی۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ یہ سب ان حضرات کے ایمان اور اعمال صالحہ اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور بھروسہ کا نتیجہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگئے تھے اسلئے دینی اور دنیوی سب کرامات و انعامات سے ان کو فائز فرما دیا تھا اور ایسی عزت و وقار عطا فرمایا تھا کہ اسکی مثال نہیں ملتی۔ آج آپ بھی وہ اعزاز و مرتبہ اپنے لئے چاہتے ہیں اور من و سلویٰ کے طالب ہیں مگر ایمان و طاعت اختیار نہیں کرتے۔ آپ محض دنیا کے لئے چاہتے ہیں اور وہ لوگ جو کرتے تھے اللہ کیلئے کرتے تھے۔ آپ بھی ایمان اور عمل صالح اختیار کریں پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

میں نے قصداً اس آیت کی تفسیر میں تفصیل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کو کچھ سمجھ میں آجائے۔ ایسا نہ ہو کہ جیسے پہلے تلاوت کر کے گذر جاتے تھے اب بھی ویسے ہی گذر جائیں۔ خوب سمجھ لیجئے۔

۷۸۶

النعم علی خیر الامم

(امت محمدیہ پر انعامات)

(۲)

وَاِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

(ترجمہ) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اپنی قوم سے کہ اے میری قوم بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اپنے اس گوسالہ کی تجویز سے سو تم اب اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو پھر بعض آدمی بعض آدمیوں کو قتل کردیہ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ تمہارے خالق کے نزدیک پھر حق تعالیٰ تمہارے حال پر متوجہ ہوئے بیشک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کرلیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں)

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کی تفسیر نہایت عمدہ کی ہے جو مجھے بہت پسند ہوئی اسکا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ امید کہ ناظرین کرام کو نفع ہوگا۔

فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے از راہ مزید شفقت و غمخواری کے فرمایا کیونکہ ہر شخص کو اپنی قوم سے تعلق اور نسبت ہوتی ہے اور ان کے امراض کے علاج کو اپنے مرض کے علاج کی طرح سمجھتا ہے اور اگر قوم اپنے باطنی امراض سے بیخبر ہوتی ہے تو ان کو لطف و عنایت سے اس کے مرض پر آگاہ کرتا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یَا قَوْمِ اے میری قوم شفقت قومی کا یہی تقاضا ہے کہ تمہارے باطنی مرض اور اس کے علاج سے تم کو باخبر کردیا جائے پس سن لو کہ یقیناً تم نے گوسالہ بناکر اپنی جانوں پر خود ہی ظلم کیا ہے کیونکہ سامری نے جو گوسالہ قبطیوں کے زیورات سے بنایا تھا تم نے بھی اس میں امداد پہونچائی تھی۔ نیز گوسالہ کو دیدہ و دانستہ اپنا معبود بنانا اور اس میں

الٰہ کے حلول کا اعتقاد کرنا گویا اس بات کا دعویٰ کرنا ہے کہ ہم نے خود ہی اپنے معبود میں جان ڈالی ہے۔ پس اب تم ہی بتاؤ کہ ایک ایسی چیز جسکو تم نے خود گڑھا ہے اور وہ درجہ میں فرعون وہامان سے بدرجہا پست اور مرتبہ الوہیت سے بہت دور ہے اسکو الوہیت و معبودیت سے کیا مناسبت و رابطہ ہوسکتا ہے۔ یہ سنکر قوم نے کہا کہ اچھا تو پھر کیا کیا جاوے کہ اس ظلم سے خلاصی ہو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ یعنی اپنے قالب تراش جناب حضرت حق جل شانہ کی طرف متوجہ ہو تاکہ اس ظلم سے تم کو بری فرمائے۔ باری کے معنی اصل میں قلم وغیرہ کے تراشنے والے کے ہیں۔ اس مقام میں اسمائے الٰہیہ میں سے اسی اسم کو اس لئے اختیار فرمایا کہ انھوں نے خدائے تعالیٰ کی قالب تراشی کے مقابلہ میں اپنے کو خدا کا قالب تراش بنالیا۔ اور إِلَىٰ بَارِئِكُمْ کی قید کی زیادتی میں اس بات کی جانب اشارہ بھی ہے کہ توبہ ازراہ ریا نہ ہونی چاہیئے اسلئے کہ توبہ بسوئے خدا وہی ہوتی ہے جو تہ دل سے ہو۔ اگر اظہار توبہ صرف زبان سے ہو تو یہ توبہ بسوئے خلق ہوگی نہ کہ بسوئے خالق۔

فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ پس اپنے کو قتل کرو یعنی قتل کرنے کے لئے پیش کرو اور اپنی جانوں کو اپنے قالبوں سے جدا کرو تاکہ تمہارے اس جریمہ کا کفارہ ہوسکے کیونکہ تم نے جان تزویر اپنے تراشے ہوئے قالب میں داخل کیا اور اسکو اپنا معبود بنالیا لہٰذا اسکے بدلے میں اپنی حقیقی جان نکالو۔ اور اپنے کو معرض تلف میں ڈالنا ہر چند کہ عقل کے نزدیک ظاہر نظر میں بہت قبیح امر ہے۔ لیکن ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ۔ یعنی یہ امر عظیم تمہارے قالب تراش کے نزدیک بہت بہتر ہے اسلئے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تم کو اس سے کامل محبت ہے یہانتک کہ اس کی راہ میں اپنی جان دے دی، نیز اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اسکی قالب تراشی اور جان آفرینی کو تم نے تسلیم کر کے اسکی تصدیق کی اور اسی کے حکم سے اسکی امانت کو واپس کردیا۔ اسی محبت و انقیاد کے سبب آخرت کے عذاب دائمی سے تکو نجات نصیب ہوگی۔ دنیا کی تکلیف چاہے جتنی بھی سخت ہو آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں تو بہت ہی کم ہے بلکہ متناہی کو غیر متناہی سے نسبت ہی کیا ہے۔ یہ سن کر بنی اسرائیل نے طریق توبہ کو بخوشی منظور کرلیا اور موسیٰ علیہ السلام نے ان کے سامنے شرائط اور طریق قتل پیش فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اس سے عدول کرے گا اسکی توبہ قبول نہ ہوگی اسکو

بھی انھوں نے تسلیم کیا۔ ان میں تین قسم کے لوگ ہو گئے تھے۔ ایک گروہ نے تو گوسالہ پرستی ہی کی تھی۔ ایک نے گوسالہ پرستی تو نہ کی تھی مگر ان پر انکار بھی نہیں کیا تھا۔ تیسری جماعت نے گوسالہ پرستی بھی نہ کی اور انکار بھی کیا۔ پہلی دونوں جماعتوں کے قتل کا حکم ہوا تھا تیسری جماعت میں بارہ ہزار آدمی تھے ان سے موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ شمشیر برہنہ لیکر ان دو جماعتوں کے قتل کے لئے نکلیں اور ان کو اپنے گھروں کے باہر گوٹ مار کر سر گھٹنوں پر رکھ کر بیٹھنے کا حکم فرمایا۔ اس کے بعد خود ایک بلند جگہ پر کھڑے ہو کر ان سے فرمایا کہ :-

یا معشر بنی اسرائیل ان اخوانکم اتوکم شاہرین سیوفھم یریدون ان یقتلوکم فاتقوا اللہ واصبروا۔ (ترجمہ) یعنی اے بنی اسرائیل تمہارے بھائی تمہارے پاس اپنی تلواروں کو سونتے ہوئے آئے ہیں تاکہ تم لوگوں کو قتل کریں سو تم لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور صبر اختیار کرو۔

جب انھوں نے قتل کرنا چاہا تو دیکھا کہ اس میں ہمارے بھائی بھتیجے۔ دوست و اقارب موجود ہیں پس شفقت جبلی مانع ہوئی اور قتل کرنے میں ان کے ہاتھ کام نہیں کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ایک سیاہ دھواں ان پر بھیجدیا جسکی وجہ سے اندھیرا چھا گیا۔ کچھ نظر نہ آتا تھا انھوں نے قتل کرنا شروع کر دیا۔ صبح سے شام تک ستر ہزار آدمی قتل ہو چکے تو ان کی عورتیں اور بچے فریاد کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے برہنہ سر ہو کر بارگاہ الٰہی میں دعا کی۔ ارشاد باری عزوجل ہوا کہ قاتلین و مقتولین سب کی توبہ قبول ہو گئی۔ جو لوگ قتل کئے گئے وہ مرتبہ شہادت سے مشرف ہوئے اور جنھوں نے قتل کیا وہ گناہ سے پاک کر دیئے گئے۔

تفسیر مظہری میں اس مقام پر اس طرح لکھا ہے کہ جب بہت سے لوگ قتل ہو چکے تو حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام رونے لگے اور تضرع کرتے ہوئے بارگاہ خداوندی میں عرض کرنے لگے کہ اے رب العزت بنی اسرائیل تو ہلاک ہو گئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے وہ سیاہ بدلی ہٹادی اور حکم ہوا کہ قتل بند کر دیں۔

الغرض بنی اسرائیل اس توبہ شاق کو بجالائے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَتَابَ عَلَیْکُمْ یعنی جب تم نے یہ کام کر لیا تو تمہاری توبہ قبول ہو گئی۔ اگرچہ تمہارا گناہ آل فرعون کے گناہ سے زیادہ سخت تھا اس لئے کہ تم لوگوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا اس کے باوجود بھی حق تعالیٰ نے تمہاری

توبہ قبول فرمایا۔ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۔ یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ توبہ کے قبول کرنے میں مبالغہ فرماتے ہیں یہانتک کہ اس امر ناشائستہ پر بھی توبہ قبول فرمالیا حالانکہ آل فرعون کو اس سے کم پر معذب فرمایا حدیث شریف میں وارد ہے کہ جب بندہ کسی گناہ سے صدق دل سے توبہ کرتا اور نادم ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکی توبہ قبول فرماتے ہیں اگرچہ دن میں ستر بار اس گناہ کا مرتکب ہوا اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہیں کہ ایک ساعت کی اذیت کے تحمل پر کرامت ابدی عنایت فرماتے ہیں۔

بنی اسرائیل کی یہ توبہ ایک عمدہ ہدایت تھی جو کہ محق و مبطل کے درمیان فارق ہوئی۔ اور ان کے قدماء نے باوجود اتنی مشقت کے اس ہدایت کو کمال بشاشت کے ساتھ قبول کیا۔ مگر بنی اسرائیل ہی کی ایک جماعت جو اس کلام کے مخاطب اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر ہیں محض زبان سے بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ اس شریعت کی سہل عبادت کو کثرت فضائل کے باوجود قبول کرتے ہیں۔ یہ بھی کفران نعمت ہی ہے اور اس آیت میں بنی اسرائیل ہی کو نہیں بلکہ تمام امت ہی کو خبردار کرنا مقصود ہے کہ توبہ و ندامت سے جی نہ چرائیں کیونکہ امت موسویہ باوجود انتہائی مشقت کے بھی اس توبہ پر دل و جان سے تیار ہوگئی۔ اور اس سے انکار نہیں کیا اور تم لوگوں سے تو ہیں نے صرف ندامت ہی طلب کیا ہے اسی پر اکتفا کیا گیا ہے اگر اسے بھی چھوڑ دو اور اتنا بھی نہ کرو تو بہت بعید ہے۔

(تفسیر عزیزی ص۲۱۳ پ ۱)

سنیئے اس آیت کے مخاطب جسطرح وہ بنی اسرائیل ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں موجود تھے اسی طرح ان کے علاوہ جملہ امت محمدیہ بھی ہیں اس میں دونوں ہی جماعتوں کے لئے تازیانہ عبرت و نصیحت ہے۔ بنی اسرائیل سے یہ کہا جارہا ہے کہ تمہارے آباء و اجداد ایسے تھے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انکے سامنے حکم الٰہی پیش فرمایا اور طریق توبہ متعین فرمادیا تو باوجود اتنی مشقت کے اسکو قبول کرلیا اور حکم خداوندی کے مطیع و منقاد ہوگئے اور تم لوگ ایسے ہو کہ صرف زبان سے بھی توبہ نہیں کرتے اور شریعت محمدیہ کو باوجود اسہل و ایسر و کثیر الفضائل ہونیکے قبول نہیں کرتے اور مومنین کو اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ امم سابقہ کی شرائع میں بڑی بڑی سختیاں تھیں یہانتک کہ ان کی توبہ بدون قتل کے قبول نہ ہوتی تھی اور تمہارے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عامہ کے طفیل منجانب اللہ ہر طرح کی سہولتیں اور آسانیاں دیگئی ہیں اور تمہاری توبہ صرف ندامت مقرر کیگئی ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت اور عین لطف و کرم ہے اب اگر ہم اتنا بھی نہ کریں اور اپنے معاصی و نافرمانیوں پر نادم تک نہ ہوں تو بہت ہی تعجب کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ کی شفقتوں اور نعمتوں کی انتہائی ناشکری و ناقدری ہوگی جسکی بناپر ہم بھی اپنے نفوس پر ظلم کرنیوالے ٹھہریں گے اور مستحق عقوبت ہوں گے۔ نعوذ باللہ منہا۔

طریقۂ اصلاح

از افاضات

مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

طریقۂ اِصلاح

فرمایا کہ میں جو کہا کرتا ہوں کہ یہ فساد کا زمانہ ہے تو گو اس کی تفصیل مشکل ہے تاہم لوگوں کے خطوط سے مجھے زمانہ کے حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ ورنہ تو ہم لوگ ایک گوشہ میں پڑے ہوئے ہیں ہم لوگوں کو کیا پتہ چلے۔ اب ان حالات میں لوگ آ کر مجھ سے کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں چلو۔ میں کہتا ہوں کہ بھائی یہیں ایک ہی جگہ اطمینان کے ساتھ رہ لیں اور اپنی عزت و آبرو بچالیں یہی غنیمت ہے۔ کہیں اور جا کر کیا کریں گے۔ سوائے اس کے کہ کسی فتنہ میں پڑجائیں اور یہ اس لئے کہ یہ سمجھتا ہوں کہ لوگوں کو ہم مولویوں پر اطمینان نہیں ہے گو سب لوگ ایسے نہ ہوں گے مگر بعض تو ضرور ایسے ہیں۔ اب یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ ہم تو آپ لوگوں کا اعتبار کریں اور آپ کی طرف سے مطمئن رہیں اور یہ سمجھ کر کہ یہ سب ہمارے مسلمان بھائی ہیں آپ کے سامنے قرآن پڑھیں، حدیث پڑھیں، بزرگوں کے حالات بیان کریں۔ مگر آپ لوگ ہمارا اعتبار تک نہ کریں اور ہماری جانب سے مطمئن کبھی نہ ہوں۔ اسی کا نام فتنہ ہے۔

میں نے ایک دن بیان کیا تھا کہ ہمارا معاملہ اور ہمارا فیصلہ اب عوام کے ہاتھ میں ہوگیا ہے اور یہ بھی کہا تھا کہ دوسری جگہوں میں تو امتحان لینے والا امتحان دینے والے سے زیادہ قابل ہوتا ہے اور یہاں علماء و مشائخ کو وہ لوگ فیل اور پاس کرتے ہیں جن کو علم و عمل سے ذرا بھی مس نہیں ہوتا۔

یہ مولوی صاحب بیٹھے ہیں کہہ رہے تھے کہ میں نے یہ مضمون ایک صاحب کو سُنایا سُن کر ہنسے۔ یہ خیال کیا ہوگا کہ ٹھیک تو کہہ رہے ہیں۔ آج یہی حال ہوگیا ہے۔

میں خیال کرتا تھا کہ آخر ہمارا کام خراب کہاں سے ہوا۔ تو حالات زمانہ کے دیکھنے سے سمجھ میں یہی آیا کہ کام یہاں سے بگڑا کہ جو لوگ مقتدا اور پیشوا تھے اُن کو تابع بنالیا گیا ہے۔ کوئی

عالم ہو، واعظ ہو، امام ہو ان سب کو لوگ اپنا تابع دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے ان کو خرید لیا ہے۔

وطن میں ایک دفعہ ایک چودھری نے کچھ اعتراض کیا میں نے اس سے کہا کہ چلو نماز پڑھاؤ وہ پیچھے ہٹا میں نے کہا کہ نماز تو تمھیں پڑھانی ہوگی۔ بس بید کی طرح ہلنے لگا۔ ایک نماز نہیں پڑھا سکے مگر علماء پر حکومت جتانے کو تیار۔ میں نے کہا کہ تم چودھری ہو تو اپنی چودھرائی مسجد سے باہر چلاؤ اور دُنیوی امور میں چلاؤ۔ مسجد میں اور دینی معاملہ میں کیوں چلاتے ہو۔ کیا یہ ضروری ہے کہ جو کوئی دُنیوی اعتبار سے چودھری اور قوم کا رئیس ہو تو وہ دین میں بھی سردار ہو جائے۔ دین سے مس نہیں۔ وضو کے سنن و فرائض تم نہ جانو۔ نماز کے فرائض تک کا تم کو علم نہیں مگر علماء پر حکومت کرنے کے لئے تیار رہو۔ میں نے یہ بھی کہا تھا ہم تمھاری رعایت کریں گے رعایت کا شریعت میں حکم ہے لیکن تم کو بھی شریعت کا پابند رہنا ہوگا۔ ہر جگہ کا یہی حال ہے۔ اسی سے سمجھ میں آیا کہ آج ہماری خرابی کا یہی سرچشمہ ہے ایک جگہ میں نماز پڑھاتا تھا ایک دن مجھے کچھ دیر ہو گئی کچھ ایسی زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی تھی ابھی اور دوسرے نمازی بھی نہیں آئے تھے ایک چودھری صاحب اُس دن اتفاق سے مسجد میں پہلے آگئے تھے۔ میں جب مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ لوگوں کو بڑبڑا رہے تھے کہ مولوی مولانا لوگ ہیں مگر نماز میں ابھی تک نہیں آئے۔ تکبر کی وجہ سے ایسا کہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا یہ کہنا پسند نہیں آیا دوسرے دن سے اس کو یہ سزا ملی اور ایسی بے توفیقی شامل حال ہو گئی کہ روزانہ فجر کی نماز میں پچھڑنے لگا۔ ایک دفعہ لوگوں سے کہنے لگا کہ ہم بوڑھے ہو گئے ہماری کوئی تعظیم نہیں کرتا۔ میں نے کہا کہ کیوں ہو گئے ہو جوان ہو جاؤ۔ اور میں نے کہا کہ ہاں بوڑھوں کی تعظیم کا بیشک شریعت میں حکم ہے مگر عالم کی تبجیل کا بھی تو حکم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مَنْ لَمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا وَ لَمْ یُبَجِّلْ عَالِمِنَا فَلَیْسَ مِنَّا یعنی جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے اور ہمارے علماء کی توقیر و احترام نہ کرے تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اس میں جس طرح سے بڑوں کی تعظیم کا حکم ہے اسی طرح چھوٹوں پر رحم کرنے اور علماء کی تعظیم و تکریم کرنے کا بھی حکم ہے اب کوئی شخص نہ تو اپنے چھوٹوں پر رحم کرے نہ علماء کی توقیر کرے اور صرف دوسروں سے اپنی تعظیم چاہے تو یہ تو صحیح نہیں ہوگا۔ انسان کی تعظیم خود اس کے ہاتھوں میں ہے تم نے خود اپنی تعظیم کھو دی۔

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ علماء کو لوگ تابع کر لینا چاہتے ہیں بلکہ کر لیا ہے اسی کا سارا فساد ہے۔ اور جس طرح سے عوام کا علماء کے ساتھ یہ معاملہ ہے اسی طرح علماء نے بھی اپنے مقتدار ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔

چنانچہ علماء بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ یعنی لوگوں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو" اور یہی حکم اُمّت محمدیہ کے علماء کے لئے بھی ہے کیونکہ قرآن میں اس کو بیان فرمایا ہے یعنی عوام سے ڈرے اور ان کی بیجا رعایت کرنی اور تبعیت شروع کر دی اس لئے اور بھی ان کی نظروں سے گر گئے۔

ایک جگہ ایک امام صاحب کے متعلق لوگوں کو یہ شبہہ تھا کہ شاید یہ دوسرے مسلک کے ہیں (یعنی آمین بالجہر وغیرہ کہنے والوں میں سے ہیں) امام صاحب اپنے اس مسلک کو ظاہر نہیں کرتے تھے ایک دن انھوں نے نماز پڑھائی اور وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے بعد آمین بھی جہر کے ساتھ نکل گئی انھوں نے سمجھا کہ مقتدیوں کو شاید معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہمارا جو گمان تھا وہ صحیح ہے۔ اب تو ہمیں امامت ہی سے علیحدہ کر دیں گے اس کے بعد ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا کہ آمین نہیں اس طرح نماز ہی فاسد کر لی۔ اس قدر غلبہ آج عوام الناس کا ہمارے اوپر ہو گیا ہے ذرا للّٰہیت باقی نہیں رہی اس قدر عوام الناس سے ڈرتے ہیں جیسے یہ سمجھتے ہوں کہ ان کے ہاتھ میں ہماری روزی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب عوام ہم کو تدیّن میں ایسا پاتے ہیں تو پھر کیوں ہمارے معتقد ہونے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ ایک طرف سے سب کا اعتبار ختم کر دیتے ہیں۔ ادھر نفس و شیطان اُنھیں الگ گمراہ کئے رہتا ہے جس کی وجہ سے عُلماء حقانی و مشائخ ربانی سے مخالفت ان کے لازم حال ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ان حضرات سے دشمنی لوگوں نے ہر زمانہ میں کی۔ دیکھ رہا ہوں کہ جو لوگ کچھ کام کرتے ہوتے ہیں انھیں کی مخالفت کی جاتی ہے ـــــ علامہ شعرانیؒ نے الیواقیت والجواہر میں جلال الدین سیوطیؒ کا قول نقل کیا ہے جسے انھوں نے اپنی کتاب التحدث بالنعمۃ میں لکھا ہے۔

فرماتے ہیں کہ:۔

ومما انعم اللّٰہ بہ علیّ	یعنی منجملہ ان انعامات کے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فرمائے
ان اقام لی عدواً یوذینی	ایک یہ ہے کہ میرے لئے ایک دُشمن کھڑا کر دیا جو مجھکو ایذار
ویمزق فی عرضی لیکونَ	پہنچاتا رہتا ہے اور میری عزت کو پاش پاش کرتا ہے" تاکہ

لی اسوۃ بالانبیاء والاولیاء — انبیاءؑ اور اولیاءؒ کا اتباع اور ان کی اقتداء مجھے اس باب میں نصیب ہو جائے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم العلماء ثم الصالحون۔ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سب سے زیادہ سخت آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے پھر علماء کی پھر صالحین کی۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ارشاد فرمایا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان پیدا کئے تھے کچھ آدمی اور کچھ جن۔ جن میں سے بعضے دوسرے بعضوں کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ ان کو دھوکہ میں ڈال دیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر نبی کے دشمن ہوئے ہیں دونوں فریق کے سرکش جن سے بھی اور انس میں سے بھی اول کو شیاطین الجن اور دوسرے کو شیاطین الانس کہا جاتا ہے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا الآیہ اور بہت سے پیغمبر جو آپ سے پہلے ہوئے ہیں ان کی بھی تکذیب کی جا چکی ہے۔ سو انھوں نے اس پر صبر ہی کیا کہ ان کی تکذیب کی گئی اور ان کو ایذائیں پہنچائی گئیں یہاں تک کہ ہماری امداد ان کو پہنچی۔

اس سے معلوم ہوا کہ مخالفین کا ہونا۔ مخالفت کیا جانا اور اس پر صبر کرنا یہ سب بھی انبیاء علیہم السلام کی سنت اور اُن کا اُسوہ ہے اور جن لوگوں کے ساتھ یہ معاملات پیش آئیں وہ خوش ہوں کہ الحمد للہ ان کو تاسّی انبیاء کی حاصل ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ چیزیں خدا کی طرف سے بطور امتحان پیش آتی ہیں اسی سے ان کو نمبر اور رتبہ ملتا ہے اور وقتی و عارضی ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ وقت گذر جاتا ہے اور یہ حضرات کامیاب ہو جاتے ہیں اور تمام چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔ مگر اس کو سمجھنا اور جھیل لینا یہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے ہوتا ہے۔

چونکہ انبیاء علیہم السلام کے نیز صالحین اُمت کے حالات بھی سامنے ہیں اور ان کے ساتھ لوگوں کے معاملات بھی پیش نظر ہیں اس لئے بہت سمجھ بوجھ کر کوئی کام کرتا ہوں۔ یہ نہیں کرتا کہ جہاں کسی نے کہیں بُلایا بس کود کر فوراً پہنچ گیا یہ دیکھتا ہوں کہ ان لوگوں کو مجھ پر اطمینان بھی ہے یا نہیں اور لوگ جو اپنے اطمینان کا اظہار کر رہے ہیں اس میں کس قدر

صدق ہے اور یہ اس لئے کرتا ہوں کہ زمانہ ظاہر و باطن کے تخالف کا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص اپنے کو جیسا ظاہر کرے ویسا ہی وہ ہو بھی میں کہیں جاؤں اور اس کی وجہ سے کسی فتنہ میں پڑ جاؤں اس کو تو خیر پسند ہی نہیں کرتا۔ اس چیز کو بھی گوارا نہیں کرتا کہ میرے کہیں آنے جانے کی وجہ سے خود مسلمان کسی فتنہ میں پڑ جائیں۔ میں تو کہیں جا کر رہوں گا اور پھر اپنے مکان چلا آؤں گا اور وہاں کے لوگ کسی شر پسند کی وجہ سے بیٹھے بٹھائے فتنہ میں پڑ جائیں اس لئے کہ کوئی بستی اور کوئی شہر ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہے اسی کام کو کرتا ہوں لوگوں کے مزاج کو خوب پہچانتا ہوں۔ ایک صاحب ابھی آئے تھے کچھ دن ہوئے مجھ سے کہتے تھے کہ ایک دفعہ میں سفر کر رہا تھا "وصیۃ الاحسان" میرے ہاتھ میں تھی۔ جن اخلاق میں آج لوگ مبتلا ہیں اس رسالہ میں اسی کو بیان کیا گیا تھا کہتے تھے کہ میرے پاس ایک غیر مسلم افسر بھی بیٹھے ہوئے تھے اُردو جانتے تھے انھوں نے میرے ہاتھ سے وہ رسالہ لے لیا اور مطالعہ کرنے لگے کل پڑھ گئے اور کہا کہ بہت اچھا لکھا ہے اور سب میرا ہی حال لکھا ہے مجھے یہ سُن کر تعجب بھی ہوا اور افسوس بھی کہ دیکھو ایک غیر مسلم نے اس کو سمجھا اور اس سے متاثر ہوا لیکن کسی مسلمان نے اسے دیکھ کر اس قسم کی بات مجھے نہیں لکھی۔

کام کرنے والوں اور ان کی مخالفت کرنے والوں اور ان سے عداوت رکھنے والوں کے یہ دونوں سلسلے شروع سے چلے آرہے ہیں۔ چنانچہ آگے علامہ شعرانیؒ نے علامہ سیوطیؒ کا قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ :-

اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ ہر نبی اپنے شہر و وطن میں اپنی حرمت کو مفقود پاتا ہے یعنی دوسری جگہ کے لوگ تو اس کی عزت اور اس کا احترام کرتے ہیں لیکن مقامی لوگ شک و شبہہ ہی میں رہتے ہیں انھیں اطمینان نہیں ہوتا۔

بیہقی نے روایت کیا ہے کہ کعب احبارؓ نے موسیٰ خولانی سے پوچھا کہ اپنی قوم کو آپ اپنے حق میں کیسا پاتے ہیں انھوں نے کہا کہ کام کرنے والے، اطاعت کرنے والے۔ کعب احبارؓ نے یہ سُن کر کہا توراۃ تو اس کی تصدیق نہیں کرتی اس میں تو یہ لکھا ہے کہ وایم اللہ ماکان رجل حلیم فی قوم قط الا بغوا علیہ وحسد وہ یعنی خدا کی قسم کوئی حلیم شخص کسی قوم میں نہیں ہوا مگر یہ کہ لوگوں نے اس پر بغاوت کی ہے اور

اس پر حسد کیا ہے۔

ابن عساکر نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے سب سے زیادہ بے نیازی برتنے والے ان کے عزیز وقریب ہوتے ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ یعنی اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے۔

حضرت ابو الدرداءؓ کہا کرتے تھے کہ عالم سے بھی سب سے زیادہ بے رغبتی کرنے والے اس کے اہل اور اس کے پڑوسی ہوتے ہیں اگر اس کے حسب میں کچھ فرق ہوا تو عار دلائیں گے اور اگر ساری عمر میں اس نے گناہ کرلیا تو عار دلائیں گے۔ اس کے بعد پھر جلال الدین سیوطیؒ کا قول نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ معلوم ہونا چاہئے کہ کسی زمانہ میں کوئی بڑا شخص نہیں ہوا ہے مگر یہ کہ کمینوں نے اس سے دشمنی کی ہے اذا الاشراف لم تزل تبتلیٰ بالاطراف یعنی اشراف ہمیشہ اطراف کی جانب سے آزمائش میں ڈالے جاتے رہے ہیں۔

چنانچہ دیکھو حضرت آدم علیہ السلام کے لئے ابلیس تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے لئے ہام تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے جالوت تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے صخر تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نمرود تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے فرعون تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ان کی پہلی زندگی میں بخت نصر اور دوسری زندگی میں دجّال ہوگا اور ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ابو جہل ہوا۔

میں کہتا ہوں کہ ابھی اس آخری زمانہ میں کیسے کیسے فضلاء ہوئے ہیں جو صرف صاحب ظاہر ہی نہیں تھے بلکہ صاحب باطن بھی تھے مگر لوگ ان کی بھی مخالفت سے باز نہ رہے۔ آج آپ امام غزالیؒ کو کتنا مانتے ہیں لیکن خبر بھی ہے کہ ان کے زمانہ میں ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا ان کی بڑی بڑی مخالفت کی گئی یہاں تک کہ ان کی کتاب احیاء العلوم جلائی گئی پھر ہوا یہ کہ جن صاحب کے حکم سے جلائی گئی انھوں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ان کے اس فعل سے ناخوش ہوئے اور ان کے کپڑے اُتروا کر ان کو دُرّے لگائے جانے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ جب وہ صبح اُٹھے تو پیٹھ پر کوڑے کے نشان موجود تھے۔ پھر اس کے بعد وہی احیاء العلوم سونے کے پانی سے لکھوائی گئی۔

یہ اس پر کہہ رہا ہوں کہ اپنے اپنے زمانہ میں ہر نبی اور ولی کی مخالفت کی گئی ہے لیکن پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت بھی ہوئی ہے اور یہی حضرات کامیاب ہوئے ہیں ــــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ایک شخص نے اُن سے کہا کیا خون ہی سفید ہوگیا ہے؟ انھوں نے پوچھا کیا بات ہے۔ اُس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لے کر کہا کہ وہ تمہارا بھتیجہ بھی ہے یا نہیں؟ کہا ہاں ہے کہو کیا بات ہے اس نے کہا کہ ان کو ابوجہل نے مارا ہے۔ یہ سُننا تھا کہ غصّہ سے چہرہ سُرخ ہوگیا۔ شکار سے واپس آرہے تھے ہاتھ میں کمان موجود تھی۔ اسی حالت میں ابوجہل کے پاس پہنچے اور اسی کمان سے اس کے سر پر دو تین ہاتھ رسید کرکے کہا کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ میرے ہی سامنے میرے بھتیجے کو مارو گے۔ خبردار اب ایسی حرکت نہ کرنا اور لو میں مسلمان ہوتا ہوں کرلو جو کرنا ہو۔ یہ کہہ کر کلمہ پڑھ لیا اور مسلمان ہوگئے۔

اسی طرح سے حضرت عمرؓ جب مسلمان ہوئے تو خانہ کعبہ کے پاس جاکر اعلان کیا کہ لوگو! میں مسلمان ہوتا ہوں۔ جسے اپنی بیوی کو بیوہ کرانا اور اپنی اولاد کو یتیم کرانا منظور ہو وہ میرے مقابلہ میں آجائے۔

علماء نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد پھر نماز کھلم کھلا مسجد حرام میں ہونے لگی اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے دین کی نصرت فرمائی۔

دین خُدا کا ہے جب کوئی شخص اخلاص کے ساتھ اور صحیح طریقہ پر کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی ضرور اس کی نصرت ہوتی ہے۔

اور کام کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے متعلقین کی اصلاح پہلے کرے اور اپنے لوگوں میں کام کرے اس میں کوئی فتنہ بھی نہیں۔ دوسری جگہ کیوں کود کر جائے۔ اپنے ہی یہاں سے کام شروع کرے۔ انھیں لوگوں پر محنت صرف کرے اور ان کو درست کرے۔ جتنا ان کو درست کرے گا اتنی ہی دین کی اشاعت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو اسی طریقہ سے کام بڑھے گا اور ترقی کرے گا۔

اِسے کہتا ہوں تو نہیں سُنتے اور ہم سے کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں چلو اور آپ جب کام کریں گے تو اسی کا اثر آپ کے کُنبہ اور برادری کے لوگوں پر یقیناً ہوگا۔ باقی

یہ ضرور ہے کہ جس درجہ کا دین آپ کے اندر ہوگا اُتنا ہی آپ کا اثر دوسروں پر ہوگا۔

صوفیہ کا طریقہ کار یہی رہا ہے۔ مولانا **عبدالرؤف** صاحب دانا پوری طبیب بھی تھے صوفی بھی تھے۔ محقق عالم تھے۔ مورخ بھی تھے اور انگریزی داں بھی تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ دین اسلام یہاں ہندوستان میں صوفیہ سے پھیلا ہے۔ اس طرح سے کہ کوئی بزرگ کسی خطہ میں جاکر بیٹھ گئے ہیں نہ کسی سے کچھ مانگتے تھے اور نہ کسی سے کچھ کہتے تھے بس خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ مخلصین کو کب پوشیدہ رہنے دیتے ہیں لوگوں کو پتہ چل ہی جاتا تھا۔ قریب ہونا شروع ہوتے تھے اُن میں سے کوئی شخص زیادہ قریب ہوتا اور ان کی چیزیں سیکھتا تو اس کو دوسرے خطہ میں بھیج دیتے تھے وہاں جاکر وہ اسی طرح کام کرتا۔ اسی طرح ہوتے ہوتے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں یہ حضرات پھیل گئے۔ یہ خاموش تبلیغ کہلاتی ہے جو کہ ناطق تبلیغ سے کہیں بہتر اور پائیدار ہوتی ہے اس لئے کہ فتنہ تو بولنے میں ہوتا ہے اور اُسی وقت لوگوں کو مخالفت کا موقع بھی ملتا ہے کہ تم کوئی بات کہو دوسرا اُس کو رد کردے لیکن ایک شخص زبان سے کچھ کہتا ہی نہیں تو اس کو کیا کہو گے۔

اب اس زمانہ میں عوام کو اور انگریزی دانوں کو سب کو بدلا ہوا دیکھ رہا ہوں اب کسی کے اندر شرائط تاثیر کی موجود ہوں تو بس اس کی بات کا اثر ہو جائے گا کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ وقت بھی دے رہے ہیں، روپیہ پیسہ بھی خرچ کر رہے ہیں۔ دین کا نام سُن کر جمع بھی ہو جاتے ہیں۔ اب سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ اب جو کوتاہی ہے وہ ہماری ہی جانب سے ہے کہ ہم اُن کے سامنے حقیقی دین اور کام کی باتیں بیان نہیں کرتے

میں ایک جگہ گیا ہوا تھا جہاں کے متعلق سُنتا تھا کہ یہ لوگ دین کی تضحیک کرتے ہیں تالیاں بجاتے ہیں میں نے تو ایک شخص کو بھی نہیں دیکھا کہ تضحیک کرتا ہو بلکہ نہایت ادب اور احترام کے ساتھ سب لوگ پیش آئے آدمی جب تک جاہل رہتا ہے اس وقت تک جو نہ کر گزرے لیکن علم و معرفت کے بعد پھر تو ادب ہی کرتا ہے۔

میں نے ایک بزرگ کا قصہ سُنایا تھا کہ لوگ ان کے چپت رسید کرتے تھے اور ہنستے تھے بالآخر ان کو الہام ہوا کہ یہ لوگ بہت دیر سے تمھاری بے ادبی کر رہے ہیں کہو تو جہاز غرق کر دیں۔ ان بزرگ نے کہا کہ اے اللہ جب تو اس پر قادر ہے کہ

ان کو غرق کر دے تو اس پر بھی قادر ہے کہ ان کی باطن کی آنکھ کھول دے تاکہ مجھے پہچان لیں۔ فوراً سب کے قلب میں آنکھ ہوگئی اور انھیں پہچان کر مؤدب بیٹھ گئے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کے بعد وہ لوگ ساری عمر نادم ہی رہے ہوں گے یعنی جب اس واقعہ کو سوچتے ہوں گے کہ ہم نے کیا حرکت کی اور ان کی طرف سے کیا دولت ملی۔ آپ لوگ بھی شاید اسی لئے چپتیاتے ہیں کہ سمجھتے ہوں گے کہ دولت ملنے کا یہی طریقہ ہے تو یہ غلط خیال ہے وہ کریم تھے اس لئے دوسرے کو ان پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اگر کوئی جلالی مل گیا تو مصیبت میں پڑجاؤگے۔

بہرحال کوئی بھی خطہ ہو جب تک کہیں کوئی اہل دل نہ ہوگا کام نہیں ہوگا کام کے لئے اہل دل کا ہونا ضروری ہے۔ رہی لوگوں کی مخالفت اور ان کی نفسانیت تو یہ ہوتی ہے مگر رفتہ رفتہ ختم بھی ہوجاتی ہے۔

ایک مولانا صاحب مجھ سے محبت کرتے تھے مجھ سے کہتے تھے کہ باہر والوں کو کہو مگر گاؤں والوں کو اور برادری والوں کو کچھ نہ کہو میں نے کہا کہ تو پھر انھیں تقویٰ طہارت کیسے آئے گا چنانچہ کہتا رہا کہتے سنتے کہتے سنتے اب دیکھتا ہوں کہ لوگ نمازی بھی ہیں تہجد گذار بھی ہیں اور بہت سے مولوی اور حافظ بھی ہوگئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی ایک جگہ جم کر کام کرے اور پہلے اپنے لوگوں میں کام کرے تو کام ہوتا ہے۔ عمومی کام کرنے میں تو فتنہ کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن خصوصی کام کرنے میں اس کا اندیشہ نہیں ہوتا اور پھر آہستہ آہستہ وہ تھوڑا کام بھی بہت ہوجاتا ہے۔

ایک صاحب نے بڑی عمدہ بات کہی ایسی کہ کسی نے نہیں کہی۔ انھوں نے کہا کہ جب سے تم الٰہ آباد آئے ہو یہاں ایک دینی ماحول پیدا ہوگیا ہے اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ پھر کام ترقی کر جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک دینی ماحول پیدا کرنا چاہئے چاہے وہ مختصر ہی سا کیوں نہ ہو چاہے اپنے گھر ہی میں کیوں نہ ہو۔

اب دیکھئے آپ لوگ یہاں جماعت سے جو نماز پڑھتے ہیں تو اس کو تمام غیر مسلم

مرد، عورت بچے سب کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں اور اس کا اُن کے قلب پر اثر پڑتا ہے اتنا تو سمجھتے ہوں گے کہ کیسے اچھے لوگ ہیں کہ دُنیا کا بھی کام کرتے ہیں اور پانچ وقت اپنے مالک کو بھی یاد کرتے ہیں۔ آپ کی اسی ایک نماز کے ذریعہ اسلام کی تشہیر ہوتی ہے۔
مصر میں ایک جگہ غنیم نے چڑھائی کی وہاں کے لوگ جماعت سے نماز پڑھ رہے تھے یہ دیکھ کر دُشمن واپس ہو گیا۔ یہی خیال کیا ہو گا کہ یہ لوگ ایک ذات کے کس قدر مطیع اور فرماں بردار ہیں۔ تم آج اگر اپنی نماز ہی درست کر لو تو بہت کام بن جائے۔
حضرت مولاناؒ جن دنوں بسلسلۂ علاج لکھنؤ تشریف رکھتے تھے قریب ہی کی مسجد میں جماعت کے لئے تشریف لے جاتے تھے وہاں کا امام کچھ دوسرے خیال کا رہا ہو گا فوراً مصلے پر پہنچ جاتا تھا۔ لوگوں نے حضرت سے کہا کہ حضرت امام کچھ ٹھیک آدمی نہیں معلوم ہوتا لہٰذا جماعت گھر ہی پر کر لی جایا کرے۔ حضرت نے فرمایا کہ نہیں جی ہم اس کی وجہ سے جماعت نہیں چھوڑیں گے۔ ایک دن اُس نے سلام پھیرتے ہی اعلان کیا کہ حضرات فاتحہ ہو گی آپ لوگ تشریف رکھئے گا۔ سب لوگ ٹھہر گئے حضرت مولانا بھی اپنی جگہ پر سر جُھکا کر اپنی مخصوص ہیئت میں بیٹھ گئے۔ میں بھی وہاں تھا۔ اپنے دل میں میں نے کہا کہ آج حضرات نے اسے لیا اور اب یہ مُرید ہوا۔ بس یہ اس کا آخری عمل ہے کچھ آیتیں پڑھیں فاتحہ ہوئی اور ریوڑیاں تقسیم ہوئیں سب سے پہلے حضرت ہی کو حصّہ دیا۔ حضرت نے اپنے رومال کے گوشہ میں لے کر باندھ لیا اور زبان سے کچھ نہیں فرمایا ہم لوگ ہوتے تو کہتے کہ یہ بدعت ہے اور ایک فتنہ برپا ہو جاتا۔ مگر حضرت حکیم تھے کچھ بھی نہیں فرمایا۔ اس کو دیکھ کر امام صاحب معتقد ہو گئے اور پڑھے لکھے لوگوں کی جماعت میں بھی اِس واقعہ کو بیان کیا۔ اُن لوگوں نے مکرر پوچھا کہ کیا مولانا بھی شریک تھے اس نے کہا ہاں صاحب شروع سے آخر تک شریک رہے میں نے حصّہ دیا اُسے بھی لے لیا اور اس کے بعد سے سب جگہ یہی کہتا پھرتا تھا کہ لوگ اُن کے متعلق غلط کہتے ہیں کہ وہ ..... ہیں غلط ہے اور بہتان ہے وہ ایسے نہیں ہیں۔
دیکھئے جماعت سے نماز پڑھنے کی کیسی برکت ظاہر ہوئی کہ امام ہی درست ہو گیا۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ نماز کو دُرست کرو سارا دین درست ہو جائے گا۔
حدیث شریف میں آتا ہے کہ:۔ الصلوٰۃ عماد الدین من اقامھا فقد اقام الدین ومن ترکھا فقد ھدم الدین۔ یعنی نماز دین کا ستون ہے جس نے اُسے قائم رکھا اس نے

دین کو قائم رکھا اور جس نے اسے ترک کیا اس نے گویا دین ہی کو منہدم کر دیا۔

میں کہتا ہوں کہ نوافل پڑھو لیکن فرائض کا اہتمام کرو۔ نوافل سے جو قرب حاصل ہوتا ہے تو اسی وقت جبکہ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو ورنہ صرف نوافل ادا کر کے اور فرائض میں کوتاہی کر کے کسی نے بھی قرب حاصل نہیں کیا ہے۔

ایک شخص نے مجھے لکھا کہ میری حالت بدل گئی ہے یعنی کچھ اچھی ہو گئی ہے۔ میں نے کہا کہ دیکھ رہا ہوں کہ تم نے فرائض کا اہتمام کر لیا ہے۔ بات یہ ہے کہ فرض نماز انسان کے کل وقت کو گھیر لیتی ہے۔ ظہر پڑھی۔ پھر عصر کا انتظار۔ عصر پڑھی تو مغرب کا انتظار۔ مغرب پڑھی تو عشاء کا انتظار۔ اس طرح سے کچھ وقت نماز میں اور کچھ انتظار میں گذر جاتا ہے۔ اس طور پر گویا سارا وقت ہی عبادت میں گذرتا ہے اور نمازی غافل نہیں ہونے پاتا اور نماز پڑھنے والا گویا دوسروں کو اسلام کی عملی دعوت دیتا ہے اور واعظ قولی دعوت دیتا ہے اور عملی دعوت قولی دعوت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ نماز سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے نمازی آدمی ساری برائیوں سے بچ جاتا ہے۔ بداخلاقی کا زمانہ ہے اس زمانہ میں کام کرنا بہت مشکل ہے لوگوں کے خطوط آتے ہیں ان کے لکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت پریشان ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ بد آدمی کی اصلاح جتنی نیک صحبت اور دینی ماحول سے ہوتی ہے کسی اور چیز سے نہیں ہوتی۔ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ انسان خود بخود ٹھیک ہونے لگتا ہے۔ آپ لوگ کہتے ہوں گے کہ ہم تصوف سیکھنے آئے ہیں آپ اس قسم کی باتیں کیا بیان کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہی تو باتیں کہنے کی ہیں اور پہنچانے کی ہیں۔ اچھی اچھی باتیں تو سبھی کہتے ہیں اور ضرورت ہے کہ کام کام کی باتیں بیان کی جائیں۔

بہر حال میں یہ بیان کر رہا تھا کہ ایک جگہ بیٹھ کر کام کرنا اچھا ہوتا ہے ہم نے یہ راہ سوچ لی ہے تب بیٹھے ہیں یعنی جو کام کر رہے ہیں سوچ سمجھ کر کر رہے ہیں اور جو لوگ ہمارے پاس آتے جاتے ہیں ان کے بھی حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم سے مطمئن ہیں بستی میں ایک شخص بھی صالح ہوگا تو اس کی وجہ سے بہت سے صالح ہو جائیں گے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ آدمی اپنے اندر صلاح و تقویٰ پیدا کرے اور پہلے خود سیکھے پھر دوسروں کو سکھلائے اگر اس کے اندر اخلاص ہوگا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے دوسروں کو نفع نہ پہنچے۔

سُنئے کام کے مختلف درجے ہیں۔ اب یہ چھٹ بھیا لوگ چاہیں کہ اولیاء اللہ کا جو کام ہے اس کو لے لیں تو یہ نہیں ہوگا۔ اولیاء اللہ نے کچھ کام کیا ہے اس سے ان کو یہ مرتبہ ملا اب اس میں آنا چاہتے ہو تو آؤ انھیں کی طرح کام کرو۔ مطلب اس سے خاص کام ہے یعنی طریق کے مطابق کام کرو اور اصلاح کرو اور اس میں سب سے بڑا مانع نفس ہے اس کو پہچانو اور اس کو مارو ورنہ یہ اللہ تعالیٰ سے تعلق نہ ہونے دے گا۔

جب یہ کہتا ہوں تو کہتے ہیں ہمیں فرصت نہیں ہے تمھیں ہمارے یہاں آجاؤ اور پیدل آجاؤ۔

میں کہتا ہوں کہ بالفرض اگر یہ لوگ آجائیں اور تمھارے تابع ہوجائیں تو تم کو اس سے کیا فائدہ؟ تمھارا فائدہ تو اسی میں ہے کہ اہل اللہ کے یہاں جاؤ تاکہ کچھ مجاہدہ ہو، نفس مٹے، تم کو اللہ تعالیٰ سے نسبت حاصل ہو، مگر اس کو نہیں سُنتے۔

آج ہم عوام الناس کو دیکھتے ہیں کہ ہم لوگوں کو بہت بہت سہولتیں اور آرام پہنچاتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہم کو کوئی دین کی بات بتلائے۔ مگر ہم لوگ بتا کے نہیں دیتے اور بتاتے اس لئے نہیں کہ سیکھتے نہیں۔

سنو! جو آدمی جس درجہ کا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں لکھا جاچکا ہے اور جو جیسا لکھا جاچکا ہے ویسا ہی ہوگا۔ محض بزرگوں کی ریس کرنے سے اور ہاتھ پاؤں مارنے سے کچھ نہیں ہوگا۔

لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ آج اپنے بیوی بچوں کو تابع نہیں بنا سکتے اور ہم لوگوں کو تابع بنانے کے لئے تیار۔

میں کہتا ہوں کہ اپنی خواہشات کو اللہ اور رسول کے تابع کرو یہ تمھارے لئے مفید ہوگا۔ اسی طرح سے میں اپنی خواہشات کو اللہ و رسول کے تابع کردوں اس کو تو سنتے نہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو اپنی خواہشات کے تابع کریں۔

جب سمجھ لیتا ہوں کہ اس مزاج کے آدمی ہیں تو ایسوں سے کہتا ہوں کہ اچھا پھر کرو۔ حالانکہ میں بیچارہ کیا چیز ہوں۔ مگر ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ آؤ اچھی جگہ آئے ہو یا تو تمھیں مجھے اپنے تابع کرلو گے اور یا نہیں تو ہم ہی تم کو خدا اور رسول کی مرضی کے تابع بنادیں گے۔ اپنی خواہشات کو تابع کرنا یہ کہنے میں تو مختصر سا کلمہ ہے مگر کوئی جب اس کے

کرنے پر آئے تب معلوم ہو کہ بڑی مشکل چیز ہے۔ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر جس پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہی شامل ہو جائے۔ لہٰذا جو شخص جس درجہ کا ہے وہ اپنے درجہ کے مطابق کام کرے ــــــ یہی بات لوگوں سے کہتا ہوں کہ جتنا کر سکتے ہو کرو اور جو نہ کر سکتے ہو اُس میں نہ پڑو۔ کوئی اللہ کا بندہ ہوگا وہ آگے کا کام کر دے گا۔ جب دیکھے گا کہ اب آگے یہ نہیں کر سکتے تو وہ کر دے گا۔

آدمی کو کام بس اپنے درجہ کے مطابق کرنا چاہئے۔ اب یہ چاہے کہ جو کام اولیاء اللہ (یعنی اہل دل) کے کرنے کا ہے میں بھی وہی کرنے لگ جاؤں اور بغیر سیکھے اور حاصل کئے کر لوں تو یہ نہیں ہو سکتا۔

میں نے یہاں کے لوگوں سے کہا کہ کام صحیح طریقہ سے کرو۔ چنانچہ کام کرنے کا طریقہ بھی لوگوں کو بتلایا۔

اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ جتنا مُرید پیر کو مانتا ہے اگر اُتنا ہی پیر مُرید کو ماننے لگے تو مُرید تو خُدا تک پہنچ ہی جائے۔ مُرید کے ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ ہمارے لئے اپنا سارا وقت اور سارا معمول کھانا پینا، سونا جاگنا، راحت و آرام، سب صرف کر دیتے ہیں۔ اب اگر ہم بھی ذرا سی توجہ ان پر کر دیں تو بس ان کا کام بن جائے۔ پیر کو اس کی فکر ہونی چاہئے کہ مُرید کا کیا حال ہے باطنی ترقی کر رہا ہے یا نہیں؟ اور اگر نہیں تو کیا امر مانع ہے اُس سے۔ اس کو نکالے اور راستہ کا روڑا صاف کرے یہاں توجہ سے یہی مُراد ہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک مولوی صاحب تھے بڑے فاضل اور جیّد عالم تھے ایک مرتبہ حضرتؒ نے ان کا نام لے کر فرمایا کہ ہمارے مولوی ..... صاحب بولتے بہت ہیں پھر یہ فرمایا کہ انشاء اللہ اب نہ بولیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد ہم لوگوں نے دیکھا کہ وہ مولوی صاحب بالکل خاموش ہی ہو گئے اور ان کو نفع ہونا شروع ہوا اور وہاں سے کچھ پا ہی گئے۔ اس کے بعد کہتے تھے کہ اب بولنا بھی چاہتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے زبان پکڑ لی ہو۔

میں کہتا ہوں کہ زبان ہی نہیں بلکہ کسی نے دل کو پکڑ لیا تھا بعض کام آسان ہوتا ہے بعض مشکل ہوتا ہے ظاہری تعلیم آسان ہے اور باطنی تعلیم بڑی مشکل ہے۔ نفس کی خرابیاں

بہت دیر میں کھلتی ہیں اب نفس کی اصلاح کا حکم ہے اور یہاں نفس کی خرابیاں ہی نہیں معلوم ہوتیں اس لئے مشکل پڑتی ہے۔

ایک بزرگ ہمیشہ صف اولیٰ میں نماز پڑھتے تھے ایک دفعہ کسی ضرورت کے سبب کچھ تاخیر ہوگئی جماعت تو ملی مگر دوسری صف میں جگہ پائی اس کی وجہ سے انھیں محسوس ہوا کہ میں لوگوں سے کچھ شرمندہ سا ہوں یعنی یہ کہ لوگ یہ کہیں گے کہ آج شیخ سے صفِ اولیٰ رہ گئی (دیکھتے ہیں آپ ؟ مخلوق سے شرمائے خدا سے نہیں) اس سے انھوں نے سمجھا کہ اچھا میں نے اب تک جتنی نمازیں پڑھی ہیں کیا یہ سب مخلوق ہی کے لئے پڑھی ہیں یہ خیال کرکے ساری عمر کی نمازیں دہرائیں کہ یہ سب مخلوق کے لئے تھیں خدا کے لئے نہ تھیں پھر اس کے بعد انھوں نے کیسی کچھ نیت باندھی ہوگی ——— یہ اس پر کہہ رہا ہوں کہ بہت بہت دنوں کے بعد سمجھ میں آتا ہے اور نفس کا کید ظاہر ہوتا ہے۔

اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں کہ ؎

توان شناخت بیک روز در شمائل مرد ۔۔۔ کہ تاکجاست رسیداست پایگاہ علوم

ولے ز باطنش ایمن مباش وغرہ مشو ۔۔۔ کہ خبث نفس نہ گردد بسالہا معلوم

یعنی ایک روز میں آدمی کی خصلت اور طبیعت کو معلوم کرسکتے ہیں کہ کہاں تک اپنے علم میں پہنچا ہوا ہے لیکن اس کے باطن سے مطمئن نہ ہو اور دھوکہ میں نہ پڑو اس لئے کہ اس کے نفس کی خباثت برسوں میں نہیں معلوم ہوسکتی۔

اب یہ عوام چاہتے ہیں کہ ہم بھی ویسا ہی کام کرلیں جیسا بزرگانِ دین سے ہوا ہے تو ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ اور اگر کہیں یہ لوگ کسی کو پاجائیں تو اس سے یہ فرمائش کریں کہ ہمارے یہاں چلو۔

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو ایک تکلیف ہوگئی تھی شدت تکلیف کی وجہ سے حضرت بیہوش ہو ہو جاتے تھے۔ اس زمانہ میں ایک جوگی تھا جو مرض کو سلب کرلیتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت پر سخت دورہ پڑا مریدوں نے چاہا کہ اسی جوگی کے پاس لے جائیں راستے میں حضرت کو ہوش آگیا فرمایا کہاں لے جارہے ہو۔ عرض کیا گیا کہ فلاں جوگی کے یہاں ارشاد فرمایا کہ نہیں واپس چلو لوگ واپس لائے دوسری بار پھر دورہ پڑا اور پہلے سے زیادہ شدید پڑا پھر لوگوں نے رائے کی کہ جوگی کے ہی پاس لے چلنا چاہئے۔ حضرت کو

تکلیف سخت ہے۔ چنانچہ اس دفعہ جوگی کے پاس لے کر پہنچ گئے اور اُس نے مرض سلب کیا اور حضرت اُٹھ کر بیٹھ گئے اس کے بعد جوگی سے حضرت نے پوچھا کہ بتاؤ تمھیں یہ کمال کس طرح سے حاصل ہوا اس نے کہا کہ ہمارے گُرو کی ہدایت تھی کہ نفس کی مخالفت کرنا۔ چنانچہ اسی پر میں نے عمل کیا جس کی وجہ سے یہ کمال مجھے حاصل ہوا۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ تمھارا نفس اسلام لانے کو بھی پسند کرتا ہے یا نہیں اس سوال سے وہ بہت گھبرایا کیونکہ ایک کافر یہ کیسے کہے کہ میں اسلام کو پسند کرتا ہوں۔ اس لئے اُس نے کہا کہ نہیں میں نہیں پسند کرتا حضرت نے فرمایا کہ تمھارے گُرو نے جو یہ بتایا تھا کہ نفس کی مخالفت کرنا تو آیا یہ بھی اس میں داخل ہے یا نہیں؟ جوگی یہ سُن کر سٹ پٹا گیا۔ مگر چونکہ اصول کا پکّا تھا اس لئے اقرار کر لیا کہ ہاں بیشک داخل ہے اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ پھر جب ایمان دل میں آگیا تو حضرت کو دیکھا کہ کہیں اونچے مرتبے پر فائز ہیں اور مؤدب بیٹھ گیا۔ تمام دہلی میں شہرت ہو گئی کہ حضرت نے جوگی کو لے لیا اور اتنے بڑے کافر کو مسلمان کر لیا تو دہلی میں اور لوگ بھی تھے مگر اس سے چھوٹے کو بھی مسلمان نہ کر سکے لیکن حضرت سے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا کام لے لیا۔

اسی کو میں کہہ رہا تھا کہ کام کے مختلف درجات ہیں۔ جو جس درجہ کا ہوتا ہے وہی وہ کام کر سکتا ہے اور کوئی چھوٹے درجے والا یہ چاہے کہ بڑے درجے والوں کا سا کام کرے تو یہ نہیں ہو سکتا۔

انھیں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے یہاں امیر و غریب سب لوگ جاتے تھے۔ حضرت کی مجلس میں پیچھے ایک شخص نے کہا کہ حضرت کے ولی ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہے لیکن ہمارے شقی ہونے میں بھی کلام نہیں ہے۔ دین کے اور مراتب تو ہم کو کیا ملتے ہم سے تو گناہ تک نہ چھوٹ سکے۔ انھوں نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا مگر اس کے بعد سے اُن کی حالت بدلنی شروع ہو گئی۔ چنانچہ خود کہتے تھے کہ حضرت نے مجھے ایسا کھینچا کہ اب اگر ہم گناہ کرنا چاہتے بھی ہیں تو نہیں کر سکتے۔ حضرت نے توجہ فرمائی ہوگی جس سے قلب کی حالت بدل گئی۔

کام طریقے سے ہی کرنا چاہیے اس کی صورت یہ ہے کہ ایک خطہ کو لے لو اور وہاں معتد بہ اصلاح کر دو کچھ دنوں وہاں کام کر کے ایک جماعت بنا لو تب آگے جاؤ تاکہ تمھاری عدم موجودگی میں یہ لوگ جنھوں نے تم سے کام سیکھا ہے اس کو باقی رکھ سکیں اور ترقی

دے سکیں۔ یہ نہیں کہ دو دن کے لئے کہیں گئے لوگوں کو شوق ہوا آئے تو معلوم ہوا کہ وہ تو دوسری جگہ چلے گئے فساد کے زمانہ میں مشائخ نے بہت کام کیا ہے اور جہاں کام کیا ہے جم کر کیا ہے اور ٹھوس کام کیا ہے یہ نہیں کیا ہے کہ "آدھا وعظ کہا اور کہا کہ آدھا کل" پھر جب کل بقیہ آدھا کہا تو لوگ پہلا آدھا بھول گئے۔ ایسا مستحکم کام کرو کہ جب دوسری بار آؤ تو کام بگڑے نہیں اور اس کے آگے کام کرنا آسان ہو۔

میں ایک جگہ تھا یہی وقت تھا وعظ و نصیحت کر رہا تھا اور جیسا کہ میرا طریقہ ہے کہ قرآن و حدیث سنا رہا تھا ایک عالم صاحب تشریف لائے اور مجلس میں کنارے بیٹھ گئے میں نے ان کو دیکھا لیکن بیان کے درمیان کچھ بولنا مناسب نہ سمجھا۔ بعد میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ کیا بات ہے؟ اس زمانہ میں کام تو پہلے سے زیادہ ہو رہا ہے مگر فائدہ اتنا نہیں ہو رہا ہے میں نے خیال کیا کہ جب انھوں نے چھیڑا ہے اور سوال کیا ہے تب جواب دینا چاہئے۔ میں نے کہا کہ خلوص نہ ہونے کی وجہ سے "کہنے لگے کہ ہاں یہ سچ کہتے ہو۔ اس زمانہ میں اسباب ہدایت پہلے سے بہت زیادہ ہیں" مگر کام نہیں ہو رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب کام کرنے والوں میں خلوص نہیں ہوگا تو کام کیسے ہوگا —— بزرگوں نے جو کام کیا ہے وہ خلوص ہی کی وجہ سے کیا ہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار فرمایا کہ کام کرتے رہو لوگ متوجہ ہو جائیں گے۔ میں تھا اور مولانا عبدالغنی صاحب تھے۔ حضرت نے یہ نصیحت فرمائی۔ مقصد یہ تھا کہ اصل چیز کام اور اخلاص ہے۔

آدمی جب کام کرتا ہے اور اخلاص سے کرتا ہے تو لوگ اس کی جانب متوجہ ہو ہی جاتے ہیں۔ چنانچہ جن بزرگوں نے کام کیا ہے مسلمانوں نے اُن کو بہت مانا ہے۔ یہاں تک کہ جہاں ان کا پسینہ گرا ہے لوگوں نے اپنا خون بہایا ہے یہ اسی لئے کہ انھوں نے بھی انتہائی خلوص و محبت کے ساتھ انھیں بتایا ہے اور ایسا بتایا ہے کہ اللہ اور رسول کا عاشق بنا دیا ہے اب لوگ مجھ سے آکر کہتے ہیں کہ اثر نہیں ہوتا۔ میں تو دیکھتا ہوں کہ اثر ہوتا ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت قبر سے فیض ہوتا ہے؟ حضرت نے دریافت فرمایا کہ فیض لینے والا کون ہے؟ کہا کہ مثلاً "میں" فرمایا کہ نہیں ہوتا۔"

میں کہتا ہوں کہ اگر وہ یہ کہدیتے کہ مثلاً آپ تو حضرت فرما دیتے "کہ ہاں ہوتا ہے" ——— اسی طرح یہ جو کہتے ہیں کہ نفع نہیں ہوتا تو میں کہتا ہوں کہ دینی کام کرنے والا کون ہے؟ اگر کہتے ہیں کہ جلسے میں" تو کہتا ہوں کہ ہاں ٹھیک کہتے ہو اثر نہیں ہوگا اور اگر کسی کامل کا نام لے دیں تو کہوں گا کہ اثر ضرور ہوگا۔ مطلب میرا یہ ہے کہ کام کا ہونا تو کام کرنے والے کے تابع ہے جیسا اُس کا اخلاص ہوگا ویسا ہی کام ہوگا اور خلوص چھپتا نہیں ہے یوں وہ باطنی چیز ہے اور اس کی صحیح حقیقت تو قیامت ہی میں معلوم ہوگی یہ صحیح ہے" مگر اس کا کچھ نہ کچھ سُراغ یہاں دُنیا میں بھی لگ ہی جاتا ہے۔

ہندوستان میں لوگوں نے بڑا کام کیا ہے۔ علمارِ ظاہر نے بھی کیا ہے اور مشائخ باطن نے بھی کام کیا ہے۔ یہ مولوی فاروق صاحب بیٹھے ہیں الٰہ آباد سے آئے ہیں ایک دفعہ میں ان کے یہاں دیہات گیا ہوا تھا ایک دن انھوں نے کہا کہ آؤ ذرا اِدھر اُدھر دکھاویں۔

چنانچہ قریب ہی ایک گاؤں میں گئے دیکھا تو ایک نہایت عمدہ شاندار مسجد ہے اور ایک مقبرہ اور پختہ خانقاہ ہے" میں نے کہا" یہاں اس دیہات میں ایسی عمدہ مسجد کیسی؟ انھوں نے بتایا کہ اس کی ایک تاریخ ہے وہ یہ کہ ان بزرگ کے یہاں ایک پٹواری لکھنؤ سے آیا تھا اس نے ان بزرگ سے جن کا یہ مقبرہ ہے اپنے لئے دُعا کرائی۔ اُن بزرگ نے اپنا قلمدان اس کی طرف بڑھا دیا جس سے اشارہ اس طرف تھا کہ تمھیں قلمدان وزارت دیتا ہوں۔ تم وزیر ہو جاؤ گے۔ چنانچہ وہ وزیر ہوگیا اور مسجد اور مقبرہ بنوایا۔

اس طرح سے مشائخ نے لوگوں کو دُنیا بھی دی ہے۔ اور دین و ایمان جو یہ حضرات دیتے ہیں اس کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اب بزرگی لینا چاہتے ہو تو کچھ کام کرو۔ بزرگی اچھی چیز تو ہے مگر اُس کے لئے یہ بھی جانتے ہو کہ کیا کرنا پڑتا ہے۔ ؎

خونِ دل پینے کو لختِ جگر کھانے کو
یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

کچھ کرکے تمنا کرو تو خیر ایک بات بھی ہے باقی کرنا ورنا خاک نہیں اور بڑے بڑے مراتب چاہنا یہ تو کچھ بھی نہیں۔

ایک شخص لاہور میں تھا کہتا پھرتا تھا کہ میں لاہور کو اُلٹ دوں گا عام طور سے لوگ اس کو دیوانہ سمجھ کر اس کی بات کی طرف التفات تک نہ کرتے تھے۔ ایک بزرگ کو خیال ہوا کہ لاؤ اس کو دیکھوں تو سہی کہ یہ کچھ ہے بھی یا یوں ہی بک رہا ہے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں ہے پھر کہا کہ لاؤ دیکھوں کہ اس کا پیر کیسا ہے؟ چنانچہ دیکھا" تو وہ تھے" بس سمجھ گئے کہ یہ اسی کے بھروسہ پر ایسا کہہ رہا ہے تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام کو خود نہیں کرسکتا لیکن اپنے بڑوں کے سہارے کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان بزرگ کی برکت سے اس سے کرا دیتے ہیں۔

کچھ سمجھوگے بھی کہ زمانہ کدھر جا رہا ہے؟ لوگ دُنیا میں کیسی کیسی ترقی کر رہے ہیں اور تم دین میں جہاں تھے وہیں ہو۔

میں نے مسلمانوں کو کبھی بُرا نہیں سمجھا اور نہ اب سمجھتا ہوں دیکھ رہا ہوں کہ ان میں دینی حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اگر ان کے اندر حقیقی دین دیکھنا چاہتے ہو تو طریقہ سے کام کرو۔ انھیں سکھاؤ بتاؤ تب تو کام ہوگا یا یوں ہی خود بخود ہو جائے گا؟ اور سکھانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے خود کسی سے سیکھو۔

اس سیکھنے سکھانے پر ایک واقعہ یاد آیا سُنئے!

ایک بزرگ تھے جو بہت بڑے عالم بھی تھے ایک امیر کبیر لڑکا بھی ان سے پڑھتا تھا ایک دن حسب معمول پڑھنے کے لئے آیا تو اُستاد کے چہرے پر کچھ نقاہت کے آثار محسوس کیا اُن سے کہا کہ حضرت آج سبق کو جی نہیں چاہتا یہ کہہ کر سیدھا اپنے مکان گیا اور وہاں سے بہت عمدہ عمدہ کھانے پکوا کر خوان میں رکھ کر خود اپنے سر پر لایا اور لاکر اس کو اُستاد کے سامنے رکھ دیا وہ ہنسے اور فرمایا کہ ضرورت کے وقت آیا مگر ہم نہیں کھائیں گے اس لئے کہ جو چیز اشراف نفس کے ساتھ آئے وہ حرام ہے اور جس وقت تم یہاں سے واپس گئے تھے مجھے بھی یہ خیال ہوا تھا کہ تم کھانا لینے جا رہے ہو پس چونکہ یہ انتظار کے ساتھ آیا اس لئے اس کو لے جاؤ اُس لڑکے نے اس پر اصرار بھی نہیں کیا اور اُن کے سامنے سے سینی اُٹھا کر واپس چلا گیا اور جب ان کی نظروں سے غائب ہو گیا پھر واپس آیا اور عرض کیا کہ حضرت اب تو اشراف نہیں رہا؟ اب قبول فرمالیجیے۔ شاگرد کی ذہانت پر وہ بزرگ بہت خوش ہوئے اور

اس کو بہت دُعائیں دیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو کھلانا چاہتا ہے وہ طریقہ بھی جانتا ہے چنانچہ ان طالبعلم نے ایسا ہی طریقہ اختیار کیا آخر تھے تو اُنھیں کے شاگرد، اُنھیں سے سیکھا تھا اور انھوں نے تعلیم و تربیت کے ذریعہ فہم و عقل سکھلایا ہوگا اسی کا یہ نتیجہ اور ثمرہ تھا جو ایسی عقلمندی کا کام انھوں نے کیا کہ ایسی صورت سے کھانے کو پھر لاکر اُستاذ کی خدمت میں پیش کیا کہ وہ اشراف نفس سے بھی محفوظ رہے اور کھانا بھی کھالیا۔ واقعی عقل و فہم بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جو ان کو اپنے اُستاذ کی صحبت اور تربیت سے حاصل ہوئی تھی۔

لہٰذا تربیت اور اصلاح کا طریقہ بھی بغیر کسی صحیح الفکر اور صحیح الحواس عالم ربانی اور اہل اللہ سے سیکھے ہوئے نہیں آئے گا اس کو سمجھئے اور کام طریقہ سے کیجئے۔

(اللہ تعالیٰ ہم سب کو فہم سلیم عطا فرمائے۔ مرتب)

ملفوظ

طریق کار

مع ضمیمہ

از افاضات

مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ملفوظ طریق کار

فرمایا کہ میں نے بمبئی کا سفر صحت کے لئے اختیار کیا ہے۔ اطبا کے مشورہ سے آیندہ کے لئے کہیں آنے جانے کا خیال قبل از وقت نہیں کرسکتا ہوں جیسا کہ بعض احباب کا مشورہ ہے اور یہی میرے سفر کے متعلق رائے بعض احباب کی معلوم ہوئی۔ آیندہ کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا اور جو ہوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیوں ہوا۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

ہر جگہ اہل علم اہل حق حضرات تشریف رکھتے ہیں وہ مقامی ضرورتوں کو پورا کرسکتے ہیں ان کو کام کرنا چاہئے اور ماشاء اللہ کام کر ہی رہے ہیں۔ میں نے کبھی کسی کام میں اقدام نہیں کیا اور نہ کروں گا۔ بہت سوچ سمجھ کر مشورہ کے بعد کام کیا جاتا ہے اب یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو کام بھی کرتا ہوں دیانت ہی سے کرتا ہوں تاہم اتنا ضرور ہے کہ بدوں مشورہ کوئی کام نہیں کرتا بہت سوچ سمجھ کر ہی قدم اُٹھاتا ہوں۔

ایک صاحب نے ایک خط میں یہ لکھا تھا کہ

ماشاء اللہ معرفت حق۔ خوب ہی خوب حق کی معرفت کا حق ادا کرتا رہتا ہے اس طرح مکانی قرب کی سعادت سے محرومی کے باوجود تعلیمی فیوض و برکات اس سے بہت زیادہ نصیب ہوتے رہتے ہیں۔ جتنا کبھی کبھی حاضری سے ہوتے تھے پھر بھی حاضری سے مستقل محرومی کا خیال باعثِ قلق و ملال ہی رہتا ہے۔

اور یہ بھی لکھا تھا کہ

تازہ معرفت حق میں ایجادات کی حیثیت وحقیقت کے تحت افادات پڑھ کر بار بار دل و زبان سے بے ساختہ ماشاء اللہ اور سبحان اللہ نکلتا تھا اس سلسلہ میں حضرت کی زبان حق ترجمان سے تو حق تعالیٰ نے ایسی حقیقت کو واضح فرمایا کہ شاید ہی اکابر وقت

میں سے کسی کو التفات ہوا ہو۔

مجھ کو بہت خوشی ہوئی کہ اس رسالہ سے فوائد پہنچ رہے ہیں اور اہل طلب اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور جو حضرات دور ہیں ان کو بھی اس سے بُعدِ مکانی کے باوجود معرفتِ حق کا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ الیواقیت سے اس کے مناسب اور اسی کی تائید کیلئے لکھتا ہوں۔ لمبی عبارت[ع] ہے۔ آخر میں یہ عبارت ہے۔

فَنَابَتْ عَنْهُمْ رسائلهم بعد موتهم في نصح المريدين۔ اس میں ان کے رسائل کو ان کا نائب قرار دیا ہے اس طرح ان کے فیوض کو عام کیا جا سکتا ہے کہ رسائل اور کُتُب سے شغف حاصل کیا جائے اور ان کا مطالعہ سمجھ کر کیا جائے۔

ع۔ از ناقل۔ یہ عبارت اسی مضمون میں آگے بھی آئی ہے لیکن ہم ناظرین کے افادہ کے لئے یہاں بھی درج کرتے ہیں کہ

فكذلك العارفون لهم اجر نيتهم وقصدهم الصالح من نفع المريدين بما وضعوه من الحقائق الكاشفة لمشكلات علم التوحيد وامراض القلوب ومن فوائد تدوينهم تلقيح قلوب الناظرين في رسائلهم من بعدهم فينظفروا من تلك المعاني ما يرقيهم ويبعث سحائب الرحمة على قلوبهم وعلى السنتهم فتشرق ارض قلوبهم بنور رشدهم وتحيا باثر هدايتهم فنابت عنهم رسائلهم بعد موتهم في نصح المريدين وكان تدوين معارفهم واسرارهم من احق الحقوق عليهم لكون غيرهم لا يقوم مقامهم في تدوين دواء امراض القلوب وآداب حضرات الحق تعالى

(ترجمہ) اسی طرح سے عارفین بھی ہیں کہ ان کو انکی نیتوں کا اجر اور ان کے قصد صالح کا ثواب ملے گا اور وہ یہ کہ طالبین کو ان کی بیان کردہ حقائق سے نفع پہنچے گا جو کہ علم توحید اور امراض قلوب کی مشکلات کو کشف کرنے والی ہیں اور ان کی تدوین کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ ان کے بعد جو لوگ ان کے رسائل کو دیکھیں تو ان کے قلوب ان مضامین سے بھر جائیں جو ان رسائل میں ہیں۔ پس اُن معنی کے سبب وہ ترقی کر سکیں اور رحمت کے بادل ان کے قلوب اور زبان پر آئیں اور ان کے قلوب کی زمین ان کے رشد کے نور سے منور ہو جائے اور ان کے ہدایت کے اثر سے زندہ ہو جائیں پس ان کے رسائل ان کی وفات کے بعد ان کی نیابت کریں اور اپنے اپنے معارف اور اسرار کی تدوین ان کے ذمہ سارے حقوق سے بڑھ کر لازم اور ضروری تھی اس لئے کہ ان کا غیر امراض قلوب کی دوا بیان کرنے میں اور جملہ امور مشروعہ میں حق تعالیٰ کے

یہ بھی سُن لیجئے کہ بغیر ضرورت کہیں جاتا نہیں اور بدوں احباب ذی ذہانت کے مشورہ کے گھر کے باہر قدم نہیں نکالتا۔ میں اس کو خوب جانتا ہوں کہ زمانہ نہایت پُر آشوب ہے کہیں کا اور کسی وقت کا اعتبار نہیں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں کس وقت کیا ہو جائے لیکن ضرورت ہی کی بنا پر گذشتہ دنوں ایسی بیماری کی حالت میں بمبئی آیا کہ اُن حالات میں سفر کرنا کسی طرح مناسب نہ تھا مگر بات یہ ہوئی کہ میرے داماد کا آپریشن ہوا تھا اور قاری مُبین صاحب یہاں تنہا تھے اور پریشان ہو رہے تھے اس لئے میں نے آنا ضروری سمجھا چنانچہ میں آیا۔

علاوہ اس کے اور جہاں بھی گیا بدوں اچھی طرح حالات کا جائزہ لئے ہوئے نہیں گیا چنانچہ بمبئی کا سفر بھی ضرورت سے ہی ہوا اور احباب کے مشورہ سے ہوا اب دوسرے حضرات کو اس کا کیا علم۔ اگر اعتقاد ہے تو سمجھنا چاہیئے۔

چنانچہ حضرت زکریا مُلتانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ مشہور ہی ہے کہ جب آپ مُلتان تشریف لائے تو وہاں کے مشائخ نے بالاتفاق رائے آپ کی خدمت میں ایک پیالہ دُودھ سے لبریز بھیجا حضرت زکریا مُلتانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر ایک پھول رکھ کر واپس کر دیا۔

حاضرین کو تعجب ہوا کہ آج دودھ پینے کو ملتا لیکن حضرت نے اس کو واپس فرما دیا۔ میں کہتا ہوں کہ آدمی پیر کے پاس رہے بھی تو دودھ پینے کے لئے اور کھانا کھانے کے لئے اور اس سے دین سیکھنے کے لئے نہیں یہ کیسا ہے ایسا پہلے سے ہوتا چلا آیا ہے بہرحال کسی مُرید نے ہمت کر کے پوچھا کہ حضرت یہ کیا قصہ تھا بات کچھ سمجھ میں آئی نہیں۔ فرمایا کہ یہاں کے مشائخ نے لسان اشارت میں مجھ سے یہ کہا تھا کہ یہاں کی اقلیم ایسی ہی پُر ہے جیسے یہ پیالہ دودھ سے لبریز ہے اس لئے یہاں آپ کی گنجائش نہیں ہے۔ تو میں نے بھی اس پر پھول رکھ کر اشارت ہی میں اس کا جواب

٭ فی جمیع الامور المشروعۃ فان لکل مقام حضور آدابًا یخصہٗ۔

الیواقیت جلد ۱ صفحہ ۲۲)

آداب بیان کرتے ہیں ان کی تمام مقامی نہیں کر سکتا تھا اس لئے کہ ہر ایک کو حق تعالیٰ کی نسبت اور آداب میں ایک خاص مقام حاصل ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں۔ (ناقل)

یہ دیا کہ جس طرح اس کٹورے میں پانی اور دودھ کی بیشک گنجائش نہیں ہے لیکن پھول کی گنجائش اب بھی ہے اسی طرح میں بھی آپ حضرات کے درمیان مانند پھول کے رہوں گا یعنی میرے یہاں کے قیام سے آپ کی عزت و احترام میں ذرا بھی ٹھیس نہ لگے گی۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ سارے مشائخ نے حضرت کے اس لطافت جواب کو پسند کیا اور آپ کے معتقد ہو گئے۔

دیکھئے حضرت زکریا ملتانیؒ کے قیام پر لوگوں کا اشکال ہوا مگر وہ بڑے شخص تھے کس خوبی کے ساتھ سب کو مطمئن کر دیا لیکن سب لوگ ایک مزاج ایک ذوق کے نہیں ہوتے کبھی لوگوں کے منوانے کے لئے دوسرا طریقہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک بزرگ کسی بستی میں تشریف لے گئے بستی کے لوگ اُن سے ملنے کے لئے آئے ایک صاحب مل کر واپس آرہے تھے کہ اُن کی ملاقات دوسرے شخص سے ہوئی جو اُن بزرگ سے ملنے جارہا تھا اُس آنے والے نے اس سے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو اُس نے بتایا کہ سُنا ہے کہ یہاں کوئی بزرگ آئے ہیں اُن سے ملنے جارہا ہوں اُس نے کہا چلو واپس چلو میں وہیں سے آرہا ہوں وہ بزرگ نہیں ہیں وہ تو اپنے آپ کو فقیر حقیر سراپا تقصیر کہتے ہیں یہ شخص سمجھ گیا۔ کہا کچھ بھی ہو ہم تو ان سے ملاقات کریں گے یہ کہہ کر چل دیا جا کر اُن بزرگ سے ملاقات کی اور تنہائی میں کہا کہ حضرت آپ یہاں کام کرنے کے لئے آئے ہیں نا۔ تو یہ سمجھ لیجئے کہ یہ دوسرے قسم کے لوگ ہیں نہایت سخت ہیں ان کے سامنے تواضع کی باتیں حقیر، فقیر وغیرہ مت کہئے آپکے معتقد ہی نہ ہوں گے تو فیض کیا حاصل کریں گے ان سے تو آپ یہ کہئے کہ میں خدا کی طرف سے بھیجا ہوا تمھارے یہاں آیا ہوں تمھیں اصلاح کرنی ہوگی۔

دیکھا آپ نے یہ بھی ایک طریقہ ہے آپ لوگوں کو تو اس کو سمجھنا ہی چاہئے کہ ہر جگہ اصول و قواعد ہیں اسکول اور کالجوں میں اُصول ہے دفتر اور کچہریوں میں اصول ہے لیکن ہمیں سے یہ بے اصولی کیوں اور ہمارا یہ کہنا بداخلاقی کیوں ہے بات یہ ہے کہ مشائخ سے جیسا اعتقاد ہونا چاہئے ویسی عقیدت لوگوں کی ہوتی نہیں اسی لئے بزرگوں کے فیض سے محروم رہتے ہیں ورنہ تو خدا کے خاص بندے ہر زمانہ میں رہتے ہیں مگر یا تو لوگ ان تک نہ پہنچنے کی وجہ سے محروم رہتے ہیں یا

ہاگر پہنچ بھی گئے تو ادب و عقیدت کی کمی کی وجہ سے محروم رہتے ہیں لوگوں میں تصنع و بناوٹ زیادہ آگئی ہے اور حقیقت رخصت ہوگئی ہے آج ہی ایک صاحب نے ایک واقعہ سنایا کہ مدراس سے کسی نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ یہاں تشریف لے آیئے یہاں ہزاروں ہزار آدمی آپ کے لئے تڑپ رہے ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب تحریر فرمایا کہ یہ خوب محبت ہے کہ وہاں تو ہزاروں ہزار تڑپ رہے ہیں اور یہاں اُن میں سے دس بیس بھی نہیں آتے یہ سب کچھ نہیں بس اپنی مجلس کو رونق دینے کے لئے اور جلسوں میں گرمی پیدا کرنے کے لئے مجھے بلانا چاہتے ہیں میں نہیں آؤں گا۔ بزرگوں سے جو نفع ہوتا ہے تو اعتقاد کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہی چیز مشکل ہے ہر زمانہ میں مشائخ کو لوگوں نے اعتراض کا نشانہ بنایا ہے چنانچہ دہلی میں ایک بزرگ پر لوگوں کو اعتراض تھا بادشاہ کو بھی رہا ہوگا لوگوں نے ان بزرگ سے مطالبہ کیا کہ آپ اس فعل کی وجہ بیان کیجئے انھوں نے کہا کہ بہت اچھا کل مجمع عام میں بادشاہ کے رُوبرو اِس مسئلہ پر گفتگو کرلی جائے۔

مناظرہ کا وقت مقرر ہوگیا حکم کا سوال ہوا تو اُن بزرگ نے فرمایا کہ حکم اس کے زکریا ملتانی ہوں گے لوگوں نے کہا کہ زکریا ملتانی یہاں کہاں ملتان سے تو دہلی بہت دور ہے فرمایا کہ وہ آجائیں گے۔ دوسرے دن سب لوگ جمع ہوئے یہ بزرگ بھی آئے اور سب سے پیچھے جوتوں میں بیٹھ گئے لوگوں نے کہا کہ حضرت آگے تشریف لایئے فرمایا کہ نہیں اس وقت میں مجرم کے خانہ میں ہوں مجھ پر اس وقت فرد جرم لگی ہوئی ہے اس لئے میری جگہ یہی ہے سب لوگ بیٹھے ہی تھے کہ حضرت زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ آگئے (باطنی طور پر خبر بھیج دی ہوگی کہ ہم پر مقدمہ قائم ہے آکر فیصلہ فرمایئے) اور آتے ہی ان بزرگ کا جوتہ لے کر اپنے سینے سے لگایا اور سر پر رکھ لیا۔ اب جو لوگوں نے یہ معاملہ دیکھا تو سٹ پٹا گئے کیونکہ حضرت زکریا ملتانی رح کی شہرت عام تھی اور وقت کے مسلم بزرگ تھے لوگوں نے دیکھا کہ جب یہ ان کی اتنی تعظیم فرما رہے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرتبہ میں ان سے بھی بڑے ہیں۔ سب کے سب بہت نادم ہوئے اور مناظرہ ختم ہوگیا۔

تو دیکھئے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو کسی بزرگ کی معرفت نہیں ہوتی وہ سمجھتا کچھ ہے اور وہ ہوتے ہیں کچھ۔ اسی طرح ایک اور بزرگ سماع سنتے تھے علماء کو

اُن پہ اعتراض تھا اور اعتراض اس جہت سے تھا کہ ان کے ڈاڑھی نہیں تھی اور مشائخ فرماتے ہیں کہ سماع کے شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس مجلس میں کوئی امرد نہ ہو چنانچہ لوگوں نے اس کو اِن سے کہا فرمایا کہ بس آپ لوگوں کو یہی اعتراض ہے اچھا تو پھر لیجئے یہ کہہ کر لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو چہرہ پر پھیرا۔ چہرہ پر اچھی خاصی ڈاڑھی ہوگئی۔ سارے معترض شرمندہ ہوگئے یہ اس پہ کہہ رہا ہوں کہ بزرگوں پر اعتراض کی عادت اچھی نہیں ہے کیونکہ اسی طرح اعتراض کرتے رہوگے اور اگر کوئی شخص بالفرض ہوا اور آپ نے حسب عادت اس پہ بھی اعتراض کر دیا تو مشکل میں پڑ جائیے گا کیونکہ اس کا (ولایت و بزرگی) کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے اور قیامت تک اللہ کے مقبول بندے دُنیا میں موجود رہیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ اُمت محمدیہ کی مثال بارش کی سی ہے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا اوّل خیر ہے۔ یا آخر خیر ہے اس لئے بزرگوں کے معاملے میں سوچ سمجھ کر کوئی کام کرنا چاہئے اور انکار یا اعتراض تو کرنا ہی نہیں چاہئے۔ ایک بزرگ کے یہاں کوئی صاحب گئے کسی برتن پر نظر پڑی اس سے یہ صاحب یہ سمجھے کہ یہ بزرگ شراب کا استعمال کرتے ہیں یہ رائے قائم کرکے وہاں سے چل دئے اور مسجد جا کر قیام کیا نہانے کی ضرورت پیش آگئی اب مٹکے میں جو جا کر دیکھتے ہیں تو بجائے پانی کے شراب بھری ہے دوسری مسجد میں غسل کرنے کے لئے گئے تو وہاں بھی حوض میں شراب بھری ہوئی ہے بھاگے ہوئے دریا پہ گئے وہاں پہ بھی یہی دیکھا سمجھ گئے کہ یہ ان بزرگ کا تصرف ہے اور میری بے ادبی کی سزا دی گئی ہے لہٰذا فوراً چل کر معافی مانگنا چاہئے ورنہ ساری عمر اسی طرح ناپاک رہ جاؤں گا چنانچہ آئے اور قدموں پہ سر رکھ دیا اور عرض کیا کہ حضرت بے ادبی معاف فرما دی جائے طریق میں ادب ہی تو اصل چیز ہے جس کو جو کچھ ملا ہے ادب سے ملا ہے اس لئے بزرگوں کا ادب کرنا چاہئے یہ حضرات خود بھی باادب ہوتے ہیں شریعت کا ادب اور حق تعالیٰ کا ادب ان سے زیادہ کون کر سکتا ہے یہی حضرات خادمان دین ہوتے ہیں ان کو کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ حضرت جلال الدینؒ پانی پتی کبیرالاولیا بڑے ہی صاحب جلال بزرگ تھے ایک مرتبہ اُن کی لبیں بڑھی ہوئی تھیں مگر رُعب کی وجہ سے کوئی اسے کاٹنے کی ہمت نہ کرتا تھا اور نہ حضرت سے ہی کہہ سکتا تھا۔ قاضی ضیاء الدین سنامی نے ہمت کی اور ایک ہاتھ سے حضرت کی ریش پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے قینچی لے کر لب کتر دی اس کے بعد

سے حضرت کا یہ حال تھا کہ کبھی کبھی اپنی ڈاڑھی کو پکڑ کر بوسہ دیتے اور فرماتے تھے کہ یہ ایک بار شریعت محمدی کے راستے میں پکڑی گئی ہے اسی طرح ایک اور بزرگ کا قصہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ان سے کسی خاص حالت میں کوئی کلمہ خلاف شرع صادر ہوگیا جب وہ حالت ختم ہوگئی تو مریدوں نے عرض کیا کہ حضرت نے ابھی ایسا ایسا کہا ہے فرمایا کہ اچھا میں نے کہا ہے پھر اس کے بعد ٹھنڈے پانی میں ایک پاؤں پر کھڑے ہوکر یہی کہتے رہے کہ شریعت محمدی دائم و قائم شریعت محمدی دائم و قائم یہاں تک کہ سردی کی وجہ سے پاؤں پھٹ کر لہو لہان ہوگئے بالآخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا کہ تمہاری توبہ قبول ہوگئی جب اس کو چھوڑا۔ یہ واقعات اس پر سنا رہا ہوں کہ آپ ہمیں کیا پابند کرتے ہیں جتنا پابند آپ کرنا چاہتے ہیں اس سے کہیں زیادہ پابند ان حضرات نے اپنے کو کر رکھا ہے فرق یہ ہے کہ ان کا خود کو پابند کرنا اللہ تعالیٰ کے تعلق کی وجہ سے ہے اور اتباع سنت و شریعت کی وجہ سے ہے اور آپ کا ان کو پابند بنانا کمی عقیدت کے سبب سے ہے اور قلت ادب و احترام کی بنا پر ہے۔

بزرگوں سے فیض حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے اعتقاد درست کرو تب تلاش کرو کوئی اللہ کا بندہ مل ہی جاوے گا ورنہ اگر ان کا ادب اور ان کے ساتھ اعتقاد ہی نہ ہوا تو کوئی ملا ہوا بھی ہوگا تو گویا نہیں ملا ہے بزرگوں کو اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی ہے۔ اس کے ثمرات میں سے توکل ہی تو اصل چیز ہے اب اس میں ان کو اپنے سے بھی کم سمجھنا کیا یہی عقیدت ہے عام لوگوں سے اگر پوچھا جائے کہ تمھیں روزی کون دیتا ہے تو یہی کہیں گے کہ خدا دیتا ہے اور ہمارے متعلق یہ خیال کہ لوگ دیتے ہیں۔ مشائخ کے متعلق یہ بدگمانی کہ انھیں توکل کا وہ درجہ بھی حاصل نہیں ہے جو عوام الناس کو حاصل ہوتا ہے کیا اسی کا نام عقیدت ہے۔ ایک بزرگ دہلی میں آکر ٹھہرے کئی وقت کے فاقہ کے بعد ایک شخص نے گرم گرم بریانی قاب میں لاکر پیش کی خوب سیر ہوکر کھایا کچھ بچ رہی خیال کیا کہ اس کو اٹھا کر رکھ دیں کہ دوسرے وقت کھائیں گے یہ سوچ کر قاب کو طاق پر رکھنا ہی چاہتے تھے کہ پھر یہ خیال ہوا کہ اٹھا کر رکھنا توکل کے خلاف ہے جس خدا نے اس وقت دیا ہے دوسرے وقت بھی دے گا۔ یہ کہہ کر نیچے اترے کہ کسی فقیر کو دے دیں سیڑھیوں پر ایک مجذوب سے ملاقات ہوئی اس نے انھیں دیکھ کر کہا خوب سمجھا بے سالے خوب سمجھا ٹھہر چکی تھی

کہ اگر قاب کو طاق میں ٹیک دے تو بھوکا مار دیا جائے۔" دیکھا آپ نے یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ آجاتا ہے۔ اور اس کے متعلق ایک حدیث بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ من جعل همه هماً واحداً هم الآخرة جعل الله غناءہ فی قلبه وجمع شمله واتته الدنيا وهي راغمة ومن همه هم الدنيا جعل فقره بين عينيه وشتت امره ولا ياتيه الا ما كتب له او كما قال۔

یعنی جس شخص نے اپنا سارا غم ایک غم کو بنا لیا اور وہ غمِ آخرت ہے تو اللہ اُس کے قلب میں غنا ڈال دے گا اور اس کی پراگندگیوں کو مجتمع فرما دے گا اور دُنیا اس کے پاس ناک رگڑتی ہوئی آئے گی اور جس شخص نے اپنا سارا غم غمِ دُنیا کو بنا لیا تو اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں کے سامنے فقر کو کر دیں گے اور اس کے سب کاموں میں تشتت پیدا فرما دیں گے اور رزق تو جتنا مقدر ہے اُتنا ہی ملے گا۔

مومن کو شریعت کی جانب سے رزق کے باب میں یہ تعلیم دی گئی ہے اس کو بھی سمجھنا اور اس پر ایمان لانا ضروری ہوگا اور کسی کام کو اگر قاعدہ سے کیا جائے تو کام کیوں نہ ہوگا باقی اس زمانہ میں دین کا کام کرنا جو مشکل ہو رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اور دینی کام کرنے کا طریقہ جب سیکھا جاتا ہے تب آتا ہے اور جب دین کو اور اس کے طریق کار کو سیکھا ہی نہ جائے گا تو دین کیسے آجائے گا اور اس بات کو آپ کے اکبر حسین جج نے خوب سمجھا اس کا افسوس ہوتا ہے کہ دین کی جس بات کو ایک انگریزی داں اور جج نے سمجھ لیا اور اس کو ایک دوسرے کو سمجھایا جا رہا ہے مولوی صاحب کی زبان سے اس کو نہیں سنا جا رہا ہے وہ کہتے ہیں کہ ؎

انھوں نے دین کب سیکھا ہے رہ کر شیخ کے گھر میں
پلے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں

جہاں تعلیم پائی ہے انھیں لوگوں کے بارے میں کہہ رہے ہیں اتنا تیز تو ہم کبھی نہیں کہتے مگر بات خوب سمجھائی ہے یعنی یہ کہ دین سیکھا جاتا ہے تب آتا ہے اور یہ بھی بتایا کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص شیخ کے گھر میں رہتا ہو لیکن دین سیکھنے کی جانب توجہ نہ کئے ہو تو محض شیخ کے یہاں رہنے کی وجہ سے اُس کو دین نہیں آجائے گا پھر جب عام طور سے لوگوں کو دین کی طلب ہی نہ ہو اور طبیعتوں میں آزادی آگئی ہو تب تو کچھ لوگوں کو اہتمام کے ساتھ

دین کے کام میں لگنا ضروری ہے ورنہ دین کی گاڑی چلے گی کیسے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ اگر مشائخ کی صحبت میسر آئے تب تو ان سے دین حاصل کرنا چاہئے اور اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو پھر ان کی تصانیف اور ان کے ملفوظات کو حصول دین کا ذریعہ بنانا چاہئے اس لئے کہ مشائخ کی غرض کتب طریق کی تدوین سے یہی تھی کہ بعد کے لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں۔
علامہ شعرانیؒ نے الیواقیت والجواہر میں اس مضمون کو بہت ہی عمدہ طریق سے بیان فرمایا ہے اس کو یہاں ہم بعینہٖ نقل کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ

فكذلك العارفون لهم اجر نياتهم وقصدهم الصالح من نفع المريدين بما وضعوه من الحقائق الكاشفة لمشكلات علم التوحيد وامراض القلوب۔

ومن فوائد تدوينهم تلقيح قلوب الناظرين في رسائلهم من بعدهم فيظفروا من تلك المعاني بما يرقيهم ويبعث سحاب الرحمة على قلوبهم وعلى السنتهم فتشرق ارض قلوبهم بنور رشدهم وتحيا باثر هداياتهم فتنابت عنهم رسائلهم بعد موتهم في نصح المريدين۔

وكان تدوين معارفهم واسرارهم من احق الحقوق عليهم لكون غيرهم لا يقوم مقامهم في تدوين دواء امراض القلوب وآداب حضرات الحق تعالى في جميع الامور المشروعة فان لكل مقام حضوراً وادباً يخصه

(صفحہ ۲۷ الیواقیت ج ۱)

اسی طرح سے عارفین بھی ہیں کہ ان کو ان کی نیتوں کا اجر اور ان کے قصد صالح کا ثواب ملے گا اور وہ یہ کہ طالبین کو ان کی بیان کردہ حقائق سے نفع پہنچے گا جو کہ علم توحید اور امراض قلوب کی مشکلات کو کشف کرنے والی ہیں۔) اس کے بعد تدوین کے قواعد بیان کرتے ہیں کہ ان کی تدوین کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ ان کے بعد جو لوگ ان کے رسائل کو دیکھیں تو ان کے قلوب ان مضامین سے بھر جائیں جو ان رسائل میں ہیں پس ان معنی کے سبب وہ ترقی کرسکیں اور رحمت کے بادل ان کے قلب و زبان پہ اٹھیں اور ان کے قلوب کی زمین ان کے رشد کے نور سے منور ہو جائے اور ان کے ہدایت کے اثر سے زندہ ہو جائیں پس ان کے رسائل ان کی وفات کے بعد ان کی نیابت کریں اور اپنے اپنے معارف اور اسرار کی تدوین ان کے ذمہ سارے حقوق سے بڑھ کر لازم اور ضروری تھی اس لئے کہ ان کا غیر امراض قلوب کی دوا بیان کرنے میں اور جملہ امور مشروعہ میں حق تعالیٰ کے آداب بیان کرنے میں ان کی قائم مقامی نہیں کرسکتا تھا اس لئے کہ ہر ایک کو حق تعالیٰ کی نسبت اور آداب میں ایک خاص مقام حاصل ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں۔

دیکھئے فرمارہے ہیں کہ ان حضرات کی نیت اپنے تصانیف سے علم توحید اور امراض قلوب کی مشکلات کو دور کرنا تھا اس لئے کہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم ان علوم کو اپنے ساتھ لے چلے جائیں گے تو بعد میں آنے والے لوگ ان کی توضیح اور تبیین پر اس درجہ قادر نہ ہوں گے اس لئے ان لوگوں نے یہ خیال کیا کہ ہم نہ ہوں گے تو ہماری قائم مقامی ہماری کتابیں ہی کریں گی اور اگر کتابیں بھی نہ ہوں گی اور ہم بھی نہ ہوں گے تو علوم بھی مُردہ ہوجائیں گے اس لئے کہ موتُ العلم بموت اہلہ یعنی عالم کی موت علم کی موت ہوا کرتی ہے اگر اُس نے اپنے علوم کو مدون نہ کیا ہو۔

دیکھا آپ نے موت العالِم موت العالَم تو بہت مشہور مقولہ ہے یعنی عالِم کی موت زمانے کی موت ہے لیکن یہ جملہ اس سے بھی بلیغ ہے کہ موت العالم موت العلم عالم کی موت گویا علم کی موت ہے اب لوگ اس کو بھی نہیں سمجھتے۔ یہ میں علماء کو خطاب کررہا ہوں جو ہم سے پوچھتے ہیں کہ کیسے کام کریں اور یہ چاہتے ہیں کہ ایک ہی آدمی تمام ہندوستان میں گھومتا پھرے۔ میں انھیں طریقہ کار بتلا رہا ہوں کہ ایک آدمی کے بس کی بات نہیں ہے اس میں بہت کام کرنے والے ہونے چاہئیں لہٰذا کام کا طریقہ یہی ہے کہ اگر خود کچھ کام کرسکتے ہو اور لوگوں کو راہ ہدایت پر لگا سکتے ہو تو خود کرو ورنہ بزرگوں کی کتابوں کو ہی سناؤ اور لوگوں کو (علم توحید تو بہت مشکل چیز ہے) امراض قلوب ہی سمجھا دو بزرگوں نے اپنے پاس آنے جانے والوں کو امراض قلوب سمجھایا ہے اور اسی سے ان کی اصلاح کی ہے والیٔ ملتان نے ایک شخص کے ذریعہ بابا فریدشکر گنج رحکی خدمت میں کچھ ہدیہ بھیجا اس نے یہ کیا کہ آدھا رکھ لیا اور آدھا حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ شیخ نے فرمایا بھائی یہ برادرانہ تقسیم تو ٹھیک نہیں ہے آج کل کے لوگ ہوتے تو خفا ہوجاتے کہ ہم کو متہم کرتے ہیں وہ شخص ڈر گیا اور جو نصف رقم رکھ لی تھی وہ بھی لاکر حضرت کو پیش کردی۔ حضرت نے یہ کیا کہ اس سے فرمایا کہ بھائی مجھے رقم مقصود نہیں ہے میں آخر کسی کو دے دیتا اس لئے اب تمھیں کو دیتا ہوں اس کو اپنے پاس رکھے رہو اور یہ لو نصف بھی تمھیں لے جاؤ مجھے تو صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ ہم لوگوں سے اس قسم کی چال نہیں چلنا چاہئے اُس شخص نے جب یہ دیکھا کہ ایسے بڑے صاحبِ کشف بزرگ ہیں کہ فوراً چوری پکڑلی تو بہت نادم ہوا اور معافی مانگی اور حضرت سے

بیعت کی درخواست کی حضرت نے مُرید کرلیا۔ چند دنوں اپنے پاس رکھا اور تکمیل کے بعد فرمایا کہ جاؤ مُلتان کی ولائت تم کو دیتا ہوں۔ دیکھئے قلب کی اصلاح کرکے اور صدق و خلوص اختیار کرکے یہ شخص دین بھی پاگیا اور دُنیا بھی پاگیا۔

اور جس طرح اِن بزرگ نے کشف کے ذریعہ اُس کے چور کو پکڑ لیا جس کی وجہ سے اُس کی اصلاح ہوگئی اسی طرح سے ہر زمانہ میں بزرگوں نے اپنی فراست اور صفائی باطن کے ذریعہ لوگوں کے قلبی چور کو پکڑا ہے۔ ایک بزرگ نماز پڑھ رہے تھے سلام پھیرا تو خادم نے اطلاع دی کہ حضرت بادشاہ آیا ہے انھوں نے سُن لیا مگر اسکی طرف التفات نہیں کیا اور پھر نماز کی نیت باندھ لی خادم نے واپس آکر بادشاہ سے کہدیا کہ میں نے آپ کی اطلاع تو کردی حضرت نے کچھ فرمایا نہیں اور نماز کی نیت باندھ لی بادشاہ کو خیال ہوا کہ شاید یہاں آکر کے اجازت طلب کرنا پسند نہ ہوا ہو اس لئے خود ہی اندر چلا گیا وہ بزرگ بہت تپاک سے ملے سیب منگایا اور خود اپنے ہاتھ سے کاٹ کاٹ کر اس کو کھلانے لگے ان میں ایک سیب ذرا بڑا تھا اس کے متعلق بادشاہ نے دل میں خیال کیا کہ اگر ان کے قلب میں روشنی ہے تو یہ سیب مجھے دے دیں گے۔ دیکھتے ہیں آپ ان بزرگ کا امتحان لینے لگے بس یہی رہ گیا ہے اِسی قسم کی بے ادبیاں لوگ مشائخ سے کرتے ہیں اور ان کے فیض سے محروم رہتے ہیں اپنی آنکھ کی روشنی کی تو خبر نہیں ہے اور دوسروں کے قلبی نور کا امتحان کرنے کے لئے تیار۔ خیر ادھر بادشاہ کے دل میں یہ خیال گذرا ادھر اُن بزرگ نے ان کو مخاطب کرکے کہا کہ سُنو ایک دراز گوش تھا وہ یہ تماشا کیا کرتا تھا کہ مجمع میں لوگ اُسے دکھلا کر کوئی چیز مثلاً انگوٹھی گھڑی وغیرہ نظر بچاکر کسی شخص کے پاس رکھ دیتے اور اُس دراز گوش کی آنکھ پر پٹی باندھ کر چھوڑ دیتے تھے وہ ہر شخص کے پاس جاتا تھا اور اُس شخص کو سونگھتا تھا جس کے پاس وہ چیز ہوتی تھی اس کو سر سے مارنے لگتا تھا۔ اس قصہ کو سُنا کر فرمایا کہ اب اگر میں بھی اپنے کشف کو ظاہر کرتا ہوں تو دراز گوش کے برابر ہوتا ہوں اور اگر نہیں ظاہر کرتا تو تم کہوگے کہ درویش کے قلب میں نور نہیں ہے یہ کہہ کر اس بڑے سیب کو بادشاہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا لو میں یہ تم کو دیتا ہوں۔ دیکھا آپ نے مشائخ کے ساتھ ہر زمانہ میں اس قسم کا معاملہ اہل دُنیا

نے کیا ہے۔

حضرت مولانا تھانوی رح کی خدمت میں تین شخص گئے ایک خاص لباس میں ان میں سے ایک نے کہا کہ ہم تو یہ لباس قصداً پہن کر چل رہے ہیں تاکہ ان کو تکلیف ہو بقیہ دو نے کہا کہ ہم تو بزرگ سمجھ کر ان کی ملاقات کو جا رہے ہیں حضرت کے یہاں پہنچنے پر ان کی نیت کے مناسب ان کے ساتھ معاملہ ہوا یعنی اُن دونوں کو تو بُلا کر پاس بٹھایا اور اس شخص پر جس نے کہا تھا کہ ایذا پہنچانے کے لئے اس لباس میں جا رہا ہوں بہت زور سے خفا ہوئے اور ڈانٹ کر نکال دیا صریح کشف تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ لوگ راستے میں باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے وہیں موجود تھے۔ اسی طرح ایک شخص نے اپنا کوئی حال لکھا اور کسی نہایت ہی سخت معصیت کے صدور کا ذکر کیا تھا اور حاضری کی بھی اجازت چاہی تھی حضرت نے اجازت تو دے دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ یہاں آکر مجھ سے یہ نہ کہنا کہ میں فلاں شخص ہوں چنانچہ وہ آیا۔ حضرت اس کی شکل دیکھتے ہی بڑے زور سے تڑپے اور اسے خانقاہ سے باہر نکال دیا۔ معلوم نہیں کیسے جان لیا کہ یہ وہی شخص ہے۔

اس قسم کے واقعات روز دیکھنے میں آتے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کس قدر نور ان کے سینے میں رکھا تھا لوگوں کا اعتقاد درست ہوجاتا تھا بزرگوں کے یہاں جاکر عقیدت ہی تو درست کرنے کی چیز ہے۔ ع

"عقیدے کو کرو کامل دکھاؤ جا کے نبض دل"

چنانچہ جو حضرات بزرگوں کے یہاں اس طور سے گئے وہ کامیاب ہوگئے۔

حضرت مولاناؒ کی مجلس میں ایک مولوی صاحب بہت بولا کرتے تھے وہی امراض قلوب چنانچہ اہل علم کا مرض یہی ہے حضرت نے ان کی اصلاح فرمانے کے لئے یہ کہا کہ ہمارے مولوی صاحب بولتے بہت ہیں پھر اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ انشاء اللہ اب نہ بولیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا ہم لوگوں نے دیکھا کہ مولوی صاحب بالکل خاموش ہوگئے اور خود وہ کہتے تھے کہ چاہتا ہوں کہ بولوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی زبان پکڑ لیتا ہو۔ یہ اس پر عرض کر رہا ہوں کہ کاملین ہر زمانہ میں ہوئے ہیں لیکن فائدہ انھیں کو ہوا ہے جو ان کی خدمت میں عقیدت کے ساتھ گئے ہیں اور

یہ سلسلہ تو شروع ہی سے چلا آرہا ہے ؎

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم

ز خاکِ مکہ ابوجہل این چہ بوالعجبی است

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے حسن رضؓ بصرہ سے آکر بلال رضؓ حبش سے آکر اور صہیب رضؓ روم سے آکر مستفیض ہوئے لیکن اسی مکہ کی سرزمین میں ابوجہل کو کچھ بھی نفع نہ ہوا کس قدر حیرت کی بات ہے۔ حضرت مولانا کے واقعات میں نے آپ کے سامنے بیان کئے کہ ان کے اندر اتنا نور تھا اسی کی روشنی سے سب کو دیکھتے تھے اور اسی کی مناسب معاملات فرماتے تھے۔ اس پر لوگ بداخلاق کہتے تھے جو چیز کسی بزرگ کا عین کمال ہو اس کو نقص قرار دیا جائے کتنے افسوس کی بات ہے اور کس قدر محرومی کی بات ہے لوگوں نے اس زمانے میں للو چپو کا نام اخلاق رکھ لیا ہے اس زمانے میں دھرا ہے اخلاق بہت دن ہوگئے اخلاق ختم ہوئے۔

مجھے لوگ جگہ جگہ سے بلاتے ہیں ابھی ایک صاحب اپنے وطن گئے ہوئے تھے کہتے تھے کہ ہمارے یہاں کے لوگوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ایک ہفتہ کے لئے یہاں آجاتے تو لوگوں کو بہت نفع ہوتا اسی طرح ایک دوسرے قصبہ کے بارے میں بھی کہتے تھے کہ وہاں کے لوگوں نے بھی کہا کہ کچھ دنوں کے لئے یہاں آجاتے تو بڑا اچھا ہوتا اور ایک صاحب نے تو مجھے یہ لکھا کہ گرمی میں بمبئی گئے ہیں تو سردی میں ہمارے یہاں تشریف لائیے اس کے متعلق کہتا ہوں کہ ہمارے بلانے سے کیا مقصد ہے اگر کام چاہتے ہیں تو یہ کام کا طریقہ نہیں اور نہ اس طریقہ سے کام ہوسکتا ہے بلکہ کام کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں ایسے علماء اور مشائخ موجود ہیں جو کام کے اہل ہیں لوگوں کو فیض پہنچا سکتے ہیں وہ خود کام کریں اور جہاں ایسے لوگ نہیں ہیں وہاں کے جو پڑھے لکھے لوگ ہیں وہ مشائخ معتبرین کی تصانیف لوگوں کو سنائیں اور اس کے ذریعہ سے دین کو سمجھائیں اور لوگوں میں اثر پیدا کریں ابھی آپ کے سامنے علامہ شعرانی کے کلام سے دکھایا کہ بزرگوں کا کلام بھی اُن کے بعد ان کا نائب ہوتا ہے اور نائب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اُن کی صحبت موثر ہوتی ہے اسی طرح ان کا کلام بھی موثر ہوتا ہے لیکن صحبت کا فائدہ تو صرف ان کی حیات ہی

میں اُٹھایا جاسکتا ہے مگر ان کے کلام سے نفع ان کے حیات میں بھی ہوتا ہے اور وفات کے بعد بھی ہوتا ہے آپ کے سامنے مثال کے طور پر حضرت مولانا تھانویؒ ہی کو پیش کرتا ہوں کہ حضرت کی صحبت سے لوگوں کو کتنا نفع پہنچا اسی طرح حضرت کے کلام اور تصانیف اور ملفوظات سے بھی آپ کی حیات میں بھی کتنے لوگ فیضیاب ہوئے اور اب حضرت کے بعد بھی ان کا نفع جاری ہے البتہ یہاں یہ خیال ہوسکتا ہے کہ اس گفتگو سے تو مشائخ کے کلام کا فضل اور نفع معلوم ہوتا ہے لیکن جب دین میں اس کا یہ درجہ ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے کلام یعنی قرآن شریف کا فائدہ اور نفع تو اس سے کہیں بڑھ کر ہوگا تو اس کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ اس میں تو کلام ہی نہیں کہ سرچشمہ ہدایت کتاب اللہ ہی ہے اور اس کے بعد احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں لیکن تمام لوگوں کے لئے براہ راست کتاب اللہ سے منتفع ہونا آسان نہیں ہے اس لئے کہ نہ ان میں استعداد ہوتی ہے اور نہ مناسبت ہی ہوتی ہے لہٰذا دین سے و کتاب وسنّت سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے مشائخ کا کلام پڑھیں اور سنیں اور اسی کو کتاب وسُنّت سے مناسبت کا ذریعہ بنائیں پھر جب مناسبت ہوجائے تو اصل راہ تو کتاب وسُنّت ہی ہے کتاب اللہ کی تلاوت کریں اور اس کے معنی میں تدبر کریں اور اللہ تعالیٰ کی معرفت میں ترقی حاصل کریں۔

ایک بات یہ سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد خلفاء چھوڑے جنھوں نے آپؐ کی صحیح ترجمانی کرکے دین کو آگے بڑھایا اسی طرح سے مشائخ نے بھی اپنی تعلیمات کو (کہ دراصل وہ خُدا اور رسول کی ہی تعلیمات ہیں) اپنے بعد باقی رہنے کے لئے انسانوں میں خلفا مقرر کئے تو خلیفہ اور نائب کا یہی مفہوم آج تک آپ کے ذہن میں رہا ہوگا لیکن آج آپ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح انبیاء اور مشائخ کے خُلفاء انسانوں میں سے کچھ لوگ ہوتے ہیں اسی طرح سے ان کا کلام بھی ان کا خلیفہ ہوتا ہے بلکہ یہ خلفا بھی اسی بات کے لئے ہیں کہ ان کی تعلیمات کو ان کے بعد باقی رکھیں پس ان کے بعد اصل چیز ان کی تعلیمات ہیں کسی آدمی کے ذریعہ باقی ہیں تو وہ خلیفہ ہے اور کتاب کے ذریعہ باقی رہیں تو وہ خلیفہ ہے بہرحال میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر اصل

سے فیض حاصل کرنا ممکن نہ ہو سکے تو فرع اور خلیفہ سے ہی نفع حاصل کرو جو قوت تاثیر میں گو اصل کے برابر نہ ہو تاہم اس کی جانب رجوع ہوئے بغیر چارہ کار ہی کیا ہے ؎

چوں کہ گُل رفت و گلستاں شُد خراب   بوئے گُل را از کہ جوئیم از گُلاب
چوں کہ شُد خورشید و ماراکرد داغ   چارہ نبود در مقامش جُز چراغ

(ترجمہ) یعنی جب کہ (گلاب کا) پھول باقی نہیں رہا اور گلستان ہی ویران ہوگیا تو اب پھول کی خوشبو بجز (عرق) گلاب کے اور کہاں سے حاصل کریں اسی طرح سے آفتاب چھپ گیا اور جُدائی کا داغ ہم کو دے گیا تو اب اس کی جگہ سوائے چراغ سے روشنی حاصل کرنے کا چارہ کار ہی کیا ہے۔

پس جب بزرگوں کو نہیں پایا یا پایا اور ان سے فیض نہیں اُٹھایا تو سوائے اس کے چارہ کار ہی کیا کہ اُن کی تصانیف کو لیا جاوے اور ان کے کلام سے فائدہ اُٹھایا جائے کیونکہ ان کا کلام ہی ان کا نائب ہے اور لوگوں کو نفع پہنچانے میں ان کی صحبت ہی جیسا اثر رکھتا ہے اس لئے کہ کسی کی صحبت موثر اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ شخص خود کامل ہوتا ہے اور جن باتوں کو دوسرے سے کہتا ہے خود اپنے قلب میں اس کا اثر لئے ہوئے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے تعلق و محبت اور اس کے عرفان سے اس کا قلب بھرا ہوتا ہے اس لئے جو شخص اس کی صحبت میں بیٹھتا ہے اس کا قلب بھی اس کے قلبی اثر سے متلون ہو جاتا ہے بس اسی طرح کلام کا بھی اثر ہوتا ہے کیونکہ کسی کا کلام حقیقتاً اس کے قلب ہی کا ترجمان ہوتا ہے چنانچہ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے کہ ؎

اِنَّ الکلامَ لفی الفؤادِ وانّما
جُعِلَ اللسانُ علی الفؤادِ دلیلاً

بلاشبہ کلام تو قلب میں ہوتا ہے باقی زبان جو تکلم کرتی ہے تو یہ قلب ہی کی ترجمانی کرتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کلام متکلم کے قلب کا ترجمان ہوتا ہے لہٰذا جس قلب میں خدا کی معرفت خدا کا ذکر اور خدا کی محبّت بھری ہو گی تو اس کے کلام میں ان آثار کا ہونا ضروری ہے اور جس کے سامنے وہ کلام پڑھا جائے اس پر اثر ہونا ضروری ہے۔ مولانا رومؒ نے بھی مثنوی میں اس مضمون کو بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ

ہاں مشو مغرور زاں گفت نکو | زانکہ باشد صد بدی در زیرِ او
ہر کہ باشد زشت اورا زشت داں | ہر چہ گوید مردہ آں رانیست جاں
گفت انساں پارۂ انساں بود | پارۂ از ناں یقیں ہم ناں بود

یعنی مکاروں کے ظاہری کلام دلپسند پر فریفتہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ اس کے باطن میں صدہا خرابیاں ہوتی ہیں جو شخص خود اخلاق ذمیمہ رکھتا ہو اس کا کلام ضرور بُرا اثر رکھے گا اور مُردہ دل جو کہے اس میں بھی جان یعنی تاثیر نہ ہوگی کیونکہ انسان کا کلام مثل جزء انسان کے ہے (جیسا متکلم ہوگا ویسا ہی اس کا کلام ہوگا) جس طرح روٹی کا ٹکڑا بھی روٹی ہوتا ہے اب یہ کتنا آسان طریقہ ہے کام کرنے کا کہ اگر آدمی سمجھتا ہے کہ میرے لئے کلام میں تاثیر نہیں ہے تو بزرگوں کا کلام پیش کرے ان کا کلام مقبول ہے اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہے اس میں تاثیر ہے اس کو ایک صاحب لکھتے ہیں کہ

"ماشاء اللہ معرفتِ حق خوب ہی خوب حق کی معرفت کا حق ادا کرتا رہتا ہے اسی طرح مکانی قرب کی سعادت سے محرومی کے باوجود تعلیمی فیوض و برکات اس سے بہت زیادہ نصیب ہوتے رہتے ہیں۔ جتنا کہ کبھی کبھی کی حاضری سے ہوتے ہیں۔ دیکھئے مولوی صاحب فرمارہے ہیں کہ رسالہ معرفت حق کے مطالعہ سے ہی نفع ہوتا ہے بلکہ یہ فرمارہے ہیں کہ جتنا کبھی کبھی حاضری سے ہوتا ہے اس سے زائد ہوتا ہے اب جب یہ مولوی صاحب کسی کے کلام سے متاثر ہوگئے تو اگر اسی کو دوسرے لوگوں سے بیان کر دیں تو کیا وجہ کہ لوگ اس سے متاثر نہ ہوں۔ راقم عرض کرتا ہے۔

مولوی صاحب نے جو یہ لکھا کہ بسا اوقات کلام کا اثر صحبت کے اثر سے زیادہ معلوم ہوتا ہے تو یہ صحیح لکھا ہے حضرت والا مدظلہ العالی نے فوائد الصحبتہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا ایک کلام نقل فرمایا ہے جو انھوں نے اخبار الاخیار کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے اس سے اس کی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

و بعد از حرمانِ دولتِ صحبتِ کاملاں و مشاہدۂ جمالِ عارفاں استماعِ اخبار و تتبعِ آثارِ ایشاں در رہت فرمائی و در	ترجمہ:۔ اور کاملین کی صحبت کی دولت اور عارفین کی زیارت کی نعمت سے محروم ہونے کی حالت میں ان حضرات کے اقوال اور حکایات کا سننا اور

ظلمت زدائے رہاں تاثیر دارد کہ صحبت و مجالست بلکہ این نیز نوعے از صحبت است کہ جمال وقت و روئے از غبار کدورت بشری و حجاب صورت عنصری مصفیٰ است وصفائے حُسن و عقیدت از مشاہدہ عادیات و اطلاع بزلات منزہ۔ (اخبار الاخیار)	اور ان کے حالات کا تتبع کرنا بھی سالک کی ہمت بڑھانے اور اس کے قلب سے غفلت کو دور کرنے میں وہی تاثیر رکھتا ہے جو ان کی صحبت اور ہمنشینی رکھتی ہے بلکہ یہ بھی ایک قسم کی صحبت ہی ہے (اور وہ بھی ایسی کہ) وقت اور شکل کا جمال بشری کدورتوں کے غبار اور صورتِ عنصری کے حجاب سے بالکل صاف ہوتا ہے اور حُسنِ عقیدت کی صفائی امورِ طبعیہ کے مشاہدہ نیز لغزشوں پر اطلاع پانے سے منزہ ہوتی ہے۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ کسی شیخ کی مصاحبت میں تو ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ سالک کے لئے کسی بزرگ کی بشریت اور اس کی انسانی کمزوریاں اس طالب کے حق میں اُس کے حصول فیض کے لئے حجاب بھی بن جائیں یعنی بعض امور یا بشری لغزش دیکھ کر سالک کی عقیدت میں تغیر واقع ہوسکتا ہے لیکن ان کے ملفوظات ارشادات حالات اور حکایات میں تو صرف ان کے جمال اور کمال ہی کا پہلو ہوتا ہے لہٰذا اس کا نافع ہونا اور احتمال ضرر سے خالی ہونا ظاہر ہے اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کے مقالات اور حالات کا سُننا اور دیکھنا بھی گویا ان کی صُحبت ہی میں بیٹھنا ہے اور بعض حالات میں صحبت کا نعم البدل ہے۔

اسی طرح سے ایک اور مولوی صاحب نے ابھی چند ہی روز ہوئے مجھے لکھا کہ معرفتِ حق کا افادہ اور افاضہ بفضلہ تعالیٰ اِس دیار میں بہت ہی تام اور تقریباً عام ہو رہا ہے۔ایک صاحب ریلوے میں ہیں۔بہرائچ کے باشندے ہیں چند دن پہلے تہذیب جدید کے شکار اس بحر میں غریق تھے ان کو کسی طرح اس کے مطالعہ کی توفیق ہوئی اب جو ان کو دیکھا تو پہچان میں نہیں آئے یعنی چہرہ پر داڑھی آگئی تھی اور انھوں نے بتایا کہ اِسی رسالہ نے مجھے دین بتایا اور اسی کی وجہ سے میں یہاں تک پہنچا اور اپنے احباب کو بھی اس کے مطالعہ کرنے کی برابر ترغیب دیا کرتا ہوں اور جو صاحب بھی دیکھتے ہیں اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

اور ایک صاحب ہیں جو اکثر رسائل منگاتے ہیں ایک روز فرما رہے تھے کہ الفرقان

ہیں صوفیہ کی نسبت کے متعلق معرفتِ حق سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جو عجیب اور غریب ہے اور اس کا اثر اس سے بھی کہیں اعجب اور اغرب ہے پڑھتے جائیے اور معلوم ہوتا ہے کہ دل کے اندر خود بخود اُترتا جاتا ہے اور اپنی جگہ بنا لیتا ہے اور قلب کی عجیب حالت ہوجاتی ہے۔ بندہ نے ان سے عرض کیا کہ آپ تو اس کے بہت ماہر ہیں اور واقف ہیں اور بات صرف اتنی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی صحیح باتیں بلا کسی اینچ پینچ کے ایک صحیح انسان (ولی) کی زبان اور قلم سے ہمارے دل تک پہنچتی ہیں پس ممکن نہیں کہ دل اس کا اثر قبول نہ کرے جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان کا حصہ ہوگا وہ یقیناً تڑپ جائے گا اور نور سے بھر جائے گا۔

اور بندہ کو تو خاص حضرت کی مجلس مقدس کا مزہ آتا ہے جب پڑھنے بیٹھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ گویا حضرت کے سامنے اور مواجہہ میں حضرت کی باتوں کو سُن رہا ہوں اس مہینے (ماہ محرم) کے رسالہ میں ایک مضمون میں یہ لفظ پڑھا پتا پھاڑ۔ تو دل کی عجیب حالت ہوگئی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بلا واسطہ کان تک حضرت کی آواز آرہی ہے۔ انتہی۔

دیکھئے ان مولوی صاحب نے بھی اپنے خط میں اپنا اور اپنے احباب کا کیسا کیسا تاثر ظاہر کیا ہے اور خود لکھ رہے ہیں کہ جو شخص اس رسالہ کو دیکھتا ہے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا پھر اب طریق کار کی کیا تلاش ہے یہی طریق کار ہے کہ بزرگوں کے کلام سے پہلے خود اثر لو اور ان کو دوسروں تک پہنچاؤ۔

ضمیمہ طریق کار

فرمایا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں سے آیا اور گھر پر رہنے لگا تو کبھی کبھی وعظ کے لئے قرب وجوار کے اطراف میں جاتا تھا اور وعظ میں صرف قرآن وحدیث کی باتیں بیان کرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ ان عوام کا ناس ان واعظوں نے ہی مارا ہے انھوں نے ان کے سامنے موٹے موٹے الفاظ کہے ہیں اور فارسی کے اشعار پڑھے ہیں اور ان لوگوں سے اپنی تعریف تو کرالی ہے مگر

ان کے پلے کچھ نہیں پڑا۔صرف جلسہ تو ان کے ہاتھ لگا اور وہ بھی ناکام باقی دین وغیرہ تو کچھ حاصل ہوا نہیں۔میں نے یہ کیا کہ تھانہ بھون سے آنے کے بعد حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی باتیں جو وہاں سنی تھیں بیان کرنا شروع کر دیا۔چونکہ کام کام کی باتیں ہوتی تھیں اس لئے لوگوں نے توجہ سے سُنا اور میں نے کہا کہ بس ان کے سامنے حقائق بیان کرو الفاظ کے چکّر میں نہ پڑو اس کی وجہ سے تمھارا نام واعظوں میں تو نہ ہوگا مگر لوگوں کے پلے کچھ پڑ جائے گا۔چنانچہ اسی طرح سیدھی سادی باتیں بیان کرنا شروع کیں تو دیکھا کہ دو دو گھنٹے تین تین گھنٹے بیان کرتا تھا مگر ایک شخص بھی درمیان سے اُٹھ کر نہ جاتا تھا۔بلکہ ہوا یہ کہ جو لوگ وعظ میں شریک ہوتے تھے انھوں نے دوسروں کے وعظ میں جانا چھوڑ دیا کہتے تھے کہ جی نہیں لگتا۔ غرض جب باتیں پہنچائی گئیں تو لوگوں نے مانا۔اور جب بے غرض ہو کر کام کیا گیا تو یہی عوام الناس متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم کچھ جانتے نہ تھے۔دین کا علم تو تم سے ہوا۔پھر مانتے ہی گئے اور قریب ہوتے گئے اور لوگوں کو نفع ہوا۔جب باتیں کروگے ہی نہیں تو لوگوں کو آئے گا کیا؟ یا ان کے مقام سے اونچی باتیں کروگے تب بھی انھیں کچھ نفع نہ ہوگا۔حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے اور ایسی ایسی باتیں حضرت کو خوب یاد تھیں۔انھیں سُن کر لوگ محظوظ بھی ہوتے تھے اور ان حکایتوں سے بڑے بڑے حقائق کا انکشاف ہوجاتا تھا۔فرماتے تھے کہ ایک شخص کے پاس دیہات سے کچھ لوگ آئے اس نے انھیں مخاطب کر کے کہا کہ "آپ کے کشت زار گندم پر تقاطر امطار ہوا یا نہیں؟ ان لوگوں نے اس کا مطلب سمجھ لیا کہ بارش کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں کہ کھیتی کا کیا حال ہے بارش وارش ہوئی یا نہیں؟

لیکن آپس میں کہا کہ چلو میاں اس وقت قرآن شریف پڑھ رہے ہیں پھر آیا جائے گا (ان کا اظہار علم دانی کا نہایت ہی لطیف جواب دیا۔مطلب یہ تھا کہ ہم دیہاتی لوگ ہیں ہم سے سیدھے سادے لفظوں میں بات کرنی چاہیے۔ہم سے کیا اظہار لیاقت کرنے چلے۔لوگوں سے بقدر ان کے علم و فہم کے ہی گفتگو کرنی چاہیے) جب لوگوں کے فہم کے مطابق کروگے کیوں نہ سمجھیں گے۔کیوں نہ مانیں گے۔مسلمان ہیں ایمان رکھتے ہیں دین کی باتیں سُنیں گے تو کیوں نہ اثر لیں گے۔دین اور ایمان انسان کو حق بات کے

ماننے اور اس سے اثر لینے پر مجبور کرتا ہے۔

ایک قاضی صاحب کے یہاں کسی معاملہ میں دو عورتوں نے آکر گواہی دی۔ قاضی ایک کا بیان سن رہا تھا کہ وہ کچھ بھولی جھٹ دوسری نے اسے ٹوک دیا۔ قاضی نے اسے منع کیا کہ ہائیں تو کیوں بولتی ہے؟ عورت بھی غضب کی تھی اس نے برجستہ کہا کہ قاضی صاحب مجھے بولنے کی اجازت قرآن نے دی۔ قاضی نے پوچھا کس طرح؟ اس نے کہا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے کہ "اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى" یعنی دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے قائم مقام اس لئے ہے کہ یہ ناقصات العقل ہوتی ہیں پس اگر ان میں ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ قاضی کو اس عورت کا یہ جواب سن کر بڑی حیرت ہوئی اس پر کہ دیکھو تو اس عورت نے اس آیت سے کیسا استدلال کیا۔ جو مجھے بھی معلوم نہ تھا جس زمانہ میں دین کا چرچا تھا تو آپ کی عورتیں بھی دین سے واقف ہوتی تھیں اور اب جو مرد واقف نہیں تو اس لئے کہ اب ان باتوں کا چرچا نہیں رہا۔ ایک جگہ بہت سے علماء جمع تھے کوئی جلسہ تھا۔ ایک مولوی صاحب وعظ کہنے کھڑے ہوئے اور اپنے بیان کے لئے لمبی تمہید اٹھائی اور اس میں لیلیٰ مجنوں کا قصہ چھیڑ دیا ایک اور مولوی صاحب تھے انھوں نے جب دیکھا کہ کچھ کام کی بات نہیں ہو رہی ہے تو ان سے کہا کہ چلو بیٹھو اور خود کھڑے ہو کر عوام کو مخاطب کیا اور کہا سنو جی! یہ جلسہ اس غرض کے لئے منعقد ہوا ہے یہ بات ہے ہمارا یہ حال ہے۔ یہ کام کرنا چاہئے اور ان باتوں سے بچنا چاہئے اور اس طرح سے کام کام کی چند باتیں بیان کر کے تقریر ختم کر دی تو آج ضرورت اسی چیز کی ہے کہ مسلمانوں کو پریشان نہ کیا جائے بلکہ صرف کام کام کی باتیں ان سے بیان کی جائیں اور ان پر عمل کا مطالبہ کیا جائے میں نے بھی یہ ارادہ تو کبھی بھی نہیں کیا کہ ان واعظوں جیسا طریقہ اختیار کروں بلکہ شروع ہی سے یہ سمجھے ہوئے تھا کہ بس لوگوں کو کام کی باتیں بتانا چاہئے اور ان کو حقائق پہنچائے جائیں۔

میرے موضع کے قریب ان مولوی صاحب کا قصبہ ہے وہاں مسجدیں بہت تھیں مگر نمازی غائب۔ کبھی کبھی میں وہاں چلا جاتا تھا۔ لوگ شوق سے وعظ سننے آتے تھے چنانچہ سنتے سنتے نماز روزہ تہجد سب کرنے لگے۔ اس سلسلہ میں کبھی کبھی تنہا ہی چلا

جاتا تھا تو لوگ پوچھتے کہ اکیلے ہی آ گئے۔ پھر لوگوں نے بہت مانا۔ راستہ میں گاؤں پڑتے تھے۔ جب ادھر سے گذرتا تھا تو مرد، عورت، بچے سب باہر نکل آتے تھے۔ کہتے تھے مولانا صاحب جا رہے ہیں۔ غیر مسلم کی عورتیں اپنے دستور کے موافق ہاتھ جوڑ کر سلام کرتیں اور پاؤں پر سر رکھ دیتیں۔ یہ دوسروں کے ماننے کا حال تھا۔ ایک دفعہ اسی بستی میں آ رہا تھا ابھی قریب پہنچا تھا کہ دیکھا کہ ایک باغ سے نکل نکل کر لوگ بھاگے جا رہے ہیں۔ خیال ہوا کیا بات ہے؟ لوگ بھاگ رہے ہیں؟ پھر اپنے ہی سے کہا کہ تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ تمہیں سے تو ڈر کر بھاگ رہے ہیں۔ یہاں باغ میں کوئی ناجائز چیز کھاتے پیتے ہوں گے تمہیں دیکھ کر بھاگ گئے۔

یہ اس پر سنا رہا ہوں کہ آدمی کام تو کرے لوگ سنیں گے کیوں نہیں اور مانیں گے کیوں نہیں؟ خواجہ صاحب فرماتے ہیں ؎

کامیابی تو کام سے ہوگی نہ کہ حسنِ کلام سے ہوگی
فکر اور اہتمام سے ہوگی ذکر کے التزام سے ہوگی

خواجہ صاحب بڑے درجے کے شاعر تھے اور حضرت مولانا کے آدمی ہیں آپ کے اکبر حسین جج اور اقبال سے کم نہیں ہیں طریق کے حقائق بیان کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ کامیابی تو کام سے ہوگی یعنی کامیابی میں کام پہلے ہے یا بعد میں یعنی کچھ چاہتے ہو تو پہلے کچھ کرو اب یہ حال ہے کہ لوگ یابی تو چاہتے ہیں اور کام غائب اسی طرح سے فرماتے ہیں ؎

لا ادھر جام کہ نا اہل ہیں منکر ساقی
در خورِ ہر کس و ناکس ترا پیمانہ نہیں

مطلب یہ کہ اور لوگ اگر نہیں سیکھتے تو نہ سیکھیں لائیے اپنا جام ہم کو دیجئے ہم اس کو پئیں گے۔ اور سیکھیں گے باقی جب اہل اس کو نہ لے گا تو نا اہل اس کا اہل بن جائے گا۔

غرض جب میں نے ان لوگوں میں اس طرح کام کیا تو لوگوں نے مانا۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ کچھ نہیں تم لوگ ایک کام کرو بس نماز پڑھو قیامت میں سب سے پہلے نماز ہی کا سوال ہوگا تو دیکھا کہ جوانوں نے اسے سنا اور نماز شروع کر دی اور

بعضوں نے یہ عذر کیا کہ کیسے پڑھیں ہم کو آتی نہیں میں نے ان سے کہا کہ آہستہ آہستہ سیکھو اور جب تک نہ آئے ہم لوگوں کے ساتھ شریک ہو جایا کرو اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والے ہیں۔ چنانچہ لوگوں نے نماز سیکھی اور سب سے پہلے کام انھیں کے موضع میں ہوا۔ پھر جب یہ لوگ دیندار ہو گئے تو اطراف کے لوگ بھی متوجہ ہو گئے۔ اور یہ دیکھا کہ بوڑھوں سے زیادہ جوانوں نے پہلے مانا۔ اور بعض بعض جوانوں کو دیکھ کر ان کے والدین بھی ماننے لگے۔ یہ اس پر کہہ رہا ہوں کہ جب کام کیا جائیگا تو ہوگا کیوں نہیں۔

شامی میں ہے ایک عالم تھے صاحب وظائف انھوں نے اپنے اُستاد کے کتاب کی شرح لکھی اور اسے اُستاد کی خدمت میں پیش کیا اور کہا کہ حضرت آپ کے فلاں کتاب کی شرح ہے۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بہت پسند کیا۔ چنانچہ اسی خوشی میں اپنی لڑکی کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔ لکھا ہے کہ اس کے بعد سے وہاں سے جو فتویٰ نکلتا تھا۔ اس میں ان عالم صاحب اور ان شاگرد اور اس لڑکی تینوں کے دستخط ہوتے تھے۔ بدوں ان کے دستخط کے کوئی فتویٰ نکلتا ہی نہیں تھا۔ ایسا کمال لڑکی نے حاصل کیا تھا۔

بہرحال جب کام کیا جائے گا تو ضرور ہوگا لیکن دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو یہ کہ آدمی کام کرنے سے پہلے کام کرنا سیکھے دوسرے یہ کہ جو کچھ کرے اخلاص کے ساتھ کرے۔ دیکھئے حکیم صاحب نے لکھنؤ سے خط لکھا تھا کہ کام شروع کر دیا ہے۔ پہلے اخلاص پر بیان کیا اور یہ بھی لکھا تھا کہ مجلس کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس دُعا پر ختم کیا۔

اللھم اجعل اعمالنا کلھا صالحۃ واجعلھا کلھا لوجھک خالصۃ ولا تجعل لغیرک فیھا شیئًا۔ یعنی اے اللہ ہمارے تمام اعمال کو صالح بنا دیجئے اور ان سب کو خالص اپنی رضا کے لئے کر دیجئے اور اپنے غیر کے لئے اس میں کچھ حصہ نہ بنایئے۔ دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ اخلاص کی ہر چیز میں ضرورت ہے فرما رہے ہیں کہ ہمارے سارے اعمال کو اپنی رضا کے لئے خالص کر دیجئے اب جس طرح گھی نخالص ہو گیا ہے تیل نخالص ہو گیا ہے اسی طرح ہمارے اعمال نخالص ہو گئے ہیں۔ یہ دیہاتی لوگ، خالص کو بھی

مخالص کہتے ہیں۔

کل میں نے بیان کیا تھا کہ ایک شخص کہتا تھا کہ میں لاہور کو اُلٹ دوں گا۔ حالانکہ خود کچھ نہیں تھا۔لیکن اس کے پیر کامل تھے اور انھیں کے بھروسے پر کہہ رہا تھا اس سے معلوم ہوا کہ سلسلہ کا بھی ایک اثر ہوتا ہے اگر کوئی شخص خود نہیں ہے۔مگر سلسلہ اس کا صحیح ہے تو اوپر سے کمک پہنچتی ہے۔جب مخلوق کا تعلق اور اس کی پُشت پناہی کا حال یہ ہے تو اگر کوئی شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو اس کا پوچھنا ہی کیا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

اللّٰھم اجعلنی ممن توکل علیک فکفیتہ واستھداک فھدیتہ واستنصرک فنصرتہ۔(ترجمہ) یا اللہ کر دے مجھے ان لوگوں میں سے جنھوں نے توکل کیا تجھ پر پس تو کافی ہو گیا ان کو اور ہدایت مانگی تجھ سے پس تو نے ہدایت کی ان کو اور مدد مانگی تجھ سے پس مدد کی تو نے ان کی۔اللہ تعالیٰ اپنے اوپر توکل کرنے والوں کے لئے کافی ہیں۔بزرگ ہونا آسان نہیں۔مگر کسی پہنچے ہوئے کے ساتھ ہو لینا آسان ہے ؎

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد

دست برپائے کبوتر زد و ناگاہ رسد

یعنی ایک چیونٹی کو یہ خواہش ہوئی کہ کعبہ کو جائے اب خود تو پہنچنا اس کے لئے آسان نہ تھا۔اس لئے اس نے یہ کیا کہ ایک کبوتر کے پاؤں سے لپٹ گئی اور اسی طرح کعبہ پہنچ گئی۔اب اسی طرح انسان خود ضعیف الھمت ہو تو اس کو چاہئے کہ کسی قوی الھمت کا ہاتھ پکڑ لے۔پہنچنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ایک مولوی صاحب نے وعظ میں بسم اللہ کی فضیلت بیان کی کہ اس کو پڑھ کر جو کام کیا جائے پورا ہو جاتا ہے۔ایک دیہاتی نے بھی اس کو سُنا تو بہت خوش ہوا۔کہ چلو دریا پار کرنے کا اچھا نسخہ ہاتھ آیا۔اس کے بعد سے بسم اللہ کہہ کر دریا میں قدم رکھتا پار ہو جاتا۔ایک دن وہ دریا کے کنارے موجود تھا کہ دیکھا اس کے کنارے پر مولوی صاحب بھی کھڑے ہیں۔پوچھا مولانا کیسے کھڑے ہیں انھوں نے کہا کہ اس کے پار آنا ہے کشتی نہیں ہے۔اس نے کہا کہ آپ نے تو بسم اللہ کی فضیلت بیان کی تھی میں تو اسی دن سے اسے پڑھ کر چلا جاتا ہوں اور چلا آتا ہوں۔مولوی صاحب اس کا کیا جواب دیتے ایک پڑھنا صرف زبان سے ہوتا ہے

ایک ایمان کے ساتھ اس دیہاتی نے ایمان اور اعتقاد کے ساتھ پڑھا تھا اور عمل بھی شروع کر دیا۔ مولوی صاحب اس درجہ کے نہیں تھے رہ گئے اس نے کہا اچھا ٹھہریئے میں آتا ہوں یہ کہا اور بسم اللہ پڑھ کر دریا کے اس پار آگیا اور مولوی صاحب سے کہا کہ آپ میری لکڑی پکڑ لیجئے اور بسم اللہ پڑھا اور پڑھ کر دریا میں قدم رکھا۔ اس پار آپہنچا۔ خود مولوی صاحب نہیں آسکے مگر وہ چونکہ پہنچا ہوا تھا اس کے ساتھ ہونے کی وجہ سے وہ بھی پار ہو گئے۔ اب لوگ بہت ساتھ ہونا چاہتے ہیں لکھتے ہیں تم فلاں جگہ کب جاؤ گے اطلاع دو تاکہ میں بھی ساتھ چلوں۔ میں کہتا ہوں کہ کسی جگہ جانے میں میرا کیا انتظار ہے۔ جگہ خالی ہے تم خود چلے جاؤ۔

دیکھئے اس شخص نے اللہ تعالیٰ سے اپنا معاملہ درست کر لیا تھا۔ اس کی برکت ظاہر ہوئی۔ حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زہر دے دیا گیا تھا۔ آپ کو اس کا علم بھی ہو گیا۔ لیکن آپ نے پیالہ ہاتھ میں لیا اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بسم اللہ الذی لا یضرّ مع اسمہ شیئٌ کہہ کر وہ پیالہ پی لیا کچھ بھی نہیں ہوا۔ دوسرا کوئی پیتا تو مر جاتا۔ چونکہ اعتقاد اور ایمان کے ساتھ پیا تھا اس نے اپنا کام کیا زہر ناکام ہو گیا۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ پہلے ایک شخص سے بیعت تھے اور ان کے خلیفہ تھے بعد میں حضرت میاں جی نور محمدؒ سے بیعت ہوئے۔ اپنے شیخ کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

تم ہو اے نور محمد خاص محبوب خُدا
ہند میں ہو نائبِ حضرت محمد مصطفیٰؐ

سُبحان اللہ دیکھئے ان حضرات نے توحید میں کیسی احتیاط کی۔ اس کا تو پوچھنا ہی کیا۔ جو اس کا ذریعہ تھا ان حضرات نے اس کا بھی حق ادا کر دیا اور اب یہ حال ہے نہ تو توحید ہی کو سمجھتے ہیں اور نہ اس کے ذریعہ کو سمجھتے ہیں۔ پھر اس کا حق کیا ادا کرینگے اولیاء اللہ نے اپنے پاس آنے جانے والوں کو توحید ہی تو سکھایا ہے۔ خود ان کا ایک ایک عمل توحید میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا کہ اس سے بادشاہ تک کو متاثر کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک بزرگ سے ایک شخص نے بادشاہ وقت کے پاس سفارش کی درخواست کی۔ انھوں نے سفارش نامہ لکھ دیا اس میں یہ لکھا کہ "اِن اعطیتہ فالمعطی ھو اللہ

وانت المشکور وان منعتہ فالمانع ھواللہ وانت المعذور۔" یہ لکھا کہ حامل رقعہ تمھارے پاس اپنی حاجت لے کر جا رہا ہے اگر تم نے اس کی مراد کو پورا کر دیا تو حقیقتًا تو حاجت روا خُدا ہے اور ہم شکر گذار تمھارے بھی ہوں گے اور اگر تم نے اس کو نہ دیا تو سمجھیں گے کہ مانع حقیقی تو خُدا ہے اسی کو منظور نہ تھا اس لئے تم کو معذور سمجھیں گے۔ بادشاہ نے جب اس سفارش نامہ کو پڑھا تو اُچھل پڑا اور نہ معلوم پھر اس کو کتنا دیا ہوگا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کے والد بڑے بزرگ شخص تھے ایک دن ایک مجذوب آیا اور حضرت خواجہ صاحب کے کان میں یہ کہہ کر چل دیا کہ ؎

در کنز و ہدایہ نتواں یافت خُدا را
سیپارۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

یعنی کہ تم کنز و ہدایہ میں خُدا کو نہیں پا سکتے اس کے لئے تو دل کا سیپارہ کھولو کہ اس سے بڑھ کر اس مضمون میں کوئی کتاب نہیں۔ بس اس شعر کا سُننا تھا کہ آگ ہی تو لگ گئی۔ اللہ تعالیٰ کے تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ایک جگہ ایک بزرگ سے ملاقات ہوگئی سمجھے کہ یہ کامل شخص ہیں ان کے پاس رہا جائے گا تو پہنچا دیں گے۔ چنانچہ ان کی خدمت میں رہ پڑے اور بعد میں جیسے شخص ہوئے وہ آپ کو معلوم ہی ہے حضرت مجدد صاحب کے پیر ہوئے ہیں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ جن لوگوں کو بزرگی ملی ہے انھوں نے کچھ کام کیا ہے اپنے کو مٹایا ہے کسی کے آگے جُھکایا ہے اپنے اندر اسباب بزرگی پیدا کی ہیں۔ تب لوگوں نے انھیں بزرگ مانا ہے۔ اب لوگ چاہیں کہ بزرگوں کی جگہ الفاظ کے ذریعہ لے لیں یہ نہیں ہوسکتا۔ اور کوئی شخص یہ چاہے کہ صرف ڈھینگ کے ذریعہ بزرگ بن جائے اور لوگ بھی اس کے ساتھ اہل اللہ جیسا معاملہ کریں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ؎

تکیہ برجائے بزرگاں نتواں زد بگزاف
مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

یعنی مسند شیخت پر کوئی شخص ڈھینگ کے ذریعہ نہیں بیٹھ سکتا اگر اس پر بیٹھنا چاہتے ہو تو بزرگوں کے سے صفات اپنے اندر پیدا کرو۔

اب لوگ چاہتے ہیں کہ جلدی سے خلافت مل جاتی تو بہت اچھا ہوتا۔ ہم

کہتے ہیں جلدی نہیں دیں گے اس لئے کہ اگر جلدی سے دے دیں گے تو تم لے کر چل دو اور پھر آؤ نہیں ۔ ہمارا جی تم کو دیکھنے کو چاہے تو پھر ہم کیا کریں گے اس لئے برسوں دوڑائیں گے اور جب یہ سمجھ لیں گے کہ اب ہم سے بھاگو گے نہیں تب دیں گے یہ دولت بہت زیادہ باوقعت چیز تھی اتنی سستی نہیں تھی ۔ جیسا کہ لوگوں نے سمجھ لیا ہے اور یہ قاعدے کی بات ہے کہ جب کوئی چیز مشقت کے بعد ملتی ہے تو آدمی اس کی قدر کرتا ہے ۔ ایک شخص نے کسی کو دیکھا کہ نہایت قیمتی دوشالہ سے جوتا صاف کر رہا ہے اسے تعجب ہوا کہا بھائی ایسا کیوں کرتے ہو ۔ اس نے کہا کہ بات یہ ہے کہ دوشالہ باپ کی کمائی کا ہے اور جوتا میری کمائی کا ہے جو چیز مفت ملا کرتی ہے اس کی آدمی قدر نہیں کرتا ۔

اہل اللہ نے ہر زمانہ میں اپنے طالبین کا امتحان کیا ہے اور لوگوں نے بھی اپنے طلب اور محبت کا ثبوت دیا ہے ۔ دہلی میں ایک عالم تھے جو کہ صاحب نسبت بزرگ تھے ۔ ایک دفعہ انھوں نے وعظ کے بعد مصافحہ کرتے کرتے ایک رئیس کی ناک پکڑ کے ہلا دی ۔ انھوں نے کہا کہ حضرت اس سے کیا ہوتا ہے ۔ آپ اگر میرے بدن سے کپڑے اُتروا کر دہلی کے بازار میں جوتیاں بھی لگائیں تب بھی مجھے جو عقیدت آپ سے ہے ۔ اس میں فرق آنے والا نہیں ہے اور یہ کہا کہ ہم نے بھی آپ کو کچھ سمجھ کر مانا ہے اور جو سودا آپ کا ہمارے سر میں سمایا ہوا ہے وہ ان چیزوں سے جانے والا نہیں ۔ ؎

تو ہو کے تُرش رو مجھے گالی ہزار دے
یہ وہ نشہ نہیں جسے تُرشی اُتار دے

دیکھا آپ نے یہ مثال ہے بزرگوں کی اور ان کے ماننے والوں کی ۔ ایسا نہیں ہوا کہ کوئی بزرگ ہوا ہو ۔ اور لوگوں نے ان کو جانا پہچانا نہ ہو ۔ بجز اس کے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مخفی ہی رکھنا چاہا ہو اور جسے مخلوق کی نفع رسانی کے لئے منتخب فرمالیا ہے ۔ اس کو لوگوں نے بہت مانا ہے ۔

دہلی ہی کا ایک اور واقعہ سُناتا ہوں ربط آپ ملا لیجئے گا ۔ باقی عشق و محبت کی باتیں تو بے ربط ہی ہوا کرتی ہیں ۔ ایک شخص نے ایک بزرگ سے درخواست کی کہ ہماری لڑکی کی شادی ہے آپ فلاں رئیس کے یہاں میری سفارش فرما دیجئے ۔ انھوں نے

اس کے نام ایک رُقعہ لکھ دیا اس شخص نے لے جاکر اس امیر کو دیا۔ وہ رئیس ان بزرگ کا مخالف تھا ان کا پرچہ دیکھ کر جل گیا اور بہت غصہ ہوا اور اس رُقعہ لانے والے سے کہا کہ جاؤ جن کے پاس سے لائے ہو ان سے کہدو کہ اس کو اپنے فلاں مقام میں رکھ لیں۔ یہ شخص واپس چلا آیا اور بہت نادم ہوا۔ کہ آج میں نے ان بزرگ کو گالی کھلوائی۔ جب ان بزرگ کے پاس آیا تو انھوں نے پوچھا کہ کیا ہوا اب یہ کیا کہتا خاموش رہا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ نہیں بتاؤ کیا کہا "کہا کہ کیا کہوں" حضرت کو گالی دی ہے؟ اور آپ کو ایسا ایسا کہا ہے۔ فرمایا کہ اس کے پاس پھر جاؤ اور اس سے کہو کہ اگر ایک مسلمان کا کام اس سے چل جائے تو میں اس کے لئے تیار ہوں اس نے جاکر کہا" اس جملہ کا سُننا تھا کہ وہ امیر اپنی جگہ سے اُٹھا اور گرتا پڑتا ان بزرگ کی خدمت میں پہنچا۔ نہ جانے کیا تصرف کر دیا تھا اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضرت معاف فرما دیجئے میں آپ کو پہچانتا نہیں تھا اور کہا کہ یہ تھیلی حاضر ہے اس میں سے جتنا روپیہ چاہئے اس کو دے دیجئے اس لئے کہ یہ شخص میرا محسن ہے۔ اسی کی وجہ سے میں نے آپ کو پہچانا۔ دیکھتے ہیں آپ جو بے اعتقادی کی بات تھی وہی ذریعہ اعتقاد بن گئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سُنا اور ایک یہی کیا۔ حضرت ایسی ایسی بہت سی باتیں بیان فرماتے تھے جن سے عبرت ہوتی تھی اور ایمان تازہ ہوجاتا تھا ہم نے سیکھا ہی نہیں ورنہ ایسے نہ ہوتے۔ اسی قسم کا ایک واقعہ اور بیان کرتا ہوں۔ مکہ میں ایک بزرگ رہتے تھے۔ سودا وغیرہ خود جاکر لے آتے تھے اور ان کا یہ طریقہ تھا کہ کسی دوکان سے دو پیسہ کا بھی سودا لیتے تو پوری ہمیانی اُلٹ دیتے اور اس میں دو پیسہ نکال کر دوکاندار کو دیتے اور بقیہ پیسہ پھر اسی تھیلی میں رکھ کر چلے آتے۔ ایک دفعہ کسی اُچکے نے تاک لیا۔ جب وہ بزرگ گلی میں مُڑے تو ان کے ہاتھ سے تھیلی اُچک کر جمپت ہوگیا۔ انھوں نے مُڑ کر دیکھا بھی نہیں کون کیا لے گیا اور اپنے گھر میں داخل ہوگئے۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ گلی میں ایک شور سُنا کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ لوگو! شیخ جو اس گھر میں رہتا ہے اس نے مجھ پر ظلم کیا ہے محلہ کے لوگ جمع ہوگئے۔ اور سب لوگوں نے اسی کو ڈانٹنا شروع کیا کہ چُپ رہو کیا بکتے ہو؟ اس گھر میں تو ایک بزرگ آدمی رہتے ہیں۔ اس نے کہا نہیں ان کو بلاؤ انھوں نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ لوگوں نے دستک

دی۔ شیخ اندر سے باہر آئے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت کیا معاملہ ہے؟ یہ شخص کچھ کہہ رہا ہے۔ اس سے فرمایا کیا بات ہے؟ اس نے کہا یہ اپنی تھیلی لے لیجئے کہا یہ میری نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں یہ آپ ہی کی ہے۔ میں نے آپ کے ہاتھ سے لی ہے۔ لوگ حیرت میں پڑ گئے کہ یہ کیا قصہ ہے۔ شیخ فرما رہے ہیں کہ میری نہیں ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ نہیں اور اس کو شیخ کا ظلم بتلا رہا ہے۔ بالآخر لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت کیا راز ہے کچھ سمجھ میں نہیں آیا بتلا دیجئے فرمایا کہ بھائی اس نے جب میرے ہاتھ سے لیا تو میں نے یہ خیال کیا کہ میری وجہ سے ایک مسلمان پر قیامت میں مواخذہ ہو۔ یہ اسے ہبہ کر دیا قبضہ اسی کا تھا ہی ہبہ قبضہ سے تام ہو جاتا ہے لہٰذا اب یہی اس کا مالک ہے میں نہیں ہوں۔ لوگوں نے کہا بھائی تو ہی رکھ لے اب یہ اس کو واپس نہ لیں گے۔ اس شخص نے کہا کہ میری آنکھ تو درست کر دیجئے۔ آپ کے روپیہ لینے کی وجہ سے میں اندھا ہو گیا ہوں۔ گھر کی طرف کا راستہ ہی نظر نہیں آتا۔ انھوں نے دعا کر دی اس کی آنکھ درست ہو گئی تمام مکہ میں ایک شور ہو گیا کہ ایک شخص نے ایسی حرکت کی اور بھگت گیا۔ فقط تمام شد

"ایک طالب کا تاثر"

حضرت مدظلہ العالی کا ایک مضمون اس سے قبل طریق کار کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس کو الحمدللہ لوگوں نے پسند کیا اور اس کے پڑھنے سے آنحضرت کے رسالہ معرفت حق کے مطالعہ کی توفیق عطا ہوئی ضلع کھیری کے ایک صاحب نے جو اپنے ہی سلسلہ کے آدمی ہیں مجھ سے آکر خود بیان کیا کہ الحمدللہ جس دن سے مضمون طریق کار کو پڑھا ہے اسی دن سے سمجھ میں آیا کہ اگر جلدی جلدی صحبت شیخ میسر نہ آوے تو یہ بھی ایک طریقہ ہے اصلاح کا کہ شیخ کے مضامین کو ہی مطالعہ میں رکھے اور سمجھ کر پڑھے جو اثر میں بمنزلہ صحبت شیخ کے ہی ہے اور اسی دن سے معرفت حق منگواکر مطالعہ کرنا شروع کر دیا اور اپنی اصلاح میں لگ گئے۔

تمسک بالسنۃ

اور

مژدۂ جانفزا

از افادات

مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فسادِ امت اور تمسک بالسنۃ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔
مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِیْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِیْ فَلَهٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِیْدٍ۔ یعنی جس نے میری سنت کے ساتھ تمسک کیا میری امت کے فساد کے زمانہ میں اس کو سو شہیدوں کے برابر ثواب ملے گا۔ یہ مشکوٰۃ شریف کی حدیث ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے تو جو لوگ تصدیق نبوی کرتے ہیں ان کے لئے آپ کی تصدیق اور آپ کے ارشاد کا سمجھنا ضروری ہے۔ لہذا ہمکو تمسک کا مطلب بھی سمجھنا ہوگا۔ سنت کو بھی سمجھنا ہوگا۔ اور فسادِ امت کو بھی سمجھنا ہوگا۔ اور یہ معلوم کرنا ہوگا کہ علماء اس کا کیا مطلب بیان فرماتے ہیں۔

چنانچہ مجھ پر بھی اس حدیث میں آیا ہوا لفظ فساد بہت ہی شاق ہوا۔ فکر ہوئی کہ دیکھنا چاہیئے کہ علماء اس کی کیا شرح فرماتے ہیں اسلئے کتب کی مراجعت کی تو دیکھا کہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ اس حدیث کو نقل کرکے اس کا ترجمہ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

ترجمہ:۔ ہرکہ لازم گیرد سنتِ مرا نزد فاسد شدن امتِ من او را ثواب صد شہید باشد
از یں حدیث معلوم شد کہ ہرکہ سنت را محکم گیرد در زمان فسادِ امت وغلبۂ کفر و
معاصی او را ثواب برابر صد شہید باشد۔ (ارشاد الطالبین ص۳۵)

یعنی جو شخص میری سنت کو میری امت کے فساد کے زمانہ میں مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہے گا اسکو سو شہیدوں کے برابر ثواب ملے گا۔ یہ تو حدیث کا ترجمہ ہوا آگے اس کا مطلب بیان فرماتے ہیں کہ جو شخص سنت کو مضبوط

پکڑے گا فسادِ امت کے زمانہ میں یعنی جب کہ کفر و معاصی کا غلبہ ہو جائے تو اس کو سو شہیدوں کے برابر ثواب ملے گا۔

قاضی صاحبؒ نے تمسک کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ لازم گیرد۔ یعنی سنت کا ملازم ہو جائے اور اس کو اس طرح سے مضبوط پکڑے کہ کسی کے چھڑانے سے اسکو نہ چھوڑے۔ یہ معنی تمسک کے بالکل صحیح اور نہایت عمدہ ہیں۔ باقی فسادِ امت کا مطلب جو بیان فرمایا کہ درزمانۂ غلبۂ کفر و معاصی، تو اگرچہ اس کی صحت میں کلام نہیں مگر مفہوم کی وضاحت کے لئے اتنا کافی نہیں۔

مشکوٰۃ کی شرح مرقاۃ میں ملا علی قاریؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

(مَنْ تَمَسَّكَ) اَیْ عَمِلَ (بِسُنَّتِیْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِیْ) اَیْ عِنْدَ غَلَبَةِ الْبِدْعَةِ وَالْجَهْلِ وَالْفِسْقِ فِیْهِمْ۔ (ص۲۶۴ ج۱)

یعنی جس نے عمل کیا میری سنت پر فسادِ امت کے وقت یعنی جبکہ اس میں بدعت اور جہل اور فسق کا غلبہ ہو جائے۔

دیکھئے صاحب مرقاۃ نے تمسک کے معنی تو صرف عمل کرنے کے فرمائے لیکن فسادِ امت کی تشریح بہت عمدہ کی ہے یعنی یہ کہ جس وقت اُمت میں بدعت، جہل و فسق کا شیوع ہو جائے اس وقت جو شخص میری سنت پر عامل ہوگا اور اسکو مضبوط پکڑے رہے گا اس کو سو شہیدوں کے برابر ثواب ملے گا۔

میں کہتا ہوں کہ فسادِ امت کی تشریح میں صاحب مرقاۃ نے بدعت، جہل اور فسق تین الفاظ اختیار فرمائے۔ اس کے باوجود مضمون ابھی تشنہ ہے۔ اسلئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فسادِ امتی فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فساد سے یہاں ایسی چیزوں کا شیوع مراد ہے جس میں امت کو عام ابتلا ہو جائے اگرچہ بدعت، جہل اور فسق میں ابتلاء بھی فساد ہے اور فساد کی یہ تشریح و تفصیل صحیح بھی ہے۔ مگر میں انھیں اکابر کی برکت سے کہتا ہوں کہ فساد کی شرح حبِ دنیا، عدم حبِ آخرت، غلبۂ نفس، غلبۂ ہویٰ و ہوس بھی ہے۔ یہ ابتلاء ان سب سے بڑھ کر ہے جن کا ذکر علماء نے کیا ہے۔ کیونکہ اعلیٰ درجہ کا فساد یہی ہے کہ انسان آخرت ہی کو بھول جائے اور حق تعالیٰ کی محبت اور جنت کی محبت اور نار کا خوف اس کے دل سے نکل جائے اور اس کی جگہ دنیا کی محبت آجائے۔ کیونکہ آخرت کے بھولنے کے لئے دنیا کی محبت لازم ہے۔ اور حبِ دنیا دل میں آجاتی ہے تو اَلشَّیْءُ اِذَا ثَبَتَ، ثَبَتَ بِلَوَازِمِهٖ[عـہ] کے قاعدے سے دنیا داروں کے سب اخلاق و صفات بھی آجاتے ہیں۔ آج ہم حبِ دنیا کے کیسے شکار ہو گئے ہیں۔ بس اسی سے عدم حبِ عقبیٰ بھی ہم میں آگئی ہے۔

عـہ یعنی جب کوئی چیز آتی ہے تو اپنے لوازم بھی ساتھ لاتی ہے ۱۲۔

صاحب مرقات نے تو فساد کی شرح کرتے ہوئے سب سے پہلے بدعت کو لیا ہے۔ پھر جہل کو پھر فسق کو، لیکن میں اسی کو یوں کہتا ہوں کہ امت میں فساد پھیل جانے کا مطلب یہ ہے کہ جب ان میں جہل کا غلبہ ہو جائے یعنی شریعت کا علم اٹھ جائے اور اعتقادیات سب ختم ہو جائیں۔ اور جب فسق کا غلبہ ہو جائے یعنی عمل اُٹھ جائے اور جب بدعت کا غلبہ ہو جائے یعنی سنت متروک ہو جائے۔ سنت و غیر سنت میں فرق ہی ختم ہو جائے بلکہ بدعت ہی سنت کی جگہ لے لے۔

میں نے اپنی شرح و تعبیر میں جہل کو مقدم اس لئے کہا ہے کہ اصل مرض اور اصل فساد اس امت کا جہل ہی ہے۔ یعنی جہل علمی اور اسی سے ناشی ہے فسق یعنی جہل عملی، اور بدعت چونکہ سنت کی ضد ہے اس لئے یہ بھی فساد ہے۔ یعنی یہ جہل ہی کے ثمرات ہیں کہ لوگوں کا آخرت پر کامل ایمان نہیں ہے اور جنت کی محبت قلب میں نہیں ہے اور اس کے لئے دنیا کی محبت لازم ہے اور پھر اس کے بعد فسق میں، بدعات میں جس چیز میں بھی انسان نہ مبتلا ہو جائے کم ہے۔

سنو! میں جہل کو اصل فساد اس لئے کہہ رہا ہوں کہ دنیا میں جو لڑائی ہے وہ دراصل علم اور جہل ہی کی ہے اور ان کے واسطے سے عالم اور جاہل میں جنگ ہے۔ یہ جنگ ابتدا آفرینش ہی سے چلی آرہی ہے۔

دیکھو حضرت سیدنا آدم علیہ السلام عالم تھے تو ان کا مقابل ابلیس جاہل تھا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام عالم تھے تو ان کے زمانہ میں نمرود جاہل تھا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام عالم تھے تو ان کے وقت میں فرعون جاہل تھا۔ پھر حضرت سیدنا مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید العلماء تھے تو آپ کے مقابلہ میں جو شخص آیا اس کا لقب ہی لوگوں نے ابو جہل رکھدیا۔ الغرض تمام انبیاء علیہم السلام اعلیٰ درجہ کا علم رکھتے تھے اسلئے کہ نبی کا علم سب لوگوں سے ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے اور ان کے مقابل اسی درجہ کے جاہل تھے۔

درحقیقت جہل کافروں کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَفَغَیْرَ اللّٰہِ تَاْمُرُوْنِّیْٓ اَعْبُدُ اَیُّہَا الْجٰہِلُوْنَ۔ یعنی اے جاہلو (اور اے کافرو) کیا تم مجھے یہ حکم دے رہے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی پرستش کرنے لگوں؟

دیکھئے یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کو اَیُّہَا الْجٰہِلُوْنَ کے لقب سے ملقب فرمایا اس لئے کہ اصل مرض کفار کا جہل ہی تھا اور یہی جہل سبب بنا ان کے کفر و عناد کا۔

بات یہ ہے کہ علم حق تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے اور اس کے پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ کیجانب سے انبیاء علیہم السلام بھیجے جاتے ہیں۔ لہذا جو لوگ ان پر ایمان نہیں لاتے اور ان کی اتباع نہیں کرتے وہ علم سے محروم رہتے ہیں۔ ان کے پلے بس صرف جہل ہی رہ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے جاہلوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ عالم کا مقابلہ اپنے جہل سے کریں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر لوگ علم کی جانب توجہ کرینگے تو پھر تو ہماری

قیادت وقیادت ختم ہی ہو جائے گی اور جہل کی سلطنت میں زوال ہی آجائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ اپنے اپنے وقت میں یہی جاہل حضرات انبیاء علیہم السلام کے مقابل ہوئے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام نے اگر علم پہونچانا چاہا تو انھوں نے جہل ہی پیش کیا۔ غرض ہر زمانہ میں ان جاہلوں نے عالموں کا مقابلہ ضرور کیا ہے۔

یہ گفتگو میں اس لئے کر رہا ہوں کہ شاید کسی کی سمجھ میں یہ بات آجائے کیونکہ قلوب بالکل فاسد ہو چکے ہیں یہ دور انتہائی بد دینی، بداخلاقی، اور جہل وعناد کا دور ہے۔ اب اس میں اگر چاہو کہ صرف تقریر کر کے لوگوں کو ٹھیک کر لو تو یہ بہت مشکل ہے۔ اس زمانہ میں اصلاح کے لئے ایمان اور قلبی نور کی ضرورت ہے۔ مصلح کو یہ بات خود سمجھنا اور لوگوں کو بھی سمجھانا ضروری ہے۔

دوسرا فساد فسق کا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ علم تو ہو مگر نفس کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو رہا ہو۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زھد

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

جس طرح جہل کہتے ہیں علم کے فساد کو اسی طرح فسق کہتے ہیں عمل کے فساد کو۔ اس کو میں دوسرے درجہ کا فساد سمجھتا ہوں یعنی جہل میں تو آدمی کو سنت اور شریعت کا علم بھی نہیں ہوتا لیکن فسق میں علم اگرچہ ہوتا ہے مگر آدمی اس پر عمل نہیں کرتا۔

پس ایک تو یہ ہے کہ آدمی علم کو مانتے ہی نہیں یہ تو ہے کفر اور ایک یہ ہے کہ آدمی دل سے تو اسے مانتا ہے مگر اس پر اس کا عمل نہیں ہے۔ یہ ہے فسق۔ گویا علم کا مقابل تو ہوا جہل اور عمل کا مقابل ہوا فسق۔

اور تیسرا فساد، بدعت ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ بھی جہالت ہی کا کرشمہ ہے اور جملہ فسادات میں بدعت سب سے اشد ہے۔ یعنی منشا و سرچشمہ اس کا بھی جہل ہی ہے۔ اور جہل کا فرد اعلیٰ یہ بدعت ہے۔ کیونکہ بدعت نام ہے علم اور سنت کے بالمقابل ایک نیا طریقہ خود ایجاد کر لینے کا۔ اس کی اصلاح بہت دشوار ہوتی ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کی تصدیق اور ان پر ایمان پھر سنت و شریعت کی بھی محبت اور تصدیق ہو تب کہیں جا کر آدمی اس سے خلاصی پا سکتا ہے۔ ورنہ معاملہ بہت مشکل ہے۔ اسکی ایک مثال سنیئے:-

ایک عالم کو ان کے مخالفین نے شاہی محل کی ایک رئیسہ کے کان بھر کر ان کی جانب سے وعظ کے لئے مدعو کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ موقع نکال کر آج ان کو ان رئیسہ سے مجمع عام میں گالیاں کھلوائیں تاکہ ان کی خوب رسوائی اور بے عزتی ہو۔ مولانا کو پہونچنے میں اتفاقاً کچھ دیر ہو گئی۔ وہ رئیسہ غصہ میں بھری بیٹھی تھیں کہ اتنے میں مولانا تشریف لے آئے، اطلاع پا کر وہ اندر سے بولیں کہ مولوی۔۔۔۔ آگئے،،

ان کے لہجہ اور تیور سے مولانا نے رنگ محفل بھانپ لیا اور معاملہ کی تہہ کو پہونچ گئے کہ آج میری رسوائی کا پورا سامان ہے، فرمایا "اخاہ! اماں جھکو ہیں کیا؟ اماں سلام! عورتوں کی تو فطرت ہی ہے کہ وہ سلام وغیرہ سے بہت ہی خوش ہو جاتی ہیں۔ اماں جھکو تو اتنے ہی سے خوش ہو گئیں۔ کہا۔ جیتے رہو، پھر ان سے گھر بھر کی خیر خیریت دریافت کرنے لگیں "فلاں کیسے ہیں؟ فلانی کیسی ہیں؟ جب یہ سب ہو گیا تو پوچھا کہ "کیوں جی فلانے! سنا ہے تم بی بی کی صحنک کو منع کرتے ہو؟ مولانا نے فرمایا کہ "اماں نہیں تو!" کہا لوگ تو کہتے ہیں (اور یہ لوگ بھی اسوقت مجلس ہی میں موجود تھے) مولانا نے فرمایا" غلط کہتے ہیں، میں تو منع نہیں کرتا" یہ سنکر وہ تو خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد مولانا نے فرمایا "اماں! میں تو بی بی کی صحنک کو منع نہیں کرتا۔ ہاں بی بی کے ابا جان (صلی اللہ علیہ وسلم) منع کرتے ہیں۔ اس لئے کہ حدیث میں ہے۔ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ۔ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا انجام دوزخ ہے۔ یہ حدیث پڑھ کر مولانا نے ایک نہایت مؤثر وعظ فرمایا۔ بی بی جھکو پہ وعظ کا بہت اثر ہوا۔ انھوں نے کہا "ہم بی بی پر ایمان نہیں لائے ہیں ہم تو بی بی کے ابا جان پر ایمان لائے ہیں، ہم تو یہ سب اس لئے کرتے تھے کہ سمجھتے تھے کہ بی بی کے ابا جان اس سے خوش ہوتے ہیں لیکن جب آپ ہی کو یہ پسند نہیں بلکہ آپ اس سے ناراض ہوتے ہیں تو ہم ایسا کام نہ کرینگے۔ اور اس کے بعد محل کی عورتوں کی جانب مخاطب ہو کر کہا کہ سن لو آج کی تاریخ سے اگر کسی نے اس رسم یعنی بی بی کی صحنک کو محل میں کیا تو اس کی چٹیا کاٹ لوں گی" ان کے اس اعلان سے مخالفین کی تو ساری اسکیمیں خاک میں مل گئیں اور مولانا وہاں سے مظفر و منصور واپس تشریف لائے۔

یہ واقعہ میں نے اسپر سنایا کہ بدعت سے نکلنا بہت ہی مشکل ہوا کرتا ہے مگر یہ کہ کسی کے قلب میں اللہ و رسول کی اور سنت و شریعت کی محبت ایسی ہی راسخ ہو جاتی ہے تب تو وہ اس کی برکت سے اسکے دل سے نکل جاتی ہے۔ ورنہ اس کا نکلنا ہے بہت دشوار۔ غرض بدعت کا فساد بڑا اس لئے ہے کہ اس میں سنت بالکل متروک ہی ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری نئی چیز دین اور ثواب کا کام بنکر آجاتی ہے۔ جہل میں تو علم ہی نہیں ہوتا۔ فسق میں علم ہوتا ہے مگر عمل نہیں ہوتا۔ اور بدعت میں عمل ہوتا ہے مگر اپنی خواہش کے مطابق اور سنت کے بالکل خلاف ہوتا ہے۔ چنانچہ علماء فرماتے ہیں:۔

مَرَاسِمُ الشَّرِيعَةِ مُضَادَّةٌ لِلْهَوَىٰ (موافقات ج ۱ ص ۳۳۲)

یعنی شریعت کے جملہ رسوم خواہشات نفس کے بالکل ضد ہیں اور فرماتے ہیں:۔

اِتِّبَاعُ الْهَوَىٰ ضِدُّ اِتِّبَاعِ الشَّرِيعَةِ (موافقات حوالہ بالا)

یعنی ہوی کا اتباع شریعت کے اتباع کے بالکل برعکس ہے یعنی جو شخص متبع ہوی ہے وہ متبع شریعت نہیں ہوسکتا۔ اگر اتباع شرع کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے اتباع نفس کو ترک کرنا ہوگا۔ چنانچہ جب امت میں فساد اور بگاڑ واقع ہوتا ہے تو اس کی صورت یہی ہوتی ہے کہ جہل وفسق اور بدعات کا نیز حب دنیا، ترک حب عقبیٰ اور نفس، ہوی وہوس کا غلبہ ہو جاتا ہے: اور انسان سنت کو بالکل بھول ہی جاتا ہے۔ تمام لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں زمانہ کے رسم ورواج کے خلاف کسی سنت یعنی نبوی سیرت کا احیا ظاہر ہے کہ آسان نہیں اسلئے اس کا اتنا بڑا اجر ہے لڑائی میں اپنا گلا کٹوا دینا آسان ہے مگر یہاں ایک مردہ شے کو زندہ کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک دوسری روایت میں یہی الفاظ آتے ہیں۔

عَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ الْمُزَنِی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْیٰی سُنَّۃً مِّنْ سُنَّتِیْ قَدْ اُمِیْتَتْ بَعْدِیْ فَاِنَّ لَہٗ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلَ اُجُوْرِ مَنْ عَمِلَ بِھَا مِنْ غَیْرِ اَنْ یَّنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِھِمْ شَیْئٌ وَمَنِ ابْتَدَعَ بِدْعَۃً ضَلَالَۃً لَا یَرْضَاھَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ کَانَ عَلَیْہِ مِنَ الْاِثْمِ مِثْلُ اٰثَامِ مَنْ عَمِلَ بِھَا لَا یَنْقُصُ ذٰلِکَ مِنْ اَوْزَارِھِمْ شَیْئٌ

(مشکوٰۃ عن الترمذی)

یعنی بلال بن حارث مزنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے میری سنتوں میں سے کسی سنت کو جو مردہ ہو چکی ہو زندہ کیا تو اسکو ان تمام لوگوں کے عمل کے برابر ثواب ملیگا جنھوں نے اس پر عمل کیا ہوگا۔ بدون اس کے کہ ان لوگوں کے ثواب سے کچھ کم بھی کیا جائے لیکن جس شخص نے کوئی نئی گمراہی ایجاد کی جس سے اللہ اور اسکے رسول راضی نہیں بلکہ اسکو ناپسند کرتے ہیں اس پر اس کا بھی گناہ ہوگا اور جن جن لوگوں نے اس پر عمل کیا ان سب کے گناہوں کے برابر گناہ اس پر بھی ہوگا بغیر اس کے کہ ان کے بوجھ میں کچھ بھی کم کیا جائے۔ (مشکوٰۃ عن الترمذی)

غرض حدیث میں تمسک بھی آیا ہے اور احییٰ بھی آیا ہے اور قاعدہ اَلْحَدِیْثُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا کی بناء پر ایک کی دوسری سے شرح ہوگئی اور حاصل دونوں کا ایک ہی ہوا۔ پس سب سے بڑا فساد یہ ہے کہ سنت مٹ جائے اور بدعت اسکی جگہ لے لے جیسا کہ اپنے زمانہ میں ہم اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ لوگوں کو سنت سے بہت ہی بُعد ہو گیا ہے یہاں تک کہ ایک متبع سنت عالم کی آج لوگوں کی نظروں میں کوئی قدر و منزلت نہیں ہے اور دوسرے دوسرے لوگوں کی خوب آؤ بھگت کیجاتی ہے میں نے اسکو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ دیہاتیوں کو دیکھا کہ عالم دین سے تو انھیں وحشت اور نفرت ہے لیکن اگر ان کے پاس کچھ لوگ آنے جانے لگتے ہیں تو ان سے یہ لوگ خوب ربط ضبط رکھتے ہیں اور خوب بڑھ بڑھ کر مصافحہ کرتے ہیں۔ عالم دین کی ان کے نزدیک اتنی عزت

نہیں ہے جتنی ایک پٹواری کی ہے۔ عالم کے تو سائے سے بھاگتے ہیں لیکن اگر کوئی پٹواری ان کے یہاں آجاتا ہے تو اس کے لئے پلنگ بچھائی جاتی ہے اس پر نہایت صاف بستر لگتا ہے مگر پھر یہ بھی دیکھا کہ جب ان کو یہ معلوم ہوجاتا تھا کہ اس پٹواری نے کھیت کے نمبرات اِدھر سے اُدھر دوسرے کے نام کر دیئے تو اسکو گالی بھی دیتے ہیں میں یہی کہتا تھا کہ یہ تمہاری دنیاداری کی سزائے معجل ہے۔

بہرحال عالم دین اور متبع سنت ان لوگوں کے نزدیک اس زمانہ میں اجنبی اور غیر مانوس ہو گئے ہیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد کہ بَدَءَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ غَرِیْبًا کَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ مِنْ اُمَّتِیْ آج بالکل صادق آرہا ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام ابتدائی زمانہ میں بھی غریب اور اجنبی تھا یعنی اسکے جاننے پہچاننے والے بہت کم لوگ تھے اور عنقریب پھر اسی طرح اجنبی ہو جائے گا جیسا شروع میں تھا۔ پس خوشخبری ہو میری امت کے اجنبیوں کے لئے۔

آگے اسی حدیث میں ہے کہ:۔

قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! مَنِ الْغُرَبَاءُ مِنْ اُمَّتِکَ ؟ قَالَ الَّذِیْنَ یُصْلِحُوْنَ مَا اَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِیْ مِنْ سُنَّتِیْ۔ یعنی عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی امت کے وہ غریب اور اجنبی لوگ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو اصلاح کریں اس سنت کی جسے میرے بعد لوگوں نے فاسد کر دیا ہو۔

اس حدیث کو نقل کرکے صاحبِ مدخل لکھتے ہیں:۔

فَمَنْ کَانَ بَاکِیًا فَلْیَبْکِ عَلٰی نَفْسِہٖ وَعَلَی الْاِسْلَامِ وَغُرْبَتِہٖ وَغُرْبَۃِ اَھْلِہٖ وَالْعَامِلِیْنَ بِالسُّنَّۃِ (مدخل ج۱ ص۲۶۳)

یعنی جو شخص رو سکتا ہو وہ یہ سنکر پہلے تو خود اپنے نفس پر روئے پھر اسلام پر اور اس کی غربت پر اور اہل اسلام کی غربت و کس مپرسی پر اور عاملین بالسنۃ کی کس مپرسی پر روئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سنت کا ترک ہوجانا یہی فساد ہے۔ پس جس طرح جہل کا غلبہ، نفس کا غلبہ، بدعت کا غلبہ، معاصی و فسق کا غلبہ یہ سب امور فساد ہیں۔ اسی طرح ترک سنت کا غلبہ بھی فساد ہے جو لوگ ایسے وقت میں سنت پر عمل کرینگے اور اسکو مضبوط پکڑے رہیں گے وہ بڑے درجہ کے لوگ ہیں اور یوں سمجھو کہ جو لوگ کفار سے جہاد کرنیوالے ہیں ان سے بھی درجہ میں بڑھے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک مردہ سنت کو زندہ کرنے والا اجر میں سو شہیدوں کے برابر ہے۔ اور یہ اسلئے کہ ان میں قوت ان سے زیادہ ہے کیونکہ جہاد کرنے والا تو بدن کی قوت سے لڑتا ہے اور یہ شخص اپنے ایمان کی قوت سے لڑتا ہے اور ایسے فساد کے زمانہ میں احیاء سنت کرنا ہے۔ لوگوں کا

فساد اس کو برگشتہ نہیں کرتا بلکہ یہ اس کی اصلاح کرتا ہے اور اپنے نفس اور اپنے ماحول سبھی کا مقابلہ بیک وقت کر رہا ہے۔

یہاں ایک بات اور کہتا ہوں وہ یہ کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فتوی کی رو سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ اس شخص کو اتنا اتنا اجر ملتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ شخص فسادی نہیں ہے کیونکہ امت کے فساد کے زمانہ میں اس نے فساد کو ختم کرنے کے لئے قدم اٹھایا ہے تو جو شخص کہ فساد کے خلاف علم جہاد بلند کر رہا ہے وہ خود فسادی کیونکر ہو سکتا ہے؟ اور اس کے برخلاف جو لوگ جاہل ہیں۔ اہل نفس یا اہل معاصی ہیں یا مبتدع ہیں، یا محب دنیا ہیں، یا تارک حب آخرت ہیں یہ سب لوگ فسادی ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا ان سب کی اصل نفس اور ہوی کا غلبہ ہے کیونکہ یہی انسان کو خدا سے غافل کر دیتا ہے۔ یہی آخرت کو بھلا دیتا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے دنیا ترک کی ہے تو وہ آخرت کے شوق کی وجہ سے کی ہے کیونکہ جس دل میں ذرا سی بھی محبت آخرت کی آجاتی ہے دنیا کی محبت اس سے بالکل نکل جاتی ہے اور جس قلب میں دنیا سمائی ہوئی ہے فکر آخرت اس سے بہت دور ہو جاتی ہے۔ اور اسی نفس کے اخذ اور ترک پر آخرت کی شقاوت اور سعادت موقوف ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی ۝

یعنی جس شخص نے سرکشی کی اور دنیوی زندگی کو ترجیح دی تو سن رکھو کہ جہنم ہی ایسوں کا ٹھکانا ہو گا۔ اور جو شخص اپنے رب کی پیشی کے خیال سے ڈرتا رہا اور اپنے نفس کو اس نے خواہشات سے روکے رکھا تو یقین رکھو کہ ایسوں کا ٹھکانا جنت ہو گا۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کو ترجیح دینا اور نفس کا طغیان ہی سبب خسران ہے اور باعث دخول نیران بنتا ہے۔ اسی نفس کو زیر کرنے کے لئے اور انسان کو عبد النفس بننے سے بچا کر عبد اللہ بنانے کے لئے شریعت آئی ہے۔ علماء نے اس کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ صاحب الموافقات لکھتے ہیں:۔

قَصْدُ الشَّارِعِ مِنْ وَضْعِ الشَّرَائِعِ اِخْرَاجُ النُّفُوْسِ عَنْ اَھْوَائِھَا وَعَوَائِدِھَا

(ج ۱ ص ۲۳۶)

یعنی شارع کا شریعت اتارنے سے مقصد ہی نفوس کو ان کی خواہشات اور عادات سیئہ سے نکالنا ہے اسی طرح سے ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ:۔

نَعَمْ وَضْعُ الشَّرِیْعَۃِ عَلٰی اَنْ تَکُوْنَ اَھْوَاءُ النُّفُوْسِ تَابِعَۃً لِمَقْصُوْدِ الشَّارِعِ فِیْھَا۔

(موافقات ج ۱ ص ۲۳۷)

یعنی شریعت کی وضع ہی اس نہج پر ہوئی ہے کہ نفوس کی خواہشات کو شارع کے مقصد کے تابع بنایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر شریعت اور سنت کو ترک کردیا جائیگا اور اسکی جگہ ہوائے نفسانی کی اتباع کی جائیگی تو دو حال سے خالی نہ ہوگا یا تو شریعت کا انکار کرکے نفس کا اتباع کیا جائے گا یہ تو کفر ہے۔ اور یا شریعت کا انکار تو نہ ہوگا لیکن اس کے احکام کو ترک کرکے نفس کے حکم پر چلا جائے گا اس کا نام فسق ہے۔

اب یہ عالم کے ذمہ ہے کہ لوگوں کو بتلائے کہ تم یہ کیا کررہے ہو اور کہاں جارہے ہو۔ ان سے کہے کہ تم ہویٰ پر چل رہے ہو۔ نفس کو پکڑے ہوئے ہو۔ اس سے نکلو اور اس سے نکلنے کا طریقہ اور ذریعہ اتباع سنت ہے۔ کیونکہ نفس اور ہویٰ ہی کے مارنے کے لئے احکام آئے ہیں۔ انہی پر چلکر خدا کا راستہ پایا جاسکتا ہے ؎

میندار سعدی کہ راہِ صفا — تواں رفت جز بر پئے مصطفےٰ

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ ہویٰ میں اور شریعت میں بالکل تضاد ہے اتباع الھویٰ ضد اتباع الشریعۃ لہذا اہل نفس کو (یعنی متبع ہویٰ کو) ابتداءً اپنی خواہش کے علاوہ سب احکام شاق معلوم ہوتے ہیں خواہ وہ احکام فی نفسہ شاق ہوں یا نہ ہوں اور یہ اس لئے کہ یہ احکام اسکو اسکی مراد سے روکتے ہیں اور نفس جو ابتک خوب گلچھرے اڑاتا تھا اس میں مانع بن جاتے ہیں لیکن جب سالک (مکلف) ہمت کرکے اپنی خواہش کو ترک کردیتا ہے اور اپنے نفس کو اس سے روک لیتا ہے اور جو عمل کہ شریعت کیجانب سے اس سے چاہا گیا ہے اسپر اپنے کو لگا لیتا ہے تو قاعدہ ہے کہ انسان جس کام کو بار بار کرتا ہے اس کا خوگر ہوجاتا ہے اور اس سے اس کو ایک قسم کی محبت ہوجاتی ہے اور اس کی تلخی مبدل بہ لذت ہوجاتی ہے بلکہ یہ ہوجاتا ہے کہ اب اس کے خلاف کرنا نفس پر شاق گذرتا ہے۔ حالانکہ اس سے قبل خود وہ عمل شاق تھا اور نفس کا حکم لذیذ تھا۔

اس لئے انسان میں بس طلب ہونا چاہیئے پھر اسکے بعد جب احکام کو اختیار کریگا تو اس کا فائدہ یعنی فنائے نفس خود بخود سامنے آئے گا۔ بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ ان پر عمل کرے اور اس پر مداوم رہے۔

آپ کے سامنے ہوائے نفسانی کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔

ایک صاحب سردیوں میں ریل کا سفر کررہے تھے اتفاقاً انھیں غسل کی حاجت ہوگئی۔ اب نہ وہاں تنہائی اور نہ گرم پانی۔ فجر کی نماز کا وقت ہوگیا۔ ایسی حالت میں آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کس قدر مخمصہ میں پڑے ہوں گے نفس اس حکم کو ٹالنا چاہتا ہوگا کہ پھر غسل کرلینا اور قضا پڑھ لینا۔ لیکن شریعت کی محبت اور اللہ اور رسول کے حکم کا تقاضا تھا کہ غسل کرکے نماز ادا کیجائے۔ بالآخر اللہ اور رسول کی تصدیق غالب آئی اور

ہمت کر کے نفس کو زیر کر لیا۔ پھر تدبیر بھی سمجھ میں آگئی وہ یہ کہ ایک بہشتی سے کہا کہ میں پلیٹ فارم پر بیٹھا جاتا ہوں تم ایک مشک پانی میرے اوپر ڈالدو چنانچہ غسل کر کے اندر آگئے اور کپڑے بدل کر نماز ادا کی۔ اپنا یہ واقعہ سنا کر حضرت سے خود کہتے تھے کہ حضرت اس نماز میں اتنا لطف آیا کہ ویسی لذت اس سے پہلے کبھی نماز میں نہ ملی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ طاعت کے ادا کر لینے کی لذت ہے جیسا کہ صاحب موافقات کے کلام میں ابھی آپ نے دیکھا۔ غرض اللہ والوں کو شروع شروع میں اپنے جوارح اور اعضاء بدن۔ ناک۔ کان۔ سر آنکھ۔ زبان۔ پاؤں وغیرہ سے مخالفت اور دشمنی کرنی پڑتی ہے اسلئے کہ یہ سب کے سب خلاف مرضی محبوب کام ان سے کرانا چاہتے ہیں اور یہ حضرات کرنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ ان کو مجاہدہ بھی بہت کرنا پڑتا ہے لیکن جب یہی سب اعضاء رام ہو جاتے ہیں اور حکم شرع کے مطیع و فرمانبردار ہو جاتے ہیں پھر ان حضرات کو ان سے محبت بھی ہو جاتی ہے اور وہ اب ان کے ساتھ نہایت ہی نرمی کا معاملہ کرنے لگ جاتے ہیں بلکہ ان کو اپنا محسن تصور کر کے ان کے ممنون احسان رہتے ہیں اور راہ محبوب میں چلنے میں ان کا واسطہ ہونا ملاحظہ کر کے ان پر ناز بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است — افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را — کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

یعنی میں اپنی آنکھ پر اب اس لئے ناز کرتا ہوں کہ اس نے تیرا جمال دیکھا ہے اور خود اپنے پیروں پر گرتا ہوں اس خیال سے کہ وہ تیرے کوچہ میں پہونچا ہے۔ ہر وقت اپنے ان ہاتھوں کو ہزاروں بوسے دیتا ہوں محض اس تصور میں کہ اسی نے تیرا دامن پکڑ کر میری جانب تجھ کو کھینچا ہے۔

سبحان اللہ! اتباع سنت ہی کی برکت سے ان سب اعضاء کے فساد رفع ہو کر آج یہ اسقدر مکرم و محترم ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فساد سے تحفظ کا واحد ذریعہ اتباع سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ اللھم جنبنا الفواحش ما ظھر منھا وما بطن وبارک لنا فی اسماعنا وابصارنا وقلوبنا وازواجنا وذریاتنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔

عرض ناقل

حضرت والا نور اللہ مرقدہٗ نے "تمسک بالسنۃ" کی یہ تقریر جو ناظرین کرام کے ملاحظے سے گذری، بزمانۂ قیام بمبئی یعنی دسمبر ۱۹۶۲ء بمقام کرلا سلیمان بلڈنگ میں ارشاد فرمائی تھی، لیکن اسی مضمون کے مناسب چونکہ حضرت والا کا ایک سابق رسالہ "مژدۂ جانفزا" کا مضمون بھی تھا۔ اسلئے اس رسالہ کو کسی قدر اضافے کے بعد اس رسالہ کیساتھ لاحق کیا جاتا ہے تاکہ ایک قسم کے مضامین یکجا ہو جائیں اور موجب ازدیاد نفع بنیں۔ والسلام

مرتب

مژدۂ جانفزا

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم

امابعد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تمسک بسنتی عند فساد امتی فلہ اجر مأۃ شہید۔ (رواہ البیہقی وابن حبان)

یعنی جو شخص میری امت کے فساد کے وقت میری سنت کو لازم پکڑے گا اسکو سو شہیدوں کا اجر ملیگا۔

یہ حدیث نص ہے اس امر میں کہ اس امت کے فساد کے وقت جو شخص تمسک بالسنۃ کرے گا اس کو سو شہیدوں کے برابر اجر ملیگا۔ یعنی یہ حدیث ارشاد فرمائی ہی گئی ہے اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے۔

لیکن یہی حدیث ظاہر ہے اس مضمون میں کہ امت پر ایک ایسا وقت بھی آئے گا کہ جسکو زمانۂ فساد امت سے تعبیر کیا جائیگا اس لئے کہ عام طور سے لوگ راہ سنت کو چھوڑ کر کفر و فسق کی راہ اختیار کرینگے تاہم ایسے وقت میں کچھ لوگ ایسے بھی ضرور ملیں گے جو دوسروں سے اپنے علوم و کمالات میں زیادہ واقف۔ زیادہ عمیق اور نیک تر ہونگے اور اس فسق و فجور کے غلبہ کے باوجود یہ لوگ سنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہیں گے۔ ایسے ہی لوگ اس اجر عظیم کے مستحق ہوں گے یعنی ان کو سو شہیدوں کا ثواب ملیگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ ایسا وقت ہوگا کہ سنت پر عمل کرنا جان پر کھیل جانے کے مرادف ہوگا اس لئے کہ فساد کی وجہ سے سب لوگوں کا عمل سنت کے خلاف ہوگا۔ ایسی صورت میں کسی کا سنت کو اختیار کرنا عام لوگوں سے مخالفت مول لینے کے مرادف ہوگا۔ اسی لئے لوگ تمسک بالسنۃ سے گھبرائیں گے اور سنت کا اختیار کرنا ایسا ہوگا جیسے ہاتھ میں انگارہ لینا بگر لوگوں کی مخالفت وغیرہ کی پروانہ کرکے جو شخص ایسے وقت میں اتباع سنت کریگا وہ امت کا بڑا شخص ہوگا اور سرفروش اور جانباز سمجھا جائیگا۔ سنت اختیار کرنے میں اسکو جو جو مزاحمتیں پیش آئیں گی چونکہ ان کا مقابلہ جنگ میں مرکر ایک بار جان دیدینے سے کہیں زیادہ نفس پر شاق ہوگا۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ایک نہیں بلکہ سو شہیدوں کا اجر فرمایا۔

حدیث شریف میں فساد امتی کا لفظ جو وارد ہے تو ہم اس کی تشریح کرتے ہیں کہ اسکا مفہوم اور مصداق کیا

ہے تاکہ لوگ اس سے احتراز کریں۔ سنئے فساد ضد ہے صلاح کی اور افساد ضد ہے اصلاح کی یہ تو اسکی مختصر تشریح ہے اور سنئے! قرآن شریف میں فساد اور افساد کی مذمت میں بہت آیتیں وارد ہیں پہلے ہی پارہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ :۔

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ - یعنی کیا آپ اس زمین میں ایسے شخص کو خلیفہ بنائیں گے جو اس میں فساد کریگا اور خونریزی کرے گا۔ اس میں سفك الدماء کو فساد پر عطف کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ افساد کا اعلیٰ فرد خونریزی ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ :۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ - (سورہ بقرہ)

یعنی اور گمراہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اس مثال سے کسی کو مگر صرف بے حکمی کرنے والوں کو جو توڑتے رہتے ہیں اُس معاہدہ کو جو اللہ تعالیٰ سے کر چکے تھے اُس کے استحکام کے بعد اور قطع کرتے رہتے ہیں ان تعلقات کو کہ حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو وابستہ رکھنے کا اور فساد کرتے رہتے ہیں زمین میں پس یہ لوگ ہیں پورے خسارہ میں پڑنے والے۔

اس آیت کے تحت صاحب روح المعانی نے افساد کے مختلف معانی[عـــہ] بیان فرمائے ہیں اور آخر میں ایک تفسیر کو سب سے عمدہ کہا ہے مجھے بھی وہ تفسیر پسند آئی اس لئے اسکو نقل کرتا ہوں۔ وھو ھذا فرماتے ہیں کہ :

يُفْسِدُونَ فی الارض ای بانهم یرتکبون کل معصیة یتعدی ضررها ویطیر فی الآفاق شررها ولعل هذا اولیٰ۔ (روح المعانی پ۱)

یعنی زمین میں فساد کرتے ہیں یعنی وہ لوگ ایسی معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں کہ جس کا ضرر متعدی ہوتا ہے اور اس کی چنگاری اطراف عالم میں اڑ کر پھیل جاتی ہے۔ اور فساد کی یہ تفسیر سب سے بہتر ہے۔

واقعی افساد کی تشریح جن لفظوں میں بیان فرمائی ہے اس سے عمدہ تشریح میں نے کہیں نہیں دیکھی خوب ہی نقشہ کھینچا ہے اور یطیر فی الآفاق شررها میں تو اس کی پوری حقیقت ظاہر فرمادی ہے اسلئے کہ جس طرح آگ لگتی ہے اور اس کے شعلے بلند ہوتے ہیں تو اس سے چنگاری اڑ کر دور دور تک پھیل جاتی ہے اور آس

عـــہ وھی ھذہٖ۔ افسادھم باستدعائهم الی الکفر والترغیب فیه وحمل الناس علیه او باخافتهم السبیل وقطعهم الطرق علی من یرید الهجرة الی الله تعالی ورسوله صلی الله تعالی علیه وسلم۔ انتہی (ترجمہ) ان کا فساد یہ تھا کہ لوگوں کو کفر کی طرف بلاتے تھے اور اسکی ترغیب دیتے تھے اور لوگوں کو اس پر آمادہ کرتے تھے ـــــ یا یہ کہ ان لوگوں کو ڈراتے اور دھمکاتے تھے اور ان کا راستہ روک رکھا تھا جو لوگ کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہجرت کرکے آنا چاہتے تھے۔ ۱۲

پاس کی چیزوں کو بھی خاکستر کر کے رکھدیتی ہے یہی حال فساد کا بھی ہے کہ اس کا ضرر لازم نہیں بلکہ متعدی ہوتا ہے بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ضرر صرف مرتکب تک محدود رہتا ہے۔ لیکن فساد ان گناہوں میں سے ہے جس کا ضرر متعدی ہوتا ہے اور فساد مثل آگ کے ہے۔ پس جس طرح سے کہ آگ کی چنگاریاں دور دور تک اڑ کر جاتی ہیں۔ اسی طرح سے فساد کا اثر بد بھی اطراف و اکناف میں پھیل جاتا ہے اور فساد جب آگ ہے تو اس کی چنگاریاں یہی امور یعنی سب و شتم، لعن وطعن، ضرب و قتل، جنگ و جدل۔ نزاع و خصومت، غیبت و شکایت اور تذلیل و توہین وغیرہ ہیں فساد کا مفہوم اور مصداق اور اسی طرح افساد چونکہ قرآن وحدیث میں وارد ہوا ہے۔ پس اس کی تفسیر علمائے اہل تفسیر اور شراح حدیث ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اس میں ہماری رائے اور قیاس کو دخل نہیں ہے۔ اسی بنا پر ہم نے ذرا مبسوط کلام کیا ہے۔ پس ہو سکتا ہے کہ ہم مدرسہ ہی کو فساد بنالیں یا علم ہی کو فساد بنالیں۔ اسکی مثال یوں سمجھئے جیسے کسی شخص کو چکر کا مرض ہو تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ ساری چیزیں حتیٰ کہ زمین آسمان سب گھوم رہے ہیں چنانچہ وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ مجھے پکڑو سب چیزیں گھومی چلی جارہی ہیں اس کو سنکر جو شخص صحیح و تندرست ہوتا ہے وہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کو دوران سر کا دورہ ہو رہا ہے ورنہ کوئی چیز بھی گھوم نہیں رہی ہے خود اسی کا سر چکرا رہا ہے اور دلیل اسکی یہ ہے کہ اگر چیزیں گھومتی ہوتیں تو مجھے بھی محسوس ہوتیں اس وقت اس کی یہی مثال سمجھ میں آئی ورنہ دوسری مثال سمجھ لیجئے۔

فساد کا مفہوم اور اس کا مصداق متعین ہو جانے کے بعد معلوم ہو گیا کہ شامت اعمال سے ہم سب اس میں مبتلا ہیں اور اس ابتلا کی خبر بھی نہیں ہر گھر میں یہ گھس گیا ہے سب اس کے شکار ہیں جس کو حدیث میں اصلاح ذات البین کے مقابلہ میں افساد ذات البین (یعنی آپس میں فساد ڈالنا) کہا گیا ہے اور اس کو حالقہ (یعنی ایمان کو مونڈ دینے والی چیز فرمایا گیا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے پناہ دیں۔

اور سنئے افساد کے معنی علماء نے یہ بھی بیان فرمائے ہیں کہ مسلمانوں کی جماعت میں خرابی ڈالنا، اور فرمایا ہے کہ اس افساد کے بہت سے مراتب اور درجات ہیں کیونکہ زمان اور مکان کے عموم اور شمول کے اعتبار سے اسکی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں مثلاً بعض فساد ایسا ہوتا ہے جس کا ضرر اور اثر صرف ایک ہی گھرانے اور خاندان پر پڑتا ہے لیکن ایک فساد اس قسم کا بھی ہوتا ہے کہ اسکی چنگاریاں پورے ایک شہر کو گھیر لیتی ہیں۔ علی ہذا القیاس

اسی طرح بعض فساد ایسا ہوتا ہے جس کا اثر ایک محدود وقت تک رہتا ہے اور ایک فساد ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ زمانہ دراز تک کے لئے اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے۔

پھر یہ سمجھئے کہ افساد کی بہت سی انواع ہیں مثلاً کبھی یہ قتل کی شکل میں ہوتا ہے۔ کبھی کسی کی اہانت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اسی طرح کسی کے عیوب کا تجسس اور اس کی غیبت و بدگوئی وغیرہ بھی افساد ہی میں داخل

ہے۔ اسی طرح مشورۂ بد دینا بھی۔

پھر یہی سب چیزیں مختلف اشخاص کے اعتبار سے فساد کا مختلف درجہ رکھتی ہیں مثلاً ـــــ محلہ کے کسی ایسے شخص کو قتل کر دینا کہ ایک مخلوق کثیر کا اور اہل محلہ کے امور معاش ومعاد کا انتظام اس سے متعلق ہو، ظاہر ہے کہ یہ بہت قبیح امر ہے ـــــ لیکن کسی بادشاہ عادل کو قتل کر دینا جو کہ ایک مخلوق کثیر کے انتشار کا سبب بن جائے بلاشبہ پہلے فساد سے ہزار درجہ قبیح ہے ـــــ اسی طرح کسی مسجد کے منتظم کو مار ڈالنا جسکی وجہ سے مسلمان مسجد میں جمع ہو کر اطمینان سے نماز ادا کرتے رہے ہوں۔ ظاہر ہے کہ بہت شنیع امر ہے ـــــ تاہم اس کے مقابلہ میں کسی ایسے عالم کامل کو قتل کر دینا (جو کہ حلاّل مشکلات ہو اور مرجع خاص وعام ہو اور مصداق اس کا ہو کہ اسکو ابوحنیفۂ وقت بخاری زماں اور غزالی عصر کہا جائے) اس درجہ قبیح اور شنیع ہے کہ جس کی کچھ انتہا ہی نہیں، اور جو حکم کسی کے قتل کا ہے وہی حکم اس کی اہانت، تجسس عیوب اور غیبت وغیرہ کا بھی ہے لیکن قتل کو تو عام طور پر فساد اور افساد سمجھا جاتا ہے مگر تجسس اور غیبت واہانت وغیرہ کو کوئی فساد نہیں سمجھتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

لہٰذا ہم یہاں اس پر کچھ مفصل گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ سنیئے:۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی کا کوئی عیب دیکھے پھر اس کو چھپائے یعنی دوسروں سے ظاہر نہ کرے تو وہ ثواب میں ایسا ہوگا جیسے کسی نے زندہ درگور لڑکی کی جان بچائی کہ قبر سے زندہ اس کو نکال لیا۔ اس روایت سے مفہوم ہوا کہ جو شخص دوسروں کا عیب نہ چھپائے تو اس نے گویا اس کو زندہ درگور کر دیا۔ کیونکہ کسی شخص کا عیب ظاہر کرنا اس کو بے عزت کرنا ہے اور بے عزت زندگی حقیقتاً موت ہے زندگی نہیں۔ (حیوٰۃ المسلمین روح نہم)

مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث یہ بیان فرمائی ہے:۔ عن معاذ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من عیر اخاہ بذنب لم یمت حتی یعملہ یعنی من ذنب قد تاب منہ رواہ الترمذی یعنی حضرت معاذ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی مسلمان بھائی کو کسی گناہ پر عار دلائے اس کو موت نہ آئیگی جب تک کہ خود اس گناہ کو نہ کرلے گا۔ آگے راوی حدیث نے تفسیر بیان فرمائی کہ یعنی من ذنب قد تاب منہ یعنی یہ وعید اس عار کے لئے ہے جو ایسے گناہ پر دلائی جائے جس سے مذنب تائب ہو چکا ہو۔

صاحب مرقاۃ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ من عیر ای وبخ ولام اخاہ ای المسلم بذنب ای صدر منہ سابقاً او علی طریق الشماتت لم یمت حتی یعملہ ای مثل ذنبہ یعنی ای یرید النبی

صلی اللہ علیہ وسلم التعییر من ذنب قد تاب منہ۔ قال میرک ھذا التفسیر منقول عن الامام احمد (مرقاۃ ص۲۳۹ ج۴) یعنی صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں کہ عَیَّرَ کے معنی توبیخ اور ملامت کے ہیں اور اپنے بھائی سے مراد یہاں دینی بھائی یعنی مسلم ہے۔ اس کو کسی گناہ پر عار دلانا یعنی جو اس سے صادر ہو چکا ہو یا اس کے ارتکاب ذنب پر خوشی ظاہر کی تو وہ نہ مرے گا یہاں تک کہ خود اس کا مرتکب ہو جائے۔ یعنی اسی جیسے گناہ کا مرتکب ہو جائے۔ آگے قد تاب منہ جو فرمایا تو شارح فرماتے ہیں کہ راوی یہ تفسیر بیان فرمانا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ یہاں اس ذنب پر عار دلانے کی مذمت کرنا ہے جس سے اس مسلم نے توبہ کرلی ہو۔ میرک کہتے ہیں کہ یہ تفسیر امام احمد سے منقول ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ وعید خاص اسی شخص کے لئے ہو جس نے کسی تائب کو عار دلائی ہو کیونکہ ظاہر ہے کہ جب ایک شخص نے سابق گناہ سے توبہ کرلی اور اللہ تعالی نے اس کی ستاری فرمالی تو اب کسی کو کیا حق پہونچتا ہے کہ اسکو رسوا کرے جب کہ خود حدیث شریف میں آتا ہے کہ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ۔ یعنی جس نے گناہ سے توبہ کرلیا ہو ایسا ہو گیا جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں، لہذا ایسے شخص کو عار دلانا بہت ہی بُرا ہے اور اسکی یہ سزا ملے گی کہ یہ عار دلانے والا بھی اس فعل شنیع کا مرتکب ہو کر رہے گا تو یہ صحیح ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ غیر تائب کو عار دلانا جائز ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ گناہ تو نفس عار دلانا ہی ہے، باقی یہ ہوسکتا ہے کہ یہ سزائے خاص اسکو نہ دی جائے اس لئے کہ پہلے جرم سے اسکا جرم خفیف ہے تاہم اس کے جرم ہونے میں تو کلام ہی نہیں۔ اور سنئے:۔

ترصیع الجواہر المکیۃ میں ہے کہ ولا یوبخ مذنبا علی ذنب سلف منہ ولیعتقد انہ تاب منہ وفی الحدیث لیس منا من عیّر التائب۔ یعنی کسی عاصی کو اس کے سابق معصیت پر عار نہ دلائے اور توبیخ نہ کرے بلکہ یہ سمجھے کہ اس نے توبہ کرلی ہوگی، مصنفؒ اپنے منہیہ میں لکھتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ اس وصف پر محافظت مہمات دین میں سے ہے اس لئے کہ حدیث شریف میں ہے کہ اگر تم میں سے کسی نے اپنے بھائی کو کتیا کے دودھ پینے پر عار دلائی ہے تو خود اس کو بھی پینا پڑے گا۔ اور میں نے تو اسکا مشاہدہ بھی کیا ہے کہ میں ظالموں اور حاکموں کے پاس آنے جانے اور مناصب شریفہ مثلاً افتاء و قضاء و ریاست میں خوض کرنے میں خود مبتلا ہوا مگر اس سبب سے کہ میں اپنے دینی بھائیوں کو (جو جماعت صوفیہ سے تعلق رکھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ سچے لوگ تھے) عار دلاتا تھا اس پر کہ وہ اہل ظلم اور رؤساء و حکام سے کیوں اختلاط رکھتے ہیں حالانکہ ان کے لئے اپنے اس اختلاط میں بعض مقاصد حسنہ اور مصالح صحیحہ تھیں۔

اسی طرح سے میں نے اہل عشق و محبت کو بھی ان کے مخصوص احوال میں ملامت کی ہے (یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں) لیکن بعد میں مجھے خود اس سے دوچار ہونا پڑا اس وقت میں نے ان حضرات کو معذور سمجھا اور خود بھی ان تمام منازل سے گذرا جن سے وہ گذرے تھے۔ باقی اب اللہ تعالیٰ (کے فضل و کرم سے) امید کرتا ہوں کہ ان حالات سے نکل چکا ہوں گا۔

دیکھا آپ نے کسی دوسرے کے عیب پر نظر کرنے کی حدیث شریف میں کیسی وعید آئی ہے۔ آج اسی فساد کو ہم عام دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ بلاغات مالکؒ میں ایک حدیث یہ آئی ہے کہ مالک بلغه عن عیسیٰ ابن مریمؑ کان یقول لا تکثروا الکلام بغیر ذکر اللہ فتقسو قلوبکم فان القلب القاسی بعید من اللہ ولکن لا تعلمون۔ یعنی حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے سوا دوسرے کلام کی کثرت نہ کرو ورنہ اس سے تمہارے دل سخت ہو جائیں گے اور قلب قاسی اللہ تعالیٰ سے بہت دور ہو جاتا ہے لیکن (چونکہ یہ قرب اور بعد ایک امر معنوی ہے اس لئے) تمہیں اس کا علم بھی نہیں ہوتا آگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوسرا ارشاد نقل فرماتے ہیں اور مجھے یہاں اسی کو بیان کرنا تھا۔ وہ یہ کہ:-

ولا تنظروا فی ذنوب الناس کانکم ارباب انظروا فی ذنوبکم کانکم عبید فانما الناس مبتلی و معافی فارحموا اہل البلاء واحمدوا اللہ علی العافیۃ۔ یعنی اہل ذنوب کے گناہوں کو اس طرح نہ دیکھو کہ گویا تم ہی خدا ہو (یعنی اس طرح نظر نہ کرو جس کا منشا کبر و تحقیر ہو) بلکہ اپنے گناہوں کو اس طرح دیکھو کہ گویا تم بندہ خطاوار ہو اور یہ اس لئے کہ لوگ مبتلائے معاصی بھی ہیں اور اہل عافیت بھی ہیں یعنی (اہل طاعت و حفاظت بھی) پس تم کو چاہئے کہ اہل بلاء پر رحم کرو اور اپنی عافیت پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرو۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث میں اہل عصیان پر کبر کرنے کی ممانعت نکلی بلکہ ترحم کی فضیلت ثابت ہوئی۔ یہ خلق ہے حضرات انبیاء علیہم السلام کا پس ان کے متبعین کو اس خُلق سے انحراف کا کیا حق ہے؟ بات یہ ہے کہ انسان کی باطنی آنکھ جب تک بند رہتی ہے اسکو دوسروں ہی کی برائیاں نظر آتی ہیں اور جب وہ اپنے عیوب کا بصیر ہو جاتا ہے تو پھر دوسرا کوئی اسکی نگاہ میں بُرا نہیں رہ جاتا۔ اسی کو اکبرالہ آبادی مرحوم فرماتے ہیں کہ ؎

اوروں پہ معترض تھے لیکن جب آنکھ کھولی   اپنے ہی دل کو ہم نے گنج عیوب دیکھا

اور اسی مضمون کو ظفر شاہ نے یوں ادا کیا ہے۔ ؎

ہمیں جب تلک اپنی ہوئی نہ خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنے گناہوں پہ جب کہ نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

اسی سلسلہ کا ایک اور شعر یہ فرماتے ہیں کہ ؎

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیئے گا، ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

بہرحال فساد چاہے دین کی صورت میں ہو یا دنیا کی اس سے امن و سکون برباد ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے اس کے بُرے ہونے کی۔ چنانچہ جو لوگ گوشہ نشین ہوتے ہیں یہ مفسد لوگ ایسوں کو بھی اس حالت میں دیکھنا پسند نہیں کرتے حالانکہ ایسے وقت کے لئے یہی آیا ہے کہ ھٰذا وقت السکوت وملازمۃ البیوت۔

اب آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ حدیث میں تمسک بالسنۃ پر اجر خاص موعود ہے اور تمسک بالسنۃ میں عقائد، عبادات، معاملات، معاشرات اور اخلاق سب داخل ہیں (یعنی متمسک بالسنۃ حقیقتاً وہ شخص کہلائیگا جس کے عقائد بھی سنت کے مطابق ہوں، عبادات بھی سنت کے مطابق ہوں، معاملات و معاشرات بھی سنت کے مطابق ہوں اور اخلاق بھی سنت کے مطابق ہوں) گویا پورا دین ہی مراد ہے اسی طرح یہ بھی بالتصریح مفہوم ہو رہا ہے کہ متمسک بالسنۃ بروئے حدیث اس زمرہ سے خارج ہے (یعنی وہ مفسد اور فسادی نہیں ہے)

ع بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

بس اب اس دعا پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس حدیث شریف پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

وصی اللہ عفی عنہ

۲۳۔ روشن باغ۔ الہ آباد

۲۵ محرم الحرام ۱۳۷۹ھ

(مزید اضافہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ)

افاضاتِ مبلّغِ کامل

یعنی

عبادُ الرحمٰن کون لوگ ہیں؟

از افاضات

مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

عباد الرحمٰن کون لوگ ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے سورہ فرقان میں ارشاد فرمایا ہے کہ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ○ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ○ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ○

اللہ تعالیٰ یہاں عباد الرحمٰن کو بیان فرمارہے ہیں کہ عباد الرحمٰن کون لوگ ہیں اور ان کے اوصاف کیا ہیں اور یہ اس لئے کہ اس سے پہلے کفار کا حال بیان کیا ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہیں بلکہ سرے سے رحمٰن ہی کا انکار کرتے ہیں وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ○ یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا چیز ہے۔ کیا ہم اس کو سجدہ کرنے لگیں گے جس کو تم سجدہ کرنے کے لئے ہم کو کہو گے اور اس سے ان کو اور زیادہ نفرت ہوتی ہے۔

دیکھتے ہیں آپ؟ انھوں نے انکار بھی کیا تو کس کا؟ رحمٰن کا۔ حالانکہ اسی وصف رحمت سے عالم کا قیام اور اس کی بقا ہے۔ ساری دنیا اس کی محتاج ہے۔ ان ظالموں نے اسی کا انکار کر دیا (ناقل عرض کرتا ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کئے جن میں سے ننانوے حصے اپنے پاس روک لئے اور ایک حصہ زمین پر اتارا (اور سب میں تقسیم فرمایا) چنانچہ اسی کا یہ اثر ہے کہ مخلوق میں سے بعض بعض پر رحم کرتے ہیں یہاں تک کہ گھوڑا اپنے پیر کو اٹھا لیتا ہے اس ڈر سے کہ اس کا بچہ دب نہ جائے۔ نیز حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ ابھی میرے پاس جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اے محمدؐ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک ایسا بندہ بھی ہے جس نے پہاڑ کی چوٹی پر اللہ تعالیٰ کی پانچ سو برس تک عبادت کی۔ اس پہاڑ کا طول وعرض تیس تیس ہاتھ تھا جس کے چاروں طرف چار چار ہزار فرسخ تک سمندر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے محض اس کی خاطر ایک

شیریں چشمہ ایک انگلی کی مقدار چوڑا پہاڑ کے نیچے سے جاری فرمادیا تھا اور اسی جگہ ایک انار کا درخت اگادیا تھا جس سے روزانہ ایک انار تیار نکلتا تھا۔ جب شام ہوتی تو وہ پہاڑ سے چشمے کی جانب اترتا اس میں وضو کرتا۔ درخت سے انار توڑتا اور اسے کھا پی کر نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا۔ (ایک دن) اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ مجھے سجدہ ہی کی حالت میں وفات دیجئے اور زمین کو یا کسی اور جانور وغیرہ کو میرے بدن پر قدرت نہ دیجئے تاکہ میں قیامت میں جب اٹھایا جاؤں تو سجدہ ہی کی حالت پر اٹھوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول فرمالیا۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ ہم آسمان سے آتے جاتے اس پر سے گزرتے تھے اور دیکھتے تھے کہ وہ اسی طرح سجدہ میں پڑا ہوا ہے۔ پھر ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اسے قیامت میں مبعوث فرمائیں گے اور اپنے سامنے کھڑا کر کے فرشتوں کو حکم دیں گے کہ میرے اس بندہ کو میری رحمت کے سبب سے جنت میں داخل کر دو۔ وہ کہے گا میں تو اپنے عمل کے سبب مستحق جنت ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیں گے کہ اچھی بات ہے۔ اس کے عمل اور میری نعمت کا موازنہ کر لو چنانچہ دیکھا جائے گا کہ صرف نعمت بینائی ہی کے مقابلہ میں اس کی پانچ سو سالہ عبادت ختم ہو جائے گی اور بقیہ جسمانی اور روحانی ظاہری و باطنی نعمتیں مقابلہ سے خالی رہیں گی یعنی ان کے عوض کوئی عمل نہ ہوگا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ لے جاؤ اس کو دوزخ میں داخل کر و۔ (کیونکہ عدل کا فیصلہ یہی ہے) یہ سن کر وہ چلائے گا اور درخواست کرے گا کہ اے پروردگار مجھے اپنی رحمت کے صدقے میں جنت میں داخل کیجئے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اچھا اس کو واپس لاؤ۔ وہ سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے انسان بتا! تجھ کو کس نے پیدا کیا اور عدم سے وجود کس نے بخشا؟ وہ عرض کرے گا پروردگار تو نے۔ پھر ارشاد ہوگا کہ یہ جو تجھے وجود ملا تو تیرے عمل کی وجہ سے یا میری رحمت کی وجہ سے؟ وہ کہے گا نہیں پروردگار تیری رحمت رحمت کی وجہ سے۔ پھر ارشاد ہوگا کہ پانچ سو سال تک عبادت کی قوت کس نے بخشی؟ کہے گا پروردگار تو نے حکم ہوگا کہ تجھے پہاڑ کے اندر باغ کے درمیان میں کس نے رکھا؟ اور تیرے شور سمندر میں شیریں پانی اور ہر دن پھلنے والا انار کا درخت کس نے پیدا کیا؟ جب کہ انار سال بھر میں صرف ایک بار پھلا کرتا ہے۔ پھر یہ کہ تو نے مجھ سے سوال کیا کہ سجدہ کی حالت میں تیری روح قبض کی جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بتلا ان سب امور کو کس نے انجام دیا؟ وہ کہے گا پروردگار سب کام آپ ہی نے کیا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ بس یہ سمجھ لے کہ یہ سب میری رحمت کے کرشمے ہیں۔ اسی طرح سے میں نے اپنی رحمت ہی کی وجہ سے تجھ کو جنت میں داخل کیا۔ یہ واقعہ سنا کر جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے بیشک تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی سے وجود میں آتی ہیں اور پایہ تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ (از تنبیہ الغافلین)۔ غرض صفت رحمت ہی سے عالم کا قیام اور اس کی بقا ہے۔

ان ظالموں نے اسی کا انکار کیا) بات یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت تو کرتے نہیں تھے۔ عباد الرحمٰن بھی نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں عباد الرحمٰن کو بتایا ہے چنانچہ ان کی بعض صفات کو شمار فرماکر آخر سورہ تک انھیں کے حالات کو بیان فرمایا ہے اور خوب ہی خوب بیان فرمایا ہے۔ ان کے اوصاف بھی بیان فرمائے انکی دعائیں بھی نقل فرمائیں اور خالق اور مخلوق ہر دو کے ساتھ ان کے معاملات بھی بیان فرمائے اور انکے روز و شب کے اعمال بھی بیان فرمائے کہ وہ دن کو کیا کرتے ہیں اور رات کو کیا کرتے ہیں۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ سے نیا مضمون شروع فرمارہے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کے اوصاف اور ان کے دینی اور دنیاوی احوال کا بیان ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں (یعنی سکینت اور وقار کے ساتھ چلتے ہیں، نہ اپنے پاؤں کو پٹکتے ہیں اور نہ جوتوں سے آواز کرتے ہیں) اور جب ان سے جہالت والے لوگ بات کرتے ہیں تو وہ رفع شر کی بات کہتے ہیں۔ (پہلے جملے میں تو ان کا ذاتی حال بیان فرمایا تھا اور یہاں ان کا حسن معاملہ دوسروں کے ساتھ بیان فرمایا۔) اور جو راتوں کو اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام میں لگے رہتے ہیں۔ (یہ ان کے رب کے ساتھ ان کے معاملے کا بیان ہے)

حضرت حسنؒ جب پہلی آیتیں تلاوت کرتے تھے تو فرماتے تھے کہ یہ ان کے دن کا حال ہے اور جب اس آیت کو پڑھتے تھے تو فرماتے تھے کہ یہ ان کے رات کا وصف ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ وہ لوگ ایسے ہیں جو دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے جہنم کے عذاب کو دور رکھئے کیونکہ اس کا عذاب پوری تباہی ہے۔ روح المعانی میں اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ وہ لوگ اس دعا کو نمازوں کے بعد پڑھتے ہیں یا عام اوقات میں پڑھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ یہ دعا خاص اوقات میں بھی کرتے ہیں مگر آپ سے کہتا ہوں کہ آپنے اس دعا کو نہ عام وقت میں کیا ہوگا نہ خاص وقت میں ہی کیا ہوگا بات یہ ہے کہ جسے کسی چیز کی اہمیت ہوتی ہے وہ اس کا اہتمام کرتا ہے۔ وہ حضرات عام اوقات میں یہ دعا اس لئے کیا کرتے ہیں کہ ممکن ہے کسی خاص وقت میں یاد نہ رہے۔ یہ ان کے اہتمام کی دلیل ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بازار سے گذرتے وقت ایک دعا پڑھنے کی تلقین صحابہ کو فرمائی۔ چنانچہ بعض حضرات نے محض اس دعا کے پڑھنے کے لئے بازار جانا شروع کر دیا تاکہ اس کے فیض سے محروم نہ رہیں (ناقل عرض کرتا ہے کہ وہ دعا یہ ہے۔) لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ اب ہمارا یہ حال ہے کہ یا تو کھائیں گے گھی سے یا جائیں گے جی سے۔ یعنی خاص وقت میں کوئی کام نہیں

کر سکتے تو کسی وقت اس کو نہیں کرتے حالانکہ چاہیے یہ کہ اگر رات میں نہیں کر سکتے تو دن ہی میں کرلیں۔ اتنا بھی بہت ہے کیونکہ رات اور دن دونوں خداوند تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے رات کو دن کا اور دن کو رات کا خلیفہ بنایا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝ یعنی وہ ایسا ہے کہ اس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والے بنائے اس شخص کے لئے جو سمجھنا چاہے یا شکر کرنا چاہے۔

اب اللہ تعالیٰ تو یہ فرمارہے ہیں اور ہم اس پر مصر ہیں کہ رات کو اگر ذکر اور تہجد نہ ہوسکے گا تو دن میں بھی کچھ عبادت نہیں کریں گے۔ بھائی جب رات اور دن دونوں خدا کے بنائے ہوئے اوقات ہیں تو ان کی عبادت رات کو کرلو تو قبول دن کو کرلو تو قبول۔ اور یہ عباد الرحمٰن کی یہ دعا جو نقل فرمائی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں تو اس میں ان کی بہت بڑی مدح نکلی کیونکہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ان کا معاملہ مخلوق کے ساتھ بھی درست ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بھی یہ لوگ لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ تو باوجود مخلوق کے ساتھ حسن المعاملہ اور خالق کے ساتھ حسن العبادت ہونے کے یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور اس کی جانب ابتہال کرتے ہیں یعنی اپنے اعمال پر اتکال نہیں کرتے۔ اس سے نکلا کہ بعث اور جزا پر ان کا ایمان تحقیقی اور یقینی ہے اور ان کے اس وصف سے یہ ثابت ہوگیا کہ یہ لوگ آخرت کے اور حساب وکتاب کے بیشک قائل ہیں۔ گویا ان کے متعلق یوں کہا جاسکتا ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِالْبَعْثِ وَالْجَزَاءِ اِیْمَانًا حَقًّا اور بعث وجزا پر جس کا ایمان ہوگا تو وہ اسے یوں ہی تھوڑے ہی رہنے دے گا۔ اس میں ایک حرکت پیدا کردے گا۔

میں کہتا ہوں کہ مومن کی جتنی صفات ہیں ان سب میں ممتاز صفت بعث اور جزا پر اس کا ایمان ہے۔ چونکہ ان عباد الرحمٰن کے اس وصف سے اِس کا پتہ چلتا تھا اس لئے اس دعا کو اللہ تعالیٰ نے مقام مدح میں ذکر فرمایا۔

آگے عباد الرحمٰن کے اور بھی دیگر صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ۝ یُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَیَخْلُدْ فِیْهٖ مُهَانًا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝ یعنی ایک وصف عباد الرحمٰن کا یہ ہے کہ جب وہ خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ تو

فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں بلکہ ان کا مزاج ان دونوں حالتوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

اور ایک وصف ان کا یہ ہے کہ وہ ایسے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کی پرستش نہیں کرتے اور جس شخص کے قتل کرنے کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اس کو قتل نہیں کرتے ہاں مگر حق پر یعنی جب قتل کے وجوب یا اباحت کا کوئی سبب شرعی پایا جائے تو اور بات ہے۔ اور وہ زنا بھی نہیں کرتے اور جو شخص ایسا کام کرے گا تو سزا سے اس کا سابقہ پڑے گا کہ قیامت کے روز اس کا عذاب بڑھتا چلا جاوے گا اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیش ذلیل ہو کر رہے گا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کون سا گناہ سب سے بڑھ کر ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تمہارا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے اور وہی تمہارا خالق ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اس کے بعد پھر کون گناہ بڑا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تمہارا اپنی اولاد کو محض اس اندیشہ سے قتل کر ڈالنا کہ وہ تمہارے ساتھ کھانے میں شریک ہوں گی۔ میں نے کہا پھر کون سا؟ اپنے پڑوسی کے اہل خانہ کے ساتھ زنا کا مرتکب ہونا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس کی تصدیق ہی فرمادی یعنی اسی ترتیب سے ان تینوں معاصی کو ذکر فرمایا ہے۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں آیت میں وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ سے کفار اور مشرکین مراد ہیں، کیونکہ یہاں آگے يُضٰعَفْ، وَيَخْلُدْ اور مُهَانًا فرمایا گیا ہے اور مومن عاصی کے لئے نہ تو تزاید ہوگا اور نہ خلود اور اس کے لئے تجدید ایمان کی بھی ضرورت نہیں صرف توبہ کافی ہے۔ آگے اس حکم سے جو لوگ مستثنیٰ ہیں ان کا بیان فرماتے ہیں کہ (یہ لوگ عذاب دائمی میں مبتلا ہوں گے) مگر جو توبہ کرلے اور ایمان لے آئے اور نیک کام کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے گناہوں کی جگہ نیکیاں عنایت فرمادیں گے اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں رحیم ہیں اور جو شخص توبہ کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف خاص طور سے رجوع کر رہا ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ عباد الرحمٰن کا ایک وصف یہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ لوگ بیہودہ باتوں (جیسے خلاف شرع لہو ولعب) میں شامل نہیں ہوتے اور اگر اتفاقاً بیہودہ مشغلوں کے پاس کو ہو کر گذریں تو سنجیدگی و شرافت کے ساتھ گذر جاتے ہیں یعنی نہ تو ان کی طرف مشغول

ہوتے ہیں اور نہ ان کے آثار اور حالات سے عاصیوں کی تحقیر اور اپنا ترفع ظاہر ہوتا ہے۔ نیز وہ ایسے ہیں کہ جس وقت ان کو اللہ کے احکام کے ذریعہ سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے بلکہ اس کی جانب کان لگاتے ہیں اور عقل اور فہم کے ساتھ قرآن کی جانب متوجہ ہوتے ہیں جس کا ثمرہ زیادت ایمان وعمل بالاحکام ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کے اوامر کا اتباع کرتے ہیں اور اس کے منہیات سے بچتے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ سنی ان سنی کردیں اور اپنے قدیم معصیت پر علیٰ حالہٖ قائم رہیں۔

اس کے بعد عباد الرحمن کی ایک اور دعا کا ذکر فرماتے ہیں کہ وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ۝ یعنی اے پروردگار ہمارے ہم کو ہماری بیبیوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک یعنی چین اور راحت عطا فرما اور ہم کو متقیوں کا افسر بنادے۔ اس سے مراد ان کی یہ نہیں ہوتی کہ وہ دنیا میں امیر وکبیر ہو جائیں یا انھیں کوئی منصب اور عہدہ حاصل ہو جائے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ دیندار ہوں اور ان کو طاعت کی توفیق ہو، چنانچہ صاحب روح المعانی نے یہی تفسیر کی ہے اور اس کی تائید میں عبداللہ ابن عباس، حضرت حسن عکرمہ اور مجاہد سے یہ روایت نقل کی ہے کہ

اَلْمُؤْمِنُ الصَّادِقُ إِذَا رَاٰى أَهْلَهٗ قَدْ شَارَكُوْهُ فِي الطَّاعَةِ قَرَّتْ بِهِمْ عَيْنُهٗ وَسَرَّ قَلْبُهٗ وَتَوَقَّعَ نَفْعَهُمْ لَهٗ فِي الدُّنْيَا حَيًّا وَّمَيِّتًا وَلُحُوْقَهُمْ لَهٗ فِي الْاُخْرٰى۔	مومن صادق جب اپنے اہل وعیال کو دیکھتا ہے کہ وہ سب بھی اس کے ساتھ طاعت ونیک کام میں شریک ہیں تو ان سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں اور اس کا قلب مسرور ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے ایسے اہل وعیال سے دنیا میں زندگی کی حالت میں اور مرنے کے بعد بھی نفع کی توقع ہوتی ہے اور آخرت میں یہ امید ہوتی ہے کہ اسی کے ساتھ وہ بھی لاحق کر دیئے جائیں گے۔
وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قُرَّةُ عَيْنِ الْوَالِدِ بِوَلَدِهٖ اَنْ يَّرَاهُ يَكْتُبُ الْفِقْهَ۔ (روح صفحہ ۴۹ ج ۱۹)	اسی طرح سے عبداللہ ابن عباسؓ سے دوسری روایت میں ہے کہ باپ کی آنکھ کی ٹھنڈک جو اپنی اولاد کی جانب سے اس کو حاصل ہوتی ہے یہ ہے کہ اس کو فقہ یعنی دین کے مسئلے مسائل لکھتا پڑھتا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے یعنی اس کا لڑکا اس کے سامنے عالم دین ہو جائے۔

دیکھا آپ نے اللہ تعالیٰ نے صالحین کی ایک صفت یہ بھی نقل فرمائی ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کے متعلق دعا بھی کرتے ہیں۔ جس طرح کوئی پیر اپنے مریدین کو اچھے حال میں دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح سے باپ بھی جب اپنی اولاد کو صالح اور متقی دیکھتا ہے تو اس کو بھی مسرت ہوتی ہے۔ آپ لوگ اپنی اولاد کی شکایت تو کرتے ہیں لیکن ان کے لئے یہ دعا نہ کرتے ہوں گے اور دعا کرنا تو جب ممکن ہوتا کہ آپ کو دعا یاد بھی ہوتی۔ یہ دعا ہی آپ کو یاد نہ ہوگی۔ پس عباد الرحمٰن کی پہلی دعا سے تو ان کا کامل ہونا معلوم ہوا اور اس دعا سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ مکمل بھی ہوتے ہیں۔ ان آیتوں کے مضامین سنا کر میں آپ کو صالحین کی سیرت بتانا چاہتا ہوں کہ دیکھئے عباد الرحمٰن کو چونکہ حق تعالیٰ کے شان کرم کی کامل معرفت ہوتی ہے اس لئے وہ اپنی حاجات کو اللہ تعالیٰ ہی سے طلب کرتے ہیں۔ آپ ہی کے مجمع میں بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو یہ کہتے ہوں گے کہ ابھی ہم قرآن کی تلاوت کئے چلے آرہے ہیں اور اسی سورت کی آج تلاوت کی ہے۔ مطلب یہ کہ میں جو کچھ سمجھانا چاہتا ہوں اسکو سمجھنا نہیں چاہتے اور قرآن میں جو لکھا ہوا ہے اس پر عمل کرنے کی ہمت نہیں ہے بس اس کے ساتھ رسمی تلاوت کا تعلق رہ گیا ہے چنانچہ جو لوگ ذوق سے نہیں سنتے ان کے سامنے ان مضامین کا بیان کرنا بھی بار ہوتا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے صالحین کا ایک حال یہ نقل فرمایا کہ وہ لوگ جس طرح راتوں کو اپنے رب کے سامنے رکوع اور سجدہ کرنے میں گزارتے ہیں جس کا عمل صالح ہونا ظاہر ہے اسی طرح سے وہ ایک عمل یہ بھی کرتے ہیں کہ زبان سے بھی یہ کہتے ہیں کہ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ اس سے معلوم ہوا کہ صرف زبان سے دعا کرنا بھی ایک مقبول اور پسندیدہ عمل ہے کیونکہ ان کی اس دعا کو مقام مدح میں لایا گیا ہے۔ اسی سے معلوم ہو گیا کہ ان کلمات کو مالک کے یہاں باریابی حاصل ہو گئی ہے اور یہ دعا رحمان کو پسند آگئی ہے کیونکہ ان کے نقل سے مقصود ہی یہ ہے کہ اور دوسرے لوگ بھی اس دعا کو اختیار کریں اور جہنم سے پناہ مانگیں۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقصد کو سمجھا اور اللہ تعالیٰ سے نہایت ہی عاجزی اور تواضع کے ساتھ دعا مانگی۔ ایک دعا میں فرماتے ہیں۔

أَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيْرُ الْمُسْتَغِيْثُ	یا اللہ میں ہی مصیبت زدہ، محتاج، فریادی، پناہ جو،
الْمُسْتَجِيْرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ	ترساں و ہراساں اقرار کرنے والا ماننے والا اپنے گناہ کا

المعترف بذنبی اسئلک مسألۃ المسکین وابتھل الیک ابتھال المذنب الذلیل وادعوک دعاء الخائف الضریر ودعاء من خضعت لک رقبتہ وفاضت لک عبرتہ وذل لک جسمہ ورغم لک انفہ

سوال کرتا ہوں تجھ سے سوال بیکس کا سا، گڑگڑاتا ہوں تیرے سامنے، گڑگڑاتا گنہگار ذلیل کا سا، اور طلب کرتا ہوں تجھ سے طلب کرنا خوف زدہ آفت رسیدہ کا سا، اور طلب کرنا اس شخص کا سا کہ جھکی ہوئی ہو تیرے سامنے گردن اس کی، اور بہہ رہے ہوں آنسو اس کے، اور فروتنی کئے ہوئے ہو وہ تیرے سامنے، اور رگڑتا ہو تیرے سامنے ناک اپنی۔ (مناجات مقبول صفحہ ۴۰)

دیکھا آپ نے عباد الرحمن کی جو ادا اللہ تعالیٰ کو پسند ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس طرح اختیار فرمایا۔ چنانچہ ہر زمانہ میں صالحین کا یہ شعار رہا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کا خوف اپنے دلوں میں پیدا کیا ہے اور اس کی ناراضگی سے اور اس کے عذاب سے اور دوزخ سے برابر پناہ مانگتے رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اس کو بہت ہی یاد دلاتے ہیں اپنی ایک دعا میں فرماتے ہیں کہ اللّٰھم انی اسئلک فکاک رقبتی من النار یا اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے جان بخشی دوزخ سے۔

اب اللہ کے رسول اور خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم تو آخرت کا اس قدر خوف فرمائیں اور جہنم سے اس طرح پناہ مانگیں اور آپ لوگوں کو اس کی ذرا بھی فکر نہ ہو۔ دوزخ کا ذکر خوش ہونے کے لئے نہیں کیا گیا بلکہ ڈرنے اور رونے کے لئے آیا ہے۔ جنت اور دوزخ بڑی چیزیں ہیں شقاوت وسعادت کا مدار ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّۃِ یعنی جو لوگ سعید ہیں وہ جنت میں ہوں گے۔ اسی طرح فرماتے ہیں کہ وَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ یعنی جو لوگ شقی ہیں وہ جہنم میں ہوں گے۔

عباد الرحمن اسی لئے عذاب جہنم سے بچنے کی دعا کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور ناراضی سے پناہ مانگ کر کے اپنے کو بھی اسی صف میں داخل فرمالیا چنانچہ ایک دعا میں ارشاد فرماتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرِضَاکَ مِنْ سَخَطِکَ وَبِمُعَافَاتِکَ مِنْ عُقُوْبَتِکَ یا اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیری رضا کے ساتھ تیری ناخوشی سے اور تیرے عفو کے ساتھ تیری سزا سے۔

سب سے بڑی فکر مومن کو اس دار دنیا میں یہی ہوتی ہے کہ آخرت میں اس کا کیا انجام ہوگا۔ اور اللہ والوں کو حق تعالیٰ کی اس دھمکی نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور لذات دنیا کو ان کے لئے کرکرا کر دیا۔ فرماتے ہیں وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ٥ یعنی عنقریب یہ ظالم لوگ جان لیں گے کہ کس جگہ ان کو لوٹ کر جانا ہے۔ باقی اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ مومن کو جس طرح خدا کا خوف ہوتا ہے اسی طرح سے اس کو اس سے محبت بھی ہوتی ہے اور جس کو خدا سے محبت ہو جاتی ہے اس کو خدا کے نیک بندوں سے بھی محبت ہو جاتی ہے، انھیں کو پسند کرتا ہے۔ حضرت مولاناؒ سے سنا کہ ایک جوان شخص نماز پڑھ رہا تھا۔ شاہ شجاع کرمانی نے اسے دیکھا۔ اس کی نماز پسند آگئی اس لئے کہ خود دیندار تھا۔ سوچا کہ اپنی لڑکی کی شادی اسی سے کروں گا۔ یہ خیال کرکے اس کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ اگر شاہ شجاع کرمانی اپنی لڑکی کا نکاح تمھارے ساتھ کرے تو تم منظور کر وگے۔ اس نے کہا چپ رہئے کیسی بات زبان سے نکال رہے ہیں، مجھے سزا دلوائیے گا کیا؟ کہا میں ہی شاہ شجاع کرمانی ہوں۔ تمھاری نماز مجھے پسند آگئی ہے اس لئے تم مجھے پسند آگئے ہو۔ چاہتا ہوں کہ اپنی لڑکی سے تمھارا عقد کر دوں اور تمھاری یہی نماز اس کا مہر ہو۔

دیکھتے ہیں آپ دینداری ایسی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے ایک بالکل غریب شخص کا نکاح بادشاہ زادی سے ہو رہا ہے اور یہ تو محض اس کا دنیاوی نفع ہے جسے آپ لوگ بھی نفع سمجھتے ہیں باقی آخرت میں اللہ تعالیٰ اپنے صالحین بندوں کو کیا کچھ دیں گے اس کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا اسی لئے جس طرح لوگوں نے جنت کی دعا مانگی ہے اسی طرح یہ بھی دعا کی ہے کہ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ یعنی مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالحین بندوں میں شامل فرما لیجئے۔ پھر جب کوئی اس جماعت ہی میں داخل ہو گیا تو پھر کیا ہے جو کچھ انھیں دنیا اور آخرت میں ملے گا اس کو بھی ملے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صالحین کا ساتھ بھی کچھ کم چیز نہیں ہے۔ یہی مطلب ہے اس شعر کا ؎

أُحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللهَ يَرْزُقُنِي صَلاحاً

یعنی میں صالحین سے محبت کرتا ہوں اور ان میں سے ہوں نہیں، اس امید پر کہ شاید اللہ تعالیٰ صلاح کا کچھ حصہ مجھے بھی عنایت فرما دیں۔ آج اگر آپ اسی ایک بات کو سمجھ لیں تب بھی بہت کچھ پا جائیں۔ یہ کچھ کم چیز نہیں ہے۔ اس کی دعا بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبروں نے کی ہے۔

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ○	اے خالق آسمانوں اور زمین کے آپ میرے کارساز ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی مجھ کو پوری فرمانبرداری کی حالت میں دنیا سے اٹھایئے اور اپنے نیک بندوں میں شامل کر لیجئے۔

(۲) اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں :۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰہُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ ○	اے میرے رب مجھ کو اس پر مداومت دیجئے کہ میں آپ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں اور میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل کر لیجئے۔

(۳) اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قرآن شریف میں نقل کی گئی ہے کہ آپ نے پہلے تو رب العالمین کی صفات شمار فرمائی ہیں کہ :۔

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِ ○ وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ○ وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ ○ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ○ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ○	رب العالمین وہ ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا پھر وہی مجھ کو رہنمائی کرتا ہے اور وہی مجھ کو کھلاتا پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے اور جو مجھ کو موت دے گا اور پھر مجھ کو زندہ کرے گا اور جس سے مجھ کو یہ امید ہے کہ میری غلط کاریوں کو قیامت کے روز معاف کرے گا۔

اس کے بعد دعا فرماتے ہیں کہ رَبِّ ھَبْ لِیْ حُکْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ○ یعنی اے میرے پروردگار مجھ کو حکمت عطا فرما اور مجھ کو نیک لوگوں کے ساتھ شامل فرما۔ دیکھئے یہ سب حضرات معصوم ہیں مگر قیامت سے اتنا ڈر رہے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اگر قیامت کا تھوڑا بھی ڈر قلب میں پیدا ہو جائے تو آدمی جنتی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی ○ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی ○	جس شخص نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو اس کی خواہشات سے روکا تو بلاشبہ اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔

مسلمانوں کے سامنے اس قسم کے مضامین بیان کیجئے۔ باقی آپ یہ چاہیں کہ قرآن شریف کے

ان مضامین سے خود ہی متاثر نہ ہوں اور دوسروں کو آپ متاثر کر دیں تو یہ نہ ہوگا اور میں آپ سے کہتا ہوں کہ مجھے یہی شکایت ہے کہ لوگ پیر کے بدن پر گرنا چاہتے ہیں اور ان سے کچھ سیکھتے نہیں۔ اور سیکھنا بھی چاہتے ہیں تو واعظوں سے حالانکہ یہ عالم لوگ خود محتاج ہیں کہ پہلے کسی صاحب باطن سے سیکھیں اور اپنے قال میں حال پیدا کریں اور آپ لوگ ان سے سیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ کیا سکھائیں گے؟ مجھ سے کیوں نہیں سیکھتے۔ غفلت کا یہ حال ہے کہ دیکھ رہے کہ میں بیمار ہوں مگر ذرا کسی چیز سے عبرت نہیں حاصل کرتے۔ جانتے ہیں کیا بات ہے؟ بات یہ ہے کہ عبرت اور نصیحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ بنایا ہے جو ان سے عبرت نہ حاصل کرے گا وہ کسی چیز سے بھی عبرت نہ حاصل کرے گا۔ بہت دنوں سے یہی سکھلا رہا ہوں کہ کسی کا بدن تبرک نہیں ہے بلکہ عمل تبرک ہے کسی کی ذات پر نہ گرو بلکہ اس کی بات سنو اور اس سے عمل سیکھو۔ لیکن کسے عمل کی فکر ہے۔ عمل کی جگہ انھوں نے جلسہ کو دے دیا ہے۔ سال بھر میں ایک دو دفعہ جلسہ کر لیا بس یہی ان کا عمل ہے۔ میں اس کو عمل نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ آپ کی توجہ اس عمل کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے حُسن عمل قرار دیا ہے اور عباد الرحمٰن کی مدح میں جس کو ذکر فرمایا ہے۔ میری مراد اُس سے ان کی یہی دُعا ہے رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ یہی لوگ اصلی ایمان کے حامل تھے کہ مخلوق اور خالق کے حقوق واجبہ کے ادا کرنے کے باوجود آخرت کے عذاب سے لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ ان کے جسم آپ کے جسم سے زیادہ مضبوط اور ان کے قلوب آپ کے قلب سے زیادہ قوی تھے لیکن آخرت پر ایمان کا یہ حال تھا کہ قیامت کے خوف اور ہول سے ان کا پتہ پانی ہو جاتا تھا اور قلب پگھل جاتا تھا۔

آج عوام سے دین کی اصلی باتیں بیان کی جائیں تو اب بھی ان کو پسینہ آجائے قلوب لرز جائیں اور جسم پر زلزلہ طاری ہو جائے لیکن ہم ان کو اس قسم کی باتیں بتاتے کب ہیں۔ میں صاف کہتا ہوں اس میں قصور آپ کا نہیں ہمارا ہے۔ آپ کو دیکھتا ہوں کہ علماء کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ انھیں بلاتے ہیں۔ ان کی دعوتیں کرتے ہیں۔ خدمت اور خاطر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہوائی جہاز تک کا کرایہ دیتے ہیں۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ کیسے سمجھا جائے کہ آپ کا دین کی طرف رجحان نہیں ہے مگر بات وہی ہے کہ جتنی خدمت ہم آپ سے لیتے ہیں اتنی خدمت آپ کی نہیں کرتے۔ یعنی کام کی باتیں بتا کر نہیں دیتے۔ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ حق تعالیٰ کے ارشاد فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا کے تحت فرماتے ہیں کہ اس آیت میں مومن کے لئے عمل آخرت پر زبردست

تحریض ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے رب سے ملاقات کی خواہش اور امید رکھتا ہو تو چاہئے کہ عمل صالح کرے مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے متمنی ہو تو آؤ اس میدان میں۔ اس لئے کہتا ہوں کہ کامیابی تو کام سے ہوا کرتی ہے اور جو شخص کسل کے ساتھ متصف ہے وہ دونوں جہان میں ناکام رہے گا۔ ہم دنیا کو دیکھتے ہیں کہ لوگ اس کو حاصل کرنے کے لئے کیسی کیسی محنت اور کتنا کتنا کام کرتے ہیں۔ دنیا حاصل کرنے کے لئے کوئی شخص کسل کو ذریعہ نہیں بناتا تو پھر آخرت اور جنت بھی یوں ہی کیسے مل جائے گی اس کے لئے بھی عمل کرنا ہوگا۔ اور یہ کہہ چکا ہوں کہ عمل اسی وقت ہوگا جب قلوب رغبت اور رہبت سے بھر جائیں گے چنانچہ سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ نے بندوں کو یہ عطا فرمائی کہ ان میں انبیاء علیہم السلام کو بھیجا اور ان کے واسطے سے لوگوں کو اعمال کے ثواب و عقاب یعنی جزا اور سزا سے واقف فرما دیا۔ آپ سے اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ عام انسانوں کی طرح عرب کے لوگ پیشاب سے احتیاط نہیں کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر دو قبروں کے پاس سے ہوا۔ آپ وہاں ٹھہر گئے اور جو لوگ ہمراہ تھے ان سے فرمایا کہ ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے اور کسی بڑی بات کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ معمولی معمولی سی چیزیں ہیں جن سے احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے یہ لوگ عذاب دیئے جا رہے ہیں۔ ایک شخص تو ان میں سے چغلی کیا کرتا تھا (یعنی اِن کی بات اُن سے اور اُن کی بات اِن سے لگاتا تھا) اور دوسرا شخص پیشاب سے نہیں بچتا تھا (خواہ پیشاب کر کے استنجا نہیں کرتا تھا یا اپنے جانوروں کے پیشاب کے چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا) اس واقعہ کو آپ نے کچھ اس طرح لوگوں کے سامنے بیان فرمایا اور ایک بدعملی کی سزا ان سے اس طرح بتلائی کہ لوگوں پر اس کا اثر ہوا۔ لوگ ڈر گئے اور پیشاب سے احتیاط کرنے لگے۔

اعمال کے سزا اور جزا پر علماء نے کتابیں لکھی ہیں (چنانچہ حضرت مولانا تھانویؒ کی کتاب جزاء الاعمال اسی موضوع پر لکھی گئی ہے) شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور دوسرے حضرات نے بھی بیان فرمایا ہے اور خوب خوب بیان فرمایا ہے اسی لئے تاکہ لوگوں کو رغبت اور رہبت پیدا ہو آخرت کا خوف اور شوق پیدا ہو۔

اب لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں میں اثر کس طرح پیدا کیا جائے۔ دیکھتے ہوں گے کہ لوگوں کو نفع نہیں ہو رہا ہے یا جیسا نفع کہ بزرگوں سے ہوتا ہے ویسا نہیں ہو رہا ہے اس لئے ہم سے پوچھتے ہیں۔ میں نے شاہ صاحب کی بیان کی ہوئی بات ان کو سنا دی کہ مومن کے قلب میں

رغبت اور رہبت ہوا کرتی ہے۔ رہبت یعنی خوف۔ کس چیز سے؟ نار سے، عذاب سے، اللہ تعالیٰ کی ناراضی سے۔ اور رغبت کس چیز کی؟ اللہ تعالیٰ کے رضا کی، آخرت کے اجر و ثواب کی اور جنت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے اسی کو بیان فرماتے تھے اور ایسا بیان فرماتے تھے کہ صحابہ کی روتے روتے داڑھیاں تر ہو جایا کرتی تھیں اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ واقعی آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ ہی ایسی باتیں بیان فرما سکتے ہیں اور جو آپ بیان فرما رہے ہیں بالکل صحیح اور حق ہے۔ اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ بس آپ ہی بیان فرما رہے ہیں۔ آپ کے بعد ان باتوں کا بیان کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔

میں بھی ان لوگوں سے یہی کہتا ہوں کہ تقریر نہ سکھاؤ۔ تقریر سے کام نہیں چلے گا۔ قلوب میں رغبت اور رہبت پیدا کرو۔ مومن کا ایمان قیامت پر ہے۔ آخرت پر ہے۔ مجال ہے وہاں کی باتیں کرو اور وہ اثر قبول نہ کرے۔ آخرت کی منزل تو سبھی کے سامنے آتی ہے اور قیامت کی پیشی بھی ہونی ضرور ہے۔ ہم کسی اور سے نہیں کہتے۔ اہل ایمان ہمارے مخاطب ہیں۔ پس مومن کی تو خیر اسی میں ہے کہ اس کو سمجھے اور اسی کے مطابق عمل کرے۔ مومن کسی برائی کو جو چھوڑتا ہے تو خدا کے ڈر سے چھوڑتا ہے، قیامت کے ڈر سے چھوڑتا ہے۔ حضرت مولانا تھانویؒ سے کوئی کہتا کہ حضرت فلاں عمل (مثلاً بدنظری وغیرہ) نہیں چھوٹتا تو فرماتے کہ اچھی بات ہے نہیں چھوٹتا تو خدا کے یہاں کی پیشی کے لئے تیار رہو۔ قیامت میں خدا اپنے سامنے کھڑا کر کے پوچھے گا کہ اسے کیوں دیکھا تھا؟ وہاں کیا جواب دو گے؟ بس اسی سے لوگ ڈر جاتے اور اس برائی سے نکل جاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی محبت یہی دونوں چیزیں مومن کا اصل سرمایہ ہیں۔ جس طرح سے لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرے ہیں اسی طرح سے لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے کیسی کیسی محبت کی ہے۔ ان کے واقعات اس پر شاہد ہیں۔ ایک صاحب نے جو ذرا خوش آواز تھے خوش الحانی کے ساتھ یہ شعر پڑھ دیا ۔

میں جو اس پر مرمٹا ناصح تو کیا بیجا کیا　　اک مجھے سودا تھا دنیا بھر تو سودائی نہ تھی

ایک صوفی صاحب نے بھی اس کو سنا سن کر ایسے زور سے چیخ ماری کہ معلوم ہوتا تھا کہ چھت ہی گر جائے گی اور ایک جست لگائی یہ جا وہ جا اپنے حجرہ میں داخل ہو گئے۔ ایسے لوگوں کو فلسفہ والے سودائی کہتے ہیں۔ حالاں کہ اس کا نام محبت ہے۔ یہ سودا اور جنون نہیں ہے۔ بہرحال شعر کا مضمون بہت خوب ہے۔ کوئی عارف اللہ تعالیٰ کی محبت کے بارے میں کہتا ہے کہ میں ہی اس میدان میں اکیلا نہیں ہوں بلکہ تمام انبیاء اور اولیاء اس میدان کے شہسوار گزرے ہیں۔

سب ہی اللہ تعالیٰ کے محب ہوئے ہیں تو اگر اس نے اللہ تعالیٰ سے محبت کی تو اس میں برائی کیا ہوئی۔ مانا کہ مجھے سودا ہے لیکن یہ سب انبیا اور اولیا جو گزرے ہیں تو کیا معاذ اللہ ان سب کو بھی سودائی کہا جائے گا؟ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کا عشق اور ان کی محبت انسان پر حق اور لازم ہے۔ اب کوئی اس حق کو نہ ادا کرے تو یہ اس کی کوتاہی ہے۔ مگر آپ سے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا عشق اور اس کی محبت تو جلدی سمجھ میں نہیں آئے گی لیکن جنت و دوزخ کا ذکر اور آخرت کی نعمتیں چوں کہ ظاہری چیزیں ہیں اس لئے وہ اچھی طرح سے سمجھ میں آسکتی ہیں۔ ان کا ذکر بھی قرآن شریف میں کم نہیں آیا ہے۔ پس جب تک لوگوں کے دلوں میں یہ شوق اور خوف پیدا نہ ہوگا قلوب آسانی کے ساتھ شریعت کی قید کو پسند نہیں کریں گے۔ ہاں جب قلوب اس سے بھر جائیں گے تو پھر یہ بھی ہے کہ سب سے زیادہ سہولت مسلمان کو شریعت کی قید اور تقویٰ کی زندگی ہی میں معلوم ہوگی اور اس کے خلاف سے نفرت اور وحشت ہوگی۔ اس لئے کہ مومن کو جب جنت کا شوق ہو جاتا ہے تو پھر اس کے آگے دنیا کی کوئی نعمت نعمت اور کوئی راحت راحت نہیں معلوم ہوتی۔ اسی طرح سے جب وہاں کی تکالیف اور عذاب کا نقشہ سامنے ہوتا ہے تو پھر یہاں کی کوئی تکلیف تکلیف نہیں رہ جاتی اور تقویٰ میں یہی کرنا پڑتا ہے کہ خواہشات کو مٹانا پڑتا ہے اور کچھ ناگواریوں کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔

حاصل یہ کہ ترغیب اور ترہیب یہی دو بازو ہیں جن سے مومن اڑتا ہے اسی لئے علماء نے ہر زمانہ میں امت کو ان کی جانب متوجہ فرمایا ہے۔ چنانچہ روح المعانی میں ہے کہ آیت یَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ○ (اے ایمان والو سود کو دوگنا اور چند گنا کر کے مت کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے) کے متعلق امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ یہ تمام قرآن میں سے اخوف آیت ہے (یعنی سب سے زیادہ ڈرانے والی) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں مومنین کو بصورت عدم امتثالِ حکم اس آگ کی دھمکی دی ہے جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ پس کس قدر ڈرنے کا مقام ہے کہ جو شے کفار کے لئے آلۂ تعذیب بنتی اس سے اس مومن کو عذاب دیا جائے۔ اسی لئے اس کو اخوف آیت فرمایا ہے۔

اسی طرح سے علماء یہ بھی فرماتے ہیں کہ آیت قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ○ یہ ارجیٰ آیت ہے کیونکہ اس میں

اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو اپنی رحمت سے نا امید ہونے کو منع فرمارہے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ مغفرت کی امید رکھنے کا حکم فرمارہے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس میں گنہ گاروں کے لئے کس قدر تسلی ہے۔ اس اعتبار سے اس کے ارجیٰ آیت ہونے میں کیا کلام ہے۔ اس آیت کا شان نزول یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ صحابہ نے ایک مرتبہ یہ خیال کیا کہ ہم لوگ ایسا ایسا گناہ کر چکے ہیں کہ اب اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کیا مفید ہوسکتی ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سے نا امید ہونا حرام ہے اَنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ یعنی اللہ کی رحمت سے کافر ہی نا امید ہوتا ہے۔ اب اگر یہ نا امیدی اعتقاد کے درجہ میں ہے تب تو کفر ہے جس طرح کہ کافر کو ہوتی ہے اور اگر عمل میں اور حال میں ہے مگر اعتقاد میں نہیں ہے تو یہ فسق ہے۔ غرض علماء نے سب سے زیادہ امید والی آیت اسی کو فرمایا ہے لیکن مکتوبات معصومیہ میں محمد باقرؒ کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ

> اے اہل عراق تم یہ کہتے ہو کہ قرآن مجید میں سب سے زیادہ امید والی آیت لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ہے مگر ہم اہل بیت اس کے قائل ہیں کہ آیت وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى سب سے ارجیٰ آیت ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک راضی ہی نہ ہوں گے جب تک کہ آپ کا ایک ایک امتی دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل نہ کر دیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں کہ تطبیق اس طرح ہوسکتی ہے کہ

> عام مخلوق کے اعتبار سے تو ارجیٰ آیت لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ہو اور امت محمدیہ کے اعتبار سے وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ہو۔ (ان دونوں میں کیا منافات ہے)

لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک اور آیت بھی جس کو اگر ارجیٰ آیت کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اور وہ آیت یہ ہے وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ اور یہ اس لئے کہ اس سے پہلی آیت وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ہے۔ جنت کی ترغیب دی ہے اور یہ فرمایا ہے

کہ دوڑو اور سبقت کرو اس مغفرت کی طرف جو تمھارے پروردگار کی طرف سے ہے اور اس کی جنت کی طرف (بھی سبقت کرو) جس کی وسعت ایسی ہے جیسے سب آسمان و زمین۔ وہ تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے اس کے بعد متقیوں کے بعض اوصاف بیان فرماتے ہیں کہ وہ ڈرنے والے کون لوگ ہیں اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ o یعنی جو کہ خرچ کرتے ہیں فراغت میں اور تنگی میں اور غصہ کے ضبط کرنے والے ہیں۔ اس کے بعد وہی آیت ہے جس کے متعلق کہنا چاہتا ہوں کہ ارجیٰ آیت ہے یعنی وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَھُمْ الآیۃ یعنی صالحین اور متقین کی جزا یعنی جنت کے مستحق وہ لوگ بھی ہیں جو ایسے ہیں کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس میں زیادتی ہو یا اپنی ذات پر نقصان اٹھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیتے ہیں پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہو اور وہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے۔ آگے فرماتے ہیں اُولٰئِکَ جَزَاؤُھُمْ مَغْفِرَۃٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِیْنَ o ان لوگوں کی جزا بخشش ہے۔ ان کے رب کی طرف سے اور ایسے باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ اچھا حق الخدمت ہے ان کام کرنے والوں کا۔

سبحان اللہ کیا رحمت ہے کہ صالحین اور متقین کو جو انعام عطا ہوا مذنبین کو بھی اس سے محروم نہیں کیا گیا بشرطیکہ وہ توبہ کر لیں اور اسی لئے تاکہ اس کے بعد کوئی کسی مذنب کو حقیر نہ جانے اس میں کس قدر تسلی ہے گنہگار کے لئے۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ یہ بھی ارجیٰ آیت ہے۔

نیز اس سے پہلی والی آیت کو امام اعظمؒ نے اخوف آیت فرمایا تھا اور وہاں اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ فرمایا گیا تھا یہاں اس کے بالمقابل اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ o فرمایا گیا ہے اور اس کو اخوف آیت کا قرین بنا کر ذکر فرمایا ہے یہ بھی قرینہ بن سکتا ہے کہ یہ ارجیٰ آیت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت یونہی جاری ہے کہ وہ رہبت اور رغبت (یعنی ترغیب و ترہیب) کا ذکر توام فرماتے ہیں نیز اس کے ارجیٰ آیت ہونے پر یہ روایت بھی دلیل بن سکتی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابلیس نے اپنے لشکر کو بلایا اور ان کے سامنے اپنے سر پر مٹی اڑانے لگا اور ویل و ثبور پکارنے لگا۔ اس کے چیلوں نے کہا کہ اے ہمارے سید یہ آپ کا کیا حال ہے؟ کہا کتاب اللہ میں ایک ایسی آیت نازل ہو گئی ہے کہ اب اس کے بعد بنی آدم کو کوئی گناہ مضر ہی نہ ہوگا۔ ان لوگوں نے پوچھا کہ وہ کیا آیت ہے تو

اس نے یہی آیت سنائی۔ انھوں نے کہا کہ حضور پریشان نہ ہوں ہم ان لوگوں کے لئے خواہشات کا ایسا دروازہ کھولیں گے کہ سب اسی میں پھنس کر رہ جائیں گے اور کسی کو توبہ کی توفیق ہی نہ ہوگی۔ یہ سن کر ابلیس خوش ہوگیا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ابلیس پر سب سے زیادہ یہی آیت شاق گزری۔ اس سے مستنبط کر کے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ارجیٰ آیت ہے اس لئے کہ اس میں رحمت اور مغفرت کا بیان ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک دعا میں ارشاد فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ مَغْفِرَتُكَ اَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِیْ وَرَحْمَتُكَ اَرْجٰی عِنْدِیْ مِنْ عَمَلِیْ یعنی اے اللہ تیری مغفرت میرے گناہوں سے زیادہ وسیع ہے اور تیری رحمت میرے نزدیک میرے عمل سے زیادہ امید والی ہے۔ بڑی عمدہ حدیث ہے سبحان اللہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اسی آیت کی تفسیر ہے جس کو علماء نے ارجیٰ آیت کہا ہے۔ اب جو آیت اور روایت اپنے نفع اور مطلب کی ہے اس کو تو یاد کرو۔ اللہ والوں نے اللہ تعالیٰ کے اسی ارشاد کے حوالے سے دعائیں مانگی ہیں۔ حضرت عطارؒ فرماتے ہیں ؎

بادشاہا جرم ما را در گزار		ماگنہگاریم و تو آمرزگار
تو نکوکاری و ما بد کردہ ایم		جرم بے اندازہ بے حد کردہ ایم
سالہا در بند عصیاں گشتہ ایم		آخر از کردہ پشیماں گشتہ ایم
دائما در فسق و عصیاں ماندہ ایم		ہم قرینِ نفس و شیطاں ماندہ ایم
روز و شب اندر معاصی بودہ ایم		غافل از امر و نواہی بودہ ایم
بے گنہ نہ گذشت بر من ساعتے		با حضور دل نہ کردم طاعتے
بر در آمد بندۂ بگریختہ		آبروئے خود ز عصیاں ریختہ

اور اس کے بعد فرماتے ہیں کہ (اور مجھے آپ کو یہی سنانا تھا) ؎

مغفرت دارم امید از لطف تو		زانکہ خود فرمودۂ لاتقنطوا
بحر الطاف تو بے پایاں بود		ناامید از رحمتت شیطاں بود
نفس و شیطاں زد کریما راہ من		رحمتت باشد شفاعت خواہ من
چشم دارم کز گنہ پاکم کنی		پیش ازاں کاندر لحد خاکم کنی

اندر آں دم کز بدن جانم بری
از جہاں با نور ایمانم بری

سبحان اللہ کیا عمدہ مناجات ہے۔ مجھے یہاں اسی کو بیان کرنا تھا کہ دیکھئے یہ بزرگ فرما رہے

ہیں کہ آپ سے مغفرت کی اس لئے امید رکھتا ہوں کہ خود آپ ہی نے فرمایا ہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

رحمت کے بارے میں آتا ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شفیع المذنبین ہیں یعنی قیامت میں سفارش فرمائیں گے اور اعمال صالح شفیع ہوں گے۔ قرآن شفاعت کرے گا، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی شفیع ہوگی۔ کتنے لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی سے بخشیں جائیں گے۔ اب یہی مضمون اثر کے لئے کچھ کم ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو اپنا بندہ فرمارہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے جبار و قہار ہونے کی تو معرفت حاصل کروگے اور ان کے غفور رحیم ہونے کی معرفت کیا قیامت میں جاکر حاصل کروگے؟

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرماکر ان بندوں کے قلوب پر مرہم رکھ دیا جن پر خوف غالب تھا ورنہ تو بہت سے اللہ کے بندے اس دنیا میں خدا کے خوف ہی سے مرجاتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے صالحین بندوں کی ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ یعنی وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں اسی لئے اللہ والوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ ابتداءً تو ان میں خشیت کا غلبہ ہوتا ہے لیکن آخر وقت میں رجاء کو اپنے اوپر غالب کرلیتے ہیں اور یہ اچھا حال ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ كَرِيْمٌ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا اے اللہ آپ معاف فرمانے والے ہیں کریم ہیں، معافی کو پسند فرماتے ہیں (چنانچہ آپ نے صالحین کی مدح فرماتے ہوئے ان کا ایک وصف یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ وہ لوگوں سے درگزر کرتے ہیں) لہٰذا میرے گناہ بھی معاف فرمادیجئے کیوں کہ جب بندوں کے لئے آپ نے اس صفت کو پسند فرمایا ہے تو خود اپنے لئے بھی اس کو ضرور ہی پسند فرمائیں گے۔ چنانچہ سب سے زیادہ اُس عالم میں ظہور عفو و رحمت کا ہی ہوگا اور یہ میں کہہ چکا ہوں کہ اِس عالم کا قیام بھی رحمت ہی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہی رحم کا یہ ادنیٰ اثر ہے کہ ماں اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے۔

روایت میں ہے کہ کسی نبی نے اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کے ہلاک کرنے کا سوال کیا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا جاؤ مٹی کے برتن بناؤ انھوں نے بنائے حکم ہوا انھیں توڑ دو۔ انھوں نے توڑ دیا۔ پوچھا کہ اس سے کچھ تمہارا دل دکھا؟ عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا بس اسی طرح سے جس مخلوق کو میں نے بنایا ہے اس کو ہلاک کرنا ہم کو بھی ناگوار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کی اس صفت کے واسطے سے دعا فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں ۔

اَللّٰھُمَّ فَارِجَ الْھَمِّ کَاشِفَ الْغَمِّ مُجِیْبَ دَعْوَةِ الْمُضْطَرِّیْنَ الرَّحْمٰنَ الدُّنْیَا رَحِیْمَھَا اَنْتَ تَرْحَمُنِیْ فَارْحَمْنِیْ بِرَحْمَةٍ تُغْنِیْنِیْ بِھَا عَنْ رَحْمَةِ مَنْ سِوَاکَ	اے اللہ دور کرنے والے فکر کے زائل کرنے والے غم کے قبول کرنے والے بے قراروں کی دعا کے رحمٰن دنیا کے اور رحیم اس کے تو ہی رحم کرے گا مجھ پر تو کر دے میرے اوپر ایسی رحمت کہ بے پرواہ کر دے اس کی وجہ سے اوروں کی رحمت سے۔

غرض دنیا کا تو سارا کاروبار ہی رزق وعافیت سب اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم سے متعلق ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک دعا میں فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِکَ وَتَحَوُّلِ عَافِیَتِکَ یعنی اے اللہ میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں آپ کی نعمت کے زوال سے اور آپ کی عافیت کے بدل جانے سے۔ نیز فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ تَمَامَ الْعَافِیَةِ وَاَسْئَلُکَ دَوَامَ الْعَافِیَةِ۔ دیکھئے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عافیت ودوام عافیت کا سوال فرماتے ہیں۔ اسی طرح سے آپ سے دارین کی عافیت کا طلب کرنا بھی ثابت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عافیت اصل ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور طلب کرنے ہی سے ملا کرتی ہے ورنہ تو ہمارا تو شاید ہی کوئی عمل ظلم سے خالی ہوتا ہو جس کے متعلق یہ بیان فرمایا ہے کہ وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِظُلْمِھِمْ مَّا تَرَکَ عَلَیْھَا مِنْ دَابَّةٍ وَّلٰکِنْ یُّؤَخِّرُھُمْ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نہایت ہی مہربان اور بڑے رحم والے ہیں کہ لوگوں سے ان کے معاصی کی وجہ سے مواخذہ نہیں فرماتے ہیں ورنہ تو روئے زمین پر انسان تو انسان حیوانات کا بھی خاتمہ ہو جائے۔ ایک صاحب کہتے تھے کہ دیکھو تو اللہ تعالیٰ کو دنیا میں لوگ کیسی کیسی خطائیں کرتے ہیں۔ کوئی شرک کر رہا ہے کوئی بے ادبی وگستاخی کر رہا ہے لیکن ان کا کرم تو دیکھو کوئی مواخذہ نہیں فرما رہے ہیں۔ یہ ان کی انتہائی رحمت وشفقت ہے کہ انسان کفر بھی کر رہا ہے اور وہ اس کو روزی دے رہے ہیں۔ انھوں نے اس بات کو کچھ ایسے عنوان سے بیان کیا کہ مجھے بہت ہی اچھا معلوم ہوا چنانچہ میں نے اس کو یاد ہی کر لیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دنیا میں ظہور ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے قلوب میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور ان کی محبت کو بھر دیا تھا جس کی وجہ سے ان حضرات کو اللہ تعالیٰ کے ان صفات کا برابر استحضار رہتا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی ہیں اپنے لڑکے کو یہ وصیت فرماتے

ہیں کہ صاحبزادے

جب میری موت ہوجائے تو میرے غسل کا منتظم کسی سمجھ دار واقف کار کو بنانا اور خزانۂ شاہی کھول کر اس میں سے وہ رومال نکال لینا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کپڑا اور کچھ موئے مبارک اور چند ٹکڑے ناخن مبارک کے بندھے ہوئے رکھے ہیں ان ٹکڑوں کو میری ناک منھ اور آنکھوں میں رکھ دینا اور اس کپڑے کو کفن کے اندر میرے جسم سے ملاکر رکھ دینا اور جب میرا جنازہ قبرستان لے جاکر دفن کر دینا تو پھر معاویہ کو ارحم الراحمین کے سپرد کر دینا۔

دیکھتے ہیں آپ اصحابہ کا استحضارِ آخرت اور یہ کہ ان حضرات کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیسی رجا تھی۔ ہم نے تو کسی کو سنا نہیں کہ اس طرح سے وصیت کی ہو۔ ان حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی تھی اس لئے ان کے قلوب رغبت اور رہبت (یعنی ایمان کامل) سے لبریز تھے اور جب کوئی شخص اپنے آپ کو اس طرح سے ارحم الراحمین کے سپرد کردے گا اور انھیں کے رحم وکرم پر اپنا معاملہ چھوڑ دے گا تو اس کے ساتھ رحم وکرم ہی کا معاملہ کیا جائے گا۔ یہ حضرات اس طرح سے آخرت کی مہم سر کرلیتے تھے۔ غرض معلوم ہوا کہ دین و دنیا کی ساری حوائج جس سے پوری ہوتی ہیں وہ حق تعالیٰ کی صفت رحمت ہی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک دعا میں ارشاد فرماتے ہیں

يَا صَرِيْخَ الْمُسْتَصْرِخِيْنَ وَمُنْتَهَى الْعَائِذِيْنَ وَالْمُفَرِّجَ عَنِ الْمَكْرُوْبِيْنَ وَالْمُرَوِّحَ عَنِ الْمَغْمُوْمِيْنَ وَمُجِيْبَ دُعَاءِ الْمُضْطَرِّيْنَ وَيَا كَاشِفَ الْكُرُوْبِ يَا اِلٰهَ الْعَالَمِيْنَ وَيَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ مَنْزُوْلٌ بِكَ كُلُّ حَاجَةٍ۔

اے دادرس فریادیوں کے اور اے منتہیٰ پناہ مانگنے والوں کے اور کشائش دینے والے بےچینیوں کے اور راحت دینے والے غمزدوں کے اور قبول کرنے والے بیقراروں کی دعا کے اور کشائش دینے والے صاحب کرب کے۔ اے الٰہ العالمین اور اے ارحم الراحمین تیرے ہی سامنے پیش کی جاتی ہے سب حاجت۔

اسی طرح سے اللہ والوں نے اس دنیا میں رہ کر اللہ تعالیٰ کا خوف بھی کیا ہے۔ دوزخ کا خوف کیا ہے۔ عذاب کا خوف کیا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا تھانویؒ نماز پڑھ کر مسجد سے باہر تشریف لا... ابھی کچھ لوگ نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ اندر سے بڑی زور سے ایک صاحب کے

رونے کی آواز آئی کچھ ایسے دل سے روئے کہ حضرتؒ پر اثر پڑگیا۔ فرمایا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا حضرت شاہ صاحب ہیں۔ فرمایا کہ ان کو یہاں بلا لیجئے۔ جب وہ آئے تو حضرت نے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے؟ شاہ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اس وقت مجھے اپنے گناہ یاد آگئے تھے۔ حضرت نے ان سے کچھ نہ فرمایا اور ایک کٹورہ میں پانی منگوا کر اس پر دم کر دیا اور فرمایا کہ لیجئے اسے پی لیجئے۔ چنانچہ پانی کے پیتے ہی قلب کی گرمی دور ہوگئی اور سکون ہوگیا۔

آپ سے کہتا ہوں کہ اسی دنیا میں جس میں آپ رہتے ہیں اللہ کے ایسے ایسے بندے بھی رہتے ہیں۔ کیا دین صرف ظاہری چیزوں ہی کا نام ہے؟ دل میں کسی نے کچھ پیدا نہیں کیا ہے؟ حضرات صحابہ کا تو ایسا دین نہیں تھا۔ اب لوگ صرف ظاہری دین پر اتر آئے ہیں اور میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ صرف ظاہر پر اکتفا مت کیجئے۔ باطن کی جانب توجہ کیجئے۔ قلب میں جنت اور آخرت کو بسائیے اور اس میں قدم آگے بڑھائیے۔ صرف زبان سے کچھ کہہ لینے اور کان سے سن لینے پر قناعت مت کیجئے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ؎

کار کن کار بگذر از گفتار　　کاندریں راہ کار باید کار

اور فرمایا ہے کہ ؎

کامیابی تو کام سے ہوگی　　نہ کہ حسن کلام سے ہوگی
فکر اور اہتمام سے ہوگی　　ذکر کے التزام سے ہوگی

آدمی جب کام کرے گا تو اسی سے آہستہ آہستہ قلب میں کیفیت بھی پیدا ہو جائے گی کیونکہ جب کسی کام کو پابندی سے کیا جائے گا تو دل بھی کبھی نہ کبھی رجوع ہو جائے گا۔ بس جب دل رجوع ہوگیا سب کام آسان ہو جائے گا۔ اور میں آپ کے لئے آسانی کا طریقہ بتلاتا ہوں اور وہ طریقہ یہ ہے کہ جو چیز مطلوب ہو اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے اور ان سے اس کا سوال کیا جائے۔ مولانا رومؒ نے مثنوی میں ایک جوان صالح کی دعا نقل کی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یوں دُعا کرتا تھا ؎

روزیے خواہم بہ ناگہ بے تعب　　کہ ندارم من ز کوشش جز طلب
کاہلم چوں آفریدی اے ملی　　روزیم دہ ہم ز راہِ کاہلی

یعنی یہ کہتا تھا کہ اے اللہ میں تجھ سے ایسی روزی طلب کرتا ہوں جو اچانک اور بلا تعب کے مجھ کو مل جائے اس لئے کہ میرے پاس سوائے تجھ سے طلب کرنے کے اور کوئی کوشش اور ذریعہ

نہیں ہے۔ اے اللہ جب تو نے مجھے کاہل پیدا کیا ہے تو پھر اے غنی تو مجھے روزی بھی کاہلی ہی کے راستہ سے عطا فرما۔

دیکھ رہے ہیں آپ جس سے محنت نہیں پڑتی وہ اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کیا کرے اور یہاں یوں کہے کہ ؎

بنتے خواہم بہ ناگہ بے تعب کہ نہ دارم من زکوشش جز طلب

یعنی وہ زبان ہی سے کہے کہ یا اللہ مجھ سے کوئی عمل وغیرہ تو ہوتا نہیں لہٰذا میں تجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں اور جنت کا تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ چنانچہ مثنوی میں ہے کہ وہ جوان اسی طرح سے برابر دعا کرتا رہا کہ اچانک ایک دن اس کے گھر میں ایک گائے گھس آئی۔ اس نے سمجھا کہ میری دعا قبول ہوئی اور گھر بیٹھے مجھے روزی ملی۔ یہ خیال کر کے اس نے اسے ذبح کیا اور اس کو استعمال کر ڈالا۔ ایک شخص مدعی کھڑا ہو گیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ تھا ان کے پاس مقدمہ پہنچا۔ جوان کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا اس لئے قریب تھا کہ فیصلہ اس کے خلاف کر دیا جائے کہ اتنے میں وہ جوان بڑے زور سے رو دیا ایسا کہ اس کے رونے کا اثر حضرت داؤد علیہ السلام کے قلب پر پڑا اور انھوں نے سمجھا کہ یہ رونا جھوٹے شخص کا رونا نہیں ہے۔ اس لئے فرمایا کہ بھائی اس مقدمہ کا فیصلہ آج نہیں کل کروں گا اور شب میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ وجداناً تو جوان حق پر معلوم ہوتا ہے مگر اس کے پاس شرعی ثبوت نہیں ہے اس میں کیا راز ہے۔ حقیقت حال کیا ہے سمجھا دیجئے۔ وحی آئی کہ ہاں یہی بات ہے اس گائے کا مالک، در اصل یہی جوان ہے کیوں کہ مدعی اس کے باپ کا غلام تھا جس نے ایک سفر میں فلاں جگہ اس کے باپ کو قتل کر کے اس کی لاش کو فلاں درخت کی جڑ میں دفن کر دیا ہے اور اس کے سب مال و جائداد کا مالک بن بیٹھا ہے۔ اس وقت یہ جوان چھوٹا بچہ تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اس لئے وہ گائے بھی اس کی ہے اور یہ مدعی بھی اسی کا غلام ہے۔ اس وحی کے بعد داؤد علیہ السلام نے اگلے روز یہی فیصلہ سنا دیا۔ لوگوں نے اس پر چہ میگوئیاں کیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے سب کو ہمراہ لے جا کر اس مقتول کی لاش برآمد کی جس کی وجہ سے سب کو اطمینان ہوا اور جوان اپنی دعا کی برکت سے مالدار ہو گیا پس ہو سکتا ہے کہ آپ بھی اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا زبان ہی سے مانگتے رہیں اور پھر ہوتے ہوتے صدق و خلوص بھی پیدا ہو جائے لیکن آپ کا حال یہ ہے کہ آخرت اور دوزخ کو ایسا بھولے ہوئے ہیں کہ ایک دفعہ بھی زبان سے جہنم سے پناہ نہ مانگی ہوگی۔ بس جنت و دوزخ کا نام کسی سے سن لیا ہے اسلئے

اس کے قائل ہیں۔ دل سے اس کی تصدیق کیجئے اور اگر جنت و دوزخ کے مناسب عمل کرنے کی ابھی ہمت نہیں ہے تو پہلے آسان طریقہ ہی استعمال کیجئے اور وہ زبان سے جنت کا طلب کرنا اور دوزخ سے پناہ مانگنا ہے۔ مشقت کا کام پہلے نہیں بتایا جائے گا بلکہ آہستہ آہستہ ہی لے چلا جائے گا۔ پس رات کو اٹھ کر تہجد پڑھنے کو اول ہی دن نہیں کہیں گے۔ بلکہ تدریجی طریقہ سے اس پر لائیں گے لہذا پہلے زبان ہی سے جنت کو یاد کیجئے اور آپ جب اس کو یاد کیجئے گا تو وہ بھی آپ کو یاد کرے گی۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عمارؓ کو (اور بھی چند صحابہ کا نام آیا ہے کہ ان کو) جنت یاد کرتی ہے۔ سبحان اللہ معلوم نہیں ان حضرات نے کس دل سے جنت کو یاد کیا تھا کہ خود جنت ہی ان کی مشتاق ہوگئی۔

اسی طرح سے دوزخ سے پناہ مانگئے۔ مانگتے مانگتے ایسا ہو جائے گا کہ خود دوزخ بھی آپ سے پناہ مانگے گی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مومن پل صراط پر سے گزرے گا تو دوزخ اس سے کہے گی کہ اے مومن تو جلدی سے گزر جا کیونکہ تیرا نور میرے نار کو بجھائے دیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کیا ہے یعنی جوارح سے جو اعمال آپ نے کیے وہ تو کئے ہی ہیں ان کے علاوہ زبان سے بھی جنت کا سوال کیا ہے اور یہ سوال تمام ہی انبیاء کی سنت رہی ہے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی ہے وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ۝ یعنی اے رب مجھے جنت نعیم کا وارث بنا دیجئے۔ یہی چیز آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں کیونکہ آپ کے نزدیک جنت طلب کرنے کا مفہوم یہ ہوگا کہ رات رات بھر نوافل پڑھی جائیں اور ہزاروں ہزار تسبیح کا ذکر کیا جائے تو ان کے نافع ہونے کا انکار نہیں ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جس طرح سے جنت کے حصول کا یہ طریقہ ہے اسی طرح سے اس کا ایک سہل طریقہ اور آسان عمل اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا بھی ہے یعنی جنت کا سوال کرے اور دوزخ سے بچنے کی درخواست کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے عباد الرحمٰن کے اوصاف میں اسے بھی شمار فرمایا ہے کہ وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ پھر یہی زبانی دعا اور سوال آگے چل کر کم اور کیف کے اعتبار سے ترقی کر جائے گا یعنی ایک سے دو اور دو سے چار بار سوال کرنے کی توفیق ہو جائے گی اور پھر زبان سے تجاوز ہو کر دل سے اس سوال کا داعیہ ابھرے گا یہاں تک کہ جنت اور آخرت کی فکر آپ پر مسلط ہو جائے گی جو جنت میں داخل کرا کے رہے گی لیکن اس کے لئے پہلے یہ ضروری ہے کہ آدمی خود جنت اور دوزخ کی دل سے تصدیق کرے۔ اللہ تعالیٰ نے

قرآن شریف میں مومن کی ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ مصدق آخرت ہوتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ۝ آخرت کی اگر تصدیق ہی نہ ہوگی تو ایمان ہی صحیح نہ ہوگا اور مومن ہونے کے بعد پھر متقی اور صالح ہونے کے لیئے ان سب اوصاف کے ساتھ اتصاف ضروری ہے جنھیں عباد الرحمٰن کی تعریف میں بیان فرمایا گیا ہے چنانچہ جس قدر مفصل بیان عباد الرحمٰن کا اور ان کی صفات کا تفصیلی ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے یکجا اور کہیں نہیں ہے اور جیسا کہ میں نے شروع میں بھی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قدر تفصیل سے اس کو اس لئے بیان کیا ہے کہ کفار اللہ تعالیٰ کی اس صفت ہی کا انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وما الرحمٰن یعنی رحمٰن کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیتے ہوئے پہلے تو اپنی عظمت وجلال کا ذکر فرمایا ہے چنانچہ فرمایا ہے کہ:

تَبَارَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَاءِ بُرُوْجاً وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرَاجاً وَّقَمَراً مُّنِیْراً ۝ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْراً ۝

بہت عالیشان ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک نورانی چاند بنایا اور وہ ایسا ہے جس نے رات و دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنایا اس شخص کے لیئے جو سمجھنا چاہے یا شکر کرنا چاہے۔

مقصد اس سے یہ ہے کہ تم اگر رحمٰن کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہو تو کیا تمھارے اس انکار کرنے سے اس کی عظمت اور قدرت میں کمی آجائے گی؟ پھر اس کے بعد عباد الرحمٰن اور ان کی صفات کو بیان فرمایا ہے مطلب یہ کہ تم اگر گستاخ اور نالائق ہو تو سن لو کہ سب لوگ تمھاری طرح نہیں ہیں بلکہ بہت سے اللہ کے نیک بندے اور عباد الرحمٰن ایسے ہیں جن کی یہ صفات ہیں ان مخلصین کو عباد الرحمٰن فرمایا اسی سے کفار کا خوب رد ہوگیا سبحان اللہ کیا عمدہ عنوان اختیار فرمایا ہے۔ انکی صفات شمار فرمانے کے بعد آخر میں ان کے اجر اور انعام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَیُلَقَّوْنَ فِیْهَا تَحِیَّةً وَّسَلٰماً ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرّاً وَّمُقَاماً ۝ (سورۂ فرقان)

ایسے لوگوں کو بہشت میں رہنے کو بالاخانے ملیں گے بوجہ انکے دین اور طاعت پر ثابت قدم رہنے کے اور ان کو اس بہشت میں فرشتوں کی جانب سے بقا کی دعا اور سلام ملے گا اور اس بہشت میں وہ لوگ ہمیشہ رہیں گے کیا اچھا وہ ٹھکانہ ہے اور کیا ہی خوب مقام ہے۔

سبحان اللہ جس مقام کو اللہ تعالیٰ اچھا فرمائیں اسکی خوبی اور عمدگی کا کیا کہنا۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ اِلَیْهَا مِنْ قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ حَالِ اَهْلِ النَّارِ وَمِنَ النَّارِ وَمَا قَرَّبَ اِلَیْهَا اِنْتَهٰی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر اور احسان ہے کہ ایک زمانہ سے جس چیز کی تمنا قلب میں موجزن تھی اور عرصہ دراز سے جس کا اشتیاق ناظرین کو محوِ انتظار بنائے ہوئے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے بالآخر اس کو پورا فرما دیا ـــــــ یعنی "تالیفات مصلح الامۃ حصہ اول" طبع ہو کر منصۂ شہود پر آ گئی۔ جو کہ انشاء اللہ تعالیٰ اپنے مطالعہ کرنے والوں کے لئے اصلاح نفس کے باب میں اکسیر اور سالکین کے لئے طریقِ راہ مولیٰ میں ایک بہترین رہبر اور رفیق ثابت ہوگی۔ یہ حصہ تو آپ کے سامنے ہی ہے۔

اب اس کے بعد حصہ دوم میں انشاء اللہ تعالیٰ حضرت اقدسؒ کی حسب ذیل چودہ کتابیں ہوں گی جس کے کل صفحات ۳۸۴ ہوں گے۔

مفتاح الرحمۃ[1]۔ راہِ صفا[2]۔ خوفِ آخرت[3]۔ ایقاظ الافکار[4]۔ اعترافِ الذنوب[5]۔ الاصول النادرۃ[6]۔ ایجادات کی حقیقت[7]۔ حج ربّ البیت[8]۔ مضمونِ طہارت[9]۔ اخوت[10]۔ تعلیم و تربیت اولاد[11]۔ سعادتِ حقیقیہ[12]۔ اتباعِ سنت[13]۔ جنت[14]

اور حصہ سوم میں اللہ تعالیٰ نے چاہا تو حسبِ ذیل آٹھ کتابیں ہونگی اور اس کے بھی کل صفحات ۳۸۴ ہونگے۔

مضمونِ ذکر[1]۔ وصیۃ الذکر[2]۔ ذکر اللہ تعالیٰ[3]۔ التذکیر بالقرآن[4]۔ تلاوتِ قرآن[5]۔ وصیۃ التلاوۃ[6]۔ مضمونِ تہجد[7]۔ مسنون دعائیں[8]

اور پھر اس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ حصہ چہارم کا نمبر ہے جسمیں حضرت مصلح الامۃؒ کی پانچ کتابیں ہونگی اور اس کا لقب "وصایائے خمسہ" مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسکے صفحات چار سو سے بھی متجاوز ہو جائیں۔ وہ کتابیں یہ ہیں۔

وصیۃ الاحسان[1]۔ وصیۃ الاخلاق[2]۔ وصیۃ الاخلاص[3]۔ وصیۃ السنۃ[4]۔ وصیۃ السالکین[5]۔

نوٹ: خیال ہے کہ ایک آخری پانچواں حصہ اور مرتب کیا جائے جسمیں "تصوف اور نسبت صوفیہ ہر دو حصہ" کے ہمراہ "محبۃ اللہ وھوی النفس" اور بعض دیگر مضامین بھی شامل کر دئے جائیں۔ ابھی یہ حصہ زیر تجویز ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کارِ عظیم کو ہمارے لئے آسان فرما دے اور اس کارِ عظیم سے ہمکو جلد کامیابی کیساتھ سبکدوش فرماوے آمین۔ والسلام دعا کا طالب

خانقاہ وصی اللّٰہی بخشی بازار۔ الہ آباد
۲۰ محرم الحرام ۱۳۹۵ھ ۲ فروری ۷۵ء

عبدالرحمٰن جامی
یکے از خدام

قال اللہ تعالیٰ

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ

ترجمہ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کا ساتھ پکڑو

(وقال الشعرانی فی الیواقیت)

"نابت عنہم رسائلہم بعد موتہم فی نصح المریدین"

یعنی ان حضرات مشائخ کی وفات کے بعد طالبین کی اصلاح کے باب میں ان کی تصانیف بھی ان کی قائم مقامی کرتی ہیں

بناءً علیہ

مجموعہ تالیفات مصلح الامۃ

حصہ دوم

عارف باللہ حضرت مولانا و مرشدنا شاہ وصی اللہ صاحب

ناشر

مکتبہ اشرفیہ

۳۶، محمد علی روڈ، بمبئی ۳

مِفتاحُ الرَّحمۃ

اور

راہِ صفا

ازافاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب
نور اللہ مرقدہٗ

مُفتاحُ الرَّحمۃ

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

دعا کے متعلق چند دنوں سے حضرت والا نہایت اہتمام اور خاص شان سے گفتگو فرما رہے ہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعائیں جو آپ نے رزق کے متعلق یا صحت و عافیت کے متعلق یا اور دیگر دینی اور دنیوی حاجات کے متعلق اللہ تعالیٰ سے فرمائی ہیں انھیں ایک خاص ذوق و حال کے ساتھ اہلِ مجلس کو سنا رہے ہیں۔ اور کسی کسی دعا کی مختصر تشریح و توضیح بھی فرماتے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ موثر اور دل نشین ہو گئی ہیں ایسی کہ عوام بھی اس کو سمجھ لیتے ہیں، اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ یوں دعا کا ایک مضمون حضرت والا مدظلہٗ العالی کے ایک سابق رسالہ "وصیۃ الاخلاق" میں کسی قدر تفصیل سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ جن حضرات کو مطالعہ کا شوق ہو وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

اس وقت آپ کے سامنے ہم جو چیز پیش کر رہے ہیں، اور جس مقصد کے پیش نظر پیش کر رہے ہیں اس کے متعلق خود حضرت والا کا ارشاد سنئے:۔

فرمایا کہ ہمارا یہ یقین ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ذات باری تعالیٰ سے جو نسبتِ عبودیت حاصل تھی اس کا تو کوئی فردِ بشر احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔ خدا تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں آپ کو عبد فرمایا ہے۔ عبدیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتہائی کمال تھا۔ اس پر سب اہلِ حق کا اتفاق ہے، اس عبدیت کا جس چیز سے ظہور ہوا ہے تو وہ آپ کی یہی ادعیہ ہیں،

چنانچہ جس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے تمام شعبوں کی تکمیل فرمائی اسی طرح سے آپ نے شعبۂ دعا کی بھی تکمیل فرمائی۔ یہ شعبہ ایک بحرِ زخار ناپیدا کنار ہے۔ اس کا احصار طاقت بشری سے باہر ہے، اور عبدیت کے لئے کمالِ افتقار و احتیاج لازم ہے، جس کا ثبوت ان ادعیہ سے ہوتا ہے۔

عقائد۔ عبادات۔ اخلاق معاملات۔ معاشرت دین و دنیا۔ معاش و معاد اور ظاہر و باطن میں کوئی خیر و شر ایسی نہیں چھوڑی جس کے لئے آپ نے دعا یا تعوذ نہ کیا ہو۔ اس

میں جس طرح عبدیت کی تکمیل ہے، امت کو تعلیم بھی ہے۔

اور جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا کہ سب ادعیہ کا احاطہ طاقت بشری سے باہر ہے تاہم علماء نے انمیں سے بہت سی دعاؤں کو محنت اٹھاکر ایک جگہ جمع بھی فرمادیا ہے۔ ہم اسوقت ان میں سے بھی صرف چند خاص خاص اور اہم دعائیں جو ہمارے ذوق کے مطابق ہیں، مع ترجمہ اور مختصر تشریح کے یہاں بیان کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کو ان سے نفع ہو، اور اس باب میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاسی اور اقتداء انھیں نصیب ہو کر ان کیلئے فلاح دارین کا ذریعہ بنے۔

نیز مقصد یہ ہے کہ ناظرین کو اولاً ان ادعیہ سے ذوق پیدا ہو تاکہ پھر وہ ہر دعا کو قلب کی شرکت کے ساتھ، اور ذوق وحال کو شامل کرکے مانگا کریں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا مقبول وہی ہے جو قلب کی شرکت کے ساتھ ہو —— حدیث شریف میں آتا ہے کہ:۔

اِنَّ اللہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَآءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ یعنی اللہ تعالیٰ غافل دل سے دعا قبول نہیں فرماتے" —— یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یوں تو رسمی اور سرسری طور سے کوئی کام بھی نہیں کرنا چاہئے کہ یہ خلوص کے خلاف ہے چہ جائیکہ دعا جیسی عظیم الشان چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص سنت اور اعلیٰ کمال ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک محبوب ترین عمل ہے، نیز ذریعۂ تقرب ہے، اس کو سرسری طور سے کرنا یہ تو بڑی ہی بے ادبی کی بات ہے اس لئے کہ دعا کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَھَنَّمَ دَاخِرِیْنَ ○ یعنی اور تمھارے پروردگار نے فرمادیا کہ تم مجھکو پکارو میں تمھاری درخواست قبول کروں گا، جو لوگ میری عبادت سے (جنمیں دعا بھی ہے) سرتابی کرتے ہیں، وہ عنقریب ذلیل ہوکر جہنم میں داخل ہوں گے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ○ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ یعنی جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کرتے ہیں تو میں قریب ہی ہوں، منظور کرلیتا ہوں عرضی درخواست کرنے والے کی جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست دیں، سو ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو قبول کیا کریں، اور مجھ پر

یقین رکھیں، امید ہے کہ وہ لوگ رشد حاصل کرسکیں گے۔"

سبحان اللہ اس آیت میں اوّلاً تو یہ فرمایا کہ میں دعا کرنیوالوں کی دعا کو قبول کرتا ہوں، پھر اس کے بعد کس قدر محبت اور شفقت کے عنوان سے اپنے احکام کے عمل پر ابھارتے ہیں۔

یہ فرماتے ہیں کہ جب میں تمھاری دعا قبول کرتا ہوں یعنی تمھاری بات مانتا ہوں تو تم بھی میری بات مانو، اور وہ یہ کہ میرے احکام یعنی شریعت کو دل سے قبول کرو۔ اور اس کی پیروی کرو۔

اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ

یعنی اچھا یہ بتلاؤ کہ تمھارے یہ معبود بہتر ہیں یا وہ ذات جو بیقرار آدمی کی سنتا ہے جب وہ اسکو پکارتا ہے، اور اس کی مصیبت کو دور کر دیتا ہے، اور تمکو زمین میں صاحب تصرف بناتا ہے" یہ سنکر اب بتلاؤ کہ کیا اللہ کے ساتھ شریک عبادت ہونے کے لائق کوئی اور معبود ہے، مگر تم لوگ بہت کم یاد رکھتے ہو۔

دیکھئے ان آیات میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی کیسی تاکید آئی ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے دعا نہ کرنے کو تکبر فرمایا۔ دوسری جگہ یہ فرما کر بندوں کو مطمئن کیا کہ ہم دعا کرنے والوں کی دعا کو قبول فرماتے ہیں۔

اسی طرح سے احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بندے کا دعا کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت ہی پسند ہے ——— چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ:۔

مَنْ لَّمْ یَسْئَلِ اللّٰهَ یَغْضَبْ عَلَیْهِ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتے ہیں۔

اسی طرح سے ایک روایت میں آتا ہے:۔ اَلدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔

نیز ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر روز جب تہائی رات باقی رہجاتی ہے تو ہمارے رب تبارک و تعالیٰ آسمانِ دنیا پر نزول فرماتے ہیں، اور اعلان فرماتے ہیں کہ ہے کوئی مجھ سے سوال کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں، اور ہے کوئی مجھ سے سوال کرنے والا کہ میں اسکو دوں، اور ہے

کوئی مجھ سے بخشش طلب کرنے والا کہ میں اس کو بخش دوں۔

اس روایت میں تو دعا، سوال، استغفار، تین ہی امور کا ذکر ہے لیکن ان ہی تینوں میں حصر نہیں ہے بلکہ بعض روایتوں میں دوسرے دوسرے الفاظ بھی آئے ہیں۔

چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ:-

هَلْ مِنْ تَائِبٍ فَاَتُوبَ عَلَيْهِ یعنی ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اسکی توبہ قبول کر دوں،

اور اسی طرح سے ایک اور روایت میں ہے مَنْ ذَا الَّذِیْ یَسْتَرْزِقُنِیْ فَاَرْزُقَهُ یعنی ہے کوئی شخص جو رزق طلب کرتا ہے کہ میں اسکو رزق دوں۔ وَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَکْشِفُ الضُّرَّ فَاَکْشِفَ عَنْهُ یعنی اور کون شخص ہے جو مجھ سے اپنی پریشانی میں نجات چاہتا ہے کہ میں اسکی پریشانی کو دور کر دوں۔

اور ایک روایت میں آتا ہے کہ اَلَا سَقِیْمٌ یَسْتَشْفِیْ فَاُشْفِیْ یعنی ہے کوئی بیمار جو مجھ سے شفا چاہتا ہے، تاکہ میں اسکو شفا دوں ـــــ ایک روایت میں اتنی زیادتی اور آئی ہے، وہ یہ کہ مَنْ یُّقْرِضُ غَیْرَ عَدِیْمٍ وَلَا ظَلُوْمٍ یعنی کون ہے جو قرض دے ایک ایسی ذات کو جو نہ تو مفلس و نادار ہے کہ اصل رقم ہی واپس نہ کرے، اور نہ ظالم ہے کہ کم دے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اس عنوان کے ذریعہ طاعت پر تحریض مقصود ہے، اور اس پر ثواب جزیل عطا فرمائے جانے کی جانب اشارہ ہے۔

فتح الباری میں ہے کہ حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ رات کے اس حصہ میں دعا مقبول ہوتی ہے، اور اگر کسی کو دعا مقبول ہوتی نہ معلوم ہو تو اس کا سبب شروطِ دعا میں خلل کا واقع ہو جانا ہے۔ مثلاً کھانے، پینے میں کوئی بے احتیاطی ہو گئی ہو، اسی وجہ سے دعا قبول نہیں ہوئی، یا دعا کرنے والے نے جلدی مچائی ہوگی کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ یُسْتَجَابُ لِاَحَدِکُمْ مَا لَمْ یَعْجَلْ یعنی تم میں سے ہر شخص کی دعا قبول ہوتی ہے بشرطیکہ جلدی نہ مچائے۔ یا کسی گناہ کے کام کی دعا ہوگی یا قطع رحم کی ہوگی اسلئے قبول نہیں ہوئی ہوگی اور کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ دعا تو قبول ہو جاتی ہے مگر کبھی مطلوب کا ملنا اس بندے کی مصلحت یا حق تعالیٰ کی مرضی نہ ہونیکی وجہ سے مؤخر ہو جاتا ہے۔ اس لئے دوسری چیز مرحمت فرما دیتے ہیں اور یا اسکو

توشۂ آخرت بنا دیتے ہیں۔

ان احادیث سے بھی معلوم ہوا کہ دعا کی کس قدر اہمیت ہے۔

غرض انھیں نصوص کے پیش نظر اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند دعائیں پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان سے مستفید فرمائیں۔ آمین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے رزق کے متعلق کس طرح سوال فرما رہے ہیں ارشاد فرماتے ہیں :۔

(۱) اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ رِزْقًا طَیِّبًا وَّ عِلْمًا نَّافِعًا وَّ عَمَلًا مُّتَقَبَّلًا "یعنی اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے رزق پاکیزہ، اور علم کار آمد، اور عمل مقبول" یہ دعا کر کے آپ نے امت کو یہ تعلیم فرمائی کہ علم و عمل کے ساتھ ساتھ رزق طیب بھی اللہ تعالیٰ ہی سے طلب کرنا چاہئے انھیں کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے، جب اُدھر ہی سے منظوری ہوتی ہے تب ہی انسان رزق کے باب میں بھی کامیاب ہوتا ہے۔ اس لئے رزق کو بھی اللہ تعالیٰ ہی سے طلب کرنا چاہئے یعنی حصول رزق کا جس طرح سے ایک ذریعہ تجارت یا ایک ذریعہ زراعت یا ایک ذریعہ ملازمت ہے اسی طرح سے اس کا ایک سبب اقویٰ سبب اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا بھی ہے۔

علماء نے فرمایا ہے کہ رزق کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رزق مضمون ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے جس کی ذمہ داری لے لی ہے اور اسکے ضامن ہو گئے ہیں، جس کا ذکر اس آیت میں ہے وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا یعنی کوئی جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اسکی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ دوسری قسم رزق موعود ہے یعنی وہ رزق جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ جس کا تذکرہ ان آیات میں ہے وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّ یَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ وَ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہونچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہے۔

چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں :۔ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ اَمْرِہٖ یُسْرًا یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے ہر کام میں آسانی کر دے گا (انھیں میں

سے رزق کا معاملہ بھی ہے)

اسی طرح ایک اور جگہ نہایت صریح لفظوں میں فرماتے ہیں کہ:۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى یعنی اپنے متعلقین کو بھی نماز کا حکم کرتے رہئے، اور خود بھی اسکے پابند رہئے۔ ہم آپ سے معاش نہیں چاہتے، معاش تو آپ کو ہم دیں گے۔ اور بہتر انجام تو پرہیز گاری کا ہے۔

ان سب آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک اور متقی بندوں کیلئے رزق کا وعدہ فرمایا ہے، یہ رزق موعود ہے ـــــ اور تیسری قسم رزق مقسوم ہے جو کہ مضمون اور موعود دونوں کو شامل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہر ایک کے لئے بقدر مقدر رزق تقسیم کیا جاچکا ہے۔ اتنا اس کو مل کر رہیگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو سید الاتقیاء ہیں، آپ کی نظر ان سب وعدوں پر تھی بلکہ آپ ہی سے تو خطاب تھا۔ مگر ان سب کے باوجود آپ اللہ تعالیٰ سے رزق بھی طلب فرما رہے ہیں، یہ عبدیت ہے اور نزول ہے، جو کہ عروج سے افضل ہے۔

سمجھتے تھے کہ وعدہ جو فرمایا ہے، تو یہ مالک کا کرم ہے۔ باقی بندہ کا حق تو یہی ہے کہ وہ اپنے مولیٰ کے سامنے اپنے کو سراپا محتاج ہی ظاہر کرے۔

چنانچہ ایک اور دعا میں فرماتے ہیں کہ:۔

(۲) اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا مِنْ فَضْلِكَ وَلَا تَحْرِمْنَا رِزْقَكَ وَبَارِكْ لَنَا فِيْمَا رَزَقْتَنَا وَاجْعَلْ غِنَاءَنَا فِيْ أَنْفُسِنَا وَاجْعَلْ رَغْبَتَنَا فِيْمَا عِنْدَكَ۔ یعنی یا اللہ نصیب کر ہمیں اپنا فضل اور محروم نہ رکھ ہمیں اپنے رزق سے، اور برکت دے ہمیں اس رزق میں جو تو نے ہمیں دیا، اور کر غنا ہماری ہمارے دلوں میں، اور کر دے رغبت ہماری اس چیز میں جو تیرے پاس ہے۔

ف ۔ سبحان اللہ اس دعا کی جامعیت ملاحظہ فرمائیے کہ اسمیں آپ دارین کی فلاح کا اللہ تعالیٰ سے سوال فرما رہے ہیں۔ یعنی پہلے تو یہ فرمایا کہ اے اللہ اپنا فضل عطا فرمائیے، اب ظاہر ہے کہ جب خدا تعالیٰ کا فضل ہی کسی کے شامل حال ہو گیا، تو پھر اب اس کو کمی کس چیز کی،

آگے رزقِ دنیا کو کس عنوان سے طلب کیا ہے، یعنی یہ فرمایا ہے کہ اپنے رزق سے ہمیں محروم نہ فرمایئے بلکہ رزق دیجئے، اور جو کچھ عنایت فرمایئے اسمیں برکت بھی فرمایئے۔

آگے فرماتے ہیں کہ مجھے ظاہری غنیٰ اور امیری درکار نہیں ہے، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے دل کو غنی بنا دیں، جیسا کہ اور روایت میں آتا ہے کہ: خَیْرُ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ یعنی بہترین غنیٰ دل کا غنیٰ ہے

اور آخر میں آخرت کو یاد کر کے فرماتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ ہم اس دنیا میں پھنس کر خدا کی جانب سے اور آخرت سے غافل ہو جائیں۔ اور بالکل مال ہی کے بندے ہو جائیں۔ اس لئے یہ فرمایا کہ میری قلبی رغبت کو اس چیز کی جانب پھیر دیجئے جو آپ کے پاس ہے۔ یعنی اجرِ آخرت جنت اور جزا اور مغفرت۔

اس دعا کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے رزقِ دنیا بھی طلب فرمایا ہے اور آخرت کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

چنانچہ جب آپ نے یہ دعا فرمائی تو یہ سنت ہو گئی۔ اب صالحینِ امت کو اپنے نبی کی اس سنت کا بھی اتباع کرنا چاہیئے ورنہ اتباع ناقص رہے گی۔

اور سنئے! ایک اور دعا میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

(۳) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ اَوْسَعَ رِزْقِكَ عَلَيَّ عِنْدَ كِبَرِ سِنِّيْ وَانْقِطَاعِ عُمُرِيْ وَاجْعَلْ خَيْرَ عُمُرِيْ اٰخِرَهٗ وَخَيْرَ عَمَلِيْ خَوَاتِمَهٗ وَخَيْرَ اَيَّامِيْ يَوْمَ اَلْقَاكَ فِيْهِ يَا وَلِيَّ الْاِسْلَامِ وَاَهْلِهٖ ثَبِّتْنِيْ بِهٖ حَتّٰى اَلْقَاكَ اَسْئَلُكَ غِنَايَ وَغِنَا مَوْلَايَ۔

یعنی یا اللہ کر کشادہ فراخ رزق میرا میرے بوڑھاپے اور میری عمر ختم ہونے کے وقت اور کر بہترین عمر میری آخر حصہ اس کا، اور بہترین عمل میرا پچھلے عمل کو، اور بہتر میرے دنوں کا وہ دن جسمیں تجھ سے ملوں، اے مددگار اسلام کے اور اہلِ اسلام کے ثابت قدم رکھ مجھکو اسلام پر یہاں تک کہ میں تجھ سے ملوں، مانگتا ہوں تجھ سے اپنی سیر چشمی اور اپنے متعلقین کی سیر چشمی!

دیکھئے! اسمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوڑھاپے میں وسعتِ رزق کی دعا مانگ رہے ہیں، یہ اس لئے کہ انسان رزق کا محتاج تو ہر زمانہ میں ہوتا ہے لیکن بوڑھاپے میں احتیاج اور بڑھ جاتی ہے، اس سبب سے کہ ایک جانب اپنے قویٰ اور اعضا کمزور ہو جاتے

ہیں، اور دوسری جانب بال بچے (پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں وغیرہ) زیادہ ہوجاتے ہیں۔ اور ان سب کی کفالت اسی سے متعلق ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اب اسوقت انسان کے پاس رزق کی وسعت ہوئی تو وہ عزت اور خوشی کے ساتھ سب کی کفالت کرسکتا ہے اور مطمئن ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر اس زمانہ میں اس کا ہاتھ تنگ ہوا تو نہ صرف یہ کہ ان سب کو فقر و فاقہ کی ہی تکلیف ہوگی بلکہ یہ شخص بھی اُن سب کی نظروں میں ذلیل ہوجائے گا۔ اس ذلت سے بچنے کیلئے آپ نے یہ دعا فرمائی۔ اور کیسی کچھ دعا فرمائی۔

سبحان اللہ! اوّلاً یہ دعا فرمائی کہ سب سے فراخ رزق میرا میرے بوڑھاپے میں اور آخر عمر میں عطا فرما۔ اور پھر یہ دعا فرمائی کہ میری آخری عمر کو صرف دنیا ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ ہر اعتبار سے بہترین بنا۔ یعنی رزق بھی اسمیں فراخی کے ساتھ عطا فرما اور عمل بھی اسوقت کا میرا بہترین عمل بنا، اور اُس کے بعد فرمایا کہ میرا سب سے اچھا دن اُس دن کو بنا جس دن میں تجھ سے ملوں۔ مطلب یہ کہ میرا خاتمہ بالخیر فرما، اور مجھے اپنی رضا عطا فرما تاکہ آپ کی رضا اور اپنی نجات کو پاکر میں یہ سمجھوں کہ بس یہی دن میرا سب سے بہترین دن ہے۔ اس کے بعد یہ دعا فرمائی کہ اے اسلام اور اہل اسلام کے ولی مجھے آخر دم تک اسلام پر ثابت قدم رکھنا۔ اور آخر میں یہ سوال کیا کہ میں ظاہری مالداری کا خواہاں نہیں ہوں بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اور میرے متعلقین کو آپ قلبی غنا یعنی سیر چشمی عطا فرمائیں تاکہ اس کے بعد مجھے اور میرے متعلقین کو ظاہری غنا کی قلت کا کچھ غم نہ ہو۔

اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر اور عمل کی خیریت کا اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے اس لئے کہ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ:۔

اِنَّ رَجُلاً قَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ النَّاسِ خَیْرٌ قَالَ مَنْ طَالَ عُمُرُہٗ وَحَسُنَ عَمَلُہٗ، قَالَ فَاَیُّ النَّاسِ شَرٌّ قَالَ مَنْ طَالَ عُمُرُہٗ وَسَاءَ عَمَلُہٗ یعنی ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ سب سے اچھا شخص کون ہے؟ آپ نے فرمایا وہ شخص جسکی عمر زیادہ ہو اور عمل اچھے ہوں۔ پھر اس نے دریافت کیا کہ اور سب سے بُرا شخص کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جسکی عمر زیادہ ہو اور عمل خراب ہوں۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ عمر کا بھی زیادہ ہونا انسان کیلئے مبارک ہوسکتا ہے

اگر اس کے اعمال صالح ہوں کیونکہ جب عمر زیادہ ہوگی تو اس میں اس کے اعمال حسنہ بھی زیادہ ہوں گے، اور اگر کسی کے اعمال بُرے ہوئے تو اس کی عمر کی زیادتی بھی وبال ہی ہوگی۔

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ میری عمر کے آخری حصہ کو بہترین۔ اور میرے اعمال کے آخری عمل کو بہترین عمل بنا تاکہ عمر اور عمل دونوں اعتبار سے میرا خاتمہ بخیر ہو جائے۔

اور سنئے! ــــــ

جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اہل تقویٰ کے لئے رزق کا وعدہ فرمایا ہے اسی طرح جو لوگ ایمان اور عمل صالح اختیار کرتے ہیں ان کے لئے اسی دار دنیا میں اور دوسری چیزوں کا بھی وعدہ فرمایا ہے۔

چنانچہ آیت لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ کی ایک تفسیر علماء نے یہی فرمائی ہے کہ محسنین کے لئے اس دنیا میں حسنہ ہے، اور حسنہ کی تفسیر صاحب روح المعانی نے صحت اور عافیت سے فرمائی ہے یعنی محسنین کیلئے اس دنیا میں صحت اور عافیت ہے ــــــ چنانچہ یہ لکھا ہے کہ:۔

اِنَّ لِلْمُحْسِنِيْنَ جَزَاءً يَسِيْرًا فِى الدُّنْيَا وَهُوَ الصِّحَّةُ وَالْعَافِيَةُ وَاِنَّمَا تُوَفّٰى اُجُوْرُهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ یعنی محسنین کو اپنی نیکیوں کا کچھ تھوڑا سا بدلا اس دنیا میں بھی ملتا ہے، اور وہ صحت و عافیت ہے، باقی پورا پورا بدلہ تو ان کو آخرت ہی میں ملیگا۔

نیز صاحب روح المعانی نے آیت نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَاءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ٥ کے تحت حضرت سفیان بن عیینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اَلْمُؤْمِنُ مُثَابٌ عَلٰى حَسَنَاتِهٖ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَالْفَاجِرُ يُعَجَّلُ لَهُ الْخَيْرُ فِى الدُّنْيَا وَمَالَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ یعنی مومن اپنے حسنات پر دنیا اور آخرت دونوں جگہ ثواب دیا جاتا ہے، اور فاجر کے لئے اسکی بھلائیوں کا ثمرہ دنیا ہی میں دیدیا جاتا ہے، اور آخرت میں اسکے لئے کوئی حصہ نہیں ہے۔

پس مومن کو اس دنیا میں جو عافیت ملا کرتی ہے تو رزق اس کا فرد اعلیٰ ہے اسلئے

کہ اگر کسی کو رزق ہی حاصل نہ ہو تو پھر وہ عافیت ہی کیا ہے :
اسی کو سیدنا رفاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : ۔
" نعمتِ عافیت کی بڑی قدر کرو جس کی حقیقت یہ ہے کہ سانس بدون تکلیف کے آتا رہے، رزق بدون مشقت کے ملتا رہے، اور عمل صالح بدون ریا کے ہوتا رہے "
(البنیان المشید)
دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ رزق کو بھی حصول عافیت میں دخل ہے۔
میں کہتا ہوں کہ حضرت سیدنا رفاعیؒ کا یہ ارشاد اس حدیث سے ماخوذ ہے :۔
مَنْ اَصْبَحَ مِنْكُمْ اٰمِنًا فِیْ سِرْبِهٖ مُعَافًی فِیْ جَسَدِهٖ عِنْدَهٗ قُوْتُ یَوْمِهٖ فَكَاَنَّمَا حِیْزَتْ لَهُ الدُّنْیَا بِحَذَافِیْرِهَا یعنی جس شخص نے تم میں سے صبح کی اس حالت میں کہ اپنے نفس اور باطن کے اعتبار سے وہ مطمئن ہے، اور اُسے جسمانی عافیت بھی حاصل ہے، اور اس کے پاس اس دن کی روزی بھی موجود ہے، تو بس یہ شخص تو ایسا ہے کہ گویا اسکے لیے تمام دنیا ہی سمیٹ کر دیدی گئی ہے۔
اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رزق کے ساتھ عافیت کے لئے بھی بہت دعائیں کی ہیں ــــ چنانچہ ایک دعا میں فرماتے ہیں : ۔
(۴) اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ فِیْ دِیْنِیْ وَدُنْیَایَ وَاَهْلِیْ وَمَالِیْ
یعنی یا اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے معافی اور امن اپنے دین میں اور اپنی دنیا میں اور اپنے اہل میں اور اپنے مال میں۔
نہایت ہی مختصر مگر بہت جامع دعا ہے، فرما رہے ہیں کہ میں اپنے دین میں امن اور معافی چاہتا ہوں۔ یعنی جو کچھ عمل کروں وہ نفس و شیطان کی شرکت سے مامون رہے، اور انکی ادائیگی میں ہم سے جو کوتاہی ہو جائے اسکو آپ درگزر فرمائیں، اسطرح سے میں اپنی دنیا اور دین اور اپنے اہل اور اپنے مال کو تیری حفاظت میں دیتا ہوں۔ یعنی اِن سب میں مجھے لغزش سے بچائیے، اور ان تمام امور میں خیر و عافیت عطا فرمائیے
دیکھئے اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح سے تمام ضروری چیزوں کو جمع فرما دیا انسان کے لئے عافیت سے بڑھکر کیا شئے ہے اسی کو اللہ تعالیٰ سے دین میں دنیا میں اہل میں مال میں طلب فرما رہے ہیں

میں دعاؤں کا جو سلسلہ اس وقت آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں ان میں سے ایک وہ دعا بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مومنین صالحین کی دعاؤں میں سب سے پہلے بیان فرمایا ہے،

ع۵ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

یعنی وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں بھی حسنہ عطا فرمایئے اور آخرت میں بھی حسنہ عطا فرمایئے، اور ہم کو عذاب جہنم سے بچایئے۔

اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں جس دعا کو سب سے مقدم فرمایا ہو اسکی کیسی کچھ اہمیت ہوگی، اسی اہمیت کی بنا پر حضرت مولانا تھانویؒ نے مناجات مقبول" کی ابتدا بھی اسی دعا سے فرمائی کیونکہ اسمیں مختصر لفظوں میں دارین کی ہر نوع کی فلاح کو چاہا گیا ہے۔

حسنہ کے معنیٰ خوبی اور بھلائی کے ہیں۔ یعنی ہر وہ چیز جو شریعت کے نزدیک بھلی ہو اسکو حسنہ کہا جاتا ہے۔ اس حسنہ کا حقیقی محل اور اصل موطن تو جنت ہے جو آخرت میں ملیگی لیکن اللہ تعالیٰ نے صالحین کا قول نقل فرمایا ہے کہ وہ ہم سے یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمکو دنیا میں بھی حسنہ عطا فرمایئے، اور آخرت میں بھی۔ اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچایئے۔

اللہ تعالیٰ کے اس طرح سے بیان کرنے سے معلوم ہوا کہ خود اللہ تعالیٰ کو بھی انکی یہ دعا بہت پسند ہوئی اس لئے ترغیباً للنّاس ان صالحین کی دعا کو ذکر فرمایا تاکہ ہر زمانہ میں اللہ کے نیک بندے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کیا کریں۔ پس یہ دعا مقبول ہو چکی ہے اور مضمون اس کا شاہ کو پسند ہو چکا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نہایت ہی جامع دعا ہے، اور شاید ہی کوئی صالح ایسا ہوا ہو کہ جس نے یہ دعا نہ کی ہو اس لئے سالکین کو چاہیئے کہ اس دعا کو حرز جان بنالیں۔ اور اگر اور کوئی دوسری دعا نہیں یاد ہے یا نہیں کرتے تو کم از کم اس کو تو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

یوں دار دنیا میں حسنہ بہت سی چیزیں ہیں لیکن سب کی اصل اور سب سے بڑھکر مومن کے حق میں جو چیز حسنہ ہے وہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ پھر اس کے بعد صحت ہے، عافیت ہے۔ نیز نصر ہے، غنیمت ہے، فتح ہے، ظہور ہے، تمکن ہے۔ صیت ہے اور شہرت ہے۔

اور آخرت کے حسنہ سے مُراد اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت ہے اور جنت و مغفرت ہے، اور ان سب سے بڑھکر اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے اور اسکی رُویت ہے۔ اور چونکہ آخرت کے حسنہ کی تکمیل اس پر موقوف تھی کہ انسان کو یہ تمام چیزیں بدون مشقت اٹھائے اور بدون جہنم کی تکلیف جھیلے حاصل ہو جائیں

یعنی جنت کا دخول جو کہ منبع الخیرات ہے اولیٰ ہو۔ اسی لئے آگے دعا میں یہ بھی فرمادیا کہ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ یعنی دوزخ کی سختیوں اور اسکی رسوائیوں سے مجھے محفوظ رکھئے۔

اسی طرح سے ایک دعا میں ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

ع ۶ ۔ اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى دِيْنِيْ بِالدُّنْيَا وَعَلٰى اٰخِرَتِيْ بِالتَّقْوٰى وَاحْفَظْنِيْ فِيْمَا غِبْتُ عَنْهُ وَلَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ فِيْمَا حَضَرْتُهٗ يَا مَنْ لَّا تَضُرُّهُ الذُّنُوْبُ وَلَا تَنْقُصُهُ الْمَغْفِرَةُ هَبْ لِيْ مَا لَا يَنْقُصُكَ وَاغْفِرْ لِيْ مَا لَا يَضُرُّكَ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ

یہ فرمایا کہ یا اللہ مدد کر میری میرے دین پر دنیا کے ساتھ، اور میری آخرت پر تقویٰ کے ساتھ مطلب یہ کہ مجھے دین کے ساتھ ساتھ دنیا بھی دیجئے لیکن نہ اس طرح کہ وہ مجھ پر حاوی ہوجاوے بلکہ اس طرح کہ وہ میرے دین کی معین ہوجائے "۔ اور تو ہی محافظ رہ میری ان چیزوں کا جو میری آنکھ سے دور ہیں اور نہ حوالہ کر مجھے میرے نفس کے ان چیزوں میں جو میرے پیش نظر ہوں لے وہ کہ نہیں نقصان پہونچاتے اُسے گناہ، اور نہیں کمی کرتی اس کے ہاں مغفرت، دے مجھے وہ چیز کہ نہیں کمی کرتی تیرے ہاں کچھ، اور معاف کردے مجھے وہ چیز کہ نہیں نقصان پہونچاتی تجھے کیونکہ تو ہی دینے والا ہے۔

اس تمہید کے بعد آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

ع ۷ ۔ اَسْئَلُكَ فَرَجًا قَرِيْبًا وَّصَبْرًا جَمِيْلًا وَّرِزْقًا وَّاسِعًا وَّالْعَافِيَةَ مِنْ جَمِيْعِ الْبَلَاءِ وَاَسْئَلُكَ تَمَامَ الْعَافِيَةِ وَاَسْئَلُكَ دَوَامَ الْعَافِيَةِ وَاَسْئَلُكَ الشُّكْرَ عَلَى الْعَافِيَةِ وَاَسْئَلُكَ الْغِنٰى عَنِ النَّاسِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

یعنی مانگتا ہوں میں تجھ سے کشائش فوری، اور صبر جمیل، اور رزق واسع، اور امن جملہ بلاؤں سے۔ اور مانگتا ہوں میں تجھ سے پورا امن، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے بقا امن کی، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے شکر امن پر، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے سیرچشمی آدمیوں سے اور نہیں ہے پھرنا گناہوں سے اور نہ قوت عبادت کی مگر ساتھ اللہ برتر و بزرگ کے۔

اسی طرح سے ایک اور دعا میں فرماتے ہیں۔

ع ۸ ۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ مِنْ صَالِحِ مَا تُؤْتِي النَّاسَ مِنَ الْمَالِ وَالْاَهْلِ وَالْوَلَدِ غَيْرَ ضَالٍّ وَّلَا مُضِلٍّ ۔

یعنی اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے وہ اچھی چیز جو تو لوگوں کو دے، مال ہو یا بیوی ہو یا اولاد

کہ نہ گمراہ ہوں میں، اور نہ گمراہ کرنے والا۔

اس دعا میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صالح مال کا سوال کیا اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں اور سب چیزوں کی ضرورت ہے وہاں مال کی بھی ضرورت ہے۔ اگر مال کسی کے پاس نہ ہو تو دین کی بھی گاڑی نہیں چل سکتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مال کیلئے صالح ہونا ضروری ہے ورنہ وہی مال عذاب اور وبال بھی بن سکتا ہے۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے۔

فرماتے ہیں:۔

عـ۹۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اِمْرَأَةٍ تُشَیِّبُنِیْ قَبْلَ الْمَشِیْبِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ وَلَدٍ یَّكُوْنُ عَلَیَّ وَبَالًا وَّاَعُوْذُبِكَ مِنْ مَّالٍ یَّكُوْنُ عَلَیَّ عَذَابًا۔

یعنی اے اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیری ایسی عورت سے کہ مجھے بوڑھا کردے بوڑھاپے سے پہلے۔ اور پناہ چاہتا ہوں تیری ایسی اولاد سے کہ ہو مجھ پر وبال، اور پناہ چاہتا ہوں تیری ایسے مال سے کہ ہو مجھ پر عذاب۔ لیکن جب یہی بیوی، اولاد اور مال صالح ہوں گے تو پھر دین و دنیا دونوں جگہ کام آویں گے جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ یعنی صالح مال انسان کیلئے کیا ہی عمدہ چیز ہے۔

اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

مال را گر بہر دین باشی حمول　　نعم مالٌ صالحٌ گفتہ رسول

یعنی مال کو اگر دین کے لئے جمع کرو تو کچھ بری بات نہیں اس لئے کہ جو مال خدا کی راہ میں خرچ ہو وہ مال صالح ہے جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے نعم المال الصالح للرجل الصالح

دیکھئے ان روایات سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے رزق بھی طلب فرمایا، مال بھی طلب فرمایا اور صحت و عافیت بھی طلب فرمائی۔

عافیتِ دارین کے متعلق ایک مختصر دعا آپ یہ فرماتے ہیں کہ۔

عـ۱۰۔ اَسْئَلُ اللّٰهَ الْعَافِیَةَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ (مشـ) یعنی اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے امن دنیا اور آخرت میں۔

اسی طرح سے طلب عافیت ایک جگہ اس عنوان سے فرمارہے ہیں:۔

عـ۱۱۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ اِیْمَانًا دَائِمًا وَّاَسْئَلُكَ قَلْبًا خَاشِعًا وَّاَسْئَلُكَ یَقِیْنًا صَادِقًا

وَاَسْئَلُكَ دِيْنًا قَيِّمًا وَّ اَسْئَلُكَ الْعَافِيَةَ مِنْ كُلِّ بَلِيَّةٍ وَّ اَسْئَلُكَ دَوَامَ الْعَافِيَةِ وَاَسْئَلُكَ الشُّكْرَ عَلَى الْعَافِيَةِ وَ اَسْئَلُكَ الْغِنٰى عَنِ النَّاسِ ع ۱۸۵

یعنی اے اللہ مانگتا ہوں میں تجھ سے ایمان ہمیشہ رہنے والا، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے دل خشوع کرنے والا، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے یقین سچا، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے دین راست اور مانگتا ہوں میں تجھ سے امن ہر بلا سے، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے ہمیشہ رہنا امن کا، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے شکر امن پر، اور مانگتا ہوں میں تجھ سے بے پروائی لوگوں سے یعنی سیر چشمی اور استغناء۔

دیکھئے اس ایک دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی چیزوں کا اللہ تعالیٰ سے سوال کیا، پہلے ایمان دائم طلب فرمایا۔ پھر قلب خاشع کا سوال کیا اور یقین صادق کا۔ نیز دین قیم کی درخواست کی اور ہر مصیبت میں امن و اطمینان اور پھر اس امن کا دوام اور پھر اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر۔

غرض ان تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ ہی سے چاہا اور آخر میں یہ درخواست کی کہ آپ کی جانب یکسوئی کے ساتھ توجہ کرنے سے مانع مخلوق کے ساتھ تعلقات اور مخلوق پر نظر ہی ہوا کرتی ہے اس لئے مجھے ایسا کر دے کہ میں تیرے سوا سب سے بے نیاز ہو جاؤں اور جملہ مخلوق سے مجھے انقطاع کلی اور استغنائے تام نصیب فرما۔

اور سنئے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک دعا میں فرماتے ہیں:۔

ع ۱۲ ۔ اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ لِيْ دِيْنِيَ الَّذِيْ هُوَ عِصْمَةُ اَمْرِيْ وَاَصْلِحْ لِيْ دُنْيَايَ الَّتِيْ فِيْهَا مَعَاشِيْ وَاَصْلِحْ لِيْ اٰخِرَتِيَ الَّتِيْ فِيْهَا مَعَادِيْ وَاجْعَلِ الْحَيٰوةَ زِيَادَةً لِّيْ فِيْ كُلِّ خَيْرٍ وَّاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لِّيْ مِنْ كُلِّ شَرٍّ (ع ۲۵)

یعنی اے اللہ درست رکھ میرا دین جو میرے حق میں بچاؤ ہے، اور درست رکھ میری دنیا جس میں میری معاش ہے، اور درست رکھ میری آخرت جہاں مجھے لوٹنا ہے، اور کر زندگی کو میرے لئے ترقی ہر بھلائی میں، اور کر موت کو میرے لئے چین ہر برائی سے۔

دیکھئے اس دعا میں دین دنیا اور آخرت اور پھر موت و حیات سب کو جمع فرما کر اس ایک ہی دعا کو انسان کی جملہ حوائج کے لئے جامع بنا دیا ہے۔ فرمایا کہ "میرے دین کی اصلاح

فرما دیجئے" اس لئے کہ وہی میرا بچاؤ ہے۔ اب اگر میرا یہ ادر وقار ہی درست نہ رہا تو ظاہر ہے کہ میں بڑی مصیبت میں پڑ جاؤں گا بلکہ ہلاک ہی ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد فرمایا کہ "اور میری دنیا کی بھی اصلاح فرمائیے جس میں کہ ہمارا رہنا سہنا ہے۔ کیونکہ اگر ہم دنیا میں رہتے ہوئے امور معاش کی جانب سے مطمئن نہ ہوئے تو ظاہر ہے کہ ہم ایسی حالت میں خدا کا حق کیا ادا کر سکتے ہیں۔ اور آخرت کے لئے کیا ذخیرہ فراہم کر سکتے ہیں اس لئے معاد کی درستگی کے ساتھ ساتھ معاش کی جانب سے بھی اطمینان نصیب ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے دین کے ساتھ ساتھ معاش کی بھی دعا فرمائی۔

آگے فرمایا کہ دنیا میں انسان کو زندگی جو عطا ہوتی ہے۔ اب اس کو انسان چاہے تو نیکیوں اور بھلائیوں میں صرف کرے۔ اور چاہے تو دوسری چیز میں صرف کرے۔ یہ انسان کا کام ہے اسلئے اس کی توفیق اللہ تعالیٰ ہی سے طلب فرمائی یعنی یہ عرض کیا کہ اے اللہ میری زندگی کو میرے لئے ہر خیر میں ترقی کا ذریعہ بنا یعنی نیکیوں کی توفیق فرما، اور خیر میں زیادتی فرما، پھر زندگی کے بعد چونکہ موت یقینی ہے اس لئے یہ فرمایا کہ میری موت کو میری ہر برائی کیلئے سبب سکون و راحت فرما یعنی موت ایسی حالت میں آوے کہ میں یہ سمجھ لوں کہ آج سے مصیبت کے دن ختم ہوئے اور اب آئندہ راحت ہی راحت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان کو حسنِ خاتمہ نصیب ہو۔ پس اس عنوان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے حسنِ خاتمہ طلب کیا گیا ہے۔

اب اعمال و اخلاق کے متعلق آپ کی دعا سنئے، اور یہ سمجھ لیجئے کہ اس راہ میں اعمال و اخلاق موجب قربِ الٰہی ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کے لئے کیسے اعمال و اخلاق اختیار کرنے چاہئیں۔ یہ سالکینِ راہ کے لئے ایک مشکل چیز ہے۔

دیکھئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اعمال پسندیدہ اور اخلاقِ برگزیدہ اختیار فرماتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ تضرع و زاری بدرگاہِ واہب العطیات بھی کرتے ہیں جیسا کہ آپ کی ادعیہ سے معلوم ہوتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

ع ۱۳ ۔ اِهْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ اِنَّهٗ لَا یَهْدِیْ لِصَالِحِهَا وَ لَا یَصْرِفُ سَیِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ (۱۰۳)

یعنی اے اللہ ہدایت کر مجھکو اچھے اعمال اور اخلاق کی کیونکہ نہیں ہدایت کرتا ہے عمدہ اعمال

واخلاق کی اور نہیں دور کرتا ہے بُرے اعمال واخلاق کو کوئی سوائے تیرے۔

دیکھئے باوجودیکہ آپ ایک اولوالعزم پیغمبر اور تمام انبیاء علیہم السلام کے سردار ہیں آپکی عبادات، آپ کے اعمال صالحات، آپ کے اخلاق اور پھر ان سب میں آپ کی حُسنِ نیت آپ کا ارادہ، آپ کا صدقِ عزم ان سب امور کا تو پوچھنا ہی کیا۔ پھر بھی ان سب کے باوجود آپ حق تعالیٰ ہی سے ہدایت طلب فرمارہے ہیں (اعمال واخلاق حسنہ کی۔ اور بُرے اعمال و بُرے اخلاق سے صَرف) یعنی ہٹنے اور بچنے کو اُدھر ہی سے طلب فرمارہے ہیں۔

بس یہی اصل ہے اس راستے کی کہ بندہ تفرّع وزاری والحاح کو اپنی خوبنالے یعنی ان سب چیزوں کا سوال برابر اللہ تعالیٰ سے کرتا رہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہی میں کرتا رہے۔ پھر جب اس کے بعد اُدھر ہی سے ہدایت توفیق حُسنِ نیت، قوت عبادت اور طاقت اجتناب معاصی یہ سب امور عطا ہوتے ہیں تب بندے کا کام بنتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے اس طرح سوال فرمایا تو اب تو یہ طریقہ مسنون ہوگیا لہذا اب سالکین راہ کے لئے بھی ضروری ہوگیا کہ وہ بھی اگر کسی عمل صالح کو کرنا چاہتے ہیں یا کسی سیئہ ورذیلہ سے بچنا چاہتے ہیں تو وہ بھی یہ طریقہ اختیار کریں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کو اپنا وظیفہ بنائیں، اور اسکے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کرتے رہیں

یہاں ایک بات اور کہتا ہوں کہ اس دعا میں جب آپ نے یہ فرمایا کہ اِهْدِنِي لِصَالِحِ الْأَعْمَالِ وَالْأَخْلَاقِ تو دعا کا مضمون ختم ہوگیا تھا۔ مگر اس کے بعد آگے یہ بھی فرمایا کہ لَا يَهْدِي لِصَالِحِهَا وَلَا يَصْرِفُ سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ تو اسمیں توحید افعالی کی تعلیم فرمائی جس کی تعریف امام غزالیؒ یہ فرماتے ہیں کہ:۔

هُوَ أَنْ يَرَى الْأَشْيَاءَ كُلَّهَا مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى رُؤْيَةً تَقْطَعُ الْاِلْتِفَاتَ إِلَى الْأَسْبَابِ یعنی توحید یہ ہے کہ انسان تمام امور کو خدا تعالیٰ کی جانب سے دیکھے، اس طرح سے کہ اسباب کی جانب التفات بالکل نہ رہ جائے۔ پس مومن جب اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ اختیار کرتا ہے تو کبھی شیطان یا خود اس کا نفس اسکی نظروں میں اسے کمال بنا کر پیش کرتا ہے اور یہ سبب بن جاتا ہے اس شخص کے عُجب میں مبتلا ہوجانے کا، جس کی وجہ سے یہ ایک جانب یہ عمل بھی کرتا جاتا ہے اور دوسری جانب اس کی برکات سے محروم بھی رہتا ہے۔

اس نقصان سے بچانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دعا فرمائی اِهْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ تو اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ اِنَّہٗ لَا یَھْدِیْ لِصَالِحِھَا وَلَا یَصْرِفُ سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ آپ نے اس جزو کا اضافہ فرما کر امت کو عجب جیسے مہلک رذیلہ سے بچایا اس لئے کہ عجب اسی وقت ہوتا ہے جب انسان کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اس کا عمل ہے۔ لیکن جب آدمی یہ سمجھ لے کہ ہر چیز کی توفیق حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ملا کرتی ہے۔ اور بدون ان کی توفیق کے ہم نہ کوئی عمل کر سکتے ہیں اور نہ اپنا کوئی خلق سنوار سکتے ہیں۔ اس استحضار کے بعد اللہ تعالیٰ کی اس طرح سے معرفت ہونے کے بعد پھر انسان عجب میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔

طریق میں یہ عقبہ بہت سخت ہے ابتدائِ احوال میں مشائخ تک اسمیں مبتلا رہتے ہیں، اور بہت دنوں کے بعد اس سے نجات ملتی ہے لیکن جب اس سے رہائی مل جاتی ہے تو آدمی راحت پا جاتا ہے، اور اس سے مشقتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کا واقعہ کتابوں میں لکھا ہے " فرماتے ہیں کہ :-

میں ایک شب اپنے وِرد سے سو گیا جس کی وجہ سے میری طبیعت بہت مکدر رہوئی کیونکہ میں ان دنوں ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے اعمال پر اعتماد کرتے تھے، یعنی جن کی نظر اپنے عمل پر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے میں چند فرائض سے سو جانے کی سزا میں مبتلا کیا گیا، بہت پریشان ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہو گی کہ یا الٰہی! یہ کیا ماجرا ہے؟ اب تو نوافل سے گذر کر فرائض کی نوبت آنے لگی۔ اتنے میں باطن سے آواز آئی کہ اے ابراہیم! ہمارے بندے بن جاؤ۔ راحت پا جاؤ گے (یعنی اپنے ارادہ و اختیار کو ختم کر دو اور ہمارے ارادے اور اختیار سے کام کرو) ہم سُلا دیں تو سو رہو اور اٹھا دیں تو اٹھ جاؤ۔ بس ان دونوں کے درمیان تمھارے اختیار میں کچھ نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک دشوار گزار گھاٹی ہے جس میں سالکین کا ابتلا ہوتا ہے اور مخلصین ہی محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس سے نکلتے ہیں۔

اسی رذیلہ سے نکلنے کا طریقہ نہایت ہی آسان اور مختصر لفظوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمایا ہے۔ یعنی انسان اللہ تعالیٰ سے صالح اعمال اور حُسن اخلاق کی دعا بھی کرے، اور اس کا بھی خیال رکھے کہ اگر ان میں سے کچھ حصہ حاصل بھی ہو جائے تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھے۔ اور اپنا کوئی کمال نہ سمجھے ــــــ سبحان اللہ کیا پاکیزہ تعلیم ہے۔

اگر یہی ایک مضمون ہمارے قلب میں راسخ ہوجائے تو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ عُجب کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکے۔

اسی کو صوفیہ کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ اس دعا کا اوّل حصہ یعنی اِھْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ یہ تو سلوک ہے۔ اور آخری حصہ یعنی اِنَّہٗ لَا یَھْدِیْ لِصَالِحِھَا وَلَا یَصْرِفُ سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ یہ جذب ہے۔

چنانچہ سلوک کے بعد جبتک اُدھر ہی سے جذب نہ ہو، یہ راہ طے نہیں ہوتی۔ پس یہ جذب فرمانا وصول الی اللہ کے لئے بمنزلہ علت تامہ کے جزو اخیر کے ہے۔ اور اس کا جزو اوّل اتباع ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۔۔۔ چنانچہ بزرگان دین کے اس قسم کے ارشادات سنتا تھا۔

مثلاً شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

مپندار سعدی کہ راہِ صفا | تواں رفت جز برپئے مصطفےٰ
خلاف پیمبر کسے رہ گزید | کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید
کسانیکہ زیں راہ برگشتہ اند | برفتند وبسیار سرگشتہ اند
دریں بحر جز مرد داعی نہ رفت | گم آں شد کہ دنبال راعی نہ رفت

فرماتے ہیں کہ اے سعدی یہ گمان نہ کرنا کہ راہِ صفا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلے بغیر طے کی جاسکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو شخص راہ اختیار کرے گا اس کی رسائی منزل تک ہرگز نہ ہوسکے گی۔ جو لوگ اس راستہ سے بھٹکے ہیں وہ گمراہی میں بڑھتے ہی چلے گئے ہیں۔ بالآخر بہت ہی حیران وسرگرداں ہوئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اس بحر میں سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی چلا نہیں ہے، آپ ہی چلے ہیں اس لئے آپکا اتباع ضروری ہے۔ اب جو شخص اتباع سنت نہیں کرے گا وہ گمراہ ہوگا۔ اور ہلاک ہوجائے گا جیسے وہ بھیڑ بکری جو چرواہے کے پیچھے پیچھے چلے تو راستہ بھٹک کر طعمۂ گرگ ہوجاتی ہے۔

قطب العالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس اللہ سرّہٗ فرماتے ہیں کہ ؎

ہر کہ در راہ محمد رہ نیافت | تا ابد گردے ازیں درگہ نیافت

یعنی جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کو اپنا راستہ نہیں بنایا اس نے خدا تعالیٰ کی درگاہ کے راستہ کی گرد کو بھی نہیں پایا۔

مفتاح الرحمۃ

(۳)

میں بزرگوں کے ان ارشادات کو اتباع باطنی نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب میں پڑھا کرتا تھا اور خوش ہوتا تھا، اب اس حدیث سے جو کہ برابر معمول ہے یہ سمجھ میں آیا کہ سالکین کا ایسی حدیثوں کو معمول بنانا بھی پیروی باطنی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور اسی سے اعمال و اخلاق کی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیروی نصیب ہوگی۔ آپ نے دل سے تو کیا زبان سے بھی ایک مرتبہ بھی نہ کہا ہوگا کہ اِهْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ اِنَّهٗ لَا یَهْدِیْ لِصَالِحِهَا وَلَا یَصْرِفُ سَیِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ

اور سنئے ایک دعا میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

۱۳ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ رَبِّ مُحِبًّا وَفِیْ نَفْسِیْ لَكَ ذَلِیْلًا وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ فَعَظِّمْنِیْ وَمِنْ سَیِّئِ الْاَخْلَاقِ فَجَنِّبْنِیْ (ح ص) اے میرے رب اپنا بنالے مجھے، اور میرے دل میں اپنے مقابلہ میں فرماں برداری ڈال دے، اور لوگوں کی نظر میں عظمت دے، اور برے اخلاق سے بچائے رکھئے مجھے

سبحان اللہ! کیا دعا ہے اور کیسی عبودیت ہے۔ اِلَیْكَ رَبِّ فَحَبِّبْنِیْ میں جو لطف ہے وہ ترجمہ میں کہاں، فرماتے ہیں کہ اپنی جانب مجھے محبوب بنالیجئے، اور میرے نفس میں اپنا انقیاد اور تابعداری اسطرح سے ڈال دیجئے کہ میں ہر آن آپ کا محتاج اور آپ کا تابع و فرمانبردار بنا رہوں اور اپنے کو آپ کے آگے انتہائی ذلیل اور محتاج بناکر پیش کروں لیکن میری یہ ذلت صرف آپ ہی کے مقابلہ میں ہو، اور لوگوں کی نظروں میں مجھے باوقار بنائیے۔ اس لئے کہ اور لوگ بھی اگر مجھے حقیر و ذلیل سمجھیں گے تب تو میں بالکل ہی بے وقعت ہو جاؤنگا۔ باقی اس کا ذریعہ چونکہ یہی ہے کہ انسان کے اخلاق اچھے ہوں اسلئے آپ سے کہتا ہوں کہ میرے اخلاق اچھے کر دیجئے اور برے اخلاق سے مجھے بچائیے۔

اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو تواضع حاصل کرنیکا طریقہ سکھایا ہے، اور تواضع میں یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی نگاہوں میں تو چھوٹا ہوتا ہے اور دوسروں کی نگاہوں میں بڑا ہوتا ہے ۔ یہ عزت نفس ہے جو کہ شرعاً مطلوب ہے۔

چنانچہ ایک دوسری دعا میں یہ الفاظ موجود ہیں اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَّفِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا یعنی اے اللہ مجھے اپنی آنکھوں میں چھوٹا دکھلایئے، اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا دکھلایئے۔

ایک مولوی صاحب نے مجھ سے اس پر اشکال کیا کہ اس دعا میں تو اللہ تعالیٰ سے بڑائی کو بھی چاہا گیا ہے حالانکہ بڑائی اچھی چیز نہیں ہے، یہ تو کبر ہے۔ میں نے کہا کہ یہاں مجموعہ مراد ہے یعنی اپنی نظروں میں چھوٹا اور دوسروں کی نظروں میں بڑا ہونا چاہا گیا ہے جس کا دوسرا نام تواضع ہے جو ایک محمود صفت ہے بلکہ جملہ فضائل کی اصل ہے اور اسی کا یہ خاصہ ہے کہ انسان اپنے کو کمتر سمجھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ دوسروں کی نظروں میں اسکی وقعت بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

اور سنئے اپنی ایک اور دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ

ع۱۵ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ التَّوْفِيْقَ لِمَحَابِّكَ مِنَ الْاَعْمَالِ وَصِدْقَ التَّوَكُّلِ عَلَيْكَ وَحُسْنَ الظَّنِّ بِكَ (ع۱۱۷) یعنی اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے توفیق تیرے پسندیدہ اعمال کی، اور سچے توکل کی تجھ پر، اور نیک گمان کی تیرے ساتھ۔

دیکھئے اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے تین چیزوں کا سوال فرمایا۔ ایک تو یہ کہ پسندیدہ اعمال کی توفیق ہو۔ مطلب یہ کہ اعمال میں سے کارآمد وہی عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو۔ ہم کوئی عمل اپنے طور پر کریں اور وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو تو یہ تو بڑے گھاٹے کی بات ہے کہ ہم نے اسمیں تعب اور مشقت بھی اٹھائی اور مقصد بھی حاصل نہ ہوا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ ہی سے یوں دعا کی کہ مجھے ایسے اعمال کے کرنے کی توفیق عطا فرمایئے جو آپ کے نزدیک پسندیدہ ہوں۔

اور دوسری چیز جو اسمیں ہے وہ یہ کہ آپ نے اللہ تعالیٰ پر صدق توکل پیدا ہو جانیکی دعا فرمائی کیونکہ بندے کو جب اللہ تعالیٰ پر توکل ہو جاتا ہے تو وہ اِدھر اُدھر نظر کرنیکی زحمت سے بچ جاتا ہے اور ہر کام کے پورا ہونے پر اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے کو بہت سی زحمتوں سے بچا لیتا ہے۔

یہاں صدق توکل کا لفظ اختیار فرمایا۔ اور ایک مقام پر ان لفظوں میں دعا فرمائی ہے

ع۱۶ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِمَّنْ تَوَكَّلَ عَلَيْكَ فَكَفَيْتَهٗ وَاسْتَهْدَاكَ فَهَدَيْتَهٗ وَاسْتَنْصَرَكَ

فَنَصَرْتَهُ (ع۱۷۶) یعنی کر دے مجھے ان لوگوں میں سے کہ انھوں نے توکل کیا تجھپر پس توکافی ہوگیا انھیں، اور انھوں نے ہدایت مانگی تجھ سے پس تونے ہدایت کر دی انھیں اور انھوں نے مدد چاہی تجھ سے پس تونے مدد کر دی انکی

اس سے بھی معلوم ہوا کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ پر توکل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو کافی ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود بھی ارشاد فرمایا ہے اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ بس پھر جب اللہ تعالیٰ ہی کسی کی کفایت فرمالیں تو اسکو ہدایت دیدیں، نصرت دیدیں اور جو چاہیں عطا فرمائیں ان کیلئے کیا مشکل ہے لیکن اسکے لئے یہ ضروری ہے کہ بندے کو اعتقاد تام حاصل ہو اور اسپر یقین حاصل ہو، اور اللہ تعالیٰ سے اسکو پورا پورا حسن ظن ہو اسی لئے صدق توکل کے بعد اس کی بھی دعا مانگو کہ آپ کیساتھ حسن ظن بھی کامل مجھے حاصل ہو اور اس میں شک نہیں کہ جیسا گمان ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ رکھے گا اُدھر سے بھی ویسا ہی معاملہ اسکے ساتھ کیا جائے گا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ یعنی بندہ میرے ساتھ جیسا گمان رکھے گا میرا معاملہ اپنے ساتھ ویسا ہی پائے گا۔

ایک دعا میں آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ

ع۱۷۷ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ یعنی اے اللہ جس کو آپ عطا فرمانا چاہیں اسکو کوئی منع کرنیوالا نہیں، اور جس کو آپ نہ دینا چاہیں اس کو کوئی دینے والا نہیں، اور کسی غنی کا غنا آپ کے مقابلہ میں اس کو کوئی منفعت نہیں پہونچا سکتا۔

اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ تعلیم فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں عطا و منع ہے۔ وہی جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں ؎

تو وہ داتا ہے کہ جو چاہے کرے جسکو چاہے دے، جسے چاہے نہ دے

اور جس کو وہ دینا چاہیں تو ساری دنیا بھی اگر اسکو روکنا چاہے تو نہیں روک سکتی اور جس کو وہی نہ دینا چاہیں تو اگر سارا عالم ملکر چاہے کہ اس کو دیدے تو نہیں دیسکتا۔ آپنے یہ تعلیم فرمائی کہ یہی عقیدہ رکھنا چاہیئے۔

چنانچہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کا یہی حال ہوتا ہے۔ اس کا نام توحید افعالی

ہے یعنی یہ کہ معطی اور مانع اسی طرح سے ضار و نافع یہ حضرات صرف خدا کی ذات کو سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ ان کے قلوب میں ایسا راسخ ہوتا ہے کہ پھر اسکے مقابلہ میں سلاطین دنیا کو بھی یہ حضرات خاطر میں نہیں لاتے۔ انبیاء علیہم السلام کی تو بڑی شان ہے۔ اولیاء نے بھی انکی پرواہ نہیں کی۔

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی نے ان سے بادشاہ کے پاس سفارش کرنے کی درخواست کی، انھوں نے بادشاہ کے نام جو خط لکھا اس کا مضمون ملاحظہ ہو۔ لکھا کہ:۔

رَفَعْتُ قَضِیَّتَہٗ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ اِلَیْکَ فَاِنْ اَعْطَیْتَہٗ شَیْئًا فَالْمُعْطِیْ ھُوَ اللّٰہُ وَ اَنْتَ الْمَشْکُوْرُ وَاِنْ مَنَعْتَہٗ فَالْمَانِعُ ھُوَ اللّٰہُ وَ اَنْتَ الْمَعْذُوْرُ

یعنی میں اس شخص کا معاملہ اولاً خدا تعالیٰ کی جناب میں پھر (سبب کے درجہ میں) تیری جانب راجع کرتا ہوں، اب اگر تو اسکو کچھ دیدے تو میں یہ سمجھونگا کہ معطی حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہیں اور تو بھی مستحق شکریہ ہے اور اگر تو نے اس کو کچھ نہ دیا تو پھر بھی میں یہ سمجھونگا کہ مانع حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں اور تو معذور ہے۔

سبحان اللہ! کس قدر توحید میں یہ حضرات مستغرق رہتے ہیں کہ سفارش بھی کردی توحید بھی باقی رکھی۔

اور سنئے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک دعا میں فرماتے ہیں کہ:۔

۱۸ اَللّٰھُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِکَ مَا تَحُوْلُ بِہٖ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مَعْصِیَتِکَ وَمِنْ طَاعَتِکَ مَا تُبَلِّغُنَا بِہٖ جَنَّتَکَ وَمِنَ الْیَقِیْنِ مَا تُھَوِّنُ بِہٖ عَلَیْنَا مَصَائِبَ الدُّنْیَا وَمَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا اَحْیَیْتَنَا وَاجْعَلْہُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰی مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلٰی مَنْ عَادَانَا وَلَا تَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَایَۃَ رَغْبَتِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَّا یَرْحَمُنَا۔ (۱۵۲) یعنی اے اللہ دے ہمیں حصہ اپنے خوف سے اتنا کہ حائل ہو جائے بذریعہ اس کے ہم میں اور تیرے گناہوں میں۔ اور اپنی عبادات سے اتنا کہ پہنچادے تو ہمیں بذریعہ اسکے اپنی جنت میں، اور یقین سے اتنا کہ سہل کردے تو اس کی وجہ سے ہمپر دنیا کی مصیبتیں اور کارآمد کر ہماری سنوائیاں اور ہماری بینائیاں اور ہماری قوت جبتک ہمیں زندہ رکھے اور کر ان اس چیز کو باقی بعد ہمارے، اور ہمارا انتقام لے اس سے جو ہمپر ظلم کرے، اور مدد دے

ہمیں اسپر جو ہم سے دشمنی کرے، اور مت کر ہماری مصیبت ہمارے دین میں اور مت کر دنیا کو مقصود اعظم ہمارا، اور نہ انتہا ہمارے معلومات کی، اور منتہا ہمارے رغبت کی، اور نہ مسلط کر ہمپر اسکو جو ہمپر رحم نہ کرے۔

اس دعا کے ایک ایک لفظ پر غور فرمائیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس کس طرح سے اللہ تعالیٰ سے دینی و دنیاوی راحت و سکون طلب فرما رہے ہیں۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے خشیت کا سوال اس لئے مطلوب ہے کہ اسکی وجہ سے آدمی گناہوں سے بچتا ہے اس لئے سوال فرماتے ہیں کہ اے اللہ آپ مجھے اپنے خوف کا کم از کم اتنا حصہ تو بخش دیجئے جو ہم سے آپکی معصیت نہ ہونے دے بلکہ ارادہ گناہ پر ہی آپ کا خوف سامنے آجائے اور ہم کو اس سے روک دے، اور اپنی طاعت سے کم از کم اتنی طاعت کی توفیق عطا فرمائیے جس کی وجہ سے آپکی جنت میں داخل ہونیکا مستحق ہوسکوں، اور مجھے اپنے وعدوں پر اتنا یقین عطا فرمائیے جسکی وجہ سے دنیا کی ساری پریشانیاں مجھ پر سہل ہوجائیں یعنی اس یقین کیوجہ سے ان سکو آپ ہی کیطرف سے سمجھوں یوں کہ آپ نے جس طرح سے انھیں بھیجا ہے اس طرح سے آپ ہی اسے دور بھی فرما سکتے ہیں۔ اور ان کے بھیجنے میں بھی ہمارے لئے کوئی مصلحت ہی ہوگی

آگے فرمایا کہ آپ نے مجھے سمع، بصر اور قلب ان سب دولتوں سے نوازا ہے تو آپ ہی انھیں کارآمد بھی بنائیے یعنی مدۃ العمر ہمارے ان سب قویٰ کو محفوظ رکھئے، اور ہم کو ان سے منتفع فرمائیے، کسی عضو میں کوئی ضعف خلل اور فتور نہ ہو۔ نیز یہ بھی کہ آپ ان کو اپنی طاعت اور مرضیات میں لگائیے۔ اور نامرضیات و معصیت سے انھیں بچائیے۔ زندگی میں بھی ان سب کو خیر کا مصدر اور اس کا سرچشمہ بنائیے، اور بعد مرنے کے بھی ان کے آثار کو باقی رکھئے۔

آگے فرماتے ہیں کہ ہم کمزور ہیں آپ ہی ہمارے ناصر و مددگار ہیں لہٰذا جو ہم پر ظلم کرے یا ہم سے دشمنی کرے تو آپ ہی ہماری کیجئے اور اس سے ہمارا انتقام لیجئے۔ اور ایک گذارش یہ ہے کہ تکوینی طور پر اگر ہمارے لئے آپ کی جناب سے مصیبت ہی مقدر ہو تو وہ مصیبت تو آکر رہے گی۔ مگر آپ سے یہ درخواست ہے کہ اس مصیبت کو ہمارے دین میں نہ کیجئے، اور دین میں مصیبت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر انسان کو اجر نہ ملے۔ کیونکہ جس مصیبت پر اجر ملے تو حقیقۃً وہ مصیبت ہی نہیں ہے۔ البتہ اگر دنیا میں پریشانی اٹھانی پڑے اور آخرت

کے اجرسے بھی وہ خالی رہے تو بیشک وہ مصیبت ہے۔ اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تمامتر فساد کی جڑ اور جملہ خطایا کی اصل حب دنیا ہے اور اس کی جانب میلان انسان کا طبعی ہے، اور دنیا میں رہ کر استعمال دنیا سے چارہ بھی نہیں اس لئے نہ تو ہم دنیا سے بچ سکتے ہیں اور نہ اس کو اپنے دل سے بالکلیہ نکال سکتے ہیں۔ مگر ہاں اسکی درخواست کرتے ہیں کہ اسکی تحصیل ہمارا مقصود اعظم نہ بنجائے اور یہ دنیا ہماری معلومات کی انتہا نہ ہوجائے، اور ہمارے رغبات کی منتہا ہوکر نہ رہ جائے کہ ہم اسی میں بالکل لت پت ہوکر تیری یاد سے غافل ہوجائیں۔

اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک اہم گذارش یہ بھی ہے کہ ہمارے اوپر کسی ایسے کو مسلط نہ فرمادیجئے گا جو کہ ہم پر رحم نہ کرے کیونکہ جب وہ رحم نہ کریگا تو ظلم کریگا، اور طرح طرح کی ایذائیں پہونچائے گا جو سبب بنے گا ہمارے تشتت قلبی کا۔ اب خواہ یہ مسلط ہونے والا ہمارا خارجی دشمن ہو یعنی شیاطین الجن یا شیاطین الانس میں سے کوئی ہو یا داخلی دشمن ہو یعنی ہمارا نفس ہو۔ اس لئے کہ نفس کو بھی حدیث شریف میں دشمن ہی کہا گیا ہے۔

ارشاد فرماتے ہیں کہ اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْكَ یعنی تمہارے دشمنوں میں سے سب سے بڑا دشمن تمہارا وہ نفس ہے جو کہ تمہارے پہلو میں ہے۔

سبحان اللہ! کس قدر جامع دعا ہے، انسان دنیا میں معصیت سے محفوظ رہے مصائب دنیا اسے پریشان نہ کریں، اور ایسے اعمال و اخلاق کی اسے توفیق ہو جو زندگی میں بھی اسے نیک نام رکھیں اور مرنے کے بعد بھی اسکی یاد کو باقی رکھیں، ظالم و دشمن سے اطمینان حاصل ہو، دینی مصیبت سے محفوظ رہے، دنیا اپنے درجہ سے زیادہ حیثیت نہ حاصل کرے اور کسی ظالم و بے رحم کا انسان پر تسلط نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں جب کسی کو حاصل ہوجائیں تو اس سے بڑھ کر دینی و دنیوی راحت و سکون اور کیا ہوسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ قُلْ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۔ یعنی آپ کہئے کہ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور تمکو کان، آنکھ اور دل دیئے تملوگ بہت کم شکر کرتے ہو ــــ اس سے معلوم ہوا کہ سمع بصر اور قلب کا انسان میں ہونا اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ یہاں حق تعالیٰ نے اس کا امتنان فرماکر شکایت فرمارہے ہیں کہ میں نے کیسی کیسی نعمتوں سے تم کو نوازا مگر تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو۔ یعنی

قاعدہ ہے کہ کسی منعم کے انعام پر اس کا شکر ادا کیا جاتا ہے مگر تم کو دیکھتا ہوں کہ ہمارے انعامات سے متمتع تو ہو رہے ہو لیکن ہمارا شکر نہیں ادا کرتے۔ اب حق تعالیٰ کا یہ ارشاد سُنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسکی جانب کس طرح صرف نظر ما سکتے تھے۔ پس آپ نے ان کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ ہی سے سوال فرمایا اور یوں درخواست کی کہ

ع۱۹ اَللّٰهُمَّ مَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا اَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا (ع۵۲)

یعنی اے اللہ کارآمد رکھ ہماری شنوائیاں اور ہماری بینائیاں اور ہماری قوت جبتک ہمیں زندہ رکھیں آپ، اور کر ان سے خیر کو باقی ہمارے بعد ـــــ کارآمد بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جو عضو جس کام کے لئے موضوع ہے ہم اسکو اسی میں لگا دیں۔ یعنی آپکی مرضیات میں انکو استعمال کریں کہ یہی ان کا شکر ہے۔

سبحان اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح سے ہم کو ہمارے جوارح سے منتفع ہونے کا طریقہ بتایا ـــ اور وہ یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کریں کہ ہمیں ان جوارح اور اعضاء سے نفع بخشے ـــ اور اسکے لئے آپ اللہ تعالیٰ ہی سے منتفع ہونیکی توفیق طلب فرما رہے ہیں ـــ چنانچہ یہ فرمایا کہ تاحیات ہمیں ہمارے سمع و بصر اور ہمارے جملہ قویٰ سے منتفع فرما اور ان سے ایسا کام لے لے کہ وہ ہمارے مرنے کے بعد بھی ہم کو نیک نام رکھیں۔

چنانچہ ایک اور دعا میں آپ نے یہ فرمایا کہ:-

ع۲۰ وَبَارِكْ لَنَا فِيْ اَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُلُوْبِنَا وَاَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (ع۴۹) یعنی اے اللہ برکت دے ہماری شنوائیوں میں اور ہماری بینائیوں میں، اور ہمارے دلوں میں، اور ہماری بیویوں میں، اور ہماری اولاد میں۔ اور توبہ قبول کر ہماری کیونکہ تو ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

دیکھئے اس دعا میں سراپا عبدیت اور کمال افتقار الی اللہ کا اظہار فرما رہے ہیں کہ سمع بصر، قلوب اور ازواج و ذریات کے لئے برکت طلب فرمایا پھر اسکے بعد یہ بھی فرمایا کہ وَتُبْ عَلَيْنَا ہماری توبہ قبول فرمالیجئے، یہ اعلیٰ درجہ کی عبدیت ہے۔

پس ایک سالک کی بھی یہی شان ہونی چاہئے کہ وہ مالک کے سامنے اپنے کو سرتاپا محتاج اور گنہ گار سمجھے اور ہر امر میں انہیں سے استعانت اور توفیق طلب کرے۔

اور سنئے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا میں یہ فرمایا:-

ع ۲۱ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ عِيْشَةً نَقِيَّةً وَمِيْتَةً سَوِيَّةً وَمَرَدًّا غَيْرَ مُخْزٍيْ وَلَا فَاضِحٍ

یعنی اے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے زندگی صاف اور موت ڈھنگ کی اور انتقال جس میں رسوائی اور فضیحت نہ ہو۔

سبحان اللہ! کیسی عمدہ دعا ہے انسان کے تمام حالات کے لئے جامع ہے کیونکہ ہر انسان کو یہی تین حالات پیش آتے ہیں زندگی موت اور مابعد الموت۔ اس دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں حالتوں کی خوبی کا اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے فرماتے ہیں کہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں صاف زندگی کا۔

علماء نے لکھا ہے کہ عِيْشَةً اى حياةً یعنی عیشہ کے معنیٰ حیات کے ہیں نَقِيَّةً اى زكية راضية مرضية یعنی نقیۃ کے معنیٰ ہیں پاکیزہ اور صاف کے یعنی ایسی زندگی جو صاف و پاکیزہ ہو اور جسے پاکر صاحب عیش راضی ہو اور وہ اس کے نزدیک پسندیدہ ہو یا جس میں اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوں اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو۔ اور مِيْتَةً کے معنیٰ ہیں حالت موت کے اور سَوِيَّةً کے معنیٰ ہیں معتدلہ کے۔ مطلب یہ کہ سوال کرتا ہوں میں تجھ سے ایسی موت کا جو معتدل ہو یعنی ارذل عمر کو نہ پہونچ جاؤں اور نہ اتنا بوڑھا ہو جاؤں کہ بوڑھاپے کی مشقت مجھے جھیلنی پڑے۔ مطلب یہ کہ میری عمر اتنی زیادہ نہ ہو جائے کہ ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضا جواب دیدیں اور میں اپنے ہر کام میں دوسروں کا محتاج ہو جاؤں۔ چنانچہ عوام میں یہ جو رائج ہے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ چلتے پیر کھے اٹھالے (یعنی چلتا پھرتا دنیا سے اٹھالے) یہ اسی حدیث کا ترجمہ ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ مَرَدًّا غَيْرَ مُخْزٍيْ وَلَا فَاضِحٍ یعنی دنیا سے آخرت میں انتقال جو میرا ہو تو اس حال میں ہو کہ نہ تو وہاں رسوائی کا منہ دیکھنا پڑے اور نہ کسی قسم کی فضیحت اٹھانی پڑے یعنی اس طرح سے جاؤں کہ نہ تو وہاں ذلیل ہوں اور نہ کسی قسم کی مصیبت اور بلا میں پڑوں اور نہ اس حالت میں وہاں میری پیشی ہو کہ میرے عیوب اور میرے گناہ دوسروں پر ظاہر ہوں اور میری فضیحت ہو جائے

دیکھئے اس ایک ہی دعا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری ساری ضروریات کا احاطہ فرمادیا ہے یعنی اچھی زندگی کا بھی سوال فرمایا کیونکہ اگر زندگی ہو اور اچھی نہ ہو یعنی کلفتوں اور مصائب سے پُر ہو یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معاصی سے لبریز ہو تو پھر وہ زندگی ہی کیا۔ اسی طرح

آگے ڈھنگ کی موت کا بھی سوال فرمایا ہے کیونکہ موت ایک تو خود ہی وحشت کی چیز ہوتی ہے اور اس پر بھی اگر وہ بے ڈھنگی ہوئی تب تو یہ مصیبت بالائے مصیبت ہو گی۔ اسی طرح آپ نے تیسرا سوال یہ فرمایا کہ آپ کی جانب لوٹ کر جانا تو برحق ہے اور وہاں سب اولین و آخرین کا سامنا ہو گا لہٰذا اے اللہ میں تجھ سے آخرت کی ایسی پیشی اور حاضری چاہتا ہوں کہ جس سے نہ تو میں ذلیل ہوں اور نہ میرے عیب اور گناہ دوسروں پر کھولیں کہ وہ میرے لئے سبب رسوائی بنے۔

مجھے یہ دعا بہت پسند ہے آپ بھی اس دعا کو معمول بنائیں یعنی روزانہ ایک دفعہ اللہ تعالٰی سے زندگی اور موت کی خیریت کا سوال تو ضرور ہی کر لیا کریں۔

(نصیحت)

فرمایا کہ نوجوانوں کو معاملات اور اخلاق کی درستی کی طرف متوجہ کرنا چاہئے اور اس کی نگرانی رکھنا چاہئے آج سب سے اہم چیز معاملات کی اصلاح ہے کیونکہ سارے جھگڑے اسی فساد (بد معاملگی) سے پیدا ہو رہے ہیں لیکن معاملات سے بھی اہم اخلاق کی اصلاح ہے اس لئے کہ اخلاق کی اصلاح کی صورت میں بد معاملگی کی نوبت ہی نہ آئے گی کیونکہ بد اخلاقی ہی کی فرع بد معاملگی ہے (جب اصل ہی نہ موجود ہو گی تو فرع کا تحقق کیونکر ہو گا)

فرمایا کہ اہل اسلام کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم کا انتظام کریں اور ہر شخص کے ذمہ لازم کر دیں کہ وہ اپنے بچوں کو اتنی مقدار میں تعلیم دین ضرور دلائے جس سے وہ اپنی آئندہ زندگی میں اپنے دین و ایمان سے ناواقف نہ رہیں اور جو بچے دنیوی تعلیم مثلاً (انگریزی یا ہندی) حاصل کر رہے ہیں ان کے لئے بھی ان کے اوقات تعلیم کے علاوہ کوئی وقت مقرر کیا جائے جس میں وہ دین سیکھیں۔

راہِ صفا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

فرمایاکہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اُمت کی اصلاح کیلئے حق تعالیٰ کی جانب سے مامور تھے اس لئے جہاں آپ نے اعمال واخلاق کی تعلیم فرمائی وہیں آپ نے اللہ تعالیٰ سے ہر قسم کی حاجات دینی ودنیوی اور حالی ومالی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی فرمائی جس سے مقصد اپنی عبدیت کا اظہار بھی تھا اور اُمت کو تعلیم بھی دینی تھی کہ وہ اپنی تمام حاجات کو اللہ تعالیٰ سے مانگا کریں اور اپنے قول وفعل اور حال کی درستگی کا اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص خاص دعاؤں کو میں پیش کروں گا۔ اس وقت آپ کے سامنے ایک دعا پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ انْعَشْنِیْ وَاَحْیِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَاهْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ اِنَّهٗ لَا یَهْدِیْ لِصَالِحِهَا وَلَا یَصْرِفُ سَیِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ۔

یعنی یا اللہ رفعت دے مجھے اور زندہ رکھ مجھے اور رزق دے مجھے اور ہدایت کر مجھ کو اچھے اعمال اور اخلاق کی کیونکہ نہیں ہدایت کرتا ہے عمدہ اعمال اور اخلاق کی اور نہیں دور کرتا ہے بُرے اعمال اور اخلاق کو کوئی بجز تیرے۔

سبحان اللہ کیا عبدیت ہے پہلے یہ فرمایا کہ کسی کو رفعت دینا زندگی بخشنا اور رزق عطا فرمانا یہ سب تصرفات آپ ہی کے قبضہ میں ہیں۔ لہٰذا میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے آپ رفعت زندگی بخشئے اور رزق عطا فرمائیے ان حاجات کو طلب فرماکر فرمایاکہ اور ہدایت کر مجھ کو اچھے اعمال اور اخلاق کی اسلئے کہ آپ ہی ہادی مطلق ہیں۔ نہیں ہدایت کرتا ہے عمدہ اعمال اور اخلاق کی اور نہیں ہٹا سکتا ہے۔ بُرے اعمال اور اخلاق کو کوئی سوائے تیرے۔

یہاں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صالح اعمال واخلاق کی دعا فرمائی ہے ایک اور موقع پر آپ نے منکرات اخلاق اور اعمال سے استعاذہ فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ مُنْکَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَھْوَاءِ وَالْاَدْوَاءِ (ص۴۰)

یعنی اے اللہ میں تیری پناہ پکڑتا ہوں ناپسندیدہ اخلاق اور اعمال سے اور نفسانی خواہشوں اور بیماریوں سے ان دعاؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اعمال واخلاق کی اصلاح کا کس درجہ اہتمام ہے چنانچہ باوجود اس کے کہ آپ ایک اولوالعزم پیغمبر اور تمام انبیاء علیہم السلام کے سردار ہیں آپ کی عبادات آپ کے اعمال صالحہ آپ کے اخلاق اور پھر ان سب میں آپ کی حسن نیت آپ کا ارادہ اور آپ کا صدق عزم ان سب امور کا تو پوچھنا ہی کیا پھر بھی آپ اعمال اور اخلاق حسنہ کی ہدایت کو حق تعالیٰ ہی سے طلب فرما رہے ہیں اور برے اعمال اور برے اخلاق سے بچنے کو ادھر ہی سے مانگ رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس راہ میں اعمال واخلاق موجب قرب الٰہی ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کے لئے کیسے اعمال اور کیسے اخلاق اختیار کرنا چاہئے یہ سالکین راہ کے لئے ایک مشکل چیز ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ان ادعیہ کے ذریعہ اس کی بھی رہنمائی فرمائی وہ یوں کہ دیکھئے آپ اعمال پسندیدہ اور اخلاق برگزیدہ بھی اختیار فرماتے ہیں اور اس کے ساتھ تضرع وزاری بدرگاہ واہب العطیات بھی فرماتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بس یہی اصل ہے اس راستہ کی کہ بندہ تضرع وزاری اور الحاح کو اپنی خو بنالے یعنی ان چیزوں کا سوال برابر اللہ تعالیٰ سے کرتا رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے الفاظ میں کرتا رہے۔ پھر جب ادھر ہی سے ہدایت۔ توفیق۔ حسن نیت۔ قوت عبادت اور طاقت اجتناب معاصی یہ سب امور عطا ہوتے ہیں تب ہی بندہ کا کام بنتا ہے۔

فائدہ:۔ اور میں نے خو بنانے کو اس لئے کہا کہ محض ایک دو دفعہ بھی سرسری طور پر صرف زبان سے ان کلمات کے کہہ لینے سے کشود کار نہیں ہوگا اس لئے کہ ان کی حیثیت تلاوت قرآن کی سی نہیں ہے کہ آپ بدون فہم معنی ان کلمات کو زبان پر جاری فرمالیں اور آپ کو ثواب مل جائے یا ایمان میں ترقی ہو جائے بلکہ ان کی حیثیت دعا اور درخواست کی ہے اس کے مضمون کو سمجھ کر اور حق تعالیٰ کے سامنے سراپا احتیاج عاجز اور ذلیل بن کر بندہ کو پیش کرنا چاہئے اور یہ مقام جب ہی حاصل ہوگا کہ آپ حق تعالیٰ کی عظمت اور قدرت اور عنایت کو پیش نظر رکھ کر ان سے اپنی حاجات کو طلب کریں اور برابر طلب کرتے رہیں یہاں تک کہ خدمت شاہ میں عرض حال اپنی خو بن جائے کیونکہ جب وہ

دیکھ لیں گے کہ اُس نے اپنے کو میرے آگے گرادیا ہے اور مجھے ہی اپنا حاجت روا اور ملجا اور ماویٰ سمجھتا ہے اور میرے علاوہ کسی دوسرے پر اُس کی نظر نہیں رہ گئی ہے تو وہ بھی متوجہ ہو جائیں گے اور جب انھیں کی توجہ ہو جائے گی تب ہی کام بنے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا یعنی اللہ تعالیٰ نے پھر ان کے حال پر توجہ فرمائی تاکہ وہ آئندہ بھی رجوع رہا کریں اس سے معلوم ہوا کہ توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہوتی ہے بندہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ تقدس کی جانب رجوع ہو لیکن کام جو بنتا ہے تو اسی وقت جب کہ اُدھر سے توجہ ہو جائے۔

اسی مضمون کو شیخ سعدیؒ نے نہایت ہی عمدہ ادا کیا ہے فرماتے ہیں کہ:۔ ؎

چہ خوش گفت درویش کوتاہ دست کہ شب توبہ کرد و سحر گہ شکست

گر او توبہ بخشد بماند درست کہ پیمانِ ما بے ثبات است و سُست

یعنی اس عاجز درویش نے کیا خوب بات کہی جو کہ رات کو توبہ کرتا تھا اور بوقت سحر وہ ٹوٹ جاتی تھی اس نے یہ کہا کہ (یہ ہماری توبہ اس لئے ٹوٹ جاتی ہے کہ) جس طرح ہم ضعیف و ناتواں ہیں ہمارا عہد و پیماں بھی سُست اور بے ثبات ہے ہاں جب حق تعالیٰ ہی توبہ کی توفیق عطا فرمائیں اور اُسکو قبول فرمائیں اور ہمارے حالِ زار پر توجہ فرمائیں تو چونکہ وہ قوی اور باقی ہیں اس لئے ان کی عطا فرمائی ہوئی توبہ بھی درست اور پائیدار ہوگی اسی لئے میں نے کہا کہ ان ادعیہ کو سالکین کو دل سے مانگنا اور اس پر دوام رکھنا اور غایت تضرع اور الحاح کے ساتھ درگاہ واہب العطیات میں اپنی حاجات کو پیش کرنا یہی راہ ہے اور یہ اس لئے کہ آپ نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے اسی طرح سوال فرمایا ہے چنانچہ جب آپ کا یہ عمل تھا تو پھر تو یہ طریقہ مسنون ہو گیا لہٰذا سالکین راہ کے لئے بھی یہ ضروری ہو گیا کہ وہ اگر کسی عمل صالح کو کرنا چاہتے ہیں یا کسی سئیہ اور رذیلہ سے بچنا چاہتے ہیں تو وہ بھی یہی طریقہ استعمال کریں۔

پس مشائخ کو چاہئے کہ اپنے پاس آنے جانے والوں کو یہی وظیفہ مسنونہ بتائیں اس لئے کہ میں تو بصیرت کے ساتھ اس کو سمجھ چکا ہوں کہ اس دور ضلالت میں اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی سے مفر نہیں ہے اس لئے کہ سعادت حقیقیہ کی تحصیل اتباعِ سنت ہی کے ساتھ وابستہ ہے اور فلاح دارین کا حصول طریق نبوی میں منحصر ہے۔

میں بزرگانِ دین کے اس قسم کے ارشادات سُنتا تھا مثلاً شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

مپندار سعدیؔ کہ راہ صفا
تواں رفت جز بر پئے مصطفےٰ

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

کسانیکہ زیں راہ بر گشتہ اند
بر فتند و بسیار سر گشتہ اند

دریں بحر جز مرد داعی نہ رفت
گم آں شد کہ دنبالِ راعی نہ رفت

فرماتے ہیں کہ اے سعدی یہ نہ سمجھنا کہ راہ صفا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلے بغیر طے کی جا سکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کے خلاف اگر کوئی شخص راستہ اختیار کرے گا تو اُس کی رسائی کبھی بھی منزل تک نہ ہو سکے گی جو لوگ اس راستے بھٹکے ہیں وہ گمراہی میں بڑھتے ہی چلے گئے ہیں اور آخر کار بہت ہی زیادہ حیران و پریشان ہوئے ہیں یہ اس لئے کہ اس بحر میں سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی چلا نہیں آپ ہی چلے ہیں اس لئے آپ کا اتباع ضروری ہے۔ جو شخص اتباع سنت نہیں کرے گا وہ گمراہ ہو گا جس طرح ہے کہ وہ بھیڑ بکری جو چرواہے کے پیچھے پیچھے نہ چلے تو راستہ بھٹک کر لقمہ گرگ ہو جاتی ہے یا مثلاً حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ ؎

ہر کہ در راہِ محمد رہ نیافت تا ابد گردے ازیں درگہ نیافت

یعنی جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کو اپنا راستہ نہیں بنایا اس نے بارگاہِ خداوندی کے راستہ کی گرد کو بھی نہیں پایا۔

تو میں بزرگوں کے اِن ارشادات کو اتباع باطنی نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کی ترغیب میں پڑھا کرتا تھا اور خوش ہوتا تھا (اس لئے کہ دیکھتا تھا کہ لوگ اِن اشعار کو سن کر خوب جھومتے ہیں تو خیال ہوتا تھا کہ اس کو سمجھتے بھی ہوں گے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ جسے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ پئے مصطفےٰ رفتن اور راہِ صفا اور رہ پیمبر اور حضرت شیخ قدس اللہ سرہٗ راہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں اور جس کے اتباع کو ضروری قرار دے رہے ہیں لوگوں کے قلوب میں اس کا صحیح خطور بھی شاید نہ ہوا ہو)۔

اب اس قسم کی حدیث سے جو کہ برابر معمول ہے یہ سمجھ میں آیا کہ سالکین کا ایسی حدیثوں کو اپنا معمول بنانا (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ادعیہ سے تمسک کرنا اور زبان سے ان کے الفاظ کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ عمل اور اپنا حال بھی اسی کے مطابق بنانا) یہی وہ پیروی باطنی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس کو یہ حضرات مشائخ فرما رہے ہیں۔

یہاں ایک بات اور کہتا ہوں اور وہ یہ کہ اِهْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَالْاَخْلَاقِ پر دعا کا مضمون ختم ہوگیا تھا مگر آپ نے یہ جو فرمایا کہ لَا یَهْدِیْ لِصَالِحِهَا وَلَا یَصْرِفُ سَیِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ اس میں آپ نے توحید کی تعلیم فرمائی جس کی تعریف امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ یوں فرماتے ہیں کہ:۔

"هو ان یری الاشیاء کلها من الله تعالیٰ رؤیة تقطع الالتفات الی الاسباب"۔

یعنی توحید یہ ہے کہ انسان اپنے تمام امور کو خدا تعالیٰ کی جانب سے دیکھے اس طرح سے کہ اسباب کی جانب اصلاً التفات نہ رہ جائے اور اس کا نفع یہاں یہ ہے کہ انسان اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ اختیار کرنیکے بعد جب یہ بھی سمجھے گا کہ اس کی توفیق خدا نے دی ہے۔ بدون اس کی توفیق کے نہ ہم کوئی عمل کر سکتے ہیں اور نہ اپنا خلق سنوار سکتے ہیں تو پھر اُسے اللہ تعالیٰ کی ایک گونہ معرفت حاصل ہو جائے گی اور عُجب سے وہ محفوظ رہے گا۔

سُبحان اللہ کیا پاکیزہ تعلیم ہے۔ اگر اسی ایک دُعا کا مضمون ہمارے قلوب میں راسخ ہو جائے تو پھر انشاء اللہ تعالیٰ عُجب کا حسن اور ہمارے اعمال صالحہ اور اخلاق ہو جائیں اور قرب الٰہی کا ذریعہ بن جائیں۔

اسی مضمون کو جو اس حدیث میں ہے صوفیہ کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ اس کا اوّل حصہ یعنی اللهم اغفرلی واهدنی وارزقنی واهدنی لصالح الاعمال الاخلاق یہ تو سلوک ہے اور اس کا آخری حصہ یعنی انه لا یهدی لصالحها ولا یصرف سیئها الا انت یہ جذب ہے۔ چنانچہ سلوک کے بعد جب تک ادھر سے جذب نہ ہو وصول نہیں ہوتا۔ تاہم جذب تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن سلوک تو ہمارے اختیار میں ہے۔ جس کا طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ان ادعیہ کے ذریعہ اُمت کو بتایا اور وہ یہی ہے کہ طاعت اور عبادت بھی کریں لیکن نہ سمجھیں کہ ہم اپنی قوت بازو سے خدا تک پہنچ جائیں گے بلکہ اُن کے آگے تو سپر ہی ڈال دیں اور صالح اعمال و اخلاق کی توفیق اور ان کی جانب ہدایت بھی انھیں سے طلب کریں۔

(اصلی کام)

(بہ تحریر خاص)

اصل کام یہ ہے کہ اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحیح و درست کیا جائے [اور اسکو نسبت کہا جاتا ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہے جس کے متعلق صاحب فتح الباری فرماتے ہیں کہ یہ فرض ہے۔

محبة الله على قسمين فرض وندب فالفرض المحبة التي تبعث على امتثال اوامره والانتهاء عن معاصيه والرضا بما يقدره فمن وقع في معصية من فعل محرم او ترك واجب فلتقصيره في محبة الله حيث قدم هوى نفسه عليه (فتح الباری ج۱ ص۲۶)

اللہ تعالیٰ کی محبت کے دو درجے ہیں فرض اور مستحب، فرض وہ محبت ہے جو اللہ تعالیٰ کے اوامر کو بجا لانے اور معاصی سے بچنے اور اسکی تقدیر پر راضی رہنے کا محرک اور باعث بنے چنانچہ جو شخص کسی حرام میں مبتلا ہوتا ہے یا کسی واجب کو ترک کرتا ہے تو یہ صرف اللہ تعالیٰ کی محبت میں تقصیر کی وجہ سے (یعنی یا تو اللہ تعالیٰ کی محبت سے بالکل خالی ہوتا ہے یا محبت کی اس میں کمی ہوتی ہے) اسی لئے تو اپنی خواہش کو احکام خداوندی پر مقدم کرتا ہے۔

اور چونکہ یہ محبت حاصل ہوتی ہے بزرگان دین کی صحبت سے اسی لئے ان حضرات سے تعلق پیدا کیا جاتا ہے اور ان کے یہاں آیا جاتا ہے۔ (از ناقل]

اور یہ (یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صحیح کرنا جب ہی ہو سکتا ہے کہ اس کے سب احکام کی پیروی کی جائے اور اس میں یہ بھی داخل ہے کہ بلوغ کے بعد سے جو احکام فوت ہوئے ہوں ایک ایک کرکے انکو ادا کیا جائے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ ان احکام کا علم ہو لہذا علم کی تحصیل لازمی ٹھہری پس خلاصہ طریق کا علم و عمل ہے۔

فرمایا کہ اس زمانہ میں تصوف کے انکار اور اس میں داخل ہونے والوں کے عدم نفع سب کا سبب جہل ہے۔ یہ مضمون ہر شخص اپنے پاس نقل کرکے رکھے اور اس کی کثرت سے اشاعت کی جائے۔

۷ ربیع الثانی ۱۳۸۶ھ تال نرجا

خوفِ آخرت

از افاضات

مصلح الاُمّت حضرت مولانا وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہٗ

خَوفِ آخِرَت[عہ]

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّي عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ

فرمایا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام امت کے مقتدا اور پیشوا ہیں۔ ان حضرات کے اقوال و افعال و احوال امت کے لئے سند اور دلیل اور نمونہ ہیں اس لئے کہ ہم کو ان حضرات کی اقتداء اور تاسی کا حکم ہے۔ چنانچہ جس طرح ہم اور تمام معاملات میں انبیاء علیہم السلام کی اتباع کو ضروری سمجھتے ہیں اسی طرح آخرت سے متعلق جو احوال ان حضرات کے تھے ہمارے لئے اس میں بھی پیروی ضروری ہے اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے احوال کو کوئی امتی پہونچ نہیں سکتا تاہم اپنے کو ان احوال سے متصف کرنا اور ان حضرات کے احوال کو اپنا نصب العین بنانا ہمارے لئے ضروری ہے۔ آج جو گمراہی ہو گئی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگوں نے آخرت سے متعلق احوال میں انبیاء علیہم السلام کی سیرت سے قطع نظر کر لیا ہے۔ نہ عوام ہی جانتے ہیں نہ علماء ہی ان کو بتلاتے ہیں حالانکہ خوف و رجا اور جنت اور دوزخ کے حالات کا علم بنیادی چیزیں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب اصولی اور بنیادی چیزوں کا علم رخصت ہو جائے گا تو گمراہی تو عام ہو ہی جائے گی۔ گمراہی کو دور کرنے کے لئے ہی تو انبیاء علیہم السلام تشریف لائے تھے۔ پس جس شعبہ میں ان کی سیرت کو ترک کیا جائے گا وہ شعبہ فاسد ہو جائے گا

سنیئے:- اللہ تعالیٰ کا خوف یعنی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا خوف، اللہ تعالیٰ کے غضب کا خوف، اس کے دوزخ اور اس کے عذاب کا خوف، یہ خوف ہر زمانہ میں

[عہ] مورخہ ۴ صفر ۱۳۸۶ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۹۶۶ء یوم چہارشنبہ۔ بمقام کراچی بمبئی نمٹ سلیمان کمتری بلڈنگ

شعار عباد اللہ الصالحین رہا ہے۔جس سے مراد انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیرو اور تمام اولیاء کرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا خوف ان سب حضرات کا شعار رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں" یَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ" یعنی اللہ تعالیٰ کے جو خاص بندے ہیں ان کا حال بیان فرماتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ اسی طرح ایک جگہ پہلے کفار کا حال بیان فرمایا کہ آخرت میں پہونچ کر تو یہ لوگ بھی اعتراف ذنب (گناہوں کا اقرار) کرینگے لیکن اس سے کیا نفع ؟ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ، لیکن مؤمن کے بارے میں فرمایا کہ ان کی مغفرت ہوگی اس لئے کہ یہ اپنے رب سے غائبانہ ڈرتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ۔

اس سے معلوم ہوا کہ کام آنے والی چیز آخرت کا وہ خوف ہے جو دنیا میں ہو۔چنانچہ مومنین کے وصف میں" یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" فرمایا گیا ہے یعنی اللہ اور آخرت پہ غائبانہ طور سے ایمان لاتے ہیں۔ آنکھوں سے نہیں دیکھا مگر دل سے تصدیق کرتے ہیں۔چنانچہ ایک دوسرے مقام پر" یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ" بھی فرمایا ہے۔پس جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس شدّ ومد کے ساتھ بیان کیا ہے یہ لوگ اس سے کیوں نہ خوف کریں گے۔ انبیاء علیہم السلام نے سب سے زیادہ خوف کیا ہے اس لئے کہ یہ خوف ایمان کی فرع ہے۔جس درجہ ایمان ہوگا اسی درجہ خوف ہوگا۔اور انبیاء علیہم السلام کے ایمان کا کہنا ہی کیا اس لئے ان کا خوف بھی سب سے زیادہ ہوا پھر اس کے بعد حضرات صحابہ کا خوف تھا اور اسی طرح اس کے بعد اولیاء اللہ کا جس پر ان کے اقوال واحوال شاہد ہیں۔

سب سے پہلے خاتم الانبیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خوف کا نمونہ پیش کرتا ہوں۔ سنئے۔ فرماتے ہیں :۔

اَسْئَلُكَ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِیْ	مانگتا ہوں میں تجھ سے بحق تیرے اس نور ذات
اَشْرَقَتْ لَهُ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ	کے کہ اس سے روشن ہیں سب آسمان وزمین

وَبِكُلِّ حَقٍّ هُوَ لَكَ وَبِحَقِّ السَّائِلِيْنَ عَلَيْكَ اَنْ تُقِيْلَنِيْ وَاَنْ تُجِيْرَنِيْ مِنَ النَّارِ بِقُدْرَتِكَ

اور صدقہ ہر اس حق کا جو تیرا ہے اور بذریعہ اس حق کے جو مانگنے والوں کا تجھ پر ہے یہ کہ درگذر کرے تو مجھ سے اور یہ کہ پناہ دے تو مجھے دوزخ سے اپنی قدرت سے

اسی طرح اپنی ایک اور دعا میں فرماتے ہیں کہ

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا اُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ

یا اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیری رضا کے ساتھ تیری ناخوشی سے اور تیرے عفو کے ساتھ تیری سزا سے ۔ اور پناہ چاہتا ہوں تیری تجھ سے نہیں کر سکتا ہوں میں تیری تعریف تو اسی تعریف کے لائق ہے کہ خود کی ہے تو نے اپنی ذات کی۔

اسی طرح ایک اور دعا تعوذ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

اَعُوْذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيْمِ الَّذِيْ اَضَاءَتْ لَهُ السَّمٰوٰتُ وَاَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ وَصَلَحَ عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اَنْ تُحِلَّ عَلَيَّ غَضَبَكَ وَتُنْزِلَ عَلَيَّ سَخَطَكَ وَلَكَ الْعُتْبٰى حَتّٰى تَرْضٰى وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ

پناہ چاہتا ہوں تیری ذات گرامی کے نور کی جس سے روشن ہیں آسمان اور چمک رہی ہیں اس سے ظلمتیں اور درست ہیں اس سے کام دنیا اور آخرت کے اس سے کہ اتارے تو مجھ پر اپنا غصہ اور نازل کرے تو مجھ پر ناخوشی اپنی ۔ اور تیرا ہی حق ہے تجھ کو منایا جانا یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے ۔ اور نہیں ہے پھیرنا گناہ سے اور طاقت عبادت کی مگر تیری مدد سے

غرض احادیث اس قسم کی دعاؤں سے پُر ہیں ان سے اللہ تعالیٰ کی خشیت کا جو آپ کے قلب اطہر میں تھی کچھ سُراغ لگتا ہے ۔ اسی طرح سے ایک اور اولو العزم پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سنئے ۔ فرماتے ہیں :۔

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝

وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ ۝ وَاغْفِرْ لِاَبِیْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ ۝ وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ۝ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۝

(ترجمہ) اے میرے پروردگار مجھکو حکمت عطا فرما اور مجھکو نیک لوگوں کے ساتھ شامل فرما۔ اور میرا ذکر آئندہ آنے والوں میں جاری رکھ۔ اور مجھکو جنت النعیم کے مستحقین میں سے کر۔ اور میرے باپ کی مغفرت فرما کہ وہ گمراہ لوگوں میں ہے۔ اور جس روز سب زندہ ہوکر اٹھیں گے اس روز مجھکو رسوا نہ کرنا۔ جس دن کہ نہ مال کام آویگا اور نہ اولاد ہاں جو اللہ کے پاس پاک دل لیکر آوے گا۔

دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے جنت کا کس طرح سے سوال کیا کہ یا اللہ تو مجھے اس کے وارثوں میں سے بنا دے اور کس طرح دوزخ سے پناہ مانگی فرمایا کہ اُس دن کی رُسوائی سے بچائیو جس دن مال اور اولاد کچھ کام نہ آئیں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد نبوت آپ ہی کے خاندان میں محصور ہو گئی تھی جو نبی بھی آئے آپ ہی کے خاندان سے آئے تو جب اپنے مورثِ اعلیٰ کو اِن حضرات نے اس طریقے پر پایا تو پھر سب نے اسی کو اپنا شعار بنا لیا جس طرح کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح سے آخرت کا خوف کرتے دیکھا تو امت محمدیہ کے صالحین نے بھی اس کو اپنا شعار بنا لیا۔

امام اعظمؒ (امام ابوحنیفہ) نے ایک بار عشاء کی نماز پڑھی۔ امام نے سورۂ زلزلت پڑھی جس کے آخر میں ہے: فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ۝ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص دنیا میں ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ آخرت میں اسے دیکھ لے گا، اسی طرح جو شخص ذرہ برابر بُرائی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔ نماز ختم ہونے پر سب لوگ تو گھر چلے گئے لیکن امام صاحبؒ عشاء کے بعد سے لے کر صبح تک انھیں آیتوں کو دُہراتے رہے اور اپنی داڑھی کو پکڑ کر روتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ اے وہ ذات جو ذرّہ برابر نیکی کا بدلہ نیکی سے دے گی اور ذرّہ برابر بدی کا بدلہ سزا اور عذاب دے گی یہ بھی میرا ایک چھوٹا سا عمل ہے کہ میں شب کی تنہائیوں میں

تجھ سے رُو رُو کر فریاد کر رہا ہوں کہ میرے اس عمل کو بھی قبول فرما لیجئے اور اپنے عبد نعمان کو دوزخ سے نجات دیجئے۔ انھیں امام کا دوسرا واقعہ ہے کہ دوزخ کے خوف سے رات بھر روتے تھے اور زار وقطار روتے تھے۔ رونے کی آواز کی وجہ سے پڑوسی جاگ جاتے تھے اور انھیں رحم آجاتا تھا اور وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے کہ یا اللہ ان کے دل میں اطمینان ڈال دیجئے تاکہ یہ اتنا نہ رویا کریں۔

دیکھا آپ نے امام صاحب مسئلہ مسائل کے تو امام ہی ہیں۔ ان کے اندر یہ چیزیں بھی تھیں۔ ایک عالم سے لوگوں نے پوچھا کہ مزاج کیسا ہے؟ انھوں نے اس کے جواب میں ایسی عمدہ بات کہی کہ میں نے جب اس کو سُنا تو یاد ہی کر لیا انھوں نے کہا مؤمن کا مزاج کیا پوچھتے ہو اس کا کیا مزاج ہے۔ مؤمن تو دنیا میں بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ رہتا ہے کچھ خبر نہیں کہ کس کروٹ اونٹ بیٹھے گا۔ جب قیامت میں اللہ تعالیٰ کے رضا کی خبر سُن لیں گے تب مزاج کا حال بتائیں گے۔

آپ سے کہتا ہوں کہ کیا بات اثر لینے کی نہیں ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور بزرگوں کے حالات لوگوں کو سُناؤ کیوں اثر نہ ہوگا ضرور اثر ہوگا۔ قرآن وحدیث دنیا میں اثر ہی لینے کے لئے ہے اور اس میں اللہ و رسول نے جنت اور دوزخ کا جو تذکرہ کیا ہے لوگوں نے اس سے اثر لیا ہے۔ باقی کسی چیز کو معطل چھوڑ دیا جائے گا تو وہ فاسد ہو ہی جائے گی جس طرح کہ آج لوگوں نے آخرت کے احوال کو اور قیامت کے احوال کو پیش نظر رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ ترغیب اور ترہیب کے مضامین سے اثر لینا ترک کر دیا ہے تو دینی تباہی میں پڑ گئے۔ اس لئے کہ دین اصل میں نام ہے قلب کی حیات اور بیداری کا اور وہ ہوتی ہے فکر آخرت سے یہی وجہ ہے کہ ظاہر دین یعنی نماز، روزہ، وعظ وجلسہ مکتب و مدرسہ سب کچھ موجود ہے اور پہلے سے زیادہ موجود ہے لیکن اہل احساس سمجھ رہے ہیں کہ ان میں جان نہیں ہے صرف دین کی صورت موجود ہے روح ختم ہو چکی ہے۔ اسی کو کہہ رہا ہوں کہ کام صرف ظاہر سے نہیں ہوگا بلکہ قلب میں حیات کو پیدا کرنا ہوگا اور یہ چیز پیدا ہوگی خوف اور رجاء سے اور خوف ورجا قلب میں آئے گا اہل خوف اور اہل رجاء کے حالات اور افعال پیش نظر رکھنے سے۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ایک بزرگ نے کچھ لڑکوں کو اِدھر اُدھر ہنستے ہوئے پھرتے دیکھا تو فرمایا کہ ان کو دیکھو ابھی موت باقی ہے، پل صراط باقی ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا باقی ہے، اور یہ لوگ ہنس رہے ہیں۔ میں نے جب یہ واقعہ حضرتؒ سے سُنا تو اپنے دل میں کہا کہ ہم نے مدرسہ میں بھی ان چیزوں کو پڑھا تھا لیکن جب حضرتؒ سے اس طریقہ سے سُنا تب ان پر ایمان لانے کی حقیقت سمجھ میں آئی۔ بات یہ ہے کہ خوف و رجا، خشیت و محبت یہ سب قلب کی صفات ہیں یعنی ان کا محل قلب ہے لسان کی صفت نہیں۔ لہٰذا ان کی حقیقت اسی وقت سمجھ میں آتی ہے جب قول کے ساتھ ساتھ قلب کا حال بھی شامل ہو جائے۔ اسی کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ صرف تقریر سے کام نہیں چلے گا بلکہ قلب میں داعیہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے کسی کی جوتیاں سیدھی کرنی ہوں گی۔ خود سمجھ لو کہ جب آج قرآن موجود ہے، حدیث موجود ہے مگر گمراہی ویسی ہی ہے تو اب سمجھنا ہی پڑے گا کہ کیا بات ہے۔ اور وہ بات یہی ہے کہ قلبی داعیہ ہمارے اندر سے گم ہو گیا ہے اوپر اوپر کی چیزیں رہ گئی ہیں اور جو ان سب کی اصل ہے اس کو ہم نے چھوڑ دیا ہے۔ آخرت کا خوف ذرا سا بھی پیدا ہو جائے تو سب کچھ کرا دے گا۔ آخرت بہت بڑی چیز ہے بس وہاں کا ثواب بھی بڑا ہے جس کے دل میں آخرت آ گئی بس دُنیا غائب غُلّہ ہو گئی۔ پھر جو کام اور لوگ نہیں کر سکتے یہ شخص کرے گا۔ کیونکہ کسی کام کا محرک اس کا داعیہ ہی ہوا کرتا ہے۔ ؎

ناصحا منع بردنت چہ اثر خواہد داد
اندرون دل من ولولہ فرمائے ہست

اے ناصح تیرا ظاہری طور پر منع کرنا بھلا کیا اثر کر سکتا ہے جبکہ میرے دل کے اندر ایک ولولہ فرما موجود ہے۔

اللہ کے نیک بندوں نے اس زمانے میں بھی یہ داعیہ، ولولہ اور خوفِ آخرت پیدا کیا ہے۔ تھانہ بھون میں ایک مرتبہ حضرتؒ نماز پڑھ کر مسجد سے باہر تشریف لائے ابھی کچھ لوگ اندر نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ اندر سے کسی صاحب کے رونے کی آواز آئی وہ کچھ ایسے زور سے روئے کہ حضرت پر بھی ان کے رونے کا اثر پڑ گیا

دریافت فرمایا کون صاحب ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت شاہ صاحب ہیں۔ فرمایا ان کو یہاں بلا دیجئے۔ جب وہ آئے تو حضرت نے اُن سے پوچھا کہ شاہ صاحب کیا بات ہے کیوں روئے۔ کہا دوزخ کے خوف سے۔ حضرت نے انھیں بٹھا یا اور گلاس میں پانی منگوایا اور اس کو دم کر کے فرمایا کہ لیجئے اس کو پی لیجئے معلوم نہیں کہ کیا پڑھ کر پھونک دیا کہ پیتے ہی سکون ہو گیا۔ یہ شاہ صاحب حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ کے مرید تھے۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ میں نے آخرت کا اور دوزخ کا ایسا خوف تو اس زمانہ میں دیکھا نہیں۔

ان تمام واقعات کے پیش کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ کام اس زمانہ میں بھی ہوگا مسلمانوں کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن طریقہ سے۔ کوئی کیسا ہی بدعمل مسلمان ہو اس کا ایمان اللہ پر رسول پر قرآن و حدیث پر تو ہوتا ہی ہے۔ اسی طرح سے مشائخ کو بھی لوگ بحمد اللہ کم نہیں مانتے۔ آپ ان کے سامنے کتاب و سنت سے اسی قسم کے مضامین بیان کریں اور بزرگانِ دین کے خوفِ آخرت سے متعلق واقعات بیان کریں اور پہلے خود اُن سے متاثر ہو کر بیان کریں تو ان کی مجال ہے کہ اثر قبول نہ کریں۔

فیض رحمانی کے نزول کا ذریعہ

واقعات شرعیہ اور نوازل حادثہ کی تحقیق میں اول اور ادلیٰ چیز جس سے فیض رحمانی کا نزول کیا جا سکتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت اور تمسک بحبل التقویٰ ہے قال اللہ تعالیٰ اتقوا ویعلمکم اللہ اور جو شخص اپنے فہم و ذہن پر اس کے تحقیق میں اعتماد کرے حالانکہ وہ معاصی میں ہے تو وہ مستحق خذلان ہے یعنی اس کے لئے نزول فیض رحمانی نہ ہوگا اس لئے کہ ——— اس نے ایسی چیز پر اعتماد کیا جس پر اعتماد روا نہیں اس لئے وہ اس آیت کا مصداق ہوگا اللہ تعالیٰ نے جس کو نور نہیں عطا فرمایا اس کو کیسے نور ملے۔ (وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ)

ایقاظ الافکار بذکر الجنۃ والنار

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

دیکھا جاتا ہے کہ آج مدارس کی کمی نہیں ہے گاؤں گاؤں مدرسے کھلے ہیں ہر ہر بستی میں اہل علم موجود ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ علم عام ہوتا عمل عام ہوتا لوگوں کے دینی اور دنیوی حالات درست ہوتے لیکن باوجود اس کے لوگوں میں دین کا نام نہیں ہے۔ کوئی بستی ٹھیک نہیں ہے یہی نہیں کہ دین درست نہیں، دنیا بھی برباد ہی ہے اور عام حالات یہی ہے اور یہ حالت روز بروز بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔

میری سمجھ میں اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ اول تو ایسے مصلحین جو کتاب وسنت پر قوم کے حالات مطابق کرنے کی اہلیت اور فکر رکھتے ہوں نہیں ہیں۔ اور جس میں یہ بات ہوتی ہے وہی جانتا ہے کہ قوم کتنی اپنی مرکز سے ہٹی ہوئی ہے اور ان کو کتنا بُعد اپنے مرکز سے ہوگیا ہے، اور ان کو کس طرح سے مرکز کے قریب کیا جاسکتا ہے اور یہ کام کتنا دشوار ہے اور اس میں کس قدر اہمیت ہے اور اس میں صرف علم کی ضرورت ہے یا عمل کی بھی اور اگر عمل کی ضرورت ہے تو صرف ظاہری یا باطنی بھی اور اگر باطنی بھی درکار ہے تو ناقص یا کامل یہ چیزیں اہلیت ہی سے معلوم ہوسکتی ہیں ورنہ صرف صوری وظاہری نماز روزہ کو لوگ دین سمجھتے ہیں اور ہر ایک کے پاس دین کی ایک ناتمام حقیقت موجود ہوتی ہے جس کو وہ کُل دین سمجھتا ہے پس ان کی مثال بالکل ویسے ہی ہے جیسے اندھوں کے پاس کوئی ہاتھی آگیا تھا جس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے سب اپنی اپنی تحقیق بگھاری جس کا ہاتھ اس کی دُم پر پڑا اس نے کہا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے مورچھل اور دوسرے نے اس کے کان ٹٹول کر کہا کہ نہیں ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے سوپ (چھاج) اور جس نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اس نے کہا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے تخت اور ایک نے اس کے پیر پکڑ پائے تو کہا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے کھمبا تو دیکھئے اندھاپن بھی کتنی بری بلا ہے کہ اتنا بڑا صحیح وسالم ہاتھی کتنے ناتمام جزؤں میں تقسیم ہوگیا۔

اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

اشتباہ از دیدہ بینا نہ بود   نیک و بد در دید شاں یکساں نبود

ہمسری با انبیاء بر داشتند اولیاء را ہمچوں خود پنداشتند

(ترجمہ) یعنی اشقیاء کے لئے چشم بینا نہیں تھی اس لئے نیک وبد دونوں انکی نگاہوں میں یکساں معلوم ہوتے تھے، چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ برابری کا دعوی کرتے تھے۔ اور اولیاء کو اپنی ہی طرح سمجھتے تھے پس جس طرح ان اندھوں نے ہاتھی کے صرف ایک عضو کو لیا اور اسی پر کل کا حکم لگادیا جو صحیح نہ تھا اسی طرح آج دین کے بارے میں لوگوں کا حال ہے کہ اسکی حقیقت سے تو ہیں ناآشنا اور بعض ظاہری چیزوں کو لے کر اسی کو کل دین سمجھتے ہیں اور جو اصلی دین کی راہ دکھاتے ہیں ان کی نہیں سنتے بلکہ ان کی مخالفت پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اس کا سبب ان کا اصلی راہ کو چھوڑ دینا ہوتا ہے اور اپنی بداعمالیوں اور قلبی امراض میں ابتلا اور انہماک سبب بنتا ہے اصلی راہ کو چھوڑنے کا اور جب اصلی راہ کو چھوڑ چکے ہیں تو اس کے بعد پھر صحیح راہ پر لگنا اور حقیقی دین اختیار کرنا ان کے لئے نہایت دشوار ہوتا ہے اور صرف یہی نہیں کہ اس پر آنا نہیں چاہتے بلکہ جو لوگ ان کے سامنے دین پیش کرتے ہیں تو ان سے انھیں نفرت اور ان کی باتوں سے وحشت ہونے لگتی ہے اور اس کے مصداق ہوجاتے ہیں ؎

ناصحا مت کر نصیحت دل مرا گھبرائے ہے میں اُسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

اصلی راہ دکھانیوالے چونکہ کم ہیں اس لئے یہ گمراہی بڑھتی جارہی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کہیں کوئی کہیں اللہ کا بندہ کچھ کام کرنیوالا ہوا بھی تو عوام کو ان کا جہل ان کی تعلیم کے اثر کو قبول کرنے سے مانع ہوتا ہے یہ اپنے جہل کو مرض ہی نہیں سمجھتے اور اس کو دور کرنا ہی نہیں چاہتے۔ جیسے عالم علم کو کمال سمجھتا ہے۔ یہ جہل کو کمال سمجھتے ہیں اور اپنے جہل میں عناد تک پہونچ جاتے ہیں اور ارباب جہل وعناد کی تقلید فطرت کو فاسد کردیتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی اہل کے کہنے کے مطابق راستہ نہیں چلتا تو قوم کے جو سردار ہوتے ہیں جو اپنے ہوائے نفسانی کی پیروی کرتے ہیں اور احکام الٰہی کی بالکل پرواہ نہیں کرتے ان کے چھوٹے انکی تقلید کرتے ہیں چھوٹے اور بڑے دونوں فاسد الاخلاق اور فاسد الطبیعۃ ہوجاتے ہیں اس حالت پر پہونچ کر علماء کا کہنا کیسے سن سکتے ہیں اصلاح بالکل ختم ہوجاتی ہے اس جہل کے نتائج اور ثمرات میں سے یہ ہے کہ آج جاہلوں میں کبر استنکاف اور عار وغیرہ وہ تمام امراض پیدا ہوگئے ہیں جو کسی زمانہ میں کفار کے اندر موجود تھے اور جس طرح سے انھوں نے اپنی انھیں بداخلاقیوں کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ اور ان کا انکار کیا اسی طرح جہلا بھی انھیں صفات بد کی وجہ سے عالم دین اور عالم شریعت کا مقابلہ کرتے

ہیں اور حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ ہے اور یہ سمجھتے بھی نہیں کہ ہم یہاں تک پہونچ گئے ہیں کیا اس حالت میں ایمان سالم ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ غلط ہے؟ کیا آج مسلمانوں کے عوام میں یہ چیزیں موجود نہیں ہیں؟ اور کیا یہ بات ٹھکرا دینے کی ہے؟ اور اس آواز پر التفات نہ کرنا انصاف و دیانت ہے۔

میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ اس کا سبب ان کا اصلی راہ کو چھوڑ دینا ہوتا ہے اور اپنی بداعمالیوں اور قلبی امراض میں ابتلا اور انہماک سبب ہوا اصلی راہ چھوڑنے کا۔

ان بداعمالیوں اور قلبی امراض میں سے حُبّ دنیا کا استیلاء قلوب پر اس طرح ہے کہ اس میں دوسرے کی گنجائش بھی باقی نہ رہے یہ بھی داخل ہے محبت کی یہ خاصیت ہے کہ اس میں محبوب کے علاوہ دوسرے کی گنجائش باقی نہیں رہجاتی جس کو ذرا البصیرت سے حصہ ملا ہے وہ ان کے حالات میں غور کر کے یہ سمجھ سکتا ہے کہ اسی حُبّ دنیا کے استیلاء نے ان کو آخرت سے بالکل بیگانہ بنا دیا ہے کہ اس کی ان کے قلوب میں گنجائش ہی باقی نہیں رہی ان میں یہ ہمت نہیں رہگئی کہ دنیا کے ساتھ آخرت کا تعلق باقی رکھ سکیں اس قدر دنی الہمت و پست حوصلہ ہو گئے ہیں۔

یہ عالی ہمتی کی بات ہے کہ دنیا کے ساتھ آخرت کا تعلق بھی باقی و قائم رکھا جائے اور اس کے حقوق میں کسی قسم کی کمی نہ ہونے دیجائے کہ عظیم کے سامنے حقیر کی حیثیت ہی کیا ہے اس کا مقتضا یہ تھا کہ دنیا کا گذر ہی ان کے دل میں نہ ہوتا کہ آخرت کریم ہے اور دنیا لئیم آخرت اس دل میں آنا نہیں چاہتی جس میں دنیا ہو کیونکہ یہ کریم ہے اور کریم لئیم کے یہاں نہیں جاتا۔ یہ بزرگوں کا ارشاد ہے۔ آخرت باقی ہے اور دائم ہے اور دنیا فانی اور زائل ہے۔ فانی اور باقی میں نسبت ہی کیا ہے؟ ان میں تو ایسی نسبت بھی نہیں ہے کہ دریا میں سوئی ڈالنے سے اس میں پانی کا جو قطرہ لگ جائے اس کو جو نسبت دریا کے ساتھ ہے دنیا کو آخرت کے ساتھ یہ نسبت بھی نہیں کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی اور قطرہ و سمندر دونوں کے دونوں فانی ہیں اور فانی کو فانی کے ساتھ تو کچھ نسبت ہوتی بھی ہے اور یہاں ایک فانی ہے اور دوسری باقی اس لئے یہاں تو وہ نسبت بھی نہیں اور جب یہ نسبت نہیں ہے تو یہ کہا جائے گا کہ یہاں موجود اور معدوم کی نسبت ہے یعنی ایک موجود دوسری معدوم۔

اب کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس نسبت کو نہ سمجھا جائے۔ ایک تو دنیا قلیل پھر اس کی عمر کے

مقابلہ میں آدمی کی عمر اقل قلیل۔ لہذا اس کے تمتعات بھی اس دنیا میں جو ہیں وہ بھی اقل قلیل ہیں تو اس تمتع پر نظر کرکے تمتعات آخرت کو نظر انداز کردینا کس قدر ضعف ایمان ہے۔

فکر آخرت جو مومن کے دل میں ہوتی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے عصائے موسیٰ علیہ السلام اس نے ساحرین کے سب عصا کو ایک دم نگل لیا تھا اور اس کے آگے وہ سب ختم ہوگئے تھے۔ اسی طرح مومن کے قلب میں جب فکر آخرت پیدا ہوجاتی ہے تو دنیا کے سب ہموم وغموم اس کے قلب کے آس پاس بھی نہیں آنے پاتے اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

آسکے غیر مرے خانۂ دل میں کیسے کہ خیالِ رُخِ دلدار ہے درباں اپنا

یہ فکر لوازم ایمان سے ہے۔ اب خیال فرمائیے کہ ایسا شخص کیسے دنیا میں منہمک ہوسکتا ہے اور کیسے اس کے شہوات ولذات کو ترجیح دے سکتا ہے؟ اب جو ترجیح ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ فکر آخرت دل میں نہیں ہے اور نہ اس کو پیدا کرنا چاہتے ہیں، اسی وجہ سے کسی کام کے نہیں رہ گئے۔ خدا کے نظر اعتبار سے ساقط ہوگئے۔ دنیا بھی چاہتے ہیں تو بھی نہیں ملتی کیونکہ انھوں نے اپنے خدا کو ناراض کرلیا جس کے قبضہ میں دنیا اور آخرت دونوں ہیں اور مومن جب آخرت کو چھوڑتا ہے تو اس کی دنیا بھی چلی جاتی ہے اور خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ کا مصداق ہوجاتا ہے۔ پس اب اسی پر کلام کو ختم کرتا ہوں کہ آخرت باقی ہے۔ اس کا بیان کما حقہ تو وہی کرسکتی ہے جو باقی ہے فانی سے اس کا ذکر کیا ہوسکے۔

آخرت کا ذکر جب آگیا تو قرآن وحدیث سے ترغیب وترہیب یعنی جنت ودوزخ ونیز اہل جنت واہل دوزخ کا بیان بھی کردینا ضروری معلوم ہوا لہذا بغیر استیعاب کے اس کا کسی قدر بیان اپنی فہم کے موافق کیا جاتا ہے۔ قرآن عظیم میں حسب تصریح اکابر علماء جو پنجگانہ علوم عظیم الشان بیان ہوئے ہیں منجملہ ان کے موت اور ما بعد الموت وحشر ونشر حساب ومیزان، جنت ونار بھی ہے اور یہ سب غیب اور اس پر ایمان ایمان بالغیب ہے۔ اور ایمان بالغیب اس دار دنیا میں مومن کا کمال ہے اس لئے مومن کو اس کا علم اور علم ہی نہیں بلکہ اس کا استحضار اور استحضار ہی نہیں بلکہ ایقان علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین ضروری ہے اور اسی ایقان واذعان کے تفاوت سے مومن کے مراتب اور درجات میں تفاوت ہے۔ جیسا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا یقین زائد اور اس لئے ان کا درجہ سب سے اعلیٰ اور ارفع ہوتا ہے ان کے بعد حضرات صحابہ رضوان اللہ عنہم کا ان کے بعد حضرات تابعین کا علیٰ ہذا القیاس۔

اسی ضرورت پر نظر کرکے ہم جنت و دوزخ کے متعلق جو قرآن و حدیث میں ترغیب و ترہیب وارد ہوئے ہیں، بیان کرتے ہیں تاکہ جنت کا شوق بلکہ اس کا عشق دل میں پیدا ہو جائے، خوف تو کسی چیز سے بدون دیکھے بھی محض اخبار سے پیدا ہو سکتا ہے اور عشق اکثر دیکھنے سے کسی چیز کے ہوتا ہے، مگر احیاناً بدون دیکھے محض اس کی خبریں سننے سے بھی ہو جاتا ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے ؎ الاذن تعشق قبل العین احیاناً

؎ اشتاقہ قبل رویتہ کما
تہوی الجنان بطیب الاخبار

اللہ تعالیٰ نے جنت کی ایسی تعریف فرمائی ہے کہ اہل ایمان کو اس کا مشتاق بنا دیا ہے یہاں تک کہ اس کی طلب میں ان اعمال کو کرنے لگے جو اس تک پہونچا دیں، چنانچہ اس آیت وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ میں عرفہالہم کی تفسیر اس سے بعض نے کی ہے، لہٰذا ان آیات و احادیث کو بیان کرتے ہیں تاکہ ایمان میں تازگی پیدا ہو کر دوزخ سے خوف اور جنت کا شوق پیدا ہو، گوش ہوش سے سنئے:۔

تَرْغِیْبُ الْجَنَّۃ

عن اسامۃ بن زید یقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا ھل مشمر للجنۃ فان الجنۃ لاخطر لہا ھی ورب الکعبۃ نور یتلالأ وریحانۃ تہتز وقصر مشید ونہر مطرد وثمرۃ نضیجۃ وزوجۃ حسناء جمیلۃ وحلل کثیرۃ ومقام ابد فی دار سلیمۃ وفاکہۃ وخضرۃ وحبرۃ ونعمۃ فی محلۃ عالیۃ بہیۃ قالوا نعم یا رسول اللہ نحن المشمرون لہا قال قولوا ان شاء اللہ

رواہ البخاری

حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سنو! ہے کوئی جنت کی تیاری کرنے والا، اور وہ جنت ایسی ہے کہ اس کا خیال بھی کسی کے دل میں نہ گذرا ہوگا رب کعبہ کی قسم سلامتی کے گھر میں ایک چمکتا ہوا نور ہے (اس میں) خوشبودار لہلہاتے ہوئے درخت ہیں، قلعی چونہ کے محل ہیں، جاری نہریں ہیں، پختہ پھل ہیں (اور بہت اچھی خوبصورت بیویاں ہیں، اور بیشمار کپڑوں کے جوڑے ہیں) ہمیشہ ہمیش کا ٹھکانا ہے، میوے اور پھل ہیں، سبزہ اور شادابی ہے، چیزوں کے انبار ہیں، نعمتیں ہیں، بلند اور روشن مقام ہیں

صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم اس کے لئے تیاری کرنے والے ہیں، آپ نے فرمایا کہ انشاء اللہ بھی کہو۔

(تفسیر مظہری)

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال لما خلق اللہ الجنۃ قال لجبریل اذھب فانظر الیھا فذھب و نظر الیھا والی ما اعد اللہ لاھلھا فیھا ثم جاء فقال ای رب وعزتک لایسمع بھا احد الا دخلھا ثم حفھا بالمکارہ ثم قال یا جبریل اذھب فانظر الیھا فذھب فنظر الیھا ثم جاء فقال ای رب وعزتک لقد خشیت ان لا یدخلھا احد الحدیث (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا فرمایا تو جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ جاؤ اسکو دیکھو، جبریلؑ گئے اور جنت کو نیز ان تمام چیزوں کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے لئے اسمیں مہیا فرمارکھی تھیں تو واپس آکر عرض کیا کہ اے پروردگار قسم ہے آپکی عزت کی (وہ تو ایسی عمدہ جگہ ہے کہ) جو شخص بھی اسکو سن پائیگا وہ اسمیں داخل ہی ہو جائیگا، پھر اللہ تعالیٰ نے اسکو مکروہات کی باڑھ سے گھیر دیا اور جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ اب جاکر جنت کو دیکھو، جبریلؑ پھر گئے، اور دیکھکر آئے اور عرض کیا کہ اے پروردگار قسم ہے آپ کی عزت کی اب تو مجھے اندیشہ ہے کہ اس میں شاید ہی کوئی داخل ہو سکے گا (یعنی جس طرح دنیا میں کسی باغ کی حفاظت کے لئے اسکو خاردار جھاڑ جھنکاڑ سے روندھ دیتے ہیں اسیطرح اللہ تعالیٰ نے جنت کو مکروہات سے گھیر دیا ہے یعنی اس کے داخلہ کے لئے دشوار ناگوار اور نفس پر شاق گزرنے والے اعمال کا دنیا میں انسان کو مکلف کر دیا ہے مثلاً نماز کے لئے سردی میں ٹھنڈے پانی سے وضو اور غسل کرنا تہجد کے لئے نرم نرم اور گرم گرم بستر کو چھوڑنا۔ گرمیوں میں شب چھوٹی ہونے کے باوجود جماعت فجر حاصل کرنے کے لئے اپنی میٹھی نیند کو قربان کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہی سب احکام شرعیہ اور عبادات شاقہ جو نفس کے خلاف اور ناگوار طبع ہوتے ہیں جنت میں داخلہ کے لئے بمنزلہ باڑھ کے ہیں، پس جس کو جنت مطلوب ہے اس کے لئے ان خاروں پر سے گزرنا بھی ناگزیر ہے، مومن کو چونکہ جنت اور درجات جنت مطلوب و محبوب و مقصود ہیں اس لئے اس کی راہ و طلب میں جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے مومن اس کو بخوشی قبول کرتا ہے۔ اس کو اس راہ کی تکالیف بھی اسیطرح محبوب ہوتی ہیں جیسی خود جنت، اور جو شخص ان سے گھبراتا ہے سمجھنا چاہئے کہ وہ طالب جنت ہے ہی نہیں، کسی کا خوب شعر ہے ؎

رنج راحت شد چو شد مطلب   گرد گلہ توتیائے چشم گرگ

یعنی جب کسی کا مطلوب و مقصود اعلیٰ ہوتا ہے تو اس کے حصول کی تکالیف بھی راحت معلوم ہوتی ہیں چنانچہ بھیڑیا گوشت کی لالچ میں بکریوں کے گلہ کی گرد بھی سرمے کی طرح آنکھوں میں لگانا پسند کر لیتا ہے اسی کو ایک اردو شاعر نے کہا ہے ؎

متاعِ جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے

جنت ایسی چیز نہیں ہے کہ کوئی اس کی رغبت و خواہش نہ کرے مگر جو لوگ جنت کو مفت مُفت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے لئے تکالیف برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ اس سے گھبراتے ہیں، ذیل کی آیت میں اللہ تعالیٰ اسکو بوالہوس قرار دیتے ہیں۔ اور انکی اس حالت پر نکیر فرماتے ہیں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۤءُ وَالضَّرَّاۤءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝

دوسری بات سنو! کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں جا داخل ہو گے حالانکہ تم کو ہنوز ان لوگوں کا سا کوئی عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، ان پر ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور ان کو یہاں تک جنبش ہوئیں کہ پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد کب ہوگی، یاد رکھو! بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد نزدیک ہے۔ (بیان القرآن)

اس پر قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ:-

فيه اشارة الى ان الوصول الى الله تعالى والفوز بالكرامة عنده برفض الهوى واللذات ومكابدة الشدائد والرياضات كما قال عليه الصلوة والسلام حفت الجنة بالمكاره وحفت النار بالشهوات (بیضاوی ص۱۲۳)

اسمیں اشارہ اس طرف ہے کہ حق تعالیٰ تک پہونچنا اور ان کے نزدیک اکرام و عزت پانا صرف خواہشات و لذات کے ترک کرنے اور مشقتوں کے جھیلنے ہی سے ممکن ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ جنت ناگواریوں سے اور دوزخ شہوات و خواہشات سے گھیر دی گئی ہے۔

نیز ترمذی (باب الزہد) کی ایک حدیث ہے کہ:-

من خاف ادلج ومن ادلج بلغ المنزل الا! ان سلعۃ اللہ غالیۃ الا ان سلعۃ اللہ ھی الجنۃ (مشکوۃ. باب البکاء والخوف)	جس کے دل میں ڈر ہوگا وہ منہ اندھیرے ہی سفر شروع کردے گا، اور جو ایسے تڑکے روانہ ہوجائیگا وہی منزل پر پہونچ سکے گا، یاد رکھو اللہ تعالیٰ کا سودا بڑا بیش قیمت ہے سنو! اللہ تعالیٰ کا سودا جنت ہے (مشکوۃ، باب البکاء والخوف)

اور سچ پوچھئے تو جنت کی نعمتیں حیات دنیویہ میں مجاہدات و ریاضات کی مشقتیں جھیلنے کے بعد ہی کچھ مزہ دیں گی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن یہ حدیث پڑھائی کہ جب تمام مستحقین جنت، جنت میں پہونچ جائیں گے تب بھی جنت کچھ خالی رہیگی تو وہ عرض کریگی کہ آپنے مجھے بھرنے کا وعدہ فرمایا تھا، اُسے پورا فرما دیجئے، تو حق تعالیٰ ایک نئی مخلوق پیدا فرماکر اُسے جنت میں داخل فرمائیں گے، اس پر حضرت مولانا تھانوی رحؒ نے دریافت کیا کہ حضرت پھر وہ تو بڑے مزے میں رہینگے اتنی سہولت میں جنت پاجائیں گے، فرمایا اجی کیا خاک لطف آئیگا۔ لطف تو ہمیں آئے گا کہ جنت میں داخل ہو کر یہ پڑھیں گے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ نِ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۝	اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا بیشک ہمارا پروردگار بڑا قدرداں ہے جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اُتارا جہاں نہ ہم کو کوئی تکلیف پہونچے گی اور نہ ہم کو کوئی خستگی پہونچے گی (بیان القرآن)

انھیں مجاہدات میں سے ایک مجاہدہ جنت کا شوق اور انتظار بھی ہے، میں نے تفسیر حقانی میں دیکھا ہے کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ جنت اور اسکی نعمتوں کا ذکر فرماتے ہیں تو روح کو اشتیاق اور انتظار اس عالم کا ہوجاتا ہے، اور اس قفس عنصری میں اس کے تڑپنے کی مثال یہ دی ہے کہ جیسے ایک طوطا کسی پنجرہ میں بند ہو اور دوسرے طوطے درخت پر بول رہے ہوں تو ان کی بولی سنکر یہ بھی اپنے پنجرہ میں پھڑپھڑا اٹھتا ہے اور چاہتا ہے کہ کیسے میں اس سے رہا ہوجاؤں اور کس طرح درخت پر چلا جاؤں ـــــ سبحان اللہ! طائر روح کے قفس عنصری میں مقید ہونے اور اس سے نکلنے کی تمنا اور خواہش کی کیسی عمدہ تصویر ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم — راحتِ جاں طلبم وز پئے جاناں بروم

روی مسلم عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حفت الجنۃ بالمکارہ وحفت النار بالشہوات (تفسیر مظہری)

مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت گھیر دی گئی ہے مکروہات سے، اور جہنم گھیر دی گئی ہے شہوات سے۔

قرآن شریف وحدیث میں جنت و دوزخ کا جو ذکر آیا ہے یہاں اس کا استیعاب و استقصاء مقصود نہیں ہے بلکہ ان میں سے چند آیات و احادیث رغبت و رہبت پیدا کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں۔

پہلے جنت کے متعلق سنئے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوْرًا۔ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا۔ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ یَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا۔ وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا۔ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا۔ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا۔ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِکَ الْیَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا۔ وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِیْرًا۔ مُّتَّکِئِیْنَ فِیْهَا عَلَی الْاَرَآئِکِ لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِیْرًا۔ وَ دَانِیَةً عَلَیْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِیْلًا۔ وَیُطَافُ عَلَیْهِمْ بِاٰنِیَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَکْوَابٍ کَانَتْ قَوَارِیْرَا۔ قَوَارِیْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِیْرًا۔ وَیُسْقَوْنَ

جو نیک ہیں وہ ایسے جام شراب پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی یعنی ایسے چشمے سے جس سے خدا کے خاص بندے پئیں گے جس کو وہ بہا کر لیجائیں گے وہ لوگ واجبات کو پورا کرتے ہیں اور ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی عام ہوگی اور وہ لوگ خدا کی محبت سے غریب اور یتیم و قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور وہ لوگ کھانا کھلا کر زبان سے یا دل سے یوں کہتے ہیں کہ) ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں، نہ ہم تم سے بدلہ چاہیں اور نہ شکریہ، ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ رکھتے ہیں، سو اللہ تعالیٰ انکو اس دن کی سختی سے محفوظ رکھے گا اور ان کو تازگی اور خوشی عطا فرمائے گا اور انکی پختگی کے بدلہ میں ان کو جنت اور ریشمی لباس دیگا اس حالت میں کہ وہ وہاں مسہریوں پر تکیہ لگائے ہوں گے نہ وہاں تپش پاویں گے اور نہ جاڑا اور یہ حالت ہوگی کہ درختوں کے سایہ ان پر جھکے ہونگے اور ان کے میوے ان کے اختیار میں ہونگے اور ان کے پاس

فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ۝ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا ۝ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا ۝ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ۝ عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ ۖ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ۝ إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ۝

چاندی کے برتن لائے جائیں گے اور آبخورہ جو شیشے کے ہوں گے وہ شیشے چاندی کے ہوں گے جن کے بھرنے والوں نے مناسب انداز سے بھرا ہوگا اور وہاں ان کو ایسا جام شراب پلایا جائیگا جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی یعنی اسکا چشمے سے جو وہاں ہوگا جس کا نام سلسبیل ہوگا اور ان کے پاس ایسے لڑکے آمد و رفت کریں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، اے مخاطب اگر تو ان کو دیکھے تو یوں سمجھے کہ موتی ہیں جو بکھر گئے ہیں، اور اے مخاطب اگر تو اس جگہ کو دیکھے تو تجھکو بڑی نعمت اور بڑی سلطنت دکھائی دے، ان جنتیوں پر باریک ریشم کے سبز کپڑے ہوں گے اور دبیز ریشم کے بھی، اور ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے، اور ان کا رب ان کو پاکیزہ شراب پینے کو دے گا (ان سب نعمتوں کو دیکر اہل جنت سے مسرت روحانی بڑھانے کے لئے کہا جاویگا کہ) یہ تمہارا صلہ ہے اور تمہاری کوشش مقبول ہوئی۔ (بیان القرآن)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ۝ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۝ يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ۝ خِتَامُهُ مِسْكٌ ۚ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۝ وَمِزَاجُهُ مِن تَسْنِيمٍ ۝ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ۝

نیک لوگ بڑی آسائش میں ہوں گے مسہریوں پر دیکھتے ہوں گے اے مخاطب تو ان کے چہروں میں آسائش پہچانیگا ان کے پینے کو شراب خالص سر بمہر جس پر مشک کی مہر ہوگی ملیگی، اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنا چاہئے اور اس شراب کی آمیزش تسنیم کے پانی سے ہوگی یعنی ایک ایسا چشمہ ہے جس سے مقرب بندے پئیں گے (بیان القرآن)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ:

يَا عِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنتُمْ تَحْزَنُونَ ۝ الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا

اے میرے بندو تم پر آج کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہوگے یعنی وہ بندے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے تھے

مُسْلِمِیْنَ. اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ تُحْبَرُوْنَ. یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَکْوَابٍ وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ وَاَنْتُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ	اور فرمانبردار تھے تم اور تمہاری بیبیاں خوش بخوش جنت میں داخل ہو جاؤ. ان کے پاس سونے کی رکابیاں اور گلاس لائے جائیں گے اور وہاں وہ چیزیں ملینگی جن کو جی چاہیگا. اور جن سے آنکھوں کو لذت ہوگی اور ان سے

کہا جاوے گا کہ تم یہاں ہمیشہ رہوگے (بیان القرآن)

صاحب روح المعانی نے یطاف علیہم بصحاف کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

والصحاف جمع صحفة قیل هی کالقصعة قیل اعظم الاوانی الاکل الجفنة ثم القصعة ثم الکیلة	صحاف صحفہ کی جمع ہے. ایک قول یہ ہے کہ وہ قصعہ کی طرح ہوتا ہے. اور ایک قول یہ ہے کہ کھانے کے برتنوں میں سب سے بڑے پیالے کو جفنہ کہتے ہیں. اس کے بعد قصعہ

ہوتا ہے اور اس سے چھوٹے کا نام کیلہ ہے
اس کے ذرا آگے فرماتے ہیں کہ:-

ولما کانت اوانی الماکول اکثر بالنسبة لاوانی المشروب عادة جمع الاول جمع کثرة والثانی جمع قلة. وقد تظافرت الاخبار بکثرة الصحاف اخرج ابن المبارک وابن ابی الدنیا فی صفة الجنة والطبرانی فی الاوسط بسند رجاله ثقات عن انس قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اسفل اهل الجنة اجمعین درجة لمن یقوم علی راسه عشرة آلاف خادم بید کل واحد صحفتان واحدة من ذهب واخری من فضة فی کل واحدة لون	اور چونکہ عادۃً کھانے کے برتن پینے کے برتنوں سے زیادہ ہوا کرتے ہیں اس لئے اول کے لئے جمع کثرت کا صیغہ لائے اور ثانی کے لئے جمع قلت کا. اور (جنت میں) پیالوں کی کثرت کے بارے میں بکثرت روایتیں آئی ہیں (چنانچہ) ابن المبارک اور ابن ابی الدنیا جنت کی صفت میں اور طبرانی نے اوسط میں ایسی سند سے جس کے رواۃ ثقہ ہیں، حضرت انس رض سے روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ کل اہل جنت میں سب سے کم درجہ کا ایسا شخص ہوگا کہ اس کے سرہانے کی جانب دس ہزار خادم ہوں گے اور ہر ایک خادم کے ہاتھ میں دو دو پیالے ہوں گے ایک سونے کا اور ایک چاندی کا، ہر ایک پیالے کا رنگ یعنی جنس کھانے کی دوسری سے مختلف ہوگی

لیس فی الاخریٰ مثلہ یاکل من اٰخرہا مثل مایاکل من اولہا یجد لاٰخرہا من الطیب واللذۃ مثل الذی یجد لاولہا ثم یکون ذلک کرشح المسک لایبولون ولایتغوطون ولایمتخطون اخوانا علی سرر متقابلین

(اور وہ شخص ان پیالوں میں سے) آخر والے سے بھی اسی شہوت کے ساتھ کھائیگا جس طرح کہ پہلے والے سے اور آخری پیالے میں بھی وہی خوشبو اور لذت پاویگا جیسی اول میں پائی تھی، پھر یہ سب (کھایا ہوا) مشک جیسی خوشبو والا پسینہ ہو کر خارج ہو جائیگا، وہاں نہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ کی حاجت ہوگی نہ ناک وغیرہ نکلے گی، بس سب کے سب بھائی بھائی ہو کر آمنے سامنے (یعنی باہم متقابل) تختوں پر مسند نشین ہوں گے۔

وفی حدیث رواہ عکرمۃ ان ادنی اہل الجنۃ منزلۃ واسفلہم درجۃ لرجل لایدخل بعدہ احد یفسح لہ فی بصرہ مسیرۃ عام فی قصور من ذہب وخیام من لوءلوء لیس فیہا موضع شبر الا معمور یغدی علیہ کل یوم ویراح بسبعین الف صحفۃ فی کل صحفۃ لون لیس فی الاخریٰ مثلہ شہوتہ فی اٰخرہا کشہوتہ فی اولہا لونزل علیہ جمیع اہل الارض لوسع علیہم مما اعطی لاینقص ذلک مما اوتی شیئا وروی ابن ابی شیبۃ ھذا العدد عن کعب ایضاً واذا کان ذلک للادنی فما ظنک بالاعلیٰ۔ رزقنا اللہ تعالیٰ مایلیق بجودہ وکرمہ۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ اہل جنت میں سے سب سے کم درجہ والا اور سب سے نچلے درجہ والا شخص کہ اب اس کے بعد کوئی شخص نہ داخل ہوگا، ایسا ہوگا کہ اس کو اتنے طویل رقبہ کے اندر سونے کے محلات اور موتی جڑاؤ خیمے جن میں ایک بالشت بھر جگہ بھی سجاوٹ سے خالی نہ ہوگی ملینگے کہ ایک جانب سے دوسری جانب کے فاصلہ کی مسافت ایک سال کی ہوگی۔ اور روزانہ صبح وشام ستر ہزار پیالے اس پر پیش کئے جائیں گے، ہر پیالے کا رنگ یعنی جنس کھانے کی دوسرے سے مختلف ہوگی۔ اس کی رغبت اور خواہش آخری پیالے کی جانب بھی بالکل ویسے ہی ہوگی جیسی کہ اول کی جانب۔ اور اگر تمام روئے زمین کے لوگ اسکے یہاں چلے جائیں تو جو کچھ وہ دیا جائیگا سب کو کافی ہو جائیگا اور اسکے دئے ہوئے میں کچھ بھی کمی نہ ہوگی۔ اور ابن ابی شیبہ نے بھی یہی تعداد حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ لہٰذا جب یہ تعداد (پیالونکی) سب سے کم درجہ والے کی ہے تو اعلیٰ درجہ والے کے بارے میں تم کیا سمجھتے ہو کتنا کچھ اسکو ملیگا۔ اللہ تعالیٰ ہمکو بھی وہ کچھ عطا فرماوے جو اس کے جود وکرم کے شایان شان ہو۔

نیز وفیہا ما تشتہیہ الانفس وتلذ الاعین و انتم فیہا خالدون کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ :۔

(وفیہا) ای فی الجنۃ (ما تشتہیہ الانفس) من فنون الملاذ (وتلذ الاعین) ای تستلذ وتقر بمشاہدتہ وذکر ذلک الشامل لکل لذۃ ونعیم بعد ذکر الطواف علیہم باوانی الذھب الذی ھو لبعض من التنعم والترفہ تعمیم بعد تخصیص کما ان ذکر لذۃ العین التی ھی جاسوس النفس بعد اشتہاء النفس تخصیص بعد تعمیم۔

اور اسمیں یعنی جنت میں وہ چیزیں ہونگی جن کو نفس پسند کریگا یعنی قسم قسم کی لذات ہونگی اور ایسی چیزیں ہوں گی جن سے آنکھیں لطف اندوز ہونگی۔ اس کے مشاہدے سے اس کو ٹھنڈک پہونچے گی۔ اور یہاں یہ فرمانا کہ فیہا ما تشتہی الآیہ ہر لذت اور نعمت کو شامل ہے اور اس سے پہلے جن چیزوں کا ذکر فرمایا ہے، خاص خاص چیزیں ہیں اور یہاں اور عام مرغوبات کو بیان فرمادیا ہے جن میں وہ پہلے بھی داخل ہوگئیں جس طرح کہ آنکھ جو کہ نفس کا جاسوس ہے اس کی لذت کا تذکرہ نفس کی مرغوبات کے بعد عام کے بعد خاص کا ذکر کرنا ہے۔

وقال بعض الاجلۃ ان قولہ تعالیٰ یطاف علیہم بصحاف دل علی الاطعمۃ واکواب علی الاشربۃ ولا بعد ان یحمل قولہ سبحانہ وفیہا ما تشتہیہ الانفس علی المنکح والملبس ما یتصل بہا لیتکامل جمیع المتمنیات النفسانیۃ فبقیت اللذۃ الکبریٰ وھی النظر الیٰ وجہ اللہ تعالیٰ الکریم فکنی عنہ بقولہ عز وجل وتلذ الاعین و لہذا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ

بعض اکابرین نے بیان کیاہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یطاف علیہم بصحاف تو کھانے کی چیزوں پر دلالت کرتا ہے، اور اکواب پینے کی چیزوں پر، اور بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وفیہا ما تشتہیہ الانفس نکاح اور لباس وغیرہ پر دلالت کرے تاکہ نفس کے جملہ مطلوبات و مرغوبات کا کامل ذکر ہوجائے (کیونکہ طعام لباس اور نکاح اور مکان یہی نفس کے خاص خاص مرغوبات ہیں)، اس کے بعد ایک سب سے بڑی نعمت باقی رہجاتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے تو وتلذ الاعین میں اسکی جانب اشارہ فرمایا اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جیسا کہ نسائی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے خوشبودار عورتیں

فیما رواہ النسائی عن انس رضی حبب الی الطیب والنساء وجعلت قرۃ عینی فی الصلوۃ ویوافق ھذا قول الامام جعفر الصادق رضی شتان بین ماتشتھی الانفس وبین ماتلذ الاعین لان جمیع ما فی الجنۃ من النعیم والشھوات فی جنب ماتلذ الاعین کاصبع تغمس فی البحر لان شھوات الجنۃ لھا حد ونھایۃ لانھا مخلوقۃ ولا تلذ عین فی الدار الباقیۃ الا بالنظر الی الباقی جل وعز ولا حد ولا صفۃ ولا نھایۃ. انتھی. (وانتم فیھا) ای فی الجنۃ (خالدون) دائمون ابد الابدین ولو دوا بذلک اتماما للنعمۃ وکمالا للسرور فان کل نعیم زائل موجب لکلفۃ الحفظ وخوف الزوال ومستعقب للتحسر فی ثانی الاحوال وللہ در القائل ؎

واذا نظرت فان بوسا زائلا
للمرء خیر من نعیم زائل

(روح المعانی ج ۲۵ صفحہ)

محبوب ہیں اور میرے آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے، اور یہ قول حضرت امام جعفر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے بھی موافق ہے، آپ فرماتے ہیں کہ ماتشتہی الانفس (یعنی نفس کی خواہشات) اور ماتلذ الاعین (یعنی جس شئی سے آنکھ لطف اندوز ہوگی)، ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہوگا کیونکہ جنت کی تمام نعمتیں اور وہاں کی جملہ محظوظات آنکھ کی لذت کے مقابلہ میں ایسی ہونگی جیسے سمندر میں کوئی انگلی ڈبو کر نکالے اور یہ اس لئے کہ بہر حال جنت کی نعمتوں کے لئے ایک حد اور نہایت ہے کیونکہ وہ مخلوق ہے اور آنکھ کی جو لذت ہوگی وہ دار باقیہ میں اللہ عز وجل کی جانب نظر کرنے کی ہوگی جو کہ باقی ہے اور اسکی کوئی حد ونہایت نہیں اور نہ اس کا وصف ہی بیان ہو سکتا ہے۔ اور تم اسمیں ہمیشہ ہمیش ابد الآباد تک رہوگے۔ اور یہ مدا جو کہی گئی تو اتمام نعمت کے طور پر اور تکمیل سرور کیلئے، اس لئے کہ ہر وہ نعمت جو زائل ہو جانے والی ہو اسمیں فی الحال تو حفاظت کی کلفت، زوال کا خوف اور انجام کار حسرت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

کسی نے خوب کہا ہے ؎

اور اگر تم غور کرو تو انسان کیلئے وہ مصیبت جو زائل ہو جانیوالی ہے اس راحت سے کہیں اچھی ہے جو زوال پذیر ہو۔

ایک اور جگہ مؤمنین کو جنت کی بشارت دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اور خوشخبری سنا دیجئے آپ اے پیغمبر ان لوگوں کو جو ایمان

اَنَّ لَہُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ کُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْہَا مِنْ ثَمَرَۃٍ رِّزْقًا قَالُوْا ھٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِہًا وَلَہُمْ فِیْہَآ اَزْوَاجٌ مُّطَہَّرَۃٌ وَّھُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ

لائے اور کام کئے اچھے اس بات کی کہ بیشک ان کیواسطے بہشتیں ہیں کہ چلتی ہونگی اُن کے نیچے سے نہریں جب کبھی دئے جائینگے وہ لوگ اُن بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا تو ہر بار میں یہی کہیں گے کہ یہ تو وہ ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے پیشتر اور ملے گا بھی ان کو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا، اور اُن کے واسطے اُن بہشتوں میں بیویاں ہونگی صاف پاک کی ہوئی۔ اور وہ لوگ اُن بہشتوں میں ہمیشہ کو بسنے والے ہوں گے (بیان القرآن) اس آیۃ کی تفسیر میں قاضی صاحبؒ نے تفسیر مظہری میں بہت احادیث ذکر کی ہیں جن کو ہم درج کرتے ہیں :-

قال ابن عباسؓ و مجاھد متشابہا فی الالوان مختلفا فی الطعوم - و قال الحسن وقتادۃ متشابہا یشبہ بعضہا بعضا فی الجودۃ یعنی ثمار الجنۃ کلہا خیار لا رد فیہا -

حضرت ابن عباسؓ و حضرت مجاہد نے واُتوا بہ متشابہا کی تفسیر میں فرمایا کہ اہل جنت کو جو پھل دیئے جائینگے وہ رنگ میں تو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونگے لیکن مزہ میں مختلف ہوں گے، حضرت حسن و قتادہ کا قول ہے کہ متشابہ ہونیکا مطلب یہ ہے کہ عمدگی اور خوبی میں ایک دوسرے کے متشابہ ہوں گے۔ یعنی جنت کے تمام پھل عمدہ اور اچھے ہی ہوں گے ان میں کوئی ردی اور خراب نہ ہوگا۔

روی البغوی بسندہ عن جابر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اھل الجنۃ یاکلون و یشربون ولا یبولون ولا یتغوطون ولا یمتخطون ولا یبزقون یلھمون الحمد والتسبیح کما یلھمون النفس۔ طعامھم جشاء و رشحھم المسک۔ رواہ المسلم۔

بغوی نے اپنی سند سے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کھائینگے بھی اور پیویں گے بھی مگر پیشاب اور پاخانہ نہ کریں گے اور نہ ناک سنکینگے اور نہ تھوکیں گے حمد اور تسبیح ان کے دلوں میں اس طرح سے ڈالدیجائیگی جیسے سانس (یعنی بلا تعب و مشقت ہمہ وقت حمد و تسبیح کرتے رہینگے) انکی غذا (ہضم ہوکر) ڈکار ہوجاویگی اور انکا پسینہ مشک ہوگا۔

روی الترمذی عن ابن مسعودؓ

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الجنة طيبة التربة وعذبة الماء وانها قيعان وان غراسها هذه يعني التسبيح والتحميد والتكبير

کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کی مٹی خوشبودار اور اس کا پانی نہایت شیریں ہے۔ اور جنت ایک (چٹیل) میدان ہے اور اس کے درخت یہی سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر کہنا ہے (یعنی جس قدر بندہ تسبیحات کہے گا اسی قدر اس کے لیے جنت میں باغات تیار رہوں گے۔

روى الترمذي عن ابي هريرة رض قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان في الجنة مائة درجة ما بين كل درجتين مائة عام (تفسير مظهري)

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں سو درجے ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان سو سال (کی مسافت) کا فاصلہ ہے۔

وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ نساء من حور العين مُّطَهَّرَةٌ من الغائط والبول والحيض والبصاق والمخاط والمني وكل قذر ومن مساوي الاخلاق فان التطهير يستعمل في الاجسام والافعال والاخلاق وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ دائمون لا يموتون فيها ولا يخرجون منها - لما ذكر الله سبحانه نعماء الجنة ازال عنهم خوف الزوال فانه منغص للنعمة -

نیز وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ کی تفسیر میں قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں، اور اہل جنت کیلئے جنت میں عورتیں ہونگی حور عین میں (یعنی سفید رنگ بڑی آنکھوں والی جو پاخانہ پیشاب حیض اور تھوک اور رینٹ اور منی اور ہر قسم کی گندگی سے پاک ہونگی اور رو گندے اخلاق سے بھی پاک ہونگی کیونکہ تطہیر کا استعمال جسطرح اجسام میں ہوتا ہے اسیطرح افعال و اخلاق میں بھی ہوتا ہے اور اہل جنت ان میں ہمیشہ ہمیش رہینگے نہ مریں گے اور نہ اس سے نکلیں گے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کے ذکر کے بعد (ہُم فیہا خالدون سے) اس کے زوال کا خوف دور کر دیا کیونکہ یہ (خوف زوال نعمت) نعمت کو مکدر اور کرکرا کر دیتا ہے۔

روى البغوي بسنده من طريق البخاري عن ابي هريرة رض قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان اول زمرة تدخل الجنة على صورة القمر

بغوی نے اپنی سند سے جو امام بخاری کے طریق سے ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پہلے جماعت جو جنت میں داخل ہوگی اسکی صورت ایسی ہوگی جیسے چودہویں رات کا چاند پھر وہ

لیلۃ البدر ثم الذین یلونہم علی اشد کوکب دری فی السماء اضاءۃ لا یبولون ولا یتغوطون ولا یتفلون ولا یمتخطون امشاطہم الذہب ورشحہم المسک ومجامرہم الالوۃ وازواجہم الحور العین علی خلق رجل واحد علی صورۃ ابیہم آدم ستون ذراعا فی السماء۔ متفق علیہ۔

لوگ جو ان کے بعد داخل ہوں گے، انکی صورت ایسی ہوگی جیسے آسمان کا کوئی نہایت ہی روشن ستارہ ہو اہل جنت نہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ کریں گے نہ تھوکیں اور نہ ناک سنکیں گے انکی کنگھیاں سونے کی ہونگی اور ان کا پسینہ مشک ہوگا ان کے انگیٹھی (کا ایندھن) اگر بتی ہوگی اور حورعین ان کی بیویاں ہونگی۔ اہل جنت سب ہم عمر ہوں گے اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی صورت پر ہوں گے ساٹھ ساٹھ ہاتھ کے ہوں گے آسمان میں۔

عن ابی سعید الخدریؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اول زمرۃ تدخل الجنۃ یوم القیمۃ صورۃ وجوہہم صورۃ القمر لیلۃ البدر والزمرۃ الثانیۃ علی لون احسن الکواکب فی السماء لکل رجل منہم زوجتان علی کل زوجۃ سبعون حلۃ یُری مخ سوقہن دون لحومہا ودماءہا وحللہا (رواہ الترمذی)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہوگا ان کا چہرہ چودہویں رات کے چاند کی طرح ہوگا، اور دوسرا گروہ تو ان کا چہرہ آسمان کے سب سے اچھے اور روشن ستارے کی طرح ہوگا اہل جنت میں ہر ہر شخص کو دو دو بیویاں ملیں گی اور ہر ہر بیوی کے لئے ستر جوڑے کپڑے ہوں گے (ان کا جسم ایسا گورا اور شفاف ہوگا کہ) ان کے ساق کا مغز ان کے گوشت اور خون اور کپڑوں کے اوپر سے دکھائی دیگا۔ روح المعانی میں ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ ہر شخص کو ستر حوریں ملیں گی، یہ روایت "ترغیب الجنۃ" کے ختم پر آگے مفصل آتی ہے۔

وعن انسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو ان امرءۃ من نساء اہل الجنۃ اطلعت علی الارض لاضاءت ما بینہما ولملئت ما بینہما ریحا۔ ولنصیفہا علی راسہا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اہل جنت کی عورتوں میں سے کوئی عورت زمین پر نظر ڈالدے تو زمین و آسمان کے درمیان ساری فضا کو منور کردے اور خوشبو سے بھردے اور اسکی وہ اوڑھنی جو اسکے سر پر ہوگی دنیا اور دنیا کی ساری چیزوں سے

خیر من الدنیا وما فیہا رواہ البخاری

سے بہتر ہے۔ اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

وروی عن ابی ھریرۃ رضی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اھل الجنۃ جرد مرد کحلی لا یفنی شبابھم ولا یبلی ثیابھم وروی مسلم نحوہ۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اہل جنت صاف جسم والے بے ریش سرمگیں آنکھوں والے ہوں گے نہ انکی جوانی کبھی ختم ہوگی اور ان کے کپڑے ہی پرانے ہوں گے۔

وعن علی رضی قال ان فی الجنۃ لسوقا لیس فیہا بیع ولا شری الا الصور من الرجال والنساء واذا اشتھی الرجل صورۃ دخلھا وان فیہا لمجتمع حور العین ینادین بصوت لم یسمع الخلائق مثلھا نحن الخالدات فلا نبید ابدا ونحن الراضیات فلا نسخط ابدا فطوبی لمن کان لنا وکنا لہ اونحن لہ۔ (رواہ البغوی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا کہ جنت میں ایک بازار ہوگا کہ اس میں اور کسی چیز کی خرید و فروخت نہ ہوگی بجز اس کے کہ اس میں مردوں اور عورتوں کی صورتیں ہونگی، جب کوئی شخص کسی صورت کی خواہش کرے گا (کہ میں ویسا ہوجاؤں) تو ویسا ہی ہوجاویگا۔ اور اس بازار میں ایک جگہ ہوگی جہاں تمام حوریں جمع ہونگی۔ وہ ایسی اچھی آواز سے پکارینگی کہ مخلوق نے ایسی آواز نہ سنی ہوگی (اور کہیں گی) کہ ہم سب ہمیشہ رہنے والی ہیں کبھی فنا نہ ہونگی اور ہم سب نعمت والی ہیں کبھی محتاج نہ ہونگی۔ اور ہم خوش رہنے والی ہیں کبھی ناخوش نہ ہونگی، خوشی ہو اس کے لئے جو ہمارے لئے ہو اور ہم اس کے لئے ہوں۔

وروی مسلم عن انس رضی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فی الجنۃ لسوقا یاتونہا کل جمعۃ فتھب ریح الشمال فتحثو فی وجوھھم وثیابھم فیزدادون حسنا وجمالا فیرجعون الی اھلیھم وقد ازدادوا حسنا وجمالا فتقول لھم اھلوھم واللہ لقد ازددتم بعدنا حسنا

امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں ایک بازار ہوگا کہ ہر جمعہ کو اہل جنت اس میں جائیں گے تو جانب شمال سے ایک ہوا چلے گی جس سے ان کے چہرے اور کپڑوں میں خوشبو بس جائیگی۔ پس یہ لوگ اس حالت میں اپنے گھر والوں کے پاس واپس ہوں گے کہ ان کے حسن و جمال بڑھ چکے ہوں گے۔ اور ان کے گھر والوں کے حسن و جمال بھی بڑھ چکے ہوں گے۔ تو انکے گھر والے کہیں گے بخدا ہمارے پاس سے جانے کے بعد آپ کا

جمالا فیقولون و انتم و اللہ لقد ازددتم بعدنا حسنا وجمالا۔

قلت ولما کان مطمح نظر اھل الدنیا فی النعماء منحصر علی المساکن والمطاعم والمناکح اقتصر اللہ تعالیٰ ونبیہ صلی اللہ علیہ وسلم غالبا فی الذکر علیہا دفی الحقیقۃ نعماء اھل الجنۃ اجل واعلیٰ۔

حسن وجمال تو بہت بڑھ گیا۔ اس پر وہ لوگ کہیں گے بخدا ہمارے جانے کے بعد تمہارا حسن وجمال بھی بڑھ گیا ہے۔

صاحب تفسیر مظہری فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ چونکہ اہل دنیا کا مطمح نظر نعمتوں کے بارے میں صرف مکانات اور کھانے اور عورتوں پر منحصر ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ تر جنت کے بیان میں انہی پر اکتفا فرمایا ہے (ورنہ) دراصل جنت کی نعمتیں اس سے کہیں اعلیٰ اور ارفع ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ نعمائے جنت جزا و بدلا ہیں ان کے اعمال کی جو اپنے اجسام و اعضاء سے کئے ہیں جسم کو بھی اس کے مناسب بدلا دیا گیا جیسا کہ اس کے خلاف میں جسم کو عذاب وسزا دی گئی، ایک دوسری جزا روح کو دی گئی اس کے اعمال و ایمان کے صلہ میں کیونکہ اس نے بھی اس دار دنیا میں معرفت اور وصول الی اللہ حاصل کیا تھا وہ رویت و نظر الیٰ وجہ اللہ ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے شہوت کے متعلق نہایت ہی عمدہ کلام فرمایا ہے اس موقع پر اس کا بیان کر دینا بھی کچھ بے محل نہ ہوگا، فرماتے ہیں کہ:۔

"انسان میں جو شہوت پیدا کی گئی ہے تو یہ فی نفسہ کوئی ذلیل اور بری چیز نہیں ہے اسی شہوت پر حق تعالیٰ نے دارین کی بقا کی بنیاد رکھی ہے جس طرح دنیا میں شہوت نہ ہو تو نسل نہیں چل سکتی اور طعام و شراب کی شہوت اسی کے لئے ہے۔ اسی طرح آخرت کی بقا بھی شہوت پر ہے کہ یہ نہ ہو تو جنت کے نعمائے حسیہ کی جو ترغیب و تحریص کی گئی ہے وہ کیسے متصور ہو سکے گی، یہ تحریص و ترغیب وارد ہے تو اس پر ایمان لانا ضروری ہوا اگرچہ اس کے ضمن میں اپنی خواہش کی تکمیل بھی ہے اس کا حصول ایمان بالغیب ہوا اور ایمان بالغیب مومن کا کمال ہے تو یہ شہوت بھی ذریعہ بنی کمال ایمان کا،

یہاں سے وہ مسئلہ بھی نکل آیا جو مشائخ بیان کرتے ہیں کہ شیخ کامل رذائل کا ازالہ نہیں کرتا، بلکہ امالہ کرتا ہے یہ شہوت اپنے محل میں صرف ہونے کی وجہ سے ذریعہ کمال بننے

سے کیسی محمود ہوئی، مذموم یہ ہے کہ محل غیر مشروع میں اس کو استعمال کیا جائے"

عن ابی ھریرۃ رضـ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ تعالیٰ اعددت بعبادی الصالحین ما لا عین رأت و لا اذن سمعت و لا خطر علی قلب بشر و اقرأوا ان شئتم فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین ۔
متفق علیہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے اپنے صالحین بندوں کے لئے ایسی نعمتیں تیار کر رکھا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی کے قلب پر اس کا گذر ہوا، اور تم چاہو تو یہ آیت پڑھو فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَہُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ (ترجمہ) سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانۂ غیب میں موجود ہے ۔

وعنہ مرفوعا موضع سوط فی الجنۃ خیر من الدنیا وما فیہا ۔
متفق علیہ

اور انھیں حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جنت میں ایک کوڑے کی جگہ دنیا اور اسکی تمام چیزوں سے بہتر ہے

وعن ابی سعید مرفوعاً یقول اللّٰہ احل علیکم رضوانی فلا اسخط بعدہ ابدا ۔ متفق علیہ

اور ابوسعیدؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت کو خطاب کر کے فرمائیں گے کہ میں نے تم لوگوں پر اپنی رضا و خوشی کو نازل کر دیا تو اب کبھی تم سے ناخوش نہ ہونگا

وروی مسلم فی حدیث طویل عن جابر بن عبد اللہ مرفوعا فیرفع الحجاب فینظرون الی وجہ اللہ فما اعطوا شیئاً احب الیہم من النظر الی ربہم ثم تلا رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم للذین احسنوا الحسنی و زیادۃ ۔

اور مسلم نے ایک لمبی حدیث میں حضرت جابر ابن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ پھر حجاب اٹھا دیا جائیگا تو لوگ اللہ تعالیٰ کے چہرہ کو دیکھیں گے تو جتنی چیزیں اہل جنت کو عطا ہونگی انہیں سب سے زیادہ محبوب ان لوگوں کو اپنے رب کا دیدار ہوگا ، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی للذین احسنوا الحسنیٰ وزیادۃ (ترجمہ) جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کیواسطے خوبی ہے اور مزید براں بھی، میں کہتا ہوں کہ للذین احسنوا الحسنیٰ کے بعد جو زیادۃ کا نظم فرمایا ہے

جس کی تفسیر "النظر الی وجہ اللہ" ہے تو یہ علاوہ ہے، اس طرح کہ اعمال حسنہ کے مقابلہ میں تو حسنہ ہے اور یہ مزید براں ہے لہذا یہ علاوہ ہوا اور علاوہ ہمیشہ کم اور ادنیٰ ہوتا ہے، اور یہاں علاوہ "النظر الی وجہ اللہ" ہے تو کیا یہ نعم العلاوہ کہنے کا مصداق نہ ہوگا اس لئے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

لہذا اب آیت مبارکہ کی تلاوت کرتا ہوں للذین احسنوا الحسنیٰ و زیادۃ

وعن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادنیٰ اھل الجنۃ منزلۃ لمن ینظر الی جنانہ وازواجہ ونعیمہ وخدمہ وسررہ مسیرۃ الف سنۃ واکرمھم علی اللہ من ینظر الی وجہہ غدوۃ وعشیۃ ثم قرأ وجوہ یومئذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلیٰ رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ۔ رواہ احمد والترمذی۔

(تفسیر مظہری ص۳۲ ج۱)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت میں سب سے ادنیٰ درجہ والا ایسا شخص ہوگا کہ اپنے باغات اور ازواج و نعمتوں اور خادموں اور تختوں کو ہزار سال کی مسافت (تک پھیلا ہوا) دیکھے گا، اور اہل جنت میں سے وہ شخص جو عند اللہ مکرم ہوگا اللہ تعالیٰ کے چہرہ کو صبح وشام دیکھتا رہیگا، اس کے بعد آپ نے تلاوت فرمایا:۔ وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ (ترجمہ) بہت سے چہرے اس روز بارونق ہونگے اپنے پروردگار کیطرف دیکھتے ہونگے (تفسیر مظہری)

وعن الحسن قال سألت عمران بن حصینؓ وابا ھریرۃ عن تفسیر "ومساکن طیبۃ" فقالا علی الخبیر سقطت سألنا عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال قصر من لؤلؤۃ فی الجنۃ۔ فی ذلک القصر سبعون دار من یاقوتۃ حمراء فی کل دار سبعون بیتا من زمرد خضراء فی کل بیت سبعون سریرا علی کل

حضرت حسن سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ میں نے حضرت عمران بن حصین و حضرت ابو ہریرہؓ سے "ومساکن طیبۃ" کی تفسیر پوچھی ان دونوں نے کہا تونے خوب باخبر سے دریافت کیا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تفسیر پوچھی تھی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں موتی کا ایک محل ہوگا اس محل میں سُرخ یاقوت کے ستر گھر ہوں گے اور ہر گھر میں سبز زمرد کی ستر کوٹھریاں ہونگی اور ہر کوٹھری میں ستر تخت ہوں گے اور ہر تخت پر ستر فرش ہوں گے ہر رنگ کے، ہر فرش پر حور عین میں سے ایک عورت ہوگی۔ ہر

سریر سبعون فراشا من کل لون علی کل فراش امرأۃ من الحور العین من کل بیت سبعون مائدۃ فی کل مائدۃ سبعون لونا من کل طعام. فی کل بیت سبعون وصیفا ووصیفۃ فیعطی المومن من القوۃ فی کل غداۃ ما یاتی علی ذلک کلہ۔

عن ابی الدرداء قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عدن دار اللہ تعالیٰ لم تر ہا عین ولم تخطر علی قلب بشر لا یسکنہا غیر ثلاثۃ. النبیوت والصدیقون والشہداء یقول اللہ سبحانہ طوبی لمن دخلک (روح المعانی، ص ۳۱)

کوٹھری میں ستر دستر خوان ہوں گے، اور ہر دستر خوان میں ستر قسم کے کھانے ہونگے اور کوٹھری میں ستر خادم اور خادمہ ہوں گے۔

تو مومن کو اتنی قوت عطا کی جاوے گی کہ وہ ہر صبح کو ان سب پر دور کرے گا۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عدن (جس کا ذکر فی جنات عدن میں ہے) اللہ تعالیٰ کا گھر ہے کہ جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ بشر کے قلب پر اس کا گذر ہوا اس میں بجز تین قسم کے لوگوں کے کوئی نہ رہیگا، انبیاء اور صدیقین اور شہداء اللہ سبحانہ فرمائیں گے بشارت ہو اسکے لئے جو اس میں داخل ہوا۔

اطلاع

حضرت مصلح الامۃ کے دیگر مضامین اور ملفوظات سے مستفید ہونے کے لئے رسالہ معرفت حق (۲۳ بخشی بازار الہ آباد ۳) حاصل کیجئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الترہیب من النار

عن ابی ھریرۃ رضؓ قال فلمّا خلق اللہ النار قال یاجبرئیل اذھب فانظر الیھا قال فذھب فنظر الیھا ثم جاء فقال ای رب وعزتک لا یسمع بھا احد فیدخلھا فحفھا بالشھوات ثم قال یاجبرئیل اذھب فانظر الیھا فذھب فنظر الیھا فقال ای رب وعزتک لقد خشیت ان لا یبقی احد الا دخلھا وقال اللہ تعالیٰ وَ اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخَاشِعِیْنَ

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو پیدا فرمایا تو فرمایا اے جبرئیل جاؤ ذرا جہنم کو دیکھو، وہ گئے اور دیکھکر واپس آئے اور عرض کیا اے پروردگار قسم ہے آپ کی عزت کی (وہ تو ایسی بری جگہ ہے کہ) یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص اس کو سُن لے اور پھر اس میں داخل ہو جائے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو شہوات کی باڑھ سے گھیر دیا اور پھر جبرئیلؑ سے فرمایا کہ اے جبرئیل اب جاکر کے دیکھو، حضرت جبرئیل گئے اور دیکھا اور آکر عرض کیا کہ اے پروردگار قسم ہے آپکی عزت کی مجھے تو اب اندیشہ ہو رہا ہے کہ اسمیں داخل ہونے سے کوئی بھی بچے گا نہیں یعنی سب ہی لوگ داخل ہو جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہی ہے کہ بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے (یعنی اس کے وعدے خواہشات نفسانی اور لذات کے باغات پھول اور پھل رکھدیئے، کہ ان کو دیکھکر انسان ان کی طرف کو بڑھتا ہے اور بالآخر جہنم میں داخل ہو جاتا ہے

کیونکہ براہ راست آگ میں جانا کس کو پسند ہے البتہ خواہشات اور لذات چونکہ سب کو محبوب ہیں اس لئے انسان ان کا مرتکب ہوتا ہے جو سبب بنتا ہے دخولِ نار کا، پس یہ سب دنیوی حظوظ گویا جہنم کی باڑھ ہیں کہ ان میں پھنس کر آدمی جہنم کا مستحق ہوجاتا ہے) اعاذنا اللہ تعالیٰ عنہا۔

دوزخ کی صفت اور اہل دوزخ کے متعلق وعیدیں قرآن شریف سے سنئے:۔

ارشاد فرماتے ہیں کہ

وَاَصۡحٰبُ الشِّمَالِ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّحَمِیۡمٍ وَّظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ لَّا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیۡمٍ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُتۡرَفِیۡنَ وَکَانُوۡا یُصِرُّوۡنَ عَلَی الۡحِنۡثِ الۡعَظِیۡمِ وَکَانُوۡا یَقُوۡلُوۡنَ اَئِذَا مِتۡنَا وَکُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ قُلۡ اِنَّ الۡاَوَّلِیۡنَ وَالۡاٰخِرِیۡنَ لَمَجۡمُوۡعُوۡنَ اِلٰی مِیۡقَاتِ یَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ ثُمَّ اِنَّکُمۡ اَیُّہَا الضَّآلُّوۡنَ الۡمُکَذِّبُوۡنَ لَاٰکِلُوۡنَ مِنۡ شَجَرٍ مِّنۡ زَقُّوۡمٍ فَمَالِـُٔوۡنَ مِنۡہَا الۡبُطُوۡنَ فَشٰرِبُوۡنَ عَلَیۡہِ مِنَ الۡحَمِیۡمِ فَشٰرِبُوۡنَ شُرۡبَ الۡہِیۡمِ ہٰذَا نُزُلُہُمۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ

(سورۂ واقعہ)

اور جو بائیں والے ہیں وہ بائیں والے کیسے بُرے ہیں، وہ لوگ آگ میں ہوں گے اور کھولتے ہوئے پانی میں اور سیاہ دھوئیں کے سایہ میں جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ فرحت بخش ہوگا، وہ لوگ اس کے قبل بڑی خوشحالی میں رہتے تھے اور بڑے بھاری گناہ پر اصرار کرتے تھے اور یوں کہا کرتے تھے کہ جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں رہ گئے تو کیا ہم دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی، آپ کہدیجئے کہ سب اگلے اور پچھلے جمع کئے جائیں گے ایک معین تاریخ کے وقت پر پھر (جمع ہونیکے بعد) تم کو اے گمراہو جھٹلانے والو درختِ زقوم سے کھانا ہوگا پھر اس سے پیٹ بھرنا ہوگا پھر اس پر کھولتا پانی پینا ہوگا پھر پینا بھی پیاسے اونٹوں کا سا۔ ان لوگوں کی قیامت کے روز یہ دعوت ہوگی۔

اسی طرح سورہ غاشیہ میں فرماتے ہیں کہ:۔

ہَلۡ اَتٰىکَ حَدِیۡثُ الۡغَاشِیَۃِ وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَۃٌ عَامِلَۃٌ نَّاصِبَۃٌ تَصۡلٰی نَارًا حَامِیَۃً تُسۡقٰی مِنۡ عَیۡنٍ

آپ کو اس محیط عام واقعہ کی کچھ خبر پہونچی ہے، بہت سے چہرے اس روز ذلیل، مصیبت جھیلتے خستہ ہوں گے آتشِ سوزاں میں داخل ہوں گے، کھولتے

آنِيَةٍ ۝ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِن ضَرِيعٍ ۝
لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِن جُوعٍ ۝

(سورۂ غاشیہ)

ہوئے چشمہ سے پانی پلائے جائینگے، ان کو بجز ایک خار دار جھاڑ کے اور کوئی کھانا نصیب نہوگا جو نہ فربہ کریگا اور نہ بھوک کو رفع کریگا۔

ایک اور جگہ عذاب کا تذکرہ ان لفظوں میں فرماتے ہیں کہ:۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ طَعَامُ الْأَثِيمِ
كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ
خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ثُمَّ
صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ
ذُقْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ إِنَّ
هَٰذَا مَا كُنتُم بِهِ تَمْتَرُونَ ۝

(سورۂ دخان)

بیشک زقوم کا درخت بڑے مجرم کا کھانا ہوگا جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا وہ پیٹ میں ایسا کھولیگا جیسا تیز گرم پانی کھولتا ہے، اس کو پکڑو پھر گھسیٹتے ہوئے دوزخ کے بیچ و بیچ تک لیجاؤ پھر اس کے سر پر تکلیف دینے والا گرم پانی چھوڑ دو (اور اس سے استہزا کیا جاویگا کہ) لے چکھ تو بڑا معزز مکرم ہے یہ وہی چیز ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے۔

(بیان القرآن)

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي عَذَابِ جَهَنَّمَ
خَالِدُونَ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيهِ
مُبْلِسُونَ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا
هُمُ الظَّالِمِينَ وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ
عَلَيْنَا رَبُّكَ قَالَ إِنَّكُم مَّاكِثُونَ ۝

(سورۂ زخرف)

بیشک نافرمان لوگ عذاب دوزخ میں ہمیشہ رہینگے وہ ان سے ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اسی میں مایوس پڑے رہیں گے، اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن یہ خود ہی ظالم تھے اور پکاریں گے کہ اے مالک تمہارا پروردگار ہمارا کام ہی تمام کردے۔ وہ جواب دیگا کہ تم ہمیشہ اسی حال میں رہوگے

(بیان القرآن)

اسی طرح ایک اور مقام پر جہنمیوں کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ:۔

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ
الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ
خَالِدُونَ تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ
فِيهَا كَالِحُونَ أَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ

اور جس شخص کا پلہ ہلکا ہوگا سو یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنا نقصان کر لیا اور جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہینگے ان کے چہروں کو آگ جھلستی ہوگی اور اسمیں ان کے منہ بگڑے ہوں گے، کیوں کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر

فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّيْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ۝	سنائی نہیں جایا کرتی تھیں اور تم ان کو جھٹلایا کرتے تھے وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہماری بدبختی نے ہم کو گھیر لیا تھا اور ہم گمراہ لوگ تھے اے ہمارے رب ہم کو اس سے نکال دیجئے پھر اگر ہم دوبارہ کریں گے تو ہم بیشک

پورے قصور وار ہیں۔ ارشاد ہوگا اسی میں راندے ہوئے پڑے رہو اور مجھ سے بات مت کرو۔ (بیان القرآن) ف

دوزخیوں کا سارا عذاب ایک طرف ہوگا اور حق تعالیٰ کا اُن سے یہ اعراض فرمانا ایک طرف ہوگا۔ اس کی تکلیف انھیں سب عذابوں سے بڑھکر ہوگی جس طرح مومن اللہ تعالیٰ کے دیدار کے آگے جنت کی سب نعمتوں اور لذتوں کو بھول جائیں گے، اسی طرح سے کافر کو بھی حق تعالیٰ کی ناراضی اور اعراض سے جو تکلیف ہوگی وہ دوزخ کی ساری تکالیف سے کہیں بڑھ کر ہوگی۔

چنانچہ ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں :۔

لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ اس کی تفسیر میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فوائد موضح القرآن میں تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

فائدہ لا یکلمہم اللہ کی دھمکی سے یہ امر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر کسی کے دل میں محبت الٰہی خوب راسخ ہے اگر سر دست محسوس نہ ہو تو اس کو بجھا اخگر بریز خاکستر سمجھنا چاہئے۔ قیامت کو جب کل موانع دور ہوں گے تو اس کا ظہور کامل ہوگا کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو پھر کفار کو یہ دھمکی ایسی ہوگی کہ کوئی اپنے دشمن کو ناخوشی اور اعراض سے ڈرانے لگے جو بالکل بے سود ہے محبان جان نثار اعراض محبوب کو درد جاں گداز سمجھتے ہیں نہ اعداء۔ پس معلوم ہوا کہ قیامت کو ہر سینہ اللہ کی محبت سے لبریز ہوگا کہ یہ بے التفاتی عذاب دوزخ سے بھی بدرجہا زیادہ ان کو جانکاہ معلوم ہوگی۔

(حاشیہ ترجمہ مولانا دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ) پ۳

اب احادیث میں جہنم اور اہل جہنم کا جو ذکر آیا وہ سنئے :۔

عن ابی هریرۃ رضی اللّٰہ عنہ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال نارکم جزء من سبعین جزءً من نار جہنم (متفق علیہ)	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری آگ جہنم کی آگ سے ستر حصوں میں سے صرف ایک حصہ ہے۔

وعن النعمان بن بشیرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھون اھل النار عذابا من لہ نعلان وشراکان من نار یغلی منھما دماغہ کما یغلی المرجل ما یری ان احدا اشد منہ عذابا وانہ لاھونھم عذابا - متفق علیہ

حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوزخیوں میں سے سب سے کم عذاب جس کو ہوگا اس کا یہ حال ہوگا کہ اس کو دو جوتے اور دو تسمے آگ کے پہنا دئے جائیں گے جس کی وجہ سے اس کا دماغ مانند ہانڈی کے جوش ماریگا اور یہ معلوم ہوگا کہ اس سے بڑھکر کسی کو عذاب نہیں ہو رہا ہے حالانکہ اس کو سب سے کم عذاب ہو رہا ہوگا -

وعن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اوقد علی النار الف سنۃ حتی احمرت ثم اوقد علیھا الف سنۃ حتی ابیضت ثم اوقد علیھا الف سنۃ حتی اسودت فھی سوداء مظلمۃ

حضرت ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ ایک ہزار سال تک جہنم کو دھونکا گیا ہے یہاں تک کہ وہ بالکل سُرخ ہوگئی۔ پھر ایک ہزار سال تک اور دھونکا گیا یہاں تک کہ سفید پڑگئی پھر ایک ہزار سال اور دھونکا گیا یہاں تک کہ بالکل سیاہ ہوگئی۔ پس اب وہ ایک نہایت ہی سیاہ اور بہت ہی تاریک چیز ہے (رواہ الترمذی)

وعن النعمان بن بشیرؓ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انذرتکم النار انذرتکم النار فما زال یقولھا حتی لو کان فی مقامی ھذا اسمعہ اھل السوق وحتی سقطت خمیصۃ کانت علیہ عند رجلیہ - (تفسیر مظہری ص بحوالہ دارمی)

حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں تم کو نار سے ڈراتا ہوں، میں تم کو نار سے ڈراتا ہوں۔ اس کلمہ کو آپ زور زور سے اور مسلسل فرماتے تھے کہ اگر اس جگہ آپ ہوتے جہاں اس وقت میں ہوں تو اہل بازار آپ کی آواز سُن لیتے، اسی طرح آپ برابر فرماتے رہے یہاں تک کہ آپ کے جسم مبارک پر جو چادر پڑی ہوئی تھی وہ آپ کے قدموں پر آگری۔

اما انکم لو اکثرتم ذکر ھاذم اللذات لشغلکم

ابو سعیدؓ سے مروی ہے کہ اے لوگو! اگر تم لذتوں کو توڑنے والی شے یعنی موت کو کثرت سے یاد کرتے تو

عما ادری الموت فاكثروا ذكر هاذم اللذات الموت فانه لم يات على القبر يوم الا تكلم فيه فيقول انا بيت الغربة وانا بيت الوحدة وانا بيت التراب وانا بيت الدود فاذا دفن العبد المؤمن قال له القبر مرحبا واهلا اما ان كنت لاحب من يمشي على ظهري الى فاذا وليتك اليوم وصرت الى فسترى صنيعي بك فيتسع له مد بصره ويفتح له باب الى الجنة واذا دفن العبد الفاجر او الكافر قال له القبر لا مرحبا ولا اهلا اما كنت لابغض من يمشي على ظهري الى فاذا وليتك اليوم وصرت الى فسترى صنيعي بك فيلتئم عليه حتى يلتقي عليه وتختلف اضلاعه ويقيض له سبعون تنينا لو ان واحدا منها نفخ في الارض ما انبتت شيئا ما بقيت الدنيا فينهشنه ويخدشنه حتى يفضى به الى الحساب انما القبر روضة من رياض الجنة او حفرة من حفر النار (رت) عن ابی سعید (جامع الصغیر صـ۱۵۷ ج۱)

وہ تم کو ان تمام مشاغل سے روک دیتی جن میں پھنسا ہُوا میں تم کو دیکھ رہا ہوں۔ لہذا لذات کا خاتمہ کر دینے والی چیز یعنی مَوت کو بکثرت یاد کیا کرو کیونکہ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جس میں قبر یہ صدا نہ لگاتی ہو کہ میں مسافرت کا گھر ہوں۔ اور میں تنہائی کا گھر ہوں اور میں خاک کا گھر ہوں اور میں کیڑے مکوڑے کا گھر ہوں۔ پس جب کوئی مومن بندہ دفن کیا جاتا ہے تو قبر اس کو خوش آمدید اور اہلاً وسہلاً کہتی ہے (یعنی اس کے آنے پر خوشی کا اظہار کرتی ہے) اور کہتی ہے کہ سُن تو روئے زمین پہ چلنے والوں میں سب سے زیادہ مجھے محبوب تھا۔ آج جبکہ میں نے تجھے پایا ہے اور تو میرے پاس آگیا ہے تو اب میرا برتاؤ بھی اپنے ساتھ دیکھے گا۔ یہ کہکر اس کے لئے تاحد نظر وسیع اور کشادہ ہوجائے گی اور اس کے لئے جنت کی جانب ایک دروازہ کھولدیا جائیگا۔ اور جب کوئی فاجر یا کافر انسان دفن کیا جاتا ہے تو اس سے قبر کہتی ہے کہ تو تیرے لئے خوش آمدید ہے اور نہ اہلاً وسہلاً ہے بلکہ میری پشت پر چلنے والوں میں سب سے زیادہ مبغوض میرے نزدیک تو ہی تھا لہذا آج جبکہ میں نے تجھ پر قابو پالیا ہے اور تو میرے پاس آگیا ہے تو پھر میرا معاملہ اپنے ساتھ دیکھیگا یہ کہکر اس کو دبوچے گی یہاں تک کہ بالکل مل جائیگی جس کی وجہ سے اسکی پسلیاں ادھر کی ادھر ہو جائینگی اور اسپر ستر زہیلے سانپ مسلط کر دیئے جائیں گے کہ اگر ایک بھی اُن میں سے زمین میں پھونک مار دے تو تاقیام دنیا زمین کوئی شے نہ اُگائے۔ پھر وہ سانپ اسکو ڈستے

اور نوچینگے یہاں تک کہ قیامت کے دن حساب کی پیشی ہوجائے گی۔ بلاشبہ قبر یا تو جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے اور یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

عن ابی الدرداء یلقی علیٰ اھل النار الجوع فیعدل ماھم فیہ من العذاب فیستغیثون بالطعام فیغاثون بطعام من ضریع لا یسمن ولا یغنی من جوع فیستغیثون بالطعام فیغاثون بطعام ذی غصۃ فیتذکرون انھم کانوا یجزون الغصص فی بالشراب فیستغیثون بالشراب فیدفع الیھم الحمیم بکلاب الحدید فاذا دنامن وجوھھم شوی وجوھھم فاذا دخل بطونھم قطع ما فی بطونھم فیقولون ادعوا خزنۃ جھنم عسا ھم یخففون عنا فیقولون لھم الم یاتکم رسلکم بالبینات قالوا بلیٰ قالوا فادعوا وما دعاء الکافرین الا فی ضلال فیقولون یامالک لیقض علینا ربک فیجیبھم انکم ماکثون قال الاعمش نبئت ان بین دعائھم واجابۃ مالک لھم مقدار الف عام فیقولون ادعوا ربکم فلا احد خیر من ربکم فیقولون ربنا غلبت علینا شقوتنا وکنا قوما ضالین

حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے کہ جہنمیوں کو ایسی زور سے بھوک لگے گی کہ تنہا اسی کی تکلیف اس عذاب کے برابر ہوگی جس میں وہ مبتلا ہوں گے پس وہ کھانا مانگیں گے تو ان کو کھانے کے لئے خاردار جھاڑی ملیگی جو نہ فربہ کریگی نہ بھوک ہی کو دفع کریگی۔ پھر وہ کھانا مانگیں گے تو ان کو ایسا کھانا ملے گا جو گلے میں پھنسے گا اور حلق کے نیچے نہ اترے گا تو وہ یاد کریں کہ دُنیا میں اس طرح سے کھانا جب پھنستا تھا تو وہ اس کو پانی سے اُتار لیا کرتے تھے۔ لہذا پانی دیا اور کوئی چیز پینے کی طلب کریں گے تو اُن کو نہایت گرم کھولتا ہُوا پانی لوہے کے آنکڑوں سے پکڑ کے دیاجائیگا ایسا کہ جب اُن کے مُنہ کے قریب پہنچے گا تو اس کو جُھلسا دے گا اور جب اُن کے پیٹ میں پہنچے گا تو اس کے اندر کی چیزوں کو کاٹ کر رکھدیگا، اسپر وہ کہیں گے کہ خزنۂ جہنم کو بلاؤ شاید وہ ہم سے عذاب کی تخفیف کردے۔ یہ سُن کر لوگ کہیں گے کہ کیا تم لوگوں کے پاس تمہارے پیغمبر دلائل لیکر نہیں آئے تھے کہیں گے بیشک آئے تھے، وہ لوگ کہیں گے پھر اب پکارو اور کافروں کا درخواست کرنا محض بے اثر ہے، اس کے بعد کہیں گے کہ اچھا مالک کو (یعنی داروغۂ جہنم) کو (مدد کے لئے) تو بلاؤ، اس سے کہیں گے اے مالک اب تو تمہارا رب ہمارا فیصلہ کردے۔ وہ کہیں گے کہ یونہی پڑے

خیرا منہ فیقولون ربنا غلبت علینا شقوتنا وکنا قوما ضالین ۔ ربنا اخرجنا منہا فان عدنا فانا ظالمون فیجیبہم اخسئوا فیہا ولا تکلمون فعند ذلک یئسوا من کل خیر و عند ذلک یاخذون فی الزفیر و الحسرۃ والویل (جمع الفوائد)

رہو۔ حضرت اعمشؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ اُن کی درخواست او رمالک کے جواب میں ایک ہزار سال کی مدت گذر جائے گی۔ پھر اس کے بعد وہ لوگ کہینگے کہ اپنے رب ہی کو پکارو دیکھو اس سے بھی کوئی خیر پاؤگے۔ چنانچہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر ہماری شقاوت غالب آئی اور ہم گمراہ قوم تھے اے رب ہمارے ہم کو اس نجات دیجئے اب ایسا نہ کریں گے اگر کریں گے تو ہم سے بڑھکر کوئی ظالم نہیں۔ اللہ تعالیٰ جواب دینگے دور ہو، اسی میں ذلیل وخوار ہو کر پڑے رہو اور مجھ سے بات مت کرو۔ اس کے بعد ہر قسم کی بھلائی سے مایوس ہو جائیں گے اور اس وقت چیخ پکار اور اپنے اوپر ویل وحسرت کریں گے۔

اب میں اخیر میں مکتوباتِ معصومیہ سے حضرت معصوم قدس سرہٗ کے مکتوبات کا ایک جزو جو ہمارے ساری ترغیب وترہیب کی روح وجان ہے جس سے سب غفلت کے پردے یکسر ھباءً منثورا ہو جاتے ہیں، درج کرتے ہیں :۔

حق سبحانہٗ باآں بزرگی وکبریائی بندہا را از کمال بندہ نوازی بجناب قدس خویش بر زبان انبیاء علیہم الصلوٰۃ والبرکات دعوت فرمودہ دراہِ وصول را بیان وروشن ساخت افسوس است کہ ازیں قسم دعوت چشم پوشیدہ واعراض نمودہ در دعوتِ نفس وشیطان درآید واز دولتِ قرب ولذتِ وصال محروم گشتہ بعذابِ حرمان گراید وآں لذت زیادہ از لذات جنات النعیم است وایں بدتر از عذاب جحیم ففروا الی اللہ انی لکم منہ

اللہ تعالیٰ نے باوجود اس بزرگی اور کبریائی کے (جو اسے حاصل ہے)، اپنے بندوں کو اپنی کمال بندہ نوازی سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اپنی بارگاہ عالی جاہ کی جانب دعوت فرمائی ہے اور وصول الی اللہ کے طریق کو نہایت ہی واضح اور روشن فرما دیا ہے۔ پھر اس کے بعد افسوس ہے کہ کوئی اسکی دعوت سے تو چشم پوشی اور روگردانی کرے اور نفس وشیطان کی دعوت کو اختیار کرے اور (حق تعالیٰ کے) قرب اور لذتِ وصال سے محروم ہو کر عذابِ حرمان میں مبتلا ہو جائے (حالانکہ وہ) لذت (یعنی قرب وصال) جنت کی نعمتوں سے کہیں بالاتر ہے اور یہ عذاب (یعنی محرومی

ندیر مبین (مکتوب معصومیہ ص ۱۲۰ مکتوب ۱۱۴) رزق، جہنم کے عذاب سے بدرجہا بڑھ کر ہے تو تم اللہ ہی کی طرف دوڑو۔ میں تمہارے واسطے اللہ کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس ترغیب و ترہیب سے ہم مسلمانوں کو کامل حصہ نصیب فرماکر ایمان میں جلاء و تازگی و قوت عطا فرمائے جس سے شکوک شبہات و وساوس سے نجات میسر ہو۔ آمین۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مقام فتح پور تال نرجا

۴ رجمادی الثانیہ ۱۳۷۵ھ

تحصیل کمال کا وقت جوانی ہے

فرمایا کہ اب اتنے دنوں کے بعد اس بڑھاپے میں جبکہ کسی چیز کی تحصیل کا وقت باقی نہیں رہا یہ بات سمجھ میں آئی کہ انسان کو کسی کمال کی تحصیل سے جو چیز مانع ہوتی ہے وہ اس کا کبر و عار ہے، کیونکہ یہی چیز اس کو کسی کامل کے آگے جھکنے سے منع کرتی ہے، ورنہ ہر ہی زمانہ میں اہل کمال رہتے ہیں جن سے کمال حاصل کیا جاسکتا ہے مگر اسی عار و استکبار کی بنا پر ان کے سامنے جھکتے نہیں اس لئے کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا کورے کے کورے ہی رہ جاتے ہیں آدمی جب اپنی خودی و تکبر کو چھوڑتا ہے تب کچھ حاصل ہوتا ہے ؎ ہر کجا پستی است آب آنجا رود

میں حضرات اہل علم کو خصوصاً اس جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ آج علماء اور طلبہ کو کوئی کمال جو نہیں حاصل ہو رہا ہے تو اس کی وجہ یہی ان کا عار اور تکبر ہے، یہی ان کی راہ مارے رہتا ہے اس کو اگر سمجھ لیں اور ہمت کر کے اس کو ترک کر دیں تو کمال کے درجہ کو پہونچ سکتے ہیں، چنانچہ جن لوگوں کو کمال حاصل ہوا ہے وہ اپنے کو مٹانے اور کسی کے آگے خود کو گرانے اور اپنے کبر و عار کو ختم کرنے ہی سے حاصل ہوا ہے!

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ

وصی اللہ عفی عنہ

اعترافِ ذنوب

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہٗ

الاعتراف والاستغفار من الذنوب من اعظم سنن النبی الکریم

(گناہوں سے استغفار اور اس کا اعتراف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم ترین سنت ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مشکوٰۃ شریف سے دو حدیثیں نقل کرتا ہوں۔ یہ دونوں حدیثیں ماخذ ہیں صوفیہ کے کلام کی کہ وہ بعض اوقات مذنب کو عابد پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ العاصی خیر من المدعی۔ آگے فائدہ میں اس پر مبسوط کلام کروں گا۔

حدیث شریف سنیئے:۔

عن جندب ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم حدث ان رجلا قال واللّٰہ لا یغفر اللّٰہ لفلان وان اللّٰہ تعالیٰ قال من ذا الذی یتالی علی اللّٰہ انی لا اغفر لفلان فانی قد غفرت لفلان واحبطت عملك اوکما قال رواہ مسلم

(مشکوٰۃ شریف)

حضرت جندب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث بیان فرمائی ہے ایک آدمی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فلاں کی مغفرت نہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کون ہے وہ شخص جو مجھ پر قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں کی مغفرت نہ کرونگا۔ سنو کہ میں فلاں کی مغفرت کرتا ہوں اور تیرے اعمال حبط کرتا ہوں۔ اسکو مسلم نے روایت کیا ہے۔

یہ حدیث پھر بھی مجمل ہے۔ دوسری حدیث جو ذیل میں درج ہے وہ مفصل ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان رجلین کانا فی بنی اسرائیل متحابین احدھما مجتھد فی العبادۃ والاخر یقول مذنب فجعل یقول اقصر عما انت فیہ فیقول خلنی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں دو شخص تھے جو آپس میں محبت رکھتے تھے۔ ایک عبادت میں اجتہاد یعنی کوشش کرتا تھا اور دوسرا یہ کہتا تھا کہ میں گنہگار ہوں۔ یہ کوشش کرنے والا گنہگار سے کہتا تھا کہ تم جس میں ہو اسکو کم کرو وہ کہتا تھا کہ

وربی حتی وجدہ یوما علی ذنب استعظمہ فقال اقصر فقال خلنی وربی ابعثت علی رقیبا فقال واللہ لا یغفر اللہ لک اذا ولا یدخلک الجنۃ فبعث اللہ الیہ ملکا فقبض ارواحھما فاجتمعا عندہ فقال للمذنب ادخل الجنۃ برحمتی وقال للاخر اتطیع ان تحظر علی عبدی رحمتی فقال لا یارب قال اذھبوا بہ الی النار۔ (رواہ احمد)	مجھ کو اور میرے رب کو چھوڑ دو (میں جانوں وہ جانے یہ بطور محبت و رجاء و نیاز کے کہتا تھا) یہاں تک کہ اسکو ایک گناہ پر پایا جس کو بڑا سمجھا پس کہا اس کو چھوڑ دو اس نے کہا مجھکو اور میرے رب کو چھوڑ دو (میں جانوں وہ جانے) کیا تو میرے اوپر نگہبان مقرر ہوا ہے اس نے کہا اللہ تعالیٰ تجھکو کبھی نہیں بخشے گا اور جنت میں داخل نہیں کریگا۔ اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتہ بھیجا۔ انکی ارواح کو اس نے قبض کیا پس خدا کے پاس دونوں مجتمع ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے گنہگار سے فرمایا میری رحمت سے جنت میں داخل ہوجا اور دوسرے سے کہا کہ تم کو قدرت ہے کہ میری رحمت کو میرے بندے پر روک لو (اس) نے کہا نہیں حکم فرمایا کہ اس کو جہنم میں لے جاؤ۔

(فائدہ) صوفیائے کرام اخلاق پر بہت زور دیتے ہیں اور اس میں کبر و عجب اصل ہے جو عبادت سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے لئے لازم ہے دوسروں کی تحقیر۔ یہ ایسا رذیلہ ہے کہ اس کے اتصاف کے ساتھ کوئی قدر و منزلت اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں انسان نہیں پاسکتا۔ اس لئے عبادت سے زیادہ قابل ازالہ اور اصلاح یہ رذائل ہیں صوفیہ کے کلام میں یہ بکثرت موجود ہیں ان میں ایک یہ ہے ؎

زاہد غرور داشت سلامت نبرد راہ
رند از رہ نیاز بدار السلام رفت

نیز یہ ہے کہ ؎

ازیں نوع طاعت نیاید بکار ۔ برو عذر تقصیر طاعت بیار

اسی طرح حضرت حافظ کا یہ شعر بھی ہے ؎

ترسم کہ صرفۂ نبرد روز باز خواست
نانِ حلال شیخ ز آبِ حرام ما

میں حضرات صوفیہ کے ان ارشادات کا ماخذ بیان کرتا ہوں وہ ماخذ یہی احادیث ہیں جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں ان میں ان کا نتیجہ و انجام بیان ہوا ہے کہ ان کو دوزخ کا حکم ہوگیا اور مذنب کو جنت کا صوفیہ سچے جو متبع سنت ہیں وہ سالکین راہ کو اس مزلۃ اقدام سے بچاتے ہیں ان کا کیا ہی احسان و کرم ہے اور کیسے اس راہ کے سالک ہیں۔ فجزاھم اللہ تعالیٰ۔

اور یہ سمجھ لیجئے کہ کوئی قدم بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تعالیٰ کے درگاہ میں معتبر اور مقبول نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الطریق کلھا مسدودۃ الا من اقتفی اثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہی مطلب ہے اس کا جو شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے ؎

پندار سعدی کہ راہِ صفا توان رفت جز بر پئے مصطفےٰ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسوۂ حسنہ قائم فرمادیا تاکہ مذنبین کو اسی راہ سے لے چلیں وہ یہ کہ آپ نے ذنب کا اعتراف قولاً و عملاً و حالاً فرمایا ہے۔ یہ آیت شریفہ اعترفوا بذنوبھم پر عمل ہے یہ آیت مذنبین کے حق میں سیر نظری ہے تاکہ سب کے لئے یہ سنت و طریق ہوجائے اور شیطان اور اس کے اثرات یعنی کبر و نخوت سے ان کا قدم دور رہے۔ یہ سیر قدمی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذنبین کے لئے اعتراف ذنب کا اسوہ قولاً جو بیان فرمایا تو اس میں اسی قسم کی احادیث داخل ہیں جو شروع میں بیان ہوئیں کیونکہ ان ارشادات سے آپ کی غرض ہی یہ ہے کہ اعتراف ذنب کی تحسین لوگوں کے ذہن نشین فرمائیں باقی آپ نے اعتراف کا عملی اور حالی اُسوہ بھی قائم فرمایا۔ میری مراد اس سے وہ حدیث ہے جس میں آپ نے اس طرح دعا فرمائی ہے کہ۔

وانا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الوجل المشفق المقر المعترف بذنبی اسألک مسألۃ المسکین وابتھل الیک ابتھال المذنب الذلیل وادعوک دعاء الخائف الضریر ودعاء من خضعت لک رقبتہ وفاضت لک عبرتہ وذل لک جسمہ ورغم لک انفہ

اور میں ہوں مصیبت زدہ محتاج فریادی پناہ جو ترساں و ہراساں اقرار کرنے والا ماننے والا اپنے گناہ کا۔ سوال کرتا ہوں تجھ سے سوال بیکس کا سا گڑگڑاتا ہوں تیرے سامنے گڑگڑانا گناہگار ذلیل کا سا۔ اور طلب کرتا خوف زدہ آفت رسیدہ کا سا اور طلب کرنا اس شخص کا سا کہ جھکی ہوئی ہو تیرے سامنے گردن اسکی اور بہے ہوں آنسو اس کے اور فروتنی کئے ہوئے ہو تیرے سامنے اور رگڑتا ہو تیرے سامنے ناک اپنی۔

(مناجات مقبول دوشنبہ)

دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم باوجودیکہ سید الانبیاء ہیں مگر کس قدر تواضع کے کلمات فرمارہے ہیں۔ حق تعالیٰ کے سامنے اپنے کو فقیر۔ وجل۔ معترف بذنب۔ مسکین۔ مذنب ذلیل سبھی کچھ فرمارہے ہیں تو یہ آپ کی غایت تواضع تھی اور امت کو تعلیم دینا مقصود تھا کہ وہ لوگ یہ دیکھیں کہ جب ایسی ذات جو کہ معصوم ہے اللہ تعالیٰ کے آگے اس طرح تضرع و زاری کے ساتھ دعا کررہی ہے تو جو لوگ کہ معصیت سے پُر ہیں اور شب و روز گناہ میں منہمک رہتے ہیں انھیں اللہ تعالیٰ کے سامنے کس درجہ گڑگڑانا چاہیئے۔ تمام انبیاء علیہم السلام

کی یہی سنت رہی ہے اور ہر زمانہ میں صالحین کا یہی شعار رہا ہے (چنانچہ بعض بزرگان دین کے واقعات ہم آگے بیان کریں گے) یہاں یہ سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر تواضع اور انکساری کے ساتھ جو یہ کلمات فرمائے اس کو صوفیاء کی اصطلاح میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان حضرات کے یہاں ایک تو ہوتا ہے عروج اور ایک ہے نزول۔ چنانچہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نزول عروج سے بڑھا ہوا ہوتا ہے اسلئے کہ اس میں عبدیت کی شان ظاہر ہوتی ہے اور عبدیت سب مقامات سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا ایک واقعہ یاد آیا۔ کسی نے حضرت سے دریافت کیا کہ حضرت مشہور ہے کہ سیدنا عبدالقادر جیلانی ؒ نے ایک مرتبہ بغداد کی جامع مسجد میں منبر پر بیٹھ کر یہ فرمایا کہ میرا یہ قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے اللہ تعالیٰ نے اس آواز کو سب اولیاء اللہ کے کانوں تک پہونچا دیا۔ چنانچہ سب نے اس کے جواب میں یہ کہا کہ بلی علی الرأس والعین یعنی ہمارے سر آنکھوں پر ہے تو اس سے تو سلسلۂ قادریہ کی افضلیت دوسرے سلاسل پر معلوم ہوتی ہے حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا کہ نہیں تو اس سے فضیلت کیسے ثابت ہو گئی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس کلمہ سے حضرت عبدالقادر جیلانی رح کا عروج میں ہونا معلوم ہوتا ہے اور جملہ اولیاء اللہ کا نزول میں اور نزول عروج سے بڑھا ہوا ہے۔ یہ مسئلہ سب صوفیہ کے نزدیک مسلم ہے۔

اسی طرح ان حضرات کے یہاں یہ بھی دستور ہے کہ شیخ جب طالبین کی اصلاح کرنا چاہتا ہے تو اپنے مقام سے نزول کرتا ہے اور ان کی استعداد کے مطابق کلام کرتا ہے ورنہ اگر وہ اپنے ہی مقام پر رہے اور اپنے حال کے مطابق کلام کرے تو طالبین کو نفع نہ ہوگا اس لئے کہ طالب شیخ کے احوال کا تحمل ہی نہیں کر سکتا۔

بس اسی طرح یہاں سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب امت کی اصلاح پیش نظر ہوئی تو آپ نے اپنے اعلیٰ و ارفع مقام سے نزول فرمایا اور یہ نزول عروج سے جو اسرار کھلاتا ہے کہیں بڑھ کر ہے۔ چنانچہ آپ نے امت کی استعداد اور ان کی صلاحیت اور ان کے احوال ملحوظ فرما کر اسی کے اعتبار سے تعلیم فرمائی اس طرح یہ دعا سب کے لئے سنت ہو گئی اور اس طرح سے ہر شخص کو اتباع سنت کا شرف حاصل ہو گیا اور امت باوجود مختلف مراتب پر شامل ہونے کے اسکو حرز جان بنانے کی مکلف ہے۔ ظاہر ہے جب کہ تواضع تمام خصال کی اصل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق ہی کے سکھانے کے لئے مبعوث ہوئے تھے تو اب اگر آپ صرف زبان سے یہ فرما دیتے کہ لوگو تواضع اختیار کرو تو کسی کی سمجھ ہی میں نہ آتا کہ تواضع کیا چیز ہے اور کیسے اختیار کی جاتی ہے اس لئے آپ نے یہ کیا کہ اپنے آپ کو عاصین اور مذنبین کی صف میں رکھ کر اللہ تعالیٰ سے انابت اور استغفار کیا اور اس کے لئے جن جن کلمات کا اختیار کرنا ایک

مذنب کے شایانِ شان ہو سکتا تھا آپ نے وہ سب کچھ استعمال فرمائے اور زبان سے کہنے کے ساتھ ساتھ اپنے حال اور انداز سے سراپا مظہر بھی بن گئے اس لئے کہ آپ معلم تھے اگر آپ اس طرح سے تعلیم نہ فرماتے تو امت کو اس کا علم ہی مشکل تھا۔

یہاں ایک بات اور سمجھ لیجئے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل اور حال سے اعتراف ذنب کا جو اسوہ مذنبین کیلئے قائم فرمایا تو اس کے ذریعہ آپ نے ہمارے حال پر احسان عظیم فرمایا اس لئے کہ یہ خیال ہو سکتا تھا کہ مذنب بوجہ مجرم ہونے کے حق تعالیٰ کے آگے لب کشائی کی ہمت ہی نہ کر سکتا اور اعتراف ذنب کے وقت اسکی زبان لڑکھڑا جاتی جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

احب مناجاۃ الحبیب باوجہ ولکن لسان المذنبین کلیل

لیکن آپ کے تعلیم فرمانے کے بعد اب یہ کہنا صحیح نہیں کہ مذنبین کی زبان کلیل ہے اس لئے کہ کلام کرنے کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں یعنی کبھی انسان خود اپنی زبان سے کہتا ہے اور کبھی ایک بات کو دوسروں کی زبان پر بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ صاحب اعتصام نے ایک موقع پر صاحب رسالہ قشیریہ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ اور یہ فرمایا ہے کہ علامہ قشیری یہ کلام لسان صوفیہ پر فرما رہے ہیں یعنی اس پر تمام صوفیاء کا اتفاق ہے اور ان سب کی طرف سے یہ کلام ہے۔

اسی طرح میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کلمات کو مذنبین کا سا حال طاری کر کے گویا ان کی لسان پر ارشاد فرمایا تو اب اگر کوئی مذنب ان کلمات کو کہے گا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لسان پر متکلم ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ آپ کی لسان کلیل نہیں تھی لہٰذا ان کلمات کی ادائیگی کے وقت مذنب کی لسان کو بھی کلیل نہ ہونا چاہیئے اس لئے کہ وہ کلام اپنی زبان سے نہیں کر رہا ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لسان پر تکلم کر رہا ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کے بعد اب کسی کا یہ خیال کرنا صحیح نہیں رہا کہ وہ مذنب ہے اور اس کی وجہ سے اس کی زبان کلیل ہے۔ پس شاعر نے اُس شعر میں جو مضمون ادا کیا ہے وہ اس اعتبار سے صحیح نہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعا فرما دینے کے بعد اب کسی مذنب کی لسان کلیل نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ معصوم ہونے کے بعد بھی آپ سے اس قسم کے الفاظ جو صادر ہوئے تو یا تو غایت تواضع اور کسر و انکسار کی بنا پر صادر ہوئے یا یہ بات تھی کہ یہ حضرات انبیاء علیہم السلام یہ سمجھتے تھے کہ طریق یہی ہے اسی سے طریق میں داخل ہوتا ہے ؎

بدرگاہ لطف و بزرگیش بر بزرگان نہادہ بزرگی زسر

بندہ اپنے مولا کے ساتھ جس قدر عجز و انکسار اور تواضع کرے کم ہی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو چونکہ حق تعالیٰ کی کامل معرفت ہوتی ہے اس لئے ان کے سامنے یہ حضرات اپنے کو قصور وار اور گنہگار ہی سمجھتے ہیں اب آپ سے کہتا ہوں جب نبوت کا یہ طریق ہے تو ولایت تو بہر حال نبوت ہی کی فرع ہے اور اس کے تابع ہے کوئی مستقل چیز نہیں ہے اس لئے کسی ولی کی مجال نہیں کہ اس راستہ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

اور یہ جو میں نے کہا کہ راہ یہی ہے تو اس کے متعلق یہ سمجھئے کہ سب سے پہلے عجب و پندار جس ذات نے کیا تھا وہ ابلیس تھا کہ اس نے اپنے کو حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں انا خیر کہا۔ اسی طرح سے فرعون نے بھی اسی کا اتباع کیا اور غایت تکبر اور ترفع میں آکر انا ربکم الاعلیٰ کہا اور اس صفت میں ابلیس سے بھی بڑھ گیا کیونکہ ابلیس نے جو کلمہ کہا تھا وہ تو حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں کہا تھا اور اس بدبخت نے تو براہِ راست حضرت حق جل و علا سے مقابلہ کیا اور اپنے کو رب اعلیٰ کہا چنانچہ اس کلمہ کی وجہ سے دونوں کا جو حشر ہوا وہ معلوم ہی ہے یعنی یہ کہ ابلیس ملعون ہوا اور فرعون بھی مردود و مطرود ہوا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے سامنے ایک جانب تو یہ نقشہ موجود تھا اور دوسری جانب حق تعالیٰ کی عظمت اور انکی بڑائی کے آگے یہ حضرات اپنا وجود ہی کچھ نہیں سمجھتے تھے اس لئے ان حضرات نے عجب کو تو ترک فرما ہی دیا تھا مزید یہ کیا کہ اپنے کو حق تعالیٰ کے سامنے نہایت ہی عاجز اور مسکین مذنب اور ذلیل حقیر اور معترف بالذنب کی حیثیت سے پیش کیا جس کا منشا ایک تو ابلیس کا واقعہ بنا اور دوسرے یہ کہ ان حضرات کو حق تعالیٰ کی کامل معرفت ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کی عظمت اور ان کا جلال ان کے قلوب پر مستولی رہتا ہے۔ چنانچہ جس قدر عظمت قلب میں ہوتی ہے اسی قدر انسان اپنے کو حق تعالیٰ کے سامنے حقیر و فقیر سمجھتا ہے۔ اسی سے خیال فرمائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر میں حق تعالیٰ کی کیسی کچھ عظمت تھی۔ اس کا تو ہمیں اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ایک باطنی شے ہے۔

باقی یہ کہ قلب مومن چونکہ اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلاصہ کائنات اور سبب تخلیق عالم ہیں اس لئے آپ کے قلب انور پر حق تعالیٰ کی جیسی کچھ تجلی ہوتی ہوگی ظاہر ہے اس کا سراغ آپ کے ان کلمات ہی سے لگتا ہے جو آپ نے استعمال فرمائے — مثلاً یہی فرمایا کہ:۔
انا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الخ حضور کے ان کلمات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے مواقع میں آدمی اَنَا کا استعمال کر سکتا ہے اور یہ وہ اَنَا نہیں ہے جو مذموم ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر مرقاۃ سے اس بحث کو نقل کروں۔ حضرت ملا علی قاریؒ نے اس مقام پر نہایت ہی عمدہ کلام فرمایا ہے۔ جو تحقیق بلیغ ہونے کے علاوہ

پُر لطف اور کیف آور بھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ سے دریافت فرمایا کہ تم میں سے آج کون شخص روزہ دار ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اَنَا (میں)، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ارشاد فرمایا کہ اچھا آج تم میں سے جنازہ کے پیچھے کون چلا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے پھر عرض کیا کہ میں، پھر آپ نے فرمایا کہ اچھا آج تم میں سے کس نے کسی مریض کی عیادت کی ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ میں نے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس انسان میں یہ تمام خصلتیں جمع ہوں وہ جنتی ہے۔

حضرت ملا علی قاریؒ نے علامہ طیبی کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ (قال ابوبکر اَنَا) میں جو اَنَا آیا ہے تو اس سے اخبار میں تعیین مقصود تھی۔ کچھ اپنے کو لگانا اور جتانا مقصود نہ تھا۔ جیسا کہ مقام مفاخرت میں لوگ یہی کرتے ہیں اور حضرات صوفیہ کے نزدیک اَنَا کا یہی استعمال منع ہے ورنہ تو لفظ اَنَا خود نص میں وارد ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے کہنے کا حکم فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے قل انما انا بشر مثلکم۔ یعنی فرما دیجئے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہوں۔ اسی طرح ارشاد ہے کہ وما انا من المتکلفین علاوہ اس کے اور بھی بہت سی نصوص ہیں جن میں اَنَا کا لفظ آیا ہے اور وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی پر نکیر منقول ہے جنھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور جب حضور نے دریافت فرمایا کہ کون، تو کہا کہ (میں)، تو یہاں نکیر اس وجہ سے تھی کہ مقام اخبار میں انھوں نے تعیین نہیں کی تھی یعنی جب حضور نے دریافت فرمایا تھا کہ کون تو انھیں اپنا نام بتلانا چاہیئے تھا۔ محض (میں) کہہ دینے سے تعیین تو نہیں ہوئی اس سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کوئی پکارنے والا پکار رہا ہے تو محض اس اتنے پر دلالت تو کنڈی کھٹکھٹانے سے بھی ہو گئی تھی۔ نیز لفظ 'اَنَا' میں تو عموم ہے یعنی ہر شخص اَنَا کہہ سکتا ہے۔ آگے خود صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ 'اَنَا' اپنی ذات کے اعتبار سے تو مذموم نہیں ہے۔ مگر اسکی مذمت جو کی جاتی ہے تو اس وقت جبکہ اس کے ذریعہ سے فخر کی باتوں کی خبر دے۔ جیسے ابلیس نے انا خیر منہ کہا تھا یا فرعون نے انا ربکم الاعلیٰ کہا۔ چنانچہ اسی قبیل سے ہے اگر کوئی شخص آج یوں کہے انا العالم۔ انا الزاھد۔ انا العابد۔ کیونکہ اس میں وہ متبع ہو گا۔ ابلیس اور فرعون کا بخلاف اس کے کہ اگر کوئی یوں کہے انا الفقیرُ۔ الحقیرُ۔ العبدُ۔ المذنبُ یا اس کے مثل اور کوئی لفظ کہے تو یہ تواضع شمار ہو گی جو کہ سنت ہے اور یہ شخص اس باب میں متمسک بالسنۃ ہو گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع سلوک میں بھی ضروری ہے اور متبع سنت اس لئے ہو گا کہ حضور نے بھی اپنے متعلق یہی فرمایا تھا۔ انا البائس الفقیر الخ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کلمات کا منشاء تجلی اعظم تھی۔ دوسرے کو وہ

کہاں نصیب. انبیاء علیہم السلام کا سا حال دوسرے کا ہونا تو محال ہی ہے۔ بایں ہمہ مومن کے لئے ان کلمات کو اپنی زبان سے کہنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ راہ یہی ہے۔ چنانچہ بزرگان دین فرماتے ہیں کہ طریق میں پہلا قدم نفس کا فنا ہے۔ اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمل اور حال کے ساتھ پیش فرما رہے ہیں۔ یہی اَنَا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے فنا ہے اب یہ چاہو کہ محض اپنی کوشش سے بدون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے حق تعالیٰ تک پہونچ جاؤ تو یہ ناممکن ہے ؎

میندار سعدی کہ راہ صفا توان رفت جز بر پئے مصطفیٰ
خلاف پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

اور یہ سمجھئے کہ راستہ بالکل بند ہے اور وہ اخبار دیکھنے سے نہیں کھلے گا بلکہ کتاب وسنت کی روشنی میں ملیگا۔ بدون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے کے کامیابی ناممکن ہے۔

قال اللہ تعالیٰ۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ وقال اللہ تعالیٰ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ۔ وقال تعالیٰ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ

مگر اتباع کرنے والے اور اتباع کی ڈینگ مارنے والے ان دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے وہ انانیت جو ابلیس اور فرعون نے کی تھی۔ انبیاء علیہم السلام کو تو اس سے نفرت تھی اس لئے آپ کے بعد پھر تمام ہی صوفیہ اس پر تل گئے کہ اس خودی کو اپنے اندر سے ہٹا کر رہیں گے کیونکہ انھوں نے ابلیس اور فرعون کو دیکھا تھا کہ وہ اسی انانیت کے ہاتھوں تباہ ہوئے۔ لہذا ان حضرات نے اس سے عبرت حاصل کرکے یہ نصیحت گرہ باندھ لی تھی کہ اس راہ نہیں چلنا ہے اور اس کے ہاتھ انصاف تو بجائے خود رہا اس کے شبہ وشائبہ سے بھی یہ لوگ بمراحل دور رہے۔

مولانا رومؒ نے بھی مثنوی میں اس مضمون کو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ ؎

زاں انائے بے انا خوش گشت جاں شد جہاں از من انائے ایں جہاں
از انا چوں رست اکنوں شد انا آفریں ہا بر انائے بے عنا

مضمون کی پاکیزگی میں کیا کلام ہے مگر بالکل چیستاں بن کر رہ گیا ہے۔ برخلاف اس کے علماء نے جو کلام فرمایا ہے وہ کتنا صاف اور واضح ہے اسی طرح مثنوی کا ایک اور شعر بھی بہت مشہور ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت فرعونے انا الحق گشت پست گفت منصورے انا الحق گشت مست

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے حالات مختلف ہیں دیکھئے جس کلمہ کو فرعون کہہ کر مردود ہوا منصور نے بھی اسی کلمہ کو کہا مگر وہ مجذوب اور محبِ خدا قرار پائے۔ مولانا روم نے اس شعر میں انا کی دو قسموں کو خوب

اچھا بیان فرمایا ہے لیکن حدیث کی شرح میں علماء کا جو کلام نقل کیا گیا ہے وہ اس سے بڑھ گیا ہے۔ حضرتؒ فرماتے تھے۔ فرعون اور منصور کے ان اقوال میں فرق نہایت عمدہ القا ہوا۔ وہ یہ کہ فرعون نے جو انا کہا تو اس سے اس کا مقصد حق کی نفی اور انا کا اثبات تھا۔ چنانچہ اس نے انا ربکم الاعلیٰ جو کہا تو اس کی غرض یہ تھی کہ جو ذات کہ رب اعلیٰ کا مصداق ہوسکتی ہے وہ میں ہوں۔ میرے علاوہ کوئی دوسرا رب اعلیٰ نہیں اور منصور نے جو انا الحق کہا تو اس سے ان کا مقصد انا کی نفی اور حق کا اثبات تھا۔ یعنی میں کچھ نہیں ہوں۔ بس حق ہی حق ہے غرض علماء جب تصوف کے مسائل بیان کرنے پر آتے ہیں تو ایسا ایسا بیان فرماتے ہیں اور قرآن و حدیث سے اسکو مستنبط فرماتے ہیں کہ آنکھ کھل جاتی ہے۔ آپ قرآن و حدیث نہیں جانتے اور نہ اسکو سمجھنے کی آپ کو فکر ہے اس لئے آپ کو تصوف سے حصہ نہیں ملا کیونکہ تصوف تو قرآن و حدیث ہی میں ہے۔

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس دعا کے ذریعہ امت کو جو تعلیم فرمائی تو امت نے بھی دل سے اسکی تلقی بالقبول کی۔ چنانچہ مشائخ نے ہر زمانہ میں آپ کی اس دعا اور مخصوص حال کی یاد تازہ فرمائی ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حال کی تفسیر حال ہی سے کی۔ اور جس طرح علماء ظاہر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و اقوال کی شرح فرمائی ہے اسی طرح حضرات مشائخ نے آپ کے حال کی شرح فرمائی ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ حال کی شرح حال ہی سے کی بھی جاسکتی ہے قول و فعل اس کے لئے کافی نہیں۔ چنانچہ دوسروں کے اندر حال اپنے حال ہی کے ذریعہ پیدا کیا جاسکتا ہے یا پھر اس شخص کے قال سے بھی حال پیدا ہوسکتا ہے جو خود صاحب حال ہے۔ اب میں آپ کے سامنے بزرگوں کے چند واقعات پیش کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ ان حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کو بھی کیسا مضبوط پکڑا ہے۔ اگر وقتاً فوقتاً یہ حضرات اسکو نہ دہراتے ہوتے تو حال کے ساتھ اتصاف تو الگ رہا اس کا علم بھی ہم سے رخصت ہوجاتا۔

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حال کی شرح جسے آپ نے انا البائس الفقیر میں معلوم کیا۔ خاندان نبوت ہی کے ایک اعلیٰ فرد اور ایک صاحب سلسلہ بزرگ کے واقعہ سے سنئے :۔

اصمعی کہتے ہیں کہ ایک شب میں بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا۔ میں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ کعبہ کے پردوں سے لپٹ کر یہ اشعار پڑھ رہا تھا ؎

یَا مَنْ یُّجِیْبُ دُعَاءَ الْمُضْطَرِّ فِی الظُّلَمِ	یَا کَاشِفَ الضُّرِّ وَالْبَلْوٰی مَعَ السَّقَمِ
قَدْ نَامَ وَفْدُكَ حَوْلَ الْبَیْتِ وَانْتَبَهُوْا	وَاَنْتَ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ لَمْ تَنَمِ
اَدْعُوْكَ رَبِّیْ حَزِیْنًا هَائِمًا قَلِقًا	فَارْحَمْ بُکَائِیْ بِحَقِّ الْبَیْتِ وَالْحَرَمِ
اِنْ کَانَ جُوْدُكَ لَا یَرْجُوْهُ ذُوْ سَفَهٍ	فَمَنْ یَّجُوْدُ عَلَی الْعَاصِیْنَ بِالْکَرَمِ

یعنی اے وہ ذات جو رات کی تاریکیوں میں مضطر کی دعا قبول فرماتے ہیں اور مصیبت اور غم کو ہمارے دور فرما دیتے ہیں۔ آپ کے پاس آیا ہوا وفد بیت اللہ کے اردگرد پھرا بھی اور پھر کر سو گیا اور پھر وہ لوگ بیدار بھی ہو گئے۔ مگر اے حی وقیوم آپ ایسے ہیں کہ آپ کبھی نہیں سوتے۔ اے رب میں آپ کو اس حال میں پکارتا ہوں کہ الم رسیدہ ہوں پریشان حال ہوں اور قلق والا ہوں۔ لہٰذا میرے رونے پر اپنے بیت اور حرم کے صدقہ میں رحم فرمایئے، آپ کے بخشش کی کوئی بیوتوف یا مذنب اگر بالفرض امید نہ کرے تو پھر گنہگاروں پر اور کون بخشش اور جود کریگا۔ یہ تو پھر بخشے ہی نہ جائیں گے حالانکہ گنہگار ہی زیادہ ہیں۔

یہ اشعار پڑھے اور پھر خوب ہی روئے۔ پھر اس کے بعد اس طرح دعا کی:۔

أَلَا أَيُّهَا الْمَقْصُودُ فِيْ كُلِّ حَاجَةٍ ... شَكَوْتُ إِلَيْكَ الضُّرَّ فَارْحَمْ شِكَايَتِيْ
أَلَا يَا رَجَائِيْ أَنْتَ تَكْشِفُ كُرْبَتِيْ ... فَهَبْ لِيْ ذُنُوْبِيْ كُلَّهَا وَاقْضِ حَاجَتِيْ
أَتَيْتُ بِأَعْمَالٍ قِبَاحٍ رَدِيَّةٍ ... وَمَا فِي الْوَرٰى عَبْدٌ جَنٰى كَجِنَايَتِيْ
أَتُحْرِقُنِيْ بِالنَّارِ يَا غَايَةَ الْمُنٰى ... فَأَيْنَ رَجَائِيْ ثُمَّ أَيْنَ مَخَافَتِيْ

یعنی اے وہ ذات جو کہ ہر حاجت میں مقصود ہے۔ میں نے آپ کی طرف اپنی تکلیف بیان کردی۔ پس میری تکلیف کو دور فرما دیجئے۔ اے وہ ذات جس سے میری امیدیں وابستہ ہیں۔ آپ ہی میرے رنج و غم کو دور کر سکتے ہیں۔ لہٰذا میرے سب گناہوں کو بخش دیجئے اور میری حاجت روائی فرمایئے میں آپ کے دربار میں نہایت ہی ردی اور قبیح اعمال لیکر حاضر ہوا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کی مخلوق میں مجھ جیسا گنہگار بندہ کوئی اور نہ ہوگا۔ بایں ہمہ اے میری امیدوں کی انتہا اور میری آرزوؤں کے منتہا کیا آپ مجھے آگ میں جلائیں گے۔ اگر بالفرض ایسا ہوا تو پھر میری امید کیا کام آئی اور میرا خوف کیا کام آیا۔ یہ کہا اور زمین پر بیہوش ہو کر گر پڑے۔

اصمعی کہتے ہیں کہ میں نے اس جوان کو قریب سے جا کر دیکھا تو حضرت زین العابدین علی بن حسین بن علی ابن ابی طالبؓ تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے ان کا سر مبارک اپنی گود میں رکھا اور خود بھی رونے لگا۔ میرے آنسوؤں کے چند قطرے آپ کے رخسار پر گرے۔ جسکی وجہ سے آپ نے آنکھ کھولدی اور فرمایا یہ کون ہے جو میرے اور میرے رب کے درمیان حائل ہو گیا ہے اور مجھ پر ہجوم کر رکھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کا غلام اصمعی ہے اور کہا کہ اے ہمارے سید آپ تو اہل بیت نبوت اور معدن رسالت سے ہیں پھر اس قدر جزع فزع کیسی؟ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے کہ إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ

اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْراً ۔ یعنی اللہ تعالیٰ ۔ اے اہل بیت ارادہ کرتا ہے کہ تم سے گندگی دور کر دے اور تم کو پاک کر دے ۔ پاک کرنا ۔ آپ نے فرمایا ۔ اے اصمعی کیا بات کہتے ہو ۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کو مطیعین کے لئے پیدا کیا ہے اگرچہ وہ عبد حبشی ہی کیوں نہ ہو اور دوزخ کو عاصیین کے لئے پیدا کیا ہے اگرچہ وہ حر قرشی ہی کیوں نہ ہو اور کیا اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا ہے کہ فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَا اَنْسَابَ بَیْنَھُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَاءَلُوْنَ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُولٰئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُولٰئِکَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَھُمْ فِیْ جَھَنَّمَ خَالِدُوْنَ ۝ یعنی جب نفخ صور ہو گا تو اس دن باہم نسب کام نہ آئے گا اور نہ اس کے بارے میں ان سے سوال کیا جائے گا بلکہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو گا وہ لوگ فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کی نیکیوں کا پلہ ہلکا ہو گا ۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے نفسوں کو خسارہ میں ڈال رکھا ہے جو کہ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ۔

سبحان اللہ کس قدر پاکیزہ حال تھا آپ کے قلب اطہر کا اور اس میں بھی کس درجہ متبع سنت تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حال کی تصویر بعد والوں کو اپنے حال سے دکھلا دی اور جس حال سے خود متصف تھے نہ معلوم کتنے لوگوں کو متصف اور متاثر کر دیا ہو گا ۔ چنانچہ یہ سلسلہ برابر چلتا ہی رہا ۔

شیخ سعدیؒ بوستاں میں لکھتے ہیں کہ :-

عبدالقادر گیلانی را دیدند رحمۃ اللہ علیہ درحرم کعبہ روئے برحصار نہادہ بود و می گفت ۔ حضرت عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو لوگوں نے دیکھا کہ حرم شریف کی کنکریوں پر پیشانی رکھے ہوئے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ اے خداوند بجشائے واگر مستوجب عقوبتم مرا روز قیامت نابینا برانگیز تا در روئے نیکاں شرمسار نہ باشم ۔ اے خداوندا مجھے بخش دیجئے اور اگر میں سزا ہی کا مستحق ہوں تو مجھے روز قیامت نابینا اٹھائیو ۔ تاکہ نیکوں کے سامنے شرمندہ نہ ہوں ۔

سبحان اللہ خوف و رجا کے جو الفاظ سننے میں آتے ہیں ان حضرات کے عمل سے اس کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے ۔ کتنے زبردست اولیاء اللہ میں سے ہیں ، چنانچہ انھیں کا وہ واقعہ ہے کہ بغداد کی جامع مسجد میں منبر پر بیٹھ کر فرمایا تھا کہ میرا قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے اور تمام اولیاء اللہ نے اس کلمہ کو سنا اور اپنی اپنی جگہ سے فرمایا کہ بلکہ ہمارے سر آنکھوں پر ۔ ایسا تو حضرت کا مرتبہ تھا اور خشیت کا یہ عالم تھا کہ حرم شریف میں کنکریوں پر پڑے ہوئے رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اے اللہ میرے گناہ بخش دے حضرت کے اس حال سے پتہ چلتا ہے کہ طاعت نے اپنا اثر کیا تھا اور اس کے ذریعہ سے حق تعالیٰ کی پوری معرفت قلب میں آگئی تھی اور اس کے آگے اپنے کو انتہائی قصوروار اور گنہگار سمجھ رہے تھے ۔ اور حقیقی

طاعت کا یہی اثر ہوتا ہے اور اگر طاعت کے بعد تواضع فروتنی کسروانکسار اور فنائیت نہ پیدا ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ عبادت میں اخلاص ہی نہیں ہے۔ ایسوں ہی کے متعلق مولانا روم فرماتے ہیں ؎

این کہ می بینی خلافِ آدم اند　　نیستند آدم غلاف ادم اند

یعنی آدم علیہ السلام کی صفات تواضع۔ فروتنی۔ انکسار۔ عاجزی۔ انابت۔ توبہ واستغفار اور اعتراف ذنب تھیں لہٰذا جس آدمی میں یہ صفات نہ ہوں تو بھلا وہ کیا آدمی ہے۔ کیونکہ فی الواقع آدمی وہی ہے جو صفات آدم کا حامل ہو اور باپ کی میراث سے جسے حصہ ملا ہو ورنہ تو محض آدمی کی صورت پر سمجھا جائے گا اور سیرت سے عاری ہوگا اور یہ ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی شیر کی کھال پہن لے تو بظاہر شیر معلوم ہوگا حقیقتاً شیر نہ ہوگا۔

آگے فرماتے ہیں ؎

میم واؤ میم نون تشریف نیست　　لفظ مومن جز پئے تعریف نیست

یعنی کوئی نام ہو مومن ہو یا کچھ اور محض تعریف کے لئے ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا مومن حقیقتاً اسکو کہا جائے گا جس میں خاص قسم کی صفات ہوں باقی منافق پر مومن کا اطلاق کیا جانا ایسا ہی ہے جیسے شیر کی کھال پہننے والے کو شیر کہہ دیا جائے یا آدمی کی صورت رکھنے والے کو آدمی کہا جائے۔ اب اس زمانہ میں اس قسم کے لوگ بہت ہوگئے ہیں۔ کیسا کیسا اپنا نام رکھتے ہیں اور صفات غائب ہیں۔ انہی لوگوں کے متعلق مولانا فرماتے ہیں ؎

کار شیطاں می کند نامش ولی　　گر ولی این ست لعنت بر ولی

یہ کہہ رہا ہوں کہ حضرت شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کے جو ماننے والے ہیں ان پر تو شیخ کی یہ سیرت حجت ہی ہے اگر کسی کو اس میں سے کچھ حصہ نہیں ملا تو اسکو کچھ نہیں ملا اور وہ ناحق ماننے کا دم بھرتا ہے۔ بزرگوں کے یہ واقعات اس لئے بیان کر رہا ہوں تاکہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کلام اور آپ کے حال قلبی کا کچھ اندازہ ہوجائے اور یہ معلوم ہوجائے کہ خوف اور خشیت کیا چیز ہے اور اللہ تعالیٰ سے بندوں کو کس طرح ڈرنا چاہیئے۔

اب لوگ ہم ہی سے آکر کہتے ہیں کہ بس قرآن کافی ہے۔ میں انھیں یہ جواب دیتا ہوں کہ ہاں بیشک کافی ہے مگر آپ نے اس کو کافی بنایا کب ہے؟ آخر اسی قرآن میں تو یہ بھی ہے کہ "یرجون رحمتہ ویخافون عذابہ" آپ نے صرف اس کا ترجمہ دیکھ لیا ہوگا مگر اس کے مصداق کو کب سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ تو معلوم ہوتا ہے بزرگوں کی سیرت سے اور میں یہ کہتا ہوں کہ کیا یہ خوف وغیرہ زبان کی صفت ہے یا قلب کا حال ہے۔ پھر آپ نے اسکی کتنی خدمت کی ہے۔ اور قلب کی جانب توجہ کرنے کی فرصت کہاں

آپ کو ملی ہے؟

اب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ دل کا کام بھی زبان سے لے لیں اور حال کی جگہ قال پیش کریں تو اس سے کام نہیں چلے گا۔ بزرگوں نے خود بھی حال پیدا کیا ہے اور پھر اسکو دوسروں میں منتقل فرمایا ہے اور کسی چیز کی اشاعت کا یہی طریقہ بھی ہوتا ہے یعنی جب بڑے یہ چاہتے ہیں کہ چھوٹوں سے کچھ کام کرائیں تو پہلے اسکو خود کرنے لگتے ہیں چنانچہ یہی مسنون بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ دعا فرمائی اللھم لا مانع لمن اعطیت ولا معطی لمن منعت۔ تو صحابہ نے بھی اس دعا کو سنا اسکی وجہ سے سب کے اندر یقین پیدا ہوگیا کہ بیشک مومن کا سب کام خدا کی ہی اعانت سے ہوتا ہے اسی طرح حضرت جیلانیؒ نے سب کے سامنے جو یہ عمل کیا تو اسی لئے کہ حاضرین اپنے اپنے یہاں جاکر اسکو نقل کریں اور تمام عابدین کیلئے شیخ کا یہ عمل تازیانہ کا کام کرے یعنی وہ یہ سمجھیں کہ جب اتنے بڑے کامل شیخ کی نظر اپنی طاعت پر نہیں ہے تو ہم لوگ بھلا کیا اپنی طاعت پر نظر کریں اور شیخ سعدی نے اس حکایت کو تو اپنی کتاب ہی میں لکھ دیا تاکہ ہر دور میں اس کا تذکرہ کم از کم لسان پر تو جاری رہے کیونکہ جب زبان پہ بار بار آتا رہیگا تو امید کی جاسکتی ہے کہ ایک نہ ایک دن قلب میں بھی اتر جائے ورنہ اگر کتاب ہی میں نہ ہوگا تو پھر زبان پر بھی نہ آسکے گا۔ بس جب تک دیکھنے والے موجود ہوں گے اس وقت تک تو جاری رہے گا اور ان کے بعد ختم ہوجائے گا کیونکہ قاعدہ ہے کہ صلاح کی باتیں صالحین کی ذات ہی تک رہتی ہیں اور جب یہ لوگ نہیں رہ جاتے تو باتیں بھی ختم ہوجاتی ہیں غرض شیخ حرم کعبہ میں جو اس طرح روئے تو حاضرین کے قلوب کو ہلا دیا اور اپنے اس ایک رونے سے نہ جانے کتنی مخلوق کو خالق سے ملا دیا۔ یہ واقعہ گو دیکھنے میں ایک چھوٹا سا واقعہ تھا مگر اثر کے لحاظ سے اس وقت کے سب لوگوں کو اور بعد میں بھی کتنے لوگوں کے لئے خدا تک پہونچنے کا ذریعہ بن گیا۔

آپ سے کہتا ہوں کہ جب یہ حال پیدا ہوجائے تو آپ کہیں بھی رہیں کچھ ڈر نہیں ہے۔ ہوائی جہاز میں اڑیں کہیں چلے جائیں کچھ مضائقہ نہیں لیکن جب تک قلب میں یہ کیفیت اور حال نہ پیدا ہوجائے آدمی کے الجھ جانے کے لئے ایک معمولی سا کانٹا بھی کافی ہے اور دنیا کی تو ہر چیز ہی کانٹا ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کسی کو اس سے محفوظ فرمالیں۔

اور میں نے یہ جو کہا کہ جب بڑے کوئی کام چھوٹوں سے لینا چاہتے ہیں تو پہلے خود اسے کرتے ہیں تاکہ اصاغر اکابر کی تقلید کریں کیونکہ دستور ہے کہ اصاغر اپنے اکابر کی تقلید کیا کرتے ہیں اور جب پیر ہی کسی کام کو نہیں کرتا تو مرید بھی نہیں کرتے بلکہ اسکی ذراسی غفلت کی وجہ سے دوسرے لوگ بہت دور جا پڑتے ہیں ہم نے خود دیکھا

کہ مدرسہ دیوبند کے دارالحدیث کی عمارت بن رہی تھی۔ بنیادیں کھودی جاچکی تھیں کہ اچانک اس قدر بارش ہوئی کہ ساری بنیادیں پانی بھر گیا جسکی وجہ سے دوسری عمارت کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا۔ حضرت مولانا دیوبندی تشریف رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت مہتمم صاحب نے اگر حضرت دیوبندی سے صورت حال عرض کی حضرت نے طلبہ سے کچھ بھی نہیں کہا بلکہ خود برتن لے کر پانی میں گھس پڑے اور باہر پھینکنے لگے۔ آپ کی دیکھا دیکھی سب ہی طلبہ پانی میں گھس پڑے اور چند گھنٹوں میں سارا پانی باہر نکال کر پھینک دیا۔

بہرحال یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان اپنے بڑوں کی تقلید کرتا ہے اچھی چیزوں میں بھی اور بری چیزوں میں بھی۔ چنانچہ مشہور ہی ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تواضع اور انکسار اختیار فرمایا تو حضرت زین العابدین نے بھی اسی کو اختیار فرمایا اور پھر حضرت جیلانی رح کے واقعہ میں بھی آپ نے اسے ملاحظہ فرمایا اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کا واقعہ سنئے۔ لوگ ان سے خفا تو ہیں لیکن دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا معاملہ کیسا درست کئے ہوئے تھے۔ عبداللہ سہمی روایت کرتے ہیں کہ ثمامہ بن کلثوم نے بیان کیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سب سے آخری جو خطبہ تھا وہ یہ تھا۔

> "فرمایا کہ اے لوگو میں اب تک تمہارا والی تھا اور یہ سمجھ لو کہ مجھ سے بہتر والی تمہیں اب نہیں ملے گا۔ آئندہ جو بھی والی ہوگا وہ بدتر ہی ہوگا۔ یہ فرماکر یزید سے مخاطب ہوکر کہا کہ سنو! جب میری موت ہوجائے تو میرے غسل کا منتظم کسی سمجھدار شخص کو بنانا اور خزانہ شاہی کھول کر اس میں سے وہ رومال نکال لینا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کپڑا اور کچھ موئے مبارک اور چند ٹکڑے ناخن مبارک کے بندھے ہوئے رکھے ہیں۔ پھر ان ٹکڑوں کو میری ناک۔ منہ اور آنکھوں میں رکھدینا اور اس کپڑے کو میرے کفن کے اندر جسم سے ملاکر رکھدینا اور والدین کے متعلق اللہ تعالیٰ کی وصیت کو یاد رکھنا اور جب میرا جنازہ قبرستان لیجاکر قبر میں رکھ چکنا تو پھر معاویہ کو ارحم الراحمین کے سپرد کردینا۔

سبحان اللہ دیکھا آپ نے یہ ہیں حضرت معاویہ رضؓ اور یہ ہے ان کی وصیت۔ زندگی میں بھی ان کی عجیب حالت رہتی تھی۔ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور حضرات شیخین رضؓ کا ذکر یاد فرماتے تھے تو بہت روتے تھے یہ فرماتے تھے کہ معاویہ تو دنیا میں بالکل گھر کر رہ گیا ہے اور میں نے کسی کتاب میں یہ بھی دیکھا ہے کہ فرماتے تھے کہ اللہ ابوبکر رضؓ پر رحم کرے وہ تو دنیا سے بالکل پاک وصاف تشریف لے گئے یعنی نہ انھوں نے دنیا کا قصد کیا اور نہ دنیا نے ہی ان کا قصد کیا۔ اسی طرح اللہ عمر رضؓ پر رحم کرے کہ انھوں نے بھی دنیا کا قصد نہیں کیا لیکن دنیا

نے ان کا قصد کیا اور رہا معاویہ تو وہ تو دنیا میں بالکل لت پت ہی ہو گیا۔ یہ فرماتے اور زار و قطار روتے یہاں تک کہ آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔ آخر تھے تو حضور کے صحابی ہی۔ آپ کی تعلیمات اور آپ کی دعا کا اثر قبول کئے ہوئے تھے یعنی خوف و خشیت کی جو تفسیر حضور کے عمل سے دیکھی تھی اپنی سیرت میں بھی اسکو جاری فرمایا تھا۔ یہ تو خوف کا حال تھا جو ساری زندگی رہا لیکن آخری حالت میں رجا کو غالب کیا چنانچہ مقام رجا میں ہی یہ فرمایا تھا کہ قبر میں معاویہ کو ارحم الراحمین کے حوالہ کر دینا۔ مطلب یہ کہ وہاں کا معاملہ تو ارحم الراحمین ہی کے رحم و کرم سے طے ہوگا۔ عمل وغیرہ وہاں کچھ کام نہ بنا سکیں گے۔

غرض یہی تواضع اور انکسار۔ توبہ و انابت اور استغفار ہر زمانہ میں بزرگوں کا شعار رہا ہے چنانچہ شیخ سعدی نے گلستاں میں ایک باب ہی اخلاق درویشاں کا قائم فرمایا ہے اور اس میں بزرگوں کے ایسے ایسے واقعات لائے ہیں کہ سبحان اللہ کیا کہنا۔ طریق کو بالکل سمجھا دیا ہے اور بہت سے لوگوں کو اس کے ذریعہ سے ولی کامل بنا دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ درویشے را دیدند کہ سر بر آستانہ کعبہ می مالید و می نالید۔ یعنی ایک درویش کو بزرگوں نے دیکھا کہ کعبہ کی چوکھٹ پر سر رگڑ رہا تھا اور رو رہا تھا و می گفت یا غفور یا رحیم تو دانی کہ از ظلوم و جہول چہ آید اور یہی کہتا تھا کہ اے غفور اے رحیم تو جانتا ہے کہ ظلوم و جہول سے کیا ہو سکتا ہے سوائے ظلم اور جہالت کے مطلب یہ کہ آپ نے تو خود ہی اپنے کلام میں انسان کو ظلوم و جہول فرمایا ہے تو میں بھی اسی کا ایک فرد ہوں اس لئے ظلم و جہالت میں مبتلا ہوں ؎

عذر تقصیر خدمت آوردم — کہ ندارم بہ طاعت استظہار

یعنی میں آپ کی خدمت میں اپنی کوتاہی کا عذر لے کر آیا ہوں اس لئے کہ طاعت کا تکیہ اور سہارا میرے پاس کچھ نہیں ہے ؎

عاصیاں از گناہ توبہ کنند — عارفاں از عبادت استغفار

جو گنہگار ہیں وہ تو اپنے گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور جو عارف ہیں وہ اپنی عبادت سے بھی استغفار کرتے ہیں۔ کیونکہ عارف ہونے کے سبب یہ سمجھتے ہیں کہ میری عبادت اس ذات کے شایان شان نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ عبادت ہی کیا ہوئی۔ گناہ ہوا۔

عابداں جزائے طاعت خواہند و بازرگانان بہائے بضاعت۔ جو عابد لوگ ہیں وہ تو اپنی طاعت کا بدلہ چاہتے ہیں اور جو سوداگر ہیں وہ اپنی پونجی کی قیمت چاہتے ہیں۔

من بندہ امید آوردہ ام نہ طاعت۔ بدریوزہ آمدہ ام نہ بہ تجارت مجھ غلام کے پاس کوئی طاعت نہیں ہے اس لئے امید لیکر حاضر ہوا ہوں۔ سائل اور بھکاری بنکر آیا ہوں تاجر بنکر نہیں۔ لہذا میرے ساتھ وہ

معاملہ فرمایئے جو آپ کے شایان شان ہے نہ وہ کہ جس کے ہم مستحق ہیں ؎

گر کشی در جرم بخشی روئے سر بر آستانم
بندہ را فرماں نہ باشد ہرچہ فرمائی برآنم

یعنی آپ چاہیں تو مار ڈالیں یا میرا جرم بخشدیں میرا سر بہرحال آپ کے آستانہ پر ہے اور غلام کے لئے تو حکم چلانا ہوتا نہیں جو کچھ آپ کا حکم ہو گا میں اس پر راضی ہوں ؎

بر در کعبہ سائلے دیدم
کہ ہمی گفت و می گرستی خوش
من نہ گویم کہ طاعتم بپذیر
قلم عفو بر گناہم کش

میں نے کعبہ کے دروازہ پر ایک سائل کو دیکھا کہ یہی کہہ رہا تھا اور رو رہا تھا کہ میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ میری طاعت قبول فرمایئے بلکہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ معافی کا قلم میرے گناہوں پر کھینچ دیجئے۔

اور سنیئے بزرگوں نے جب راستہ کا سراغ لگالیا کہ طریق نام ہے تواضع کا اور فنا کا تو پھر اللہ کے بندوں نے اپنے کو ایسا ایسا مٹایا ہے کہ جسکی نظیر ملنی مشکل ہے۔ یعنی اس امر کے پیش نظر رکھنے کے بعد انھوں نے اپنے کو سب سے حقیر اور کمتر جانا ہے اور باوجود محفوظ ہونے کے اور کثرت طاعت کے خود کو گنہگار ہی سمجھا ہے۔

چنانچہ حضرت ذوالنون مصریؒ کا قصہ بوستاں میں مذکور ہے کہ ایک سال مصر کے دریائے نیل میں پانی نہیں تھا جسکی وجہ سے قحط کے آثار ظاہر ہوئے کچھ لوگ کہسار کی طرف بارش طلب کرنے کے لئے نکلے بہت روئے دھوئے مگر آسمان کو ان کے حال زار پر رونا نہ آیا یعنی بارش نہ ہوئی۔ حضرت ذوالنون مصری کو بھی مخلوق کی اس پریشانی کی اطلاع کی گئی اور عرض کیا گیا کہ آپ بھی اللہ تعالیٰ سے دعا فرما دیجئے کہ مقبول خدا ہیں اور مقبولین کی دعا رد نہیں ہوتی۔ شیخ لکھتے ہیں کہ میں نے سنا کہ یہ سن کر حضرت ذوالنون مدین کی طرف روانہ ہو گئے چنانچہ ان کا شہر مصر سے باہر نکلنا تھا کہ بارش شروع ہو گئی اور انہیں مدین پہنچکر اس کی اطلاع ہوئی کہ بارش ہو چکی ہے اور دریا پانی سے لبریز ہو گیا۔ کسی عارف نے ان سے تنہائی میں پوچھا کہ آپ کے مصر سے چلے جانے میں کیا راز تھا فرمایا کہ میں نے سنا تھا کہ قحط جو ہوتا ہے تو وہ برے لوگوں کے افعال بد کی وجہ سے ہوتا ہے اور میں نے جہانتک غور کیا اپنے سے زیادہ کسی کو اس بستی میں گنہگار نہ پایا۔ اس لئے میں ہی وہاں سے چلا گیا کہ خواہمخواہ میری نحوست کا خمیازہ یہ لوگ کیوں بھگتیں۔ سبحان اللہ دیکھا آپ نے یہ ہے آپ کے اسلاف کی سیرت اور یہ وہی حضرت ذوالنون ہیں جن کی شکایت کسی نے بادشاہ وقت سے کر دی تھی۔ اس نے انھیں بلوا بھیجا۔ لیکن جب ان سے گفتگو کی تو

ان کے علم و فضل کا اُسے اندازہ ہوا۔ پھر بڑی عزت کے ساتھ پیش آیا اور یہ کہا کہ جس مجلس میں اولیاء اللہ کا ذکر کیا جاوے اور ذوالنون مصری کا ذکر نہ کیا جائے تو بڑے ظلم کی بات ہے۔

حضرت تھانویؒ سے کسی نے عرض کیا کہ حضرت ذوالنون مصریؒ نے یہ جو فرمایا یہ تو بظاہر خلاف معلوم ہوتا ہے حضرت نے فرمایا کہ شاید صحیح کہتے ہوں جضرت سے دریافت کرنے کی تو ہمت پڑی نہیں کہ آخر اس کا کیا مطلب ہے، مگر بعد میں سمجھ میں آگیا وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے معارف اور فضل و احسانات جو ان حضرات پر ہوتے ہیں اس کے مقابلہ میں باوجود طاعت وغیرہ کرنے کے یہ لوگ اپنے کو واقعی قصوروار ہی سمجھتے ہیں کیونکہ بزرگوں نے لکھا ہے کہ توحید وہ دَین ہے کہ اس سے آدمی کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا بلاشبہ ان بزرگوں کا بڑا احسان ہے کہ راستہ کو بالکل واضح کر دیا۔

ان واقعات کے سننے سے آپ کو بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انا البائس الفقیر کے ذریعہ جو تعلیم امت کو دی تھی امت نے اسے سیکھا اور اس امر میں بھی متبع سنت ہوئی اور آپ تو تھے معصوم پھر بھی جو اس طرح سے دعا مانگی تو مقصود اس سے یہی تھا کہ امت کو اعتراف ذنب کا طریقہ تعلیم فرمائیں چنانچہ اگر آپ عمل کرکے خود نہ بتلا دیتے اور محض قال پر اکتفا فرماتے تو کسی کو اس کا خاص طریقہ ہی نہ معلوم ہوتا مگر آپ کی تعلیم کے بعد اب سب کے لئے آسان ہوگیا۔ اور امت کو یہ معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ اسی طرح طے کیا جاتا ہے ورنہ تو ہم لوگ اعتراف ذنب کی فضیلت سنتے لیکن اس پر عمل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ یہی کرتے کہ زبان سے کہہ لیتے کہ یا اللہ ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ مگر یہ بات کہ اعتراف میں قلب کا کیا حال ہونا چاہیئے اور طرز اعتراف کیا ہونا چاہیئے یہ سب کچھ سمجھ میں نہ آتا مگر جب آپ نے خود مناجات کرکے اعتراف ذنب کا طریقہ بتایا تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ امت کو خواہ عاصی ہو یا مطیع عابد ہو یا مذنب سبھی کو اعتراف ذنب کرنا چاہیئے اور یہ سب کے لئے لازم ہے اور اس میں انتہائی تضرع و زاری اور غایت مسکنت و انکساری ہونی چاہیئے اور یہ بھی سنت ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔ ؎

پے نہ برد ہیچ کس تا منزل حق الیقیں
گر نہ بودے ذات پاکت اندریں رہ مقتدا

اور اس میں شک نہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عملی تعلیم نہ فرماتے تو کسی کی سمجھ میں نہ آتا کیونکہ یہ مشکل چیز تھی بالخصوص عابدین کے لئے کہ کریں عبادت اور سمجھیں اپنے آپ کو مذنب یہ بہت مشکل تھا کسی فقیر اور محتاج کو خود کو محتاج سمجھنا آسان ہے مگر کسی مالدار کا اپنے آپ کو فقیر سمجھنا بہت

مشکل ہے۔ اسی طرح کسی گنہگار کا اپنے کو خطاکار سمجھنا نہایت آسان بات ہے مگر کسی عابد کا اپنے کو گنہگار سمجھنا اور اپنی عبادت سے صَرفِ نظر کرلینا آسان کام نہیں ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب کسی کو اللہ تعالیٰ کی کامل معرفت ہی حاصل ہو جائے اور وہ یہ سمجھے کہ میری کوئی عبادت اللہ تعالیٰ کی جناب کے شایانِ شان نہیں یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہی اس کے شاملِ حال ہو جائے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کو چونکہ اللہ تعالیٰ کی کامل معرفت ہوتی ہے اس لئے باوجود عبادت اور غایت قرب بلکہ عصمت کے بھی وہ اپنے کو اللہ تعالیٰ کا بیحد محتاج اور خود سراپا خطاکار ہی سمجھتے ہیں اور دوسروں کی تعلیم کے لئے اس طرح دعائیں کرکے اپنا عجز و انکسار اپنی مسکنت و افتقار کو ظاہر فرماتے ہیں چنانچہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے جو سچے جانشین ہوتے ہیں ان کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پورے مطیع ہوتے ہیں اور اپنا سارا وقت اسی کی طاعت اور رضا کے کاموں میں صرف کرتے ہیں (مگر اپنے کو قصوروار ہی سمجھتے رہتے ہیں) یہ بھی عجیب بات ہے کہ کام کرتے تو ہیں یہ حضرات جنت کا اور ڈرتے ہیں دوزخ سے اور جو لوگ کہ شب و روز معصیت میں منہمک رہتے ہیں انھیں دوزخ بھولکر بھی یاد نہیں آتی۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ منافق کہ جہنم میں جائے گا (اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ) مگر اس کو اس کا خطرہ تک نہیں گذرتا اور باوجودیکہ نفاق سے پُر ہوتا ہے۔ مگر اپنے اوپر نفاق کا شبہ تک نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے مومن نفاق سے بری ہوتا ہے۔ مگر ہر وقت وہ اپنے اوپر نفاق کا خوف ہی کرتا رہتا ہے

بہرحال حقیقی طاعت کا یہی اثر ہوتا ہے کہ انسان خود اپنے میں کوئی کمال نہیں دیکھتا۔ ورنہ تو اگر طاعت کے بعد تواضع فروتنی اور کسر و انکسار نہ پیدا ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ اس کی عبادت میں اخلاص نہیں ہے جیسا کہ مجتہد فی العبادۃ کا حال اور انجام ابتدا مضمون کی حدیث میں آپ نے دیکھا۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہاں اس عابد سے جو کچھ کلام صادر ہوا تو وہ کبر کی بنا پر اور غضباً للنفس ہوا ورنہ تو اگر بغض فی اللہ کے سبب ہوتا تو اس کے ساتھ بھی اچھا ہی معاملہ ہوتا مگر چونکہ وہ مغرور بالعباد تھا۔ مذنب تائب کو حقیر سمجھنے والا تھا اس لئے سزا پا گیا۔ یہیں سے کہا گیا ہے کہ وہ معصیت جو انسان میں ذلت اور استغفار پیدا کرے اس طاعت سے کہیں بہتر ہے جو عجب اور استکبار پیدا کرے۔

نیک لوگوں میں خواہ عالم ہوں یا عابد بس یہی روگ لگ جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ ظاہری نیکی ہی ان کے لئے وبالِ جان ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس علم و عبادت کا ایسا نشہ ہوتا ہے کہ اسکی وجہ سے آدمی نہ اپنی ہی رعایت کرتا ہے نہ دوسرے کی بلکہ اس کا ضرر لازمی بھی ہو جاتا ہے اور متعدی بھی۔ اس کی تائید میں آپ کے سامنے حضرت سیدنا رفاعیؒ کا قول نقل کرتا ہوں جو اپنے وقت کے

درویش کامل تھے۔

فقہاء کے درجات قائم کر کے فرماتے ہیں کہ تیسرا درجہ اس شخص کا ہے جس نے مشکل مسائل کو حل کیا۔ منقولات و معقولات کی باریک باتیں معلوم کیں۔ مناظرہ کے دریاؤں میں گھس گیا اور ان تمام باتوں میں اس کی نیت یہ ہے کہ علم حاصل کر کے شریعت کی مدد کریگا مگر اس کے اندر غرور علم ہے۔ علم کی وجہ سے دوسروں کو اپنے سے کم سمجھتا ہے، جب کسی مسئلہ میں شریعت کی حمایت کو کھڑا ہوتا ہے اس وقت اگر کوئی اس کی دلیل پر اعتراض کردے تو اپنے نفس کی حمایت میں ایسا مغلوب ہوجاتا ہے کہ حد سے نکل جاتا ہے اور مدمقابل کے خلاف دلیلیں قائم کرنے لگتا ہے اسکو برا کہنے لگتا ہے اور بعض اوقات اسکو کافر بنا دیتا ہے اس پر طعن کرنے لگتا ہے۔ اور ایسا حملہ کرتا ہے جیسا درندہ شکار پر حملہ کیا کرتا ہے۔ شریعت کے مقرر کردہ حد کی بالکل رعایت نہیں کرتا۔ نہ اپنے حالات میں نہ اس مدمقابل کے معاملات میں۔"

(انتہیٰ)

بس مجھے یہاں یہی دکھلانا ہے کہ ایسا شخص اپنی بھی رعایت نہیں کرتا اور نہ اپنے مدمقابل کی یعنی ضرر اس کا لازمی بھی ہوتا ہے اور متعدی بھی۔

حدیث میں جو واقعہ مذکور ہوا اسی نوع کا ایک واقعہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے بوستاں میں بھی لکھا ہے اس کو میں کچھ شرح کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں اور اس قسم کی باتیں وضاحت کے ساتھ اسلئے بیان کرتا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ اخلاق کسے کہتے ہیں اور بداخلاقی میں کیا نقصان ہے اور ہمارے اسلاف کس چیز کو دین سمجھتے تھے آج کل جیسا معاملہ نہیں تھا کہ لوگ صرف بزرگوں کے بدن پر گرنا چاہتے ہیں اور ان کی تعلیمات کی جانب اصلاً التفات نہیں کرتے۔ یہ بوستاں ہے۔ شیخ نے اس میں حکایت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور عابد ناپارسا بیان فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

شنیدستم از راویانِ کلام	کہ در عہد عیسیٰ علیہ السلام
یکے زندگانی تلف کردہ بود	بجہل و ضلالت سر آوردہ بود
دلیرے سیہ نامۂ سخت دل	زناپاکی ابلیس از وے خجل

اہل تاریخ سے میں نے سنا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ایک شخص تھا جس نے اپنی زندگی برباد کر رکھی تھی یعنی جہالت اور گمراہی میں تمام عمر گذار دی تھی جبری

بیباک، قاسی القلب اور اعمالنامہ اس کا بالکل سیاہ ایسا کہ اسکی ناپاکی کے آگے ابلیس بھی شرمندہ تھا۔ اس کے یہ اوصاف شیخ بیان کر رہے ہیں اور آگے دیکھئے گا کہ اسی نے میدان مار لیا اور ایسی پاکی میں آگیا کہ ابلیس اس کے حال کو دیکھ کر منہ کے بل گر گیا ہوگا اور اپنے پنجہ سے اس کے چھوٹ جانے پر ساری عمر رویا ہوگا۔ معاملہ اللہ تعالیٰ کے اختیار کا ہے۔ اس شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف ایک بار اور وہ بھی دور سے دیکھا تھا اور اس کی یہ حالت ہوئی کہ کامیاب ہوگیا اور آگے آتا ہے کہ اس پارسا کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ جانے کتنی بار تشریف لائے ہونگے لیکن اس کا دوسرا ہی انجام ہوا اس کے بعد شیخ اس کی کچھ اور بدحالی بیان کر کے فرماتے ہیں کہ ؎

شنیدم کہ عیسیٰ در آمد ز دشت بمقصورۂ عابدے بر گذشت
بزیر آمد از غرفہ خلوت نشیں بپائش در افتاد سر بر زمیں
گنہگار برگشتہ اختر ز دور چوں پروانہ حیراں و ریشاں ز نور
تامل بحسرت کناں شرمسار چوں درویش در دست سرمایہ دار

میں نے سنا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنگل سے تشریف لا رہے تھے آپ کا گذر ایک عابد کے عبادت خانہ پر ہوا۔ آپ کو دیکھ کر عابد خلوت نشیں بالاخانہ سے نیچے آیا اور حضرت کے قدموں پر اپنا سر رکھدیا اور ادھر وہ بد نصیب گنہگار دور ہی سے ان دونوں کے معاملہ کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا جس طرح کہ پروانہ نور اور روشنی کو دیکھ کر بیتاب ہو جاتا ہے دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا اور حسرت کی نگاہوں سے ان کو اس طرح تکتا تھا جیسے کوئی غریب کسی امیر کے ہاتھ کو بہ نظر حسرت تک رہا ہو۔ پھر کچھ دور چل کر شیخ فرماتے ہیں کہ وہ زار و قطار رو رہا تھا اور یہ دعا کر رہا تھا ؎

گناہم بہ بخش اے جہاں آفریں کہ گر با من آید فبئس القریں

یعنی اے پروردگار میرے گناہ کو بخش دے کیونکہ قیامت میں بھی اگر وہ گناہ میرے ساتھ رہا تو نہایت ہی برا ساتھی ہوگا۔ یہ تو اس گنہگار کا حال تھا۔ اب پارسا کا حال سنئے:۔

دریں گوشہ نالاں گنہگار پیر کہ فریاد حالم رس اے دستگیر
وزاں نیمہ عابد سر پُر غرور ترش کردہ بر فاسق ابروز دور
کہ ایں مدبر اندر پئے ما چرا است نگوں بخت ناداں چہ ہم جنس ماست

ادھر تو اس گوشہ میں بڈھا گنہگار رو رہا تھا اور کہتا تھا کہ اے خدا میری دستگیری فرما اور دوسری جانب وہ عابد جس کا سر غرور سے پُر تھا دور ہی سے اس گنہگار غریب کو دیکھ دیکھ کر چیں بجبیں ہو رہا تھا اور

کہتا تھا کہ یہ بدبخت ہمارے پیچھے کیوں لگا ہے۔ جاہل ہے۔ بدنصیب ہے ہم سے اسکو نسبت ہی کیا۔ ذرا آگے چل کر شیخ نے اس کا یہ مقولہ بھی نقل کیا جو اس نے انتہائی تکبر اور غرور میں کہا۔ کہتا تھا ؎

همی رنجم از طلعت ناخوشش　　　مبادا کہ در من فتد آتشش

بمحشر کہ حاضر شود انجمن　　　خدایا تو با او مکن حشرِ من

یعنی میں اس کے بُرے دیدار سے اس لئے رنجیدہ ہوتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی آگ میں سے کچھ مجھ پر بھی پڑ جائے، ہو اے خدا محشر کے روز جبکہ ساری دنیا حساب و کتاب کے لئے جمع ہوگی تو میرا حشر اس کے ساتھ نہ کیجیو۔

دیکھئے یہی وہ حالت ہے جس کے متعلق سیدنا رفاعیؒ نے فرمایا ہے کہ انسان کبھی نہ اپنی رعایت کرتا ہے نہ اپنے مد مقابل کی۔ یہاں بھی اس عابد ناپارسا نے نہ اپنی رعایت کی کیونکہ سر میں پندار رکھا اور گنہگار کی تحقیر کی اور نہ اس کی رعایت کی بلکہ جو منہ میں آیا کہا۔ ان سب کا رذائل ہونا ظاہر ہے۔ آگے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

دریں بُد کہ وحی از جلیل الصفات　　　درآمد بعیسیٰ علیہ الصلاۃ

کہ گر عالم است آں وگر وے جہول　　　مرا دعوتِ ہر دو آمد قبول

عفو کردم از وے عمل ہائے زشت　　　درآرم بفضل خودش در بہشت

وگر عار دارد عبادت پرست　　　کہ در خلد با وے بود ہم نشست

بگو ننگ از و در قیامت مدار　　　کہ آں را بجنت برند ایں بنار

کہ آں را جگر خوں شد از سوز و درد　　　گر ایں تکیہ بر طاعتِ خویش کرد

ندانست در بارگاہِ غنی　　　کہ بے چارگی بہ کہ کبر و منی

یعنی وہ اپنے غرور ہی میں مست تھا کہ حق تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی آگئی کہ اگر یہ عالم ہے تو کیا اور وہ جاہل ہے تو کیا میں نے دونوں کی دعا قبول کرلی۔ وہ دعا یہ تھی ؎

گناہم بہ بخش اے جہاں آفریں　　　کہ گر با من آید فبئس القرین

اس گنہگار سے تو اس کے بُرے اعمال کو معاف کر دیا اور محض اپنے فضل و کرم سے جنت میں داخل کر دیا اور فرمایا ان عابد صاحب کو اگر اس بات سے عار ہے کہ اس کے ساتھ جنت میں رہیں تو ان سے کہدو کہ قیامت میں عار کا بالکل اندیشہ نہ کریں۔ اس کو جنت میں لیجائیں گے اور تم کو جہنم میں۔ اس لئے کہ اس غریب کا تو دل پارہ پارہ اور جگر بالکل خون ہوگیا ہے اور انہوں نے اپنی طاعت پر تکیہ کیا تھا۔ کیا یہ

اتنی بات بھی نہیں جانتے کہ غنی کے دربار میں بیچارگی ہی بھلی ہے کبر اور انانیت سے ؎

کرا جامہ پاک است و سیرت پلید | در دوزخش را نباید کلید
برین آستاں عجز و مسکینیت | بہ از طاعت و خویشتن بینیت
چوں خود را زنیکاں شمردی بدی | نمی گنجد اندر خدائی خودی
اگر مردی از مردی خود مگوئی | نہ ہر شہ سوارے بدر بردہ گوئی
پیاز آمد آں بے ہنر جملہ پوست | کہ پنداشت چوں پستہ مغزے در اوست
دریں نوع طاعت نیاید بکار | برو عذر تقصیر طاعت بیار
نخورد از عبادت برآں بے خرد | کہ با حق نکو بود با خلق بد

(ترجمہ) جس شخص کا ظاہر اچھا ہے اور باطن خراب ہے اس کے لئے (دوزخ کے دروازے) پہلے سے کھلے ہوئے ہیں۔ دوزخ اس کے انتظار میں ہے (لہذا) دوزخ کا دروازہ کھولنے کے لئے کنجی کی حاجت نہیں ہے۔ اس درگاہ میں تو عاجزی اور مسکنت ہی چاہیئے نہ کہ طاعت اور خود بینی۔ کیونکہ تو نے اگر اپنے کو پارسا گمان کیا تو نہایت برا ہے اس لئے کہ خدائی کے اندر خودی کا گذر نہیں۔ اگر تم عقلمند ہو تو اپنی بڑائی مت ہانکو اس لئے کہ ہر شہسوار کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جولان گاہ میں گیند آگے لیجائے۔

جو شخص اپنے متعلق یہ خیال کرے کہ وہ مانند پستہ کے مغز ہی مغز ہے تو جان لو کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ ایسا شخص مہمل ہے اور مانند پیاز کے ہے تہ بہ تہ چھلکا ہی چھلکا ہے۔ اس قسم کی عبادت (جس کے بعد عجب پیدا ہو جائے) کچھ کام نہیں آتی بلکہ در اصل طاعت کر کے اپنی تقصیر کی معذرت پیش کرنی چاہیئے (تاکہ کچھ کام دے جائے) دیکھو وہ عابد اسی حقیقت سے بے خبر تھا اس لئے اپنی عبادت کے ثمرات نہ پا سکا کیونکہ حق تعالیٰ کے ساتھ اس کا معاملہ درست تھا (کہ عابد تھا) مگر مخلوق کے ساتھ برا تھا (کہ کبر میں مبتلا تھا) آگے شیخ بطور تنبیہ کے فرماتے ہیں ؎

سخن ماند از عاقلاں یادگار | ز سعدی ہمیں یک سخن یاد دار
گنہ گار اندیشہ ناک از خدائے | بہ از پارسائے عبادت نمائے

(ترجمہ) قاعدہ ہے کہ عاقلوں کی باتیں یاد رکھی جاتی ہیں لہذا تم بھی سعدی سے یہی ایک بات یاد رکھ لو کہ جس گنہگار کو خوف خدا ہو اور وہ اپنے معاصی کی وجہ سے لرزاں اور ترساں ہو اور مغفرت کے باب میں صرف خدا پر اس کی نظر ہو (وہ عاصی) اس پارسائے بہتر ہے جس کو اپنی

عبادت پر ناز ہو اور اس وجہ سے خوف خدا اس کو نہ ہو۔

میں نے یہ پورا واقعہ جو آپ کو سنایا تو مقصد اس سے یہی اس کا آخری شعر تھا کہ ؎

گنہگار اندیشناک از خدائے   بہ از پارسائے عبادت نمائے

اس کے متعلق کچھ تفصیل سے کہنا چاہتا ہوں سنئے۔

شیخ سعدیؒ مقابلہ فرماتے ہیں کہ یہ عبادت پرست ایسا ہے کہ سلوک کو تو اس سے زیادہ اس گنہگار نے سمجھا کیونکہ عبادت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ کی معرفت ہو اور معصیت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ سے دور کر دیتی ہے۔ چونکہ اس پارسا کی عبادت ریائی تھی اور اس نے اس کے اندر کبر شامل کر لیا تھا۔ اس لئے یہ عبادت بھی خدا سے بُعد کا ذریعہ بن گئی۔ اور اس گنہگار نے چونکہ حق تعالیٰ کا خوف کیا اور خدا کی پکڑ سے ڈرا اپنے گناہوں پر نادم ہوا اور حق تعالیٰ کے سامنے رویا۔ ان سب آثار نے اسکو حق تعالیٰ سے قریب کر دیا۔ عبادت کرنے کے بعد اگر عبادت پر نظر ہو اور خود پسندی پیدا ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ شخص عبادت پرست ہے۔ خدا پرست نہیں۔ عابد پارسا نہیں ہے بلکہ عابد ناپارسا ہے اور ان صفات میں اولاد آدم میں سے ہونے کے باوجود ابلیس کا متبع ہے کیونکہ طاعت میں ریا اور کبر ابلیس کی صفت ہے۔ اول بانی ریا و کبر کا ابلیس ہے اور اول العابدین انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور سب سے بڑی صفت ان میں تواضع اور خلوص ہوتی ہے۔ اب عابدین میں جو ریا اور کبر ہوتا ہے وہ ابلیس کے اغواء سے ہوتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ دشوار گذار گھاٹی ہوتی ہے عابدین کے لئے۔ اس سے مفر کی کوئی صورت نہیں بجز اس کے کہ انبیاء کی سچی پیروی ان کے اخلاق و عادات میں، ریاضات و مجاہدات میں اختیار کی جائے۔ یہی مطلب ہے اس شعر کا ؎

مپندار سعدی کہ راہِ صفا   تواں رفت جز بر پئے مصطفٰے

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اور ابلیس چونکہ اپنے ریا و کبر اور حسد کی بنا پر مردود بارگاہ ایزدی ہوا تھا اس لئے اولادآدم کو اغواء کرتا ہے اور ان میں یہ صفات بد پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ جو میں نے کہا کہ ریا اور کبر کا بانی ابلیس ہے تو اس کے متعلق سنئے۔

تکبر کے بارے میں تو نص ہی ہے کہ ابیٰ واستکبر وکان من الکافرین اور ریا کے بارے میں سنئے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ جنات چند ہزار سال سے زمین میں متصرف تھے اور آسمان پر بھی جاتے تھے۔ جب ان کا فساد اور خوں ریزی بڑھی تو ملائکہ نے

بحکم الٰہی بعض کو قتل کیا اور بعض کو جنگل پہاڑ اور جزائر میں منتشر کر دیا۔ ابلیس ان میں بڑا عالم اور عابد تھا۔ اس نے جنات کے فساد سے اپنی بے تعلقی ظاہر کی۔ فرشتوں کی صفائی سے یہ بچ گیا اور انھیں میں رہنے لگا۔ اور اس طمع میں کہ تمام جنات کی جگہ اب صرف میں تمام روئے زمین پر متصرف بنایا جاؤں۔ عبادت میں بہت کوشش کرتا رہا اور خلافت ارض کا خیال پکاتا رہا۔ جب حکم الٰہی حضرت آدم کی نسبت خلافت کا ظاہر ہوا تو ابلیس مایوس ہوا اور اپنی عبادت ریائی کے رائگاں جانے پر جوش حسد میں سب کچھ کیا اور ملعون ہوا۔ اسی واقعہ کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

صد ہزاراں سال ابلیس لعیں　　　　بود ز ابدال و امیر المومنین
پنجہ زد با آدمے نازے کہ داشت　　　　گشت رسوا ہم چو سرگیں وقت چاشت
پنجہ با مرداں مزن اے بوالہوس　　　　برتر از سلطان چہ می رانی فرس

یعنی لاکھوں سال ابلیس لعین بزرگ اور افضل اہل ایمان رہا حتیٰ کہ ناز و عجب میں آکر حضرت آدم کا مخالف اور مقابل بن بیٹھا۔ اور ایسا رسوا ہوا جیسے تیز دھوپ کے وقت گوبر۔ واقعی مردان خدا کا مقابلہ و دعویٰ مساوات کبھی نہ کرنا۔ بھلا بادشاہ سے آگے گھوڑا چلانا کیا زیبا ہے۔ اسی طرح یہ حضرات بوجہ قرب و قبول مثل بادشاہ کے ہیں۔ ان سے سبقت کا دعویٰ خسران محض ہے۔

اسی طرح حسد کا بانی بھی ابلیس ہے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

ور حسد گیرد ترا در رہ گلو　　　　در حسد ابلیس را باشد غلو
کو ز آدم ننگ دارد از حسد　　　　با سعادت جنگ دارد از حسد
عقبۂ زیں صعب تر در راہ نیست　　　　اے خنک آنکس حسد ہمراہ نیست

یعنی اگر راہ حق میں حسد تیرا گلوگیر ہو جائے تو سمجھ لے کہ حسد طریقہ ابلیس کا ہے اور وہ اس صفت میں کمال رکھتا ہے کہ اسکو آدم علیہ السلام سے بوجہ حسد ہی کے عار ہوا تھا اور واقع میں اس حسد کی بدولت اپنی ہی منفعت اور سعادت سے مخالفت کرتا تھا۔ اس راہ سلوک میں بھی حسد سے بڑھ کر کوئی امر مانع نہیں کہ اس کے سبب سے ناقصین کمال حاصل کرنے سے رہ گئے۔ کامل کا اتباع کرنے کو خلاف شان سمجھا بالخصوص اپنے شیخ کے خلیفہ سے کہ وہ اپنا پیر بھائی ہوتا ہے رجوع کرنا تو غالب طبائع کے خلاف ہوتا ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم بوجہ پیر بھائی ہونے کے مساوات کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ پھر اس سے کس طرح التجا کریں اور تکمیل بدون کسی کامل کی اتباع کے ممکن نہیں۔ وہ شخص بڑا خوشحال ہے جس کے پاس حسد نہیں ہے۔

دیکھئے جس طرح یہاں شیطان کو آدم علیہ السلام سے عار ہوا وہی عار اس عبادت پرست کو بھی گنہگار سے ہوا تھا اسی لئے میں نے کہا کہ یہ شخص اپنی ان تمام صفات میں ابلیس کا پیرو ہے۔ اور وہ گنہگار حضرت آدم علیہ السلام کے نقش قدم پر چلا کیونکہ خطا آدم علیہ السلام سے بھی ہوئی تھی مگر انھوں نے اس کے بعد کس قدر ندامت اور شرمساری کا ثبوت دیا۔

صاحب روح المعانی نے بھی ابلیس کے قصہ کی تفسیر کرتے ہوئے نہایت ہی عمدہ اور خوب کلام فرمایا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس موقعہ پر اسکو بھی بیان کردوں۔

فرماتے ہیں کہ:۔

ثم الظاهر ان كفره عن جهل بان استرد سبحانه تعالىٰ منه ما اعار من العلم الذي كان مرتديا به حين كان طاؤس الملائكة و اظافير القضا اذا حكت ادمت وقسي القدر اذا رمت اصمت ؎

وكان سراج الوصل ازهر بيننا
فهبت به الريح من البين فانطفى

ظاہر تو یہی ہے کہ ابلیس کے کفر کا منشا، اس کا جہل ہوا جس کی صورت یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ علم اس کو مرحمت فرمایا تھا جسے وہ چادر بنائے ہوئے تھا جب کہ فرشتوں کے درمیان طاؤس بنکر رہتا تھا۔ وہ علم اس سے سلب فرمالیا اور قضا کے ناخن جب گڑائے جاتے ہیں تو زخمی بنا دیتے ہیں۔ اور قدر کی کمان جب تیراندازی کرتی ہے تو بہرا بنا دیتی ہے۔ شیطان زبان حال سے کہتا تھا کہ ؎ وصل کا چراغ ہمارے اور ہمارے محبوب کے درمیان روشن تھا کہ اچانک فراق کی ہوا چلی اور وہ بجھ گیا۔

وقيل عناد حمله عليه حب الرياسة والاعجاب بما اوتي من النفاسة ولم يدر المسكين انه لو امتثل ارتفع قدره وسما بين الملاء الاعلى فخره ولكن ؎

اذا لم يكن عون من الله للفتى
فاول ما يجني عليه اجتهاده

ایک قول یہ ہے کہ اس کے کفر کا سبب اس کا عناد بنا تھا جس پر حب جاہ اور جس شرف سے مشرف تھا اس پر اعجاب نے اس کو ابھارا تھا اور مسکین نے یہ بھی نہ جانا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے حکم کا امتثال کرلیتا تو اس کی قدر اور بڑھ جاتی اور عالی مرتبت ملائکہ میں اس کا شہرہ اور بلند ہو جاتا لیکن بات یہ ہے کہ جب کسی شخص کے شامل حال اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں ہوتی تو اول وہ چیز جو اسکو نقصان پہونچاتی ہے وہ خود اس کا اجتہاد ہوتا ہے (یعنی اسکی فہم ماری جاتی ہے)

آگے فرماتے ہیں کہ:۔

وکم ارقت هذا القصة جفوننا و ارقت من العیون عیونا۔ فان ابلیس کان منذ ان ذلال طاعته یختال فی رواء مرافقته ثم صار الی ما تری واجری مابه القلم جری ؎	اور اس واقعہ نے نہ جانے کتنی آنکھوں سے ہمیشہ ہمیش کیلئے نیند ہی کو اڑا دیا اور ان کے لئے پلک جھپکانے کو حرام کردیا اور نہ معلوم کتنی چشم ہیں جنھوں نے اس قصہ کو سنکر چشمے جاری کردیئے اس لئے کہ شیطان ایک زمانہ تک اپنی طاعت کے غرور و ناز میں تھا اور حق تعالیٰ کے تعلق کی چادر میں اترا تا پھرتا تھا لیکن اس کے بعد اس کا جو حشر ہوا وہ تم کو معلوم ہی ہے۔ تقدیر کا لکھا سامنے آیا اور اس کا مصداق ہوگیا کہ:۔
وکنا ولیلیٰ فی صعود من الھوی فلما توافینا ثبتُّ و زلت	ہم اور لیلیٰ عشق و محبت کے پہاڑ پر چڑھے چلے جارہے تھے پس جس وقت کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے ملے ہی رہے میں تو ثابت رہا اور وہ پھسل گئی
(روح المعانی صہ ۲۱۳ ج۱)	

ابلیس کا یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ یہی سب سے پہلا قصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بیان فرمایا ہے اس لئے اس میں بڑی ہدایت رکھی ہے اور اللہ کے بہت سے بندوں نے اس قصہ سے ہدایت حاصل کی ہے۔ جیساکہ صاحب روح المعانی نے لکھاہے کہ نہ معلوم کتنی آنکھوں سے اس واقعہ نے نیند کو اڑا دیا اور نہ معلوم کتنی آنکھوں نے اسکی وجہ سے آنسوؤں کے دریا بہادیئے لیکن یہ سب اسی وقت تھا جب قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھا پڑھایا جاتا تھا۔ اب ہم لوگ بھی ان آیات پر سے گذرتے ہیں مگر ذرا قلب میں حرکت نہیں پیدا ہوتی حالانکہ کبر و عجب جیسے رذائل کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے یہی ایک واقعہ کافی ہے کہ ابلیس عجب و پندار میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوگیا اور حضرت سیدنا آدم علیہ السلام نے توبہ و انابت کی تو قصور معاف ہوگیا اور مقبول و محبوب ہو گئے۔

(احقر جامع عرض کرتا ہے کہ اگر انسان یہی خیال کرے کہ میں آدم زادہ ہوں اور حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کی صفت تواضع اور اعتراف ذنب تھی اور تکبر و انانیت تو شیطان کی صفت ہے لہذا مجھے اپنے باپ کی صفت اختیار کرنی چاہیئے نہ کہ ان کے دشمن کی۔ یہ تو غیرت کے بھی خلاف ہے یہ مراقبہ پیش نظر رکھے تو امید ہے کہ ان رذائل سے بچنا اس کے لئے بہت کچھ آسان ہوجائیگا اس لئے کہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے باپ دادا کے طریقہ پر رہنا پسند کرتا ہے۔ شر میں تو آدمی اسی اصول کو مضبوطی سے پکڑے رہتا ہے مگر خدا معلوم کہ خیر میں اس کا یہ جذبہ کیوں سرد پڑ جاتا ہے۔)

الاعتراف والاستغفار من الذنوب من اعظم سنن النبی الکریم

(گناہوں سے استغفار اور اس کا اعتراف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم ترین سنت ہے)

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی ابلیس اور آدم کے اس واقعہ کے سلسلہ میں خاقانی کے کچھ اشعار پڑھا کرتے تھے جس سے لوگوں کو بڑا ہی لطف آتا تھا اور مجمع جھوم جاتا تھا۔ حضرت یہ پڑھتے تھے کہ ؎

ابلیس گفت طاعت من بیکرانہ بود　　سیمرغ وصل را دل و جاں آشیانہ بود
آدم ز خاک بود و من از نور پاک او　　گفتم کہ من یگانہ و او خود یگانہ بود
در لوح بُد نوشتہ کہ ملعون شود یکے　　بردم گماں بہ ہر کس و بر خود گماں بود
او خواست تا فسانۂ لعنت کند مرا　　کرد انچہ خواست آدم خاکی بہانہ بود
خاقانیا تو تکیہ بر طاعاتِ خود مکن　　کیں پند بہر دانش اہل زمانہ بود

ابلیس نے کہا کہ میری طاعات کثیر تھیں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے میرے دل و جان سے زیادہ قریب تھے۔ آدم تو مٹی سے بنائے گئے تھے اور میری تخلیق حق تعالیٰ کے نور سے ہوئی تھی اور میں اپنے ہی کو یگانہ سمجھتا تھا لیکن واقعہ یہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام ہی یگانہ اور مقرب تھے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ یگانہ تھے اپنی توحید میں اور افسوس کہ لوح محفوظ میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ایک ذات ملعون ہوگی مگر میں نے ہر ایک کو اس کا مصداق گمان کیا مگر اپنی طرف خیال نہیں گیا اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ مجھے لعنت کا فسانہ بنا دیں چنانچہ بنا دیا باقی آدم خاکی کا واقعہ تو بس ایک بہانہ ہی تھا۔ اے خاقانی خبردار تم اپنی طاعت پر کبھی تکیہ نہ کرنا کیونکہ ابلیس کا یہ واقعہ اہل دنیا کی عبرت ہی کے لئے معرض وجود میں آیا ہے۔

دیکھئے اس سے بھی معلوم ہوا کہ طاعات پر تکیہ کرنا اور اس پر نظر کرنا یہ صفت ابلیس کی تھی جیسا کہ یہاں اس عابد نا پارسا نے کیا اور اپنے کو پارسا سمجھا اور دوسرے کو بہ نظر تحقیر دیکھنا یہ شیطان کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ جو ذات کہ ملعون ہوگی وہ میں نہیں ہوں بلکہ انسان اور فرشتوں ہی میں سے کوئی ہوگا حالانکہ خود ہی ہونے والا تھا اور اپنے سے بے خوف تھا اور فرشتے جو کہ اس سے محفوظ تھے ان میں سے ہر ہر فرد اپنے ہی متعلق یہ اندیشہ رکھتا تھا کہ کہیں

وہ بس ہی نہ ہوں۔

بالکل یہی حال یہاں اس عابد ناپارسا اور گنہ گار اندیشہ ناک کا تھا کہ عابد کو گرفت کا مطلق خوف نہیں تھا بلکہ وہ اپنی جانب سے مطمئن تھا اور گنہگار کو مواخذہ خداوندی کا خوف تھا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے اسی واقعہ کو بیان کر کے عابدین کا ناز ہی ختم کر دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ واقعی مربی ہیں کیونکہ بزرگوں کا یہی کام ہے کہ وہ لوگوں کی تربیت کریں اور جس جانب سے گمراہی کو آتا دیکھیں اس پر تنبیہ کریں۔

یہاں ایک اور بات یہ سمجھ لیجئے کہ شیخ سعدیؒ عاصی جری اور بیباک کا حکم نہیں بیان فرما رہے ہیں۔ چنانچہ گنہگار کی صفت یہاں اندیشناک بیان کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس گنہگار کو اپنے گناہ پر اندیشہ نہ ہو اس کا دوسرا حکم ہے۔ جیسا کہ ایک شخص کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ مرتے وقت اس نے اپنے محبوب مجازی کو مخاطب کر کے یہ کہا کہ اے محبوب تیری رضا معبود جلیل کی رضا سے مقدم ہے۔ توبہ توبہ یہ تو صریح کفر ہے۔ اسی طرح سے ایک شخص مرتے وقت یہی کہہ رہا تھا کہ یہ کپڑا چار روپیہ گز اور یہ کپڑا تین روپیہ گز ہے" اناللہ" تو اس کا ذکر نہیں بلکہ گفتگو اندیشہ کرنے والے گنہگار کی ہے۔ کیونکہ جب اسکو اندیشہ ہے تو خوف ہے اور جب خوف ہے تو ایمان ہے اور جب ایمان ہے تو نجات بھی ہے۔ تو اسکی یہ نجات دراصل اسکے ایمان کی وجہ سے ہوئی اور عابد ناپارسا کے ایمان میں یہی کسر تھی، جبھی تو وہ ریاکار اور منکر ہوا۔ چونکہ اس نے عبادت مخلوق کے دکھانے کے لئے کی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذرا سا بھی حصہ اسکو نہیں ملا۔ کیونکہ اگر معرفت ہوتی تو اس قسم کی ڈینگ سے اس کو باز رکھتی۔ اہل معرفت کے پیش نظر تو حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہوتا ہے کہ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ یعنی ظالمین کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کس کروٹ ان کو سونا ہے۔ بزرگان دین پر یہ آیت نہایت سخت ہوئی ہے اسکی وجہ سے ان کا پتہ پانی ہو گیا ہے۔ اگر اس عابد کو طاعت سے کچھ بھی فیض ہوا ہوتا تو ایسی بات زبان سے نہ نکالتا کہ اس کو مدبر کہا اور یہ کہدیا کہ

ع خدایا تو با او مکن حشر من

تو دیکھئے شیخ کے بیان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مطلق گنہگار کو مطلق عابد سے نہیں بڑھا رہے ہیں بلکہ یہاں وہ گنہگار مراد ہے جس نے خدا کا خوف کیا تواضع اختیار کی۔ اپنے گناہوں پر نادم اور شرمسار ہوا۔ آخرت کا یقین کیا اور نہایت ہی خلوص کے ساتھ حق تعالےٰ سے دعا کی جو قبول ہو گئی۔ اس لئے اس کی مغفرت ہو گئی اور عابد سے وہ عابد مراد ہے جس نے ریا اور تکبر اختیار کیا اور عبادت نے اس کے نفس میں ذرا بھی تواضع اور جھکاؤ نہیں پیدا کیا تو ایسے گنہ گار کو ایسے عابد پر

شیخ بڑھا رہے ہیں ورنہ یہ تو معلوم ہی ہے کہ کفرٌ دون کفر ہوتا ہے اور معصیۃٌ دون معصیۃ ہوتی ہے یعنی گناہ گناہ میں فرق ہوتا ہے چنانچہ بعضے گناہ ایسے ہیں کہ ان کا انجام جہنم ہی ہے۔ شیخ اس کی فضیلت نہیں بیان کر رہے ہیں کیونکہ یہ نص کے بھی خلاف ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ۝

آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مومن و کافر اور اسی طرح سے مومن عاصی (نافرمان) اور مومن طائع (فرمانبردار) برابر نہیں یہ آیت کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ کلبی سے روایت ہے کہ عتبہ وشیبہ و ولید بن عتبہ۔ ان سب نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے مومنین سے کہا کہ واللہ ما انتم علی شیئ ولئن کان ما تقولون حقا لحالنا افضل من حالکم فی الآخرۃ کما ھو افضل فی الدنیا فنزلت الآیۃ ام حسب الذین اجترحوا السیئات الآیۃ

یعنی عتبہ وشیبہ اور ولید نے حضرت علی رضی اللہ عنہ و حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے مسلمانوں سے بربنائے غایت کبر کے یہ کہا کہ تمہارا دین کچھ نہیں۔ آخرت وغیرہ کچھ نہیں اور اگر بالفرض تمہاری ہی بات صحیح ہوئی یعنی مرنے کے بعد پھر زندگی ہوگئی تو آخرت میں بھی ہمارا حال تم لوگوں کے حال سے اچھا ہوگا۔ جیسا کہ آج دنیا میں ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس کے بعد صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ یستنبط منھا تباین حالی المومن العاصی والمومن الطائع فرماتے ہیں کہ یہ آیت اگرچہ کفار کے بارے میں نازل ہوئی یعنی مومن اور کافر برابر نہیں تاہم اس سے مومن عاصی اور مومن طائع کا حکم بھی معلوم کیا جا سکتا ہے یعنی یہ دونوں بھی برابر نہیں اور اس کے بعد فرماتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے عُباد کو دیکھا گیا ہے کہ اس آیت کی تلاوت کے وقت روتے تھے یہاں تک کہ اس آیت کا نام ہی مبکاۃ العابدین (یعنی عابدین کو رلانے والی آیت) پڑ گیا۔ روایت میں ہے کہ حضرت تمیم داری نے سورۂ جاثیہ کی تلاوت کی۔ جب اس آیت پر پہونچے تو اس کو دہراتے رہے اور روتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ اور وہ مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ اسی طرح سے بشیر جو ربیع بن خیثم کے مولیٰ ہیں بیان کرتے ہیں کہ ربیع نماز پڑھ رہے تھے اور اس آیت پر سے گزرے پس صبح تک اسی کو بار بار دہراتے رہے۔ حضرت فضیل ابن عیاض اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتے تھے جب اس آیت پر سے گزرتے تھے کہ اے نفس کاش کہ تو یہ جان لیتا کہ ان دو فریقوں میں سے تو کس میں سے ہے۔ آیت میں علاوہ ایمان و کفر کے مقابلہ کے چونکہ یہ بھی احتمال ہے کہ صالحین اور طالحین کا باہم مقابلہ

ہوا اسی لئے بزرگان دین اسکی تلاوت کے وقت روتے تھے۔ صاحب روح المعانی آگے فرماتے ہیں کہ میں نے بہت سے مغرورین کو (جو کہ شب و روز فسق و فجور میں مبتلا رہتے ہیں) زبان قال و زبان حال سے یہ کہتے سنا ہے کہ ہم قیامت کے دن بہت سے عابدین سے اچھے ہی رہیں گے۔ یہ انکی صریح گمراہی اور نفس کا بھلاوا ہے اس زمانہ میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے اب اس قسم کی آیات کو تلاوت کر کے رونا اور اللہ تعالیٰ سے خوف کرنا یہ سب تو ختم ہو گیا بس یہ رہ گیا ہے کہ جہاں کوئی عالم ہوا اور اس نے کچھ دین کا کام کرنا شروع کیا تو دیکھا جاتا ہے کہ ہر محفل اور ہر ہوٹل میں اسی کی غیبت شکایت اور اسی کا برائی سے تذکرہ رہتا ہے۔ دراصل ابلیس ایسے لوگوں کی طرف سے سوءظن پیدا کرا دیتا ہے تاکہ لوگ دین ہی نہ سیکھ سکیں اور اس میں اپنا معین بہت سے شیاطین الانس کو بنالیتا ہے جو ایمان کے حق میں رہزن ہوتے ہیں۔ اب ان چوروں اور ڈاکوؤں کو کوئی کہنے والا نہیں یہ باتیں میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ مگر کسی سے آپ سنئے گا بھی نہیں کس قدر ستم کی بات ہے کہ عابدین تو اس کی وجہ سے رو رہے ہیں اور فاسقین کا کل وقت دینداروں کی برائی کرنے اور ان پر قہقہہ لگانے میں صرف ہو رہا ہے آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں یعنی ان دو جماعتوں کو جو لوگ برابر سمجھ رہے ہیں تو یہ فیصلہ ان کا صحیح نہیں عاصی اور طائع دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر نیک لوگوں کا آنسو پونچھا ہے ورنہ تو یہ فاسق لوگ عابدین کو اُڑا ہی دیتے بیشک اللہ تعالیٰ ہی اپنی قوت سے ان کو دنیا میں رکھتے ہیں ورنہ تو دوسرے قسم کے لوگ ان حضرات کے اکھاڑنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ نیک لوگوں کے لئے دنیا میں بڑی مشکلات ہیں۔ کمبخت کافر تو توہین کرتے ہی ہیں فاسق لوگ بھی انہی کی راہ چلنے لگتے ہیں۔ اس آیت میں نہایت ہی تعریض اور تسلی ہے اللہ والوں کو چنانچہ حق تعالیٰ کی اسی عنایت کے تصوّر سے ان حضرات کو مزا آجاتا تھا اور رات رات بھر اسی کی لذّت میں گزار دیتے تھے غرض ان مغرورین کا اپنے کو صالحین سے بہتر تبلانا نص کے بالکل خلاف ہے مگر یہ لوگ نص کو کیا جانیں انکی نص تو ان کا نفس ہے اللہ تعالیٰ تو ارشاد فرماتے ہیں کہ دونوں برابر نہ ہوں گے۔ اب اگر یہاں لوگ اپنے فسق و فجور کی وجہ سے صالحین پر غالب نظر آئیں اور قیامت میں بھی ان مجرمین ہی کا حال افضل ہو تو پھر تو قیامت کے کوئی معنیٰ ہی نہ ہوئے۔

دیکھئے جب یہ امر منصوص ہے کہ اہل طاعت اور اہل معصیت یہ دونوں برابر نہیں تو ظاہر ہے کہ شیخ سعدی رح بھی مطلقاً گنہ گار کو اہل طاعت پر کیسے فضیلت دے سکتے ہیں شیخ نے یہاں جو عاصی اور عابد کا مقابلہ کیا اور عاصی کی تعریف کی تو یہ دوسری ہی بات تھی وہ یہ کہ یہاں معصیت

کے ساتھ خوف بھی تھا جو کہ ایک قلبی عمل اور باطنی طاعت ہے اسکی وجہ سے اسکی نجات ہوگئی اور اس عابد میں عبادت کے ساتھ ساتھ کبر و ناز پیدا ہوگیا تھا۔ اس چیز نے اس کا بیڑا غرق کردیا تو دراصل شیخ نے یہاں خوف و خشیت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پر نظر وغیرہ جیسی طاعات کی مدح فرمائی ہے اور کبر و عجب و ریا جیسی برائی کی مذمت کی ہے۔ عابد کی عبادت بری نہ تھی مگر اس کا کبر یقیناً برا تھا کیونکہ اس کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ لا تدخل الجنتہ من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر (مشکوٰۃ صـ۴۳۳) اور ظاہر ہے کہ کبر شیطان کی صفت ہے اس لئے کہ وہ بھی بہت عبادت گذار تھا لیکن اپنے اس رذیلہ کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام سے بگڑ گیا اور اسکی وجہ سے رسوا ہوا۔

مولانا روم نے مثنوی میں اسی کبر و ناز کی تباہی کا ایک اور واقعہ بیان کیا ہے اور وہ قصہ ہے بلعم باعور کا جو کہ بہت عابد و زاہد شخص تھا مستجاب الدعوات تھا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مخالف ہوگیا اور ان کے ساتھ مقابلہ کر بیٹھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بزرگی تو کیا باقی رہتی ایمان بھی سلب ہوگیا۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

بلعم باعور را خلق جہاں — سغبہ شد مانند عیسیٰ زماں

سجدہ ناوردند کس را دون او — صحت رنجور بود افسون او

پنجہ زد با موسیٰ از کبر و کمال — آن چناں شد کہ شنیدستی تو حال

دیکھو بلعم باعور کے تمام لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح فریفتہ اور معتقد تھے اور اسکی سی تعظیم کسی کی نہ کرتے تھے اور بیمار اس کی جھاڑ پھونک سے صحت پاتے تھے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جب مخالفت کی تو وہ حال ہوا جو تم نے کسی عالم سے سنا ہوگا (کہ ایمان بھی سلب ہوگیا اور ظاہراً بھی ذلیل و خوار ہوگیا) پس مخالفت اہل اللہ کی ایسی وبال کی چیز ہے آگے فرماتے ہیں کہ اس مخالفت پر کچھ ایک ہی دو کو سزا نہیں ہوئی بلکہ ؎

صد ہزار ابلیس و بلعم در جہاں — ہم چنیں بودست پیدا و نہاں

ایں دو را مشہور گردانید الہ — تاکہ باشد ایں دو بر باقی گواہ

رہزناں را در بیاباں چوں کشند — یک دو تن را سوئے دہ زیں شاں کشند

تا ببینند اہل دہ گیرند پند — رویت ایشاں بود شاں ہم چو بند

لاکھوں ابلیس اور بلعم کی مثل دنیا میں ہو چکے ہیں کچھ مشہور اور کچھ غیر مشہور جن میں سے ان دو کو اللہ تعالیٰ نے زیادہ مشہور کردیا تاکہ بقیہ امثال پر بطور نظیر کے ہو جاویں جیسا کہ ناظمان سلطنت کا قاعدہ ہے کہ جب رہزنوں کو جنگل میں قتل کرتے ہیں تو ایک دو کی لاش کو بستی میں لاتے ہیں تاکہ بستی

والے انکو دیکھیں اور عبرت حاصل کریں اور ان کو دیکھنا ایسے افعال سے بندش کے طور پر ہوجاوے ؎

ایں دو دار پرچم بکوئے شہر برد | کشتگان قہر را نتواں شمرد
نازنینی تو ولے در حد خویش | الله الله پامنہ زاندازہ بیش
گر زنے بر نازنیں تر از خودت | در تگ ہفتم زمیں زیر آردت

عالم میں ایسے چور بہت ہوئے ہیں صرف ان دو کا پرچم شہر میں لے آئے ورنہ کشتگان قہر کا شمار نہیں ہوسکتا چنانچہ حضرت مولانا رومؒ نے ہی ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے کہ طریق میں کشتوں کے پشتے لگے ہوئے ہیں کوئی یہاں گرا پڑا ہے کوئی کچھ دور آگے چل کر کوئی کچھ اور دور چل کر غرض یہ راستہ کشتگان قہر سے پٹا پڑا ہے آگے بطور نصیحت کے فرماتے ہیں کہ ہم نے مانا کہ تم بھی نازنیں ہو اور بوجہ طاعت و تقوی کے محبوب ہو لیکن اپنے اندازہ پر یعنی ان کے درجہ پر نہیں ہو لہذا خدارا اپنی حد سے قدم آگے مت رکھنا اور ان کا مقابلہ مت کرنا اور اگر تم ایسے شخص پر جو تم سے زیادہ مقبول و محبوب ہے حملہ کروگے تو تم کو قعر زمین ہفتم کے نیچے پہونچادے گا۔ (کلید مثنوی ص۲۰۶ جلد اول حصہ دوم)

بہر حال وہ گنہ گار اپنی تواضع اور کسر و انکسار کی وجہ سے کامیاب ہوگیا اور وہ عابد اپنے عجب و استکبار کی وجہ سے ناکام رہا۔ علمار نے فرمایا ہے کہ تمام اخلاق کی اصل تواضع ہے۔ تواضع جب انسان میں آجاتی ہے تو اس کے اور دوسرے اخلاق بھی درست ہوجاتے ہیں اور سارے رذائل کی جڑ تکبر ہے۔ تکبر جب کسی میں پیدا ہوجاتا ہے تو اس کے دوسرے اخلاق بھی خراب ہوجاتے ہیں اسی طرح بزرگوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ابلیس کو خدا تعالیٰ کی محبت نہ تھی۔ اسکو کبر جو ہوا تو محبت ہی کے نہ ہونے سے محبت کے ساتھ کبر اور حکم سے سرتابی جمع نہیں ہوسکتی۔ حضرت حافظؒ فرماتے ہیں ؎

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی | مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

یہی وجہ ہے کہ مولانا رومؒ نے مثنوی میں عشق و محبت کا بیان بہت زیادہ کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ ؎

ہر کہ را جامہ ز عشقے چاک شد | او ز حرص و عیب کلی پاک شد

اس میں یہ بیان فرمارہے ہیں کہ طریق قطع تعلقات ماسوا اور زوال حرص دنیا کا ذریعہ عشق ہے۔ اسکی بدولت آدمی حرص اور جمیع نقائص بلکہ تمام اخلاق ذمیمہ سے بالکل پاک ہوجاتا ہے حضرت مولانا تھانویؒ نے اسکی شرح کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اخلاق ذمیمہ کے دو علاج ہیں ایک جزئی یعنی خاص وہ یہ کہ ہر ہر خلق کا جدا جدا علاج کیا جاوے جیسا کہ احیاء العلوم وغیرہ میں لکھا ہے اسکو طریق سلوک کہتے ہیں۔ دوسرا کلی یعنی عام وہ یہ کہ ذکر و شغل سے یا جس طرح شیخ کامل تجویز کرے، حق سبحانہ و تعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا کی

جاوے جب اس کا غلبہ ہوگا اپنی ہستی وخودی مضمحل ہونا شروع ہوگی اور سب اخلاق ذمیمہ جو کہ اس خودی اور دعوی ہستی سے پیدا ہوتے ہیں زائل ہوجائیں گے اسکو طریق جذب کہتے ہیں اور طریق اول گو بے خطر ہے مگر طویل ہے اور طریق ثانی گو خطرناک ہے مگر قریب ہے اور ہر شیخ کا مذاق مختلف ہوتا ہے مولانا پر چونکہ مذاق ثانی غالب ہے اس لئے اُسی کی تعلیم فرماتے ہیں اور اس کی طرف رغبت دلاتے ہیں اور اسکی مدح کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　　اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما　　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

یعنی اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہوجاتے ہیں اور تجھ سے سب امراض کا علاج ہوجاتا ہے۔ تجھ سے نخوت و ناموس کا دفعیہ ہوتا ہے یعنی عار و ننگ کے دفع کرنے میں بہ نسبت دوسرے اخلاق ذمیمہ کے اسے ایک خاص خصوصیت حاصل ہے کیونکہ عشق کے لئے ذلت لازم ہے کہ ذلت و ناموس ایک جگہ جمع نہیں ہوتے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ طریق جذب میں یہ جو فرمایا کہ ذکر و شغل کے ذریعہ حق تعالیٰ کی محبت پیدا کیجائے اور جب محبت پیدا ہوجائے گی تو وہ سارے اخلاق ذمیمہ کو قلب سے نکال پھینکیں گی تو یہ عشق کامل کے اثر کا بیان ہے یعنی جب عشق و محبت کا استیلاء قلب پر ہوجاتا ہے تو پھر وہ ماسوا کو قلب سے نکال پھینکتی ہے اور تمام چیزوں کو جلاکر رکھ دیتی ہے ورنہ تو عشق جب تک ناقص رہتا ہے خطرے سے خالی نہیں چنانچہ بزرگان سلف رحمہم اللہ عشق کو خطرناک فرماتے ہیں مگر اسکی وجہ نہیں بیان فرماتے غور کرنے سے سمجھ میں آیا کہ خطرناک اسی وجہ سے ہے کہ بہت سے خطرناک حالات سے عبور کرنا ہوتا ہے ایسے کہ غیر مبتلا کے لئے اس کا سمجھنا بھی دشوار ہے۔ چنانچہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اسکی وجہ سے انسان میں عجب و پندار اور اہل کمال سے مساوات کا دعویٰ پیدا ہوجاتا ہے اس لئے کہ عشق کی وجہ سے ناقص پر جب اس کا مخصوص سرور اور حظ طاری ہوتا ہے تو اس حالت میں وہ اپنی حد پر قائم نہیں رہتا بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ اس راہ میں میں سب پر فوقیت لے گیا ہوں چنانچہ ناقص کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مدعی کمال ہو۔ یہی خطرناک حالت ہے اور غلط اس لئے ہے کہ گو اسے عشق و محبت کی سرشاری حاصل ہے اور اسکی وجہ سے وہ اپنے طور پر یہ بھی سمجھ رہا ہے کہ مجھے کوئی دولت حاصل ہوگئی ہے۔ تو سمجھے مگر اسے اس کا کیا حق پہونچتا ہے کہ وہ اہل کمال سے مساوات کا دعویٰ بھی کرنے لگ جائے یا اپنے آپ کو سب سے اونچا دیکھے اُس کو اپنی حد پر رہنا چاہیے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

نازنینی تو ولے در حد خویش　　　　اللہ اللہ پا منہ زاندازہ بیش

میں کہتا ہوں کہ اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے سالک کو چاہئے کہ حق تعالیٰ کی محبت کے ساتھ ساتھ ذکر و شغل سے بھی محبت کرے۔ کیونکہ جب ان سے محبت پیدا ہوجائے گی تو پھر راستہ بالکل آسان اور بے خطر ہوجائے گا اس لئے ذکر و شغل اور اعمال صالحہ اس طرح سے کرنا چاہئے کہ ان اعمال سے محبت ہوجائے اور جب ان سب سے محبت ہوجائے گی تو پھر اللہ تعالیٰ سے بھی محبت ہوجائے گی کیونکہ جنھیں اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے وہ لوگ کچھ آسمان پر نہیں چلے جاتے بلکہ یہیں رہتے ہیں اور ان اعمال سے ان کو خاص محبت اور تعلق ہوجاتا ہے لہٰذا جب تک یہ نہ پیدا ہوجائے حالت بیشک خطرناک ہے کیونکہ خطرناک وہی محبت ہے جو اعمال کے واسطے نہیں ہے اور جو محبت کہ اعمال کے واسطے سے ہوتی ہے اس میں کچھ بھی خطرہ نہیں ہوتا۔ آج جو لوگ نہیں پہونچ رہے ہیں اعمال کے ذریعہ سے تو اسی لئے کہ ان سے محبت نہیں ہے اور جب ان سے محبت نہیں ہوتی تو پھر خدا تعالیٰ سے بھی نہیں ہوپاتی یہ جو بات کہہ رہا ہوں اس کو خوب سمجھئے۔ نہایت ہی کام کی بات کہہ رہا ہوں حق تعالیٰ سے براہ راست محبت خطرناک ہے اسکو اہل محبت سمجھتے ہیں مگر اعمال کے ذریعہ سے جو محبت اور معرفت ہوتی ہے اس میں خطرہ نہیں رہتا بہرحال میں یہ بیان کر رہا تھا کہ گنہگار کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو اپنے گناہوں پر جری ہو اور ایک وہ جو جری نہ ہو۔ ابلیس اپنی معصیت پر جری تھا اور چونکہ خود اپنی دولت کھو چکا تھا اس لئے دوسروں کو بہکانا اور ان میں کبر و غرور پیدا کرنا اسکی عام عادت تھی۔ چنانچہ اس عابد کے اندر بھی اس نے اپنی ہی صفات پیدا کردی تھیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت ہی مبغوض اور ناپسندیدہ ہیں۔ عبادت خدا کے یہاں بہت ہے۔ کثرت عبادت کو وہاں پوچھتا کون ہے۔ اسی لئے اللہ کے جو نیک بندے ہوتے ہیں وہ بہت کچھ کرنے کے بعد بھی نظر اس پر سے ہٹائے رہتے ہیں ایسے ہی شخص کو فقیر الی اللہ کہتے ہیں اسی طرح سے یہ حضرات دوسروں کے عیوب سے بھی صرف نظر کئے رہتے ہیں باقی یہ درجہ حاصل کرنا بہت مشکل ہے کہ آدمی کو اپنی معرفت ہوجانے اور طاعت کرنے کے بعد اس پر تکیہ نہ ہو بلکہ توکل حق تعالیٰ کے فضل پر ہو یہ بہت مشکل کام ہے۔ ایک غریب شخص اگر اپنے آپ کو مالدار نہ سمجھے تو چنداں کمال نہیں لیکن مال دار ہوکر انسان اپنے آپ کو فقیر سمجھے بلاشبہ یہ بڑا مشکل ہے مشائخ نے فرمایا ہے کہ بزرگوں کے اندر دو صفات نہایت ہی عمدہ ہوتی ہیں اور وہی ان کے سارے کمالات کی اصل ہیں ایک تواضع اور دوسرے توکل۔ چنانچہ ہمیشہ سے صالحین کی یہی سیرت رہی ہے

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافریست راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

یعنی اپنے تقویٰ و دانش پر اعتماد کرنا طریقت میں کفر کی بات ہے۔ سالک اگر سو ہنر بھی رکھتا ہو یعنی طاعت کی کثرت رکھتا ہو تب بھی اسکو توکل ہی کرنا چاہئے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ حضرت حافظؒ کے اس شعر کو اپنے وعظ میں لائے ہیں اگر حضرت کے وعظ میں صرف یہی شعر ہوتا تو بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ حضرت نے طریقت سے سب کچھ بیان فرمادیا اس لئے کہ یہ پورے طریقت کا خلاصہ ہے۔ شیخ سعدیؒ نے بھی اسی تکیہ سے منع فرمایا ہے چنانچہ عابد ناپارسا کی حکایت میں فرماتے ہیں ؎

کہ آنرا جگر خوں شد از سوز و درد گر ایں تکیہ بر طاعت خویش کرد

یعنی عابد نے چونکہ اپنی طاعت پر تکیہ کیا تھا اس لئے تباہ ہوا اور گناہ گار اپنے گناہوں کو سوچ سوچ کر نہایت نادم اور افسردہ تھا۔ اس لئے نجات پاگیا۔ ایک شخص کے پاس طاعت نہیں ہے اس لئے اس پر تکیہ بھی نہیں ہے۔ اور ایک کے پاس طاعت ہے اور اس پر تکیہ ہے یہ شخص پہلے سے کہیں زیادہ بُرا ہے جس کا ظاہر خراب ہو اور وہ دوزخ میں چلا جائے اس سے اتنا تعجب نہیں جتنا کہ اس شخص سے تعجب ہے کہ جس نے ساری عمر اپنے ظاہر کو اچھا رکھا ہو۔ طاعت کی ہو مگر وہی ذریعہ بن جائے اس کے دوزخ میں جانے کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عابد کا اپنی طاعت پر نظر کرنا یہ نہایت ہی بری چیز ہے اور گنہگار کا اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم پر بھروسہ کرنا نہایت ہی عمدہ خصلت ہے اور بزرگان دین تو طاعت کرنے کے بعد بھی نظر اپنی طاعت پر نہیں رکھتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل ہی پر رکھتے ہیں اسی کا نام توکل ہے۔ توکل کے معنی تاکل کے نہیں ہیں کہ اسباب رزق کو ترک کردے بلکہ یہ ہر چیز میں ہوتا ہے۔ طاعت میں بھی ہوتا ہے۔ یعنی کام توسب کردے اور بھروسہ اللہ پر رکھے یعنی یہ سمجھے ان کی مہربانی ہوگی تو بس بیڑا پار ہوجاوے گا ورنہ اسی میں پکڑ جاؤنگا۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت سعدی، حضرت حافظ حضرت مولانا تھانوی رحمہم اللہ اور دوسرے مشائخ سب اس امر پر متفق ہیں کہ انسان کو عبادت کے باب میں بھی توکل اختیار کرنا چاہئے اسی کو میں یوں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے تو اب طاعت کا نکرنا تعطل ہے اور عبادت کرکے اس پر نظر کرنا یہ گویا تشبیہ ہے اور طاعت کرکے اللہ تعالیٰ پر نظر رکھنا یہ توحید ہے اور آپ جانتے ہیں کہ بزرگان دین نے جو اس توکل کو اپنا منصب بنایا ہے یہ کہاں سے ماخوذ ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ یہ ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائیگا۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا کہ کیا آپ بھی نہیں یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی نہیں۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی مجھے ڈھانپ لے دیکھئے جب سید الانبیاء اور امام الاولیاء صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم اپنے متعلق یہ فرما رہے ہیں کہ جنت میں اپنے عمل کی وجہ سے نہیں جائینگے تو پھر اس کے سننے کے بعد کسی ولی یا کسی صوفی کی کیا مجال تھی کہ وہ اپنی طاعت پر نظر کرتا۔ یہی حدیث ماخذ ہے حضرات صوفیہ کے اس عمل کا کہ وہ طاعت پر نظر کو جائز ہی قرار نہیں دیتے محض اللہ تعالیٰ کی رحمت پر توکل کرتے ہیں چنانچہ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کا واقعہ ترصیع الجواہر المکیہ میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک شب اپنے ورد سے سو گیا جسکی وجہ سے مجھے کچھ تکدر ہوا۔ اس لئے کہ اس وقت میں ان لوگوں میں سے تھا جو اعمال پر اعتماد کرتے ہیں یعنی جن کی نظر اپنی طاعت پر ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے یہ سزا دی گئی کہ چند فرائض نیند کی وجہ سے مجھ سے چھوٹ گئے، اور باطن میں یہ ندا کی گئی کہ اے ابراہیم میرے بندے ہو جاؤ راحت پا جاؤ گے یعنی جب ہم سلادیں سو جاؤ اور قیام کی توفیق دیدیں تو قیام کرلو۔ ان دونوں کے درمیان تم کو کسی چیز کا اختیار نہیں ہے۔

دیکھئے حضرت ابراہیم ابن ادہم کا شمار اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے مگر اپنے متعلق ایک وقت وہ بھی فرماتے ہیں کہ میری نظر طاعت پر تھی گو ان کے اخلاص کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے نکال دیا تاہم اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ طاعت کر کے طاعت پر نظر ہو جانا کچھ بعید نہیں انسان جب اخلاص اختیار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے آگے اپنے کو ڈال دیتا ہے ان کی قدرت اور ان کے استغنا اور انکی بے نیازی کو اپنے سامنے رکھتا ہے تب ہی اس عقبہ سے نکلتا ہے۔ بزرگوں نے اس سے نکالنے کے لئے کیسے کیسے مضامین بیان کئے ہیں اور لوگوں کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی ہے چنانچہ شیخ سعدی جو اس فن کے امام ہیں بوستان میں فرماتے ہیں۔

زمغرور دنیا رہ دیں مجوئے ۔۔۔ خدا بینی از خویشتن بیں مجوئے
گرت جاہ باید مکن چوں خساں ۔۔۔ بہ چشم حقارت نگہ در کساں
گماں کے برد مردم ہوشمند ۔۔۔ کہ در سر گرانیست قدر بلند
ازیں نامور تر محلے مجوئے ۔۔۔ کہ خوانند خلعت پسندیدہ خوئے

جو شخص خدا سے غافل ہو اور دنیا کے دھوکہ میں پڑا ہو اس سے دین کی توقع نہ رکھو۔ جو خود بیں شخص ہے اس سے خدا بینی کی امید نہ کرو اگر تم مرتبہ چاہتے ہو تو کمینوں کی طرح لوگوں کو بنظر حقارت مت دیکھو۔ جو عقلمند شخص ہے اسکو بھلا یہ خیال کب ہو سکتا ہے کہ تکبر اور غرور کے اندر مرتبہ کی بلندی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی مرتبہ مت تلاش کرو کہ مخلوق تم کو یہ کہے کہ نہایت اچھے اخلاق والا شخص ہے۔

نگہ چو توئے بر تو کبر آورد ۔۔۔ بزرگش نہ بینی بہ چشم خرد
تو نیز از تکبر کنی ہم چناں ۔۔۔ نمائی کہ پیشت تکبر کناں

چو استادئی بر مقام بلند | بر افتادہ گر ہوشمندی مخند
بسا ایستادہ در آمد ز پائے | کہ افتادگانش گرفتند جائے

ذرا غور کرو کہ اگر تم جیسا کوئی شخص تم پر تکبر کرے تو تم اسکو کبھی بزرگ سمجھنے کے لئے تیار نہ ہوگے لہٰذا تم خود تکبر کی وجہ سے ایسا تو نہ کرو کہ جس طرح تمہارے سامنے اوراہل تکبر کرتے ہیں اور اگر تم کسی بلند مقام پر کھڑے ہو تو عقلمندی کی بات تو یہ ہے کہ نیچے گرے ہوؤں پر مت ہنسو اس لئے کہ ایسا بہت ہوتا ہے کہ کھڑا ہونے والا پھسل کر نیچے گر جاتا ہے اور نیچے پڑے ہوئے لوگ اسکی جگہ لے لیتے ہیں۔

گرفتم کہ خود ہستی از عیب پاک | تعنت مکن بر من عیب ناک
یکے حلقہ کعبہ دارد بدست | یکے در خراباتے افتادہ مست
گر آنرا بخواند کہ نگزاردش | وزیں را براند کہ بازاردش
نہ مستظہرست ایں با اعمال خویش | نہ انرا در توبہ بست است پیش

میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم عیب سے پاک ہو اور پارسا ہو لیکن مجھ گناہگار پر زیادتی کرنے کا تمھیں کیا حق ہے۔ ایک شخص اپنے ہاتھ سے کعبہ کا پردہ پکڑے ہوئے ہے اور دوسرا شراب خانہ میں مست پڑا ہوا ہے۔ اب اگر حق تعالیٰ اس خرابات والے کو مقبول فرمالیں تو کون ہے جو اسکو ہونے دے اور اگر اس کعبہ والے کو اپنے در سے بھگادیں تو کس کی مجال جو اس کو واپس لاسکے۔ نہ اس عبادت گزار کو اپنے اعمال پر تکیہ کرنے کا کوئی حق ہے اور نہ اس گنہگار کے لئے توبہ کا دروازہ ہی بند ہے۔

جب معاملہ یہ ہے تو پھر کسی زاہد کو کسی رند پر تکبر کرنے کا کیا حق پہونچتا ہے اور اپنے عبادت پر تکیہ کرنا اس کو کب زیبا ہے۔ حضرت حافظؒ کا شعر ابھی میں نے پڑھا ہے فرماتے ہیں کہ ؎

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافریست
راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

حضرت مولاناؒ اس کو اس انداز سے پڑھا کرتے تھے کہ لوگوں کو لطف آجاتا تھا اور پڑھنے ہی کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ خود حضرت والا کا حال ہے اسی طرح حضرت کبھی کبھی ان اشعار کو بھی پڑھا کرتے تھے ؎

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد راہ | در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش | ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

اسی طرح حضرتؒ اس شعر کو بھی بہت پڑھا کرتے تھے ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن | کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

اور اس میں شک نہیں کہ یہ سب اشعار آب حیات اور تصوف کی روح اور اسکی جان ہیں۔
حضرت حافظؒ فرماتے ہیں ؎

زاہد غرور داشت سلامت نہ برد راہ — رند از رہ نیاز بدار السلام رفت

یعنی زاہد غرور اور پندار کی وجہ سے راہ صحیح و سالم نہ طے کر سکا اور رند راہ نیاز سے دار السلام میں داخل ہوگیا اور فرماتے ہیں ؎

ترسم کہ صرفۂ نہ برد روز باز خواست — نان حلال شیخ ز آب حرام ما

مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے دن بازی نہ لے جائے گی شیخ کی نان حلال ہمارے آب حرام سے ہر زمانہ میں بزرگوں نے یہی سیرت پیش کی ہے چنانچہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ہے عبادت کا سہارا عابدوں کے واسطے — ہے عصائے آہ مجھ بے دست و پا کے واسطے

اب ان سب باتوں کا وقت تو ہے نہیں مگر آپ کے سامنے اس لئے بیان کرتا ہوں کہ اگر آپ سیکھ لیں گے تو اس کا نفع آپ ہی کو پہونچے گا اور یہ ہو سکتا ہے کہ یہاں نقصان کی خبر نہ ہو مگر آخرت میں تو ہوگی۔
مضمون سابق یعنی حکایت حضرت عیسٰی علیہ السلام و عابد ناپارسا پر مزید کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ عابد صاحب پر چور پکڑ گیا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے جو قصہ لکھا ہے کہ عبادت پرست نے جب اس گنہگار کو دیکھا تو اسکو بہت کچھ سخت سست کہا اس پر ابرو ترش کئے اُسے مُدبر۔ نگوں بخت اور نادان کہا اور یہ کہا کہ اسکی مصاحبت سے اس لئے دور رہنا چاہتا ہوں کہ مبادا اس کی آگ کا کچھ حصہ مجھ پر نہ پڑ جائے حتیٰ کہ آخر میں یہانتک کہہ دیا کہ ؎ بہ محشر کہ حاضر شود انجمن

خدایا تو با او مکن حشر من

یعنی اے خدا محشر میں جبکہ سب لوگ جمع ہونگے تو میرا حشر اس کے ساتھ نہ کیجیو تو اس کا یہ سب کہنا کبر کی بنا پر تھا اور کبر کسی میں بلا وجہ نہیں ہو جایا کرتا بلکہ اس کے کچھ اسباب ہوتے ہیں، اور یہاں وہ سبب یہ ہوا کہ عبادت کی وجہ سے وہ اپنے کو بزرگ سمجھنے لگا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ میں تو عابد ہوں شب و روز اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہوں اس لئے مقبول بارگاہ ہوں حالانکہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں بزرگوں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ ع بزرگاں نہادہ بزرگی ز سر اللہ تعالیٰ کی ذات نہایت مستغنی و بے نیاز ہے فرشتے جن کی غذا ہی طاعت ہے وہ بھی اس کے حکم کے آگے گم صم ہیں۔ شیخ سعدیؒ نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا کچھ بیان بوستاں کے دیباچہ میں کیا ہے خوب کہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

یکے را بہ سر بر نہد تاج بخت — یکے را بخاک اندر آرد ز تخت

کلاہِ سعادت یکے بر سرش
گلیمے شقاوت یکے در برش

گلستاں کند آتشے بر خلیل
گروہے بہ آتش برد ز آب نیل

ایک کے سر پر نصیبے کا تاج رکھتا ہے اور ایک کو تخت سے آتار کر زمین پر لاتا ہے۔ کسی کے سر پر سعادت کی ٹوپی رکھدی ہے اور کسی کے بدن پر شقاوت کی کملی ڈال رکھی ہے۔ حضرت خلیل اللہ پر آگ کو گلستاں بنادیا اور ایک جماعت کے حق میں دریائے نیل کو آگ بنادیا۔

گر آن ست منشور احسان اوست
درین است توقیر فرمان اوست

پس پردہ بیند عمل ہائے بد
ہمو پردہ پوشد بآلائے خود

بتہدید گر برکشد تیغ حکم
بمانند کروبیاں صم وبکم

اگر وہ اس کے احسان کا مظاہرہ ہے تو یہ اس کے عظمت حکم کا مشاہدہ ہے برے اعمال کو پردہ کے پیچھے سے دیکھ لیتا ہے مگر اس کے بعد اپنے انعام کے ذریعہ پردہ پوشی ہی کرتا ہے۔ اگر وہ شاہی جلال کے ساتھ حکم کی تلوار کھینچے تو مقرب فرشتے بھی بس گم صم ہوکر رہ جائیں۔

دگر در دہد یک صلائے کرم
عزازیل گوید نصیبے برم

بدرگاہِ لطف و بزرگیش بر
بزرگاں نہادہ بزرگی ز سر

اور اگر وہ کرم کا اعلان کردے تو ابلیس کو بھی اپنی بخشش کی توقع ہو جائے اس کے سراپا لطف و بزرگی کے دربار میں بزرگوں نے اپنے سرسے بزرگی اتار کر رکھدی ہے۔ جب یہ شان ہے حق تعالیٰ کی تو وہاں آپ کی عبادت کو پوچھتا کون ہے۔ بڑے بڑے ملائک شب و روز عبادت کرنے کے بعد بھی اپنے آپ کو قاصر ہی سمجھتے ہیں مگر اس عابد نے تھوڑی سی عبادت کی اور اپنے آپ کو بزرگ سمجھ لیا یہی اس کے عدم اخلاص کی دلیل تھی اور یہ قاعدہ ہے کہ جو شخص خود بزرگ نہو لیکن اپنے کو بزرگوں کے زمرہ میں شمار کرنا چاہتا ہو تو وہ اسی قسم کی باتیں کرتا ہے۔ اس کے لئے بزرگی کا سنبھالنا تو آسان نہیں ہوتا۔ لامحالہ اکی جگہ ڈینگ ہی سے کام لیتا ہے۔ اس شخص کو عبادت کا کچھ بھی فیض نہیں حاصل ہوا۔ عبادت تو عابد و معبود کے درمیان واسطہ ہوتی ہے اور اسے نہ اپنی ہی معرفت تھی اور نہ معبود کی ورنہ تو اگر ذرا سا حصہ معرفت کا نصیب ہوجاتا تو اُسے عُجب و کبر سوجھتا؟ اور دوسروں پر نظر جاتی؟ یا کہ خود اپنی فکر پڑجاتی اور قلب خشیت و خوف سے بھر جاتا۔ چنانچہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے اسی کتاب میں ایک حکایت دہقان در لشکر سلطان بیان کی ہے جس کے ذریعہ سے اس بات کو سمجھا دیا ہے حکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی دیہات کے ایک رئیس اور اس کے لڑکے کا گذر بادشاہ کے لشکر پر ہوا۔ لڑکے نے جب لشکریوں کے ساز و سامان کو دیکھا اور فوجوں کے

کروفر کا مشاہدہ کیا اور یہ دیکھا کہ ان سب کے سامنے میرا باپ بالکل کمتر ہے ذلیل معلوم ہوتا ہے تو اس نے باپ سے پوچھا کہ آخر آپ یہاں اس قدر مسکین اور متواضع کیوں نظر آرہے ہیں۔ آخر آپ بھی تو گاؤں کے چودھری ہیں اور بہت سے سرداروں سے بڑھ کر ہیں۔ پھر یہ آپ کا کیا حال ہو رہا ہے کہ اس قدر گھبرائے ہوئے سے ہیں کہ جیسے مرہی جاوینگے اور بادشاہ کے سامنے اس طرح کانپ رہے ہیں جیسے بید کی ٹہنی ہے لڑکے کے اس سوال کا جواب جو باپ نے دیا بس میرا مقصود یہاں اسی کا بیان کرنا ہے اس نے کہا ؎

بلے گفت سالار و فرماں دہم — ولے عزتم ہست تا در دہم

بزرگاں ازاں دہشت آلودہ اند — کہ در بارگاہِ ملک بودہ اند

تو اے بے خبر ہم چناں در دہی — کہ بر خویشتن منصبے می نہی

یعنی باپ نے کہا کہ ہاں بے شک میں سردار بھی ہوں اور حکمراں بھی ہوں لیکن میری عزت [illegible] بس گاؤں تک ہے۔ آگے شیخ سعدیؒ بطور تتمہ کے فرماتے ہیں کہ بزرگان دین پر جو خوف [illegible] ہراس طاری رہتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ شاہی دربار میں ہوتے ہیں اور تو اے بے خبر [illegible] ابھی اپنے لئے کوئی منصب اور مقام سمجھتا ہے تو یہ جان لے کہ تو بھی دیہات [illegible] میں نے اس پر سنائی کہ اس عابد کو اگر معرفت کا کچھ حصہ ملا ہوتا تو اس کی نظر خود [illegible] اپنی عبادت سے اٹھ چکی ہوتی لیکن جب اس پر نظر باقی ہے تو معلوم ہوا کہ [illegible] بجمیعت نہیں ہوئی۔ طریق نام ہے فنا کا۔ عابد پر جب عبادت اثر کرجاتی ہے تو وہ یاد محبوب میں غرق ہوجاتا ہے اور اپنے وجود کو ان کے وجود میں فنا کردیتا ہے۔ شیخ نے اس مسئلہ کو بھی حکایت (کرمک شب تاب) کا عنوان قائم فرما کر نہایت ہی دلکش عنوان سے ثابت کیا ہے فرماتے ہیں ؎

مگر دیدہ باشی کہ در باغ و راغ — بتابد بشب کرمکے چوں چراغ

یعنی تم نے اکثر باغ و بیابان میں دیکھا ہوگا کہ رات کے وقت ایک چھوٹا سا کیڑا چراغ کی طرح چمکتا پھرتا ہے۔

یکے گفتش اے مرغکے شب فروز — چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز

کسی نے اس سے دریافت کیا کہ اے رات کو چمکنے والے چھوٹے کیڑے تو دن میں باہر کیوں نہیں نکلتا۔

ببیں کاتشیں کرمکے خاک زاد — جواب از سر روشنائی چہ داد

دیکھو مٹی سے پیدا ہونے والے اس آتشیں کیڑے نے کیسی عقلمندی کا جواب دیا۔

کہ من روز و شب جز بہ صحرا نیم — ولے پیش خورشید پیدا نیم

اس نے کہا کہ میں تو رات و دن جنگل میں رہتا ہوں ہاں مگر اتنی بات ہے کہ آفتاب کے آگے میرا وجود نظر نہیں آتا۔

سبحان اللہ فنا کے مسئلہ کو کس طرح معمولی قصوں سے ثابت فرمایا ہے۔ واقعی گنہ گار کے مقابلہ میں اس عابد کی زبان جو قینچی کی طرح چلی تو اسی لئے کہ اس نے اپنے وجود کو ختم نہیں کیا تھا اور نہ اس مسکین کو معرفت کی ہوا لگی تھی ورنہ تو ع آنراکہ خبر شد خبرش باز نیامد کا مصداق ہوتا نہ کہ اس قسم کے تکبر کے کلمات زبان پر لاتا۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ شیخ نے عابد ناپارسا کی جو کچھ مذمت بیان کی ہے وہ اسکی عبادت کی بنا پر نہیں کی ہے بلکہ اس کی ناپارسائی کی بنا پر کی۔ ورنہ عبادت کا شرف اور فضل تو منصوص ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ یعنی ہم کتابوں میں لوح محفوظ (میں لکھنے) کے بعد لکھ چکے ہیں کہ اس زمین کے مالک نیک بندے ہونگے۔ اس میں زمین سے مراد اگرچہ ارض جنت کو کہا گیا ہے تاہم ابن عباس سے مروی ہے کہ المراد بها ارض الدنيا يرثها المومنون ويستولون عليها وهو قول الكلبي وايد بقوله تعالىٰ ليستخلفنهم في الارض یعنی ابن عباس فرماتے ہیں کہ مراد اس سے دنیا کی ہی نہیں ہے جس کے وارث مومن ہونگے اور ان کا اس پر تسلط ہوگا۔ کلبی کا بھی یہ قول ہے جس کی تائید میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش کیا ہے کہ وہ ان کو زمین کا ضرور بالضرور خلیفہ بنائے گا۔ بہر حال آگے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ یعنی بلاشبہ اس میں کافی مضمون ہے ان لوگوں کے لئے جو بندگی کرنے والے ہیں اور ہم نے آپ کو کسی اور بات کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگوں پر مہربانی کرنے کے لئے۔ دیکھئے اس آیت میں بلاغ اور کفایت کو قوم عابدین کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین کی وراثت چاہتے ہو تو عبادت کرو۔ اس سے عبادت کی تعریف نکلی۔ مگر مراد اس سے وہ عبادت ہے کہ جس میں عابد حق تعالیٰ کی رضا کا قصد کرے نہ ایسی کہ ایک جانب عبادت بھی کرتا جائے اور دوسری جانب اسکی بدحالی بھی بڑھتی جائے جیسا کہ اس عابد ناپارسا کا حال ہوا۔ اس جیسی عبادت کی تعریف نہیں کی جائیگی کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی عبادت ہی نہیں بلکہ مخلوق کی خاطر ہے اور عبادت کی عبادت ہے۔ اسی واسطے شیخ نے اسکو عبادت پرست فرمایا ہے اس قسم کے لوگ اندر اندر اپنے ہی معتقد ہوتے چلے جاتے ہیں اس لئے جتنا کرتے جاتے ہیں اتنا ہی ان کے اخلاق خراب ہوتے جاتے ہیں اور مخلوق نے اگر کچھ تعریف وغیرہ کردی تب تو یہ اور بگڑ گئے یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ

جب ان کی ریائی عبادت کی وجہ سے ایک مخلوق دھوکے میں آکر ان کے پیچھے پیچھے ہولیتی ہے تو اُن کی نظر اپنے خداع اور بد باطنی پر نہیں جاتی بلکہ الٹے اپنے کو بزرگ سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ خدا کے یہاں سے ان کا پتہ کٹ جاتا ہے ؎

او چو بیند خلق را سرمست خویش　　از تکبر می رود از دست خویش

اور اس کا مصداق ہوجاتے ہیں کہ ؎

یہ تیلی کے کچھ بیل سے کم نہیں ہیں　　پھرے رات بھر پھر جہاں تھے وہیں ہیں

میں یہ کہہ رہا ہوں کہ عبادت اور عابدین کی مدح تو منصوص ہے اور یہاں شیخ ان کی مذمت کر رہے ہیں تو بات یہ ہے کہ یہ لوگ عابد ہی نہیں اور اسکی دو وجہ ہے ایک تو یہ کہ انکو اپنی عبادت کا زعم ہوجاتا ہے اور دوسری چیز یہ کہ ان میں ریاکاری کی وجہ سے حمق پیدا ہوجاتا ہے اور جو اللہ کا طالب ہوتا ہے اس کی عقل درست ہوتی ہے۔ عارف سب سے زیادہ عاقل ہوتا ہے ان لوگوں کے اس قسم کے دعاوی خود ان کے مفاد کے بھی خلاف ہوتے ہیں کیونکہ لوگ بھی اہل دعویٰ کو پہچان ہی لیتے ہیں اور ان سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کے لئے کتنے نقصان کی بات ہے کیونکہ ریاکاری سے جو مقصود ہے اس کے خلاف ہے مگر اس حمق کے اختیار کرنے پر یہ لوگ مجبور بھی ہیں کیونکہ خدائے تعالیٰ کے یہاں سے جب کچھ ملا نہیں ہوگا تو ایسے شخص کے لئے اس قسم کی خرافات اور بکواس لازم حال ہوجاتی ہے جب کوئی سچا نہ ہوگا تو لامحالہ جھوٹا ہوگا اب جھوٹے لوگوں سے سچوں کے حالات کیسے پیدا ہوسکتے ہیں۔ مسیلمہ کذاب کے متعلق لکھا ہے کہ اپنے یہاں اذان میں اپنے لئے بھی رسالت کی گواہی دلواتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بھی اعلان کراتا تھا گویا حضور سے مساوات کا دعویٰ تھا۔ یہ سمجھتا تھا کہ آپ کا انکار تو چلے گا نہیں اس لئے آپ کے ساتھ ساتھ اپنے کو بھی شامل کرلیا۔ اس لئے علماء نے فرمایا ہے کہ جو شخص کچھ ہو اور دعویٰ کسی کمال کا کرے وہ مسیلمہ کذاب کا بھائی ہے۔ شیخ نے اسی لئے اس واقعہ کو بیان کیا تاکہ آپ کو ایسے لوگوں کی معرفت کرادیں کہ جب دعویٰ ہو تو سمجھ لو کہ کچھ نہیں ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں سے راندہ ہوا ہے۔ یہاں اس واقعہ میں بھی عابد کو اپنی عبادت پر ناز پیدا ہوگیا تھا۔ تقاضائے عبادت کے بالکل خلاف کیونکہ عبادت کی وجہ سے تو اس کے اندر تواضع، مسکنت، خاکساری اور انکسار پیدا ہونا چاہئے تھا مگر بجائے اس کے رعونت، تعلّی، کبر یہ سب رذائل پیدا ہوگئے جو کہ معصیت کے خواص تھے اور اس نے اپنی طاعت پر نظر کی اور اس پر تکیہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اپنے کو بے نیاز جانا اسے عبادت کا ناز پیدا ہوگیا اور نیک لوگوں میں یہ چیزیں پیدا ہو ہی جاتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ عجب ہے

بڑی دشوار گزار گھاٹی ہے اللہ تعالیٰ ہی فضل فرماویں تو انسان اس سے بچ سکتا ہے ورنہ بہت مشکل ہے تکیہ کے بارے میں بزرگانِ دین کا یہ فتویٰ ہے کہ یہ کافری ہے چنانچہ حضرت حافظؒ فرماتے ہیں ؎

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافریست　　راہ رو گرصد ہنر دارد توکل بایدش

اور کافری اس لئے ہے کہ مومن کا تکیہ خدا پر ہوتا ہے اس کے فضل و کرم پر ہوتا ہے اب غیر اللہ پر تکیہ کرنا ظاہر ہے کہ یہ کافروں ہی کی صفت ہوسکتی ہے۔ یہاں ایک بات یہ سمجھئے کہ جس طرح تکیہ زہد و طاعت پر ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی معصیت پر بھی ہوجاتا ہے یعنی گنہگار کی نظر حق تعالیٰ کے عفو و کرم سے ہٹ کر اپنی معصیت پر مقصور ہوجاتی ہے چنانچہ جب وہ اپنے گناہوں کی کثرت پر نظر کرتا ہے تو اس میں ایک یاس کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے یعنی وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب میں بخشا ہی نہ جاؤں گا گویا ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے اسکی نظر ہی ہٹ جاتی ہے اس کو بھی مشائخ فرماتے ہیں کہ یہ خطرناک حال ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو گنہگاروں کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا یعنی اے وہ لوگو جنھوں نے معصیت کرکے اپنے جانوں پر ظلم کیا ہے۔ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو بیشک اللہ تعالیٰ گناہوں کو بخش بھی دیا کرتے ہیں۔ اسلامی عقیدہ تو یہ ہے اور یہ شخص اپنی عقل سے یہ حکم لگا رہا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ اس کو بخش ہی نہیں سکتے۔ نہایت ہی مہمل اور بے عقل شخص ہے۔

بہرحال تکیہ خواہ طاعت پر ہو یا معصیت پر دونوں مذموم ہیں اور طاعت پر تکیہ عابد کو اس لئے ہوجاتا ہے کہ اسکی نظر يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ پر نہیں رہتی اور عاصی جو اپنی معصیت پر تکیہ کرلیتا ہے تو اس لئے کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اس کے پیش نظر نہیں ہوتا اس لئے اعتدال کی راہ یہ ہے کہ عابد کو تو چاہئے کہ اگر وہ ایک جانب اپنی عبادت سے خوش ہوتا ہے تو ہو لیکن اس کو چاہئے کہ دوسری جانب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بھی ڈرتا ہے اسی طرح گنہگار اگر معاصی سے خوف کرتا ہے تو کرے مگر ساتھ ہی ساتھ اسے اللہ تعالیٰ کے غفور و رحیم ہونے کا عقیدہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے عاصی کے اندر اگر یہ چیزیں موجود ہوں تو اس کے بعد معصیت مضر نہ ہوگی اور اس کا یہی خوف اس کا کام بنادے گا جیسا کہ آپ نے عابد نا پارسا کی حکایت میں گنہ گار کا حال دیکھا۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان معصیت کرتا ہے اور اس پر جری ہوتا ہے ندامت اور انابت تو الگ رہی گناہ کرکے اس پر فخر کرتا ہے۔ رات کو گناہ کرتا ہے اور دن میں لوگوں سے اس کو ہنسی خوشی بیان کرتا ہے اس کا نام جرأت ہے اس پر اس سے قیامت میں مواخذہ ہوجائے گا۔

بہر حال یہ حق تعالیٰ کی تربیت ہے کہ ایک نیک آدمی کو رحمت کے خیال کے ساتھ ساتھ عذاب کا دھیان بھی رکھنے کو فرمایا اور عاصی کو خوف و خشیت کے ساتھ ساتھ رحمت کی جانب بھی متوجہ فرمایا۔

یہاں ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ شیخ سعدیؒ نے اس حکایت میں اُس عابد کو جو نا پارسا کہا تو اس سے معلوم ہوا کہ عابد دو طرح کے ہوا کرتے ہیں ایک پارسا اور ایک نا پارسا۔ اب یہ بات کہ عابد نا پارسا کون کہلاتا ہے تو اس کے متعلق کہتا ہوں کہ شیخ نے اس حکایت سے پہلے جو مضمون بیان کیا ہے اسکی سرخی جو قائم کی ہے کہ "گفتار در عجب و عاقبت آں و شکستگی و برکت آں" اس میں ایک نصیحت یہ بھی فرمائی کہ ؎

گرفتم کہ خود ہستی از عیب پاک　　تعنت مکن بر من عیب ناک

اس میں بتایا کہ کوئی شخص اگر خود عیوب سے پاک ہو تو سبحان اللہ کیا کہنا لیکن جو لوگ کہ اہل معصیت اور اہل عیب ہیں ان کے متعلق طعن اور عیب گوئی بھی نہ کرنی چاہئے۔ اس سے ان کی نیکی کی تکمیل ہوگی اور وہ عابد پارسا کہلائیگا ورنہ اگر اپنی عبادت کے ساتھ ساتھ دوسروں کی تحقیر اور تذلیل بھی پیش نظر رہی تو یہ شخص عابد تو کہلائیگا مگر پارسا نہ ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ عابد ہونا تو آسان ہے مگر پارسا ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ یہاں یہ عابد، جو نا پارسا کہلایا تو اسی لئے کہ اس گنہگار کے ساتھ نہایت ہی بد خلقی اور ترش کلامی سے پیش آیا معلوم ہوتا ہے کہ جب شیخ سعدیؒ نے نیکوں کو تعنت سے منع فرمایا تو اس کے بعد ہی عابد نا پارسا کی حکایت بیان کر کے اس تعنت کی توضیح فرمادی اس سے معلوم ہوا کہ اس کے نا پارسا ہونے کا سبب اس کا یہی تعنت تھا اور اس تعنت کا سبب یہ بنا کہ اس نے اپنے آپ کو بزرگ سمجھ لیا تھا اور اپنے عمل پر اس کی نظر ہوگئی تھی جس کی وجہ سے دوسروں کی حقارت قلب میں پیدا ہوگئی تھی۔

سبحان اللہ ان تعلیمات کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں اخلاق کا معیار کس قدر بلند ہے کہ ایک شخص جو گناہوں سے محفوظ بلکہ معصوم ہی کیوں نہ ہو اس کو بھی یہ حق نہیں دیا گیا کہ کسی گنہ گار کو حقیر سمجھے اسکی خیریت اسی میں ہے کہ اپنے ہی کو حقیر سمجھے اور دوسروں کو بہ نظر توقیر دیکھے کیونکہ اعتبار خاتمہ کا ہے اور اسکی خبر نہیں۔ رہا عمل تو اس پر کوئی کیا فخر کر سکتا ہے جبکہ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا۔ اس پر حضرت عائشہ صدیقہؓ کو تعجب بھی ہوا۔ عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ بھی اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائینگے آپ نے فرمایا کہ ہاں میں بھی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی مجھے ڈھانپ لے یہ مسئلہ اس عابد نا پارسا کو نہیں معلوم تھا یا اُس پر

اُس کا عمل نہ تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے قول وفعل اور حال سب کے ذریعہ اپنی امت کو سمجھایا ہے اور امت نے اسے سمجھا ہے چنانچہ شیخ سعدیؒ نے بوستاں کے شروع ہی میں جو نعت لکھی ہے اس میں کس قدر عاجزی اور تواضع کے اشعار لائے ہیں کہ سبحان اللہ۔ ان کے پڑھنے سے ہی آدمی میں ایک حال پیدا ہو جاتا ہے اور اللہ و رسول کا مرتبہ اور اپنی پستی و حقارت سامنے آجاتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خدایا بحق بنی فاطمہ — کہ بر قول ایماں کنم خاتمہ
اگر دعوتم رد کنی ور قبول — من و دست و داماں آل رسول
چہ کم گردد اے صدر فرخندہ پے — ز قدر رفیعت بدرگاہ حی
کہ باشند مشتے گدایان خیل — بہ مہمان دار السلامت طفیل

اے خدا حضرت فاطمہ کی اولاد کے طفیل میں یہ درخواست ہے کہ میرا خاتمہ ایمان پر ہو۔ آپ میری دعا کو خواہ رد کریں یا قبول کریں قیامت میں میں ہونگا۔ میرا ہاتھ ہوگا اور آل رسول کا دامن ہوگا۔ اے مرتبہ بلند کے صدر نشین حق تعالیٰ کی درگاہ میں جو آپ کا مرتبہ عظیم ہے اس میں کیا کمی آجائیگی اگر تھوڑے سے فقرا بھی آپ کے دار السلام کے مہمانوں کے ساتھ طفیلی ہو کر آجائیں۔

خدایت ثنا گفت و تبجیل کرد — زمیں بوس قدر تو جبرئیل کرد
بلند آسماں پیش قدرت خجل — تو مخلوق و آدم ہنوز آب و گل

اللہ تعالیٰ نے آپ کی ثنا کی ہے اور بزرگی بیان کی ہے اور جبرئیل علیہ السلام نے آپ کی قدر کی زمین کو بوسہ دیا ہے۔ بلند آسماں آپ کی قدرت کے آگے شرمندہ ہے اور آپ کی تخلیق ہو چکی تھی درآنحالیکہ آدم علیہ السلام ہنوز آب و گل ہی میں تھے۔

تو اصل وجود آمدی وز نخست — دگر ہرچہ موجود شد فرع تست
ندانم کدامی سخن گویمت — کہ والا تری زاں چہ من گویمت
ترا عز لولاک تمکیں بس است — ثنائے تو طٰہٰ و یٰسین بس است
چہ وصفت کند سعدیؒ ناتمام — علیک الصلوٰۃ اے نبیؐ السلام

آپ ابتدا ہی سے ساری کائنات کے وجود کے اصل تھے بعد میں جو چیزیں موجود وجود میں آئیں وہ آپ ہی کی فرع ہیں۔ میں اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کی شان میں کون سی ایسی بات کہوں جو آپ کو پسند آجائے کیونکہ میں جو کچھ بھی کہونگا آپ اس سے کہیں بالاتر ہیں۔ آپ کے مرتبہ کے لئے لولاک

لما خلقت الافلاک کا شرف ہی کافی ہے اور آپ کی ثنا کے لئے طٰہٰ و یٰسین کافی ہے۔ یہ نااہل و ناقص سعدی آپ کا کیا وصف بیان کر سکتا ہے بس اے نبی آپ پر اللہ ہی کا درود و سلام ہو۔

دیکھئے شیخ نے اپنی کتاب کی ابتدا کس قدر پاکیزہ عنوان سے کی ہے۔ حق تعالیٰ کی حمد بیان کی جیسی کہ انکی شان ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت جو لکھی وہ بھی نہایت ہی مؤثر انداز میں کہ ہر ہر شعر ادب اور تواضع میں ڈوبا ہوا ہے اور سنئے۔ اپنی اسی کتاب کے باب چہارم میں سید الطائفہ حضرت جنیدؒ کی تواضع کا ایک واقعہ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندگان دین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے کس درجہ شغف اور مناسبت رہی ہے کہ جو انداز کسر و انکسار کا آپ نے اختیار فرمایا خواص امت بھی اسی پر چل پڑے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا کہ راہ یہی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ ؎

شنیدم کہ بر دشت صنعا جنید | سگ دید برکندہ دندانِ صید
زنیروئے سرپنجۂ شیر گیر | فرو ماند عاجز چو روباہ پیر
پس از عزم و آہو گرفتن بہ پے | لگد خوردہ از گوسپندان حے

میں نے سنا کہ صنعا کے جنگل میں حضرت جنید نے ایک کتے کو دیکھا کہ جس کے شکار کرنے والے دانت گر چکے تھے اور وہ شیر کو پکڑنے والے پنجے کی طاقت بھی کھو چکا تھا اور مانند بوڑھی لومڑی کے عاجز ہوگیا تھا۔ یا تو پہاڑی بکرے کو شکار کرنے کے بعد ہرن کا شکار کرلیتا تھا اور یا اب قبیلہ کی بھیڑوں کی لات کھاتا تھا۔

چوں مسکین و بے طاقتش دید وریش | بدو داد یک نیمہ از زاد خویش
شنیدم کہ می گفت وخوں می گریست | کہ داند کہ بہتر زما ہر دو کیست
بظاہر من امروز ازیں بہترم | دگر تا چہ راند قضا بر سرم

حضرت جنید نے جب اُسے مسکین کمزور اور زخمی دیکھا تو اپنے توشہ میں سے ایک ٹکڑا اس کے آگے بھی ڈال دیا۔ میں نے سنا کہ حضرت جنید یہ کہتے تھے اور خون کے آنسو روتے تھے کہ کون جانتا ہے کہ ہم دونوں میں سے عند اللہ کون بہتر ہے۔ گو بظاہر آج میں اس سے بہتر معلوم ہوتا ہوں لیکن کل کو میرے سر پہ قضا کیا گزارے گی کچھ خبر نہیں۔

گرم پائے ایماں نہ لغزد زجائے | بہ سر بر نہم تاج عفو خدائے
دگر کسوت معرفت در برم | نہ ماند بہ بسیار ازیں کمترم
کہ سگ باہمہ زشت نامی چو مرد | مرد را بدوزخ نہ خواہند برد

اگر میرے ایمان کے قدم نے اپنی جگہ سے لغزش نہیں کی تو حق تعالیٰ کے عفو کا تاج سر پر رکھوں گا اور اگر کہیں خدانخواستہ معرفت ہی کا لباس ہمارے اوپر نہ رہ جائے یعنی ہم اس سے خالی ہو جائیں تو پھر میں کتے سے کہیں کمتر ہوں اور یہ مجھ سے کہیں بڑھ کر ہے اس لئے کہ کتے میں ہزار برائی سہی مگر جب وہ مرجائیگا تو دوزخ میں اس کو نہ لیجائیں گے اور انسانوں کے لئے تو دوزخ بھی ہے۔

رہ این ست سعدی کہ مردانِ راہ به عزت نکردند در خود نگاہ

ازیں بر ملائک شرف داشتند کہ خود را بہ از سگ نہ پنداشتند

سبحان اللہ۔ حکایت کا خلاصہ کیا عمدہ بیان فرمایا ہے کہ اے سعدی راہ بس یہی ہے کہ سالکان طریق نے کبھی اپنے اندر عزت کے ساتھ نگاہ نہیں کی یعنی عجب و خود پسندی میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ تواضع ہی اختیار کی چنانچہ فرشتوں سے اسی لئے شرف میں بڑھ گئے ہیں کہ انھوں نے اپنے کو کبھی کتے سے اچھا نہیں سمجھا۔

شیخ سعدیؒ کے کلام کی ابتدا اور وسط تو آپ نے ملاحظہ فرمایا اب کلام کی انتہا بھی دیکھئے چونکہ اختتام کے مناسب رجاء ہے اس لئے شیخ نے اس کا طریقہ بھی سکھلایا بلکہ دعا کرکے یہ بتادیا کہ اس طرح سے بندہ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت پر نظر رکھنا چاہئے اور اس میں شک نہیں کہ شیخ نے بہت ہی خوب بیان کیا ہے فرماتے ہیں ؎

دلم می دہد وقت وقت ایں امید کہ حق شرم دارد ز موئے سپید

عجب دارم از شرم دارد زمن کہ شرمم نمی آید از خویشتن

میرا دل رہ رہ کر مجھے یہ امید دلاتا ہے کہ حق تعالیٰ سپید بال والے مومن سے شرماتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ حق تعالیٰ کو مجھ سے شرم آتی ہے تو میرے لئے یہ بڑے تعجب کا مقام ہے کہ مجھے اپنے سے شرم نہیں آتی۔

نہ یوسف کہ چندیں بلا دید و بند چو حکمش رواں گشت و قدرش بلند

گنہ عفو کرد آلِ یعقوب را کہ معنیٰ بود صورتِ خوب را

بکردار بد شاں مقید نہ کرد بضاعات مزجات شاں رد نہ کرد

تم نے نہیں سنا کہ یوسف علیہ السلام نے باوجودیکہ اس قدر مصیبت جھیلی اور قید و بند میں رہے مگر جب حاکم ہوئے اور ان کا مرتبہ بلند ہوگیا تو آلِ یعقوب کے قصور کو معاف کردیا اور کیوں نہ ہوتا

جب اللہ نے انھیں صورتاً حسین بنایا تھا تو سیرت بھی اسی کے شایان شان ہی ہونی چاہیئے اور معاف یوں کر دیا کہ ان کی بد اخلاقی کے سبب سے انھیں قید نہیں کیا اور ان کی کھوٹی پونجی کو رد نہیں فرمایا پس جب ایک نبی کے عفو و کرم کا یہ حال ہے تو ؎

زلطفت ہمیں چشم داریم نیز   بدیں بے بضاعت بہ بخش اے عزیز
بضاعت نیاوردم الا امید   خدایا زعفوم مکن نا امید

اسی طرح اے خدا آپ کے لطف و کرم سے بھی ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس بے سرمایہ کو محض اپنے فضل و کرم سے بخش دیں گے۔

میں بھی کوئی پونجی لے کر نہیں آیا ہوں سوائے رجا اور امید کے لہذا اے خدا مجھ کو اپنے عفو سے ناامید فرمائیے دیکھا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انا البائس الفقیر ارشاد فرما کر امت کو جو تعلیم کی تھی تو امت نے اسے کیسا سیکھا باقی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرح سے اعتراف ذنب کا سبب کیا ہوا جبکہ آپ معصوم بھی تھے تو اس کے متعلق سنئے۔

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا ۝ اس میں اعتراف ذنب کرنے والوں کی فضیلت اور انکی مدح فرمائی گئی ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی شان ہی یہ تھی کہ کان خلقہ القرآن کس طرح اس فضیلت کے حاصل کرنے سے صرف نظر فرماتے اور یہ ظاہر ہے کہ ہر فضل و کمال انبیاء علیہم السلام میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے اس لئے آپ نے بھی خود کو مذنبین کی صف میں کھڑا کر کے باوجود معصوم ہونے کے ایسا اعتراف ذنب کیا اور اس طرح گریہ و زاری فرمائی کہ اس منصب کا حق ہی ادا کر دیا اور توبہ و استغفار میں بھی سب سے بڑھ گئے۔ سبحان اللہ دیکھئے آپ نے کیسے کیسے کلمات فرمائے کہ دوسرا کوئی اس طرح کہنے پر قادر ہی نہیں تھا یہ فرمایا کہ:

"میں مصیبت زدہ ہوں۔ محتاج ہوں۔ فریادی ہوں۔ پناہ جو ہوں۔ ترساں و ہراساں ہوں اپنے گناہوں کا اقرار و اعتراف کرنے والا ہوں۔ سوال کرتا ہوں۔ تجھ سے سوال بیکس کا سا۔ گڑگڑاتا ہوں تیرے سامنے گڑگڑانا گنہگار ذلیل کا سا اور طلب کرتا ہوں تجھ سے طلب کرنا خوف زدہ آفت رسیدہ کا سا اور طلب کرنا اس شخص کا سا کہ جھکی ہوئی ہو تیرے سامنے گردن اسکی اور بہہ رہے ہوں تیرے روبرو آنسو اس کے اور دعا مانگتا ہوں تجھ سے اس شخص کی سی جو فروتنی کئے ہوئے ہو تیرے سامنے اور رگڑتا ہو تیرے سامنے ناک اپنی۔"

سبحان اللہ اعتراف ذنب کا کیسا نقشہ کھینچا ہے اور اس کے ذریعہ گنہ گاروں کی کس قدر دلجوئی اور تسکین فرمائی ہے اور کس قدر عنایت ہے گنہگاروں کے حال پر کہ ان کی یوں تسلی فرمادی کہ میں ان کا بھی نبی ہوں اگر میں ہی ان کو چھوڑ دوں گا تو پھر وہ کہاں جائیں گے۔

واقعی کوئی شیخ ایسا نہیں ہے جو اس طرح مرید کے مقام پر نزول کر کے ان کی تربیت کرے جس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تو یہ تھی جو آپ نے ملاحظہ فرمائی لیکن کتابوں میں سید گیسو دراز کا عجیب واقعہ لکھا ہے اور یہ بڑے شخص ہوئے ہیں کسی نے ان کے بارے میں لکھا ہے ؎

ہر کو مرید سید گیسو دراز شد　　　　واللہ خلاف نیست کہ او عشقباز شد

واقعہ یہ ہے کہ صاحب مرأۃ الاسرار لکھتے ہیں کہ میں سید گیسو دراز قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا انھوں نے مجھے روپیہ دیا کہ شراب خرید کر لاؤ میں نے تعمیل حکم کی فرمایا کہ پیالہ میں پُر کر کے مجھے دو میں نے پیش کیا شیخ نے نوش فرمالیا۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ تم بھی ایک پیالہ پیو۔ مجبوراً میں نے بھی الامر فوق الادب کے خیال سے ایک پیالہ پی لیا۔ حق تعالیٰ علیم ہیں کہ وہ شہد خالص تھا۔ سبحان اللہ کیا احوال اور کیا اسرار۔ اسکی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سالکین کو نہایت سلوک میں جب اپنی عبادت پر نظر اور عجب ہوتا ہے تو اپنے کو معصیت میں ڈال کر اپنے عجب کا ازالہ کرتے ہیں پھر جب یہ حضرات اپنے کو اس درجہ گرا دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کے صدق و خلوص کی برکت سے ان کے لئے حقیقت اشیاء ہی کو بدل دیتے ہیں علماء اسے بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ کتاب ہی میں لکھ دیا ہے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ صوفی اگر کسی عقبہ میں گرفتار ہو جائے تو اس سے نکلنے کے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ خلاف سنت بلکہ خلاف شریعت عمل کیا جائے ایسے موقعہ پر بھی سنت ہی کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ یہی راستہ روشن اور بے خطر ہے اور وہ راستہ یہی ہے کہ اس موقعہ پر اس کا استحضار رکھو کہ انا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الخ اسکو زبان سے کہو گے اور دل سے سمجھو گے تو گیا اس کے ذریعہ سے اس عقبہ سے تم ہیں نکل جاؤ گے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ دل تک پہونچتے پہونچتے اُسے کچھ دیر لگ جائے اور کچھ دنوں بعد یہ دل نشین ہو مگر کرتے کرتے ہو ہی جائیگا اور اس سے نکل جاؤ گے اب اس کے بعد آپ سے پوچھتا ہوں کہ کسی بڑے سے بڑے ولی اور بزرگ کے لئے آخر یہ زیبا کب ہے کہ اس سے نکلنے کے لئے اس قسم کے خلاف شرع امور کے ارتکاب کی ہمت کرے بہر حال ہم کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ کرنے کا طریقہ تبلادیا ہے تو بس معصیت سے نکلنے کے لئے یہی کافی ہے اور قرآن شریف کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ اول الاعمال ہے ارشاد فرماتے ہیں:

التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحافظون لحدود اللہ وبشر المومنین۔ یہاں اللہ تعالیٰ مومنین مجاہدین کی جو صفات بیان فرمارہے ہیں ان میں سب سے پہلی صفت توبہ ہی کی بیان کی ہے عبادت اس کے بعد ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن تھا آپ نے جب دیکھا کہ صفت توبہ حق تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے تو آپ اس وصف میں بھی سب سے آگے رہے۔ چنانچہ فرمایا وانا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الوجل الخ اور اسی سبب آگے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جتنے بھی کمالات ہوتے ہیں حضرات انبیاء علیہم السلام اُن سب میں اُمتیوں سے بڑھے ہوئے ہیں اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے توبہ کی مدح فرمائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کو بھی توبہ کرنے والوں کی صف میں سب سے آگے رکھا اور حق استغفار ادا کرکے دکھلا دیا اور سب سے فائق ہوگئے۔ توبہ اور استغفار ایک ہی چیز ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ توبہ دل میں ہوتی ہے اور استغفار زبان سے کہنے کا نام ہے۔ پھر جب توبہ اول الاعمال ہے تو ہر جگہ اول ہی رہیگی یعنی اگر کافر مسلمان ہو تو توبہ کرے۔ مذنب اگر اہل اصلاح میں سے ہونا چاہے تو توبہ کرے کوئی صوفی طریق میں قدم رکھے تو اول توبہ کرے، غرض کافر و مشرک ہو یا مذنب ہو یا عابد و صوفی ہو یا ولی صدیق ترقی کرنا چاہے تو توبہ کرے جب یہ لوگ چاہیں کہ ہماری ترقی ہو تو جب تک اپنے کو کسر نہ کرینگے اور توبہ نہ کرینگے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہزار مجاہدہ ایک طرف اور توبہ صادق ایک طرف۔ اسکی وجہ سے اعمال پر سے نظر ساقط ہوجاتی ہے کیونکہ آدمی جب کوئی عمل کرتا ہے تو تھوڑی بہت نظر اپنے عمل پر ہو ہی جاتی ہے۔ اسی لئے بزرگوں نے اس پر بہت زور دیا ہے اور شاہی دربار میں داخلہ کے لئے پہلی چیز توبہ کو قرار دیا ہے کیونکہ انھوں نے معلوم کرلیا ہے کہ اس کو بارگاہ خداوندی میں دخل عظیم ہے اسی لیے اسکو لیا ہے اور نیازمندی اختیار کی ہے ؎

زاہد غرور داشت سلامت نبرد راہ رند از رہِ نیاز بدار السلام رفت

بات یہ ہے کہ سب علتوں کی علت نفس ہے جب یہ خراب ہوجاتا ہے تو ہر چیز کو خراب کردیتا ہے عبادت کیسی اچھی چیز ہے مگر جب نفس اس میں شریک ہوجاتا ہے تو اسکو خراب کردیتا ہے اسی لئے اسکو توڑنے اور ختم کرنے کی ضرورت ہے اور اسکو توڑنے کی سب سے عمدہ چیز استغفار ہے اب اس کے بعد اسی موقعہ پر اس شعر کو پڑھ سکتا ہوں جو مولوی موسیٰ صاحبؒ اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

اب نہ ڈھونڈھیں گے ہرگز پتہ مل گیا جب نبی مل گیا تو خدا مل گیا

میں کہتا ہوں کہ جس طرح توبہ اول الاعمال ہے اسی طرح آخر الاعمال بھی ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ جو چیز جہاں سے شروع ہوتی ہے وہیں پر ختم بھی ہوجاتی ہے۔ چنانچہ کسی بزرگ سے پوچھا گیا کہ ما النہایہ۔ انھوں نے جواب دیا کہ الرجوع الی البدایہ۔ یعنی کسی نے ان سے پوچھا کہ طریق میں انتہا کس کا نام ہے فرمایا کہ ابتداء کی جانب لوٹ جانا۔ چنانچہ یہ توبہ بھی حال نہیں بلکہ مقام ہے اور اعلیٰ مقام ہے اسی لئے تمام انبیاء اور اولیاء نے اسے لازم پکڑا ہے۔ اہل اللہ جب اس مقام پر پہنچتے ہیں اور اپنے عجز و قصور کو دیکھتے ہیں تو توبہ و استغفار ان کے لازم حال ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۂ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ آخر میں نازل ہوئی جس میں آپ کو تسبیح و استغفار کا ہی حکم تھا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝

اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے بزرگان دین نے بھی اپنے اپنے زمانہ میں ذکر و فکر۔ اعتراف ذنب۔ توبہ و استغفار اور نفی کمال و مراد از خود کی ترغیب دی ہے چنانچہ مکتوبات معصومیہ میں ہے کہ:۔

حلقۂ ذکر را گرم دارند و بخلوت و تنہائی راغب باشند و در شبانروزے یک دو وقت برائے عزلت معہ باید ساخت ذکر و فکر و تذکر زلات و تقصیرات و توبہ و استغفار و نفی وجود و سائر کمالات و نفی مرادات از خود دراں وقت از مغتنمات باید شمرد و باقی اوقات در افادہ و استفادہ صرف باید کرد۔ والسلام

حلقۂ ذکر کا اہتمام اور اس پر دوام رکھیں اور تنہائی وخلوت میں رغبت اختیار کریں۔ چنانچہ دن رات میں سے گھڑی دو گھڑی اسکے لئے نکالیں اور اسوقت تنہائی میں رہیں۔ اور اس وقت میں ذکر و فکر کرنے۔ اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کو یاد کرنے اور توبہ استغفار کرنے اور اپنے تمام کمالات بلکہ وجود ہی کی نفی کرنے اور اپنے سے مرادات کی نفی کرنے کو مغتنمات میں سے سمجھنا چاہیئے۔ اور بقیہ اوقات کو افادہ اور استفادہ میں صرف کرنا چاہیئے۔

(مکتوبات صہ ۲۳ نمبر ۱۷۶)

کیا عمدہ نصیحت فرمائی ہے۔ یعنی یہ کہ سالک کو چاہیئے کہ کچھ وقت روز آنہ نکال کر اس میں ذکر و فکر کیا کرے اور توبہ و استغفار کرے اور اپنی مراد کی نفی بلکہ خود اپنے وجود و کمالات کی نفی کیا کرے کہ عجب وغیرہ سے نکلنے کا یہی مجرب طریقہ ہے۔ اب یہ حال ہوگیا ہے کہ بزرگوں کی بات کیجانب التفات نہیں ہے محض انکی ذات پر گرنا چاہتے ہیں اور اسی کو اب مقصود بنا رکھا ہے

الاعتراف والاستغفار من الذنوب من اعظم سنن النبی الکریمؐ

(گناہوں کا اعتراف اور اس سے استغفار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم ترین سنت ہے)

اس نصیحت میں خواجہ محمد معصومؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس وقت خاص میں اپنے سے مرادات کی بھی نفی کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ مشائخ نے لکھا ہے کہ حق تعالیٰ سے فتوحات کا طلب کرنا عبودیت کے منافی ہے بلکہ سوء ادبی ہے چنانچہ ترصیع الجواہر میں ہے کہ اس کی وجہ سے بندہ جتنا پاتا ہے اس سے کہیں زیادہ فوت کر دیتا ہے اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کو پیدا فرمایا اور اس دنیا کو دار تکلیف بنایا۔ چنانچہ کچھ چیزوں کے کرنے کا حکم دیا اور کچھ چیزوں سے منع فرمایا۔ اب اگر واقعی وہ بندہ ہے تو اس کا وظیفہ صرف یہی ہونا چاہیئے کہ اوامر کا امتثال کرے اور نواہی سے باز رہے اور اس پر توفیق طلب کرنے میں اللہ تعالیٰ سے مدد چاہے اور اس پر لازم ہے کہ اپنے قلب کو تیار کرے اس کی جگہ کے لئے یعنی اس میں غیر اللہ کی ربانیت کو دخل نہ پانے دے اور ان علائق کے قطع کرنے میں کوشش کرے جو اس کی عبودیت میں نقصان پیدا کرتے ہوں۔ یہ تو عبد کے شایان شان ہے۔ باقی اعمال کے ثمرات کا طلب کرنا یہ کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ نتائج کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ وہ چاہیں تو دنیا ہی میں دیدیں یا چاہیں تو آخرت میں عطا فرمادیں بندہ کو اس میں کوئی اختیار نہیں۔ اب اگر اس نے ثمرات کے طلب کرنے میں جلدی کی تو دو وجہوں سے اس نے بے ادبی کی ایک تو یہ کہ ثمرہ طلب کیا دوسرے یہ کہ اس موطن یعنی دنیا کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جو اس کی حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ یوں اگر اللہ تعالیٰ کسی کو کچھ عطا فرمادیں تو ادب کے ساتھ بلا توقف اس کو قبول کر لینا چاہیئے اور نعمتوں پر تو اس اعتبار سے خوش ہو سکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی دلیل ہے باقی اس کی یہ حالت کہ نعمت پر خوش اور سلب نعمت پر محزون ہو یہ کسی طرح مناسب نہیں اس لئے کہ بندہ کو مسلوب الارادہ ہونا چاہیئے جیسا کہ کہا گیا ہے ؂

مرادی منک نسیان المراد   اذا رمت السبیل الی الرشاد

(ترجمہ) آپ سے تو میری مراد یہ ہے کہ کچھ نہ چاہوں بلکہ اپنی مراد ہی کو بھول جاؤں۔ جب کہ میں رشد و ہدایت کے طریق کا قصد کروں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے بندے اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں راضی ہی رہتے ہیں۔ دنیا ان پر وسیع ہو یا تنگ۔ کثرت عبادت کی توفیق دئے جائیں یا نہیں اور یہ اس لئے کہ وہ نہیں جانتے کہ خیریت کس میں ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم نے فرمایا کہ ایک رات میں اپنے ورد سے سوگیا جس کی وجہ سے مجھے تکدر ہوا اور اس وقت میں اپنے اعمال پر اعتماد کرنے والوں میں تھا۔ دیکھا آپ نے شیخ کیا فرمارہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اس وقت میں اپنے اعمال پر نظر کرتا تھا۔ چونکہ اخلاص تھا اس لئے اپنا کچا چٹھا سب بیان کردیا۔ ورنہ تو اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگوں کا سلوک تمام ہوچکا ہے اور اب سب لوگ ان عقبات سے گذر چکے ہیں اور کامل ہوگئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ نہ تو عقبات سے نکلے ہو اور نہ سلوک ہی طے ہوا ہے۔ بس کچھ سمجھتے بوجھتے نہیں ہو اس لئے بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ کیا دنیا کے امور میں تو فہم کی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ کے طریق میں فہم کی ضرورت ہی نہیں اسی لئے ترقی نہیں ہورہی ہے اور راستہ بند ہے۔ آج فہم بڑھاؤ اور باتوں کو سمجھو تو کام بن جائے گا

حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ چونکہ مجھے ورد کے چھوٹ جانے سے تکدر ہوا اس لئے نیند کی وجہ سے چند فرائض کے چھوٹ جانے کی سزا دیا گیا اور میرے باطن میں یہ ندا آئی کہ اے ابراہیم میرے بندے ہوجاؤ راحت پاجاؤ گے۔ یعنی ہم اگر سلادیں تو سوجاؤ اور اگر کھڑا کردیں تو کھڑے ہوجاؤ۔ درمیان میں تمہیں کسی چیز کا اختیار نہیں ہے۔

یہاں جاکر اعتماد اعمال سے اٹھا۔ اور بندے کو اپنی تجویز اور اپنی رائے اس لئے ختم کردینا چاہیئے کہ کبھی اللہ تعالیٰ اس کو گناہ میں اس لئے مبتلا فرماتے ہیں کہ وہ معصیت جو ذلت اور انکسار پیدا کرے اس طاعت سے کہیں بہتر ہے جو علو اور استکبار کا سبب بنے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ بندہ گناہ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ گناہ کے بعد جو توبہ و استغفار کرتا ہے اور انابت و اعتراف کرتا ہے اس کی وجہ سے اس کی مغفرت ہوجاتی ہے۔ کیونکہ وہ اس گناہ کی وجہ سے ہمیشہ غمگین، افسردہ، شکستہ دل، شرمسار اور سرنگوں رہتا ہے اور یہ سب چیزیں حسنات ہیں حاصل یہ کہ عبودیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کا امتثال، اور نواہی سے اجتناب محض اللہ تعالیٰ کے لئے کرے اس میں کسی اور غرض کی آمیزش نہ ہو اور اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں راضی رہے۔

اور اپنے لئے کوئی اختیار نہ ثابت کرے۔

فتح ربانی میں ہے کہ ایک شخص نے ایک غلام خریدا اور اس سے پوچھا کہ کیا پہننا چاہتے ہو عرض کیا جو آپ پہنادیں پھر دریافت کیا کون سا کام کرنا چاہتے ہو کہا جس کا آپ حکم دیں پھر سوال کیا کہاں رہنا چاہتے ہو عرض کیا جہاں آپ امر فرمادیں۔ یہ سن کر سید نے کہا کہ تم تو عجیب آدمی ہو کہ تمہاری کوئی مراد ہی نہیں ہے۔ اس نے عرض کیا کہ اے میرے سید بھلا عبد کے لئے بھی اپنے مالک کے ساتھ کوئی مراد ہوا کرتی ہے۔ یہ سنکر مولیٰ نے کہا کہ اے کاش میں بھی اپنے مالک حقیقی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا جیسے کہ تم میرے ساتھ ہو۔ جاؤ تم کو اسی بات پر آزاد کرتا ہوں اور اب یہ چاہتا ہوں کہ تم میری جگہ بیٹھو اور میں تمہاری خدمت کروں۔ اس لئے کہ تم میرے سید ہو تم نے مجھے بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔ اسلئے تم اس لائق ہو کہ میں تمہاری خدمت کروں ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی   مرا با جان جاں ہمراز کردی

صاحب ترصیع نے یہ بات خوب بیان فرمائی کہ کبھی اللہ تعالیٰ معصیت کے ذریعہ اپنے بندے کی آزمائش کرتا ہے اور وہی معصیت اس کے لئے توبہ وانابت کے بعد طاعت سے بہتر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ خیارکم کل مفتن تواب۔ یعنی تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو فتنہ میں پڑ جانے (یعنی ارتکاب معصیت) کے بعد کثرت سے توبہ کرے۔ ایسے شخص کو مفتون اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کے ذریعہ اس کا امتحان لیتے ہیں اور بار بار لیتے ہیں چنانچہ اس سے گناہ صادر ہوتا ہے اور وہ توبہ کرتا ہے پھر گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے۔ اسی طرح لوٹتا پوٹتا راستہ طے کرتا چلا جاتا ہے بقول شخصے ؎

اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں   گر پڑے گر کر اٹھے اٹھ کر چلے

بعض عارفین نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی ہے کہ امت کے خیار لوگ بھی زلل اور لغزش سے محفوظ نہ ہوں گے اور یہ کہ ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ان کو گناہوں سے باز نہ رکھ سکے گا۔ ان سے اس لئے گناہ ہوگا تاکہ اللہ تعالیٰ کی جانب توبہ اور انابت کے ساتھ رجوع ہوں۔ یہ انابت اور توبہ اللہ تعالیٰ کو نہایت پسند ہے چونکہ یہ معصیت پر موقوف ہے اس لئے ان حضرات سے بھی اس کا صدور ہو جاتا ہے یہی مطلب ہے اس قول کا جو بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ رُبَّ ذنبٍ یکون للمومن انفع من کثیر من الطاعات من وجلہ وانابتہ۔

یعنی بعضے گناہ ایسے ہیں جو مومن کے حق میں بہت سی طاعات سے بڑھ کر نافع ہو جاتے ہیں اسی لئے کہ وہ اس کے ارتکاب کے بعد اللہ تعالیٰ کا خوف اپنے دل میں لاتا ہے اور اس کی جانب انابت کرتا ہے اسی وجہ سے کثرت سے توبہ کرنے والا ہو جاتا ہے اور حقیقی توبہ کے لئے وجل اور انابت لازم ہے اس کی وجہ سے یہ شخص خیار مجوبین میں سے ہو جاتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کو پسند فرماتے ہیں اور توبہ سے مراد یہاں وہ توبہ ہے جو قلب سے ہو نہ کہ وہ شخص جو صرف زبان سے استغفار کرے اور اس کا قلب معصیت پر مصر ہو۔ ایسا استغفار تو خود استغفار کا محتاج ہے۔

علامہ حرالی کہتے ہیں کہ منجملہ نفس کے وساوس اور شیطان کی ایجاد کے یہ بھی ہے کہ وہ گنہگار سے کہتا ہے کہ جب تک یہ نہ معلوم ہو جاوے کہ اب پھر اس گناہ کو نہ کروگے توبہ نہ کرنا کیونکہ ایسی توبہ سے کیا فائدہ جو ٹوٹ جائے۔ یہ شیطان کے مکائد میں سے ہے اور انسان کی ہوائے نفس کے قبیل سے ہے۔ لہذا انسان کو توبہ کی جانب سبقت کرنی چاہیئے پھر اگر توبہ ٹوٹ جائے تو مکرر توبہ کرے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو انسان کا یہ حال نہایت ہی پسند ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے اس کی طاعات کا عجب ٹوٹتا ہے اور رہی معصیت تو اس کو توبہ محو کر دیتی ہے۔ بالآخر دونوں ہی کا خاتمہ ہو جاتا ہے یعنی نہ عجب ہی انسان میں رہ جاتا ہے اور نہ گناہ ہی باقی رہتا ہے یہ حق تعالیٰ کی تربیت ہے اس طریقہ سے جب وہ پاک وصاف ہو جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ خیار المجوبین تو ہو ہی جائے گا اس سے معلوم ہوا کہ انسان جب طاعت کرتا ہے تو اس کی وجہ سے ضرور کچھ عجب پیدا ہو جاتا ہے جس سے اس کو نکالنا ضروری ہوتا ہے۔ اور طاعت کا عجب جاتا نہیں جب تک کہ انسان اپنے کو مبتلائے معصیت دیکھ نہیں لیتا۔ پس اس معصیت کے عیب سے اس عجب کے عیب کا تو خاتمہ ہی ہو جاتا ہے اب رہ گئی معصیت تو اس کے ازالہ کے لئے حق تعالیٰ نے توبہ کو مشروع کیا۔ چنانچہ انسان جب صدق دل سے توبہ کرتا ہے اور اس کے قلب میں وجل اور انابت کی صفت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ گناہ بھی معاف ہو جاتا ہے۔ اسی چیز نے اولیاء اللہ کی کمر توڑ دی ہے یعنی یہ حضرات چاہتے ہیں کہ گناہ سرزد نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ طاعت پر ان کی نظر نہ ہو اس لئے گناہ کا صدور ان سے بھی ہو جاتا ہے اور گو ان حضرات کو انابت الی اللہ طاعت میں کبھی نصیب ہوتی ہے مگر اس میں خوف نہیں ہوتا اس لئے انسان عجب وغیرہ میں مبتلا ہو جاتا ہے برخلاف اس

انابت کے جو اہل معاصی کو ارتکاب معصیت کے بعد پیدا ہوتی ہے کہ اس میں خوف بھی ہوتا ہے اسی لئے یہ انابت اس انابت سے بڑھ جاتی ہے اور واقعی انسان ایسی طاعت کرے جس سے یہ سمجھتا ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کر رہا ہوں اور پھر اس کی وجہ سے اس کے قلب میں خوف پیدا ہو جائے یہ بہت مشکل کام ہے کیونکہ طاعت کی وجہ سے اس کو ایک کیف و سرور حاصل ہوتا ہے جس کا نتیجہ عجب و پندار تو ہو سکتا ہے باقی خوف نہیں ہوا کرتا الا ماشاء اللہ اسی وجہ سے یہ عابد درجہ میں اس گنہگار سے کم ہو جاتا ہے نہ اس وجہ سے کہ اس نے عبادت کی بلکہ اس وجہ سے کہ اس کے ساتھ رذائل کو بھی شامل کر لیا اسی طرح سے جو گنہگار کہ - انابت اور وجل کے ساتھ متصف ہو وہ درجہ میں عابد سے بڑھ جاتا ہے نہ اس وجہ سے کہ اس نے وہ معصیت کی ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے بعد اس نے وجل اور انابت جیسی باطنی طاعت بھی کی ہے اس نے اس کا درجہ بڑھا دیا آج ہماری ایمانی ترقی جو نہیں ہو رہی ہے تو اسی لئے کہ ہم اپنے باطن سے غافل ہیں اور پہلے لوگوں نے جو ترقی کی تھی تو اس لئے کہ ان کی نظر اپنے باطنی اعمال پر بھی ہوتی تھی اور باطنی عمل کا یہ حال ہوتا ہے کہ لوگ تو اس کو عمل سے عاری سمجھتے ہیں اور وہ اندر اندر کام کرتا رہتا ہے مثلاً یہی خوف اور انابت ہی ہے۔ یہ جس کے قلب میں جاگزیں ہو جائیگی تو اس کو چین نہ لینے دیگی۔ اللہ تعالیٰ کے خوف سے اپنے قلب و جگر کو اس شخص نے خون کر دیا۔ یہی ایمان ہے اور کسی دوسرے شخص کو اس کی اطلاع بھی نہیں ہوتی۔ چنانچہ مومن کے قلب میں خوف و رجا ہر وقت موجود ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ اپنے دماغی توازن کو ٹھیک رکھتا ہے۔ اگر طاعات سے عجب کا کچھ خیال ہوا تو خوف کو اپنے پیش نظر کر لیتا ہے اور اگر خوف و یاس کا غلبہ ہوا تو رجاء کو مدنظر کر لیتا ہے۔ اسی لئے آپ نے سنا ہو گا کہ الایمان بین الخوف والرجاء یعنی ایمان نام ہی اس کا ہے کہ انسان امید و بیم کے مابین رہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی وعیدوں کا اس کو خوف لگا ہو اور وعدے سے رجا قائم ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ بھی کیا ہے اور دوزخ کا ذکر کر کے وعید بھی سنائی ہے اسی لئے مومن کا دونوں پر ایمان ہوتا ہے اور اس کے قلب میں یہ دونوں صفتیں موجود ہوتی ہیں۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ جو بہت زبردست عالم تھے اور حضرت مولانا شاہ فضل رحمنؒ کے خلیفہ بھی تھے ان سے کسی نے دریافت کیا کہ مولانا مزاج کیسا ہے فرمایا کہ بھائی مومن کا کیا مزاج پوچھتے ہو دنیا میں تو وہ بین الخوف والرجا ہی رہتا ہے اور جو شخص خوف و رجا کے درمیان ہو اسکا مزاج ہی کیا۔ مزاج کا حال تو اس وقت بیان کیا جا سکتا ہے جب دخول جنت کی بشارت سن لیں۔

سبحان اللہ کیسا عمدہ عالمانہ اور صوفیانہ جواب دیا۔ علمائے اس جواب کو بہت پسند فرمایا ہے غرض مومن کے قلب میں خوف و رجا برابر ہی موجود رہتی ہیں اس سے اس کو خلو نہیں ہوتا۔ آج بمبئی سے ایک صاحب کا خط آیا ہے یہاں سے جانے کے بعد اپنے تاثرات کو ان صاحب نے ایک شعر میں ادا کیا ہے وہ یہ ہے ؎

بے رونقی جمود۔ تعطل۔ سکوتِ مرگ
ایسا ہے کائنات کا نقشہ ترے بغیر

یہ انھوں نے لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بھائی جب قلب میں خوف و رجا متمکن ہو اور باہم دونوں متلاطم بھی ہوں یعنی کبھی یہ غالب ہو اور کبھی وہ غالب ہو اس میں بھلا سکون و سکوت کہاں۔

بہر حال کلام طویل ہو گیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ خوف اور رجا یہ دونوں قلب کی صفات ہیں اور باطنی عمل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اس باطنی عمل سے متصف ہو گو بظاہر طاعت وغیرہ میں اس کی کمی ہو یا معصیت ہی میں کیوں نہ مبتلا ہو برخلاف اس کے کہ ایک شخص ایسا ہوتا ہے کہ ظاہری طاعات تو اس کے پاس بہت ہوتی ہیں مگر ان باطنی اعمال سے وہ کورا ہوتا ہے اور بجائے اس کے دوسرے باطنی رذائل میں مبتلا ہوتا ہے چنانچہ جب ان دونوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو یہ باطنی طاعت ہی ظاہری طاعت پر غالب آجاتی ہے اور جیسا کہ عابد ناپارسا اور گنہگار کے واقعہ میں مفصل بیان کیا جا چکا ہے کہ اس گنہگار کی رجا اور انابت کام آگئی اور اس پارسا کی پارسائی کا اس کے عجب نے ناس کر دیا اور گنہگار سے رجا اس لئے پسندیدہ ہے کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے اس کا امر فرمایا ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا۔

اس میں قنوط یعنی ناامیدی سے نہی فرمائی ہے جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ رجا کا امر فرمایا گیا ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ ایک چیز سے نہی اس کی ضد کا امر ہوتا ہے اور کسی چیز کا امر اس کے خلاف سے نہی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کا کس قدر فضل عظیم ہے کہ گنہگاروں کو امید رکھنے کا امر فرمایا اور ناامیدی سے منع فرمایا۔ چنانچہ علماء فرماتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ سے نڈر اور بے خوف ہو جانا کفر ہے اسی طرح اسکی رحمت سے ناامید ہونا بھی کفر ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ :۔ ؏ "ناامیدی را خدا گردن زدہ است"

یعنی اللہ تعالیٰ نے نا امیدی کی گردن ہی مار دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ نے اس آیت کو ارجیٰ آیت فرمایا ہے۔ مکتوبات معصومیہ میں اس کے متعلق نہایت ہی عمدہ کلام فرمایا ہے۔ اسکو ہم بیان کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے ایک اور سوال و جواب نقل کیا ہے جو خالی از لطف نہیں ہم پہلے اس کو ہی بیان کرتے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں:۔

نوشتہ بودند کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والبرکات در مقام رضا بودہ اند پس آیت کریمہ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ بچہ معنیٰ است۔ مخدوما رضا بر دو گونہ است۔ رضائیست پیش از وجود عطیہ۔ انبیاء را علیہم الصلوٰۃ والبرکات امروز ایں رضا حاصل است۔ عطیہ و عدم عطیہ و نعمت و نقمت دریں رضا مستوی است ہرچہ ازاں طرف می رسد و قضائے ازلی براں رفتہ است بآں راضی اند و رضائیست بعد وجود عطیہ و پیغمبر را صلی اللہ علیہ و علیٰ آلہ وسلم در روز قیامت چوں عطیات و انعامات بیشمار شود ... پیغمبر فرمائند علیہ الصلوٰۃ والسلام بس است من راضی شدم۔

(ص ۲۲۲ ج ۳)

آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والبرکات تو مقام رضا میں ہوتے ہی ہیں پس آیت کریمہ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ یعنی آپ کا رب آپ کو اتنا دیگا کہ آپ راضی ہو جاویں گے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ مخدوم من! رضا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ رضا ہے جو انعام کے وجود سے پہلے ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والبرکات کو یہ رضا ہر وقت حاصل ہوتی ہے۔ عطیہ کا ملنا نہ ملنا۔ نعمت اور نقمت سب حال اس رضا میں یکساں ہیں یعنی جو چیز کہ ان کی جانب سے پہونچے اور جس پر قضا جاری ہو چکی ہے۔ یہ حضرات اس پر دل سے راضی ہیں۔ اور ایک درجہ رضا کا وہ ہوتا ہے کہ انعام، عطایا وغیرہ ملنے کے بعد ہی رضا حاصل ہوتی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت میں جب بے شمار انعامات اور عطایا کا مشاہدہ کرینگے تو فرماویں گے کہ پروردگار بس۔ بس۔ میں راضی ہو گیا۔

اب اس کے بعد وہی گفتگو ہے جو میں اس موقعہ پر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ:۔

از امام محمد باقر منقول است کہ گفت اہل عراق شما می گوئید کہ ارجیٰ آیت در قرآن شریف لا تقنطوا من

حضرت امام محمد باقر سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ تم اہل عراق یہ کہتے ہو کہ قرآن مجید میں سب سے زیادہ امید والی آیت لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ہے اور

رَحْمَةِ اللهِ است و ما اہل بیت برانیم که امید درایت وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ بیشتر است۔ چہ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم راضی نہ شود کہ یکے از امت او در دوزخ باشد گوئیم کہ می تواند کہ ارجیٰ آیت نسبت بعامۃ الخلق آیت اولی بود وارجیٰ نسبت باین امت آیت ثانیہ بود۔

ہم اہل بیت اس کے قائل ہیں کہ آیت وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ میں زیادہ امید ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک راضی ہی نہ ہوں گے جب تک کہ آپکا ایک امتی بھی دوزخ میں ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ تطبیق اسطرح ہو سکتی ہے کہ عام مخلوق کے اعتبار سے زیادہ امید والی آیت اول لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللهِ ہے اور اس امت محمدیہ کے اعتبار سے آیت ثانی وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ہے۔

(مکتوبات معصومیہ جلد ثالث صد ۲۲)

دیکھا آپ نے یہاں اس امر میں اختلاف ہوگیا کہ ارجیٰ آیت کون سی ہے کسی نے لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللهِ کو کہا اور کسی نے وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ کو کہا اور امام محمد باقرؒ نے کیسی عمدہ تطبیق فرمائی لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللهِ تو عام لوگوں کے لئے ہے یعنی تمام امتوں کے لئے اور وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ خاص اس امت کے لئے ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرمارہے ہیں کہ آپ گھبرائیں نہیں۔ عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو بکثرت نعمتیں دیگا اتنی کہ آپ اس سے خوش ہوجائیں گے۔ پس یہ آیت ارجیٰ آیت اس لئے ہوئی کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی فرمادینے کا گویا وعدہ فرمایا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اگر آپ کی امت کا ایک فرد بھی جہنم میں ہوگا تو آپ کیوں کر راضی ہوجائیں گے یہ آپ کی شان کرم سے بعید ہے۔ اسی مضمون کو کسی نے خوب ادا کیا ہے ؎

أَلَمْ يُرْضِكَ الرَّحْمٰنُ فِي سُوْرَةِ الضُّحٰى
فَحَاشَاكَ أَنْ تَرْضٰى وَفِيْنَا مُعَذَّبٌ

یعنی کیا آپ کو رحمٰن نے سورہ والضحیٰ میں راضی کرنے کا وعدہ نہیں فرمایا ہے تو آپ سے بعید ہے کہ راضی ہوجائیں اگر ہم میں سے ایک فرد بھی جہنم میں معذب ہو۔

سبحان اللہ خوب مضمون ہے۔

الاعتراف والاستغفار من الذنوب من اعظم سنن النبی الکریم

(گناہوں کا اعتراف واستغفار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم ترین سنت ہے)

اب آپ کو ایک اور آیت سناتا ہوں۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً وَّاتَّقُوا اللہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ (پارہ ۴)

اس آیت کے متعلق روح المعانی میں ہے کہ امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ یہ تمام قرآن میں سے اخوف آیت ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس نار کی دھمکی دی ہے جو کافرین کے لئے تیار کی گئی ہے وہ اس میں داخل ہوں گے۔ جب کہ وہ محارم سے اجتناب نہ کریں۔ جس طرح سے کہ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ارجیٰ آیت ہے اسی طرح پر یہ اخوف آیت ہے۔ ارجیٰ کو پاکر تو آپ لوگ بہت خوش ہوئے اخوف کو بھی تو لیجئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن شریف میں خوف ورجا دونوں کا ذکر ہے لیکن ہم قرآن شریف برابر پڑھتے ہیں اور یہ خبر نہیں کہ قرآن شریف کو بھی سلوک میں کچھ دخل ہے یا نہیں۔ رجا اور خوف یہ دونوں قلب کی صفات ہیں لہٰذا علماء کسی آیت کے متعلق یہ جو فرماتے ہیں کہ یہ ارجیٰ آیت ہے یا فلاں اخوف آیت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب ان آیتوں پر سے گذرو تو قلب میں بھی یہی کیفیت موجود ہونی چاہیئے کیونکہ اگر قلب میں ان کے مضامین کا کچھ بھی اثر نہ ہوا تو ان کا ارجیٰ یا اخوف ہونا ہمارے کس کام آیا۔ اس لئے مومن کو چاہیئے کہ علی العموم تلاوت کے وقت قلب کو حاضر رکھے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں اور کس کا کلام پڑھ رہا ہوں۔ بالخصوص اس قسم کی آیت پر سے جب گذرے تو اپنی توجہ اور التفات کو قوی کرے اور دلی قصد وارادہ کے ساتھ ان آیات کو زبان سے پڑھے اور سعی اس بات کی کرے کہ قلب بھی ان کے مضامین اور اثرات سے سرشار ہو۔ چنانچہ اگر ایک بار کے پڑھنے میں یہ کیفیت قلب میں نہ محسوس کرے تو کرر وسہ کرر پڑھے اور جب تک اس کیفیت کا کچھ حصہ نصیب نہ ہوجائے آگے نہ بڑھے۔ چنانچہ آگے فرماتے ہیں کہ:۔
وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝

ایک صاحب جو انگریزی دانوں کے نزدیک مسلم شخص تھے وہ کہتے تھے کہ حضرت ہاجرہ کو

صفا و مروہ پر دوڑا کر اللہ تعالیٰ نے سب کو قیامت تک کے لئے دوڑا دیا میں نے کہا کہ آپ نے دہ تو دیکھا اور اسکو نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں آیت وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ الخ نازل فرماکر سب کو مغفرت اور جنت کی طرف دوڑا دیا اور یہاں مراد اس کے اسباب ہیں یعنی اعمال صالحہ۔ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ ادائے فرائض کی طرف سبقت کرو۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اسلام کی طرف۔ ابوالعالیہؒ کہتے ہیں کہ ہجرت کی طرف۔ انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ نماز کی تکبیر اولیٰ کی طرف۔ سعید بن جبیرؒ کا ارشاد ہے کہ ادائے طاعت کی طرف۔ حضرت یمانؓ سے منقول ہے کہ صلوٰۃ خمسہ کی طرف۔ ضحاک کہتے ہیں کہ جہاد کی طرف۔ حضرت عکرمہؒ کہتے ہیں کہ توبہ کی طرف۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ تمام ہی معنیٰ مراد ہیں جس میں سارے اعمال داخل ہیں اور آیت میں مغفرت کی تقدیم جنت پر اس لئے کی گئی کہ مغفرت میں تخلیہ ہے اور جنت میں تحلیہ اور تحلیہ سے تخلیہ مقدم ہوتا ہے یا اس لئے کہ مغفرت ہی سبب دخول جنت کا ہوگا اور اس موقع پر رب کا لفظ استعمال فرمانا اور اسکو مخاطبین کی جانب مضاف کرنا ان کے اوپر مزید لطف و کرم کے اظہار کے لئے ہے اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ بنی اسرائیل ہم سے زیادہ خدا کے نزدیک مکرم ہیں اس لئے کہ ان میں کوئی شخص جب گناہ کرتا تھا تو اس حال میں صبح کرتا تھا کہ اس کا گناہ اور اس کی سزا کو اس کے دروازے پر لکھ دیا جاتا تھا مثلاً یہ کہ اپنی ناک کاٹ یا اپنا کان کاٹ یا ایسا ایسا کر۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی جس کا آخری حصہ یہ ہے کہ وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

(پارہ ۴۔ سورہ نساء)

اس آیت کے متعلق یہ بھی روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شخصوں میں مواخاۃ فرمادی چنانچہ وہ دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے تھے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان میں سے ایک شخص غزوہ میں چلا گیا اور دوسرے کو اپنے اہل خانہ اور اپنی ضروریات خانہ داری پر محافظ بنا گیا۔ اس سے اپنے ساتھی کی عدم موجودگی میں کوئی گناہ صغیرہ ہو گیا۔ اس پر وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا تھا اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ سے توبہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا ساتھی واپس آیا اور اس کی تلاش میں نکلا دیکھا تو ایک جگہ وہ سجدے میں پڑا ہوا ہے اور یہ کہہ رہا ہے ربی ذنبی۔ ربی ذنبی۔ یعنی اے رب میں نے بڑے گناہ کا کام

کیا اور اپنے بھائی کی امانت میں خیانت کی اس نے اسے اٹھایا اور کہا کہ چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اور اپنے گناہ سے استغفار کی درخواست کرو۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ کشادگی فرمادیں چنانچہ ادھر وہ مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ نماز عصر کا وقت تھا ادھر جبرئیل علیہ السلام اس کی توبہ لیکر حاضر ہوئے یعنی یہ آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً ..... الی قولہ سبحانہ و تعالیٰ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِیْنَ۔ اس پر حضرت عمرؓ بولے کہ یا رسول اللہ کیا اسی کے لئے خاص ہے یا سب کے لئے عام ہے۔ حضور نے فرمایا کہ نہیں سب کے لئے عام ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابلیس نے اپنے لشکر کو بلایا اور اپنے سر پر مٹی اڑانے لگا اور ویل و ثبور پکارنے لگا۔ یہاں تک کہ ہر طرف سے اس کے لشکری آگئے سب نے اس سے پوچھا کہ اے ہمارے سید یہ آپ کا کیا حال ہے اس نے کہا کہ کچھ نہ پوچھو کتاب اللہ میں ایک ایسی آیت نازل ہوگئی ہے کہ اب اس کے بعد کسی بنی آدم کو کوئی گناہ بھی مضر نہ ہوگا۔ ان سب نے پوچھا کہ وہ کون سی آیت ہے اس نے یہی آیت بتلائی۔ ان سب نے کہا حضور پریشان نہ ہوں ہم ان لوگوں کے لئے خواہشات کا دروازہ کھولدیں گے۔ پس نہ تو کوئی توبہ کرے گا نہ استغفار ہی کرے گا اور جو کام بھی کرینگے تو یہی سمجھیں گے کہ ہم حق پر ہیں۔ یہ سن کر ابلیس خوش ہوگیا اور اس سے اس کے کچھ آنسو پونچھ گئے میں کہتا ہوں کہ علماء نے اس کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ یہ ارجیٰ آیت ہے لیکن آیت کے شان نزول اور اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس پر سب سے زیادہ شاق یہی آیت ہوئی۔ اور گنہگاروں کے لئے کس قدر تسلی اور شفقت ہے کہ وہ گناہ کرنے کے بعد اگر اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرلیں تو پھر ایسے ہوجائیں کہ گویا انھوں نے گناہ کیا ہی نہیں۔ چنانچہ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ کے عنوان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذنبین کے لئے بجز حق تعالیٰ کے کرم اور فضل کے اور کوئی مفزع نہیں ہے اور یہ اس لئے کہ جو ذات ایسی ہو کہ اس کی رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہو تو ظاہر ہے کہ کرم و فضل کے نشر میں اس کا کوئی ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ آیت ارجیٰ آیت یوں ہے کہ بندہ جب حق تعالیٰ کی ایسی عنایت دیکھے گا اور توبہ کے متعلق اس قدر اہتمام دیکھے گا تو اس کے نشاط میں حرکت ہوگی اور اس کے میلان میں تقویت ہوگی تو پھر وہ توبہ سے صبر ہی نہ کر سکے گا۔ نیز بطور استغراق کے جو بیان کیا گیا تو اس سے مقصود یاس اور قنوط کا قلع قمع کرنا ہے۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا میں قنوط سے صراحۃً منع فرمادیا گیا ہے جس کی وجہ سے اللہ والوں

کو مغفرت کی امید لگانے کا ایک ذریعہ ہاتھ آگیا۔ چنانچہ بزرگوں نے اسی کے حوالہ سے دعائیں کی ہیں۔ حضرت شیخ عطارؒ فرماتے ہیں ؎

مغفرت دارم امید از لطف تو
زانکہ خود فرمودۂ لَا تَقْنَطُوْا

یعنی آپ کے لطف و کرم سے امید مغفرت کی اس لئے رکھتا ہوں کہ آپ نے خود ہی لا تقنطوا فرمایا ہے۔ اب اس حکم کے بعد پھر یاس و ناامیدی کفر ہی ہے۔

اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ جس طرح اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ کے متعلق امام صاحبؒ نے یہ فرمایا کہ اخوف آیت ہے تو آگے اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ جو فرمایا ہے اس کے متعلق قرینہ مقابلہ سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ارجیٰ آیت ہے مجھے تو اس وقت یہاں یہ بیان کرنا تھا کہ یہ آیتیں بھی ارجیٰ آیتیں ہیں لیکن جب مضمون سامنے آگیا ہے تو اس آیت کی تفسیر بھی سن لیجئے کیونکہ اس میں مکارم اخلاق کا بیان ہے۔ جب یہ فرمایا کہ جنت متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے تو آگے یہ بیان فرماتے ہیں کہ متقی کون لوگ ہیں۔ یہاں ان کے تین اوصاف بیان فرمائے۔ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ اور وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ اور وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ یعنی ان کی ایک صفت انفاق ہے خواہ حالت عسر کی ہو یا یسر کی۔ حال سرور کا ہو یا غم کا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زندگی میں بھی خرچ کرتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی بشکل وصیت اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان مقامات پر بھی خرچ کرتے ہیں جہاں انھیں اچھا معلوم ہوتا ہے یعنی اولاد و عزیز قریب پر اور ان مقامات پر بھی خرچ کرتے ہیں جہاں خرچ کرنا انھیں کھلتا ہے۔ مثلاً اپنے دشمنوں پر۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک دانہ انگور کا بھی صدقہ کر دیا۔ بعض سلف سے منقول ہے کہ ان کے پاس ایک پوتی پیاز کی تھی اس کو بھی انھوں نے صدقہ کر دیا۔ حدیث شریف میں ہے اتقوا النار ولو بشق تمرۃ اور یہ بھی آتا ہے کہ سائل کو کچھ نہ کچھ ضرور دو اگرچہ جلی ہوئی کھری ہی کیوں نہ ہو۔

اب کظم غیظ کے متعلق سنئے۔ کظم کے معنی ہیں بھر جانے پر مشک کا منہ بند کر دینا اور غیظ کہتے ہیں کسی منکر امر کو دیکھ کر طبیعت میں ہیجان کا پیدا ہو جانا۔ غیظ میں اور غضب میں فرق یہ ہے کہ غضب کے بعد انتقام کا ارادہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور غیظ میں یہ ضروری نہیں ہے ایک قول یہ ہے کہ غضب وہ ہے کہ جس کا اثر بلا اختیار جوارح بشرہ پر ظاہر ہو اور غیظ میں ایسا نہیں ہوتا۔

حدیث شریف میں ہے کہ جس نے کظم غیظ کیا اور وہ اس کے نافذ کرنے پر بھی قادر ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو امن و ایمان سے بھر دیگا۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کظم غیظ کیا اور وہ اس کے جاری کرنے پر بھی قادر ہے تو قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کو سب لوگوں کے سامنے طلب فرمائیں گے اور اختیار دینگے کہ جس حور کو چاہے لیلے دیکھئے کظم غیظ کی اتنی تو فضیلت آئی ہے اور کتنے کتنے اجر کا وعدہ کیا گیا ہے مگر دیکھتا ہوں کہ آج جس قدر عملداری غصہ کی ہے اتنی اور کسی چیز کی نہیں۔ ہر شخص اس کی وجہ سے بادشاہ بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں اتنا مزہ ہے کہ عمدہ عمدہ کھانوں میں بھی نہیں ہے۔

اب عفو کے متعلق سنئے:۔ متقی وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو معاف کرتے ہیں یعنی تسامح فرماتے ہیں ان لوگوں کو سزا دینے سے جو مستحق مواخذہ ہوتے ہیں جبکہ اس کو معاف کرنے میں کوئی دینی نقصان نہ ہو حضرت حسن سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں ارشاد فرمائیں گے کہ جس شخص کا اللہ پر اجر ہو وہ کھڑا ہو جائے تو کوئی شخص نہ کھڑا ہو گا۔ بجز اس کے جس نے دنیا میں معاف کیا ہو گا۔ نیز حدیث شریف میں ہے کہ جس کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے لئے مکانات تعمیر کئے جائیں اور اس کے درجات بلند ہوں تو چاہئے کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والے کو معاف کر دے اور جو اس سے محروم کرے اسکو دے اور جو قطع رحمی کرے اس کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔ سبحان اللہ یہ صفات تھے متقیوں کے اب جو ترقی نہیں ہو رہی ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ علم صحیح نہیں ہے چنانچہ آپ کو بھی دین کا علم نہیں ہے۔ اب کس کو غرض پڑی ہے کہ وہ آپ کی خاطر در در مولوے اور آپ کو دین کا علم سکھلائے۔ میں تو کہتا ہوں کہ خود آپ کو بھی غرض نہیں پڑی ہے۔ باقی آپ جو کسی کے پاس آتے جاتے ہیں تو محض تبرک بنانے کے لئے اور اس کے بدن پر گرنے کے لئے۔ اللہ تعالیٰ نے تو متقیوں کے لئے جنت کو تیار فرمایا ہے اور آپ ہیں کہ اس کو یاد بھی نہیں کرتے۔

خیر یہ گفتگو تو ضمناً آگئی تھی میں اصل میں خوف و رجا پر کلام کر رہا ہوں اور الحمد للہ کہ ایک حد تک اس پر مفصل کلام ہو گیا چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ قلب کی صفات ہیں اور ظاہر ہے کہ جس قلب میں خوف و رجا موجود ہوں تو وہ انسان تو اپنے ہی متعلق اندیشہ میں پڑ جائے گا اسکو دوسروں کی برائی دیکھنے کی فرصت ہی کب ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جب عابد کا قلب ان صفات سے خالی ہوتا ہے تو اس کی نظر اپنی طاعت پر پڑتی ہے اور دوسروں کے گناہ پر پھر اس کی وجہ سے عجب و تکبر پیدا ہوتا ہے اور کبھی کبھی وہ دوسروں کو کچھ زجر و توبیخ کرتا ہے اور گنہگار، فاسق

کو دیکھ کر چیں بجبیں ہوتا ہے۔ پس منشا تو اس کا ہوتا ہے کبر باطن اور وہ اسکو سمجھتا ہے غضب للہ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں میں التباس شدید ہے۔

یہیں سے اس اشکال کا جواب یہی سمجھ میں آگیا جو اس مقام پر ہو سکتا ہے وہ یہ کہ فساق و فجار اور کفار سے تو بغض رکھنے کا شریعت میں حکم ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق مکتوبات معصومیہ میں ہے کہ:۔

"افسوس صوفیائے خام اور اس زمانہ کے ملاحدہ کفار سے موالات میں باک نہیں رکھتے اور یہ کہتے ہیں کہ فقیری کا راستہ کسی سے برا نہ بنناہے۔ سبحان اللہ سرور انبیاء اور رئیس الاولیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو تو یہ حکم دیا گیا کہ یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ اور آپ کا طریقہ مرضیہ تو غلظت اور قتال با کفار تھا۔ عجب قسم کے فقرا ہیں کہ پیغمبر خدا کا راستہ ترک کر کے دوسرا راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں حالانکہ آپ کے طریقہ کو چھوڑنے کے بعد سوائے گمراہی اور ضلالت کے کیا رہ جاتا ہے۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ

بلا شبہ کفار اعداء اللہ ہیں نص قطعی اس پر دال ہے عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو ان سے دوستی کا دعویٰ ہے اور دوسری جانب ان کے دشمنوں سے بھی دوستی۔ اگر کفار و فساق اعداء حق اور عند اللہ مبغوض نہ ہوتے تو بغض فی اللہ واجبات دین میں سے نہ ہوتا اور افضل مقربات اور مکمل ایمان نہ قرار پاتا اور ولایت کے حصول کا سبب اور قرب حق اور رضائے باری تعالیٰ کا ذریعہ نہ بنتا۔" حدیث شریف میں ہے کہ:۔

عن عمرو بن الجموح انه سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یحق العبد حق صریح الایمان حتی یحب للہ ویبغض للہ فاذا

حضرت عمرو بن الجموح کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے کہ بندہ صریح ایمان کا حق نہیں ادا کرتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے لئے حب اور بغض کرنے لگے۔ چنانچہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے لئے محبت اور اللہ تعالیٰ کے

احب اللہ تبارک وابغض اللہ تبارک فقد استحق الولاء من اللہ (رواہ احمد)

کے لئے بغض کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی محبت کے رجانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔

وعن ابی امامۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابوامامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ کے واسطے محبت کی اور اللہ کے واسطے بغض رکھا اور اللہ کے واسطے دیا اور اللہ کے واسطے روکا اس نے ایمان کی تکمیل کر لی۔

وہم درحدیث آمدہ است

تقربوا الی اللہ سبحانہ ببغض اہل المعاصی والقوہم بوجوہ مکفہرۃ والتمسوا رضاء اللہ تعالیٰ بسخطہم وتقربوا الی اللہ عزوجل بالتباعد منہم۔

نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ

اللہ تعالیٰ سبحانہ کا قرب حاصل کرو اہل معاصی سے بغض کرکے اور ان سے ترش روئی کے ساتھ ملو اور اللہ تعالیٰ کی رضا ان لوگوں کی ناراضگی میں حاصل کرو اور اللہ تعالیٰ کا قرب ان سے دوری میں تلاش کرو۔

وہم درحدیث آمدہ است

اوحی اللہ تعالیٰ الی نبی من الانبیاء قل لفلان العابد اما زھدك فی الدنیا فتعجلت راحۃ نفسك واما انقطاعك الی فتعززت بی فماذا عملت فی مالی علیك قال یارب وماذا علی قال ھل عادیت فی عدوا او ھل والیت لی ولیًا۔

نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سابق انبیاء میں سے کسی نبی کی جانب وحی بھیجی کہ فلاں عابد سے کہدو کہ رہا تیرا یہ دنیا سے زہد تو وہ تو اس لئے ہے کہ (کسب کی مشقت سے) تیرا نفس راحت پا گیا۔ اور رہا میری جانب تیرا انقطاع تو، تو نے میری وجہ سے عزت بھی تو پائی۔ یہ بتلا کہ میرا تجھ پر جو حق تھا اس کو تو نے کتنا ادا کیا؟ اس نے عرض کیا کہ اے رب مجھ پر کون سا تیرا حق تھا (جسکو میں نے نہیں ادا کیا) ارشاد ہوا کہ میرے لئے میرے کسی دشمن سے کبھی دشمنی رکھی؟ اور میری خاطر کبھی کسی میرے ولی کی زیارت کو تو گیا؟

مکتوبات معصومیہ ص

آگے فرماتے ہیں کہ:۔

والحق کہ محبت دوستان محبوب و عداوت دشمنان او از لوازم محبت است۔ محب صادق دریں دو عمل محتاج کسب و تعمل نیست چنانکہ در اعمال دیگر محتاج است۔ دوستاں دوست چہ بلا زیبا بہ نظر درآیند و دشمنان او چہ قدر زشت ایں معنیٰ در مجاز ظاہر است ہر کہ دعویٰ دوستی نماید تا تبری از دشمنان او بکند مقبول نیست از منافق بیش نمی دانند۔

حق یہ ہے کہ محبوب کے دوستوں سے محبت اور اس کے دشمنوں سے عداوت بھی محبت کے لوازم سے ہے۔ محب صادق ان دونوں کاموں میں عمل اور کسب کا محتاج نہیں ہے (مطلب یہ کہ) جس طرح سے دیگر اعمال ہیں (جب کسی کام کو باختیار خود کرتا ہے تب ہی وہ ہوتا ہے لیکن یہاں محبوب کے دوست سے محبت اور دشمنوں سے عداوت اضطراری طور سے ہوتی ہے) واقعی دوست کے احباب بھی محب کی نظروں میں کس قدر خوب ہوتے ہیں اور اسکے اعدا کس قدر بد معلوم ہوتے ہیں اسکا اندازہ اہل مجاز کے معاملات سے بھی عیاں ہے۔ (وہ یہ کہ) مثلاً جو شخص کسی سے دوستی کا دم بھرے تو جب تک کہ اس کے دشمنوں سے بیزاری نہ ظاہر کردے اس کا دعویٰ مقبول نہیں ہے۔ بلکہ منافق سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

(مکتوبات معصومیہ صفہ ۹)

دیکھئے کس قدر زوردار کلام فرمایا ہے۔ اس امر کے ثبوت کے لئے کہ فاسق فاجر اور کافر سے بغض رکھنا ہی علامت ایمان ہے اور ان سے ترش رو چہرہ کے ساتھ ہی ملنا چاہیئے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قرب ان سے دوری اختیار کرنے میں ہے۔ اشکال یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے جیسا کہ حدیث شریف سے معلوم ہوا تو پھر اس عابد نے اس گنہگار کو جو بہ نظر حقارت اور ترش رو چہرہ کے ساتھ دیکھا تھا تو کیا برا کیا تھا۔ حالانکہ شیخ نے اس کا جو یہ حال بیان کیا ہے کہ ؎

دراں خیمہ عابد سر پر غرور　　　ترش کردہ بر فاسق ابرو زدور

یہ کچھ بطور مدح کے نہیں بیان کیا ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ مکتوبات معصومیہ میں جو روایات مذکور ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فاسق و فاجر سے بغض رکھنا چاہیئے۔ یہ بھی صحیح ہے لیکن حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں کہ من ابغض للہ جس سے یہ معلوم ہوا کہ بغض جو مطلوب و محمود ہے وہ ہے جو اللہ کے لئے ہے اپنے نفس کے لئے نہ ہو اور یہاں اس عابد پر جو نکیر کی گئی تو اس لئے کہ اس نے جو کچھ کیا تھا اپنے نفس کے لئے کیا تھا اس میں وہ مخلص نہیں تھا۔

مخلص کا کچھ انداز ہی جدا ہوتا ہے اس کے غضب میں بھی نور ہوتا ہے۔ وہ گناہ کو برا سمجھتا ہے مگر گناہگار کی ذات کو حقیر نہیں سمجھتا۔ بلکہ اپنے ہی اوپر خائف رہتا ہے کہ معلوم نہیں میرا کیا حال ہو اس کی گفتگو میں کبر اور عجب کی شان نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس عابد ناپارسا کا یہ حال نہیں تھا بلکہ وہ اپنے کو کامل سمجھ رہا تھا اور تھا کچھ نہیں اور باتیں اپنے متعلق ایسی کر رہا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ کاملین کی فہرست میں خود کو داخل کرنا چاہتا ہے یہ بہت برا ہے بغض فی اللہ کا درجہ حاصل کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ یہ تو نقالی ہوئی۔ اور نیک لوگوں کی شباہت اختیار کرنا ہوا اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے یعنی اس میں کہ ایک وہ شخص ہو جو واقعی کامل ہو اور ایک وہ جو کمال کا دعویٰ کرتا ہو۔ مولانا رومؒ نے مثنوی میں اس مسئلہ کو ایک مثال کے ذریعہ خوب ہی سمجھایا ہے۔ چنانچہ شغال رنگین کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک گیدڑ رنگ کے مٹکے میں گر گیا۔ نکلا تو رنگین تھا۔ اس نے اپنے ہم جنسوں کے سامنے یہ دعویٰ کیا کہ میں مور ہو گیا ہوں اور اس پر اپنے ظاہری رنگ کو دلیل بنایا کہ میرا بدن دیکھو اور اپنا بدن دیکھو۔ دوسرے گیدڑوں کو اس کا یہ دعویٰ برا تو معلوم ہوا لیکن ظاہری فرق کا کوئی جواب بھی نہیں تھا اس لئے خاموش ہو گئے۔ ایک پرانا گیدڑ آگے بڑھا اور اس نے کہا کہ تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ تم مور ہو گئے ہو اچھا مور تو ناچتا ہے اور بولی بھی بولتا ہے۔ تم بھی ناچو اور بولی بولو۔ چنانچہ وہ بولا تو گیدڑ کی سی بولی جس سے سب پر اسکا گیدڑ ہونا ظاہر ہو گیا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اسی طرح سے بعضے لوگ اپنے ظاہر کو رنگ لیتے ہیں اور دعویٰ کمال کا کرتے ہیں لیکن امتحان ان کو رسوا کر دیتا ہے۔ ظاہر کو رنگنے سے کام نہیں چلے گا۔ اندر کو رنگنا چاہیئے اور اندر کا رنگ جانتے ہیں کیا ہے؟ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ رقص محبت ہے اور بولی معرفت ہے اوپر اوپر کو تو اپنے رنگ سکتے ہو لیکن نہ رقص کر سکتے ہو اور نہ معرفت کی باتیں ہی بیان کر سکتے ہو۔

غرض میں یہ کہہ رہا ہوں کہ بغض فی اللہ بھی کوئی چیز ہے مگر کوئی اس کے ساتھ متصف بھی تو ہو وہ دوسرے ہی قسم کے لوگ تھے جن کے یہ اوصاف تھے اب ویسا ہونا بہت مشکل ہے ہاں دعویٰ اور نقالی البتہ آسان ہے۔ چنانچہ عابد ناپارسا کی حکایت میں اس عابد کے بغض پر جو انکار کیا گیا اور شیخ سعدیؒ نے اس کو پسند نہیں فرمایا تو اسی لئے کہ وہ نقال اور ریاکار تھا کبر کا شکار تھا کیونکہ اس نے جو جو الفاظ اس گنہ گار کے متعلق کہے تھے کہ اس کو مدبر کہا اور یہ

کہا کہ مسیح سے اسکو کیا تعلق ہے اور یہ کہا کہ ایسوں کیلئے دوزخ کے دروازہ کے کھولنے کی بھی ضرورت نہیں ہے تو یہ سب اس کا خالص تکبر تھا اور حدیث شریف میں جس بغض کا ذکر ہے اور حضرات صحابہ جو معاملہ کیا کرتے تھے وہ غایت اخلاص اور للّٰہیت سے کرتے تھے ان دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں صورتاً تو دونوں یکساں معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے بغض فی اللہ کا شرعاً حکم ہے اور انسان اسکو تواضع کے ساتھ جمع کرسکتا ہے یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ انسان بغض فی اللہ بھی کرے اور عین اسی حالت میں غایت درجہ کا متواضع بھی ہو برخلاف اس بغض و غصہ کے جس کا منشا کبر باطن ہو کہ اس میں تواضع اصلا باقی نہیں رہتی۔

چنانچہ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس مسئلہ پر نہایت ہی محققانہ کلام فرمایا ہے جس کو ہم یہاں بعینہ نقل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

"اگر تم کہو کہ میرے لئے یہ بھلا کس طرح ممکن ہے کہ کسی مبتدع یا فاسق سے بغض فی اللہ بھی رکھوں کیوں کہ ہم کو ان سے بغض رکھنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان سے تواضع سے بھی پیش آؤں اس لئے کہ ان دونوں کا جمع کرنا جمع بین المتناقضین سا ہے۔ اس کے جواب میں امام فرماتے ہیں کہ بیشک تمہارا یہ خیال صحیح ہے اور صرف تم ہی نہیں بلکہ بہت سے لوگوں پر یہ امر مشتبہ رہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بدعت اور فسق پر انکار کے وقت غضب للہ کبر نفس اور علم و تقویٰ پر ناز کے ساتھ مختلط ہوجاتا ہے یعنی صورتاً چونکہ دونوں چیزیں یکساں ہوتی ہیں اس لئے ان میں باہم اشتباہ واقع ہوجاتا ہے۔"

(میں کہتا ہوں کہ امام غزالیؒ کی یہ بات آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اس فرق کو اگر ناقصین سمجھ لیں اور اپنا معمول بنالیں تو کامل ہوجائیں) آگے امام فرماتے ہیں کہ

چنانچہ بہت سے عابد جاہل اور عالم مغرور جب کسی فاسق کو اپنے پہلو میں بیٹھا ہوا دیکھتے ہیں تو اسکو دھتکار دیتے ہیں اور اپنے کبر باطن کے سبب سے اس سے اس طرح نفرت اور دوری کا اظہار کرتے ہیں جیسے کہ کوئی نجاست وغیرہ سے اپنے دامن کو بچاتا ہو اور لطف یہ کہ سمجھتے یہ ہیں کہ ہمارا یہ غصہ اللہ کے واسطے ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے

ایک عابد نے اپنے رفیق کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ کیا تھا۔ امام کی مراد اس سے وہی عابد ناپارسا ہے کہ جس کا واقعہ شیخ سعدی نے بوستاں میں بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ عابد جاہل اور عالم مغرور سے جو چیزیں صادر ہوتی ہیں وہ اس لئے کہ یہ لوگ عبادت وغیرہ کرنے کی وجہ سے علم اور زہد میں تو کچھ ترقی کر لیتے ہیں مگر اخلاق کی بلندی پر فائز نہیں ہوتے بلکہ اس کے اعتبار سے پستی میں ہی رہتے ہیں اس لئے ان کو اپنی اخلاقی کمزوری مثلاً یہ کہ نفس میں کبر موجود ہے یا اپنے علم وورع پر ان کو ناز پیدا ہو گیا ہے۔ یہ سب باتیں ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔ اب اگر یہ لوگ اخلاقی بلندی حاصل کریں مثلاً تواضع جو کہ سب سے بڑا خلق بلکہ تمام اخلاق محمودہ کی اصل ہے اس کو سمجھنے اور اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ تب اپنی خامیاں اور کمزوریاں ان کو محسوس ہوں گی۔ یعنی جب خلق تواضع کی خوبی سے متصف ہو جائیں گے اور اب اس وقت نفس میں بگاڑ پیدا ہو کر اگر کبر آئے گا تو یہ فوراً اس کو محسوس کر لیں گے اور غضب للہ اور غضب للنفس میں انکو تمیز حاصل ہو جائیگی جیسا کہ صالحین امت کو ہر زمانہ میں ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کی کچھ مثالیں ہم آئندہ بیان کرینگے) آگے امام فرماتے ہیں کہ:۔

فاسق پر کبر اور غضب بغض فی اللہ کے مشابہ اس لئے ہوتا ہے کہ مطیع پر کبر کا شر ہونا تو ظاہر ہے اور اس سے بچنا بھی ممکن ہے۔ مگر فاسق اور مبتدع پر کبر کرنا اور اس پر غصہ ہونا اسکو تو اچھا ہی سمجھا جاتا ہے کیونکہ بغض فی اللہ کے مشابہ ہوتا ہے اور بغض فی اللہ محمود ہے۔ نیز غضب اور تکبر دونوں لازم وملزوم ہیں بھی کیونکہ غصہ والا جس پر غصہ کرتا ہے اس سے گویا تکبر ہی کے ساتھ پیش آتا ہے اور تکبر کرنے والا غصہ ضرور کرتا ہے۔ غرض دونوں لازم ملزوم اور باہم ملے جلے اور صورتاً ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ امام نے یہ جو فرمایا کہ مطیع پر کبر کا شر ہونا ظاہر ہے تو یہ امام اپنے زمانہ کا حال بیان فرماتے ہوں گے تاہم اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ مطیعین پر بھی کبر کیا جاتا ہے مگر وہ ہوتا ہے شر اور مذموم اور اس سے بچنا بھی ممکن ہوتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ یوں تو باہم خوب ملے جلے رہتے ہیں لیکن کوئی شخص اگر ان میں نیک اور صالح ہوتا ہے تو اسی پر انکار کیا

جاتا ہے بلکہ اسکو افضل العبادات سمجھا جاتا ہے ظاہر ہے کہ علماء اور مشائخ جو کہ دین حاصل ہونے کے ذرائع تھے جب انھیں سے کبر کیا جائیگا اور ان کو حقیر سمجھا جائیگا تو پھر حصول دین کی سبیل ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اس کا انجام ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ دین سے تعلق ختم ہی ہوتا چلا جارہا ہے اس لئے کہ لوگ اہل دین سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آگے امام فرماتے ہیں کہ :-

> چونکہ ان دونوں میں التباس شدید ہے اس لئے ان میں تمیز وہی شخص کر سکتا ہے جو موفق من اللہ ہو (یعنی جس شخص کو اس کے اخلاص کے سبب سے منجانب اللہ ایک ذوق و تمیز عطا ہوئی ہو جس سے بروقت وہ دونوں میں فرق کر لیتا ہو۔)

میں کہتا ہوں کہ امام کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ جو موفق من اللہ ہوتا ہے اسے غضب للہ اور غضب للنفس میں تمیز حاصل ہوتی ہے لہذا ضرورت ہے کہ لوگ ایسی چیزوں کو اختیار کریں جنکی وجہ سے قلب میں امتیاز کا ملکہ پیدا ہو جائے تاکہ جب غضب للہ میں نفس شامل ہونے لگے تو فوراً اس کا احساس ہو جائے۔ امام نے جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح سے کہ عبادت میں خلوص کی ضرورت ہے یعنی یہ کہ وہ غیر اللہ کی آمیزش سے خالی ہو چنانچہ یہی وجہ ہے کہ شرعاً ریا کی ممانعت ہے اور اخلاص نیت کا حکم ہے کہ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے یہاں عبادت مقبول نہیں ہوتی۔ اسی طرح سے یہ بھی سمجھنا ضروری ہو گا کہ تعلیم و تربیت کا سلسلہ بھی عنداللہ اسی پر موقوف ہے اور اسی قاعدہ پر یہ بھی مرتب ہے کیونکہ بدعت اور فسق پر انکار بھی دین ہی ہے بلکہ اعظم خدمت دین ہے۔ تو اس میں بھی اخلاص کی ضرورت ہو گی یہ بھی بدون اخلاص کے مقبول نہ ہو گی۔ اور اخلاص بدون آمیزش نفس سے خالی ہوئے نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب بدعت یا فسق کے انکار میں کبر یا علم و ورع پر ادلال ہو جایا کرتا ہے تو ایسے ناپاک مرض کے ہوتے ہوئے یہ انکار عنداللہ کیسے دین ہو سکتا ہے۔ بدعت اور فسق کے انکار کا منشاء غضب للہ ہوتا ہے جیسا کہ اکابر امت سے ثابت ہے۔ باقی غضب للنفس کا شمول بھی اس میں ہو جاتا ہے۔ یہ بھی انہیں اکابر کی تصریحات سے معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان حضرات نے غضب للنفس کو ترک کیا ہے۔ جس طرح سے کہ غضب للہ کو اللہ کے لئے عمل میں لائے ہیں۔ یہ دونوں قسمیں انہیں بزرگوں کے طرز عمل سے ثابت ہوئیں ورنہ غضب للنفس کو اگر یہ حضرات اپنے عمل میں نہ بیان فرماتے تو یہی باقی رہتا اور اس پر گمان غضب للہ کا کیا جاتا۔ اسی طرح غضب للنفس

دنیا سے رخصت ہی ہو جاتا۔

غرض غضب للہ جس طرح فرض ہے اسی طرح غضب للنفس حرام ہے۔ امام غزالیؒ کی غضب للہ اور غضب للنفس کی یہ تفریق تمام عباد اور علماء پر حجت ہے۔ لہذا ان کو یہ سمجھنا ہوگا کہ امام نے جس کی مذمت بیان فرمائی ہے کہیں ہم تو اس میں داخل نہیں ہیں۔

چونکہ غضب للہ اور غضب للنفس میں التباس اور اشتباہ واقع ہو جاتا ہے لہذا ان دونوں میں باہم امتیاز کرنا ضروری ہے۔ اب جو شخص ان میں تمیز رکھتا ہو اسکے لئے تو معاملہ بالکل آسان ہے لیکن جو ابھی ناقص ہے یعنی تمیز سے عاری ہے اسے اس موقع پر کیا کرنا چاہیئے۔ اس کے متعلق امام غزالیؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ :۔

> اس خلط اور التباس سے خلاصی کی یہ صورت ہے کہ جب تم کسی فاسق یا مبتدع کو دیکھو یا انھیں امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرو تو اس وقت تین باتوں کا استحضار رکھو۔
>
> ۱۔ ایک تو یہ کہ اپنی توجہ اپنے سابقہ معاصی پر رکھو تاکہ تمہارا مرتبہ خود تمہاری نگاہوں میں کمتر معلوم ہو اور تمہارا نفس ہی تم کو ذلیل جانے۔
>
> ۲۔ دوسری بات یہ کہ تم کو جو فاسق یا مبتدع پر فوقیت حاصل ہے خواہ علم میں یا اعتقاد حق میں یا عمل صالح میں تو یہ سمجھو کہ یہ سب چیزیں حق تعالیٰ کی عطایا ہیں اور اسی کا تفضل ہے تمہارا اس میں کچھ کمال نہیں۔ جب اس بات کا لحاظ رکھو گے تو پھر تمہیں عجب نہ ہوگا اور جب عجب نہ ہوگا تو تکبر بھی نہ ہوگا۔
>
> ۳۔ تیسری بات یہ کہ تمہارا اور اس شخص کا انجام جو کہ سردست ایک امر مبہم ہے اس کے متعلق کم از کم یہ اندیشہ رکھو کہ شاید تمہارا خاتمہ اچھا نہ ہو (العیاذ باللہ) اور اس کا اچھا ہو جائے۔ جب اس امر کا تصور رکھو گے تو اس کی وجہ سے تمہارے اندر خوف پیدا ہوگا اور پھر وہ تمہیں تکبر سے باز رکھے گا۔
>
> اب اگر تم یہ کہو کہ ان امور کی وجہ سے خوف جو طاری ہوگا تو اس کی وجہ سے کبر نفس تو بلاشبہ ختم ہو جائے گا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ غصہ

کا بھی تو خاتمہ ہو جائے گا پھر غضب للہ کی کیا سبیل ہوگی؟ تو میں کہونگا کہ نہیں اگر تمہارا سید تمہیں غصہ کرنے کا حکم دے تو تم اس کے لئے غصہ کر سکتے ہو اور تمہارا یہ غصہ یقیناً اپنے نفس کے لئے نہ ہوگا اس لئے کہ اس وقت تم اپنے غصہ کرنے میں اپنے کو ناجی اور اپنے صاحب کو ہالک نہیں سمجھوگے بلکہ تمہیں تو خود اپنا ہی خوف لگا ہوگا۔ کیونکہ تم یہ سمجھتے ہوگے کہ گو بظاہر یہ شخص گنہگار ہے لیکن مخفی اور باطنی گناہ میرے اس سے کہیں زیادہ ہیں اور پھر خاتمہ کا بھی حال معلوم نہیں۔ تو پھر کس بنا پر دوسرے کو حقیر سمجھا جائے۔ (حاصل یہ کہ اس طور سے تواضع اور غضب کو باہم جمع کیا جا سکتا ہے۔)

اب ہم تمہیں ایک مثال کے ذریعہ اسکو واضح کرتے ہیں۔ کہ غضب للہ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ انسان مغضوب علیہ پر تکبر بھی کرے اور اپنے آپ کو اس سے بڑا ہی جانے۔ دیکھو کسی بادشاہ کا کوئی غلام ہو اور ایک لڑکا بھی ہو جو کہ اس کا لخت جگر اور نور نظر ہو۔ اور اس نے اپنے لڑکے کو غلام کی تربیت میں دیدیا ہو اور اسے حکم فرمایا ہو کہ جب یہ کوئی بے ادبی کرے یا کوئی نازیبا حرکت اس سے سرزد ہو تو اس کو ڈانٹے۔ تنبیہ کرے اور اگر ضرورت سمجھے تو مارے بھی۔ اب اگر یہ غلام اپنے مالک کا محب اور فرمانبردار غلام ہوگا تو لڑکے کی بے ادبی پر اس کے لئے مارنے اور تنبیہ کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ چنانچہ اب یہ جو اس پر غصہ کرے گا تو محض اپنے مالک کی خاطر سے کرے گا اور اس سے اس کا مقصد امتثال امر کرکے قرب حاصل کرنا اور مولا کی مرضی کا پورا کرنا ہوگا۔ نیز اس لئے ہوگا کہ اس لڑکے سے اس کے مالک کی مرضی کے خلاف کا صدور ہوا ہے۔ لہذا وہ اس پر غصہ کرے گا مگر اس پر ذرا تکبر نہیں کرے گا بلکہ اس حال میں بھی متواضع ہی رہے گا کیونکہ اس کے پیش نظر اپنی حیثیت بھی ہے اور لڑکے کا مرتبہ بھی۔ وہ یہ کہ لڑکا بہر حال غلام

سے اعلیٰ و افضل ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر غصہ کے لئے تکبر اور عدم تواضع ضروری نہیں پس اس طرح سے ممکن ہے کہ مبتدع اور فاسق پر تم نکیر بھی کرو اور اپنے دل میں یہ سمجھتے ہو کہ شاید اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی تم سے افضل ہو۔ کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ ازل میں اس کے لئے حسن القضاء اور تمہارے لئے سوء القضاء ثابت ہو چکی ہو اور تمہیں اس کی خبر نہ ہو۔ لہٰذا اب اس حال میں تم جو اس پر غصہ کروگے تو محض مالک کے حکم کی خاطر اور اپنے مولا کی محبت کی وجہ سے اور اس لئے کہ اس لڑکے سے مولیٰ کی مرضی کے خلاف کام ہوا ہے۔ پس اس وقت اس کے ساتھ تواضع بھی قائم رہے گی۔ کیونکہ تم یہ سمجھے ہوئے ہو کہ ہو سکتا ہے کہ کل کو قیامت میں اس کا مرتبہ تم سے بڑھا ہوا ہو اس کے بعد پھر تکبر کہاں باقی رہ سکتا ہے۔

چنانچہ علماء میں سے جو اہل فہم و بصیرت ہیں وہ اسی طرح سے تواضع اور خوف کو جمع کر لیا کرتے ہیں اور جو مغرور (یعنی دھوکہ میں پڑے ہوئے) ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ ایک طرف تکبر بھی کرینگے اور پھر اپنے لئے دوسروں سے زائد اجر اور ثواب کے بھی خواہشمند ہوں گے۔ حالانکہ انجام کی کچھ خبر نہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر دھوکہ کی چیز اور کیا ہو سکتی ہے غرض یہ طریقہ ہے عاصی اور مبتدع کے ساتھ تواضع اور بغض فی اللہ کے جمع کرنے کا اور خود کو کمتر سمجھتے ہوئے بھی فاسق اور مبتدع سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا۔ جو کہ مطلوب شرعی ہے۔

(انتہی کلامہ۔ احیاء العلوم صفحہ ۳ ج ۳)

میں کہتا ہوں کہ امام نے خلاصی کی جو سبیل بیان فرمائی صحیح ہے۔ لیکن ایک مخصوص طبقہ ہی اس پر عمل کر سکتا ہے۔ ہر شخص کے لئے اس طریقہ پر عمل کرنا آسان نہیں اس لئے امام ہی کی برکت سے بلکہ انہیں کے کلام سے مستنبط کر کے اس کا آسان حکم بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ امام نے رفق کی فضیلت بیان کرتے ہوئے باب کے آخر میں لکھا ہے کہ ابی عون انصاری سے منقول ہے کہ کسی شخص نے کوئی سخت کلمہ اپنی زبان سے نہیں نکالا مگر یہ کہ اس کے قائمقام کوئی نرم کلمہ بھی ضرور ہوتا ہے جو وہ اسکی

جگہ استعمال کر سکتا تھا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ دیکھو تمام اہل علم رفق اور نرمی کی مدح جو فرما رہے ہیں تو یہ اسی لئے کہ نرمی اکثر احوال اور اغلب مواقع میں مفید ہی ہوتی ہے اور سختی کی جانب حاجت شاذ و نادر ہی پڑا کرتی ہے اور کامل وہ شخص ہے جس کو رفق و عنف کے مواقع کی تمیز پیدا ہو گئی ہو اور وہ ہر شخص کو اس کا حق دے سکتا ہو۔ لیکن اگر وہ ناقص البصیرت ہو اور کسی خاص واقعہ کا حکم اس پر پوشیدہ رہ جائے یعنی وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہاں پر سختی کرنی چاہیئے یا نرمی تو اسے نرمی ہی اختیار کرنی چاہیئے اس لئے کہ اس میں کامیابی زیادہ ہے۔

(احیاء العلوم ص۱۸۶ ج۳)

ناقص و کامل کا یہ حکم جو امام نے بیان فرمایا وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں رفق اور عنف اختیار کرنے سے متعلق تھا۔ پس اسی پر قیاس کر کے ہم یہاں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص کامل ہو یعنی اسکو امتیاز حاصل ہو وہ تو بدعت اور فسق پر انکار کر سکتا ہے کیونکہ اسے تمیز ہے کہ یہ غضب للہ ہے لیکن جو شخص ناقص ہو یعنی یہ تمیز نہ رکھتا ہو اس کے لئے متعین ہے کہ زبان سے ان پر انکار نہ کرے کہ یہ انکار منجر بہ کبر ہو گا۔ یہ بغض فی اللہ ہے ہی نہیں۔ کبر سے بچنا اہم ہے اس لئے اس کو اجازت اس کی نہ دیجائے گی۔ اگر اجازت دے دی جائے تو بڑے مفاسد پیدا ہوں گے۔ جیسا کہ آج کل مشاہد ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کامل کا اور حکم ہے اور ناقص کا اور۔ جس کو تمیز حاصل ہو چکی ہو وہ اس کے مطابق معاملہ کرے اور جسے نہ حاصل ہوئی ہو تو اس کے لئے احتیاط اسی میں ہے کہ وہ زبان سے انکار نہ کرے۔ باقی اس تمیز کا حاصل کرنا ہے اختیاری شے۔ یعنی انسان جب کہ نیت صحیح کر کے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے اس کے قلب میں صفائی پیدا فرما دیتے ہیں اور اسی کی وجہ سے اس کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ یعنی رذائل دور ہو جاتے ہیں اور صحیح اور اچھی چیزوں سے اسکو تعلق اور لگاؤ سا ہو جاتا ہے اور دین و دیانت کے ساتھ اسکو ایسی مناسبت حاصل ہو جاتی ہے کہ جہاں کوئی بات اس کے خلاف پیش آئی اور کوئی حال اس حال سے مختلف قلب میں گذرا تو یہ شخص اسکو ذوقاً اور وجداناً محسوس کر لیتا ہے۔ اسی ذوق والے کو مُوَفّق کہتے ہیں جس طرح حس ظاہر سے ہم مزہ کا احساس کرتے ہیں مثلاً یہ کہ پانی کو پی کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ پانی ہے اور اس میں

اگر شکر مل جائے تو یہ جانتے ہیں کہ یہ شربت ہے اور پانی سے الگ ایک چیز ہے یا مثلاً کسی چیز میں نمک پڑا ہوا ہو اور دوسری چیز اس سے خالی ہو تو ہم چکھ کر دونوں کا فرق معلوم کر لیتے ہیں۔ اسی طرح سے اعمال کا بھی باطناً ایک مزہ ہوتا ہے جب کہ وہ اخلاص کے ساتھ ادا ہو رہے ہوں اور جب اخلاص فوت ہو جائے تو اس کا دوسرا مزا ہو جاتا ہے اسکو موفق من اللہ پہچانتا ہے۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ ابتداء میں کسی کے اندر کام میں اخلاص موجود ہو مگر بعد میں چل کر نہ رہ جائے۔ اسی طرح سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابتداء میں کسی کام میں اخلاص نہ رہا ہو لیکن بعد میں چلکر پیدا ہو جائے۔

اب ہم آپ کے سامنے بزرگانِ دین کے کچھ واقعات بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ یہ حضرات کس قدر مخلص ہوتے تھے کہ اگر کبھی ان کے کام میں اخلاص کے خلاف کوئی چیز شامل ہو جاتی تھی تو یہ حضرات اسے فوراً محسوس کر لیتے تھے، اور اخلاص اور نفسانیت میں باہم تمیز فرما لیتے تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ فتح بیت المقدس بیان کرتے ہیں وہ یہ کہ آپ کے دور خلافت میں مسلمانوں نے جب بیت المقدس کا محاصرہ کیا تو اہل شہر نے کہا کہ تم اپنے خلیفہ کو بلاؤ۔ ہماری کتاب میں ان کا حلیہ لکھا ہوا ہے اگر مطابق ہو جائے گا تو ہم بغیر جنگ کئے ہی قلعہ کا دروازہ کھولدیں گے۔ اور شہر تمہارے حوالہ کر دیں گے۔ چنانچہ مسلمانوں کے سپہ سالار نے خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کے پاس یہ اطلاع بھیجی اور آپ شام یعنی (بیت المقدس) کے لئے روانہ ہو گئے۔ بوقت روانگی آپ کا یہ حال تھا کہ پیوند لگے ہوئے معمولی کپڑے زیب تن فرمائے ہوئے تھے اور اونٹ پر سوار تھے۔ یہ دیکھ کر ساتھ کے مسلمانوں نے آپ سے درخواست کی کہ آپ مسلمانوں کے خلیفہ ہیں لہٰذا اچھے اور صاف کپڑے پہن لیں اور گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لے چلیں حضرت عمرؓ نے لوگوں کی اس درخواست پر کپڑے بدل لئے اور اونٹ سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گئے مگر ابھی چند ہی قدم چلے تھے کہ فرمانے لگے کہ بھائی میرا نفس ان چیزوں کی وجہ سے پھول رہا ہے۔ لاؤ میرے پرانے کپڑے اور میرا اونٹ میں اسی پر چلوں گا۔ اور یہ فرمایا کہ نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام یعنی ہم ایسی قوم ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ عزت دی ہے وہی ہمارے لئے کافی ہے۔ یہ فرمایا اور پھر وہی پیوند دار کپڑے پہن لئے اور اونٹ پر سوار ہو کر تشریف لے گئے۔ اللہ اکبر۔

دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں کے کہنے سننے کی وجہ سے اپنے کپڑے

اور سواری کو بدلنے کو تو بدل لیا لیکن اس کی وجہ سے نفس میں جو تغیر پیدا ہوا اس کو فوراً محسوس فرمالیا اور خلوص اور نفسانیت میں امتیاز کرلیا۔ چنانچہ لباس و سواری کو بدل دیا پھر آپ کے اس اخلاص کی جو برکات ظاہر ہوئیں وہ معلوم ہیں کہ اسی کی وجہ سے قلعہ فتح ہوگیا۔

اور سنئے۔ مثنوی میں مولانا رومؒ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ جہاد میں کسی غیر مسلم پر آپ غالب آئے اور چاہا کہ تلوار سے اس کا کام تمام کردیں۔ اس بے ادب نے آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوک دیا۔ آپ نے اسی وقت تلوار پھینک دی اور اس کے سینہ پر سے اتر آئے۔ اس کو بہت حیرت ہوئی اور اس چھوڑنے کا سبب پوچھا۔ آپ نے فرمایا کہ ؎

چوں خدو انداختی بر روئے من　　　نفس جنبید و تبہ شد خوئے من
نیم بہر حق شد و نیمے ہوا　　　شرکت اندر کار حق نبود روا

آپ نے فرمایا کہ جب تو نے میرے منہ پر تھوک دیا تو میرے نفس کو حرکت ہوئی اور میرا خلق حسن بگڑنے لگا پس میرا یہ لڑنا کچھ تو اللہ کے واسطے رہ گیا اور کچھ نفس کے لئے ہوگیا اور حق تعالیٰ کی عبادت میں شرکت جائز نہیں ہے اور یہ بھی فرمایا کہ ؎

تو نگارید ۂ کف مولیستی　　　آنِ حقّے کردۂ من نیستی
نقش حق را ہم بامر حق شکن　　　بر زجاجۂ دوست سنگِ دوست زن

یعنی تو دست حق کا بنایا ہوا ہے اور حق تعالیٰ کا مملوک ہے میرا مملوک نہیں ہے پس وہی تصرف جائز ہوگا جو باذن حق ہو۔ کیونکہ تو مصنوع حق ہے اور مصنوع حق کو امر حق سے ہی توڑنا چاہیئے اور شیشۂ دوست پر سنگِ دوست ہی مارنا چاہیئے۔

دیکھئے یہ حضرت کے خلوص ہی کی برکت تھی کہ اپنے نفس پر قابو پاگئے چنانچہ آپ کے اخلاص پر یہ ثمرہ مرتب ہوا کہ وہ کافر مسلمان ہوگیا اور اپنے بہت سے خاندان والوں کو بھی مسلمان کرادیا۔

یہ واقعہ تو ایک جلیل القدر صحابی بلکہ امیر المومنینؓ کا تھا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ سلاطین اسلام میں بھی بہت سے ایسے بادشاہ گذرے ہیں جن کو یہ تمیز حاصل تھی اور وہ موقع پر خلوص کو نفسانیت سے تمیز دے لیتے تھے۔ چنانچہ اخلاق محسنی میں ہے کہ خراسان کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ نے ایک مجرم کو سزا دینے کا حکم فرمایا۔ ادھر لوگوں نے اسے کوڑے لگانے شروع کئے ادھر اس نے بے شرمی کی زبان کھولی اور بادشاہ کو گالیاں دینی شروع کیں۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ سزا بند کردیجائے

اور اس کو رہا کردیا۔ مقربان شاہی میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضور! جو موقع اس بے حیا کو اور زیادہ سزا دینے کا تھا ایسے وقت میں معاف کردینے اور چھوڑ دینے کا کیا سبب ہوا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں اسکو خدا کے لئے تنبیہ کرتا تھا۔ جب اس نے مجھے بُرا بھلا کہنا شروع کیا تو اس سے میرا نفس متغیر اور متاثر ہوا جی چاہا کہ اس سے بدلہ لوں لیکن پسند نہ آیا کہ حق تعالیٰ کے معاملہ میں نفس کو بھی شریک گردانوں کہ یہ صورت شیوۂ اخلاص سے بعید ہے کیونکہ جو شخص کوئی دینی عمل کرے اور اس میں کسی دنیوی غرض کو بھی شامل کرے تو وہ اس کے ثواب سے محروم رہتا ہے ؎

از سخنش آتش من تیز شد — کار الٰہی غرض آمیز شد

داعیۂ نفس چو بنمود رو — معنئ اخلاص نماند اندرو

کار کز اخلاص نہ شد بہرہ ور — ترکِ چناں کار سزا وار تر

یعنی اس کی بدگوئی و بدکلامی سے میرے غصہ کی آگ بھی تیز ہوگئی جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے لئے جو عمل تھا وہ غرض آمیز ہوگیا اور جب نفس کا داعیہ ظاہر ہوا تو پھر اس کام میں اخلاص کہاں باقی رہا جس کام میں اخلاص ہی نہ پایا جاوے ایسے کام کو ترک کردینا ہی بہتر ہے۔

دیکھا آپ نے جیسا کہ مولانا روم نے فرمایا تھا ؏

از علی آموز اخلاص عمل

اس خلیفہ نے سیکھا اور انھیں کی سنت پر چلا۔

اسی طرح سے احیاء العلوم میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ کبھی فضول کلام نہ فرماتے تھے۔ ایک دن دریا کے کنارے جارہے تھے کہ سامنے سے ایک کشتی آتی ہوئی نظر پڑی۔ اس پر کچھ مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ کشتی والے سے پوچھ پڑے کہ اس میں کیا ہے اس نے بڑی تیزی سے کہا کہ سلطان کی شراب جارہی ہے کرلو جو کرنا ہو۔ ان بزرگ نے کشتی والے سے کہا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے اس نے کہا ڈنڈا کہا ذرا دیر کے لئے مجھے تو دیدو اس نے جھٹک کر دیدیا انھوں نے اس سے لاٹھی لیکر ایک ایک مٹکے کو توڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ تیس میں سے انتیس مٹکے توڑ ڈالے اور ایک چھوڑ دیا۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی ان کو طلب کیا۔ کہتے ہیں کہ نہایت ہی جابر بادشاہ تھا۔ لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر لوہے کا گرز ہاتھ میں لے کر دربار کرتا تھا ان بزرگ سے پوچھا کہ آپ نے ان مٹکوں کو توڑا ہے۔ کہا ہاں۔ اس نے کہا کہ آپ کو محتسب کس نے بنایا ہے کہا کہ جس نے آپ کو بادشاہ بنایا ہے۔ یہ سنکر بادشاہ نے سر نیچا کرلیا۔ ذرا دیر کے بعد پھر ان سے پوچھا

کہ اچھا یہ بتایئے کہ آپ کو کس جذبہ نے اس فعل پر آمادہ کیا۔ فرمایا کہ محض امیر المومنین کی خیر خواہی نے اس لئے کہ اگر میں یہ دیکھوں کہ امیر المومنین کی جانب کوئی موذی جانور مثلاً سانپ یا بچھو چلا آرہا ہے تو میرا فرض ہے کہ میں امیر المومنین کو اس سے بچاؤں۔ اسی طرح میں نے جب یہ دیکھا کہ ایسی شئے امیر المومنین کی طرف جارہی ہے جس کے ارتکاب کی وجہ سے قیامت میں سخت مواخذہ ہوگا۔ تو امیر المومنین کی خیر خواہی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں امیر المومنین کو اس سے بچالوں۔ یہ سن کر وہ پھر سرنگوں ہوگیا اور دیر تک سر جھکائے رہا پھر اس نے پوچھا کہ اچھا ایک بات اور بتلا دیجئے وہ یہ کہ جب توڑنا ہی تھا تو سارے ہی مٹکے توڑ ڈالے ہوتے۔ ایک کو کیوں چھوڑ دیا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ جب آپ نے پوچھا ہی ہے تو بتلانا ضروری ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب تک میں انتیس مٹکوں کو توڑتا رہا۔ میرے قلب کی حالت نہایت عمدہ تھی۔ بغض فی اللہ اور نصح مسلم کا جذبہ کارفرما تھا اور قلب میں ایسی قوت محسوس کرتا تھا کہ اگر ساری روئے زمین شراب کے مٹکوں سے بھری ہوتی تو سب کو توڑ دیتا لیکن جب تیسویں پر پہونچا تو نفس نے کچھ حصہ لے لیا۔ یہ خیال آگیا کہ تم نہی عن المنکر کے باب میں اس قدر جری ہو کہ حاکم وقت کی بھی پروا نہیں کرتے بس اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے کہا کہ یہ تو نفسانیت آگئی للہیت رخصت ہوگئی اس لئے اس کو چھوڑ دیا۔

بادشاہ پر ان بزرگ کی اس گفتگو کا بہت اثر ہوا اس نے کہا اچھا آج سے تم کو محتسب بناتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ معاف کیجئے۔ آپ جب بنا سکتے ہیں تو یہ منصب لے بھی سکتے ہیں۔ لہٰذا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہاں سے چلے گئے اور جب تک وہ بادشاہ زندہ رہا اس شہر میں آئے ہی نہیں۔

دیکھا آپ نے بزرگوں کو اور اللہ والوں کو ان کے اخلاص کی وجہ سے قلب میں ایک وجدانی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے جس سے ان کو للہیت اور نفسانیت میں تمیز حاصل ہوجاتی ہے میں کہتا ہوں کہ جب اخلاص حاصل کرنا ضروری ہے اور نفسانیت سے بچنا فرض ہے تو پھر ہر مسلمان کو اس امتیاز کو سمجھنا اور اپنے قلب میں پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔ بزرگان دین کے یہاں یہی کام ہی ہوتا رہا ہے کہ وہ اخلاص پر بحث کرتے ہیں اور اپنے لوگوں میں اسی چیز کے پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ضرورت سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ اس لئے کہ آپ نے دیکھا کہ اس عابد ناپارسا کے پاس طاعت اور عبادت کی کمی نہیں تھی کمی جو تھی تو اخلاص کی تھی

اور سنئے مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلویؒ نے ایک واقعہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا بیان

فرمایا کہ دہلی کا سفر پیش آیا تو فرمایا کہ کپڑے لے لو وہیں چل کر بدل لیں گے اور راستہ کیلئے تو یہی کافی ہیں۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ دہلی جانے کے بعد بھی حضرت نے اپنے کپڑے بدلے نہیں۔ انھیں پہلے کپڑوں میں وعظ فرمایا۔ حضرت کو کچھ خیال آگیا ہوگا۔ اس لئے تبدیل نہیں فرمائے۔

دوسرا واقعہ سنیئے:۔

حضرت مولانا تھانویؒ نے ایک دفعہ حضرت دیوبندیؒ کو کانپور بلایا حضرت سے وعظ کی درخواست کی گئی۔ حضرت نے منظور فرمایا اور نہایت ہی عمدہ تقریر فرمائی۔ ایسی کہ بڑے بڑے معقولی سنکر حیران وششدر رہ گئے۔ اتنے میں مولوی لطف اللہ صاحب علیگڈھی بھی آگئے۔ حضرت نے وعظ بند فرما دیا۔ لوگوں کو افسوس ہوا کہ آج ہی تو موقع تھا۔ مولوی صاحب آگئے تھے۔ حضرت کی تقریر بھی نہایت فاضلانہ ہو رہی تھی۔ کاش حضرت سلسلہ تقریر جاری رکھتے تو مولوی صاحب کو بھی کچھ سننے کا موقع مل جاتا۔ یہانتک کہ کسی نے ہمت کر کے حضرت دیوبندی سے بھی اس کا ذکر کر دیا حضرت نے صاف فرمایا کہ بھائی یہی خیال تو مجھے بھی ہوا تھا اس لئے میں نے تقریر بند کر دی۔ کہ اب تو یہ تقریر خدا کے لئے نہ ہوگی۔

ان واقعات سے آپ نے اندازہ کیا کہ بزرگان دین کی کس قدر توجہ خود اپنے نفس پر رہتی ہے دوسروں کو کچھ کہنے سننے کے بجائے ہر وقت یہ حضرات اپنا ہی محاسبہ کرتے رہتے ہیں۔

آخر میں بطور خلاصہ کے عرض کرتا ہوں۔ حاصل مضمون یہ ہے کہ:۔

(۱) آدمی کو چاہیئے کہ اپنے ہی عیوب پر نظر کرے۔ دوسروں کو حقیر و ذلیل اور اپنے سے کمتر سمجھنا نہایت بری بات ہے اور جس وقت تک انسان کے پیش نظر اپنے عیوب نہیں ہوتے وہ دوسروں کے عیوب پر نظر کرتا ہے لیکن جب اپنے معائب سامنے آجاتے ہیں تو پھر دوسروں کی تحقیر قلب سے نکل جاتی ہے ؎

اوروں پہ معترض تھے لیکن جب آنکھ کھولی
اپنے ہی دل کو ہم نے گنجِ عیوب دیکھا

(۲) جو گنہگار کہ اپنے گناہوں پر شرمسار ہو اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف اسکی مغفرت کی رجا اسکو حاصل ہو وہ عاصی اس پرہیزگار سے بہتر ہے جسے اپنی عبادت پر تکیہ ہو ؎

گنہگار اندیشناک از خدائے
بہ از پارسائے عبادت نمائے

یہی مطلب ہے بزرگوں کے اس ارشاد کا کہ العاصی خیر من المدعی اور اس کا کہ ؎

زاہد غرور داشت سلامت نہ برد راہ

رند از رہ نیاز بدار السلام رفت

(۳) اصل طریق تواضع ہے۔ یہی انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور ہر زمانہ میں صالحین امت کا اس پر عمل رہا ہے۔ جیساکہ حدیث انا البائس الفقیر الحدیث کی تشریح سے ظاہر ہوا۔

(۴) تواضع اور بغض فی اللہ میں منافات نہیں ہے دونوں جمع ہو سکتی ہیں۔ تواضع باقی رکھنے کے لئے اپنی حیثیت پیش نظر رکھے۔ ایاز قدر خود بشناس اور بغض کرنے کے لئے دوسرے کی مصلحت سامنے کرے یعنی یہ سمجھے کہ یہی طریقہ اس کے حق میں نافع ہوگا۔ پس تواضع اپنے اعتبار سے کرے اور بغض اس کے اعتبار سے ان دونوں میں کیا تضاد ہے؟

(۵) البتہ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی بغض للنفس کا اشتباہ بغض فی اللہ کے ساتھ ہوجاتا ہے یعنی ہوتا تو ہے نفسانی غصہ اور نفس یہ دھوکا دیتا ہے کہ یہ بغض فی اللہ ہے۔ تو اس مغلطہ سے نکلنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر امتیاز پیدا کرے۔ بزرگوں نے اسکو پیدا کیا ہے اور نفسانیت اور خلوص میں اس کے ذریعہ تمیز دی ہے۔ ہر شخص اس کا مکلف ہے کہ یہ تمیز پیدا کرے اور ظاہر ہے یہ تمیز اہل تمیز کی صحبت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور جب تک آدمی کے اندر یہ چیز نہ پیدا ہو وہ بغض فی اللہ کا اظہار زبان سے نہ کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ نفس شامل ہوجائے اور اس کو خبر بھی نہ ہو۔ پس اس کا ترک اس درجہ مضر نہیں جتنا کہ نفسانیت کی آمیزش اور کبر و تکبر اور دوسرے کی تحقیر مضر ہے۔ اسلئے انسب اور احوط اس کا ترک ہی کردینا ہے۔ جس طرح سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں جو شخص مواقع عنف ولین کو نہ پہچانتا ہو اس کے لئے نرمی ہی متعین ہے۔

بس اب اسی دعا پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِيْ وَتَرٰى مَكَانِيْ وَتَعْلَمُ سِرِّيْ وَعَلَانِيَتِيْ لَا يَخْفٰى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِّنْ اَمْرِيْ وَاَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيْرُ الْمُسْتَغِيْثُ الْمُسْتَجِيْرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِيْ اَسْاَلُكَ مَسْئَلَةَ الْمِسْكِيْنِ وَاَبْتَهِلُ اِلَيْكَ اِبْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيْلِ وَاَدْعُوْكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيْرِ + دُعَاءَ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهٗ وَفَاضَتْ لَكَ عَبْرَتُهٗ وَذَلَّ لَكَ جِسْمُهٗ وَرَغِمَ لَكَ اَنْفُهٗ +

الاصول النادرة! لاصلاح الامة الحاضرة

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الذی انزل علیہ ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر الآیہ

اما بعد! آج کل عام طور پر مسلمانوں میں تبلیغ اور اصلاح نفس کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے اور اس ضرورت کے پیش نظر مختلف جماعت اپنے اپنے کام اور صواب دید کے مطابق اس خدمت کو انجام دے رہی ہیں تاہم حسب توقع کامیابی نظر نہیں آتی اور پائدار اور دیرپا اثر محسوس نہیں ہوتا. ایک طبیب کو اگر باوجود پیہم استعمال ادویہ اور پرہیز بھی مریض کے مرض میں افاقہ محسوس نہ ہو تو اس کو تشخیص اور تجویز میں نظر ثانی کرنا چاہئے. اور اگر خود تعیین مرض و دوا تک رسائی نہ ہو تو بغیر کسی عار یا استنکاف کے تجربہ کار ماہرین سے رجوع اور مشورہ کرنا چاہئے جن کی نظر امراض کے ظاہری اور باطنی اسباب پر ہو اور جن ہاتھ سے سالہا سال تک ہزاروں مریض نکل چکے ہوں. ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھانا چاہئے

چنانچہ تبلیغی امور میں پیہم ناکامی کے مشاہدہ کے بعد بعض احباب نے مرشدی و مولائی جناب مولٰنا الحاج الحافظ الشاہ **وصی اللہ** صاحب فتحپوری مدظلہ العالی سے رجوع کیا اور حضرت مخدوم مدظلہ نے نہ تنہا اپنے سالہا سال کے کامیاب تجربے بلکہ حکماء اُمت کے اقوال کی تائید کے ساتھ چند اصول تحریر فرمائے.

امید ہے کہ اگر اس وقت کام کرنے والی تبلیغی جماعتیں اور افراد ان اصولوں کو پیش نظر رکھ کر کام کریں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد اور پائدار کامیابی سے مشرف ہوں گے، وما توفیقی الا باللہ۔ فقط

بندہ ظہور الحسن غفرلہٗ کسولوی یکم ج ۲ ر ۱۳۷۱ھ

تنبیہ: ان اصولوں سے صحیح اور پورا فائدہ اسوقت ہوسکتا ہے کہ ان کا بار بار مطالعہ کیا جائے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے. خود نہ سمجھ میں آئے تو دوسروں سے سمجھ لیا جائے اور عمل کے وقت بھی گاہ گاہ اس کا مطالعہ کرکے سب اصولوں کو تازہ کرلیا جائے.

التماس از ناشر: جہاں تک یاد پڑتا ہے تالیفات میں سے حضرتؒ کی سب سے پہلی تالیف یہی رسالہ ہے۔ ——— جامی غفرلہٗ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ۔ اَمَّا بَعْدُ! چند ضروری امور یا اصول جن کا پیشِ نظر رہنا بسلسلۂ اصلاح ضروری معلوم ہوا ان کو ضبط کر دیا گیا کہ ان کا تذکرہ و تحفظ سہل ہو۔ یہاں وہ نمبر وار درج ذیل ہیں۔

سب سے پہلے اصل اصول جو کہ مدار اصلاح ہے اس اعتبار سے اس کو اصل اوّل کہا جاوے اور سب پر تقدیم کی جائے تو اس کی وہ مستحق ہے وہ ہے جو کہ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں فرمایا ہے۔ وھُوَ ھٰذَا

اصل اوّل جو اصل الاصول ہے

(انقسام القلوب فی التغیر والثبات کے بیان میں فرماتے ہیں کہ)

(القلب الثانی) القلب المخذول المشحون بالھوٰی المدنس بالاخلاق المذمومۃ والخبائث المفتوح فیہ ابواب الشیاطین المسدود عنہ ابواب الملائکۃ ومبدأ الشر فیہ ان ینقدح فیہ خاطر من الھوٰی ویھجس فیہ فینظر القلب الٰی حاکم العقل لیستفتی منہ ویستکشف وجہ الصواب فیہ فیکون العقل قد اَلِفَ خدمۃ الھوٰی وانس بہ واستمر علی استنباط الحیل وعلی مساعدۃ الھوٰی فیستولی النفس وتساعد علیہ فینشرح الصدر بالھوٰی وتنبسط فیہ ظلماتہ

(قلب ثانی) وہ قلب ہے جو خواہشات نفسانی میں انہماک کی وجہ سے مردود و مطرود ہو چکا ہو اور خباثتوں اور بداخلاقیوں سے مل کر میلا اور گندہ ہو گیا ہو۔ شیاطین کے لئے تو اس کے دروازے کھلے ہوں لیکن فرشتوں کے لئے بند ہو گئے ہوں اس قلب میں شر کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ پہلے ایک نفسانی خیال کا اس میں گذرا اور خطور ہوتا ہے پس قلب (اپنے) حاکم (یعنی) عقل کی طرف نظر کرتا ہے تاکہ اس سے اس خیال کے بارے میں استفسار اور تحقیق کر کے صحیح حال معلوم کرے کہ آیا یہ قابل التفات ہے یا نہیں، یہاں یہ حال ہوتا ہے کہ عقل پہلے ہی سے خواہشات کی غلامی کی خوگر اور اس سے مانوس ہوتی ہے، تیز حیلوں کو تراشنے اور خواہشات کی مدد کرتے اس کو ایک زمانہ گذر چکا ہوتا ہے اس لئے نفس ہی عقل پر غالب اور مستولی

لانحباس جند العقل عن مدافعته
فيقوى سلطان الشيطان لاتساع مكانه
بسبب انتشار الهوى فيقبل عليه بالتزيين
والغرور والاماني فيوحي بذلك زخرفا
من القول غرورا فيضعف سلطان الايمان
بالوعد والوعيد ويخبو نور اليقين لخوف
الآخرة اذ يتصاعد عن الهوى دخان
مظلم الى القلب يملأ جوانبه حتى تنطفي
انواره فيصير العقل كالعين التي ملأ
الدخان اجفانها فلا يقدر على ان ينظر
وهكذا تفعل غلبة الشهوة بالعقل
حتى لا يبقى للقلب مكان للتوقف
والاستبصار ولو بصره واعظ واسمعه
ما هو الحق فيه عمي عن الفهم وصم
عن السمع وهاجت الشهوة فيه وسطا
الشيطان وتحركت الجوارح على وفق
الهوى فظهرت المعصية الى عالم
الشهادة من عالم الغيب بقضاءٍ من
الله تعالى وقدره والى مثل هذا القلب
الاشارة بقوله تعالى أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ
إِلٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا ۝
أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ
إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا ۝

ہو جاتا ہے اور اس نفسانی خیال کا اس کو خیرت صدمہ ہو جاتا
ہے پھر اس کی تاریکیاں قلب میں خوب پھیل جاتی ہیں کیونکہ
عقل کا لشکر اس کی مدافعت سے قاصر ہو جاتا ہے (اور وہ
لشکر مدافعت ہی کیا کر سکتا ہے جس کا سالارِ اعظم دشمن سے
مل چکا ہو) آخر کار شیطان کی سلطنت قوی ہو جاتی ہے
کیونکہ خواہشات نفسانیہ کے قلب میں پھیل جانے کی وجہ سے
اس کی حدود حکومت وسیع ہو جاتی ہے۔ بعد اس کے خواہشات
نفسانیہ بن سنور کر (فاتحانہ) غرور کے ساتھ امید اور آرزو
لئے ہوئے عقل کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اس کو مزخرفات
(ملمع کئے ہوئے) اور دھوکے کی باتوں کا سبز باغ دکھاتی
ہے پس اللہ کے وعدوں اور وعیدوں (کو سچ جاننے والی)
ایمانی حکومت کمزور ہو جاتی ہے اور خوف آخرت کے یقین
کا نور ماند پڑ جاتا ہے کیونکہ خواہشات نفسانیہ کا کالا دھواں
نکل کر قلب کی طرف جاتا ہے اور اس کے اطراف و جوانب کو
محیط ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا نور بجھ جاتا ہے اس وقت
عقل کی مثال اس آنکھ کے مانند ہو جاتی ہے جس کی پلکیں دھوئیں
سے بھر گئی ہوں اور وہ دیکھنے سے عاجز رہ گئی ہو۔ بالکل یہی
معاملہ غلبۂ شہوت بھی کرتا ہے عقل کے ساتھ یہاں تک کہ قلب
میں سمجھنے اور دیکھنے کی قوت نہیں باقی رہتی اور اگر کوئی واعظ
اور ناصح اس کو حق بات دکھانا یا سنانا چاہے تو اس کے سمجھنے اور
سننے سے اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے شہوات ابھر آتی ہیں اور شیطان
اس پر غالب ہو جاتا ہے اور اعضاء بھی خواہشات ہی کی موافقت
میں حرکت کرتے ہیں پس معصیت بمقتضاء قضا و قدر عالم الغیب

وبقوله عز وجل لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰى أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وبقوله تعالىٰ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ورُبَّ قلبٍ هٰذا حاله بالاضافة الىٰ بعض الشهواة كالذى يتورع عن بعض الاشياء ولكنه اذا رأى وجهاً حسناً لم يملك عينه وقلبه وطاش عقله وسقط امساك قلبه او كالذى لايملك نفسه فيمافيه الجاه والرياسة والكبر ولا يبقى معه مسكة للتثبت عند ظهور اسبابه او كالذى لايملك نفسه عند الغضب مهما استحقر وذكر عيب من عيوبه او كالذى لايملك نفسه عند القدرة على اخذ درهم او دينار بل يتهالك عليه تهالك الواله المستهتر فنسى فيه المروة والتقوى فكل ذلك لتصاعد دخان الهوىٰ الى القلب حتى يظلم وتنطفى عنه انواره فينطفى نور الحياء والمروة والايمان ويسعىٰ فى تحصيل مراد الشيطان۔

سے عالم شہود میں ظاہر ہو جاتی ہے اور ایسے ہی قلب کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے (ترجمہ) اے پیغمبر اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے سو کیا آپ اُن کی نگرانی کر سکتے ہیں یا آپ خیال کرتے ہیں کہ انہیں اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں یہ تو محض چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں اور قول عز وجل ان میں اکثر لوگوں کو پر بات ثابت ہو چکی ہے سو یہ لوگ ایمان نہ لاویں گے اور قول باری تعالیٰ کا کہ برابر ہے ان کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ لوگ ایمان نہ لاویں گے (یہ حال ان قلوب کا ہے جو خارج از اسلام ہیں اور انہیں کسی چیز کی قابلیت باقی نہ رہی) اور بعض قلوب کا بعض شہوات کے لحاظ سے ایسا ہی حال ہے (کہ گو وہ خارج از اسلام نہ ہوں مگر فاسق اور اشد فاسق ہیں کہ بعض شہوات میں انکا حال ان ہی مذکورہ اشخاص کے موافق ہے) مثلاً کوئی شخص کسی برائی سے اجتناب کرتا رہتا ہے لیکن جب کسی حسین چہرہ کو دیکھ لیتا ہے تو پھر اپنی آنکھ اور دل پر قابو نہیں پاتا اس کی عقل اڑ جاتی ہے اور قلب کی روک اور گرفت چھوٹ جاتی ہے یا مثلاً وہ شخص جس کو اپنے نفس پر جاہ و ریاست اور کبر کے مواقع میں قدرت نہ ہو اور ان امور کے اسباب کے پائے جانے کے وقت ثابت قدم رہنے (اور اسمیں مبتلا نہ ہونے) کی اسے قدرت نہ ہو یا جیسے کوئی شخص اپنے نفس پر قابو نہ پائے جس وقت کہ اس کی تحقیر کی جائے اور اس کے عیوب میں سے کوئی کوئی عیب بیان کیا جائے یا جیسے کوئی شخص روپیہ پیسہ کی تحصیل کے وقت اپنے نفس پر قادر نہ ہو بلکہ ایک بے صبرے عاشق کی طرح اس پر اس طرح ٹوٹ کر گرے کہ مروت اور تقویٰ کو بالکل بھول ہی جائے جس طرح بے صبرا عاشق معشوق کو

پاکر تقویٰ فراموش کر دیتا ہے یہ ساری باتیں اس لئے وقوع میں آتی ہیں کہ خواہشات نفسانی کا دھواں قلب کی طرف چڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کو بالکل تاریک کر دیتا ہے جس کی وجہ سے قلب کے انوار ماند پڑ جاتے ہیں اس کے بعد حیا رخصت مروت اور ایمان کا نور بھی بجھ جاتا ہے اور نفس شیطان کی مراد کی تحصیل میں کوشش کرنے لگ جاتا ہے

اصل دوم

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ قوت علمیہ وعملیہ دونوں قریب قریب معطل ہیں (اور اس کی وجہ یہ ہے کہ) اصلاح موقوف ہے احساس صحیح پر اور احساس صحیح کا حصول موقوف ہے اہل احساس صحیح کے اقوال اور احوال پیش نظر رکھنے اور ان کے اتباع صادق پر۔ اور آج کل اس کا اہتمام نہیں بلکہ اس کی ضرورت ہی مسلم نہیں۔

اصل سوم

تجربہ سے یہ بات ظاہر ہے کہ اہل تعطل (یعنی بیکار لوگوں) کی جبتک خاص طور پر نگرانی نہ کیجائے (وہ از خود) کام نہیں کر سکتے کیونکہ احساس کے فقدان (یعنی نہ ہونے) سے کام اور اس کے منافع کی کوئی قدر ان کو نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کام کرنے سے اس کے منافع کا اذعان (یعنی یقین) اور احساس ہوتا ہے پھر اسوقت قدر ہوتی ہے (اور ان کو ابھی کام ہی کی نوبت نہیں آئی پھر قدر کیسے ہو)

اصل چہارم

یہ بات بھی تجربہ سے معلوم ہوئی کہ علماء فکر معاش کی وجہ سے کام نہیں کر سکتے (اس لئے کہ اول تو آج کل ہمت ضعیف ہے پھر طلب صادق نہیں لہذا طلب آخرت کے موانع (یعنی حصول معاش) میں پڑ کر آخرت سے بیکار ہو جاتے ہیں، پس جبتک قوم کی طرف سے ان کو فکر معاش سے بیفکر نہ کیا جائے گا خدمت دین کا کام نہیں کر سکتے (مشغلۂ معاش کے لحاظ سے) اگرچہ (وہ کسی مدرسۂ دینیات کے مدرس ہی کیوں نہ ہوں یا بزرگان دین سے تعلق بھی کیوں نہ رکھتے ہوں یا بزعم خود تعلق کا دعویٰ بھی کرتے ہوں تاہم وہ فارغین کی طرح خدمت دین انجام نہیں دے سکتے اور ان کا دعویٰ بے حقیقت ہوگا ؎

وجائزة دعوی المحبة فی الهوی　　ولکن لا یخفی کلام المنافق

(ترجمہ) عشق میں محبت کا زبانی دعویٰ تو بہت آسان ہے اور ہر ایک کیلئے ممکن ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ منافق کا

اصل پنجم

کام ہوتا ہے اخلاص سے اور ہم میں اخلاص نہیں ہے محض دعویٰ سے مخلصین کی برابری کرتے ہیں حالانکہ خدا مخلص اور غیر مخلص کو برابر نہیں کرتا جبتک (ہم ریا و نمود سے تصفیۂ قلب کرکے) اہل اخلاص (میں سے نہ ہوں گے کام نہیں ہوگا اور ہر ادارہ میں ہر مرکز میں ان (اہل اخلاص) کی سخت ضرورت ہے:

اصل ششم

طلبہ میں علم کی کمی کا اصلی سبب یہ ہے کہ اہل علم کو اور اساتذہ کو (الا ماشاء اللہ) خود علم کا صحیح ذوق نہیں تو پھر شاگردوں کو کیا خاک ذوق پیدا ہوگا (اساتذہ کی طرح شاگردوں کو بھی) کسی فن سے ادنیٰ مناسبت نہیں ہوتی۔ علم کے ضیاع کا اصلی سبب یہ ہے اور یہی سبب ہے عمل کے ضیاع کا۔

اصل ہفتم

عوام علماء کی طرف اس وقت تک ہرگز رجوع نہیں کرسکتے جبتک ان میں تدین خاص نہ دیکھیں گے اور یہ (تدین خاص) ان کے صفات محمودہ اور اخلاق فاضلہ پیدا کرنے سے ہوسکتا ہے منجملہ ان صفات حمیدہ کے جن سے وہ مقتدا اور مرجع خلائق بن سکتے ہیں، استغنا ہے اور طمع و کبر کا نہ ہونا ہے۔

اصل ہشتم

اس زمانہ میں بہت سے لوگوں نے صلاح نفس کو برباد کرکے بہم آزادی و مطلق العنانی و بد سلیقگی و بد معاملگی و بد عہدی و بد خلقی اور بد انتظامیوں سے اپنے کو ایسا ضائع کیا ہے کہ اب نہ تو وہ معاش ہی کے قابل رہے اور نہ معاد کے، اس لئے کہ ان کی قوت عملیہ ہی بیکار ہوگئی اور وہ اپنے نفس کے ہاتھوں تباہ ہوگئے، فریب نفس پر ان کو تنبہ ہو تب دونوں (دنیا و آخرت) کی تعمیر ممکن ہے ایسے لوگوں کی اصلاح ہر شخص کا کام نہیں بلکہ ماہر مصلح ہی کرسکتا ہے کہ وہی ان کے فریبوں پر انھیں مطلع کرکے راہ پر لگا سکتا ہے اور وہی ان کو اس ہلاکی سے نکال سکتا ہے اور گئی ہوئی قوت عملیہ واپس دلا سکتا ہے جس سے معاش اور

معاد دونوں منتظم ہو سکتے ہیں اور فلاح دارین حاصل ہو سکتی ہے۔

اصل نہم

اصلاحِ نفس بغیر سیاست (تربیت) ناممکن ہے اور فی زماننا طالبین کی حالت یہ ہے کہ غلبۂ نفس اور ہوئی وہوس سے نفس کے خلاف ادنیٰ بات بھی گوارا نہیں ہوتی گو علماءِ دین و مفتیان شرع متین ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو۔ دیکھا جاتا ہے کہ علماءِ حق کو حق بات کہنے پر طرح طرح سے بدنام کیا جاتا ہے اور اس بدنام کرنے میں عوام کے ساتھ ان کے ہم مشرب علماء بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ فیا حسرتاہ دیا ویلتاہ و یا مصیبتاہ۔

اصل دہم

آجکل دیکھا جاتا ہے کہ مریدین و طالبین قرب مشائخ ڈھونڈتے ہیں ان میں سے بعض مریدین کا تو مقصود ہی دین اور خدا تک پہنچنا نہیں ہوتا بلکہ مشائخ ہی مقصود ہوتے ہیں یا کچھ دنیوی اغراض ہوتی ہیں، لہٰذا ان کے اس فعل کو جنون اور خود ان کو مجنون کہنا بعید نہ ہوگا۔ اور جن مریدوں کا مقصود دین ہوتا ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں، بعض تو اس کو قرب شیخ، انقیاد و اتباع کامل اصلاح اعمال و اخلاق اور طلب صادق کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں، جو سراسر محمود و مقصود اور مطلوب ہے۔ اور بعض کی نیت گو قرب مشائخ سے دین ہی ہوتی ہے لیکن وہ اس کے حصول کے لئے اتباع، انقیاد، اطلاع حالات اور اصلاح کو ذریعہ نہیں بناتے بلکہ محض ظاہری ورسمی حاضر باشی، دست بوسی، نذرانہ گذاری اور تملق و چاپلوسی تک ان کا ذریعہ محدود رہتا ہے۔ ایسا تعلق اور قرب غیر محمود ہے اور ایسا طالب، طالب کاذب ہے اس کو اگر مجنون نہ کہا جائے تو یہ شخص احمق ضرور ہے۔ اس لئے کہ اس کا مطلوب صحیح اور محمود ہے۔ لہٰذا اس کو مجنون نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس کے حاصل کرنے کا طریقہ اس نے غلط اختیار کیا ہے اس لئے اس کے احمق ہونے میں تو کلام ہی نہیں ہے جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

والفرق بین الحمق والجنون ان الاحمق مقصودہ صحیح ولکن سلوکہ الطریق فاسد فلا تکون لہ رویۃ صحیحۃ	حماقت اور جنون میں فرق یہ ہے کہ احمق کا مقصد تو صحیح ہوتا ہے لیکن اس کا طریق کار غلط ہوتا ہے پس اس کے لئے (یعنی اس شخص کے لئے جو مجنون ہو)

فی سلوک الطریق الموصل فی الغرض واما المجنون فانہ یختار ما لا ینبغی ان یختار فیکون اصل اختیارہ وایثارہ فاسداً۔ (احیاء العلوم ص۳)

قطعی اصابت رائے نہیں ہوتی اس راستہ کے اختیار کرنے میں جو مقصود تک پہنچانے والا ہو۔ اور مجنون تو ایسی چیز کو اختیار کرتا ہے جس کو اختیار نہ کرنا چاہئے پس اس کا انتخاب اور اختیار ہی سرے سے فاسد ہو جاتا ہے۔

اضافہ از ناقل حاصل یہ ہے کہ انسان تین طرح کے ہوتے ہیں۔ عاقل، احمق، اور مجنون۔ عاقل وہ ہے جس کا مقصد اور طریق کار دونوں صحیح ہوں۔ احمق وہ ہے جس نے کسی صحیح مقصد کی خاطر غلط طریق کار اختیار کر رکھا ہو۔ اور مجنون وہ ہے جس کا کوئی صحیح مقصد ہی نہ ہو۔ پس اس طریق میں بھی عاقل وہ شخص ہے جس کا مقصود خدا تعالیٰ تک پہنچنا ہو اور اس کا طریق اس نے انقیاد واتباعِ شیخ کامل کو بنایا ہے۔ اور اگر مقصود حق تعالیٰ ہی ہیں لیکن طریق کار شیخ سے صرف رسمی تعلقات اور اس کی چاپلوسی وغیرہ تجویز کیا ہے تو یہ شخص احمق ہے۔ اور وہ شخص جس کا مطلوب ہی شیخ ہو، خدا تک پہنچنا اس کا مقصد ہی نہ ہو وہ مثل مجنون کے ہے کیونکہ اس کا انتخاب ہی سرے سے فاسد ہے ـــــ انسان کی ان ہی دونوں پہلی قسموں کا تذکرہ اس حدیث میں ہے:۔

عن شداد بن اوسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت۔ العاجز من اتبع نفسہ ھواھا وتمنی علی اللہ الامانی۔ رواہ الترمذی واحمد والحاکم وابن ماجہ (الادب النبوی ص۲۲۵)

حضرت شداد بن اوسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیس (یعنی عاقل تجربہ کار اور عاقبت اندیش) وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس کو ذلیل اور پامال کر کے اس پر قابو پالیا ہو اور عمل (واہتمام) کیا ہو مرنے کے بعد (والی زندگی) کے لئے (یعنی خالق ومخلوق، نفس، اہل وعیال اور اپنی قوم کا حق ادا کر کے بعث وحشر، حساب کتاب سزا وجزا کی تیاری کرلی ہو) اور عاجز (یعنی واجبات میں کوتاہی کرنے والا) وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس سے خواہشات کی اتباع کرائی ہو (پس اپنی شہوات کا ایسا تابع ہو گیا ہو کہ اس کے ہر حکم پر لبیک کہتا ہو۔ یہی شخص مستحق ہے اس کا کہ اس کو احمق کہا جائے) اور اس کی حماقت میں اضافہ ہو جاتا ہے اس بات سے کہ یہ شخص کچھ نہ کرنے کے باوجود) اللہ تعالیٰ سے اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کے ملنے کی امید لگائے بیٹھا ہے (اور اپنی بے عملی و بے راہ روی کے متعلق اپنے دل کو کبھی یوں تسلی دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ بڑے غفور ورحیم ہیں اور کبھی اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے

اور کبھی یہ خیال کر لیتا ہو کہ اخیر عمر میں گناہوں سے توبہ کر لیں گے اور تلافی مافات کریں گے حالانکہ اس مسکین کو یہ نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو لکھی ہوئی ہے (صرف) ان لوگوں کے لئے جو اس سے ڈرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں اور اسکے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے ہیں نیز اس مغفل نے یہ بھی نہ جانا کہ موت کا کیا اعتبار کہ کب آجائے کتنے جوان العمر طاقتور اور تندرست لوگ موت کا نشانہ بن چکے ہیں (الحاصل کام کچھ نہ کرنا اور ثمرات کا منتظر رہنا ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ اور اس کا قائل کسی احمق سے کم نہیں ہے)

اسی قسم کی تمنا کے متعلق قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے:۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ الآیہ۔ نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے (کہ خالی خولی زبان سے اپنے فضائل بیان کیا کریں، بلکہ مدار کار طاعت پر ہے۔ پس جو شخص طاعت میں کمی کرے گا اور) کوئی برا کام کرے گا (خواہ از قسم عقائد ہو یا از قسم اعمال) وہ اس کے عوض میں سزا دیا جائے گا (تفسیر بیان القرآن ص ۱۵۹/۲)

اصل یازدہم

(سوانح حیات مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مضمون ان اصول کے مناسب معلوم ہوا لہٰذا وہ بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے):۔

"اس زمانہ میں لوگوں کی ہمتیں ریاضات میں مشقت اٹھانے سے پست ہوگئیں آرام طلبی کا نفس خوگر ہوگیا اور جاہ طلبی انسان کے لئے جبلی اور فطری امر ہے، اگر علماء کی جماعت میں ہوئے تو خیال یہ پیدا ہوا کہ ہمیں لوگ ایسی نظر سے دیکھیں جس نظر سے علماء باللہ کو دیکھتے ہیں۔ اگر مشائخ وصوفیہ کے لباس میں ہوئے تو اس کی ہوس پیدا ہوئی کہ اسطرح مانے جائیں جس طرح جنیدؒ و شبلیؒ و بایزیدؒ مانے جاتے تھے۔ ادھر افعال، عادات، مجاہدات کو دیکھا تو مطلع صاف۔"

اصل دوازدہم

قال امام الغزالیؒ فی کتاب الامر بالمعروف امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں امر بالمعروف

والنهی عن المنکر من ربع العادات الثانی من کتب احیاء العلوم الدین بعد الحمد والصلوٰۃ - هٰذہ عبارتہٗ

امابعد فان الامر بالمعروف و النهی عن المنکر هو القطب الاعظم فی الدین وهو المهم الذی انبعث الله له النبیین اجمعین ولوطوی بساطه واهمل عمله لتعطلت النبوة واضمحلت الدیانة وعمت الفترة وفشت الضلالة وشاعت الجهالة واستشری الفساد واتسع الخرق وخربت البلاد وهلك العباد وان لم یشعروا بالهلاك الایوم التناد و قد کان الذی خفنا ان یکون، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ، اذ قد اندرس من هذا القطب عمله وعلمه وانمحی بالکلیة حقیقته ورسمه واستولت علی القلوب مداهنة الخلق وانمحت عنها مراقبة الخالق واسترسل الناس فی اتباع الهوی والشهوات استرسال البهائم وعز علی بساط الارض مومنٌ صادقٌ لاتاخذہ فی الله لومة لائم

اور نہی عن المنکر کے بیان میں بعد حمد وصلوٰۃ کے فرمایا ہے ۔ عبارت یہ ہے کہ

:-

امابعد بلاشبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دین میں قطب اعظم ہے اور یہی وہ مہم ہے جس کیلئے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا ہے اگر اس کا بساط تہ کر دیا جائے اور اس کا علم وعمل مہمل بنا دیا جائے تو نبوت معطل ہوجائے (یعنی اس کا اب کوئی کام ہی نہ رہ جائے) اور دیانت مضمحل ہوجائے (کیونکہ دیانت معروف ومنکر میں منحصر ہے) سستی وتکاسل (اعمال میں) عام ہوجائے ۔ جہالت اور فساد شائع وساری ہوجائے اور خروق اور اختلاف کی خلیج وسیع ہوجائے اور ملک خراب ہوجائے تمام لوگ ہلاک ہوجائیں اگرچہ وہ اپنی ہلاکت کو قیامت سے پہلے نہ سمجھیں (بالآخر) جس کا ہمیں خوف تھا وہ ہو کر رہا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ اس لئے کہ اس قطب اعظم کا علم وعمل محو ہوگیا اور اس کی حقیقت اور رسم تک مٹ گئی، قلوب پر مداہنت خلق کا استیلاء وتسلط ہوگیا اور خالق کا مراقبہ قلوب سے محو ہوگیا، لوگ اتباع ہوا میں ایسے پڑ گئے جیسے بہائم چھوٹ کر کھیت میں پڑ جاتے ہیں اور ساری روئے زمین پر ایسا مؤمن صادق نادر الوجود ہوگیا جسکو حق تعالیٰ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ ہو۔

اصل سیزدہم

قال صاحب روح المعانی تحت قوله تعالیٰ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ الآية - ثم ان هذا التوبيخ والتقريع وان كان خطابا لبني اسرائيل الا انه عام من حيث المعنى لكل واعظ يأمر ولا يأتمر ويزجر ولا ينزجر ينادي الناس البدار البدار، ويرضى لنفسه التخلف والبوار يدعو الخلق الى الحق و ينفر عنه ويطالب العوام بالحقائق و لا يشم ريحها منه وهذا هو الذي يبدأ بعذابه قبل عبدة الاوثان ويعظم ما يلقى لوفور تقصيره يوم لا حاكم الا الملك الديان وعن محمد بن واسع قال بلغني ان اناسا من اهل الجنة اطلعوا على ناس من اهل النار فقالوا لهم قد كنتم تأمروننا باشياء عملناها فدخلنا الجنة قالوا كنا نأمركم بها ونخالف الى غيرها

آیت شریفہ اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم کے تحت صاحب روح المعانی نے فرمایا ہے کہ اس توبیخ و سرزنش میں اگرچہ بظاہر خطاب بنی اسرائیل کو ہے لیکن درحقیقت یہ ہر شخص کے لئے عام ہے جو دوسرے کو باز رکھے اور خود باز نہ رہے، لوگوں کو پکارے کہ (اعمال حسنہ میں) جلدی کرو جلدی کرو اور خود پسماندگی اور ہلاکت پر راضی رہے مخلوق کو حق کی دعوت دے اور خود اس سے گریز کرے عوام سے حقائق کا مطالبہ کرے اور خود اسکی ہوا بھی نہ لگی ہو یہی وہ شخص ہے کہ بت پرستوں کے عذاب سے قبل اس کو عذاب دیا جائے گا۔ اور چونکہ اس کی تقصیر بڑی ہے اس لئے اس کو سزا بھی بڑی ملیگی جسدن کہ کوئی حاکم نہ ہوگا بجز ملک دیان کے۔ محمد بن واسعؒ سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ جنت کے کچھ لوگ بعض اہل نار کو دیکھیں گے پس ان سے کہیں گے تم لوگوں نے ہمیں باتیں بتائی تھیں جن پر عمل کر کے ہم جنت میں داخل ہو گئے (پھر تم لوگ دوزخ میں کیسے پڑے ہو) وہ لوگ جواب دینگے کہ جن باتوں کا ہم تم کو حکم کرتے تھے خود اس کے خلاف کرتے تھے اس لئے ہمارا یہ حشر ہوا۔

اصل چہاردہم

(الوظيفة الثامنة) ان يكون المعلم عاملا بعلمه فلا يكذب قوله فعله لان

معلم کا آٹھواں وظیفہ یہ ہے کہ اپنے علم پر عامل ہو اس کا فعل اس کے قول کی تکذیب نہ کرے اس لئے کہ علم

العلم يدرك بالبصائر والعمل يدرك بالابصار وارباب الابصار اكثر فاذا خالف العمل العلم منع الرشد وكل من تناول شيئا وقال للناس لا تتناولوه فانه سم مهلك سخر الناس به واتهموه وزاد حرصهم عليه فيقولون لولا انه اطيب الاشياء والذها لما كان يستأثر به ومثل المعلم المرشد من المسترشدين مثل النقش من الطين والظل من العود فكيف ينقش الطين بما لا نقش فيه ومتى استوى الظل والعود اعوج واذا اعوج العود اعوج الظل ولذلك قيل في المعنى ؎

لا تنه عن خلق وتاتي مثله
عار عليك اذا فعلت عظيم

وقال الله تعالىٰ اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسكم ولذلك كان وزر العالم في معاصيه اكبر من وزر الجاهل اذ يزل بزلته عالم و يقتدون به ومن سن سنة سيئة فعليه وزرها ووزر من عمل بها ولذلك قال علیؓ قصم ظهري رجلان عالم متهتك وجاهل متنسك فالجاهل

کا ادراک تو باطنی آنکھ سے ہوتا ہے اور عمل ظاہری آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور ظاہری آنکھ والے بہ نسبت باطنی کے زیادہ ہیں (تو ہو سکتا ہے کہ علم کا ادراک نہ ہو اور عمل کا ادراک ہو جائے) پس اگر عمل علم کے خلاف ہوگا تو ہدایت سے مانع ہوگا اور جو شخص خود تو کوئی کام کرے اور لوگوں سے کہے کہ تم نہ کرو تو یہ سم قاتل ہے لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے اور اسکو متہم گردانیں گے اور اس چیز کے کرنے پر انکی حرص زیادہ ہوگی، یہ خیال کرتے ہوئے کہ اگر یہ کوئی پسندیدہ اور اچھی چیز نہ ہوتی تو وہ خود کیوں کرتا۔ اور مثال ہدایت کرنے والے معلم اور اس سے ہدایت حاصل کرنیوالوں کی ایسی ہے جیسے نقش اور مٹی اور سایہ اور لکڑی پس گندھی ہوئی مٹی کو کیونکر نقش کیا جا سکتا ہے ایسے سانچے سے جس میں نقش نہ ہو اور سایہ کیسے سیدھا ہو سکتا ہے جبکہ لکڑی ہی ٹیڑھی ہو، جب لکڑی ٹیڑھی ہوگی ظاہر ہے کہ سایہ بھی ٹیڑھا ہوگا اور اسی معنی میں یہ شعر ہے (ترجمہ) "ایسا نہ کرو کہ ایک بات سے دوسروں کو منع کرو اور خود اسے کرو، اگر ایسا کیا تو تمہارے لئے یہ بڑی شرم کی بات ہے" اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کیا غضب ہے کہ کہتے ہو لوگوں کو نیک کام کرنیکو اور اپنی خبر نہیں لیتے اسی واسطے عالم کے گناہ کا وبال جاہل کے گناہ سے زیادہ ہے کیونکہ اس کی لغزش سے ایک دنیا کو لغزش ہو جاتی ہے اور لوگ اسکی اقتدا کرتے ہیں اور حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص کوئی برا طریقہ ایجاد کرے تو اس پر اپنا وبال بھی ہوگا۔ اور ان لوگوں کا وبال بھی ہوگا جن لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے، اسی واسطے حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ میری کمر دو

یغر الناس بتنسکه والعالم یغرھم بھتکه واللہ اعلم (احیاء العلوم ج۱ ص۱۶)

آدمیوں نے توڑ رکھی ہے ایک عالم جو حکم شرعی کی پروانہ کرتا ہو بیحرمتی اور ہتک کرتا ہو، اور دوسرا عبادت گزار جاہل، جاہل اس لئے کہ لوگ اس کی عبادت سے دھوکے میں پڑینگے اور عالم اس لئے کہ اپنی بے عملی سے لوگوں کو دھوکہ میں ڈالے گا۔ واللہ اعلم بالصواب)

اصل پانزدہم

وفی تبیین المحارم لاشك فی فرضیة علم الفرائض الخمس وعلم الاخلاص لان صحة العمل موقوفة علیه وعلم الحلال والحرام وعلم الریاء لان العابد محروم من ثواب عمله بالریاء وعلم الحسد والعجب اذھما یاکلان العمل کما تاکل النار الحطب وعلم البیع والشراء والنکاح والطلاق لمن اراد الدخول فی ھذہ الاشیاء وعلم الالفاظ المحرمة اوالمکفرة ولعمری ھذا من اھم المھمات فی ھذا الزمان لانك تسمع کثیرا من العوام یتکلمون بما یکفرھم عنھا غافلون والاحتیاط ان یجدد الجاھل ایمانه کل یوم ویجدد نکاح امرأته عند شاھدین فی کل شھر مرة اومرتین اذ الخطاء ان لم یصدر من الرجل فھو من النساء کثیر (شامی ج۱ ص۳۰)

تبیین المحارم میں لکھا ہے کہ فرائض خمسہ (یعنی ارکان اسلام کلمہ توحید، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) کا علم حاصل کرنا فرض ہے اور علم الاخلاص (کے حاصل کرنے کا طریقہ جاننا) بھی فرض ہے اس لئے کہ عمل کی صحت اسی پر موقوف ہے (اسی طرح) حلال وحرام کا علم بھی ضروری ہے) اور ریاء کا علم بھی فرض ہے اس لئے کہ عبادت کرنیوالا اسی ریار کی وجہ سے عمل کے ثواب سے محروم رہتا ہے حسد اور عجب کا علم بھی فرض ہے کیونکہ یہ دونوں عمل کو اس طرح سے کھا کر ختم کر دیتے ہیں جس طرح آگ لکڑی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے) نیز خرید و فروخت نکاح وطلاق کے مسائل کا علم ہر اس شخص کیلئے ضروری ہے جس کو ان امور سے سابقہ پڑتا ہو، اسی طرح الفاظ محرمہ اور کلمات کفریہ کا جاننا بھی فرض ہے اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس آخری چیز کا علم اس زمانہ میں ایک اہم المھمات میں سے ہے۔ اس لئے کہ تم بہت سے عوام کو کلمات کفریہ زبان سے نکالتے سنو گے اور ان غریبوں کو اس کا پتہ بھی نہیں ہوتا۔ پس احتیاط یہ ہے کہ جاہل (اور عامی شخص)، اپنے ایمان کی ہر روز تجدید کر لیا کرے اور دو گواہوں کے سامنے ہر مہینہ میں ایکبار یا دو بار اپنے نکاح کی بھی تجدید کر لیا کرے اس لئے کہ اس قسم کی غلطیاں اگر مرد سے نہ بھی واقع ہوں تاہم عورتوں سے

بکثرت وقوع میں آتی رہتی ہیں۔

اصل شانزدہم

اخبرنا عبد الملک بن سلیمان ابو عبد الرحمن الانطاکی عن عباد بن عباد الخواص الشامی ابو عتبۃ قال امّا بعد اعقلوا و العقل نعمۃ فرب ذی عقل قد شُغِل قلبہ بالتعمق فیما ھو علیہ ضرر عن الانتفاع بما یحتاج الیہ حتی صار عن ذلک ساھیاً و من فضل عقل المرء ترک النظر فیما لا نظر فیہ حتی لا یکون فضل عقلہ وبالاً علیہ فی ترک منافسۃ من ھو دونہ فی الاعمال الصالحۃ

خبر دی ہمیں ابو عبد الرحمن عبد الملک بن سلیمان انطاکی نے بیان کرتے ہوئے ابو عتبہ عباد بن عباد شامی سے کہ انھوں نے فرمایا، اما بعد! (اے لوگو) عقل اور سمجھ سے کام لو اور جان لو کہ) عقل ایک بڑی نعمت ہے، مگر بہت سے عقل والے ایسے بھی ہیں کہ ان کا قلب مضر اشیاء میں شغف کے ساتھ مشغول ہونیکی وجہ سے اپنی مفید و ضروری چیزوں سے بھی منتفع ہونے سے قاصر ہوگیا ہے یہاں تک کہ (وہ قلب گویا) ان مفید چیزوں کو بھول ہی گیا ہے۔ انسان کے کمال عقل سے یہ بات ہے کہ وہ کسی ایسی چیز میں غور و خوض نہ کرے جو قابل توجہ و التفات نہو تاکہ اس کی زیادتی عقل اسپر وبال نہو جائے (کسی ایسے موقع میں جو محتاج نظر و توجہ ہو مثلاً) اس شخص سے مناقشہ اور تعرض ترک کرنے میں جو اپنے سے اعمال صالحہ میں کم ہو (کہ یہ محل نظر ہے کیونکہ ممکن ہے کہ اسکی عقل ایسے شخص سے مناقشہ کرنے میں تردد کرے اور عجب نہیں کہ مناقشہ ہی کو اچھا سمجھے حالانکہ عقل کا فیصلہ ہونا یہ چاہئے کہ اس سے تعرض نہ کیا جائے اس لئے کہ اعمال صالحہ کی کمی ایک ایسی عملی کوتاہی ہے جو مناقشہ کی اجازت نہیں دیتی ورنہ اگر ایسی بات پر بھی مناقشہ کا دروازہ کھولا جائے گا تو دنیا فتنہ و فساد سے بھر جائے گی پس اگر اس نے سمجھ سے کام نہ لیا بلکہ عقل کی تیزی کی وجہ سے ایسے شخص سے بھڑ گیا، یہی عقل کا وبال ہونا ہے۔

او رجل شغل قلبہ ببدعۃ قلد فیہا دینہ رجالاً دون اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یا (متردد ہو) ایسے شخص سے مناقشہ ترک کرنے میں جس کا قلب کسی ایسی بدعت کیساتھ مشغول ہو جسمیں اس نے اپنے دین کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے علاوہ دوسرے اشخاص کا تابع بنا دیا ہو (یہ مقام بھی قابل توجہ ہے اس میں بھی عقل کو وبال ہونے

بچانا چاہئے یعنی عقل اگر ایسے شخص سے مناقشہ کو روکے اور مصالح دکھلاکر ترک کو ترجیح دے تو اس کو ترک نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس شخص کی یہ اعتقادی خرابی ہے اگر اس کا انسداد نہ کیا گیا تو دنیا میں بدینی کا دور دورہ ہوجائیگا ایسی صورت میں اس کا مناقشہ نہ کرنا بھی عقل کے وبال ہونے کا مصداق ہے

او اکتفی بارائه فیما لایری الهدی الا فیها ولایری الضلالة الا فی ترکها یزعم انه اخذها من القرآن وهو یدعو الی فراق القرآن فما کان للقرآن حملة قبله وقبل اصحابه یعملون بمحکمه ویؤمنون بمتشابهه وکانوا منه علی منار اوضح الطریق وکان القرآن امام رسول الله صلی الله علیه وسلم وکان رسول الله صلی الله علیه وسلم اماما لاصحابه وکان اصحابه ائمة لمن بعدهم رجال معروفون منسوبون فی البلدان متفقون فی الرد علی اصحاب الاهواء مع ما کان بینهم من الاختلاف وتسکع اصحاب الاهواء بارائهم فی سبل مختلفة جائرة عن القصد مفارقة للصراط المستقیم فتوتهت بهم ادلائهم فی مهامة مضلة فامعنوا فیها متعسفین فی هیأتهم کلما احدث لهم الشیطان بدعة فی ضلالتهم انتقلوا منها الی

یا ایسے شخص سے (مناقشہ کرنے میں متردد ہو) جس نے اپنی رائے پر اکتفاء (اور اعتماد) کیا ہو ایسے (اہم) مسائل (منقولہ) میں کہ ہدایت اسی میں منحصر ہو اور ترک اس کا موجب ضلالت ہو (اور عقل کی وہاں دسترس نہو اور نہ عقل کا حکم معتبر ہو) اس کا خیال تو یہ ہو کہ اس نے اس مسئلہ کو قرآن سے اخذ کیا ہے حالانکہ (حقیقۃً) وہ قرآن کو چھوڑنے کی دعوت دے رہا ہے (کیونکہ وہ خود اس کا مخترع ہے اور قرآن کے خلاف ہے) (یہ شخص جو مدعی ہے فہم قرآن کا اس سے دریافت کرنا چاہئے کہ) کیا قرآن کے پڑھنے اور سمجھنے والے اس کے اور اس کے ساتھیوں سے پہلے کچھ لوگ ایسے نہیں گزرے ہیں جو اس کے محکم پر عامل رہے اور اس کے متشابہات پر ایمان رکھتے ہوں اور اس (قرآن) کے اعتبار سے ایک واضح راستہ کے منارہ پر فائز رہے ہوں (بیشک ایسے لوگ گزرے ہیں دیکھو) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امام قرآن تھا اور وہ (آپؐ) صحابہ کے امام تھے اور صحابہ کرام بعد میں ہونے والے سب لوگوں کے امام تھے اور تمام بلاد میں مشہور و معروف تھے اور سب کے سب اہل اہوا کو رد کرنے میں متحد تھے باوجود اس کے کہ ان اہل اہواء میں آپس میں خیالات کا اختلاف بھی تھا اور وہ لوگ اپنی اپنی رائے اور خیالات کو لیکر ایسے مختلف راستوں میں حیران تھے جو میانہ روی سے دور اور صراط مستقیم کے بالکل مخالف تھے۔ ان

۔ الی غیرهم او نهم لم یطلبوا انزال الاهین لم یقتدوا بالائمه ... عن عمر انه قال ... الخ

اہل اہواء کے رہنما سُست اور کمزور ہو کر ایک گمراہ کن (حالت کے) وسیع میدان میں پڑ گئے اور اسی طرح واقع ہو گئے درآنحالیکہ وہ اپنی اس حالت میں بلاسوچے سمجھے داخل ہونے والے تھے اور جب بھی شیطان ان کے لئے ان کی گمراہیوں میں سے کسی بدعت کی ایجاد کرتا تو (نہ صرف یہ کہ اسے کرلیتے) اس سے دوسری بدعت کی طرف بھی منتقل ہو جاتے اور یہ اس لئے (ہوتا تھا) کہ ان لوگوں نے نہ تو اسلام کا طریقہ اختیار کیا اور نہ مہاجرین ہی کی اقتداء پسند کی حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ آپ نے حضرت زیادؓ سے پوچھا، جانتے ہو اسلام کو منہدم کرنے والی کیا چیز ہے پھر خود ہی فرمایا کہ تین چیزیں ہیں، ایک تو، عالم کی لغزش (دوسرے) منافق کا جدال بالقرآن (یعنی خود اس کے دل میں قرآن کی عظمت نہ ہو مگر دوسروں سے جدال و مناظرہ کے وقت قرآن کی آیتیں پیش کرے تیسرے گمراہ کن ائمہ.

اتقوا اللہ وما حدث فی قرائکم واھل مساجدکم من الغیبة والنمیمة والمشی بین الناس بوجھین ولسانین وقد ذکر ان من کان ذا وجھین فی الدنیا کان ذا وجھین فی النار۔ یلقاک صاحب الغیبة فیغتاب عندک من یری انک تحب غیبتہ یخالفک الیٰ صاحبک فیاتیہ عنک بمثلہ فاذا ھو قد اصاب عند کل واحد منکما حاجتہ وخفی علیٰ کل واحد منک ما یاتی صاحبہ حضورہ عند من حضرہ حضور الاخوان وغیبتہ عمن غاب عنہ غیبة الاعداء من حضر منھم کانت لہ الاثرۃ ومن غاب منھم لم یکن لہ حرمة یغبن من حضرہ بالتزکیة ویغتاب من غاب عنہ بالغیبة

لوگو! خدا سے ڈرو اور ان چیزوں سے بچو جو تمہارے (آجکل کے) قراء یعنی علماء اور اہل مساجد (یعنی نمازیوں میں پیدا ہو گئی ہیں یعنی غیبت، چغلخوری اور لوگوں سے دورُخے پن سے ملنا جلنا حالانکہ (حدیث میں آتا ہے) کہ جو شخص دنیا میں دورُخا ہوگا اس کے لئے دوزخ میں بھی دورُخ ہوں گے. غیبت کرنیوالا ذکرتا یہ ہے کہ) تم سے ملتا ہے تو تم سے ایسے شخص کی غیبت کرتا ہے جس کے بارے میں یہ سمجھتا ہے کہ تم اس کی غیبتوں کو پسند کروگے (اور اس پر خوش ہوگے) پھر تم سے ہٹ کر تمہارے ساتھی کے پاس آتا ہے (جس کی غیبت تم سے کر چکا ہے) اور اس سے تمہارے متعلق اسی قسم کی باتیں کرتا ہے (اس طرح) تم دونوں میں سے ہر ایک سے اپنا مقصد تو حاصل کر لیتا ہے اور ہر شخص سے دوسرے کی بات پوشیدہ رکھتا ہے اس کی حاضری اس شخص کے پاس جس کے یہاں وہ جاتا ہے بھائیوں جیسی حاضری ہوتی ہے یعنی اس کے سامنے بالکل بھائی جیسا بن جاتا ہے) اور اس کا

غائب ہونا اس شخص کے سامنے سے جس کے یہاں سے وہ غائب ہوتا ہے دشمنوں کی سی غیبت ہوتی ہے (یعنی پیٹھ پیچھے دشمن جیسا ہوتا ہے) ان میں سے جو سامنے پڑ جائے بس اسی کو ترجیح ہے اور جو موجود نہ ہو اس کا کوئی احترام نہیں جس کے پاس حاضر ہو تعریف کر کے اس کو دھوکے میں رکھے اور جس کے پاس سے غائب ہو برائیاں کر کے اس کی غیبت کہے ۔ (افسوس)

فیا لعباد اللہ اما فی القوم من رشید
ولا مصلح بہ یقمع ھذا عن مکیدتہ
ویردہ عن عرض اخیہ المسلم بل
عرف ھواھم فیما مشی بہ الیھم
فاستمکن منھم وامکنوہ من حاجتہ
فاکل بدینہ مع ادیانھم

اِن اللہ کے بندوں (عالموں اور نمازیوں) کو کیا ہو گیا ہے کیا ساری قوم میں کوئی سمجھدار شخص نہیں رہ گیا ہے اور کیا قوم میں کوئی بھی ایسا مصلح (اور خیر خواہ) موجود نہیں ہے جو (اس جیسے فتنہ پرداز سے) اسکی یہ چالبازی چھڑا دے اور اس کو اپنے مسلمان بھائی کی بے عزتی کرنے سے روک دے (اس غیبت کرنیوالے سے اسکی عادتِ بد کو چھڑانا اور اسکو اس فعل شنیع سے باز رکھنا تو درکنار، دیکھا یہ جاتا ہے کہ خود لوگوں کی بھی رغبت اسکی غیبت کی طرف ہوتی ہے پس وہ غیبت کرنیوالا لوگوں سے اپنی خواہش پوری کرتا ہے اور دوسرے لوگ اس سے اپنی خواہش پوری کرتے ہیں (یعنی ہر ایک محظوظ ہوتا ہے، ایک سنکر دوسرا سنا کر) اس طرح وہ غیبت کرنے والا اپنا بھی دین کھا ڈالتا ہے اور ان کا بھی (یعنی دونوں کی نیکیوں کے ضیاع کا سبب بنتا ہے۔

فاللہ اللہ ذُبُّوا عن حُرَمِ اعیانکم وکفوا
السنتکم عنھم الامن خیر وناصحوا
اللہ فی امتکم اذکنتم حملۃ الکتاب و
السنۃ فان الکتاب لا ینطق حتی ینطق بہ وان
السنۃ لا تعمل حتی یعمل بھا فمتی
یتعلم الجاھل اذا سکت العالم فلم
ینکر ما ظھر ولم یامر بما ترک وَقَدْ اَخَذَ
اللہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَیُبَیِّنُنَّہٗ
لِلنَّاسِ وَلَا یَکْتُمُوْنَہٗ

(اے عالمو اور نمازیو) اللہ سے ڈرو۔ اللہ سے ڈرو۔ اپنے بھائیوں کی پردہ دری سے باز رہو اور ان کے متعلق گفتگو کرنے) سے اپنی زبانوں کو روکو بجز اس کے کہ کوئی اچھی بات ہو اور اپنی قوم کے لئے خدا کے دین کے ناصح بنو اس لئے کہ تم کتاب و سنت کے حامل ہو اور دیکھو، کتاب خود تو بولے گی نہیں یہاں تک کہ اسکے ذریعہ سے بولا جائے اسیطرح یہ بھی یقینی ہے کہ سنت خود تو عمل کریگی نہیں یہانتک کہ اسپر عمل کیا جائے (یعنی کتاب و سنت کا نطق اس کا پڑھنا اور اسپر عمل کرنا ہے) پھر بھلا کیسے سیکھ سکتا ہے ایک جاہل جبکہ عالم ہی خاموش رہیگا جو نہ اس جاہل کے افعال ظاہرہ (خلاف

شرع) پر نکیر کرے اور نہ اس کو اعمال متروکہ (معروفہ) کا امر کرے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے عہد لیا ہے کہ وہ لوگ اسکی کتاب کو لوگوں تک ضرور بالضرور پہونچائیں گے اور چھپائیں گے نہیں۔

اتقوا الله فانكم في زمان رق فيه الورع وقل فيه الخشوع وحمل العلم مفسدوه فاحبوا ان يعرفوا بحمله و كرهوا ان يعرفوا باضاعته فنطقوا فيه بالهوى لما دخلوا فيه من الخطأ وحرفوا الكلم عما تركوا من الحق الى ما عملوا به من باطل فذنوبهم ذنوب لا يستغفر منها وتقصيرهم تقصير لا يعترف به كيف يهتدي المستدل المسترشد اذا كان الدليل جائرا احبوا الدنيا وكرهوا منزلة اهلها فشاركوهم في العيش و زايلوهم بالقول ودافعوا بالقول عن انفسهم ان ينسبوا الى عملهم فلم يتبرؤا مما انتفوا منه ولم يدخلوا فيما نسبوا اليه انفسهم لان العامل بالحق متكلم وان سكت وقد ذكر ان الله تعالى يقول اني لست كل كلام الحكيم اتقبل و لكني انظر الى همه وهواه فان كان همه وهواه لي جعلت صمته

(اے عالمو) اللہ سے ڈرو اس لئے کہ تم ایک ایسے زمانہ میں ہو جس میں تقویٰ و پرہیزگاری نادر ہو گئی ہے، خشوع کم ہو گیا ہے علم کے حامل وہ لوگ ہو گئے ہیں جو اس کو تباہ و برباد کرنے والے ہیں ان (ظالموں) نے یہ چاہا کہ حاملین علم کے لقب سے مشہور ہوں اور اس بات کو ناپسند کیا کہ علم کے ضائع کرنے والوں میں ان کا شمار ہو اس لئے اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق اس میں (من مانا) کلام کیا (جب بھی ذرا) ان کو غلطی سے اسمیں داخل ہونے کا موقع مل گیا اور (حرکت یہ کی کہ) کلام کو حق سے پھیر کر جس کو کہ انھوں نے ترک کیا تھا باطل کی طرف کر دیا جس پر کہ وہ عامل تھے پس ان کا یہ گناہ ایسا گناہ ہے جس سے استغفار نہیں کیا جاتا اور ان کی یہ تقصیر ایسی تقصیر ہے جس کا اعتراف نہیں کیا جاتا (یعنی اس کو گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا کیونکہ اس کو دین سمجھا جاتا ہے پھر اعتراف استغفار چہ معنی دارد) جب یہ حال ہے تو تم ہی بتاؤ کہ) کیونکر راہ یاب ہو سکتا ہے کوئی مستدل طالب رشد جبکہ دلیل ہی میں غلطی اور کجی واقع ہو رہی ہو ان حاملین علم نے (حقیقۃً مفسدین علم میں) دنیا کو تو پسند کیا لیکن اہل دنیا کے درجہ کو برا ہی جانا۔ گویا عیش میں تو ان کے شریک کار بنے اور زبان سے ان سے علیحدگی بھی ظاہر کرتے رہے اور اقوال سے اپنے نفس کو ان کے عمل (یعنی دنیا داری کی طرف منسوب ہونے سے بھی بچاتے رہے لیکن جس شئی کی اپنے نفس سے نفی کرنی چاہی تھی

حداً او وقاراً لی وان لم یتکلم وقال الله تعالیٰ مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا (لم یعملوا بها) کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا (کتبا) وقال خُذُوْا مَا اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّةٍ قال العمل بما فیه

نہ تو اس سے بَری رہ سکے (یعنی دنیاداری کا طعنہ) اور نہ اس چیز ہی میں داخل ہو سکے جس کی جانب اپنے کو منسوب کیا تھا (یعنی حاملینِ علم) اس لئے کہ حق پر عمل کرنے والا ناطق ہوتا ہے اگرچہ ساکت ہو۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں ہر حکیم کے کلام کو قبول ہی نہیں کرتا بلکہ میں اس کے قصد اور ارادہ کو دیکھتا ہوں۔ اگر اس کا ارادہ میرے لئے ہوتا ہے تو پھر میں اس کی خاموشی کو ہی اپنی حمد اور توقیر قرار دیتا ہوں اگرچہ (زبان سے کچھ) نہ بولے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مثال ان لوگوں کی جو حامل تورات ہیں لیکن اس پر عامل نہیں، ایسی ہے جیسے گدھا جو (اپنی پشت پر) کتابیں لادے ہوئے ہے نیز فرمایا کہ اور جو کچھ ہم تم کو دیں اسے مضبوطی سے پکڑو (یعنی اس پر عمل کرو)۔

ولا تکتفوا من السنة بانتحالها بالقول دون العمل بها فان انتحال السنة دون العمل بها کذب بالقول مع اضاعة العلم ولا تعیبوا بالبدع تزینا بعیبها فان فساد اهل البدع لیس بزائد فی صلاحکم ولا تعیبوها بغیاً علی اهلها فان البغی من فساد انفسکم ولیس ینبغی للطبیب ان یداوی المرضیٰ بما یبرئهم و یمرضه فانه اذا مرض اشتغل بمرضه عن مداواتهم ولکن ینبغی ان یلتمس لنفسه الصحة لیقوی به علی علاج المرضیٰ فلیکن امرکم فیما تنکرون علی اخوانکم نظراً منکم لانفسکم و نصیحة منکم لربکم

(اور دیکھو) حدیث کو صرف زبان سے نقل کر دینے ہی پر اکتفا نہ کرو کہ اس پر عمل کرو (یہ بہت ہی برا ہے) کیونکہ احادیث کا صرف نقل کرنا اور اس پر خود عمل نہ کرنا (ایک تو) کذب قولی ہے پھر علم کا ضیاع بھی ہے (کہ اس علم سے کیا فائدہ جس پر عمل نہ کیا) اور صرف بدعات ہی کو اس کی برائی دیکھتے ہوئے برا بھلا مت کہو اس لئے کہ اہل بدعت کا فساد تمہاری صلاح میں کچھ اضافہ نہ کر دیگا (یعنی محض دوسرونکی برائی کرنے سے تو اپنی اصلاح میں کچھ زیادتی نہ ہو جائیگی) نیز بدعات کی تردید اس انداز سے بھی مت کرو کہ (جس سے) اہل بدعت پر ظلم و تعدی ہو جائے کیونکہ یہ تعدی خود تمہارے نفس کا فساد ہے اور دوسروں کی اصلاح کی خاطر اپنے نفس میں فساد پیدا کر لینا کونسی دانشمندی ہے (اسی لئے) طبیب کو نہیں چاہئے کہ مریضوں کا علاج کسی ایسی چیز سے کرے جو انہیں تو اچھا کر دے اور اسے بیمار ڈالدے کیونکہ جب طبیب خود ہی مریض ہو جائیگا تو اپنے مرض کی وجہ

وشفقتہ منکم علیٰ اخوانکم وان تکونوا مع ذلک بعیوب انفسکم اعنا منکم بعیوب غیرکم وان یستفطر بعضکم بعضا النصیحۃ وان یحظی عندکم من بذلہا لکم وقبلہا منکم وقد قال عمر بن الخطابؓ رحم اللہ من اھدیٰ الی عیوبی تحبون ان تقولوا فیحتمل وان قیل لکم مثل الذی قلتم غضبتم تجدون علی الناس فیما تنکرون من امورھم وتاتون مثل ذلک افلا تحبون ان یوخذ علیکم اتھموا رأیکم ورأی اھل زمانکم وتثبتوا قبل ان تکلموا وتعلموا قبل ان تعملوا فانہ یاتی زمان یشتبہ فیہ الحق والباطل ویکون المعروف فیہ منکرا والمنکر فیہ معروفا۔

سے دوسروں کے علاج سے قاصر رہیگا بلکہ اس کو چاہیے کہ اپنے نفس کے لیے صحت تلاش کرے تاکہ اسکی وجہ سے دوسرے بیماروں کے علاج پر قادر ہو۔ پس چاہیئے کہ تمہارا اپنے بھائیوں کو امر بالمعروف) کرنا خود اپنے (عیوب) میں نظر کرنے کی غرض سے ہو اور یہ کہ تم ان تمام امور کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی عیوب پر اس سے کہیں زیادہ فکرمند ہو جتنا کہ دوسروں کے عیوب پر۔ اور یہ کہ تم میں بعض بعض سے اخلاص کے ساتھ نصیحت حاصل کرے اور (تمہاری جانب سے قدر و منزلت کا) حصہ اس شخص کو ملنا چاہیئے جو تمھیں کوئی نصیحت کرے یا تمہاری کوئی نصیحت قبول کرے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحم کرے اس شخص پر جو مجھ پر میرے عیوب پیش کرے تم لوگ پسند کرتے ہو کہ (کچھ بھی) کہو لوگ تمہاری بات برداشت کریں لیکن اگر تم سے کہا جائے وہی جو تم نے کہا ہے تو تم غصہ ہوتے ہو تم لوگوں سے تو خفا ہوتے ہو ان باتوں پر جن میں تم ان پر نکیر کرتے ہو اور خود وہی کام کرتے ہو کیا تم پسند نہیں کرتے کہ تم پر مواخذہ کیا جائے۔ متہم سمجھا کرو اپنی رائے کو اور اپنے اہل زمانہ کی رائے کو۔ اور بات کرنے سے پہلے اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ اور عمل کرنے سے پہلے علم سیکھو۔ اس لئے کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جس میں حق و باطل مشتبہ ہو جائینگے۔

وعلی ہذا اچھا آدمی برا اور برا آدمی اچھا سمجھا جائے گا۔ خوش اخلاق بداخلاق اور بداخلاق خوش اخلاق متصور ہوگا۔ صادق کاذب اور کاذب صادق خیال کیا جائے گا۔ سنت بدعت اور بدعت سنت سمجھی جائیگی متبع سنت مخالف رسول اور تابع ہوا و نفس محب رسول قرار دیا جائیگا۔ افسوس کہ جس زمانہ کی پیشینگوئی کیگئی تھی آج ہم اسی دور سے گذر رہے ہیں اور جس چیز کا خطرہ محسوس کیا جارہا تھا ہم اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ معروف و منکر میں اشتباہ ہو رہا ہے اور حق کو باطل، باطل کو حق سمجھا جارہا ہے۔ چنانچہ علمائے محققین

سے تو استغنا برتا جارہا ہے اور غیر محققین کو رہنما بنایا جارہا ہے مشائخ معتبرین سے تو اعراض ہے اور دنیا دار پیروں سے اعتقاد ہے خاندان اور برادری کی رسمیں باوجود سخت و دشوار ہونے کے ہمیں گوارا ہیں اور شرعی احکام سہل ہونے پر بھی ناگوار ہیں پھر نہ صرف یہ کہ ان پر عمل نہیں ہے بلکہ بیشتر موقعوں پر ان کے ضد پر عمل کیا جارہا ہے دیکھو شرع میں ڈاڑھی بڑھانے اور مونچھ کم کرنے کا حکم ہے اس کے برعکس ڈاڑھی منڈائی اور مونچھ بڑھائی جارہی ہے۔ نماز جمعہ میں خطبہ کا مختصر پڑھنا مسنون تھا طویل پڑھا جارہا ہے۔ نماز کو طویل کرنا مطلوب تھا مختصر ادا کی جارہی ہے۔ نماز تنہائی میں لمبی پڑھنی چاہیے اور جماعت میں مختصر اس کے برعکس کیا جارہا ہے حُبّ دنیا مذموم شے تھی باعثِ عزت تصور کی جارہی۔ نفاق بدترین عیب تھا ہنر سمجھا جارہا ہے۔

فمنکم متقرب الی اللہ بما یباعدہ ومتحبب الیہ بما یبغضہ علیہ قال اللہ تعالیٰ أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا الآیۃ فعلیکم بالوقوف عند الشبہات حتی یبرز لکم واضح الحق بالبینۃ فان الداخل فیما لا یعلم بغیر علم اثم ومن نظر للہ نظر اللہ لہ علیکم بالقرآن فاتموا بہ وأمّوا بہ وعلیکم بطلب اثر الماضین فیہ

تم میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اس سے بعید کرنے والی چیزوں کے ذریعہ ڈھونڈینگے اور حق تعالیٰ کے محبوب بننا چاہینگے۔ ان چیزوں کے واسطے جو اللہ کو ناراض کرنے والی ہونگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کیا وہ شخص جس کے لئے اس کی برائیاں مزین کر دی گئی ہیں پس وہ انھیں اچھا سمجھ رہا ہو الآیۃ پس لازم کرلو اپنے ذمہ اس امر کو کہ شبہات کے کام میں توقف کروگے تا آنکہ دلائل واضحہ سے تمہارے لئے حق ظاہر نہ ہوجائے کیونکہ وہ شخص بلا علم کے نامعلوم اشیاء میں قدم رکھے گا وہ گنہ گار ہوگا اور جو شخص اللہ کے لئے نظر کریگا تو اللہ تعالیٰ بھی اسکی طرف توجہ فرمائیں گے قرآن شریف کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور (اپنے جملہ امور کو) اسی کے ذریعہ پورا کرو اور اسی کی طرف قصد کرو۔ نیز اپنے ذمہ ضروری کرلو سلف کی اتباع کو قرآن (کے معنی و مطلب سمجھنے کے بارے) میں۔

ولوان الاحبار والرہبان لم یتقوا زوال مراتبہم وفساد منزلتہم باقامۃ الکتاب وتبیانہ ماحرفوہ ولا کتموہ ولکنہم لما خالفوا الکتاب

اور (دیکھو) اگر یہ احبار و رہبان (یعنی یہود و نصاریٰ کے علماء) کتاب اللہ کی اقامت اور اس کے شرح و بیان کرنے پر اپنے مرتبہ کے فساد اور اپنی قدر کے زوال کا خوف نہ کرتے تو کتاب اللہ کی نہ تو تحریف کرتے اور نہ اس کا کتمان ہی کرتے لیکن جبکہ ان لوگوں نے

بما عمالهم التمسوا ان يخدعوا قومهم عما صنعوا مخافة ان يفسد منازلهم وان يتبين للناس فسادهم فحرفوا الكتاب بالتفسير ما لم يستطيعوا تحريفه كتموه فسكتوا عن صنيع نفسهم ابقاءً على منازلهم وسكتوا عما صنع قومهم مصانعة لهم وَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ لَيُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا يَكْتُمُوْنَهٗ بل مالوا عليه و رفقوا لهم فيه ۔ تمت الرسالة

(دارمی ص ۵۵ تا ۸۰)

اپنے اعمال سے کتاب اللہ کی مخالفت کی تو اپنے کئے ہوئے کی طرف سے قوم کو دھوکہ دینا تجویز کیا (محض) اس خوف سے کہ کہیں ان کے مدارج ختم نہ ہوجائیں اور لوگوں پر انکا فساد عیاں نہ ہوجائے پس کتاب کی (اپنی مخترع) تفسیر کے ذریعہ تحریف (معنوی) کی اور جن مقامات پر تحریف کرتے نہ بن پڑا اُسے چھپالیا اور اپنی اس نفسانی کارروائی کو ان پر ظاہر بھی نہ کیا تاکہ اپنے مرتبہ پر برقرار رہ سکیں اور جو کچھ ان کی قوم نے حرکتیں کیں اپنے کو ان کا ہم پیشہ اور شریک کار ظاہر کرتے ہوئے اسکی جانب سے بھی سکوت اختیار کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ وہ ضرور بالضرور کتاب اللہ کو لوگوں کو پہنچائیں گے اور اسکو چھپائیں گے نہیں لیکن عہد کے خلاف خود بھی تحریف وکتمان کی طرف مائل ہوئے اور لوگوں سے بھی اس مسئلہ میں بہت نرمی سے پیش آئے"۔

خصوصیت حضرت والا در اصلاح امت

فرمایا کہ — میں نے اپنے کام کی بنا تمسک بالکتاب اور تمسک بالسنۃ پر رکھی ہے یہی وجہ ہے جو آپ اس قدر لوگوں کا مرجوعہ دیکھ رہے ہیں اگر بزرگوں کے ملفوظات ہی سناتا رہتا تو کچھ لوگ سنتے مگر اس قدر عام مرجوعہ نہ ہوتا اور آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ اسی تمسک بالکتاب والسنۃ کی برکت سے الحمد للہ کچھ حاصل ہوگیا ورنہ میں خود بالکل کورا رہتا۔

بات یہ ہے کہ کتاب وسنت پر تو سب کا ایمان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مطاع مطلق اور متبوع مطلق قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَلَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اور بزرگوں کا ذکر نہیں ہے اور کسی خاص بزرگ پر ایمان بھی نہیں ہے کسی بزرگ کو جو مانا جاتا ہے تو اسی لئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع ہے اس لئے اس بزرگ کا قابل اتباع ہونا موقوف ہے اس امر کے اثبات پر کہ وہ متبع سنت تھے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے لوگوں کو سنت سے روشناس کیا جائے اور اس کے بعد ان اکابر کی سیرت کو پیش کیا جائے کہ دیکھو یہ سنت ہے اور یہ ان حضرات کا عمل ہے اس طرح سے ان بزرگوں سے بھی عقیدت ہو جائے گی باقی بدون اس کے آپ چاہیں کہ کسی بزرگ کو منوالیں تو یہ بڑا مشکل ہے آپ ایک بزرگ کو پیش کریں گے دوسرے لوگ اس کے مقابل میں اپنے بزرگ کو پیش کر دیں گے لامحالہ کتاب وسنت ہی کو حکم بنانا ہوگا۔

اس لئے میں نے اصل ہی کو لے لیا اور قرآن وحدیث پیش کرنا شروع کیا کہ کرو اس پر اعتراض۔ اب اس پر کیا اعتراض کریں اور کس طرح سے انکار کریں اعتراض یا انکار ہو تو ایمان ہی رخصت ہو جائے۔

(ملفوظات مصلح الامۃ۔ جمع کردہ جامی عفی عنہ)

حقیقی تلاوت کا طریقہ

فرمایا کہ حقیقی تلاوت جس پر میں زور دے رہا ہوں وہ کچھ ایسی آسان بھی نہیں ہے کہ ہر شخص کو فوراً ہی حاصل ہو جائے۔ بلکہ جب اس کی تحصیل کا ارادہ کیجئے گا اور اس کا جو طریقہ ہے اس کو اختیار کیجئے گا تب جا کر وہ حاصل ہو گی۔ باقی آپ جو روزانہ تلاوت کرتے ہیں اور کئی کئی پارہ کی کر کے آتے ہیں میں اس کو نہیں کہہ رہا ہوں۔

اصلی اور حقیقی تلاوت وہ ہے جو قلب سے ہو اور جس کا منشا ایمان ہو اسی سے ناشی ہو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تلاوت سے پہلے اس بات کا استحضار کیجئے کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے جس کی آپ تلاوت کرنے جا رہے ہیں اس امر کی تصدیق بالقصد والاختیار کیجئے اسی تصدیق کا نام ایمان ہے اور جب تک اس کا مراقبہ تام ہو جائے تلاوت شروع نہ کیجئے۔ خواہ اس میں کچھ وقت ہی کیوں نہ لگ جائے۔

پھر جب یہ مراقبہ تام ہو جائے اور کلام اللہ کے کلام اللہ ہونے کا استحضار ہو جائے اور اس کی پوری تصدیق قلب میں آ جائے تو گویا ایمان حاصل ہو گیا اب اسکے بعد جو تلاوت کرے گا وہ ایمانی تلاوت ہو گی اور ایک ایسا عمل ہو گا جو ایمان سے ناشی ہو گا۔ اسی طرح سے کرتا رہے گا تو عمل کی برکت سے اس کے ایمان میں بھی ترقی ہو گی۔ چنانچہ یہاں دونوں ہی چیزیں ہوتی ہیں اول تو ایمان منشا رہوتا ہے اور عمل (تلاوت) اس سے ناشی ہوتی ہے پھر یہ عمل (تلاوت) منشا ربن جاتا ہے اور کمال ایمان اس سے ناشی ہوتا رہتا ہے۔

(ملفوظات مصلح الامۃ۔ جمع کردہ
جامی عفی عنہ)

طریقہ تلاوت قرآن شریف

فرمایا کہ تلاوت قرآن قرب الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس سے سارے مراتب قرب کے حاصل ہوتے ہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اعتقاد و عظمت کے ساتھ دل سے تلاوت کی جائے یہی ایمان اور اذعان اور اعتقاد ہے جو کہ خود ایک کمال ہے اور بہت سارے کمالات کا موجب ہے اور مانند بھوک پیاس کے ایک وجدانی شے ہے جب انسان کو حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کو محسوس کرتا ہے اور اس کو اس کا علم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حلاوت لذت۔ ذوق و شوق اور محبت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

طریقہ تلاوت کا یہ ہے کہ اس سے پہلے عظمت قرآن کا استحضار کیا جائے اور استغفار کے ساتھ ساتھ تجدید ایمان بھی کی جائے اور اس امر کی تصدیق کیجائے کہ یا اللہ یہ آپ کا کلام ہے اور برحق ہے اس پر ہمارا ایمان ہے اس میں جو کچھ ہے سب برحق ہے ہم کو اس کی معرفت با اخلاص عطا فرما اور اس کے مطابق ہماری زندگی بنادے۔ اور اس کے جملہ اوامر و مناھی پر عمل کی توفیق فرما اور اس کے برکات و ثمرات سے نواز دیجے اور اس کو قبول فرمائے۔

اس طرح سے تلاوت کرے اول اول تکلف ہوگا مگر بعد میں لطف آنے لگے گا اور قرآن شریف کی ایک ہی آیت پکڑے گی چلنے نہ دے گی۔ حضرات صحابہ کرام کی تلاوت کا یہی طریقہ تھا۔

اللہ تعالیٰ ہم کو صحیح تلاوت اور حقیقی تلاوت کی توفیق عطا فرمادے۔

(ملفوظات مصلح الامۃ جمع کردہ جامی عفی عنہ)

ایجادات کی حقیقت

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

حضرت مولانا دامت برکاتہم کے ارشادات وملفوظات کے ضبط میں دقت اور دشواری دیکھ کر بعض حساس احباب نے یہ مشورہ دیا کہ اس زمانہ کی ایک نئی ایجاد "ٹیپ ریکارڈ" کا انتظام کر لیا جائے تو مضامین کے ضبط میں بہت سہولت ہو جائیگی اسلئے کہ اس میں من وعن تقریر محفوظ ہو جاتی ہے جو بہ آسانی قید کتابت میں لائی جاسکتی ہے۔ اس مشورہ کو پسند کیا گیا اور حضرت والا دامت برکاتہم بھی راضی ہو گئے تو اس کا انتظام ہوا۔ جب پہلے دن یہ آلہ ضبط تقریر کیلئے مجلس میں رکھا گیا تو حضرت والا نے بغایہ آیت تلاوت فرمائی وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا الآیۃ

اور نہایت مؤثر انداز میں اسکی تفسیر فرماتے ہوئے بصیرت افروز تقریر فرمائی اور آخرت، بعث ونشر اور وہاں کے حساب وکتاب کو ایسا یاد دلایا کہ گویا قیامت کا نقشہ نظروں کے سامنے پیش فرما دیا اور کئی روز تک مختلف مجالس میں مسلسل اس مضمون کو بیان فرماتے رہے۔ نیز جن شرعی باتوں کو آج اہل دنیا مستبعد اور خلاف عقل وخرد سمجھتے ہیں ان کو انھیں کی ایجادات سے جو محسوس ہیں سمجھانیکی کوشش فرمائی اور اسی آلہ کو ضبط اعمال کی نظیر میں پیش فرمایا کہ جس طرح یہ آلہ ہر بات کو محفوظ کر لیتا ہے اسی طرح منجانب اللہ مامور ملائکہ تمام اعمال کو ضبط کرتے جا رہے ہیں جنکو بروز قیامت من وعن پیش کرینگے۔ بیشک یہی حضرات صحیح معنوں میں حقائق اشیاء کے عارف ہوتے ہیں ان کو ہر شے میں آخرت ہی نظر آتی ہے اور ہر وقت وہیں کی باتیں یاد آتی ہیں ؎

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اور ؎ نگوید از سر بازیچہ حرفے کزو پندے نگیرد صاحب ہوش

اب آپ حضرات کے سامنے وہ تقریر پیش کیجاتی ہے۔ امید کہ آپ بھی اس سے محظوظ اور لطف اندوز ہوں گے۔

(از مرتب)

(۲۳-۲۴ ربیع الآخر ۱۳۸۴ھ) جمعہ و شنبہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ایجادات کی حقیقت و حیثیت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَوُضِعَ الْکِتٰبُ فَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْہِ وَیَقُوْلُوْنَ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً اِلَّآ اَحْصٰىہَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا یَظْلِمُ رَبُّکَ اَحَدًا ۝

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَوُضِعَ الْکِتٰبُ یعنی کتاب رکھدی جائیگی اور مراد کتاب سے بندوں کا نامۂ اعمال ہے اسلئے کہ سب کے نامۂ اعمال لوگوں کے داہنے یا بائیں ہاتھوں میں رکھ دیئے جائیں گے۔ یا میزان میں یا اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھدیئے جائیں گے۔ فَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْہِ۔ تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے (جن کے نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے) کہ اس میں جو کچھ گناہ لکھا ہوگا اس کو دیکھ کر خائف ہوں گے۔ وَیَقُوْلُوْنَ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً اِلَّآ اَحْصٰىہَا اور کہتے ہوں گے ہائے ہماری ہلاکت کہ اس کتاب کو کیا ہوگیا ہے کہ اس نے نہ کسی صغیرہ کو چھوڑا اور نہ کسی کبیرہ کو مگر یہ کہ اسکو احصاء (شمار) کرلیا۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ صغیرہ سے مراد تبسم ہے جو بے موقع ہو اور کبیرہ سے مراد قہقہہ ہے اور سعید ابن جبیر نے فرمایا کہ صغیرہ لمم و مسیس اور قُبلہ ہے اور کبیرہ زنا ہے اور یہ علیٰ سبیل التمثیل بیان کیا ہے ورنہ اس کے علاوہ جتنے صغائر و کبائر ہیں سب مراد ہیں۔

سہل ابن سعد سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ حقیر سے حقیر گناہوں سے بچو اسلئے کہ یہ بھی موبقات یعنی مہلکات ہیں۔ اور سعد ابن جنادہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حنین سے فارغ ہوئے تو ہم لوگ ایک چٹیل میدان میں نازل ہوئے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر شخص جو کچھ پائے اسکو یہاں لاوے۔ ابھی تھوڑا ہی وقفہ ہوا تھا کہ ہم لوگوں نے ایک ذخیرہ جمع کردیا۔ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم لوگ اسکو دیکھ رہے ہو؟

ے گناہ کے قریب ہونا۔

اسی طرح تم پر ذنوب بھی جمع ہو رہے ہیں جیسے تم لوگوں نے اسکو جمع کر دیا۔ لہذا چاہیئے کہ ہر شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔ نہ کوئی صغیرہ کا ارتکاب کرے اور نہ کبیرہ کا۔ اس لئے کہ ان سب کا شمار و احصا کیا جا رہا ہے۔ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا۔ اور جو کچھ انھوں نے دنیا میں کیا تھا وہ سب لکھا ہوا موجود پائیں گے۔ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا۔ اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا کہ بے کیا ہوا گناہ لکھ دے یا یہ کہ عمل کے مناسب جو سزا ہے اس پر زیادتی کر دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن تین پیشیاں ہوں گی۔ ایک تو جدال کی، دوسرے معاذیر کی اور تیسری پیشی میں صُحُف کا تطایر ہوگا (یعنی نامہ اعمال اڑ اڑ کر آپ سے آپ لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچیگا) کوئی دائیں ہاتھ میں لے گا اور کوئی بائیں میں۔

حکیم ترمذی فرماتے ہیں کہ جدال کفار و اعدا کے لئے ہوگا وہ لوگ اپنے رب کی عدم معرفت کی وجہ سے جدال کریں گے کہ شاید اس کی وجہ سے نجات پا جائیں اور ان کی حجت قائم ہو جائے۔ اور معاذیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام اور تمام انبیاء علیہم السلام کے سامنے عذر پیش فرمادیں گے اور ان کے نزدیک دشمنوں کے مقابلہ میں اپنی حجت قائم فرمادیں گے (جب حجت اعداء پر قائم ہو جائے گی) تو ان کو جہنم میں بھیجدیں گے۔ اور تیسری پیشی مومنین کی مغفرت کے لئے ہوگی اور ان پر خلوت میں مزید عتاب فرمادیں گے تاکہ حیاء اور خجالت کا وبال چکھیں۔ پھر ان کی مغفرت فرمادیں گے اور ان سے راضی ہو جائیں گے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ بعض مومنین کو گناہوں سے اس قدر خجالت ہوگی کہ بیہوش ہو جائیں گے۔

علامہ شعرانی الیواقیت والجواہر میں فرماتے ہیں کہ:۔

واما العرض علی اللہ یوم القیامۃ فھو مثل عرض العساکر علی الملک فیوقف العبد بین یدی اللہ عزوجل کما یلیق بجلالہ ویقع السوال بحسب ما یرید اللہ عزوجل بذلک العبد فیالہ من موقف تیساقط فیہ لحم الوجوہ من شدۃ الخجل والحیاء من اللہ عزوجل۔	اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے تو اسطرح پیشی ہوگی جیسے لشکری بادشاہ کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ تو بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائیگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے جلال کے لائق ہے اور اس بندہ سے جس طور پر اللہ تعالیٰ ارادہ فرمادیں گے۔ سوال کریں گے۔ پس کیا حال ہوگا اس موقف کا جس میں چہروں کے گوشت اللہ تعالیٰ سے حیاء و خجالت کی وجہ سے ساقط ہو جائیں گے۔

(ص ۱۶۶ ج ۲)

تفسیر مظہری میں ہے کہ حضرت انسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تمام نامۂ اعمال تحت العرش ہوں گے۔ جب موقف ہوگا تو اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجیں گے وہ ان کو داہنے اور بائیں ہاتھوں میں پہونچا دیگی اور اوّل شے اس میں یہ مکتوب ہوگی۔ اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔ یعنی اپنی اس کتاب کو پڑھو آج کے دن تم خود اپنا حساب کرنے کے لئے کافی ہو۔

اور قتادہ سے روایت ہے کہ جو لوگ دنیا میں قاری نہیں ہیں اس دن وہ لوگ بھی اس کو پڑھیں گے۔

میں نے خاص طور سے یہ آیت اسلئے پڑھی کہ آپ لوگوں کو بتلاؤں کہ آپ کی ہر بات کا احصاء ہو رہا ہے اور فرشتے اسکو قلمبند کرتے چلے جارہے ہیں اور قیامت کے دن سب آپ کے سامنے کھول دیئے جائیں گے اور آپ کا سب کیا دھرا اور ہر بات آپ کے سامنے ہوگی۔ مگر ہم لوگوں کو اسکی طرف التفات نہیں ہے اور نہ اسکو کچھ عجیب و غریب ہی سمجھتے ہیں۔

آواز کے ضبط کرنے کا ایک آلہ آگیا ہے اس میں ہر بات ضبط ہو جاتی ہے۔ جب سے وہ آیا ہے سب لوگ بہت خوش ہیں اور دھوم مچی ہوئی ہے کہ کتنی عجیب و غریب چیز آگئی ہے مگر افسوس کی بات ہے کہ فرشتے جو ضبط کر رہے ہیں اور آپ کی ہر بات لکھے جارہے ہیں جسکو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمایا ہے اسکو ذرا بھی عجیب نہیں سمجھتے۔ آخر ہو کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو نہایت شد و مد سے قرآن میں قیامت کا بیان فرمارہے ہیں مگر ہم لوگ ان سب باتوں سے غافل ہیں ہمکو یہ چیزیں عجیب ہی نہیں معلوم ہوتی ہیں کس قدر تعجب کی بات ہے۔ یہ آلہ انگریزوں کی ایجاد ہے جسکو اب کے لوگ بہت بڑی کامیابی اور ترقی سمجھتے ہیں مگر اپنے اسلاف کے احوال سے واقفیت نہیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی تو ان سے کیسی کیسی باتیں صادر ہوئیں جو آج کل کے لوگوں کے وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتیں۔ چنانچہ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

لما اودعت الكعبة شهادة التوحيد عند تقبيلي الحجر الاسود خرجت الشهادة عند تلفظي بها وانا انظر اليها بعيني فى صورة ملك وانفتح فى الحجر الاسود مثل الطاق	جب کہ میں نے شہادت توحید کو حجر اسود کے بوسہ دینے کے وقت کعبہ شریف کو ودیعت کی تو میرے تلفظ کے وقت وہ شہادت فرشتہ کی صورت میں خارج ہوئی جس کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور مثل طاق کے حجر اسود میں انفتاح ہو گیا۔ یہاں تک کہ میں نے حجر اسود کے قعر میں نظر کی

حتی نظرت الی قعر الحجر والشہادۃ قد صارت مثل الکعبۃ واستقرت فی قعر الحجر وانطبق الحجر علیھما وانسد ذلک انطاق وانا انظر الیہ فقالت لی ھذہ امانۃ لک عندی ارفعھا لک الی یوم القیامۃ فشکرتہا علی ذلک انتہی۔ (الیواقیت والجواہر ص۱۴۲)	اور شہادت مثل کعبہ کے وسیع ہو گئی اور وہ قعر حجر میں مستقر ہو گئی اور حجر اسود اس پر بالکل ڈھک گیا اور وہ طاق بند ہو گیا اور میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا تو کعبہ نے مجھ سے کہا کہ یہ آپ کی امانت میرے پاس ہے۔ جسکو قیامت کے دن آپ کی خدمت میں پیش کرونگا تو میں نے اس بات پر اسکا شکر ادا کیا۔

دیکھا آپ نے یہ کوئی معمولی چیز ہے کہ حجر اسود جو ایک چھوٹا سا پتھر ہے اس کے اندر اتنی وسعت ہو گئی کہ اس نے شیخ کی شہادت کو جو کعبہ کے مثل ہو گئی تھی اسکو ضبط کر لیا اور یہ کہا کہ یہ امانت ہے جسکو قیامت کے دن آپ کے سامنے پیش کرونگا۔

لوگ اہل اللہ کے ان واقعات کو نہیں دیکھتے۔ لندن اور امریکہ کے شاگرد ہو گئے ہیں مگر کب تک ان کی شاگردی کرو گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر کب شاگردی اختیار کرو گے ؎

چند خوانی حکمت یونانیاں   حکمت ایمانیاں را ہم بخواں

سنیئے! یہ آلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک بڑی چیز سمجھی جاتی ہے۔ آجکل کے عقلاء اس کو بڑی کامیابی سمجھتے ہیں ساری دنیا اسکی طرف راغب ہے اور ان ایجادات کو انتہائی ترقی اور عروج سمجھتے ہیں۔ مگر میں اسکی حیثیت اور حقیقت بیان کرتا ہوں۔ شاید آپ لوگوں کی سمجھ میں آئے۔

یہ آلہ آپ کا شاگرد ہے۔ آپ اصل ہیں اور یہ فرع، آپ معلم ہیں اور یہ متعلم۔ اس کے اندر کوئی ذاتی صلاحیت نہیں ہے جیسے اور جمادات ہیں ویسے ہی یہ بھی ایک جماد ہے جو بالکل بے حس وحرکت ہے حیوانات سے بھی اس کا درجہ کم ہے جیسے کہ یہ تپائی ہے کہ اسکو جہاں چاہیں رکھیں اس پر کتاب رکھیں یا اور کوئی چیز رکھدیں۔ آپ کو اختیار ہے۔ اس کے اندر کوئی قدرت و اختیار نہیں آپ کی مملوک ہے۔ آپ اس کے مالک ہیں جیسے چاہیں اس میں تصرف کر سکتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی آپ کے بالکل تابع ہے جب آپ کی زبان تکلم کریگی جبھی اس کے اندر کلام ضبط ہو سکتا ہے اور اگر زبان ساکت ہو جائے تو پھر یہ بھی بالکل بے اختیار و بیکار ہو جائے گا اور آواز ضبط کرنے کے بھی بہت سے قواعد وضوابط ہیں جب انھیں قواعد سے آپ اسکو چلائیں گے تو کلام کو ضبط کریگا ورنہ نہیں غرض یہ ہر طرح سے آپ کے تابع ہے اور آپ کا محتاج ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو یہ سمجھئے کہ آپ کے شاگرد انسان جن کو آپ

سکھلا پڑھا رہے ہیں اس آلہ سے کہیں افضل واعلیٰ ہیں۔ اس لئے کہ یہ آلہ تو محض آواز کو ضبط کرتا ہے مگر آپ کے شاگرد آپ کے علوم کو اپنے سینوں میں محفوظ کر رہے ہیں اور علوم کو دوسری جگہ پہونچا سکتے ہیں میں تو اس آلہ کی حیثیت ایک بچے سے بھی کم سمجھتا ہوں اسلئے کہ اسکو پڑھایا جاتا ہے تو چونکہ قدرے قلیل ہی سہی فہم تو ہے جسکی وجہ سے وہ باتوں کو سمجھتا ہے اور وہ موقع بے موقع کی باتوں میں فرق کرتا ہے اور آپ کا سکھلانا اسکے علمی ترقی کا موجب ہوتا ہے۔ مگر اس آلہ کو کیا کہا جائے بالکل ہی بے سمجھ اور بے شعور ہے۔ جو بات کہتا ہوں ضبط کرلیتا ہے حتیٰ کہ کھانسی وغیرہ کو بھی نہیں چھوڑتا۔

اس آلہ کی مثال اس صندوق جیسی ہے جس میں روپیہ رکھا ہو تو ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے اس صندوق کے اندر کوئی شرف وفضیلت نہیں آجاتی۔ بعینہ اسی طرح کلام کی حکایت کرنیکی وجہ سے اس آلہ کے اندر کیا شرف حاصل ہوگا اسلئے کہ اصل شرف تو محکی عنہ کا ہے جو اس سے خارج ہوتا ہے۔

سنئے۔ تعلیم وتربیت کے لئے جو طریقہ انبیاء نے اختیار فرمایا وہی نافع ومفید ہے اس سے بڑھ کر کوئی شئے نافع ہو ہی نہیں سکتی اسلئے کہ اگر کوئی چیز اس سے زیادہ مفید ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو ضرور اسکی تعلیم فرماتے۔ اور وہ طریقہ یہ ہے کہ لسان سے علوم کو پہونچایا جائے یا ان کو کتاب میں لکھ لیا جائے۔

اصول فقہ کی کتاب نور الانوار وغیرہ میں قرآن پاک کی تعریف یوں کی ہے۔ القرآن هو المکتوب فی المصاحف والمقروء من الالسن۔ یعنی قرآن وہ ہے جو مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور زبان سے پڑھا جاتا ہے۔ دیکھئے قرآن کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ لسان سے پڑھا جاتا ہے اور مصاحف میں لکھا جاتا ہے ان دونوں کی کیسی فضیلت نکلی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو نازل فرمایا ہے۔ اسلئے وہ ہر کتاب کی اصل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی تعلیم فرمائی ہے تو آپ سب کے معلم ہیں۔ انبیاء لسان ہی سے تعلیم فرماتے ہیں۔ اس کے برابر کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ دیکھئے میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں سب اس میں ضبط ہوتا چلا جا رہا ہے مگر اس سے اسکو کیا فائدہ۔ کمال تو یہ ہے کہ یہ علم سے متصف ہو جائے اور اس کو علوم سکھلا دیئے جائیں۔

اکابر نے تعلیم وتربیت کر کے لوگوں کو خلیفہ بنایا ہے اور سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنایا ہے۔ سلسلۂ خلافت آدم علیہ السلام سے چلا آرہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اسماء سکھلائے۔ چمچہ، ڈوئی نیز اور تمام چھوٹی چھوٹی چیزوں کے نام تعلیم فرما دیئے اور آدم علیہ السلام نے ان سب کو سیکھ لیا تب خلافت کے اہل ہوئے اور ملائکہ چونکہ اس کے سیکھنے سے عاجز تھے ان کے اندر اس کی

صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ سیکھیں اس لئے اللہ تعالیٰ کی خلافت کے مستحق اور اہل نہیں قرار دیئے گئے۔
اسی طرح اس آلہ کو کوئی اپنا خلیفہ نہیں بنا سکتا۔ یہ تو بالکل عاجز و بے اختیار ہے۔ ہم بول رہے ہیں قرآن و حدیث کی باتیں کر رہے ہیں تو اسکو ضبط کر رہا ہے اور ابھی کوئی کفر و فسق کی باتیں کرنے لگے تو اسکو بھی ضبط کریگا کوئی فرق نہ ہوگا تو اس کو کیا شرف نکلا جسکو اتنی تمیز نہ ہو۔ اور ہمارا شاگرد جو ہوگا وہ ہماری ترجمانی کریگا۔ قرآن و حدیث کی باتوں کو اپنے سینہ میں محفوظ کریگا اگر اسکو نسیان کا خوف ہو تو صحیفہ سے ضبط کریگا۔ یہی طریقہ شروع سے چلا آرہا ہے اور یہی نافع ہے اور اب کے زمانہ کے طلبہ تو ایسے ہوگئے ہیں کہ علوم کو حفظ نہیں کرتے ورنہ پہلے جیسے قرآن کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے ویسے ہی احادیث کو بھی اپنے صدور میں محفوظ رکھتے تھے۔ فقہ کو یاد کرتے تھے مگر اب زمانہ ہی بالکل بدل گیا۔ جب یہ طلبہ جو کہ پڑھنے کے لئے آتے ہیں اور عقل بھی کچھ رکھتے ہیں پھر بھی استادوں کی باتوں کو یاد نہیں رکھتے تو بیچارہ آلہ جو اینٹ پتھر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ان کے علوم کو کیا محفوظ رکھ سکتا ہے اور اس سے کیا کام چل سکتا ہے۔ ایک بہت بڑی جگہ درس حدیث میں یہ آلہ سامنے رکھا جاتا تھا کہ تقریر ضبط ہو جائے یہ تو بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ یہ سمجھا گیا کہ اب کے زمانہ کے طلبہ ایسے نہیں ہیں کہ تقریر حدیث کو اپنے سینوں یا صحیفوں میں ضبط کرسکیں تو اس کے بقاو حفاظت کے لئے یہ آلہ استعمال کیا گیا ورنہ سب علوم ختم ہو جائیں گے۔ یہ طلبہ کے لئے کتنی بڑی بات ہے اور ڈوب مرنے کی بات ہے کہ ان کو بالکل ہی نااہل سمجھا گیا ایک جماد سے بھی کمتر جانا گیا۔

آپ کو امام بخاریؒ کا واقعہ معلوم ہوگا کہ ان کے پاس بہت سے محدثین بغرض امتحان آئے اور سب نے غلط سند کے ساتھ احادیث پڑھیں ہر ایک کے متعلق آپ نے فرمایا کہ لَا (نہیں) جب سن چکے تو ایک ایک حدیث کو لیا اور جو سند انھوں نے پڑھی تھی وہ پڑھی اور کہا یہ سند غلط ہے اور سند صحیح یہ ہے۔ معلوم نہیں پچاس ساٹھ کتنی احادیث تھیں سب کی سند درست کر کے پڑھ دیں تو وہ حضرات مان گئے دیکھا آپ نے کیسا یاد رکھتے تھے اب کوئی ایسا ہے اور اتنا شغف علم سے ہے ؟

قرآن پاک کا تو یاد رکھنا ضروری ہے ہی ورنہ کیسے نماز ادا ہوگی، تراویح کیسے ہوگی اور اسکی حفاظت کا تو اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا ہے اس لئے اسکے حفظ کرنے والے تو بہت سے ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔
اسی طرح احادیث کا یاد رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ سنت محفوظ رہے اور اب چونکہ احادیث کتب میں مدون ہوگئی ہیں اسلئے لوگ زبانی یاد نہیں کرتے تاہم جس صورت سے بھی ممکن ہو اسکی حفاظت بھی لازم ہے اگر زبانی یاد ہوں تو بہت خوب ہے۔ فقہ کا یاد رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ عمل کیا جاسکے بغیر اس کے کیسے عمل ہو سکتا ہے۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ طریقہ تعلیم کے لئے اللہ تعالیٰ نے لسان کو پیدا فرمایا ہے اس سے بڑھکر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا اور آدمی کے اندر نطق کا ہونا اللہ تعالیٰ کی زبردست صنعت و کاریگری کی دلیل ہے۔ چنانچہ تیج گنج کے خطبہ میں فرماتے ہیں کہ الحمد للہ الذی خلق الانسان وانطق لہ اللسان۔ تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے انسان کو پیدا کیا۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ کی حمد میں انسان کے خلق کو خصوصیت سے ذکر فرمایا۔ اس لئے کہ انسان کے خلق میں جتنی صنعت و کاریگری ہے اتنی کسی اور مصنوع میں نہیں ہے گویا انسان ایک طرف اور اس کے علاوہ ساری مخلوقات و مصنوعات ایک طرف۔ پھر انسان کے اندر جو خوبیاں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں سب ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ مگر خاص طور پر زبان کو ناطق اور گویا بنانے پر اللہ تعالیٰ کی حمد کر رہے ہیں چنانچہ خلق الانسان کے بعد فرماتے ہیں وانطق لہ اللسان یعنی سب حمد اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس نے انسان کو پیدا فرمایا اور اسکی زبان کو گویا فرمایا۔

سبحان اللہ کتنا عمدہ خطبہ ہے۔ اب کے طلبہ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ کس کتاب کا خطبہ کیسا ہے۔ پڑھے چلے جارہے ہیں مگر ان لوگوں کو ذرا عقل نہیں کہ کچھ تمیز کر سکیں۔ مجھے یہ خطبہ بچپن ہی سے پسند تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی حمد کی ہے۔ اس سے انسان کی اور اس کے نطق کی کیسی فضیلت نکلی کہ یہ عجائب مصنوعات سے ہے ورنہ ہم لوگوں کو اتنا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تو تعریف ہوئی لسان کی۔ اب کان کی تعریف سنئے۔

اللہ تعالیٰ واقعات ماضیہ کو ذکر فرما کر فرماتے ہیں وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَّاعِيَةٌ۔ اللہ تعالیٰ کانوں کے متعلق فرمارہے ہیں کہ ان باتوں کو محفوظ کرنے والے کان محفوظ کر لیتے ہیں تو دیکھئے کان سے حفاظت کو فرمارہے ہیں۔ اب یہ آلہ ہے جو باتیں کہہ رہا ہوں اسکو ضبط کر لیتا ہے اسکو عجیب چیز سمجھ رہے ہیں مگر اپنے کان کو نہیں دیکھتے اور اس پر غور نہیں کرتے آخر یہ بھی تو ہماری باتوں کو محفوظ کر رہا ہے۔ اس میں اور اس میں کیا فرق ہے۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ مومنین کے قول کو نقل فرماتے ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا تو سمع کان ہی سے تو ہوتا ہے۔ سماع مقدم ہے اطاعت پر۔ جس درجہ کا سماع ہوگا ویسے ہی اطاعت بھی ہوگی۔

ہم میں جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی ہیں اسکی قدر نہیں کرتے اسکی بھی ہم کو معرفت نہیں ہے۔ ایک بچہ ہے کہ ڈیڑھ دو سال خاموش رہتا ہے پھر یکایک تکلم کرتا ہے تو کیا تعجب کی بات نہیں ہے اس پر غور نہیں کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بین دلیل ہے۔ اگر دنیا میں آکر ان مصنوعات سے اللہ تعالیٰ

کی معرفت نہ ہوئی تو دنیا میں آنا بالکل بیکار اور لغو ہوا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○ اور یہ معرفت انھیں افعال اور مصنوعات الٰہیہ ہی میں غور کرنے سے ہوتی ہے۔ اسی کو دیکھئے کہ بزرگان دین سے کوئی خرق عادت بات صادر ہوتی ہے تو اسکو ان کی کرامت سمجھتے ہیں اور اسکی آپ کے نزدیک اہمیت ہوتی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ بچے کا تکلم مع رعایات اصطلاحات کے یہ بھی کچھ کم خرق عادت نہیں ہے۔ آخر کونسی قدرت اسکے اندر پیدا ہوگئی کہ تکلم کرنے لگا۔ آپ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ہم لوگ بڈھے ہو گئے اب تک غور نہیں کیا تو اب ان امور میں کیا غور کریں۔ تو مت کرو ویسے ہی رہو۔ اور بلا معرفت ہی دنیا سے چلے جاؤ۔ اہل یورپ وامریکہ کے معتقد ہو گئے ہو۔ تمہارے مزاج کو بگاڑ دیا ہے۔ ان لہو ولعب کے آلات پر عاشق و فریفتہ ہو گئے ہو اس کے دلدادہ ہو گئے ہو۔ اس میں کمال حاصل کرنے کے لئے لندن امریکہ چلے جا رہے ہو مگر یاد رکھو یہ آخرت میں تمہارے کچھ کام نہ آئے گا۔ سب دھرا دھرایا رہ جائیگا۔ وہ لوگ آخرت میں جاکر تمہاری مدد نہ کریں گے۔ ہاں اگر تم نے اس دار دنیا میں کچھ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لی اور ان سے تعلق ونسبت پیدا کر لیا تو وہی وہاں کام آوے گی۔

اب اللہ تعالیٰ کی دوسری صنعت ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے اور یہ بات عارف ہی بیان کر سکتا ہے وہ یہ کہ حلق میں دو راستے ہیں ایک سانس لینے کا ہے اور ایک اسکے لئے ہے کہ جب آدمی کھائے پیئے تو اسکے ذریعہ سے معدہ میں پہونچ جائے۔ ذرا سا کھانا یا پانی سانس کی نلی میں پہونچ جائے تو موت کا سامنا ہو جاتا ہے۔ سخت تکلیف ہوتی ہے آنکھیں باہر کو نکل آتی ہیں سانس بند ہو جاتی ہے۔ آدمی دو وقتہ کھانا کھاتا ہے تو باختیار خود اپنی ہلاکت کا سامان کرتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی کھلی قدرت نظر آتی ہے اور پورے توکل کا مقام ہے۔ یہ کلام ابتدا و طعام کے متعلق ہے اور معدہ میں پہونچنے کے بعد تو پھر ذرا بھی اختیار باقی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ کی ہی حفاظت کام کرتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت اقدس ؒ کو ایسے ہی ہو گیا تھا۔ دیر تک یہ کیفیت رہی۔

حضرت مولانا ہی کھانسی کے متعلق یہ بیان فرماتے تھے کہ طب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب کوئی شے ثقیل پھیپھڑے کی نلی یا پھیپھڑے میں پہونچتی ہے تو پھیپھڑا ہوا کو بند کر کے ایک حرکت کرتا ہے جس سے وہ چیز ہوا کے ساتھ باہر نکل آتی ہے۔ کھانسی پھیپھڑے کے لئے ایسی حرکت ہے جیسے دماغ کے لئے چھینک۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کی صنعتیں ہیں عقل حیران ہو جاتی ہے۔ اسی کو دیکھ لیجئے کہ حلق میں دو راستے کتنے قریب قریب ہیں مگر اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرماتے ہیں کہ ہوا ہوا کے راستے سے اور کھانے پینے کی چیزیں اپنے راستے سے جاتی ہیں۔ آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔

ان خرافات پر جو عاشق ہوئے جاتے ہو تو اس سے کچھ نفع نہ ہوگا ہاں مگر اس سے یہ نتیجہ نکالو کہ جس طرح ہماری آواز اس میں ضبط ہوتی جارہی ہے ویسے ہی فرشتے ہمارے قول و فعل کو قلمبند کرتے جارہے ہیں۔ ایک چیز بھی ان سے چھوٹ نہیں سکتی سب قیامت میں سامنے رکھ دیئے جائیں گے۔ یہ آلہ تو ایسا ہے کہ اگر ذرا اسکے اندر کوئی کل پرزہ خراب ہوا تو ایک بات بھی ضبط نہیں کر سکتا۔ تعجب ہے ان عقلاء سے کہ یہ سب چیزیں تو ایجاد کرتے چلے جارہے ہیں مگر (عقل سے خدا کو نہیں پہچانتے) میں تو انھیں کو سب سے زیادہ بے ایمان پاتا ہوں ملاساب ایمان کثیر ہوتے جارہے ہیں مگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے بات یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف ان اشیاء کی نسبت نہیں کرتے بلکہ اپنی عقل و دانش کی طرف نسبت کرتے ہیں تو بھلا کیوں ایمان لادیں۔ ایک صاحب سے میں نے ایک دفعہ کہا کہ یہ عقل کس کام کی ہے کہ اسکی وجہ سے کتنے لوگ دوزخ میں چلے جائیں گے اور ایک بیوقوف آدمی اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے تو وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اسکو پسند کیا۔

لوگ اس آلہ کو بہت کارآمد سمجھتے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ اس سے کہیں زیادہ مفید شے دیاسلائی ہے۔ بہت ہی کام آتی ہے اسی طرح گھڑی ہے اس سے نماز کے اوقات معلوم ہوتے ہیں غرضکہ یہ سب چیزیں بہت کام کی معلوم ہوتی ہیں مگر اس آلہ کا کیا فائدہ ہے۔ انھیں سب ایجادات لہو ولعب نے جوانوں کو خراب کر دیا۔ عورتوں کے اخلاق بگڑ گئے۔ سب کے سب اسی میں پٹے ہوئے ہیں۔ گانے کی آواز برابر سنائی پڑتی ہے۔ سارا وقت ان کا اسی میں ضائع ہو رہا ہے۔ اپنی جوانی کو تباہ کر رہے ہیں مگر ان کو کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں،

اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا فَالْیَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ یَوْمِهِمْ هٰذَا وَمَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ۔ (ان یہود نے اپنے دین کو تفریح اور کھیل بنالیا ہے اور ان کو اس موجودہ زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا ہے تو آج ہم بھی ان کو بھلائے دے رہے ہیں۔ جیسے یہ لوگ آج اپنی اس ہستی کو بھول بیٹھے ہیں اور اسکو بھول بیٹھے ہیں کہ یہ لوگ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے۔)

یہ ایجادات جن پر آج کل کے سائنس داں نازاں ہیں اس سے پہلے بھی ایسی چیزوں کو لوگ ایجاد کر چکے ہیں چنانچہ سکندر نے آئینہ ایجاد کیا۔ اس کا کتنا بڑا کمال ہے اور کتنے کام کی چیز ہے۔

اسی طرح جمشید نے ایک جام جم بنایا تھا جس میں ساری دنیا نظر آتی تھی کیا اس وقت کوئی ایسا آلہ اب تک ایجاد ہوا ہے۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ ایک معمولی درجے کا چراغ ہی لے لیجئے جس نے اسکو سب سے پہلے ایجاد کیا تھا اس کا کسقدر کمال ہے کہ بتی روئی کی بنائی اس میں تیل ڈالا پھر آگ لگایا تو آہستہ آہستہ وہ روشنی دیتا ہے ورنہ اگر تیل نہ ہو تو ایک ہی دفعہ میں سب روئی جل جائے۔ اسکی روشنی کیسی مناسب ہوتی ہے۔ ذرا غور تو فرمایئے کس قدر معرفت پر یہ چیزیں دلالت کرتی ہیں اب اس میں ترقی کی گئی ہے تو جو فضیلت پہلے لوگوں کو حاصل ہے وہ بعد والوں کو نہیں حاصل ہو سکتی۔ الفضل للمتقدم۔

جب ان ترقیات کو اہل اللہ نے دیکھا تو انھوں نے بھی ایک چیز اس چراغ اور آئینہ اور جام سے بڑھ کر پیش کی۔ وہ قلب ہے ان حضرات نے اپنے قلب ہی کو روشن و منور کردیا اور یہ شعر پڑھا ؎

جام جہاں نماست ضمیر منیر دوست　　اظہار احتیاج بآنجا چہ حاجت است

حضرت مجدد صاحب شب برات میں عبادت میں مشغول تھے۔ اچانک اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ اس شخص کا کیا حال ہوگا کہ اس سال اس کا انتقال ہو جائیگا۔ حضرت نے لوح محفوظ میں نظر کشفی سے دیکھ کر یہ فرمایا تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اسی طرح ایک صاحب دل بادشاہ تخت پر بیٹھا تھا اسکی بیوی بھی ساتھ تھی یکایک رونے لگا اور آنسو گرنے لگے۔ بیوی نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے تو کہنے لگے کہ میں نے ابھی لوح محفوظ میں دیکھا ہے کہ میں مرجاؤں گا اور اس حبشی دربان سے تمہارا نکاح ہو جائیگا۔ بیوی نے کہا کہ جب لوح محفوظ میں دیکھ لیا ہے تو پھر رنج کی کیا بات ہے راضی رہنا چاہیئے۔

یہ سب واقعات کچھ کم اہمیت رکھتے ہیں۔ ان پر کیوں نہیں التفات کیا جاتا۔ اپنے گھر کی خبر نہیں۔

اب بس کرتا ہوں! انشاء اللہ تعالیٰ کل اسکو پھر بیان کروں گا۔

ایجادات کی حقیقت وحیثیت

(۲)

آج کا مضمون کل کے مضمون سے مرتبط ہے۔ کل میں نے بیان کیا تھا کہ آلات جدیدہ کی بڑی وقعت ہے اس پر لوگ گرے پڑ رہے ہیں اور اسکی وجہ سے ایسی غفلت اور ایسا حجاب ہوگیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صنعتوں کی جانب اصلاً التفات نہیں کرتے۔ نہ اسکی خوبیوں پر غور کرتے ہیں اور نہ اسکے کمالات کو سمجھتے ہیں۔ علماء نے اللہ تعالیٰ کی مخلوقات و مصنوعات کو نظر غائر سے دیکھا ہے اور اسکی معرفت حاصل کی ہے چنانچہ صاحب پنج گنج جو علم صرف کی کتاب ہے خطبہ میں تحریر فرماتے ہیں:

الحمد للہ الذی خلق الانسان وانطق لہ اللسان الخ

یعنی ہر حمد مختص ہے اللہ تعالیٰ کے لئے اس بنا پر کہ اس نے انسان کو پیدا فرمایا۔ دوسری مخلوقات و مصنوعات کا ذکر اس موقع پر نہیں لائے تو معلوم ہوا کہ انسان کا خلق نہایت مہتم بالشان ہے اس میں عجیب عجیب صنعتیں ہیں کہ اسکو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ایک لسان ہی کو لے لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں گویائی کی قدرت عطا فرمائی کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ زبان میں کیا خاص بات ہے کہ وہ تکلم کرتی ہے اور دوسرے اعضاء تکلم نہیں کرتے۔ بس اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اس میں نطق کا ملکہ عطا فرمایا ہے ورنہ جسکو نہیں عطا فرماتے کوئی طاقت نہیں ہے کہ اسکو گویا بنا دے۔ اسی لئے مصنفؒ نے انسان کے خلق کے بیان کے بعد خطبہ میں خاص طور سے نطق کا ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حمد جو مختص ہے اس لئے بھی کہ اس نے انسان کی لسان کو ناطق بنایا تاکہ اپنی حاجات قلبیہ کو اس کے ذریعہ سے بیان کر سکے۔ اگر آدمی کلام پر قادر نہ ہو تو خواہ کتنا ہی عاقل ہو اور قلب میں کتنے ہی علوم و معارف رکھتا ہو انکو دوسروں پر کیسے ظاہر کر سکتا ہے اور مافی الضمیر کو کیسے ادا کر سکتا ہے۔ علوم تو قلب و دماغ میں ہوتے ہیں مگر ان کی ترجمانی لسان ہی کرتی ہے اور یہ جو شعر ہے ؎

زبان دل کے لئے ہے نہ دل زبان کے لئے　　　عیاں نہ ہونا تھا یہ راز دل عیاں نہ ہوا

تو یہ اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ قلب کے حالات و کیفیات کو زبان نہیں بیان کرسکتی مگر سنئے اگر اسکو کوئی چیز کچھ بیان کرسکتی ہے تو زبان ہی کرسکتی ہے اور اسی سے قلبی احوال کا کچھ انداز و سراغ لگ سکتا ہے۔ اگر کسی دوسری شئے سے اظہار کرنا چاہیں تو اتنا بھی نہیں ہوسکتا۔ خوب سمجھ لیجئے۔ بہرحال میں یہ بیان کررہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو زبان میں نطق و تکلم کی قدرت رکھی ہے تو یہ بہت بڑی صنعت اور ایجاد ہے۔ ذرا غور تو کیجئے کتنی عجیب چیز ہے اور قیامت میں تو اللہ تعالیٰ دوسرے اعضاء میں بھی نطق عطا فرمادیں گے چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو شہادت دینگے جس پر کفار کو بہت تعجب ہوگا کہ ان اعضاء کو کس نے ناطق بنادیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں حَتّٰۤی اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ یہاں تک کہ جب وہ (کفار) اس (دوزخ) کے قریب آجاویں گے تو ان کے کان اور آنکھیں اور ان کی کھالیں ان پر ان کے اعمال گواہی دیں گے اور (اسوقت) وہ لوگ (متعجب ہوکر) اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف میں کیوں گواہی دی وہ (اعضاء) جواب دینگے کہ ہم کو اس (قادر مطلق) نے گویائی دی جس نے ہر (گویا) چیز کو گویائی دی اور اسی نے تم کو اول بار پیدا کیا تھا اور اسی کے پاس پھر لائے گئے ہو۔ تو دیکھئے انھیں اعضاء کے لئے آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت کرتا ہے مگر یہی اللہ تعالیٰ کے سامنے جاکر شہادت دیں گے اور اللہ تعالیٰ انھیں اعضاء کو ناطق بنادیں گے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے جیسے یہاں اللہ تعالیٰ کے ناطق بنانے کی وجہ سے زبان بولتی ہے ویسے ہی اللہ تعالیٰ ان اعضاء میں نطق پیدا فرمادیں گے جس کی وجہ سے وہ نطق کریں گی۔ الغرض آپکی لسان کوئی معمولی شے نہیں ہے نہایت کارآمد شے ہے، انبیاء نے تبلیغ احکام و شرائع لسان ہی کے ذریعہ سے تو فرمائی ہے اور لوگوں کو اسکے ذریعہ سے دین سکھلایا ہے اور ایمان کی باتیں بتلائی ہیں۔ آپ کے ایک بہت بڑے آدمی یہ کہتے تھے کہ کانوں تک پہونچانے کا آلہ تو ایجاد ہوگیا ہے مگر اب تک قلوب تک پہونچانے کا کوئی آلہ ایجاد نہ ہوسکا۔ تو میں کہتا ہوں کہ آلہ ایجاد ہوا ہے اور وہ لسان ہے۔ اسی سے قلب تک اپنی باتوں کو پہونچایا جاتا ہے۔ اپنی حاجات کی تبلیغ اور تفہیم تو سب ہی کرتے ہیں اور ایمان اور دین کی تبلیغ بھی اسی سے لوگ کرتے آئے ہیں۔ مگر ہر زبان میں اسکی اہلیت نہیں ہے بلکہ اس زبان میں اہلیت ہے جس کے صاحب کا دل علوم و معارف سے معمور ہو۔

قلب سے زبان کو برابر فیض پہونچ رہا ہو۔ لسان قلب کے علوم کی ترجمانی کرتی ہو۔ پہلے اس کا قلب ناطق ہوتا ہو اسکے بعد اسکی لسان ناطق ہوتی ہو تو پھر ایسی لسان سے نکلے ہوئے کلمات طیبات قلب تک براہ راست پہونچتے ہیں۔ درمیان میں نہ کوئی شئے حائل ہے اور نہ مانع۔ مقولہ مشہور ہے۔ ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔ یعنی جو چیز دل سے نکلتی ہے براہ راست دل تک پہونچتی ہے۔

اور یہ بھی سنئے کہ پنج گنج کا نام پنج گنج اسلئے رکھا گیا ہے کہ اس میں پانچ باب ہیں تو گویا ہر باب ایک خزانہ ہے اسی طرح پوری کتاب گویا پانچ خزانہ ہے اور حضرت مولانا روم نے فرمایا ہے: پنج گوہر دادیم در درج سرؔ اے اللہ تعالیٰ آپ نے سر کے ڈبہ میں پانچ گوہر عطا فرمائے ہیں سر کو ڈبہ فرمایا ہے جس میں بیش قیمت چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ یعنی آنکھ، کان، ناک، اور زبان میں دو قوتیں ہیں ایک سے نطق کرتی ہے اور دوسرے سے مزہ معلوم کرتی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ پانچ خزانے اور عطا فرمائے ہیں یہ پانچ نمازیں ہیں جو مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔

(خیر یہ بات ضمناً آگئی تھی) اب اصل کلام سنئے اگر ان مصنوعات الٰہیہ میں غور و خوض کیا جائے اور تدبر سے کام لیا جائے تو آدمی عارف کامل ہوجائے مولانا روم کا کلام محبت اور فنا سے بھرا ہوا ہے اسکے ساتھ ساتھ معرفت بھی کامل رکھتے ہیں تمام اہل اللہ نے ان کے کلام کو حجت بنایا ہے۔ حضرت مولانا رومیؒ ہی مثنوی میں فرماتے ہیں ؎

یا خفیَّ الذات محسوس العطا	انت کالماء و نحن کالرحا

یعنی اے وہ جس کی ذات تو پوشیدہ ہے مگر جس کے انعامات محسوس ہیں تیری مثال پانی کی سی اور ہماری مثال چکی کی سی ہے۔ آگے فرماتے ہیں ؎

انت کالریح و نحن کالغبار	یختفی الریح و غبراہ جہار

یعنی تو مثل ہوا کے ہے اور ہم مثل غبار کے ہر طرف اڑ رہے ہیں۔ ہوا خود چھپی رہتی ہے مگر اس کا غبار نمایاں رہتا ہے ؎

تو بہاری ما چوں باغ سبز و خوش	او نہان و آشکارا بخشش

یعنی تو بہار ہے ہم ہرا بھرا باغ ہیں وہ خدا خود پوشیدہ ہے مگر اسکی بخشش ظاہر ہے۔

تو چو جانی ما مثال دست و پا　　　قبض و بسط دست از جاں شد روا

تو ہی روح ہے اور ہم گویا ہاتھ پیر ہیں ہاتھ کا پھیلنا سکڑنا جان ہی سے تو ہوتا ہے۔

تو چو عقلی ما مثال ایں زباں　　　ایں زباں از عقل می یابد بیاں

تو جیسے عقل ہو اور ہم جیسے یہ زبان، عقل ہی سے تو یہ زبان گویائی کی طاقت پاتی ہے۔

تو مثال شادی و ما خندہ ایم　　　کہ نتیجہ شادی فرخندہ ایم

تیری مثال خوشی کی کیفیت کی سی ہے اور ہماری مثال ہنسی کی سی ہے کہ وہ ہنسی خوشی کا نتیجہ ہوتی ہے اور مبارک سمجھی جاتی ہے۔ سنا آپ نے یہ اشعار کس قدر معرفت پر مبنی ہیں۔ اور حضرت مولاناؒ نے مثنوی کو مندرجہ ذیل اشعار سے شروع فرمایا ہے۔

؎ بشنو از نے چوں حکایت می کند　　　وز جدائیہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

تو مولانا نے ایک نے فرض کیا ہے اور اس سے مراد روح انسانی لیا ہے اور نیستاں فرض کیا جس سے مراد عالم ارواح ہے۔ اور فرما رہے ہیں کہ نے سے سنو کہ اپنی جدائی کی کیسی شکایت کر رہی ہے کہ جب سے نیستاں سے مجھ کو لوگوں نے علیحدہ کر دیا ہے میری نفیر سے مرد و زن رو رہے ہیں مرد سے مراد کامل اور زن سے مراد ناقص ہے یعنی سبھی لوگ اسکی جدائی کی حکایت سے پریشان ہیں۔ تو دیکھئے اسی سے کلام کو شروع فرمایا ہے اور اسکے ضمن میں بہت بہت حقائق معارف بیان فرمائے ہیں کہ اہل اللہ انکے کلام سے مست ہو گئے ہیں کتنے لوگوں کو محبت و معرفت اور فنا کا مقام حاصل ہو گیا۔ اسی کو ہم لوگ بھی پڑھتے پڑھاتے ہیں مگر کچھ اثر نہیں لیتے زبان پر جاری کر لیتے ہیں دل میں ان احوال کو پیدا نہیں کرتے۔ اس پڑھنے پڑھانے سے کیا فائدہ۔ بیروت میں عیسائی ہدایہ پڑھاتے ہیں تو کیا محض اس سے وہ مسلم و مومن ہو جائیں گے؟

پھر حضرت مولانا روم نے کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

؎ دو دہاں داریم گویا ہمچو نے　　　یک دہاں پنہانست در لبہائے وے

نے کی طرح ہم دو منہ رکھتے ہیں ایک دہان اسکے لبوں میں پوشیدہ ہے۔

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما　　　ہائے و ہوئے در فگندہ در سماء

ایک منہ اس کا تمہاری طرف نالہ کر رہا ہے جسکی وجہ سے شور و غوغا تمام آسمانوں میں ہے۔ اسی مضمون کو ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان فرما رہے ہیں ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اور یہ مضمون قرآن پاک میں بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللهَ رَمٰى

اسی مضمون کو حضرت مولانا روم نے مثال دیکر خوب خوب واضح فرمایا ہے تو دیکھئے نے ایک معمولی شے ہے مگر اس سے کیسی معرفت حاصل کی اور اس کی وجہ سے کیسے حقائق و معارف بیان ہوئے تو کیا آپ بھی ایسے ہی ہیں۔ اگر نے کی مثال نہ دیتے تو آپ کو اتنی معرفت نہ تھی کہ آپ سمجھتے اور اس کو اس موقع پر مثال میں لاتے۔

اہل اللہ مصنوعات میں تفکر کرتے رہتے ہیں اور اس سے نتائج اخذ کرتے ہیں اور اگر ہم نے ان آلات جدیدہ سے معرفت حاصل نہ کی تو بہت ہی خسارہ کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مصنوعات و مخلوقات میں تفکر و تدبر کا امر بھی فرمایا ہے اور بار بار اسکی پیدائش کو یاد دلایا کہ غور کرو کہ انسان کو کس چیز سے پیدا فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اَوَلَمْ يَرَ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ کیا آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اسکو نطفہ سے پیدا کیا سو اب وہی علانیہ اعتراض کرنے لگا ہے۔ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۔ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ أَنْشَأَهَآ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۔ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَآ أَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ۔ اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا اور اپنی اصل کو بھول گیا (کہ نطفۂ حقیر ہے جس سے ہم نے اسکو انسان بنایا۔ ورنہ طبعاً اور عقلاً ایسی بات نہ کہتا اگر اپنی اصل کو نہ بھولتا) کہتا ہے کہ ہڈیوں کو (خصوص) جب کہ وہ بوسیدہ ہوگئی ہوں کون زندہ کردیگا۔ آپ جواب دیدیجئے کہ ان کو وہ زندہ کریگا جس نے اول بار میں ان کو پیدا کیا ہے (جب کہ وہ حیات سے بہت بعید تھیں اور اب تو ایک بار وہ حیات کو قبول بھی کر چکی ہیں) اور وہ سب طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے وہ ایسا ہے کہ ہرے درخت سے تمہارے لئے آگ پیدا کردیتا ہے پھر تم اس سے اور آگ سلگا لیتے ہو۔

اگر آدمی اپنے ابتدائے خلق پر غور کرے اور سوچے کہ نطفۂ ناپاک ہماری اصل ہے تو اس پر گھمنڈ

پانی پڑ جائے۔ اگر اہل یورپ ہوں وہ بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ یاد دلا کر انسان کی ذات کو فنا کیا ہے اور خجل کیا ہے اگر خجالت کامل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ تک پہونچ جائیں مگر ان باتوں پر غور ہی کب کرتے ہیں۔ حضرت مجدد صاحب نسیان ماسوی اللہ کا بہت ذکر فرماتے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ نسیان ماسوی اللہ میں اپنے خلق کا نسیان نہیں ہے اس کا یاد کرنا ضروری ہے۔ چونکہ نسخ خلقہ ہیں اس پر نکیر ہے لہذا یہ نسیان مذموم ہوگا۔

کل میں نے چراغ منگایا تھا اور آپ لوگوں کو دکھلایا تھا مقصد تو اس کا ظاہر تھا کہ اب روشنی کے لئے بجلی ایجاد ہو گئی ہے پہلے یہ چیز نہ تھی تو متقدمین نے یہ صورت اختیار کی تھی کہ ایک برتن میں تیل ڈالتے تھے اور اس میں روئی کی بتی ڈال کر بتی کے سرے میں آگ لگا دیتے تھے وہ بتی جلنے لگتی تھی اور اس میں آہستہ آہستہ تیل پہونچتا رہتا تھا یہ ایجاد بھی کم نہ تھی نہایت فہم و دانش پر مبنی تھی۔ یہی بیان کا مقصد تھا مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آیا تو میں کیا کروں محسوسات کو بھی نہ سمجھیں تو پھر اب سمجھانے کی کیا صورت کی جائے۔

اب دوسری بات کہتا ہوں سنئے۔ صوفیہ کرام تجدد امثال کے قائل ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں مخلوقات پر ہر وقت فنا طاری ہوتا رہتا ہے۔ فنا ان پر ہر آن طاری ہوتا ہے اور دوسرا وجود بھی ہر آن ملتا ہے جو مثل وجود اول کے ہوتا ہے اور آنی ہوتا ہے لہذا محسوس نہیں ہوتا۔ اہل کشف کی تحقیق یہ ہے کہ یہ وجود ہر آن میں جدا آتا ہے مگر اتصال و تشابہ وجودات کی وجہ سے امتیاز تغایر کا نہیں ہوتا نہ درمیان کا عدم معلوم ہوتا ہے۔ اسکی ایسی مثال ہے جیسے کہ بتی کے سرے پر جو آگ کا شعلہ ہے اس میں چراغ سے ہر وقت نیا تیل آتا ہے اور فنا ہو کر دوسرا آتا ہے اسی طرح تمام تیل ختم ہو جاتا ہے مگر حس میں ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ پہلا کب فنا ہو گیا اور دوسرا کب آیا۔ اسکو تجدد امثال کہتے ہیں۔

دیکھئے تجدد امثال جو نہایت اہم مسئلہ ہے اسکو اسی چراغ سے مثال دیکر سمجھایا آپ ہی لوگ بتلائیے اس کے علاوہ اور دوسری کیا مثال ہو سکتی ہے۔ اگر یہ مثال نہ دیتے تو ہم کبھی اس کا سراغ بھی نہ لگا سکتے تھے۔ اس چراغ کی ایجاد سے صوفیہ کرام کو فائدہ پہونچا۔

اب اور سنئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال چراغ سے دی ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○

اللہ تعالیٰ نور دینے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اس کے نور کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے (اور) اس میں ایک چراغ (رکھا) ہے (اور) وہ چراغ (خود طاق میں نہیں رکھا بلکہ) ایک قندیل میں ہے (اور قندیل طاق میں رکھا ہے اور) وہ قندیل ایسا (صاف شفاف) ہے جیسا ایک چمکدار ستارہ ہو (اور) وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے کہ وہ زیتون (کا درخت) ہے جو (کسی آڑ کے) نہ پورب رخ ہے اور نہ (کسی آڑ کے) پچھم رخ ہے (یعنی نہ اس کی جانب شرقی میں کسی درخت یا پہاڑ کی آڑ ہے کہ اول نہار میں اس پر دھوپ نہ پڑے اور نہ اس کی جانب غربی میں کوئی آڑ ہے کہ آخر نہار میں اس پر دھوپ نہ پڑے بلکہ کھلے میدان میں ہے جہاں تمام دن دھوپ رہتی ہے۔ ایسے درخت کا روغن بہت لطیف اور صاف اور روشن ہوتا ہے اور) اس کا تیل (اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ) اگر اس کو آگ بھی نہ چھووے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا (اور جب آگ بھی لگ گئی تب تو) نور علی نور ہے — یعنی (ایک تو اس میں خود قابلیت نور کی اعلیٰ درجہ کی تھی پھر اوپر سے فاعل یعنی نار کے ساتھ اجتماع ہو گیا اور پھر اجتماع بھی ان کیفیات کے ساتھ کہ چراغ قندیل میں رکھا ہو جس سے بالمشاہدہ چمک بڑھ جاتی ہے اور پھر وہ ایسے طاق میں رکھا ہو جو ایک طرف سے بند ہے ایسے موقع پر شعاعیں ایک جگہ سمٹ کر بہت تیز روشنی ہوتی ہے اور پھر تیل بھی زیتون کا جو مزید اشراق وقلت دخان میں مشہور ہے تو اس قدر تیز روشنی ہو گئی جیسے بہت سی روشنیاں جمع ہو گئی ہوں اس کو نور علی نور فرمایا۔

دیکھئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال ایسے منور طاق سے دی جس میں چراغ رکھا ہوا ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے اور وہ قندیل ایسا صاف شفاف ہے جیسا کہ ایک چمکدار ستارہ ہو۔ اور نیز اللہ تعالیٰ نے اس قندیل کی تشبیہ شمس وقمر سے نہ دی اس لئے کہ یہ دونوں خسوف وکسوف کے وقت مظلم وتاریک دکھلائی پڑتے ہیں۔ بخلاف کوکب کے کہ جب بھی نظر آتا ہے نورانی اور روشن ہی نظر آتا ہے۔

اور اسکو بھی ملاحظہ فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی تشبیہہ مصباح سے دی۔ اس نئی روشنی (یعنی بجلی) سے نہیں دی اگر مصباح سے یہ بجلی یا کوئی اور شئے بڑھ کر ہوتی تو اسی سے تشبیہہ دیتے مصباح سے نہ دیتے۔ اب اس نئی روشنی کا حال سنئے کہ جب جلتی ہے تو اجالا ہی اجالا رہتا ہے مگر آئے دن خراب ہوتی ہے ایک دن عشا کی جماعت ہو رہی تھی کہ یکایک اندھیرا ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ بجلی فیل ہوگئی بہت ضیق ہوئی نماز کی حالت میں کیا کیا جا سکتا تھا؟ اس کے بعد موم بتی سے روشنی کی گئی۔ جب میں نے دیکھا کہ روزانہ یہی معاملہ رہتا ہے تو مسجد میں لالٹین کا انتظام کردیا اور یہاں بھی اور گھر میں بھی لالٹین لگوادی تاکہ بوقت ضرورت کام آیا کرے۔ روزانہ اسکی لائن ہی خراب رہتی ہے کہاں تک ان کے تابع رہا جائے۔ روشنی اپنی اور اسکے جلانے میں دوسروں کے تابع رہیں یہ کون سی عقل ہے اور اس چراغ کو دیکھئے کہ اپنے اختیار میں ہے کہ جب چاہیں بجھادیں اور جب ضرورت ہو جلادیں۔ آپ لوگوں کو بجلی پسند ہے مگر بھائی ان پریشانیوں کی وجہ سے اس سے میری طبیعت گھبراتی ہے کہ ایک وقت خوب روشنی ہے چل پھر رہے ہیں کام دھام کررہے ہیں اور اچانک اندھیرا گھپ ہوجاتا ہے اور سب لوگ بیکار ہوجاتے ہیں۔ آپ کی نئی روشنی کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ کُلَّمَا اَضَاءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِیْہِ وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَیْھِمْ قَامُوْا وَلَوْشَاءَ اللّٰہُ لَذَھَبَ بِسَمْعِھِمْ وَاَبْصَارِھِمْ۔ بجلی کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بینائی اس نے لی جہاں انکو ذرا بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کیا اور جب ان پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رکھ گئے اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو ان کے گوش وچشم سب سلب کرلیتے۔

سنا آپ نے آپ کی بجلی کی یہ حیثیت ہے۔ اسکی وجہ سے چھوٹے چھوٹے بچوں کے آنکھ کی روشنی خراب ہوگئی ہے عینک کی ضرورت پڑگئی ہے۔ جتنی ایجادات بڑھتی جارہی ہیں میں دیکھتا ہوں کہ صحت خراب ہوتی جارہی ہے یہ مزدور اب تھوڑی دور بھی پیدل نہیں چلتے۔ اپاہج ہوتے جارہے ہیں۔ مگر سب لوگ بس دوڑ دوڑ کر یورپ چلے جارہے ہیں۔ اور ان سے تمدن حاصل کررہے ہیں مگر ان لوگوں کو نہیں معلوم کہ مسلمانوں سے ان لوگوں نے تمدن سیکھا ہے انکو اپنے گھر کی خبر نہیں۔ عجم کے لوگ تو جاتے ہی ہیں اہل عرب بھی عیسائیوں کے یہاں چلے جارہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں ؟

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب　　اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

اس شعر کو ایک عالم نے لوگوں کے سامنے پڑھا سن کر سب خوش ہوئے خوب ہنسے مگر مذہب جب بھی نہیں بدلا۔ سب لوگ ان کے خیالات سے متاثر ہوگئے ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب سنئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی تشبیہ میں مشکوۃ کا ذکر فرمایا ہے تو ہمیں سے علماء مشکوۃ نبوت کا لفظ استعمال فرماتے ہیں اور ایک حدیث کی کتاب کا نام ہی مشکوۃ المصابیح رکھا ہے اس لئے کہ یہ سب احادیث حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مشکوۃ یعنی صدر مبارک سے ظاہر ہوئی ہیں پس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا صدر مبارک مشکوۃ ہے اور آپ کے قلب میں جو علوم و معارف ہیں وہ مصباح ہیں اور اس کا تیل آپ کی باطنی استعداد ہے جس سے آپ نور کو اخذ فرماتے ہیں اور مخلوق پر افاضہ فرماتے ہیں۔

اب دوسری آیت سنئے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سراج منیر فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۝ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝ اے نبی ہم نے بیشک آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہونگے اور آپ بشارت دینے والے ہیں اور ڈر سنانے والے ہیں۔ اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں ــــ مجھے　اس وقت سراج منیر ہی کے متعلق کچھ بیان کرنا ہے۔ مگر اس سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد مبشر نذیر اور داعی الی اللہ فرمایا گیا ہے تو ان کا بھی مختصراً بیان کرتا ہوں اسلئے کہ شاہد وغیرہ کا لفظ بولتے تو بہت سے لوگ ہیں مگر اس کے معنی بہت کم لوگ سمجھتے ہونگے۔ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں۔

انا ارسلنٰک شاھداً۔ ای علی امتك	یعنی آپ کو ہم نے آپ کی امت پر شاہد بنا کر بھیجا ہے (چنانچہ)
اخرج ابن المبارك عن سعید ابن المسیب	ابن مبارک نے سعید ابن مسیب سے تخریج کی ہے کہ
قال لیس من یوم الا و یُعرضُ علی النبی	کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ جس میں صبح و شام حضور
صلی اللہ علیہ وسلم اُمتہٗ غدوۃً و عشیۃً	پر آپ کی امت پیش نہ کی جاتی ہو تو آپ انکو انکی
فیعرفھم بسیماھم ولذلك یشھد علیھم	سیما و علامت سے پہچانتے ہیں اور اسی وجہ سے
	ان پر شاہد ہونگے۔

اوشاھداً لامتك مصدقا لھم حین یشھدون الرسل علی الامم بالتبلیغ

(اور دوسرا مطلب ہے) کہ آپ اس وقت اپنی امت کے لئے شاہد اور انکے مصدق ہونگے جبکہ یہ لوگ شہادت دینگے کہ رسولوں نے امم کو تبلیغ (احکام) کردی تھی۔

اخرج البخاری والترمذی والنسائی وابن ماجه عن ابی سعید الخدری قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یدعی نوح یوم القیامة فیقال له هل بلغت فیقول نعم فیدعی امته فیقال لهم هل بلغکم فیقولون ما اتانا من نذیر وما اتانا احد فیقال من یشهد لك فیقول محمد وامته الحدیث

حضرت ابو سعید سے بخاری ترمذی نسائی ابن ماجہ نے تخریج کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نوح (علیہ السلام) قیامت کے دن بلائے جائینگے اور ان سے کہا جائیگا کیا آپ نے تبلیغ کردی تھی تو نوح علیہ السلام فرمائینگے کہ ہاں پھر انکی امت طلب کی جائیگی اور ان سے سوال ہوگا کہ تم لوگوں کو انھوں نے تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس نہ تو کوئی ڈرانے والا آیا اور نہ کوئی اور۔ تو نوح علیہ السلام سے کہا جائے گا کہ آپ کا کوئی شاہد ہے وہ فرمادیں گے کہ ہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی امت۔ الحدیث۔

دیکھئے شاہد کے معنی مفسرین یہ لکھتے ہیں اب مبشراً ونذیراً کے متعلق سنئے آپ مومنین کے لئے مبشر ہیں اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے انکے لئے نذیر ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں اور رسولوں کی تصدیق کرتے ہیں انکو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کی بشارت دینے والے ہیں اور جو لوگ کفر ومعصیت کرتے ہیں انکو وعیدیں سنا کر ڈرانے والے ہیں۔ دَاعِیاً اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید وطاعت اور انکی جنت اور لقاء غیر تکیف کی طرف اللہ کے امر اور ان کے آسان فرمادینے سے داعی ہیں۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ داعیاً کو باذنہ کے ساتھ اس لئے مقید فرمایا کہ اس بات کی طرف اشارہ کریں کہ بغیر جناب قدس سے معونت کے یہ کام نہایت سخت اور دشوار ہے، خصوصاً اللہ تعالیٰ کی لقاء کی طرف دعوت دینا (تو بہت ہی صعب ہے) اسلئے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ تک پہونچنا بغیر اللہ تعالیٰ کے فضل کے ممکن ہی نہیں ہے۔ اور صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ

باذنه ای بتسهیله وتیسیره تعالیٰ۔ وباذنه من متعلقات داعیاً وقیدت الدعوة بذلك

باذنہ یعنی اللہ تعالیٰ کی تسہیل وتیسیر کے ساتھ اور لفظ باذنہ داعیاً کے متعلق ہے چنانچہ دعوت کو باذنہ سے اسلئے مقید

ایذانا بانها امر صعب المنال و خطب فی غایة الاعضال لا یتاتی الا بامداد من جناب قدسه کیف لا و هو صرف للوجوه عن القبل المعبودة وادخال الاعناق فی قلادة غیر معهودة

کہا گیا ہے تاکہ اس بات کی طرف اشارہ ہوجائے کہ اس امر کا حصول بہت ہی دشوار ہے امر عظیم ہے نہایت ہی مشکل ہے اسکو بغیر جناب قدس سے امداد کے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اور کیوں نہو حال یہ ہے کہ وہ (یعنی دعوت) وجوہ کا پھیرنا ہے ان قبلوں سے جنکی عبادت کی جارہی ہے اور غیر معہود قلادہ میں گردنوں کو ڈالنا ہے۔

دیکھئے مفسرین تو یہ فرمارہے ہیں کہ باذنہ کی قید اس لئے لگائی ہے تاکہ یہ بتلادیں کہ دعوت کا کام نہایت مشکل و دشوار ہے اللہ تعالی کی طرف سے جب تک نصرت و تائید نہو کوئی شخص کر ہی نہیں سکتا اسلئے کہ اس میں لوگوں کے رخ کو پھیر کر اللہ تعالی کی طرف لانا ہوتا ہے اور ایسے قلادہ میں گردنوں کو ڈالنا ہوتا ہے جو غیر مانوس و غیر معہود ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ کتنا دشوار امر ہے۔ مگر اب کے لوگ سب سے آسان کام دعوت الی اللہ ہی کو سمجھتے ہیں کہ نہ اس میں عقل کی ضرورت ہے اور نہ علم کی۔ مدار کامیابی مجمع کی کثرت کو سمجھتے ہیں۔ صاحب روح المعانی قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ کے تحت اپنے زمانہ کے دعاۃ کا حال بیان فرمارہے ہیں سنئے:۔

والدعاة الی اللہ تعالی الیوم من هؤلاء الذین نصبوا انفسهم الی الارشاد بزعمهم اجهل من حمار الحکیم

اور آج کل کے داعی اللہ جنھوں نے اپنی زعم میں اپنے کو مسند ارشاد پر نصب کرلیا ہے وہ تو بھکتے رہنے میں حکیم کے گدھے سے بھی زیادہ جاہل ہیں۔

توها وهم یعمری فی ضلالة مدلهمة ومهامه یحار فیه الخریت و هم یحسبون انهم یحسنون صنعا ولبئس ما کانوا یصنعون

قسم ہے میری عمر کی کہ یہ لوگ بہت ہی تاریک ضلالت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایسے جنگلوں میں ہیں جن میں ماہر رہبر بھی حیران ہوجاتا ہے۔ اور یہ لوگ گمان کر رہے ہیں کہ کوئی اچھا کام کر رہے ہیں حالانکہ جو کچھ کر رہے ہیں بہت ہی برا ہے۔

یہ صاحب روح المعانی فرمارہے ہیں میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ خوب سمجھ لیجئے۔

اب سراج منیر کے متعلق سنئے کہ چونکہ آپ اللہ تعالی کی طرف داعی اور راہبر ہیں اور الحمد

میں روشنی کی ضرورت پڑتی ہے اسلئے آپ کو روشنی عطا کی گئی بلکہ آپ کی ذات مبارک ہی کو روشن چراغ بنا دیا گیا اور پھر کیسا چراغ جس کو خود اللہ تعالیٰ نے روشن کیا ہے اس کی روشنی کیسی ہوگی کیا وہ کسی کے بجھانے سے بجھ سکتا ہے ہرگز نہیں یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِؤُا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاہِہِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ۔ ایک عارف فرماتے ہیں ؎

چراغے را کہ ایزد می فروزد ہر آں کو تف زند ریشش بسوزد

اسی نور کا حصہ اہل اللہ کو بھی ملا ہے اور یہ آفتاب و ماہتاب کے نور سے کہیں بڑھ کر ہے۔ حضرت مولانا روم اپنے شیخ شمس تبریزؒ کی تعریف میں فرماتے ہیں

شمس تبریزی کہ نور مطلق است آفتاب است وز انوار حق است

فرما رہے ہیں کہ شمس تبریز کی جب بات آئی تو آفتاب شرمندہ ہو کر غروب ہو گیا اسلئے کہ وہ اجسام کو نور بخشتا ہے اور ہمارا شمس ارواح کو نور عطا کرتا ہے۔ اور یہ نور کبھی بجھتا نہیں ہے اور کبھی مظلم نہیں ہوتا۔ آخر اس نور کو کب حاصل کیجئے گا کیا مرنے کے بعد!

چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحبؒ تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں کہ:

قولہ تعالیٰ وسراجاً منیراً سماہ سراجاً لانہ یستضاء بہ ویہتدی بہ کالسراج یستضاء بہ ویہتدی بہ فی ظلمۃ اللیل یعنی انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان بلسانہ داعیاً الی اللہ وبقلبہ وقالبہ کان مثل السراج یتلون المومنون بالوانہ و یتنورون بانوارہ کالعالم یتنور بنور الشمس والبیت بالسراج۔ ولاجل ذالک اختصت الصحابۃ رضی اللہ عنہم بمزید

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سراج رکھا اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے منور حاصل کیا جاتا ہے اور اسی سے ہدایت پکڑی جاتی ہے جیسے کہ سراج سے رات کی ظلمت میں روشنی اور ہدایت حاصل کی جاتی ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی لسان سے تو اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے اور داعی الی اللہ تھے مگر آپ اپنے قلب و قالب سے مثل سراج کے تھے کہ آپ کے الوان سے مومنین متلون ہو جاتے تھے اور آپ کے انوار سے متنور ہو جاتے تھے جیسے کہ یہ عالم آفتاب کے نور سے منور ہو جاتا ہے اور گھر سراج کے ذریعہ روشن ہوتا ہے اسی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم اوروں کے مقابلہ میں مزید فضل کے ساتھ مختص ہوئے کیونکہ وہ

الفضل علی الناس فان العلوم التی تلقتہا الامۃ من لسانہ لم یتفاوت فیہ الناس من الصحابۃ وغیرھم بل رب مبلغ اوعی من سامع اما التنور بانوار فانہ وان کان حاصلاً للناس بتوسط اصحابہ واصحاب اصحابہ الی یوم القیامۃ لکن لیس الغائب فیہ کالشاھد بل مثلہ کمثل بیت تنور بنور الساحۃ التی تنورت بنور الشمس لاجل مقابلتہا واین ھذا من ذلک واللہ اعلم

علوم جن کو امت نے حضورؐ کی لسان سے تلقی کیا ہے ان میں صحابہ اور غیر صحابہ متفاوت نہیں ہیں بلکہ بہت سے مبلغ زیادہ محفوظ کرنے والے ہیں سامع سے۔ بہر حال آپؐ کے انوار سے تنور اگرچہ لوگوں کو صحابہ کے واسطے یا صحابہ کے اصحاب کے توسط سے قیامت تک حاصل ہوتا رہیگا۔ لیکن غائب مثل حاضر کے نہیں ہوسکتا بلکہ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی حجرہ ہے جو کہ صحن کے نور سے متنور ہے اور صحن آفتاب کے مقابل ہونے کی وجہ سے (خود) اس کے نور سے متنور ہوگیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے۔

قاضی صاحبؒ فرما رہے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار سے متنور ہونے میں صحابہ اور غیر صحابہ میں تفاوت ہے۔ صحابہ کو نور زیادہ ملا ہے اور بعد والوں کو کم۔ اسلئے کہ غائب شاہد کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اور یہ فرمایا کہ صحابہ کو جو جمیع امت پر فضیلت حاصل ہے تو اسی نور کی زیادتی کی وجہ سے ورنہ تو علوم کی تلقی میں سب برابر ہیں۔

اس پر عرض کرتا ہوں کہ قاضی صاحب انوار میں تفاوت کو تو فرما ہی رہے ہیں مگر علوم میں تساوی کے قائل ہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ نفس احکام و شرائع میں تو سب لوگ برابر ہیں مگر فہم وادراک میں ضرور تفاوت ہے۔ صحابہ جتنا حضور کی صحبت کی وجہ سے سمجھتے تھے دوسرے لوگ نہیں سمجھ سکتے خود صحابہ میں فہم کے اعتبار سے فرق ہے جتنا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے کوئی دوسرا نہیں سمجھتا تھا چنانچہ یہ کہا گیا کہ وہ ہم میں سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق لوگوں کو خیال ہوا کہ انکو حضورؐ نے کچھ زیادہ باتیں بتلائی ہیں، آپ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ نہیں ایک آدمی کو فہم فی القرآن دیا جاتا ہے اسکی وجہ سے وہ ایسی باتیں بیان کرتا ہے جنکو دوسرے لوگ نہیں بیان کرسکتے۔ تو پھر بعد والے صحابہ کا کیا مقابلہ کرسکتے ہیں؟

قاضی صاحب نے صحابہؓ اور غیر صحابہ کے انوار میں تفاوت کی یہ مثال دی ہے کہ صحابہ کی مثال

تو ایسی ہے جیسے ساحت (صحن مکان) کہ وہ بلا واسطہ شمس کے نور سے متنور ہوتا ہے اسلئے کہ آفتاب اور ساحت کے درمیان کوئی حائل نہیں ہے اور بعد والوں کی مثال ایسی ہے جیسے کمرہ کہ آفتاب کی روشنی وہاں تک نہیں پہنچ رہی ہے بلکہ ساحت (صحن) چونکہ متنور ہے اسلئے اس کا نور کمرہ میں جارہا ہے جس کی وجہ سے کمرہ روشن ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کمرہ کے متعلق جو یہ فرمایا کہ ساحت کی روشنی سے متنور ہے تو یہ سمجھئے کہ صحن و ساحت میں جو نور ہے اسکا تو آفتاب سے ہونا ظاہر ہے مگر کمرہ میں جو روشنی ہے وہ بھی حقیقتاً آفتاب ہی کا نور ہے ساحت کا نہیں۔ ساحت چونکہ آفتاب کے مقابلہ میں ہے اسلئے اس کا نور قوی اور زیادہ پہونچا ہے لیکن کمرہ چونکہ آفتاب کے مقابلہ میں نہیں پڑتا اس لئے اس کا نور اس تک پہونچتے پہونچتے ضعیف ہوجاتا ہے لیکن جتنی بھی روشنی ہے وہ سب ہے آفتاب ہی کی، ساحت کی نہیں۔ بعینہ اسی طرح صحابہ کو جو نور ملا ہے وہ بلا واسطہ ملا ہے اور سراج منیر سے براہ راست متنور ہوئے ہیں اور صحابہ جو سراج منیر سے متنور ہوئے ہیں ان سے دوسرے لوگ متنور ہوتے ہیں مگر وہ نور خود صحابہ کا نہیں ہے اصل نور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ہے۔ واسطہ کی کمی زیادتی کی وجہ سے نور کے ضعف و قوت میں تفاوت ہو جاتا ہے۔

اب اصل مضمون سنئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سراج منیر فرمایا اسلئے کہ اس سے روشنی کا حاصل کرنا آسان ہے اور اپنے اختیار کی چیز ہے ہر وقت اس سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے اور یہ بھی سنئے کہ اس کے ذریعہ سے بہت سے چراغ روشن ہوسکتے ہیں ان رعایات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سراج منیر فرمایا گیا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ روشنی خالی یہی روشنی یعنی بجلی ہے اللہ تعالیٰ نے اہل اللہ کے قلب میں نور عطا فرمایا ہے اگر اللہ تعالیٰ نہ بیان فرماتے تو آپ لوگ سمجھتے کہ خالی آفتاب و ماہتاب ہی میں روشنی ہے اور نور خالی بجلی ہی میں ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتاً فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ۔ الخ

کیا ایسا شخص جو کہ مردہ تھا ہم نے اسکو زندہ بنادیا اور ہم نے اسکو ایک ایسا نور دیدیا کہ وہ اس کو لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے۔ الخ تو آپ نے سنا ایسا نور ہے کہ اسکو لے کر لوگوں میں چلتا پھرتا ہے مگر آپ کو معلوم نہیں۔ آپ اسی بجلی اور جدید آلات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں آخر

اللہ تعالیٰ کی مصنوعات میں کب غور کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ ۝ وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِیْرِ ۝ جس نے سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے تو خدا کی اس صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھے گا سو تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ۔ نگاہ ذلیل اور درماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آوے گی۔ اور ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں (ستاروں) سے آراستہ کر رکھا ہے اور ہم نے ان کو شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بھی بنایا ہے اور ہم نے ان شیطانوں کے لئے دوزخ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ آسمان میں نگاہ کرنے کو فرما رہے ہیں اور اس میں عدم خلل کو بیان فرما رہے ہیں۔ اور آپ کے آلات تو برابر خلل پذیر ہوتے رہتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی مصنوعات کو دیکھئے کہ نہ کبھی خراب ہوتے ہیں اور نہ بگڑتے ہیں۔

آخر کیا بات ہے کہ لندن اور امریکہ سے کوئی خبر آتی ہے تو اسکو بے چون وچرا تسلیم کر لیتے ہو اور انبیاء جن باتوں کی اطلاع دیتے ہیں انکو کیوں نہیں مانتے۔ جب انبیاء کا اخبار تمہارے نزدیک معتبر نہیں تو پھر اخبار کو اور لندن اور امریکہ کے لوگوں کی باتوں کو بھی مت تسلیم کرو۔ انبیاء علیہم السلام صادق ہوتے ہیں انکی ہر خبر سچی ہوتی ہے اس سے علم یقین حاصل ہوتا ہے جیسے عقل وحواس سے حاصل ہوتا ہے بلکہ انبیاء کی خبریں عقل وحواس سے حاصل شدہ باتوں سے بھی زیادہ قابل یقین ہیں۔ صاحب شرح العقائد فرماتے ہیں۔

لما وجدوا بعض الادراکات حاصلۃ عقیب استعمال الحواس الظاهرۃ التی لا شک فیها سواء کان من ذوی العقول او غیرهم جعلوا الحواس احد اسباب العلوم ولما کان معظم المعلومات الدینیۃ مستفاداً من الخبر الصادق جعلوہ سبباً آخر۔

یعنی چونکہ بعض ادراکات یقیناً حواس ظاہرہ کے استعمال کے بعد ہی حاصل ہوتے ہیں تو حواس کو اسباب علوم کا ایک سبب قرار دیا اسی طرح چونکہ معلومات دینیہ کا اکثر حصہ خبر صادق سے

مستفاد ہے اسلئے خبر صادق کو بھی ایک مستقل سبب کر دیا ہے ـــــ تو دیکھئے خبر صادق کا یہ درجہ ہے اب انبیاء سے زیادہ کون سچا ہوگا۔ ابو جہل سے ایک شخص نے تنہائی میں حضور کے متعلق پوچھا تو کہا کہ بھائی وہ کبھی جھوٹ بولے ہی نہیں (یعنی وہ دعوائے نبوت میں بھی سچے ہیں) مگر پھر بھی ایمان نہ لایا۔ اب ہم اپنے کو مسلمان کہے جاتے ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخبار کی تصدیق نہیں کرتے۔ آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو اغیار پریشان کر رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں غلط ہے ہم کو ہماری بے ایمانی اور نفاق نے پریشان کر دیا ہے آج ایمان لاؤ دیکھو پریشانی ختم ہوتی ہے یا نہیں ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا تو پڑتا نہیں بس ہر چیز کو عقل سے سمجھنا چاہتے ہیں ہر حکم کی لم اور علت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

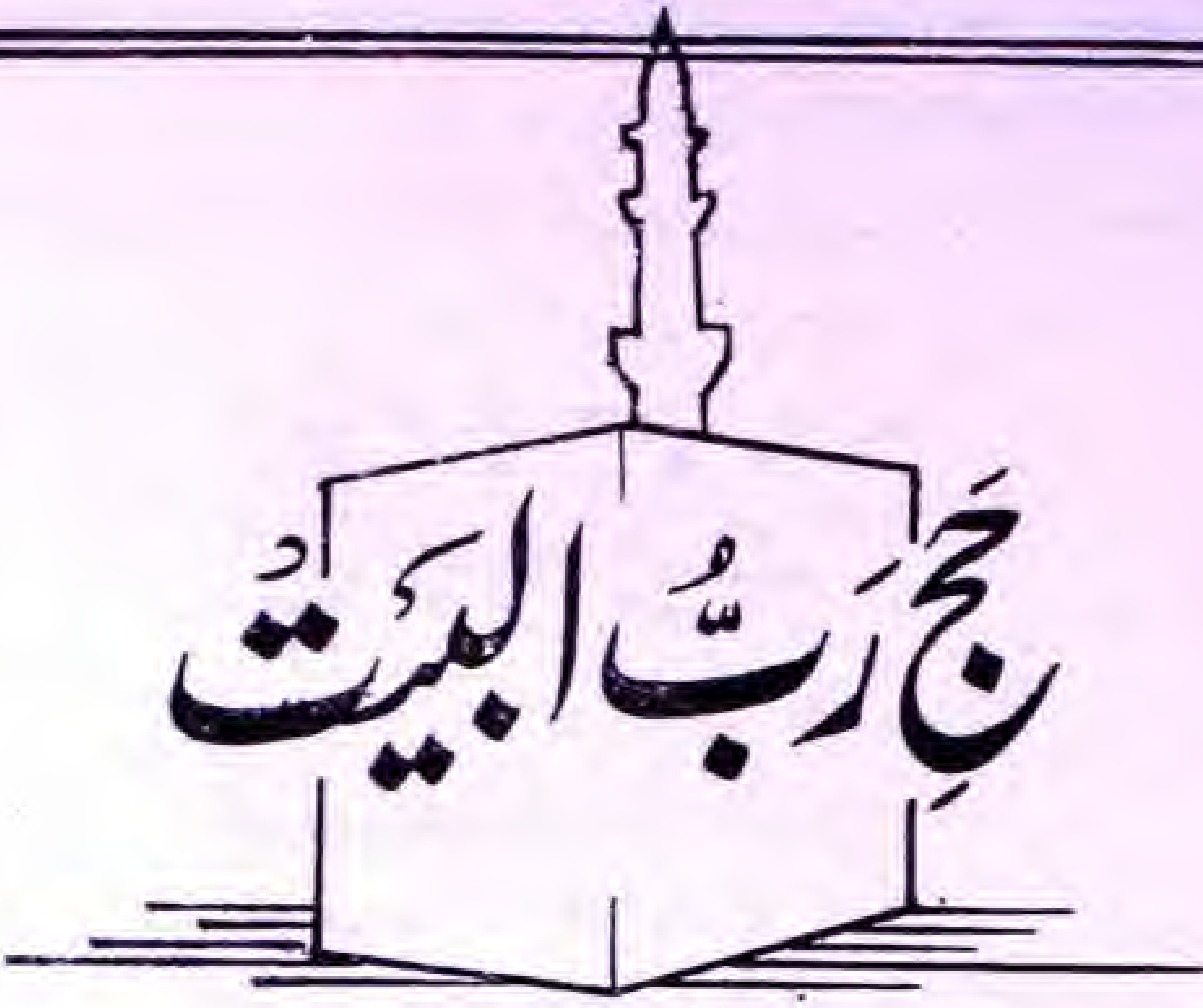
اور یہ جو ایجادات کرتے ہیں یہ اپنے عقل و دماغ کا کرشمہ سمجھتے ہیں ذرا بھی اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ نہیں ہوتی حالانکہ یہ چیز ایسی ہے کہ اس سے قلب میں ایمان پیدا ہو جائے مگر جتنے بڑے عقلمند ہیں اتنے ہی بڑے منکر اور بے ایمان ہیں۔ اہل اللہ نے انھیں چیزوں سے معرفت وعبرت حاصل کی ہے ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفترے است معرفت کردگار

(یعنی ہرے بھرے درختوں کے پتے ایک عاقل کی نگاہ میں ایسے ہیں کہ گویا ہر ہر پتہ اس کا حق تعالےٰ کی معرفت کا ایک ایک دفتر ہے۔)

اخیر میں یہ بات عرض کرتا ہوں کہ میں ان ایجادات کا منکر اور مخالف نہیں ہوں مگر ہاں ان ایجادات میں لگ کر اللہ تعالیٰ اور اسکی مصنوعات سے غفلت بھی نہ ہونا چاہئے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ سے غفلت حرام ہے اور جو شے مورث و موجب بنے حرام کا وہ خود بھی حرام ہوتی ہے۔

ختم شد



حجِ ربِّ البیت

از افاضات

مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نوّر اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"حَجِّ رَبِّ الْبَیْتِ"

نحمدہ ونصلے علےٰ رسولہ الکریم

امابعد۔ بزرگان دین کے ملفوظات اوران کی عبارات میں اس قسم کا مضمون پایا جاتا ہے جس سے ظاہر بینوں کو کچھ توحش ہوتاہے اور ممکن ہے بعض غیر معتقد بھی ہوجاتے ہوں۔ ایسے اقوال اگر فرقۂ باطنیہ سے صادر ہوں تو قابل انکار ورد ہوں گے اور اگر کسی متبع سنت سے منقول ہوں تو مبادرت بالانکار (یعنی سنتے ہی جلدی سے انکار کر بیٹھنا) جائز نہ ہوگا۔ یعنی مراد اگر نہ بھی سمجھ میں آئے تب بھی انکار منع ہوگا۔ بطور مثال کے اب چند اقوال لکھتا ہوں۔ پھران کی توجیہ عرض کروں گا۔

(۱) مثلاً ملفوظات حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ میں صفحہ ۱۵۵ پر زیر عنوان "ذکر زیارت مکہ معظمہ"۔ یہ عبارت ہے کہ ———— ؟

بعد ازاں فرمود کہ بعد از نقل شیخ الاسلام فرید الدہر قدس سرہ العزیز مرا اشتیاق حج عظیم غالب شد۔ گفتم بائے دراجودھن بردم بزیارت شیخ۔ القصہ چوں بزیارت شیخ الاسلام رسیدم آں مقصود من حاصل گشت مع شئ زائد۔ بار دیگر ہم چنیں ہوس باعث آمد باز۔ بزیارت شیخ رفتم آں غرض حاصل شد۔

اس کے بعد فرمایا کہ شیخ الاسلام حضرت بابا فرید گنج شکر قدس سرہٗ کے یہاں سے واپس ہونے پر مجھے حج بیت اللہ کا شوق ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ اجودھن چلا جاؤں، اور حضرت شیخ کی زیارت سے مشرف ہوں۔ غرض شیخ الاسلام کی زیارت کیلئے گیا —— تو مجھے میرا مقصود مع شئی زائد حاصل ہوگیا۔

پھر دوسری بار اسی طرح کا شوق غالب آیا چنانچہ پھر حضرت شیخ کی زیارت کو چلا گیا۔ میری غرض پوری ہوگئی۔

(فوائد الفواد)

(۲) یا مثلاً اسی کتاب میں ذرا آگے چلکر یہ عبارت ہے کہ :-
بحج کسے رود کہ او را پیر نباشد ———— یعنی حج کرنے وہ شخص جائے جس کا پیر نہ ہو۔
(۳) یا مثلاً اسی کتاب میں یہ مصرعہ بھی ہے جو کہ بہت مشہور اور زبان زد ہے کہ :-
ع آں رہ بسوئے کعبہ بر دو ایں بسوئے دوست
یعنی وہ راستہ تو صرف کعبہ ہی تک جاتا ہے اور مشائخ کی صحبت کا راستہ براہ راست دوست تک لے جاتا ہے۔
(۴) یا مثلاً مثنوی مولانا روم کا یہ شعر ہے ؎
صورتے کو فاخر و عالی بود
اُو زبیت اللہ کے خالی بود
یعنی جو صورت کہ نور ایمان اور آثار عمل سے مزین ہو کر فاخر اور عالی ہو جاتی ہے وہ بیت اللہ سے کب کم ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح سے بیت اللہ۔ اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ اور اسکی معرفت کا ایک ذریعہ اور اس کی ذات کا مظہر ہے۔ اسی طرح سے اولیا اللہ بھی حق تعالیٰ کے مظہر اتم ہوتے ہیں حضرات صوفیہ صافیہ کے نزدیک یہ تمام عالم اللہ تعالیٰ کا مظہر ہے اور ذات حق اس میں ظاہر ہے۔
(۵) یا مثلاً ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎
اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید
معشوق دریں جاست بیائید بیائید
یعنی اے لوگو جو حج کو جا رہے ہو کہاں جا رہے ہو کہاں جا رہے ہو معشوق تو یہیں موجود ہے۔ اِدھر آؤ۔ اِدھر آؤ۔
(۶) یا مثلاً حضرت بایزید بسطامی رح کا وہ واقعہ جسے مولانا روم رح نے مثنوی میں بیان فرمایا ہے سرخی یہ قائم فرمائی ہے۔
"رفتن بایزید بسطامی بکعبہ و در راہ بخدمت بزرگے رسیدن و گفتنِ آں بزرگ کہ کعبہ من ام مرا طواف کن"
پھر اس عنوان کے تحت یہ اشعار بیان فرمائے ہیں ؎
حق آں حقے کہ جانت دیدہ است ‌ ‌ ‌ کہ مرا بر بیت خود بگزیدہ است
(اس خدائے برحق جل جلالہ کی قسم ہے جسے تیری جان نے دیکھ لیا ہے ———— کہ اسی نے مجھے اپنے بیت سے بھی بڑا درجہ دیا ہے

کعبہ ہر چندے کہ خانہ بر اوست
اگرچہ کعبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکیوں کا گھر ہے

خلقت من نیز خانہ سر اوست
تو سمجھ رکھو کہ میری پیدائش بھی اللہ تعالیٰ کے راز کا گھر ہے

تا بکرد آں خانہ را در وے نرفت
جب سے اس گھر کے گرداگرد نہیں گیا

واندریں خانہ بجز آں حی نرفت
تو یاد رکھو کہ میرے دل کے گھر میں بجز ذات حی قیوم کے کسی کا خطرہ نہیں گذرا

چوں مرا دیدی خدا را دیدہٗ
اب جو تم نے مجھے دیکھ لیا ہے تو سمجھ لو کہ تم نے خدا تعالیٰ ہی کو دیکھ لیا ہے

گرد کعبہ صدق بر گردیدہٗ
اور سچے کعبہ کے گرداگرد تم گھوم لئے

خدمت من طاعت و حمد خدا ست
میری خدمت میں رہنا اور میری خدمت کرنا ہی خدا کی اطاعت اور اسکی حمد کے برابر ہے

تا نہ پنداری کہ حق از من جدا ست
دیکھنا کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا مجھ سے الگ کہیں ہے

چشم نیکو باز کن در من نگر
ذرا آنکھیں خوب کھولو اور میرے اندر نظر ڈالو

تا بہ بینی نور حق اندر بشر
تب تمھیں انسان کے اندر حق کا نور نظر آئے گا

بایزیدا ! کعبہ را دریافتے
اے بایزید! (میرے پاس جو تم آگئے تو گویا) کعبہ ہی کو پا گئے

صد بہاو عز و صد فر یافتی
اب سینکڑوں عزت ۔ رونق ۔ اور مرتبہ پاؤ گے

کعبہ را یک بار بیتی گفتہ یار
خدائے تعالیٰ نے کعبہ کو تو صرف ایک ہی بار بیتی (میرا گھر) فرمایا

گفت یا عبدی مرا ہفتاد بار
گر مجھے تو حق تعالے نے ستر بار یا عبدی کہہ کر پکارا ہے

بایزید آں نکتہا را ہوش داشت
بایزید نے ان تمام نکتوں کو غور سے سنا

ہمچو زریں حلقہ اش در گوش داشت
اور ان نکتوں کو کان کا زیور سمجھ کر کانوں میں ڈال لیا

آمد از وے بایزید اندر مزید
اس عقیدتمندی کی بدولت بایزید کو اور ترقی کی دولت ملی

منتہی در منتہی آخر رسید
اور آخرکار انتہائی منتہا تک وہ پہنچ گئے

حضرات مشائخ کے ان سب اقوال میں بیت اللہ کا خود ان کی ذات کے ساتھ تقابل کیا گیا ہے بلکہ بعض کلام میں تو صحبتِ مشائخ کو زیارت بیت اللہ پر ترجیح دی گئی ہے۔ اسی سے عام طبائع کو توحش ہو کر مشائخ کے ان کلمات پر انکار پیدا ہوتا ہے تو اس کے متعلق یہ سمجھئے کہ جن حضرات کے یہ کلمات ہیں اُن میں سے بہت سے بلکہ تقریباً سبھی مسلّم شیخ اور متبع سنت بزرگ ہوئے ہیں جن کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی یہ باتیں زندقہ اور گمراہی کی ہیں کیونکہ ان حضرات کو شریعت کی حدود کا جس قدر خیال و لحاظ ہوتا ہے ہم لوگوں کو تو اس کا عُشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔ نیز عوام الناس کو دین کا جو کچھ بھی خیال

پیدا ہوتا ہے، وہ انہیں حضرات کی برکت سے ہوتا ہے، تو اب اگر یہی لوگ گمراہ ہوجائیں گے تو پھر ہدایت کہاں ہوگی۔ لیکن بات یہ ہے کہ بزرگوں کے کلام کو سمجھنا آسان نہیں ہے بالخصوص اس زمانہ میں جبکہ لوگوں کو دین سے اور بزرگانِ دین سے مناسبت ہی باقی نہیں ہے اور نہ اُن کی معرفت ہی حاصل ہے اس لئے ان کی بات بھی نہیں سمجھتے۔

تاہم جب ان بزرگوں نے اس مضمون کو لکھا ہے تو آخر اس میں کوئی نہ کوئی بات تو ضرور رہی ہوگی اس کے متعلق بطور قاعدہ کلیہ کے یہ سمجھ لیجئے کہ ظاہری الفاظ ان کے خواہ کچھ موحش کیوں نہ ہوں لیکن اُن میں یہ حضرات جو حقیقت بیان فرماتے ہیں وہ کتاب وسنت کے عین مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ سنئے مالا بد منہ میں ہے کہ:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ حرمت مال وابروئے مسلمان مثل حرمت خون اوست وکعبہ را فرمودہ کہ حق تعالیٰ تراچہ قدر حرمت دادہ لیکن حرمت مسلمان وحرمتِ خون او ومال او وابروئے او از تو زیادہ است۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کے مال اور آبرو کی حرمت مانند اس کے خون کی حرمت کے ہے اور کعبہ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اے کعبہ اللہ تعالیٰ نے تیرا مرتبہ کتنا عظیم بنایا ہے اور تجھ کو کیسی کچھ عزت بخشی ہے لیکن مسلمان کی حرمت اور اس کے خون اور آبرو اور مال کی حرمت تجھ سے کہیں بڑھ کر ہے۔

(صـ۱۵۹)

میں کہتا ہوں کہ عجب نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہاں مسلمان سے خود ذات شریفہ ہی ہو یعنی کنایہ کے طور پر اپنے ہی متعلق مخالفین کو یہ سنانا چاہتے ہوں کہ تم لوگ ایک جانب تو کعبہ کی تعظیم کے مدعی ہو اور ادھر مجھے ایذائیں بھی پہونچا رہے ہو جسمانی بھی اور قلبی وروحانی بھی تو سمجھ رکھو کہ ایک نبی کا قلب حرمت اور عظمت میں کعبہ سے کہیں بڑھا ہوا ہے کیونکہ جس خدا نے کعبہ کو شرف بخشا ہے اسی نے بوجہ ایمان وایقان کے انبیاء علیہم السلام کے قلوب کو بھی واجب الاحترام بنایا ہے پس ادنیٰ شے کو ماننا اور اعلیٰ کا انکار کردینا انتہا درجہ کی نفسانیت ہے۔ یوں آپ کے طفیل میں دولت ایمان کی برکت سے عامۂ مومنین کے قلب کو بھی یہ شرف حاصل ہوجائے تو غلط نہیں ہوگا مگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہی میں اور تبعًا ہوگا)

دیکھئے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مومن کامل اور اس کی جان اور اس کی آبروریزی سب حرام ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مومن کی جان اور مال اور اس کی آبرو واحترام میں کعبہ سے بھی بڑھکر

ہے۔ اب اس مضمون کی صحت میں تو کسی کو کلام کی مجال نہیں ہے کیونکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور اسکو آپ وحی سے فرمارہے ہیں پس مشائخ کے اُن تمام کلمات کا مرجع اور مآخذ جن میں کعبہ سے تقابل معلوم ہوتا ہے یہی حدیث ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اس لئے آپ کا کلام بھی نہایت ہی صاف و شفاف اور توحش سے پاک ہے اور حضرات مشائخ کا مقام چونکہ مقام نبوت سے فروتر ہے اس لئے ان کے کلام میں بھی وہ بات نہیں آسکتی جو نبی کی خصوصیات میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عظمت اور احترام کعبہ کو ملحوظ و محفوظ رکھتے ہوئے حرمت مومن کی ترجیح اس طریقہ سے بیان فرمائی جو کسی گوشہ سے بھی تنقیص کعبہ پر مشتمل نہیں ہے لیکن حضرات مشائخ نے بھی اسی مسئلہ کو بیان کرنا چاہا تو اندازِ بیان کچھ ایسا ہوگیا جس سے حرمت مومن کی اثبات کے ساتھ ساتھ تنقیص کعبہ کا شائبہ پیدا ہوگیا چنانچہ یہی امر لوگوں کی کھٹک کا باعث بنا مثلاً جس مضمون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی خوبی کے ساتھ اس حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ اسی مضمون کے متعلق ایک صوفی کا بیان سنئے۔ فرماتے ہیں ؎

کعبہ بنیادِ خلیل آزر است دل گذرگاہِ جلیل اکبر است

از ہزاراں کعبہ یکدل بہتر است دل بدست آور کہ حج اکبر است

یعنی کعبہ تو حضرت ابراہیم ابن آزر کا تعمیر کیا ہوا ایک گھر ہے اور دل وہ تو جلیل اکبر یعنی حق تعالیٰ کی گذرگاہ ہے۔ پس ایک دل ہزاروں کعبہ سے بڑھ کر افضل و مکرم و محترم ہے۔ لہٰذا دلداری کرو کہ یہی حج اکبر ہے۔

آج لوگوں کی زبان پر یہ اشعار جاری اور ساری ہیں اور ان کو خوب لطف لے لے کر پڑھا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کا دوسرا شعر حدیث کا گویا ترجمہ ہی ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مضمون کے بیان کرنے سے پہلے کعبہ کے فضل و احترام کو بھی تسلیم کیا تھا۔ چنانچہ یہ الفاظ فرمائے کہ حق تعالیٰ ترا چہ قدر حرمت دادہ لیکن ان بزرگ نے اس مدعا کے اثبات کے لئے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں جو تمہید اٹھائی وہ نہایت ہی بھونڈی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؏

کعبہ بنیادِ خلیل آزر است

میں کہتا ہوں کہ کعبہ کے ساتھ آزر کا کیا جوڑ یہ کعبہ خلیل آزر کی بنیاد تھی۔ یا خلیل اللہ کی ہے تعجب ہے کہ بنائے کعبہ کے متعلق قرآن شریف میں حق تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرماکر تو یہ فرمائیں کہ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ۔ یعنی اُس

وقت کو یاد کیجئے جبکہ ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کو تعمیر فرما رہے تھے اور اسمٰعیل علیہ السلام بھی ان کے مددگار تھے) ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے اس بیان سے بیت اللہ کی عظمت اور اس کا شرف معلوم ہوتا ہے جس کو ان بزرگ نے بنیاد خلیل آزر فرمایا ہے، تعجب ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر حق تعالیٰ کا یہ ارشاد آخر کیوں نہیں رہا ——— اور سنئے۔

نص قرآنی ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ صرف بناء ابراہیمی ہی نہیں ہے بلکہ دنیا کا سب سے پہلا گھر ہے اور سب سے پہلے اس کو فرشتوں نے تعمیر کیا تھا۔ چنانچہ آیۃ کریمہ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبَارَکًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ یعنی بلاشبہ وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ مکہ میں ہے۔ جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے اور جہان بھر کے لوگوں کا رہنما ہے۔

اس آیۃ کے تحت صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ:۔

وورد فی بعض الآثار ان اول من بنی البیت الملائکۃ۔ وقد بنوہ قبل آدم علیہ السلام بالفی عام۔ وعن مجاهد وقتادہ والسدی ما یؤید ذلک۔ وحکی ان بناء الملائکۃ لہ من یاقوتۃ الحمراء۔ ثم بناہ آدم ثم شیث ثم ابراهیم ثم العمالقۃ ثم جرهم ثم قصی ثم قریش ثم عبد اللہ بن زبیر ثم الحجاج واستمر بناء الحجاج الی الآن الا فی المیزاب والباب والعتبۃ ووقع الترمیم فی الجدار والسقف غیر مرۃ وجدد فیہ الرخام وقیل انہ نزل مع آدم من الجنۃ ثم رفع بعد موتہ الی السماء۔ وقیل بنی قبلہ ورفع

بعض روایات میں آتا ہے کہ سب سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر ملائکہ نے کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے دو ہزار سال قبل اسکی تعمیر کی تھی۔ مجاہد اور قتادہ اور سدی سے بھی اسی کے مطابق روایات ہیں۔ اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ فرشتوں نے اس کو سرخ یاقوت سے بنایا تھا۔

پھر اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے اسکو بنایا۔ پھر حضرت شیث علیہ السلام نے پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھر عمالقہ نے پھر جرہم نے پھر قصی نے پھر قریش نے پھر عبداللہ بن زبیرؓ نے پھر حجاج بن یوسف نے چنانچہ حجاج ہی کی تعمیر ابتک باقی ہے سوا میزاب کے اور باب الکعبہ کے اور اسکی چوکھٹ کے ہیں کچھ ترمیم اسکی دیواروں اور چھت میں بھی متعدد بار ہو چکی ہے اور اس میں جدید سنگ مرمر بھی بدلے گئے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ کعبہ بھی حضرت آدمؑ کے ہمراہ جنت سے نازل ہوا تھا۔ پھر آپ کے وصال کے بعد آسمان کی جانب اٹھا لیا گیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آدمؑ سے پہلے تعمیر

فی الطوفان الی السماء السابعۃ و قیل الرابعۃ۔	ہوا تھا اور طوفان نوح کے وقت ساتویں یا چوتھے آسمان پر اٹھا لیا گیا۔

(روح المعانی ص۵ ج۴)

اس کے بالمقابل ایک دوسرے بزرگ یوں فرماتے ہیں - اور اس میں شک نہیں کہ خوب ہی فرمایا ہے ؎

کعبہ را ہر دم تجلی می فزود	ویں ز اخلاصاتِ ابراہیم بود۔

یعنی یہ جو تم کعبہ پر روز افزوں تجلی دیکھتے ہو	یہ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اخلاص کی برکات ہیں

میں کہتا ہوں کہ جب حضرت ابراہیمؑ کے اخلاص کی وجہ سے کعبہ پر اس قدر تجلی ہو گئی تو خود حضرت کے قلب اطہر پر حق تعالیٰ کی کیسی کچھ تجلی رہی ہو گی اور اولیاء کرام و مشائخ عظام بھی چونکہ وصول الی اللہ میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے نائب ہوتے ہیں اس لئے ان کے قلب پر بھی یہی تجلی ہوتی ہے۔ جو کہ صحبت کے ذریعہ سالکین کے قلب میں منتقل ہوتی ہے" ان حضرات سے اخذ فیض زیادہ آسان ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ کعبہ سے اس فیض کو لیا جائے۔ غرض اس تقریر سے یہ واضح ہو گیا کہ ان حضرات نے کوئی غلط بات نہیں فرمائی۔

اب اس کے بعد سنئے کہ مشائخ محققین نے ایسا کیوں فرمایا؟

رسالہ قشیریہ میں ہے اور یہ فن کی نہایت ہی معتبر کتاب ہے اور امام ابو القاسم عبد الکریم القشیری الشافعی نیشاپوری کی تصنیف ہے جو کہ چوتھی پانچویں صدی کے لوگوں میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ:-

"احکام مریدین کے منجملہ یہ ہے کہ جب کسی تربیت کرنے والے شیخ کو اپنی بستی میں نہ پائیں تو وہاں سے ہجرت اور سفر کر کے اس شخص کے پاس پہونچیں جو اپنے زمانہ میں لوگوں کی اصلاح کے لئے منجانب اللہ منصب ارشاد و تربیت پر فائز ہو پھر اسی کے پاس مقیم رہیں اور اس کی چوکھٹ کو نہ چھوڑیں جب تک کہ وہ اجازت نہ دے دے"

آگے فرماتے ہیں (اور یہی سنانا آپ کو اس وقت مقصود بھی ہے) کہ:-

واعلم ان تقدیم معرفۃ رب البیت علی زیارۃ البیت واجب" فلولا معرفۃ رب البیت ما وجبت	خوب سمجھ لو کہ حق تعالیٰ کی معرفت کو زیارت بیت اللہ پر مقدم کرنا واجب ہے۔ اس لئے کہ اگر رب تعالیٰ کی معرفت ضروری نہ ہوتی تو زیارت بیت واجب ہی

زیادۃ البیت۔　　　　　　　　نہ ہوتی۔

یعنی سب سے مقدم اور اہم چیز جو انسان کے لئے اس دنیا میں ہے وہ اپنے رب کی معرفت ہے۔ بس یہی اصل جواب ہے کیونکہ حج سے بھی زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ معرفت رب البیت کی نہیں ہوتی اور بزرگوں کی خدمت میں حاضری سے طالب خدا کو معرفت خدا کی ہوتی ہے کیونکہ یہ جگہ اسی لئے موضوع ہے۔ اور اہل اللہ کی خدمت میں رہنے کے بعد اور معرفت حاصل کر لینے کے بعد کعبہ کی تجلیات کا مشاہدہ ہوتا ہے جس کو بزرگان دین نے حج کی روح اور اس کی اصل اور حج مردانہ سے تعبیر فرمایا ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

حج زیارت کردن خانہ بود　　　　حج رب البیت مردانہ بود

(یعنی یوں تو حج نام ہے خانہ کعبہ کی زیارت کا لیکن رب البیت کی معرفت جس کو حاصل ہوجائے اس کا حج مردانہ ہے)

یہی مطلب ہے صاحب قشیریہ کے مذکورہ بالا اس ارشاد کا کہ:۔

فلولا معرفۃ رب البیت ما وجبت زیارۃ البیت یعنی اگر رب البیت کی معرفت حاصل کرنی ضروری نہ ہوتی تو زیارت بیت اللہ یعنی حج بھی واجب نہ کیا جاتا۔

غرض علماء و مشائخ کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ رب البیت کی زیارت اصل ہے اور بیت کی زیارت اس کا وسیلہ ہے۔

اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس قول کے حق ہونے میں بھی کسی کو کلام ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ضروری چیز ہے حضرات مشائخ نے لوگوں کے عمل سے یہی اندازہ لگایا ہوگا کہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے لوگ حدود پر رہ نہیں گئے ہیں۔ چنانچہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ عورتیں بلا محرم کے حج کرنے جاتی ہیں۔ اور ایک چیز روح سے خالی ہو کر محض رسم کے درجہ میں رہی جاتی ہے۔ اسی پر تنبیہ فرمانے کے لئے اس قسم کے کلام ارشاد فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو یہ پسند ہے کہ بچپن ہی میں وفات پا جاتے اور گناہ وغیرہ سے محفوظ رہ کر پاک وصاف دنیا سے چلے جاتے یا یہ پسند ہے کہ بالغ ہو کر دنیا میں زندگی گذاریں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے یہاں گنہگار ہی جانا پڑے۔ آپ نے اس کا جو جواب دیا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے فرمایا کہ بھائی مجھے تو یہی پسند ہے کہ بالغ ہو کر دنیا سے رخصت ہوں بلا سے گنہگار جاؤں لیکن اللہ تعالیٰ کی معرفت تو ہو جائیگی۔ اور بچپن کی معرفت کا کچھ اعتبار نہیں۔

دیکھا آپ نے معرفت رب البیت کتنی بڑی دولت ہے۔ اب لوگوں کو بزرگوں کے کلام میں شبہ اور اشکال ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگ حقیقت حال سے ناواقف ہوتے ہیں۔ ان کو اس دولت کی خبر ہی نہیں ہے جو بزرگوں کے پاس ہوتی ہے اور جس کے حاصل کرنے کے لئے لوگ ان کے یہاں جاتے ہیں۔

حضرت مولینا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ حج بدل کے لئے کسی نے کہا ہو تو مجھے بھیج دیجئے گا۔ میں کہتا تھا کہ حضرت دل میں یہ فرماتے ہونگے کہ دیکھو تو اسکو حج کرنے کا کتنا شوق ہے اور میرے پاس جو دولت موجود ہے اسکی جانب توجہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے متعلق جب حج کو جارہا تھا حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ امسال حج کا ارادہ ہے اور اس کے بعد ہی یہ کہا کہ حج تو میرا یہیں ہوتا ہے یعنی مقصد حج تو یہیں حاصل ہوتا ہے۔ حضرت گھر جانے کے لئے اٹھ ہی رہے تھے میری یہ بات سنکر بیٹھ گئے اور غور سے میری بات کو سنا میں تو ڈر گیا کہ شاید کوئی بات ناگوار نہ گذری ہو لیکن میں نے بمبئی سے پھر خط لکھا تو بہت پسند فرمایا اس سے اندازہ ہوا کہ خوش تھے۔ تو بات یہی ہے کہ حضرات مشائخ نے کبھی کبھی جو اس قسم کے کلمات فرمادیے ہیں تو اس سے انکا مطلب یہی رہا ہے کہ زیارت بیت کی تو فکر ہے اور معرفت رب البیت کی جانب اصلاً التفات نہیں حالانکہ وہی اصل ہے اور زیارت بیت اس کا ایک وسیلہ ہے جس طرح سے اس کا ایک دوسرا وسیلہ مشائخ کی صحبت بھی ہے اور تجربہ سے یہ بات ان حضرات کو معلوم ہوئی کہ ہمارے پاس جو لوگ آمد و شد رکھتے ہیں ان کو تو وصول ہو جاتا ہے اور وہ عارف باللہ بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن حج کرنے کے بعد بھی عام طور سے یہی دیکھا جاتا ہے کہ لوگوں کے اندر ذرا تغیر نہیں پیدا ہوتا۔ جیسے جاتے ہیں اسی طرح سے واپس آجاتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ اس لئے ان حضرات نے اپنے اعتبار سے ایسا فرمایا اور نفل حج کرنے والوں کو اس کا مخاطب بنایا ورنہ تو حج فریضۂ اسلام ہے اور اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا ہے۔ پس جس طرح کہ نماز و روزہ اور زکوٰۃ اللہ تعالیٰ تک پہونچنے کے راستے ہیں اسی طرح سے حج بھی ہے۔ اس کے متعلق یہ حضرات نہ ایسا فرمارہے ہیں اور نہ فرما سکتے ہیں۔ انھیں بزرگوں سے تو ہم کو دین ملا تو کیا یہی دین اور خدا کے فریضے سے لوگوں کو منع کردیں گے۔ معاذ اللہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پس یہی محمل ان کے کلام کا متعین ہے اب جو شخص اس کے علاوہ کوئی معنی مراد لے یا ان کو ظاہر پر محمول کرے وہ غلطی پر ہے اس اشکال کا یہ نہایت ہی محققانہ جواب ہے۔

اس کے علاوہ ایک بات اور سمجھئے وہ یہ کہ حضرات مشائخ کرام کے کارنامے اور انکی تاریخ

شاہد ہے کہ ہر زمانہ میں ان حضرات نے اللہ تعالے کے بندوں کو اللہ تعالیٰ سے قریب ہی کیا ہے۔ چنانچہ یہی خدمت ان کی اصلی خدمت اور ان کے فن کا موضوع لئے رہی ہے جس طرح سے کہ اعمال ظاہری کی خدمت علماء ظاہر نے فرمائی ہے مشائخ نے قلب کی اور باطن کی خدمت کی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی کام بدون کسی استاد سے سیکھے نہیں آتا۔ پس جس طرح کہ ہم ظاہری احکام شرع کے جاننے میں علماء کے محتاج ہیں اسی طرح سے باطنی اعمال (ایمان اور اخلاص) کے جاننے میں صوفیاء کرام کے محتاج ہیں اور یہ بھی مسلم ہے کہ حج میں جس طرح سے ظاہری اعمال وافعال ہیں اسی طرح سے باطنی اعمال بھی اس میں ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان کو سیکھے اور اپنے اندر پیدا کئے بغیر حج کو جائیگا تو گو ارکانِ ظاہری اس کے ادا ہو جائیں لیکن بیت اللہ کی تجلی اور حج کی روح سے تو وہ محروم ہی رہے گا۔

پس ان حضرات نے محض نصح نصیح کے طور پر طالب ہی کی مصلحت سے کبھی یہ فرمایا ہے کہ مشائخ کی خدمت میں رہ کر قلب میں پہلے کچھ استعداد وصلاحیت پیدا کرلو تب حج کو جاؤ تاکہ اللہ تعالیٰ کی خاص تجلیات جو بیت اللہ پر ہوتی ہیں اس سے بھی حصہ پاؤ۔ غرض ان کلمات کے ذریعہ یہ حضرات کسی جانے والے کو روکتے نہیں بلکہ شرائط داخلہ کی تحصیل کی جانب متوجہ فرماتے ہیں تاکہ خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ انسان حج کو بھی جائے اور اس کا مصداق ہو کہ ؎

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند   کہ برونِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

میں خانہ کعبہ کا طواف کرنیکے لئے حاضر ہوا تو حرم میں مجھے گھسنے نہیں دیا (اور یہ فرمایا کہ) تو نے باہر کیا کیا ہے جو اب گھر کے اندر آنا چاہتا ہے۔

اور یہ سننا پڑے کہ ؎

بزمیں چو سجدہ کردم زِ زمیں ندا برآمد   کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

میں نے جب زمین پر سجدہ کیا تو زمین کے اندر سے یہ آواز آئی کہ اے ظالم تو نے تو ریائی سجدہ کرکے مجھے بھی خراب کر دیا۔

اب فرمائیے بزرگانِ دین کے یہ کلمات کس قدر اخلاص پیدا کرنے والے ہیں۔ نہایت عمدہ بات اور بالکل شریعت اور عقل کے موافق کلام ہے لیکن نہ تو ہم کو آج حق تعالیٰ کی معرفت کی فکر ہے اور نہ دین اور بزرگوں کی معرفت ہی حاصل ہے اس لئے ان کی باتوں کو بھی نہیں سمجھتے اور عار و استکبار کی وجہ سے کسی دوسرے سے ان کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ حالانکہ جب کسی بڑے شخص سے کوئی ایسا کلام صادر ہو جو اپنے ظاہر کے اعتبار سے منکر معلوم ہوتا ہو تو اس کا مطلب

سمجھنا چاہیئے اور خود نہ معلوم ہو تو کسی جاننے والے سے پوچھنا چاہیئے جیسا کہ ان صاحب[عہ] نے مجھ سے دریافت کیا میں تو ان کے اس سوال سے بہت خوش ہوا کہ انھوں نے کام کی بات پوچھی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ میرے ماموں امداد علی صاحب رح کہتے تھے کہ میرے پاس روپیہ نہیں ہے تو مجھ پر حج بھی فرض نہیں ہے لہذا یہ خیال بھی مجھے کبھی نہیں ہوتا کہ میرے پاس روپیہ ہوتا تو حج کرتا۔ لیکن یہ تمنا ضرور ہوتی ہے کہ اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو حضرت حاجی صاحب رح کی زیارت کو جاتا۔ یہ کیوں فرماتے تھے؟ اسی لئے فرماتے تھے کہ معرفت رب البیت زیارت بیت پر مقدم تھی۔ حضرت حاجی صاحب رح سے بہت تعلق تھا شاید حضرت ہی کی دعا سے پیدا بھی ہوئے تھے۔ بچپن میں حضرت حاجی صاحب رح نے ان کو گود میں لے کر کہا تھا کہ میں امداد اللہ اور تو امداد علی پھر تیسرا کون؟

انھیں کے متعلق حضرت حاجی صاحب رح نے حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا تھا کہ میاں فلاں! تمھارے ماموں صاحب ابھی تلوین میں ہیں میرے پاس آتے تو میں تمکین میں کر دیتا اب آپ اسکو کیسا سُن رہے ہیں اس تلوین اور تمکین کو تو آپ لوگ خوب ہی سمجھتے ہوں گے؟ اور یہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ ہم سب لوگ تمکین ہی میں ہیں۔ جی اب دھرے ہیں سمجھنے والے۔

حضرت مولانا رح اور ان کی تصانیف نہ ہوتیں تو ان چیزوں کا مصداق تو درکنار لوگ ان کے نام سے بھی آشنا نہ ہوتے۔

خیر۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان بزرگ نے حضرت حاجی صاحب رح کے زیارت کی جو تمنا کی تو اسلئے کہ وہ معرفت رب البیت کا ذریعہ تھا جس طرح سے مقصود زیارت بیت اللہ سے بھی معرفت رب البیت ہی ہے اور یہ زیارت اس کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح سے یہ بزرگان دین بھی دراصل معرفت رب ہی کے اعلیٰ ترین ذرائع اور اسباب میں سے ہیں۔ اسی کو مولانا روم رح فرماتے ہیں ؎

صورتے کو فاخرد عالی بود　　　　او ز بیت اللہ کے خالی بود

اور اسی معنی کر بزرگوں نے اپنے مشائخ کو قبلہ تک کہہ دیا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم صاحب رح آب حیات کے شروع ہی میں فرماتے ہیں کہ:۔

"اوراق مسودہ کا پشتارہ باندھ کر جہاز پر چڑھا اور محض بامداد خداوندی باوجود گمراہی اور نامہ سیاہی کے جس کی وجہ سے اپنی رسائی تو درکنار ہمراہیوں کی گم گشتگی کا بھی اندیشہ تھا، دریا پار ہو کر جدہ پہونچا اور وہاں سے بسواری شتر دو روز میں دونوں قبلوں کی زیارت سے مشرف

عہ۔ ایک صاحب نے یہی سوال کیا تھا۔ اور اس وقت مجلس میں موجود تھے۔

ہوا۔ بیت اللہ زادھا اللہ شرفاً وعزۃً الی یوم القیامۃ کا طواف میسر آیا اور حضرت پیر و مرشد ادام اللہ فیوضہ کی قدمبوسی سے رتبۂ عالی پایا۔" انتہیٰ۔

دیکھئے حضرت مولانا نانوتوی ؒ لکھتے ہیں کہ:۔

دونوں قبلوں کی زیارت سے مشرف ہوا ایک قبلہ تو بیت اللہ تھا اور دوسرا قبلہ پیر و مرشد یعنی حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ تھے۔ حضرت حاجی صاحبؒ کو بھی قبلہ فرمایا۔

یہ حضرات چونکہ بزرگوں سے اور ان کی باطنی دولت سے واقف تھے اور ان سے اس کو حاصل کرتے تھے اس لئے ان کی صحبت اور ان کی زیارت کو کبریت احمر اور غنیمت کبری سمجھتے تھے اور ہم لوگ چونکہ اس سے ناواقف ہیں ہم کو کیا معلوم کہ یہ دولت کیا ہوتی ہے اس لئے نہ ہم بزرگوں کا کلام ہی سمجھ سکتے ہیں اور نہ اہل عقیدت کے معاملات ہی کی فہم رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا قاسم صاحبؒ کے صرف اتنے ہی کلام سے کسقدر عقیدت، عظمت اور محبت کا پتہ چلتا ہے جو کہ ان حضرات کو اپنے بزرگوں سے ہوتی تھی۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ لوگ خشک ہوتے ہیں بزرگو کو اور پیروں کو مانتے ہی نہیں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس قدر ان حضرات نے اپنے مشائخ کو مانا ہے شاید ہی کسی نے مانا ہو۔

غرضکہ جو دولت بزرگوں کے پاس ہوتی ہے یعنی معرفت رب البیت ان حضرات کا مقصد مریدوں کو اسی کی جانب متوجہ کرنا ہوتا ہے اور اسی کو سمجھانے کے لئے کبھی کبھی عنوان میں اپنا اور بیت اللہ کا بظاہر مقابلہ سا بھی ہو جاتا ہے باقی جو بات فرماتے ہیں وہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہوتی ہے۔

اب لوگ حج بھی کرنے جاتے ہیں مگر دیکھ لیجئے کہ معرفت رب البیت سے ذرا حصہ ان کو نہیں ملتا۔ چنانچہ اسی کو آگے چل کر صاحب رسالہ قشیریہ فرماتے ہیں کہ:۔

والشُبان الذین یخرجون الی الحج من ھؤلاء القوم من غیر اشارۃ الشیوخ فھی بد لالات نشاط النفوس فھم متوسمون بھذہ الطریقۃ ولیس سفرھم علی اصل والذی یدل علی ذلک انہ لا یزداد سفرھم الا وتزداد تفرقۃ قلوبھم۔ فلو انھم ارتحلوا من عند

اور وہ نوجوان جو اس طریق میں ہوکر بدون اجازت شیخ کے حج کیلئے نکلتے ہیں تو وہ محض اسلئے کہ نفس ذرا سیر و تفریح حاصل کرے اور یہ لوگ بس نام کیلئے طریق میں ہیں اور ان کا سفر صحیح مقصد پر ہوتا نہیں جسکی دلیل یہ ہے کہ جوں جوں ان کا سفر زیادہ ہوتا رہتا ہے اتنا ہی ان کا قلبی تشتت بھی زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ پس اگر یہ لوگ کہیں اپنے نفس کے چھوڑنے کے سفر کا ایک قدم بھی چلتے تو وہ ان کے لئے

انفسہم بخطوۃ لکان اخطیٰ لہم من الف سفرۃ ۔ اس جیسے ہزاروں حج سے بہتر ہوتا۔ (رسالہ قشیریہ)

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ نفس کی اصلاح کرنا (گویا معرفت رب البیت) کہیں زیادہ اہم ہے زیارت بیت سے اور اصلاح نفس کا طریق صحبت ہے۔ چنانچہ اسی مضمون کو اس شعر میں بیان کیا گیا ہے ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید معشوق دریں جاست بیائید بیائید

(یعنی اے وہ لوگو جو حج کو چلے ہو کہاں جاتے ہو؟ کہاں جاتے ہو —— معشوق تو یہاں موجود ہے اِدھر آؤ اِدھر آؤ

اور اسی مضمون کو اس مصرع میں بھی بیان کیا گیا ہے جسے ان صاحب نے لکھا تھا۔ ؏

"آں رہ بسوئے کعبہ بَرد وایں بسوئے دوست"

(یعنی وہ شخص تو کعبہ ہی تک راستہ پائیگا اور یہ دوست تک راستہ پائے گا)

یہ مضمون نہایت عمدہ اور بالکل صحیح ہے اور علماء ظاہر کے کلام بلکہ نصوص سے بھی مؤید ہے۔ غلط فہمی کا سبب ہماری ناواقفیت اور کم علمی ہے۔ اس مسئلہ کو اور واضح کرتا ہوں سنئے:۔

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رح نے مالا بد منہ میں فقہی ابحاث کے بعد کتاب الاحسان کا عنوان بھی قائم فرمایا ہے اس میں لکھتے ہیں کہ:۔

ایں ہمہ کہ گفتہ شد صورت ایمان و اسلام و شریعت است۔ و مغز حقیقت در خدمت درویشاں باید جُست۔

یہ جو کچھ کہ کہا گیا ہے ایمان اور اسلام کی صورت تھی جس کا نام شریعت ہے باقی اس کی حقیقت اور مغز کو بزرگوں کی خدمت اور صحبت میں تلاش کرنا چاہیئے۔

پھر اس کے کچھ دور بعد فرماتے ہیں کہ:۔

نور باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را از سینۂ درویشاں باید جست وبداں نور سینۂ خود را روشن باید کرد تا ہر خیر و شر بفراست صحیحہ دریافت شود۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے نور باطن کو درویشوں کے سینہ سے حاصل کرنا چاہیئے اور اس نور سے اپنے سینہ کو روشن کرنا چاہیئے تاکہ فراست صحیحہ حاصل ہو کر ہر خیر و شر دریافت ہو سکے۔

(مالا بد منہ ص۱۷۱)

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک باطنی نور بھی ہوتا ہے جو کہ درویشوں کے سینہ سے ملتا ہے اور اس نور کو حاصل بھی کرنا چاہیئے۔ یہی وہ نور ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے

فرماتے ہیں :۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ	سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھولدیا اور وہ اپنے پروردگار کے نور پر ہے۔

اور اسی نور کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ :۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم النور اذا دخل الصدر انفسح فقیل یا رسول اللّٰہ ھل لذلک من علم یعرف بہ قال نعم التجافی من دار الغرور والانابۃ الی دار الخلود والاستعداد للموت قبل نزولہ ۔	فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ نور جب سینہ میں داخل ہوتا ہے تو اس میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ! اسکی کوئی علامت بھی ہے ؟ فرمایا ہاں۔ دنیا سے نفرت، آخرت سے رغبت اور موت سے پہلے اس کی تیاری کی فکر۔ (یہ سب علامات ہیں کہ نور سینہ میں اتر گیا ہے۔

(رواہ البیہقی، حاشیہ مکتوبات معصومیہ ص ۱۲۳)

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ دین اور ایمان کا ایک نور ہوتا ہے جو اہل اللہ کی صحبت اور ان کے سینوں سے اخذ کیا جاتا ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان میں معرفت پیدا ہوتی ہے پس جس طرح سے کہ اس معرفت کا ایک ذریعہ حج بیت اللہ شریف ہے۔ اسی طرح سے اس کا ایک ذریعہ بزرگوں کا قلب بھی ہے۔ پھر بیت اللہ سے معرفت تو کسی ہی کسی اللہ کے بندے کو حاصل ہوتی ہوگی۔ جن میں اس کے حاصل کرنے کی پہلے سے استعداد پیدا ہوچکی ہو انھیں کو کچھ حاصل ہوتی ہوگی اور بزرگانِ دین سے تو معرفت بھی حاصل ہوتی ہے اور یہ حضرات اس کی استعداد بھی پیدا کرتے ہیں۔

بزرگوں سے سنا ہے کہ جو لوگ اہل دل اور اہل معرفت ہوتے ہیں جن کے سینے میں نور ہوتا ہے جب وہ طواف کرتے ہیں تو پورا مطاف بلکہ ساری مسجد حرام ہی ان کے نور سے منور ہوجاتی ہے اور بعضے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو نور تو کیا ملتا اہل دل کو ان کی ظلمت کی وجہ سے طواف کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔

مولوی شفیع الدین صاحب کے بھائی مولوی محب الدین صاحبؒ جو کہ حاجی صاحبؒ کے خلیفہ تھے ایک بار حرم میں موجود تھے مولانا خلیل احمد صاحبؒ سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ آخاہ آپ موجود ہیں جب ہی تو میں کہوں کہ آج حرم کیوں اتنا منور ہو رہا ہے۔

اسی طرح سے حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ بعض لوگ ایسے کامل النور ہوتے ہیں کہ ان کے نور کو آدمی دیکھے تو بس دیکھتا ہی رہ جائے (اس ظاہری آنکھ سے نہیں بلکہ باطن کی آنکھ سے) اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی ظلمت کی وجہ سے لوگوں کو طواف کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بہرحال اس تقریر سے جب یہ معلوم ہوگیا کہ رب البیت کی معرفت زیارت بیت پر مقدم ہے اور معرفت الٰہی کا محل بزرگوں کا سینہ اور ان کا قلب ہے۔ اسی کی جانب وہ لوگوں کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں تو اب اس کے بعد ان کے کلام میں کوئی وجہ اشکال کی باقی نہیں رہ جاتی اس لئے کہ ان حضرات کے قلب میں دین اور اسلام اور اس کے شعائر کی جو عظمت اور احترام اور اس کے ساتھ جو عقیدت اور تعلق ہوتا ہے اس کا تو ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ خاصکر حج جیسا مہتم بالشان فریضہ جو شعائرِ اسلام میں سے ہے اور جس پر کہ تمام عالم اسلامی کا قیام ہے جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیَامًا لِّلنَّاسِ اور نہ صرف کعبہ شریف ہی بلکہ پورا مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا اسلام میں جو مقام ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے زَادَ ھُمَا اللّٰہُ شرفا وعزۃً اور ان حضرات پر بھی وہ مخفی نہیں تو پھر اس کے بعد یہ بات خیال میں خطرہ اور وہم کے طور پر بھی نہیں آسکتی کہ یہ حضرات ایسی واجب الاحترام چیز کی تنقیص فرمائیں یا اس سے لوگوں کو منع کرینگے۔ معاذ اللہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ بات وہی ہے جس کو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس سے بھی جو اہم شے ہے یعنی رب البیت کی معرفت جب لوگوں کو اس کی جانب سے غافل اور سست پایا تو اس کی جانب متوجہ کرنے اور اسکی اہمیت قلب میں زیادہ پیدا کرنے کے لئے اس قسم کے ذرا موحش عنوان اختیار فرمائے تاکہ مسلمان کے دل میں جاکر لگے اور وہ اتنی بڑی دولت سے محروم نہ رہے اور متوجہ یوں فرمایا کہ بیت اللہ کی زیارت کا بڑا شوق ہے اور مشائخ کے قلب اور ان کی صحبت سے اسقدر استغناء ہے، حالانکہ جس طرح بیت اللہ حق تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے تو قلب اہل اللہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مورد ہے۔

چنانچہ مشائخ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ کعبہ پر جو اس قدر تجلی ہے اس کا سبب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خلوص ہے ؎

کعبہ را ہردم تجلی می فزود　　　این ز اخلاصات ابراہیم بود

یہ جو کعبہ پر حق تعالیٰ کی تجلی ہر آن بڑھتی رہتی ہے (جانتے ہو ایسا کیوں ہے؟) یہ حضرت ابراہیم علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام کے اخلاص کی برکت

پھر یہ افراط و تفریط کیسی؟ کیوں ان کے سینے سے نور باطن نہیں اخذ کیا جاتا؟ جب کہ علماء باطن یہ بھی فرماتے ہیں:۔

"نورِ باطنِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را از سینۂ درویشاں باید جُست و بداں نورِ سینہٴ خود را روشن باید کرد"

بس اسی کی جانب لوگوں کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ مشائخ سے استفیض کریں اور ان سے اپنی اصلاحِ نفس کرانے کو ضروری سمجھیں۔ یہی مقصود تھا ان حضرات کا چنانچہ یہی مطلب ہے اس کا ع

آں رہ بسوئے کعبہ برد ویں بسوئے دوست۔ اور اس کا کہ ؎ "صورتے کو فاخرد عالی بود۔ او زبیت اللہ کے خالی بود" اور اس کا کہ ع "بہ حج کے رود کہ او راپیر نباشد" اور اس کا کہ ؎

"اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید معشوق دریں جاست بیائید بیائید"

پھر اگر حالات کا تتبع کیجئے گا تو اس قسم کے کلمات کا محل عموماً نفل ہی حج کو پائیگا فرض تو خدا کا ہے اس کے کرنے کا تو خدا نے حکم دیا ہے اس کو یہ لوگ کیسے منع کر سکتے ہیں۔ یہ حضرات خدا کے حکم کی اتباع سکھلاتے ہیں نہ یہ کہ بے عملی اور اسکی مخالفت ؎

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

میرے خیال میں اب تو بات بالکل صاف ہوگئی اور اب شاید کسی کے لئے بزرگانِ دین کے اس قسم کے کلام میں اشکال کی کوئی وجہ نہ ہوگی۔

اب سنئے کہ حج اور زیارت بیت بھی اللہ تعالیٰ سے نسبت اور تعلق ہی کا ذریعہ ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جس کی نسبت میں نقص اور کمی ہو وہ آئے اور بیت اللہ سے اپنے نور اور نسبت کی تکمیل کرے۔ تو دیکھئے لوگوں نے یہ بھی تو کہا ہے۔ مولانا شاہ فضل الرحمن صاحبؒ کے خلیفہ کے ایک خلیفہ تھے وہی یہ فرماتے تھے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ مگر آپ سے کہتا ہوں کہ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جو شخص پہلے سے صاحبِ نسبت ہو اور اسکی نسبت میں ابھی کسر اور نقص ہو تو وہ تو اپنی نسبت کی تکمیل بیت اللہ سے کرے گا۔ لیکن اگر کسی نے سرے سے نسبت ہی نہیں پیدا کی اور اس سے بالکل کورا ہے تو وہ کیا تکمیل کریگا۔ اسکے لئے تو ضرورت کسی شیخ کامل اور مکمل ہی کی پڑے گی۔ خیر وہ صاحب جو بات کہتے تھے وہ صحیح ہے کہ کعبہ شریف سے ایمان کی نسبت کی تکمیل بیشک ہوتی ہے چاہے کسی کی بھی ہوتی ہو لیکن میں ایک آسان ذریعہ اس قسم کی تکمیل کا اور بتلاتا ہوں لوگ اس کو نہیں لیتے اور اسکو مکمل ایمان اور متمم نسبت نہیں سمجھتے حالانکہ وہ بھی ہے اور یقیناً ہے اور آپ کی بھی سمجھ میں آجائے گا کہ بیشک وہ ہے۔ وہ کیا چیز ہے؟ وہ ہے قرآن شریف۔ اب جس کے اندر کسی بزرگ کی صحبت کی برکت سے کچھ بھی حصہ نسبت کا پیدا ہو چکا ہے وہ قرآن شریف

سے بھی اپنی تکمیل کر سکتا ہے۔ کیونکہ جس طرح کعبہ شریف بیت اللہ ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ جسم نہیں ہیں کہ ان کا کوئی مکان ہو اسی طرح سے قرآن شریف بھی کلام اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ متکلم ہیں۔ کلام اللہ تعالیٰ کی صفات کمالیہ ازلیہ میں سے ہے۔ پس جس طرح سے اللہ تعالیٰ کی تجلی بیت اللہ میں ہوتی ہے اور وہی منشا ہوتی ہے۔ سالک کی تکمیل کا اسی طرح سے وہی تجلی کلام اللہ میں بھی درجۂ اتم و اعلیٰ موجود ہے۔ کیونکہ کسی کے اسم کو مسمی سے وہ نسبت اور اتصال نہیں حاصل ہوتا جو کہ اس کے کلام کو اس کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی جیسی کچھ تجلی اس کے کلام میں ہوگی، ظاہر ہے کہ کسی دوسری چیز میں نہ ہوگی۔ اس مسئلہ پر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنی تفسیر میں نہایت ہی عمدہ کلام فرمایا ہے۔ اس کو بعینہٖ نقل کرتا ہوں کَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ کے تحت لکھتے ہیں کہ:۔

واختلاف مضامین را در ذکر بود نش تاثیرے نیست زیراکہ ہر مضمون کہ باشد کلام آلہی است۔ واتصال کلام با متکلم اقوی واشد است از اتصال نامے با صاحب نام والتفاتے کہ در وقت ذکر نام شخص بآں شخص حاصل می شود از التفاتے کہ در وقت خواندن کلام او حاصل می گردد کمتر است چنانچہ بر صاحب تجربہ پوشیدہ نیست ونیز کلام شخص شانے ست عمدہ از شیون ذات او در وقت تلاوت آں کلام بر قلب تالی متجلی می شود۔ لہذا تاثیر کلام بزرگان در نفس زیادہ تر از تاثیر نام آنہا می باشد ولہذا در حدیث شریف وارد است کہ در حق قرآن فرمودہ اند کہ ھو حبل اللہ المتین۔

قرآن شریف میں مختلف مضامین جو بیان کئے گئے ہیں تو ان کے اختلاف سے اسکے ذکر ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا اسلئے کہ جو مضمون بھی اس میں ہے وہ کلام الٰہی ہے اور کلام کو متکلم کیساتھ جو اتصال اور نسبت ہوتی ہے وہ اس سے کہیں زائد قوی اور شدید ہوتی ہے جو کسی کے نام کو اپنے مسمی سے ہوتی ہے اور وہ توجہ اور التفات جو کسی شخص کے نام لینے سے اسکی طرف ہوتی ہے بہت ہی کم ہے اس توجہ اور التفات سے جو کہ اسکے کلام کے پڑھنے کے وقت اسکی جانب ہوتی ہے جیسا کہ صاحب تجربہ پر پوشیدہ نہیں۔ نیز یہ کہ کسی شخص کا کلام اسکے ذات کی شانوں میں سے ایک عمدہ شان ہے جو کہ اس کلام کے تلاوت کیوقت قلب تالی پر متجلی ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگوں کے کلام کی تاثیر نفس میں ان کے نام کی تاثیر سے زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے۔

اور حضرت امام جعفر صادق رحؒ فرمودہ اند کہ تجلی اللہ لعبادہٖ فی کلامہٖ ولکنھم

اور حضرت امام جعفر صادق رحؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے بندوں کے لئے اپنے کلام میں تجلی فرمائی ہے لیکن

لا یبصرون ۔ وہ دیکھتے نہیں۔

(صد عزیزی)

تو دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ کلام اللہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی تجلیات موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں اسی طرح سے مخفی ہیں جیسے خوشبو پھول میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

چنانچہ خوب کہا ہے کہ ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

حضرت مولانا رح فرماتے تھے کہ اسکو اللہ تعالیٰ اور کلام اللہ کے لئے بھی پڑھا جاسکتا ہے یعنی چونکہ کلام اللہ میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات ہیں جو اس میں اسی طرح سے موجود ہیں جیسے پھول میں خوشبو تو جو شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت اور ان کے دیکھنے کا قصد رکھتا ہو تو وہ ان کو ان کے کلام میں دیکھے گویا حق تعالیٰ کی جانب سے اس کو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

پس اللہ تعالیٰ کی جو تجلی قرآن میں ہے یا معیت اللہ میں ہے اس کو مومن حاصل کرتا ہے اور بقدر اپنے ایمان کے حاصل کرتا ہے۔ اب ان سب تصریحات کے ہوتے ہوئے بھی کیا کوئی مسلمان اس کا انکار کر سکتا ہے کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات نہیں ہیں۔

پھر اس کو ذریعہ تکمیل نسبت اور ایمان جو نہیں بنایا جاتا تو اس میں نفس کا ایک چور ہوتا ہے وہ یہ کہ حج کے لئے تو کچھ اہتمام و انتظام وغیرہ کرنا پڑتا ہے اور دور دراز کا سفر کرنا ہوتا ہے اس لئے اس کی تو عظمت قلوب میں ہے اور قرآن شریف چونکہ ہر شخص کے گھر میں موجود ہے اس لئے اس کی قدر نہیں حالانکہ کلام اللہ کو اللہ تعالیٰ سے جو نسبت اور تعلق ہے وہ ابھی آپ نے سن ہی لیا۔ اب اس کے بعد اگر حج اور قرآن کے متعلق یہ کہا جائے تو بالکل صحیح ہوگا کہ ع

آں رہ سوئے کعبہ بر د ایں بسوئے دوست

اب یہ رمضان شریف کا مہینہ ہے بہت سے لوگ یہاں اس لئے آتے ہیں کہ حج کے لئے جانا ہے اس کے لئے تیاری کریں۔ تو میں کہتا ہوں کہ مقصود حج سے نفس کی تکمیل ہی ہوتی ہے پھر اس مہینے میں اور وہ بھی قرآن شریف کے ذریعے سے نفس کی جو تکمیل ہو سکتی ہے اس کی جانب سے آپ لوگ آخر کیوں غافل ہیں ؟

بات یہ ہے کہ بزرگوں سے بھی ایمان اور نسبت حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن اس زمانے میں

چونکہ ان چیزوں کا اعتقاد لوگوں سے ختم ہوتا جارہا ہے اس لئے یہ سب باتیں سمجھ میں ہی نہیں آتیں بس اس لئے لوگ کچھ پاتے بھی نہیں۔

ارے بھائی نفس کا مارنا جو فرض ہے تو کیا اس کے لئے مکہ شریف ہی جانے کا انتظار ہے؟ کیا وہ ہندوستان میں فرض نہیں ہے؟ پھر آخر یہاں بھی جو چیز فرض ہے اسکی جانب التفات کیوں نہیں ہے۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ یعنی کیا بعض چیزوں کو تو لیجئگا اور بعض کو چھوڑ دیجئے گا؟ دین میں یہ تقسیم کیسی؟

لہٰذا جس طرح سے قرب خداوندی کا ایک ذریعہ حج ہے اسی طرح سے اس کا ایک ذریعہ تلاوت قرآن بھی ہے۔ اور جس طرح سے حصول نسبت کا ایک طریقہ زیارت بیت ہے اسی طرح سے اس کا ایک ذریعہ اہل اللہ کی صحبت بھی ہے اس میں کیا اشکال ہے؟

بس مجھے اس جگہ یہی کلام کرنا ہے۔ امید ہے کہ اس تشریح و توضیح کے بعد خلجان رفع ہو گیا ہوگا۔ نیز اس سے معلوم ہوا کہ مشائخ محققین کی کوئی بات شریعت کے خلاف نہیں ہوا کرتی البتہ کبھی کبھی کلام میں کچھ خفا ہوتا ہے اس لئے اسکو کسی محقق سے سمجھنا چاہیئے۔

بزرگوں کے کلام میں علوم و معارف ہوتے ہیں۔ کبھی ان کی ایک ہی بات سے آدمی کہیں سے کہیں پہونچ جاتا ہے۔ اس لئے ان پر بجائے اعتراض و انکار کرنے کے ان حضرات سے مناسبت اور باطن کا ذوق پیدا کرنا چاہیئے؎

چوں بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

علماء نے لکھا ہے کہ اولیاء اللہ کا کلام ان کے بعد ان کا خلیفہ ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح ان کی ذات سے فیض ہوتا ہے بعد کے لوگوں کو ان کے کلام سے بھی نفع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے صالحین بندوں کے قال سے مستفید فرماوے اور ان کے حال سے بھی حصۂ وافر نصیب فرماوے؎

اُحِبُّ الصَّالِحِیْنَ وَلَسْتُ مِنْھُمْ
لَعَلَّ اللّٰہَ یَرْزُقُنِیْ صَلَاحًا

مضمون طہارت

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا و مقتدانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مضمون طہارت

فرمایا کہ حضرت مولانا شاہ ولی صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں کہ

ان من اجل نعم اللہ تعالیٰ التی لا یستطیع العباد شکرھا ان بعث الانبیاء مترجمین عن الغیب ھادین الی طرق التقرب الی اللہ تعالیٰ لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحییٰ من حی عن بینۃ ثم جعل لھم ورثۃ یقومون بعلمھم بین الناس ویحیون سنتھم ویدعون الی رشدھم۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ان بڑی نعمتوں میں سے جن کا شکر ادا کرنے سے بندے قاصر ہیں ایک بڑی نعمت حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہے جو غیب کے ترجمان ہیں۔ اور ان حضرات کی بعثت اسلئے ہوتی ہے تاکہ اس کے بعد جو ہلاک ہو وہ بینہ کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ بینہ کے ساتھ زندہ رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء کے لئے ورثہ بنائے جنھوں نے لوگوں میں ان حضرات کے علوم پھیلائے اور ان کی سنت اور ان کے طریق کو زندہ رکھا اور ان کی ہی ہدایت کی جانب لوگوں کو دعوت دی آگے فرماتے ہیں۔

ومعظم مادعت الی اقامتہ الرسل امور ثلاثۃ تصحیح العقائد فی المبدأ والمعاد والمجازات وغیرھا وتکفل بھذا الفن اھل الاصول من علماء الامۃ شکر اللہ مساعیھم۔

اور حضرات انبیاء علیہم السلام نے جن امور کے قائم کرنے کی دعوت دی ان میں سے بڑے بڑے امور تین ہیں۔ ایک تو مبدا اور معاد جزا و سزا کے متعلق عقائد کی تصحیح کرنا (یعنی اپنی پیدائش میں غور کرنا پھر اپنی موت کو سامنے رکھنا اور آخرت کے حساب و کتاب جزا و سزا کے متعلق اسلامی عقیدے رکھنا اور اس فن کی کفالت علماء اصول یعنی حضرات متکلمین نے فرمائی اللہ تعالیٰ ان کی سعی مشکور فرمائے

وتصحیح العمل فی الطاعات المقربة والارتفاقات الضروریة علی وفق السنة وتکفل بھذا الفن فقھاء الامة فھدا ھم اللہ بھم کثیرین واقام بھم فرقۃً عوجاً۔

دوسری چیز طاعات مقربہ میں عمل کی تصحیح کرنا اور سنت کے مطابق ضروری طریق انتفاع کا بیان اور اس فن کی کفالت فقہائے امت نے فرمائی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے بہت سے لوگوں کو ہدایت بخشی اور بہت سے فرقوں کی کجی کو درست فرمادیا۔

وتصحیح الاخلاص والاحسان وتکفل بھا الصوفیہ۔

اور تیسری چیز ان میں سے اخلاص اور احسان کی تصحیح ہے جس کی کفالت حضرات صوفیہ صافیہ رحمہم تعالیٰ نے فرمائی۔

تفہیمات ص ۱۲ ج ۱

تو دیکھئے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بعثت انبیا کو اجل نعم الٰہی میں سے جو شمار فرمارہے ہیں تو اسی لئے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے ہمیں تقرب الی اللہ کا راستہ معلوم ہوا اور پھر ان کے بعد ان کے ورثہ نے ان کی سنت کو زندہ رکھا اور انھیں کی ہدایت کی جانب لوگوں کو دعوت دی۔

پھر آگے شاہ صاحب نے خود بیان فرمایا ہے کہ ورثہ کون حضرات ہیں۔ چنانچہ علمائے اصول، فقہا اور صوفیہ کو ان کا وارث قرار دیا اس لئے کہ ان کی دعوت کا بڑا حصہ تین ہی امور سے متعلق تھا ایک تو عقائد کی تصحیح ۔ دوسرے طاعات مقربہ میں عمل کی تصحیح تیسرے اخلاص کی تصحیح ۔ ان میں سے عمل کی تصحیح کی بابت فرمایا کہ اس شعبہ کی کفالت حضرات فقہا نے فرمائی چنانچہ فقہا بھی یہی لکھتے ہیں۔ اور اپنی تصانیف کا تعارف انھیں لفظوں میں فرماتے ہیں۔ مثلاً یہ لکھتے ہیں کہ ہم نے اپنی کتاب میں ان مسائل کو بیان کیا ہے جن سے عبادات خمسہ کی تصحیح ہوتی ہے جیسا کہ صاحب مراقی الفلاح اپنی کتاب کے خطبہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ۔

ان ھذا کتاب صغیر حجمہ غزیر علمہ صحیح حکمہ احتوی علی ما بہ تصحیح العبادات الخمس۔

یعنی میری کتاب ضخامت میں تو کم ہے مگر اس کا علم بہت ہی کثیر اور عمیق ہے اور اس کے دلائل سب کے سب صحیح ہیں اور یہ ایسے مسائل پر مشتمل ہے جن سے عبادات خمسہ کی تصحیح ہوتی ہے۔

دیکھئے یہاں مصنف اپنی تالیف کا مقصد عبادات کی تصحیح کو فرما رہے ہیں جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ فقہا کا منصب طاعات مقررہ میں عمل کی تصحیح ہے اور یہ فرما رہے ہیں کہ وہ عبادات پانچ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ حدیث شریف میں آتا ہے بنی الاسلام علی خمس۔ یعنی اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمد عبدہ ورسولہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والحج وصوم رمضان یعنی گواہی دینا اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ نماز کا قائم کرنا۔ زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا ان میں چار تو وہی عبادات ہیں جن کا تذکرہ فقہا فرماتے ہیں یعنی نماز روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج لیکن پانچویں چیز حدیث شریف میں ایمان کو فرمایا گیا ہے۔ اس لئے کہ ان سب کی اصل تو وہی ہے اور فقہاء چونکہ صرف امور فرعیہ کو بیان کرتے ہیں اس لئے یہ حضرات بجائے ایمان کے طہارت کا تذکرہ فرماتے ہیں

بہرحال حدیث میں جس نمبر پر ایمان کا تذکرہ کیا گیا ہے فقہ میں طہارت کو وہی درجہ دیا گیا ہے یعنی پہلی عبادت اسی کو قرار دیا گیا ہے۔

آپ سے کہتا ہوں کہ طہارت کے شرف کے لئے یہ کچھ کم ہے۔ شائد اسی لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ الطہور شطر الایمان یعنی طہارت نصف ایمان ہے۔ بہرحال مصنف نے یہاں عبادات خمس فرمایا۔ اور عبادت کے نام سے عرف میں چار ہی چیزیں مشہور ہیں۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ اور حج اس لئے علامہ طحطاوی اس کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

(العبادات الخمس) اراد الطهارة والصلوٰة والصوم والزكوٰة والحج وعد الطهارة عبادة لانه يثاب عليها بالنية وان كانت لا تشترط فيها۔ (طحطاوی علی المراقی ص۱۱)

یعنی عبادات خمسہ سے مراد طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج لیا ہے اور طہارت کو عبادت اس لئے شمار کیا ہے کہ نیت کے بعد وہ بھی عبادت ہو جاتی ہے اگرچہ نیت صحت طہارت کے لئے شرط نہیں۔

جس طرح سے نماز روزہ اور دیگر عبادات اپنی صحت اور ثواب میں نیت کے محتاج ہیں۔ اسی طرح سے ترتب ثواب میں طہارت بھی محتاج نیت ہے۔ اسی اشتراک حکم کی وجہ سے اس کو بھی عبادت شمار کر لیا گیا۔

میں کہتا ہوں کہ طہارت کو عبادت اس لئے بھی کہا گیا ہے کہ یہ نماز کا موقوف علیہ ہے۔

نیز طہارت اس لئے بھی عبادت ہے کہ اس کا حکم نص میں آیا ہے چنانچہ صاحب ہدایہ کتاب الطہارۃ کا عنوان ابتداہی میں قائم فرماتے ہیں اور اس کو اس آیۃ سے شروع فرماتے ہیں۔

قال اللہ تعالیٰ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ اے ایمان والو جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اپنے چہرہ کو دھوؤ اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھوؤ اور اپنے سروں کا مسح کرو اور پیروں کو ٹخنوں سمیت دھوؤ پس جب طہارت کا حکم ہے تو یہ بھی عبادت ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا امتثال عبادت ہے۔

وضو کے متعلق صاحب درمختار نے ایک بات یہ فرمائی کہ

لیس اصل الوضوء من خصوصیات ھذہ الامۃ بل الغرۃ والتحجیل بدلیل ھذا وضوئی ووضوء الانبیاء من قبلی وقد تقرر فی الاصول ان شرع من قبلنا شرع لنا اذا قصہ اللہ تعالیٰ ورسولہ من غیر انکار ولم یظھر نسخہ۔

نفس وضو اس امت کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ خصوصیت جو ہے تو وہ چہرہ اور ہاتھ پاؤں کا آثار وضو سے چمکنا ہے چنانچہ اسی کے سبب سے آپ قیامت میں اپنی امت کو پہچانیں گے اور اصل وضو کی خصوصیت اس لئے نہیں ہے کہ اگلی امتوں میں بھی اس کا حکم تھا جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے۔

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین تین بار وضو فرمایا ہے اور یہ فرمایا کہ یہ میرا وضو ہے اور مجھ سے پہلے کے تمام انبیاء کا وضو ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وضو ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ پچھلی امتوں میں بھی وضو تھا اور اصول میں یہ امر طے شدہ ہے کہ ہم سے پہلے لوگوں کی جو شریعت ہے وہ ہمارے لئے بھی شریعت ہے جب کہ اللہ ورسول اس کو بلا نکیر ذکر فرمادیں اور وہ حکم منسوخ بھی نہ ہوگیا ہو۔

لہٰذا اس قاعدہ کی رو سے تو وضو ہم پر بھی لازم تھا اس کے وجوب کے لئے نص جدید کی حاجت نہ تھی پھر قرآن شریف میں اس کا حکم مستقل طور پر جو آیا تو کے متعلق صاحب درمختار فرماتے ہیں کہ

ففائدۃ نزول الآیۃ تقریر الحکم الثابت۔

یعنی وضو کے متعلق نص جو وارد ہوئی تو اس کا فائدہ حکم ثابت کی تقریر ہے یعنی اس کی تثبیت اور اس کو باقی رکھنا ہے اس لئے کہ وضو مستقل عبادت تو تھی نہیں بلکہ یہ نماز کے تابع تھا۔ تو ہو سکتا تھا کہ امت سے کما حقہ اس کی شان کا اہتمام فوت ہو جاتا اور زمانہ وحی سے بُعد کے سبب اور نقل

کرنے والوں کی کمی کی وجہ سے لوگ اس کے شرائط اور ارکان کی ادائیگی میں بھی تساہلی برتتے اور اس طور پر یہ ضمنی حکم آہستہ آہستہ ختم ہی ہو جاتا۔ بخلاف اس کے جب کہ نص متواتر سے بھی ثابت ہو گیا ایسی نص جو ہر زمانہ میں باقی رہنے والی اور ہر شخص کی زبان پر جاری وساری رہنے والی ہے تو اب اس کے ختم بلکہ اس میں تغیر و تبدل ہونے کا بھی احتمال ختم ہو گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ و رسول کے نزدیک طہارت کس درجہ مطلوب اور مہتم بالشان چیز ہے۔

طہارت کا اسلام میں خاص درجہ ہے چنانچہ تمام فقہا نے اپنی اپنی کتابوں میں اسی کو سب سے پہلے بیان کیا ہے۔ یہ ہدایہ ہے فقہ حنفی کی نہایت معتبر کتاب ہے اور اس کے مصنف بھی بڑے آدمی ہیں انھوں نے اپنی کتاب میں نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج تمام عبادات کے مسائل بیان فرمائے ہیں لیکن کتاب الصلوٰۃ کا بیان تیئس ۳۲ ورق کے بعد کیا ہے اور اس سے پہلے اتنی دور تک کتاب الطہارۃ ہی کا بیان کیا ہے جس میں فرائض وضو، سنن وضو، نواقض وضو، طریقۂ غسل، موجبات غسل۔ پھر اس پانی کا بیان جس سے طہارت جائز ہے اس سلسلہ میں کنوئیں کے پاک کرنے کا طریقہ بیان کیا ہے پھر تیمم کا بیان ہے۔ پھر عورتوں کے طہارت کے سلسلے میں حیض و نفاس کا بیان کیا ہے پھر نجاست حقیقیہ سے بدن، کپڑے، اور جگہ کے پاک کرنے کی تفصیلات اور پھر اس کے بعد نجاست خفیفہ و غلیظہ کا بیان ہے اور یہ کہ کس قدر مقدار ہر ایک سے معاف ہے ان سب کو مفصل بیان کر کے تب اس کے بعد کتاب الصلوٰۃ شروع کی ہے تو دیکھئے فقہا نے طہارت کا اس قدر اہتمام آخر کیوں کیا ہے یہ اسی لئے کہ حقوق اللہ میں سے ایمان کے بعد نماز تمام ارکان سے بڑھ کر ہے اور اس کی صحت طہارت پر موقوف ہے۔

مراقی الفلاح میں تطہیر کے معنی بیان فرماتے ہیں کہ

والتطهير اما اثبات الطهارة بالمحل او ازالة النجاسة عنه ويفترض في مالا يعفى منها وقد ورد ان اول شيئ يسئل عنه العبد في قبره الطهارة وان عامة عذاب القبر من عدم الاعتناء لشانها والتحرز عن النجاسة خصوصا البول۔

یعنی تطہیر کے معنی ہیں کسی محل میں طہارت کا ثابت کرنا یا کسی محل سے نجاست کو زائل کرنا اور یہ طہارت فرض ہے اس نجاست سے جو معافی کی مقدار کے اندر اندر نہ ہو کیونکہ کچھ کچھ مقدار نجاست

غلیظ اور خفیفہ کی معاف ہے اگر اس کے اندر اندر ہے تو اس کا پاک کرنا فرض نہیں۔ آگے اس فرضیت کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ سب سے پہلی چیز جس کا سوال بندے سے اس کی قبر میں ہوگا وہ طہارت ہے۔ نیز حدیث میں آتا ہے کہ پیشاب سے بچو اس لئے کہ عام طور پر عذاب قبر اسی سے ہوتا ہے۔ یعنی طہارت کا اہتمام نہ کرنے سے اور نجاست سے نہ بچنے سے خاص کر پیشاب سے (چنانچہ حدیث میں ہے کہ عذاب قبر تین چیزوں سے ہوتا ہے۔ غیبت سے نمیمہ سے اور پیشاب سے احتیاط نہ کرنے سے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے اور فرمایا کہ ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے اور کسی بڑی وجہ سے نہیں ہو رہا بلکہ ایک ان میں سے چغلی کھایا کرتا تھا اور دوسرا پیشاب سے احتیاط نہیں کرتا تھا۔

دیکھا آپ نے شریعت میں طہارت کی کس درجہ اہمیت ہے فرماتے ہیں کہ قبر میں سب سے پہلے اسی کا سوال ہوگا۔

آپ جانتے ہیں کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے اور طہارت نماز پر بھی مقدم ہے پس جب محشر میں سب سے پہلے نماز کا سوال ہوگا اس لئے کہ وہ آخرت کی دوسری منزل ہے تو پہلی چیز یعنی طہارت کا سوال پہلی منزل یعنی قبر میں ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ طہارت کی اہمیت کے لئے یہ کچھ کم ہے۔ علما نے جس طرح سے نماز روزہ کے مسائل بیان کئے اسی طرح سے طہارت کے مسائل بھی بیان کئے ہیں تاکہ ان سب کی ادائیگی انسان کے لئے آسان ہو جائے اور اللہ و رسول کے منشا کے مطابق ہو جائے۔ اس لئے کہ بالغ ہونے کے بعد ہمارے لڑکوں اور لڑکیوں پر سب سے پہلا حکم شریعت کا جو عائد ہوتا ہے وہ طہارت ہے چنانچہ علما نے انھیں مسائل کو ایسے طریقہ سے بیان کیا ہے کہ لوگ اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ طحطاوی میں ہے کہ۔

(دی) ان الشافعی استحسن مبسوط الامام محمد فحفظہ۔

یعنی روایت ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام محمد کی کتاب مبسوط کا مطالعہ کیا اور اس کو اتنا پسند کیا کہ اس کو حفظ کر لیا۔

دیکھئے انسان کلام اللہ کو حفظ کیا کرتا ہے مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو امام محمد کی مبسوط اس قدر پسند ہوئی کہ اس کا حرف حرف یاد کر لیا۔ معلوم نہیں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں کیا لکھ دیا تھا اور کس عنوان سے ان مسائل کا بیان فرمایا تھا کہ امام شافعی صاحب جو خود امام تھے اس سے اتنا متاثر ہوئے۔

اسی طرح سے ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ۔

واسلم حکیم من کفار اھل الکتاب بسبب مطالعتہ وقال ھذا کتاب

محمد کم الاصغر فکیف کتاب محمد کم الاکبر۔

طحطاوی علی المراقی ص۱

یعنی اہل کتاب کا ایک حکیم امام محمد کی اسی مبسوط کے مطالعہ کی وجہ سے مسلمان ہوگیا اور کہا کہ یہ تو تمہارے محمد اصغر کی کتاب ہے پس تمہارے محمد اکبر کی کتاب کی کیا شان ہوگی یعنی قرآن شریف جس کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پاس سے لائے ہیں وہ کیسا کچھ ہوگا۔ امام محمد صاحب کی مبسوط تو اب شائد ملتی بھی نہیں۔ بڑا اشتیاق ہے کہ اس کو دیکھتا البتہ امام سرخسی کی مبسوط ملتی ہے اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ایسی فقہی مسائل وہ بھی لکھتے ہیں اور اس کے دلائل بیان فرماتے ہیں لیکن اس میں جو دلائل لائے ہیں وہ اپنے فقہاء کے دلائل سے بالکل مختلف ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ احکام خدا تعالیٰ کی طرف سے بیان فرما رہے ہیں۔

اس حکیم پر اسی بات کا اثر ہوا اس نے دیکھا ہوگا کہ اسلام کے ابتدائی احکام کی یہ کتاب ہے اور اس قدر مرتب اور مہذب اس کا بیان ہے اور جو بات کہی ہے اس کے نہایت ہی معقول دلائل موجود ہیں ان کے دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بیشک یہ خدائی احکام ہیں اور ان کے رسول جن سے یہ احکام منقول ہیں بلاشبہ خدا کے رسول ہیں غرض امام محمدؒ کے حسن بیان سے اس کے قلب میں ایمان آگیا اور وہ یہ کہہ کر مسلمان ہوگیا کہ جب محمد اصغر یعنی امام محمد صاحبؒ کی لکھی ہوئی کتاب ایسی زبردست ہے تو محمد اکبر یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب یعنی قرآن شریف کی شان کا تو پوچھنا ہی کیا۔

میں کہتا ہوں کہ اس حکیم نے بہت ہی خوب بات کہی۔ عاقل شخص تھا اس کی عقل نے صحیح رہنمائی کی کہ امام محمدؒ کی مبسوط کے مطالعہ سے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ہوگئی اور اس سے اس نے سمجھا کہ مسائل کی یہ تعبیر اور تحریر امام محمدؒ کی ہے لیکن یہ مسائل اور تعلیمات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں اور جب ایک امتی کی کتاب ایسے عالی مضامین پر مشتمل ہے تو نبی کی کتاب کیسے کچھ مضامین کا خزانہ ہوگی اور اس کے ان الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی اس نے صرف مبسوط ہی کا مطالعہ کیا تھا۔ قرآن شریف اس کی نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ اس نے اسکے مضامین کے حسن کو مبسوط پر قیاس کر کے کہا تھا باقی اس میں شک نہیں کہ قرآن شریف کے مطالعہ سے

اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں توحید کے مضامین بیان فرمائے ہیں اور بندوں کو اپنی ذات صفات اور افعال کی معرفت کرائی ہے جس سے کلام کی شوکت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشک شاہی کلام ہے۔

ایک دفعہ حضرت مولاناؒ نے مجلس میں بیان فرمایا کہ قرآن شریف اور حدیث شریف میں فرق یہ ہے کہ کلام اللہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی ذات کا کلام ہے جو کسی سے ڈرتی نہیں ہے کلام میں شاہانہ دبدبہ اور شوکت ہے۔ اور حدیث شریف کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی ذات کا کلام ہے جو کہتا جاتا ہے اور کسی سے ڈرتا جاتا ہے یعنی یہ کہ مالک کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ ہو جائے اور یہ اس لئے کہ یہ بہر حال مخلوق کا کلام ہے جو خود کو خالق کے ماتحت سمجھتا ہے رہا کلام اللہ تو یہ خالق کا کلام ہے اور وہ کسی کا ماتحت اور تابع نہیں جس کی شان یہ ہے لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ یعنی جو کچھ کرتا ہے تو اس کے بارے میں کوئی سوال کرنے والا نہیں اور لوگ جو کچھ کریں گے اس کی بابت میں ان سے سوال کیا جائے گا۔

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ تقرب الی اللہ کا ایک شعبہ تصحیح عمل بھی ہے جس میں طاعت اور طہارت سبھی داخل ہیں اور آپ نے دیکھا کہ طہارت دیگر طاعت پر مقدم ہے۔

اب اس زمانہ میں طہارت کی اہمیت سے آپ لوگ صرف نظر کر لیں تو کر لیں لیکن آپ کے اسلاف کے نزدیک تو اس کی بڑی اہمیت تھی اور یہ حضرات اس کا بہت اہتمام کرتے تھے چنانچہ کتابوں میں امام محمدؒ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن امام ابو حنیفہؒ درس دے رہے تھے۔ امام محمد بھی آکر کنارے کھڑے ہو گئے اس دن اتفاق سے یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ کوئی نابالغ لڑکا شب کو سویا اور اسی رات کو وہ بالغ ہو گیا تو اس پر عشاء کی نماز فرض ہوئی یا نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس پر نماز فرض ہو جاتی ہے اس کو ادا کرنا چاہئے۔ اب امام محمد یہ سنتے ہی وہاں سے چلے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آگئے۔

امام ابو حنیفہؒ نے پوچھا کہ میاں صاحبزادے کہاں چلے گئے تھے امام محمد نے جواب دیا کہ ابھی آپ حضرات جس مسئلہ میں گفتگو فرما رہے تھے آج رات میں اسی میں مبتلا ہوا تھا چنانچہ جب میں نے سنا کہ اس پر نماز فرض ہو جاتی ہے تو اسی کو ادا کرنے گیا تھا امام ابو حنیفہؒ کو ان کی یہ ادا یعنی عظمت شرع اور جذبۂ امتثال احکام پسند آیا بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میاں صاحبزادے تم بہت ہونہار معلوم ہوتے ہو ہمارے پاس آیا کرو کامیاب ہو جاؤ گے چنانچہ اس کے بعد سے امام محمد صاحب

امام ابوحنیفہؒ کے درس میں حاضر ہونے لگے اور پھر فقہ میں ان کا جو درجہ ہوا وہ معلوم ہے۔ دیکھئے امام محمدؒ کے کمال کی ابتدا بھی طہارت ہی سے ہوئی۔

اسی لئے کہتا ہوں کہ خدا کا تقرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو کام ترتیب سے کرو قلب کو کیا پاک کروگے جب تمہارا بدن اور کپڑا ہی پاک نہ ہوگا۔ علماء نے جو یہ سب کتابیں لکھی ہیں اور طہارت اور نماز ظاہر شرع کو بیان فرمایا ہے تو یہ سب تقرب الی اللہ ہی کا طریق بنایا ہے پہلے ظاہر ہی کو ٹھیک کیا جائے گا پھر اس کے بعد باطن کو لیا جائے گا۔ محققین نے ہر زمانہ میں یہی ترتیب اختیار کی ہے چنانچہ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں ہے جنہیں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے جمع فرمایا ہے۔ کہ

"اول راہ سلوک کی یہ ہے کہ جو آدمی شریعت پر ثابت قدم ہوا
اور جو کچھ احکام شرع کے ہیں ان کو بجالایا اور سرمو اُن سے تجاوز نہ کیا
تو اس کا مرتبہ آگے کو بڑھتا ہے اور دوسرے مرتبہ میں پہنچ جاتا ہے"
(ص ۱۲ السنۃ الجلیۃ)

اس کے تحت حضرت مولانا تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ دیکھئے اس میں کیسی تصریح ہے کہ تمام ترقیاں اس پر موقوف ہیں کہ شریعت پر ثابت قدم رہے۔ انتہیٰ

بس کہتا ہوں کہ شریعت میں جس طرح سے اور احکام ہیں اسی طرح سے اس میں طہارت اور نماز بھی ہے۔ جسے آپ لوگوں نے آج بے قدر بنا رکھا ہے آپ کو یہی سمجھانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو آج بھی نفع ہو۔ مگر نفع جو نہیں ہو رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کام ترتیب سے نہیں ہو رہا ہے تصوف حاصل کرنے کے لئے ہمارے پاس آتے ہیں لیکن میں جب طہارت اور نماز کے مسائل بیان کرتا ہوں تو اس کو خلاف تصوف سمجھتے ہیں۔ اسی بات کو میں نے پہلے بھی بیان کیا تھا کہ تمہاری ترقی تو صرف فرائض پر عمل کرنے سے ہو جائے لیکن جب کہ اس کو اعتقاد کے ساتھ ادا کرو تب اور خدا کے فریضے کے ساتھ بدعقیدگی رکھو اور اس کو کم سمجھو اور نوافل میں بزرگی کا یقین کرو تو کچھ نہ ملے گا۔ لوگوں کے اس حال کو ایک بزرگ نے اس طرح بیان فرمایا ہے

ہر گاہ شیطان لعین برین جماعت چیرہ دست می شود و بمقتضائے
وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ
آنہارا از راہ حق دور تر می برد۔ نماز را مثل بیگار سرکار حاکم

وقت می دانند و ایں قدر وقت راکہ در نماز و وضو می گذارند رائگاں
می انگارند و کار آمدن خود نمی دانند۔ معاذ اللہ من ذالک
صراط مستقیم ص۴۹

جس وقت کہ شیطان لعین اس جماعت پر (یعنی نامقبول کی جماعت پر جن کا طریقہ یہ ہے کہ مشائخ کے وظائف کا تو اہتمام کرتے ہیں لیکن فرض نماز کا اہتمام اس کا سواں حصہ بھی نہیں کرتے قابو پالیتا ہے تو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان کے بھائی گمراہی میں ان کو دور تک کھینچے جاتے ہیں اور اس میں کوتاہی نہیں کرتے شیطان ان لوگوں کو بھی راہ حق سے بہت دور لے جاتا ہے جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ پھر یہ لوگ فرض نماز کو بھی سرکار حاکم وقت کی بیگار سمجھتے ہیں اور جتنا وقت کہ ان کا وضو اور نماز میں گزرتا ہے اس کو ضائع اور بیکار سمجھتے ہیں۔ معاذ اللہ۔

اس کو کہہ رہا ہوں کہ جب وضو اور نماز کے ساتھ یہ معاملہ رکھو گے تو پھر اس سے فیض کیا خاک ملے گا۔ اور اس کی برکات آپ کو کیا حاصل ہوں گی، اس زمانہ میں عام حالات لوگوں کے یہی دیکھ رہا ہوں کہ نماز سے غافل ہیں اور طہارت سے جاہل ہیں حالانکہ وہ نماز کا مقدمہ ہے۔ آدمی نماز کیلئے اٹھتا ہے تو پہلے وضو کرتا ہے اور اس وقت اگر پیشاب وغیرہ کا تقاضا ہوا تو اس سے بھی فراغت حاصل کرتا ہے۔ پس جس طرح سے نماز پڑھنے میں اس کو ثواب ملتا ہے اسی طرح سے وضو اور غسل کرنے میں ثواب ملتا ہے بالکل اسی طرح سے حقیقی اور حکمی نجاسات سے بدن اور کپڑے وغیرہ کو پاک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہے۔ جس طرح سے علمائے باطن نے رذائل کی گندگیوں سے قلب کے طاہر کرنے کا طریقہ سکھلایا۔ اسی طرح سے علمائے ظاہر نے طہارت وغیرہ کے مسائل کتابوں میں مدون فرمائے اسی کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ حضرات صوفیہ نے تصحیح اخلاص و احسان میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی نیابت فرمائی اور حضرات فقہاء تصحیح طاعات مقربہ میں انبیاء علیہم السلام کے نائب ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے نماز روزہ، زکوٰۃ، حج اور طہارت کے مسائل سے امت کو روشناس کرایا اور اس میں شک نہیں کہ اگر پاکی و ناپاکی کے مسائل اللہ و رسول کی طرف سے نہ بیان کئے جاتے تو بندوں کے لئے قلبی اور باطنی طہارت تو الگ رہی ظاہری طہارت یعنی اپنے بدن اور کپڑے کے پاک کرنے کا طریقہ بھی انسان کو نہ معلوم ہوتا چنانچہ جو لوگ اللہ و رسول اور شریعت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے احکام کو نہیں مانتے انھیں دیکھتا ہوں کہ بالکل گندے ہی رہ جاتے ہیں اور بجائے تطہیر کے تلویث ہی میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے حضرت شاہ صاحب نے

بعثت انبیاء کو اجل نعم فرمایا ہے کہ آپ نے جس طرح سے اخلاق اور امور باطن کی تعلیم دیکر ہمارے قلوب کا تزکیہ فرمایا اسی طرح سے نجاست اور طہارت کی تفصیلات کو بیان فرما کر ہمارے ظاہر کو بھی طاہر کر دیا۔ جب انسان کا ظاہر پاک ہوتا ہے تو اُس کا اثر اُس کے باطن پر بھی پڑتا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ تم وضو سے پہلے اپنے قلب کو دیکھو اور پھر وضو کرنے کے بعد اپنے باطن میں غور کرو تو اپنے اندر ایک نور محسوس کرو گے چنانچہ یہ سب مشاہدہ ہے کہ آپ وضو کر لیجئے تو اُس کی وجہ سے اپنے قلب میں ایک قسم کا انشراح پائیے گا۔

چونکہ اللہ و رسول نے طہارت پر زور دیا ہے اس لئے میں بھی ان امور کی جانب آپ لوگوں کو متوجہ کرتا ہوں اور علماء سے کہتا ہوں کہ وعظ میں ان چیزوں کو کیوں نہیں بیان کرتے۔ لوگوں کو طہارت کے مسائل سکھاؤ۔ ان کی طہارت ٹھیک ہو جائے گی تو نماز بھی ٹھیک ہو جائے گی، اور جب نماز ٹھیک ہو جائے گی تو پورا دین درست ہو جائے گا اور اگر ابتدا ہی درست نہیں ہوگی تو انتہا کی درستی کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ اسی لئے میں آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ انسان پر بالغ ہونے کے بعد سب سے پہلا فریضہ طہارت ہی کا عائد ہوتا ہے جو کہ نماز پر بھی مقدم ہے۔ اب اگر آپ اپنے لڑکے لڑکیوں کو نجاست کی اقسام اور طہارت کے احکام نہ سکھائیں گے تو وہ خدا کے دربار میں پاک ہو کر کھڑے تک نہ ہو سکیں گے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ یعنی تم میں کا ہر شخص نگہبان ہے۔ اور ہر شخص سے اس کے متعلقین کے بارے میں سوال ہوگا۔

اس حدیث کی رو سے ہم سب مکلف ہیں کہ اپنی اولاد کو نماز اور طہارت کے مسائل بچپن ہی میں سکھائیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ

اذا بلغ اولادکم سبع سنین فعلموھم الصلوٰۃ۔

واذا بلغوا عشر سنین فاضربوھم علیہا وفرقوا بینھم فی المضاجع۔

یعنی جب تمہاری اولاد سات برس کی ہو جائے تو اس کو نماز سکھاؤ اور جب دس برس کی ہو جائے تو اس کو نماز کے ترک کرنے پر سزا دو اور سونے میں انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرو یعنی الگ الگ سلاؤ۔ بذل المجہود میں ہے فرقوا بینھم فی المضاجع۔

ای فرقوا بین الاخ والاخت مثلاً فی المضاجع

لئلا یقعوا فیما لا ینبغی لان بلوغ العشر مظنۃ الشھوۃ

(بذل صفحہ ۲۷۸ جلد ۱)

یعنی بھائی کو بہن سے اور لڑکے کو ماں سے اور لڑکی کو باپ سے بلکہ ایک بھائی کو بھی دوسرے بھائی سے الگ سلاؤ) تاکہ کسی نامناسب حال میں نہ واقع ہو جائیں اس لئے کہ دس سال کی عمر میں شہوت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

اس حدیث میں تو صرف نماز ہی کا حکم دیا گیا ہے لیکن فقہاء نے اور دیگر احکام کا بھی یہی حکم بیان کیا ہے۔ چنانچہ مراقی الفلاح میں ہے کہ تؤمر بها الاولاد لسبع سنين وتضرب عليها لعشر بيدلا بخشبة۔ (مراقی الفلاح ص۹۳)

یعنی اولاد کو نماز کا حکم کیا جائے گا جب کہ وہ سات برس کی ہو جائے۔ اور اس کو مارا جائے گا جبکہ وہ دس برس کی ہو جائے لیکن ہاتھ سے مارے لکڑی وغیرہ سے نہیں۔ دیکھئے نماز کے ترک کرنے پر یہاں اولاد کو مارنے کا حکم ہے لیکن شریعت میں اس کی بھی حدیں مقرر ہیں۔ چنانچہ فقہاء فرماتے ہیں کہ ہاتھ سے مارے لکڑی وغیرہ سے نہیں لیکن آج ہمارا یہ حال ہے کہ یا تو اولاد کی جانب سے بالکل غفلت ہی برتیں گے یا تربیت پر اتر آئیں گے تو پھر لکڑی، ڈنڈا، چھڑی چھاتا جو بھی سامنے آیا اسی سے مارنا شروع کر دیں گے اور یہ نہ دیکھیں گے کہ ناک ٹوٹ گئی یا کان پھٹ گیا یا چہرہ زخمی ہو گیا۔ چنانچہ ایک مدرس کو دیکھا کہ ظالم بچوں کو دانت سے کاٹ لیتا تھا۔ یہ صریح ظلم ہے اور اس کا مصداق ہے کہ

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یہاں مراقی الفلاح میں تو صرف نماز کا حکم بیان فرمایا ہے اس کے تحت طحطاوی میں ہے کہ تؤمر بها الاولاد ذكوراً واناثاً والصوم كالصلوٰة وفي الدر انه يؤمر بالصوم والصلوٰة وينهى عن شرب الخمر ويألف الخير وليعرض عن الشر والظاهر منه ان هذا واجب على الولى۔

(طحطاوی ص۹۳)

یعنی اولاد کو نماز کا حکم کیا جائے گا خواہ لڑکا ہو یا لڑکی اور روزہ کا بھی حکم مثل نماز کے ہے اور در مختار میں ہے کہ بچوں کو نماز روزہ کا حکم کیا جائے گا اور شراب وغیرہ کے پینے سے روکا جائے گا اور خیر کی ان کو رغبت دلائی جائے گی اور برائیوں سے ان کو منع کیا جائے گا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ سب امور ولی پر واجب ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ جب نماز کی تاکید ولی کے ذمہ ہے تو طہارت کی تعلیم بدرجۂ اولیٰ واجب ہو گی

اس لئے کہ نماز بغیر طہارت کے صحیح نہیں ہوتی۔ اسی کو کہتا ہوں کہ اولیا کے ذمہ یہ سب چیزیں لازم ہیں۔ اب خواہ وہ خود سکھائیں یا کسی معلم کا انتظام کریں۔

اسلاف میں ترویج دین کا یہی طریقہ تھا کہ لوگ اپنے باپ دادا سے نماز اور طہارت کے مسائل سیکھتے تھے۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں ہے کہ

> عوام کی یہ حالت تھی کہ لوگ طریقۂ وضو اور غسل اور نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام اپنے باپ دادا سے (یعنی اپنے گھر ہی میں) سیکھتے تھے یا شہر کے معلمین سے سیکھ کر اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔
>
> (صفحہ ۱۵۴ جلد ۱)

میں کہتا ہوں کہ معلمین سے زیادہ ذمہ داری والدین اور اولیا پر ہے۔ پس اگر یہ لوگ اگر اولاد کی تعلیم و تربیت میں کوتاہی کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ اور جس طرح خود نہ عمل کرنے سے فاسق ہوں گے اسی طرح سے اولاد کی تعلیم و تربیت جو ان پر فرض کی گئی ہے نہ کرنے سے فاسق گردانے جائیں گے۔

آج یہ ہمارے لڑکے جو نماز سے بھاگتے اور جان چراتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل یہ وضو اور غسل سے گھبراتے ہیں۔ اس کی اہمیت دلوں میں نہیں ہوتی اور ضرورت غسل کی ہوتی ہے کہتے ہیں کہ کون غسل کرے اور اگر صبح کا وقت اور سردی کا زمانہ ہوا تو پھر ایسے وقت میں نہانا پورا مجاہدہ ہی ہے۔ جس پر عمل بدون شریعت پر ایمان کے اور اللہ اور رسول کی عظمت کے مشکل ہے۔ اب ہر شخص تو امام محمدؒ ہو نہیں سکتا پھر جب احکام سے بھی ناواقف ہوگا اور قلوب میں شریعت کی عظمت بھی نہ ہوگی تو ظاہر ہے کہ آج ایک عمل کو چھوڑ دے گا کل دوسرے عمل کو اسی طرح چھوڑتے چھوڑتے ترک کی خو اور بدعملی کی عادت ہو جائے گی جس کا ترک پھر آسان نہ ہوگا۔ لیکن تعلیم و تربیت کے ذریعہ اگر کسی کے قلب میں اللہ و رسول کی محبت اور احکام شرع کی عظمت پیدا ہو چکی ہوتی ہے تو پھر وہ وقت پر کام بنا دیتی ہے۔ جیسا کہ میں نے ایک مولوی صاحب کا واقعہ آپ کو بارہا سنایا کہ وہ ریل پر سفر کر رہے تھے۔ غسل کی ضرورت پیش آئی نماز کا وقت آگیا انھیں بڑی فکر لاحق ہوئی کہ یا اللہ کیا کروں کیسے نماز پڑھوں۔ بالآخر ایک تدبیر ذہن میں آئی وہ یہ کہ جب گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھہری تو انھوں نے ایک بہشتی سے کہا کہ میں لنگی پہن کر پلیٹ فارم بیٹھ جاتا ہوں تو میرے اوپر مشک سے پانی ڈال دے۔ اس طرح سے غسل کر کے ریل کے اندر آکر کپڑے بدل لئے اور پھر نماز ادا کی

اپنے اس واقعہ کو حضرت مولاناؒ سے بیان کر کے یہ کہتے تھے کہ حضرت اس نماز میں مجھے جتنا لطف آیا اور جیسی لذت ملی وہ کبھی نہیں ملی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ لذت احکام الٰہی کے امتثال کی تھی اللہ تعالیٰ کے حکم پر مجاہدہ کر کے انھوں نے عمل کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسی دنیا میں اس کا صلہ اور بدلہ بھی عطا فرمادیا کہ ان کو اس نماز میں اتنا لطف و مزہ آیا۔ یہ تو محض دنیاوی صلہ تھا۔ اور آخرت میں جو اجر ملے گا وہ اس سے کہیں زیادہ ہوگا۔ یہ اس پر سنا رہا ہوں کہ جب احکام شرع کی عظمت قلب میں ہوگی تبھی اس پر عمل ہو سکے گا۔ اگر احکام خداوندی کا اہتمام کروگے تو فرشتوں سے بڑھ سکتے ہو اور احکام میں سب سے پہلا درجہ طہارت ہی کا ہے میں تو ان نوجوانوں سے کہتا ہوں کہ دیکھو تم اسی میں فیل ہوتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جب نماز کو فرض کیا اور طہارت کو اس کے لئے شرط قرار دیا تو جس طرح نماز ضروری ہے طہارت کا سیکھنا ضروری ہے۔ اسی قید کو یہ لوگ دشوار سمجھتے ہیں ورنہ اگر وضو اور غسل کی قید ہٹا دی جائے تو یہ لوگ نماز خوب بے وضو ٹرخائیں۔ اس بے وضو ٹرخانے پر ایک قصہ سنئے۔ ایک عالم نے کسی دیہاتی سے کہا کہ تم چالیس دن نماز پڑھو تو ہم تم کو ایک بھینس دیں گے۔ چالیس دن پورے کر کے مولوی صاحب کے پاس آیا اور بھینس کا طالب ہوا۔

مولوی صاحب نے کہا کہ بھائی بھینس وینس کہاں ہے۔ میں نے تو تمھیں پابند نماز بنانے کے لئے ایسا کہا تھا اور یہ سمجھا تھا کہ چالیس دن کے بعد تم کو نماز سے تعلق ہو جائے گا پھر بھینس وغیرہ کا تمھیں خیال بھی نہ ہوگا بلکہ بجائے مجھ سے طلب کرنے کے تم خود مجھے بھینس دوگے۔ اس نے جب مولوی صاحب کا یہ جواب سنا تو کہا کہ اچھا مولوی صاحب تو پھر سن لو کہ میں نے بھی بلا وضو ہی ٹرخائی ہے۔

دیکھا آپ نے ظالم نے بے وضو ہی نماز پڑھی تھی۔ اور اس پر آیا تھا مولوی صاحب سے بھینس لینے کے لئے۔ مولوی صاحب نے تو وعدہ نماز پڑھنے پر کیا تھا اور وضو کے بغیر نماز ہی کب بنتی ہے جو وعدہ کہ نماز پر تھا اس کو ان مولوی صاحب سے بلا نماز ہی کے لینا چاہتا تھا۔

اور جس طرح سے یہاں یہ شخص شرط کو فوت کر کے مشروط اور جزا کا طالب ہو رہا تھا۔ اسی طرح سے ایک اور صاحب کا واقعہ ہے وہ یہ کہ ــــ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے چالیس دن عبادت کرتا ہے تو اس کے قلب سے حکمت کے چشمے جاری فرمادیتے ہیں۔

ایک شخص نے یہ حدیث سن کر عبادت کرنی شروع کی چالیس دن پورے ہو گئے مگر حکمت کے

چشمے جاری نہیں ہوئے کسی عارف سے اس کو بیان کیا کہ حدیث شریف میں تو یہ آتا ہے. اور میں نے عبادت کی مگر اس کے ثمرہ سے محروم ہوں کیا بات ہے؟۔ انھوں نے فرمایا کہ حدیث بالکل صحیح ہے اس پر شبہہ نہ کرو۔ اس میں تو یہ آتا ہے کہ اخلص ﷲ اربعین صباحاً یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے چالیس دن اخلاص کے ساتھ عبادت کرے تب ایسا ہوگا اور تم نے تو یہ عبادت حکمت کے چشمے جاری کرانے کے لئے کی تھی یہ اخلاص تو نہ ہوا پس جب شرط نہیں پائی گئی تو پھر اس پر جزا کا ترتب کیسے ہو میں کہتا ہوں کہ ہوشیار لوگ ہیں کام نہیں کرنا چاہتے ہیں اور اجرت اس پر پوری چاہتے ہیں۔ آج کل کے لوگوں کا عام حال یہی ہے باقی بدون طہارت کے نماز پڑھ لینا یہ تو بڑی ہی بددینی کی بات ہے۔

ایک دفعہ میں نے ایک شخص سے کہا کہ چلو نماز پڑھو وہ میرے ساتھ مسجد گیا اور نماز پڑھ لی بعد میں مجھ سے کہا کہ میں آپ کے کہنے کی وجہ سے اس وقت مسجد چلا گیا تھا۔ لیکن میں اس وقت ناپاک تھا اور مجھے غسل کی حاجت تھی میں نے یہ سن کر اس سے کہا کہ اب میں تجھے کہوں یا اپنے کو کہوں مجھے اگر یہ معلوم ہوتا تو کبھی تجھ سے نہ کہتا اور اگر تو نے ایسا کر لیا تھا تو مجھ سے کیوں کہا چھپا ہی لیتا۔ اور اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کر لیتا۔ ایسے لوگ اس زمانہ میں بہت ہیں کہ دین اور دیانت میں کمی اور مسائل شرعیہ سے جہالت کے سبب ایسے ایسے امور کا ارتکاب کر لیتے ہیں کہ فقہا کے نزدیک ان کے لئے سخت حکم ہے۔

اور یہ دیانت علم سے الگ ایک شئے ہے ہو سکتا ہے کہ آدمی جاہل ہو اور متدین ہو اور عالم ہو مگر اس میں تدین نہ ہو۔ ایک عالم ایک دوسرے اہل علم کے متعلق کہتے تھے کہ میں ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا حالانکہ وہ ان کے استاد تھے مگر کہتے تھے کہ مجھے ان کا اعتبار نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نماز بلا وضو ہی پڑھا دیں سن کر حیرت ہوتی تھی کہ ایک شخص عالم ہے مگر دیانت کی کمی کی وجہ سے لوگوں کو ان پر اعتماد نہیں اور ان کا اعتبار نہیں۔ ان کی جانب سے اندیشہ کرتے ہیں کہ کہیں بلا وضو ہی نہ مصلے پر کھڑے ہو جائیں۔ توبہ توبہ

یہ سب دیانت کی کمی کا نتیجہ ہے اور قلب میں شریعت کی تعظیم نہ ہونے کا ثمرہ اسی لئے کہتا ہوں کہ طہارت کا اہتمام قلب میں پیدا نہیں ہوگا جب تک کہ ابتدا ہی سے اسے نہ سکھاؤ گے۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ نوجوان نماز سے جو بھاگتے ہیں تو وضو اور غسل (یعنی طہارت) کی قید کی وجہ سے. نماز ان پر اتنی دشوار نہیں ہے. جتنی کہ اس کی شرائط ان پر شاق ہیں۔ انھیں میں سے ایک شرط طہارت بھی ہے

وہ بھی ان پر شاق ہوتی ہے۔ اور یہ شاق اس لئے ہوتی ہے کہ بچپن سے ان کو اس کی ترغیب اور تربیت نہیں سنائی جاتی۔ حالانکہ ابھی آپ نے سنا کہ قبر میں سب سے پہلے طہارت ہی کا سوال ہوگا اور عام طور سے عذاب قبر ستانِ طہارت کے عدم اعتناء اور نجاست سے احتراز کرنے میں لاپرواہی کے سبب سے ہوتا ہے۔ خاص کر پیشاب وغیرہ سے احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے۔ آپ جب اس قسم کے مضامین لوگوں کو سنائیے گا تو ان کے قلب میں اس کی اہمیت کس طرح پیدا ہوگی۔ اور آپ سے کہتا ہوں کہ حدیث شریف میں یہ جو آتا ہے کہ قبر میں پہلا سوال طہارت کے متعلق ہوگا تو یہ کہ قبر کا سوال اور اس کا عذاب حق ہے۔ لیکن اس زمانہ میں چونکہ دین کی تعلیمات اور شریعت کی عظمت میں کمی ہوگئی طبیعتوں میں آزادی آگئی ہے۔ اس لئے آخرت کا انکار عذاب قبر کا انکار اگر ہو جائے تو کچھ تعجب نہیں۔

ایک مولوی صاحب تھے ان سے ایک انگریزی داں نے کہا کہ مجھے عذاب قبر کے بارے میں کچھ شبہہ ہے مجھے اس کو سمجھا دیجئے وہ مولوی صاحب بے چارے رونے لگے کہ یا اللہ اس کو کیسے سمجھاؤں۔ پس جب یہ عذاب قبر کا منکر ہے تو دوزخ کے عذاب اور آخرت کے واقعات پر بھی اس کو انکار ہوگا۔ اتنے میں ایک اور صوفی صاحب جو اُن کے ملنے والے تھے آگئے تو ان مولوی صاحب نے صوفی صاحب سے کہا کہ یہ شخص عذابِ قبر کو نہیں مانتا آپ ہی اس کو کچھ سمجھا دیجئے۔ صوفی صاحب نے اس شخص سے کہا کہ ہاں میں تمھیں عذاب قبر سمجھا سکتا ہوں۔ بلکہ دکھا سکتا ہوں مگر جاؤ نہا دھو کر کپڑے بدل کر آؤ لیکن ایک بات یہ بھی سمجھ لو کہ میں تمھیں عذابِ قبر کا مشاہدہ کرا تو دوں گا مگر ہو سکتا ہے کہ تم وہاں سے زندہ واپس نہ آؤ یہ سن کر وہ شخص ڈر گیا اور ان کے ساتھ قبرستان جانے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اپنی بدعقیدگی سے توبہ کی اور انھیں سے کہا کہ بیعت کر لیجئے۔ چنانچہ انھوں نے بیعت کر لیا اور ان مولوی صاحب نے بھی اُن کا ہاتھ پکڑ لیا کہ نہایت مبارک بیعت ہے انھوں نے ایک شخص کے ایمان کو درست کر دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اس کا نمونہ دکھاتے رہتے ہیں تاکہ منکرین کو ایمان کی توفیق ہو اور مومنین کی تصدیق میں اضافہ ہو۔ ابھی چند روز ہوئے میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا تھا لکھا تھا کہ "

عذاب قبر اور آخرت میں عذاب نار کے ڈر سے رونگٹے کانپنے لگتے ہیں اور وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ ابھی دس بارہ دن ہو رہے ہیں کہ ہمارے دیار کے ایک گاؤں میں ایک واقعہ یہ ہوا کہ ایک عورت مر گئی اُس کو

دفنانے کے لئے جب لوگوں نے قبر کھودی تو اس کے اندر ایک اژدھا سانپ موجود دیکھا اس قبر کو چھوڑ کر دوسری قبر کچھ فاصلہ پر کھودی دہاں بھی جب میت کو لے جاکر رکھنا چاہا تو اس دوسری قبر کے اندر بھی اژدھا دیکھا گیا۔ لوگ اس گاؤں کے ایک مستان صاحب کے پاس گئے اور انسے دریافت کیا کہ اب کیا کیا جائے انھوں نے لوگوں سے عورت کے خصائل کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ عورت اپنے شوہر کو بہت گالی دیا کرتی تھی اور لوگوں کو بھی کوسا کرتی تھی بہت بدزبان تھی اس پر مستان صاحب نے مشورہ دیا کہ سب لوگ مل کر اس کی مغفرت کی دعا کریں تاکہ اس کو عذاب قبر سے نجات ملے اور کچھ دور پر تیسری قبر کھودیں چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ مگر اس میت کو قبر کے اندر جب قبلہ رخ پھیرنے لگے تو وہاں بھی دیکھا گیا کہ اس عورت کے منھ کو اژدھا سانپ پکڑے ہوئے ہے یہ دیکھ کر لوگ جلدی سے قبر بند کر کے چلے آئے۔

دیکھا آپ نے ایسے ایسے واقعات اس زمانے میں بھی ہوتے رہتے ہیں جن سے اللہ اور رسول کے ارشادات کی تصدیق ہوتی ہے۔ انھیں ارشادات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قبر میں سب سے پہلے طہارت کا سوال ہوگا اس لئے کہتا ہوں کہ اپنی اولاد کو سب سے پہلے طہارت سکھلادو۔

اللہ تعالیٰ کے احکام طہارت سے متعلق بھی ہیں۔ اگر ان احکام کو ادا کروگے تو قرب حاصل ہوگا میں پہلے کہتا تھا کہ یہ راستہ بدنی نہیں ہے۔ مگر اب کہتا ہوں کہ نہیں بدنی بھی ہے اس لئے کہ ہم بشر ہیں ہمارے بدن کے بھی بہت سے تقاضے ہیں۔ اُن کے متعلق خدائی احکام ہیں مثلاً پیشاب پاخانہ سے طہارت حاصل کرنا وضو اور غسل کی حاجت ہونا اور پھر اس نجاست حکمی سے اپنے کو پاک کرنا اور ان کے احکام سے واقف ہونا تاکہ خدا اور رسول کے مرضی کے مطابق ہم پاک اور طاہر رہ سکیں۔ ہمارے لئے یہ ضروری ہے۔ اس کے لئے ہمیں شریعت کے احکام اور فقہاء امت نے اس کی جو تفاصیل بیان فرمائی ہیں ان کا جاننا ضروری ہے اگر حکم شرع سے تجاوز ہوگا تو وہ اللہ اور رسول کو پسند نہ ہوگا۔

ایک مولانا صاحب بیمار ہوئے۔ ایک دوسرے مولانا صاحب جو ان کے عزیز اور ساتھی تھے ان کی عیادت کو گئے دیکھا کہ باوجود عذر شرعی کے وہ بجائے تیمم کے وضو کر رہے ہیں انھوں نے ادب کے ساتھ ٹوکا اور کہا کہ آپ تیمم کیوں نہیں فرما رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تیسیر سے فائدہ نہیں

اٹھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم تیمم نازل کرنے کے بعد یہ فرمایا ہے کہ (یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ) یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا چاہتا ہے دشواری کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس کے باوجود آپ جو وضو فرما رہے ہیں تو اپنے قلب میں غور کیجئے اس کی وجہ یہ ہوگی کہ آپ تیمم کو طہارت ناقصہ سمجھتے ہوں گے یہ چور ہوگا۔ حالانکہ ہمارے نزدیک وہ بھی طہارت کاملہ ہی ہے اور وضو کا کامل خلیفہ ہے۔ اس کے بعد سے ان مولوی صاحب نے تیمم کرنا شروع کر دیا۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ بزرگی شریعت سے الگ ہو کر کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اتباع شریعت میں بزرگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تقرب حاصل کرنے کا راستہ شریعت ہی ہے جو لوگ شریعت میں اور طریقت میں فرق کرتے ہیں وہ انتہائی جہالت کی بات کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا ایسا کہنا کفر ہے حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی فقہ میں کتاب مالابد لکھی ہے۔ اس کے آخر میں کتاب الاحسان کا بھی ایک عنوان قائم فرمایا ہے اور اس طرز میں یہ منفرد ہیں کہ فقہ اور احسان (یعنی شریعت اور طریقت) کو جمع کر کے ایک ہی جگہ بیان فرمایا وہ تحریر فرماتے ہیں کہ۔

> "بدان اسعدک اللہ تعالیٰ ایں ہمہ کہ گفتہ شدہ صورت ایمان و اسلام و شریعت ست و مغز حقیقت او در خدمت درویشاں باید جست و خیال نباید کرد کہ حقیقت خلاف شریعت ست کہ ایں سخن جہل و کفرت بلکہ ہمیں شریعت ست کہ در خدمت درویشان چوں قلب از تعلق علمی و حبی کہ بماسوی اللہ داشت پاک شود و رذائل نفس برطرف گشتہ نفس مطمئنہ شود و اخلاص بہم رساند شریعت در حق او بامغز شود نماز او عند اللہ تعلق دیگر بہم رساند و دو رکعت او بہتر از لک رکعت دیگران باشد و ہمچنیں صوم او و صدقہ او۔
>
> (مالابد صفحہ ۱۷۲)

یعنی جانو اللہ تعالیٰ تمہیں نیک بخت بنائے یہ جو کچھ بیان کیا گیا۔ ایمان اور اسلام اور شریعت کی صورت تھی۔ باقی اس کا مغز اور اس کی حقیقت درویشوں کی صحبت میں تلاش کرنا چاہئے اور خیال بھی نہ کرنا چاہئے کہ حقیقت (یعنی بزرگی اور تصوف) شریعت کے خلاف کوئی چیز ہے کیونکہ ایسا کہنا کفر اور جہالت ہے بلکہ یہی شریعت ہی ہے کہ بزرگوں کی خدمت میں رہنے کے بعد جب قلب اس تعلق علمی

وجہ سے پاک ہو جاتا ہے جو ماسوا اللہ کے ساتھ رکھتا ہے اور نفس کے رذائل دور ہو کر نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے اور اخلاص کامل اس کو حاصل ہو جاتا ہے تو پھر یہی شریعت اس کے حق میں با مغز ہو جاتی ہے اور پھر اس کی نماز اللہ تعالیٰ سے دوسرے ہی نوع کا تعلق پیدا کر دیتی ہے (جس کی وجہ سے) اب اس کی دو رکعت دوسروں کی لاکھ رکعت سے بڑھ کر ہوتی ہے یہی حال اس کے صوم اور صدقہ کا بھی ہو جاتا ہے۔

پس طریقت اور حقیقت کو شریعت کے خلاف سمجھنا گمراہی کی بات ہے۔ اگر شریعت کی اتباع نہیں کروگے تو خدا تک نہیں پہنچ سکو گے۔

جن کو آپ آج بزرگ سمجھتے ہیں وہ لوگ اسی وجہ سے ہوئے کہ انھوں نے اللہ اور رسول کے احکام کا احترام کیا۔ چنانچہ اسی راستہ سے وہ لوگ خدا تعالیٰ تک پہنچتے ہیں یعنی نماز و طہارت کا ہی پورا اہتمام کیا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دو ملفوظات سنئے۔

۱۔ فرمایا کہ ایک وقت ہم اور خواجہ اجل بیٹھے تھے۔ نماز مغرب کا وقت تھا۔ خواجہ تازہ وضو کرتے تھے۔ انگلیوں میں خلال کرنا ان سے سہواً فراموش ہو گیا۔ ہاتف غیبی نے آواز دی اور ان کے کان مبارک میں کہا اے اجل ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دوستی کا دعویٰ کرتے ہو اور انکی امت سے کہلاتے ہو اور ان کی سنت کو تم نے ترک کیا اس کے بعد خواجہ اجل نے قسم کھائی کہ جس دن سے میں نے ندا سنی موت کے وقت تک کوئی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں سے متروک نہ ہوگی۔ پھر فرمایا کہ میں نے ایک وقت خواجہ اجل کو انتہا متردد دیکھا اور پوچھا کیا حال ہے۔ فرمایا کہ جس روز سے انگلیوں کا خلال مجھ سے فوت ہوا ہے مجھ کو حیرت ہے کہ کل کے روز قیامت میں یہ منھ خواجہ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں کر دکھاؤں گا۔

ف۔ دیکھئے خلال کے ترک پر اور وہ سہواً پھر سنت موکدہ بھی نہیں صرف مستحب۔ کس قدر قلق ہوا۔ اس سے ان حضرات کے احترام شرع کا اندازہ لگتا ہے۔ فرمایا کہ خواجہ فضیل بن عیاضؒ وضو کے وقت دوبارہ ہاتھ دھونا بھول گئے اور نماز ادا کی۔ اسی رات حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ حضرت نے فرمایا کہ اے فضیل بن عیاض تعجب کی بات ہے کہ وضو میں تجھ سے نقصان واقع ہو۔ خواجہ مارے ہیبت کے نیند سے جاگ اٹھے اور از سر نو تازہ وضو کیا اور اس جرم کے کفارہ میں پانچسو رکعت نماز پڑھنی ایک برس تک اپنے اوپر واجب کیں۔

ف۔ اول تو یہ تکرار فرض و واجب نہ تھا۔ دوسرے سہواً یہ کوتاہی ہوگئی تھی۔ اس لئے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد درجہ ناخوشی میں نہ تھا مگر پھر بھی ان پر کس قدر اثر ہوا۔ اس سے زیادہ شریعت کا کیا اہتمام ہوگا۔

یہ واقعات بزرگوں کے میں نے اس پر سنائے کہ راستہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا یہی شریعت ہے جس کا اہم اور اقدم شعبہ طہارت ہے۔

حدیث شریف میں تو یہاں تک فرمایا گیا ہے کہ الطہور شطر الایمان طہارت آدھا ایمان ہے اس لئے آپ لوگ جب میرے پاس آتے ہیں تو خدا اور رسول کا حکم سمجھ کر دین و دیانت کی جو بات سمجھ میں آتی ہے بتاتا ہوں۔ اگر آپ لوگ اس کو بزرگی اور تصوف نہیں سمجھتے تو جائیے جہاں سے تصوف اور بزرگی ملے حاصل کر لیجئے میرے پاس کیوں آتے ہیں اور یہ میں طہارت وغیرہ پر زور اس لئے دے رہا ہوں کہ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہمیں کچھ بتاؤ۔ ہم کیا کریں کہ کامیاب ہوجائیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اطمینان دل میں آجائے اس کے لئے کوئی طریقہ بتاؤ۔ اس قسم کے سوالات کے جواب میں یہی کہتا ہوں کہ ہم کو جو معلوم ہے وہ تو یہی ہے کہ ان سب چیزوں کے حاصل کرنیکا ذریعہ دین اور شریعت پر عمل کرنا ہے اور اس میں سب سے پہلی چیز طہارت ہے۔

آج جو ہر شخص آسیب کی شکایت کرتا ہے جس کو دیکھو مبتلائے آسیب ہے تو اس کے بارے میں بھی یہی کہتا ہوں کہ جب تم پاکی ناپاکی کو نہ پہچانو گے۔ تمہاری عورتیں اور تمہارے بچے اس کے احکام کو نہ جانیں گے اور تم اس طرح سے ظاہری اور جسمانی اعتبار سے بھی نجس اور گندے رہوگے تو الجنس یمیل الی الجنس تمہارے پاس آسیب نہ آئے گا تو کیا فرشتہ آئے گا۔ بلکہ کبھی کبھی یہ کہہ دیتا ہوں کہ تمہارے پاس آسیب وغیرہ نہیں آتا۔ بلکہ تم خود آسیب ہوگئے ہو۔ جسکو چمٹ جاؤ اس کا ناس مار دو، پیروں کے پاس پہنچ جاتے ہو نہ خود کچھ کام کرتے ہو نہ ان کو کرنے دیتے ہو شریعت پر کیوں نہیں آتے ہو۔ دین اختیار کرو۔ ذکر و تلاوت۔ نماز و طہارت اختیار کرو۔ دیکھو قلب میں روشنی اور نور پیدا ہوجاتا ہے یا نہیں اور اگر ان سب باتوں کو کرنا ہی نہ چاہو تو اس کا کیا علاج ہے۔

آج مسلمانوں کی دینی بے عملی اور جہالت کے پیش نظر یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ اور قرب حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلی چیز طہارت ہے۔ بزرگوں نے تو اور کچھ فرمایا ہے اور وہ غلط بھی نہیں ہے۔ کسی وجہ سے انھوں نے ایسا فرمایا ہے چنانچہ فتوح الغیب میں ہے کہ

قال رضی اللہ عنه سألنی رجل شیخ فی المنام فقال ای شیئ یتقرب به العبد الی اللہ تعالیٰ فقلت و لذلک ابتداء و انتهاء فابتداؤه الورع وانتهاؤه الرضاء والتسلیم والتوکل۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھ سے ایک بوڑھے آدمی نے خواب میں دریافت کیا کہ وہ کون سی چیز ہے جس کے سبب بندہ اللہ کا تقرب حاصل کرتا ہے میں نے اس کے جواب میں کہا کہ جس چیز سے حق تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے اس کی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا ہے ابتدا اس کی ورع اور تقویٰ ہے جو کہ نام ہے بقدر امکان محرمات اور مکروہات سے بچنے کا اور اس کی انتہا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر بندہ راضی رہے اور اللہ تعالیٰ اپنے ارادے سے جو امور واقع فرمائیں اپنے کو ان پر ڈال دے اور اپنے کاموں کو حق تعالیٰ پر چھوڑ دے۔

حضرت جیلانی قدس سرہ بڑے شخص ہیں انھوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اپنے مرتبہ اور اس زمانہ کے لوگوں کے حالات کے مطابق تھا اس لئے کہ لوگ اس وقت بزرگوں کے پاس جو جاتے تھے تو اس حال میں کہ اپنے ظاہر کو شریعت کا پابند بنائے ہوئے ہوتے تھے یعنی نماز روزہ اور طہارت وغیرہ جو کہ بنیادی اور ابتدائی چیزیں ہیں ان سب کو سیکھنے اور ان کو عمل میں لانے کے بعد تب بزرگوں کی خدمت میں اللہ تعالیٰ کا راستہ حاصل کرنے کے لئے جاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے فرمایا کہ بھائی طریق میں پہلی چیز ورع اور تقویٰ ہے۔ یعنی مکروہات اور محرمات سے اپنے کو بچانا اور اب اس زمانہ میں خیر القرون سے دوری کے سبب سے اس قدر جہالت ہوگئی ہے کہ شریعت کا ادب و احترام ہی قلوب سے نکل چکا ہے جس کے سبب سے ہماری ظاہری نماز روزہ بلکہ طہارت بھی درست نہیں ہے اس لئے اب اس زمانہ میں اور ان حالات میں جب کوئی شخص راہ خدا کا طالب ہو تو اول اسے طہارت اور ظاہر شریعت کو درست کرنے کو کہا جائے گا اس لئے کہ کوئی کام ہو دین کا یا دنیا کا جب طریقہ اور ترتیب سے کیا جاتا ہے تب ہی مفید ہوتا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ تقرب الی اللہ کا طریق اختیار کرنے والے کیلئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے طہارت کا اہتمام کرے کیونکہ اعمال ظاہری میں سب سے مقدم طہارت ہے جس طرح کہ امور باطنی میں سب سے اول چیز ہے توبہ۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کی صفات میں سب سے پہلے اسی کا ذکر کیا ہے۔ عبادت سے پہلے توبہ کا ذکر فرمایا ہے ارشاد ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

اللہ تعالیٰ نے مؤمنین مجاہدین کی تعریف فرمانے کے بعد ان کے کچھ اوصاف کا ذکر کیا ہے کہ وہ ایسے ہے جو توبہ کرنے والے عبادت کرنے والے حمد کرنے والے اور روزہ رکھنے والے رکوع اور سجدہ کرنے والے نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے بری باتوں سے باز رکھنے والے اور اللہ تعالیٰ کی حدوں کا خیال رکھنے والے ہیں اور ایسے مومنین کو آپ خوشخبری سنا دیجئے۔

تو دیکھئے یہاں عبادت سے پہلے توبہ کا ذکر فرمایا ہے حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا توبہ کے مضمون پر ایک وعظ ہی ہے اس کا نام حضرت نے اول الاعمال رکھا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ نے احیاء العلوم کے حصہ چہارم جس کو ربع المنجیات کہا جاتا ہے اس کی ابتدا بھی کتاب التوبہ سے فرمائی ہے۔ اور اس میں یہ فرمایا ہے کہ توبہ سب کیلئے ضروری ہے کوئی شخص ہو۔ کافر ہو۔ مشرک ہو۔ عاصی ہو۔ سالک ہو۔ عابد ہو۔ ولی ہو۔ صدیق ہو۔ حتیٰ کہ نبی ہو سب کے لئے اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق توبہ ضروری ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ۔

فان التوبة عن الذنوب بالرجوع الى ستار العيوب وعلام الغيوب مبدا طريق السالكين ورأس مال الفائزين واول اقدام المريدين ومفتاح استقامة المائلين ومطلع الاصطفاء والاجتباء للمقربين ولابينا آدم عليه الصلوٰة والسلام وعلى سائر الانبياء اجمعين وما اسعد باولاد الاقتداء بالآباء والاجداد۔

اپنے گناہوں سے توبہ کرنا اس ذات کی جانب رجوع ہو کر جو عیبوں کو چھپانے والی اور عیبوں کو جاننے والی ہے سالکین کے طریق کی ابتدا ہے اور کاملین کی پونجی ہی ہے۔ مریدین کا سب سے پہلا قدم ہے جو لوگ راہ صواب سے مائل ہونے والے ہیں ان کی اصلاح دائنگی کی کنجی ہے اسی کی وجہ سے مقربین مصطفیٰ اور مجتبیٰ بنائے جاتے ہیں اور یہی ہمارے مورث اعلیٰ اور جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کے تقرب کا مطلع اور زینہ بنا۔ اس لئے کتنی سعادتمند ہے وہ اولاد جو اپنے آباء و اجداد کی اقتداء کرنے والی اور ان کے نقش قدم پر چلنے والی ہو۔

مطلب یہ کہ جب ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی کامیابی کا ذریعہ اور ذریعہ توبہ ہے تو ان کی اولاد کو بھی یہی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ یہی سعادت مندی کا بھی تقاضہ ہے۔

دیکھئے حضرت جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے تو تقرب کی زینہ اور ورع کو فرمایا تھا لیکن امام غزالیؒ مقربین کے اجتباء اور اصطفاء کا سبب توبہ کو فرما رہے ہیں چنانچہ اہل طریق میں یہی مشہور اور

معروف بھی ہے کہ راجع الی اللہ کا سب سے پہلا عمل توبہ ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ توبہ طہارت باطنی ہے اسکی وجہ سے قلب طاہر ہوتا ہے اور وضو طہارت ظاہری ہے۔ اسی سے جسم پاک ہوتا ہے اور یہ معلوم ہے کہ ظاہر کی طہارت باطن کی طہارت پر مقدم ہے اس لئے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ تقرب الی اللہ حاصل کرنے والے کے سب سے پہلی چیز طہارت ہے تو اس میں کیا اشکال ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اسی کا اہتمام کرنا چاہئے اور اسے چھوٹا اور معمولی کام سمجھ کر ترک نہیں کر دینا چاہئے کیونکہ کسی کام کے کرنے میں ترتیب کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ صاحب موافقات نے ایک مقام پر چند فرقوں کا تذکرہ کر کے یہ لکھا ہے کہ۔

لیس کل ما یعلم مما ھو حق یطلب نشرہ وان کان علم الشریعۃ ومما یفید علما بالاحکام بل ذالک ینقسم فمنہ ماھو مطلوب النشر وھو غالب علم الشریعۃ ومنہ مالا یطلب نشرہ بالاطلاق اولا یطلب نشرہ بالنسبۃ الی حال او وقت او شخص۔ (موافقات صفحہ ۱۹۱ جلد ۴)

یعنی جو بات حق ہو تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کا شائع کرنا بھی مستحسن ہو اگرچہ وہ علم شریعت اور اس کے احکام ہی سے متعلق کوئی بات ہو بلکہ اس میں تفصیل اور تقسیم ہے وہ یہ کہ ۱۔ بعض امور قابل اشاعت ہوتے ہیں۔ مثلاً عام شرعی احکام۔ ۲۔ بعض چیزوں کا نشر مطلقاً جائز نہیں ہوتا۔ اور بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ بعض حالات بعض اوقات اور بعض اشخاص کے اعتبار سے ان کا نشر مناسب نہیں ہوا کرتا۔ یوں عام طور سے چاہے وہ ممنوع النشر نہ ہوں۔

پھر اس کے کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں اور مجھے اس وقت یہی آپ کو سنانا ہے کہ۔

ومنہ ان لا یذکر من العلم ماھو حظ المنتھی بل یربی لصغار العلم قبل کبارہ۔

(صفحہ ۱۹۱ جلد ۴)

یعنی ان امور میں سے جن کی رعایت مصلح اور کام کرنے والے کے لئے ضروری ہے ایک یہ کہ مبتدی کے سامنے ان علوم کو نہ بیان کرے جو منتہیوں کا حصہ یعنی ان کے حسب حال ہوں بلکہ اس کو چاہئے کہ پہلے چھوٹے چھوٹے علوم کے ذریعہ لوگوں کی تربیت کرے پھر بڑے بڑے علوم کو ان تک پہنچائے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بھی فرمایا ہے کہ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ اور ربانی رب سے ماخوذ ہے اور رب تربیت سے مشتق اور تربیت کے معنی ہیں کسی چیز کو درجہ بدرجہ

کمال تک پہنچانا۔ پس عالم ربانی کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ اُمت کو تدریجاً تقرب الی اللہ کا طریق بتائے اور اس پر لے چلے۔

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ جو لوگ تقرب الی اللہ کے طریق کے طالب ہیں۔ ان کو ابتداء سے لے چلو یعنی پہلے طہارت کے مسائل کو سکھلاؤ۔ نماز روزہ کا پابند بناؤ حقوق العباد کی ادائیگی کا اہتمام انکے اندر پیدا کرو اور حقوق اللہ میں سے پہلے فرائض کی تعظیم اور ان کا اہتمام ان کے دل میں ڈالو۔ قضا نمازیں قضا روزے اس طرح سے کفارے وغیرہ اگر ان کے ذمہ ہوں ان کو ادا کراؤ۔ اور ظاہری اور مشہور مشہور اخلاق رذیلہ مثلاً کذب۔ غیبت۔ نمیمہ۔ غصہ اور نفاق وغیرہ ان سے ترک کراؤ اور انکو متوجہ کرو کہ اپنی روزی خود حاصل کریں اور حلال روزی کمائیں۔ کاہل اور عہدی بن کر نہ رہیں اور کسی پر کل اور بار نہ ہوں یہ سب ابتدائی چیزیں ہیں اور کرنے کے کام ہیں ان سب کو تو نہ کرو۔ اور اول ہی دن سے وظیفہ کا مطالبہ شروع کردو مراقبہ اور مشاہدہ۔ ذکر قلبی اور دوام ذکر فنا فی الشیخ فنا فی اللہ بقاباللہ ان سب امور کی تحقیق اور تدقیق کے درپے ہو جاؤ تو یہ سب کام نہ کرنے کی باتیں ہیں اس لئے کہ جن چیزوں کو سمجھتے نہیں اس کے تو پیچھے پڑے ہوا ور جس کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ قبر میں سب سے پہلے اس کا سوال ہوگا۔ اس کی فکر نہیں بس اب اس دعا پر مضمون کو ختم کرتا ہوں

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ تَمَامَ الْوُضُوْءِ وَتَمَامَ الصَّلٰوۃِ وَتَمَامَ رِضْوَانِکَ وَتَمَامَ مَغْفِرَتِکَ۔

اور

اَللّٰھُمَّ طَہِّرْ قَلْبِیْ مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِیْ مِنَ الرِّیَاءِ وَلِسَانِیْ مِنَ الْکِذْبِ وَعَیْنِیْ مِنَ الْخِیَانَۃِ فَاِنَّکَ تَعْلَمُ خَائِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ

اے اللہ میں سوال کرتا ہوں آپ سے کامل وضو اور کامل نماز کی اور آپ کی پوری رضامندی اور آپ کی پوری مغفرت کی۔

اے اللہ پاک کردے میرے دل کو نفاق سے اور میرے عمل کو ریا سے اور میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھ کو خیانت سے اس لئے کہ آپ جانتے ہیں خیانت کرنے والی آنکھوں کو اور وہ چیز جو چھپاتے ہیں دل دیکھئے ان دعاؤں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح سے باطنی اور قلبی طہارت کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا ہے اسیطرح آپنے ظاہری طہارت کا بھی اللہ تعالیٰ سے سوال کیا یہ اسلئے کہ باطنی طہارت کا ذریعہ ظاہری طہارت ہے چنانچہ جسقدر کسیکی طہارت کامل اسقدر اسکی نماز کامل اور جتنی نماز کامل اسی قدر اسکا دین کامل۔

ملفوظات

فرمایا کہ میں اپنے مسلک میں تو نرم ہوں نہیں لیکن دوسرے لوگوں سے بھی پورے اخلاق سے ملتا ہوں یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی کشش اپنی جانب پاتا ہوں۔ جس جماعت کی اپنی ہی جماعت کے لوگ تفسیق و تکفیر تک کرتے ہیں میں ان سے بھی بہت نرمی سے ملتا ہوں اور اس کا یہ اثر دیکھتا ہوں کہ اہلِ حق کی جانب سے ان کے اندر بھی نرمی پیدا ہوئی۔ جو شخص مصلح ہو اس کے لئے اس خلق کو بہت ضروری سمجھتا ہوں۔

اور یہ خلق انبیا علیہم السلام کا ہے کہ خود تو ہوتے ہیں معصوم مگر اہلِ معاصی کو حقیر نہیں جانتے۔ گناہ کبیرہ کے مرتکب پر بھی شفقت کا معاملہ فرماتے ہیں اس اخلاق کو دیکھ کر وہ لوگ ذبح ہو جاتے تھے۔

پس جو لوگ متبع سنت ہیں وہ اس وصف سے حصہ دئے جاتے ہیں۔

فرمایا کہ فنا فی اللہ اور اللہ تعالیٰ سے محبت کی ترغیب میں اس شعر کے مضمون سے زیادہ موثر مضمون میری نظر سے نہیں گذرا ؎

میں جو اس پر مر مٹا ناصح تو کیا بیجا کیا
اک مجھے سودا تھا دنیا بھر تو سودائی نہ تھی

فرمایا کہ کیسے کیسے انبیاء و مرسلین علماء مشائخ ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا دم بھرتے آئے ہیں کیا سب کے سب سودائی ہی تھے (معاذ اللہ)

فرمایا کہ آدمی پیر کے بدن سے قرب حاصل کرتا ہے تو پیر تک پہونچ جاتا ہے اور اس کے روح سے قرب حاصل کرے گا تو اللہ تعالیٰ تک پہونچ جائیگا باقی صرف بدن سے قرب حاصل کر کے خدا تک پہونچنا چاہے یہ نہیں ہو سکتا۔ لوگ یہی سمجھے ہوئے ہیں اور میں اسی کو سمجھاتا ہوں کہ بدن پر گرنا بے سود ہے۔

مضمونِ اُخوّت

از افاضات

مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہٗ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اخوّت

قال اللہ تعالیٰ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ۔ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَلۡمُسۡلِمُ اخوالمُسۡلِمِ۔

اس آیت اور اس حدیث سے مسلمانوں میں باہم اخوت کا مطلوب ہونا معلوم ہوا۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اخوت اور صحبت کے کچھ آداب اور حقوق بیان فرمائے ہیں ہم آج اسی کو بیان کرنا چاہتے ہیں دیکھئے جس طرح ماں باپ میں یا صرف باپ یا صرف ماں میں شرکت کی وجہ سے دو شخص آپس میں بھائی بھائی ہوجاتے ہیں اسی طرح اسلام و ایمان میں مشارکت کی وجہ سے دو شخصوں میں دینی اخوت قائم ہوجاتی ہے۔ ایک پیر کے جتنے مُرید ہیں یا اس کو جانے دیجئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سب لوگ اُمتی ہیں لہٰذا سب میں اخوت قائم ہے خواہ وہ اس کو زبان سے کہے یا نہ کہے اخوت بہرحال قائم ہے جس طرح سے دو شخص ایک ماں باپ کی اولاد ہوں تو وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اس اخوت کے ثابت ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اس کو زبان سے بھی کہیں کہ ہم بھائی ہیں ہم بھائی ہیں۔ اخوت تو ان کی فطری طور پر قائم ہے یعنی کسی کے کہنے پر موقوف نہیں ہے۔ اسی طرح سے اخوت دینی بھی خود بخود قائم ہوجاتی ہے۔ تاہم لوگوں نے عقدِ اخوت کو منعقد بھی کیا ہے چنانچہ اسلام میں ابتداءً عقدِ اخوت لوگ منعقد کرتے تھے اور اس کی وجہ سے ان میں باہم میراث بھی جاری ہوتی تھی۔ گو بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ بہرحال اس عقد اخوت کے متعلق احیاء العلوم میں ہے کہ عقدِ اخوت دو شخصوں کے درمیان ایک رابطہ اور تعلق کا نام ہے۔ جیسے کہ زوجین کے مابین عقد نکاح اور جس طرح سے کہ نکاح مقتضی ہوتا ہے کچھ حقوق کو جن کا ایفاء جانبین کے لئے واجب ہوتا ہے تاکہ یہ عقد قائم رہے اسی طرح سے عقد اخوت بھی کچھ حقوق کو واجب کرتا ہے

جن کا لحاظ ہر ایک کے لئے ضروری ہوتا ہے اور جس طرح سے کہ عقد نکاح کے حقوق کا ایفا نہ کیا جائے تو جانبین سے مطالبہ متارکت کا ہوتا ہے اسی طرح سے عقد اخوت کی وجہ سے جو حقوق ایک کے دوسرے پر عائد ہوتے ہیں اگر ان کی ادائیگی میں کوتاہی ہوئی تو پھر اس کا بھی نتیجہ متارکت و مفارقت بلکہ باہمی بغض و عداوت کی شکل میں نمودار ہونا ناگزیر ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عقد اخوت کی وجہ سے تمہارے بھائی کا تم پر مال میں بھی حق ہوتا ہے اور نفس میں بھی۔ زبان میں بھی اور قلب میں بھی۔ یعنی یہ کہ اس کو معاف کرو۔ درگذر کرو۔ اس کے لئے دعا کرو۔ اس کے ساتھ اخلاص سے پیش آؤ اس کے حقوق کو ادا کرو۔ اس کے ساتھ سہولت پسندی کا معاملہ کرو اور تکلف اور تکلیف کو ترک کرو چنانچہ یہ کُل آٹھ حقوق ہیں۔ پہلا حق مال میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دو بھائیوں کی مثال ایسی ہے جیسے کہ دونوں ہاتھ کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو دھوتا اور صاف کرتا ہے آپؐ نے دو بھائیوں کو دو ہاتھوں سے تشبیہ دی ہاتھ اور پیر سے نہیں دی اس لئے کہ ہاتھ اور پیر کے اغراض مختلف ہوتے ہیں اور دونوں ایک ساتھ ہی کام میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے ہیں اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ یہی حال دو دینی بھائیوں کا ہے کہ ان کی اخوت بھی اسی وقت تام سمجھی جائے گی جبکہ ایک مقصد میں دونوں شریک ہوں پس وہ دونوں ایک حیثیت سے مانند شخص واحد کے ہیں اور جب ایسا ہے تو اس کا تقاضا ہے کہ رنج و راحت میں دونوں ایک دوسرے کے شریک کار ہوں اور مال اور حال میں دونوں مشارک۔ درمیان سے اختصاص اُٹھ جائے اور کسی کو کسی پر ترجیح باقی نہ رہے۔

آگے فرماتے ہیں کہ اپنے بھائی کے ساتھ مال کے سلسلہ میں برتاؤ تین قسم پر ہے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس کو اپنے غلام اور خادم کے مانند سمجھو یعنی اپنے فاضل مال سے اس کی حاجت روائی کرو جب اس کو کوئی ضرورت پیش آئے اور تمہارے پاس اپنی ضرورت سے فاضل مال بھی موجود ہو تو اس کو بلا مانگے ہوئے دو۔ سوال پر اس کو مجبور نہ کرو۔ یہ میں امام غزالی کے ارشادات سُنا رہا ہوں اب لوگ سب سے

پہلے اس کو اُنجھی پر مشق کرتے ہیں یعنی ہم کو ہمارے کلام سے مجوج کرکے ہمیں سے اس پر عمل کا مطالبہ کرتے ہیں اور خود عمل نہیں کرتے۔ ہم کو آزماتے ہیں اپنے کو کوئی نہیں آزماتا۔ آپ سے پوچھتا ہوں کہ علماء اور مشائخ کو تو لوگ مرنے کے وقت تک آزمائیں اور اپنے کو نہ آزمائیں۔ یہ کیسا ہے؟ آگے سنئے امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم نے اس کو سوال پر مجبور کیا تو یہ عقد اخوت میں انتہائی خامی اور کوتاہی کی بات ہے اور یہ سمجھو کہ تم نے اس کا ادنیٰ درجہ بھی ادا نہیں کیا۔

دوسرا درجہ اخوت کا یہ ہے کہ تم اس کو اپنی طرح سمجھو اور اس بات پر راضی ہو جاؤ کہ وہ تمہارے مال میں اور تمہارے جملہ تصرفات میں تمہارا شریک کار ہو جائے، یہاں تک کہ تم اپنا نصف مال ہی اس کو دے دو۔ حضرت حسن رضؓ فرماتے ہیں کہ اس مرتبہ میں اسلاف کا یہ حال تھا کہ اگر کسی کے پاس ایک تہبند ہی ہوتا تو وہ اس میں سے نصف پھاڑ کر اپنے بھائی کو دیتا اور نصف خود استعمال کرتا۔

اور عقد اخوت کا تیسرا مرتبہ جو کہ سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کو اپنے نفس پر بھی ترجیح دو اور اس کی حاجت کو اپنی حاجت پر مقدم سمجھو اور یہ مرتبہ صدیقین کا ہے اور باہم محبت رکھنے والوں کا اعلیٰ درجہ ہے ــــ میں یہ مضمون اس لئے بیان کر رہا ہوں تاکہ آپ لوگ اس کو سُن کر گھبرا جائیں کیونکہ یہ سب کام تو آپ سے ہوں گے نہیں۔ اس زمانہ میں یہ بہت مشکل ہے اور مجھے کچھ آپ کے موجودہ حالات سے یہ توقع بھی نہیں کہ آپ لوگ اس پر عمل کریں گے۔ وہ تو دوسرے ہی لوگ تھے اور دوسرا ہی زمانہ تھا جب کہ لوگ اس پر عمل کرتے تھے اب نہ آپ ویسے۔ نہ ہم ویسے اور نہ زمانہ ویسا۔ باقی اگر آپ یہ فرمائیں کہ اچھا پھر اس قسم کے مضامین کو بیان ہی کیوں کرتے ہو؟ تو میں عرض کروں گا کہ بیان اس لئے کرتا ہوں کہ آپ کو آپ کے اسلاف کا نمونہ دکھلاؤں تاکہ آپ ان کی سیرت کے آئینہ میں اپنی تصویر دیکھیں۔ اور آپ کو اندازہ ہو کہ آپ کہاں تھے اور کہاں پہنچ چکے ہیں۔ اخلاق کی کس بلندی پر تھے اور اب بداخلاق کی کس پستی میں گر گئے ہیں۔ الغرض اس قسم کے مضامین بیان ہی اس لئے کرتا ہوں کہ آپ گھبرا کر زبان قال سے یا کم از کم زبان حال

سے یہ کہیں کہ تم نے تو بیان کا ایسا سلسلہ شروع کر دیا ہے کہ اب اس زمانہ میں ان پر عمل تو درکنار ان کا سننا ہی بار خاطر ہوتا ہے۔ اس لئے ایسی باتیں نہ بیان کرو۔ میں کہوں گا کہ اسی قسم کے مضامین کے بیان کرنے کی تو ضرورت ہے اب اس کو نہ بیان کروں تو کیا بیان کروں۔ لہٰذا میں تو بیان کروں گا آپ یہ فرمائیں گے کہ اب اس زمانہ میں بھلا ہم لوگوں سے ان باتوں پر عمل ہو سکتا ہے؟ ارے اپنے باپ ماں اور بھائی بہن کو تو کوئی مال دینے کے لئے تیار نہیں ہے اور آپ دوست کا ایسا ایسا حق بیان کر رہے ہیں میں یہ کہوں گا کہ ہاں یہ ٹھیک ہے اچھا اگر آپ سے اتنی اونچی چیزوں پر عمل نہیں ہو سکتا تو پھر میرے اور آپ کے درمیان صلح کی بھی صورت ہو سکتی ہے کہ کچھ آپ دبئے اور کچھ ہم دبیں ہم آپ سے اس اعلیٰ درجہ کا مطالبہ نہ کریں گے لیکن آپ بھی یہ کریں کہ اگر اخوت کے یہ سب مراتب نہیں اختیار کر سکتے اور کسی کو اپنی ذات سے نفع نہیں پہنچا سکتے تو نہ پہنچایئے لیکن کم از کم اتنا تو کیجئے کہ کسی کو ضرر نہ پہنچایئے۔ اس زمانہ میں اگر اسی قدر پر ہماری اور آپ کی صلح ہو جائے تو غنیمت ہے۔

الحاصل میں اخوۃ کے یہ سب حقوق اسی لئے بیان کر رہا ہوں تاکہ اس کو سن کر آپ یہ سمجھیں کہ اللہ اکبر مسلمانوں کے اور اخوۃ کے اتنے حقوق ہیں اور ہم انہیں کس قدر پامال کر رہے ہیں جب اس کا احساس ہو گا تب جا کر ادنیٰ درجہ پر آپ آسکیں گے یعنی یہ کہ کسی کو نقصان اور ضرر نہ پہنچائیں گے کہ لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک صاحب سے ان کے کسی نزاع کے متعلق کچھ گفتگو فرمائی اور کچھ سمجھایا اور نصیحت فرمائی پھر ان سے پوچھا کہ آپ سمجھ گئے کہنے لگے جی ہاں۔ سمجھ میں تو آگیا زبان تو ساکت ہو جائے گی مگر دل ساکت نہ ہوگا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ بس میں اتنا ہی چاہتا ہوں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر کسی کی نصیحت کا اتنا ہی اثر دوسرے پر پڑے کہ وہ اپنی زبان بند کر لے تو کچھ کم فائدہ ہے؟ زبان ہی تو نزاعات کی جڑ ہے۔ آج جتنے بھی فسادات اور عداوت مسلمانوں میں ہیں ان میں اکثر و بیشتر کا سبب یہی زبان ہوتی ہے۔ آدمی کے قلب میں اگر بالفرض کبر۔ حسد یا غصہ اور عداوت وغیرہ موجود ہے تو اس سے خود

اس کا نقصان تو ہے کہ یہ بداخلاق سمجھا جائے گا لیکن دوسروں کا اس سے کیا ضرر؟ غیر کے حق میں تو یہ مضر اسی وقت ہوگا جب کہ یہ شخص اپنے قلب کے مقتضار پر جوارح سے عمل کرے اور ان میں سب سے پیش پیش آدمی کی زبان ہی ہے۔ اسی لئے میں نے کہا کہ زبان ہی فتنوں کی جڑ ہے اور بغض و عداوت کے شیوع کا ذریعہ ہے اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ چیزیں آج ہم میں عام ہیں۔

اب اگر مسلمانوں کے انھیں حالات کو دیکھ کر جب کہ آپ حضرات یہاں تشریف لاتے ہیں اور جمع ہوتے ہیں آپ کے سامنے اس قسم کے مضامین نہ بیان کروں تو پھر کیا باپ دادا کا ذکر کروں ایک صاحب نے کسی عالم سے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت میں کمی معلوم ہوتی ہے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور خصائل بیان کئے۔ نیز آپ کے جمال و کمال و منال پر نہایت عمدہ وعظ فرمایا جس سے یہ صاحب خوب محظوظ اور لطف اندوز ہو رہے تھے۔ درمیان میں ان عالم صاحب نے فرمایا کہ یہ سارے کمالات تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آپ سُن رہے ہیں لیکن آپ کے والد صاحب بھی بہت اچھے آدمی تھے اس پر وہ صاحب بولے کہ ارے مولانا! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں کہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ہو رہا ہے اور کہاں میرے باپ دادا کا ذکر آپ نے چھیڑ دیا۔ کس قدر بے جوڑ سی بات ہے یہ سُن کر مولوی صاحب نے فرمایا کہ ہاں بات تو بے جوڑ ہے لیکن میں نے ایسا قصداً کیا ہے آپ کو یہ سمجھانا مقصود تھا کہ آپ کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے اور بحمد اللہ والدین کی محبت سے زائد ہے اسی لئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے درمیان میں اپنے باپ دادا کا ذکر آپ کو ناگوار گذرا ورنہ تو میں نے تو ان کی تعریف ہی تو کی تھی۔ ان کی مذمت تو کی نہیں تھی۔۔۔

اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ اگر ان سب مضامین کو آپ کے سامنے نہ بیان کروں تو کیا باپ دادا کا ذکر کروں اور اگر میں کرنے لگوں تو آپ کو بھی ناگوار گذرے گا اور آپ بھی کہیں گے کہ اصلاحی مجلس میں ان سب باتوں کا کیا جوڑ؟ تو سُنئے اصلاح انھیں سب چیزوں کے بیان کا نام ہے۔ اصلاح عمدہ عمدہ اشعار پڑھ دینے کا نام نہیں ہے اور نہ اس کا نام ہے کہ لوگوں کے سامنے قواعد کلیہ

نہایت مدلل طریقہ سے بیان کر دیئے جائیں محض اس اتنے سے اصلاح نہ ہوگی میں نے ابھی چند روز ہوئے بیان کیا تھا کہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی ؒ نے حجۃ البالغہ میں فرمایا ہے کہ :-

باب بیان ما کان علیہ حال اھل الجاھلیۃ فاصلحہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم	اہل جاہلیت جس حال پر تھے اس کا بیان نیز یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اس کی جو اصلاح فرمائی اس کا بیان ۔

یہ باب قائم فرما کر فرماتے ہیں کہ :-

ان کنت ترید النظر فی معانی شریعۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتحقق اولاً حال الامیین الذین بعث فیھم التی ھی مادۃ تشریعہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔(حجۃ اللہ البالغہ)	اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے معانی میں نظر و فکر کرنا چاہتے ہو تو پہلے ان اُمیوں کے حالات پیش نظر کرو جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے اور جو کہ آپ کی شریعت کے لئے بمنزلہ مادہ کے تھے ۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

اس سے معلوم ہوا کہ ہر زمانہ میں قوم کی اصلاح کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوم کے حالات خود بھی پیش نظر رکھے اور قوم کو بھی اسلاف کی سیرت سے واقف کرائے ۔ لوگوں کے حالات ہی کو اپنی اصلاح کا مادہ قرار دے اور ان سے یوں کہے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ کے احکامات یہ ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات ہیں ۔ اسلاف کی یہ سیرت ہے اور تمھارا یہ حال ہے ۔ شریعت کی یہ تعلیمات ہیں اور تمھارے یہ اعمال ہیں ۔ تم کو ایسا ہونا چاہئے تھا اور تم یہ ہو ۔ تمھیں ادھر چلنا تھا اور تم کدھر جا رہے ہو ۔ تمھارے کبھی یہ اخلاق تھے اور اب ان کی جگہ ان بد اخلاقیوں نے لے لی ہے ۔ کسی وقت میں تم میں آپس میں یہ اخوت اور ایسی صداقت تھی اور اب تم میں باہم یہ نفرت اور یہ بغض اور یہ عداوت پیدا ہوگئی ہے ۔ اخلاص کی جگہ نفاق اور ذکر کی جگہ غفلت سے پوری قوم دو چار ہے آپس کے تعلقات کی پراگندگی کی وجہ سے کوئی دو شخص باہم یک دل نہیں رہے دُنیا میں محبت و مروّت اور اخوت کا صرف نام ہی نام باقی رہ گیا ہے اور اہل دُنیا

اس کا مصداق دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ یوں ظاہراً گو ملنا جلنا بھی ہے مگر اہل احساس سمجھتے ہیں کہ اس ظاہر یہ میں باطن نام کو نہیں ہے اور اس صورت میں حقیقت کا دور تک پتہ نہیں ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

آپ لوگ صرف جسمانی طور سے مجتمع ہوں اور قلوب میں اس اجتماع کا مطلقاً اثر نہ ہو تو یہ بھی کوئی اجتماع ہے؟ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ بات تو ہنسی کی ہے لیکن ہے ہمارے حال کے عین مطابق اس لئے بیان کرتا ہوں۔ ہمارے دوستوں میں سے ایک بنگالی ماسٹر صاحب تھے یہ بجھاں میں ماش کی دال زیادہ کھاتے ہیں اور کبھی کبھی اس کو خشک بھی پکاتے ہیں۔ ایک دفعہ ان کے کھانے میں چاول اور ماش کی بھری بھری دال آئی۔ چاول بھی خشک تھے اس لئے دونوں باہم ملتے نہ تھے۔ انھوں نے کھانے کو تو جیسے تیسے کھا ہی لیا مگر ہم لوگوں سے کہتے تھے کہ دال بہت خشک تھی۔ آج دال بھات میں ملاقات نہیں ہوا۔ لوگ تو یہ سُن کر بہت ہنسے اور ان کا ایک مذاق سا بنا لیا جب ملتے تو لوگ ان سے کہتے کہ ماسٹر صاحب! آج دال بھات میں مُلاقات ہوا یا نہیں؟ لیکن میں نے اس سے ایک مسئلہ نکالا وہ یہ کہ اس سے معلوم ہوا کہ بعض ملاقات ایسی بھی ہوتی ہے کہ ملاقات ہونے پر بھی ملاقات نہیں ہوتی۔ چنانچہ دیکھئے دال چاول ایک ہی برتن میں موجود تھے اور ان کو باہم ملا کر کھایا بھی گیا تھا مگر ماسٹر صاحب کہتے تھے کہ ملاقات نہیں ہوا تو کیا بات تھی؟ بات یہ تھی کہ چاول خشک تھے اور دال بھی اتفاق سے خشک تھی اس لئے باوجود ملانے کے بھی وہ ملی نہیں بلکہ ہر ایک اپنی جگہ اینٹھا رہا جس طرح سے دو متکبر شخص اپنے اپنے طور پر اکڑے رہتے ہیں اور باہم ملتے نہیں گو بظاہر ملے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے ایک اور واقعہ سُنئے۔

ایک صاحب ذرا چھوٹے قد کے تھے ان کی ملاقات ایک ایسے صاحب سے ہوئی جن کی توند نکلی ہوئی تھی باہم معانقہ کیا لیکن کچھ تو یہ پستہ قد اور کچھ ان کی بڑی توند اس لئے گلے سے گلا نہ مل سکا اس پر ان میں سے ایک صاحب نے بعد میں کہا کہ یہ تو معانقہ نہیں ہوا۔ مباطنہ ہو گیا۔ تو دیکھئے بعضا ملنا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملنے پر بھی آدمی نہیں ملتا یعنی محض صوری ہوتا ہے اور حقیقی نہیں ہوتا۔

دو شخص میری ہی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے ان میں آپس میں کچھ اختلاف رہا ہوگا جس کی وجہ سے باہم ایک دوسرے کو سلام تک کرنے کے روادار نہیں تھے۔ میں ان کی یہ حالت دیکھ کر کہتا تھا کہ یا اللہ میں دن رات انھیں باتوں کو بیان کرتا ہوں مگر ان لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ان کو کیا ہوگیا ہے۔ حالانکہ میں کتاب میں دکھا سکتا ہوں کہ ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان سے ملتا ہے تو اس کی وجہ سے ہر ایک کے دوسرے پر کچھ حقوق ہوجاتے ہیں لیکن آج اس کو لوگ سمجھتے تک نہیں اور اس زمانہ میں اس بحث کا سمجھنا بھی مشکل ہے اور سمجھانا بھی مشکل ہے۔

آجکل جن لوگوں کو آزاد خیال کہا جاتا ہے دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ جب آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو مجلس اور ملاقات کا کچھ حق بھی ادا کرتے ہیں۔ باہم خوش طبعی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں مگر ہم لوگ جو اخلاق کے مدعی ہیں ان میں سے یہ سب چیزیں بالکل ختم ہوچکی ہیں —— تو جس طرح سے ان ماسٹر صاحب نے کہا تھا کہ دال بھات میں ملاقات نہیں ہوا اور اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ ایسی ملاقات نہیں ہوئی جیسی کہ ان کے اطراف کے دال بھات میں ہوا کرتی ہے یعنی یہ کہ دونوں چیزیں اشارۂ حسیہ میں بھی متحد ہوجائیں اور ایک طرف اشارہ بعینہٖ دوسرے کے جانب اشارہ ہوجائے۔ مثلاً دیکھئے یہ دیوار ہے اور یہ سفید ہے تو سفیدی دیوار کے ساتھ اس درجہ متحد ہے کہ اگر آپ سفیدی کی طرف اشارہ کریں تو وہی اشارہ دیوار کی جانب بھی ہوجائے گا اور دیوار کی جانب اشارہ کیا جائے تو وہی سفیدی کی طرف سمجھا جائے گا۔ گویا ملنے سے ان کا مطلب یہ تھا کہ ایسا نہیں ملا کہ اس کا مصداق ہوجاتا کہ ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ آج اور تعلقات کو تو جانے دیجئے خود پیر اور مرید میں ایسی ملاقات نہیں ہے جیسی وہ ماسٹر صاحب دال اور بھات میں چاہتے تھے اور یہی حال اس زمانہ میں تمام تعلقات کا ہوگیا ہے۔ آج اپنے کسی بھائی کی مدد کرنا تو درکنار اس کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔ چاہتے ہیں کہ کس طرح اسے تباہ کریں

یہ حال ہمارا ہوگیا ہے۔

آج اسی بداخلاقی نے قوم کو کھوکھلا کر دیا ہے اور ہماری تمام خرابی اور تباہی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ غیروں نے ہمیں تباہ کیا ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ ہم نے خود اپنے پاؤں میں کلہاڑی ماری ہے ہم خود اپنی بداخلاقی کی وجہ سے خراب ہوئے ہیں اور اپنی تباہی و بربادی کے خود ہم ذمہ دار ہیں اب میں ان باتوں کو بیان کروں اور چاہوں کہ آپ حضرات کو کچھ اس جانب متوجہ کروں تو اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ سے کہتا ہوں کہ آپ نے بھی دوستوں سے ایسا ہی عقد باندھا ہے جس کو امام غزالی رح بیان فرمارہے ہیں یا نہیں؟ اگر باندھا ہے تو پھر اس کے حقوق کیوں نہیں ادا ہو رہے ہیں اور اگر ابھی تک یہ عقد ہی نہیں باندھا تو اب سے اس کو کیجئے۔ اور دل سے کیجئے۔ امام فرماتے ہیں کہ جو عقد کہ ابھی تک باطن میں نہ منعقد ہوا ہو تو اس کے بغیر یہ میل ملاپ اور آمد و رفت جو باہم جاری ہے محض رسمی ہے جس کا کہ نہ عقل کے نزدیک کچھ اعتبار ہے اور نہ شرع میں۔

میں اس وقت جو کلام کر رہا ہوں وہ زمانہ اور لوگوں کے حالات کے تقاضے کے موافق کر رہا ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ اہل فہم کے نزدیک وہی کلام معتبر ہے جو کہ مقتضٰی حال کے مطابق ہو۔ اب جو یہ باتیں کہہ رہا ہوں اگر لوگ اس کو سن کر ان پر عمل بھی کرنے لگیں تو اس میں ان کا کیا ضرر ہے؟ پھر لوگ عمل کیوں نہیں کرتے؟

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت نہ صرف مسلمان بلکہ ساری دُنیا ایسے حالات سے گذر رہی ہے کہ اب ایسی ہی گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایسا وقت ہے کہ بداخلاقیوں کے شیوع کی وجہ سے نہ کسی کی جان و مال محفوظ ہے اور نہ کسی کی عزت و آبرو محفوظ ہے۔ ایذا اور اضرار حرام ہے۔ لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام لیکن حال یہ ہے کہ معمولی سے معمولی باتوں پر لوگ جھوٹا حلف تک اُٹھانے میں باک نہیں کرتے اور تماشہ یہ کہ کام تو کرتے ہیں غلط اور اس کو کمال سمجھتے ہیں۔ ایک شخص جھوٹا حلف اُٹھا رہا تھا اور حلق خشک ہوتا جا رہا تھا

لوگ سمجھتے تھے کہ یہ جھوٹا شخص ہے اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ ہوشیاری ہے اور اس کے لوگ بھی یہی سمجھتے تھے کہ یہ شخص بہت ہوشیار ہے۔ یہ کیسا ہے، قرآن شریف اور حدیث میں جس کو نفاق کہا گیا ہے اب لوگ اسی کو ہوشیاری کہیں۔ آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ کیسا ہے، لوگوں کا مذاق کس درجہ فاسد ہو چکا ہے اور آپ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔

میں سچ کہتا ہوں کہ آج اسی نفس پرستی نے لوگوں کو خدا پرستی سے روک دیا ہے اور ہماری اسی بد اخلاقی نے ہمیں یہ روز بد دکھلایا ہے۔ معاد یعنی آخرت کی درستگی تو اصلاح پر موقوف ہے ہی میں تو اب یہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کی دنیوی زندگی کا چین اور سکون بھی اخلاق ہی کے درست کرنے پر موقوف ہے اور اس پر قسم کھا سکتا ہوں کہ جس طرح سے کہ اگلے زمانہ میں صوفیاء کرام نے اپنے نفس کو مارا تھا اسی طرح سے اب ہر ہر شخص کو آخرت کے لئے نہیں تو دنیوی راحت کے لئے اپنے نفس کی اصلاح کرنی ہوگی اور اسی طرح سے کرنی ہوگی جس طرح سے صوفیاء کرام نے کی تھی۔ باقی وہ لوگ تو بڑے لوگ تھے انھوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے نفس کو مارا تھا اور اپنے اخلاق کی اصلاح کی تھی اور آپ کو اب دنیوی چین اور سکون حاصل کرنے کے لئے نفس کو مارنا ہوگا ورنہ بدون اس کے آخرت تو خراب ہوگی ہی یہ دنیا بھی دوزخ کا نمونہ بن جائے گی۔

میں نے سفر حج میں ایک مصری عالم کو وعظ کہتے ہوئے سنا تھا انھوں نے نہایت مؤثر طریقہ سے مسلمانوں کی بد اخلاقی کا بیان کیا تھا ایسا کہ میں نے ان کی تقریر سن کر اپنے دل میں کہا کہ ہاں یہ ہے وعظ اور یہ سمجھا کہ میرا یہ سفر کامیاب ہوگیا۔ انھوں نے یہ بیان کیا تھا کہ دیکھو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں تشریف آوری کا مقصد یہ تھا کہ ہم کو دونوں جہان کی فلاح کا طریقہ بتائیں۔ چنانچہ آپ نے معاد اور معاش دونوں کی درستگی کے اصول تعلیم فرمائے۔ آپ نے خالق اور مخلوق کے مابین اصلاح کا طریق سکھلایا اور آپ نے یہ بھی بتایا کہ باہم ایک مخلوق کے دوسرے پر کیا کیا حقوق ہیں چنانچہ اسلامی اخلاق اور آداب معاشرت دنیا کے سامنے پیش فرمائے اور آپ نے بتایا کہ تدبیر منزل کے کیا کیا اصول ہیں اولاد پر والدین کے اور والدین پر اولاد کے اسی طرح سے زوجین کے باہم ایک دوسرے پر کیا

حقوق ہیں؟

غرضیکہ آپ نے دین و دُنیا کی کوئی ایسی ضرورت کی چیز نہیں چھوڑی جس میں رہنمائی نہ فرمائی ہو تو اب جس نے آپ کی کامل تصدیق کی یعنی معاد میں بھی اور معاش میں بھی وہ یہاں بھی کامیاب ہوا اور وہاں بھی کامیاب ہوا اور جس نے جس قدر تصدیق میں کمی کی وہ اسی قدر نقصان اور خسارہ میں پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اس دُنیوی زندگی سے متعلق جو امور تھے ان میں تو تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق نہیں کی یعنی آپ کے تعلیم فرمودہ اخلاق اور اصول معاشرت کو چھوڑا تو اس کا انجام بد تمھاری نظروں کے سامنے ہے کہ آج بھائی بھائی سے جُدا ہے۔ اس کو اس سے ناگواری ہے میاں بیوی میں تفریق ہے۔ ہر ایک دوسرے سے مُنہ پھلائے ہوئے ہے۔ باپ بیٹے میں مُنافرت ہے غرضیکہ زندگی دُشوار ہوگئی ہے۔ یہ تو وہ نتیجہ ہے جو تمھارے سامنے آچکا ہے بلکہ تم اس کو بھگت بھی رہے ہو۔ اس سے قیاس کرلو کہ امور معاد (آخرت) سے متعلق آپ نے جو تعلیمات فرمائی ہیں اگر اس کی بھی تصدیق نہ کروگے تو یہاں کی طرح وہاں بھی سزا ملے گی اس کے لئے تیار رہو اور منتظر رہو موت کے بس یہاں سے جانے کی دیر ہے اور وہاں اس سے کہیں زیادہ دیکھو گے جتنا کہ دُنیا میں دیکھ رہے ہو اللّٰھم احفظنا

وہ مصری عالم صاحب نہایت ہی فصیح بلیغ عربی میں یہ تقریر فرما رہے تھے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے ان کے اس وعظ سے بہت فائدہ پہنچا۔ میں نے کہا کہ دیکھو اس شخص نے تھوڑے لفظوں میں کتنی بڑی حقیقت کی معرفت کرادی۔ میں نے اسی وقت ان کی اس نصیحت کو پلّے باندھ لیا اور اپنے نفس سے کہا یہ مضمون کبھی بھولنے کا نہیں ہے۔

اب آپ سے کہتا ہوں کہ دیکھئے جہاں اخلاق کی ایسی ایسی تعلیمات ہوں وہاں لوگ اس درجہ بد اخلاق ہوں اور اپنی ان بد اخلاقیوں کو کمال سمجھیں کس قدر افسوس کی بات ہے۔ قوم کے اس حال پر اگر خون کے آنسو بھی رو دئے جائیں تو کم ہے۔

ابھی میں نے بیان کیا ہے کہ جس چیز نے لوگوں کو خدا پرستی سے روک دیا ہے وہ نفس پرستی ہے اور نفس پرستی کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ اور بت پرستی دونوں ایک ہی چیز ہے۔ مولانا رومؒ نے مثنوی میں فرمایا ہے کہ جو لوگ بت پرست تھے تو ان کی بت پرستی کا منشا بھی نفس پرستی ہی تھا۔ اس لئے صوفیائے کرام نے انسان [illegible] پندار کو بھی بت ہی

فرمایا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

تادر تو ز پندار تو ہستی باقی است
می داں بیقیں کہ بت پرستی باقی است
گفتی بت پندار شکستم رستم
آں بت کہ ز پندار شکستی باقی است

جب تک کہ تمہارے اندر پندار کا کچھ بھی شائبہ موجود ہے تو یقیناً یہ سمجھ لو کہ بت پرستی باقی ہے اور اگر تم یہ کہو کہ میں نے اپنے پندار کو ختم کر دیا ہے اور اب اس سے نجات پا گیا تو جس پندار کے بت کو تم نے پندار کے ساتھ توڑا تو پندار کا بت تو اب بھی موجود ہے۔ وہ کب فنا ہوا۔

اس نفس پرستی کا شکار بنی اسرائیل رہے جس کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کی ہدایت سے فائدہ نہ اٹھا سکے بلکہ ہمیشہ ان کی مخالفت اور اپنے نفس کی متابعت ہی کرتے رہے جیساکہ قرآن شریف میں ان کے متعلق ایک جگہ ارشاد ہے کہ وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْھُمْ وَھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْکُمْ اِخْرَاجُھُمْ

یعنی اگر ان لوگوں میں سے کوئی گرفتار ہو کر تم تک پہنچ جاتا ہے تو ایسوں کو کچھ خرچ کر کرا کے رہا کرا دیتے ہو حالانکہ یہ بات ہے کہ تم ان کا ترکِ وطن کرا دینا نیز ممنوع ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس باب میں ان پر تین حکم واجب تھے۔

اول قتل نہ کرنا۔ دوئم جلا وطن نہ کرنا۔ سوم اپنی قوم میں سے کسی کو گرفتار دیکھیں تو روپیہ خرچ کر کے چھڑا دینا۔ سو ان لوگوں نے حکم اول و دوئم کو تو ضائع کر دیا تھا اور سوم کا اہتمام کیا کرتے تھے اور وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ سہل اور نفس کے موافق تھا اس لئے اس پر عمل تھا ورنہ خدا کا حکم تو سب چیزوں کا تھا۔ یہی نفس پرستی تھی۔

لفظ اُسرٰی پر صاحب تفسیر روح المعانی لکھتے ہیں کہ قیدیوں کی چند قسمیں ہوتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ:۔

کوئی شخص ہوا و ہوس کا قیدی ہو یعنی اسیر النفس ہو تو اس کے خلاصی کا طریقہ یہ ہے کہ ہدایت کی باتوں کی جانب اس کی رہنمائی کی جائے اور اس کو بھی اس قید سے چھڑایا جائے۔ پس جس طرح سے کہ اس ظاہری قیدی کو چھڑانے میں

ثواب ملتا ہے اسی طرح سے اس اسیر النفس کو بھی اس کے نفس سے رہائی دلانے میں ثواب ملتا ہے بزرگان دین کا بس یہی کام ہے کہ یہ حضرات ہوی کے قیدی کو نفس کی قید سے چھڑاتے ہیں اور جس کو یہ اس کے نفس کی قید سے رہائی دلا دیتے ہیں تو نفس سے چھوٹنے کے بعد تو یہ شخص ان کا غلام ہی ہو جاتا ہے کیونکہ اس وقت اس کو محسوس ہوتا ہے کہ میں کیا تھا اور کیا ہوگیا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میرے احباب مجھے ایسے ایسے خطوط لکھتے ہیں کہ ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر میں ان سے جان بھی مانگوں تو ان کو اس میں بھی عذر نہ ہوگا۔ اور آپ کے سامنے تو مسلمانوں کی تاریخ موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رض کو نفس سے چھڑایا تو وہ آپ پر ایسے فدا ہوئے کہ کیا کوئی کسی پر فدا ہوگا اور اس کے بعد ان کی زندگی کا نقشہ ہی کچھ اور ہوگیا۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بیان فرمایا ہے ارشاد ہے کہ:-

اُذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا۔ وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ○

تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا اس کو یاد کرو جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے اس خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں کو بیان کرتا ہے تاکہ تم لوگ ہدایت پاؤ۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر تمام عرب اور عجم پر جو احسان فرمایا ہے اس پر امتنان فرمارہے ہیں کیونکہ واقعی آپ کی تشریف آوری سے پہلے وہ لوگ اخوۃ اور دوستی کا نام تک نہیں جانتے تھے بلکہ سب کے سب آپس میں دشمن تھے اور دشمنی بھی ایسی تھی جو کہ اپنی انتہا تک پہنچ چکی تھی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو بھائی بھائی بنا دیا پھر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو زندگی کا کیسا کچھ لطف حاصل ہوا ہوگا کیونکہ سب سے بری چیز جو عیش دنیا کو مکدر اور کرکرا کر دیتی ہے وہ آپس کی عداوت ہے مگر آج ہم

ہر جگہ یہی دیکھ رہے ہیں اور کچھ نہیں کہہ سکتے بس ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔

میرے پاس آنے جانے والوں میں دو بھائی تھے ان میں باہم سخت عداوت تھی۔ میں نے ہر چند چاہا کہ ان دونوں میں صلح کرادوں مگر میں اس میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ ویسے آپس میں ملتے تو خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتے لیکن عداوت اور بغض قلب میں گھر چکا تھا اس لئے جب مجھ سے کہتے تو ایک ہی بات کو بار بار کہے چلے جاتے میں نے ان کے حالات کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ بس اسلم یہی ہے کہ ان کے درمیان میں پڑا ہی نہ جائے یہ لوگ تو ماننے والے نہیں خواہ مخواہ بات چھیڑ کر جذبات کو اُبھارنا اور عداوت کو تازہ کرنا ہے اس لئے مناسب سکوت ہی ہے۔

سیدنا حضرت آدم جب جنت سے گیہوں کھانے کی وجہ سے دُنیا میں بھیجے گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ یعنی جاؤ نیچے اُترو تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہوں گے۔ گویا ایک ظاہری سزا تو یہ ہے کہ جنت سے باہر جاؤ اور آسمان سے نیچے اُتر کر زمین پر جاکر رہو اور دوسری سزائے باطنی یہ ہے کہ تم میں آپس میں عداوت رہے گی جس کی وجہ سے لطف زندگی بہت کچھ کم ہو جائے گا۔ حضرتؒ نے بیان القرآن میں یہی تفسیر فرمائی ہے۔

تو دیکھئے عداوت کو لطف زندگی ختم کرنے والا فرمایا اور آج ہمارا یہ حال ہے کہ ہم اسی میں لطفِ زندگی سمجھ رہے ہیں۔ اب آپ لوگ یہ تو سُن رہے ہیں مگر بہت سے لوگ آپ ہی میں سے دل میں یہ کہتے ہوں گے کہ تم پُرانے خیال کے آدمی ہو تم کیا جانو جو مزا کہ عداوت میں ہے اس کو تم سمجھ بھی نہیں سکتے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو پھانس کر تماشہ نہ دیکھا تو زندگی کا لُطف ہی کیا حاصل ہوا چنانچہ آج عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ لوگ کسی شخص کو پھانس دیتے ہیں اور دور سے اس کا تماشا دیکھتے ہیں اور اس پر ہنستے ہیں جس طرح سے کہ میں نے خود دیکھا کہ ایک بچے کو بھڑ نے کاٹ لیا تھا وہ غریب تکلیف کی وجہ سے رو رہا تھا اور کود اُچھل رہا تھا اور گھر کے سب لوگ اس پر ہنس رہے تھے اور اس کا تماشہ دیکھ رہے تھے میں خفا ہوا کہ یہ کیا بداخلاقی اور سنگ دلی ہے کہ ایک شخص تو مصیبت میں مبتلا ہے اور دوسرے لوگ یہ تو نہیں کرتے کہ اس پر کوئی دوا لگا دیں جس سے اس کو سکون ہو اور اس پر ہنس

رہے ہیں یہ ایسا ہی ہے جیسے شکاری جال میں کسی پرندہ وغیرہ کو پھنسا لیتا ہے شکار تو جال میں پھڑپھڑاتا ہے اور چیختا ہے اور شکاری خوش ہے کہ وہ کامیاب ہوگیا۔

یہ احساس کا فقدان ہے اور محبت کے خاتمہ کی دلیل ہے حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ مومن اُلفت و محبت کا گھر ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :۔

فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا نفع جو اہل عرب کو پہنچا وہ یہ تھا کہ سب لوگ بھائی بھائی ہوگئے جس کی وجہ سے انھیں لُطف زندگی کی دولت حاصل ہوئی ورنہ اس سے قبل ان کی زندگی بالکل بے امن زندگی تھی کسی کو کسی کی طرف سے اطمینان نصیب نہیں تھا کوئی شخص اگر کسی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کی وجہ سے قبیلہ در قبیلہ عداوت برسہا برس تک چلتی رہتی تھی پس سب سے بڑا احسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عرب پر اور اس کے واسطہ سے تمام عجم پر یہ ہوا کہ لوگ اپنی جان مال، عزت اور آبرو میں مامون ہوگئے اور سب کو اطمینان کُلی نصیب ہوگیا۔

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو جو ان چیزوں سے مامون فرما دیا تو کیا یہ فیض آپ کا کچھ کم فیض تھا؟ اور یہ تو آپ کا اُمت پر دنیوی احسان ہوا کہ آپ ہی نے لوگوں کو عداوت کی قباحت اور اس کے اسباب پر اطلاع فرمائی اور پھر آپ نے اس کا علاج بھی بتایا جس کی وجہ سے ان کی برسہا برس کی عداوت مبدل بہ صداقت و اُلفت اور مودت و محبت ہوگئی مخلوق کے آپس کے تعلقات دُرست ہوگئے۔ چنانچہ عداوت کے جو اسباب ہیں ان کا ہی نام اخلاق رزیلہ ہے اور مودت کے جو اسباب ہیں ان کا نام اخلاق حمیدہ ہے اور جس طرح سے کہ اخلاق رزیلہ کا نتیجہ دُشمنی اور عداوت ہے اسی طرح سے اخلاق حمیدہ کا ثمرہ اُلفت و مودت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اخلاق حسنہ سے روشناس فرمایا تو ان کی آنکھیں کُھل گئیں اور سب کے سب اخلاق حمیدہ کے ساتھ متصف ہوگئے اور سب کو ایک دوسرے سے اخوۃ کا تعلق ہوگیا اسی کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔ (سُنو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے بھائی بھائی ہوگئے)۔

الغرض یہ احسان تو دُنیوی ہوا اور دینی احسان یہ ہوا کہ لوگ اپنی بداخلاقیوں کی وجہ سے جہنم کے گڑھے کے بالکل کنارے پہنچ چکے تھے آپ نے ان کو اس میں گرنے سے بچا لیا

حاصل یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو انسان کو اللہ تعالیٰ سے ملا دیا یعنی خالق کے تعلق کو درست فرما دیا اسی طرح سے دوسری جانب انسانوں کے آپس کے تعلقات بھی درست فرمائے کیونکہ انسان جو سچ پوچھئے تو جانوروں سے بھی بدتر تھا انسان سے جانور کو اتنا توحش نہ تھا جتنا کہ انسان سے انسان کو تھا۔ انسان کی وقعت گاجر اور مولی سے بھی کم ہو گئی تھی کسی انسان کا قتل کر دینا ان کے نزدیک معمولی سی بات تھی۔

روح المعانی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اہل عرب کا یہ حال تھا کہ وہ سب کے سب آپس کی عداوت اور دشمنی میں ہلاک تھے اور کوئی دو شخص بھی ان میں باہم ایک دل نہ تھے لیکن اللہ نے جب فضل فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو سارے اہل عرب مانند ایک نفس کے ہو گئے۔ یا تو دو آدمیوں میں اتفاق نہ تھا یا کُل کے کُل عرب یک دل اور مثل ایک نفس کے ہو گئے۔ سبحان اللہ یہ محض حق تعالیٰ کے فضل سے ہوا۔ ورنہ اتنی بڑی تبدیلی کسی کے بس کی بات نہ تھی اسی کو فرمایا لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ یعنی اگر آپ زمین بھر کی چیزیں خرچ فرما دیتے تو ان کی عداوت کو ختم نہ کر سکتے تھے کیونکہ ان کی عداوت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور روپیہ پیسہ کا یہ کام نہیں کہ وہ قلبی اُلفت پیدا کر سکے اور دو دلوں کو جوڑ سکے اور مودت تو وہی ہے جو قلب اور قالب دونوں سے ہو البتہ یہ قوت اخلاق میں ہے کہ اس کے ذریعہ سے قلب اور قالب دونوں تابع ہو جاتے ہیں مال میں یہ طاقت نہیں کہ وہ دل کو بھی جھکا سکے بس اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ آدمی کا قالب تابع ہو جائے گا مگر وہ بھی ظاہری طور سے لیکن اس کے لئے یہ تو ضروری نہیں کہ قلب بھی تابع ہو جائے اور یہاں اللہ تعالیٰ کا فضل کچھ ایسا شامل حال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو اخلاق سکھائے تو اس کی وجہ سے سب لوگوں میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کا میل ہو گیا قالب بھی باہم متحد ہو گئے اور قلوب بھی سب متفق ہو گئے۔

اس جگہ ایک بات اور سمجھ لیجئے وہ یہ کہ اتفاق کئی وجوہ سے ہوتا ہے مثلاً یہاں آپ سب لوگ جمع ہیں اور میری باتیں سُن رہے ہیں تو اس مقصد میں تو سب اتفاق رکھتے ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ دوسری اغراض کی وجہ سے آپ لوگ باہم مختلف بھی ہوں

باقی حضرات صحابہ میں جو اتفاق تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں جو غرض ایک کے قلب میں تھی وہی دوسرے کا بھی مقصود تھا اس لئے نا اتفاقی کا وہاں کہاں گذر ہو سکتا تھا نااتفاقی جو ہوتی ہے وہ اغراض کے اختلاف سے ہوتی ہے اور وہاں اغراض میں سب متفق تھے اس لئے محبت اور مودت آگئی اور عداوت قلب سے نکل گئی۔

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس آیۃ سے عداوت کی مذمت اور قدح اور محبت و مودت کی مدح نہیں نکلی؟ کیا اس سے یہ نہیں معلوم ہوا کہ عداوت زمانہ جہالت اور ظلمت کی چیز ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غائت باہم اُلفت و محبت کا پیدا فرمانا تھا۔ مگر آج اس مضمون کو بیان کیجئے تو سننے والوں پر اس کا کوئی اثر نہیں سننے سے پہلے جیسے تھے سننے کے بعد بھی ویسے ہی رہتے ہیں صرف واہ واہ کرتے ہیں لیکن حالات میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں اور اس کے بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ جلسہ کامیاب رہا۔ میں کہتا ہوں کہ جلسہ تو آپ ہی لوگ تھے جو بیٹھے ہوئے سن رہے تھے ان کو تو میں کامیاب دیکھتا نہیں ہاں بے چارے جس عالم نے کھڑے ہو کر اتنی دیر تک آپ کے سامنے تقریر کی۔ اگر اس کی نیت درست ہے تو وہ البتہ کامیاب رہا کہ 'بر رسولاں بلاغ باشد و بس' لیکن وہ تو قائم ہے جالس نہیں پھر یہ کیوں کہتے ہیں کہ جلسہ کامیاب رہا۔ کیا کامیابی اسی کا نام ہے؟ جو لوگ اس میں شریک ہوں ان میں سے کسی کی حالت نہ بدلے اور جلسہ کامیاب ہو جائے۔

دیکھئے اب آپ لوگ اسی مضمون کو کیسا سن رہے ہیں لیکن اس کا سننا آسان نہیں ہے یوں زبان سے تو آپ بھی بہت زور دار لفظوں میں اس کی تائید کر دیں گے مگر کسی کی بات کو دل سے سنا جائے اور عمل کرنے کے لئے سنا جائے اس زمانہ میں بڑا مشکل ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال۔ یعنی کہنے والے کی بات کو دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے اس کی ذات کو نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے۔

مرد باید کہ گیرد اندر گوش
در نبشت ست پند بر دیوار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو صرف معاد یعنی امور آخرت ہی کی تعلیم نہیں فرمائی بلکہ آپ نے معاش یعنی دُنیوی زندگی گذارنے کا طور طریقہ بھی سکھلایا اور یہ اس لئے کہ انسان مدنی الطبع ہے اپنی ضروریات دنیوی کی تحصیل میں دوسروں کا محتاج ہے لہٰذا

بدوں ابنائے جنس کی اعانت اور ان سے میل جول کے اس دُنیا میں کسی کا کام چل ہی نہیں سکتا اور چونکہ سب سے زیادہ مُضر چیز اس زندگی میں انسان کے لئے عداوت ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اسباب بھی بیان فرما دیئے اور ایسے ایسے قواعد اور قوانین مقرر فرمائے کہ ان پر عمل کرنے کے بعد عداوت باقی ہی نہیں رہ سکتی۔ اب آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ جب لوگوں کے قلوب ہی باہم ملے ہوئے نہ ہوں تو پھر یہ ہمارا اجتماع بھی کوئی اجتماع ہے اور جب آپس میں میل و محبت صداقت اور اخوۃ رہے گی تو باہم بغض و عداوت کی گنجائش ہی کب باقی رہ سکتی ہے کیونکہ عداوت ضد ہے صداقت کی اور بغض ضد ہے محبت کی جب قلوب میں محبت اور عمل میں صداقت آگئی تو پھر قلب میں بغض اور ظاہر میں عداوت کب باقی رہ سکتی ہے۔

سُنئے! حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ بنی الحکم آپ کے منبر پر چڑھ اُتر رہے ہیں۔ بس صبح کو نہایت غصہ کی حالت میں اُٹھے اور فرمایا کہ میں نے بنی الحکم کو دیکھا کہ میرے منبر پر اس طرح سے کود اُچھل رہے ہیں جیسے بندر کودا کرتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ راوی الحدیث فرماتے ہیں کہ پھر اس دن سے میں نے آخر عمر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنستے نہیں دیکھا۔ یہ اس لئے ہوا ہو گا کہ آپ نے سمجھا کہ میرے بعد ان لوگوں کا اس پر قبضہ ہو جائے گا۔ اس غم میں پھر آپ کو کبھی ہنسی نہیں آئی دیکھا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُمت کے اختلاف اور ان کے شیرازہ منتشر ہونے کا کس قدر غم تھا۔ آج ہم کو اس کا بھی کچھ احساس نہیں رہ گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اپنی اُمت پر چھ چیزوں کا خوف کرتا ہوں۔

امرۃ الصبیان یعنی لڑکا امیر ہو گا۔ سپاہی کی زیادتی ہو گی اور رشوت کی گرم بازاری ہو گی۔ قطع رحمی عام ہو جائے گی۔ قتل معمولی چیز ہو جائے گی۔ قرآن شریف کو مزامیر بنا لیا جائے گا اور اس کے ساتھ گانا گایا جائے گا۔

اسی کو میں نے کہا تھا کہ ایک تو وہ قیدی ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں ہتھکڑی اور پیر میں بیڑی ہو تو اس کو وہ کاٹ بھی سکتا ہے لیکن جو شخص کہ ہویٰ کا قیدی ہے اس کو اس قید سے چھڑانا بڑا مشکل ہے ظاہری قید والا تو ہو سکتا ہے کہ مظلوم بھی ہو لیکن اسیر النفس تو ظاہر ہی ہوتا ہے اب جو شخص اس اسیر کو اس کے قید سے نکالنے کی سعی کرتا ہے اور اس کو اس سے

چھڑاتا ہے بڑی ہمت والا ہے اب آپ خود خیال فرمائیے کہ جو اہل اللہ کہ نفس اور ہوئی کی قید سے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی قید میں کرتے ہیں ان کا کتنا بڑا احسان ہے اور ہوی (نفس) کے قیدی میں ایک فرق یہ ہے کہ نفس کا قیدی تو یہ چاہتا بھی ہے کہ اس قید سے نکل کر باہر ہو مگر اللہ تعالیٰ کا قیدی اس قید پر فخر کرتا ہے اور اس قید سے نکلنا نہیں چاہتا۔ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ

اسیرت نخواہد رہائی ز بند　　　شکارش نجوید خلاص از کمند

یعنی تیرا قیدی قید اور بند سے رہائی نہیں چاہتا اور تیرا شکار کمند سے خلاصی نہیں طلب کرتا اسی کو حضرت حافظ فرماتے ہیں۔ ؎

خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد　　　کہ بستگان کمند تو رستگارانند

یعنی اے حافظ خُدا کرے تم اس تابدار زلف سے خلاصی نہ پاؤ کیونکہ تیرے کمند کے جو قیدی ہیں وہ آزاد ہی ہیں یہ کمند وہ ہے جس میں رہنے کو انبیاء علیہم السلام اور اولیاء فخر کرتے ہیں اور خود کو اس میں قید ہی رکھنے پر خوش ہیں بعض قید اور بند ایسی ہی ہوتی ہے کہ خود قیدی اس پر فخر کرتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک دفعہ حج کے موقع پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی اونٹ اپنے دست مبارک سے ذبح فرمائے روایت میں ہے کہ ان میں سے ہر اونٹ آپ کی طرف گردن لپکا رہا تھا کہ آپ پہلے اس کو ذبح فرمائیں۔ سبحان اللہ کس قدر محبوبیت تھی آپ کی کہ انسان تو انسان جانور تک آپ سے اس درجہ محبت رکھتے تھے کہ ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ آپ پہلے اس کو ذبح کریں ؎

داغ جاتے تو ہیں مقتل میں یہ اول سب سے　　　دیکھئے وار کرے وہ ستم آرا کس پر

کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف　　　بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

جنگل کے سب ہرن اپنے اپنے سروں کو ہتھیلی پر لئے ہوئے اس اُمید پر موجود ہیں کہ شاید کسی دن تو شکار کو آجائے۔

جب اونٹوں کا یہ حال تھا تو اس سے اندازہ کیجئے کہ صحابہؓ کی فدائیت کا کیا عالم رہا ہوگا ان حضرات کا تو تکیہ کلام ہی یہ لفظ تھا کہ فداک ابی وامی۔ ایک صحابی جہاد میں لڑ رہے تھے آپ ان سے فرمایا کہ ہاں مارو فداک ابی و امی۔ آپ کی زبان مبارک

سے اپنے متعلق یہ کلمات سُن کر وہ صحابی ذبح ہی تو ہو گئے ہوں گے۔ ساری عمر اس پر فخر فرماتے رہے کہ ہم لوگ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فداک ابی و امی کہتے تھے اور حضورؐ نے مجھے یہ فرمایا غرض بعض قیدیں بلکہ بعضا ذبح ایسا ہوتا ہے کہ خود مذبوح ذابح کا احسان مند ہوتا ہے اور قیدی اس قید ہی پر فخر کرتا ہے۔

ہم تڑپنے سے چھٹیں گے تو ہماری فکر سے
ذبح کر احساں ترا مانیں گے اے صیاد ہم

افسوس کہ جن دو دولتوں کی جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا تھا آج ہم دونوں سے محروم ہیں یعنی نہ تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہمارا تعلق درست ہے اور نہ آپس ہی میں کچھ اُلفت و محبت ہے۔

بزرگان دین نے فرمایا ہے کہ بہت زیادہ دوستی اور عداوت دونوں چیزوں سے دور رہو کیونکہ دُشمنی تو قلب کا ناس کر ہی دیتی ہے دوستی سے بھی آدمی کو نقصان پہنچتا ہے اس لئے کہ یہ لوگ بھی سارا وقت لے لیتے ہیں۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ

خود چہ جائے جنگ و جدلے نیک و بد کایں دلم از صلحہا ہم می رسد

جس دل میں ایسے ایسے غیرے نتھو خیرے ہوں اس کو اللہ تعالیٰ کے تعلق اور اس کی یاد کی کہاں فرصت ہو سکتی ہے یہ لوگ نماز میں بھی عداوت ہی کا حساب لگاتے ہوں گے جس طرح سے کہ ایک عورت سودا بیچتی تھی اور صرف مغرب کی نماز پڑھتی تھی لوگوں نے اس سے پوچھا کہ بڑی بی یہ تم صرف ایک ہی وقت کی نماز کیوں پڑھتی ہو اس نے کہا کہ دن بھر سودا بیچتی ہوں تو اس کا سارا حساب نماز میں ہی یاد آتا ہے اس لئے ایک وقت کی پڑھ لیتی ہوں۔

الغرض دوستی جو زیادہ ہو وہ تو مضر ہے مگر دوستوں سے لوگوں کو فائدہ بھی پہنچا ہے اور سچا دوست اگر ایک بھی مل جائے تو آدمی کو زندگی کا لطف حاصل ہو جائے دوست تو ایسا ہوتا ہے کہ اس کے چہرے کو دیکھنے سے غم غلط ہو جاتا ہے۔

پہلے زمانہ کا واقعہ ہے اب کا نہیں کہ ایک صاحب اپنے دوست کے پاس رات کو گئے دروازہ پر دستک دی وہ ذرا دیر میں باہر نکلے لیکن نکلے بھی تو عجیب شان کے ساتھ بدن پر ہتھیار سجے ہوئے ایک غلام کے سر پر دسترخوان رکھے ہوئے، ہاتھ میں توڑے اشرفیوں کے لئے ہوئے اور پیچھے پیچھے ایک باندی ساتھ لئے ہوئے۔

ان دوست صاحب نے کہا کہ بھائی بہت دیر میں نکلے کیا بات ہے۔ کہنے لگے کہ تم ناوقت آئے مجھے تشویش ہوئی کہ کیا بات ہے۔ خیال ہوا کہ شاید کسی دشمن سے مقابلہ کی ضرورت ہو تو ہتھیار بند ہو کر آیا ہوں چلو تمہارے ساتھ چلوں اور اگر کھانے وغیرہ کی ضرورت ہو تو یہ خوان حاضر ہے کھاؤ اور نقدی کی کچھ ضرورت ہو تو یہ توڑے اشرفیوں کے موجود ہیں اس میں سے جتنا چاہو لے لو اور یہ بھی خیال ہوا کہ شائد رات کی تنہائی سے تم متوحش ہوتے ہو تو یہ باندی تمہاری ملک ہے اس کو لے جاؤ۔ یہ سب سُن کر انھوں نے کہا کہ نہیں بھائی مجھے ان سب چیزوں میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے میں تو صرف دیکھنے آیا تھا تمہاری صورت دیکھ لی تسلی ہوگئی جاؤ گھر جاؤ میں بھی واپس جاتا ہوں۔ السلام علیکم۔

دیکھا آپ نے کبھی ایسے ایسے بھی دوست ہوتے تھے اس میں لطف زندگی ہے یا جیسے تعلقات ہم لوگوں نے اس زمانہ میں کر رکھے ہیں اس میں راحت ہے۔ میرے خیال میں تو سب سے زیادہ فرحت آدمی کو اپنے کسی مخلص دوست سے ملاقات کے وقت ہی حاصل ہوتی ہوگی دلی دوست سے ملاقات کے وقت آدمی قلب میں ایک قسم کی قوت محسوس کرتا۔

ایک شخص بہت بیمار تھا طبیب سے اس کی دوستی تھی جب طبیب اس کو دیکھنے کے لئے آیا تو یہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور یہ تو واقعی دیکھا جاتا ہے کہ بعض دفعہ کسی سے ملنے سے مرض بالکل جاتا رہتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کیا وجہ ہے؟ بات یہ ہے کہ اس کی ملاقات کی وجہ سے قلب میں ایک قوت آجاتی ہے جو مرض کو دفع کر دیتی ہے تو جس طرح سے دوستی سبب ہے قلب کی قوت کا اسی طرح دشمنی سبب ہے قلب کے ضعف کا۔ آپ جب چاہئے تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ دل میں عداوت اور دشمنی کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آدمی تنہا ہو اور کوئی اس کا ساتھی نہ ہو اور قلب ان سب سے خالی ہو اور اس میں مودت اور محبّت ہو تو آدمی اپنے اندر ایک قوت محسوس کرتا ہے۔

میں کہنے پر مجبور ہوں مجھے معاف کیجئے گا کہ اس زمانہ میں اخلاق خراب ہو گئے ہیں موافقت کی جانب طبیعت نہیں چلتی اور مخالفت کی طرف خوب چلتی ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ آپ کے یہ گھر والے آپ کے فریق ہوتے ہیں بیٹا ہے تو وہ باپ کا فریق ہوتا ہے یہ دوسروں کے تو ہوتے ہیں مگر گھر والوں کے نہیں ہوتے دوستوں کے

ہوتے ہیں مگر آپ کے نہیں ہوتے۔ آپ جن کی خاطر مرتے ہیں مشقت اُٹھاتے ہیں وہی آپ کے نہیں ہوتے۔ ؎

ساری دُنیا کے ہوئے میرے سوا میں نے دُنیا چھوڑ دی جن کے لئے

بات یہ ہے کہ قلب آزاد ہو گئے ہیں اخلاق خراب ہو چکے ہیں طبیعتوں میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ ظاہر کو تو لوگ درست بھی کر لیتے ہیں لیکن باطن کی درستگی کی طرف اصلا التفات نہیں ہے اس کی فکر نہیں کہ قلب میں کیا کیا امراض گھس گئے ہیں بس انھیں چیزوں نے گھن کی طرح قلب کا ناس مار رکھا ہے اور وہ امراض کیا ہیں سُنئے ایک شاعر کہتا ہے کہ ؎

كُلُّ الْعَدَاوَةِ قَدْ تُرْجٰى إِمَاتَتُهَا

إِلَّا عَدَاوَةَ مَنْ عَادَاكَ مِنْ حَسَدٍ

یعنی ہر قسم کی عداوت کے ختم ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے بجز اس عداوت کے جس کا منشا حسد ہو۔ ؎

وَعَيْنُ الرِّضَا عَنْ كُلِّ عَيْبٍ كَلِيْلَةٌ

وَلٰكِنَّ عَيْنَ السُّخْطِ تُبْدِيْ مُسَاوِيَا

یعنی رضا اور دوستی کی آنکھ تو ہر عیب کی طرف سے اندھی ہوتی ہے لیکن ناراضی کی آنکھ عیبوں کو ظاہر کرتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ بزرگوں نے جو یہ فرمایا ہے تو کیا یوں ہی فرمایا ہے؛ ان حضرات نے ان چیزوں کو اور ان لوگوں کے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے تب یہ فرمایا ہے۔

ایک شخص نے مجھے خط لکھا ہے کہ ایک صاحب نے عورت کے سر کے بال کاٹ کر اس کو گھر سے نکال دیا۔ مجھے یہ سُن کر بیحد تکلیف ہوئی اتنی تکلیف کہ میں ٹوپی اُتار کر ٹہلنے لگا جیسے کوئی مضطرب ٹہلتا ہے اور میں نے کہا کہ اگر مجھے ایسی بات نہ لکھتے تو اچھا تھا اور میں نے خیال کیا کہ جب اس واقعہ سے محض سُن کر میرا یہ حال ہے تو اس گھر کا کیا حال ہوگا جس میں کہ یہ واقعہ ہوا ہے آج کل انھیں حالات کی وجہ سے لوگوں کا گھر دوزخ کا نمونہ ہو رہا ہے اور اس سے نکلنے کی کوشش تو بعد کی چیز ہے اس کو سمجھا بھی نہیں جاتا۔

اب آخر میں کنز العمال سے ترک خصومت اور جدال کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک ارشاد نقل کرتا ہوں جس کا ہر وقت پیش نظر رکھنا اخوت کے قیام اور اس کی بقاء کے لئے ضروری ہے کیونکہ اخوت اسی وقت باقی رہ سکتی ہے جب کہ انسان عداوت اور اسباب عداوت سے اجتناب کرے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:۔

ایاکم و معادات الرجال فانھم لا یخلون من ضربین من عاقل یمکر بکم او جاھل یعجل بکم بما لیس فیکم۔ واعلموا انہ الکلام ذکر والجواب انثیٰ وحیث ما اجتمع الزوجان فلا بد من انتاج ثم انشا یقول ؎

سلیم العرض من حذر الجوابا
ومن داری الرجال فقد اصابا
ومن ھاب الرجال تھیبوہ
ومن حقر الرجال فلن یھابا

اپنے آپ کو لوگوں کی دشمنی سے بچاؤ اس لئے کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں یا تو عاقل ہوگا تو تمہارے ساتھ خفیہ تدبیر کرے گا یا جاہل ہوگا تو ایسی چیز کے کہدینے میں جلدی کرے گا جس سے تم بری ہوگے اور یہ جان لو کہ کلام گویا ایک نر ہے اور اس کا جواب مادہ ہے اور جہاں کہیں نر مادہ جمع ہو جائیں تو بچہ کا ہونا ضروری ہو جاتا ہے (اور یہاں سوال و جواب کا نتیجہ یہی عداوت ہے)

پھر آپ نے یہ اشعار پڑھے ؎

آبرو اس شخص کی محفوظ رہتی ہے جو جاہل کی بات کے جواب دینے سے احتراز کرے۔ اور جس شخص نے لوگوں سے مدارات کا معاملہ کیا اس نے نیک کام کیا اور جو شخص دوسروں کا لحاظ کرتا ہے تو دوسرے لوگ بھی اس سے ڈرتے ہیں۔ اور جو شخص دوسرے لوگوں کی تحقیر کرتا ہے تو اس سے بھی ڈرا نہیں جاتا یعنی اس کی بھی بے رغبتی ہوتی ہے۔

بیان اخوت کے مناسب صراط مستقیم سے ایک مضمون نقل کرتا ہوں جو اصلاح کے لئے نہایت ضروری ہے

"افادہ"

ہر مسلمان را از دو چیز پرہیز واجتناب لازم است اول کبر یعنی تکبر کہ آدمی خود را بہتر و بلند تر داند و مدام تعلی و بزرگی خود جوید چہ ایں خصلت قبیح انساں را بہ کبر می رساند ازیں جہت اقبح است از دیگر اعمال و خصائل۔

در حدیث شریف است لایدخل النار احد فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من ایمان ولایدخل الجنۃ احد فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من کبر۔ دوئم افساد و خرابی انداختن درمیان جماعتے از مسلمین وایں مراتب بسیار دارد و باعتبار عموم وشمول امکنہ وازمنہ۔ افساد اہل یک خانہ است و افساد اہل یک شہر است و افساد اہل اقلیم وافساد اہل چند اقلیم وہمچنیں افساد یک قرن یا دو قرن یا زیادہ ازاں۔ و اعلائے آں افسادی است کہ تامرو

ہر انسان کو ان دو چیزوں سے اجتناب اور پرہیز ضروری ہے اول کبر یعنی یہ کہ آدمی اپنے کو دوسروں سے بہتر اور بالاتر سمجھے اور ہمیشہ اپنے لئے بزرگی اور بڑائی کی ہی فکر میں لگا رہے۔ اس کا ترک اس لئے ضروری ہے کہ یہ چیزیں انسان کو متکبر بنا دیتی ہیں اور تکبر خدا ہی کو زیبا ہے) اس لئے اور دوسرے اعمال وخصائل سے یہ زیادہ قبیح ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جس شخص کے قلب میں رائی کے برابر ایمان ہوگا وہ دوزخ میں نہ جائے گا۔ اسی طرح آیا ہے کہ جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر کبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا دوم مسلمانوں کی جماعت میں فساد اور اختلاف واقع کرنا یہ بھی بہت بڑا ہے اور اس سے بھی اجتناب لازم ہے اور جگہ یا زمانہ کے عام اور شامل ہونے کے اعتبار سے اس افساد کے بہت سے مراتب ہیں۔ مثلاً صرف ایک گھر کا فساد یا ایک شہر کا فساد یا ایک اقلیم میں رہنے والوں کا فساد یا چند اقلیم میں بسنے والوں کا فساد (یہ تو مکان کے لحاظ سے ہوا) اور زمان کے لحاظ سے) مثلاً ایک قرن یا دو قرن یا اس سے زیادہ زمانہ تک کا فساد اور ان سب میں بڑا وہ فساد ہے جس میں ایک زمانہ گذر جائے اور عرصہ دراز تک وہ باقی رہے مثلاً

و دہور از قرن متطاولہ باقی است مثل افساد بلوائیان شہادت حضرت عثمان رضی کہ تمام قرون ایں امت را اثر آں افساد محیط شدہ و اول افسادیست کہ دریں امت پیدا گشتہ۔

و افساد را انواع بسیار است گاہی قتل می بود گاہے اہانت وگاہے تجسس عیوب وگاہی مشورت بد دادن و ایں امور ہم بہ نسبت اشخاص در معنی افساد متبدل می شود مثلاً کشتن رئیس یک محلہ کہ موجب انتظام امور معاش و معاد بود مرتبہ دارد و قبح کشتن بادشاہ عادل ضابط کہ بموجب برہمی امور خلائق باشد افسادیست کہ قبح آں بہزار با مراتب زائد از قبح اول است۔

ہمچنیں کشتن قیم مسجد کہ چند کس از مسلمین بسببش در مسجد بنا بر نماز جمع می شوند قبیح است و کشتن عالمے باکمال کہ حلال مشکلات و مرجع خاص و عام خلائق بودہ مصداق امام اعظم وقت و بخاری عہد و غزالی زماں گشتہ باشد قبحی وخامتی دارد کہ پایاں آں نیست و بر کشتن قیاس باید کرد اہانت و تجسس عیوب را۔

و ہر قدر افساد سخت تر برہمی ایمان

وہ فساد جو بلوائیوں نے حضرت عثمان رضی کی شہادت کے موقع پر کیا تھا جس کے اثر نے اس امت کے تمام زمانہ کا احاطہ کرلیا ہے اور وہی سب سے پہلا فساد ہے جو اس امت میں پیدا ہوا۔

(پھر یہ سمجھو کہ)

فساد کے بہت سے طریقے ہیں کبھی قتل اس کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کبھی کسی کی اہانت ہی سبب فتنہ ہوجاتی ہے اور کبھی عیوب کی تفتیش اور تجسس اور کبھی کسی کو غلط مشورہ دے دینا بھی منشار فساد بن جاتا ہے اور یہ سب چیزیں بھی مختلف لوگوں کے اعتبار سے فساد کے مختلف درجات اختیار کرلیتی ہیں مثلاً محلہ کے کسی ایسے رئیس کا قتل جو لوگوں کے معاش اور معاد کے انتظام کا ذریعہ تھا برائی میں ایک مرتبہ رکھتا ہے لیکن کسی ایسے عادل منتظم بادشاہ کا قتل جو کہ مخلوق کے امور کے برہمی کا باعث ہو ظاہر ہے کہ ایک ایسا فساد ہے کہ جس کا قبح پہلے کے قبح سے ہزار درجہ زائد ہے۔

اسی طرح سے کسی مسجد کے منتظم کو مار ڈالنا جس کی وجہ سے انتظام مسجد درست تھا لوگ نماز کے لئے جمع ہوتے تھے نہایت بری بات ہے لیکن کسی عالم باکمال کو جو کہ لوگوں کی مشکلات کو حل کرتا ہو اور مرجع خلائق خاص و عام ہو اور مصداق اس کا ہو کہ اس کو وقت کا امام اعظم اور بخاری وقت کہا جائے اور وہ غزالی زماں بھی ہو ایسے شخص کو مار ڈالنا یہ اس درجہ قبیح اور مذموم ہے کہ اس کی کچھ انتہا ہی نہیں ہے اور قتل کرنے ہی پر اہانت اور تجسس عیوب کو بھی قیاس کرنا چاہئے اور جس قدر کہ فساد سخت تر

بیشتر و سبب افزونی قبح ایں کار زشت آں است کہ از انساد اتلاف حقوق ناس و تخم گناہاں کثیر کہ تا مدتہا باقی ماند می شود و آں قدر وبال آں بر مفسد فتنہ انگیز تراکم می شود کہ در غضب الٰہی گرفتار شدہ بانجام بد و خاتمہ سوء از دنیا میرود و مایوس از مغفرت و رحمت الٰہی می گردد۔ و از ظلم ہم احتراز لازم است کہ فی الحقیقت منشاء ظلم یا کبر ست یا افساد پس در ظلم شعبہ کبر خواہد بود یا شعبہ از افساد و اجتناب از کبر و افساد تمام نخواہد شد مگر باجتناب از ظلم در حدیث شریف است۔ الا اخبرکم بافضل من درجۃ الصیام والصدقۃ والصلٰوۃ قالوا بلیٰ قال اصلاح ذات البین وافساد ذات البین ھی الحالقۃ

(صراط مستقیم صہ)

ہوگا اسی قدر بر ہمی ایمان زیادہ ہوگی اور اس امر قبیح کے سبب سے زیادہ شنیع ہونے کا سبب یہ ہے کہ فتنہ و فساد سے لوگوں کی حق تلفیاں ہوتی ہیں نیز بہت سے ایسے گناہوں کی تخم ریزی ہوتی ہے جو زمانہ دراز تک باقی رہتے ہیں اور ان سب کا وبال اس مفسد فتنہ انگیز پر اس طرح سے مسلسل پڑتا رہتا ہے کہ وہ غضب الٰہی میں گرفتار ہو کر انجام بد اور سوء خاتمہ سے دوچار ہو کر دنیا سے جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت سے بالکل مایوس ہوجاتا ہے اور ظلم کرنے سے بھی احتراز کرنا چاہئے کیونکہ درحقیقت اس کا بھی منشا یا تو کبر ہوتا ہے یا فساد پس ہر ظلم میں یا تو شعبہ کبر کا ہوگا یا فساد کا اور کبر اور فساد سے کامل طور سے بچاؤ ہو نہیں سکتا بجز اس کے کہ ظلم ہی سے بچا جائے حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تم کو ایسی چیز نہ بتلاؤں جو درجہ میں نماز روزہ اور صدقہ سے بھی بڑھ کر ہو صحابہؓ نے عرض کیا بیشک فرمائیے آپ نے فرمایا کہ لوگوں کے باہمی نزاعات کی اصلاح کر دینا اور یہ فرمایا کہ لوگوں میں آپس میں فساد ڈالنا یہ تو دین کو مونڈنے والی چیز ہے۔ بس اب آخر میں اس دعا پر ختم کرتا ہوں۔

اللّٰھم بارک لنا فی اسماعنا وابصارنا وقلوبنا وازواجنا وذریاتنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔

(ختم شد)

نصیحت

"خود را معطل و مہمل نگذارند کارِ عقبیٰ بسازند۔ و اگر نتوانند کارِ دنیا از دست نہ ہند۔" *

یعنی منجملہ نصائح کے ایک نصیحت یہ فرماتے ہیں کہ اپنے کو معطل اور مہمل نہ چھوڑیں بلکہ آخرت کا اور دین کا کام کریں اور اگر یہ نہ کر سکیں تو دنیا کا کام ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ دنیا ہی کا کام کریں یعنی کوئی ہنر یا پیشہ ہی سیکھیں تاکہ دنیا ہی کی جانب سے مطمئن ہو جائیں باقی یہ کہ آدمی نہ دین کا ہو نہ دنیا کا یہ شخص نکما ناکارہ اور بطال ہے یہ صفت عند الشرع منکر ہے۔ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ

إِنِّي لَأَكْرَهُ أَنْ أَرَى أَحَدَكُمْ سَبَهْلَلًا لَا فِي عَمَلِ دُنْيَا وَلَا فِي عَمَلِ آخِرَةٍ

(الیسیر المہذب ص ۹۳)

یعنی حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں تم میں کسی شخص کو سبہلل دیکھنا پسند نہیں کرتا اور سبہلل ہونا یہ ہے کہ آدمی نہ دین کا کام کرے نہ دنیا کا۔

یہی میں لوگوں سے کہتا تھا کہ بھائی تم سے اگر دین نہیں پڑتا تو دنیا ہی کما لو۔ دنیا کی جانب سے جب مطمئن رہو گے تو دین بھی حاصل کر لو گے۔ ورنہ جب تمھارا ہوش و حواس اور عقل و فکر ہی درست نہ رہے گی تو تم دین بھی نہ اختیار کر سکو گے۔ چنانچہ آج جن لوگوں کو دنیا کی طرف سے فارغ دیکھتا ہوں انھیں کو دین کے کام میں بھی لگا ہوا دیکھ رہا ہوں اور جس کی دنیا تباہ ہے اُسکا دین اس سے زیادہ برباد ہے۔ یہ امرِ مشاہد ہے اس لئے شاہ صاحبؒ کی یہ نصیحت بہت پسند آئی۔ ضرورت ہے کہ لوگ اس کو برابر پیش نظر رکھیں۔ اور حرزِ جان بنائیں۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا

(اے ایمان والو! اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ)

بفحوائے ارشادِ ربّ العباد رسالہ

تعلیم و تربیتِ اولاد

(از افادات)

مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا و مرشدنا شاہ وصی اللہ صاحب رحمہ اللہ

سرورق احمد حسین لکھنوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعلیم و تربیت اولاد

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

اما بعد۔ فقد قال اللہ تعالیٰ

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا قُوْآ اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا ٭

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو آگ (یعنی دوزخ) سے بچاؤ۔

قال ابوبکر جصاص رازی فی تفسیرہٖ مطلبٌ۔ یجب علینا تعلیم اولادنا واھلینا۔ روی عن علیؓ فی قولہٖ تعالیٰ قُوْآ اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ قال علموا انفسکم واھلیکم الخیر۔ وقال الحسنؒ تعلمھم و تامرھم وتنھاھم۔ قال ابوبکرؒ وھذا یدل علی ان علینا تعلیم اولادنا واھلینا الدین والخیر ومالا یستغنی عنہ من الادب وھو مثل قولہ تعالیٰ وَاْمُرْ اَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْھَا ٭

حضرت ابوبکر جصاص رازیؒ اپنی تفسیر احکام القرآن میں اس کے متعلق یہ عنوان قائم فرماتے ہیں کہ :۔

"بیان اس کا کہ ہمارے ذمہ اپنی اولاد اور اپنے اہل و عیال کی تعلیم واجب ہے" اور اس کے تحت لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے آیۂ شریفہ قوا انفسکم الایۃ کی تفسیر میں منقول ہے کہ اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو خیر (یعنی علم اور ہر قسم کی بھلائی) سکھلاؤ اور حضرت حسنؒ[1] فرماتے ہیں کہ ان کو علم سکھاؤ نیکیوں کا حکم کرو اور برائیوں سے انھیں منع کرو۔ آگے ابوبکر رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ہمارے ذمہ لازم ہے کہ ہم اپنی اولاد کو اور اپنے اہل و عیال کو دین، علم اور ہر بھلی بات اور ان تمام آداب کی تعلیم دیں جو ان کے لئے ضروری ہیں۔ اور حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا کہ اپنے متعلقین کو بھی نماز کا حکم کرتے رہیے

[1] اس سے مراد حضرت حسن بصریؒ ہیں۔

اور خود بھی اس کے پابند رہیئے۔

ونحو قوله تعالى للنبي صلى الله عليه وسلم وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ.

نیز ایسا ہی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمانا کہ آپ اپنے نزدیک کے کنبہ کو ڈرایئے۔

فللاقرب منا مزية في لزومنا تعليمهم وامرهم بطاعة الله تعالى

لہٰذا ہم سے جو جسقدر زیادہ قریب ہے وہ زیادہ مستحق ہے کہ ہم اسکو تعلیم دیں اور اللہ تعالیٰ کی طاعت کا اس کو حکم کریں۔

ويشهد له قول النبي صلى الله عليه وسلم كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته ومعلوم ان الراعي كما عليه حفظ من استرعى وحمايته والتماس مصالحه فكذالك عليه تاديبه وتعليمه وقال عليه السلام فالرجل راع على اهله وهو مسئول عنهم والامير راع على رعيته وهو مسئول عنهم.

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اس پر شاہد ہے کہ "تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت (ماتحت) کا سوال ہوگا۔ اور یہ بات معلوم ہی ہے کہ راعی کے ذمہ جس طرح سے ماتحتوں کی حفاظت اور حمایت ضروری ہے اور ان کی مصالح کا بندوبست لازم ہے اسی طرح سے اسکے ذمہ ان کو تعلیم دینا اور ادب سکھانا بھی واجب ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ انسان اپنے اہل کیلئے راعی ہے اور اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا۔ (مطلب ہے کہ اولاد ہر شخص کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اب اسکے درست رکھنے کی کوشش کرنا تو امانت کا حق ادا کرنا ہے اور اس میں غفلت کرنا خیانت ہے اور اسی خیانت کی بازپرس حق تعالیٰ کے یہاں ہوگی کہ تم نے اس امانت کو کیوں ضائع اور برباد کیا۔ تمہاری اس خیانت سے جس جس کی عاقبت خراب ہوگی اس کے تم ذمہ دار ہو) اور امیر (یعنی بادشاہ) اپنی رعایا کا راعی ہے۔ اس سے ان کے متعلق سوال کیا جائیگا۔

میں کہتا ہوں کہ اسی طرح راعی میں پیر اور استاد بھی داخل ہیں اور اہل میں مریدین اور طلبہ داخل ہیں یعنی پیر سے مریدین کی بابت سوال ہوگا اور استاد طالبعلموں کا ذمہ دار ہے اس سے ان کے بارے میں پوچھ ہوگی کیونکہ ایک دوسری روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته کا عام اور کلی حکم بیان فرمانے کے بعد اس کی متعدد جزئیات بھی بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ شیخین کی ایک حدیث میں ہے۔

عن عبد الله بن عمرؓ قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے کہ ہر شخص راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔

الامام راع ومسؤل عن رعیته والرجل راع فی اهله وهو مسؤل عن رعیته والمرأة راعیة فی بیت زوجها ومسئولة عن رعیتها۔

چنانچہ امام بھی راعی ہے اور اس سے اپنی رعیت کے متعلق سوال ہوگا۔ اور آدمی اپنے اہل و عیال کا راعی ہے اور اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے مکان میں راعیہ ہے لہٰذا اس سے اس کے متعلق سوال ہوگا۔

والخادم راع فی مال سیده ومسئول عن رعیته قال وحسبت ان قد قال الرجل راع فی مال ابیه وهو مسئول عن رعیته وکلکم راع ومسئول عن رعیته۔
(رواہ البخاری ومسلم)
(الادب النبوی ص۶۵)

خادم اپنے سید اور مالک کے مال میں راعی ہے اس سے اس کے بارے میں پوچھ ہوگی۔ راوی کہتے ہیں کہ خیال ہوتا ہے کہ آپ نے شاید یہ بھی فرمایا کہ انسان راعی ہے۔ اپنے باپ کے مال میں اور اس سے اسکے متعلق بازپرس ہوگی اور تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اس سے اپنی رعیت (ماتحت) کے بارے میں سوال ہوگا۔

آگے پھر ابوبکر رازی کا قول نقل کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ :-

وحدثنا عبد الباقی بسنده عن سالم عن ابیه عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال ما نحل والد ولداً خیراً من ادب حسن۔

ہم سے عبد الباقی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت سالم سے اور وہ اپنے والد سے اور وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ کسی باپ نے اپنے بیٹے کو حسن ادب سے بڑھ کر کوئی عطیہ نہیں دیا۔

میں کہتا ہوں کہ آج مال و جائداد کو تو سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور علم و ادب کی کوئی قدر نہیں ہے۔ اگر کسی باپ نے اپنی اولاد کے لئے مال و متاع نہیں چھوڑا تو گویا اس نے اس پر ظلم کیا۔ چاہے اس نے علم و ادب اور تہذیبِ اخلاق سے ان کو کتنا ہی آراستہ کیوں نہ کر دیا ہو۔

یہ آیت اور یہ حدیث اس خیال کی تردید کرتی ہیں۔

وحدثنا عبد الباقی بسند آخر عن عطاء عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم حق الولد علی والده ان یحسن اسمه و یحسن ادبه۔

نیز عبد الباقی دوسری سند سے حضرت عطاءؒ سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ والد پر اولاد کا یہ حق ہے کہ اس کا نام اچھا رکھے اور اس کو حسن ادب سکھلائے۔

آج کتنے لوگ ہیں جن کا اس پر عمل ہے ؟ حالانکہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین پر اولاد کے بھی کچھ حقوق ہیں لوگ ان کی ادائیگی میں تو کوتاہی کرتے ہیں اور پھر شکایت اس کی ہے کہ ہماری اولاد نافرمان ہے ۔ اس پر ایک واقعہ سنیئے !

" حضرت عمرؓ کے دربار میں ایک باپ نے اپنے بیٹے پر دعویٰ کیا کہ یہ میرے حقوق ادا نہیں کرتا۔ حضرت عمرؓ نے لڑکے سے دریافت کیا۔ اس نے کہا اے امیر المومنین کیا باپ ہی کا سارا حق اولاد پر ہے یا اولاد کا بھی باپ پر کچھ حق ہے ؟

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اولاد کا بھی باپ کے ذمہ حق ہے۔ کہا میں ان حقوق کو سننا چاہتا ہوں، فرمایا اولاد کا حق باپ پر یہ ہے کہ اولاد حاصل کرنے کے لئے شریف عورت تجویز کرے اور جب اولاد پیدا ہو ان کا نام اچھا رکھے اور جب ان کے ہوش درست ہو جائیں ان کو تہذیب اور تعلیم دین دے۔ لڑکے نے کہا کہ میرے باپ نے ان حقوق میں سے ایک حق بھی ادا نہیں کیا۔ کیونکہ اس نے ایسی باندی کو میری ماں بنایا ہے جو آوارہ گرد تھی اور جب میں پیدا ہوا تو میرا نام جُعَل رکھا (جس کے معنی ہیں گوہ کا کیڑا) اور مجھے دین کا ایک حرف نہیں سکھلایا۔ مجھے دینی تعلیم سے بالکل کورا رکھا۔ یہ سنکر حضرت عمرؓ کو باپ پر بہت غصہ آیا اور اسکو دھمکایا اور یہ کہہ کر مقدمہ خارج کر دیا کہ جاؤ پہلے تم اپنے ظلم کی مکافات کرو اس کے بعد لڑکے کے ظلم کی فریاد کرنا۔" انتہٰی۔

دیکھئے اس واقعہ سے یہ نکلا کہ جب باپ اس طرح سے حق تلفی کرے تو پھر بیٹا اگر اس کی نافرمانی کرے تو اس پر الزام نہیں ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آج کل اولاد جو والدین کی نافرمان ہوتی ہے تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بھی حقوق والدین کے ذمہ رکھے تھے جس کی ادائیگی میں ان لوگوں سے کوتاہی ہوتی ہے تو جب یہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق ادا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی دنیوی سزا اور عذاب یہ دیتے ہیں کہ ان کی اولاد کو ان کا نافرمان بنا دیتے ہیں۔ ع

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

اور یہ عین عدل ہے کیونکہ جب انھوں نے اس کے حقوق نہیں ادا کئے تو اولاد سے کیوں مطالبہ ہے اور جب وہ بھی ان کے حقوق ادا نہیں کرتے تو بھناتے کیوں ہیں ؟

آگے پھر امام رازیؒ کا قول نقل کرتا ہوں سنیے :۔

فرماتے ہیں کہ۔

وحدثنا عبد الباقی کبسند آخر عن عبد الباقی ایک دوسری سند سے محمد بن عبد الرحمن

محمد بن عبد الرحمن عن ابی هریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا بلغ اولادکم سبع سنین فعلموھم الصلوۃ واذا بلغوا عشر سنین فاضربوھم علیھا وفرقوا بینھم فی المضاجع ۔

سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمہاری اولاد سات برس کی ہوجائے تو اس کو نماز سکھلاؤ اور جب دس برس کی ہوجائے تو ان کو (ترک) نماز پر مارو اور سونے میں باہم انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کردو یعنی الگ الگ سلاؤ۔

(احکام القرآن ج ۳ ص ۴۶۷)

ابو داؤد شریف میں یہی حدیث ان لفظوں سے آئی ہے :۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہٖ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مروا اولادکم بالصلوۃ وھم ابناء سبع سنین واضربوا ھم علیھا وھم ابناء عشر وفرقوا بینھم فی المضاجع - قال صاحب بذل المجھود ای فرقوا بین الاخ والاخت مثلاً فی المضاجع لئلا یقعوا فیما لا ینبغی لان بلوغ العشر مظنۃ الشھوۃ

(بذل المجھود ص ۲۷۵ ج ۱)

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اولاد کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم کرو اور دس برس کے ہوجائیں تو اس پر ان کو مارو اور اب سے علیحدہ بستر پر سلایا کرو (یعنی بھائی کو بہن سے، لڑکے کو ماں سے۔ لڑکی کو باپ سے بلکہ بھائی کو بھی دوسرے بھائی سے الگ سلاؤ تاکہ کسی نامناسب حال میں نہ واقع ہوجائیں اس لئے کہ دس سال کی عمر میں شہوت پیدا ہوجایا کرتی ہے)۔

نیز حدیث شریف میں یہ جو فرمایا کہ واضربوھم علیھا یعنی دس سال کی عمر میں نماز پر انھیں مارو تو اس کے متعلق علما فرماتے ہیں کہ علیھا کے معنی علی ترکھا کے ہیں یعنی نماز کے ترک کرنے پر انھیں مارو۔

ایک مرتبہ مجھے یہ خیال ہوا کہ حدیث میں تو ترک کا لفظ آیا نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ترکھا بھی تو فرما سکتے تھے پھر آخر اس کے ترک میں کیا نکتہ ہے۔ اس سلسلہ میں مجمع البحار دیکھا تو اس میں ضرب کا صلہ جب علیٰ آتا ہے تو اس کی مثال بیان کی ہے کہ :۔

یضربوننا علی الشھادۃ والعھد

لوگ ہم کو شہادت اور عہد پر مارتے تھے۔ اس

ای یأدبوننا ویأمرونا بالکف عنها والاحتیاط فیھا و عدم استعمالھا (ص ۲۹۳ ج ۲)

کا مطلب یہ تھا کہ ہم کو ادب سکھلاتے تھے اور ہم کو اس سے رکنے کا اور اس باب میں احتیاط سے کام لینے کا اور ان کو نہ استعمال کرنے کا حکم فرماتے تھے۔

اس استعمال کے دیکھنے سے واضربوھم علیھا کا مفہوم خوب واضح ہوگیا کہ یہاں بھی مراد یہ ہے کہ نماز کے باب میں اہتمام پیدا کرنے کی خاطر ان کو مارا جا سکتا ہے۔ اب خواہ ان سے ترک نماز کا صدور ہو یا تاخیر کے وہ مرتکب ہوں یا اسکو جلدی جلدی ادا کرتے ہوں۔ غرض کہ ان کے جس فعل سے بھی قلت اہتمام پایا جائے گا اس پر تنبیہ کیجائیگی تاکہ ابھی سے طبیعت میں اس کی عظمت اور اس کا احترام و اہتمام پیدا ہو۔

دیکھئے اس حدیث میں جس طرح سے کہ اولاد کے لئے تعلیم و تربیت کا حکم مذکور ہے اسی طرح سے یہ بھی بیان فرمایا گیا ہے کہ یہ فریضہ اولیاء پر عائد ہوتا ہے اور وہی اس کے مکلف ہیں۔ اس میں تدریج کی بھی رعایت فرمائی گئی ہے اور اس کے حدود بھی ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ پس اب تو یہ مسئلہ گویا منصوص ہوگیا۔ اب اپنی طرف سے خیال و عقل کی گنجائش اس میں باقی نہیں رہ گئی مسلمان کا کام منصوص پر ایمان و ایقان اور ان سے انحراف نہ کرنا ہے کوئی مسلمان اس سے انحراف کیسے کرسکتا ہے۔ اگر انحراف اعتقادی ہے تب تو اس زمرہ ہی سے خارج ہو جائیگا اور اگر صرف عملی انحراف ہے تب بھی دین سے بہت دور ہے۔ یہ مسئلہ آج کا نہیں ہے بہت قدیم ہے زمانۂ نبوت میں بھی اس کی ضرورت و اہمیت کا لحاظ و احساس کر کے حضرت نبوت سے اس کی تعلیم کی گئی اور اس پر امت نے ایمان کامل اور عمل کامل اختیار کیا چنانچہ ہر ہر گھر میں دین اور دینی تعلیم رائج ہوگئی گویا ہر گھر مدرسہ ہوگیا اسوجہ سے ترک تعلیم سے جو اثرات بد ہوتے اس کے ضرر سے محفوظ رہے۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دھلوی رح حجۃ اللہ البالغہ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:۔

اعلم ان اللہ تعالیٰ انشاء بعد عصر التابعین نشأ من حملۃ العلم انجازا لما وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیث قال یحمل ھذا

اللہ تعالیٰ نے حضرات تابعینؓ کے بعد حاملین علم کی ایک نئی جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدہ کو پورا کرنے کے لئے پیدا فرمائی۔ کیونکہ آپ نے فرمایا تھا کہ اس علم (دین) کو متدین اسلاف سے عادل اخلاف حاصل کرتے

العلم من كل خلف عن ولده تاخذوا عمن اجتمعوا معه منهم صفة الوضوء والغسل والصلوٰة والحج والنكاح والبيوع وسائر ما يكون وقوعه +

رہیں گے۔ لہٰذا عام لوگ ان اخلاف عدول میں سے جسکے ساتھ جمع ہوئے یعنی جسکی بھی صحبت پائی اسی سے وضو اور غسل کا طریقہ، نماز و حج کے مسائل اور نکاح و بیوع کے احکام اور جو جو امور کثیر الوقوع تھے ان سب کی تفاصیل معلوم کیں۔

صـ ۱۴۴

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ اسلاف میں ترویج[1] علم کا یہی طریقہ تھا کہ لوگ جس ماحول میں رہتے تھے اور ان کے گرد و پیش جو مجمع ہوتا تھا اسی سے علم دین یعنی نماز و طہارت وغیرہ کے مسائل سیکھتے تھے۔ ایک اور مقام پر تو تصریح فرمادی ہے کہ لوگ اپنے آباء اور شہر کے معلمین سے دین سیکھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

وكان من خبر العامة انهم كانوا فى المسائل الاجتماعية التى لا اختلاف فيها بين المسلمين او جمهور المجتهدين لا يقلدون الا صاحب الشرع وكانوا يتعلمون صفة الوضوء والغسل والصلوٰة والزكاة ونحو ذلك من آبائهم او معلمى بلدانهم فيمشون حسب ذلك +

عوام کی یہ حالت تھی کہ وہ لوگ متفق علیہا مسائل میں بھی جن میں مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہ تھا اور سب مجتہدین کے نزدیک وہ مسلم تھے ان میں تو صرف شارعؑ کی تقلید کرتے تھے اور طریقۂ وضو اور غسل اور نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام اور مسائل اپنے باپ دادا سے یعنی (گھر ہی سے) سیکھتے تھے۔ یا شہر کے معلمین حضرات سے سیکھ کر اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔

(حجۃ اللہ البالغہ صـ ۱۵۳ ج ۱)

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ لوگ ابتدائی دینی تعلیم اپنے اپنے گھر ہی سیکھتے تھے یا شہر میں وہی لوگ کسی معلم کا انتظام کر دیتے یا کوئی اللہ کا بندہ از خود تعلیم کے لئے تیار ہو جاتا تو اس کے پاس جاکر ہی لوگ دین سیکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصلاح و تعلیم محض علماء ہی کے ذمہ نہیں ہے بلکہ والدین اور معلمین کے ذمہ بھی ہے کہ بچوں کو دینی تعلیم دیں۔ میں کہتا ہوں کہ معلمین سے زیادہ ذمہ داری والدین اور اولیاء پر ہے۔ اگر یہ لوگ تعلیم و تربیت نہ کریں گے تو گنہگار ہوں گے اور جس طرح

[1] علم پھیلانا۔

سے خود عمل نہ کرنے سے فاسق ہوں گے۔ اسی طرح اولاد کی تعلیم و تربیت جو ان پر فرض کی گئی ہے نہ کرنے سے فاسق گردانے جائیں گے۔

اسی کو میں نے کہا کہ امت نے اس پر عمل بھی کیا ہے۔ اب کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اسطرت تو التفات نہ کیا جائے اور اپنی ذمہ داری کو محسوس نہ کیا جائے اور اپنی ذمہ داری سے قطع نظر کر کے اس کو صرف علما کے سر مڑھا جائے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

خود فراموشی کند تہمت دہد استاد را

کا یہی مصداق ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے امت بے گانہ ہو گی تو اس کا کہاں ٹھکانا ہو گا؟ ؎

کسانیکہ زیں راہ برگشتہ اند
برفتند و بسیار سرگشتہ اند

نیز اس حدیث شریف سے یہ معلوم ہوا کہ سات برس میں اولاد کو نماز کا حکم کرنا چاہیے اور دس برس کی عمر میں نماز نہ پڑھنے پر ان کو مارنا چاہیے۔ حالانکہ ان پر نماز دس برس کی عمر میں بھی فرض نہیں ہوتی لیکن یہ شریعت کا اہتمام اور حسن انتظام ہے کہ فرض کے ادائیگی کی عادت ڈالنے کے لئے اولیاء پر واجب کر دیا تاکہ فرض ہونے کے بعد پھر ان سے نہ چھوٹنے پائے۔

اور اس حدیث میں تو صرف نماز ہی کے بارے میں فرمایا گیا ہے لیکن فقہاء لکھتے ہیں کہ روزہ کا بھی یہی حکم ہے۔

نیز اور دوسری اچھی چیزوں سے بھی اس عمر سے اس کو مالوف کیا جائے گا اور بری باتوں سے روکا جائیگا چنانچہ نور الایضاح میں ہے کہ :۔

تؤمر بها الاولاد بسبع سنین	اولاد کو نماز کا حکم کیا جائے گا جبکہ وہ سات برس کی ہو جائے
وتضرب علیها بعشر بید لا بخشبة۔	اور اسکو مارا جائیگا جبکہ وہ دس برس کی ہو جائے لیکن صرف ہاتھ
(مراقی الفلاح ص۹۳)	سے مارے لکڑی سے نہیں۔

دیکھئے ترک نماز پر یہاں مارنے کا حکم ضرور ہے لیکن شریعت میں اس کے حدود بھی مقرر ہیں فقہاء کے کلام سے معلوم ہوا کہ ہاتھ سے مارے لکڑی وغیرہ سے نہ مارے لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ یا تو اولاد کی جانب سے بالکل غفلت ہی برتیں گے اور یا اس کی تربیت کرنے پر اتر آئینگے تو پھر چھڑی، ڈنڈا جو بھی

سامنے آجائے گا اس سے مارنا شروع کردیں گے اور یہ نہ دیکھیں گے کہ اس کی ناک ٹوٹ گئی یا کان پھٹ گیا یا چہرہ زخمی ہوگیا۔ یہ صریح ظلم ہے اور اس کا مصداق ہے کہ ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

بہرحال نور الایضاح کی عبارت سے تو معلوم ہوا کہ اولاد کو نماز کا حکم سات سال کی عمر میں کیا جائے گا اور دس برس میں اس پر اسکو مارا بھی جائے گا۔ اسکے تحت طحطاوی میں ہے کہ

قولہ تومر بھا الاولاد ذکوراً واناثاً والصوم کالصلوۃ وفی الدر انہ یومر بالصوم والصلوۃ وینھی عن شرب الخمر ویتألف الخیر ویعرض عن الشر والظاھر منہ ان ھذا واجب علی الولی۔

(طحطاوی ص۹۳)

اولاد کو نماز کا حکم کیا جائے گا خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ اور روزہ کا بھی حکم مثل نماز کے ہے اور درمختار میں ہے کہ بچوں کو نماز اور روزہ کا حکم کیا جائے گا اور شراب وغیرہ کے پینے سے روکا جائیگا اور خیر کی ان کو رغبت دلائی جائیگی اور برائیوں سے ان کو منع کیا جائے گا اور ظاہر یہ ہے کہ یہ سب چیزیں ولی پر واجب ہیں۔

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ یہ اولاد کی تعلیم و تربیت جو ولی پر واجب ہے تو اس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں داخل ہیں یعنی جس طرح سے لڑکوں کی تعلیم و تربیت واجب ہے اسی طرح سے لڑکیوں کی بھی دینی تعلیم اور تربیت اولیاء کے ذمہ لازم ہے۔

اب لڑکوں کی جانب تو کسی قدر توجہ بھی ہے لیکن لڑکیوں کی تعلیم اور تربیت کی جانب اصلا توجہ نہیں کیجاتی۔ مردوں کو تو نیک لوگوں کے پاس اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے خیر کچھ باتیں معلوم بھی ہو جاتی ہیں لیکن عورتیں تو دین سے بالکل ہی جاہل ہوتی ہیں۔ اور جب یہ خود جاہل ہوں گی تو اپنے گود کے بچوں کو کیا خاک دینی تعلیم دے سکیں گی۔ اس لئے اس زمانہ میں ضرورت ہے کہ ان کے تعلیم طرف بھی خصوصی توجہ کیجائے اور لڑکیوں کو بھی دین و مذہب سے اوائل عمر ہی میں واقف کرایا جائے اس کے ترک سے جو مفاسد رونما ہوئے ہیں وہ ہر عاقل اور تجربہ کار پر مخفی نہیں۔

جب ولی کے ذمے واجب ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کو نماز و روزہ خیر و شر۔ جائز و ناجائز حلال و حرام کی تعلیم کرے تو ظاہر ہے کہ جس جگہ بھی ان امور کی تعلیم کیجائیگی وہ مدرسہ ہی ہوگا۔

خیر القرون میں اور اس کے بعد بھی بہت زمانہ تک مسلمانوں کا اس پر عمل رہا۔ چنانچہ ہر قسم کی فلاح و

بہبود ان کو حاصل تھی لیکن آج مسلمانوں نے اپنے اس مدرسہ ہی کو ختم کردیا ہے اور وہ ساری باتیں جو کسی زمانہ میں بچے ماں کی گود سے اور والد کی تربیت سے سیکھ کر تب تعلیم کے لئے مدرسوں میں داخل ہوتے تھے۔ آج ان تمام امور کی تعلیم بھی مدارس میں اساتذہ کو بلکہ خانقاہوں میں مشائخ کو دینی پڑتی ہے۔

رہا یہ کہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں کیا ترتیب ہونی چاہیئے اور اس کا کیا طریقہ کار ہو تو اس کے متعلق احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ :۔

"ضروری ہے کہ اوائل عمر میں سب سے پہلے بچوں کو اسلامی عقائد حفظ کرائے جائیں۔"

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند ضروری عقائد کا ذکر کردیا جائے۔ چنانچہ حضرت مولانا تھانوی ؒ نے تعلیم الدین میں ان کو مفصل بیان فرمایا ہے۔ ہم یہاں ان کو بعینہٖ نقل کرتے ہیں۔ وھو ھذا

عقائد و تصدیقات

(۱) تمام عالم پہلے بالکل ناپید تھا پھر اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے موجود ہوا۔

(۲) اللہ ایک ہے وہ کسی کا محتاج نہیں نہ اس نے کسی کو جنا نہ وہ کسی سے جنا گیا کوئی اس کے مقابل کا نہیں۔

(۳) وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

(۴) کوئی چیز اس کے مانند نہیں وہ سب سے نرالا ہے۔

(۵) وہ زندہ ہے ہر چیز پر اسکو قدرت ہے۔ کوئی چیز اس کے علم سے پوشیدہ نہیں۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے، سنتا ہے وہ جو چاہے کرتا ہے کلام فرماتا ہے وہی پوجنے کے قابل ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں اپنے بندوں پر مہربان ہے بادشاہ ہے وہ سب عیبوں سے پاک ہے۔ وہی اپنے بندوں کو سب آفتوں سے بچاتا ہے۔ وہی عزت والا ہے۔ بڑائی والا ہے، پیدا کرنے والا ہے، گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ زبردست ہے، بہت دینے والا ہے، روزی پہونچانے والا ہے، جس کی روزی چاہے تنگ کردے، فراخ کردے، جس کو چاہے پست کردے، جسکو چاہے بلند کردے، جسکو چاہے عزت دے، جسکو چاہے ذلت دے، انصاف والا ہے، بردبار اور برداشت والا ہے، خدمت کی قدردانی کرنے والا ہے، دعا قبول کرنے والا ہے، اس کا

ابتدا۔

کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، وہ سب کام بنانے والا ہے اسی نے سب کو پہلے پیدا کیا۔ وہی قیامت میں دوبارہ پیدا کرے گا، وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے، اس کو نشانیوں اور صفتوں سے سب جانتے ہیں اور اس کی ذات کی باریکی کو کوئی نہیں جانتا، گنہگاروں کی توبہ قبول کرتا ہے جو سزا کے قابل ہیں ان کو سزا دیتا ہے، وہی ہدایت دیتا ہے، نہ وہ سوتا ہے نہ اونگھتا ہے۔ وہ تمام عالم کی حفاظت سے تھکتا نہیں۔ وہی سب چیزوں کو تھامے ہوئے ہیں، اسی طرح تمام صفتیں کمال کی اسکو حاصل ہیں۔

(۶) مخلوق کی صفتوں سے وہ پاک ہے اور قرآن وحدیث میں بعضی جگہ جو ایسی باتوں کی خبر دی گئی ہے یا تو ان کے معنیٰ کو اللہ کے سپرد کردیں وہی اس کی حقیقت جانتا ہے اور ہم بے کھود کرید کئے ہوئے ایمان اور یقین کرلیتے ہیں اور یہی بہتر ہے اور یا کچھ مناسب معنیٰ اس کے لگالئے جائیں جس سے وہ سمجھ میں آجائے۔

(۷) عالم میں جو کچھ بھلا برا ہوتا ہے سب کو اللہ تعالیٰ اس کے ہونے سے پہلے ہمیشہ سے جانتا ہے اور اپنے جاننے کے موافق اسکو پیدا کرتا ہے۔ تقدیر اسی کا نام ہے اور بری باتوں کے پیدا کرنے میں بہت بھید ہیں ان کو ہر کوئی نہیں جانتا۔

(۸) بندوں کو اللہ تعالیٰ نے سمجھ اور ارادہ دیا ہے جس سے وہ گناہ اور ثواب کا کام اپنے اختیار سے کرتے ہیں مگر بندوں کو کسی کام کے پیدا کرنے کی قدرت نہیں ہے، گناہ کے کام سے اللہ تعالیٰ ناراض اور ثواب کے کام سے خوش ہوتے ہیں۔

(۹) اللہ تعالیٰ نے بندوں کو ایسے کسی کام کا حکم نہیں کیا جو بندوں سے نہ ہو سکے۔

(۱۰) کوئی چیز خدا کے ذمہ ضروری نہیں وہ جو کچھ مہربانی کرے اس کا فضل ہے۔

(۱۱) بہت سے پیغمبر اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے بندوں کو سیدھی راہ بتلانے آئے اور وہ سب گناہوں سے پاک ہیں، گنتی ان کی پوری طرح تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ ان کی سچائی بتلانے کے لئے ان کے ہاتھوں ایسی نئی نئی مشکل باتیں ظاہر کیں جو اور لوگ ظاہر نہیں کر سکتے ایسی باتوں کو معجزہ کہتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام تھے اور سب کے بعد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی درمیان میں ہوئے ان میں بعضے بہت مشہور ہوئے مثلاً حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت داؤد

علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت ایوب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام۔ حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ حضرت الیاس علیہ السلام، حضرت الیسع علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت ذوالکفل علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام حضرت ہود علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام،

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ

(۱۲) پیغمبروں میں بعضوں کا رتبہ بعضوں سے بڑا ہے۔ سب میں زیادہ مرتبہ ہمارے پیغمبر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور آپ کے بعد کوئی نیا پیغمبر نہیں آسکتا، قیامت تک جتنے آدمی اور جن ہوں گے آپ سب کے پیغمبر ہیں۔

(۱۳) ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جاگتے میں جسم کے ساتھ مکہ سے بیت المقدس میں اور وہاں سے ساتوں آسمانوں پر اور وہاں سے جہاں تک اللہ کو منظور ہوا پہنچایا اور پھر مکے میں پہنچادیا اس کو معراج کہتے ہیں۔

(۱۴) اللہ تعالیٰ نے کچھ مخلوقات نور سے پیدا کر کے ان کو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ کیا ہے۔ ان کو فرشتہ کہتے ہیں ان کا مرد یا عورت ہونا کچھ نہیں تبلایا گیا۔ بہت سے کام ان کے سپرد ہیں وہ کبھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے۔ ان میں چار فرشتے بہت مشہور ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام حضرت عزرائیل علیہ السلام۔

(۱۵) اللہ تعالیٰ نے کچھ مخلوقات آگ سے پیدا کر کے ان کو ہماری نظروں سے پوشیدہ کیا ہے ان کو جن کہتے ہیں ان میں نیک و بد سب طرح کے ہوتے ہیں ان کے اولاد بھی ہوتی ہے ان سب میں زیادہ مشہور شریر ابلیس شیطان ہے۔

(۱۶) مسلمان جب خوب عبادت کرتا ہے اور گناہوں سے بچتا ہے اور دنیا سے محبت نہیں رکھتا اور پیغمبر صاحب کی ہر طرح تابعداری کرتا ہے تو وہ اللہ کا دوست اور پیارا ہوجاتا ہے۔ ایسے شخص کو ولی کہتے ہیں۔ اس شخص سے ایسی باتیں ظہور میں آتی ہیں جو اور لوگوں سے نہیں ہوسکتیں ایسی باتوں کو کرامت کہتے ہیں۔

(۱۷) ولی کتنے ہی بڑے درجے کو پہنچ جائے مگر نبی کے برابر نہیں ہوسکتا۔

(۱۸) خدا کا کیسا ہی پیارا ہو جائے مگر جب تک ہوش و حواس درست ہیں شرع کا پابند رہنا فرض ہے، نماز روزہ اور کوئی عبادت معاف نہیں ہوتی جو گناہ کی باتیں ہیں وہ اس کے لئے درست نہیں ہو جاتیں۔

(۱۹) جو شخص شرع کے خلاف ہو وہ خدا کا دوست نہیں ہو سکتا اگر اس کے ہاتھوں سے کوئی اچنبھے کی بات دکھلائی دے تو یا وہ جادو ہے یا نفسانی اور شیطانی دھندا ہے اس سے اعتقاد درست نہیں

(۲۰) ولی لوگوں کو بعضی باتیں بھید کی سوتے یا جاگتے میں معلوم ہو جاتی ہیں اس کو کشف اور الہام کہتے ہیں اگر وہ شرع کے موافق ہے قبول ہے اور اگر خلاف ہے تو رد ہے۔

(۲۱) اللہ اور رسولؐ نے دین کی سب باتیں قرآن و حدیث میں بندوں کو تبلا دیں، اب کوئی نئی بات نکالنا دین میں درست نہیں ایسی نئی بات کو بدعت کہتے ہیں۔ بدعت بہت بڑا گناہ ہے البتہ بعض باریک باتیں دین کی جو ہر ایک کے سمجھ میں نہیں آتیں پچھلے اگلے عالموں نے اپنے علم کے زور سے قرآن و حدیث سے سمجھ کر دوسروں کو تبلا دیں ایسے لوگ مجتہد کہلاتے ہیں۔ مجتہد بہت ہوئے چار ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ۔ امام شافعیؒ امام مالکؒ۔ امام احمدؒ جس مجتہد سے زیادہ اعتقاد ہو اس کی پیروی کرے۔

ہندوستان میں ابو حنیفہ کی پیروی کرنے والے زیادہ ہیں وہ حنفی کہلاتے ہیں (چنانچہ ہملوگ بھی امام اعظم کے پیرو یعنی حنفی ہیں۔ اسی طرح نفس کے سنوارنے کے طریقے قرآن و حدیث کے موافق ولی لوگوں نے اپنے دل کی روشنی سے سمجھ کر تبلائے ایسے لوگ شیخ کہلاتے ہیں۔ شیخ بہت ہوئے مگر ان میں چار زیادہ مشہور ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ حضرت غوث الاعظم عبدالقادر جیلانیؒ۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ خواجہ بہاءالدین نقشبندؒ۔ جس مجتہد اور شیخ سے اعتقاد ہو اس کی پیروی کر کے دوسروں کو برا سمجھنا درست نہیں اور، پیروی مجتہد اور شیخ کی اسی وقت تک ہے جب تک ان کی بات خدا و رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو اور اگر ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہو اس میں پیروی نہیں ہے۔

(۲۲) اللہ تعالیٰ نے بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں آسمانوں سے جبرئیلؑ کی معرفت بہت سے پیغمبروں پر اتاریں تاکہ وہ اپنی اپنی امتوں کو دین کی باتیں تبلائیں۔ ان میں چار کتابیں بہت مشہور ہیں۔ توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی، زبور حضرت داؤد علیہ السلام کو،

انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام، قرآن مجید ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور قرآن مجید آخری کتاب ہے۔ اب کوئی کتاب آسمان سے نہ آئے گی قیامت تک قرآن شریف ہی کا حکم چلتا رہے گا۔ دوسری کتابوں کو گمراہ لوگوں نے بہت کچھ بدل ڈالا مگر قرآن مجید کی نگہبانی اور حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے اسکو کوئی نہیں بدل سکتا۔

(۲۳) ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جس جس مسلمان نے دیکھا اسکو صحابی رضی کہتے ہیں ان کی بڑی بڑی بزرگیاں آئی ہیں ان سب سے محبت اور اچھا گمان رکھنا چاہیئے۔ اگر کوئی لڑائی جھگڑا ان کا سننے میں آئے تو اسکو بھول چوک سمجھے ان کی برائی نہ کرے۔ ان میں سب سے بڑھ کر چار صحابی ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ پیغمبر صاحب کے بعد ان کی جگہ بیٹھے اور دین کا بندوبست کیا۔ اس لئے یہ اول خلیفہ کہلاتے ہیں۔ تمام امت میں یہ سب سے بہتر ہیں ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دوسرے خلیفہ ہیں۔ ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ تیسرے خلیفہ ہیں ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ چوتھے خلیفہ ہیں۔

(۲۴) پیغمبر صاحب کی اولاد اور بیبیاں سب تعظیم کے لائق ہیں۔ اولاد میں سب سے بڑا رتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا اور بیبیوں میں حضرت خدیجہ رضی اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ہے۔

(۲۵) ایمان جب درست ہوتا ہے کہ اللہ و رسول کو سب باتوں میں سچا سمجھے اور ان کو مان لے اللہ و رسول کی کسی بات میں بھی شک کرنا یا اسکو جھٹلانا یا اس میں عیب نکالنا یا اس کے ساتھ مذاق اڑانا ان سب باتوں سے ایمان جاتا رہتا ہے

(۲۶) قرآن و حدیث کے کھلے کھلے مطلب کا نہ ماننا اور اینچ پینچ کر کے اپنے مطلب بنانے کو معنی گڑھنا بددینی کی بات ہے۔

(۲۷) گناہ کو حلال سمجھنے سے ایمان جاتا رہتا ہے

(۲۸) گناہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو جب تک اس کو برا سمجھے اس سے ایمان نہیں جاتا البتہ کمزور ہو جاتا ہے۔

(۲۹) اللہ تعالیٰ سے نڈر ہو جانا یا ناامید ہو جانا کفر ہے۔

(۳۰) کسی سے غیب کی باتیں پوچھنا اور اس کا یقین کرنا کفر ہے۔ البتہ نبیوں کو وحی سے اور ولیوں کو کشف و الہام سے اور عام لوگوں کو نشانیوں سے کوئی بات معلوم ہو سکتی ہے۔

(۳۱) کسی کا نام لیکر کافر کہنا یا لعنت کرنا بڑا گناہ ہے ہاں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ظالموں پر لعنت جھوٹوں پر لعنت مگر جن کا نام لیکر اللہ و رسول نے لعنت کی ہے یا ان کے کفر کی خبر دی ہے۔ ان کو کافر ملعون کہنا گناہ نہیں۔

(۳۲) جب آدمی مرجاتا ہے اگر گاڑا جاوے تو گاڑنے کے بعد اور اگر نہ گاڑا جاوے تو جس حال میں ہو اس کے پاس دو فرشتے جن میں ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہتے ہیں۔ آکر پوچھتے ہیں کہ تیرا پروردگار کون ہے، تیرا دین کیا ہے، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پوچھتے ہیں کہ یہ کون ہیں۔ اگر مردہ ایماندار ہوا تو ٹھیک ٹھیک جواب دیتا ہے پھر اس کے لئے سب طرح کا چین ہے اور نہیں تو وہ سب باتوں میں یہی کہتا ہے کہ مجھے خبر نہیں، پھر اس پر بڑی سختی ہوتی ہے اور بعضوں کو اللہ تعالیٰ اس بات سے معاف کر دیتا ہے مگر یہ باتیں مردے کو معلوم ہوتی ہیں ہم لوگ نہیں دیکھتے، جیسے سوتا ہوا آدمی خواب میں سب کچھ دیکھتا ہے اور جاگتا ہوا آدمی اس کے پاس بیٹھا ہوا بے خبر ہے۔

(۳۳) مردے کے لئے دعا کرنے سے کچھ خیر خیرات دیکر بخشنے سے اس کو ثواب پہنچتا ہے اور اس سے اسکو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔

(۳۴) اللہ و رسول نے جتنی نشانیاں قیامت کی تبلائی ہیں سب ضروری ہونے والی ہیں۔ حضرت مہدی رضؓ ظاہر ہوں گے اور خوب انصاف سے بادشاہی کریں گے، کانا دجال نکلے گا اور دنیا میں بہت فساد مچائے گا، اس کے مار ڈالنے کے واسطے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے اور اسکو مار ڈالیں گے، یاجوج و ماجوج بڑے زبردست آدمی ہیں وہ تمام زمین پر پھیل پڑیں گے پھر وہ خدا کے قہر سے ہلاک ہوں گے، ایک عجیب طور کا جانور زمین سے نکلیگا اور آدمیوں سے باتیں کرے گا مغرب کی طرف سے آفتاب نکلے گا، قرآن مجید اٹھ جائے گا اور چند روز میں تمام مسلمان مرجائیں گے اور تمام دنیا کافروں سے بھر جائیگی اور بہت سی باتیں ہوں گی۔

(۳۵) جب ساری نشانیاں پوری ہوجائیں گی اب قیامت کا سامان شروع ہوگا۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام خدا کے حکم سے صور پھونکیں گے یہ صور ایک بہت بڑی سینگ کی شکل کی چیز ہے، اس صور کے پھونکنے سے تمام زمین و آسمان پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، تمام مخلوقات مرجائیں گی اور جو مرچکے ہیں ان کی روحیں بیہوش ہو جائیں گی، مگر

اللہ تعالیٰ کو جن کا بچانا منظور ہے وہ اپنے حال پر رہیں گے۔ ایک مدت اسی کیفیت پر گذر جائے گی۔

(۳۶) پھر جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا کہ تمام عالم دوبارہ پیدا ہو جائے دوسری بار صور پھونکا جائیگا اس سے پھر سارا عالم موجود ہو جائے گا، مردے زندہ ہو جائیں گے، اور قیامت کے میدان میں سب اکٹھے ہوں گے اور وہاں کی تکلیفوں سے گھبرا کر سب پیغمبروں کے پاس سفارش کرانے جائیں گے، آخر ہمارے پیغمبر صاحبؐ سفارش کریں گے سب بھلے برے عمل تولے جائیں گے، ان کا حساب ہوگا مگر بعضے بدون حساب جنت میں جائیں گے، نیکیوں کا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں اور بدیوں کا بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو حوض کوثر کا پانی پلائیں گے جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا، پل صراط پر چلنا ہوگا جو نیک لوگ ہیں وہ اس سے پار ہو کر بہشت میں پہنچ جاویں گے، جو بد ہیں وہ اس پر سے دوزخ میں گر پڑینگے۔

(۳۷) دوزخ پیدا ہو چکی ہے اور اس میں سانپ بچھو اور طرح طرح کا عذاب ہے، دوزخیوں میں سے جن میں ذرا بھی ایمان ہوگا وہ اپنے اعمال کی سزا بھگت کر پیغمبروں اور بزرگوں کی سفارش سے نکلکر بہشت میں داخل ہوں گے خواہ کتنے ہی بڑے گنہگار ہوں اور جو کافر و مشرک ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور ان کو موت بھی نہ آئے گی۔

(۳۸) بہشت بھی پیدا ہو چکی ہے اور اس میں طرح طرح کے چین اور نعمتیں ہیں، بہشتیوں کو کسی طرح کا ڈر اور غم نہ ہوگا اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ اس سے نکلیں گے اور نہ وہاں مرینگے۔

(۳۹) اللہ کو اختیار ہے کہ چھوٹے گناہ پر سزا دیدے یا بڑے گناہ کو محض اپنی مہربانی سے معاف کردے اور بالکل اس پر سزا نہ دے۔

(۴۰) جن لوگوں کا نام لیکر اللہ و رسول نے بہشتی ہونا بتلا دیا ہے ان کے سوا کسی کے بہشتی ہونے کا یقینی حکم نہیں لگا سکتے، البتہ اچھی نشانیاں دیکھ کر اچھا گمان رکھنا اور اللہ کی رحمت سے امید رکھنا ضروری ہے۔

(۴۱) بہشت میں سب سے بڑی نعمت اللہ کا دیدار ہے جو بہشتیوں کو نصیب ہوگا۔ اسکی لذت کے سامنے تمام نعمتیں ہیچ معلوم ہوں گی۔

(۴۲) دنیا میں جاگتے ہوئے ان آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو کسی نے نہیں دیکھا اور نہ کوئی دیکھ سکتا ہے۔
(۴۳) عمر بھر کوئی کیسا ہی بھلا برا ہو مگر جس حالت پر خاتمہ ہوتا ہے اسی کے موافق جزا و سزا ہوتی ہے
ان عقائد کو ابتدائی عمر میں بچوں کو زبانی یاد کرا دیا جائے پھر آہستہ آہستہ اسکی کسی قدر توضیح اور تشریح بیان کیجائے۔ پس ابتدا تو حفظ ہی سے ہوگی۔ پھر اس کا فہم ہوگا پھر اس کا اعتقاد ہوگا یعنی ایقان و تصدیق ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کا کچھ فضل ایسا ہے کہ یہ چیزیں بچوں کے ذہن میں یونہی صرف بتانے ہی سے آجاتی ہے اسپر کسی دلیل و براہان کے پیش کرنے کی حاجت نہیں پڑتی اور اس امر کا انکار کیونکر کیا جاسکتا ہے جبکہ دیکھا جاتا ہے کہ عوام کے جو عقائد ہوتے ہیں انکی ابتدا بھی محض تلقین و تقلید ہی سے ہوتی ہے

مگر ہاں یہ بات ہے کہ وہ اعتقاد جو محض تقلید سے حاصل ہوتا ہے وہ خالی از ضعف بھی نہیں ہوتا یعنی یہ کہ اگر اس کے خلاف کوئی بات بتلائی جائے تو پہلی بات ہٹکر دوسری بات اس کے ذہن میں آجائیگی لہذا اس تقلیدی عقیدے کی تقویت کی ضرورت ہے تاکہ یہ عقائد بچوں اور عوام کے قلوب میں خوب اچھی طرح سے راسخ ہو جائیں اور ان میں ضعف اور تزلزل نہ رہجائے۔

تو سنئے کہ اس کا طریقہ بحث و مناظرہ کرنا اور علم کلام کا پڑھنا نہیں ہے بلکہ طریقہ اس کا یہ ہے کہ تلاوت قرآن میں مشغول ہو اس کی تفسیر سنے حدیث شریف خود پڑھے یا دوسروں سے سنے اور اس کا مطلب علماء سے معلوم کرے اسی طرح سے اور دیگر اسلامی عبادات میں لگ جائے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روز بروز اس کا عقیدہ پختہ ہوتا جائے گا کیونکہ قرآن و حدیث میں بھی یہی سب باتیں مستحکم دلیل کے ساتھ برابر آتی رہیں گی اور یہ انکو سن سن کر ان سے متاثر ہوتا جائیگا نیز اس کی عبادت کا نور اسپر چمکیگا اس سے بھی قلب کا عقیدہ مستحکم اور مضبوط ہوتا رہے گا اور اس کا موثر اور آسان طریقہ صالحین کی صحبت اور ان کی ہم نشینی ہے اس کی وجہ سے ان کے اخلاق اور ان کی رفتار و گفتار جس سے سراسر خشیت خداوندی، تواضع اور مسکنت ٹپکتی ہوتی ہے اس کی نظر سے گذریں گے تو ان امور کا اس پر بھی اثر ہوگا۔

پس وہ تو بانی تلقین تو بمنزلہ قلب میں بیج ڈالنے کے ہوگی اور یہ سارے اسباب مانند سینچنے کے اور اسکی نگہداشت کرنے کے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ پھر اس کے بعد ایمان کا پودا قوی اور بلند ہی ہوتا جائیگا اور ایک ایسے مستحکم درخت کی طرح ہو جائے گا جس کی جڑیں تو زمین

میں مضبوطی کے ساتھ قائم ہوں گی اور اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کرتی ہوں گی۔
بچوں کا نشو و نما جب اس طرح اسلامی عقائد پر ہوگا تو بعد میں وہ دنیا کے جس شعبہ میں بھی مشغول ہوں گے، دوسرے باطل خیالات ان اسلامی عقائد پر غالب نہ آسکیں گے اور آخرت میں ان کا اہل حق کے عقائد ہی پر ہونا شمار کیا جائیگا۔ اس لئے کہ شریعت نے عرب جیسے تند خو اور ناواقف لوگوں کو ظاہر عقائد میں تصدیق جازم سے زائد کا مکلف نہیں بنایا تھا چنانچہ بحث و تفتیش کا ان کو اصلا مکلف نہیں کیا گیا چنانچہ آدمی جب چاہتا ہے کہ آخرت کا راستہ چلے اور توفیق الٰہی اس کا ساتھ دیتی ہے اور وہ عمل و تقویٰ کو اختیار کرتا ہے نفس کو خواہشات سے روکتا ہے، ریاضت و مجاہدہ اختیار کرتا ہے تو انہیں عقائد کی برکت سے اسکے لئے ہدایت کا باب کھل جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو اپنے نور سے منور فرمادیتے ہیں۔ (احیاء)
یہ عقائد کی تصحیح اس لئے مقدم ہے کہ یہ نہایت ہی اہم اور مہتم بالشان چیز ہے۔ چنانچہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے مہمات مقاصد میں سے ایک اہم مقصد تصحیح عقائد بھی تھا۔
حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ تفہیمات میں لکھتے ہیں کہ جن امور کے قائم کرنے کی دعوت حضرات انبیاء علیہم السلام نے دی ہے ان میں بڑے بڑے امور تین ہیں۔ ایک تو مبداء اور معاد جزا و سزا کے متعلق عقائد کی تصحیح کرنا اور اس فن کی اشاعت کی کفالت علمائے امت میں سے اہل اصول یعنی حضرات متکلمین نے فرمائی اللہ تعالیٰ ان حضرات کی سعی کو مشکور فرمائے۔ دوسرے طاعات مقربہ میں عمل کی تصحیح کرنا نیز سنت کے مطابق ضروری ضروری طرق انتفاع کا بیان کرنا اور اس فن کی کفالت فقہاء امت نے فرمائی رحمہم اللہ تعالیٰ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو ہدایت بخشی اور بہت سے فرقوں نے اپنی کجی کو درست کرلیا اور تیسرے اخلاص اور احسان کی تصحیح اور یہی دونوں اس دین حنیفی کی اصل ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پسند فرمایا ہے۔
اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ تیسری قسم جملہ مقاصد شرعیہ میں سب سے ادق ہے از روے ماخذ کے اور سب سے زیادہ گہری ہے از روئے اصل کے اور تمام شرائع کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے روح جسم کے مقابلہ میں اور معنی الفاظ کے مقابلہ میں اور اس فن کی کفالت فرمائی ہے حضرات صوفیہ صافیہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے چنانچہ یہ حضرات پہلے خود مہتدی ہوئے اور پھر

ہادی بنے۔ پہلے خود ہدایت حاصل کی اور پھر دوسروں کی ہدایت کی۔ خود پیا اور دوسروں کو پلایا اور سعادت قصوی پر فائز ہوئے اور بڑے حصے کو سمیٹا۔ پس اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے ان کی خوبی اور کیا ہی عام ہے ان کا نفع اور کیسا تام ہے ان کا نور۔

(تفہیمات الٰہیہ)

یہ گفتگو تعلیم میں ترتیب اور طریقہ کار سے متعلق تو درمیان میں آئی اور میں بیان یہ کر رہا تھا کہ یہ تو منصوص ہے کہ اولاد کی تعلیم و تربیت اولیاء کے ذمہ واجب ہے۔ چنانچہ اب اولیا اپنی اس ذمہ داری کو خود تو نہ محسوس کریں بلکہ اسکو علماء کے سر ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ نص اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ علماء کے ذمہ اپنے وعظ و تبلیغ کے ذریعہ احکام دین کا پہونچانا زیادہ سے زیادہ مستحب ہے۔ مگر اولیاء پر تو واجب ہے اب اسکو خواہ وہ خود کریں یا خود نہیں کر سکتے تو کسی معلم کے ذریعہ اولاد کی تعلیم و تربیت کرائیں۔ بہرحال اس کا انتظام انھیں کے ذمہ لازم ہے۔

اور یہ لزوم لفظ قوا سے مفہوم ہوا اس لئے کہ یہ امر ہے اور امر وجوب کیلئے آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد قوا انفسکم و اھلیکم نارا میں تو اصل ذکر اس کا ہے کہ اپنے نفسوں کو اور اپنی اولاد اور اپنے متعلقین کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ یہ آیتہ اس مضمون میں تو نص ہے یعنی اسی کے بیان کے لئے چلائی گئی ہے۔ باقی حضرت حسن رضؓ اور حضرت علی رضؓ سے اسکی تفسیر علم کے ساتھ جو آئی ہے تو وہ اس لئے کہ یہی علم طریق وقایہ ہے۔ کیونکہ دوزخ سے ہم اپنے نفس کو اور متعلقین کو جو بچا سکتے ہیں تو اس کا طریقہ علم ہی ہے۔ یعنی یہ کہ اوامر و نواہی کا خود بھی علم سیکھیں اور اس کے مطابق عمل کریں اور اپنے نفس کو درست کریں اور اسی طرح سے اپنے اہل و عیال کو بھی علم سکھلائیں اور اس پر عمل کرائیں۔ یہی دوزخ سے بچانے کا طریقہ ہے کیونکہ یوں تو دوزخ سے بچانا غیر اختیاری ہے لیکن اس کا یہ طریق اختیاری ہے۔

اسی بات کو دوسرے لفظوں میں کہتا ہوں کہ اس آیت میں اپنے نفس کی تکمیل کا اور اپنے اہل و عیال کے نفوس کی تکمیل کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ کیونکہ نفس کی تکمیل علم و عمل ہی سے ہوا کرتی ہے علم سے جہالت دور ہوتی ہے۔ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ رسوم باطلہ کا ابطال ہوتا ہے۔ چنانچہ

مشاہدہ ہے کہ آج جو قومیں پستی اور تنزل میں ہیں ان کو علم سے کوئی حصہ نہیں ملا ہے لہٰذا وہ اپنے باپ دادا کے اخلاق و عادات اختیار کئے ہوئے ہیں اور یہی آباء و اجداد کے رسوم ہی ان کی راہ مارے رہتے ہیں اس لئے کہ اصلاح کا ذریعہ تو علم تھا اور یہ لوگ اس سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔

ترقی کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب علم ہے۔ اب علم خواہ دنیا کا ہو یا دین کا۔ اب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جن قوموں میں کچھ تھوڑا بہت علم ہے ان کو ترقی اور فلاح سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملا ہے اور جن لوگوں میں علم نہیں ہے وہ پہلے کی طرح اب بھی تنزل اور قعر مذلت ہی میں ہیں۔

اسی کو ہم دوسرے لفظوں میں یہ کہتے ہیں کہ آج سے تیرہ سو برس پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے ہمکو جبری تعلیم کا حکم دیا تھا کیونکہ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا یہ نص قطعی ہے اس میں اپنی اور اپنی اولاد اور اپنے متعلقین کی تعلیم کا وجوب نکل رہا ہے اور آج متمدن قومیں جس نظریہ کے ماتحت لوگوں میں علم عام کرنا چاہتی ہیں (یعنی یہی تاکہ لوگ لڑائی جھگڑے، فتنے فساد سے نکل کر مہذب اور شائستہ ہو جائیں) تو ہماری شریعت میں آج سے بہت پہلے یہ حکم آچکا ہے کہ:۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا کیونکہ اس میں جہنم سے بچانے کا حکم ہے اور اس کا ذریعہ تعلیم ہی ہے۔ خدا تعالیٰ نے جس طرح سے ہم پر یہ فضل فرمایا کہ ہماری ہدایت کے لئے نبی بھیجا اور اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اسی طرح سے یہ کتنا بڑا فضل فرمایا کہ ہم کو تعلیم کا بھی حکم فرمایا کہ ہم اپنے نفس اور اپنے اہل و عیال کی تعلیم کریں اور ان سب کو درست کریں اور کس قدر کام سہل فرما دیا ہے کہ ہر شخص کو اپنے اہل و عیال کی تعلیم کا مکلف کیا کیونکہ ہر ایک شخص کے لئے صرف اپنے اہل و عیال کی تعلیم کیا دشوار ہے۔ لوگ اس ارشاد پر تو عمل نہیں کرتے اور سب کی تعلیم کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔ آج مسلمان اسی ایک حکم پر عمل کر کے دیکھیں کہ ساری قوم کو فلاح ہوتی ہے یا نہیں؟

اس مقام پر ایک ضروری بات یہ بھی سمجھ لیجئے کہ آیت قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا میں اولاد و متعلقین کی تعلیم و تربیت کا جو حکم ہے تو یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں اس میں کچھ دشواریاں بھی پیش آتی ہیں جسکی وجہ سے لوگوں کے لئے یہ ایک مشکل مسئلہ بن جاتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اسی آیت میں اس کا حل بھی بیان فرما دیا گیا ہے وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اھلیکم کا ذکر بعد میں فرمایا ہے اور اس سے پہلے قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ فرمایا ہے تو ذکر میں اَنْفُسَکُمْ کو مقدم فرما کر اس امر کی جانب اشارہ فرمایا ہے کہ یہ تقدم ذکری (جسکو تقدم وضعی بھی کہا جاتا ہے) اس لئے ہے کہ طبعاً بھی یہی مقدم ہے۔

پس وضع کو طبع کے موافق لایا گیا ہے۔ جس طرح سے کہ خود اپنے نفوس وجود میں مقدم ہوتے ہیں اپنے اہل وغیرہ کے وجود پر اس طرح سے تعلیم میں بھی یہی ترتیب ہونی چاہیئے کہ انسان پہلے اپنے نفس کو تعلیم دے اور اس کی اصلاح کرے۔ پھر اس کے بعد اپنے اولاد کی تعلیم و تربیت کرے تب اسکو تو اس میں آسانی ہوگی۔ چنانچہ دیکھا بھی جاتا ہے کہ جسکو خود اپنی اصلاح کی فکر ہے اسکو اپنی اولاد اور متعلقین کی تعلیم و تربیت کی بھی فکر ہے اور وہ اس کے لئے آسان بھی ہے اور جس کو ان کی فکر نہیں یا جس پر ان کی تعلیم شاق ہے تو اسی لئے کہ اسکو خود اپنی فکر نہیں ہوگی۔ اگر اپنی اصلاح کی فکر ہوتی تو اس پر تعلیم اولاد اور ان کی تربیت دشوار نہ ہوتی بلکہ سہل ہو جاتی اس طرح الحمد للہ کہ اس مشکل کا حل بھی یہیں سے نکل آیا۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں بیان فرمایا ہے کہ :۔

تقویم الغیر مرتب علی تقویمہ نفسہ فلیبدأ بنفسہ ثم بمن یعول۔

دوسروں کی درستگی مرتب ہوتی ہے خود اپنی اصلاح پر لہذا پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرنی چاہیئے پھر دوسروں کی۔

فرماتے ہیں کہ دوسروں کی اصلاح اپنی اصلاح پر مرتب ہوتی ہے لہذا چاہئے کہ انسان اصلاح پہلے اپنے نفس سے شروع کرے پھر اس کے بعد اپنے متعلقین کی اصلاح کرے۔

دیکھئے امام کی اس تصریح سے معلوم ہوا کہ اصلاح میں بھی مراتب ہیں یعنی دوسروں کی اصلاح مرتب ہوتی ہے اپنے نفس کی اصلاح پر پس اپنی اصلاح مقدم ہے دوسروں کی اصلاح پر لہذا اسی شخص سے دوسروں کی اصلاح ہو سکتی ہے جو پہلے اپنی اصلاح کر چکا ہو اور جس شخص کی خود اپنی اصلاح نہیں ہوئی اس سے دوسرے کی بھی اصلاح مشکل ہے۔

صاحب روح المعانی نے ایک موقع پر باب الاشارۃ فی الآیات میں لکھا ہے کہ آیت سے نکلا کہ اپنا نفس چونکہ سب سے زیادہ اپنے سے قریب ہے لہذا اصلاح کا کام اسی سے شروع کرنا چاہیئے۔

اور اس مقام پر یہ اشعار لائے ہیں ؎

اِبْدَأْ بِنَفْسِكَ فَانْهَهَا عَنْ غَيِّهَا فَاِذَا انْتَهَتْ عَنْهُ فَاَنْتَ حَكِيْمُ

اصلاح اپنے نفس سے شروع کرو یعنی پہلے اسکو اسکی برائیوں سے روکو ۔ جب وہ اس سے رک جائے تب تم حکیم ہوگے

فَهُنَاكَ يُسْمَعُ مَا تَقُوْلُ وَيُقْتَدٰى بِالْقَوْلِ مِنْكَ وَيَنْفَعُ التَّعْلِيْمُ

یعنی اسوقت جو بات تم دوسروں سے کہو گے وہ سنی جائیگی اور تمہارے نصیحت کی اتباع کیجائیگی اور اب تمہاری تعلیم نفع دے گی

میں کہتا ہوں کہ اپنے نفس سے ابتدا کرنے کو علماء آیات سے اشارۃً نکالتے ہیں۔ حالانکہ قُوا اَنْفُسَکُمْ وَاَهْلِیْکُمْ میں تو آیت کا مدلول ہی یہ ہے کہ اپنے نفس سے اصلاح کی ابتدا کرو۔ (کیونکہ یہاں تو اَنْفُسَکُمْ کا لفظ ہی موجود ہے اور اَهْلِیْکُمْ سے مقدم بھی ہے) لہذا ان اشعار کو اس آیت کی تفسیر میں لانا زیادہ چسپاں اور موقع کے مناسب ہے۔

(راقم کہتا ہے کہ صاحب رُوح نے تو یہاں دو ہی شعر نقل کئے ہیں۔ ناظرین کی تنشیط طبع کے لئے ہم اس سلسلہ کے دو شعر اور لکھتے ہیں جو الترغیب والترھیب للمنذری کے باب الترھیب من ان یعلم ولا یعمل بعلمہ کے حاشیہ میں مذکور ہیں۔ وھو ہذا :-

یَا اَیُّهَا الرَّجُلُ الْمُعَلِّمُ غَیْرَهٗ ہَلَّا لِنَفْسِکَ کَانَ ذَا التَّعْلِیْمُ
(بمعنی ہذا)

اے وہ شخص جو دوسروں کو تعلیم دینے کیلئے چلا ہے خود اپنے آپ کو تعلیم کیوں نہیں دیتا۔

تَصِفُ الدَّوَاءَ لِذِی السِّقَامِ وَذِی الضَّنَا کَیْمَا یَصِحَّ بِهٖ وَاَنْتَ سَقِیْمُ

تو دوسرے بیماروں اور مریضوں کیلئے تو نسخے بیان کرتا ہے تاکہ وہ استعمال کر کے تندرست ہو جائیں درحال یہ ہے کہ تو خود مریض ہے

اور پھر اس کے بعد یہ اشعار ہیں :-

اِبْدَأْ بِنَفْسِکَ فَانْهَهَا عَنْ غَیِّهَا فَاِذَا انْتَهَتْ عَنْهُ فَاَنْتَ حَکِیْمُ

پہلے اپنے سے اصلاح کا کام شروع کرو اور اپنے نفس کو برائیوں سے بچاؤ جب وہ بچ جائے تب تم حکیم ہو جاؤ گے۔

فَهُنَاکَ یُقْبَلُ مَا وَعَظْتَ وَیُقْتَدٰی بِالْعِلْمِ مِنْکَ وَیَنْفَعُ التَّعْلِیْمُ

یعنی اب اسوقت تمھاری نصیحت قبول کی جائے گی اور تمھارے علم کا اتباع کیا جائے گا اور تمھاری تعلیم نافع ہوگی۔

اسی سلسلہ میں ایک اور بات یہ سمجھئے کہ بعض نیک لوگ جو اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت دینی ہی اصول پر دینا چاہتے ہیں تو کبھی دیکھا جاتا ہے کہ ان کی اولاد بھی ٹھیک نہیں ہوتی تو اسکے کچھ اسباب ہیں مثلاً ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ آپ تو ان کو دینی تعلیم پر سے چلنا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ کی تعلیم کے خلاف کوئی دوسرا بھی ان کو تعلیم دیتا رہتا ہے یعنی ان کے کچھ دوست واحباب ہوتے ہیں جن کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے ان لوگوں کا اس پر پورا پورا اثر ہوتا ہے اور وہ درست نہیں ہوتے۔ آپ یہ سوچ سوچکر پریشان ہوتے ہیں کہ میری تربیت کا یہ اثر کیوں نہیں قبول کر رہا ہے آخر وہ قبول کس طرح کرے ان کے دل میں تو گھر کوئی اور کئے ہوتا ہے۔

یا اس کی وجہ کبھی یہ ہوتی ہے کہ ابتداء عمر میں پہلے خود باپ بھی اپنی اصلاح نہیں کئے ہوتا اور بدعمل رہتا ہے تو بعد میں گو وہ تائب ہو کر اپنے کو درست کرلیتا ہے لیکن اس کی پہلی زندگی اس کی اولاد کے سامنے رہتی ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ اس سے بدعقیدہ ہو چکے ہوتے ہیں اور ان کی یہ بدعقیدگی ان کے توبہ کے بعد تک قائم رہتی ہے اس لئے والدین کی تعلیم وتربیت کا کچھ بھی اثر قبول نہیں کرتے۔ لہٰذا انسان کو اپنی اولاد کی جانب سے بھی ہمیشہ کھٹکنا ہی چاہئے کیونکہ اکثر یہ لوگ اپنے ماں باپ کے معتقد نہیں ہوتے لیکن جھوٹا سچا اعتبار قائم کرکے وہ ان سے اپنی اغراض پوری کرانے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

میں اپنی طرف سے اگر یہ سب باتیں کہتا تو ہر شخص کو اس پر کلام کرنے اور اعتراض کرنے کا حق تھا لیکن میں تو صرف اللہ تعالیٰ کے کلام کی شرح ایک اتنے بڑے مفسر کی تفسیر سے نقل کرتا ہوں۔ اگر لوگوں کو راہ دکھانا ہی چاہتے ہیں تو قرآن وحدیث سے کیوں نہیں دکھاتے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک حق بات اگر کوئی شخص کہہ رہا ہے تو اسکو کیوں نہیں مانا جاتا کیا صرف اس لئے کہ اس کی بات کو کمتر اور اس شخص کو غیر معروف سمجھ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے حالانکہ وہ جو کچھ بیان کررہا ہے قرآن وحدیث سے بیان کررہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب یہ طریقہ اللہ ورسول کا موجود ہے تو پھر ہر شخص جو آجکل تعلیم تعلیم پکار رہا ہے اس پر کیوں نہیں آتا ہمارے پاس کیا نہیں ہے؟ ہمارے پاس سب کچھ ہے جب ہمارے دین کی تکمیل ہو چکی تو سب چیز اس میں مکمل ہو چکی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم نے سب کچھ فراموش کردیا ہے اور فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ کے مصداق ہوگئے ہیں۔

یہ بات اگر کسی کو ناگوار اور تلخ معلوم ہو تو وہ مجھے معاف کرے لیکن میں جو بات اس وقت کہنا چاہتا ہوں وہ حق ہے اور بالکل صحیح ہے مسلمانوں کی بربادی ان کے گھر سے ہے باہر کے لوگ تو ان کو ملتے ہیں گھر کے لوگ نہیں مانتے۔ باہر ان کی تعلیم لوگ جاری کرتے ہیں۔ گھر کے لوگ نہیں کرتے۔ ہر شخص کا قریب قریب یہی حال ہے۔ چنانچہ علم بھی آج دوسروں ہی کے لئے پڑھا پڑھایا جاتا ہے۔ اپنے گھر والوں کے لئے اور اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے گھر والوں سے تو ٹھیک طور سے بیان بھی نہیں کیا جاتا۔

چنانچہ اسی کے نتیجہ میں دیکھا جاتا ہے کہ جب اپنے گھر کی اصلاح نہیں کی جاتی اور اپنے اہل وعیال کی تعلیم وتربیت سے غفلت برتی جاتی ہے تو وہی اولاد سمجھ دار ہو کر والدین کے لئے

اسی دنیا میں وبال جان اور سوہان روح ہو جاتی ہے چنانچہ ایسے ایسے واقعات نے جاتے ہیں کہ نالائق اولاد کی کسی حرکت (مثلاً چوری وغیرہ) کے سبب والدین بلکہ کبھی تو پوری قوم کو انتہائی لت اٹھانی پڑتی ہے حتیٰ کہ بعض تو اسکو نہ برداشت کرکے زہر وغیرہ تک کھا لیتے ہیں۔ تو یہ روز بد یکھنا اسی کا ثمرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا اور رسول اللہ صلی اللہ لیہ وسلم کے ارشاد فالرجل راع علی اھلہ پر اصلاً توجہ نہیں کی گئی۔

آج مسلمانوں کی زیادہ تر ضیق اور پریشانی خود اپنے گھر سے ہے کہ ان کی اولاد ٹھیک نہیں ہے اور اگر کوئی باپ کچھ احساس والا ہے تو اس کے لئے تو یہ دنیا ہی جہنم ہو جاتی ہے۔ بڑھاپے میں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملنے کا وقت ہوتا ہے اسکو اولاد کی فکر دامنگیر رہتی ہے کہ ہمارے بعد ان کا کیا حشر ہو گا۔ اور اگر اولاد ٹھیک ہو اور ان سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں تو مرنے کا بھی لطف ہو کہ ان سب کی طرف سے بے فکر ہو کر خالص توجہ اللہ تعالیٰ کی جانب ہو جائے۔

اب بھلا بتلایئے کہ عوام کی اصلاح ہو تو کیسے ہو۔ جب کہ اصل طریقہ ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ خدا اور رسول کے بتلائے ہوئے طریقہ کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ عقل جسکو کہتی ہے اسکو چھوڑ دیا گیا ہے۔ ہر شخص بس اندھا دھند کام کر رہا ہے۔ علی وجہ البصیرت کام کرنے والے بہت کم ہیں۔ یا یوں کہئے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں کام کرنے والے بہت کم ہیں۔ مفسرین نے اس آیۃ کے متعلق جو کچھ کلام کردیا ہے وہ بہت کافی ووافی تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کا وہ بیان بھی آجکل کے لوگوں کے لئے کافی نہ ہوتا کیونکہ آجکل کے لوگوں کے سامنے جب تک بہت سے الفاظ نہ بیان کئے جائیں بات ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ چنانچہ میں نے اتنا بیان کردیا ہے اور اگر کسی کو میرے یہ الفاظ بھی کافی نہ ہوں کم معلوم ہوں تو وہ اپنی طرف سے اور الفاظ بڑھالے۔

باقی اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو اتنا ہی ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا جو نہ تو کوئی پوری سورت ہے اور نہ کوئی لمبی آیۃ ہے بلکہ آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔ بس اسی پر کلام کو ختم کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرما دیں۔

اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَبَارِكْ لَنَا فِيْٓ اَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُلُوْبِنَا وَاَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔

فتنۂ اموال واولاد

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ۔ یعنی اے ایمان والو تمھاری بعض بیویاں اور اولاد تمہارے دشمن ہیں سو تم ان سے ہوشیار رہو۔ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ تمہارے اموال اور اولادیں تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ازواج واولاد کو عدو فرمایا ہے اور ان سے حذر کرنے اور ہوشیار رہنے کا امر فرمایا ہے بخلاف مال کے کہ اسکو فتنہ فرمایا، عدو نہیں۔ یہ اسلئے کہ مال تو کوئی صاحب اختیار شئی نہیں ہے کہ عداوت کر سکے۔ ہاں اسکے ذریعہ سے خود صاحب مال طغیان میں پڑجاتا ہے اور مال کے حاصل کرنے میں حلال وحرام جائز وناجائز کی تمیز نہیں کرتا اور اللہ کی محبت پر اسکی محبت کو ترجیح دیتا ہے بخلاف اولاد کے کہ وہ صاحب اختیار ہیں۔ مقابلہ اور مخالفت پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو ان سے بچنا اور احتراز کرنا مشکل امر ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان سے چوکنے و ہوشیار رہنے اور حذر کرنے کا امر فرمایا جیسا کہ ھُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْھُمْ میں منافقین سے حذر کا امر فرمایا ہے۔

علماء نے فرمایا ہے کہ انکی عداوت یہی ہے کہ یہ لوگ انسان کو طاعات اور اُمور آخرت کے کرنے سے مانع ہوجاتے ہیں نیز کبھی یہ لوگ اسکو اپنے دنیوی نفع کیلئے کسب حرام اور ارتکاب معاصی پر مجبور کر دیتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ میری امت پر ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ انسان کی ہلاکت اپنے بیوی بچوں کے ہاتھوں ہوگی اسطور پر کہ وہ لوگ اسکو فقر وتنگدستی پر عار دلائیں گے اور یہ شخص اسکی وجہ سے بری راہ کسب کی اختیار کریگا اور خود کو ہلاک کرے گا یا کبھی ایسا بھی ہوگا کہ بدون انکے مطالبہ کے خود انسان ہی کو اپنے بال بچوں کی محبت آمادہ کریگی کہ وہ اسکے سامنے بھی نیز اسکے مرنے کے بعد بھی خوش عیشی کی زندگی بسر کریں۔ بس اُنکی خاطر مال جمع کرنے کے چکر میں پڑکر خود کو ہلاک کرے گا۔

آیت کا شان نزول بھی اسی قسم کا ایک واقعہ ہوا تھا ترمذی وغیرہ نے ابن عباسؓ سے روایت نقل کیا ہے کہ مکہ کی ایک قوم مسلمان ہوئی اور انھوں نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں (دین حاصل کرنے کے لئے) حاضر ہوں اور چندے قیام کریں مگر بیوی بچوں نے انکو اپنے سے الگ نہیں ہونے دیا۔ بالآخر جب کچھ دنوں کے بعد یہ لوگ حاضر خدمت اقدس ہوئے تو دیکھا کہ اور ساتھی دین میں ان سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں اس پر ان لوگوں نے چاہا کہ اپنے بیوی بچوں کو سزا دیں تو آیت نازل ہوئی جس کا حاصل یہ تھا کہ بلاشبہ بعض دفعہ یہ لوگ دینی دشمن ثابت ہوتے ہیں لہذا ان سے ہوشیار رہنا چاہئے۔ تاہم اس دفعہ انکو معاف کردو کہ منشا اسکا ہم سے عداوت نہ تھی بلکہ تم سے محبت تھی اور ہمارے نزدیک محبت کی قدر ہے لہذا تم انکو تو معاف کردو اور ان کی محبت سے ہماری محبت کا سبق حاصل کرو۔ (از ناقل)

سعادتِ حقیقیہ

اور

وصیتِ نبویہ

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہٗ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سعادتِ حقیقیہ

اور اُسکے حاصل کرنے کا طریقہ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

صاحب مشکوٰۃ نے احمدؒ ابوداؤدؒ ترمذی اور ابن ماجہ کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے وہ یہ کہ حضرت عرباض بن ساریہؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہمکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور اسکے بعد آپ نے وعظ فرمایا' وعظ ایسا بلیغ[1] اور مؤثر[2] تھا کہ اسکی وجہ سے سامعین[3] کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور انکے قلوب دہل گئے۔ یہ منظر دیکھکر ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ تو ودائی[4] وعظ معلوم ہوتا ہے لہٰذا آپ ہم لوگوں کو کچھ وصیت[5] فرمایئے آپ نے فرمایا کہ میں تم کو اللہ تعالیٰ کے تقویٰ اور اپنے امیر کی سمع وطاعت[6] کی اگرچہ وہ عبد حبشی ہی کیوں نہ ہو وصیت کرتا ہوں اور یہ اسلئے کہ تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہیگا تو وہ اختلافات کثیرہ دیکھے گا لہٰذا اسوقت میری سنت اور خلفاء راشدین ومہدیین[7] کی سنت کو لازم پکڑنا اور اسی سے تمسک کرنا اور اسکو دانتوں سے مضبوط پکڑے رہنا اور محدثات[8] امور سے خود کو بچانا اس لئے کہ ہر محدَث بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

یہ تو اصل حدیث کا مضمون ہوا اب دیکھئے علماء اسکی شرح میں کیا فرماتے ہیں۔ صاحب مرقاۃ نے بعض محققین سے نقل کیا ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص میری وصیت کو قبول کریگا یعنی اللہ کے تقویٰ کو لازم پکڑے گا اور اس پر جو شخص والی مقرر کیا جائے اسکی اطاعت کریگا اور شر وفتنہ کو برانگیختہ[9] نہیں کریگا تو میرے بعد جو اختلافات اور کثرتِ آراء[10] اور فتن[11] وغیرہ پیش آئینگے تو یہ شخص ان حالات میں بھی امن ہی سے رہیگا۔

علامہ سید جمال الدین رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ حاصل اس ارشاد کا یہ ہوا کہ میری اس وصیت کو سنو اور اس پر عمل کرو۔ کیونکہ میرے بعد بڑے بڑے فتنے پیش آنے والے ہیں جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ اسوقت ان سے خلاصی[12] کی سبیل[13] بجز میری اس نصیحت پر عمل کرنے کے اور کوئی نہ ہوگی۔

میں کہتا ہوں کہ شاید اسی لئے حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تَمَسَّکُوْا بِہَا فرمانے کے بعد وَعَضُّوْا عَلَیْہَا بِالنَّوَاجِذِ بھی ارشاد فرمایا ہے کیونکہ اسکے سوا مخلص[14] نہ ہوگا یعنی فتن سے

[1] واضح
[2] اثر کرنیوالا
[3] سننے والے
[4] رخصت کرنے والا
[5] بہت زیادہ نصیحت
[6] بات سننا اور حکم ماننا
[7] ہدایت پانے والے
[8] نئی نئی باتوں سے
[9] ابھارنا
[10] رائے کی کثرت
[11] فتنہ کی جمع یعنی فساد
[12] نجات
[13] صورت
[14] چھٹکارا

محفوظ رہنے کا ذریعہ بجز اتباع سنت کے اور کچھ نہ ہوگا۔

یہاں ایک بات اور سمجھئے کہ جس طرح سے فتن سے حفاظت کا سبب اتباع سنت ہے اسی طرح بعض دوسرے امور سے اجتناب کرنا بھی ضروری ہے ورنہ تو متبع سنت ہونے کے باوجود آدمی کبھی فتنہ میں پڑ جاتا ہے۔ بس یوں کہنا چاہئے کہ سنت کی تکمیل ہی ان امور کی رعایت کے بغیر نہیں ہوسکتی اس لحاظ سے وہ بھی گویا اتباع سنت ہی کا جزو ہے۔ اسی کو صاحب مرقاۃ لکھتے ہیں کہ کہ تحصیل السعادات الحقیقیۃ بعد مجانبۃ کل صاحب یفسد الوقت وکل سبب مفتن للقلب منوط باتباع السنۃ یعنی ہر اس ساتھی سے جو وقت کو برباد کرنیوالا ہو اور ہر اس سبب سے جو قلب کو مفتون کرنیوالا ہو، دوری اختیار کرنے کے بعد سعادت حقیقیہ کا حاصل کرنا اتباع سنت کیساتھ وابستہ ہے یعنی جب اتباع سنت کیجائیگی تب ہی وہ سعادت حاصل ہوسکے گی

میں کہتا ہوں کہ یہ بالکل صحیح ہے کہ سعادت حقیقیہ یعنی فلاح دارین اور وہ بھی صوری اور نہیں بلکہ حقیقی کامیابی اور کامل سعادت موقوف ہے اتباع سنت پر۔ اسی لئے آپؐ نے ان صحابی کی درخواست پر ایسی وصیت فرمائی جو قیامت تک کے لوگوں کے حق میں سعادت حقیقیہ کی تحصیل کیلئے بمنزلہ کلید کے تھی یعنی آپؐ نے یہ فرمایا کہ تم کو دو چیزوں کی وصیت کرتا ہوں۔ ایک اللہ تعالیٰ کا تقویٰ۔ دوسری اپنے امیر کی سمع و طاعت اختیار کرنا یعنی اسکا حکم سننا اور اسکی اطاعت کرنا اور ان دونوں امور کا تعلق سعادت دارین سے اس طرح پر ہے کہ جب آدمی میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ ہوگا تو اسکی وجہ سے محرمات شرعیہ سے اجتناب کریگا اور مامورات کو ادا کریگا۔ اللہ تعالیٰ سے محبت اور نسبت حاصل کریگا۔ جسکی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا اسکا قرب اور اسکی جنت اس کو ملیگی ان سب امور کا فلاحِ آخرت سے تعلق ظاہر ہے۔

اسی طرح سے جب امام وقت اور اپنے امیر کے ساتھ سمع و طاعت کے طور پر پیش آئیگا تو انجام اسکا یہ ہوگا کہ دنیا میں امن وامان قائم رہیگا۔ کیونکہ اگر امام کی طاعت نہ کی گئی تو امیر چونکہ با اختیار اور صاحب اقتدار ہوتا ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ وہ اسکی وجہ سے سختی کا برتاؤ کرے مثلاً قید و بند میں اسے رکھدے جس کا فتنہ ہونا اور فلاح کے خلاف ہونا ظاہر ہے اور ایسی زندگی کو جو فتنہ و فساد سے پُر ہو کوئی احمق بھی فلاح والی زندگی نہیں کہہ سکتا۔

پھر یہ کہ سمع و طاعت کا حکم بھی اسلئے فرمایا کہ عالم کا نظام اسی سمع و طاعت پر قائم ہے اور اسی کی وجہ سے باقی رہیگا۔ ورنہ اگر بات میں کوتاہی کی گئی یعنی سمع و طاعت کو درمیان سے نکال

دیا گیا تو اولاد والدین کی نافرمان ہو جائیگی۔ رعایا بادشاہ کے خلاف کرنے ہی کو فخر سمجھے گی۔ طلباء اساتذہ کا مقابلہ اور ان سے مطالبہ کرینگے اور عجب نہیں کہ ایک مرید بھی پیر ہی سے مطالبہ کرنے لگ جائے ان امور کا فتنہ و فساد ہونا ظاہر ہے۔ بلکہ اس زمانے میں تو مشاہد بھی ہے۔ چنانچہ ان حالات کے ساتھ جیسی کچھ فلاحِ دنیا آج لوگوں کو میسر ہے معلوم ہے۔

نیز اگر سمع وطاعت پر عمل نہ کیا جائے تو اس کے اثرات متعدی ہوتے چلے جائیں گے چنانچہ آج اگر آپ اپنے اکابر کو نہ مانیے گا اور انکا احترام فوت کیجئے گا تو کل کو آپکے اصاغر بھی آپکو نہ مانیں گے اور اسمیں کوئی شبہ بھی نہیں۔ ع۔ ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے۔

امت کے یہ سارے حالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھے اسلئے آپ نے شفقۃً علی الامۃ ورحمۃً علیہم ایسی وصیت فرمائی جو کہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ چنانچہ اہلِ سعادت کیلئے سعادات حقیقیہ تک پہونچنے کا یہی ذریعہ ہے، اور ہر زمانہ میں صلحائے امت نے اسے سمجھا ہے اور علماء ربانی اور مشائخ حقانی نے لوگوں کو اسے سمجھایا ہے۔

سعادت حقیقیہ کی تحصیل مطلوب ہے۔ اسی کے لئے حضرات انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے اور انکی نیابت میں اولیاء نے بھی یہی کام کیا اور لوگوں کو بتایا کہ دو چیزیں ہیں سعادت اور شقاوت، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ اور فرماتے ہیں وَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ۔ آخرت میں اہل سعادات کا مقام جنت ہے اور اہل شقاوت کا ٹھکانا دوزخ ہے اور دنیا میں اہل شقاوت کا نصیب معصیت ہے اور اہل سعادت کا حصہ طاعت اور اتباع سنت ہے۔

شریعت نے سعادت کی مقصودیت کو جب بیان کیا تو اسکے ساتھ ہی ساتھ اسکے حصول کا طریقہ بھی بتایا جیسا کہ حدیث شریف اور اسکی شرح میں آپ نے ملاحظہ فرمایا۔

باقی صاحب مرقات نے یہ جو فرمایا کہ سعادات حقیقیہ کی تحصیل اتباع سنت کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ صحیح ہے مگر کب؟ جبکہ اس سے پہلے دو چیزوں کا اور اہتمام رکھا جائے۔ ایک تو یہ کہ ہر اس صاحب (ساتھی اور ہمنشین) سے دوری اختیار کیجائے جو اسکے وقت کو فاسد کردے۔ اور دوسرے یہ کہ ہر اس سبب سے اجتناب کیا جائے جو اسکے قلب کو مفتون کرنے والا ہو۔

میں کہتا ہوں کہ یہ دونوں ایک ہی ہیں یعنی ساتھی جو وقت کو فاسد کرنے والا ہو وہ بھی منجملہ ان اسباب کے ایک سبب ہے جو قلب کو مفتون کرتا ہے بلکہ سب سے بڑا سبب ہے پس

جس طرح سے کہ یہ وقت کو فاسد کرتا ہے اسی طرح سے قلب کو بھی مفتون کرنے والا ہے اسطرح سے جو اسباب کہ مُفتِنِ[1] قلب ہوں گے ضروری ہے کہ وہ وقت کے فاسد کرنے والے بھی ہوں پس اسباب مشوشہ[2] قلب میں سے صاحب و مصاحب[3] بھی ہیں۔ اس لئے اس سے مجانبۃ[4] اور احتراز تحصیل سعادت کے لئے اہم مہمات[5] سے ہے اور یہ عین اتباع سنت ہے۔

اور یوں تو اسباب مشوشہ[6] قلب بہت ہیں مبتلی بہ اسکو سمجھتا ہے منجملہ ان کے کسی سے عداوت و دشمنی یا بہت زیادہ تعلق اور دوستی بھی ہے۔

آدمی کسی کی عداوت کیوجہ سے اپنا بہت نقصان کرلیتا ہے۔ مال کا نقصان۔ وقت کا نقصان۔ قلب کا نقصان بلکہ تن بدن تک کا نقصان کرلیتا ہے جیسا مقدمہ بازوں کے حالات میں اسکا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح سے کسی سے تعلق اور دوستی جو دین کے لئے نہ ہو وہ بھی انسان کے وقت کو بکھیڑن[7] میں برباد کردیتی ہے اور اگر کوئی شخص کسی فاجر فاسق کی صحبت میں پڑ گیا تب تو وقت اور مال کے ضیاع[8] کے علاوہ قلب و دین کا بھی ضیاع ہوجاتا ہے۔

چنانچہ آپ کے یہ نوجوان جو بگڑتے ہیں تو کس طرح سے؟ کیا مولوی لوگ انکو خراب کردیتے ہیں؟ نہیں بلکہ اپنی بری صحبت اور خراب ماحول کیوجہ سے خراب ہوتے ہیں بددینوں کی صحبت کیوجہ سے دین سے آزاد ہوجاتے ہیں۔ اخلاق سے آزاد ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ انسانیت سے آزاد ہوجاتے ہیں۔ اور بعضوں کا حال تو اسقدر ناگفتہ بہ[9] ہوجاتا ہے کہ وہ ایسی حالت کو پہنچ جاتے ہیں کہ زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ دین تو برباد کیا ہی تھا دنیا کا بھی کوئی لطف انھیں حاصل نہیں ہوپاتا۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذَالِكَ هُوَالْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ۔

آپ سے پوچھتا ہوں یہ کس وجہ سے ہوتا ہے؟ اسی چیز کی وجہ سے جس پر یہ حضرات تنبیہ فرما رہے ہیں کہ اتباع سنت سے پہلے اسکا اہتمام کرو کہ بری صحبت کیوجہ سے تمہارا وقت اور تمہارا قلب فاسد اور مفتون نہ ہونے پائے۔

وقت کو فساد سے بچانا شرعاً مطلوب ہے اس لئے کہ یہی وقت سعادات حقیقیہ کے حاصل کرنے کا ظرف[11] ہے۔ اسی کے اندر آدمی ترقی کرتا ہے اور مراتب دین کے ہوں یا دنیا کے حاصل کرتا ہے۔ تمام کمالات وقت ہی کی قدر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس کو کمال کے تحصیل کی فکر ہے اسکو وقت کی بھی قدر ہوگی اور جو وقت کا ناقدرا ہے وہ کمالات سے

[1] فتنہ میں ڈالنے والا
[2] پریشانی میں ڈالنے والا
[3] دوست، ساتھی
[4] دوری
[5] نہایت ضروری
[6] تشویش میں ڈالنے والا
[7] جھگڑا، بکھیڑا
[8] ضائع، بربادی
[9] برا ہونا
[10] رکھنے والا
[11] محل

بھی عار ہی ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ و رسول نے بھی وقت کی قدر کو پہچنوایا ہے اور اپنے اپنے زمانہ میں مشائخ نے بلکہ تمام عقلاء نے اسکا اہتمام کیا ہے۔

ایک بزرگ جا رہے تھے دیکھا کہ ایک شخص بیکار بیٹھا ہوا ہے انھوں اسکو سلام نہیں کیا اور گذر گئے پھر جب واپس ہوئے تو دیکھا کہ انگلی سے زمین کرید رہا ہے انھوں نے اسکو سلام کیا لوگوں نے دریافت کیا کہ حضرت پہلی بار سلام نہ کرنے اور دوسری بار میں سلام کرنے میں کیا راز تھا سمجھ میں نہیں آیا۔ فرمایا بات یہ ہے کہ پہلی دفعہ وہ خالی بیٹھا ہوا تھا چونکہ کوئی مشغلہ نہیں تھا اس لئے شیطان اس سے زیادہ قریب تھا لیکن بعد میں جب وہ زمین کریدنے کے شغل میں لگ گیا تو گو وہ مشغلہ بھی لغو تھا تاہم اس کی مشغولی کی وجہ سے شیطان اس سے زیادہ دور ہو گیا تھا اسلئے میں نے اسکو سلام کیا۔

دیکھا آپنے بیکاری اہل طریق کے نزدیک اسدرجہ مضر اور معیوب چیز ہے۔ اسی لئے میں ان نوجوانوں سے کہتا ہوں کہ تم سے اگر دین نہیں سپرتا تو دنیا ہی کما کر دکھلاؤ۔ میں اس نوجوان کو بھی دیکھکر خوش ہوتا ہوں جسے دیکھتا ہوں کہ دنیا ہی کے کام میں ہوشیار ہے۔ کیونکہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کی طرف سے آسودہ اور مطمئن رہے گا تو دین بھی پختہ رہیگا ورنہ اسکے دین کا بھی اعتبار نہیں۔ ع

پراگندہ روزی پراگندہ دل

ایسے لوگوں کو جنھیں دنیا ہی کمانی آجائے اور اپنے معاش کیجانب سے وہ مطمئن ہوں غنیمت سمجھتا ہوں۔ زیادہ ضیق ایسے لوگوں کو دیکھکر ہوتی ہے جو دین میں بھی نکمے اور دنیا کے اعتبار سے بھی ناکارہ ہوتے ہیں جنکی وجہ سے والدین پر بار اور کلاًّ عَلَى النَّاسِ کے مصداق ہوتے ہیں۔ انکو صرف کھانے اور سونے سے مطلب، نہ یہ وقت کی قدر کو جانتے ہیں نہ اپنے ہی کو پہچانتے ہیں جسکا انجام یہ ہوتا ہے کہ بالکل مہمل ہو کر رہ جاتے ہیں پھر اگر خدانخواستہ کسی کا ساتھ پکڑ لیا تو اور بھی تباہ ہوئے رات ہوئی سنیما چلے گئے، رات کو جاگے تو دن بھر پڑ کر سوئے۔ اب ظاہر ہے کہ جنکے لیل و نہار کے یہ مشاغل ہوں وہ کیا کمال حاصل کر سکتے ہیں

حضرت مولانا سے سنا فرماتے تھے کہ یورپ میں انگریزوں نے قانون بنا دیا ہے کہ طلبہ سیاست میں حصہ نہیں۔ سنا آپ نے جہاں سے لوگوں نے سیاست سیکھی ہے وہاں کا یہ حال ہے کہ طلبہ کے لئے سیاسیات میں شرکت کو پسند نہیں کیا گیا۔ یہ اس لئے کہ عقلمند لوگ ہیں جانتے تھے کہ تحصیل علم کے زمانے میں اگر دوسری جانب مشغولی ہوگی تو علم سے رہ جائیں گے اور اپنا تمام وقت انھیں سب لغویات میں صارئع کر لیں گے

حاشیہ: ۱ مشغلہ، کام ۲ بزرگی ۳ عیب دار ۴ جہنم ۵ روزی ۶ نکمی ۷ ناکارہ ۸ بوجھ ۹ لوگوں پر بوجھ ۱۰ بیکار

البتہ تو تم ہوتے ہی ہیں مدرسہ میں باتیں انھیں کوئی سکھاتا نہیں اور جہاں اس قسم کی باتیں سکھلائی جاتی ہیں وہاں یہ لوگ جاتے نہیں۔

بہرحال وقت چونکہ ظرف اور محل ہے اسی کے اندر کمالات کی تحصیل کیجاتی ہے۔ اسی میں اعمال صالحہ ادا کیے جاتے اسلئے اسکا تحفظ اور اسکو ضیاع سے بچانا بہت ضروری ہوا۔ اسی لئے اتباع سنت سے پہلے اسکے اہتمام کو بیان فرمایا کیونکہ بدون اسکے سعادات حقیقیہ کی تحصیل نا ممکن ہے۔

آگے صاحب مرقاۃ نے اتباع سنت کی جو تشریح فرمائی ہے اور اسپر جو آثار مرتب ہوتے ہیں انکی جو توضیح فرمائی ہے وہ بہت ہی خوب ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

لِاَنَّ تَحْصِیْلَ السَّعَادَاتِ الْحَقِیْقِیَّۃِ ... مَنُوْطٌ بِاِتِّبَاعِ السُّنَّۃِ بِاَنْ یَّمْتَثِلَ الْاَمْرَ عَلٰی مُشَاهَدَۃِ الْاِخْلَاصِ وَیُعْظِمُ النَّهْیَ عَلٰی مُشَاهَدَۃِ الْخَوْفِ۔

یعنی اتباع کا مطلب یہ ہے کہ اوامر شرعیہ کا امتثال خلوص کے مشاہدہ کے ساتھ کرے اور منہیات سے اجتناب اس طرح سے کرے کہ اسکے اندر خوف کا مشاہدہ کیا جائے یعنی ممنوعات شرعیہ سے ایسا ڈرے گویا کہ اسکے ارتکاب پر جو عذاب و سزا مقرر ہے اسکو دیکھ رہا ہے۔ آگے اور ترقی کرکے فرماتے ہیں کہ:۔

بَلْ بِاقْتِفَاءِ آثَارِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ جَمِیْعِ مَوَارِدِہٖ وَمَصَادِرِہٖ وَحَرَکَاتِہٖ وَسَکَنَاتِہٖ وَیَقْظَتِہٖ وَمَنَامِہٖ حَتّٰی یُلْجِمَ النَّفْسَ بِلِجَامِ الشَّرِیْعَۃِ وَیَتَجَلّٰی فِی الْقَلْبِ حَقَائِقُ الْحَقِیْقَۃِ بِتَصْقِیْلِہٖ مِنْ مَقَابِحِ الْاَخْلَاقِ وَتَنْوِیْرِہٖ بِاَنْوَارِ الذِّکْرِ وَالْمَعْرِفَۃِ وَالْوِفَاقِ وَتَعْدِیْلِہٖ بِاِجْرَاءِ جَمِیْعِ حَرَکَاتِ الْجَوَارِحِ عَلٰی قَانُوْنِ الْعَدْلِ حَتّٰی یَحْدُثَ فِیْہِ هَیْئَۃٌ عَادِلَۃٌ مَسْنُوْنَۃٌ مِنْ آثَارِ الْفَضْلِ یَسْتَعِدُّ بِقَبُوْلِ الْمَعَارِفِ وَالْحَقَائِقِ وَیَصْلُحَ اَنْ یُّنْفَخَ فِیْہِ رُوْحُ اللّٰہِ الْمَخْصُوْصِ بِسُلَالَۃِ اَحْسَنِ الطَّرَائِقِ۔

(مرقات ص ۲۳ ج ۱)

یعنی اتباع سنت سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ بس اوامر کو بجالائے بلکہ یہ ہے کہ اسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کی ایک فکر اور دھن پیدا ہو جائے۔ چنانچہ آپ کے جملہ

حرکات و سکنات حتیٰ کہ نوم و بیداری سب ہی چیزوں میں آپ کا اتباع کرے یہاں تک کہ اپنے نفس کو گویا شریعت کی لگام ہی پہنا دے تاکہ وہ اسی کے اشارہ پر چلے اور اسی کے ارشارہ پر رکے، اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قلب اعلیٰ اخلاق کی قلعی سے مصقل[1] ہوکر اور ذکر و معرفت کے نور سے منور[2] ہوکر بالکل مجلّی[3] ہوجاتا ہے اور پھر اسکے بعد (بفحوائے حدیث اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ) تمام جوارح قانون عدل (یعنی شریعت) پر عمل کرنے لگتے ہیں اور قلب کے ساتھ ساتھ وہ بھی عادل ہوجاتے ہیں پھر اسکی وجہ سے انسان کے قلب میں ایک ہیئۃ[4] عادلۃ[5] مسنونۃ[6] پیدا جاتی ہے (جسکو نسبت بھی کہا جاتا ہے) اور یہ فضل الٰہی کے آثار میں سے ایک اثر ہوتا ہے۔ اس ہیئت اور نسبت کے اندر معارف و حقائق کے قبول کرنیکی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے اور اس امر کی استعداد پیدا ہوجاتی ہے کہ اب اسکے اندر اللہ تعالیٰ کی وہ روح پھونک دی جائے جو کہ مخصوص ہے ان حضرات کے ساتھ جو احسن طریق سے راہ کو طے کرنے والے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ جس طرح سے قانون عدل پر چلنے کیوجہ سے قلب میں ایک ہیئۃ عادلۃ مسنونۃ پیدا ہوجاتی اور وہ ہر قسم کی صلاح کیلئے مثمر[7] ہوتی ہے اسی طرح سے اسکے برخلاف قانون غیر عادلہ پر چلنے کیوجہ سے بھی انسان کے قلب میں ایک ہیئۃ غیر عادلۃ غیر مسنونۃ پیدا ہوجاتی ہے جس کے ثمرات میں سے فتنہ و فساد۔ نزاع و خلاف وغیرہ امور ہیں جیسا کہ ہم اس زمانہ میں اسکا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ طالب علم ہیں اور شاگرد ہیں مگر اپنے اساتذہ ہی سے مطالبہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ مطالبہ بڑوں کو چھوٹوں سے کرنا چاہئے۔ علم کا مطالبہ۔ عمل کا مطالبہ۔ اخلاق کا مطالبہ۔ مگر دیکھا یہ جا رہا ہے کہ اسکے بجائے الٹے اصاغر ہی اکابر سے مطالبہ کر رہے ہیں۔ آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ سب اسلئے ہو رہا ہے کہ انکے قلب میں ہیئت عادلۃ مسنونۃ موجود ہے۔ یا یہ اس چیز کا پتہ دیتی ہے کہ قلوب فاسد اور خراب ہو چکے ہیں اور ان میں ہیئۃ غیر عادلۃ غیر مسنونۃ پیدا ہوگئی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

[1] قلعی دار [2] روشن [3] صاف شفاف [4] کیفیت [5] معتدل [6] سنت کے مطابق [7] نتیجہ دینے والی

غرض کہ سعادت حقیقیہ کی تحصیل موقوف ہے اتباع سنت پر اسکو چاہے یوں کہہ لیجئے کہ عافیت دارین کی تحصیل موقوف ہے اتباع سنت پر آدمی اتباع سنت کا اہتمام کریگا تب ہی اسکو روحانی جسمانی صحت و عافیت اور قلب کی حیات نصیب ہوگی آگے فرماتے ہیں کہ یہ سعادت اتباع سنت کے ذریعہ اسوقت حاصل ہوگی جبکہ ایسے شخص کی مصاحبت سے اپنے کو دور رکھے جو وقت کو برباد کرنیوالا ہو اور ان تمام اسباب کے اختیار کرنے سے احتراز کرے جن سے قلب میں تشویش و انتشار پیدا ہو اسی کو فرماتے ہیں کہ ؎

تا توانی دور شو از یار بد یار بد بدتر بود از مار بد

ترجمہ۔ جہاں تک ہو سکے برے ساتھی سے دور رہو کیونکہ برا ساتھی بدترین سانپ سے بھی بڑھکر مضر اور مہلک ہے۔

جس طرح سے کہ نیک صحبت کی فضیلت آئی ہے اور بعض حالات میں وہ خلوت و تنہائی سے بہتر ہے جیسا کہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے لکھا ہے کہ اَلْعُزْلَةُ خَيْرٌ مِّنَ الْجَلِيْسِ السَّوْءِ وَالْجَلِيْسُ الصَّالِحُ خَيْرٌ مِّنَ الْعُزْلَةِ اسی طرح سے بری صحبت سے بچنے کی بھی ضرورت ہے علماء نے عزلت اور اختلاط پر مفصل گفتگو فرمائی ہے۔ مطلقاً اسی کو اچھا نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس مسئلہ میں تفصیل ہے بعض حالات میں عزلت کو ترجیح ہوگی یعنی جبکہ کوئی جلیس صالح نہ میسر ہو اور اگر صالح ہمنشین مل جائے تو پھر عزلت کو ترجیح کیا معنیٰ جائز بھی نہ ہوگی۔ اسکا ترک کرنا اور صحبت نیک میں جاکر علم و عمل حاصل کرنا واجب ہوگا۔ چنانچہ علماء جس طرح سے یہ فرماتے ہیں کہ ؎

تا توانی دور شو از یار بد یار بد بدتر بود از مار بد

ترجمہ۔ جہاں تک ہو سکے برے ساتھی سے دور رہو کیونکہ برا ساتھی بدترین سانپ سے بھی بڑھکر مضر اور مہلک ہے اسی طرح سے وہ حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ ؎

یک زمانہ صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

یعنی تھوڑی دیر بھی تمہارا اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھنا سو سال کی ریا سے خالی عبادت سے بڑھ کر ہے۔

باقی حدیث شریف میں برے ساتھی سے جو پناہ مانگی گئی ہے وہ بھی بالکل صحیح ہے ایسا اختلاط
عوام اور ایسے صاحب سے دوری واجب ہے کیونکہ ؎

مار بہ تنہا ہمیں بر جاں زند یار بد بر جاں و بر ایماں زند

یعنی موذی سانپ صرف جان ہی کو نقصان پہونچاتا ہے مگر برا ساتھی جان و ایمان دونوں کے حق میں زہر قاتل ہے۔ اسلئے اس سے بچنا بہت ضروری ہے۔ اسلئے کہ جتنی بری عادتیں انسان میں پیدا ہوتی ہیں یار بد سے پیدا ہوتی ہیں۔ بری عادتیں ماں کے پیٹ سے لیکر کوئی نہیں آتا جس طرح کہ نیک صحبت نیکی سکھلاتی ہے لوگ اسکی وجہ سے بڑے بڑے کمالات سے متصف ہو جاتے ہیں اسی طرح سے بری صحبت بڑی بڑی برائی آدمی میں پیدا کر دیتی ہے۔ اسلئے بچوں کو اس سے بچایا جاتا ہے کیونکہ اسمیں پڑکر وہ بالکل ہی ناس[1] ہو جاتے ہیں۔ برا ساتھی قلب کو مفتون کر دیتا ہے اور اسکی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور وقت تو برباد ہو ہی جاتا ہے یوں ہی تجارت و زراعت اسی طرح سے اور دیگر اسباب بھی آدمی کے قلب کو فاسد اور خراب کر دیتے ہیں مگر اس سے زیادہ بربادی صاحب سوء[2] کیوجہ سے ہوتی ہے۔ انسان میں ایک خصلت نہیں ہوتی مگر کسی برے کا ساتھ پکڑ لیتا ہے جسکی وجہ سے اسکے اندر بھی وہ عادت پیدا ہو جاتی ہے۔

ہمارے پاس جو لوگ آتے ہیں وہ ہم کو بھلواتے[3] ہیں ہم پابند ہیں کہ انکو وقت دیں صحیح صحیح چیزیں بتلائیں اور یہ لوگ اسکے پابند نہیں کہ ہماری باتوں کو سنیں اور اسپر عمل کریں۔ بات یہ ہے کہ قلب تو انکا دنیا میں مفتون ہو چکا ہے قلب کو مفتون کرنیوالا اسکے صحیح راستہ کو ختم کرنیوالا اور اسکو معاصی میں مبتلا کر دینے والا رذائل میں مبتلا کر دینے والا یہی ساتھی ہے اور اسکو اور دیگر اسباب مثلاً تجارت و زراعت وغیرہ سے بڑھکر مفسد اسلئے کہتا ہوں کہ اور سب چیزیں انسان کے تابع ہوتی ہیں انسان اگر انکے فساد سے بچنا چاہے تو بچ سکتا ہے اگر کسی کا ساتھ پکڑ لیا تو اسکی دوستی کیوجہ سے ایک گھنٹہ دو گھنٹہ ایک دن دو دن اسی طرح ہوتے ہوتے انسان اپنی کل عمر ہی برباد کر لیتا ہے۔ ہم ایک جگہ رہتے تھے دیکھتے تھے کہ لوگ جہاں رہتے تھے وہاں کے بھی نہیں تھے ایک وقت میں ایک جگہ سب لوگ جمع ہوتے تھے اور ایران کی توران کی ہانکتے تھے اور آپسمیں کہتے تھے کہ جب تک یہاں جمع نہیں ہو لیتے چین نہیں پڑتا۔ لوگ یہاں بھی آتے ہیں اور آگر مجھے سکھاتے ہیں میں کہتا ہوں کہ آؤ سکھا دیں بھی لوگوں کو دیکھ چکا ہوں۔ لوگ چاہیں کہ اپنی باتیں ہمکو سکھا دیں تو سکھا نہیں سکتے۔

ہم جب آپکو فساد سے بچائیں تو آپ کے حالات پر گفتگو کرنے کی ہمت کریں ورنہ اگر ہم

[1] خراب
[2] بُرا ساتھی
[3] دھوکا دیتے ہیں

آپ کے سامنے آپ کے حالات ہی پیش کر سکیں گے تو اُنکی اصلاح کیا کریں گے چنانچہ ہم نے دیکھا ہے کہ جنکا احترام نہیں کرنا چاہیئے یعنی جس نے ان دیہاتیوں کے مال و جائداد کو حیثیہ بخرہ کر دیا اور لوگوں کو آپس میں لڑوا دیا اسی کے لئے یہ لوگ چادریں بچھاتے تھے اور تکیہ رکھتے تھے اس شخص کا نام ہماری زبان میں پٹواری ہے چنانچہ عالم دین کی لوگ اتنی وقعت نہیں کرتے جتنی کہ پٹواری کی کرتے تھے۔ اور یہی دیکھتا تھا کہ پیٹھ پیچھے اسے گالی بھی دیتے تھے۔ ایک طرف احترام تو ایسا جیسے عالم دین کا اور دوسری طرف اس کو گالی دینا جس طرح سے کہ علماء کے ساتھ انکا یہ معاملہ تھا کہ انکی برائی اور غیبت اور شکایت کرتے تھے۔ میرے متعلق سب یہ چاہتے تھے کہ میرے یہاں آکر بیٹھے اور جن مشاغل میں ہم لوگ رہتے ہیں اسی میں یہ بھی ملوث ہو جائے۔ یہ چاہتے تھے کہ عالم بھی ہمارے تابع ہو کر رہے۔

ایک دفعہ مجھ سے سب لوگوں نے کہا کچھ بیان کر دو۔ میں نے کہا اچھا اور یہ سوچا کہ جن حالات میں یہ لوگ مبتلا ہیں اس پر کچھ کلام کروں۔ میں نے کہا کہ نماز کیلئے آپ لوگ کمیٹی کمیٹا بناتے ہیں مگر خود آپ ہی لوگ نہیں پڑھتے۔ اور دیکھتا ہوں کہ آپ لوگ جس سے خوش رہتے ہیں یا کوئی بڑا آدمی ہوتا ہے تو اسکو تو معاف کر دیتے ہیں اور جس سے ناخوش ہوتے ہیں یا کوئی غریب آدمی ہوا تو اس پر جرمانہ مقرر کر دیتے ہیں یہ کیسا ہے؟ میں نے یہ بھی کہا کہ دین کمیٹی کمیٹا کا نام نہیں اس میں اسکے لئے آدمی کے قلب کو درست کیا جاتا ہے۔ جب میں نے اس قسم کی باتیں بیان کیں تو سمجھے اور اور کہا ہاں ٹھیک تو کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہی تو تمہارا مرض ہے اور اصلاح کے ضمن میں فساد ہے۔ دین کی پیروی کے لئے ایسے ہی لوگوں کو راہنما بنانا چاہتے ہو۔ میں نے یہ بھی کہا کہ تم لوگوں میں دنیا کی محبت آگئی ہے اور دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے گڑ کہ جس میں بہت سے چیونٹے آکر گرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ گرتے تو ہیں اسے کھانے کے لئے لیکن مر کر ہی نکلتے ہیں۔ بس یہی حال تمہارا ہے کہ دنیا کی محبت میں اس بری طرح لت پت ہو اور گرتے ہو کھانے کے لئے اور مر کر ہی شاید نکل سکو۔ اس طرح سے مثال دیکر انکے حال کو سمجھایا تو اسکو لوگوں نے پسند کیا۔

کام جب قاعدے سے کیا جاتا ہے تب ہی وہ دنیا میں بھی مفید ہوتا ہے اور آخرت میں بھی مقبول ہوتا ہے حدیث شریف میں ہے کہ مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے مقاتلہ کرے وہ مقبول ہے اور تمکو دیکھ رہا ہوں کہ کام طریقہ سے کرنا تو درکنار تم اپنے ہی آدمی کو زیر کرنا چاہتے ہو۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ دین کے

کام کو دین کیطرح سے کرو۔ تب سب کی سمجھ میں آیا کہ ہاں جی بات بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے کہا اور کیں سب کو اپنا تابع بنانا چاہتے ہو؟

یہ کہہ رہا ہوں کہ سب سے زیادہ مفسد اور سب سے زیادہ قلب کو فتنہ میں ڈالنے والا برا ساتھی ہے جو کہ خود اپنے وقت کو خراب اور قلب کو فاسد کرچکا ہوتا ہے اسلئے دوسرے کے وقت کو بھی فاسد کئے رہتا ہے کیونکہ وقت کی حفاظت صاحب وقت کرتا ہے اور جس کو اپنے وقت کی نگرانی نہ ہو اسکو ضائع کرتا ہوگا وہ تو دوسرے کے وقت کیلئے اضیع ہوگا۔ نیک لوگ اپنے وقت کی بہت قدر کرتے ہیں چنانچہ صوفی کے متعلق کہا ہی جاتا ہے کہ وہ ابن الوقت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا یعنی بیشک نماز مومنین پر وقت وقت سے فرض کی گئی۔ جس طرح سے اسکا تعلق وقت سے ہوتا ہے اسی طرح سے صاحب اوقات سے بھی ہوتا ہے۔ اب صوفی کو چاہے ابن الوقت کہہ لیجئے یا ابو الوقت کہہ لیجئے دونوں کا حاصل ایک ہے نماز کے موقت ہونے کو وہی پسند کریگا جس کو خود وقت کی قدر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں وقت اور زمانہ کی قسم کھائی ہے۔ فرماتے ہیں وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ترجمہ۔ قسم ہے زمانہ کی کہ انسان بڑے خسارہ میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو حق کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو پابندی کی فہمائش کرتے رہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت حسرت اور افسوس کی جگہ نہیں ہے وہاں کسی قسم کا افسوس نہ ہوگا ہاں مگر جو وقت کہ دنیا میں غفلت میں گذرا ہوگا اس کی حسرت ضرور ہوگی کہ کاش اسے غفلت میں نہ گذارے ہوتے اور اسمیں اللہ اللہ کیے ہوتے۔ وقت کے متعلق علماء نے بہت بیان کیا ہے چنانچہ اتباع سنت کے بارے میں جو کہا گیا ہے تو سب سے زیادہ سنتیں وہی ہیں جو وقت کے ساتھ موقت ہیں۔ اور یہ جو کہا کہ ایسے سبب سے بھی احتراز کرنے جو قلب کو فتنہ میں ڈالدے اور سب سے بڑا سبب بُرا ساتھی ہے کیونکہ جو شخص خدا سے غافل ہے اسکی صحبت میں آپ بھی غافل ہو جائیں گے۔ انسان میں غفلت یونہی بلاوجہ نہیں پیدا ہو جاتی بلکہ جب وہ اسباب غفلت اختیار کرتا ہے تب ہی اسکا قلب غافل ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے اللہ و رسول کی اطاعت میں رہتے ہوئے دنیا کے بھی کام کئے ہیں زراعت و تجارت بھی کی ہے لیکن قلب خدا سے متعلق تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انکی تعریف میں یہ آیت نازل فرمائی رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ یعنی ایسے اللہ والے لوگ کہ انکے قلب کو تجارت اور خرید فروخت

۱۔ زیادہ فاسد کرنے والا
۲۔ وقت کا پابند
۳۔ وقت کا عادی ہونے والا
۴۔ وقت وقت کے ہونا
۵۔ دوسری اختیار

اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز کے پڑھنے سے نہیں روکتی۔

یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ سعادت حقیقی یعنی حیات روحانی اور احکام کی پابندی یہ سب اچھی ہی صحبت سے حاصل ہوتی ہیں کوئی اچھا آدمی مل جاتا ہے اور آدمی اسکا دامن پکڑ لیتا ہے تو پھر کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی لئے جتنا اہتمام اچھے ساتھی کا ہے کسی دوسری چیز کا نہیں۔ حضرات صحابہؓ فرمایا کرتے تھے اِجلِسْ بِنَا نُؤمِنُ سَاعَةً آؤ ہمارے پاس بیٹھو تاکہ باہم ایمان تازہ کریں اسی سے معلوم ہوا کہ یہ حضرات بھی کسی صالح کی صحبت کو سبب ترقیٔ ایمان سمجھتے تھے اور جلیس صالح کی تلاش میں رہتے تھے۔ ترمذی میں حدیث ہے حضرت حریثؓ بن قبیصہ فرماتے ہیں کہ میں جب مدینہ منورہ حاضر ہوا تو میں نے یہ دعا کی کہ یا اللہ مجھے کوئی جلیس صالح عطا فرما چنانچہ کہتے ہیں کہ میری ملاقات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوئی میں نے ان سے کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ کوئی جلیس صالح مجھے عطا فرما تو آپ مجھے ملے ہیں لہٰذا مجھے کوئی ایسی حدیث سنایئے جسے آپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو شاید اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس سے نفع عطا فرمائے۔ چنانچہ انھوں نے یہ حدیث سنائی، فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قیامت کے دن بندوں کے اعمال میں سب سے پہلے جسکا حساب ہوگا وہ نماز ہوگی اگر یہ درست ہوگئی تو وہ شخص کامیاب ہوگیا اور جسکا نماز کا حساب صاف نہ ہوا تو پھر وہ خائب خاسر ہوا۔ پھر اگر اسکے فریضہ میں کچھ کمی ہوگی تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دیکھو میرے بندے کے پاس کوئی نفل عبادت بھی ہے اگر ہوئی تو اس سے اسکے فریضہ کی تکمیل کردی جائیگی پھر اسکے بقیہ اعمال بھی اسی طریقہ پر پیش ہونگے۔

دیکھا آپ نے جو زمانہ کہ خیریت کا تھا اسمیں بھی لوگ کہیں جاتے تھے تو مصاحبت کے لئے کسی صالح کو پہلے تلاش کرتے تھے یہ اس لئے کہ سمجھتے تھے کہ تمام بھلائیوں کی اصل جلیس صالح ہے اور ہر قسم کی برائیوں کا سرچشمہ جلیس سوء ہے میں کہتا ہوں کہ بری صحبت سے بچنے کا طریقہ ہی یہ ہے کہ آدمی نیک صحبت اختیار کرے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

دیدنِ دانا عبادت ایں بود فتحِ ابوابِ سعادت ایں بود

ترجمہ۔ فرماتے ہیں کہ کسی دانا کا دیکھنا عبادت ہے بلکہ ہر سعادت کیلئے فتح باب ہے۔

اب اس زمانہ میں ان سب باتوں کو تو کوئی سنتا سناتا نہیں تاہم ہم یہ گفتگو کرتے ہیں کہ شاید کوئی ٹھیک ہی ہو جائے اور کام پر لگ جائے۔ ابھی اس دفعہ الہ آباد میں ایک صاحب نے جو ڈپٹی رہ چکے ہیں کہا کہ جب آپ فلاں جگہ آئے تھے اسی وقت سے آپ سے تعلق ہوا اور آپکی ہدایت

کے مطابق میں نے اسی وقت سے قضائے عمری پڑھنا شروع کردی آج حضرت کو اطلاع دیتا ہوں کہ الحمدللہ گزشتہ سال کی نماز کی قضا سے سبکدوش ہوگیا۔ تو دیکھئے ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ ان باتوں سے اثر بھی لے لیتا ہے اب جس طرح سے نیک صحبت سے اثر ہوتا ہے بری صحبت سے بھی ہوتا ہے اور زیادہ ہوتا ہے اور جلد ہوتا ہے اس لئے میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ اس سے بچو اور اپنے لڑکوں کو اس سے بچاؤ، مگر نہیں سنتے۔

سنت اور دین ایک ہی ہے۔ ایسے فتنہ کے زمانہ میں فتنہ پر گفتگو کرنا اور لوگوں کو یہ بتانا کہ یہ دین ہے، اور یہ دین نہیں ہے یہ آسان کام نہیں ہے یوں ایک دو گھنٹہ تقریر کردینا آسان ہے مگر دین کو سمجھا دینا آسان نہیں ہے۔ خاصکر نوجوان طبقہ کو جنکے مزاج میں آزادی ہوتی ہے انکو دین کا پابند کردینا بہت مشکل ہے لیکن کوئی صالح شخص ہو تو وہ انکو دین کی، وقت کی اور جسم کی حفاظت کی طرف متوجہ کردیگا۔ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ وقت اور دین برباد کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا جسم اور اپنی صحت بھی برباد کرلیتے چنانچہ جب اپنے آپ کو بالکل برباد کرلیتے ہیں تب انکی آنکھ کھلتی ہے اور ایسے وقت میں بزرگوں کے یہاں پہونچتے ہیں کہ معاملہ اختیار سے باہر ہوجاتا ہے ورنہ تو اگر کچھ بھی پہلے ان حضرات کے یہاں پہونچ جائیں تو باوجود حکیم و ڈاکٹر کے عاجز رہنے کے یہ حضرات سنبھال لیتے ہیں لیکن آدمی جب اپنے کو بالکل ختم ہی کرلے تو پھر اسکا کیا علاج؟

اب ان باتوں کا سمجھانا بھی مشکل ہے عمل کرنا اور دوسروں سے کرانا تو مشکل ہے ہی مگر لوگوں کو یہ بتانا کہ یہ دیانت ہے اور یہ تقویٰ ہے یہ بھی مشکل ہے۔

آج عوام الناس کو دیکھتا ہوں کہ وہ ہم لوگوں کے پاس آتے ہیں چنانچہ انکی آمد و رفت سے انکی طلب کا اندازہ ہوتا ہے اب یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم انکے قلب میں حیات پیدا کریں اور انکو کام پر لگائیں۔ مومن کے قلب میں حیات ہوتی ہے اسی کو ابھارا جاتا ہے۔ چنانچہ میں تو کہتا ہوں کہ عوام کی حالت دین کے اعتبار سے ہم سے اچھی ہے بہت سی خصلتوں سے بچے رہتے ہیں۔ اگر انکو دین سکھایا جائے تو بہت اعلیٰ حالات انکے ہوجائیں یہ دین کے بہت مشتاق ہوتے ہیں انکے اندر خوف بھی ہوتا ہے۔ . . . . میں ایک جگہ تھا تو ایک وکیل صاحب نے ایک موقع پر بہت عمدہ بات کہی، میں لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے انکی اس سست رفتاری پر کچھ خفا ہو رہا تھا پھر انھوں نے کہا کہ آپکے تشریف لانے کے بعد سے ہم لوگوں کو بہت نفع ہوا یہاں ایک دینی ماحول پیدا ہوگیا یوں یہاں مسجد بھی تھی، مدرسہ بھی تھا، نمازی بھی تھے لیکن دینی روح

ہم میں نہیں تھی میں نے انکے اس قول کی تحسین کی کہ ٹھیک کہا۔ چنانچہ میں نے بھی محسوس کیا کہ لوگوں کو نفع ہے۔ بعضے لوگ میرے یہاں آتے تھے تو بیان کرتے تھے کہ لوگ کہتے ہیں کہ وہاں جاتے ہو وہ تو فلاں جماعت کے ہیں، کہتے تھے کہ ہم نے یہ جواب دیا کہ کسی جماعت کے ہوں قرآن پڑھتے ہیں اور اسکا مطلب بتلاتے ہیں۔ حدیث پڑھتے ہیں اور اسکے معنے بتاتے ہیں بزرگوں کے حالات اور ملفوظات سناتے ہیں۔ اور لوگوں کی طرح نہیں ہیں۔ میں نے کہا سچ کہتے ہو واقعی میرا موجودہ کسی جماعت سے تعلق نہیں ہے بس اہل سنت والجماعت ہوں میرا طریقہ قرآن وحدیث کا طریقہ ہے۔

کبھی کبھی میں یہ بھی کہہ دیا کرتا ہوں کہ یہ جلسہ وعظ نہیں ہے کہ جہاں آپ لوگ دھواں دھار اور مسلسل تقریر کی توقع رکھیں، چنانچہ میں مسلسل گفتگو نہیں کرتا اور یہ اس لئے کہ دین سمجھانا چاہتا ہوں حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کلام یہی آتا ہے کہ يَتَكَلَّمُ بِكَلَامٍ فَصْلٍ یعنی آپ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرمایا کرتے تھے تسلسل اور روانی کے ساتھ جب تقریر کی جاتی ہے وہ کچھ زیادہ نافع نہیں ہوتی اور مسلسل مضمون قلب میں بیٹھتا بھی نہیں اور آہستہ آہستہ کلام جو کیا جاتا ہے تو وہ قلب میں اترتا چلا جاتا ہے اور نفس میں جاگزیں ہوتا جاتا ہے۔ میرا یہ طریقہ شروع ہی سے رہا ہے اور دیکھا کہ لوگ جب اس سے مانوس ہو گئے ہیں تو دوسرے کلام کو پسند نہیں کیا ہے اور یہ طریقہ میں نے سوچ سمجھ کر کتاب وسنت کی روشنی میں اختیار کیا ہے اور اس کا نفع بھی بیّن طور پر دیکھ رہا ہوں جس سے میں نے سمجھا کہ یہ طریقہ بہتر اور زیادہ نافع ہے اللہ تعالیٰ اسکو قبول فرمائے۔

وَصِیَّۃُ الاحسان کامل

حضرت مصلح الامۃؒ کے ملفوظات متعلقہ نفاق کا مجموعہ ہے۔ مجموعہ میں نفاق کی تعریف۔ اس کی اقسام پر سیر حاصل کلام کیا گیا ہے۔ اہل زمانہ کی اصلاح کے سلسلہ کا مفید ترین رسالہ ہے۔

یہ کتاب تالیفات مصلح الامۃ کے حصہ چہارم میں آ رہی ہے۔

فرمایا کہ بڑے لوگ اسکے مکلف ہیں کہ اصول دین پر عمل کریں۔ عالم میں بہت اختلاف ہوگیا ہے۔ بڑے فتنہ کا زمانہ ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے بعد جو زندہ رہے گا اختلافات کثیرہ دیکھے گا۔ اور اسکی وجہ بھی آپ نے بیان فرمائی کہ آراء کا تشعب ہوگا یعنی ہر ایک کی رائے دوسرے سے مختلف ہوگی اور لطف یہ کہ ہر شخص اپنی رائے کو صحیح سمجھے گا۔ اس زمانہ میں رائے تو اب رہی نہیں، لوگ سب چیزوں کو ختم کرچکے ہیں، مگر یہ چھٹ بھیا لوگ اپنی رائے کے آگے کسی دوسرے کی رائے ماننے کیلئے تیار نہیں۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اگر تمھیں ایک دن کے لئے سلطنت دیدی جائے تو چلا نہ سکوگے مگر رائے دینے کے لئے تیار۔ اور ایسے لوگ یہاں بھی آجاتے ہیں میں ان سے کہتا ہوں کہ اگر چاہو کہ یہاں سے کوئی مرتبہ پاجاؤ تو یہ نہیں ہوگا۔ ہاں یہ یہ کہتا ہوں کہ جب تم خود رائے رکھتے ہو اور مستقل ہو ہمارا اتباع نہیں کرنا چاہتے تو ہمارے سرپرست ہوجاؤ۔ جب اس طرح سے کہتا ہوں تب سمجھتے ہیں کہ ہم کو سمجھتے ہیں۔

ایک مولوی صاحب ایک اور صاحب کے یہاں گئے وہ انکے آنے سے خوش ہوئے اور ان سے کہا کہ اسوقت تو آپ لوگ ہیں مگر رفتار زمانہ سے ایسا معلوم ہورہا ہے کہ بیس سال کے بعد کوئی مسئلہ تک بتانیوالا نہیں ملیگا۔ بالکل صحیح کہا آج یہی حال ہے۔ ساری چیزوں کو تو ان دنیاداروں نے لے لیا ہے اب ان جگہوں کو بھی لے لینا چاہتے ہیں تاکہ اسکو بھی فاسد کردیں اور اسکا بھی ناس ماردیں۔

لوگوں میں رائے کا جو اختلاف ہوتا ہے اور اسکی وجہ سے باہم مخالفت پیدا ہوجاتی ہے تو اسکا سبب عُجب ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کی علامت میں سے ایک علامت إِعْجَابُ كُلِّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهٖ بھی ہے۔ یعنی ہر رائے والا اپنی رائے کو بڑا سمجھے گا اور اسکے مقابلہ میں دوسرے کی بات نہیں سُنے گا۔ اسی لئے اسکا علاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان

فرمایا۔ آدمی ایک شخص کو اپنا امیر بنالے اور اسکے آگے اپنی رائے کو چھوڑ دے اور سمع وطاعت اختیار کرے اس سے بڑھکر امن وسکون کی کوئی صورت نہیں۔

میں لوگوں کو یہی سمجھاتا تھا کہ اور دوسرے لوگ جو یہ سب کر رہے ہیں تو وہ کچھ عقل رکھتے ہیں تجربہ رکھتے ہیں، سمجھ رکھتے ہیں، تم انکی ریس کیوں کرتے ہو تمہیں تو دیکھتا ہوں کہ تمہارے اندر فہم ہے نہ عقل، تم سے اپنے گھر کا انتظام تو ہو نہیں پاتا سلطنت کے امور کو تم کیا سمجھوگے۔ پھر آپس کے اختلاف نے تمہیں الگ تھلگ کر رکھا ہے۔ ایک صاحب میرے پاس آتے تھے پھر انھوں نے آنا چھوڑ دیا پھر اسکے بعد ایک دن آئے تو میں نے کہا بہت دنوں کے بعد تشریف لائے کہنے لگے جی ہاں نظریئے کا اختلاف ہے۔ یہ حال ہے لوگوں کا کہ آتے بھی ہیں اور نظریہ الگ رکھتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حالات کے پیش نظر وصیت فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنا اور امام کے ساتھ سمع وطاعت کے ساتھ رہنا اگرچہ وہ عبد حبشی ہی کیوں نہ ہو حدیث کی تعلیم تو یہ ہے کہ شریعت نے حقوق کی تقسیم کر دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا وَلَمْ يُجِلَّ عَالِمَنَا فَلَيْسَ مِنَّا یعنی جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کرے اور ہمارے علماء کی تعظیم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ یہ طریقہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور یہ سب چیزیں کتابوں میں موجود ہیں اور اہل مدارس بھی اسکو پڑھتے پڑھاتے ہیں لیکن عمل کے وقت یہ اور عوام دونوں برابر ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے ایک مدرسہ سے مجھے لکھا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ نظم کس طرح چلائیں؟ میں نے سوچا انھیں کیا لکھوں، جی میں تو آیا کہ لکھدوں کہ انھیں چھوٹوں کو دیدو کہ لو چلاؤ۔ اب میں آپ لوگوں کو کتاب سے یہ حدیث سنا رہا ہوں اور اگر اس کام کو آپ لوگوں کے ہی حوالہ کر دوں کہ لو یہ عربی میں ہے اسکو سنا کر لوگوں کو سمجھاؤ، تو آپ سے پوچھتا ہوں یہ کیسا ہے؟ بس اسی طرح یہ لوگ چاہتے ہیں چھٹ بھیوں کو دیدیا جائے کہ لو یہ چلاؤ۔

آج یہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں ہمارا بھی ان سے ایک مطالبہ ہے کہ آپ لوگ نفس کو شریعت کی لگام پہنا دیجئے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اتباع سنت کو ہر امر میں لازم پکڑے اور علماء نے اسکا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قانون عدل پر عمل کرے یہاں تک کہ نفس کو شریعت کی لگام پہنا دے۔

یہ پہلے کے لوگ فرما رہے ہیں ہم نہیں کہہ رہے ہیں۔ آپ کا جی چاہے مانیئے جی چاہے نہ مانیئے علماء نے ہر زمانہ میں شریعت کی عظمت اور اسکے احترام کے لئے فرمایا ہے بلکہ اپنے عمل سے کرکے دکھایا ہے حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اقطاب میں تھے بڑے بڑے علماء اور بادشاہ انکے معتقد تھے۔ ایک مرتبہ دہلی سے محتسب کا حکم پہونچا کہ سماع نہ سنو ورنہ ہم آتے ہیں اگر حضرت چاہتے تو بادشاہ کو لکھ دیتے اور محتسب کا حکم منسوخ کرا لیتے لیکن حضرت نے ایسا نہیں کیا بلکہ سماع ہی سننا چھوڑ دیا۔ شہر کے لوگ ہنسنے لگے کہ شیخ نے محتسب کے کوڑے کے ڈر سے سماع ترک کر دیا لوگوں نے حضرت سے اسکو بیان کیا، فرمایا بھائی میں مسلمان میرے باپ دادا مسلمان میں نے شریعت کا ایک حکم سنا اسکو مان لیا اسمیں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ میں نے اس واقعہ کو حکیم اجمیری صاحب کے سامنے بھی بیان کیا تھا اور ان سے کہا کہ دیکھئے آپ کے جدامجد ایسے تھے سنکر بہت متاثر ہوئے میں نے کہا کہ حضرت شیخ کے سارے کمالات ایک طرف اور انکا یہ ایک واقعہ احترام شرع کا ایک طرف۔ یہی ایک کمال انکا سارے کمالات سے بڑھکر ہے۔

ایک بات اور یاد آگئی تو کہتا ہوں، ہر وقت نہیں یاد پڑتی، اسوقت یاد آگئی۔ پانی پت کے ایک حاکم کی سواری جا رہی تھی جو کہ شاہ دہلی کی طرف سے وہاں کا گورنر مقرر تھا ایک کوتوال آگے آگے ہٹو بچو، ہٹو بچو کہتا ہوا راستہ صاف کرتا ہوا چلتا تھا حضرت قلندر صاحب قدس سرہٗ کا کوئی خادم بھی سڑک پر جا رہا تھا اور کسی خاص دھن میں تھا کہ اس نے یہ آواز نہیں سنی۔ کوتوال نے بڑھکر اسکے منھ پر ایک طمانچہ مارا اس نے قلندر صاحب سے آکر شکایت کر دی حضرت کو غصہ آگیا فوراً شاہ دہلی کے نام پروانہ لکھکر روانہ فرمایا کہ

"شحنۂ دہلی را اعلام آنکہ پیش دریدہ ناحق طمانچہ بر روکشیدہ کہ آہش بآسمان رسیدہ۔ بجائے او دیگرے فرستاد ورنہ بجائے تو دیگرے خواہم فرستاد"

یعنی حاکم دہلی کو مطلع کرتا ہوں کہ یہاں تیرے کوتوال نے جو بیس دریدہ پیش بریدہ ہے میرے آدمی کے منھ پر بلا وجہ ایک طمانچہ مار دیا ہے کہ اسکی آہ آسمان تک پہنچی ہے لہذا میں تجھ سے کہتا ہوں کہ یا تو اسکو فوراً معزول کرکے اسکی جگہ پر دوسرا حاکم بھیج ورنہ تیری جگہ پر دوسرے کو مقرر کرتا ہوں۔

بادشاہ کے پاس جب یہ تحریر پہنچی تو اسے پڑھکر لرز گیا اور فوراً ایک شخص کو پانی پت حضرت قلندر صاحب کے پاس معذرت نامہ لکھکر بھیجا اور اس کوتوال کے نام پروانہ معزولی روانہ کر دیا۔

دیکھئے جب آپ کے بزرگ موجود تھے تو انکا ایسا دبدبہ تھا اب ہم لوگوں میں سنت پر عمل نہیں ہے اسلئے نہ ویسی بزرگی ہے نہ ویسے درجات جب لوگوں کا عمل شریعت پر تھا تو لوگوں کے قلوب میں بھی انکی عظمت اور عزت تھی۔ اب جب سے اتباع سنت میں کمی ہوگئی ہے نہ بڑوں کا احترام باقی رہ گیا ہے نہ علماء کی عزت باقی ہے۔ شریعت نے سب کے حقوق تقسیم کردیئے تھے بڑوں کو حکم دیا کہ وہ چھوٹوں پر رحم کریں اور چھوٹوں کو یہ حکم کہ بڑوں کی تعظیم کریں اور سب کو یہ حکم دیا کہ عالم دین کی تبجیل کریں۔ اب یہی نہیں ہے کہ چھوٹوں نے تعظیم وتکریم کرنا کم کردیا ہے بلکہ ادھر بھی معاملہ ایسا ہی ہے یعنی بڑوں کی بھی شفقت اور رحمت کی نظر چھوٹوں پر کم ہوگئی ہے۔ رحم کے معانی صرف کھانے پینے ہی کے انتظام کے نہیں ہیں بلکہ تعلیم وتربیت اور تنبیہ وتادیب بھی اسمیں داخل ہے۔ سب سے بڑی چیز ادب ہی ہے۔ پس بڑوں کو جو رحم کرنیکا حکم ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ انکے کھانے پینے پہننے رہنے کا بھی انتظام کریں اور اسکے ساتھ ساتھ دیگر ضروریات کا بھی لحاظ رکھیں اور چھوٹوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ بڑوں کی توقیر کریں۔ یہ کل تین ہی تو طبقے ہیں چھوٹے، بڑے اور علماء ومشائخ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایک کے حقوق دوسروں کو بتلا دیئے یعنی ارشاد فرمایا کہ چھوٹوں پر رحم کیا جائے اور بڑوں کی توقیر کیجائے اور عالم کی تبجیل کی جائے۔

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی ایک تعلیم پر آجاؤ تو کام بنجائے تم عالم کی تبجیل کرو تو پھر وہ تم سے خفا کیوں ہوگا تمہاری تو تعریف کریگا کہ بڑے اچھے آدمی ہیں بڑوں کی تعظیم وتوقیر کے بڑے بڑے واقعات علماء نے بیان فرمائے ہیں اور کتابوں میں لکھدیئے ہیں۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ سے سنا ایک ڈپٹی صاحب اجلاس پر کام کر رہے تھے بہت دنوں گھر خط نہیں لکھا تھا والدین پریشان تھے چنانچہ انکے والد صاحب پوچھتے پوچھتے انکے اجلاس پر پہنچے اور وہیں پکڑ کر انھیں ٹپکا اور جوتے سے مارنے لگے لوگ دوڑے اور چاہا کہ ان بڑے میاں کو سرزنش کریں، ڈپٹی صاحب نے کہا رہنے دو یہ میرے والد بزرگوار ہیں۔ اس واقعہ کی وجہ سے انکی بڑی شہرت ہوئی کہ بڑا شریف آدمی ہے۔ حکام میں انکی اور زیادہ عزت بڑھ گئی اسی طرح حضرت فرماتے تھے کہ دہلی میں وائسرائے کا ایک میر منشی تھا وائسرائے کے ساتھ ٹم ٹم میں کہیں جارہا تھا ایک ننگے شخص کو دیکھا کہ سڑک پر پڑا ہوا ہے اس نے ٹم ٹم روک کر اس سے جاکر ملاقات کی اور اس سے لپٹ گیا۔ وائسرائے نے پوچھا کہ ''ول'' یہ کون ہے؟ کہا حضور یہ میرا باپ ہے جہاز کے سفر میں گیا ہوا تھا جہاز طوفان میں آگیا اسکا سامان وغیرہ سب غائب ہوگیا

اسی طرح سے اسکی جان بچی اور یہ ساحل پر آگیا۔ یہ سنکر وائسرائے نے اپنا دوشالہ دیا کہا کر اسے اڑھا دو یہ تمھارا باپ ہے تو ہمارا بھی باپ ہے۔ اس واقعہ کی شہرت تمام شہر میں ہوگئی کہ بہت شریف آدمی ہے۔ حضرت جب اس واقعہ کو بیان فرماتے تھے تو سامعین پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

یہ واقعات میں آپکو اس پر سنا رہا ہوں کہ لوگوں نے بڑوں کی توقیر کی ہے تو اسکی وجہ سے انھیں عزت اور مرتبہ ملا۔ پس عزت حاصل کرنیکا طریقہ اللہ و رسول کے فرمانے کے مطابق یہی ہے کہ آدمی اپنی حیثیت کو اور دوسروں کے مرتبہ کو پہچانے۔ اور میں جو یہ بیان کر رہا ہوں یہ حدود ہیں جو خدا کی طرف سے مقرر ہیں ان حدود کی اگر لوگ رعایت کریں تو نہایت امن کے ساتھ زندگی گذار سکتے ہیں جس طرح سے کہ اختلاف کے وقت کا حکم بتایا کہ تقویٰ اللہ اختیار کرے اور اپنے امیر کے ساتھ سمع و طاعت کا معاملہ رکھے تو اسکی وجہ سے سعادت دارین حاصل ہوسکتی ہے۔ چنانچہ فتنے بھی بہت ہو گئے ہیں پہلے بھی بہت ہوئے لیکن جن لوگوں نے اس حدیث پر عمل کیا وہ ہر زمانہ میں اچھے ہی رہے۔ سب سے بڑی چیز دین میں خدا کی مقرر کردہ حدود ہیں اور ان کی حفاظت کرنا نہایت ضروری ہے۔ گر فرق مراتب نکنی زندیقی۔

ذی رائے لوگ اپنی اپنی رائے پیش کر سکتے ہیں اب مجلس شوریٰ ان کے رائے مشورہ کو ماننے یا نہ ماننے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔ یعنی یہ نہیں کر سکتے کہ منتظمین کو اپنی رائے کو قبول کرنے پر مجبور کریں اور ان سے مطالبہ کریں کہ ہماری رائے مانو۔

اگر کوئی چھوٹا ہے تو اسے چھوٹا ہو کر رہنا چاہئے اور بڑا ہے تو بڑا ہو کر رہنا چاہئے اگر کوئی عالم ہے تو اسکو عالم کی حیثیت سے رہنا چاہئے اور دوسرے لوگوں کو اسکی یہ جہت تسلیم کرنی چاہئے اب ہر ایک کو اسکے درجہ پر رکھئے پھر دیکھئے کہ کیا آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سنت کو اگر آپ جاری کرلیں تو اسکے برکات دیکھیں گے۔ اس زمانہ میں ادب ہی تو اٹھ گیا ہے اور پہلے زمانہ میں اسی کا بڑا لحاظ کیا جاتا تھا۔ اسکا اہتمام ہوتا تھا کہ علم اگر زیادہ نہیں حاصل ہوا ہے تو نہ سہی ادب اور تہذیب سکھانے پر زیادہ زور صرف کرتے تھے۔ اس پر ایک واقعہ یاد آیا۔ کتابوں میں لکھا ہوا ہے میں دکھلا سکتا ہوں ایک عالم تھے، بادشاہ کے بچوں کے استاد تھے، ایک دن وہ عالم صاحب بادشاہ سے ملنے تشریف لائے جیسے ہی جوتا اتار کر فرش پر قدم رکھا ان دونوں نے جھپٹ کر انکے جوتے اٹھائے اسی اثنا میں بادشاہ نے ان عالم صاحب کو طلب فرمایا وہ ڈر گئے سمجھے کہ ان لڑکوں کا میرا جوتا اٹھانا شاہی مزاج

کے خلاف ہوا بادشاہ نے شاید اسی پر تنبیہ فرمانے کے لئے یاد کیا ہے۔ لیکن جب بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو بہت ہی خوش ہوا اور دس ہزار درہم استاد صاحب کو اور دس دس ہزار ان دونوں بچوں کو انعام دیا اور ان سے کہا کہ آپ کے اس حسن تربیت کو دیکھکر اسوقت میرا دل باغ باغ ہوگیا آپ کا بڑا احسان ہے کہ آپ نے میرے بچوں کو ایسی تربیت دی۔ دیکھا آپ نے اخلاق کی اس زمانہ میں اتنی قدر تھی اور توقیر کبیر۔ اور تجیل عالم پر ان لوگوں کا کتنا عمل تھا۔ میں کہتا ہوں کہ نیک اخلاق سے جنت تو آخرت میں ملے ہی گی اسکا اثر دنیا میں بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔

آج کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو حدود کی رعایت رکھنی چاہئے اور برے ساتھی اور قلب کو مفتون کر دینے والے اسباب سے دوری اختیار کرنی چاہئے۔ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ یہ نص ہے یعنی تقویٰ اور نیکی کے کاموں باہم ایک دوسرے کی اعانت کرو اور گناہ اور سرکشی کی باتوں پر ایک دوسرے کا تعاون مت کرو۔ یہ خدائی حکم ہے اسکے خلاف کروگے تو دنیوی راحت بھی نہیں ملے گی۔ اس زمانہ میں اخلاق کی اصلاح ایک اہم مسئلہ ہے مگر کوئی اگر جان ہی پر کھیل جائے تو کچھ لوگ تو اچھے ہو ہی جائینگے باقی اخلاق درست کرنے کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ مشہور رہی ہے کہ انکی والدہ بہت ضعیفہ تھیں اور مکان پر سوائے انکے اور کوئی نہ تھا اسلئے حضور کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکے اور یہ کہلا بھیجا کہ آپکی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ خدمت اقدس میں ابھی حاضر ہو جاؤں مگر آپ ہی کا حکم ہے کہ والدہ کی خدمت کرنی چاہئے اسلئے آپکی محبت کو آپکے حکم پر ترجیح دیتا ہوں۔ چنانچہ والدہ کی خدمت کرتے رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات نہ کرسکے اسی واسطے صحابیت کے شرف سے بھی مشرف نہ ہوسکے۔ سبحان اللہ شریعت پر عمل اور طبیعت پر اسکو غالب کرنے کی اس سے بڑھکر اور کیا مثال ہوسکتی ہے۔

ایک بزرگ کے یہاں ایک صاحب گئے اور کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد انسے کہا کہ اب میں گھر جانا چاہتا ہوں والدہ نے بس اتنے ہی دنوں کی اجازت دی تھی وہ بزرگ یہ سنکر بہت خوش ہوئے کیونکہ اس سے انھوں نے یہ سمجھا کہ یہ لڑکا سعید معلوم ہوتا ہے ماں باپ کا مطیع اور فرماں بردار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بچے تھے لوگوں نے بدون باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے انکی والدہ

پر شبہ کیا چنانچہ ان سے یہ کہا کہ یَا اُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا یعنی اے مریم تمہارا باپ تو برا آدمی نہیں تھا اور نہ تمہاری ماں ہی فاحشہ تھیں پھر یہ بچہ تم کہاں سے لائیں حضرت مریم علیہا السلام نے حضرت عیسیٰ کی طرف اشارہ فرما دیا کہ ان سے پوچھو قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا لوگوں نے کہا جو بچہ ابھی جھولے میں پڑا ہے اس سے ہم کیا پوچھیں اتنے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بول پڑے قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا وَّ بَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا فرمایا کہ میں عبد اللہ ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی کتاب عطا فرمائی ہے اور مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے اور مجھے نماز زکوٰۃ کا تاکیدی حکم فرمایا ہے جب تک میں زندہ ہوں انکو ادا کرتا رہوں اور مجھکو والدہ کی اطاعت اور فرماں برداری کی بھی بہت تاکید فرمائی ہے اور مجھے جبار اور شقی نہیں بنایا ہے۔

چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صرف والدہ ہی تھیں اس لئے آپ نے صرف والدہ ہی کی اطاعت کے متعلق کہا اس سے معلوم ہوا کہ والدین کی اطاعت سعادت ہے اور انکی نافرمانی شقاوت ہے۔ میں کہتا ہوں اسی طرح سے اپنے بڑے کی اطاعت کرنا والدین ہوں یا استاد پیر ہوں یا والی دامیر ہوں ان سب کی اطاعت موجب سعادت ہے۔ اس مضمون کو ابھی بیان کرونگا اور تھوڑا تھوڑا بیان ہی کرتا رہونگا۔ آدمی فرشتہ نہیں ہے بشر ہے لہذا اُسے بشریت ہی کی راہ سے ترقی کرنی ہوگی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو وصیت فرمائی اسمیں زور اخلاق کی درستی پر بھی دیا ہے۔ یہ اسی لئے کہ انسان جتنی ترقی اخلاق کی روسے کرسکتا ہے دوسری راہ سے نہیں کرسکتا۔ کیونکہ عبادت میں فرشتے اس سے بہت آگے ہیں اور اخلاق میں ترقی کرنے کے لئے اسکو نفس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور عوارض بشریہ مانع ہوتے ہیں لہذا جب ان سب کا مقابلہ کرکے انسان اس راہ سے ترقی کرجاتا ہے تو اسکی یہ ترقی سب سے بڑھ جاتی ہے۔

میں نے شروع میں جو حدیث پڑھی تھی کہ مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا وَلَمْ يُجِلَّ عَالِمَنَا فَلَيْسَ مِنَّا۔ اس حدیث کا حاصل اخلاق کی تعلیم ہے۔ چنانچہ سب سے بڑی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حسن خلق کا اختیار کرنا ہے۔ اسمیں بڑوں کو تعلیم فرمایا کہ ہماری سنت اور ہمارا طریقہ یہ ہے کہ چھوٹوں پر رحم کیا جائے اور چھوٹوں سے یہ فرمایا کہ دیکھو ہمارا طریقہ یہ ہے کہ بڑوں کی تعظیم کیجائے اور عوام الناس کو بتایا کہ عالم کا احترام کرنا چاہئے۔ غرض ہر طبقہ کو اسکے مناسب خُلق سکھلایا اور

انسانی صفات

اس پر عمل نہ کرنے پر سخت دھمکی دی کہ اگر کوئی شخص اس خلق کے خلاف کریگا تو وہ ہم میں سے نہیں ہے یعنی ہمارے اخلاق پر نہیں ہے، ہماری سنت اور طریقہ پر نہیں ہے۔ یہ فرما کر گویا اسکا پتہ ہی کاٹ دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ سخت مزاج تھے، شام کے ایک شخص نے لوگوں سے انکے متعلق پوچھا کہ انکا طریقہ بچوں کے ساتھ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا بچے تو آپ سے بہت مانوس ہیں جب آپکو دیکھ لیتے ہیں تو کوئی ہاتھ پکڑ لیتا ہے، کوئی کپڑے پکڑ کر کھینچ لیتا ہے، کوئی کندھوں پر چڑھ جاتا ہے۔ یہ سنکر اس نے کہا کہ پھر وہ بد اخلاق نہیں ورنہ بچے اسطرح سے انکے ساتھ معاملہ نہ کرتے۔ دیکھئے اس نے اسکو دلیل بنایا۔ آدمی میں جب خلق ہوتا ہے تو وہ چھوٹو پر رحم کرتا ہے۔ اسطرح سے چھوٹوں کے جب خلاق درست ہوتے ہیں تو پھر بڑوں کی تعظیم بھی انکے قلب میں پیدا ہو جاتی ہے

ایک بزرگ کہیں تشریف لے گئے اور جاتے وقت اپنے ایک دوسرے عزیز کو چھوڑ گئے اور اپنی سواری انکے حوالہ کر گئے اور ان سے کہا کہ تم اسپر چلے آنا اور فلاں کو لیتے آنا (یہ صاحب ان بزرگ کے خادم تھے) ان صاحب نے یہ کیا کہ سواری کے اوپر عمدہ دو شالہ بچھایا اور ان خادم صاحب کو آگے بٹھایا اور خود پیچھے بیٹھے۔ اس خادم کو آگے بیٹھنے میں کچھ تکلف ہوا اور انھوں نے بہت اصرار کیا کہ آپ آگے بیٹھئے میں پیچھے بیٹھ جاؤنگا لیکن یہ نہ مانے اور یہی کہتے رہے کہ میاں صاحب مجھکو حکم دے گئے ہیں کہ انکو لیتے آنا اس لئے میں آپ کو نہایت عزت کے ساتھ لے چلونگا۔ دیکھا آپ نے یہ اخلاق تھے آپ کے اسلاف کے اور میں کہتا ہوں کہ اتباع سنت میں سب سے بڑی چیز اخلاق ہی ہے۔ اب ہم لوگوں میں بھی چونکہ اخلاق نہیں رہے اسلئے اصاغر اور عوام کی جانب سے علماء کی تبجیل بھی باقی نہیں رہی ورنہ تو جب کوئی اللہ والا ہوتا تھا تو اسکی عظمت اور رعب کی وجہ سے شہر میں سناٹا ہو جاتا تھا مطالبہ کے کیا معنی؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا وقار ختم ہو چکا ہے۔

کتابوں میں لکھا ہوا ہے، ہماری تاریخ ہے کہ علماء کی عظمت انکے خلوص اور للہیت اور اتباع سنت کیوجہ سے عوام کے قلوب میں بادشاہ کی عظمت سے کم نہیں تھی۔ ایک دفعہ بادشاہ اپنے محل میں بیٹھا ہوا تھا کہ شہر کے اندر ایک شور سنائی دیا وہ گھبرا گیا کہ شاید کوئی غنیم چڑھ آیا ہے واقعہ کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حضرت عبد اللہ ابن مبارکؒ کو چھینک آئی تھی اس پر انھوں نے الحمد للہ کہا جو لوگ سامنے موجود تھے انھوں نے انکے جواب میں یرحمک اللہ کہا انکا جواب سنکر انکے پاس کے لوگوں نے بھی یرحمک اللہ کہا اسی طرح پھر انکے بعد کے لوگوں نے کہا یوں سلسلہ بسلسلہ جواب کی آوازے

شہر گونج گیا۔ دیکھا آپ نے ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ لوگ عالم دین کی ایسی توقیر کرتے تھے اور یہ تو پہلے زمانہ کا حال تھا ابھی تھوڑے زمانہ کا واقعہ ہے حضرت مولانا تھانویؒ سفر فرما رہے تھے ریل میں مولانا ایاس صاحبؒ بھی ساتھ تھے اور میں بھی تھا ایک موقع پر حضرت مولانا ایاس صاحبؒ نے حضرت مولاناؒ کا جوتہ اٹھا لیا فرمایا کہ ارے مولانا آپ نے یہ کیا کیا! جوتہ سر پر رکھنے کے لائق ہوگیا بہشتوں کیا؟ انکی اس تواضع کا حضرت مولاناؒ برابر ذکر فرماتے تھے۔

اسی طرح سے حضرتؒ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور لوگ کرسی پکڑا کرلے جارہے تھے۔ ایک طرف کا پایہ مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری نے پکڑ لیا حضرتؒ نے فرمایا کہ مولانا ایسطرح سے جنت میں بھی لے چلئے گا؟

یہ کہہ رہا ہوں کہ ادب و تواضع ایسی چیزیں ہیں کہ طریق میں جس کو جو کچھ ملا ہے اسی سے ملا ہے اور جس نے اپنے بڑوں کا جتنا ادب کیا ہے اتنا ہی بڑا وہ شخص ہوا ہے۔ ہمارے اسلاف نے تو تواضع کی انتہا کردی۔ بڑوں سے تو کرتے ہی تھے غریب اور چھوٹے لوگوں سے نہایت تواضع سے پیش آتے تھے چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ان سے ملنے کے لئے ایک بڑے شخص آئے جن کے ساتھ بہت سے خدام وغیرہ تھے۔ حضرت مولانا نے انکے ٹھہرانے کا انتظام فرمایا اور لوگوں کو خدمت پر انکے لئے معمور کردیا۔ انکے ساتھ انکا ایک بھنگی بھی تھا۔ حضرت نے اسکی خدمت خود اپنے ذمہ لی اس طرح پر سب لوگوں کو نہایت آرام اور احترام کے ساتھ رکھا اور اپنے لوگوں سے یہ اعلان فرمادیا کہ فلاں صاحب آرہے ہیں خبردار خبردار کوئی صاحب انسے سنت و بدعت کی بحث چھیڑ کر مناظرہ نہ فرمائیں۔ چنانچہ حضرت مولانا کے اس اخلاق کا ان پر بہت اثر ہوا اور انھوں نے حضرت سے اقرار کیا کہ حضرت اتباع سنت تو بس آپ لوگ کرتے ہیں اور ہم لوگ تو محض پیٹ کیلئے پیر ہیں۔

دیکھا آپ نے اخلاق میں بڑی قوت ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا قاسم صاحبؒ کے اخلاق کا کیا کہنا مشہور تھا کہ حضرت سے جو کوئی ایک بار مل لیتا تھا تو پھر وہ بچکر نہیں آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی تاثیر عطا فرمائی تھی کہ جو شخص ذرا دیر کے لئے بھی صحبت میں ایک بار بیٹھتا تھا بس وہ مسخر ہی ہوجاتا تھا۔

ابتدائی زمانہ میں وطن کے اطراف کے لوگ مجھ سے کچھ خفا رہتے تھے۔ انکے بچے آتے تھے تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہاں آئے جائیگا تو دنیا چھوٹ جائیگی بعض لڑکوں نے مجھ سے کہا کہ والد آنے سے

خفا ہوتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا بھائی یہاں آنا چاہتے ہو تو ذرا سی مشقت کرو یعنی رات کو یہاں کا کام کرو اور دن کو گھر کا کام دیکھو تمہارے والد تم سے ناراض نہیں ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا سے رہ جائیگا اسلئے تم دین کے ساتھ ساتھ دنیا بھی اوروں سے زیادہ کما کر دکھا دو۔ اس نے ایسا ہی کیا تو خوش ہو گئے پھر اگر اسکو از خود آنے میں دیر ہوتی تو تقاضا کر کے بھیجتے کہ اتنے دن ہو گیا مولانا کے یہاں نہیں گئے۔ میں تو ان لوگوں کی نبض پہچانتا ہوں انکی دنیا نہ چھوٹے اور اسکے ساتھ ساتھ کوئی آدمی بزرگ ہو جائے ولی ہو جائے تو انکا کیا نقصان ہے۔

یہ تمام باتیں میں نے اخلاق پر آپ کو سنائیں کہ آدمی کے اخلاق اچھے ہوتے ہیں تو سب لوگ اسکی عزت کرتے ہیں چنانچہ علماء نے یہ جو فرمایا ہے کہ سعادتِ حقیقیہ منوط ہے اتباع سنت کے ساتھ اس سنت کا سب سے اعلیٰ فرد اخلاق ہی کو سمجھتا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ سعادتِ حقیقیہ جس اتباع سنت اور اتباع شریعت کے ساتھ منوط ہے اس سے مراد حقیقی اتباع ہے جو ظاہراً بھی ہو اور باطناً بھی ہو قلب سے بھی ہو قالب سے بھی ہو یہ نہیں کہ صرف ظاہراً اتباع کر لیا اور باطناً نہیں کیا۔ اس سے سعادت حقیقیہ نہیں حاصل ہوگی۔ اور میں یہ جو کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں فلاح دنیوی کے بھی حصول کا ذریعہ اتباع شریعت ہے اس سے مراد یہی اتباع حقیقی ہے اب لوگ یہ کرتے ہیں کہ فلاح و سعادت کو تو چاہتے ہیں حقیقی اور اتباع میں کافی سمجھتے ہیں ظاہری اور صوری اتباع کو اسی لئے فلاح نہیں ہوتی۔ کیونکہ فلاح حقیقی کا ترتب اتباع حقیقی پر ہوتا ہے۔

لیکن یہاں ایک بات اور سمجھ لیجئے وہ یہ کہ سعادت منوط ہے اتباع سنت پر اور اتباع سنت کا راستہ ترک اتباعِ نفس ہے۔ اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ سعادتِ حقیقیہ کا حصول نفس اور نفسانیت کے ترک پر موقوف ہے اسی کو میں یوں کہتا ہوں کہ ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگزارند و خم طرۂ یارے گیرند

اصل قائل نے تو اس سے یہ مراد لیا تھا کہ میرے دیکھنے میں تو مصلحت کا رصرف یہ سمجھ میں آتی ہے کہ احباب اپنے تمام مشاغل ترک کر کے بس یار کو پکڑ لیں میں کہتا ہوں کہ یار سے مراد یہاں اپنے نفس ہی کو لیجئے یعنی اگر دارین کی فلاح چاہتے ہو تو سب چیزوں سے صرف نظر کر کے بس اپنے نفس کو پکڑ لیں اور اسی کی اصلاح کریں اسکی وجہ سے ہر قسم کی خیر بلکہ فلاح دارین حاصل ہو جائیگی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا یعنی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اس نے فلاح پائی۔ اور فرماتے ہیں وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى۔ یعنی جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو جنت اسکا ٹھکانا ہوگا۔

فرماتے ہیں کہ سعادات حقیقیہ کی تحصیل منوط ہے اتباع سنت کے ساتھ یعنی حقیقی سعادت یعنی دینی و دنیاوی ظاہری و باطنی سعادت کے حاصل ہونے کا ذریعہ اتباع سنت ہے۔ آگے اتباع سنت کی تشریح فرماتے ہیں کہ اتباع سنت یہ ہے کہ اوامر کا امتثال کرے اخلاص کے ساتھ اور مناہی سے اجتناب کرے خوف کے ساتھ۔ اوامر اور منہیات پر عمل کرنا اتباع سنت ہے یعنی منہیات سے بچنا اور اوامر کا امتثال کرنا ان ہی دونوں پر اتباع سنت کا دارومدار ہے لیکن اتباع سنت سعادتِ حقیقیہ کا مدار اسوقت ہوگی جبکہ اسکے ساتھ ساتھ دو چیزوں کا اور اہتمام کیا جائے، ایک تو یہ کہ ہر ایسے ساتھی سے مجانبت اور دوری اختیار کی جائے جو اسکے وقت کو فاسد کرے، دوسرے یہ کہ ہر ایسے علاقہ اور سبب سے احتراز کیا جائے جو اسکے قلب کو فتنہ میں ڈالدے۔

اسی کو میں نے بیان کیا تھا کہ دونوں ایک ہی چیز ہے اور ان میں سب سے زیادہ مضر اور مہلک برا ساتھی ہے۔ اس سے قلب بھی مفتون ہوتا ہے اور وقت بھی برباد ہوتا ہے کیونکہ یہ ایسا سبب ہے کہ قلب کو اپنی جانب متوجہ کرلیتا ہے پھر جس جانب قلب ہوگیا انسان کا سارا ہی وقت اسکی نذر ہوجائیگا۔ اس لئے آدمی اسکے بعد کسی کام کا رہ نہیں جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ سعادت حقیقیہ کیلئے جب اتباع سنت کو طریق گردانا تو یہ بھی بتا دیا کہ اس سے پہلے ان امور کا بھی اہتمام چاہیے ورنہ تو اگر قلب اور وقت کو نہ بچایا گیا اور وقت چلا گیا تو پھر سعادتِ حقیقیہ تک رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں آپ اسکو ڈھونڈھا کیجئے۔

انسان کے تمام جوارح اور اعضاء اسکے قلب کے تابع ہوتے ہیں چنانچہ جب قلب ہی کا ناس ہوجاتا ہے اور وہ فاسد ہوجاتا ہے تو پھر دیگر اعضاء بھی فاسد ہوجاتے ہیں اور انسان کا وقت بھی فاسد ہوجاتا ہے۔ اسلئے وقت کا لحاظ کرنا اور اسکو فساد سے بچانا بہت ضروری ہے یہی حالات ہوتے ہیں اسی میں کسی کو کوئی کامل ملجاتا ہے تو وہ اپنے وقت کی حفاظت کرکے کامیاب ہوجاتا ہے

اور کسی کا ساتھ کسی صاحب سوء اور برے مصاحب سے پڑجاتا ہے وہ اپنے کو بھی خراب کرلیتا ہے یہیں سے معلوم ہوا کہ جس طرح سے برے ساتھی کا ساتھ پکڑ کر آدمی برا ہوجاتا ہے اور اپنے وقت اور قلب کو فاسد اور خراب کرلیتا ہے اسی طرح سے کسی کو کوئی جلیس صالح مل جاتا ہے تو اسکی وجہ سے وہ اپنے قلب اور وقت کی حفاظت کرکے سعادت حقیقیہ کی راہ بھی اختیار کرلیتا ہے اور اسکا رخ ہدایت کیجانب ہوجاتا ہے۔ مجھ سے یہیں ایک صاحب نے کہا کہ فلاں جگہ چلو میں نے کہا کہ وہاں تو خود ہی اہل علم موجود ہیں اور باہر سے بھی علماء آتے جاتے رہتے ہیں پھر مجھے کیوں لیجانا چاہتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ بیشک وہاں اہل علم موجود ہیں لیکن اس لیے آپکو لے چلنا چاہتا ہوں تاکہ ان سب کا رخ درست ہوجائے۔

بہر حال میں وہاں گیا نہیں اس زمانہ میں کسی کا رخ درست کرنا آسان ہے؟ اور وہ بھی اہل علم کا؟ یہ میں نے آپکو اس پر سنایا کہ یہ صحیح ہے کہ نیک ساتھی کے رہنے سے اور اچھوں کی صحبت اختیار کرنے کی وجہ سے آدمی کا رخ درست ہوجاتا ہے جس طرح سے کہ برے ہمنشین کیوجہ سے رخ درست بھی ہوچکا ہو جب بھی ٹیڑھا ہوجاتا ہے اور علماء نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بری صحبت کا اثر جلد ہوتا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یارِ بد، مارِ بد سے بھی بدتر ہوتا ہے۔

تا توانی دور شو از یارِ بد   یارِ بد بدتر بود از مارِ بد
مارِ بد تنہا ہمیں بر جاں زند   یارِ بد بر جان و بر ایماں زند

یعنی جہانتک تم سے ہوسکے برے ساتھی سے دور رہو اسلئے کہ برا ساتھی زہریلے سانپ سے بھی زیادہ مہلک ہوتا ہے کیونکہ زہریلا سانپ تو بہت زیادہ یہ کریگا کہ جان لے لیگا اور برا ساتھی سبب ہلاکتِ جان و ایمان دونوں ہی ہوجاتا ہے۔ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں آپکے بزرگ فرما رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی نکلا کہ جہاں تک ہوسکے آدمی نیک صحبت میں رہے یعنی جس طرح سے بری صحبت سے بچنے کی ضرورت ہے اسی طرح سے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی نیک صحبت اختیار کرے اور اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آدمی اپنے دین کی حفاظت کرے۔

وطن میں تھا، ایک بار ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ فلاں صاحب کا روپیہ چوری ہوگیا ہے میں نے صاحب مال کو بلایا اور ان پر خفا ہوا اور ان سے کہا کہ نکلو تم خانقاہ سے چلے ہو دین حاصل کرنے کے لیے اور تم سے دنیا کی حفاظت تو ہوتی نہیں پھر دین کا تحفظ کیا کرسکو گے دنیا کمانا آسان ہے لیکن مال کی حفاظت مشکل ہے اور اسکو اپنے مصرف پر صرف کرنا اور زیادہ مشکل ہے

گلستان میں شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص کے پاس مال تھا اسکی حفاظت کی فکر میں اسکو رات بھر نیند نہ آتی تھی اسنے یہ خیال کیا کہ یہ تو ایک بہت بڑی مصیبت ہے کہ میں مال کی حفاظت میں رات بھر جاگا کرتا ہوں اسلئے اس نے نگہبانی کے لئے ایک ملازم رکھا اور یہ خیال کیا کہ آج رات کو اطمینان سے سوؤنگا۔ چنانچہ خوب سویا۔ اسی رات چوری ہوگئی تو اس نے کہا واللہ بدرقہ بُرد یعنی ساتھی لے گیا۔ خانقاہ میں بھی لوگوں نے مال مسروقہ کی تلاش شروع کی کسی نے اپنا تجربہ بیان کیا کہ فلاں موقع پر اسی طرح چوری ہوئی تھی مال غسلخانہ کی چھت پر ملا تھا چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا دیکھا گیا تو اسی پر تھا۔ لوگوں نے آکر مجھ سے بتلایا کہ رقم مل گئی، ایک ڈاکٹر صاحب بھی ان دنوں ٹھہرے ہوئے تھے انھوں نے یہ کیا کہ سب لوگوں کی نبض دیکھنا شروع کیا تو جس نے چوری کی تھی اسکی نبض بہت سرعت کے ساتھ چل رہی تھی اسکو پکڑ لیا اور میرے پاس لائے میں نے اس سے کہا کہ تم نے اگر چوری کی ہو تو سچ سچ بتاؤ معاف کردونگا اور اگر نہ بتاؤ گے تو سخت سزا دونگا چنانچہ اس نے اقرار کیا۔ یہ شخص جس بستی کا رہنے والا تھا وہاں کے بڑے لوگوں نے اسکی حرکات سے عاجز ہوکر اسکو میرے پاس رکھنا طے کیا میں نے یہ خیال کر کے منظور کر لیا کہ شاید صحبت بدل جانے پر ٹھیک ہوجائے چنانچہ ان لوگوں نے اسکی تنخواہ مقرر کردی کہ تنخواہ لے اور یہاں پڑا رہے اور اپنی اصلاح کرے مگر وہ خصلت اسکے اندر اس درجہ راسخ ہوچکی تھی کہ مجھ سے لوگوں نے کہا کہ مکان ہی سے یہ کہکر آیا تھا کہ فتحپور رہا جائیگا تو وہاں بھی یہ کام کیا جائیگا اور جب جمعہ کو گھر آیا جائے گا تو یہاں بھی کیا جائیگا۔ میں نے یہ خیال کرکے اسے رکھ لیا کہ اگر کسی مسلمان کی اصلاح ہوجائے اور اس کے ضرر سے دوسرے مسلمان مامون و محفوظ رہیں تو کیا حرج ہے۔ لیکن وہ کرتا یہ تھا کہ اصلاح وغیرہ تو الگ رہی تنخواہ بھی لیتا تھا اور چوری بھی کرتا تھا۔ جو لوگ اسے تنخواہ دیتے تھے ان سے کہتا تھا ہم تم کو سمجھ لیں گے۔ میں نے سنا تو کہا ارے اب وہ کیا سمجھے گا اسکو تو خود سمجھا گیا ہے تم لوگ ڈرو مت کچھ کرے تو ہم سے کہنا۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ تعلیم و تربیت کا مسئلہ بہت ضروری ہے۔ حضرت عرباض بن ساریہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور پھر ہم لوگوں کی جانب رخ فرمالیا۔ ہمیں نہایت بلیغ وعظ فرمایا ایسا کہ جسے سنکر آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور ہم سب کے دل دہل گئے۔ یہ دیکھکر ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کا یہ وعظ تو گویا رخصت کرنے والا وعظ معلوم ہوتا ہے لہٰذا ہمیں کچھ وصیت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا میں تم کو نصیحت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ

مزاجی

کے تقویٰ کی، اور اپنے امیر کے لئے سمع وطاعت کی اگرچہ وہ عبد حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ پھر یہ فرمایا کہ یہ اسلئے کہہ رہا ہوں کہ جو شخص تم میں سے میرے بعد زندہ رہیگا تو وہ اختلاف کثیر دیکھے گا اسوقت بجز میری سنت کے اختیار کرنے کے اور کوئی سبیل نجات کی نہ ہوگی۔ اسلئے میری سنت اور میرے خلفاء راشدین کی سنت کو اپنے اوپر لازم کرلینا اور انھیں سے تمسک کرنا۔ بلکہ اپنے دانتوں سے مضبوط پکڑ لینا اور اپنے کو محدثات امور یعنی بدعات سے بچانا۔ اس لئے کہ ہر محدث بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس وصیت میں آپؐ نے ایک تو تقویٰ اللہ کو فرمایا یہ تو خالق کا حق ہوا اور دوسرے سمع وطاعت کا حق فرمایا یعنی فتنہ سے امن کا ایک طریقہ یہ ہے کہ چھوٹا اپنے بڑے کی اطاعت کرے اور اسکا حکم مانے اسکا منقاد رہے، خواہ وہ بڑا امام ہو یا امیر المومنین ہو یا سلطان وقت ہو اسی طرح سے باپ ہو کہ استاد ہو کہ اپنا شیخ ہو۔

اور آپ نے سمع وطاعت کے مفید ہونے کی وجہ بھی بیان فرمائی یعنی یہ کہ میرے بعد اختلافاتِ کثیرہ رونما ہونگے اور اس اختلاف کا سبب رائے کی کثرت ہوگی اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی معاملہ میں آراء مختلف ہوجائیں اور ہر شخص اپنی ہی رائے کو صحیح سمجھتا ہو تو پھر خلاف ونزاع اسکے لئے لازم وضروری ہے اسلئے خلاف ونزاع کو ختم کرنے کا بس واحد طریقہ وہی ہے جسکو لسان نبوت نے بایں الفاظ امت کو سکھلایا ہے کہ فَعَلَيْكُمْ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ وَاِنْ اُمِّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ (الحدیث) میں آپ سے کہتا ہوں کہ دنیا کے تمام عقلا بھی اگر جمع ہوجائیں تو اختلاف کے دور کرنیکا اس سے بہتر کوئی طریقہ تجویز نہیں کرسکتے۔ (اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق بخشیں)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

وصیتِ نبوی اور فلاحِ دارین

میں آپ کو ایک حدیث سناتا ہوں جس میں فلاح دارین مضمر ہے۔ یہ حدیث احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی اور ابن ماجہ کی ہے۔ وھو ھذا

عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَوَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَاَنَّهَا هٰذِهٖ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا فَقَالَ اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا فَاِنَّهٗ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرٰى اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ رواہ احمد وابوداؤد والترمذی وابن ماجہ

اس کا مطلب علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ جس نے میری وصیت قبول کی اور اللہ کے تقوے کا التزام کیا اور جو شخص کہ اس پر والی بنایا گیا اس کی طاعت کو قبول کرلیا اور فتن کو نہ اُبھارا وہ مامون رہیگا اختلاف کثیرہ سے اور فتن سے جو مختلف رایوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

یہ حدیث اُمت کے لئے ایسے وقت میں سند ہے۔

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو انکی اصلاح دنیا کے لئے ایک نظام مرحمت فرمایا ہے اور وہ ہے "اطاعت" یعنی ہر چھوٹے کو حکم دیا کہ وہ اپنے بڑے کی اطاعت کرے خواہ وہ حاکم و امیر ہو یا والدین یا استاد و پیر ہوں۔ کیونکہ اسی اطاعت پر نظام عالم کا قیام ہے اور اسی کے نہ ہونے کی وجہ سے فتنہ وفساد ہے۔ مگر آج دیکھا جاتا ہے کہ ہمارا اسی پر عمل نہیں ہے ہر چھوٹا اباد ہو کر چھوٹا ہے مگر اسی حال میں

وہ بڑا ہو گیا ہے اور ہر بڑا باوجودیکہ بڑا ہے مگر اسی حال میں چھوٹا بنا ہوا ہے۔ حالانکہ حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ فرق مراتب ضروری ہے یعنی چھوٹے کو چھوٹا ہو کر رہنا چاہیئے۔ بڑے کو بڑا ہو کر رہنا چاہیئے۔ باپ کو باپ سمجھنا چاہیئے۔ اُستاد کو اُستاد کا مقام دیا جانا چاہیئے اور پیر کو پیر کے درجہ پر رکھنا چاہیئے۔

اسی مضمون کو ایک دوسری حدیث میں یوں بیان فرمایا ہے کہ مَنْ لَمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا وَلَمْ یُبَجِّلْ عَالِمَنَا فَلَیْسَ مِنَّا یعنی جس نے ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کیا اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہیں کی اور ہمارے عالم کی تعظیم نہیں کی وہ ہم میں سے نہیں ہے یعنی اس نے ہمارے طریق اور ہمارے دین کے خلاف کام کیا اس لئے ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ باہم فرق مراتب ضروری ہے۔ صوفیا نے تو ایک مقولہ اور معنی کر کہا ہے لیکن اگر ہم اس کو یہاں بھی یہ کہیں کہ ؏

گر فرق مراتب نکنی زندیقی

تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ اللہ و رسول کے نزدیک ضروری ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے مرتبہ کا لحاظ کریں۔ اگر اس کا لحاظ نہ کیا گیا تو اس کا بالکل یقینی نتیجہ فساد ہے یعنی فساد دین اور اس سے پہلے فساد دنیا۔

اس لئے کہ فرق مراتب[1] اور حفظ[2] مدارج ہی میں دنیا کی فلاح ہے۔ چھوٹے، بڑوں کا ادب و احترام کریں اور بڑے، چھوٹوں کی رعایت نیز ان کے ساتھ رحم و مہربانی کا برتاؤ کریں۔ اسی طرح سے عوام اپنے عالموں کی توقیر[3] کریں اس طرح سے کسی کو کسی سے کوئی شکایت اور اپنے حق کا مطالبہ ہی نہ رہے تو ظاہر ہے کہ پھر دنیا میں ہر طرف امن ہی امن ہے۔

اور اطاعت جو آج نہیں ہو رہی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر شخص اپنے کو ذی رائے[4] سمجھتا ہے اور اپنی رائے پر معجب[5] ہے یعنی اسی کو سب سے بہتر سمجھتا ہے اور دوسرے کی بات ماننے اور انکی اتباع کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اس لئے رایوں کی کثرت ہے اور اس کے سبب فتنوں کی بھی کثرت ہے۔

حدیث شریف میں اس کو یعنی اعجاب کل ذی رائے برأیہ کو علامت قیامت فرمایا گیا ہے نیز اس کو ثلاث موبقات[6] میں بھی شمار کرکے اس کو ان سب میں اشد کہا گیا ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلٰثٌ مُنْجِیَاتٌ وَثَلٰثٌ مُهْلِکَاتٌ فَاَمَّا الْمُنْجِیَاتُ فَتَقْوَى اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ وَالْقَوْلِ بِالْحَقِّ فِی الرِّضَا وَالسُّخْطِ وَالْقَصْدِ فِی الْغِنٰى وَالْفَقْرِ وَاَمَّا الْمُهْلِکَاتُ فَهَوًى مُتَّبَعٌ وَشُحٌّ مُطَاعٌ وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ وَهِیَ اَشَدُّهُنَّ (مشکوٰۃ شریف ص۴۳۵ ج ۲) یعنی حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں نجات دلانے والی ہیں اور تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں۔ منجیات یہ ہیں۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا سراً و علانیۃً ہر حال میں اور حق بات کہنا حالت رضا میں بھی اور غضب میں بھی اور نفقہ میں میانہ روی اختیار کرنا حالت غنی میں بھی اور فقر میں بھی اور مہلکات یہ ہیں۔ خواہش جس کا اتباع کیا جائے۔ بخل جس کی اطاعت کی جائے اور انسان کا اپنے نفس کو (اپنی رائے کو) بڑا سمجھنا اور اس پر عجب کرنا۔ اور یہ تینوں میں سب سے بڑھ کر ہے۔

آج یہی زمانہ کا حال ہے۔ اسی کی کاٹ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو مشورہ کا حکم دیا۔ چنانچہ فرمایا کہ مَا هَلَكَ قَوْمٌ عَنِ الْمَشْوَرَةِ یعنی کوئی قوم جو مشورہ سے کام کرتی ہو وہ ہلاک نہیں ہوتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مشورہ کا حکم ہوا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کیونکہ مشورہ کے بعد ہر شخص کا اعتماد اور اتکال اپنی رائے سے اٹھ جاتا ہے۔ اس طور پر جو چیز کہ سبب فساد بنتی وہ ختم ہو جاتی ہے اس طرح سے آپ نے اس کی بندش فرمادی اور رائے کے زہر کو مار دیا۔

پس اس حدیث میں تقویٰ اللہ کی وصیت فرما کر تو آپ نے ہماری آخرت بنادی اور سمع وطاعت کا حکم دے کر آپ نے فلاح دنیا کا سامان فرمادیا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ایسے وقت میں امت اس تعلیم نبوی کی جانب توجہ کرے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے اور اپنے اوپر جو شخص حاکم مقرر کیا جائے اس کی اطاعت کرے اگرچہ وہ عبد حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی امیر کے بارے میں حسب ونسب کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ جو شخص امیر مقرر ہو گیا اس کی اطاعت لازم ہو گئی۔

اسلام میں اطاعت کا مسئلہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ:۔

ہر آنکس کہ گردن بفرماں نہد
کسے بر نیاید کہ فرماں دہد

یعنی جو شخص کسی دوسرے کے فرمان کے آگے گردن ڈال دیتا ہے تو بہت دن نہیں گذرتے کہ وہ اسی کی برکت سے فرمان دہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مشائخ فرماتے ہیں کہ جو قابل ہوتا ہے وہ ایک دن مقبول ہو جاتا ہے یعنی یہی قابلیت اس کو مقبولیت تک پہونچا دیتی ہے۔ اسی طرح سے جو طالب ہوتا ہے وہ کچھ ہی دنوں میں مطلوب ہو جاتا ہے اور جو مرید ہوتا ہے وہ عنقریب ہی مراد ہو جاتا ہے۔ یہ سب اطاعت ہی کے ثمرات ہیں اور طاعت ایمان کا ثمرہ ہے۔ جس قدر ایمان ہوگا اسی قدر اطاعت ہوگی۔ مومن کا خاص وصف جس کو اسکا طغرائے امتیاز کہنا چاہئے یہی طاعت ہے۔ حضرات صحابہ کرام اسی کے ساتھ متصف تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایک موقعہ پر سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا کہنے کو ان کی

مدح میں شمار فرمایا ہے اور قرآن شریف میں اس کا ذکر فرمایا ہے ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ. یعنی اعتقاد رکھتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کے حق ہونے کا جو اُن کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے یعنی قرآن اور دوسرے مومنین بھی اسکا اعتقاد رکھتے ہیں سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتابوں کے ساتھ اور اس کے سب پیغمبروں کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں عقیدہ رکھنے میں تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں اور کسی کو نہ سمجھیں اور ان سب نے یوں کہا کہ ہم نے آپکا ارشاد سنا اور اس کو خوشی سے مانا۔ ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار اور آپ ہی کی طرف ہم سب کو لوٹنا ہے۔ (بیان القرآن)

اور یہ یہودیوں کا حال تھا کہ سنتے اور کہتے تھے کہ ہم نے سنا (یعنی کان سے) اور نافرمانی کی (یعنی دل سے) حالانکہ اصل سننا وہی ہے جو کان کے ساتھ ساتھ دل سے بھی ہو۔ یہود کا قول نقل فرمایا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ هَادُوْا یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَیًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِی الدِّیْنِ یعنی یہ لوگ یہودیوں میں سے ہیں کلام کو اسکے مواقع سے دوسری طرف پھیر دیتے ہیں اور یہ کلمات کہتے ہیں سمعنا وعصینا واسمع غیر مسمع اور راعنا اس طور پر کہ اپنی زبانوں کو پھیر کر اور دین میں طعنہ زنی کی نیت سے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کے اس قول پر نکیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ یعنی اگر یہ لوگ بجائے سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا کے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہتے اور بجائے وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا کہتے تو یہ بات ان کے لئے بہتر ہوتی اور موقع کی بات تھی۔

ان تمام تصریحات سے معلوم ہوا کہ اطاعت کا شریعت میں کیا درجہ ہے۔

آخر میں ایک بات اور کہتا ہوں کہ میں نے یہ جو کہا کہ ہر شخص دوسرے کا حق پہچانے۔ چھوٹا بڑے کا حق پہچانے۔ شاگرد اُستاد کا حق پہچانے۔ بیٹا باپ کا حق پہچانے۔ مرید پیر کا حق پہچانے۔ محکوم حاکم کا حق پہچانے۔ رعایا بادشاہ کا حق پہچانے اور سب کا لحاظ رکھا جائے تو فلاح دنیا کا یہی ذریعہ ہے۔ تو اسکا مطلب یہ ہے کہ عام طبائع ایسی ہی ہوتی ہیں کہ اگر انکے حق کو ادا کیا جائے ان کے ساتھ سلوک کیا

مُلہم طبیعتیں

جائے تو وہ بھی احسان مانتے ہیں اور محسن کی قدر کرتے ہیں باقی ہو سکتا ہے کہ اسی دار دنیا میں کسی کو کوئی ایسا ساتھی مل جائے کہ جو خبیث النفس ہو اور اس پر کسی سلوک یا احسان کا کوئی اثر نہ ہوتا ہو جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث تفہیمات میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

وَاصْحَبِ النَّاسَ عَلٰى شَرِيْطَتَيْنِ اَحَدُهُمَا قَطْعُ الطَّمَعِ عَنْهُمْ وَعَمَّا فِيْ اَيْدِيْهِمْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مُوْصِلٌ اِلَيْكَ مِنْهُمْ مَا يَحْصُرُ مِنْهُ وَلَمْ تَكُ تَرَقُّبُهُ بِلَا عَزْمٍ مِّنْكَ۔

وَثَانِيْهِمَا النَّصِيْحَةُ وَالْاِنْبِسَاطُ وَحُسْنُ الْخُلُقِ بِكُلِّ اَحَدٍ سَوَاءٌ الْمُتَمَوِّلُ وَالْفَقِيْرُ وَصَاحِبُ الْجَاهِ وَالْخَامِلِ مَعَ عِرْفَانِ مَنْزِلَةِ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ وَكُلُّ مَنْ عَادَاكَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاِنَّمَا هُوَ خَبِيْثُ النَّفْسِ ظَالِمٌ۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَىَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۵ (صلا۱ تفہیمات ۲۹)

یعنی لوگوں کے ساتھ دو شرطوں کی رعایت رکھتے ہوئے مصاحبت اختیار کرو ایک تو یہ کہ خود ان سے اور جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہے مال وغیرہ اس سے اپنی طمع کو قطع کر لو اس لئے کہ اگر خدا کو منظور ہوگا تو اس مال سے کچھ حصہ تمہیں بھی مل جائے گا بدون تمہارے انتظار و عزم و ارادے کے (پھر جب ایسا ہے تو تمہیں طمع کرنے کی ضرورت؟)

دوسرے یہ کہ ہر شخص کے ساتھ نصیحت اور خیر خواہی ابساط[1] اور حسن خلق کا معاملہ رکھو خواہ وہ کوئی امیر شخص ہو یا غریب و فقیر ہو اور خواہ کوئی صاحب منصب[2] و جاہ ہو یا کوئی گمنام و گوشہ نشین ہو ہاں اسکا خیال رکھو کہ انہیں سے ہر ایک کا منصب پہچان کر اسکے مطابق اسکے ساتھ معاملہ کرو (پس جب تم نے اتنا کر لیا تو تم نے اسکا حق اور اپنا فریضہ ادا کر دیا) اب اسکے بعد بھی اگر کوئی شخص تم سے دشمنی اور عداوت کرتا ہے تو وہ خبیث النفس ہے اور عنقریب ان لوگوں کو معلوم ہو جائیگا جنھوں نے ظلم کر رکھا ہے کہ کیسی جگہ لوٹ کر ان کو جانا ہے۔

الغرض اللہ اور رسول نے جس طرح سے کہ اطاعت کی ضرورت اور اس کی اہمیت[3] کو بیان فرمایا ہے تاکہ لوگ اس کو اختیار کریں اور فلاح دارین حاصل کریں اسی طرح سے ایک اور رذیلہ ہے جو ہمارے درمیان بہت کثرت سے رائج ہے اور وہ بھی آپس کے اختلاف و نزاع[4] و بغض اور عداوت کا سبب بنتا ہے اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسکا بھی بیان کر دیا جائے کیونکہ جس طرح سے کہ فلاح عالم کا سبب وجود اطاعت و انقیاد[5] ہے اسی طرح سے اس رذیلہ کا ترک بھی اصلاح معاشرت کا موجب ہے چنانچہ شریعت میں اس کی

حرمت وارد ہے اور ان دو خصلتوں کا نام غیبت اور نمیمہ[1] ہے نووی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور و معروف تالیف الاذکار میں ارقام فرماتے ہیں کہ :-

جانو کہ یہ دو خصلتیں رذائل میں سے قبیح ترین[2] رذیلہ ہیں اور لوگوں میں بہت زیادہ شائع و ذائع ہیں یہاں تک کہ انسانوں میں سے شاید ہی کوئی ان سے بچا ہو۔ لہٰذا لوگوں کو اس سے بچانے کے لئے اس پر بہت زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت ہے ۔۔۔ سب سے پہلے غیبت کا بیان کرتا ہوں۔

غیبت اسے کہتے ہیں کہ تم اپنے بھائی کی کسی ایسی بات کا تذکرہ کرو جو اسے ناگوار ہو خواہ وہ گفتگو اس کے بدن سے متعلق ہو یا اس کے دین سے متعلق ہو یا اس کے اخلاص سے متعلق ہو یا اس کے مال سے متعلق ہو یا اس کی اولاد سے متعلق ہو یا اسکے والدین سے متعلق ہو یا اس کی بیوی سے متعلق ہو یا اس کے خادم سے متعلق ہو یا اس کے غلام سے متعلق ہو یا اس کے عمامہ اور پگڑی سے متعلق ہو، یا اس کے کپڑے سے متعلق، ہو یا اس کی چال سے متعلق ہو یا اس کی حرکت سے متعلق ہو یا اس کی نشاط و خوشی سے متعلق ہو یا اس کی خوش طبعی سے متعلق ہو یا اس کی ترشروئی سے متعلق، ہو یا اس کی طلاقت[3] لسانی سے متعلق ہو یا اس کے علاوہ کسی اور چیز سے متعلق ہو جو اس شخص سے تعلق رکھتی ہو پھر اس قسم کی بات بہر حال غیبت شمار ہوگی خواہ تم اس کو لفظوں سے کہو یا تحریر میں ادا کرو یا اشارہ و کنایہ سے کہو پھر خواہ آنکھ کے اشارے سے کہو یا ہاتھ اور سر وغیرہ کے اشارہ سے کہو۔

بہر حال بدن سے متعلق کسی چیز کے بیان سے غیبت ہونے کی مثال یہ ہے کہ مثلاً تم اس کو اندھا کہو یا لنگڑا کہو یا چندھا کہو یا گنجا کہو یا ناٹا اور ٹھنگنا کہو یا لمبا کہو یا کالا کہو یا اصغر کہو۔

اور دین سے متعلق کسی بات کا غیبت شمار ہونا یہ ہے کہ تم اسے فاسق کہو یا چور کہو یا خائن کہو یا ظالم کہو یا نماز میں سستی کرنے والا کہو یا نجاست سے بچنے میں کوتاہی کرنے والا کہو یا یہ کہو کہ اپنے والدین کا مطیع نہیں ہے یا یہ کہو کہ زکوٰۃ کو اپنے مصرف میں صرف نہیں کرتا یا یہ کہو کہ غیبت سے اجتناب نہیں کرتا (تو چونکہ یہ سارے کے سارے امور اس کو دین میں عیب نکالنے والے ہیں اس لئے یہ سب غیبت شمار ہوں گے۔)

بہر حال وہ دنیوی امور جن کا تذکرہ لوگوں برا معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ غیبت شمار ہوتے ہیں یہ ہے کہ مثلاً تم کسی کو بے ادب یا قلیل الادب کہدو یا یہ کہو کہ لوگوں کو اپنے سے کم سمجھتا ہے یا یہ کہدو کہ اپنے پر کسی کا حق نہیں سمجھتا یا یہ کہدو کہ بہت باتیں کرتا ہے یا یہ کہدو کہ بہت زیادہ کھانے والا ہے یا یہ کہدو کہ بہت زیادہ سونے والا ہے یا ناوقت سویا کرتا ہے یا یہ کہدو کہ دوسروں کی جگہ پر

[1] چغلخوری
[2] بدترین
[3] [illegible]

بیٹھتا ہے۔

بہرحال وہ اُمور جو کسی انسان کے والدین کے متعلق ہوں اور وہ اُسے بُرے معلوم ہوتے ہوں یہ کہ مثلاً کسی کو کوئی یوں کہے کہ تیرا باپ فاسق ہے یا تیرا باپ ہندی ہے یا تیرا باپ نبطی ہے یا حبشی ہے یا جوتا گانٹھنے والا ہے یا بزاز ہے یا کھٹیرا ہے یا بڑھئی ہے یا لوہار ہے یا کپڑا بننے والا ہے۔

بہرحال وہ اُمور جو کسی کے خلق سے متعلق ہوں جن کا تذکرہ اس کو بُرا لگے یہ ہیں کہ مثلاً کسی کو بدخلق کہدے یا متکبر کہدے یا جھگڑالو کہدے یا جبار کہدے یا عاجز کہدے یا بزدل کہدے یا غصیلا کہدے یا ترش رو ہو جانے والا کہدے یا نکلا ہوا کہدے وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال کپڑے سے متعلق عیوب یہ ہیں کہ مثلاً یہ کہدے کہ چوڑی آستین والے یا اسے لمبے دامن والے یا اتنے میلے کپڑے والے یا اسی کے مثل کوئی اور بات کہدی۔

یہ تفصیل تو کسی کے بدن دین۔ والدین۔ خلق اور کپڑے سے متعلق تھی باقی اور دوسری چیزوں مثلاً غلام و خادم وغیرہ کی مثالوں کو انھیں مذکورہ اُمور پر قیاس کرلو اور بس اتنا سمجھ لو کہ ضابطہ یہ ہے کہ ہر ایسی بات جو اسے ناگوار گذرے جب پسِ پشت کہی جائے گی غیبت شمار ہوگی۔

(کتاب النووی ص۲۴۰)

میں کہتا ہوں کہ غیبت کی جو تفصیل امام نوویؒ نے بیان فرمائی ہے اس کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ جرم سخت ہے اور لوگوں سے اس باب میں بہت کوتاہی ہو رہی ہے۔

صاحب روح المعانی نے آیۂ کریمہ وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ای لا يَذْكُرْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا بِمَا يَكْرَهُ فِي غَيْبَتِهِ فَقَدْ قَالَ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَدْرُوْنَ مَا الْغِيْبَةُ قَالُوْا اللهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ قَالَ ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ قِيْلَ أَفَرَأَيْتَ لَوْ كَانَ فِيْ أَخِيْ مَا أَقُوْلُ قَالَ إِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهُ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ بَهَتَّهُ۔ (رواہ مسلم وابوداؤد ترمذی ونسائی)

یعنی پسِ پشت نہ تذکرہ کرے تم میں کا بعض دوسرے کا ایسے طریقہ پر جو اُسے بُرا لگے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا تم لوگ جانتے ہو غیبت کسے کہتے ہیں صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اُسکا رسول زیادہ جاننے والا ہے۔ آپ نے فرمایا تمہارا ذکر کرنا اپنے بھائی کے متعلق ایسی چیزوں کا جو اُسے ناگوار ہو۔ عرض کیا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ باتیں ہوں جو میں کہہ رہا ہوں تب آپ نے فرمایا کہ اگر اس میں وہ بات ہے جو تم کہہ رہے ہو تب ہی تو تم نے اس کی غیبت اگر

اس کے اندر وہ بات نہ ہوئی جو تم نے کہی ہے پھر تو تم نے اس پر بہتان باندھا، آگے فرماتے ہیں کہ ذَالمرادُ بِمَا يَكْرَهُهُ أَعَمُّ مِنْ أَنْ يَكُوْنَ فِيْ دِيْنِهِ أَوْ دُنْيَاهُ أَوْ فِيْ خَلْقِهِ أَوْ مَالِهِ أَوْ وَلَدِهِ أَوْ زَوْجَتِهِ أَوْ مَمْلُوْكِهِ أَوْ خَادِمِهِ أَوْ لِبَاسِهِ أَوْ غَيْرِ ذَالِكَ مِمَّا يَتَعَلَّقُ بِهِ یعنی جس چیز کا ذکر انسان کو برا لگے وہی غیبت کہلائے گی عام اس سے کہ وہ اس کے دین سے متعلق ہو یا دنیا سے اور اس کے خَلق سے متعلق ہو یا خُلق سے مال سے متعلق ہو یا ولد و زوجہ سے اسی طرح سے مملوک اور خادم سے متعلق ہو لباس سے وغیرہ وغیرہ

پھر کچھ دور آگے چل کر لکھتے ہیں کہ لَا يَبْعُدُ أَنْ يَكُوْنَ مِنْهَا مَا هُوَ مِنَ الصَّغَائِرِ كَالْغِيْبَةِ الَّتِيْ لَا يَتَأَذَّى بِهَا كَثِيْرًا نَحْوُ عَيْبِ الْمَلْبُوْسِ وَالدَّابَّةِ وَمِنْهَا مَالَا يَنْبَغِيْ أَنْ يُشَكَّ فِيْ أَنَّهُ مِنْ أَكْبَرِ الْكَبَائِرِ كَغِيْبَةِ الْأَوْلِيَاءِ وَالْعُلَمَاءِ بِأَلْفَاظِ الْفِسْقِ وَالْفُجُوْرِ وَنَحْوِهَا مِنَ الْأَلْفَاظِ الشَّنِيْعَةِ الْإِيْذَاءِ وَالْأَشْبَهُ أَنْ يَكُوْنَ حُكْمُ السُّكُوْتِ عَلَيْهَا مَعَ الْقُدْرَةِ عَلٰى دَفْعِهَا حُكْمُهَا۔ یعنی بعید نہیں ہیں کہ جو چیزیں صغیرہ شمار ہوتی ہیں بعض ان میں سے غیبت قرار دی جائیں مثلاً وہ غیبت جس سے انسان کو کچھ زیادہ ایذا نہیں ہوتی جیسے کسی کے کپڑے کا عیب بیان کر دیا کسی کی سواری کا عیب نکالدیا باقی بہت سی غیبتیں ایسی ہیں کہ شک نہیں کہ وہ اکبر الکبائر ہیں جیسے اولیاء و علماء کی غیبت اور وہ بھی نہایت بُرے الفاظ کے ساتھ مثلاً فسق و فجور کے ساتھ جیسے کسی کو فاسق و فاجر کہدیا یا اس کے مثل اور کوئی لفظ جس سے اس کو بہت زیادہ ایذا پہونچتی ہو کہدیا اور صحیح قول یہ ہے کہ جو شخص کسی کی غیبت سنے اور اس کے دفع کرنے پر قادر ہونے کے باوجود خاموش رہے تو وہ بھی حکم میں غیبت کرنے والے کے ہی ہے۔ (روح المعانی ص ۱۴۵ ج ۲۶)

۱ و جمالی عیبہ ۲ یعنی غیب ۳ خلوق، تعلق

میں اطاعت کے متعلق بیان کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلق فیما بین المخلوق درست ہونے کے لئے اطاعت کا حکم اور سمع و طاعت کی وصیت فرمائی ہے اسی طرح سے بڑوں کو متوجہ کیا کہ وہ چھوٹوں پر رحم کیا کریں یہی میری سنت ہے اور حق تعالیٰ کا پسندیدہ راستہ ہے اور چھوٹوں اور بڑوں سب کو یہ حکم دیا کہ وہ علماء دین کی تعظیم و تکریم کریں اس لئے کہ انکا اکرام دین کا اکرام ہے اور ان کی اہانت کرنے والا شریعت کی اہانت کرنے والا ہے اس سے بڑھ کر دوسرا کوئی فساد نہیں کیسے اسلئے کہ ہر زمانہ میں عوام کو جو دین آیا ہے تو وہ خواص ہی کی وجہ سے تو جب کسی قوم کے عوام اپنے ہی خواص کے مخالف ہو جائیں گے اور ان کی عظمت انکے قلوب سے نکل جائے گی تو پھر ظاہر ہے کہ عوام کے اصلاح کی اور کیا صورت ہوگی۔ لہٰذا فرق مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے رحم و شفقت تعظیم و تکریم اور اطاعت و فرمانبرداری یہ سب کی سب نبوی تعلیمات ہیں جنکے مطابق اپنا عمل رکھنا ہر زمانہ میں بالخصوص اس زمانہ میں اشد ضروری ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کا ایک ارشاد ایسا ہے کہ اگر آج ہم اپنے عمل کو اس کے مطابق کریں تو اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمیں فلاح دین و فلاح دنیا دونوں حاصل ہو جائیں گی لیکن مشکل یہ ہے کہ اس زمانہ میں لوگ اپنی دشواریوں کا حل ایسے مقام سے طلب کرتے ہیں جہاں پر وہ موجود نہیں ہوتا اور جہاں پر حل موجود ہے یعنی کتاب و سنت ہماری اس کی جانب توجہ نہیں ہے۔

دیکھا جارہا ہے کہ اسلام آج دنیا والوں کے نزدیک بالکل اجنبی اور غریب[1] ہو کر رہ گیا ہے۔ یعنی تعلیمات اسلام کسمپرسی[2] کی حالت میں ہیں اور حاملین سنت سے جو لوگ غیر مانوس ہو گئے ہیں اور اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی وہ آج ہمارے سامنے ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ بَدَأَ[3] الْاِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ غَرِيبًا كَمَا بَدَأَ فَطُوبٰى لِلْغُرَبَاءِ مِنْ أُمَّتِي قِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَمَنِ الْغُرَبَاءُ مِنْ أُمَّتِكَ قَالَ الَّذِينَ يُصْلِحُونَ مَا أَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِي مِنْ سُنَّتِي یعنی آپ نے ارشاد فرمایا کہ اسلام غربت کی حالت میں شروع ہوا اور پھر عنقریب لوگوں میں اجنبی اور غیر مانوس ہو جائے گا جس طرح سے کہ ابتداء میں تھا بس میری اُمت کے جو غرباء ہیں ان کے لئے خوشخبری ہے۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ آپ کی اُمت کے غرباء کون لوگ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو میری اُن سنتوں کی اصلاح کرتے ہیں جسے میرے بعد لوگوں نے فاسد کر دیا ہے۔

اس حدیث کے تحت صاحب مدخل لکھتے ہیں کہ (اس) حدیث کے مضمون کو دیکھو اور جس کو رونا ہو وہ اپنے نفس پر روئے اور اہل اسلام کی غربت پر روئے اور عاملین بالسنۃ کی غربت یعنی ان کی کسمپرسی پر روئے۔ (بیاض حضرت والا ص۲۷)

عالم ربانی حقانی کا اللہ و رسول کے یہاں بڑا درجہ ہے باقی یہ کہ عالم ربانی کون ہے تو اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنئے۔ فرماتے ہیں کہ ہر عالم کے پاس مت بیٹھو بجز اس عالم کے جو تمہیں پانچ چیزوں کے ترک کا حکم کرتا ہو اور پانچ چیزوں کے اختیار کرنے کا حکم کرتا ہو یعنی شک کے ترک کرنے کا حکم کرتا ہو اور یقین کے اختیار کرنے کا حکم کرتا ہو اسی طرح ریاء کے چھوڑنے کا حکم کرتا ہو اور اخلاص کے اختیار کرنے کا حکم کرتا ہو اور دنیا کی محبت سے نکال کر زہد کی جانب متوجہ کرتا ہو اور کبر اور رعونت سے نکال کر تواضع اور مسکنت کی جانب دعوت دیتا ہو اور عداوت و دشمنی سے نکال کر نصیحت کی جانب تم کو دعوت دیتا ہو۔ (فاتحۃ العلوم ص۱۱ بیاض جدید ص۵)

دیکھئے اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کو عالم حقانی کی معرفت کرا رہے

ہیں اور وہ یہ کہ فرمارہے ہیں کہ عالم ربانی کو اس کے کلام اور گفتگو سے پہچانو یعنی یہ دیکھو کہ وہ تمہیں یقین کی طرف اخلاص کی طرف زہد کی طرف اور تواضع کی طرف اور مودت اور نصیحت کی طرف دعوت دے رہا ہے یا نہیں. اسی طرح سے تمہیں شک سے ریاء سے رغبت الی الدنیا سے اور کبر سے اور عداوت سے نکال رہا ہے یا نہیں۔ اگر اس کے کلام میں یہ سب ترغیبات و ترہیبات موجود ہیں تب تو سمجھو کہ وہ عالم ربانی ہے اس کی مصاحبت اختیار کرو ورنہ اس سے احتراز کرو اور یہ سمجھو کہ سب سے بڑی چیز جس کی وجہ سے علما اپنے منصب سے ساقط ہو جاتے ہیں حب دنیا ہے۔

چنانچہ فاتحۃ العلوم میں ہے کہ جب علماء کے قلوب حب دنیا کی جانب مائل ہو جائیں یعنی وہ دنیا کو دین پر ترجیح دینے لگیں پس اس وقت اللہ تعالیٰ ان سے حکمت کے چشمے سلب کر لیتا ہے اور ان کے قلوب سے ہدایت کے چراغ کو بجھا دیتا ہے اس وقت تم جب ایسے عالم سے ملاقات کرو گے تو وہ تمہیں اپنے متعلق زبان سے یہ خبر دے گا کہ وہ اللہ سے ڈرتا ہے حالانکہ اس کے عمل میں کھلا ہوا فجور موجود ہوگا تو دیکھو کہ ایسے وقت میں زبانیں کیسی تر اور شاداب ہوں گی اور قلوب کیسے قحط زدہ اور خشک ہوں گے۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں عالموں کا یہ حال جس کو ہم نے ابھی بیان کیا ہے نہیں ہوا مگر اس وجہ سے کہ معلمین نے غیر اللہ کے لئے انھیں تعلیم دی اور متعلمین نے غیر اللہ کے لئے علم حاصل کیا (یعنی اخلاص سے دور ہیں ساری بات یہ ہے کہ نہ انھوں نے خدا کے لئے پڑھایا اور سکھایا.... .... اور نہ انھوں نے خدا کے لئے پڑھا اور سیکھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بیشک شیطان تم پر غالب ہو گیا ہے علم کے واسطے سے، عرض کیا گیا کہ یہ کیونکر یا رسول اللہ! فرمایا کہ وہ تم سے کہتا ہے کہ علم حاصل کرو اور عمل کی فکر نہ کرو جب تک کہ کل علم حاصل نہ کرلو چنانچہ اس کے اس کہنے کی وجہ سے انسان علم کا حریص ہو جاتا ہے اور برابر اس کی تحصیل میں کوشاں رہتا ہے اور عمل کو اپنے لئے ٹالتا رہتا ہے (یعنی یوں کہتا ہے کل کریں گے، پرسوں کریں گے یہی کہتا رہتا ہے) یہاں تک کہ مر بھی جاتا ہے اور عمل کی توفیق اس کو نہیں ہوتی۔ (فاتحۃ العلوم ص۱۹)

میں نے شروع میں حضرت عرباض بن ساریہؓ کی حدیث نقل کی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک وصیت میں سمع وطاعت کا حکم فرمایا تھا چونکہ آپ کا یہ ارشاد اس وقت کے حال کے بالکل مناسب ہے اس لئے آپ کو بھی اسے ہی سنانا مقصود تھا اور نہ صرف سنانا ہی بلکہ میں بھی اپنے لوگوں کو اس کی وصیت کرتا ہوں اگرچہ رسول اللہ

حضرت حکمت کے باطنی

یعنی زبان سے اپنے کو خائف بتائے گا حالانکہ عمل میں فجور ہوگا

گمراہ کر رہے ہیں۔

حضرت عرباض بن ساریہ کی حدیث

صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے بعد پھر کسی کی وصیت کی حاجت باقی نہیں رہ جاتی تاہم اتباع سنت کے خیال سے اپنے لوگوں کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ کتاب و سنت کے جملہ احکام کا لحاظ اپنے عمل میں رکھیں بالخصوص ان دونوں حدیثوں (یعنی حدیث عرباض بن ساریہؓ اور حدیث من لم یرحم صغیرنا الخ) سے جو اطاعت و فرمانبرداری کا مضمون مفہوم ہوتا ہے اس کا خاص اہتمام کریں کیونکہ فلاح دین اور فلاح دنیا دونوں اسی سے وابستہ ہیں۔ دونوں حدیثوں کا ترجمہ یہ ہے:۔

حضرت عرباض بن ساریہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک روز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو نماز پڑھائی پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور نہایت بلیغ انداز میں زبردست وعظ فرمایا جس کی تاثیر سے لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہ پڑے اور غلبۂ خشیت کی وجہ سے ان کے قلوب ڈر گئے۔ پس ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کی یہ نصیحت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا آپ ہم لوگوں کو رخصت فرما رہے ہیں اور یہ آخری نصیحت ہے۔ لہٰذا ہم کو کچھ وصیت فرمائیے (تاکہ ہم اس کو سنیں اور سمجھیں اور عمل کریں) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں اللہ کے تقویٰ کی اور سمع و طاعت کی اگرچہ تم پر عبد حبشی والی مقرر کردیا جائے اور جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھیں گے اس وقت تم لوگ میری سنت کو اور خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑنا اور اسی سے تمسک کرنا اور اس کو مضبوطی سے تھامے رہنا اور محدثات و بدعات سے بچنا اسلئے کہ ہر محدث بدعت ہے اور ہر بدعت ضلالت و گمراہی ہے۔

(مشکوٰۃ شریف ص۳۰)

دوسری حدیث کا ترجمہ یہ ہے:۔

کہ جس نے ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کیا اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہیں کی اور ہمارے عالموں کی تعظیم نہیں کی وہ ہم میں سے نہیں ہے یعنی اس نے ہمارے طریقہ اور ہمارے دین کے خلاف کام کیا اس لئے ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

التماس از جامع

ناظرین سے گذارش ہے کہ اس مضمون کو بار بار پڑھیں اور اپنے احباب و متعلقین کو بھی سنائیں نہایت ہی ضروری اور مفید باتیں بیان فرمائی گئی ہیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس وصیت نبوی پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما دیں۔ آمین

رسالۂ

حجت

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب
نور اللہ مرقدہٗ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

امابعد ۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حُفَّتِ الْجَنَّۃُ بِالْمَکَارِہِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّھَوَاتِ ـــــ (رواہ البخاری ومسلم) حدیث شریف میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا فرمایا تو جبرئیلؑ سے فرمایا کہ جاؤ اس کو دیکھو، جبرئیلؑ گئے اور جنت کو نیز ان تمام چیزوں کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے لئے اس میں مہیا فرمار کھی تھیں ۔ واپس آکر عرض کیا کہ اے پروردگار! قسم ہے آپ کے عزت و جلال کی وہ تو ایسی جگہ ہے کہ جو شخص بھی اس کو سن پائے گا وہ اس میں بغیر داخل ہوئے رہے گا نہیں ۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو مکروہات کی باڑھ سے گھیر دیا اور پھر جبرئیلؑ سے فرمایا کہ اب تو جا کر دیکھو ۔ جبرئیلؑ گئے اور دیکھ کر آئے اور عرض کیا کہ اے پروردگار! قسم ہے آپ کے عزت کی اب تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ شاید ہی اس میں کوئی داخل ہو سکے گا ۔

دیکھئے حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ جس طرح سے دنیا میں کسی باغ کی حفاظت کے لئے اس کو خار اور جھاڑ اور جھنکار سے روندھ دیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جنت کو مکروہات (یعنی نفس پر شاق ہونے والے احکام) سے گھیر دیا ہے اور اس کے داخلے کے لئے دشوار اور ناگوار اعمال کا دنیا میں انسان کا مکلف بنایا ہے ۔ مثلاً نماز کے لئے سردی میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا تہجد کیلئے نرم اور گرم بستر کو چھوڑنا ۔ فجر کی جماعت کے لئے اپنی میٹھی نیند کو قربان کرنا وغیرہ وغیرہ یہی سب احکام شرعیہ اور عبادات شاقہ جو نفس کے خلاف اور ناگوار طبع ہوتی ہیں ، جنت میں داخلہ کے لئے بمنزلہ باڑھ کے ہیں ۔ پس جس کو جنت مطلوب ہے اس کے لئے ان خاروں پر گزرنا بھی ناگزیر ہے ۔ اور یہ تو بالکل ظاہر بات ہے کہ راحت اور آرام تو سب ہی کو مطلوب ہوتا ہے عیش اور لذت کا کون شخص متمنی نہیں ہے لہٰذا چاہیئے تو یہ کہ جب آرام اور مزہ مرغوب ہے تو جن ذرائع اور طریقوں سے وہ آرام حاصل ہو سکتا ہے اس کی بھی تکلف کو گوارا کیا جائے تب ہی تو آرام کا لطف ہے

ورنہ بدون مشقت اُٹھائے راحت میں کیا مزا؟

حدیث شریف میں ہے کہ جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو پھر بھی جنت بہت خالی رہے گی اور وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے پُر نہ ہونے کا شکوہ کرے گی اور کہے گی کہ مجھے بھر دیجئے اس پر اللہ تعالیٰ ایک مخلوق پیدا فرما دیں گے اور جنت کو اس سے بھر دیں گے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے اس حدیث کو سن کر عرض کیا کہ حضرت پھر تو یہ لوگ بڑے مزے میں ہوں گے کہ کچھ کرنا ورنا نہیں پڑا اور جنت ان کو یونہی مل گئی۔ مولانا نے فرمایا کہ اجی خاک مزا ان کو آئے گا" قدر نعمت کے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید" یعنی راحت کا مزہ تو وہ جانتا ہے جو پہلے مشقت اٹھا چکتا ہے۔ مزا تو انشاء اللہ تعالیٰ ہمیں آئے گا کہ دنیا میں تکلیفیں جھیلیں ہیں۔ مشقتیں برداشت کی ہیں اور سب سے آخر میں موت کی تکلیف برداشت کی ہے۔ پھر آخرت میں حساب کتاب کی۔ پھر پل صراط کی۔ غرض کہ مسلسل تکلیف ہی تکلیف میں رہے۔ لہٰذا جب ان سب منازل سے گزر کر جنت میں پہونچیں گے تو اس کا پورا لطف اور مزا ہم کو آئے جو جنت ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں رکھ دیئے گئے۔ ان کو پتہ ہی نہیں کہ مصیبت اور مشقت ہوتی کیا ہے؟ اور جب اس کا علم نہیں تو راحت کا مزہ بھی وہ غریب کیا جان سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں آتا ہے کہ جنتی جب جنت میں داخل ہو جائیں گے تو وہاں کی راحت و آرام اور جنت اور اس کی نعمت کو دیکھ کر کہیں گے کہ:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۝

تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہم سے رنج و غم دور کر دیا واقعی ہمارا رب بخشنے والا ہے قدر کرنے والا ہے جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اتارا جہاں نہ ہم کو کوئی کلفت پہونچے گی اور نہ ہم کو کوئی خستگی پہونچے گی۔

یعنی دنیا کی تمام تکالیف سے خلاصی پانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے اور یوں کہیں گے اَلَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ تو اب اس کو یہ جنتی لوگ کیسے کہیں گے؟ کیونکہ انھوں نے تو حزن کبھی دیکھا ہی نہیں ہے نہ اس میں کبھی رہے پھر اس سے نکلنے کو کیسے کہہ سکتے ہیں اور اگر کہیں گے تو جھوٹ ہوگا اس لئے یہ لوگ نہ تو یہ کہہ سکیں گے اور نہ ان کو جنت کی اور اس کی نعمتوں کی قدر ہی ہوگی کیونکہ اس کے خلاف دوسری حالت میں کبھی رہے ہی نہیں اور اہل دنیا چونکہ

رہ چکے ہیں اس لئے ان کو قدر ہوگی۔ وبضدھا تتبین الاشیاء

جو شخص پہلے رنج و محن میں رہ چکا ہو اسی کو نعمت اور راحت کی قدر ہو سکتی ہے چنانچہ یہ دنیا دار الابتلاء ہے لہٰذا اس کے بعد ہی جنت کا بھی لطف ہے اور جس نے محنت و مشقت ابتلاء اور آزمائش کا نام بھی نہ سنا ہوگا ان کا برداشت کرنا تو الگ رہا وہ راحت و آرام کی قدر کیا جان سکتا ہے؟ دنیا میں جس کا جتنا زیادہ ایمان ہوتا ہے اسی قدر ابتلاء اور آزمائش بھی اس کی زیادہ ہوتی ہے اور پھر اسی کے بقدر انسان آخرت میں راحت و لذت بھی دیکھے گا۔

حدیث شریف میں ہے کہ جنت چٹیل میدان ہے اور تم جو سبحان اللہ، الحمد للہ وغیرہ یہاں زبان سے کہتے ہو وہاں جا کر یہی درخت لگ جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے اعمال کا ثمرہ وہاں اس شکل میں دیکھیں گے اور آدمی کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ اسکے فلاں کلمہ کا بدلہ ہے مثلاً یہ سبحان اللہ کا عوض ہے اور یہ الحمد للہ کا ثمرہ ہے لہٰذا آپ بھی جب مرتبہ چاہتے ہیں تو پھر عمل سے نہ گھبرائیے اور راحت چاہتے ہیں تو مشقت برداشت کیجئے۔ مشقت پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔

احیاء العلوم میں امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے معرفت سمعان نامی ایک راہب سے سیکھی اس طرح کہ میں ایک دن اس کے عبادت خانہ میں گیا اور اس سے پوچھا کہ تم اس جگہ کب سے مقیم ہو؟ اس نے کہا ستر سال سے، میں نے کہا کھاتے کیا ہو؟ اس نے کہا اے حنیفی! یعنی اے مسلم! اس سوال سے تیرا کیا مقصد ہے میں نے کہا کچھ نہیں صرف جاننا چاہتا ہوں، اس نے کہا کہ ہر شب میں صرف ایک چنا کھاتا ہوں، میں نے کہا تمہارے قلب میں ایسی کون سی قوت ہے جس کی وجہ سے تمہیں صرف ایک چنا روزانہ کفایت کر جاتا ہے؟ کہا جب تم نے پوچھا ہے تو سنو! وہ دیکھو تمہیں سامنے کوئی بستی نظر آرہی ہے؟ کہا ہاں، کہا اس بستی کے لوگ میرے بہت معتقد ہیں چنانچہ سال بھر میں ایک دن وہ سب یہاں آتے ہیں اور میرے اس گرجے کو لیپ پوت کر خوب آراستہ و پیراستہ کرتے ہیں پھر اس کے گرد طواف کرتے ہیں اور اس دن میری بہت ہی زیادہ تعظیم و تکریم کرتے ہیں جس سے مجھے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ تو جب میرا نفس عبادت میں کسلمند ہوتا ہے تو میں اس کو اسی ایک گھڑی کی عزت اور خوشی کی یاد دلاتا ہوں بس پھر وہ چست ہو کر عبادت میں لگ جاتا ہے۔

پس میں تو صرف اپنی اسی ایک گھڑی کی عزت کے خاطر سال بھر تک عبادت اور مجاہدہ کی مشقت برداشت کرتا ہوں، لیکن اے حنیفی! تم مجھ جیسا نفس پرور نہ ہونا بلکہ صرف ایک گھڑی کی

مشقت اٹھالو تاکہ ابدالآباد کی راحت اور چین تمہیں نصیب ہو کیوں کہ اس دنیا کی یہ قلیل زندگی آخرت کی طویل مدت کے مقابلہ میں ایک ساعت اور ایک گھڑی ہی ہے بلکہ اس سے بھی کم کہ یہ دنیا فانی ہے اور وہ باقی حضرت ابن ادہم کہتے ہیں کہ اس راہب کی اس بات نے بس میرے قلب کے رگ و ریشہ میں معرفت کو پیوست کر دیا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ یہ کافی ہے یا اور کچھ بتلاؤں؟ میں نے کہا کہ ضرور بتلائیے۔ اس نے کہا کہ اچھا گرجے سے نیچے اتر و میں اتر گیا تو اس نے اوپر سے ایک برتن لٹکایا جس میں بیس دانے چنے کے تھے اور مجھ سے کہا کہ اس سامنے والی بستی میں جاؤ ان لوگوں نے میرے اس لٹکانے کو دیکھ لیا ہے۔ جب بستی میں پہونچا تو سب عیسائی میرے گرد جمع ہو گئے اور کہا کہ اے حنیفی! بتاؤ ہمارے شیخ نے تمہاری طرف کیا چیز لٹکائی تھی؟ میں نے کہا کہ اپنے کھانے کی چیز میں سے کچھ تھوڑا سا مجھے دیا ہے ان لوگوں نے کہا کہ آپ اس کو کیا کیجئے گا ہم لوگ اس تبرک کے زیادہ مستحق ہیں۔ پھر کہا کہ اچھا دام بتائیے میں نے کہا کہ بیس دینار لوں گا ان سب نے فوراً مجھے بیس دینار دیدیئے۔ میں اس کے بعد راہب کے پاس واپس آیا۔ اس نے کہا کہ اے حنیفی! تم نے ان دانوں کو کیا کیا؟ میں نے کہا کہ اس بستی والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ کہا کس قیمت پر؟ میں نے کہا بیس دینار کے عوض پر فروخت کیا ہے۔ اس نے کہا تم نے بڑی غلطی کی اگر تم ان سے بیس ہزار دینار بھی مانگتے تو وہ تمہیں دیدیتے۔ پھر کہا دیکھو یہ عزت تو اس شخص کی ہے جس کی تم پرستش بھی نہیں کرتے، اسی پر قیاس کر و کہ اس ذات کی کیسی کچھ عزت ہوگی جس کی تم عبادت بھی کرتے ہو لہٰذا اے حنیفی! بس اپنے رب کی جانب متوجہ ہو جاؤ اور ادھر ادھر کی آمد و رفت ترک کر دو۔

واقعی اس راہب نے خوب ہی بات کہی آج اگر ہم کو آخرت کے انعامات کا یقین ہو جائے اور ان کے مزے کا صحیح اندازہ ہو جائے تو سارے مجاہدات اور مشقتیں ہمارے لئے آسان ہو جائیں اور دنیا میں ان سب تکالیف اور مشقتوں سے دو چار ہونے کے بعد ہی آخرت کی نعمتوں کا لطف آئے گا حضرت مولانا تھانوی کبھی فرماتے تھے اور وہی اس قسم کی باتیں بھی کہہ دیتے تھے اور دوسرا کوئی ہوتا تو اپنے متعلق یہ کہتا بھی نہیں مگر بزرگوں میں تو نفس ہوتا نہیں اس لئے وہ صاف صاف کہہ دیا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جب کام کرتے کرتے تھک جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ نفس اب کام کرنے سے جی چراتا ہے تو اس سے کہتا ہوں کہ کام کر لو گھر میں آج بہت عمدہ عمدہ کھانے پکے ہیں بس پھر وہ کام کرنے لگ جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ کھانا تو کچھ کام

کرنے کے بعد ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اب دیکھئے بزرگان دین تو یہ فرماتے ہیں اور آج کل ہمارے نوجوانوں کا یہ حال ہے کہ بالکل ہی نکما اور بطّال رہنا انکو پسند ہے ان کے نزدیک کام اور محنت وغیرہ کوئی چیز نہیں ہے بلا کام کئے ہوئے ہی ان کو کھانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ دنیا میں اس طرح سے پریشانیاں اور تکلیف اٹھا چکنے کے بعد جب جنت اور اس کی نعمت اس کو ملے گی تو اس کی قدر ہوگی۔ اب مومن کو چونکہ جنت اور درجات جنت محبوب و مطلوب اور مقصود ہیں اس لئے اس کی راہ و طلب میں جن تکالیف کا بھی سامنا پڑے مومن اس کو بھی بخوشی برداشت کرتا ہے بلکہ اس کو اس راہ کی تکلیف بھی اسی طرح محبوب ہوتی ہے جیسے خود جنت اور جو شخص اس سے گھبراتا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ طالب جنت ہی نہیں۔

جنت ایسی چیز نہیں ہے کہ کوئی اس کی رغبت اور خواہش نہ کرے مگر جو لوگ جنت کو مفت سُفت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے تکالیف برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں بلکہ اس سے گھبراتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو بوالہوس قرار دیتے ہیں اور ان کی اس حالت پر نکیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ۔

کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں جا داخل ہوگئے حالانکہ تم کو ہنوز ان لوگوں سا کوئی عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے گزرے ہیں ان پر ایسی ایسی اور سختی واقع اور ان کو یہاں تک جنبشیں ہوئیں کہ پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے بول اُٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد کب تک یاد رکھو بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد نزدیک ہے۔

اسی قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ :۔

فيه اشارة الى ان الوصول الى الله تعالى والفوز بالكرامة عنده برفض الهوى واللذات ومكابدة الشدائد والرياضات كما قال عليه الصلوٰة والسلام حفت الجنة بالمكاره وحفت النار بالشهوات۔ (بیضاوی شریف ص ۵۲)

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ تک پہنچنا اور ان کے نزدیک اکرام وعزت پانا صرف خواہشات اور لذائذ ہی کے ترک کرنے اور مشقتوں کے جھیلنے سے ممکن ہے جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا ہے کہ جنت ناگواریوں سے اور دوزخ شہوات اور خواہشات سے گھیر دی گئی ہے۔

نیز ترمذی شریف باب الزہد میں یہ حدیث ہے کہ :- من خاف ادلج ومن ادلج

بلغ المنزل الا ان سلعة الله غالية - الا ان سلعة الله هي الجنة۔ (ترمذی شریف)

جس کے دل میں ڈر ہوگا وہ منھ اندھیرے ہی سفر شروع کر دے گا اور جو ایسے وقت روانہ ہوگا وہی منزل پر بھی پہونچ سکے گا۔

یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کا سودا بڑا بیش قیمت ہے اور سن لو کہ اللہ کا وہ سودا جنت ہے۔ سبحان اللہ دیکھئے کیسے عجیب عنوان سے اللہ اور رسول نے مومنین کو جنت کا شوق دلایا ہے۔ جنت کی نعمتوں کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے۔

مالا عین راءت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔

نہ تو کسی آنکھ نے انھیں دیکھا ہوگا اور نہ کسی کان نے سنا ہوگا اور نہ کسی کے قلب میں ہی اُن کا تصور ہوا ہوگا۔ پس ایک تو جنت کی اشیا فی نفسہا عمدہ پھر اُس پر یہ کہ دنیا کے تعب ومشقت کے بعد جب وہ ملیں گے تو پھر اُن کی لذت کا کیا پوچھنا۔ اس کو پاکر یہ دنیا والے جس دل سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور اس کی نعمت کا شکر ادا کریں گے جنت والی مخلوق ان لوگوں کا سا وہ دل کہاں سے لائے گی؟

غرض جیسا کہ میں نے ابھی حضرت مولاناؒ کا قول نقل کیا ہے کہ کھانا کا مزہ تو کام کرنے کے بعد ہی ہے، اسی طرح سے سمجھئے کہ ہر اس خوشی میں لطف زیادہ حاصل ہوتا ہے جو غم کے بعد ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا عام طور پر آج یہ حال ہو گیا ہے کہ نفع میں شریک ہونا چاہتے ہیں مگر کمائی میں شرکت نہیں کرنا چاہتے اور یہ چیز کچھ دنیوی ہی امور کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ نیک لوگ بھی عمل سے گھبراتے ہیں۔ چنانچہ ولایت اور بزرگی سب کو اچھی لگتی ہے دوسروں کا ہاتھ چومنا کیسا اچھا معلوم ہوتا ہے مگر ہم اگر یہ کہیں کہ اس کو آپ بھی حاصل کیجئے تو کہتے ہیں کہ ارے صاحب اس کے لئے تو عمل اور مجاہدہ کرنا ہوگا سو آپ کے لئے چاہے آسان ہو ہمارے لئے بہت مشکل ہے اسی کو ایک حکیم شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

دین کا ادّعا ہے خلق میں سہل حق ہو راضی یہ بات مشکل ہے
اٰمَنُوْا میں تو سب کے آگے ہیں عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مشکل ہے
چشم ظاہر جسے نہ دیکھ سکے اس طرف التفات مشکل ہے
وصل ہو یا فراق ہو اکبر جاگنا ساری رات مشکل ہے

غرض ولایت بھی اچھی چیز ہے ، نہایت ہی عزیز ہے اور بہت ہی لذیذ ہے مگر جانتے بھی ہیں کہ اس سے پہلے کیا کرنا ہوتا ہے ؎

خون دل پینے کو اور لخت جگر کھانے کو　　　یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

اور اسی کے لئے کہا گیا ہے کہ ؎

سر فروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر　　　تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر

اب اگر ولایت اچھی معلوم ہوتی ہے اور اس کو چاہتے ہو تو پھر اس کے لئے جس راہ سے گذرنا ہوتا ہے اس کو بھی چاہو اور اس کو حاصل کرو اور جانتے ہو وہ راہ کون سی ہے؟ وہ راہ تقویٰ ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ۔

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم و لا یحزنون ○ الذین آمنوا وکانوا یتقون ○

سن لو کہ اولیاء اللہ پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ یہ لوگ غمگین ہوں گے اور یہ لوگ وہ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا ۔

اور اسی کو اکبر الٰہ آبادی مرحوم بھی اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں کہ ؎

اس عہد میں اے اکبر ہم اس کو ولی سمجھے　　　تھوڑا سا بھی جس دل میں اللہ کا ڈر دیکھا
گردوں کے ستم دیکھئے اجڑا ہوا گھر دیکھا　　　دیکھا تو نہ جاتا تھا ناچار مگر دیکھا
اب آنکھ اٹھانا ہے ایمان کی بربادی　　　اس بت کی نظر دیکھی اور اس کا اثر دیکھا
تکبیر ہی اچھی تھی تقریر میں جھگڑے تھے　　　ترک ہم نے کیا اس کو جس میں شر دیکھا
دنیا کی یہ ذہنیت عقبیٰ کے وہ ہیں علے　　　غافل نے ادھر دیکھا عاقل نے ادھر دیکھا

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہر آرام سے پہلے مشقت کا ہونا ضروری ہے اور رنج و محن کے بعد جو راحت ملتی ہے اسی میں لذت ہوتی ہے ۔ تو وہ مکارہ پر بھی خوشی خوشی عمل کرتا ہے اور اسی سے اس کا طالب یا غیر طالب ہونا بھی معلوم ہو جاتا ہے ۔ اب آپ لوگوں کو یہ سب باتیں کیسی اچھی لگتی ہوں گی مگر میں یہ جو عرض کر رہا ہوں کہ مرتبہ چاہتے ہو تو کچھ کام بھی کرنا ہوگا ، یہ بھی سمجھ میں آتا ہے یا نہیں بات یہ ہے کہ آپ لوگ دینی مجالس میں آتے ہیں اور جو کچھ سنتے ہیں اس کا اثر بھی لیتے ہیں مگر جہاں اپنے اپنے گھر گئے اور کسی نے کان میں کچھ اور بات کہہ دی اور آپ پر دوسرا اثر ہو گیا ۔ جیسے کہ ایک صاحب تھے وہ مسجد میں فجر کی نماز کے بعد ذرا کچھ دیر تک رہتے تھے اور اپنے

معمولات وغیرہ پورے کرکے تب گھر جاتے تھے تو بیوی بہت خفا ہوتی اور یہی کہتی کہ تم تو تمام دن مسجد ہی میں رہتے ہو دیکھا آپ نے وہ بیچارے گھنٹے آدھ گھنٹے کے لئے رُک جاتے ہوں گے تو اسکو کہنی کہتی کہ سارا دن مسجد میں گزار دیتے ہو اسی کو کہتا ہوں کہ جب آپ بھی یہ سب سُنیں گے تو اُس کا مقابلہ آسان نہیں ہوگا۔ یہ دنیا بھی دین کا پورا مقابل اور دیندار کے لئے مستقل آفت ہے

دنیائے دنی محلِ آفات بھی ہے — فکرِ روزی مُخلِّ اوقات بھی ہے

طرّہ پھر اُس پہ یہ کہ مرنا بھی ضرور — جینا رہے آدمی تو اِک بات بھی ہے

بڑے بڑے اس منزل میں فیل ہو گئے ہیں۔ حضرت حافظ ضامن صاحب جو ہمارے حضرت حاجی صاحب کے پیر بھائی تھے ان کے پاس ایک نوجوان آمد و رفت رکھتا تھا حافظ نے اس سے فرمایا ارے میاں یہاں کیا آتے ہو، بیوی تم سے لڑے گی اُس نے کہا حضرت بیوی کیا لڑ سکتی ہے اسکی ایسی کی تیسی، لیکن کچھ دنوں کے بعد اُس نے واقعی آنا چھوڑ دیا۔ پھر بہت دنوں کے بعد ایک دن جنگل سے مویشیوں کو لے کر آرہا تھا اُدھر سے حافظ صاحب جا رہے تھے راستہ میں ملاقات ہوگئی حضرت نے فرمایا السلام وعلیکم۔ لڑکا حضرت کو دیکھ کر ہنسا اور کہا کہ حضرت آپ ٹھیک فرماتے تھے وہی ہوا بیوی مجھے لڑی اور کہنے لگی سنو جی! یا تو انھیں کے پاس آیا جایا کرو اور مجھ کو چھوڑ دو یا میرے پاس رہو۔ اس لئے حضرت آنے سے مجبور ہو گیا۔ اسی کو مولانا رومؒ نے لکھا ہے کہ اس راہ میں لوگوں کے پشتے لگے ہوئے ہیں کوئی یہاں گرا پڑا ہے، کوئی دو قدم آگے چل کر گر گیا، کوئی ذرا دور اور چلا اور گر گیا کوئی ذرا اور چلا اور گر گیا غرضیکہ یہاں سے لے کر وہاں تک اس راہ میں لوگوں کے پشتے کے پشتے لگے ہوئے اور بہت کم لوگ ایسے ہوں اس راہ کو سلامت لے گئے ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ ناقصین کی تعداد زیادہ ہے اور کاملین اور واصلین میں سے تو کوئی ہی کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہے۔ اس کو حضرت ضامن صاحبؒ سمجھتے تھے۔ اسی لئے اس سے کہا تھا کہ میرے پاس نہ آؤ یہ راہ دشوار ہے چل نہ سکو گے اور اگر خود ہمت بھی کر جاؤ گے تو یہ گھر والے نہ چلنے دیں گے مگر اُس کی سمجھ میں اس وقت نہ آیا۔

جانتے ہیں یہاں ان صاحبزادے سے کیا غلطی ہوئی؟ ان کو چاہئے تھا کہ جب حضرتؒ نے یہ فرمایا تھا کہ تمھاری بیوی تم سے لڑے گی تو یہ نہ کہتے کہ کیسے لڑے گی! اُس کی ایسی کی تیسی اُس میں تو اپنے اوپر اتکال اور دعویٰ پایا گیا جو ایک بزرگ کے ارشاد کے مقابلہ میں تھا، بس یہیں سے یہ مارے گئے۔ ان کو یہ نہیں کہنا چاہئے تھا بلکہ کرتے یہ کہ حضرت ہی سے کہتے کہ حضرت واقعی میرے بس کا

نہیں ہے آپ کے پاس آتا ہی اس لئے ہوں کہ ایسے وقت میں آپ ہی مجھے سنبھالئے ورنہ میں تو ہلاک ہو جاؤں گا۔ نہایت ہی عاجزی سے یہ کہنا چاہئے تھا اس وقت حضرت یہی فرماتے کہ اچھا تو جب تم نے اپنے کو میرے حوالہ کیا تو میں نے بھی تمھارے معاملہ کو خدا کے حوالہ کیا بس اس کا کام بن جاتا۔ پھر اس کے بعد اب بیوی کی مجال تھی جو اس کو روک سکتی اور خدا کی راہ سے ہٹا دیتی۔ مگر اس وقت تو انھوں نے بڑے زور سے دعوی کر دیا اور بیوی کی ایسی تیسی کرنے لگے اور بعد میں اسی کے مرید ہو گئے یہ کیا ہے؟ آدمی کو چاہئے کہ شیخ سے تو اپنا صاف صاف حال کہدے اور اپنا کچا چٹھا اس سے کہہ سنا دے اور ان سے کہے کہ میں ان حالات میں مبتلا ہوں۔ اب آپ ہی مجھے سنبھالئے تو دیکھے وہ سنبھالتے ہیں یا نہیں؟ مگر اب ان سے بھی چوری کی جائے تو پھر کام کیسے چلے؟

جو لوگ اصلی ولایت چاہتے ہیں اور بزرگی کے سچے طالب ہوتے ہیں وہ ایسے تھوڑے ہی ہوتے ہیں وہ تو اس راہ میں سر و جان کی بازی لگا دیتے ہیں اور جب اپنے کو اس طرح سے خدا کی طلب میں پیش کرتے ہیں تو پھر خدائے تعالیٰ بھی اپنی راہ ان کے لئے آسان فرما دیتے ہیں ورنہ یہاں معاملہ اپنے بس اور اختیار کا نہیں ہے بزرگوں سے سنا ہے کہ ادھر ہی سے فضل ہو جائے تو ہزار برس کی راہ ایک پل میں قطع ہو جائے ورنہ اس طریق کے ایک ہی خار میں الجھ کر آدمی اپنی عمر ہی کھو دے پس جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سچے طالب ہیں وہ ولایت کے محبوب ہونے کی خاطر راہ کی سب مکارہ کو محبوب رکھتے ہیں اور دشواریاں پیش آنے کے وقت بجائے پریشان ہونیکے یہ کہتے ہیں ؎

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ　　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

سچے طالب اور جھوٹے طالب میں یہی تو فرق ہوتا ہے کہ وہ تو دوست کی راہ کے مکروہات کو بھی دوست رکھتا ہے اور جب محبت کا نام لیتا ہے تو پھر مشقت کو بھی برداشت کرتا ہے اور جھوٹا شخص صرف دعوی ہی دعوی کرتا ہے اور امتحان کے وقت بھاگ نکلتا ہے اسی کو کسی نے کہا ہے ؎

وجائزۃ دعوی المحبۃ فی الھوی　　　ولکن لا یخفی کلام المنافق

یعنی کسی کے عشق میں محبت کا دعوی تو ممکن ہے اور بہت آسان ہے لیکن منافق کی بات چھپتی نہیں یہ معلوم ہی ہو جاتا ہے کہ کون محب صادق ہے اور کون محض مدعی اور اس کا علم امتحان کے وقت ہوتا ہے۔

آپ نے نہیں سنا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الاولیاء

ثم الامثل فالامثل یعنی آزمائش میں سب سے بڑھ کر انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں پھر اولیاء کرام اور پھر اس کے بعد جو جس درجہ کا ہوا اسی کے مطابق اس کی آزمائش ہوتی ہے۔ اور یہ اس لئے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی ولایت بھی چونکہ بڑی ہوتی ہے اس لئے ان حضرات کی آزمائش بھی شدید ہوتی ہے پس ولایت اور بزرگی جو آپ کو اچھی طرح معلوم ہوتی ہے تو کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ جو لوگ ولی ہوتے وہ کیسے ہو جاتے ہیں ؎

خون دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

بہت دنوں تک خونِ دل پینا پڑتا ہے اور عرصۂ دراز تک لخت جگر کھانا پڑتا ہے تب جا کر کہیں ولایت ملتی ہے۔ جن لوگوں کو آج آپ بزرگ اور ولی کہتے ہیں جانتے بھی ہیں کہ انھوں نے کیسا کیسا مجاہدہ کیا ہے اور ایک مدت تک نفس سے جنگ کی تب یہ مرتبہ ملا ہے۔ اسی کو کہتا ہوں کہ آدمی نفع اور آمدنی میں تو شریک ہو اور کام اور کمائی میں شریک نہ ہو یہ کیسا ہے؟ ولایت پسند ہے مگر مجاہدہ سے بھاگتے ہیں۔ جنت پسند ہے لیکن مکارہ گوارہ نہیں۔ محبت مرغوب ہے مگر ابتلاء اور آزمائش سے بچنا چاہتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا یہی مخلص لوگ ہیں؟ محبت کا دعویٰ اور امتحان سے گھبرانا۔ اللہ تعالیٰ کے طریق کا تو کہنا ہی کیا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیوی محبوب بھی اپنے محب کا امتحان لیتے ہیں مثنوی میں مولانا رومؒ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کسی معشوق نے اپنے عاشق سے شب میں دو بجے ملاقات کا وعدہ کیا، عاشق صاحب برابر جاگتے رہے لیکن جب وقت قریب ہوا اور رات زیادہ ہوئی تو سو گئے، اسی کو اکبر الہ آبادی مرحوم نے کہا تھا کہ ؎

وصل ہو یا فراق ہو اکبرؔ جاگنا ساری رات مشکل ہے

حسب وعدہ جب دو بجے معشوق آیا تو ان کو سوتا ہوا پایا بہت ناگوار ہوئی کہ عشق کا دم بھرتا ہے اور اس کے ساتھ یہ غفلت اس کے بعد جواب میں اس نے یہ کیا اس کے سینہ پر کچھ بسکٹ اکچھ مٹھائی اور دو ایک کھونے رکھ کر چلا گیا جب اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ملاقات کا وقت تو گزر چکا ہے اور محبوب کا پتہ نہیں ہے مگر کچھ چیزیں موجود ہیں ایک طرف اس کے نہ آنے کا افسوس بھی ہوا لیکن ان چیزوں کے موجود ہونے پر تعجب بھی تھا صبح کو کسی اہل بصیرت سے اپنے اس واقعہ کا ذکر کیا اُسنے کہا کہ کیا کسی شخص نے تمہارے پاس آنے کا وعدہ کیا تھا؟ کہا ہاں میرا ایک معشوق ہے اُس نے شب میں آنے کا وعدہ کیا تھا میں انتظار کرتے کرتے سو گیا۔ وہ تو آیا نہیں، جب اٹھا تو یہ تمام چیزیں اپنے سینے پر موجود پائیں۔ اُس نے کہا نہیں وہ آیا تھا اور تم کو سوتا پاکر ناراض ہو کر چلا گیا اور زبانِ

اشارات میں کہہ گیا ہے کہ آپ ناحق عشق کا دم بھرتے ہیں ابھی آپ اس کوچہ میں طفل مکتب ہیں لہذا جسطرح کہ بچے مٹھائی وغیرہ کھاتے ہیں گھنگھنا بجاتے ہیں اسیطرح آپ بھی کیجئے اور آئندہ عشق کے دعویٰ سے باز آجائیے دیکھا آپ نے عشاق مجازی کا ان کے معشوق کی طرف سے اس طرح امتحان لیا جاتا ہے اب جو ناقص اور مدعی ہوتے ہیں وہ فیل ہو جاتے ہیں اسی کو میں نے کہا تھا کہ ؎

مولانا رومؒ نے عشق مجازی کا یہ واقعہ بیان کر کے عشاق حقیقی کو تنبیہ فرمائی ہے کہ محبت کا دم بھرنا تو آسان ہے مگر امتحان میں پورا اترنا مشکل ہے کیونکہ جو شخص دعویٰ میں سچا ہوتا ہے تو وہ اپنے دعویٰ کی دلیل بھی رکھتا ہے اور جو جھوٹا ہوتا ہے تو خود دلیل اس کی تکذیب کر دیتی ہے دنیا دار ابتلاء ہے یہاں ہر شخص کا امتحان ہو جاتا ہے۔ انبیا کا بھی اور اولیا کا بھی، باقی یہ حضرات چونکہ سچے ہوتے ہیں اسلئے امتحان میں پورے اُترتے ہیں اور جو لوگ جھوٹے ہوتے ہیں اور محض مدعی ہوتے ہیں وہ بھاگ نکلتے ہیں ایک مرتبہ مجھے یہ خیال ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کا بھی ابتلا اور ان کی بھی آزمائش فرماتے ہیں حالانکہ وہ خاص الخاص بندے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کے انتخاب سے ہوتے ہیں اور اولیا، تو اپنے کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں فنا ہی کر دیتے ہیں اور ان کی ہر مرضی پر راضی رہتے ہیں۔ پھر ان کی آزمائش کیوں ہوتی ہے؟ پھر اس کا جواب ذہن میں آیا کہ یہ آزمائش ان کے لئے نہیں ہوتی بلکہ اس لئے ہوتی ہے کہ جھوٹے لوگ اس میں نہ داخل ہو سکیں اور پھر یہ کہ ان حضرات کو اس ابتلا میں لذت بھی ملتی ہے کیونکہ ضرب الحبیب زبیب چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش کا واقعہ مشہور ہی ہے کہ آپ کے تمام جسم میں کیڑے پڑ گئے تھے صرف زبان محفوظ تھی وہ بھی اس لئے کہ ناطق بذکر اللہ تھی۔ غرض آپ کی بیماری اس درجہ شدید تھی کہ سارے عزیز و اقارب ہٹ گئے بجز آپ کی بیوی کے کہ وہ تو برابر آپ کی تیمارداری کرتی رہیں، ایسا سخت تو ابتلا تھا مگر اس میں آپ کو ایسی لذت ملتی تھی کہ اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اس طرح سے کہ صبح و شام ایک آواز حق تعالیٰ کی جانب سے آتی تھی کہ "ایوبؑ مزاج کیسا ہے" اب آپ خود خیال فرمائیے کہ جس محبوب نے مرض دیا ہو وہی مزاج پرسی بھی کرے تو ایک عاشق صادق کو اس میں کیسا کچھ لطف ملتا ہوگا۔ بالخصوص جب کہ یہ معاملہ محبوب حقیقی کی جانب سے ہو کسی نے خوب کہا ہے ؎

درد از یار است درمان نیز ہم　　دل فدائے یار شد جاں نیز ہم

معلوم ہوا کہ ان حضرات کا ابتلا، دوسروں کے اعتبار سے ہوتا ہے کہ وہ نہ گھس سکیں نہ کہ ان حضرات کے اعتبار سے کیونکہ یہ تو اس آزمائش سے خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور نہایت ہی مسرت کے ساتھ اس حال میں یہ کہتے ہیں ؎

ہم نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا پھر کلیجہ رکھ دیا دل رکھ دیا، سر رکھ دیا
قطرۂ خونِ جگر سے کی تواضع عشق کی سامنے مہمان کے جو تھا میسر رکھ دیا

کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

اگرچہ عشق میں آفت بھی ہے بلا بھی ہے مگر برا نہیں یہ درد کچھ بھلا بھی ہے

پس اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے نیک بندوں کی جو آزمائش ہوتی ہے اس میں گو ان حضرات کو کچھ جسمانی تکلیف ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ روحانی اور قلبی مسرت بھی حاصل ہوتی ہے علاوہ اس کے اللہ تعالیٰ کی ان مقبولین کی آزمائش میں اور نہ جانے کیا کیا مصالح ہوتی ہیں باقی اس سے ان حضرات کو رسوا کرنا مقصود نہیں ہوتا اس پر ایک واقعہ سنئے۔

ایک بزرگ سے اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ تھا کہ ان کو روزی مل جاتی تھی اور انھوں نے بھی اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا تھا کہ غیر کی جانب ہاتھ نہ بڑھاؤں گا ایک دفعہ ایک باغ میں سیر کو گئے میوے درختوں پر لدے ہوئے تھے بس بھول کر ایک پھل کی جانب ہاتھ بڑھا ہی تو تھا پھل توڑا نہیں مگر ہاتھ تو پھیلا ہی دیا۔ اتفاق ایسا کہ اسی وقت پاس کے باغ میں کچھ ڈاکو ٹھہرے ہوئے تھے سپاہی آگئے ڈاکوؤں کے تعاقب میں دوڑے سامنے یہی بزرگ نظر پڑ گئے انھیں کو گرفتار کرلیا اور کوتوال کے پاس لے گئے اس نے بھی کچھ زیادہ تحقیق وغیرہ نہیں کی ان پر اسی چوری کا جرم عائد کرکے دونوں ہاتھ کاٹے جانے کا حکم دیدیا چنانچہ ایک ہاتھ کٹنے کے بعد دوسرا ہاتھ کٹنے ہی جارہا تھا کہ سامنے سے ایک سوار نہایت تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا آتا نظر پڑا اس نے دور ہی سے شور مچانا شروع کیا ہاں ہاں ان کا ہاتھ نہ کاٹنا یہ تو فلاں بزرگ ہیں جب کوتوال نے ان کا نام سنا تو بہت گھبرایا اس لئے کہ اس اطراف میں مسلّم بزرگ تھے سب لوگ ان کا نام جانتے تھے اس نے کہا یہ بڑی بے ادبی ہوگئی میں نے ایک ہاتھ ان کا کٹوادیا یہ خیال کرکے ان کے قدموں پر گر گیا اور بڑی لجاجت سے عرض کیا کہ حضرت معاف فرمادیجئے آپ کو پہچانا نہیں، فرمایا کہ بھائی تمہارا کوئی قصور ہے نہیں بلکہ میں نے ہی اپنے مالک سے بدعہدی کی ہے اس کے بدلہ میں تو سزاوار تو اس کا تھا کہ میرا سارا جسم ٹکڑے ٹکڑے کردیا جاتا اور یہ تو صرف ایک ہی کٹا ہے یہ بھی ان کا کرم ہے۔ چنانچہ اس کے بعد سے ایک ہاتھ پر پٹی باندھے رہتے تھے اور کسی کی مجال نہ تھی جو ان سے اس ہاتھ کے کٹنے کی وجہ پوچھتا ایک دفعہ کسی نے پوچھا

تو فرمایا بھائی کچھ نہیں "یدٌ خنت فقطعت" یعنی ایک ہاتھ تھا اس نے خیانت کی اس کے عوض بیر کاٹ دیا گیا۔ یہ تو ان کی آزمائش تھی اب سنئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو رسوائی اور ذلت سے کس طرح بچاتے ہیں۔

یہ بزرگ کچھ ٹوکری وغیرہ بھی بنایا کرتے تھے تو تنہائی میں جب کام کرتے تو ان کی کرامت کیوجہ سے وہ کٹا ہوا ہاتھ بھی درست ہو جاتا تھا اور لوگوں کے سامنے کٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایک دن وہ گھر کے اندر حسب معمول کام کر رہے تھے کہ اچانک ایک شخص بلا اجازت لئے ہوئے ان کے پاس اندر چلا گیا اور دیکھا کہ وہ دونوں ہاتھ سے کام کر رہے ہیں انھوں نے پہلے تو اس کو ڈانٹا کہ تم بغیر اجازت اندر کیوں آئے پھر فرمایا کہ اچھا خبردار اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کرنا مگر اس نے باہر جاکر شور مچادیا کہ لوگو! ان بزرگ کی کرامت سنو ان کے تنہائی میں دونوں ہاتھ درست ہو جاتے ہیں یہ خبر ان بزرگ کو بھی ہو گئی کہ تمام لوگوں میں میری اس کرامت کا شہرہ ہو گیا ہے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ کہ آپ نے مجھے میرے جرم کی سزا دی پھر اس کرامت سے مجھے نوازا تو میں نے سوچا کہ چلو اچھا ہے میرا کوئی حرج بھی نہیں ہے اور لوگ مجھے برا سمجھ کر اب سے میرا پیچھا چھوڑ دینگے لیکن پھر آپ نے اس کرامت کو بھی ظاہر فرما دیا اور اب لوگ اور بھی میرے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ اس میں کیا بھید ہے اس کو سمجھا دیجئے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے الہام ہوا کہ اس تمہارے ہاتھ کٹنے کی وجہ سے چور سمجھنے لگے تھے یہ مجھے پسند نہیں ہوا کہ میرا کوئی ولی اور دوست ہو اور لوگ اس کو چور سمجھیں۔ اس لئے ہم نے اپنا آدمی تمہارے پاس خلوت میں بھیج کر اس کرامت کی تشہیر کرادی تاکہ لوگوں کی نظروں میں تم رسوا اور ذلیل نہ ہو تم نے ہمارا جرم کیا تھا ہم اس کی سزا تم کو دی یہ ہمارا اور تمہارا معاملہ تھا لیکن ہم اس کو گوارہ نہیں کر سکتے کہ تم کو کوئی دوسرا کچھ کہے۔

دیکھا آپ نے، یہ فرمایا کہ ہم نے اپنا آدمی قصداً بھیجا ہی تھا تاکہ کرامت پر مطلع ہو اور باہر نکل کر اس کی خوب تشہیر کردے۔

میں کہتا ہوں اسی طرح مشائخ کا معاملہ ہے کہ وہ مرید کو اللہ تعالیٰ کے لئے سزا بھی دیتے ہیں ان سے خفا بھی ہوتے ہیں ان کو نکالتے بھی ہیں مگر یہ نہیں چاہتے کہ دوسرا کوئی ان کو ذلیل اور حقیر سمجھے۔ علماء نے فرمایا ہے کہ ع

این بلائے دوست تطہیر شما است

یعنی دوست کی یہ تمام آزمائش تمہارے لئے بمنزلہ پاکی کے ہے واقعی آدمی کے جتنا زیادہ بلا سے ہوتا ہے اور کسی چیز سے نہیں ہوتا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق کے لئے سب سے بڑا مانع مخلوق ہے

اور ملامت وغیرہ لئے نکی جانب سے بہت دور ہٹ جاتا ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ جب یہی ملامت کرتی ہے تو پھر اس سے دل لگانا ٹھیک نہیں ہے۔ بس جہاں یہ خیال دل میں جما اور اس کا کام بنا چنانچہ اسی لئے اہل اللہ سے تعلق پیدا کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات مخلوق کے تعلق کو ختم فرمادیتے ہیں اور قلب کو اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ فرمادیتے ہیں اسی لئے خاقانی کہتے ہیں کہ ؎

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بہ خاقانی

کہ یکدم باخدا بودن بہ از ملک سلیمانی

یعنی تیس سال کے بعد خاقانی کو یہ بات محقق ہوئی کہ تھوڑی دیر کی خدا کی یاد بھی سلیمان علیہ السلام کے تخت سے کہیں بڑھی ہوئی ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کتنی بڑی تھی مگر فرماتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ ایک دفعہ سبحان اللہ یا الحمد للہ کہہ لینا نہ صرف اس سے بلکہ دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

بہ فراغ دل زمانے نظرے بہ ماہ روے

بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوے

یعنی تھوڑی سی دیر کے لئے فراغت قلبی کے ساتھ کسی ماہ رو کی جانب ایک نظر کر لینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ چتر شاہی سر پر ہو اور تمام دن ہاؤ اور ہُو میں گزرے۔

حضرتؒ اس کو بہت پڑھتے تھے اور لوگوں کو اس پر وجد آجاتا تھا جس کسی کے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے وہ مزے سے آرام میں ہو جاتا ہے اور جس کی سمجھ میں نہیں آتی وہ بہت دنوں تک پریشان رہتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ دل میں بھلا کسی دوسری چیز کا خیال کیسے آسکتا ہے؟ اس کا تعلق تو جس سے ہے ہے۔ اصلی اور دلی تعلق ہونے کے بعد پھر کہیں کوئی چیز اس کو جنبش دے سکتی ہے۔ اور جب دلی تعلق نہیں ہوتا تو میاں ذرا سا چرکہ لگا اور بھاگ نکلے۔ اور صحیح تعلق کے بعد انسان کو دنیا کا کیسا ہی کچھ کام کیوں نہ کرنا پڑے وہ دل بیار اور دست بکار اور خلوت در انجمن کا مصداق ہوتا ہے۔ یعنی ہاتھ پاؤں سے اپنے دنیا کا کام کرتا ہے لیکن دل کو خدا ہی کی یاد میں لگائے رہتا ہے خلوت در انجمن اسی کا نام ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب آدمی کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو اس کے لئے تمام مکروہات اور مجاہدات کو برداشت کرتا ہے بلکہ اس کے لئے وہ تکلیف پھر تکلیف ہی نہیں رہ جاتی بلکہ عین راحت بنجاتی ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ؎

رنج، راحت شد چو شد مطلب بزرگ   گرد گلہ توتیائے چشم گرگ

یعنی جب مطلب بڑا ہوتا ہے تو پھر تکلیف بھی مبدل بہ راحت ہو جاتی ہے۔ دیکھو بھیڑیا جب بکریوں کے گلہ کا پیچھا کرتا ہے تو اس گلہ کے بھاگنے سے جو گرد اڑتی ہے وہ پیچھے آنے والے بھیڑیے کی آنکھ میں گرد نہیں رہ جاتی بلکہ سُرمہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے وہ اچھی طرح سے ان کا شکار کرتا اور خوب شکم سیر ہو جاتا ہے۔

سچا طالب بھی کہیں ہٹتا ہے اور جو ہٹ جائے تو سمجھے کہ وہ سچا نہیں ہے ایک شخص ایک بزرگ کے یہاں گیا مرید ہونے کے لئے انھوں نے فرمایا کہ بھائی پہلے استخارہ کر لو۔ اس نے کہا بہت اچھا کچھ دور جا کر پھر واپس آگیا ان بزرگ نے دریافت فرمایا استخارہ کر لیا۔ فرمایا کیا کر لیا؟ کہا کہ نفس سے میں نے پوچھا کہ بیعت ہونا چاہتے ہو، مجاہدہ کرنا ہوگا تو خواہ مخواہ کیوں یہ مصیبت مول لیتے ہو اس نے جواب دیا کہ ہاں مجاہدہ تو بیشک کرنا ہوگا لیکن خدا بھی تو ملے گا اس پر میں نے کہا کہ نہ ملا تب؟ تو اس نے یہ جواب دے دیا کہ ہاں خیر نہ ملے نہ سہی لیکن خدا کو یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ کسی نے اُسکو طلب کیا تھا یہی کیا کم ہے! یہ سن کر ان بزرگ نے فرمایا کہ بھائی تمھاری طرح تو کسی نے بھی استخارہ نہیں کیا۔ مگر یہ سب باتیں تو پہلے زمانہ کی ہیں اور اب اس زمانہ میں تو یہی رہ گیا ہے کہ ولایت تو پسند ہے مگر مجاہدہ پسند نہیں ہے وہ بیچارہ تو ولایت بھی نہیں چاہتا تھا صرف یہ چاہتا تھا کہ اللہ تعالےٰ کے طالبین کی فہرست میں میرا بھی نام لکھ لیا جائے بلا سے بزرگی ملے یا نہ ملے مگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ بزرگی بھی مل جائے اور کرنا درنا بھی کچھ نہ پڑے ع

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

اس نام لکھانے پر ایک واقعہ یاد آیا سلئے فرماتے ہیں کہ ؎

چو یوسف شد بخوبی گرم بازار
شدندش مصریاں یکسر خریدار

جب یوسف علیہ السلام کی حسن وجمال میں شہرت ہوئی تو تمام اہل مصر آپ کے خریدار ہو گئے۔

بہر چیزے کہ ہر کس دسترس داشت
درآں بازار بیع او ہوس داشت

جس کے پاس جو چیز موجود تھی اس کو لے کر مصر کے بازار میں آپ کو خریدنے کے لئے آیا۔

شنیدم کز غمش زالے بر آشفت
تلینندہ ریسمانی چند و می گفت

میں نے سنا کہ ایک بڑھیا کو بھی آپ کی خریداری کا خیال پیدا ہوا وہ بھی چند سوت لیکر بازار آئی اور کہتی یہ تھی کہ

ہمیں بس گرچہ من کا سد قماشم
کہ در سلک خریدارانش باشم

اگرچہ میں پونجی کھوٹی رکھتی ہوں مگر اس لئے یہاں آئی ہوں تاکہ یوسفؑ کے خریداروں کے سلک میں تو منسلک ہو جاؤں۔

دیکھا آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے طالب سب اہل مصر تھے اور ان کے ساتھ ایک بڑھیا بھی تھی جو یہ جانتی تھی کہ مصر کے بازار میں یوسفؑ کو خریدنے کے لئے بڑے بڑے بادشاہ اور امرا موجود ہیں ظاہر ہے کہ ان کے مقابلہ میں اس بڑھیا کے ان سوتوں کی کیا حیثیت تھی مگر وہ اس خیال میں مگن تھی کہ یوسفؑ کو نہ خرید سکوں نہ سہی کم از کم اس کی وجہ سے ان کے خریداروں کی سلک میں تو منسلک ہو جاؤں گی اور ان کے طالبین اور محبین کی فہرست میں تو میرا نام درج ہو جائیگا یہی میرے لئے کیا کم ہے ؎

فی الحمد نسبتے بتو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ آدمی اگر خدا تعالیٰ تک نہ بھی پہنچ سکے مگر خدا کے طالبین میں اسکا نام ہو جائے یہ کیا کم ہے؟ جس شخص کو طلب ہوگی وہ صبر نہیں کر سکتا اور اللہ تعالیٰ والوں ہی میں اپنے کو ڈال دیتا ہے۔ اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

خواب ناکی بیک ہم بر رہ خسپ
اللہ اللہ بر رہ اللہ خسپ

یعنی اگر تم سونا ہی چاہتے ہو تو راستہ کے کنارے پر سوؤ۔ اللہ اللہ، تم اللہ کے راستہ پر سوؤ

تا بود کے سالکے بر تو زند
از خیالاتِ نعاسک بر کنند

تاکہ شائد کوئی راہ گزر ادھر سے گزرے، تو تم کو نیند سے بیدار کر دے۔ ورنہ سوتے ہی رہ جاؤگے

پس جس طرح سے راستہ میں سونے کی وجہ سے کوئی راہرو اس کو جگا ہی دے گا اسی طرح سے جو شخص غافل ہو اس کو چاہئے کہ ذاکرین کی صحبت میں رہے کہ کبھی نہ کبھی ان کی برکت سے یہ بھی ذاکر ہو ہی جائے گا دنیا میں اللہ والوں کے ساتھ ہو رہا جاتا ہے تو اسی لئے کہ قلب سے غفلت دور ہو اور دل کچھ ادھر متوجہ ہو یعنی ترک دنیا کے لئے اور مراد اس سے ضروری دنیا کا ترک نہیں ہے کیونکہ بقدر ضرورت تو دنیا کی تحصیل لازم ہے اس سے کون منع کر سکتا ہے۔ منع تو اس دنیا سے کیا جاتا ہے جو خدا سے اور آخرت سے غافل کر دے۔ طلب دنیا میں اگر کسی یہ حال ہے تو بلاشبہ وہ قابل علاج ہے ؎

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

دنیا اللہ تعالیٰ کے بھول جانے اور ان سے غفلت کا نام ہے نہ کہ کپڑے اور سامان چاندی کا سونا اور فرزند و زن کا۔ پس ہو سکتا ہے کہ کسی کے پاس یہ سب چیزیں موجود ہوں اور وہ دنیا دار نہ ہو اور جب قلب میں غفلت موجود ہے تو باوجودیکہ ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے پاس نہ ہو پھر بھی وہ دنیا دار ہی کہلائے گا۔

اللہ کے بندو! یہ کیا کر رہے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں، اس پر توجہ کرو ایک دن تو مرنا ہے ہی تو کچھ کر کے مرو اور کچھ یہاں سے لے کر جاؤ۔ اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق پیدا کرو پھر دنیا کی مجال ہے جو دل کے اندر گھس سکے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا کمانا چھوڑ دو، نہیں دنیا بھی کماؤ اور خوب کماؤ مگر اس کو دل میں جگہ نہ دو دل خدا کی یاد کی جگہ ہے دنیا کی جگہ نہیں دنیا کو صندوق میں رکھو جیب میں رکھو مگر دل سے باہر رکھو۔ اللہ تعالیٰ نے سارے اعضاء دو دو بنائے ہیں لیکن قلب ایک ہی بنایا ہے تو یہ اسلئے کہ وہ محبوب حقیقی کا جائے قیام ہے غیر کا نہیں حضرت حاجیؒ صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

اسکے غیر ہے خانۂ دل میں کیسے کہ خیالِ رخِ دلدار ہے دربان اپنا

اور کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری

یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جب یہ دنیا چند روزہ ہے اور یہاں سے ہم سب کو جانا ہی ہے تو دل میں کچھ اس کی یاد اس کی محبت لے کر جاؤ یہ اچھا ہے یا دنیا سے یوں ہی خالی جانا یہ اچھا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

آرزوئے دید جاناں بزم میں لائی مجھے   بزم سے میں آرزوئے دید جاناں لے چلا

میں نے آپ کا بہت وقت لیا تاہم اس کا لحاظ ضرور رہا کہ کام کی باتیں بیان کی جائیں اور جو کچھ عرض کیا جائے بطور نصح کے اخلاص کے ساتھ عرض کر دیا جائے کیونکہ اس زمانے میں ہم میں اسی چیز کی بہت کمی ہو گئی ہے یہی وجہ ہے کہ اسباب ہدایت زائد ہونے کے باوجود ظلمت اور گمراہی بڑھتی ہی جا رہی ہے بقول اکبر ؎

انوار اس دور کے دل افروز ہیں کم   گویا کہ شبین بہت ہیں اور روز ہیں کم

ہر چرب زباں نہیں ہے شمع اخلاص   جلنے والے بہت ہیں دل سوز ہیں کم

حاصل میری اس تمام گزارش کا یہ ہے کہ جب جنت پسند ہے تو مکارہ کیوں پسند نہیں ہیں جب کہ قاعدہ کی بات ہے کہ آرام میں لذت کچھ تکلیف ہی کے بعد ملا کرتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جنت میں پہلے دنیا کی روٹی کھلائی جائے گی تاکہ دنیا کی تمام نعمتوں کی لذت از سر نو تازہ ہو جائے اور اس کے بعد جب جنت کی نعمتیں کھائیں تو دونوں کا باہم تقابل آسان ہو۔

انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ نفع چاہتا ہے تو کام بھی کرے باقی نفع میں اور آمدنی میں تو شریک رہے اور محنت اور کام کے وقت دور رہے یہ مذہب ٹھیک نہیں اگرچہ آجکل بہت رائج ہے۔

ایک دفعہ حضرت مولاناؒ نے ملاقات کے وقت مجھ سے پوچھا کہ بھائی لوگ یہ تو نہیں کہتے کہ آمدنی میں شریک ہیں اور کسب میں نہیں، میں نے کہا نہیں ایسا خیال تو نہیں معلوم ہوتا میں نے کہنے کو تو حضرت سے کہہ دیا لیکن بعد میں اس پر غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ بات یہی ہے جو حضرت فرما رہے ہیں یہ زمانہ ہی ایسا ہے کہ اگر اس زمانے میں کسی کو یہ خیال ہو جائے تو کچھ بعید نہیں ہے۔

بس میں نے حضرت کے اس ارشاد کو پلے باندھ لیا اور مجھے تو اس سے بہت نفع ہوا اسی لئے آج آپ لوگوں سے بھی یہ گفتگو کر رہا ہوں اور اب تو آنکھوں سے یہ دیکھ رہا ہوں کہ اکثر و بیشتر ہمارے گھر و نکے فسادات اور نزاعات کی بنا یہی مسئلہ بنا ہوا ہے ہر شخص دوسروں سے کچھ توقعات قائم کئے ہوئے ہے اور دوسروں ہی سے اپنے حقوق کی ادائیگی کا مطالبہ کرتا ہے اس کی فکر نہیں کہ ہمارے ذمہ بھی دوسروں کے کچھ حقوق ہیں یا نہیں؛ چنانچہ اسی حالت کے نتیجہ میں پھر غیبت بھی ہے دشمنی اور عداوت بھی ہے جس کی وجہ سے پوری قوم کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہے۔ اب اس کی سزا آخرت میں جا تو جو بھگتنا ہوگا وہ تو ہے ہی اس دنیا میں بھی مل رہی ہے وہ ہمارے اور آپ کے سامنے ہے کہ نہ باہم الفت ہے، نہ محبت ہے، نہ شوکت ہے۔ نہ طاقت ہے، نہ صحت ہے، نہ ہمت ہے اور کیونکر یہ چیزیں

ہو سکتی ہیں جب کہ ہم نے راستہ ہی دوسرا اختیار کر رکھا ہے۔ بس اس پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما دے اور ہم سے راضی ہو جائے اور آخرت کے علاوہ اس دنیا میں بھی ہمیں نعمتوں سے نوازے۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

آپس میں موافق رہو طاقت ہے تو یہ ہے　　دیکھو نہ بہم عیب محبت ہے تو یہ ہے
صحت بھی ہو روزی بھی ہو اہو دل کو بھی تسکین　　دنیا میں بشر کے لئے نعمت ہے تو یہ ہے

رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْآخِرَۃِ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ
وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ
تَعَالیٰ عَلیٰ خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ
اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ ٥

دفتر معرفت حق سے ملنے والی
چند کتابیں

تالیفات مصلح الامۃ حصہ اوّل ــــ حصہ دوم
۱۴ روپیہ　　۱۸ روپیہ

وصیۃ الاحسان کامل ــــ وصیۃ الاخلاص
۳ روپیہ　　۱/۵۰

تلاوت قرآن　　التذکیر بالقرآن
۲/۵۰　　۶۰/

معرفت حق مکمل غیر مجلد ۱۹۷۰ء و ۱۹۷۵ء　　فی جلد ۱۲ روپیہ
معرفت حق متفرق ۱۵ شمارے　　۵ روپیہ

مناجات مقبول کرمی ــــ معمولات نبوی
۷/۵۰　　۴/۵۰

وصیۃ السالکین ۹۰ پیسہ　　(اسوۃ الصالحین زیر طبع)

اتباعِ سنّت

از افادات

مصلح الامّۃ عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقَدمہ

ناظرین کرام۔ السلام علیکم۔

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے ارشادات میں سے ایک مضمون بعنوان اعتقاد وانکار" پیر کا" سے ہم آپکی خدمت میں پیش کر چکے ہیں۔

آج کل حضرت والاؒ بمبئی والہ آباد میں مختلف مجالس میں اتباع سنت پر سلسل بیان کرا رہے ہیں جو کہ" رسالہ معرفت" الہ آباد میں برابر" وصیۃ السنۃ" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ چونکہ اس سے سالکین راہ کو الحمد للہ بڑی آسانیاں نصیب ہو رہی ہیں اور طریق پر صحیح روشنی پڑ رہی ہے اس لئے نفع عام کیلئے حضرتؒ کا یہ ایک مضمون بعنوان" اِتّباعِ سنت" شائع کر رہا ہوں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ احقر کیلئے اور قارئین کیلئے نافع بنائیں۔ آمین۔

اس سلسلہ میں حضرت کا یہ ارشاد ناظرین کے نفع کیلئے نقل کر رہا ہوں کہ

" جس شخص نے رسول اللہ صلعم کا راستہ نہیں اختیار کیا یعنی خدا تک پہونچنے کے لئے آپؐ کے طریقوں اور آپکی سنتوں کو ذریعہ نہیں بنایا تو وہ کبھی بھی اس درگاہ تک نہیں پہونچا اور پہونچا تو بجائے خود رہا اس درگاہ کی گرد راہ کو بھی اس نے نہیں پایا۔ اسی لئے آپ کے سامنے سنت کا مضمون چھیڑا ہے تاکہ آپکو راستہ مل جائے کیونکہ یہی راہ ہے ؎

مپندار سعدی کہ راہ صفا توان یافت جز بر پئے مصطفےٰ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید"

(معرفت حق۔ فروری سنہ ۷۰ء ص ۲۵)

(یکے از خدام)

مجلس

(دوشنبہ۔ ۱۰ جمادی الثانیہ ۱۳۸۶ھ)

میں اسوقت ایک مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ لوگ اسکو سنیں تو ہوش اڑ جائیں اور خصوصیت سے علماء کی توجہ اسکی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ ہم بشر ہیں فرشتہ نہیں ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام بھی بشر ہیں۔ لہٰذا ہماری جملہ ترقیات بشریت کی راہ سے ہیں ملکیت سے نہیں۔ انسان کو ملکی قوت بھی دی گئی ہے اور بشری بھی مگر قوت ملکی بشری سے کم ہے۔ انسان کے اندر جو ملکیت ہے اسکے اوصاف میں سے خدا کا ذکر اور تسبیح و تقدیس ہے فرشتے ہر وقت اسی میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یُسَبِّحُوْنَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ رات دن تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تھکتے نہیں۔ اسی طرح انسان ان چیزوں کو بھی کرتا ہے یعنی ذکر و تسبیح و تہلیل بھی کرتا ہے اور تھکتا نہیں۔ یہ تو ملکیت کی شان ہوئی۔ چنانچہ صوفیہ کو جو احوال طاری ہوتے ہیں وہ اسی قبیل سے ہیں اسلئے کہ یہ بھی ملائکہ کی صفت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کلام فرماتے ہیں تو بیہوش ہو جاتے ہیں اور پھر ہوش میں آنے کے بعد ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا؟ یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو کیفیت و احوال سے ازخود رفتہ ہو جاتے ہیں۔ تو یہ بھی بڑی چیز ہے کہ بشر ہو کر ملکی اوصاف اختیار کرے، مگر میں اور چیز کو بیان کر رہا ہوں یعنی بشریت کو۔ اور یہ کہہ رہا ہوں کہ بشر حالت بشریت میں اوصاف بشریہ کے ساتھ متصف ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے اعلیٰ درجہ کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔

بشریت کے لوازم میں سے کھانا، پینا، سونا، پیشاب، پاخانہ اور دوسری چیزیں ہیں۔ انبیاء علیہم السلام نے انھیں چیزوں کو اعلیٰ درجہ کا قرب کا ذریعہ بنایا جنکو ہم نے اعلیٰ درجہ کی غفلت بنا لیا ہے۔ یہ کہہ رہا ہوں کہ یہی اوصاف بشریہ کھانا، پینا اور سونا وغیرہ جو خاص بشریت اور موجب غفلت ہیں اور جنکا قرب میں کوئی دخل نہیں سمجھتے ہو انکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلیٰ درجہ کا ذکر بنا دیا واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا احسان ہے کہ آپ نے عین غفلت کو ذکر بنا دیا۔ سونا تو خیر غفلت ہے ہی کھانا بھی غفلت کا سبب ہوتا ہے اسلئے کہ جتنے بھی غافلین ہیں ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ کا صدور اسی کھانے کے سبب ہوتا ہے

اگر کھانے میں کمی کریں تو ان سے معاصی کا صدور کم ہو۔ اور اگر ان اوصاف بشریہ کو سنت کے مطابق کرلیں تو اس سے غفلت دور ہو جائے۔ لیکن میں جو کہہ رہا ہوں یہ بات باوجود آسان اور سہل ہونے کے آپ لوگوں میں جلدی نہیں آوے گی اس لئے کہ سنت سے بہت دور ہو چکے ہو، ہاں اگر کوئی چیز ایسی بتلادوں کہ اس سے دماغ پر اثر ہو جاوے اور بعض لوگ اس میں پاگل تک ہو جاویں تو البتہ سمجھیں گے کہ ہاں کوئی چیز ہے۔ بعضے اشغال وغیرہ ایسے ہیں کہ ان سے فائدہ کیا ہوگا لوگ پاگل ہو جاتے ہیں اگر میں انکو نہیں بتاتا ہوں بلکہ یہ بتارہا ہوں کہ اوصاف بشریت سے متصف ہونے کے وقت ہی میں قرب اور فرشتوں سے زیادہ قرب حاصل کر سکتے ہو۔

ان اوصاف بشریہ میں سے ایک کھانا ہے۔ اس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھوئے یہ ایک سنت ہوئی پھر بسم اللہ کہے یہ دوسری سنت ہوئی۔ جب کھانا کھا چکے تو دعا پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ یہ تیسری سنت ہوئی ہو جب کھانا کھانے کے بعد یہ دعا پڑھتا ہے تو اسکا تعلق اللہ کے ساتھ کیسا کچھ ہوتا ہے اسکو وہی جانتا ہے اسلئے یہ کھانا نعمت ہے اور نعمت سے منعم کی معرفت ہوتی ہے اور یہ معرفت فعل قلب ہے لسان کا فعل نہیں چنانچہ بخاری میں ہے اِنَّ الْمَعْرِفَةَ فِعْلُ الْقَلْبِ (فتح الباری ص۵۵ ج۱)۔

پس مومن جب نعمت کو استعمال کرتا ہے تو اس نعمت کے منعم کی معرفت اسکو ہوتی ہے۔ اور اسی معرفت میں وہ غرق ہو جاتا ہے اسکے بعد وہ صرف اسی قلب کی معرفت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ زبان سے بھی منعم کا شکر اس طرح ادا کرتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اور یہ ذکر لسانی اسی معرفت کا اثر ہوتا ہے اور اتنے ہی سے مومن بہت دور تک پہونچ جاتا ہے۔ اور منعم کی جو معرفت قلب میں حاصل ہوتی ہے زبان سے الحمد للہ کہنے کی وجہ سے اسمیں اور ترقی ہوتی ہے اور شکر کے طور پر جتنے کلمات مومن کہتا ہے وہ سب اسکے ایمان کی ترقی کے باعث اور ازدیاد ایمان کے موجب ہوتے ہیں

قلب میں جو چیز ہے یعنی معرفت جب وہ زور کرتی ہے تو زبان پر آتی ہے اور جب زبان سے کہتا ہے تو دل میں جاتی ہے زبان تائید کرتی ہے قلب کی اور قلب تائید کرتا ہے زبان کی دونوں ایک دوسرے سے ملکر ایمان کی ترقیات کے باعث ہوتے ہیں اور اسطرح

مومن کا ایمان بڑھتا رہتا ہے۔

اسکے لئے میں نے ایک مثال پیش کی تھی کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ مجھکو جب کوئی شخص ہدیہ دیتا ہے تو قلب اللہ تعالیٰ سے ایک نیا معاملہ کرلیتا ہے اور ایک نیا عہد باندھ لیتا ہے۔ میں نے کہا بھائی جبھی تو انکو ہدیہ زیادہ ملتا تھا اسواسطے کہ اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ میں انکے پاس بھیجونگا تو یہ فوراً میری طرف رجوع ہو جائیں گے اور مجھ سے نیا عہد باندھ لیں گے۔ اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے دیا ہے یہ بیچارے ہدیہ پیش کرنے والے کیا دیتے۔ موحد یہی سمجھتا ہے کہ جو چیز بھی پہونچتی ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے پہونچتی ہے۔ سبحان اللہ خوب عہد ہے اور کیسا معاملہ ہے۔ ہم لوگ ذکر کرتے ہیں تب بھی قلب کا عہد اللہ تعالیٰ سے نہیں بندھتا اور انکو دیکھئے کہ ہدیہ پا رہے ہیں اور نیا عہد باندھ رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ وہ بزرگ ہدیہ لینے کے وقت جو نیا معاملہ کرتے تھے تو اس لئے کہ روپیہ حاجات کے رفع کرنے کا ذریعہ ہے اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ نیا تعلق پیدا کرتے تھے ہم لوگوں کو ہدیہ ملتا نہیں تو کھانا تو دونوں وقت ملتا ہے۔ اسی کو کہتا ہوں کہ روپیہ اتنی مفید چیز نہیں ہے جتنا کہ کھانا اور پانی۔ روپیہ تو اگر بہت سا بھی پاس میں ہو تو زیادہ تر دوسروں کے ہی کام آتا ہے، ملازم کی تنخواہ، مکان کا کرایہ، اور دیگر امور میں صرف ہو جاتا ہے۔ البتہ جو کھانا ہم کھا لیتے ہیں اور جو پانی ہم پی لیتے ہیں وہی ہمارے کام آتا ہے اور اسی سے ہماری بشریت کا قیام ہے اس لئے کہ ہم اسکے محتاج ہیں اور برابر اسکو کرتے رہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے لئے روپیہ پیسہ سے زیادہ کارآمد کھانا اور پانی ہے اسلئے اسکو اگر اللہ کی طرف سے سمجھے اور اسکا شکر ادا کرے اور ہر کھانے کے وقت اللہ تعالیٰ سے نیا عہد باندھے تو اسی سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جائے۔ مگر اس کے اختیار کرنے میں نفس سے مجاہدہ کرنا ہوگا وہ بزرگ جو ہدیہ لینے کے وقت نیا عہد باندھتے تھے انکو یہ بات بہت دنوں میں حاصل ہوئی ہوگی اسی طرح آپ بھی کرتے رہیئے دل سے، اخلاص کے ساتھ اور ہر وقت کی سنت کو اس کے استحضار کے ساتھ کیجئے کرتے کرتے یہ چیز آپکو حاصل ہو جائیگی۔ ابتداء میں مجاہدہ کرنا ہوگا ورنہ جب کھانا کھانے بیٹھئے گا بھول جائیے گا۔ پہلے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں نفس پر غصہ اور ترک سنت پر رنج و غم اختیار کیا جاتا ہے تب نفس سنت کی راہ پکڑتا ہے۔

میں نے ایک واقعہ بیان کیا تھا کہ ایک بزرگ تھے وہ کھانا کھاتے وقت ہاتھ دھونا کبھی

نہیں بھولتے تھے اور بسم اللہ کہنا بھول جاتے تھے اور کھانا کے بعد کی دعا پڑھتے تھے۔ اسی طرح جب پاخانہ جاتے تھے تو پہلے بایاں پیر داخل کرنا کبھی نہیں بھولتے تھے لیکن دعا پڑھنا بھول جاتے تھے اور نکلنے کے بعد کی دعا وہاں بھی یاد رہتی تھی اسکو ضرور پڑھتے تھے اس پر انھوں اپنے نفس سے سخت محاسبہ کیا کہ دو سنتوں میں سے ایک کو لیتا ہے اور دوسرے کو کیوں ترک کر دیتا ہے۔ جسطرح کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا سنت ہے اسی طرح بسم اللہ پڑھنا بھی سنت ہے بلکہ ہاتھ دھونے سے بڑھکر ہے۔ اسی طرح وہ بزرگ برابر اپنے نفس کو ملامت کرتے تھے کہ تم سے اور بڑی سنتوں پر کیا عمل ہوگا جب یہ چھوٹی چھوٹی سنتیں تم سے نہیں ہوتیں۔ غرض رنج کرنا اور غم اٹھانا اس راستہ میں مجاہدہ ہے اگر غم نہیں کروگے تو بدحالی ہمیشہ رہ جائیگی۔

اہل اللہ اپنی بدحالی سے بہت رنج و غم کرتے ہیں تب کہیں جاکر سنت اور فرض کو پکڑ پاتے ہیں۔ اسی طرح میں نے ایک حکایت بیان کی تھی کہ کچھ بزرگ لوگ کہیں کھانا کھا رہے تھے اتنے میں ایک شخص آیا اور انکو سلام کیا ان لوگوں نے سلام کا جواب نہیں دیا بلکہ کھانے میں مشغول رہے جب کھانے سے فارغ ہوئے تو اس نے سوال کیا کہ میں نے آپ لوگوں کو سلام کیا آپ لوگوں نے میرے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا۔ انھوں نے کہا ہم صوفی لوگ ہیں ہمارا ہر کام اللہ کیلئے ہوتا ہے اور ہمارا کھانا بھی عبادت ہے اور عبادت میں مشغولی کے وقت نہ سلام کرنا چاہیئے اور نہ اسکا جواب دینا چاہیئے۔ جس طرح جب کوئی آدمی نماز یا ذکر کررہا ہو تو ایسی حالت میں سلام کرنا اور اسکا جواب دینا نہیں چاہیئے

دیکھئے ان لوگوں نے کیسی عمدہ بات کہی کہ ہم لوگ صوفی ہیں ہمارا طریقہ غفلت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرنے کا نہیں اور جب ہم لوگ اللہ تعالےٰ کی نعمتوں کو استعمال کرتے ہیں تو اسوقت ذاکر ہوتے ہیں۔ سبھی مسلمانوں کو یہ کرنا چاہیئے لیکن اب تو حال یہ ہے کہ نماز میں بھی ذکر نہیں ہوتا اور ان حضرات کا ذکر کھانے میں بھی ہوتا تھا۔ آپ خود غور کر لیجئے کہ آپ میں اور ان میں کتنا فرق ہے۔ کھانے پینے کے بعد پاخانہ کی نوبت آتی ہے اور کھانے سے بڑھکر اجابت کا ہوجانا اللہ تعالےٰ کی نعمت ہے اس لئے کہ اگر کھانا ہضم نہ ہو یا قبض ہوجائے اور پاخانہ نہ ہو تو سخت مصیبت ہوجاتی ہے اور جتنی بیماریاں ہیں وہ سب معدہ ہی سے ہوتی ہیں۔ اسکے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم فرمائی ہے

کہ پاخانہ جانے سے پہلے یہ دعاء پڑھے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ اور پہلے بایاں پیر داخل کرے اور جب نکلے تو پہلے دایاں پیر نکالے اور یہ دعاء پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّیْ مَا یُؤْذِیْنِیْ وَاَبْقٰی عَلَیَّ مَا یَنْفَعُنِیْ تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے موذی چیز کو مجھ سے دور کردیا اور اس چیز کو مجھ پر باقی رکھا جو نفع دے۔ کھانے کے بعد جو دعاء پڑھی جاتی ہے اس سے کہیں بڑھکر یہ دعاء ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر یہ دعاء نہ فرماتے تو ہم لوگ کھانے کو تو نعمت سمجھتے مگر پاخانہ کے ہوجانے کو کون نعمت سمجھتا۔ یہ ہے بشریت کی راہ سے ترقی اسلئے کہ فرشتے نہ کھانے کو جانتے ہیں نہ پاخانے کو۔ تو اگر ہماری تعلیم کے لئے اللہ تعالیٰ فرشتے کو بھیجتے تو وہ ان سب چیزوں کو کیا بتلاتے اور انبیاء علیہم السلام چونکہ بشر ہوتے ہیں انکی ترقیات کھانے میں بھی ہوتی ہیں اور پیشاب پاخانہ کے ہونے میں بھی اور وہ اس سے اللہ تعالیٰ کا اعلیٰ درجہ کا قرب حاصل کر لیتے ہیں۔ پس ہمارے لئے بھی یہ چیزیں قرب کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اور سونے کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعاء تعلیم فرمائی اَللّٰھُمَّ اَنْتَ خَلَقْتَ نَفْسِیْ وَاَنْتَ تَوَفّٰھَا لَکَ مَمَاتُھَا وَمَحْیَاھَا اِنْ اَحْیَیْتَھَا فَاحْفَظْھَا بِمَا تَحْفَظُ بِعِبَادِکَ الصَّالِحِیْنَ وَاِنْ اَمَتَّھَا فَاغْفِرْ لَھَا وَارْحَمْھَا اور اَللّٰھُمَّ بِاسْمِکَ اَمُوْتُ وَاَحْیٰی اَللّٰھُمَّ قِنِیْ عَذَابَکَ یَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَکَ۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی دعائیں ہیں اور جب سوکر اٹھے تو یہ دعاء پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ جب ان دعاؤں کو پڑھکر سوئے گا تو ذکر ہی پر نوم ہوئی اور جب اٹھتے ہی دعائیں پڑھیں گے تو بیداری بھی ذکر کے ساتھ ہوئی، پھر درمیانی وقت بھی ذکر ہی میں شمار ہوگا اور اسکا سونا بھی سنت کے ساتھ ہوا اس لئے کہ اسوقت کی سنت کا لحاظ کرکے اور دعاء پڑھکر تب سویا اور اسکی بیداری بھی سنت ہی کے ساتھ ہوئی تو درمیان میں جو وقت گذرا یہ سب سنت میں گذرا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا صحابہؓ اسقدر اہتمام کرتے تھے کہ کوئی سنت ان سے ترک نہ ہوتی تھی۔ ایک صحابی گورنر تھے جب کبھی کھانا کھاتے وقت کوئی چیز گرجاتی تھی تو اسے اٹھاکر صاف کرکے کھالیتے تھے یہ بھی سنت ہے لوگوں نے ان سے کہاکہ حضرت آپ گورنر ہیں اور یہ عجمی لوگ ہیں اسکو ناپسند کرتے ہیں اپنی نظروں سے گرادینگے۔ انھوں نے فرمایا کہ چاہے کچھ ہو ہم رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی سنت اِنکی خاطر نہیں چھوڑیں گے یہ لوگ ہم سے راضی ہوں یا راضی نہ ہوں۔ ہم اسلئے نہیں آئے ہیں کہ ان لوگوں میں رہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی سنت کو چھوڑ دیں ورنہ اسی طرح ایک ایک کر کے سب سنتیں ختم ہو جائینگی۔ لہٰذا اب بھی امت کو چاہیئے کہ ان سنن نبویہ کو اپنے عمل میں جاری کریں ورنہ صرف کتب احادیث میں یہ لکھی رہ جائیں گی اور امت ان کے برکات سے محروم ہی رہ جائیگی۔ اسی لئے اس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔

میں نے کہا تھا کہ سنت کے اختیار کرنے میں نفس سے مجاہدہ کرنا ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سنتوں کو یاد کرنا ہوگا۔ اور یہ مجاہدہ کرنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے۔ اور نفس کو مارنا بھی سنّت ہے۔ اسلئے طالبین اور سالکین کو چاہیئے کہ اپنے نفس کی شرارتوں پر خود غصہ کریں اور ترک سنّت پر رنج وغم کریں۔ امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ ریاضت میں اپنے نفس پر غصہ کرنا ضروری ہے اگر ایسا نہیں کیا جائیگا تو اصلاح نہیں ہوگی۔

اگر نفس نہ ہوتا تو آپ کی طلب اور آپکا مجاہدہ کیسے ثابت ہوتا اللہ تعالےٰ نے مجاہدہ ہی کیلئے نفس کو پیدا کیا ہے اور اس نفس کی نہیں معلوم کتنی خواہشات ہیں اور ہر ہر خواہش اللہ تعالےٰ سے روکنے والی ہے۔ اسلئے جو شخص اپنی ہر خواہش کا مقابلہ کریگا وہ اللہ تعالےٰ کے یہاں بڑا نمبر پاویگا۔ اللہ تعالےٰ کہیں گے کہ تم ہمارے دوست ہو اسلئے کہ تم نے اپنے نفس کو جو تمھارا دوست تھا ہماری خاطر چھوڑ دیا۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے جو نفس کو دیا ہے تو سب سے بڑی بشریت یہی ہے مگر اللہ والوں نے اسکو پورا مٹا کر ذلیل وخوار کر کے، رام کر کے، تابع کر کے چھوڑا۔ اللہ کے بندوں نے یہی کیا اور اپنی پوری سعی کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کیطرف رجوع ہوئے ہیں کہ یا اللہ یہ نفس بھی آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے اور اسکی خواہشات بھی آپ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں اگر آپ ہی رُخ کو پھیر دیں تو یہ رام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسکے لئے یہ فرماتے تھے اَللّٰھُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوٰھَا وَزَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا اَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلَاھَا۔ بس ہم کو بھی یہی طریق اختیار کرنا چاہیئے اور سنت کی راہ پکڑنا چاہیئے۔

نوٹ: حضرت مصلح الامۃ کے دیگر مضامین اصلاحی سے استفادہ کیلئے رسالہ معرفت حق کا مطالعہ فرمایئے (پتہ: ۲۳ بخشی بازار۔ الہ آباد ۳)

مجلس

(یوم شنبہ - ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۸۰ھ م ۵ فروری ۱۹۶۱ء - الٰہ آباد)

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ کی یہ کتاب ہے جو بہت بڑے عالم اور بڑے درجہ کے صوفی ہیں اپنی اس کتاب میں سب مسائل بیان کیے ہیں انکا طرز یہ ہے کہ پہلے بطور کلی کے ایک بات بیان کرتے ہیں پھر اسکے تحت بہت سے مسائل لکھتے ہیں۔ چنانچہ پیر کے تلاش کرنے کا طریقہ اور پیر کی صفات کا بیان کیا ہے۔ بہت زبردست مضمون ہے۔ اسکے بعد فرماتے ہیں کہ:-

(مسئلہ) اگر کوئی شخص شیخ کی خدمت میں مدت تک حسن اعتقاد سے رہا اور اسکی صحبت میں تاثیر نہیں پائی تو اسپر واجب ہے کہ اسکو چھوڑ کر دوسرے شیخ کی تلاش کرے، ورنہ اسکا مقصود ومعبود وہ شیخ ہوگا نہ کہ خداوند تعالیٰ اور یہ شرک ہے۔

دیکھئے! قاضی صاحبؒ فرما رہے ہیں کہ یہ شرک ہے۔ یعنی یہ کہ شیخ کو پکڑے رہے اور اس سے فائدہ بھی نہیں پھر اسکو چھوڑتا بھی نہیں یہ عقیدہ کی غلطی ہے۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مقصود شیخ ہوگیا ہے حالانکہ مقصود ومعبود محض خدا تعالیٰ ہیں۔ یہی شرک ہے۔ مشائخ کیلئے ضروری ہے کہ امت کے احوال سے واقف ہوں کہ وہ کدھر جارہی ہے۔ نیز مشائخ کیلئے لازم ہے کہ وہ لوگوں کو بتلادیں کہ ہم مقصود نہیں ہیں بلکہ خدا مقصود ہے ورنہ قیامت میں پرسش ہوجائیگی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں آیا ہے کہ انکو اللہ تعالیٰ اپنے سامنے کھڑا کرکے پوچھیں گے کہ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ۔ اس سوال سے حضرت عیسیٰ ایسے ڈر جائیں گے کہ تمام بدن سے خون کے فوارے نکلنے لگیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اس منصب پر ہیں قیامت میں ان سے پرسش ہوگی۔

آپ خود سوچئے کہ جو اللہ تعالیٰ تک پہونچانے کا ذریعہ ہو وہ خود مقصود ومعبود ہوجائے تو کتنی بُری بات ہے۔ اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں جابجا ارشاد فرمایا ہے اور یہود ونصاریٰ کے اس حال پر نکیر فرمائی ہے چنانچہ انکے شرک کا حال بیان فرماکر یہ

فرماتے ہیں اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (یعنی انھوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اپنا رب لیا ہے) صحابہؓ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا اُن لوگوں نے رب بنا لیا تھا حالانکہ وہ تو اہل کتاب تھے تو آپ نے فرمایا کہ ہاں جس چیز کو انکے علماء اپنی طرف سے حلال و حرام کہتے تھے اسکو یقین کرتے جاتے تھے چاہے خدا کے حکم کے خلاف ہی ہو یہ مطلب ہے رب بنا لینے کا۔ حلال و حرام قرار دینا یہ رب کی شان ہے (اور وہ لوگ خود ہی جس چیز کو حلال کر دیتے تھے اسکو عوام حلال سمجھتے تھے، اور جس چیز کو حرام کر دیتے تھے اسکو حرام سمجھتے تھے۔ ان کے عوام و خواص گمراہ تھے۔ اسلئے جب خدا کے فتویٰ کو چھوڑ دیا جائیگا تو پھر گمراہی دھری ہے۔ اور تحلیل و تحریم خدا کی طرف سے ہوتی ہے اسکو مخلوق کی طرف سے اعتقاد کرنے لگے تو یہی شرک ہے کیونکہ یہی رب بنانا ہے۔

اسکے بعد قاضی صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ عزیزان رامیتنی پیر طریقہ نقشبندیہ فرماتے ہیں ؎

با ہر کہ نشستی و نشد جمع دلت　　　وز تو نہ رسید صحبت آب و گلت

جس کے ساتھ تم بیٹھے اور تمہارا دل جمع نہیں ہوا یعنی خدا کیطرف جمع نہیں ہوا اور دل جمعی خدا کے ساتھ نہیں ہوئی اور مخلوق سے دل علٰحدہ نہیں ہوا (یہ حضرات صوفیہ کی خاص اصطلاح ہے مخلوق کا مجمع نہیں مراد ہے) اور تم سے آب و گل کی صحبت نہیں گئی (یعنی دنیا اور دنیا والوں سے انقطاع نہیں ہوا) ؎

زنہار ز صحبتش گریزاں می باش　　　ورنہ نکند روح عزیزاں بحلت

خبردار اس کی صحبت سے بہت گریز کرو ورنہ عزیزاں کی روح تم کو معاف نہیں کریگی (مراد اس سے پورے سلسلہ کی روح ہے) یعنی اگر تم اسکی صحبت سے گریز نہ کروگے تو تمام اہلِ سلسلہ تم کو معاف نہیں کرینگے۔

(ترصیع الجواہر المکیہ) تصوف کی ایک عمدہ کتاب ہے اسکے بعض مقامات مجھکو بہت ہی پسند آئے مختصر سی عبارت میں فن کے بڑے بڑے مسائل کو محققانہ طور پر بیان فرمایا ہے۔ اسوقت انکی بیان کردہ چند تنبیہات پیش کرتا ہوں، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ مولف نے ہر مسئلہ پر تنبیہ کا عنوان اسلئے اختیار فرمایا ہے کہ یہ بتلائیں کہ طریق میں یہ نہایت ضروری امور ہیں اور مصرح ہیں مگر لوگ اِنکی طرف سے غافل ہیں کیونکہ تنبیہ انھیں چیزوں پر کیجاتی ہے جن سے واقفیت تو ہو مگر تساہل کی بنا پر لوگ اسکو ترک کئے ہوں۔ چنانچہ

فرماتے ہیں کہ قد ذکرنا لك سابقا ان فتح باب الغیب موقوف علی عمل الطاعات وترك المخالفات وتصفیۃ القلب من الاخلاق الذمیمہ (ھذہ تنبیہ ہم) ہم نے تم سے ابھی سابق میں یہ بیان کیا ہے کہ غیب کا دروازہ کھلنا موقوف ہے۔ طاعات (یعنی عبادات کے کرنے اور مخالفات (یعنی معاصی) کے ترک کرنے اور قلب کے اخلاق رذیلہ کے تصفیہ کرنے پر یعنی سالک کیلئے (بلکہ مسلمانوں کیلئے) غیب کا دروازہ کھلنا اسپر موقوف ہے کہ وہ طاعات کریں اور مخالفات یعنی معاصی کو چھوڑ دیں اور اپنے اخلاق رذیلہ کو دور کریں میں کہتا ہوں کہ یہ ترتیب تو انھوں نے بیان فرمائی ہے جو عین شریعت ہے، طاعات پر عمل اور معاصی کا تزکیہ۔ باقی میں سمجھتا ہوں کہ حقیقت میں باب غیب کی فتح صرف ایک ہی پر موقوف اور وہ ہے اخلاق ذمیمہ سے قلب کا تصفیہ جو تزکیہ ہے۔

چنانچہ انسان اپنے قلب کو جب رذائل سے پاک وصاف کرلیتا ہے تو اول فتح جو اسپر ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ اسکو طاعات کی توفیق ہوجاتی ہے۔ مخالفات اور معاصی کا ترک اسکے لئے آسان ہوجاتا ہے۔ یہ اسلئے کہ فتح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی ہے جب قلب پر نازل ہوجاتی ہے تو محال ہے کہ آدمی اسکے بعد پھر طاعات پر عمل نہ کرے یا مخالفت کا ارتکاب کرے۔ پس میرے نزدیک عمل طاعات اور ترک مخالفات یہ دونوں تصفیۂ قلب کے قرین نہیں بلکہ اسکے ثمرات ہیں۔

آگے مولف فرماتے ہیں کہ فاعلم الآن ان العبادۃ شطر ان شطر الاکتساب لاطاعۃ وشطر الاجتناب للمعصیۃ التی فیھا الاخلاق الذمیمۃ وان شطر الاجتناب افضل واشرف للعبد من شطر الاکتساب فان ترك المضار مقدم علی جلب المنافع۔ یعنی، تو اب سنو کہ عبادت کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ طاعت کرنا ہے دوسرا حصہ معصیت سے بچنا ہے جن میں اخلاق ذمیمہ بھی شامل ہیں اور یہ سمجھ رکھو کہ ان دونوں حصوں میں سے اجتناب والا حصہ انسان کے حق میں اکتساب والے حصہ سے افضل واشرف ہے اسلئے کہ نقصان دہ چیزوں کو اپنے سے دور کرنا ہمیشہ اہم اور مقدم ہوا کرتا ہے مصالح اور منافع کے حصول سے۔

میں کہتا ہوں کہ صاحب ترصیع نے بات نہایت ہی عمدہ بیان فرمائی ہے بلاشبہ ترک معاصی اتیان طاعت سے مقدم اور ضروری شئے ہے۔ اور میں اسکو آیت سے بھی موید کرسکتا ہوں

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ۔ (جو شخص جہنم سے دور رکھا گیا ہے اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو بس وہ کامیاب ہو گیا)۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک جنت ہے اور ایک نار ہے۔ معاصی کا ارتکاب کرنیوالا نار میں جاتا ہے اور طاعات کرنے والا جنت کا مستحق ہوتا ہے مگران دونوں میں سے دوزخ سے بچنا زیادہ اہم و ضروری ہے۔ چنانچہ اسکو یہاں ذکر میں بھی مقدم رکھا گیا ہے کیونکہ دوزخ میں ایک منٹ کا قیام بھی ناقابل برداشت ہوگا۔ چنانچہ جتنے بھی انبیاء علیہم السلام تشریف لائے سب ہی نے دوزخ سے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے پناہ مانگی ہے اور انکے بعد حضرات اولیاء کرام بھی انھیں کے نقش قدم پر چلے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ اللہ تعالیٰ سے ان لفظوں میں دعا مانگتے ہیں کہ ؎

من نہ گویم کہ طاعتم بہ پذیر قلم عفو بر گناہم کش

میں نہیں کہتا ہوں کہ آپ میری طاعت قبول کر لیجئے بلکہ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ بخشش کا قلم میرے گناہوں پر پھیر دیجئے یعنی انھیں معاف کر کے دوزخ سے مجھے بچا لیجئے۔ بس میرے لئے یہی کافی ہے مجھے جنت کے مراتب نہ ملیں نہ سہی دوزخ سے ضرور رہائی چاہتا ہوں۔ یہی مضمون ہے جسکو فرمایا گیا ہے کہ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ (جسکی دوزخ سے رہائی ہوکر بس جنت میں رسائی ہوگئی وہ کامیاب ہو گیا)۔

میں کہتا ہوں کہ ابھی بیان کر چکا ہوں کہ اصل چیز قلب سے رذائل تصفیہ ہے اور وہ ہوتا ہے معاصی کے ترک کرنے سے اور دوزخ میں پہونچانے والی چیز معصیت ہے اور طاعات کی جو توفیق ہوتی ہے وہ تصفیہ کے بعد ہی ہوتی ہے اس لئے تصفیہ یعنی تخلیہ کو تحلیہ سے مقدم ہونا ہی چاہئے۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ آج اسی کے اہتمام میں کمی ہے۔ طاعت کیجانب تو کچھ توجہ ہے بھی مگر ترکِ معصیت کی جانب اصلا توجہ نہیں ہے۔ اسلئے اسکی اہمیت کو قلب میں پیدا کرنے کیلئے اور سالکین کو صحیح راہ پر لگانے کے لئے یہاں مصنف نے یہ عنوان بہت ہی خوب اختیار فرمایا یعنی یہ کہ عبادات میں سے اجتناب کا حصہ اکتساب کے حصہ سے افضل ہے اسلئے کہ دفع مضرت جلب منفعت سے اولیٰ اور اقدم ہوا کرتی ہے۔ آدمی کو نفع حاصل نہ ہو نہ سہی مگر نقصان سے خود کو بچا ، سکے یہ بہت ضروری ہے۔ آگے مولف نے صوفیہ کا عمل بھی اس کی تائید میں بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ولذلک تری الاکتساب شان المبتدئین والاجتناب

ارباب البصائر اذ همتهم حفظ القلوب عن الميل لغيره تعالیٰ وحفظ البطون عن فضول الاطعمة وحفظ الالسن عن اللغو وحفظ الاعين عن النظر لما لا يعني وهذا كله من ثمرة انصلاح القلب فيقدر اصلاح القلب ينصلح الجوارح اكتساباً او اجتناباً۔ یعنی اجتناب کا پہلو چونکہ اکتساب سے افضل ہے یہی وجہ ہے کہ تم دیکھو گے کہ مبتدیوں کی توجہ طاعات کے اکتساب کی طرف زیادہ رہتی ہے اور جو حضرات کہ منتہی اور ارباب بصائر میں سے ہیں انکی تمام تر کوشش اسی جانب رہتی ہے کہ کوئی ظاہری یا باطنی معصیت نہ ہونے پائے۔ چنانچہ انکا قصد بس یہ ہوتا ہے کہ اپنے قلوب کو غیر اللہ کیجانب میلان سے بچائیں اور اپنے بطون کو فضول کھانوں سے محفوظ رکھیں اور اپنی زبانوں کو لغو اور بیکار باتوں سے بچائیں اسی طرح اپنی آنکھوں کو ہر اس شئے کیجانب نظر کرنے سے باز رکھیں جسکے دیکھنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ آگے اسکی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ ان حضرات کو اپنے بطن، لسان اور نظر کی حفاظت کی جو توفیق ہوتی ہے تو یہ اسلئے کہ قلب انکا منصلح (یعنی اصلاح پذیر) ہو چکا ہوتا ہے اور اسی کی انصلاح یعنی اثر پذیر ہونے کا یہ ثمرہ اور نتیجہ ہوتا ہے کہ دیگر تمام اعضاء اور جوارح بھی اصلاح کا اثر قبول کر لیتے ہیں۔ قلب جس طرح سے مصلح ہوتا ہے منصلح بھی ہوتا ہے بلکہ سب سے پہلے انصلاح قلب ہی قبول کر لیتا ہے اسکے بعد دوسرے اعضاء کیونکہ متأثر صلاح سے فساد سے پہلے قلب ہوتا ہے۔ چنانچہ نظر جو غلط محل میں پڑتی ہے تو اسکا داعیہ اور ارادہ پہلے قلب ہی میں ہوتا ہے آنکھ اسکا اتباع کر لیتی ہے۔ اسی طرح سے آدمی اگر کسی ناجائز مقام پر جانا چاہتا ہے تو قدم اٹھنے سے پہلے اسکا تقاضہ قلب میں پیدا ہوتا ہے۔ یہی حال صلاح کا ہے کہ منصلح پہلے قلب ہوتا ہے اور پھر اسکے انصلاح سے جوارح بھی منصلح ہو جاتے ہیں۔ انصلاح باب انفعال سے ہے جسکی خاصیت ہے تاثر یعنی اثر قبول کرنا۔ چنانچہ بولتے ہیں قطعتہ فانقطع یعنی میں نے اسکو کاٹا پس وہ کٹ گیا۔ اسی طرح سے قلب خود منصلح ہو کر جب دوسرے اعضاء کی اصلاح کرتا ہے تو دیگر اعضاء بھی اسکی اصلاح قبول کرتے ہیں اور چونکہ انکا اثر قبول کرنا قلب کے اثر قبول کرنے کے بعد اور اسی کی وجہ سے ہوتا ہے اس لئے جس قدر کسی کا قلب صلاح حاصل کئے ہوتا ہے اس کے بقدر اعضاء بھی (طاعات کرنے کے اعتبار سے یا معاصی کے ترک کے اعتبار سے) صلاح پذیر ہوتے ہیں۔

صاحب ترصیع کا یہ بیان بھی منجملہ ان بیانات کے ہے جو اس کتاب میں مجھے پسند

ہیں۔ ایسی باتیں (جن سے عبد کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے صحیح ہو) جو لوگ بیان کرتے ہیں وہ صاحب معالم کہلاتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں نہایت کام کی باتیں سمجھی جاتی ہیں اور مسلمانوں کے لئے نہایت مفید ہوتی ہیں۔

دیکھئے! کیسی عمدہ بات بیان فرمائی اور کیسے اچھے الفاظ میں اسکو ادا کیا ہے اور انصلاح قلب کا لفظ تو میں نے انھیں سے سنا، یوں مضمون تو مشہور حدیث کا ہے مگر اسکی شرح اس طریقہ سے کسی نے نہیں کی یہ چونکہ صوفی ہیں طریق کی باتوں کو کتاب وسنت سے مستنبط کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ فن کی باتوں کو جیسا یہ حضرات کتاب وسنت سے نکال لیتے اور ان نصوص کو جتنا یہ سمجھتے ہیں اتنا علماء ظاہر نہیں سمجھتے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب۔ یعنی انسان کے بدن میں ایک لوتھڑا ہے جب تک وہ درست رہتا ہے تمام بدن درست رہتا ہے اور جب وہ فاسد ہو جاتا ہے تو تمام بدن ہی فاسد ہو جاتا ہے سن لو! وہ لوتھڑا یہی قلب ہے۔ غرض جب قلب سب میں اصل ٹھہرا تو ارباب بصائر کے پیش نظر بھی یہی رہا، اور ان حضرات نے سب سے زیادہ اہتمام اس امر کا رکھا کہ غیر اللہ کیجانب میلان سے اپنے قلب کو بچایا جائے۔ اسی طرح سے اپنے بطون کو فضول اطعمہ سے اور زبان کو لغو و لایعنی کلام سے اور آنکھ کو نامشروع محل میں استعمال سے باز رکھا جائے اور یہ سب کے سب امور اجتناب ہی کے قبیل کے ہیں۔

گویا ان حضرات نے اکتساب سے زیادہ اہتمام اجتناب کا کیا ہے اور جو مبتدی ہوتے ہیں وہ اکتساب کے درپے رہتے ہیں اور اجتناب کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ اسکا منشاء انکا نقص ہوتا ہے یہ اسلئے کہ اکتساب میں کچھ کرنا ہوتا ہے اور دوسروں کی نظر بھی اس پر پڑتی ہے کیونکہ وہ وجودی ہوتا ہے لہذا نفس میں اسکو اپنا حصہ لینے کا موقع ملتا ہے اور اسکو حظ آتا ہے اور مبتدی چونکہ ابھی حظِ نفس سے نکلا نہیں ہوتا ہے اسلئے اسکو اسی شق سے مناسبت ہوتی ہے اور منتہی کی نظر چونکہ اپنی جانب سے اور طاعات سے اٹھ چکی ہوتی ہے اور اسکے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی رہتی ہے اسلئے وہ عبادت سے زیادہ تقویٰ کا خیال رکھتا ہے یعنی اسکا خیال رکھتا ہے کہ محبوب کے خلاف منشاء اور خلاف ادب کوئی حرکت نہ ہو جائے اس لئے اس کے شایان شان اجتناب ہے۔

سالکین کو انکی اسی خامی پر تنبہ کرنے کیلئے آگے مولفؒ نے اسکے مناسب ایک دوسری تنبیہ فرمائی ہے جو بہت زیادہ قابل توجہ ہے۔ فرماتے ہیں تنبیہ الاعمال الصالحۃ انواعٌ نوع الفرض ونوع الواجب ونوع المسنون الموکد ونوع المندوب وعلی المکلف ان یبدأ بالاھم فالاھم فان خالف ھذا الترتیب فھو جاھل مغرور کمن علیہ قضاء فوائت وھو مشتغل بالنفل او علیہ دین او زکوٰۃ مفروضۃ وھو مشتغل بالصدقۃ النافلۃ او ترک خدمۃ والدیہ وطاعتھا لفعل مستحب فکل ذلک غرور وعصیان یظلم بہ القلب وھذا الترتیب لایمکن القیام بہ علی الوجہ المطلوب الا بمعرفۃ المرشد الکامل او تعلم علم الفقہ ولذالک قالوا الصوفی عبارۃ عن العالم العامل بعلمہ ۔ یعنی اعمال صالحہ کی چند قسمیں ہیں ایک قسم فرض ہے ایک واجب ایک سنت مؤکدہ ہے ایک مندوب ہے۔ لہٰذا مکلّف پر لازم ہے کہ ان میں سے پہلے اہم کو لے پھر اسکے بعد جو اس سے کم درجہ کی ہو اسکو اختیار کرے۔ اب اگر اس نے اس ترتیب کیخلاف کیا یعنی غیر اہم کو لیا اور اہم کو ترک کردیا تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ نہایت ہی جاہل ہے اور دھوکہ میں پڑا ہوا ہے۔ جیسے کسی شخص کے ذمہ قضا نمازیں باقی ہوں اور وہ انکو تو نہ ادا کرے اور نوافل ادا کرنے میں مشغول ہوجائے ۔ اور دوسری مثال سنیئے! یا کسی پر قرض ہے یا فرض زکوٰۃ ادا کرنا باقی ہو اور وہ انکو ادا کرنے کے بجائے صدقات کی ادائگی میں مشغول ہوجائے ۔ تیسری مثال سنیئے! یا والدین کی خدمت کو ترک کردے اور انکی طاعت جو کہ اسکے ذمہ واجب ہے اسکا تو اہتمام نہ کرے اور کسی فعل مستحب میں اپنے کو لگائے رکھے۔ یا والدین کی خدمت وغیرہ جو کہ اہم امور ہیں انکی طرف سے غفلت برتے اور کسی امر مستحب میں جو اسکے نفس کے موافق ہو ان کی طاعت کے بہانے لگا رہے۔ یعنی یوں کہے مثلاً کہ والد صاحب نے یوں فرمایا ہے یا والدہ صاحبہ کی یہ خواہش ہے حالانکہ اس نے بڑے بڑے امور میں انکی خواہش اور انکے منشا کا ذرا بھی خیال نہیں کیا۔ پس یہ چیزیں غرور اور عصیان ہیں جنکی وجہ سے قلب میں ظلمت پیدا ہوتی ہے اور ان امور میں اہم جو ترتیب ہے اس پر عمل بدون مرشد کامل کی رہنمائی کے یا علم فقہ کے جانے ناممکن ہے اسی واسطے مشائخ نے فرمایا ہے کہ صوفی اسے کہتے ہیں جو عالم ہو اور اپنے علم پر عامل ہو۔

٭ اسی مضمون کو اکبر الٰہ آبادی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہے ؎

چشم ظاہر جسے ؛ دیکھ سکے

اس طرف التفات مشکل ہے

ملفوظات

(۲۳ ذیقعدہ ۱۳۸۶ھ)

ملفوظ:۔ فرمایا کہ علم حقیقتِ اشیاء کے انکشاف کا نام ہے اور یہ فرمایا کہ جب حقائقِ اشیا کا انکشاف ہوگا تو اس سے ہدایت ہوگی کیونکہ الفاظ کے ساتھ حال بھی مخاطب کے اندر داخل ہوتا ہے لہٰذا جس ناصح پر منکشف ہے وہ خود بھی تو متاثر ہوگا تو دوسرے میں بھی اثر ہوگا ورنہ جہل سے ہدایت کہاں ہو سکتی ہے۔

ملفوظ:۔ فرمایا کہ جس طرح کثرت مال موجب طغیان ہے اسی طرح کثرت عمل بعض اوقات موجبِ عُجب ہوتا ہے۔

ملفوظ:۔ فرمایا کہ اسلام اتباع شریعت، اور تقاضائے طبعی سے بے رخی کا نام ہے۔ اور اسلام کا حق ادا کرو احکام شرعیہ ادا کر کے اور عقل کو رہبر بنا کر۔

ایک خط

(جو متعلقہ حفظ از فتن ہے اور عام لوگوں کیلئے مفید ہو اسی کیساتھ برائے استفادہ عام پیش کیا جاتا ہے)

مکرمی جناب ... صاحب دام عنایتکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ (ناقل)

آپکا خط اور جناب قاری ... صاحب مدظلہٗ کا گرامی نامہ حضرت والا مدظلہٗ العالی کے ملاحظہ سے گذرا فرمایا کہ تم چاہو تو سید صاحب کو لکھدو اور انکا جی چاہے تو قاری صاحب کو لکھدیں کہ آپ نے یہ جو فرمایا ہے کہ "فتن نے قلوب کا ستیاناس بنا دیا کڑوی چیز شیریں اور شیریں تلخ معلوم ہو رہی ہیں" یہ تو صحیح ہے۔ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جنکا یہی حال ہے اور ایسا حال انھیں لوگوں کا ہوتا ہے جو خود فتنہ میں پڑے ہوتے ہیں اور مفتون ہوتے ہیں۔ باقی اسی دنیا میں اسی فاسد ماحول میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک مولوی صاحب کا خط عہ جو ایک عربی مدرسہ کے مدرس اول ہیں، ارسال خدمت ہے اسکو ملاحظہ فرمائیے (نقل خط ہمرشتہ مکتوب ہذا ہے) ایسے لوگوں کو فتن سے چاہے کچھ ایذا رسانی پہونچ جائے اور کچھ ظاہری پریشانیاں اٹھانی پڑ جائیں تو ہو سکتا ہے باقی یہ کہ انکے قلب ہی کا ستیاناس ہو جائے ایسا نہیں ہو سکتا ہے بلکہ یہ حضرات

عہ۔ یہ خط کتاب کے آخر میں غزل کے بعد ملاحظہ فرمائیے۔ جامی۔

اسی فضا میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور فتن سے دور رہنے کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی دعا کو سپر بناتے ہیں یعنی یہ کہتے ہیں اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ اور یہ کہ نَعُوْذُبِکَ مِنْ یَوْمِ السُّوْءِ وَمِنْ لَیْلَۃِ السُّوْءِ وَمِنْ سَاعَۃِ السُّوْءِ وَمِنْ صَاحِبِ السُّوْءِ یا اور انہیں کے مثل دعا اور استعاذوں کے ذریعہ فتن سے پناہ مانگتے ہوئے اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور اگرچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب مخاطبین یا ان میں سے بعض طلب سے خالی ہوتے ہیں تو ان سے خطاب کرنے کو جی نہیں چاہتا جیسا کہ مولانا رومؒ مثنوی میں ایک مقام پر فرماتے ہیں ؎

گر ہزاراں طالبان و یک ملول ... از رسالت باز می ماند رسول

لیکن جہاں یہ ہے وہیں دوسرے مقام پر مولانا رومؒ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ ؎

راز جز با رازداں انباز نیست ... راز اندر گوشِ منکر راز نیست
لیک دعوت وارد ست از کردگار ... با قبول و ناقبولِ او چہ کار
نوح نہ صد سال دعوت می نمود ... دمبدم انکار قومش می فزود
ہیچ از گفتن عنان واپس کشید ... ہیچ اندر غارِ خاموشی خزید
زانکہ از بانگ و علالائے سگاں ... ہیچ واگردد ز راہے کارواں
یا شب مہتاب از غوغائے سگ ... سست گردد بدر را در سیر تگ
مہ فشاند نور و سگ عوعو کند ... ہر کسے بر خلقت خود می تند
ہر کسے در خدمتے داده قضا ... در خور آں گوہرش در ابتلا

(مثنوی دفتر ششم ص ...)

حاصل یہ کہ آدمی اپنے ایمان کو درست کرلے اور اپنے اندر صدق و اخلاص پیدا کرے اور اپنے کام میں لگا رہے، یہ اسکا کام ہے اور حالات کو سازگار بنانا یہ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

اور آپ سے کہتا ہوں کہ جب کسی کا یہ حال ہو جائے کہ تلخ شیریں اور شیریں تلخ معلوم ہونے لگے تو یہ امر دلیل ہے اسکی کہ اسکا مزاج اور مذاق فاسد ہو گیا ہے اسلئے اسکو علاج کی ضرورت ہے کیونکہ اصل یہی ہے کہ ذائقہ کو درست کیا جائے۔ پس جسطرح سے ظاہری ذائقہ جب خراب ہو جاتا ہے تو عمدہ عمدہ کھانا بھی بدمزہ اور لذیذ سے لذیذ مٹھائیاں بھی تلخ معلوم ہوتی ہیں تو اسکے لئے طبیب سے نسخہ لکھوا کر دوا استعمال کرکے اسکی اصلاح کیجاتی ہے، اسی طرح سے جب باطنی مذاق بگڑ جاتا ہے اور فاسد ہو جاتا ہے تو اس روحانی مرض کا بھی علاج کرانا ضروری ہوتا ہے اور اسکا مطب اہل اللہ کی صحبت ہے اور اسکے ذریعہ سے قلب میں ایمان پیوست کرنے کی ضرورت ہے۔ باقی یہ کام زبان اور تقریر کا نہیں ہے۔

ایک بات تو یہ ہوئی۔ اب دوسری بات سنیئے کہ اس فساد اخلاق اور فساد مزاج کے زمانے میں بھی کام اگر طریقہ اور سلیقہ سے کیا جائے گا تو نفع ہوگا۔ اس امر کے ثبوت کیلئے بعض احباب کے خطوط نقل کرتا ہوں۔ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی ابھی حال میں بمبئی تشریف لے گئے تھے واپسی پر انہوں نے جو خط لکھا اسمیں تحریر فرماتے ہیں:۔

"۷ مارچ کو ایک عربی مدرسہ کے افتتاح کیلئے بمبئی گیا تھا حضرت والا کئی روز پہلے تشریف لیجا چکے تھے لیکن مجلسیں حضرات کے قیام کے فوائد و برکات کے ذکر سے معمور تھیں خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی بڑی اصلاح ہوئی، نیز ان تجار اور اہل ثروت کی جو اس سے پہلے مسلک سے بعید اور متوحش تھے۔ میمنوں اور دوسرے تعلیم یافتہ حضرات کے اجتماع میں مجھے بھی کچھ عرض کرنے کا موقع ملا۔ الحمد للہ جناب والا کے قیام کے اثرات اس مرتبہ بہت محسوس کئے۔ اطال اللہ بقاءکم و متعنا بفیوضکم والسلام مع الاکرام۔"

اسی طرح سے ایک اور صاحب اپنے ایک دوست کو امریکہ سے لکھتے ہیں:۔

"معرفت حق کے دو پرچے ملے ارے ..... بھائی کہہ نہیں سکتا کہ کیسی مسرت ہوئی ساری پڑھائی بند کردی اور دو دن مستقل رات میں کئی گھنٹے تک پڑھتا رہا اور سر دھنتا رہا حضرت کیلئے دل سے دعائیں نکلیں، اللہ تعالیٰ انکا سایہ ہم سب پر تا دیر قائم رکھے اور انکے وجود کی برکت سے ہمارے اعمال سدھر جائیں۔ میں نے اپنے والدین کو بھی لکھا ہے کہ وہ جا کر حضرت والا کے یہاں حاضری دیں، وہ لوگ انشاء اللہ جائیں گے۔ ارے آپ لوگوں سے بھی کہتا ہوں کہ (حضرت کو) پکڑ لیجئے مضبوطی سے۔ حضرت والا یہاں میری بڑی نگرانی فرماتے ہیں۔ کیسے لکھوں اور کیا لکھوں کہ یہ چیزیں لکھنے کی نہیں یعنی لکھی نہیں جاسکتیں اس کا تعلق میری حقیر رائے میں حال سے ہے۔ حضرت والا تک پہونچنے کیلئے کبھی کبھی دل بڑا بے چین ہوتا ہے، ملاقات کیلئے جی چاہتا ہے، کیسے اڑ کر پہنچوں۔ میرا سلام پہونچا ہے۔ دیوبند کیلئے اپیل پڑھی حضرت والا کی اپیل سر آنکھوں پر اللہ تعالیٰ نے دل میں خیال ڈالا کہ مدد کروں، میں انشاء اللہ نیت کر رہا ہوں جو کچھ ہو سکے گا بھیجوں گا۔"

اسی طرح ایک اور صاحب کا خط ملاحظہ فرمایئے اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں:۔

"ایک صاحب کے یہاں "معرفت حق" پر نظر پڑی پڑھکر بہت خوشی ہوئی فوراً لکھ کر خریدار بن گیا اور پچھلے سارے پرچے منگوا لیئے۔ اس جریدہ کو پڑھکر مولانا صاحب سے

ملنے کا اشتیاق ہوا۔ ویسے پیری مریدی پر اب تک اعتقاد نہیں ہے مگر کسی عالم و متقی ولی اللہ کی صحبت سے استفادہ کا خواہشمند ہوں۔ بزرگوں فقیروں سے ملنے کی کوشش کرتا ہوں پتہ نہیں کب اللہ انشراح صدر کر دے اور میں کسی مرشد کامل سے رشد و ہدایت پا سکوں۔ والسلام۔ (باقر گنج پٹنہ)

اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ ان دونوں باتوں میں آپ نے کیا فرق دیکھا ایک جگہ تو مذاق ہی فاسد ہو گیا ہے اور لوگوں کو شیریں تلخ اور تلخ شیریں محسوس ہو رہا ہے اور ایک جماعت ہے کہ وہ کہیں سے دین کی خوشبو پا لیتی ہے تو اسکی روح بے چین ہو جاتی ہے۔ انھیں حالات کو دیکھتے ہوئے میں تو اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ کام آج بھی ہو سکتا ہے مگر طریقہ سے اور وہ طریقہ یہی ہے کہ اپنے اسلاف اور بزرگوں کی سیرت معلوم کیجائے اور اسکو برابر پیش نظر رکھا جائے۔ علماء اور مشائخ نے اس سلسلہ میں بڑی محنت و جانفشانی کی ہے کہ بزرگوں کے اقوال و اعمال و احوال کو کتابوں میں جمع کر دیا ہے تاکہ وہ انکی عدم موجودگی میں انکی نیابت کریں اور لوگ ان سے نفع اٹھائیں انکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فتنہ اور کوئی بد حالی ایسی نہیں ہے جسکا علاج ان حضرات نے نہ لکھدیا ہو۔ باقی ہم اسکو دیکھتے ہی کب ہیں ہم کو اپنے مشاغل ہی سے کب فرصت ہے۔ اب اسکا کیا علاج؟

لہٰذا جب ان حضرات کی خدمات سے فائدہ نہیں اٹھایا جائے گا اور ان حضرات سے تلخ کو شیریں بنانا نہ سیکھا جائے گا تو مفتون ہی ہونا پڑے گا اور تلخیاں بھی برداشت کرنی پڑیں گی۔

والسلام۔ راقم جامی۔ ۲ ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ

ملک کے مشہور ادیب اور ملک الشعراء جناب روش صدیقی صاحب ماہ اپریل ۱۹۶۷ء کے اواخر میں حضرت مصلح الامۃ کیخدمت میں بمبئی میں حاضر ہوئے اور شریک مجلس ہوئے وہاں کے تأثرات اس حقیر سے بیان کئے کہ حضرت کے خون کا ایک ایک پاک قطرہ جو بنتا ہے امت کیخدمت میں صرف ہو رہا ہے۔ حضرت کی شفقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حضرت کو دیکھکر صحابہؓ یاد آتے ہیں۔

گذشتہ ہفتہ جناب روشن صاحب حقیر کے ساتھ حضرت مولانا تھانویؒ کے مزار اقدس

حاضر ہوئے اور وہاں دیر تک فاتحہ پڑھتے رہے اسکے بعد حضرت حافظ ضامن صاحبؒ کے مزار مبارک پر ہم لوگ گئے جو کہ بیری کے گنجان درختوں کے سایہ میں ہے، حافظ صاحبؒ کے یہاں حاضری پر روشؔ صاحب نے اپنے جذبات پر بہت قابو حاصل کیا کہتے تھے کہ آپ حضرات ساتھ نہ ہوتے اور شریعت کا پاس نہوتا تو شاید حضرت حافظ صاحبؒ کے مزار سے پسٹ کر خوب روتا ——— اس تاثر کا حاصل مندرجہ ذیل غزل کا مقطع ہے ——— زاں بعد ہم لوگ خانقاہ تھانہ بھون میں گئے اور حضرت حکیم الامتؒ کی سہ دری دیکھی جہاں سے حضرت مولانا تھانویؒ نے ۵۵ سال تک امت کی رہبری کی ہے اور ملفوظات وارشادات سے طالبین کو سیراب کیا ہے۔ ساتھ ہی حاجی صاحبؒ کا حجرہ بھی لگا ہوا ہے۔ وہاں بھی ہم لوگ تا دیر باادب خاموش کھڑے رہے ——— ان تاثرات کا نتیجہ اس غزل کا مطلع اور دوسرا شعر ہے ——— تیسرا شعر دور حاضر کے سطحی نظریات کی عکاسی جناب روشؔ کے بہترین طرز میں کررہا ہے اور چوتھا تغزل کی بہترین مثال ہے۔

(از ناقل)

غزل

(از جناب روشؔ صاحب صدیقی)

حاصلِ عمر خراباتِ مغاں کیا کہیئے ہوش آیا ہے تو آیا ہے کہاں کیا کہیئے

اے صنم خانۂ کونین، تقاضائے سکوت قصۂ شوخئ گفتارِ بتاں کیا کہیئے

علمِ حاضر کی کہانی سے خموشی ہی بھلی کچھ جو کہیئے تو بجز وہم گماں کیا کہیئے

لبِ جو، حلقۂ گل موجِ صبا، کیفِ غزل اور مفہومِ حیاتِ گذراں کیا کہیئے

حق ادا ہو نہ سکا راہ کے کانٹوں کا روشؔ

ساتھ تھا قافلۂ گلبدناں کیا کہیئے

مکتوب

(عربی مدرسہ کے مدرس اوّل صاحب کا وہ خط جسکا ذکر صفحہ پر آیا ہے)

حال ۔ نماز کے خالص عبادت بننے کے متعلق حضرتؒ سے عرض کیا تھا حضرتؒ نے دعار فرمائی تھی اور یہ فرمایا تھا کہ اس خاص جزو کے متعلق مجھے بار بار یاد دلاتے رہنا اس ہدایت کے مطابق عرض ہے کہ نماز کی مقبولیت کے لئے جس خشوع اور توجہ الی اللہ کی حاجت ہے وہ مفقود پاتا ہوں اور اب یہ خلش بڑھتی جارہی ہے ۔ شروع کرتے وقت تو کوشش کر کے تکبیر تحریمہ کہہ لی جاتی ہے اور کچھ دیر توجہ بھی رہتی ہے مگر دوام نہیں رہتا کبھی کبھی بار تجدید بھی کر لیتا ہوں پھر ذہن ہٹ جاتا ہے ۔ ادہر کچھ دنوں سے یہ الجھن ستارہی ہے کہ امامت کی حالت میں اگر تیری ہی نماز مکمل نہ ہوئی تو اسکا اثر مقتدیوں کی نماز پر بھی پڑے گا اور ان سب کی نمازوں کی باز پرس بھی امام ہی سے ہوگی ۔ اس تصور سے بڑی وحشت ہوتی ہے کہ سیکڑوں مقتدیوں کا بوجھ کیسے برداشت ہوگا ۔ چونکہ امامت بلامعاوضہ ہے اس لئے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ امامت ہی چھوڑ دوں مگر دقت یہ ہے کہ جس مسجد میں نماز پڑھتا ہوں کوئی موزوں شخص جو پابندی بھی کرے اور قبول بھی کرے نہیں ملتا ۔ اسلئے الجھن ہے ۔

اس سے آگے یہی الجھن ترجمۂ قرآن پاک میں حائل ہے کہ سب کچھ دوسروں کو سناتا ہے لیکن قرآن پر خود کتنا عمل ہے اور جب نہیں ہے تو پھر ان سارے سننے والوں کی ذمہ داری بھی تیرے ہی سر ہے ۔ اللہ تعالیٰ سے دعار کرتا ہوں اور تہجد کی تنہائی میں دعار کرتا ہوں اور حضرت اقدس کی ارشاد فرمودہ حدیث من تعارہ باللیل کو یاد کر کے اسوقت اللہ تعالیٰ سے عرض کرتا ہوں کہ وہ دین میں اور دینی امور میں مخلص بنادے اور صرف اپنی رضا کیلئے یہ سارے کام مجھ سے لے لے ۔

پھر بھی قلب کو اطمینان نہیں ہوتا کہ نہ معلوم کیا انجام ہوتا ہے ۔ فکر بڑھتی جارہی ہے کہ کس طرح جواب دہی ہوگی ۔ اس سے آگے یہی ذہنی تشویش مدرسہ کے سارے کاموں میں پاتا ہوں ۔ یہاں بھی خلوص کی مانگ ہے اور اپنے پاس اسی پونجی کی کمی ہے ۔

رحمتوں کی حدیثیں بھی پڑھتا ہوں اور رحمتوں کی آیتیں بھی مگر اب نظر آتا ہے کہ عمر بھر

ہیں کوئی عمل قابل قبول ادا نہیں ہوا۔'

کچھ سمجھ میں نہیں آتا اسلئے حضرت ہی کی رہبری کا محتاج ہوں، پورے الحاح کیساتھ درخواست ہے کہ حضرت اقدس رہبری فرمائیں اور دعا بھی ضرور فرمائیں اور بار بار کہ اللہ تعالیٰ نماز درست کر دے۔

خادم کو یقین ہے کہ اگر نماز درست ہو جائے اور جس درجہ کا خشوع و خلوص (کم سے کم) مطلوب ہے اگر اتنا عطا ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ نماز ڈھنگ کی بنکر قابل قبول ہو جائیگی بلکہ پوری زندگی میں انشاء اللہ خلوص نصیب ہو جائے گا

خادم کو یقین ہے کہ جس شفقت سے حضرت اقدس نے خادم کو نیک راہ پر لگانے کی کوشش فرمائی ہے اسی شفقت و مرحمت سے اسوقت بھی ضرور نوازیں گے۔

تحقیق۔ آپ کے مجموعی حالات سے بہت خوش ہوا کیونکہ اب تک تو یہ سمجھتا تھا کہ آپکو ظاہری علوم سے دلچسپی اور مناسبت ہے باطن کیجانب کچھ زیادہ توجہ نہیں ہے۔ لیکن آپکے ان حالات سے معلوم ہوا کہ اسکی (درستی) کی بھی فکر پیدا ہوگئی ہے تو سنیئے!

اس راہ میں اعمال و اخلاص موجب قرب الٰہی ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کے لئے کیسے اعمال و اخلاق اختیار کرنے چاہئیں، سالکین راہ کیلئے ایک مشکل چیز ہے۔ دیکھئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اعمال پسندیدہ اور اعمال برگزیدہ اختیار فرماتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ تضرع وزاری بدرگاہ واہب العطیات بھی کرتے ہیں جیسا کہ آپکی ادعیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اِهْدِنِي لِصَالِحِ الْأَعْمَالِ وَالْأَخْلَاقِ إِنَّهُ لَا يَهْدِي لِصَالِحِهَا وَلَا يَصْرِفُ سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ دیکھئے باوجودیکہ آپ اولوالعزم پیغمبر ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام کے سردار ہیں آپکی عبادت آپکے اعمال صالحہ آپ کے اخلاق اور پھر انہیں آپکی حسنِ نیت، آپکا ارادہ آپکا صدق عزم ان سب چیزوں کا تو پوچھنا ہی کیا ہے اسکے باوجود آپ اللہ تعالیٰ ہی سے ہدایت طلب فرما رہے ہیں۔ اعمال و اخلاقِ حسنہ کی اور بُرے اعمال اور بُرے اخلاق سے صَرف یعنی ہٹنے اور بچنے کو اُدھر ہی سے طلب فرما رہے ہیں۔ یہی اصل ہے اس راستہ کی کہ بندہ تضرع وزاری کو اپنی خو بنالے۔ پھر اسکے بعد ادھر سے جب ہدایت توفیق، حسنِ نیت، قوت عبادت اور طاقتِ اجتنابِ معاصی یہ سب امور عطا ہوتے ہیں تب ہی اسکا کام بنتا ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ سے سوال فرمایا تو اب طریقہ مسنون ہوگیا ہے۔ لہٰذا سالکین راہ کیلئے بھی ضروری ہوگا کہ وہ بھی اگر کسی عمل صالح کو کرنا چاہتے ہیں یا کسی سیئہ سے بچنا چاہتے ہیں تو وہ بھی یہی طریقہ اختیار کریں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کو اپنا وظیفہ بنائیں اور اس کے ذریعہ اللہ تعالےٰ ہی سے توفیق طلب کریں۔

اسی طرح سے ایک اور دعا میں آپ فرماتے ہیں کہ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ التَّوْفِیْقَ لِمَحَابِّكَ مِنَ الْاَعْمَالِ وَصِدْقَ التَّوَكُّلِ عَلَیْكَ وَحُسْنَ الظَّنِّ بِكَ اس میں پسندیدہ اعمال کی توفیق، صدق توکل اور حسن ظن کی دعا آپ اللہ تعالیٰ ہی سے فرما رہے ہیں

ان ادعیہ میں غور فرمایئے اور انکا خصوصی ورد رکھیئے ______ ایک اور دعا میں فرماتے ہیں جو دین دنیا دونوں کیلئے جامع ہے اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا مِنْ فَضْلِكَ وَلَا تَحْرِمْنَا رِزْقَكَ وَبَارِكْ لَنَا فِیْمَا رَزَقْتَنَا وَاجْعَلْ غِنَاءَنَا فِیْ اَنْفُسِنَا وَاجْعَلْ رَغْبَتَنَا فِیْمَا عِنْدَكَ ۔

آپ تو عالم ہیں اسکے ایک ایک لفظ پر غور فرمایئے اور دیکھئے کہ کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو دنیوی پریشانیوں سے بچنے کا طریقہ سکھلایا اور دنیا کے سوال کے وقت بھی آخرت کو بھولنے نہیں دیا۔

اور سنیئے! ایک دعا میں فرماتے ہیں کہ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِمَّنْ تَوَكَّلَ عَلَیْكَ فَكَفَیْتَهٗ وَ سْتَهْدَاكَ فَهَدَیْتَهٗ وَاسْتَنْصَرَكَ فَنَصَرْتَهٗ اس سے بھی معلوم ہوا کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرلیتا ہے تو اللہ تعالےٰ اسکو کافی ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے خود ہی ارشاد فرمایا ہے الیس اللہ بکاف عبدہٗ۔

پس جب اللہ تعالیٰ ہی کسی کی کفایت فرمائیں تو اسکو ہدایت دیدیں، نصرت دیدیں اور جو چاہیں عطا فرمادیں انکے لئے کیا مشکل ہے۔

حضرت رفاعیؒ فرماتے ہیں کہ نعمت عافیت کی بڑی قدر کرو جس کی حقیقت یہ ہے کہ سانس بدون تکلیف کے آتی رہے۔ رزق بدون مشقت کے ملتا رہے۔ اور عمل صالح بدون ریا کے ہوتا رہے

سبحان اللہ نہایت عمدہ تعریف فرمائی ہے۔ آج اوّل کو تو عافیت سمجھا جاتا ہے

لیکن رزق بدون مشقت کے ملتا رہے فرما رہے ہیں کہ یہ بھی عافیت ہے۔ اب اگر رزق ہی نہ ملے یا بڑی مشقت کے بعد ملے تو عافیت نہیں۔ اور یہ کہ عمل اخلاص کے ساتھ ہوتا رہے اسکو تو کوئی عافیت سمجھتا ہی نہیں، حالانکہ حضرت رفاعی اسکو بھی عافیت کا جزو فرما رہے ہیں یعنی اگر اعمال صالحہ ہو ہی نہیں یا اگر عمل ہو تو مگر اس میں خلوص نہو تو بھی عافیت باقی نہیں ہے۔

آپ کے خط سے جس فکر وغم کے قلب میں پیدا ہو جانے کا اندازہ ہوا طریق میں وہ مقصود اور مطلوب ہے اور جس قدر یہ فکر بڑھتی جائیگی راستہ جلد کھلنے کی امید ہے۔ باقی اطمینان کو جو آپ نے لکھا ہے تو اطمینان کی جگہ تو آخرت ہے۔ دنیا میں اطمینان کہاں؟ یہاں تو بین الخوف والرجا ہی رہنا ہے۔ اسی کو اہلِ طریق یوں فرماتے ہیں کہ ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

تا دمے آخر دمے آخر بُوَد کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(ترجمہ) اس راہ میں (یعنی طلب خدا کے راستہ میں) تو ہر وقت تراش وخراش ہی جاری رہنا چاہیئے اور آخر وقت تک انسان کو فارغ اور مطمئن نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جب آخری وقت کی بھی آخری گھڑی آئے اسی وقت ہی تجھ پر اللہ تعالیٰ کی عنایت متوجہ ہو جائے اور اسمیں انکی جو بھی مصلحت ہو وہ جانیں تم کو تو ہمہ وقت مستعد اور تیار ہی رہنا چاہیئے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی)

آپ شب کو کچھ کام کر لیتے ہیں، دن کا وقت بھی خاصا طویل ہوتا ہے اسلئے تھوڑا سا وقت اس میں سے بھی ذکر وفکر کے لئے نکال لیجئے انشاء اللہ تعالیٰ نفع ہوگا۔

والسلام

ختم شد

حصہ دوم

قَالَ اللّٰہُ تعالیٰ

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

الحمد للہ کہ عجالہ نافعہ مسمّٰی بہ

مضمون ذکر

مشتمل بر حقیقت و اہمیت و نافعیت ذکر

از افادات

مصلح الامۃ عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ

ناشر:- دفتر معرفت حق ۲۳ بخشی بازار

الہ آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ؕ

امابعد - واضح ہو کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے دینی اور دنیوی ہر کام اور ہر نظام میں بے عملی نے جیسی کچھ راہ پکڑ لی ہے ظاہر ہے۔

چنانچہ اسی بے عملی کے سبب ہمارے دینی (علمی اور عملی) اداروں کا بھی جو حال ہے محتاج بیان نہیں ہر وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے ذرا سی بھی بصیرت عطا فرمائی ہے وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ ہماری ان جگہوں میں روح باقی نہیں رہی ہے صرف جسد ہی جسد رہ گیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ علم تو چونکہ عمل سے الگ ایک شے ہے اس لئے اگر بالفرض عمل نہ بھی پایا جائے تو بھی علم موجود ہو سکتا ہے لیکن تصوف جو کہ سراپا عمل ہی کا نام ہے، جب یہاں سے عمل رخصت ہو جائے گا تو پھر اس کے بعد کیا باقی رہ جائے گا۔

پھر اعمال میں سے ذکر و فکر کو طریق میں جو اہمیت حاصل ہے وہ بھی مخفی نہیں ہے۔ ہمارے حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

کامیابی تو کام سے ہوگی ۔۔۔ نہ کہ حُسنِ کلام سے ہوگی
فکرؔ اور اہتمام سے ہوگی ۔۔۔ ذکر کے التزام سے ہوگی

یہی کام ذکرؔ و فکرؔ جس کو اکابر طریق کلید کامیابی فرماتے چلے آئے ہیں آج ہم میں سے وہ لوگ بھی جو طریق کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ اس میں داخل بھی ہیں، اس کا کتنا حق ادا کرتے ہیں، جانتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ بات یہ ہے کہ کسی شے کے حقوق ادا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی کو پہلے اس کی حقیقت اسکی اہمیت اور اسکی نافعیت کا علم ہو۔

چنانچہ اسی امر کے پیش نظر مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب دامت برکاتہم نے ذکر کے متعلق جو اہم افادات وافاضات مختلف اوقات میں فرمائے ان سب کو نیز اور بعض ضروری اضافات کو جمع کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی اس مختصر سے رسالے میں سعی کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس سعی کو مشکور فرمائے اور اس کے دینی و دنیوی ثمرات اور برکات سے ہم سب کو حصہ وافر نصیب فرمائے آمین۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ

۳۰ رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ ۔۔۔ راقم جامع عفی عنہ حسن منزل الٰہ آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِاَھْلِہٖ وَالصَّلٰوۃُ لِاَھْلِھَا

(مجرد ذکر لسانی کی فضیلت)

درس حدیث میں بخاری شریف کی اس حدیث پر کہ :۔

ما من احد یشھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ صدقاً من قلبہ الا حرمہ اللہ علی النار ۔	کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ صدق دل سے اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ پر حرام کر دے گا۔

تقریر فرماتے ہوئے فتح الباری سے اس مقام کا مشہور اشکال اور اس کے جوابات بیان فرمائے۔ اشکال کا حاصل یہ تھا کہ "ظاہر حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص بھی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ صدق دل سے کہدے گا وہ دوزخ میں نہ جائیگا۔ اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کو حرام فرما دیں گے۔ لیکن اہل سنت والجماعت کے نزدیک دلائل قطعیہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عصاۃ مومنین کو عذاب ہوگا پھر بعد میں شفاعت کے ذریعہ وہ دوزخ سے نکال لیے جائیں گے اور ان دونوں باتوں میں بظاہر صریح تعارض معلوم ہوتا ہے۔

صاحب فتح الباری نے اس کے بہت سے جوابات نقل فرمائے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا قائل جو دوزخ پر حرام ہے تو مراد اس سے اس کا فی الجملہ حرام ہونا ہے یعنی اُس کے بعض اعضاء نار پر حرام ہوں گے۔ یہ ضروری نہیں کہ سارا جسم حرام ہو۔

چنانچہ یہ ثابت ہے کہ آگ مومن کے اعضاء سجود کو نہیں کھائے گی جیسا کہ حدیث شفاعت سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح سے اس کی زبان بھی جلنے سے محفوظ رہے گی کیونکہ وہ دنیا میں ناطق بالتوحید رہ چکی ہے سبحان اللہ! ۔ نیز حدیث شریف میں شفاعت کے بیان میں ہے کہ بہت سے لوگ دوزخ میں ایسے ہونگے کہ آگ اُن کے اعضاء سجود اور زبان پر کچھ بھی اثر نہ کرے گی اور اُن کے یہ اعضاء چمکتے ہوں گے۔ اسی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں پہچان لیں گے اور اُنکی سفارش فرمائیں گے۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ مومن کے اعضاء سجود اور اس کی زبان پر دوزخ کا کچھ بھی اثر نہ ہوگا اور زبان کے نہ جلنے کی وجہ تو صاحب فتح الباری نے صراحۃً ہی بیان کردی کہ وہ اس لئے نہ جلے گی کہ وہ ناطق بالتوحید تھی گویا ذکر کا اثر یہ ہوا کہ وہ جلنے سے مستثنیٰ ہوگئی۔ اب اس سے بڑھ کر ذکر لسانی کی اور کیا فضیلت ہوسکتی ہے؟

پھر اسی مضمون کی تائید میں حضرت والا دامت برکاتہم نے بزرگوں کا کلام دکھلایا کہ بزرگوں نے ذکر لسانی کی جو ترغیب دی ہے اور اپنے لوگوں کو جو اس پر اُبھارا ہے کہ اگر ذکر قلبی میسر نہیں تو لسانی ہی کرو۔ یہ بھی خالی از نفع نہیں۔ اور یہی ذکر لسانی ذکر قلبی کا بھی ذریعہ ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات سے یہ عبارت سنائی۔

"اور جس قدر ہوسکے اگرچہ قلیل ہو اُس کو اسی ہی تشویش سے مخلوط کرکے کرتا رہے۔ اگر پریشانی خاطر ہے تو فقط لسانی ہی سہی کہ اگر لطیفۂ قلب معطل رہا و غافل ہوا تو زبان تو معطل و غافل نہیں۔ ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ (جس چیز کو کل نہ پاسکے تو یہ بھی نہ کرے کہ کل ہی کو چھوڑ دے) ذکر ایسی شئی ہے کہ اگر اس کو کرتا رہے اگرچہ بیہوشی خاطر و پریشانی تعلقات میں محض تحریک لسانی ہو نافع اور موجب نورانی قلب کے ہوتا ہے۔ ہرچند "ذکر قلبی" ہی ہے اور ذکر کامل وہی ہے کہ تمام لطائف کو شاغل بنا دے۔ مگر یہ نہ ہو تو فقط لسان کو بھی کیوں بیکار کردیوے۔ یہ محض لسانی غفلت کا ذکر کشاں کشاں قلب تک پہونچا دیتا ہے۔ عضو لسان اگر جنت میں جائے گا تو کیا دیگر جملہ اعضاء محل نار رہ سکتے ہیں؟ ذکر وہ شئی ہے کہ اگر کسی جزو انسانی سے متصل ہوئے گا تمام جسد کو اپنی طرف کھینچ لیوے گا۔ زنہار کہ آپ التزام شغل کے واسطے فرصت کا انتظار کریں۔ اگرچہ پانچ چار منٹ ہی ہو مگر شغل کو شروع کرو اور خیر العمل ما دیم علیہ کو پیش نظر کرکے اس ہی پانچ منٹ پر التزام کریں اگرچہ محض لسانی بھاگتے دوڑتے ہو۔ پس اس تحریر کو مبالغہ نہ تصور فرمادیں اور اپنا کام ان ہی کاموں میں بالالتزام شروع فرماویں جب پانچ منٹ کا التزام ہوگا وہ زائد ہوجاوے گا"۔ والسلام (مکتوبات رشیدیہ ص ۳۰)

حضرت گنگوہیؒ کی یہ عبارت سنا کر فرمایا کہ ـــــ دیکھئے حضرت کے اس ارشاد میں ذکر لسانی اور ذکر قلبی دونوں کا مفہوم واضح ہوگیا۔ یعنی یہ کہ ذکر لسانی تو اسے کہتے ہیں کہ محض زبان سے ذکر کیا جائے اور قلب کی اس میں مطلقاً شرکت نہ ہو بلکہ ذکر کے برعکس اس میں غفلت موجود ہو یعنی بالکل معطل اور مشوش ہو۔ اور ذکر قلبی اس کا نام ہے کہ زبان سے جو کچھ ذکر کیا جائے تو اس میں قلب کو بھی شریک کیا جائے۔ یعنی قلب سے بھی ذکر کا قصد

کیا جائے اور قلب کو ذکر کی جانب متوجہ کیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ذکر لسانی میں فقط لسان سے ذکر ہوتا ہے قلب کی اس میں مطلقاً شرکت نہیں ہوتی اسی طرح ذکر قلبی میں یہ ضروری نہیں کہ وہ محض قلب ہی سے ہو اور لسان کا اسمیں کچھ بھی دخل نہ ہو۔

نیز حضرت نے یہ جو فرمایا کہ "عضو لسان اگر جنت میں جائے گا تو کیا دیگر جملہ اعضاء محل نار ہو سکتے ہیں" تو صاحب فتح الباری نے جو نقل فرمایا ہے کہ "حدیث شفاعت میں ہے کہ دوزخ کی آگ مسلم کے مواضع سجود کو نہیں کھائے گی اور اس کی زبان بھی آگ کے اثر سے اس لئے محفوظ رہے گی کہ وہ دنیا میں ناطق بالتوحید تھی" حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کا ماخذ یہی ہے۔ اگر حضرتؒ یہاں اس حدیث کو بھی ذکر فرما دیتے تو یہ مضمون حدیث سے بھی مؤید ہو جاتا۔

اس موقع پر مجرد ذکر لسانی کو بیکار ثابت کرنے کے لئے بعض لوگ یہ شعر پڑھ دیتے ہیں ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر — ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

اور اس شعر کو مثنوی مولانا رومؒ کا ظاہر کرتے ہیں حالانکہ یہ کسی اور کتابؔ کا شعر ہے جو مثنوی ہی کی بحر میں ہے، اس لئے سننے والوں کو دھوکا ہو سکتا ہے لیکن محققین کے نزدیک اس کا مضمون صحیح نہیں ہے۔ اسی لئے حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذرا سا تصرف فرما کر اس طرح کر دیا ہے کہ ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر

(ذکر قلبی کی تحقیق)

اور یہ کہ اس کا سبب عادی ذکر لسانی ہے!

ذکر لسانی اور ذکر قلبی کی اس مختصر سی تشریح کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علماء اور مشائخ کے کلام سے اس پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کر دی جائے کیونکہ اس زمانہ میں گو اسباب علم زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ حقائق و معارف سے ناواقف ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ لوگ برسہا برس تک جس چیز میں رہتے ہیں اس کی بھی حقیقت سے واقف نہیں ہوتے۔

چنانچہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ لوگ طریق میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور بزرگوں کے احوال وکیفیات معلوم کر کے چاہتے ہیں کہ اپنے اندر بھی ان احوال کو دیکھیں لیکن یہی حقیقت سے ناواقفیت ان کو اس سے محروم رکھتی ہے۔

ؔ اس کتاب کا نام "نان وحلوہ" ہے جو ایک شیعہ کی تصنیف ہے۔

چنانچہ ذکر قلبی جس کی تعریف آپ کو ابھی معلوم ہو چکی ہے اس کے متعلق مشائخ فرماتے ہیں کہ یہ طریق کی اصل ہے اور اس راہ میں جتنے بھی مدارج اور مراتب کسی کو حاصل ہوتے ہیں وہ اسی سے طے ہوتے ہیں اور میاں یہ حال ہے کہ اس کا عمل میں لانا اور قلب کا اس سے اتصاف تو الگ رہا آج کتنے ہیں جو اس کی حقیقت اور اس کے حصول کے طریقہ سے بھی واقف ہیں؟ حالانکہ نہ صرف علمائے باطن بلکہ علمائے ظاہر بھی اس ذکر قلبی کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ "افضل الذکر" ہے اور جملہ انواع اذکار کے لئے مصحح ہے جیسا کہ آگے آتا ہے:۔

ہم یہاں اپنے اس قول کے اثبات کے لئے ابوبکر جصاص رازیؒ کی مشہور و معروف کتاب احکام القرآن سے آیۂ کریمہ فَاذْكُرُونِي اور اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کی تفسیر نقل کرتے ہیں وھو ہٰذا

وقوله فَاذْكُرُونِي اذكركم قد تضمن الامر بسائر وجوه الذكر منها سائر وجوه طاعته وهو اعم الذكر۔

ومنها ذكره باللسان على وجه التعظيم والثناء عليه ۔ والذكر على وجه الشكر والاعتراف بنعمته

ومنها ذكره بدعاء الناس اليه والتنبيه على دلائله وحججه ووحدانيته وحكمته وذكره بالفكر في دلائله وآياته وقدرته وعظمته وهذا افضل الذكر وسائر وجوه الذكر مبنية عليه وتابعة له وبه يصح معناها لان اليقين والطمانينة به يكون قال الله تعالى الا بذكر الله تطمئن القلوب يعني والله اعلم ذكر القلب الذي هو الفكر في دلائل الله تعالى وحججه وآياته و بيناته وكلما ازداد فيها فكرا ازداد [illegible] اليه وسكونا اهـ

اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَاذْكُرُونِي میں ذکر کا جو امر ہے وہ تمام طرق ذکر کو متضمن ہے۔ منجملہ ان کے حق تعالیٰ کی جملہ طاعات ہیں اور یہ ذکر سب اذکار سے عام ہے۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کو زبان سے یاد کرنا بطور ثنا اور تعظیم کے بھی ذکر ہے۔ اور بطور شکر ذکر کرنا اور اس کی نعمتوں کا اعتراف کرنا یہ بھی ذکر ہے۔

نیز منجملہ ذکر ہی کے کسی شخص کا لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی جانب دعوت دینا اور اس کے وجوب و وجود کے دلائل پر تنبیہ کرنا اور اس کی حکمتوں کو بیان کرنا بھی ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ کے دلائل اور انکی آیات اور قدرت و عظمت میں تفکر کرنا یہ بھی ذکر ہے بلکہ افضل الذکر ہے۔ اور دیگر وجوہ ذکر اسی پر مبنی اور اس کے تابع ہیں چنانچہ اسی کے ذریعہ ان سب کے معنی کی صحت ہوتی ہے اس لئے کہ یقین اور طمانینت اسی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے تو یوں تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں باقی معنی اسکے یہی ہیں کہ ذکر قلب جس کا، وہ امام اللہ تعالیٰ کے دلائل اور اس کے حجج اور آیات اور اس کی بینات میں غور و فکر کرنا ہے۔ اسی ذکر قلبی سے قلوب کو اطمینان ہوتا ہے۔ تم ان سب میں جس قدر زیادہ اپنی فکر کو بڑھاؤ گے اسی قدر

افضل الذکر لان سائر الاذکار انما یصح ویثبت حکمہا بثبوتہ

(احکام القرآن صفحہ ۲۹۳ ج ۱)

طمانیت اور سکون بھی بڑھتا ہوا پاؤ گے اور یہی افضل الذکر ہے اس لئے کہ اور دوسرے اذکار کی صحت اور ان کے حکم کا ثبوت اسی سے ہوتا ہے۔

دیکھئے یہاں امام رازیؒ نے ذکر کے اقسام بیان فرمائے کہ اس کی ایک قسم جملہ طاعات یعنی نماز روزہ زکوۃ حج وغیرہ بھی ہے۔ اسی طرح ایک قسم ثنا اور تعظیم کے طور پر زبان سے ذکر کرنا بھی ہے۔ نیز لوگوں کو اپنے وعظ وتبلیغ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی جانب دعوت دینا یا اللہ تعالیٰ کی توحید کے دلائل بیان کرنا، یہ سب بھی ذکر میں داخل ہیں۔ اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کے دلائل وآیات، اس کی قدرت وعظمت میں فکر کرنا یہ فکر بھی، ذکر ہی کی ایک قسم بلکہ اسکی اعلیٰ فرد ہے۔ اور جملہ انواع ذکر سے افضل ہے کیونکہ بقیہ اور قسمیں ذکر کی اسی قسم پر مبنی اور اسی کے تابع ہیں بلکہ ان سب کے معنی کی صحت اسی سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ذکر کا جو اثر ہے یعنی یقین قلبی اور طمانیت، اس کا حصول اسی ذکر قلبی سے ہوتا ہے جس کا دوسرا نام فکر ہے۔

اسی فکر کے متعلق صاحب دلیل الفالحین شارح ریاض الصالحین لکھتے ہیں کہ:-

لا عبادۃ کالتفکر وقیل الفکرۃ تذہب الغفلۃ وتحدث للقلب الخشیۃ کما یحدث الماء للزرع النبات وما جلیت القلوب بمثل الاحزان ولا استنارت بمثل الفکرۃ۔

فکر کی طرح کوئی دوسری عبادت نہیں ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ تفکر غفلت کو دور کرتی ہے اور قلب میں خشیت پیدا کرتی ہے جس طرح کہ پانی کھیت میں پودا اُگاتا ہے۔ اور حزن (رنج وغم) سے بڑھ کر کوئی شئی قلب کا جلا کرنے والی نہیں۔ اور فکر سے زیادہ کوئی چیز قلب کے لئے روشنی بخش نہیں۔

وقد روی ان یونس علیہ السلام کان یرفع فی کل یوم مثل عمل اہل الارض قالوا انما کان ذلک التفکر فی امر اللہ الذی ہو عمل القلب لان احدا لا یقدر ان یعمل بجوارحہ فی الیوم مثل عمل اہل الارض۔

روایت ہے کہ حضرت یونسؑ کا اتنا عمل ہر روز اوپر کو اٹھایا جاتا تھا جتنا کہ روئے زمین بھر کے لوگوں کا عمل ہوتا ہے۔ علماء نے فرمایا ہے کہ یہ وہی تفکر فی امر اللہ ہے جو کہ ایک قلبی عمل ہے اس لئے کہ کوئی شخص بھی اپنے ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء بدن سے ایک دن میں سارے روئے زمین والوں کے عمل کے برابر عمل تو کر ہی نہیں سکتا (لامحالہ یہ کوئی دوسرا ہی عمل ہے)

بہرحال فکر کی یہ تشریح کہ اس کا دوسرا نام ذکر قلبی ہے اور مطلق ذکر کا یہ افضل ترین فرد ہے۔ علماء ظاہر کے کلام سے بیان کی گئی۔

اب آپ کے سامنے لسان صوفیہ سے ذکر وفکر کا مفہوم پیش کرتے ہیں اور اس کے بعد بیان کریں گے کہ

یہ حضرات بھی قریب قریب وہی بات فرماتے ہیں جو علمائے ظاہر کے کلام سے آپ نے معلوم کیا۔

ایک عالم محقق اور صوفی کامل فرماتے ہیں:-

"جاننا چاہیئے کہ حق تعالیٰ کی محبت حاصل ہونے کا سبب عادی ذکر و فکر ہے۔ یعنی عادۃ اللہ یونہی جاری ہے کہ انسان جب ذکر و فکر طریقہ سے کرتا ہے تو اس سے اسکے قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس محبت کی دو قسمیں ہیں حبِ عشقی اور حبِ ایمانی اور ان دونوں میں سے ہر ایک نوع کی محبت کے تحصیل کا ذکر و فکر دوسری نوع کے ذکر و فکر سے جدا ہے مثلاً حبِ ایمانی کے حصول کا طریق تلاوت قرآن شریف اور عمل بالسنۃ وغیرہ ہے۔ اور حبِ عشق کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ ذکر کرنے والا جب زبان سے اللہ اللہ کرتا ہے تو یہ لفظ مبارک اللہ (جو نشار الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی تجلی ہے) اس کے تالو اور دہان، زبان اور کان سب اعضاء کو نور اور سکینہ اور لذت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ (اور یہ سب ذکر بالجہر میں ہوتا ہے جب کہ اُسے صوفیائے کرام کے معہود طریق پر کیا جاوے کیونکہ ذکر جہر موضوع ہی ہے وساوس کو دفع کرنے، خاطر کو جمع کرنے اور ارواح کی توفیق کے لئے) اسی طرح سے اس ذکر کا یہ اثر بھی ہوتا ہے کہ وہ ذاکر کے خیال کو بالکل گم اور مضمحل کر دیتا ہے (اور یہ سب ذکر خفی میں ہوتا ہے جبکہ اُس کو مشائخ کے مقررہ طور پر کیا جاوے۔ اس لئے کہ ذکر خفی میں خلوت ہوگی سکوت ہوگا اور اختلاط ناس سے اجتناب ہوگا اور یہ سب چیزیں ان امور کے لوازم ہیں)

الغرض کبھی صرف اللہ اللہ کے ذکر سے یہ بات حاصل ہو جاتی ہے (چنانچہ یہی وہ لفظ ہے جس کے بارے میں بہت سے علماء اور مشائخ فرماتے ہیں کہ یہی اسم اعظم ہے اور صاحب مقام کے لئے یہ ایک ایسا ذکر ہے کہ اس کے اوپر اور کوئی ذکر نہیں۔ اسی کے متعلق شرح تحریر میں ہے کہ:-

روی ہشام عن محمد عن ابی حنیفۃ رح انہ اسم اللہ الاعظم وبہ قال الطحاوی وکثیر من العلماء واکثر العارفین حتی انہ لا ذکر عندھم لصاحب مقام فوق الذکر بہ (الرسائل حضرت ۱۱)

حضرت ہشام امام محمدؒ سے اور وہ حضرت امام ابو حنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں کہ یہی لفظ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ طحاوی نے بھی یہی فرمایا ہے اور بہت سے علماء اور اکثر عارفین اسی کے قائل ہیں۔ یہاں تک کہ صاحب مقام کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی ذکر ہی نہیں۔

عہ قال العارف الرومیؒ ۔ اللہ اللہ این چہ شیرین است نام ؛ شیر و شکر می شود جانم تمام

پھر اس کے بعد طالب کو ترقی ہوتی ہے اور وہ لفظ سے اس کے مفہوم کے تصور کی جانب منتقل ہوتا ہے یا منتقل کر دیا جاتا ہے یعنی حق تعالیٰ کی اس تجلی کی جانب متوجہ ہوتا ہے یا کر دیا جاتا ہے جو کہ نشاء علم کے اندر ہے اور یہ تجلی حق تعالیٰ کی تجلیات میں سے سب سے اعلیٰ اور الطف اور حضرت حق سبحانہٗ کی ذات والاصفات سے قریب ہے۔

پھر جب یہ تجلی یعنی اس لفظ اللہ اللہ کا مفہوم جو کہ بسیط اور مجرد محض ہے ذاکر کے ذہن میں اس طرح مستقر اور جاگزیں ہو جاتا ہے کہ اس کی ظاہری نہیں بلکہ بصیرت کی آنکھ اس کے مفہوم کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتی ہے اور اس طرح سے ہمہ تن اُدھر متوجہ ہو جاتی ہے کہ ماسوا کی جانب قلبی توجہ اور التفات اصلاً باقی نہیں رہ جاتا (جیسا کہ ایک عارف فرماتے ہیں ؎

گئے دن باندھنے کے ٹکٹکی کے — اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

اس میں پہلے مصرع میں اسی درجہ کی جانب اشارہ ہے اور دوسرے میں ترقی کے بعد دوسری حالت کا ذکر ہے) اور اگر بالفرض کبھی ماسوا کا گذر ہوا بھی تو اس کا درجہ خطرہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ یعنی بس آیا اور چلا گیا۔ (چنانچہ حضرت خواجہ محمد معصومؒ خلف رشید حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوب میں کسی کو لکھتے ہیں کہ:-

دراحوال مشارٌ الیہ نوشتہ اندکہ بے تعلقی دل بہم رسیدہ است وخطرۂ ماسوا بدل نمی گذرد ایں حال بسے شریف است ومعتبر است بہ فناء قلب وقدم اول است در اطوار ولایت (مکتوبات معصومیہ ص۲۵)	آپ نے اپنے حالات کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ دل کی بے تعلقی بخوبی حاصل ہوگئی ہے اور اب دل میں ماسوا کا خطرہ تک نہیں گذرتا تو یہ حال نہایت ہی عمدہ ہے اسی کو صوفیاء فناء قلب کہتے ہیں اور یہی مدارج ولایت میں پہلا قدم ہے

میں کہتا ہوں کہ دیکھئے صوفیاء بھی فکر اسی چیز کو فرمارہے ہیں جس کی ابتداء اور پہلی منزل ذکر ہی تھی اس سے معلوم ہوا کہ علماء ظاہر اور مشائخ کے طرز بیان اور تعبیر میں کچھ فرق ہو تو ہو باقی حقیقۃً ذکر ہی کی ایک قسم کا نام فکر ہونے پر فریقین کا اتفاق ہے۔ چونکہ یہ درجہ کہ ذاکر لفظ سے معنی کی جانب متوجہ ہو جائے۔ پہلے درجہ سے اعلیٰ اور اتم ہے اس لئے اس کا نام بدل کر بجائے ذکر کے فکر رکھ دیا گیا بلکہ مشائخ کے کلام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی فکر کو ذکر قلبی بھی کہتے ہیں اور اسی کو حضور اور یاد داشت سے بھی تعبیر کرتے ہیں چنانچہ حضرت مولانا گنگوہیؒ اپنے ایک مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:-

"جب مراقبہ خوب قائم ہو جاتا ہے اُس وقت سب ذکر لسانی ہو یا قلبی، جلی ہو یا خفی مثل مراقبہ ایک درجہ مساوی میں آجاتے ہیں اور وہ کیفیت کہ اپنے آپ کو

روبرو مالک معبود کے جانے اور شرم وحیا طاری ہو جائے اس کا نام حضور اور یاد داشت ہے۔ اسی کو لسانِ شرع میں احسان کہتے ہیں اور یہی نسبت معتبرہ ہے کہ مسلسل چلی آرہی جب خوب اس کا ملکہ ہو جائے تو یہی امر ہے کہ قابل اجازت تلقین کے بناتی ہے اور اس کا ہی نام ذکر قلبی ہے اور اس سے پہلے سب مقدمات اس کے ہیں" (مکتوبات رشیدیہ صفحہ ۹۵)

حضرت خواجہ محمد معصوم صاحبؒ کے کلام میں بھی اس کی تصریح ہے کہ اس مقام کا نام فنائے قلب ہے اور طریق میں یہ پہلا قدم ہے — چنانچہ فرماتے ہیں کہ :-

"در احوال مشارٌ الیہ نوشتہ بودند کہ بے تعلقی دل بہم رسیدہ است و خطرۂ ماسوا بدل نمی گذرد ایں حال بسے شریف است و معتبر است بفنائے قلب و قدم اول است در اطوار ولایت۔ (مکتوبات معصومیہ صفحہ ۳۵)

یہ گفتگو تو اس امر میں تھی کہ علماءِ ظاہر جس کو فکر کہتے ہیں مشائخ بھی اسی کو فکر کہتے ہیں۔ چنانچہ جب ذکر کے معنی قلب میں خوب راسخ ہو جاتے ہیں اور ماسوا کی جانب التفات کرنے کی قلب کو فرصت ہی نہیں ملتی تو اس کا نام فکر ہے۔ آگے پھر مشائخ کا کلام نقل کرتا ہوں :-

حاصل یہ کہ جب طالب کو اپنے ادراک و ہمت سے اس مفہوم میں کامل استغراق حاصل ہو جاتا ہے اور وہ تجلّی اس کی جزو جان ہو جاتی ہے یہاں تک کہ سالک کا جو لطیف ترین جزو ہے یعنی روحِ الٰہی یہ تجلّی اس کو اپنا آشیانہ بنا لیتی ہے اور اس کے ساتھ اتصال او امتزاج حاصل کر کے ایسا امتزاج جو مصداق ہوتا ہے من کا کہ ع (در من و من در او چوں بو بہ گلاب اندر) اس کو بھی اپنی اصل کی طرف کھینچنا چاہتی ہے حالانکہ یہ روحِ الٰہی خود بھی عالم پاک ہی کی چیز تھی قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ اس کی شان میں وارد ہے لیکن مشتِ خاک میں محبوس ہونے کے سبب اس نے اپنی اصل کو بھلا دیا اور اس کے ادراک کا آئینہ زنگ آلود ہو گیا مگر جب اس کے نور کی وجہ سے وہ روحِ الٰہی مصقّل اور مصفّا ہو جاتی ہے اور کمالاتِ الٰہی کا عکس اپنے اندر دیکھتی ہے جیسا کہ ان اللہ خلق آدم علیٰ صورتہ میں اسی جانب اشارہ ہے۔ تو اس کو اپنا بھولا ہوا وطن یاد آکر اپنی اصل تک پہونچنے کا تقاضا پیدا ہوتا ہے۔ پس ادھر تو یہ تجلّی اس روح کو جذب کرتی ہے اور ادھر روح اسمیں منجذب ہو جاتی ہے بسبب اس کے کہ وہ منتہی ہوئی ہے اس تیقظ کی طرف جس کو اس نے اس تجلّی کے استقراء سے حاصل کیا تھا جس کی بنا پر اب اس میں تقاضا حظیرۃ القدس کی طرف چڑھنے اور رفیقِ اعلیٰ سے ملنے کا پیدا ہو جاتا ہے لیکن بشریت کا غبار حظیرۃ القدس کے ساتھ لاحق ہونے سے مانع ہوتا ہے تو چار و ناچار روحانی و نفسانی تقاضوں میں باہم کشاکشی واقع ہو جاتی ہے

جس کے سبب ایک شورش اور غلغلہ اور گرمی نسمہ میں جو کہ روح طبی ہے واقع ہوجاتی ہے اور یہ شورش اور گرمی بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ غصہ کے وقت انسان میں گرمی پیدا ہوجاتی ہے یا جیساکہ خوشی کے وقت ایک انبساط اور انشراح انسان کو حاصل ہوجاتا ہے۔

غرضکہ یہی غلغلہ اور شورش جوکہ روح انسانی میں پیدا ہوجاتی ہے وہی طالب کو دیوانہ اور مستانہ بنا دیتی ہے اور اس کے عقل و فکر کے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسکو حدود شرع اور قانونِ ادب سے بھی خارج کر دیتی ہے اور اسی شدت اور حدت کی وجہ سے طالب وحشت کے ساتھ جنگل اور میدانوں میں مارا مارا پھرتا ہے اور مجالس اور مساکن سے اُسے وحشت ہوتی ہے اور بزبان حال کہتا ہے کہ ؎

باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل — اب کہاں لیجا کے بٹھیں ایسے دیوانہ کو ہم

نیز اسی کا یہ بھی اثر ہوتا ہے کہ اس کے چہرہ کا رنگ زردی مائل اور آنکھوں سے ہر وقت آنسو رواں رہتے ہیں، یہی وہ کیفیت ہے جس کا نام عشق ہے۔ چنانچہ جس قدر کہ یہ کیفیت روح حیوانی میں زیادہ ہوگی اسی قدر یہ عشق زیادہ ہوگا اور اس کو حُبِّ نفسانی کے ساتھ موسوم کیا جائیگا اور یہ کیفیت آناً فاناً بڑھتی ہے یہانتک کہ طالب اپنے حجاب بشری کو پارہ پارہ کر دیتا ہے اور اس کا نفسانی غبار پاش پاش ہوجاتا ہے اور بالآخر اس حب (یعنی حب عشقی) کا ثمرہ (فنائے نفس) مرتب ہوجاتا ہے (انتہیٰ دصراط مستقیم ص)

حاصل یہ کہ یہی وہ حب عشقی ہے جس کے حصول کا طریق ذکر و فکر کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی جس کی ابتداء ذکر لسانی سے ہوکر کے درمیانی مدارج ذکر قلبی اور فنا و قلب وغیرہ طے کرتے ہوئے طالب فنائے نفس تک پہونچتا ہے۔ جو کہ اس راہ میں قدم ثانی ہے جیساکہ حضرت خواجہ محمد معصوم صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:۔

ایں کوہ الوند بکلند کلمہ طیبہ از بیخ و بن برکندہ شود و انانیت و معادات کہ بمولائے خود دارد منتفی شود و ایں حالت معبر بفنائے نفس است و قدم ثانی است دریں راہ۔ (مکتوبات معصومیہ ص۲۵۶)	اس کوہ الوند کو (مراد اس سے اپنا نفس ہے) کلمہ طیبہ لاالہ الااللہ کے تیشہ سے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جا سکتا ہے اور اسی کے ذریعہ انسان کی انانیت اور معادات جس کو وہ اپنے مولائے حقیقی کے ساتھ رکھتا ہے نیست و نابود ہوجاتی ہے۔ اور اس حالت کو فنائے نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہی اس طریق کا دوسرا قدم ہے۔

دیکھئے حضرت خواجہ صاحبؒ کے اس ارشاد میں تصریح ہے کہ یہی کلمہ طیبہ (لاالہ الااللہ) وہ کلمہ ہے کہ نفس کے کوہ الوند کو اس کے تیشہ سے پاش پاش کر کے اس کو بیخ و بن سے اکھاڑا جا سکتا ہے اسی معنیٰ

گو کسی عارف نے یوں کہا ہے کہ ؎

تا بجاروب لا نروبی راہ ٭ نرسی در سرائے الا اللہ

(ترجمہ) جب تک کہ لا کی جھاڑو سے راستہ صاف نہ کروگے الا اللہ کی سرائے میں جگہ نہ پاسکوگے۔

اور یہ جو فرمایا کہ اسی حالت کا نام فناءِ نفس ہے اور یہ طریق کا دوسرا قدم ہے تو اس کے متعلق بھی سنئے سالک کے لئے یہ فنا ضروری ہے ورنہ بدون اس کے بارگاہ کبریا تک رسائی ناممکن ہے۔ حضرت معروفی نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہیچکس را تا نہ گردد او فنا ٭ نیست رہ در بارگاہ کبریا

(ترجمہ) کوئی بھی ہو جب تک کہ وہ اپنے آپ کو فنا نہ کردیگا حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی رسائی نہیں ہوگی۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

بے فنائے خویش و بے جذب قوی ٭ کے حریم وصل را محرم شوی

یعنی بدون اپنے کو فنا کئے ہوئے اور بدون اُدھر سے جذب قوی کے آئے ہوئے تم حریم وصل کے محرم (یعنی واصل بمحبوب حقیقی) کب ہو سکتے ہو؟

یہانتک تو کلام اس پر تھا کہ ذکر قلبی کی حقیقت کیا ہے؟ وہ کیونکر حاصل ہوتا ہے؟ اور اس پر ثمرہ کیا مرتب ہوتا ہے؟ چنانچہ ماقبل کی تفصیل سے اس کی حقیقت معلوم ہو گئی، نیز اس کے تحصیل کا طریقہ بھی معلوم ہو گیا کہ سبب عادی اس کا ذکر لسانی ہے اور آخر میں ثمرہ بھی اس کا بیان کیا گیا کہ فناءِ نفس ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب انسان کا نفس فنا ہو جاتا ہے تو اس کے سارے اخلاق رذیلہ بھی زائل ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ سب رذائل خودی اور دعوئ ہستی سے پیدا ہوتے ہیں اور نفس کے فنا ہونے سے دعوئ ہستی اور خودی وغیرہ سب چیزیں ہی فنا ہو جاتی ہیں۔

پس اب اس مقام پر یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ جس طرح سے اخلاق رذیلہ کا ازالہ ذکر و شغل سے ہوتا ہے اس طور پر کہ اس سے حق تعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا ہوتی ہے اور اس کے غلبہ کی وجہ سے ہستی اور خودی مضمحل ہو جاتی ہے اور پھر سب اخلاق ذمیمہ جو اسی خودی اور دعوئ ہستی سے پیدا ہوتے ہیں زائل ہو جاتے ہیں اور اس علاج کا نام علاج کلی اور طریق جذب ہے۔ اسی طرح سے رذائل کے دور کرنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے اور وہ علاج جزوی کہلاتا ہے اور اس کو طریق سلوک کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہر ہر خلق کا جدا جدا علاج کیا جائے تو کوئی شخص بالخصوص اس زمانہ میں کسی ایک طریقہ کو لیکر دوسرے سے مستغنی نہیں ہو سکتا بلکہ ہر ایک پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کے لئے ذکر و شغل بھی کرے

اور رذائل کے ازالہ کے لئے معالجۂ اخلاق بھی کرے۔

میرے نزدیک تو اس زمانہ میں اصلاح اسی طریق میں منحصر ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے ایک طالب کا خط اور اس کا جواب نقل کرتا ہوں، ناظرین کی بصیرت کے لئے انشاء اللہ کافی وافی ہوگا۔

(نقل خط مع جواب)

حال (۱) حضرت اقدس (مولینا تھانوی) قدس سرہٗ نے التکشف حصہ سوم ص۲ پر تحریر فرمایا ہے کہ "اخلاق ذمیمہ کے دو علاج ہیں، ایک جزئی یعنی خاص (الیٰ قولہ) دوسرا کلی یعنی عام وہ یہ کہ ذکر و شغل سے یا جس طرح شیخ کامل تجویز کرے حق سبحانہٗ تعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا کیجائے، جب اس کا غلبہ ہوگا اپنی ہستی و خودی مضمحل ہونا شروع ہوگی اور سب اخلاق ذمیمہ جو اسی خودی اور دعویٰ ہستی سے پیدا ہوتے ہیں، سب زائل ہو جائیں گے۔" الخ

(۲) اور الافاضات الیومیہ ص۳۲ ج، میں ہے کہ ــــــ "ایسی ہی ایک دوسری غلطی ہے کہ ذکر اصلاح کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے (الیٰ قولہ) یہ بالکل کھلی بات ہے کہ محض ذکر سے اصلاح تو کیا ہوتی بعضوں کا نفس اور بگڑ جاتا ہے۔" الخ

حضرت والا! کیا ان دونوں ارشادات میں تعارض ہے؟ یا مطابقت ہو سکتی ہے؟ اگر ہو سکتی ہے تو کس طرح سے؟ معلوم کرنے کا اشتیاق ہے۔

تحقیق۔ حضرت کی رائے پہلی وہی ہوگی (جو التکشف میں ہے) بعد میں بدلی ہے۔

حال۔ نیز اخلاق ذمیمہ کا علاج کلی کیا دور حاضر میں ہو سکتا ہے؟

تحقیق۔ جب اصلاح کی تکلیف اس دور میں بھی ہے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اصلاح نہیں ہو سکتی۔

حال۔ میں تو اجمالی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ طبیعتوں میں آزادی اس قدر آ گئی ہے کہ اس قسم کے علاج سے لوگ اصلاح پذیر نہیں ہو سکیں گے۔

تحقیق۔ بیشک ایسا ہی ہے۔

حال۔ ہاں سلیم الطبع مخلص جس کی فطرت ہی میں خلوص پہلے سے ہو شاید ہی کوئی ایسا ہو اس کے لئے مفید ہو تو ہو۔

تحقیق۔ صحیح ہے۔

حال۔ بہرحال حضرت اقدس (حکیم الامۃ) قدس سرہٗ کے کلام میں اس کو دیکھکر کچھ خلجان سا پیدا ہوا کہ صراط مستقیم کی عبارت یعنی موجودہ زمانہ کے سالکین کو باوجود سلوک منضبط کے تمام کر دینے فائدہ نہ ہونے کا سبب جو بیان فرمایا ہے (اس میں) نیز حضرت اقدس قدس سرہٗ کے اس کے سوا دوسری کتابوں کے ارشادات نیز حضرت والا (مدظلہ العالی) کے خصوصی طرز تربیت و اصلاح میں اور التکشف کی مذکورہ بالا عبارت میں مطابقت ہو سکتی ہے؟

تحقیق۔ میں نے لکھدیا (یعنی حضرت مولینا تھانویؒ کی پہلی رائے وہی ہوگی بعد میں بدلی۔)

حال۔ الحمدللہ حضرت اقدس (حکیم الامۃ) قدس سرہٗ اور حضرت والا (مدظلہ) کے طرز تربیت و اصلاح سے پوری طرح اطمینان و تسلی ہے۔

تحقیق۔ الحمدللہ۔

حال۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس خصوصی طرز کے سوا دوسرے کسی اور طریقہ سے اخلاق کی اصلاح اس زمانہ میں عبث اور عمر عزیز کو ضائع کرنا ہے، واقعات اور تجربے اس پر شاہد ہیں۔

تحقیق۔ الحمدللہ۔

حال۔ حضرت اقدس قدس سرہٗ نے الافاضات الیومیہ صـ۲۶۶ ج، پر جو ارشاد فرمایا ہے کہ "میں نے بڑے بڑے مشائخ کے خاص خاص مریدوں سے (جنھوں نے یہاں آکر تعلیم کا سلسلہ جاری کرنا چاہا) پوچھا کر تم کو شیخ نے کیا بتلایا تھا، جہاں جہاں اور جس جس سے تحقیق کیا بس اوراد و وظائف ہی کی تعلیم معلوم ہوئی اصلاح کا پتہ نہیں . . . .

. . . حضرت! میں نے علماء کو دیکھا ہے کہ بعضے ان میں مشائخ کی طرف سے صاحب اجازت بھی ہیں مگر غلطیوں میں مبتلا ہیں" —— بعینہٖ اس کا مشاہدہ اب ہو رہا ہے کہ اور مشائخ کے بعض اجازت یافتہ کا حال یہ ہے کہ کیفیات نفسانیہ کو طریق اور مقصود سمجھے ہوئے ہیں باقی اخلاق کی اصلاح وغیرہ کا قصہ بالکل صاف ہے، اس سے بحث ہی نہیں ہے" التکشف میں جو طریقہ ہے اس کے متعلق محض بصیرت کے لئے حضرت والا کی زبان مبارک سے کچھ معلوم کرنے کا اشتیاق ہے دوسروں سے الجھنے کے لئے نہیں بلکہ محض اپنے لئے اور اپنے احباب خاص کے لئے۔

تحقیق۔ بالکل صحیح آپ کی رائے ہے۔

(اس خط کو حضرت والا نے مجلس میں سنایا اور اس کے بعد اس مسئلہ پر ایک تقریر فرمائی جسے ضبط کر لیا گیا اور حضرت والا کی تصحیح و تصویب کے بعد مولوی صاحب موصوف کو بھی بھیجی گئی چونکہ وہ

بھی تمہ جواب ہے (اس لئے یہاں بھی نقل کیجاتی ہے ناقل عفی عنہ) وھو ہذا۔

ارشاد — ماشاء اللہ آپ نے نہایت ہی عمدہ اور بہت ہی ضروری سوال کیا کیونکہ اس زمانہ میں یہ مسئلہ بہت سے لوگوں کے لئے غلط فہمی کا سبب بنا ہوا ہے حضرت والا دامت برکاتہم نے اس کا ایک جواب تو تحریر ہی فرما دیا ہے یعنی یہ کہ محض ذکر و شغل سے حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہو کر خودی اور دعویٰ کا خاتمہ ہو جانا اور پھر انسان کی اصلاح ہو جانا یہ حضرت مولینا تھانویؒ کی پہلی رائے تھی ۔ لیکن بعد میں حضرتؒ کی رائے بدلی اور یہ ہو گئی کہ محض ذکر سے اصلاح تو کیا ہوتی بعضوں کا نفس اور بگڑ جاتا ہے جیسا کہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ التکشف تو بہت پہلے کی تصنیف ہے اور الافاضات الیومیہ جلد سات میں بعد کا اور آخری قول درج ہے ۔ اور قول آخر اول کے لئے ناسخ ہوتا ہے ۔ نہایت واضح یہ جواب ہے ۔

لیکن علاوہ اس جواب کے حضرت والا نے اس مسئلہ کی مزید وضاحت زبانی بھی فرمائی حسب استعداد اس کو ضبط کر کے آپ کو لکھ رہا ہوں ۔ نہایت ہی محققانہ کلام ہے ، اگر یہ بات سمجھ میں آجائے تو اس مسئلہ کی جانب سے انسان ایک بصیرت میں ہو جائے ، اور یہ مسئلہ اس قابل ہے کہ اس کی اشاعت کیجائے ۔

آگے حضرت والا کا ارشاد نقل کرتا ہوں :-

فرمایا کہ — ذکر و شغل سے حصول محبت اور پھر اس سے اصلاح کا ہونا نہ صرف حضرت کے التکشف ہی سے معلوم ہوتا ہے بلکہ قدماء مشائخ میں سے بہت سے حضرات نے اسے لکھا ہے اور یہی مشائخ متقدمین کا معمول بھی رہا ہے ۔ اور یہ بات بالکل صحیح ہے ، لوگوں نے ذکر و شغل کیا ہے جس کی وجہ سے خودی اور دعویٰ کا بالکلیہ خاتمہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی محبت اور صحیح تعلق لوگوں کو حاصل ہوا ہے لیکن یہ اس وقت تھا جبکہ طبائع میں بالعموم سلامتی اور قلوب میں اخلاص تھا ، لوگ مشائخ سے تعلق کرنے سے پہلے رذائل اور معاصی کو ترک کر کے آتے تھے یا کم از کم ان کے ترک کرنے کی ہمت کر کے طریق میں قدم رکھتے تھے ۔

پس جب ایسا خلوص تھا تو اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی ان کے لئے وصول کا ذریعہ بن جاتا تھا ، اور اب چونکہ طبائع ویسے نہیں رہے اور حضرت نے اپنی بصیرت اور تجربہ سے جب لوگوں کا یہ حال دیکھا کہ ذکر و شغل کرنے کے بعد کچھ کیفیت اور احوال تو لوگوں کو حاصل ہو جاتے ہیں ، لیکن نفس ان کا جہاں تھا وہیں رہتا ہے اور قلبی رذائل باقی رہتے ہیں حتیٰ کہ بعضوں کو مشائخ کی جانب سے اجازت بھی ہو جاتی ہے مگر نفس رذائل تک سے پاک نہیں ہوتا ۔ تو چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو منصب تجدید بھی عطا فرمایا تھا اور حضرت محقق عالم ربانی بھی تھے اس لئے حضرت نے فرمایا کہ اب اس زمانہ میں محض ذکر وصول کے لئے کافی نہیں

کیونکہ نہ تو نفوس میں سلامتی باقی رہی اور نہ اس زمانہ میں کوئی شخص متقدمین کا سا ذکر ہی کر سکتا ہے اور نہ اس مقام تک پہونچ ہی سکتا ہے جہاں پہونچکر دعویٰ وغیرہ ختم ہوجاتا ہے اور خودی و ہستی کا اضمحلال ہوجاتا ہے۔ اور اِدھر نفوس میں رذائل بیشمار موجود ہیں، تو اگر اس کا انتظار کیا جائے کہ ذکر سے محبت پیدا ہو اور محبت سے دعویٰ اور خودی فنا ہوجائے جس کے بعد رذائل کی اصلاح ہوجائے تو یہ تو "تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود" کا مصداق ہوگا، کیونکہ جب تک یہ درجہ حاصل ہو رذائل نفس جو کہ غالب ہیں، انسان کو کہاں سے کہاں پہونچادیں گے بلکہ اور ترقی کرکے کہا جاسکتا ہے کہ قلب میں رذائل موجود ہونے کی وجہ سے ذکر کی برکت ہی نہ حاصل ہوگی، اور ان رذائل کی نحوست سے تھوڑا بہت حال جو حاصل بھی ہوا ہوگا وہ بھی ضائع ہوجائے گا اور اس مقام تک پہونچے گا ہی نہیں جہاں پہونچکر خودی کا خاتمہ ہوجاتا ہے کیونکہ اس زمانے میں زبان سے تو یہ کہدینا آسان ہے کہ ہم میں دعویٰ اور خودی نہیں ہے لیکن عملی طور پر اس پر پورا اترنا بہت مشکل ہے، کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

تا در تو زِ پندار ہستی باقی ست — می داں بیقیں کہ بت پرستی باقی ست
گفتی بتِ پندار شکستم رستم — آں بت کہ زِ پندار شکستی باقی ست

"یعنی تیرے اندر جبکہ اپنی ہستی کا کچھ بھی پندار باقی ہے تو یقیناً یہ سمجھ لے کہ تیرے اندر بت پرستی موجود ہے۔ اگر تو یہ کہے کہ میں نے اپنے پندار کے بت کو توڑدیا اور اس سے خلاصی پاگیا تو یہ سمجھ لے کہ جس بت کو تو نے پندار کے ساتھ توڑا وہ باقی ہے یعنی پندار تو اب بھی باقی ہے اس سے تو کہاں نکلا" (از ناقل)

لہٰذا جب نفس میں یہ سب خباثتیں اور رذائل موجود ہیں جن کے دور کرنے کا انسان مکلّف ہے تو اب ان کے ہوتے ہوئے کوئی عالم دین یہ کیسے کہہ سکتا ہے اور اس کو یہ کہنا جائز بھی کب ہے؟ کہ بس تم ذکر و شغل کئے جاؤ یہ رذائل خود بخود دور ہوجائیں گے، بلکہ ایک عالم دین کا تو یہ فرض ہوگا کہ وہ لوگوں کو متوجہ کرے کہ یہ رذائل جو تمہارے اندر موجود ہیں ان کو بالقصد والارادہ دور کرو اور ایک منٹ کے لئے بھی ان کی جانب سے غافل نہ ہو بلکہ ان کے ازالہ کو بھی شرعاً مقصود سمجھو۔

اسی کے پیش نظر حضرت حکیم الامت مولینا تھانویؒ کے دوسرے ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ ذکر و شغل تنہا اصلاح کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ اب اس زمانہ میں سالکین کو چاہئے کہ وہ ذکر و شغل بھی کریں اور اس کے ساتھ ساتھ معالجۂ اخلاق بھی کریں یعنی نفس کی اصلاح کریں، ذکر کا وہ درجہ جو رذائل کو اکھاڑ پھینکے اس درجہ تک نہ لوگ آسانی سے پہونچ سکتے ہیں اور نہ کسی کی اتنی ہمت اور اتنا شوق کہ وہ اتنا مجاہدہ کرے ادھر اخلاق بد (یعنی رذائل نفس) کی جانب سے ہمیشہ یہ کھٹکا کہ نہ معلوم کس مقام

پر سے قعر ہیں گرا دیں، اس لئے نہ تنہا اس پر اکتفا کرے اور نہ تنہا ذکر ہی پر بلکہ دونوں کو بیک وقت ساتھ ساتھ لیکر چلے، اس زمانہ میں اصلاح اسی طریقہ میں منحصر ہے۔

پس حضرتؒ کی آخری رائے کا یہ مطلب نہیں کہ ذکر و اشغال مطلقاً ذریعہ وصول ہی نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے طبائع کے بگاڑ نے، اور رذائل کی زیادتی نے اس زمانہ میں تنہا ذکر کو غیر نافع، بلکہ بعض صورتوں میں تو مُضر اور مہلک بنا دیا ہے جس پر تجربہ شاہد ہے، ورنہ تو فی نفسہ ذکر اگر اپنے جملہ شرائط اور حدود کے ساتھ پایا جائے تو آج بھی اسمیں وصول الی اللہ کی صلاحیت موجود ہے۔ مگر کرنے والے کہاں؟ اور اس کے درجہ کے مطابق صدق و خلوص اور مجاہدہ اس زمانہ میں کتنے لوگوں میں پایا جاتا ہے؟ اور پھر محض ذکر و شغل کرنے کی وجہ سے رذائل کی تو اصلاح معاف نہ ہو جائیگی بلکہ جب رذائل کسی کے نفس میں موجود ہیں تو یہی کہا جائیگا کہ اس کی اصلاح ضروری اور واجب ہے۔ انتہٰی

حاصل اس کا یہ ہوا کہ حضرتؒ کے دونوں اقوال میں کوئی تعارض نہیں ہے بلکہ وصول الی اللہ کے لئے قدما مشائخ کے یہاں جو طریق رائج تھا وہ عشق و محبت ہی کا طریق تھا۔ چنانچہ حضرتؒ بھی ایک مدت تک اسی طریق پر رہے، اور وہ حضرات اس عشق کو اپنے اوپر اس درجہ مسلط کر لیتے تھے کہ پھر اس سے ان کے رذائل کی بھی اصلاح ہو جاتی تھی اور ان کو اس کے لئے الگ سے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا (اس طریق کے متعلق میں آئندہ کچھ کلام کروں گا)

لیکن حضرتؒ نے بعد میں جب یہ دیکھا، اور لوگوں کے حالات سے اس کا تجربہ اور مشاہدہ ہو گیا کہ اب لوگوں میں اس درجہ کا عشق و محبت پیدا کرنے کا حوصلہ اور اس کی ہمت ہی نہیں جو کہ ان حضرات کے نزدیک معتبر تھا یعنی عشق و محبت کامل جس سے رذائل فنا ہو جائیں اور وصول ہو جائے، دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ وہ عشق جو قلب سے متجاوز ہو کر نفس میں پیدا ہو جائے، اب اس سے لوگ بھاگتے ہیں اور ذکر وغیرہ کر کے صرف عشق و محبت سے کچھ قلب کو متاثر کر لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صوفی بھی ہو جاتے ہیں مگر نفس کے رذائل باقی رہتے ہیں۔ تو حضرتؒ کے منصب تجدید کا تقاضا تھا کہ حضرتؒ اس کی اصلاح فرمائیں چنانچہ اسی سلسلہ کا ایک کارنامہ یہ ہوا کہ فرمایا کہ جس طرح سے لوگ ذکر کی جانب بالذات توجہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے اُن میں گو کچھ حالات اور کیفیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں مگر عشق و محبت کے ناتمام ہونے کی وجہ سے نفس نہیں مرتا اور اگر اس کے اور عیوب سے نجات بھی ہو جاتی ہے تو کم از کم خودی اور دعویٰ تو باقی ہی رہتا ہے۔ اسی طرح سے اب اس زمانہ میں ضرورت ہے کہ لوگ ذکر کے ساتھ ساتھ (اس کو ترک کر کے نہیں) نفس کی بھی اصلاح کریں، اور نفس مریگا تو عشق کامل اور محبت ہی سے، تاہم

جب تک یہ مقام حاصل ہو اس وقت تک نفس کی اصلاح معاف تو نہ رہے گی، بلکہ آدمی رذائل کے دور کرنے کا شرعاً مکلف رہیگا، لہٰذا اس کی جانب بھی بالقصد ویسی ہی توجہ کرنا چاہئے جیسی کہ اب تک ذکر کی جانب کرتا رہا ہے اور یہ مانا کہ اس وقت محنت و مشقت بڑھ جائیگی اور کام دوگنا ہو جائے گا مگر کیا کیا جائے جو کام ضروری ہے اسے تو کرنا ہی ہوگا ہاں جب عشق کامل ہو جائے گا اور اس کی وجہ سے نفس کے رذائل سب سوخت ہو جائیں گے اس وقت اصلاح کی مشقت سے بھی یہ چھوٹ جائے گا اور اب یہ کہا جائیگا کہ تنہا یہی عشق و محبت کافی ہے کیونکہ محبت ناقص کے ساتھ تو رذائل باقی رہ سکتے ہیں لیکن جب عشق کامل ہو جاتا ہے تو ان سب کا بالکلیہ خاتمہ ہو جاتا ہے، اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد   او ز حرص و عیب کلی پاک شد

اب یہ سنئے کہ حضرت مولانا نے جو بات فرمائی ہے اس میں حضرت متفرد نہیں بلکہ اپنے اپنے وقت میں مشائخ اور محققین سب کہتے چلے آئے ہیں۔ رسالہ قشیریہ میں ہے :-

ولیس من آداب المریدین کثرۃ الاوراد بالظاھر فان القوم فی مکابدۃ اخراج خواطرھم ومعالجۃ اخلاقھم ونفی الغفلۃ عن قلوبھم لا فی تکثیر اعمال البر الخ

(رسالہ قشیریہ صفحہ)

مریدین کے آداب میں سے ظاہری وظیفے اور وظائف کی کثرت نہیں ہے اس لئے کہ قوم (صوفیہ) تو در پے اس کے ہے کہ اپنے قلوب کے وساوس ردیہ کو نکالے اور اپنے اخلاق رذیلہ کا علاج کرے اور قلب سے غفلت دور کر کے اس میں ذکر پیدا کرے نہ یہ کہ اعمال بر یعنی نوافل وغیرہ کی کثرت کرے۔

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ رذائل کا معالجہ بھی منجملہ مریدین کے وظائف کے ہے اور قلب میں غفلت کی جگہ ذکر پیدا کرنا یہ بھی ضروری ہے اور وساوس سے اس کو خالی کرنا بھی لازم ہے۔ تو امام یہ کیوں فرماتے ہیں؟ ضرور قوم سے اس باب میں کچھ تساہلی دیکھی ہوگی اسی لئے تو یہ فرمایا۔

بس اسی طرح حضرت نے بھی جب یہ دیکھا کہ وظیفے وظائف تو بہت ہیں اور قلب کی لوگوں کو تو کچھ فکر بھی ہے لیکن نفس کی جانب اصلاً التفات نہیں اس لئے شد و مد کے ساتھ یہ فرمایا اور ہر زمانہ کے مصلح کا یہ کام ہی ہے کہ جس باب میں لوگوں میں تساہلی دیکھے تو اس کا نہایت ہی شد و مد کے ساتھ بیان کرے۔

بہر حال امام قشیریؒ تو اپنے وقت کے امام ہیں وہ بھی وہی فرما رہے ہیں جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس باب میں دونوں اماموں کی ایک رائے ہے۔

صاحب رسالہ قشیریہ کے کلام میں نفی غفلت کا جو ذکر ہے تو اس کی ضرورت کو قرآن و حدیث سے بیان کرتا ہوں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ، مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ	ان منکر لوگوں سے ان کا وقت حساب نزدیک آپہونچا اور یہ ابھی غفلت ہی میں پڑے ہیں اور اس سے اعراض کئے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے جو نصیحت تازہ آتی ہے تو یہ اس کو ایسے طور سے سنتے ہیں کہ ہنسی کرتے ہیں ۔ ان کے دل متوجہ نہیں ہوتے یعنی اس سے غافل ہوتے ہیں ۔

اس میں بیان ہے کہ لوگوں میں غفلت بھی ہوتی ہے اور "لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ" سے معلوم ہوا کہ وہ غفلت قلب میں ہوتی ہے کیونکہ لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ یہ غفلت ہی کی دوسری تعبیر ہے ۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ۔ "وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا "اطاعت کیجئے اس کی جس کے قلب کو ہم نے غافل بنادیا ہے"۔ اس میں تو تصریح ہی فرمادی کہ غفلت قلبی چیز ہے اور اس کا محل قلب ہوتا ہے ، حدیث شریف میں ہے :-
اِنَّ اللهَ لَا يَسْتَجِيبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاهٍ "یعنی اللہ تعالیٰ غافل دل سے کی ہوئی دعا نہیں قبول فرماتے" نیز ایک روایت میں شیطان کے متعلق آتا ہے کہ جب وہ انسان کے قلب کو غافل پاتا ہے تو وسوسہ ڈالتا ہے ۔

مَا مِنْ مَوْلُودٍ اِلَّا عَلَىٰ قَلْبِهِ الْوَسْوَاسُ فَاِذَا عَمِلَ فَذَكَرَ اللهَ خَنَسَ وَاِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ (فتح الباری ص۳۲۵ ج۸)	کوئی بچہ نہیں پیدا ہوتا مگر یہ کہ اس کے قلب پر وسواس ہوتا ہے جب وہ عمل کرتا ہے یعنی ذکراللہ کرتا ہے تو وہ چھپ جاتا ہے اور جب وہ غافل ہوجاتا ہے تو وسوسہ ڈالتا ہے ۔

ان سب نصوص سے معلوم ہوا کہ غفلت ایک مذموم شئی ہے اور اس کا تعلق انسان کے قلب سے ہوتا ہے بس اسی غفلت کو قلب سے دور کرنے کو یہ حضرات فرماتے ہیں اور چونکہ یہ غفلت ذکر کی ضد ہے تو اس کے دور کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ قلب کو ذاکر بنایا جائے ، جب قلب میں ذکر پیدا ہوجائے گا اسی وقت یہ غفلت زائل ہوگی کیونکہ ایک قلب دو متضاد صفات کا محل نہیں بن سکتا ، اور یہی ذکر جب قلب میں اتر جاتا ہے تو اس کا ہی نام فکر ہے ۔ فکر اور ذکر قلبی ایک چیز ہے ۔ جیسا کہ اس پر کلام کرچکے ہیں ۔
بہرحال یہ غفلت قلبی جسے زائل کرنے کو محققین نے ہر زمانہ میں فرمایا ہے مشکل چیز ہے لیکن دوسری چیز یعنی معالجۂ اخلاق بھی ضروری ہے اور اس سے زیادہ مشکل ہے ۔ اور اس کا درجہ بھی اس سے مقدم ہے ۔ آج یہی نہیں سمجھا جاتا اور کام طریقہ اور ترتیب سے نہیں کیا جاتا اسی لئے کامیابی نہیں ہوتی ورنہ تو لوگ آج

جس قدر محنت کرتے ہیں اگر اصول سے کام کریں تو اس سے کم میں کامیاب ہو جائیں۔

یہی صاحب رسالہ قشیریہ کتاب کے آخر میں باب الوصیۃ للمریدین میں فرماتے ہیں۔

فاول قدم للمرید فی ھٰذہ الطریقۃ ینبغی ان یکون علی الصدق لیصح لہٗ البناء علیٰ اصل صحیح فان الشیوخ قالوا انما حرموا الوصول لتضییعھم الاصول (رسالہ قشیریہ صـ ۱۹۷)	اس طریق میں مرید کا پہلا قدم صدق پر ہونا چاہئے تاکہ اس کو ایک اصل صحیح پر بنا قائم کرنا ممکن ہو سکے کیونکہ مشائخ نے فرمایا ہے کہ لوگ وصول (الی اللہ) سے اسلئے محروم ہیں کہ انھوں نے اصول طریق) کو ضائع کر دیا ہے یعنی اس کو استعمال نہیں کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصول میں علماء نے سب سے پہلے صدق و خلوص کو فرمایا ہے، حضرت فریدالدین عطارؒ فرماتے ہیں کہ ؎

در ارادت باش صادق اے فرید تا بیابی گنج عرفاں را کلید

(یعنی اے فرید ارادت اور عقیدت میں سچے ہو تاکہ گنج عرفان کی کنجی پا سکو ۱۲ منہ)

اور یہ جو فرمایا "تاکہ اصل صحیح پر بنا ہو سکے" تو یہ اس لئے کہ اگر بنیاد ہی غلط ہو گی تو ساری دیوار ہی خراب رہے گی۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:۔

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا میرود دیوار کج

(جب پہلی ہی اینٹ معمار غلط رکھے گا تو آخر تک دیوار ٹیڑھی ہی جائے گی ۱۲ منہ)

پھر صدق کے بعد اصلاح نفس اور معالجۂ اخلاق ہے پھر اس کے بعد ذکر کا درجہ ہے اور ذکر میں بھی پہلے لسانی ہے پھر قلبی پھر اس کے بعد قلب مع اللہ ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہم نے امام غزالی کے بیان سے زیادہ مرتب اور واضح بیان نہیں دیکھا اس لئے احیاء العلوم سے اس کو اختصار کے ساتھ نقل کرتے ہیں، ربع المھلکات بیان شروط الارادت و مقدمات المجاہدہ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ:۔

اما شروط التی لابد من تقدیمھا فی الارادۃ فھی رفع السد والحجاب الذی بینہ وبین الحق	بہرحال وہ شرطیں کہ ارادت ہیں جن کی تقدیم ضروری ہے منجملہ ان کے یہ ہے کہ اپنے اور خالق کے درمیان جو آڑ اور حجاب ہے اس کو دور کرے۔

پھر اس کے بعد اخلاق رذیلہ کا حجاب اور سد ہونا بیان فرما کر اور اس کے ترک کا طریقہ بیان کر کے لکھتے ہیں کہ:۔

فاذا انمحى ذلك او ضعف بالمجاهدة ولم يبق فى قلبه علاقة تشغله بعد ذلك يلزم قلبه على الدوام ويمنعه من تكثير الاوراد الظاهرة بل يقتصر على الفرائض والرواتب ويكون ورده وردًا واحدًا اعنى ملازمة القلب لذكر الله تعالىٰ.

وهذا التجرد لا يحصل الا مع صدق الارادة واستيلاء حب الله تعالىٰ على القلب حتى يكون فى صورة العاشق المستهتر الذى ليس له الا هم واحد: اذا كان كذلك الزمه الشيخ زاوية وعند ذلك يلقنه ذكرًا من الاذكار حتى يشتغل به لسانه وقلبه فيجلس ويقول مثلًا الله الله او سبحان الله سبحان الله فلا يزال يواظب عليه حتى تسقط حركة اللسان وتكون الكلمة كانها جارية على اللسان من غير تحريك ثم لا يزال كذلك حتى يمحى عن القلب حروف اللفظ و صورته وتبقى حقيقة معناه لازمة للقلب حاضرة معه غالبة عليها قد فرغ من كل ما سواه...

پس جب نفس کے رذائل ختم ہوجائیں اس مجاہدہ کی وجہ سے یا ضعیف ہوجائیں اور اب اس کے قلب میں کوئی مشغول کرنے والا علاقہ نہ رہا تو اس کے بعد علی الدوام اپنے قلب کو لازم پکڑے اور اسکو کثرت وظائف ظاہری سے روکے بس صرف فرائض و واجبات اور سنن موکدہ پر مقصور رکھے۔

اور اس کا وظیفہ بس ایک ہی وظیفہ ہو یعنی قلب سے اللہ تعالےٰ کا ذکر کیا جائے۔

لیکن یہ خلاصی بدون صدق ارادہ کے حاصل نہ ہوگی۔ نیز بغیر اللہ تعالیٰ کی محبت کے قلب پر اس طرح تسلط کیئے کہ دیکھنے میں یہ شخص ایک ایسا حیران و سرگرداں عاشق معلوم ہوتا ہے جس کا بجز ایک مقصد کے دوسرا کوئی مقصد نہ ہو جب ایسا ہو جائے تب اس کے لئے شیخ کوئی نہ کوئی گوشہ تجویز کر دے اور اذکار میں سے کسی ذکر کی تلقین فرمادے بس کے ساتھ اس کی زبان اور قلب مشغول رہے، پس بیٹھ کر زبان سے یوں کہے مثلاً اللہ اللہ یا سبحان اللہ سبحان اللہ اور اس پر مداومت برتے یہاں تک کہ زبان کی حرکت ساقط ہوجائے۔ اور ذکر کا کلمہ اب اس کی زبان پر بدون تحریک لسان کے جاری رہے پھر ایسا ہی کرتا رہے یہاں تک کہ قلب سے بھی لفظ کے حروف اور اس کی صورت مٹ جائے اور اس کے معنیٰ کی حقیقت باقی رہے اس طرح سے کہ وہ قلب کو لازم ہوجائے اور اس کے ساتھ حاضر رہے اس پر غالب رہے اور یہ شخص ماسوا سے فارغ ہوجائے۔

... فاذا حصل قلبه مع الله تعالے انکشف له جلال الحضرة الربوبية وتجلى له الحق وظهر له لطائف الله تعالے ما لا يجوز ان يوصف بل لا يحيط به الوصف اصلاً	پھر جب اس طرح سے قلب اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو جائے گا تو اس کے لئے حق تعالیٰ کا جلال اور اس کی تجلی منکشف ہوگی اور لطائف ربانی میں سے ایسی ایسی چیزیں اس کے لئے ظاہر ہونگی کہ جن کا بیان نہ تو سالک کے لئے جائز ہے اور نہ اس کے احاطۂ توصیف کی میں آسکتی ہیں۔

(احیاء العلوم ص۲۲ ج۳)

دیکھئے امام نے سالک کے کام کو کس قدر ترتیب وار بیان فرمایا یعنی سب سے پہلے وہ ذاکر کے سد اور حجاب کو دور کرے اور نفس کو مجاہدہ کے ذریعہ ختم کرے یا ضعیف کرے اس کے بعد ملازم ذکر رہے اور اس ملازمت قلبی کو اپنا واحد وظیفہ جانے۔ جب اتنا کر لے تب شیخ اس کو کوئی ورد تلقین فرما دے جسے پہلے تو وہ زبان سے کہے اور پھر قلب میں اتار دے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اس قدر کثرت سے ذکر کرے کہ زبان کی حرکت ساقط ہو جائے اور کلمۂ ذکر بدون تحریک لسان ہی کے گویا زبان پر جاری ہو جائے۔ پھر اسی طرح کرتا رہے یہاں تک کہ الفاظ کے حروف اور اسکی صورت قلب سے بھی محو ہو جائے اور صرف اس کے معنی کی حقیقت باقی رہ جائیں اسی کا نام ذکر قلبی ہے اور یہی درجہ مطلوب ہے۔ اس مرتبہ پر پہونچکر قلب من اللہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے قلب سالک پر حق تعالیٰ کی جو تجلی اور الطاف ہوتے ہیں اس کو وہی جانتا ہے۔ وہ احاطۂ وصف سے بالاتر ہے۔

نیز امام نے اس سلسلہ میں مجاہدہ، ملازمت قلب لذکر اللہ اور مواظبت علی الذکر وغیرہ جو فرمایا تو سمجھنا چاہئے کہ ان امور کو ہر زمانہ میں مشائخ نے بیان کیا ہے اور ان پر زور دیا ہے چنانچہ مجاہدہ کے متعلق شیخ اکبر ابن عربیؒ کیا فرماتے ہیں سنئے:۔

۱۔ اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ۔

ومن شرطه ان يحاسب المريد على انفاسه وحركاته ويضيق على تدقه صدقة فى اتباعه فانه طريق الشدة ليس للرخاء فيه مدخل لان الرخص انما هى للعوام لانهم قنعوا بكونهم	اور شیخ کے شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ مرید کے ہر سانس اور حرکت کا محاسبہ کرے اور جتنا زیادہ اسکو اطاعت و تبعیت میں اس پر معاملہ میں تنگی کرے کیونکہ یہ راستہ ہی شدت کا ہے کہ اس میں نرمی کو دخل نہیں اس لئے کہ رخصتیں تو عوام کے لئے ہیں اس لئے کہ وہ تو صرف اس پر قناعت کرتے ہیں کہ اللہ

ينطق عليهم اسم الايمان خلصة مؤدين لما فرض الله عليهم ومن طلب الا نفس والزيادة على مرتبة العوام فلابد ان يذوق الشدائد في نيل ذٰلك فانه من اراد ان يرى الدر في بحره فلابد ان يقاسي ظلمة بحره يعني روح الحياة عن سريانه فان الفاطس في البحر لابد يمسك نفسه (آداب الشيخ والمريد)

ایمان اور اسلام کا نام آجائے اور صرف ان چیزوں کو ادا کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کی ہیں۔ اور جو شخص اعلیٰ درجہ کو اور عوام سے مرتبہ میں زیادتی کو طلب کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے حاصل کرنے میں سختیاں برداشت کرے، اور جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے سینہ پر موتیوں کا ہار دیکھے اس پر ضروری ہے کہ قعر دریا کی ظلمت کو برداشت کرنے اور روح حیات یعنی سانس کو چلنے سے روک دے کیونکہ دریا میں غوطہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ اپنی سانس کو روکے۔

دیکھئے شیخ نے مثالوں کے ذریعہ طریق کی کیسی عظمت بیان فرمائی اور یہ کہ جو چیز عظیم القدر ہوتی ہے اس کے حصول کا طریق بھی دشوار ہوتا ہے، کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر   تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر

۲- اسی طرح سے ملازمت لذکر اللہ جس کا دوسرا نام شغل باطن بھی ہے اس کے متعلق صاحب رسالہ قشیریہ بھی فرماتے ہیں کہ :-

الذي لابد لهم اقامة الفرائض والسنن الراتبة فاما الزيادات من الصلوات النافلة فاستدامة الذكر بالقلب اتم لهم (رسالہ قشیریہ)

اور جو ان کے لئے ضروری ہے وہ یہ کہ فرائض و واجبات اور سنن موکدہ بجالائیں، رہی اور نوافل وغیرہ کی زیادتی تو اس سے مقدم ان کے لئے یہ ہے کہ قلب کو دوام ذکر کے ساتھ متصف رکھیں۔

اور شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ضیاء القلوب میں فرماتے ہیں کہ

"ونیز سالک را باید کہ بر اوامر شریعت استحکام دارد و از ممنوعات او بہ پرہیزد و تقویٰ و پرہیزگاری راشعار خود سازد" پھر چند سطر کے بعد فرماتے ہیں کہ "اوقات خود را بعد ادائے فرائض و واجبات و سنن در شغل باطن گزارد و بر زیادتی نوافل وا وراد نہ پردازد بلکہ مشغولی باطن را فرض دائمی داند و گاہی غافل نشود" (قصد السبیل صـ۳)

دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب مشائخ ایک ہی بات کو بیان کئے چلے جارہے ہیں
۳۔ تیسری چیز مواظبت علی الذکر کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں تو کلام نہیں ہے کہ طریق میں جس نے بھی جو پایا ہے وہ اسی کی بدولت پایا ہے۔ چنانچہ خود حضرتؒ فرماتے تھے کہ "اپنے پہلے لوگوں میں اور بعد میں آنے والوں میں فرق دیکھتا ہوں، پہلے کے لوگ ذکر وغیرہ کرتے تھے اب لوگ ذکر نہیں کرتے،" تو یہ تو بالکل صحیح ہے کہ ذکر کے انوار ہی کچھ اور ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ تو ذکر کرنے ہی سے ملیں گے تاہم کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس زمانے میں قویٰ ضعیف ہو چکے ہیں اور پہلے زمانہ میں لوگوں کے قویٰ قوی تھے، تو وہ لوگ جن شدائد اور مجاہدات کا تحمل کر لیتے تھے آج ہم اُنکی ریس میں اگر کریں گے تو نقصان اٹھا جائیں گے۔ کتنے لوگوں نے ذکر کی کثرت کی اور اپنا دماغ ہی خراب کر لیا، اس لئے اس باب میں کسی شیخ کامل کی رہنمائی ضروری ہے، اپنی طرف سے یا کسی کتاب وغیرہ میں دیکھکر کوئی ذکر ہرگز ہرگز نہ تجویز کریں ورنہ ضرر میں پڑ جائیں گے، یہی وہ موقع ہے جہاں شیخ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے علاوہ طریق میں اور نہ معلوم کتنی گھاٹیاں آتی ہیں کہ شیخ کی ضرورت پڑتی ہے، اسی لئے سالک کے لئے اختیار شیخ ناگزیر ہے۔

یہ تنبیہ تو ان کے مناسب حال ہے جو کہ اس باب میں افراط سے کام لیتے ہیں لیکن ایک اور جماعت بھی ہے جو اس سلسلہ میں تفریط سے کام لینا چاہتی ہے یعنی بعض لوگ اس کے خواہاں ہوتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا درنا نہ پڑے بس شیخ ہی توجہ کر دے جس سے وصول ہو جائے تو اس مسلک کے لوگوں کو حضرت مولانا گنگوہیؒ کا یہ ارشاد جو کسی طالب کے خط کے جواب میں حضرت نے تجویز فرمایا تھا برابر پیش نظر رکھنا چاہیے، فرماتے ہیں کہ

> "ولایت نظری کے یہ معنیٰ ہیں کہ بعض وقت بدون اختیار عارف کے ایسا آجاتا ہے کہ عارف کی نظر میں اور توجہ میں اثر ہوتا ہے کہ جس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس پر ایک اثر پڑتا ہے جس سے وہ ملون ہو جاتا ہے مثل آفتاب کے کہ جب وہ نمایاں ہوتا ہے تو ہر شے پر اس کی شعاع ہوتی ہے مگر جو طبع مصفیٰ قابل ہوتی ہے تو انوار کا عکس آجاتا ہے اور نہیں تو حرارت کا اثر ہوتا ہے، اس میں بھی تفاوت استعداد ہے آئینہ پر نور زیادہ اور عاج (یعنی ہاتھی کے دانت) پر کم۔ پتھر پر گرمی زیادہ اور گارے (یعنی کیچڑ) پر کم۔ علیٰ ہٰذا۔ پھر جو وہ عکس بزرگ کا قائم ہو گیا، فبہا، اور جو زائل ہو گیا تو پھر ویسا ہی رہ گیا یہ بھی تفاوت رکھتا ہے تو یہ امر اتفاقی ہے، اب بے

اختیاری۔ اس پر کوئی انتظار کرکے نہیں بیٹھا۔ اپنا سر مارنا اور مجاہدہ مشروط ہے اور اپنا ہی کیا حال قائم دائم لاتا ہے۔" (مکتوبات رشیدیہ ص۵۹)

دیکھئے حضرت نے کس عمدہ طریقہ سے اتنے بڑے خندق سے لوگوں کو نکال دیا ہے۔ واقعی آج اس قسم کے لوگ بہت ہیں جو اسی انتظار میں ہیں کہ شیخ کی جہاں توجہ ہوئی نہیں کہ ہم پہونچے نہیں حضرت نے اس کو امر اتفاقی اور غیر اختیاری فرمایا اور یہ فرمایا کہ میاں کس تلبیس ابلیس میں پڑکر راستہ چلنے سے رُکے ہوئے ہو۔ چلو راستہ تو اپنے ہی چلنے سے طے ہوگا اور اگر بالفرض کسی کو توجہ شیخ کی حاصل بھی ہوگئی تو اس سے پیدا شدہ حال کا قائم و دائم رہنا ضروری نہیں۔ شیخ کی روشنی میں کچھ دور چل لوگے مگر پھر اندھیرا، لہٰذا خود ذکر و مجاہدہ کرکے اپنے اندر ذاتی طور پر حال پیدا کرو، تو یہ حال قائم و دائم رہیگا۔

امام غزالیؒ کے کلام سے متعلق ضروری تشریح کے بعد اب اور بعض اکابر کا کلام نقل کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معالجۂ اخلاق کا درجہ ذکر و اذکار سے مقدم ہے۔

۳۔ سنئے حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں کہ۔

"نفس کو فنا کرنے سے پہلے کثرت نوافل اور تلاوت قرآن سے قرب الٰہی میں ترقی نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" یعنی ہاتھ نہ لگائیں اس کو مگر طہارت والے لوگ" چنانچہ طہارت ظاہری نماز کی شرط ہے۔ رذائل نفس سے پاک ہوئے بغیر نماز اور تلاوت کی برکتیں حاصل نہیں کی جاسکتیں"

اس کا بھی حاصل وہی ہے کہ اصلاح نفس ضروری ہے بدون اس کے انسان طاعات کے انوار و برکات سے محروم رہتا ہے۔

۴۔ اور سنئے حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ آداب الشیخ والمرید میں فرماتے ہیں کہ

ان الزمان مشحون بالدعاوی الکاذبة العریضة فلا مرید صادق ثابت القدم فی سلوکه ولا شیخ محقق ینصح فیخرجه من رعونة نفسه واعجابه برأیه ویعرب له عن طریق الحق فالمرید یدعی الشیخوخة والریاسة وهذا کله تخبیط وتلبیس (ص۵)

زمانہ لمبے چوڑے جھوٹے دعووں سے بھرا ہوا ہے نہ کوئی مرید ہی صادق اور سلوک میں ثابت القدم نظر آتا ہے نہ کوئی شیخ ہی محقق نظر پڑتا ہے جو مرید کی خیر خواہی کرے اور اس کو نفس کی رعونت اور خود رائی سے نکالے اور طریق حق اس کے سامنے ظاہر کردے پس مرید شیخوخت اور بڑائی کا مدعی ہوجاتا ہے اور یہ سب خبط اور تلبیس ہے۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ سلوک میں سب کچھ طے ہوجانے کے بعد جو عقبہ سالک کو پیش آجاتا ہے وہ دعویٰ اور خودی ہے جس کا منشاء بھی ظاہر ہے کہ نفس کی اصلاح کا نہ ہونا ہے۔

۵۔ اور سنئے صاحب روح المعانی آیۃ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا کے تحت فرماتے ہیں کہ :-

وقال ابو الحسن الوراق هذا مثل ضربه الله تعالیٰ لمن لم يصحح احوال الارادة فارتقى من تلك الاحوال بالدعاوى الى احوال الاكابر فكان يضئ عليه احوال ارادة لو صححها بملازمة آدابها فلما مزجها بالدعاوى اذهب الله تعالیٰ عنه تلك الانوار وبقي في ظلمات دعاويه لا يبصر طريق المخرج منها نسأل الله تعالیٰ العفو والعافية ونعوذ به من الحور بعد الكور

(روح المعانی ج ۱ ص ۱۵۵)

حضرت ابو الحسن وراقؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایک مثال ہے جو اس شخص پر بھی منطبق ہے جس نے ہنوز اپنی ارادت کی بھی تصحیح نہ کی ہو اور ان احوال کی وجہ سے جو اسے ابتداء میں حاصل ہوئے ہوں اکابر طریق کے احوال تک چڑھ گیا ہو یعنی اپنے لئے اسے ثابت کرتا ہو تو یہ شخص ایسا تھا کہ اگر ارادت کی تصحیح کر لیتا اس کے آداب کا لحاظ کر کے تو ارادت کے احوال اس پر روشن ہوتے لیکن جب اس نے اس میں آمیزش دعاوی کاذبہ کی کر لی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے اس کے نور کو سلب فرمایا اور وہ اپنے دعویٰ کی تاریکی میں پڑا رہ گیا اس طرح سے کہ اسے اسکو نکلنے کی بھی سبیل سجھائی نہیں دیتی، ہم اللہ تعالیٰ سے عفو اور عافیت کا سوال کرتے ہیں اور کمال کے بعد نقصان سے پناہ مانگتے ہیں

(روح المعانی ج ۱)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ سالک کو جو احوال حاصل بھی ہوتے ہیں تو آداب کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے وہ سلب بھی ہوجاتے ہیں اور وہی بے ادبی اس کے لئے وصول سے مانع ہوجاتی ہے۔ چنانچہ سب سے بڑا مانع اور حجاب اکبر یہی دعویٰ ہے جس کا منشا اس کا نفس ہوتا ہے۔

۶۔ اور سنئے صراط مستقیم میں ہے کہ :-

از قوی ترین موانع نزول فیض رحمانی و ورود عنایات یزدانی بر سالکین راہ حق تلوث نفوس بہیمہ ایشان ست بر ذائل اخلاق مثل بخل و کبر و حرام و غیبت و کینہ و ریا و کذب و طمع و حرص۔ سلف صالحین تزکیہ از یں ذائل

سالکین پر فیض رحمانی کے نزول اور عنایات یزدانی کے ورود کا، ایک بڑا مانع اُن کے نفوس حیوانی کا رذائل اخلاق مثلاً بخل۔ حسد۔ کبر۔ حرام مال کھانا۔ غیبت۔ جھوٹ۔ کینہ ریا اور حرص وطمع وغیرہ سے ملوث ہونا ہے۔

سلف صالحین، ان رذائل سے تزکیہ کو سب امور سے

مقدم تر و مہم تر میدانستند و آنرا صرف بنا بر رضا جوئی حق تعالیٰ از دل خود منقطع و منقلع می کردہ اند تا اثرے ازاں باقی نمی ماند و دلہائے ایشاں مصفی می گردد لہٰذا مورد عنایات بے غایات می شدند و بہمیں تصفیہ کہ ارضاء اللہ تعالیٰ بعمل می آوردند مقبول می گشتند۔

و ہر کہ باوجود طے مراتب سلوک منضبط مورد آثار عنایات نشود آنرا ایں ہمہ رذائل یا بعض آں در وے البتہ محسوس خواہد بود پس وجود ایں رذائل اخلاق مانع ورود عنایات الٰہی است۔ (صراط مستقیم ص۳۲)

اہم اور مقدم سمجھتے تھے اور ان کو محض اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرنے کی خاطر اپنے قلب سے نکالتے اور ان کا بالکل قلع قمع کرتے تھے تاکہ کوئی اثر باقی نہ رہے اور ان کے قلوب مصفی ہوجائیں اسی لئے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بے انتہا عنایات کے مورد ہوتے تھے اور اسی تصفیہ قلب کی وجہ سے جسے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے کرتے تھے مقبول خلق و خالق ہوتے تھے۔

اور جو شخص کہ باوجود سلوک کے مراتب منضبط طے کرنے کے عنایات حق تعالیٰ سبحانہٗ کا مورد نہ ہو تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان تمام رذائل کا یا ان میں سے بعض کا اثر ابھی اس کے قلب میں موجود ہے پس ان ہی رذائل اخلاق کی موجودگی عنایات حق تعالیٰ کے نزول سے مانع ہوتی ہے۔

دیکھا آپ نے اسمیں بھی حضرت مولانا دہلویؒ نے رذائل نفس کو مانع فیض رحمانی فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ اسی لئے اسلاف کا دستور تھا کہ وہ تزکیۂ اخلاق کو اہم اور اقدم سمجھتے تھے اور یہ بھی تصریح فرمائی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کسی شخص کا سلوک مشائخ کے معہودہ طریق پر طے بھی ہوچکا ہو لیکن اگر اسمیں رذائل کلاً یا بعضاً موجود رہے تو راستہ نہیں کھلے گا۔

یہی مطلب ہے حضرت حاجی صاحبؒ کے اس ارشاد کا کہ "جب تک رذائل نفس کی اصلاح نہیں ہوجاتی آدمی میں وصول الی اللہ کی استعداد تک نہیں پیدا ہوتی۔ میری سمجھ میں اسکی وجہ یہ آتی ہے کہ رذائل میں سے کبر۔ حسد۔ اعجاب۔ جاہ۔ غصہ۔ حرام مال کی خواہش ریا وغیرہ یہ سب ام الامراض ہیں اور یہ سب اخلاق یا تو ابلیس کے ہیں یا کفار کے اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں پس مبغوضین کے اخلاق رکھتے ہوئے کوئی شخص ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا محبوب کیسے ہوسکتا ہے۔

الغرض مشائخ محققین اور علماء ربانیین کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ نفس کا روڑا وصول الی اللہ میں نہایت سخت روڑا ہوتا ہے اسی لئے مصلحین امت نے جب بھی قوم کو اسکی جانب سے سست پایا تو نہایت اہتمام کے ساتھ اس پر تنبیہ فرمائی جیسا کہ صاحب رسالہ قشیریہ، امام غزالیؒ، شیخ اکبرؒ، قاضی ثناء اللہ صاحبؒ اور حضرت دہلویؒ کے کلام میں آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ پس اس آخری دور میں چونکہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی حضرت مولانا تھانویؒ بھی تھے اس لئے حضرتؒ نے بھی وہی طریقہ پیش فرمایا جو اپنے اپنے زمانہ میں ہر امام طریق اور ہر مصلح امت نے پیش فرمایا تھا۔

یہاں تک تو کلام اس شبہہ کے ازالہ میں تھا جو ان مولوی صاحب کو حضرت کی دو مذکورہ بالا عبارتوں میں تھا جن میں بظاہر تعارض سا معلوم ہوتا تھا۔ باقی میں بھی چونکہ حضرت کی خدمت میں ایک مدت رہا ہوں اس لئے دیکھا بھی ہے کہ حضرت آخر میں اصلاحِ نفس ہی پر زیادہ زور دیتے تھے جو شخص کچھ پوچھتا تو فرماتے کہ پہلے نفس کی اصلاح کرو جہاں کسی نے وظائف دریافت کئے فرماتے کہ پہلے نفس سے رذائل دور کرو۔

اس سلسلہ میں مجھے بھی ایک اشکال رہا اور بہت دنوں تک رہا۔ لیکن میں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا، بس اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا تھا کہ یا اللہ یہ بات سمجھا دیجئے، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد خود حضرت ہی کے مضامین سے وہ زائل بھی ہو گیا۔ میں نے ایک عالم کے سامنے (جو حضرت ہی کے لوگوں میں سے ہیں) اپنا اشکال اور پھر اس کا جواب بیان کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ واقعی اشکال تو ہوتا ہے، اور جواب بھی آپ نے خوب سمجھا۔ آپ بھی سنئے۔

مجھے یہ خلجان تھا کہ حضرت اصلاحِ نفس کا مطالبہ مبتدی سے بھی فرماتے ہیں تو نفس اور رذائلِ نفس کا معاملہ تو بڑا ہی غامض اور ادق ہے، جس شخص نے ابھی آج ہی طریق میں قدم رکھا ہے وہ غریب کیا جانے کہ نفس کیا ہوتا ہے اور رذائل کیا ہوتے ہیں؟ نفس کی اصلاح تو منتہیوں تک پر دشوار ہوتی ہے پھر مبتدی بھلا اس میں کیا چل سکتا ہے۔ یہی خلجان تھا جس میں بہت دنوں تک غلطاں اور پیچاں تھا لیکن بعد میں حضرت ہی کی برکت سے حضرت ہی کے مضامین سے اس کا جواب سمجھ میں آگیا وہ یہ کہ مبتدی کو جب ابتدا میں ذکر وغیرہ بتایا جاتا ہے تو ذکر کرنے کی وجہ سے اس کو کچھ حالات اور کیفیات حاصل ہو جاتی ہیں جن میں اس کو حظ بھی آتا ہے اس لئے اس کی نظر بس انہیں میں مقصور ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ اپنے کو کامل سمجھ لیتا ہے۔ اصلاحِ نفس سے غافل ہو جاتا ہے، اور جب نفس باقی رہتا ہے تو ہر وقت اندیشہ کہ نہ معلوم کس گھاٹی میں اس کو ڈھکیل دے۔

اس لئے ضرورت ہوئی کہ ابتداءً ہی اس کو بجائے اوراد و وظائف میں لگانے کے نفس کی اصلاح کی جانب متوجہ کیا جائے اور اس کے رذائل اس کے پیشِ نظر کئے جائیں۔ اب معرفت اور بصیرت نیز استعداد کی کمی سے گو اس کی اصلاح جلدی نہ ہو سکے تاہم نفس اصلاح کی ضرورت تو اس کے نفس کو مسلّم ہو جائیگی، پھر اب اس کے بعد اگر ذکر وغیرہ کریگا تو اس کے ضرر سے محفوظ رہیگا۔ کیونکہ اس کو حال خواہ کیسا ہی کیوں نہ مل جائے، چونکہ نفس اور اس کے رذائل کی اُسے فی الجملہ معرفت ہو چکی ہے اور اصلاح کی ضرورت بھی تسلیم ہو چکی ہے اس لئے اس کی جانب سے بیفکری اس کو کبھی نہ ہوگی۔

اس سے سمجھ میں آیا کہ مبتدی سے نفس کی بحث چھیڑنے اور اس سے اصلاحِ اخلاق کا مطالبہ کرنے میں یہ مصلحت تھی جو بالکل صحیح اور عین تجربہ پر مبنی ہے۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ اب اس زمانہ میں دونوں چیزوں کو ساتھ لیکر چلنا چاہئے نہ تنہا ذکر پر اکتفا کرے اور نہ تنہا اصلاحِ نفس پر اور اب اصلاح کے لئے یہی طریق متعین ہے۔

حضرت کے ارشادات میں تطبیق کے متعلق جو کلام تھا سو الحمد للہ کہ وہ بالتفصیل ختم ہوا اب (جیسا کہ میں نے وعدہ کیا تھا) طریق عشق پر بھی کچھ کلام کر دینا چاہتا ہوں تاکہ بحث اپنے تمام گوشوں کے اعتبار سے مکمل ہو جائے طالب کو نفع پہونچے اور کسی کو اس سلسلہ میں بھی اگر کچھ خلجان ہو تو وہ رفع ہو جائے۔ سنئے۔

حضرت مولٰنا محمد یعقوب صاحبؒ مکتوبات میں لکھتے ہیں کہ:۔

"راہ وصول کا خلاصہ خودی کو چھوڑنا ہے کہ علاج اس کا وہ ہے جو منہاج العابدین میں مذکور ہے، اور متاخرین کے نزدیک کثرت ذکر، کم کھانا، کم سونا، کم بولنا، اور کم خلق سے ملنا، اسکی اصل ہے کہ غلبہ ذکر میں سب صفائی ایک ساتھ ہی ہو جاتی ہے۔ (مکتوبات یعقوبیہ ص۱۱)

دیکھئے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے بھی وصول کا خلاصہ ترک خودی کو فرمایا، باقی یہ کہ وہ خودی زائل کیسے ہو؟ اس کے علاج کے متعلق فرمایا کہ منہاج العابدین میں مذکور ہے۔ اب منہاج العابدین تو میرے پاس موجود نہیں کہ اس میں اس کا طریقہ دیکھوں۔ اس لئے خیال یہ ہے کہ ایسی ہی چیزیں ہوں گی جن سے خودی پاش پاش ہو کر ختم ہو جاتی ہوگی۔ میرا خیال یہ بھی ہے کہ اس خودی کے ترک کے لئے سب سے زیادہ آسان اور اقرب طریقہ عشق و محبت ہی ہے کیونکہ یوں محنت اور مجاہدہ کر کے اور نفس کے جزئی جزئی امراض کی اصلاح کر کے کسی درجہ میں نفس کو مغلوب کر لو تو کر لو لیکن نفس مرتا نہیں جب تک کہ عشق و محبت کے کوچہ میں نہیں گذرتا۔ کما قال العارف الرومی۔ ؎

ھر کرا جامہ ز عشقے چاک شد او ز حرص و عیب کلی پاک شد

(یعنی جس شخص کا جامہ عشق سے چاک ہو جاتا ہے تو وہ حرص اور تمام عیوب سے بالکلیہ پاک ہو جاتا ہے۔

تو حضرت اگر بالکلیہ پاکی چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ تو عشق ہی ہے اگرچہ اسمیں بھی کلام ہے کہ آیا نفس سے رذائل بالکل ختم ہی ہو جاتے ہیں یا نفس تابع اور مغلوب ہو جاتا ہے، اپنے تقاضے پر عمل نہیں کر پاتا، باقی رذائل کے ملکات اندر اندر موجود رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ تو اس کی ذاتیات ہیں اور ذاتیات شے شے سے جدا نہیں ہوا کرتی۔

اس پر حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحبؒ کی ایک مثال یاد آئی بڑی عمدہ مثال دی ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت کو اسی قسم کے علوم عطا فرمائے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دیکھو ٹھنڈا ہونا پانی کا ذاتی امر ہے جو کہ اس سے کسی حال میں منفک نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ آپ پانی کو گرم کیجئے اور خوب کھولا لیجئے ایسا کہ اگر بدن پر پڑ جائے تو اس کو جلادے لیکن اگر اسی پانی کو آپ آگ پر ڈالدیں تو اسکو بجھا دیگا کیونکہ اسکی گرمی جو ہے وہ عارضی ہے جو کہ ہمارے لئے تو آگ کا کام کر رہی ہے مگر برودت اس کی ذاتی ہے جو اسمیں اس حال میں بھی موجود ہے اسی لئے تو اس نے آگ کو بجھا دیا، بس یہی نفس کا حال ہے کہ عشق و محبت کی گرمی کیوجہ سے اسمیں ایسی صلاحیت اور استعداد پیدا ہو جاتی ہے

کہ وہ مرضی الٰہی کی مخالفت نہیں کرتا، باقی یہ کہ اس کے اندر مخالفت کا ملکہ بھی نہ رہ جاتا ہو یہ ضروری نہیں اور اسمیں ہمارا نقصان بھی کیا ہے پانی میں اگر آگ پر رکھنے کے بعد بھی ذاتی برودت موجود ہے تو رہے ہمارا کھانا پکانے کے لئے تو اس کی عارضی گرمی بھی کافی ہے۔ لہٰذا اب ہم اس کا غم کیوں کریں کہ اس کی ذات میں برودت کیوں موجود ہے؟۔

بہر حال، عشق کی وجہ سے نفس کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہو یا اُس کے تقاضے ختم ہو جاتے ہوں، ہمارا کام بنانے کے لئے دونوں ہی کافی ہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ نفس کی خودی وغیرہ کے ختم کرنے کا آسان اور مختصر راستہ یہی عشق و محبت ہے۔ بزرگانِ دین یہی کہتے آئے ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ محبت جب کامل ہو جاتی ہے تو پھر وہ سوائے محبوب کے اور کسی دوسری چیز کے لئے قلب میں جگہ چھوڑتی نہیں، عرفاء کے کلام سے یہی معلوم ہوتا ہے اس مضمون کو جتنا عمدہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے بیان فرمایا ہے کم دیکھنے میں آیا ہے، مکتوبات میں فرماتے ہیں کہ

"محبت میں یہی اصل ہے کہ محبوب کے سامنے محو ہو جائے اور سب خواہشوں کو گم کر دے ورنہ محبت ناقص ہے کیونکہ اس صورت میں محبوب وہ خواہشیں ہیں نہ وہ یارِ دلنواز"

(مکتوبات ص۱۲۱)

سبحان اللہ، کیسے عمدہ اور کیسے دلکش عنوان سے محبت کا یہ کارنامہ بیان فرمایا ہے کہ اصل اس میں یہ ہے کہ محب محبوب کے سامنے محو ہو جائے، اسی کا نام فنا ہے ... رکِ خودی بھی ہے اور یہ خودی بھی ایک روڑا ہی ہوتا ہے اس کو جب آدمی درمیان سے ہٹاتا ہے تب ہی کامیاب ہوتا ہے۔ حضرت حافظ فرماتے ہیں کہ ؎

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　　تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

یعنی عاشق معشوق کے درمیان میں (بجز عاشق کی خودی کے اور) کوئی چیز حائل نہیں ہے لہٰذا اے حافظ تم بھی اپنی خودی کو درمیان سے ہٹاؤ۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں انت الحجاب علیٰ شمسک لیکن یہ روڑا بدون عشق و محبت پیدا کئے درمیان سے ہٹنے کا نہیں، رہی یہ بات کہ یہ محبت اور عشق حاصل کس طرح سے ہو؟ تو اس کے متعلق یہ سمجھئے کہ اس کے لئے اہلِ محبت اور اہلِ عشق کی صحبت سے بڑھکر کوئی چیز نہیں ہے اور اسی میں یہ بھی داخل ہے کہ عشق و محبت کا ذکر اتنا کیا جائے کہ آدمی کو محبت ہی سے محبت اور عشق ہی سے عشق ہو جائے، پہلے انسان کو عشق ہی سے محبت ہوتی ہے اور محبت سے عشق ہوتا ہے پھر اس کے بعد محبوب سے محبت ہوتی ہے اسی کو کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

غم چہ ایستادۂ بر درِ ما　　　اندر آ یارِ ما، برادرِ ما

(یعنی اے غم (یعنی غم عشق) تو دروازہ پر کیا کھڑا ہوا ہے، اے میرے یار اے میرے بھائی اندر آجا)

حضرت مولانا رومؒ یا اور دیگر عرفاء کے کلام میں بار بار جو عشق کا ذکر آیا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ کامل کو چاہیئے کہ وہ عشق و محبت کے فضائل اتنی کثرت سے بیان کرے کہ آدمی کو اس کی وجہ سے اس کے حاصل کرنے کی طلب اور رغبت علی وجہ الکمال پیدا ہو جائے۔

یہی حُبِ عشقی چونکہ سالک کو محبوبِ حقیقی سے واصل کرتی ہے اسی لئے مشائخ اور صوفیاء نے ہر زمانہ میں اپنی تحریر و تقریر میں اس کی ترغیب دی ہے۔ اسی لئے صوفیاء محققین کا کلام عشق کی تعریف و مدح سے بھرا ہوا ہے مولانا رومؒ مثنوی میں فرماتے ہیں کہ ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　　اے طبیب جملہ علتہائے ما

(یعنی خوش رہ اے عشق کہ تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہوتے ہیں اور تجھ سے تمام امراض کا علاج ہو جاتا ہے) آگے فرماتے ہیں کہ ؎

اے دوائے نخوت و ناموس ما　　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

(یعنی تجھ سے نخوت و ناموس کا دفعیہ ہوتا ہے لہٰذا تو ہی میرے لئے افلاطون اور تو ہی میرے حق میں جالینوس ہے)

یہاں ایک نکتہ ابھی ذہن میں آیا۔ میرے خیال میں اچھا نکتہ ہے، وہ یہ کہ، ہوتا تو یہ ہے کہ طبیب الگ ہوتا ہے اور دوا الگ ہوتی ہے لیکن یہاں مولانا نے عشق ہی کو طبیب بھی فرمایا اور اسی کو دوا بھی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مریض کو دونوں ہی چیزوں کی حاجت ہوتی ہے طبیب کی بھی اور دوا کی بھی، طبیب کی تو اس لئے کہ وہ فرماں روا ہوتا ہے اور امراض کی جانب رہنمائی کرتا ہے اور دوا کی اس لئے کہ وہ مزیلِ مرض ہوتی ہے اور یہاں عشق ہی کو طبیب بھی کہا ہے اور اسی کو دوا بھی سو اس لئے کہ عشق ہی سے امراض باطنی کا انکشاف ہوتا ہے جس طرح سے کہ طبیب جسمانی کے ذریعہ امراض بدنی کا علم ہوتا ہے اس لئے وہ طبیب ہوا اور اسی سے وہ سب امراض دور بھی ہوتے ہیں جس طرح سے ظاہری امراض دوا سے زائل ہوتے ہیں اس لئے وہی دوا بھی ہے ——— پس طریق میں عشق ہی طبیب ہے اور عشق ہی دوا ہے۔ دوا ہونے کی وجہ سے مزیلِ مرض دعویٰ و خودی وغیرہ ہے اور طبیب ہونے کی حیثیت سے رہبر و رہنما اور نفس کا فرمانروا بھی ہے۔

حضرت سعدیؒ نے بوستاں میں ایک عنوان قائم فرمایا ہے کہ "گفتار اندر ثبوت عشق حقیقی، بدلیل مجازی" اور اسمیں فرماتے ہیں کہ ؎

چو عشقے کہ بنیاد او بر ہواست　　　چنیں فتنہ انگیز و فرماں رواست

اس میں عشق مجازی کو فتنہ انگیز اور فرماں روا فرما رہے ہیں جب مجازی کا یہ حال ہے تو حقیقی عشق کیسا ہوگا؟ کیا وہ فرماں روا اور فتنہ انگیز نہ ہوگا؟

اس سے معلوم ہوا کہ عشق جب انسان میں پیدا ہو جاتا ہے تو وہ حاکم ہوتا ہے اور وہ شخص اس کا محکوم ہو جاتا ہے۔ عشق اس کو پکڑ لیتا ہے اور گرفتار کر لیتا ہے اور محبوب کے خلاف اس کو چلنے نہیں دیتا۔ فرماں روا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نفس کی سرتابی جو روح سے ہوتی ہے، جب نفس میں عشق اثر کر جاتا ہے تو اس کی یہ سرتابی ختم ہو جاتی ہے اور وہ روح کا مطیع اور تابع ہو جاتا ہے اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے راستے میں محبت کے بال و پر سے آدمی پرواز کرنے لگتا ہے ورنہ تو اس سے پہلے آہستہ آہستہ راہِ باطن طے کرتا رہتا ہے۔

حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں کہ

تامل در آئینہ دل کنی صفائی بتدریج حاصل کنی

مگر بوئے از عشق سستت کند طلبگار عہد الستت کند

بپائے طلب رہ بدینجا بری وزینجا بہ بال محبت پری

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کچھ راہ تو طلب سے طے کرتا ہے لیکن اس کے بعد جب عشق آجاتا ہے تب ہی منزل مقصود تک رسائی ہوتی ہے اسی کو میں نے کہا تھا کہ یہ راستہ بدون عشق کے طے نہیں ہوتا۔ اور اس پر تعجب نہ کیجئے یہ راستہ تو اللہ تعالیٰ راستہ ہے، عشاق مجازی نے جب اپنی سواری کو سست گام پایا ہے اور مقصود میں مزاحم دیکھا ہے تو اس کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا ہے کہ اب ہمارا راستہ سواری سے نہیں طے ہوگا بلکہ عشق سے طے ہوگا۔ کلام تو کچھ طویل ضرور ہو جائے گا مگر جس مقصد کے لئے یہ سب باتیں بیان کر رہا ہوں اس کے عین مناسب اور معین ہونے کی وجہ سے مجنوں کا ایک واقعہ لکھتا ہوں جسے مولانا رومؒ نے مثنوی میں بیان فرمایا ہے وہ یہ کہ مجنوں ایک دفعہ لیلیٰ سے ملاقات کے لئے اونٹنی پر سوار ہو کر چلا اونٹنی کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا جو پیچھے رہ گیا جب اس نے میاں مجنوں کو لیلیٰ کی یاد میں کھویا ہوا پایا تو اپنے بچے کو ہمراہ لینے کے لئے پیچھے لوٹ آئی جب ان کو کچھ ہوش آیا تو دیکھا کہ اونٹنی بجائے آگے جانے کے پیچھے کی جانب چل رہی ہے، سمجھ گئے کہ اپنے بچہ کی خاطر لوٹی ہے، اس کی مہار پھیر دی اور تیز چلایا، تھوڑی دیر میں بچہ پھر زیادہ پیچھے ہو گیا اور ادھر مجنوں پھر بے ہوش ہو گئے، اونٹنی نے پھر بچہ کی جانب رُخ کیا۔ پھر مجنوں کو ہوش آیا اور اس نے دوبارہ اس کو موڑ دیا۔

الغرض یہی ہوتا رہا، یہ چاہتا تھا کہ جلدی سے وصال محبوب ہو اور اونٹنی اس غم میں تھی کہ اپنے محبوب سے فراق نہ ہو جائے، بالآخر مجنوں جب اس کشاکش سے تنگ آ گیا تو اس نے کہا کہ میرا محبوب آگے ہے اور میری ناقہ کا محبوب پیچھے ہے، لہٰذا ہمارا اور اس کا راستہ مختلف ہے، پھر ہمارا اس کا ساتھ کیسے ہو سکتا ہے، اور یہ بھی کہا کہ اب یہ محبوب کی راہ اس سواری سے طے نہیں کروں گا، بلکہ عشق کو سواری بناؤں گا، اور اب

یہ راہ اسی سے طے ہو گی. یہ کہا اور اپنے کو اترنے کی مہلت بھی نہیں دی بلکہ اسی طرح سے اونٹنی پر سے گرادیا جس کی وجہ سے زخمی بھی ہو گیا اور پیر میں چوٹ آگئی اس نے کہا کہ اب میں عشق کو چوگان بناؤں گا اور خود گیند بنوں گا اور اس طرح سے دور دراز کا راستہ ایک آن میں طے کروں گا۔

مولانا رومؒ جو قصوں سے تصوف کے مسائل نکالنے کے امام ہیں یہ حکایت بیان کر کے فرماتے ہیں کہ بس اسی طرح سے سمجھو کہ ہمارا یہ جو جسم ہے یہ بھی ایک سواری (ناقہ) ہے اور رُوح اس پر سوار ہے اور جس طرح سے کہ یہاں سوار یعنی مجنوں کا مطلوب اور تھا اور سواری یعنی ناقہ کا محبوب اور، اسی طرح سے یہاں جسم جو کہ ناسوتی شے ہے وہ تو خواہشات کی عاشق ہے اور روح چونکہ عالم ملکوت سے تعلق رکھتی ہے اس لئے وہ خدا کی عاشق ہے، اس لئے ان دونوں میں بھی باہم تزاحم، اختلاف اور کشاکشی ہے، وہ اپنی طرف لیجانا چاہتی ہے اور یہ اپنی طرف آخر میں مولانا رومؒ بطور نتیجہ کے فرماتے ہیں کہ ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

(یعنی تم نے دیکھا کہ مجنوں نے جب راستہ کو عشق کے ذریعہ طے کرنا چاہا تو اپنے کو سواری سے گرادیا اور زخمی ہو کر لیٹے ہی لیٹے ادھر کو سرکنے لگا اور کہا کہ اب عشق میرا چوگان ہو گا اور میں اس کا گیند ___ تو جب اس نے لیلیٰ کے عشق میں یہ سب کیا تو مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کیا کم ہے، پھر اس کے لئے سالک کیوں چوگانِ عشق کا گیند نہیں بن جاتا حالانکہ اس کے لئے تو گیند بن جانا لائق تر ہے)

میں یہی کہہ رہا تھا کہ یہ نفس کی مزاحمت مجاہدہ وریاضت سے ختم نہیں ہو گی اس کے ختم کرنے کا آسان طریقہ عشق پیدا کر لینا ہے، کیونکہ ایک تو سلوک ہوتا ہے اور ایک جذب، سلوک سے راستہ طے نہیں ہوتا اور جو ہوتا بھی ہے تو بہت دیر لگتی ہے، آدمی چلتا ہے پیچھے ہٹ جاتا ہے، پھر چلتا ہے پھر پیچھے رہ جاتا ہے اور کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ جتنا چلتا ہے اس سے زیادہ پیچھے آجاتا ہے۔ اس لئے عشق و محبت اختیار کرو وہ فرماں روا ہے وہ تم کو پیچھے نہیں آنے دیگا۔ اور ذراسی دیر میں تم کو کہیں سے کہیں پہونچا دیگا۔

یہی سب حضرات کہتے چلے آئے ہیں بلکہ یہ حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ جو سلوک عشق و محبت سے خالی ہو وہ اخلاق رذیلہ سے کبھی خالی ہی نہیں ہو سکتا بلکہ اسمیں کچھ نہ کچھ اثر رذائل کا باقی ہی رہ جاتا ہے اسی لئے سلوک کے لئے ضروری ہے کہ عشق بھی پیدا کیا جائے بدون اس کے نفس کے امراض رہ جاتے ہیں اگر دوسرے امراض نہ رہے تو خودی تو باقی رہی جاتی ہے۔ اسی لئے بزرگانِ دین کہتے ہیں کہ بغیر عشق کے جو سلوک ہو وہ ابتر ہے یعنی دُم بریدہ اور ناقص ہے اور عشق کامل جب ہی سمجھا جائے گا جب کہ خودی ختم ہو جائے۔

پھر جب خودی ختم ہو کر عشق کامل ہو جاتا ہے تو نفس کو خلاف محبوب چلنے نہیں دیتا اور محبت تام

ہو جاتی ہے تو محب کو نچائے نچائے پھرتی ہے۔ اس پر ایک واقعہ سنئے :۔

ایک عالم تھے جو ایک بزرگ پر کچھ اعتراض کیا کرتے تھے یعنی ان کے مریدوں سے ان کی خیریت اس طرح دریافت کرتے تھے کہ کہو تمہارے نچنیا پیر کیسے ہیں مریدین نے ایک دن حضرت سے کہدیا کہ ہمارے یہاں ایک مولانا صاحب ہیں جو اس اس طرح کہتے ہیں اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ اب کے اگر کہیں تو یوں کہنا کہ وہ ناچتے بھی ہیں اور نچاتے بھی ہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا مولانا نے پھر وہی کہا، کہ تمہارے نچنیا پیر کیسے ہیں ؟ اس پر ان لوگوں نے کہا کہ وہ ناچتے بھی ہیں اور نچاتے بھی ہیں اس جملہ کا سننا تھا کہ مولانا پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اپنے اسی جبہ و دستار کے ساتھ ناچنے لگے اور ناچتے ناچتے کئی کوس کا راستہ طے کر کے ان بزرگ کے پاس پہونچے انھوں نے فرمایا کہ کہئے مولانا یہ آپ ناچ کیوں رہے ہیں؟ اور یہ آپ خود نہیں ناچ رہے ہیں بلکہ کوئی نچا رہا ہے تو ناچتے ہیں، اسی طرح ہم کو بھی کوئی نچاتا ہے تب ناچتے ہیں۔

جانتے ہیں یہاں نچانے والی چیز کیا ہے ؟ یہی محبت ہے، آدمی میں جب تک محبت نہ پیدا ہو جائے اس وقت تک اس کا اعتبار نہیں کہ کب بگڑ جائے

آج لوگ جو بزرگوں کو نہیں مانتے تو اسی لئے کہ یہ چیزیں نہیں دیکھتے اگر آج بھی یہ حضرات اسی طرح سے دارنٹ بھیجکر پکڑوا بلوائیں تو مجال ہے کہ لوگ انکار کر سکیں، بہر حال اب لوگوں نے بھی طریق سے گویا عشق و محبت کو خارج ہی کر دیا ہے، اسی لئے ناقص رہتے ہیں اور کچھ ملتا ملاتا نہیں۔ اسی سے لوگوں کو ہمت و جرأت ہوتی ہے کہ وہ ہماری حجامت بنائیں۔ دوسرے لوگ تو ہمارے نقصان کو محسوس کرلیں اور سمجھ جائیں کہ یہ کچھ نہیں ہیں مگر افسوس کہ خود ہماری نظر اپنے نقصان پر نہیں ہے مرید سمجھتے ہیں کہ پیر صاحب کامل نہیں ہیں اور پیر صاحب کو ذرا افسوس اپنے نقصان کا نہیں ؎

روتی ہے خلق میری تباہی کو دیکھکر روتا ہوں میں کہ ہائے مری چشم نم نہیں

پہلے کے لوگ ایسے نہیں ہوتے تھے مجال نہیں تھی کہ کوئی ان پر ہنس سکے اور کوئی ہنستا تھا تو سزا دیا جاتا تھا۔ کلام طویل ہوگیا۔ بات میں بات نکل آئی مگر الحمد للہ ہیں یہ سب مفید مضامین۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ عرفاء نے ہر زمانہ میں عشق کی مدح فرمائی ہے تاکہ لوگ اسکی جانب بھی توجہ کریں اسی سلسلہ میں مثنوی کا یہ شعر بیان کیا تھا

ع شاد باش اے عشق سودائے ما الخ

اور سنئے، مولانا فرماتے ہیں کہ ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت ہر کہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(یعنی عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو ماسوا معشوق کے ہر چیز کو جلا دیتا ہے)
بالکل صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نفس کو کتنا ہی مارو گے اسی کو غالب پاؤگے اور وہ تم سے اور لپٹ جائیگا اور یہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ جب تم کسی کو قتل کرنا چاہو گے تو بالآخر وہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہوگا، ایک دفعہ تو تم سے چمٹ ہی جائے گا یہی نفس کا حال ہے کہ جب تم اس کو مارنا چاہو گے تو وہ بھی لپٹ جائے گا اس لئے اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آگ روشن کرو۔ دیکھئے اگر آپ کسی درخت کو خاکستر کرنا چاہیں تو اس کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ اس کو تلوار اور کلھاڑے سے کاٹئے بلکہ ایک ماچس لگا دیجئے وہ جل کر خاک ہو جائیگا ورنہ اگر صرف عبادت کے ذریعہ اس کو مارنا چاہو گے تو قسم خدا کی نفس مرے گا نہیں بلکہ خودی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

نہ گردد قطع ہر گز جادۂ عشق از دویدنہا کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

آگ ظاہری کو تو پانی سے بجھایا بھی جا سکتا ہے لیکن نار عشق کسی طرح بجھتی نہیں بلکہ وہ اور بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ آپ اگر صرف ایک ایک مرض کو لیں گے اور اسکی اصلاح کریں گے تو اس کے لئے شاید عمر نوحؑ بھی کافی نہ ہو، تب بھی کچھ نہ کچھ نفس باقی رہیگا۔ اور عشق پیدا کرلیں تو یہ ایک منٹ میں غیر محبوب کو جلا کر رکھدے گا۔ بزرگوں نے فرمایا ہے "العشق نار یحرق ما سوی المحبوب"
اور سنئے مولانا روم فرماتے ہیں کہ ؎

تیغ لا در قتل غیر حق براند در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

(یعنی لا کی تلوار کو غیر اللہ کے قتل کے لئے چلاؤ یعنی لا الٰہ کہو اور پھر دیکھو کہ لا کے بعد کیا باقی رہا)
آگے خود ہی فرماتے ہیں کہ ؎

ماند الا اللہ باقی جملہ رفت مرحبا اے عشق شرکت سوز زفت

(یعنی صرف اللہ باقی رہا اور اس کے ماسوا سب ختم ہو گیا۔ اے عشق تجھ پر مرحبا کہ تو بہت ہی شرکت سوز ہے)
اور فرماتے ہیں کہ ؎

عشق آں زندہ گزیں کو باقی است واز شراب جانفزایت ساقی است

(ترجمہ۔ اگر عشق اختیار کرنا ہے تو اس ذات کا اختیار کرو جو باقی ہے اور شراب جاں فزا سے تیرا ساقی ہے)
اور فرماتے ہیں کہ ؎

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد او ز حرص و عیب کلی پاک شد

(جس کا جامہ عشق سے چاک ہوا یعنی جس نے عشق کا طریق اختیار کیا تو اس کی بد دلت وہ حرص اور جمیع نقائص سے اور اخلاق ذمیمہ سے بالکلیہ پاک ہو جاتا ہے)

مولانا نے یہاں یہ جو فرمایا کہ "ہر کرا جامہ زعشقے چاک شد" تو اس عشق سے جامہ چاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے نفس تک عشق پہونچ جائے کیونکہ آدمی عیب سے بالکلیہ اسی وقت پاک ہوتا ہے جبکہ عشق سے نفس متاثر ہو جائے اور یہ اس لئے کہ نفس ہی منشا اور محرک ہوتا ہے رذائل کے صدور کا اور وہی امارہ بالسوء ہے لہذا جب یہی عاشق ہوتا ہے تب ہی کام بنتا ہے اور اصل بھی یہی ہے کہ نفس عاشق ہو، کیونکہ روح تو پہلے سے عاشق ہے اب اس کو عشق حاصل کرنے کی کیا ضرورت اس کو تو نفس ہی نے اپنے کام سے روکدیا ہے لہٰذا جب نفس بھی عاشق ہو جائے گا تو اس کی مزاحمت رُوح کے ساتھ ختم ہو جائے گی اور دونوں کا راستہ ایک ہو جائے گا اور اب مقصد میں اتحاد کی وجہ سے دونوں ہم مشرب ہم مسلک ہو جائیں گے۔ کام آسان ہو جائے گا۔

اب جو ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود عشق ہونے کے نفس کی مزاحمت ختم نہیں ہوتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق صرف قلب ہی تک پہونچا ہوتا ہے نفس تک اس کی رسائی ابھی نہیں ہوئی ہوتی، یعنی عشق ناقص اور ناتمام ہوتا ہے۔ ورنہ تو عشق جب نفس تک پہونچ جاتا ہے اس وقت تو نفس کا خاتمہ ہی ہو جاتا ہے اب اس سے مزاحمت متصور ہی نہیں ہو سکتی، اسی کو صراط مستقیم میں مولانا نے فرمایا تھا کہ

"یہ کیفیت آناً فاناً بڑھتی ہے یہاں تک کہ طالب اپنے حجاب بشری کو پارہ پارہ کر دیتا ہے اور اس کا نفسانی غبار پاش پاش ہو جاتا ہے"۔

پس ہو سکتا ہے کہ پہلے زمانہ میں لوگوں کا عشق نفس تک پہونچ جاتا ہو اس لئے ان کی اصلاح ہو جاتی ہو اور اس زمانہ میں عشق کو نفس تک نہ پہونچایا جاتا ہو بلکہ ذکر وغیرہ کے ذریعہ سے صرف قلب تک ہی پہنچایا جاتا ہو اس لئے نفس کی اصلاح نہ ہوتی ہو حالانکہ عشق کی ضرورت نفس ہی کو ہے تاکہ وہ پاش پاش ہو جائے روح کو نہیں کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے عاشق ہے۔ باقی رہا یہ کہ عشق کو نفس تک پہونچانا ذرا آسان بھی نہیں ہے اور نہ ہر بوالہوس کے بس کی بات ہے۔

سعدیا کنگرۂ عشق بلند است بلند ۔۔۔ دست ہر بوالہوس آنجا بہ فضولے نرسد

(یعنی سعدی عشق کا کنگرہ بلند ہے، اور بہت بلند ہے ہر جھوٹے عاشق کا ہاتھ وہاں تک یونہی آسانی سے نہیں پہونچ سکتا)

نفس کو خدائے تعالیٰ کا عاشق تو وہی شخص بنا سکتا ہے جو موفق من اللہ ہو اور خون دل اور لخت جگر کو اپنی

غذا بنانے کے لئے تیار ہو چکا ہو ؎

خونِ دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو　　یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

آپ کو اس تقریر سے عشق و محبت کا کچھ درجہ معلوم ہو گیا ہو گا، نیز یہ کہ طریق میں اس کا کیا مقام ہے اس کا بھی اندازہ ہوا ہو گا، میں کہتا ہوں کہ آج ہماری دینی گاڑی ہو یا دنیوی جو رُکی پڑی ہے تو اسکی وجہ یہی ہے کہ ہم نے محبت ہی کو ختم کر دیا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ عبادات کی مشقت محبت ہی سے ختم ہوتی ہے۔

ع　　از محبت تلخہا شیریں شود

مصلحین فرماتے ہیں کہ دنیوی تعلقات کے بھی درست کرنے اور اس کے باقی رکھنے کا طریقہ محبت ہے۔ جس شخص کے ساتھ نباہ نہ ہوتا ہو لیکن اس کے ساتھ نباہ کرنا ضروری بھی ہو تو اسکی محبت اپنے قلب میں پیدا کرے "ضرب الحبیب زبیب" چونکہ محبوب کی مار بھی کشمش ہوتی ہے اس لئے ناگواریاں گوارا ہو جائیں گی اور تعلقات خوشگوار ہو جائیں گے۔ بزرگوں کی بات بھی کیسی ہوتی ہے۔ ایک شخص کے خط کے جواب میں مولانا گنگوہی فرماتے ہیں کہ

"دعا کرو کہ حق تعالیٰ مجھکو اپنی حب دیوے تو اس کے حُب سے حُب اس کے اولیاء اللہ کی ہووے اور پھر اس حُب سے حُب برادران دینی کی ہووے" (مکاتیب ص۳۳)

دیکھئے حضرت مولانا تو دعا کر رہے ہیں کہ اللہ و رسول کی، اولیاء اللہ کی اور برادران دینی کی محبت نصیب ہو اور ہم آج جتنے اسباب محبت کے ختم کرنے کے ہیں ایک ایک کر کے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان میں کونسی راہ درست ہے اس کا فیصلہ خود آپ فرمائیے۔

بہر حال محبت کا جب غلبہ ہوتا ہے تو آدمی کی طبیعت پر وہ حاکم ہو جاتی ہے اور طبعی ہو جاتی ہے اور خود اس کو نیز دوسروں کو ذوق سے اس کا پتہ بھی چل جاتا ہے اور محبت تو دراصل وہی ہے جو طبعی ہو۔ عقلی محبت بھی کوئی محبت ہے۔ حضرات صحابۂ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طبعی محبت تھی ورنہ تو کسی انسان کا تیر و تلوار کے رُخ پر اپنے بدن کو کر دینا کیا عقل کے موافق بات ہے؟

ہم تو دیکھتے ہیں کہ فطری امر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپکی آنکھ کی طرف انگلی سے اشارہ کرے تو پلک جھپک جائیگی اور گردن ادھر سے پھر جائیگی، لیکن حدیث میں آیا ہے کہ صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک غزوہ میں اس طرح حفاظت فرمائی کہ جس جانب سے تیر آتا تھا اپنے بدن کو اسپر کر لیتے تھے اور اس تیر کو اپنے ہاتھ اور سینے پر لیتے تھے۔ سبحان اللہ۔ یہ محبت طبعی ہی میں ہو سکتا ہے۔

حاصل یہ کہ محبت جب انسان کے نفس میں گھر کر جاتی ہے تو طبیعت پھر مخالفت نہیں کرتی اور آدمی

کی ترقی کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ نے ابتک جو راستہ اختیار کیا، کیا، اب کچھ دنوں کے لئے بطور تجربہ ہی کے راہ محبت کو بھی اختیار کر کے تو دیکھئے کامیابی ہوتی ہے یا نہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دل خراش　　　آزموں را یک زمانہ خاک باش

(تم سالہا سال تک دل خراش پتھر رہے ہو، آزمانے کے لئے سہی کچھ دنوں کیلئے ذرا خاک ہو کر تو دیکھو)

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ　　　خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

(موسم بہار میں پتھر کہاں سرسبز شاداب ہوتا ہے، مٹی ہو جاؤ تاکہ اسمیں سے رنگ برنگ کے پھول کھلیں)

میں سمجھتا ہوں کہ عشق و محبت پر اب مفصل کلام ہو چکا ہے۔ لہٰذا آخر میں پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ اس کے حصول کا ذریعہ اہل محبت کی صحبت ہے اور محبت کوئی کتابی چیز نہیں ہے بلکہ ایک ذوقی کیفیت کا نام ہے اس لئے یہ محبت والوں ہی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ کتاب وغیرہ سے نہیں ملے گی جس طرح کہ دین دیندار کی صفت ہے کتاب کی نہیں، اس لئے دین کسی دیندار ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، اسی طرح محبت بھی اہل محبت سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے یوں کسی کتاب وغیرہ سے کسی شخص کو کوئی حال مل جائے تو یہ شاذ و نادر بات ہے جس پر حکم کلی نہیں لگایا جا سکتا باقی عام عادت اللہ تو یہی جاری ہے کہ انسان میں جو بھی کمال پیدا ہوتا ہے وہ کسی صاحب کمال ہی کی صحبت سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے کتاب وغیرہ سے جو حال ملتا ہے وہ ناقص ہوتا ہے۔

اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ کتاب سے جو حال ملتا ہے وہ بھی کتاب کی صفت نہیں ہے بلکہ وہ بھی صاحب کتاب کے حال کا اثر ہے۔ کیونکہ کسی شخص کے قلبی حالات کا اثر اس کے کلام میں بھی ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم کسی عارف کا ایک شعر سنتے ہیں تو اس سے قلب پر اثر پڑتا ہے اور غیر عارف کے کلام میں یہ بات نہیں ہوتی۔ دیکھئے دنیوی ہوا و ہوس کو ترک کرنے اور دل کی سیر کرنے کی جانب ایک عارف کس طرح سالکین کو متوجہ کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ　　　تو ز غنچہ کم ندمیدۂ، در دل کشا بہ چمن درآ

(یعنی بہت ہی ظلم کی بات ہے اگر تم کو ہوئی و ہوس سرو سمن (یعنی ظاہری باغ) کی سیر و تفریح کی جانب متوجہ کرے، تم خود شگفتہ غنچہ سے کیا کم ہو، اپنے دل کا دروازہ کھولو اور چمن کے اندر آجاؤ کیونکہ مومن کا قلب بھی ایک چمن ہے)

اسی مضمون کو ہمارے حاجی صاحبؒ یوں بیان فرماتے ہیں کہ ؎

وسعت دل کی کیا کرتے ہیں سیر اے امداد　　　کہ یہی باغ ہے اپنا، یہی میدان اپنا

ایک اور صاحب دل فرماتے ہیں کہ ؎

خلوت گزیدہ را بتماشہ چہ حاجت است چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجت است

(یعنی جو شخص کہ خلوت اختیار کئے ہوئے ہو اس کو اور کسی دنیوی تماشہ کی کیا ضرورت ہے جب محبوب کی گلی موجود ہے تو پھر صحرا اور بیاباں میں جانے کی کیا حاجت ہے)

اسی طرح ایک اور عارف، اہل اللہ کے قلب کی وسعت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ؎

پرتو حسنت نہ گنجد در زمین و آسماں در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جا کردۂ

(یعنی آپ کے حسن کا پرتو تو آسمان اور زمین میں بھی نہیں سما سکتا، پھر میرے حریم سینہ میں آپ کیونکر جاگزیں ہیں مجھے اس پر سخت حیرت ہے)

الحمد للہ کہ طریق عشق و محبت، اور محبت پیدا کرنے کا کیا طریقہ ہے، ان سب پر مفصل بحث ہو چکی ہے لہٰذا اب آخر میں مضمون ذکر کی مناسبت سے دو اور ضروری امور کا ذکر بے محل نہ ہوگا کیونکہ لوگ اس کو اکثر مجھ سے دریافت کیا کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نماز میں دل لگنے کا طریقہ کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ صفائی قلب اور دل میں نور کس طرح سے حاصل کیا جائے؟ اس کے لئے کونسا عمل کرنا چاہئے؟ چنانچہ ایک صاحب نے مجھ سے پہلا سوال کیا تو میں نے انھیں یہ لکھا کہ

"نماز میں دل لگنے کے متعلق بہت لوگ دریافت کرتے ہیں میں سب کو یہی بتاتا ہوں کہ نماز سے باہر دل کو خدا کی طرف توجہ کر دو تب یہ توجہ خارج میں بڑھیگی تو نماز میں بھی باقی رہیگی بزرگوں نے اسیطرح اپنی نماز کو ٹھیک کیا ہے اور اس کے لئے وظیفہ بھی پڑھا ہے کہ جس سے دل خدا کی طرف ہو جائے چنانچہ تمام بزرگان دین کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا بہ کثرت ذکر کیا کرتے ہیں۔ اس سے ایمان کی تجدید ہوا کرتی ہے اور اس میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ آپ بھی اس کی کثرت کریں انشاء اللہ تعالیٰ دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا پھر نماز میں بھی متوجہ رہیگا۔ دعا میں بھی کرتا ہوں۔"

اور ایک دوسرے صاحب نے قلب کی صفائی کا طریقہ مجھ سے پوچھا تو میں نے لکھا

"قلب کا نور اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی یاد اس وقت قلب میں جاگزیں ہوگی جبکہ غیر اللہ سے اس کو فارغ کیا جائے دنیوی تمام تعلقات جن میں پڑ کر آدمی کا دل ہمیشہ بارہ بانٹ رہتا ہے ان کو اگر فوراً ختم نہ کر سکے تو کم کرنے کی سعی کرے کیونکہ ظاہر ہے کہ جس برتن میں پہلے سے کوئی چیز موجود ہو تو بدون خالی کئے ہوئے اس کے اندر دوسری

۔ سے بھی جاسکتی ہے، اسی لئے بزرگوں نے ہر زمانہ میں قلب کے روشن کرنیکا طریقہ تلقین فرمایا ہے کہ آدمی کے لئے طاعات ضروریہ کی پابندی اور معاصی سے نفرت تو ازبس ضروری ہے ہی اس کے ساتھ ساتھ زید وعمرو وبکر کے تعلقات سے بھی اپنے قلب کو پاک کرے رذائل کی اصلاح کرے اور فراغت قلب کے ساتھ کچھ ذکر اللہ بھی کیا کرے پھر اس کے بعد صفائی قلب اور دل میں نور پیدا ہونے کی امید رکھے کیونکہ مخلوقات کے تعلقات کی کدورت کو صفائی باطن کے ساتھ ضد کی نسبت ہے دونوں ایک قلب میں جمع نہیں ہوسکتیں حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

چوں ہر ساعت از تو بجائے رود دل ... بہ تنہائی اندر صفائی نہ بینی

(یعنی جب ہر وقت تمہارا دل کسی نہ کسی طرف جائے گا تو تنہائی کی حالت میں بھی تم اپنے قلب میں صفائی نہ پاسکوگے)

بزرگوں نے اسی طرح صفائی پیدا کی ہے اس لئے آج بھی اس کا وہی طریقہ ہے باقی اس کے لئے وظیفہ بھی معین ہے۔ تمام بزرگوں نے کلمہ طیبہ کا ذکر کیا ہے اور اسی سے قلب میں صفائی پیدا ہوئی ہے آپ بھی یہی کیجئے"۔ والسلام

(احقر مرتب عرض کرتا ہے کہ حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ نے یہاں سالکین کو ان دوباتوں کی جانب متوجہ فرمایا ہے کہ۔ ذکر میں دل لگنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور یہ کہ کون سا ذکر کیا جائے جس سے قلب میں صفائی پیدا ہو تو اس میں شک نہیں کہ نہایت ہی کام کی باتیں ہیں اور آج عام طور سے لوگ بزرگوں کے پاس ان امور کے طالب رہتے ہیں۔ باقی ہے چونکہ یہ طریق عملی ہے اس لئے کشود کار تو عمل کرنے ہی سے ہوگا اسی سے راہ کھلتی ہے اور اسی سے ترقی ہوتی ہے۔ لہذا سالک اور طالب کو چاہیے کہ کام پر لگے اور دور تک راستہ کا اتا پتا دریافت کرنے کے لئے بجائے تھوڑا سا جو راستہ نظر آرہا ہے بس اس پر چلنا شروع کردے۔ اللہ تعالےٰ اپنے طالب کی مدد فرماویں گے۔ آگے اس رسالہ کا خاتمہ بھی حضرت اقدس کا ارشاد فرمودہ ہے ملاحظہ فرمائیے۔ جامی)

خاتمہ

اس مضمون کی ابتدا بخاری شریف کی حدیث مامن احد یشھد ان لا الٰہ الا اللہ و ان محمداً رسول اللہ صدقاً من قلبہ الا حرمہ اللہ علی النار سے ہوئی ہے اس لئے اس افتتاح کے مناسب اختتام پر بھی اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث بیان کر کے اس رسالہ کو اسی پر ختم کرتا ہوں تاکہ افتتاح اور اختتام میں توافق ہوجائے اور حسن ابتدا کے ساتھ ساتھ حسن خاتمہ بھی نصیب ہو، یہ حدیث میں نے ایک قلمی کتاب میں دیکھی ہے۔ وہو ہٰذا

قال فی الصواعق لما دخل علی الرضا نیشا بور کما فی تاریخھا وشق سوقھا وعلیہ مظلۃ لا یری من ورائھا تعرض لہ الحافظان ابوزرعۃ الرازی ومحمد بن اسلم الطوسی ومعھما من طلبۃ العلم والحدیث من لا یحصٰی فتضرعا ان یریھم وجھہٗ ویروی لھم حدیثاً عن اٰبائہٖ فاستوقف البغلۃ فامر الغلمان بکشف المظلۃ واقر عیون تلک الخلائق برویۃ طلعۃ المبارکۃ فکانت ذو ابتان مدلیتان علٰی عاتقہ والناس بین صارخ وباک ومتمرغ فی التراب ومقبل لحافر بغلتہ فصاحت العلماء معاشر الناس انصتوا فانصتوا واستملی منہ الحافظان المذکوران فقال حدثنی ابی موسیٰ الکاظم عن ابیہ جعفر الصادق عن ابیہ محمد الباقر عن ابیہ زین العابدین عن ابیہ الحسین عن ابیہ علی بن ابی طالب رضی

صواعق میں ہے کہ جب حضرت علی رضا نیشاپور میں داخل ہوئے اور اس کے بازار سے گذرے تو ان کے چہرہ پر نقاب پڑی تھی جس کے اندر سے وہ نظر نہیں آتے تھے اتنے میں حافظ ابوزرعہ رازی اور محمد بن اسلم طوسی آگے بڑھے اور ان کے پیچھے پیچھے علم حدیث کے بہت سے طلباء تھے ان دونوں نے نہایت ہی لجاجت کے ساتھ حضرت سے یہ درخواست کی کہ اپنے چہرۂ انور کی زیارت کرادیں اور اپنے آباء کی سند سے کوئی حدیث بیان فرمادیں یہ سنکر آپ نے سواری ٹھہرالی اور دو غلاموں سے فرمایا کہ پردہ ہٹادو چنانچہ جتنے لوگ موجود تھے ان سب کی آنکھوں کو اپنے چہرۂ مبارک کی زیارت سے ٹھنڈا کیا اور آپ کے دونوں گیسو آپ کے کندھے پر لٹک رہے تھے اور ادھر لوگوں کا یہ حال تھا کہ کوئی چیخ رہا تھا اور کوئی رو رہا تھا اور کوئی زمین پر لوٹ رہا تھا اور کوئی آپ کی سواری کے پاؤں اور کھر ہی کو بوسہ دے رہا تھا علماء نے یہ شور و شغب دیکھکر بلند آواز سے کہا کہ لوگو خاموش ہوجاؤ جب سب لوگ چپ ہوگئے تو ان دونوں حافظوں نے حضرت سے حدیث املا کرانے کی درخواست کی آپ نے فرمایا کہ مجھ سے حدیث بیان کیا میرے والد موسیٰ کاظم نے اپنے والد جعفر صادق رضی سے اور وہ اپنے والد محمد باقر رضی اور وہ اپنے والد

اللہ عنہم قال حدثنی حبیبی وقرۃ عینی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال حدثنی جبرئیل سمعت رب العزۃ سبحانہ یقول لا الٰہ الا اللہ حصنی فمن قالہا دخل حصنی ومن دخل حصنی امن عذابی ثم ارخی الستر وسار (مضامین تصوف)

زین العابدین سے اور وہ اپنے والد حضرت حسین رض سے اور وہ اپنے والد ماجد حضرت علی بن ابی طالب سے انھوں نے فرمایا کہ مجھ سے حدیث بیان کی میرے حبیب اور محبوب اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ نے فرمایا کہ مجھ سے بیان کیا حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہ انھوں نے رب العزت سبحانہ تعالیٰ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ لا الٰہ الا اللہ میرا قلعہ ہے جو شخص اس کو کہہ لیگا وہ میرے قلعہ میں داخل ہو جائیگا اور جو میرے قلعہ میں داخل ہو گیا وہ میرے عذاب سے مامون ہو گیا۔ یہ فرمایا اور پردہ گرایا اور روانہ ہو گئے۔

سبحان اللہ، حضرت نے حدیث بھی کیسی منتخب فرمائی نہایت جامع اور کتنی موثر۔ ایک حدیث کیا سنائی کہ جنت کی کنجی ہی دیدی (آخر تھے بھی کس گھرانے کے)

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ذکر اللہ کو قلوب کے قفل کی کنجی فرمایا ہے اس لئے بس اس دعا پر مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ۔

اللھم افتح اقفال قلوبنا بذکرک واتمم علینا نعمتک وافض علینا من فضلک واجعلنا من عبادک الصالحین ۔ اے اللہ ہمارے دلوں کے تالے کو کھولدیجئے بذریعہ اپنے ذکر کے اور تمام کر دیجئے ہم پر اپنی نعمتوں کو اور ہم پر اپنے فضل کی بارش برسائیے اور کر دیجئے ہمکو اپنے صالحین بندوں میں سے۔

حسن منزل الہ آباد ۱۵ر رمضان المبارک سنہ ھ

تاریخ طبع ھٰذا :- سنہ ۹۲ ہجری مطابق سنہ ۷۲ عیسوی

(فائدہ) امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کی سند کو اگر کسی مجنون پر پڑھا جائے تو اگر خدا نے چاہا تو اس کو جن یا جنون سے نجات ہو جائے گی۔ (ناقل عفی عنہ)

وَصِیَّۃُ الذِّکر

از افاضات

مُصلحِ الاُمّت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نوّر اللہ مرقدہٗ

ناشر

دفتر ماہنامہ معرفتِ حق ۲۳ بخشی بازار الٰہ آباد ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

مضمون وَصِیَّۃُ الذِّکْرِ

ایک عرصہ سے جی چاہتا تھا کہ ذکر و فکر جس کا کہ نصوص قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں بکثرت ذکر آیا ہے اور علماء ربانی اور مشائخ حقانی نے اپنے کلام میں جس کی حقیقت، اقسام اور تفاصیل پر دل کھول کر خوب ہی خوب کلام فرمایا ہے۔ اس پر ایک مضمون لکھوں جس سے طالبین کو نفع پہنچے۔ چنانچہ اب سے بہت پہلے اپنے ایک رسالہ **مضمون ذکر** میں اس موضوع پر کچھ کلام بھی کیا تھا۔ اور الحمد للہ دیکھا کہ لوگوں کو اس سے نفع ہوا۔ بہت سے اللہ کے بندوں نے اس کو پسند کیا اور دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا اور دور دور سے خطوط آئے کہ اس کتاب سے بہت فائدہ ہوا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اس زمانہ میں اس قسم کے مضامین بھی پہنچانے کی اشد ضرورت ہے اس لئے کہ طریق سے اور مسائل طریق سے اس قدر لوگوں کو بعد ہوگیا ہے کہ عوام تو عوام بہت سے خواص باطنی چیزوں کے علم سے بالکل کورے ہیں۔ جہل کے سبب کسی اہم سے اہم شے کی بھی عظمت قلب میں نہیں رہ گئی ہے اس لئے اس کے معلوم کرنے کی بھی فکر نہیں ہے۔ رسوم پر قناعت کئے ہوئے ہیں اور حقیقت کی جانب سے بالکل چہ غم ہیں۔ قلبی غفلت نے اس احساس کو بھی ختم کردیا ہے کہ روحِ دین ہم میں موجود نہیں ہے، اس کو معلوم کرنا چاہئے اور اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے۔ اور ظاہر ہے کہ جب آدمی کسی چیز کو معلوم ہی نہ کرے گا تو وہ از خود کیسے معلوم ہو جائے گی اور اہل علم ہی جب کسی شے سے ناواقف ہوں گے تو عوام اس سے کس طرح واقف ہو جائیں گے۔ جب کہ ان کے علم کے لئے یہی حضرات واسطہ ہیں۔

اس لئے طبیعت چاہی کہ ذکر و فکر کا دین میں جو درجہ ہے اور جیسی کچھ اس کی اہمیت اور عظمت ہے اس کے شایان شان مزید کچھ کلام کردیا جائے اور اس کی ضرورت۔ اور حقیقت کو مسلمانوں کے سامنے ایسے عنوان سے بیان کیا جائے کہ یہ مضمون ناظرین کو فرسودہ نہ معلوم ہو بلکہ طرز بیان ایسا موثر ہو کہ حقیقت ذکر منکشف ہوکر ان کے قلوب کو اس طرح متاثر کردے کہ پھر کسی کے لئے مجال انکار باقی نہ رہے۔ اور انکار کیا معنیٰ ان کے قلب میں ذکر اللہ کا ایک شوق

اور داعیہ پیدا ہو جائے جو قلب کو ذاکر بنا دے اور انسان کو اپنے دل کے اندر سے غفلت کو دور کرنے کی فکر لاحق ہو جائے اس لئے کہ اصل چیز جو زائل کرنے کی ہے وہ قلب ہی کی غفلت ہے۔ یہ غفلت ذکر کی ضد ہے اس لئے ایک قلب میں یہ دونوں جمع نہیں ہوتیں۔ مومن کے قلب میں ایمان اور ذکر ہوتا ہے اس لئے اس کے قلب میں غفلت نہیں ہوتی جیسا کہ صاحبِ الادب النبوی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

وَلَعَلَّكَ عَرَفْتَ بِهٰذَا اَنَّ الْاِيْمَانَ لَا يَتَّفِقُ وَالْغَفْلَةُ بَلْ يَقْتَضِي الْحَذَرَ وَالْحِيْطَةَ - وَاَنَّ اُوْلٰئِكَ الَّذِيْنَ يَضْحَكُ عَلَيْهِمْ وَلَا يَتَّعِظُوْنَ بِالْمَاضِيْ وَلَا يَسْتَفِيْدُوْنَ مِنَ التَّجَارِبِ، لَمْ يَكْمُلِ الْاِيْمَانُ بَعْدُ فِيْ نُفُوْسِهِمْ وَاِنْ كَانُوْا قَائِمِيْنَ بِرُسُوْمِ الْعِبَادَةِ (الادب النبوی ص۱۸۲)

اور شاید کہ تم نے ہمارے اس بیان سے یہ سمجھ لیا ہو گا کہ ایمان اور غفلت ایک قلب میں جمع نہیں ہوتے بلکہ ایمان تیقظ اور احتیاط کو چاہتا ہے باقی یہ لوگ جن پر دنیا ہنستی ہے اور جو واقعات ماضیہ سے سبق نہیں حاصل کرتے اور نہ ہی تجربات سابقہ سے مستفید ہوتے ہیں ابھی تک ایمان ان کے نفوس میں راسخ نہیں ہوا ہے اگرچہ بظاہر رسوم عبادت کے ساتھ یہ لوگ متصف بھی ہیں۔

اور کافر کے قلب میں غفلت ہوتی ہے اس لئے ذکر سے اسے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا بلکہ یہی غفلت ہی اس کے کفر کا سبب بنتی ہے جس طرح سے مومن کے قلب کا ذکر اس کے ایمان کا ذریعہ اور باعث ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب غفلت کفر کا سبب بن جائے تو یہ خود بھی کفر ہی ہو گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ چونکہ ذکر قلبی ایمان کا ذریعہ بنتا ہے اس لئے حسب قاعدہ مقدمۃ الواجب واجبٌ اس ذکر کا حصول بھی واجب بلکہ فرض ہو گا۔

اب آپ خود غور فرمائیے کہ جو چیز کہ اللہ و رسول کے نزدیک ایک فرض اور واجب کا درجہ رکھتی ہو اس کی جانب سے مسلمانوں کی اس قدر بے اعتنائی کس قدر حق تعالیٰ کے سخط اور مقت کے لئے جالب ہو گی۔ اور بایں حالت کہ قلب اپنے وظیفہ سے تو غافل رہے وہ کس طرح مورد الطاف ربانی ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک اس وقت قوم کے عدم فلاح کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ جو صفات کفار کی اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بیان فرمائی تھیں آج مسلمان ان کے ساتھ متصف ہیں۔ حق تعالیٰ نے کافروں اور منکروں کے متعلق یہ آیت نازل فرمائی تھی کہ:-

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝ مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ۔ الآیۃ

ان منکر لوگوں سے ان کا وقتِ حساب نزدیک آپہنچا اور یہ غفلت میں ہی اعراض کئے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے جو نصیحت تازہ آتی ہے یہ اس کو ایسے طور سے سنتے ہیں کہ ہنسی کرتے ہیں۔ ان کے دل متوجہ نہیں ہوتے۔

یہ غفلت، اعراض، ہنسی اڑانا اور دل کا متوجہ نہ ہونا جو صفات کفار کی تھیں آج کون سی صفت ان میں سے ایسی ہے جس کے ساتھ مسلمان کے اکثر و بیشتر افراد متصف نہیں ہیں غفلت ان کے اندر موجود ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس کے درجات مختلف ہیں۔ کافر میں جو غفلت ہوتی ہے وہ تو بالکل کفر ہی ہوتی ہے لیکن جو شخص اللہ و رسول کی اطاعت کا بھی مدعی ہو اور کام اس کے خلاف کرے بجز یہ گو کفر نہیں تاہم اس کے فسق اور حرام ہونے میں تو کلام ہی نہیں ہے۔ اس کی دلیل سنئے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تفسیر مظہری میں ضَلٰلًا مُّبِیْنًا کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ اَیْ بَیِّنَ الْاِنْحِرَافِ عَنِ الصَّوَابِ فَاِنْ كَانَ عِصْيَانَ رَدٍّ وَّاِنْكَارٍ فَهُوَ ضَلَالُ كُفْرٍ وَاِنْ كَانَ عِصْيَانَ فِعْلٍ مَعَ قَبُوْلِ الْاَمْرِ وَاعْتِقَادِ الْوُجُوْبِ فَضَلَالُ فِسْقٍ۔

(ص۳۴۷ مظہری پ۲۲)

اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا۔ یعنی اس کا یہ ضلال راہ صواب سے کھلا ہوا انحراف ہے اب اگر انکار اور رد کی صورت کا عصیان ہے تب تو یہ ضلال کفر ہے یعنی ایسی گمراہی ہے جو کفر کے مرادف ہے اور اگر صرف ترک عمل ہی ہے اور دل سے حکم شرع قبول کرتا ہے اور اس کے وجوب کا معتقد ہے تو یہ ضلال فسق ہے یعنی ایسی گمراہی ہے جو فسق کے درجہ کو تو پہنچی ہی ہوئی ہے۔

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ ضلال کی دو قسمیں ہیں ایک ضلال کفر ہوتا ہے اور ایک ضلال فسق۔ پس جس طرح سے کافر کے قلب میں غفلت کا انتہائی اور اعلیٰ فرد یعنی کفر موجود ہوتا ہے اسی طرح سے مومن عاصی کے قلب میں بھی غفلت موجود ہوتی ہے اگرچہ وہ کفر نہ ہو فسق ہو اور کافر کی غفلت سے اس کا درجہ کم ہو تاہم ہے تو وہ بھی غفلت ہی کا فرد۔ اور یہ بھی حرام ہے۔

اسی طرح سے امور دینیہ سے اور احکام شرعیہ سے اعراض بھی آج عام طور سے شاہد ہے

اسی طرح سے دل کا متوجہ نہ ہونا یہ مرض بھی مسلمانوں میں فی زمانہ عام طور سے پایا جارہا ہے۔ جس کو دیکھئے اس کا شکار ہے۔ جسے دیکھئے نماز میں دل نہ لگنے کا شاکی ہے کیا یہ سب آثار دلی توجہ حاصل ہونے کے ہیں۔ باقی رہا ہنسی اڑانا اور سخریہ واستہزار کرنا تو اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اسے کافروں کا شیوہ بتایا ہے مگر افسوس ہے کہ آج مسلمان اس صفت میں دوسروں سے کہیں آگے نظر آتا ہے۔ دیکھئے کافر ہمارے دین کا منکر ہے اس سے اس کو کلی اختلاف ہے مگر دیکھا یہ جاتا ہے کہ سارے دینی امور کے ساتھ وہ استہزا نہیں کرتا بلکہ برخلاف اس کے نماز و نمازی کے ساتھ کچھ عظمت اور احترام ہی کا معاملہ کرتا ہے اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اسی دین کی حقانیت کے قائل ہیں مگر ان کے لئے دین اور اہل دین سے استہزا کرنا ضروری ہے۔ نماز کا مذاق، روزہ کا مذاق، سادہ وضع اور لباس کے ساتھ تمسخر ان کا گویا ہر وقت کا مشغلہ ہے۔ بہرحال میں کہہ رہا تھا کہ سب سے بڑی شئے جو اور بہت سی دوسری خرابیوں کی بھی جڑ ہے وہ ہے قلب کا غافل ہونا۔ اس لئے جملہ دینی مفاسد سے نکلنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اس غفلت کو دور کرے۔ اور غفلت دور ہوتی ہے ذکر سے۔ اور ذکر بھی وہ جو قلب سے ہو اس لئے کہ غفلت قلب کی صفت ہے اور ذکر لسانی مجرد زبان کا فعل ہے۔ اور یہ عقلی مسئلہ ہے کہ جس جگہ مرض ہو اسی جگہ دوا کو بھی پہنچنا چاہئے۔ پس مرض تو ہو قلب میں اور آپ اس کی دوا لگائیں زبان پر ظاہر ہے کہ یہ صحیح طریقہ علاج کا نہ ہوگا۔ لہٰذا جہاں غفلت موجود ہے یعنی قلب میں وہیں ذکر کو بھی پہنچانا چاہئے یعنی ذکر قلبی کرنا چاہئے تب غفلت زائل ہوگی۔ اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ چونکہ ذکر لسانی ہے اس لئے وہ بھی ضروری ہے۔

اب قبل اس کے کہ میں ذکر کے معنی اور اس کے اقسام لسانی وقلبی کو کچھ تفصیل سے بیان کروں پہلے اس کی فرضیت اور ضرورت پر کچھ کلام کرنا چاہتا ہوں۔ سنئے حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی جو اپنے وقت کے ایک زبردست عالم، مفسر، محدث، فقیہ اور صوفی کامل تھے۔ اپنی تفسیر میں آیت شریفہ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا یعنی اے ایمان والو تم اللہ کو خوب کثرت سے یاد کرو۔ کے تحت لکھتے ہیں کہ:

قَالَ اِبْنُ عَبَّاسٍ اِنَّہٗ لَمْ یَفْرِضِ اللّٰہُ عَلٰی عِبَادِہٖ فَرِیْضَۃً اِلَّا جَعَلَ لَھَا حَدًّا مَعْلُوْمًا ثُمَّ عَذَرَ اَھْلَھَا فِیْ حَالِ الْعُذْرِ غَیْرَ الذِّکْرِ فَاِنَّہٗ	حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر کوئی فریضہ ایسا نہیں مقرر فرمایا جس کی حدود متعین نہ کردی ہو اور حالت عذر میں اس کے اہل کو ترک پر معذور نہ قرار دیا ہو سوائے ذکر کے کہ یہ ایک ایسا فریضہ ہے

لَمْ يَجْعَلْ لَهُ حَدًّا يُنْتَهَى إِلَيْهِ وَلَمْ يَعْذِرْ أَحَدًا فِي تَرْكِهِ إِلَّا مَغْلُوبًا عَلَى عَقْلِهِ فَأَمَرَ بِهِ فِي الْأَحْوَالِ كُلِّهَا فَقَالَ فَاذْكُرُوا اللهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِكُمْ وَقَالَ اذْكُرُوا اللهَ ذِكْرًا كَثِيرًا بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَالصِّحَّةِ وَالسُّقْمِ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ (تفسیر مظہری)

کہ اس کے ختم کی کوئی حد ہی نہیں بیان فرمائی اور نہ کسی کو اس کے ترک پر معذور ہی قرار دیا بجز مجنون کے چنانچہ تمام اوقات میں کرنے کا اس کو حکم دیا اور یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرو کھڑے کھڑے بھی بیٹھے بیٹھے بھی اور پہلو پر لیٹے لیٹے بھی اور یہ فرمایا کہ اللہ کو خوب کثرت سے یاد کرو یعنی رات میں، دن میں، خشکی میں، سمندر میں، صحت کی حالت میں اور بیماری میں، پوشیدہ طور پر اور علانیہ طور سے۔

علامہ نوویؒ نے اپنی کتاب ریاض الصالحین کے خطبہ میں فرمایا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ مُكَوِّرِ اللَّيْلِ عَلَى النَّهَارِ تَذْكِرَةً لِأُولِي الْقُلُوْبِ وَالْأَبْصَارِ وَتَبْصِرَةً لِذَوِي الْأَلْبَابِ وَالْاِعْتِبَارِ الَّذِيْ أَيْقَظَ مِنْ خَلْقِهِ مَنِ اصْطَفَاهُ فَزَهَّدَهُمْ فِي هٰذِهِ الدَّارِ وَشَغَلَهُمْ بِمُرَاقَبَتِهِ وَإِدَامَةِ الْأَفْكَارِ وَمُلَازَمَةِ الْاِتِّعَاظِ وَالْاِدِّكَارِ الخ

تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں جو یکتا ہے اور قاہر ہے غالب ہے اور ستار الذنوب ہے۔ رات کو دن پر داخل کرنے والا ہے تاکہ یہ امر اصحاب قلوب اور اہل بصیرت کے لئے تذکرہ کا سبب بنے نیز عقلاء اور اہل فہم کے لئے سبب بصیرت ہو وہ خدا جس نے کہ اپنی مخلوقات میں سے ایک جماعت کو منتخب کرلیا اور ان کو اس دنیا دنی سے زاہد اور بے رغبت بناکر ان کو اپنے ہی ذات کے مراقبہ اور اپنی مصنوعات میں ادامۃ فکر کے لئے اور ہر واقعہ سے نصیحت حاصل کرنے نیز ہر بھول کے بعد یاد کرنے اور ہر غفلت کے بعد متنبہ ہوجانے میں مشغول فرمادیا۔

اس میں افتکار کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی مصنوعات میں تفکر کرنا اور ان سے حق تعالیٰ کی الوہیت اور ان کے قدرت عظیمہ پر استدلال کرنا۔ اس کے تحت صاحب دلیل الفالحین لکھتے ہیں کہ:

قَالَ تَعَالَى إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِيْنَ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بیشک آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں نشانیاں ہیں اہل فہم کے لئے۔ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں حالت قیام میں بھی اور

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْاٰيَة. وَفِي الْحَدِيْثِ تَفَكَّرُوْا فِيْ آلَاءِ اللّٰهِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ. وَجَاءَ بِلَفْظِ تَفَكَّرُوْا فِي الْخَلْقِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِي الْخَالِقِ فَاِنَّكُمْ لَا تَقْدِرُوْنَ قَدْرَهٗ وَفِي الْحَدِيْثِ اَيْضًا مَرْفُوْعًا كَمَا فِي الْكَشَّافِ بَيْنَمَا رَجُلٌ مُسْتَلْقٍ فِيْ فِرَاشِهٖ اِذْ رَفَعَ رَأْسَهٗ اِلَى النُّجُوْمِ وَاِلَى السَّمَاءِ فَقَالَ اَشْهَدُ اَنَّ لَكَ رَبًّا وَخَالِقًا اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ فَنَظَرَ اللّٰهُ اِلَيْهِ فَغَفَرَ لَهٗ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا عِبَادَةَ كَالتَّفَكُّرِ وَقِيْلَ الْفِكْرَةُ تُذْهِبُ الْغَفْلَةَ وَتُحْدِثُ لِلْقَلْبِ الْخَشْيَةَ كَمَا تُحْدِثُ الْمَاءُ لِلزَّرْعِ النَّبَاتَ وَمَا جُلِيَتِ الْقُلُوْبُ بِمِثْلِ الْاَحْزَانِ وَلَا اسْتَنَارَتْ بِمِثْلِ الْفِكْرَةِ.

حالت قعود میں بھی اور پہلو پر لیٹے ہوئے بھی اور آسمانوں اور زمینوں میں تفکر کرتے ہیں۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں تفکر کیا کرو لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات میں مت تفکر کرو نیز ان لفظوں میں بھی وارد ہے کہ خلق میں تفکر کرو اور خالق میں نہیں اس لئے کہ تم اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور حدیث میں یہ بھی آیا ہے جیسا کہ کشاف میں ہے کہ ایک شخص شب کے وقت اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا کہ اچانک اس نے اپنی نظر کو تاروں کی جانب اٹھایا اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ بیشک تیرا کوئی رب ضرور ہے پھر کہا کہ اے اللہ مجھے بخش دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی جانب نظر رحمت فرمائی اور اس کی مغفرت فرما دی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فکر کی طرح کوئی دوسری عبادت نہیں ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ تفکر غفلت کو دور کرتا ہے اور قلب میں خشیت پیدا کرتا ہے جس طرح کہ پانی کھیت میں پودا اگاتا ہے۔ اور حزن یعنی رنج و غم سے بڑھ کر کوئی شے قلب کا جلا کرنے والی نہیں۔ اور فکر سے زیادہ کوئی چیز قلب کے لئے روشنی بخش نہیں۔

وَقَدْ رُوِيَ اَنَّ يُوْنُسَ كَانَ يُرْفَعُ لَهٗ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ مِثْلُ عَمَلِ اَهْلِ الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا كَانَ ذٰلِكَ التَّفَكُّرُ فِيْ اَمْرِ اللّٰهِ الَّذِيْ هُوَ عَمَلُ الْقَلْبِ لِاَنَّ اَحَدًا لَا يَقْدِرُ اَنْ يَعْمَلَ بِجَوَارِحِهٖ فِي الْيَوْمِ مِثْلَ عَمَلِ اَهْلِ الْاَرْضِ.

روایت ہے کہ حضرت یونس کا اتنا عمل ہر روز اوپر کو اٹھایا جاتا تھا جتنا کہ روئے زمین بھر کا عمل ہوتا تھا۔ علماء نے فرمایا ہے کہ یہ وہی تفکر فی امر اللہ ہے جو کہ ایک قلبی عمل ہے اس لئے کہ کوئی شخص بھی اپنے ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء بدن سے ایک دن میں تمام روئے زمین والوں کے برابر عمل تو کر ہی نہیں سکتا (لامحالہ یہ کوئی دوسرا ہی عمل ہے)۔

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَّاَبُو الدَّرْدَاءِؓ فِکْرَۃُ سَاعَۃٍ خَیْرٌ مِّنْ قِیَامِ لَیْلَۃٍ قَالَ السَّرِیُّ السَّقَطِیُّ فِکْرَۃُ سَاعَۃٍ خَیْرٌ مِّنْ عِبَادَۃِ سَنَۃٍ مَا ھُوَ اِلَّا اَنْ تَحُلَّ اَطْنَابَ خَیْمَتِکَ فَتَجْعَلَھَا فِی الْجَنَّۃِ (دلیل الفالحین ص ۱۹۵)

حضرت ابن عباسؓ اور ابو درداءؓ سے مروی ہے کہ گھڑی بھر کی فکر ساری رات کے قیام سے بہتر ہے حضرت سری سقطی فرماتے ہیں کہ ایک ساعت کی فکر ایک سال کی عبادت سے بڑھ کر ہے اور اس کی مثال بس ایسی سمجھو کہ جیسے تم اپنے خیمے کی رسیاں کھولو اور جنت میں اس کو نصب کرو۔

علماء کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ تفکر جو کہ ایک قلبی عمل ہے اس کا درجہ کس قدر ہے کہ عمل جوارح میں سے کوئی اس کو نہیں پا سکتا یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے بھی جگہ جگہ اس کا حکم دیا ہے اور اس پر عمل کرنے والوں کی مدح فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ:

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰٓی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ○ (پ ۲۴ ع ۲)

اللہ ہی قبض کرتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اور ان جانوں کو بھی کہ جن کی موت نہیں آئی ان کے سونے کے وقت پھر ان جانوں کو تو روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم فرما چکا ہے اور باقی جانوں کو ایک میعاد تک کے لئے رہا کر دیتا ہے اس میں ان لوگوں کے لئے جو کہ سوچنے کے عادی ہیں دلائل ہیں۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ:

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ○ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا ○ یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِھَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ○ (پ ۱۴ ع ۱۵)

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈالی کہ تو پہاڑوں میں گھر بنالے اور درختوں میں اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں۔ پھر ہر قسم کے پھلوں کو چوستی پھر۔ پھر اپنے رب کے رستوں میں چل جو آسان ہیں۔ اس کے پیٹ میں سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کی رنگتیں مختلف ہوتی ہیں کہ اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی دلیل ہے جو سوچتے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے کہ:

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (پ ۱۴ ع ۸)

وہ ایسا ہے جس نے تمھارے واسطے آسمان سے پانی برسایا جس سے تم کو پینے کو ملتا ہے اور جس سے درخت ہیں جن میں تم چرنے کو چھوڑ دیتے ہو اس سے تمھارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے بیشک اس میں سوچنے والوں کے لئے دلیل ہے۔

ایک اور جگہ یوں فرماتے ہیں کہ:

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (پ ۱۳ ع ۷)

اور وہ ایسا ہے کہ اس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسم کے پیدا کیے شب سے دن کو چھپا دیا ان امور میں سوچنے والوں کے واسطے دلائل ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں کہ:

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (پ ۱۱ ع ۷)

بس دنیوی زندگی کی حالت تو ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کی نباتات جن کو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں خوب گنجان ہو کر نکلے۔ یہاں تک کہ جب وہ زمین اپنی رونق کا پورا حصہ لے چکی اور اس کی خوب زیبائش ہو گئی اور اس کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب ہم اس پر بالکل قابض ہو چکے ہیں تو دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حادثہ آ پڑا سو ہم نے اس کو ایسا صاف کر دیا کہ گویا کل وہ موجود ہی نہ تھی ہم اسی طرح آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ:

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْکُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○ وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ○ (پ ۲۵ ع ۱۸)

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے دریا کو مسخر بنایا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کی روزی تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔ اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا بیشک ان باتوں میں ان لوگوں کے لئے دلیل ہے جو غور کرتے رہتے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ○ (پ ۲۱ ع ۶)

اور اسی کی نشانیوں میں یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے۔ اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی۔ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔

دیکھئے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے دلائل بیان کر کے ہر جگہ آخر میں یہ فرمایا کہ یہ دلائل اس قوم کے لئے ہیں جو فکر کرتی ہے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ ایک قوم ہمیشہ ایسی موجود رہے گی جس کا کام ہی ذکر و فکر کرنا ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ قوم یہی حضرات صوفیہ ہیں۔

مشائخ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر کی دو قسمیں ہیں ایک لسانی دوسرا قلبی۔ ان میں ذکر لسانی کو تو سب جانتے ہیں کہ زبان سے ذکر کرنے کو ذکر لسانی کہا جاتا ہے لیکن ذکر قلبی کی حقیقت سے کم لوگ واقف ہیں اس کا مفہوم عوام تو عوام بہت سے خواص اور اہل علم بھی نہیں جانتے اور چونکہ لسانی ذکر آسان ہے اس لئے لوگ اسی پر قناعت کرتے ہیں اور دشوار ہونے کی وجہ سے ذکر قلبی کی حقیقت معلوم کرنے کی بھی فکر نہیں ہوتی۔ حالانکہ اللہ کے نیک بندوں کا ذکر کبھی ایسا نہیں رہا کہ وہ صرف زبان سے ذکر کر لیتے ہوں اور قلب تک اس کو پہنچانے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔

دیکھتا ہوں کہ آج پڑھے لکھے لوگ بھی ذکر کا تعلق صرف لسان سے سمجھے ہوئے ہیں اور جہاں ذکر قلبی کا نام سنا اور گھبرا گئے مشکل ہونے کے سبب اس پر آتے نہیں اور اس کو سمجھنا بھی نہیں

چاہتے کیونکہ جس گاؤں جانا نہیں اس کا رستہ کیا پوچھنا۔ حالانکہ یہ مسئلہ ایسا کچھ دشوار نہ تھا۔ حضرات صوفیہ جس چیز کو نسبت ملکۂ یادداشت اور ذکر قلبی کہتے ہیں علماء ظاہر اس کو فکر کہتے ہیں اور اہل دنیا کے نزدیک اسی چیز کا نام محبت ہے۔ دھیان، تعلق اور ربط وغیرہ ہے۔ پھر جب اہل محاورہ اپنی زبان میں دلی تعلق، قلبی محبت اور رشتہ دل وغیرہ کے الفاظ بولتے ہیں اور اس کو سمجھا جاتا ہے تو اگر خدا کے ذکر کا تعلق بھی قلب سے جوڑ کر اس کو ذکر قلبی کہہ دیا جائے تو یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی؟

بات یہ ہے کہ طریق سے بے مناسبتی اور اہل طریق کی کمی کی وجہ سے یہ سب امور آج ہمارے لئے اجنبی ہو کر رہ گئے ہیں حالانکہ یہی فکر اور ذکر قلبی جسکی حقیقت آپ نے ابھی معلوم کی۔ سب اذکار کی اصل ہے اور جملہ امور اسی پر دائر ہیں اور قلب کی حقیقی آبادی اسی کی وجہ سے ہے۔ یہی مومن کا وہ ایمان ہے جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں میں دعا فرمائی تھی اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا یُّبَاشِرُ قَلْبِیْ یعنی اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ایسے ایمان کا جو بذات خود قلب کو ابھارے اور آمادہ کرے اور ظاہر ہے کہ جب ایمان قلب کو برابر حرکت دیتا رہے گا تو پھر اس کے بعد اس قلب میں غفلت کیسے باقی رہ سکتی ہے اور خوف و خشیت سے ایسا قلب کیسے خالی رہ سکتا ہے۔

چنانچہ جس طرح علماء نے فکر کے متعلق لکھا ہے کہ یہ افضل الذکر ہے اور سائر وجوہ ذکر اسی پر مبنی ہیں۔ اسی طرح سے مشائخ نے ایمان کے متعلق بھی لکھا ہے کہ سلوک میں بھی اصل رہبر یہی ایمان ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی فتح الربانی میں فرماتے ہیں:

یَا غُلَامُ تَحْتَاجُ اِلَی الْاِیْمَانِ یُسَیِّرُکَ اِلٰی طَرِیْقِ الْحَقِّ عَزَّوَجَلَّ وَاِلَی الْاِیْقَانِ یُثَبِّتُکَ فِیْھَا۔ (ص۳۰)	صاحبزادے! تم کو اولاً ایمان کی حاجت ہے جو تمہیں طریق حق کی جانب لے چلے اسی طرح سے تمہیں ایقان کی بھی ضرورت ہے جو تمہیں اس طریق میں ثابت قدم رکھے۔

اس سے بحمد اللہ ہمارا مدعا باحسن وجوہ ثابت ہو گیا کہ ایمان خود ذکر قلبی ہے اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ تَرْجُوْ رَحْمَتَکَ وَنَخْشٰی عَذَابَکَ میں جو رجاء اور خشیت کا ذکر آیا ہے یا یَرْجُوْنَ رَحْمَتَہٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَہٗ میں جو رجاء اور خوف کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ یہ سب کیفیات قلبیہ کے نام ہیں کیونکہ رجاء امید اور خوف و خشیت یعنی وہ ڈر جو کسی ضرر کے احتمال سے مومن کے قلب میں ہوتا ہے یہ سب چیزیں بھی ذکر قلبی ہی کا فرد ہیں۔

الغرض مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ ذکر قلبی حضرات صوفیہ کی اپنی کوئی جدید اصطلاح نہیں ہے بلکہ کتاب و سنت ہی میں آئی ہوئی چیز ہے۔ باقی ان حضرات کو چونکہ قلب کا زیادہ اہتمام رہتا ہے اس لئے اس کی بحث ان کے یہاں اکثر اور مہتم بالشان ہو جاتی ہے۔

ناقل عرض کرتا ہے کہ

حضرت والا اکثر فرماتے تھے کہ جی چاہتا ہے کہ ذکر پر مفصل کلام کروں چنانچہ مختلف مجالس میں فرماتے بھی تھے لیکن جس بسط کے ساتھ اس پر سیر حاصل کلام فرمانا چاہتے تھے اس کا موقع نہ آتا۔ یہاں تک کہ بیماری کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ انھیں دنوں ایک صاحب نے اپنے ایک عزیز کا (جو کہ مکہ مکرمہ میں رہتے ہیں) خط سنایا اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ:

"حضرت صاحب کے رسائل یہاں احباب نے بہت پسند کئے بعض دوستوں نے مجھ سے انھیں طلب بھی کیا ہے۔ لہذا آنے والے حاجی صاحبان سے ہر کتاب کے چند نسخے بھجوا دیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ دستی ہی بھیجیں ڈاک سے نہیں اس لئے کہ یہاں کی حکومت کا تصوف کے بارے میں کچھ خیال اچھا نہیں ہے۔ اس لئے ایسی کتابیں روک دی جاتی ہیں۔ مجھے نہ مل سکیں گی۔"

ان صاحب نے تو اس خیال سے خط پیش کیا تھا کہ حضرت والا اس سے مسرور ہوں گے لیکن حضرت کو اس سے تکلیف ہوگئی۔ خط پڑھ کر فرمایا کہ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ؎

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

اور حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آخر یہ حکومت تصوف کے کیوں خلاف ہے۔ تصوف میں کون سی بری بات ہے۔ پھر فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نجدی لوگ بالکل ناواقف ہیں کسی حقیقی صوفی سے ان کی بھینٹ نہیں ہوئی اور تحقیق کی ان کو فرصت کہاں؟ اچھا اگر میں چل کر تصوف ہی پر گفتگو کروں اور اس کے ثبوت میں قرآن و حدیث پڑھنے لگوں تو کیا وہ لوگ اس کا بھی انکار کر دیں گے؟ اچھا قرآن شریف میں جو آتا ہے کہ يَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ یہ کیا ہے؟ یا یہ آتا ہے کہ هُمْ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ یہ کیا ہے؟ اسی طرح سے یہ جو فرمایا ہے کہ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ یہ کیا ہے؟

اور حدیث شریف میں جو آتا ہے کہ الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ الخ یہ کیا ہے؟ اور فرمایا ہے کہ انما الاعمال بالنیات یہ کیا ہے؟

اور امام مالک صاحب جو کہ تابعی ہیں مدنی ہیں امام دار الھجرۃ ہیں وہ جو فرما رہے ہیں کہ مَنْ تَفَقَّهَ وَلَمْ يَتَصَوَّفْ فَقَدْ تَفَسَّقَ یہ کیا ہے؟ اس سے تو معلوم ہوا کہ وہ بھی تصوف کی

ضرورت کے قائل ہیں پھر یہ بدعت کیونکر ہوا۔ غرض اس طرح سے انتہائی جوش میں تاثرات کا دیر تک اظہار فرماتے رہے۔

حسن اتفاق کہ ان ہی دنوں مجلس میں ذکر اللہ پر گفتگو کئی دنوں سے چل رہی تھی اور حضرت والا نے اپنی خواہش دیرینہ کے مطابق ہم لوگوں کو ہدایت فرما رکھی تھی کہ اس مضمون کو اہتمام کے ساتھ لکھیں۔ اس واقعہ کے بعد راقم سے فرمایا کہ وہ ذکر اللہ کا مضمون تم لکھ رہے ہو یا نہیں؟ اس پر حاضرین میں سے کوئی صاحب بولے کہ سبحان اللہ ذکر کا مضمون نہایت ہی عمدہ بیان ہو رہا ہے۔ یکجا جمع ہو جانا نہایت ضروری ہے۔ یہ سن کر ان صاحب سے فرمایا کہ پھر آپ ہی ان سے کہئے کہ اس کو یہ لکھیں۔ شاید آپ کے کہنے سے یہ لکھ لیں۔ پھر راقم کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا اس کو جلد لکھواور مجھے دکھلاؤ میں جلد سے جلد اس کو شایع کرنا چاہتا ہوں اور اسی کو لے کر وہاں چلوں گا اور اہل عرب کے سامنے اس کو پیش کروں گا۔ وہ لوگ زبان داں ہیں ان مضامین کو وہ لوگ خوب سمجھیں گے۔

راقم نے بمعیت مولانا عبدالحلیم صاحب اس مضمون کو صاف کیا اور حضرت والا کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت والا نے حرف بحرف ملاحظہ کر کے فرمایا کہ ٹھیک تو ہے۔ قریب قریب سب باتیں آگئیں۔ الحمد للہ اس سلسلے میں جو چاہتا تھا وہ سب کلام یکجا جمع ہو گیا ہے۔ اور پھر فرمایا اچھا اس کو جلد طبع کراؤ۔

ظاہر ہے کہ اگر قیام الہ آباد میں ہوتا تو جلد سے جلد طبع کرایا جا سکتا تھا لیکن بمبئی میں ہونے کی وجہ سے جن لوگوں کے تعلقات کاتب اور پریس والوں سے تھے ان سے کہا تو انھوں نے جواب دیا کہ وقت بہت تنگ ہے۔ اتنی مدت میں اتنے طویل مضمون کی طباعت تو کیا کتابت بھی ناممکن ہے اس لئے اس وقت تو یہ مضمون طبع نہ ہو سکا اور سفر سے واپسی کے بعد اب تک بھی اس کی نوبت نہ آسکی۔ سچ ہے کل امر مرھون باوقاتہ۔ جب کسی کام کا وقت آتا ہے تبھی وہ انجام کو پہنچتا ہے۔ الحمد للہ کہ آج ہم حضرت اقدس کے اس گراں قدر مضمون کو ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ اور حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کے دیگر رسائل کی مناسبت سے اس کا نام **وصیۃ الذکر** مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور جس طرح سے کہ یہ مضمون (ذکر اللہ) حضرت کا آخری مضمون ہے اسی طرح ہم سب مسلمانوں کا آخری کلام بھی اپنے ذکر کو بنائے۔

جب دم واپسیں ہو یا اللہ   لب پہ ہو لا الہ الا اللہ

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام قارئین کے قلوب کو اپنے ذکر کے انوار سے بھر دے اور ہم سب کو ذکر قلبی کی دولت سے مالا مال فرمائیں بجاہ سید الانبیا افضل الرسل رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ

وَصِیَّۃُ الذِّکْرِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مشکوٰۃ شریف میں یہ روایت آئی ہے۔

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِخَیْرِ اَعْمَالِکُمْ وَاَزْکَاھَا عِنْدَ مَلِیْکِکُمْ وَاَرْفَعِھَا فِیْ دَرَجَاتِکُمْ وَخَیْرٌ لَّکُمْ مِنْ اِنْفَاقِ الذَّھَبِ وَالْوَرِقِ وَخَیْرٌ لَّکُمْ مِنْ اَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّکُمْ فَتَضْرِبُوْا اَعْنَاقَکُمْ قَالُوْا بَلٰی قَالَ ذِکْرُ اللّٰہِ

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کیا میں تم کو ایک ایسے عمل کی خبر نہ دوں جو تمھارے سب اعمال سے بہتر ہو اور تمھارے مالک کے نزدیک سب میں پسندیدہ ہو اور تمھارے درجات کا بڑھانے والا ہو اور تمھارے لئے چاندی اور سونے کے خرچ کرنے سے کہیں بہتر ہو۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ہو کہ تم اپنے دشمنوں سے ملو اور ان کی گردنیں مارو اور وہ تمھاری گردنیں ماریں (یعنی خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے بھی بڑھ کر ہے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ضرور ارشاد فرمائیے آپ نے فرمایا کہ وہ عمل ذکر اللہ ہے۔

اب جب کہ حدیث شریف میں ذکر اللہ کی اتنی فضیلت آئی ہے تو پھر تو ہم کو اس کا مفہوم سمجھنا ہوگا۔

علماء نے بھی ذکر اللہ کے متعلق نہایت عمدہ کلام کیا ہے چنانچہ صاحب ترصیع لکھتے ہیں کہ:

اِعْلَمْ اَنَّ اَسْرَعَ الطَّاعَاتِ فِیْ جِلَاءِ الْقَلْبِ وَتَنْوِیْرِہٖ وَتَبْدِیْلِ الْاَوْصَافِ الرَّدِیَّۃِ بِالْاَوْصَافِ الْحَمِیْدَۃِ ذِکْرُ اللّٰہِ تَعَالٰی قَالَ تَعَالٰی اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ وَقَالُوْا اِنَّ عَمَلَ الذِّکْرِ فِیْ جِلَاءِ الْقَلْبِ عَمَلُ الرَّمَلِ فِیْ جِلَاءِ النُّحَاسِ وَعَمَلُ بَقِیَّۃِ الطَّاعَاتِ فِیْ جِلَائِہٖ عَمَلُ الصَّابُوْنِ

فی جلاءِ النحاس (ترجمہ منہ)

یعنی قلب کے جلار اور اس کی تنویر اور اس کے رذائل کو مبدل بفضائل کرنے میں سب طاعتوں سے بڑھ کر موثر ذکر اللہ ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نماز تمام خواہش اور برائیوں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر تو بہت بڑی چیز ہے۔ علمار نے فرمایا ہے کہ قلب کی صفائی کے باب میں ذکر وہ کام کرتا ہے جو تانبا کے صاف کرنے میں ریت کرتی ہے اور دیگر طاعات کا اثر جلار قلب کے باب میں ایسا ہوتا ہے جیسے تانبے کی صفائی کے لئے صابون استعمال کیا جائے۔ مطلب یہ کہ اس کے ذریعہ اوپر اوپر کی تو صفائی ہو جائے گی مگر ریت تو اس کے جمے ہوئے زنگ کو کھرچ کر نکال پھینکتا ہے اور اس کو چمکا دیتا ہے۔

اس سلسلے میں جستجو ہوئی کہ ذکر اللہ کا مصداق معلوم کیا جائے تو سب سے عمدہ اور جامع بیان ابوبکر جصاص رازیؒ کا ملا جسے انھوں نے آیۂ کریمہ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ اور أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ کی تفسیر میں نقل فرمایا ہے۔ وھو ہذا۔

(فَاذْكُرُونِي) قَدْ تَضَمَّنَ الْأَمْرُ بِسَائِرِ وُجُوهِ الذِّكْرِ مِنْهَا سَائِرُ وُجُوهِ طَاعَتِهٖ وَهُوَ أَعَمُّ الذِّكْرِ وَمِنْهَا ذِكْرُهٗ بِاللِّسَانِ عَلٰى وَجْهِ التَّعْظِيْمِ وَالثَّنَاءِ عَلَيْهِ وَالذِّكْرُ عَلٰى وَجْهِ الشُّكْرِ وَالْاِعْتِرَافِ بِنِعَمِهٖ وَمِنْهَا ذِكْرُهٗ بِدُعَاءِ النَّاسِ إِلَيْهِ وَالتَّنْبِيْهُ عَلٰى دَلَائِلِهٖ وَحُجَجِهٖ وَوَحْدَانِيَّتِهٖ وَحِكْمَتِهٖ وَذِكْرُهٗ بِالْفِكْرِ فِيْ دَلَائِلِهٖ وَآيَاتِهٖ وَقُدْرَتِهٖ وَعَظَمَتِهٖ وَهٰذَا أَفْضَلُ الذِّكْرِ وَسَائِرُ وُجُوْهِ الذِّكْرِ مَبْنِيَّةٌ عَلَيْهِ وَتَابِعَةٌ لَهٗ وَبِهٖ يَصِحُّ مَعْنَاهَا لِأَنَّ الْيَقِيْنَ وَالطُّمَانِيْنَةَ بِهٖ تَكُوْنُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ يَعْنِيْ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ ذِكْرُ الْقُلُوْبِ الَّذِيْ هُوَ الْفِكْرُ فِيْ دَلَائِلِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَحُجَجِهٖ وَآيَاتِهٖ وَبَيِّنَاتِهٖ وَكُلَّمَا ازْدَادَتْ فِيْهَا فِكْرًا ازْدَادَتْ طُمَانِيْنَةً وَسُكُوْنًا وَهٰذَا هُوَ أَفْضَلُ الذِّكْرِ لِأَنَّ سَائِرَ الْأَذْكَارِ إِنَّمَا يَصِحُّ وَيَثْبُتُ حُكْمُهَا بِثُبُوْتِهٖ۔ (احکام القرآن ص۹۳ ج ۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَاذْكُرُونِي میں ذکر کا جو امر ہے وہ تمام طرق ذکر کو متضمن ہے منجملہ ان کے حق تعالیٰ کی جملہ طاعات ہیں اور یہ ذکر سب اذکار سے عام ہے۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کو زبان سے یاد کرنا بطور ثنا اور تعظیم کے یہ بھی ذکر ہے اور بطور شکر کے ذکر کرنا اور اس کی نعمتوں کا اعتراف کرنا یہ بھی ذکر ہے نیز منجملہ ذکر ہی کے کسی شخص کا لوگوں کو اللہ

تعالیٰ کی جانب دعوت دینا اور اس کے وجوب وجود کے دلائل پر تنبیہ کرنا اور اس کی حکمتوں کو بیان کرنا بھی ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ کے دلائل اور ان کی آیات اور قدرت وعظمت میں تفکر کرنا یہ بھی ذکر ہے بلکہ افضل الذکر ہے اور دیگر وجوہ ذکر اسی پر مبنی اور اس کے تابع ہیں چنانچہ اسی کے ذریعہ ان سب کے معنی کی صحت ہوتی ہے اس لئے کہ یقین وطمانیت اسی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے تو یوں تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں باقی معنی اس کے یہی ہیں کہ ذکر قلب جس کا دوسرا نام اللہ تعالیٰ کے دلائل اس کے حجج اور آیات اور اس کی بینات میں غور وفکر کرنا ہے۔ اسی ذکر قلبی سے قلوب کو اطمینان ہوتا ہے۔ تم ان سب میں جس قدر زیادہ اپنی فکر کو بڑھاؤ گے اسی قدر طمانیت اور سکون کو بڑھتا ہوا پاؤ گے اور یہی افضل الذکر ہے اس لئے کہ اور دوسرے اذکار کی صحت اور ان کے حکم کا ثبوت اسی سے ہوتا ہے۔

دیکھئے یہاں امام رازیؒ نے ذکر کے اقسام بیان فرمائے اور اس کی ایک قسم جملہ طاعات یعنی نماز روزہ زکوٰۃ وحج وغیرہ بھی ہے اسی طرح ایک قسم ثنا اور تعظیم کے طور پر زبان سے ذکر کرنا بھی ہے نیز لوگوں کو اپنے وعظ وتبلیغ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی جانب دعوت دینا یا اللہ تعالیٰ کی توحید کے دلائل بیان کرنا یہ سب ہی ذکر میں داخل ہیں۔ اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کے دلائل وآیات، اس کی قدرت وعظمت میں فکر کرنا یہ فکر بھی ذکر ہی کی ایک قسم بلکہ اس کی اعلیٰ فرد ہے۔ اور یہ جملہ انواع ذکر سے افضل ہے کیونکہ بقیہ اور قسمیں ذکر کی اسی قسم پر مبنی اور اسی کے تابع ہیں بلکہ ان سب کے معنی کی صحت اسی سے ہوتی ہے اس لئے کہ ذکر کا جو اثر ہے یعنی یقین قلبی اور طمانیت اس کا حصول اسی ذکر قلبی سے ہوتا ہے جس کا دوسرا نام فکر ہے۔

امام رازیؒ کی اس تفسیر سے بڑی بصیرت ہوئی وہ یہ کہ ذکر کے متعلق تفصیلی معلومات ہو گئیں کہ مطلق ذکر کی بہت سی انواع ہیں ان سب پر ذکر کا اطلاق ہوتا ہے گو ان چیزوں میں سے بعض زبان کا وظیفہ ہیں بعض دیگر جوارح کا اور بعض قلب کا کیونکہ اس میں جملہ طاعات کو بھی ذکر کہا گیا ہے اور ثنا وتعظیم کے طور پر زبان سے ذکر کرنے کو بھی ذکر کہا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے آیات اور اسکی قدرت میں فکر کرنے کو بھی ذکر کہا گیا ہے اور اس آخری قسم کو سب سے افضل اس لئے کہا ہے کہ یہ قلب کا وظیفہ ہے اور قلب امیر البدن اور رئیس الجوارح ہے اور امیر کی صلاح سے رعیت کی صلاح وابستہ ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

ذکر قلبی افضل ترین ذکر ہے

اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ (بخاری شریف)

یعنی آگاہ ہوجاؤ کہ انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو تمام بدن درست رہتا ہے اور جب وہ فاسد ہوجاتا ہے تو سارا بدن فاسد ہوجاتا ہے اور سن لو کہ وہ گوشت کا ٹکڑا انسان کا قلب ہے۔

اس کے تحت صاحبِ فتح الباری لکھتے ہیں:

وَخُصَّ الْقَلْبُ بِذٰلِکَ لِاَنَّہٗ اَمِیْرُ الْبَدَنِ وَبِصَلَاحِ الْاَمِیْرِ تَصْلُحُ الرَّعِیَّۃُ وَبِفَسَادِہٖ تَفْسُدُ وَفِیْہِ تَنْبِیْہٌ عَلٰی تَعْظِیْمِ قَدْرِ الْقَلْبِ وَالْحَثُّ عَلٰی صَلَاحِہٖ وَالْمُرَادُ الْمُتَعَلِّقُ مِنَ الْفَہْمِ الَّذِیْ رَکَّبَہُ اللّٰہُ فِیْہِ (فتح الباری ط۹۶ ج ۱)

یعنی قلب کو اس مرتبہ کے ساتھ اس لئے خاص کیا کہ وہ امیر البدن ہے اور امیر کی صلاح سے رعیت کی صلاح وابستہ ہوتی ہے آگے صاحب فتح الباری فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں قدر قلب کی تعظیم پر تنبیہ ہے یعنی انسان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو قلب عطا فرمایا ہے تم اس کی قدر کرو اور اسے کوئی معمولی چیز نہ سمجھو بلکہ یہ بہت عظیم المرتبت چیز ہے اور جوارح کی اصل اور ان کا امیر ہے اس لئے اس کی صلاح کی فکر کرو باقی مراد یہاں قلب سے قلب کی وہ فہم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس میں ودیعت فرمایا ہے۔

پس قلب چونکہ تمام اعضاء کا سردار ہے اس لئے اس کا وظیفہ یعنی ذکر جس کا دوسرا نام ذکر قلبی بھی ہے جملہ انواع اذکار سے بڑھا ہوا ہے اور ان کا منتہا ہے اور ذکر کا جو حقیقی اثر ہے یعنی یقین قلبی اور طمانینت وہ اسی ذکر قلبی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے حضرت جصاص رازیؒ نے اس کو اصل اور مبنیٰ اور دیگر انواع اذکار کو اس کا تابع فرمایا ہے۔

الغرض جب ذکر ان تمام انواع کو شامل ہے اور اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عام تشریع فرمارہے ہیں تو ظاہر یہی ہے کہ یہاں بھی ذکر سے اس کے عام معنی مراد ہیں جو ذکر لسانی کو بھی شامل ہے اور ذکر قلبی اگرچہ درجہ میں اس سے بڑھا ہوا ہے لیکن ذکر لسانی بھی کچھ کم چیز نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس کو درمیان سے مطلقاً ساقط کردیا ہے نصوص اور تصریحات علماء محققین کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔

(اور یہ بالکل ظاہر بات بھی ہے کیونکہ ذکر لسانی جبکہ اسا س درمیا دہے ذکر قلبی کی اور اسکے حصول کا ذریعہ ہے تو ذکر کے مفہوم سے وہ خارج کیونکر ہوجائیگا۔ ذکر کا فرد تو وہ بھی ہے لیکن اصل اور اعلیٰ فرد اس کا بیشک ذکر قلبی ہے جس طرح

ہے کہ بنیاد اور دیواریں بھی جزو مکان تو ہیں مگر اصل مکان تو اندر اور پر ہی کا حصہ کہلاتا ہے جس کا تعلق رہائش سے ہوتا ہے)

چنانچہ حضرت مولنا محمد گنگوہی اپنے ایک مکتوب میں کسی طالب کو تحریر فرماتے ہیں کہ ذکر ایسی شے ہے کہ اگر اس کو کرتا رہے اگرچہ بے ہوشی خاطر اور پریشانی تعلقات میں محض تحریک لسانی ہو نافع اور موجب نورانیت قلب کے ہوتا ہے . . . یہ محض لسانی غفلت کا ذکر کشاں کشاں قلب تک پہونچا دیتا ہے . عضو لسان اگر جنت میں جائیگا تو گیا دیگر اعضا محل نار ہو سکتے ہیں؟ ذکر وہ شے ہے کہ اگر کسی جزو انسانی سے متصل ہو ویگا تمام جسد کو اپنی طرف کھینچ لیوے گا۔

نیز صاحب فتح الباری تصریح فرماتے ہیں کہ مومن کی لسان پر دوزخ کی آگ کا کچھ بھی اثر نہ ہوگا۔ اس لئے کہ وہ ناطق بالتوحید رہ چکی ہے . اب اس سے بڑھ کر ذکر لسانی کی اور کیا فضیلت ہو سکتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ ذکر لسانی بھی معتبر ہے اور ذکر تو حقیقۃً لسان ہی کا وظیفہ ہے اور قلب سے جو ذکر ہوتا ہے اس کا نام فکر ہے . لیکن احکام القرآن سے ایسی جو ذکر لسانی کے معنی ہیں نے . تاہم اس میں اتنی قید ضرور ہے کہ زبان سے جو ذکر کیا جائے وہ علی وجہ التعظیم والثناء ہو یا علی وجہ الشکر والاعتراف ہو اس لئے کہ فقدان تعظیم نام خدا کو علماء نے عبادت کے لئے مخل قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اسم کو لا علی وجہ الخشوع و لا علی وجہ التعظیم لینے سے بچانے کو واجب قرار دیا ہے . چنانچہ اس سلسلہ میں مولانا دہلوی نے صراط مستقیم میں جو بیان فرمایا ہے وہ بہت ہی عمدہ کلام ہے . ذکر لسانی کی فضیلت پر میں نے اس سے بہتر کلام نہیں دیکھا یہاں اس کو نقل کرتا ہوں، فرماتے ہیں کہ :-

از عمدہ مخلات عبادت فقدان محبت وتعظیم نام خداست ہر چند ہر شخص را محبت وتعظیم نام خدا می باشد اما بحدیکہ موجب کامیابی شود و بوضعیکہ اکابر دین را بود نمی باشد۔ (صراط مستقیم ص ۱۸)

یعنی عبادت کے لئے سب سے بڑا مخل جو امر ہے وہ حق تعالیٰ کے نام مبارک کی تعظیم اور محبت سے قلب عابد (ذاکر) کا خالی ہونا ہے اور یوں تو اللہ تعالیٰ کے نام کی محبت اور عظمت سے کوئی بھی انسان خالی نہیں ہے مگر اتنی محبت جو کہ موجب کامیابی بن جائے اور ایسی محبت جیسی اکابر دین کو تھی سب کے اندر نہیں ہوتی۔

حاصل یہ کہ ذکر وعبادت سے انسان کا جو مقصود ہوگا اور جس درجہ کی اس میں نیت کریگا اسی درجہ کی تعظیم اور محبت حق تعالیٰ کی اس کے قلب میں پیدا ہوگی اور اس باب میں لوگوں کے مدارج مختلف ہیں اس لئے کہ

اغراض مختلف ہوتی ہیں۔ بعض کی دنیوی ہوتی ہیں بعض کی دینی ہوتی ہیں۔ پھر ان دونوں میں مراتب بیشمار ہیں اس کے بعد چند دینی و دنیوی اغراض بیان کرکے آخر میں فرماتے ہیں کہ:۔

پس بہترین نیات و اغراض در محبت و تعظیم نام پاک وے رضا جوئی وے است بنا مش جز رضائے وے ہیچ نخواہد و ہیچ مطلبے دنیوی و اخروی اجرت خود نداند بلکہ کمال انعام جلیل القدر کہ مقابل آں ہیچ نعمت دنیا و آخرت تواند شد ہمین است کہ توفیق و قوت ذکر نام پاک او یافت ہمیں انعام را بشرح و بسط تمام کہ صرف بقوت و توفیق اوست فہمیدہ در دل خود جا دادہ از تہ دل شاداں و ممنون احسان ایزدی باشد۔ (صراط مستقیم ص۹۳)

حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ کا نام پاک لیتے وقت سب سے عمدہ نیت اور بہترین غرض محبت اور تعظیم کے باب میں بس ان کی رضا جوئی کا خیال رکھنا ہے یعنی خدا کا نام لے کر اس کے ذریعہ بجز اس کی رضا اور خوشنودی کے اور کچھ نہ طلب کرے۔ (سعدی علیہ الرحمۃ نے خوب فرمایا ہے کہ ؎

خلاف طریقت بود کا ولیا
تمنا کنند از خدا جز خدا

یعنی طریقت کے خلاف یہ بات ہے کہ اولیا اللہ تعالیٰ سے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کچھ چاہیں) اور دنیا و آخرت کی کسی حاجت کو اپنے ذکر و طاعت کا صلہ نہ جانے بلکہ سب سے بڑا انعام گرانقدر جس کے مقابلہ میں دنیا و آخرت کی کوئی دوسری نعمت نہیں ہوسکتی اسی کو سمجھے کہ اس نے اپنے نام پاک کے لینے کی توفیق اور قوت عطا فرمائی۔ پس حق تعالیٰ کے اسی انعام کو جو کہ محض ان ہی کی توفیق اور قوت دینے سے حاصل ہوا ہے۔ جس قدر شرح و بسط کے ساتھ چاہیں سمجھ لیں اور اپنے دل میں اس کو جگہ دے کر بصمیم قلب مولیٰ تعالیٰ کے احسان کے ممنون ہوں اور اسکے انعام پر شاداں و فرحاں رہیں آگے اس شرح و بسط کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

شرح و بسط کے ساتھ قلب میں مستحضر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ذاکر پہلے ذکر کے مبادی و اسباب میں غور کرے کہ یہ سب چیزیں خدائے تعالیٰ ہی کا عطیہ ہیں۔ یعنی اس کے تمام جوارح جن میں لسان و قلب بھی داخل ہے اسی طرح سے

حواس ظاہرہ اور حواس باطنہ غرض جن جن امور کو ذکر میں دخل ہے وہ سب خدائی انعام عام ہیں اور آخر میں توفیق ذکر جو کہ خواص بندگان پر حق تعالیٰ کا خاص انعام ہوتا ہے وہ بھی ادھر ہی سے ہوا کرتی ہے۔ (ان سب امور میں غور کرے اگر اللہ تعالیٰ کے انعامات کو دیکھ کر مزید شکر کا داعیہ پیدا ہو اور مزید توفیق حاصل ہو)۔

کیونکہ کسی کی جانب سے انعام دیکھ کر اسکا ممنون احسان ہونا اور اس کا شکر ادا کرنا ایک فطری امر ہے اور شکر میں لسان یا قلب کی تخصیص نہیں ہے بلکہ انسان جب کسی کو اپنا محسن سمجھ لیتا ہے تو اسکا ہر بن مو اپنے محسن کا شکر گذار ہو جاتا ہے۔ اسی مضمون کو کسی شاعر نے خوب ادا کیا ہے کہتا ہے کہ ؎

اَفَادَتْکُمُ النَّعْمَاءُ مِنِّیْ ثَلَاثَۃً
یَدِیْ وَلِسَانِیْ وَالضَّمِیْرَ الْمُحَجَّبَا

یعنی فائدہ پہونچایا تم کو تمہارے انعامات نے میری جانب سے تین چیزوں کا میرے ہاتھ کا میری زبان کا اور میرے مخفی قلب کا یعنی اس کی وجہ سے میں ہاتھ سے بھی تمہارا شکر ادا کر رہا ہوں اور میری زبان بھی شکر گذار ہے اور میرا قلب بھی ادائے شکر میں مصروف ہے۔ بس اپنے انعام کرنے کی وجہ سے آپ نے گویا مجھے ہی خرید لیا اور اب میرے تمام اعضاء میرے نہیں رہے بلکہ آپکے ہو گئے۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ ادائے شکر کا ایک ذریعہ زبان بھی ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ شکر کے سارے طریقوں سے زبان کا شکر زیادہ ظاہر ہے کیونکہ ہاتھ کی حرکت میں دوسرے احتمالات بھی ہو سکتے ہیں اور قلب کا فعل دوسرے کو نظر نہیں آتا البتہ زبان سے جو شکر ادا کیا جاتا ہے وہ نہایت واضح ہوتا ہے اور اس کی دلالت اپنے معنی پر مطابقی ہوتی ہے۔ بس جب مخلوق کا شکر ادا کرنے میں زبان کا یہ مقام ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے اگر کوئی ذکر لسانی کرے تو وہ کیوں غیر معتبر ہوگا ہاں بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے جیسا کہ احکام القرآن میں ہے کہ وہ ذکر لسانی علی وجہ التعظیم والثناء اور ذکر علی وجہ الشکر والاعتراف والخشوع ہو اور یہ داعیہ پیدا ہوگا مبادی واسباب میں غور کرنے سے۔ یعنی یہ کہ انعام عام یعنی درستگی حواس ظاہرہ و باطنہ اور انعام خاص یعنی توفیق یہ سب خدا تعالیٰ

کی طرف سے ہے اگر ان کی توفیق شامل حال نہ ہو تو قلب و زبان فہم و دانش سب رکھی رہ جائے گی چنانچہ آگے فرماتے ہیں کہ :۔

بسا شخص است کہ ہمہ اعضاء و قوی و دل و زبان و فہم و دانش او درست باشد و ہزارہا تقاریر دنیوی و افکار معاشی بر زبان و دل او می گذرد و ہمتیکہ ارادہ ذکر زبانی یا فکر قلبی کردہ توجہ بخدائے تعالیٰ نماید ثقلے در زبان و وہمے در دلش پدید می آید کہ ہرگز بذکر و فکر نمی آید۔　　(صراط مستقیم ص۸۳)

چنانچہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جن کے تمام اعضاء و قوی دل و زبان فہم و دانش یہ سب چیزیں ٹھیک ہوتی ہیں اور دنیوی ہزاروں تقریریں اور امور معاش کی سیکڑوں اسکیمیں ان کے قلب و زبان پر رہتی ہیں لیکن ذکر زبانی یا فکر قلبی کے ذریعہ خدائے تعالیٰ کی جانب توجہ کرنے کا جب ارادہ کرتے ہیں تو زبان میں ثقل اور دل میں اِدھر اُدھر کے خیالات کچھ اس طرح سے مسلط ہو جاتے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے وہ ذکر و فکر پر قادر ہی نہیں ہوتا ہے۔ یعنی ذکر کی توفیق ہی سلب کر لی جاتی ہے اس لئے ہزار فہم و دانش اور صحت و قوت کے باوجود زبان پر اللہ کا نام نہیں آتا۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کے صرف زبان ہی پر اللہ تعالیٰ کا نام آجائے تو یہ دلیل اس امر کی ہے کہ اُدھر سے توفیق ہوئی ہے اس لئے یہ ذکر لسانی بھی کچھ چیز نہ ہوئی جیسا کہ آگے مولانا فرماتے ہیں کہ :۔

وبالجملہ صرف جریان نام خدا بر زبانِ انسان نعمتے است فخیم ہمیں انعام را بہترین انعامات دانستہ از طلب جزائے ثواب دیگر اغماض نماید بایں وجہ تعظیم و محبت اصل و بنیاد ہمہ کمال است۔　　(صراط مستقیم ص۸۳)

حاصل کلام یہ کہ حق تعالیٰ کے نام مبارک کا صرف انسان کی زبان پر جاری ہو جانا ہی بہت بڑی نعمت ہے۔ بس اس نعمت کو اور دوسری تمام نعمتوں سے بہتر سمجھتے ہوئے کسی اور ثواب و جزا کی خواہش اور طلب سے چشم پوشی اختیار کرنی چاہیے اس طرح سے اللہ تعالیٰ کے نام پاک کی تعظیم و محبت جملہ کمالات کی اصل اور بنیاد ہے اسی لئے علامہ جصاص رازیؒ نے ذکر لسانی میں علی وجہ التعظیم والثناء کی قید لگائی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اس طرح سے زبان سے یاد کرنا کہ قلب خشوع اور تعظیم سے بھی خالی ہو۔ نفس یہ بھی

اس پر کمیر آئی ہے جیسا کہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی کی تفسیر میں صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ:۔

صَوْنُہٗ عَنِ الْاِبْتِذَالِ وَالتَّلَفُّظِ فِیْ مَحَلٍّ لَا یَلِیْقُ بِہٖ کَالْخَلَاءِ وَحَالَۃِ التَّغَوُّطِ وَذِکْرِہٖ لَا عَلٰی وَجْہِ الْخُشُوْعِ وَالتَّعْظِیْمِ۔

(روح المعانی ص۱۰۶ ج۳۰)

یعنی اللہ تعالیٰ کے نام پاک کو بے وقعت ہونے سے بچاؤ اور ایسے محل میں اس کا نام لینے سے بچاؤ جو اس کے شایانِ شان نہ ہو مثلاً پیشاب پاخانہ کے وقت اسی طرح سے اس کے نام پاک کو لا علے وجہ الخشوع ولا علی وجہ التعظیم لینے سے بھی بچاؤ۔

صاحب روح المعانی کی اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ سبح اسم ربک میں لفظ اسم مقحم (یعنی زائد) نہیں ہے بلکہ اسم رب کی بھی تعظیم کرنا اور نامناسب امور سے اس کی صیانت وحفاظت واجب ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اسم رب الفاظ ہی کے قبیل سے ہے اس لئے یہاں مطلب یہی ہے کہ انکا ذکر لسان پر بھی جو لاؤ تو عظمت وخشوع کے ساتھ لاؤ۔

اس مقام پر صاحب روح المعانی نے قدرے طویل کلام کیا ہے لیکن اچھا کلام کیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین بھی اس سے مستفید ہوں اس لئے اس کو نقل کرتا ہوں۔

فرماتے ہیں کہ:۔

(سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی) اَیْ نَزِّہْ اَسْمَاءَہٗ عَزَّ وَجَلَّ عَمَّا لَا یَلِیْقُ فَلَا تُؤَوِّلْ مِمَّا وَرَدَ مِنْہَا اِسْمًا مِنْ غَیْرِ مُقْتَضٍ وَلَا تُبْقِہٖ عَلٰی ظَاہِرِہٖ اِذَا کَانَ مَا وُضِعَ لَہٗ مِمَّا لَا یَصِحُّ لَہٗ تَعَالٰی وَلَا تُطْلِقْہُ عَلٰی غَیْرِہٖ سُبْحَانَہٗ اَصْلًا اِذَا کَانَ مُخْتَصًّا کَالْاِسْمِ الْجَلِیْلِ اَوْ عَلٰی وَجْہٍ یُشْعِرُ بِاَنَّہٗ تَعَالٰی وَالْغَیْرُ فِیْہِ سَوَاءٌ اِذَا لَمْ یَکُنْ مُخْتَصًّا فَلَا تَقُلْ لِمَنْ اَعْطَاكَ شَیْئًا مَثَلًا ھٰذَا رَازِقِیْ عَلٰی وَجْہٍ یُشْعِرُ بِذٰلِكَ

وَصَوْنُہٗ عَنِ الْاِبْتِذَالِ وَالتَّلَفُّظِ بِہٖ فِیْ مَحَلٍّ لَا یَلِیْقُ بِہٖ کَالْخَلَاءِ وَحَالَۃِ التَّغَوُّطِ۔

تنبیہ: ذکر کرنے والے کو ضروری ہے کہ ذکر باادب ہو [illegible]

تنزیہ اسم رب کا مطلب از افادات روح المعانی

[illegible]

وَذِکْرُہٗ لَا عَلٰی وَجْہِ الْخُشُوْعِ وَالتَّعْظِیْمِ وَرُبَّمَا یُعَدُّ مِمَّا لَا یَلِیْقُ ذِکْرُہٗ عَنْ مَنْ یَکْرَہُ مِمَّا عِنْدَہٗ مِنْ غَیْرِ ضَرُوْرَۃٍ اِلَیْہِ۔

وَعَنِ الْاِمَامِ مَالِکٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّہٗ کَانَ اِذَا لَمْ یَجِدْ مَا یُعْطِی السَّائِلَ یَقُوْلُ مَا عِنْدِیْ مَا اُعْطِیْکَ اَوْ اِسْتَلْنِیْ فِیْ وَقْتٍ آخَرَ اَوْ نَحْوَ ذٰلِکَ۔

وَلَا یَقُوْلُ نَحْوَ مَا یَقُوْلُ النَّاسُ یَرْزُقُکَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَوْ یَبْعَثُ اللّٰہُ تَعَالٰی لَکَ اَوْ یُعْطِیْکَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَوْ نَحْوَہٗ۔

فَسُئِلَ عَنْ ذٰلِکَ فَقَالَ اِنَّ السَّائِلَ اَثْقَلُ شَیْءٍ عَلٰی سَمْعِہٖ وَالْبُغْضَۃُ اِلَیْہِ قَوْلُ الْمَسْئُوْلِ لَہٗ مَا یُفِیْدُ رَدَّہٗ وَحِرْمَانَہٗ وَاَنَا اُجِلُّ اِسْمَ اللّٰہِ سُبْحَانَہٗ مِنْ اَنْ اَذْکُرَہٗ لِمَنْ یَکْرَہُ سِمَاعَہٗ وَلَوْ فِیْ ضِمْنِ جُمْلَۃٍ وَھٰذَا مِنْہُ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ غَایَۃٌ فِی الْوَرَعِ۔

(روح المعانی ص ۱۰۲ پ ۳۰)

یعنی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی یعنی آپ اپنے پروردگار عالیشان کے نام کی تسبیح کیجئے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے اسماء کو اُن امور سے جو اُنکے شایانِ شان نہیں ہیں منزہ رکھئے مثلاً جو نام اللہ تعالیٰ کے شرع میں آئے ہیں ان کو اُن کے ظاہر سے بلا وجہ مت پھیریئے یا اگر کوئی ایسا نام اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کیا جاتا ہو کہ اُس کے ظاہر کا اطلاق حق تعالیٰ کے لئے شرعاً درست نہ ہو تو آپ اس کو اُس کے ظاہر پر نہ رکھئے بلکہ اُس میں تاویل کر لیجئے اسی طرح سے اگر حق تعالیٰ کا کوئی مخصوص نام ہو جیسے اللہ تو اس کو غیر اللہ پر ہرگز نہ بولئے یا اگر خاص نہ ہو تو ایسے طور پر اسکا اطلاق نہ کیجئے جس سے شبہ ہو کہ شاید اللہ تعالیٰ اور وہ غیر دونوں اس وصف میں معاذ اللہ برابر ہیں. مثلاً اگر کسی نے تم کو کوئی چیز دی تو اُس کے متعلق یہ مت کہو کہ یہ میرا رازق ہے کیونکہ رازق تو حقیقتاً خدا ہے اس لئے اس کہنے میں شرک کا ایہام ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نام کو بے وقعت بولنے سے بھی بچاؤ اور ایسے مقامات پر اسکا تلفظ نہ کرو جو اُس کے لئے مناسب نہیں ہے. مثلاً بیت الخلاء یا وقت قضاء

اللہ تعالیٰ کے اسماء کو ان کے ظاہر سے نہ پھیرے

اللہ تعالیٰ کا مخصوص نام غیر اللہ پر نہ بولے

وغیرہ۔ یعنی پیشاب پاخانہ کرتے ہیں یا پیشاب خانے اور پاخانے میں بھی اس کا نام مت لو۔
اسی طرح سے خود کو اس سے بھی بچاؤ کہ اللہ تعالیٰ کا نام بدون خشوع اور تعظیم کے لو اور تنزیہ میں یہ بھی داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام ایسے شخص کے سامنے بلاضرورت نہ لیا جائے جو کہ اُسکا سننا پسند نہ کرتا ہو جیسا کہ امام مالکؒ کا واقعہ لکھا ہے کہ اُنکے پاس جب سائل کے دینے کے لئے کوئی چیز نہیں ہوتی تھی تو اُس سے یوں فرماتے کہ بھائی اس وقت تم کو دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ یا کبھی یوں فرماتے کہ جاؤ کسی دوسرے وقت آنا یا اس کے مثل کچھ اور فرما دیتے۔ باقی جیسا کہ عام لوگوں کا قاعدہ ہے کہ ایسے موقعہ پر جواب میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ جاؤ بھائی اللہ تم کو روزی دے یا یہ کہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا حصہ بھیجیں یا یہ کہ اللہ تعالیٰ تم کو دیں یا اس کے مثل کوئی اور کلمہ امام مالک صاحبؒ نہ فرماتے۔
کسی نے آپ سے پوچھا کہ حضرت آپ کا جواب عام لوگوں کے جواب سے مختلف کیوں ہوتا ہے۔ فرمایا کہ بھائی بات یہ ہے کہ سائل کے کانوں پر سب سے زیادہ شاق اور انتہائی ناپسند یدہ لوگوں کا وہ جواب ہوتا ہے جس میں اس کا رد اور حرماں ہو تو بھائی میں تو اللہ تعالیٰ کے نام کو اس سے کہیں اعلیٰ اور ارفع سمجھتا ہوں کہ اس کو کسی شخص کے ساتھ ایسے کلام میں استعمال کروں جس کا سننا بھی اُسے ناگوار ہو۔ اگرچہ یہ نام جملہ کے ضمن ہی میں کیوں نہ آجائے۔

(روح المعانی صہ ۱۰۲ جلد ۳۰)

سبحان اللہ یہ امام مالک صاحب کا ادب تھا اور انکا اعلیٰ درجہ کا ورع تھا۔
دیکھئے صاحب روح المعانی نے اللہ تعالیٰ کے نام کی تعظیم کی کیسی کیسی صورتیں بیان فرمائی ہیں اور امام مالکؒ کے واقعہ سے تو حیرت ہی ہوتی ہے۔ سبحان اللہ یہ حضرات کس درجہ اللہ تعالیٰ کی عظمت پیش نظر رکھتے تھے یہی وہ ادب تھا جس نے ان حضرات کے مراتب کو دارین میں چمکایا۔
میں کہتا ہوں کہ امام مالکؒ کا تو کہنا ہی کیا وہ تو امام المتقین تھے ہی اللہ تعالیٰ کے نام کی جیسی کچھ بھی عظمت فرمائیں انکا حق ہے۔ ایک نحوی کا بھی قصہ مشہور ہے کہ لفظ اللہ میں جو مشہور اختلافات ہیں یعنی یہ کہ آیا یہ مشتق ہے یا غیر مشتق ہے اور اس کی یہ اصل ہے یا وہ اصل ہے۔ اس کو سُن کر اُس نے کہا کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ لفظ اللہ علم ذات ازلی ہے اور جس طرح سے کہ اس کی ذات تبدل اور تغیر سے منزہ ہے اسی طرح سے اسکا اسم بھی مثل اسم کے تغیر اور تبدل سے پاک ہے۔ چنانچہ اُس کے انتقال کے بعد کسی نے اسکو خواب

صہ ۱۲۱ جلد ۱ روح المعانی

میں دیکھا پوچھا کیا معاملہ ہوا۔ کہا میں نے یہ جو کہا تھا کہ لفظ اللہ مستقل ہے تغیر و تبدل سے بے نیاز ہے جس طرح سے کہ اس کی ذات منزہ ہے بس یہی بات حق تعالیٰ کو پسند آگئی۔ حکم ہوا کہ جاؤ تمھارے اس ادب اور تعظیم کے صلہ میں تم کو بخش دیا۔

دیکھئے اللہ تعالیٰ کے محض اسم کی تعظیم اور لفظ کے ادب کا اس کو یہ صلہ ملا۔ جس سے تعظیم کی اہمیت معلوم ہوئی۔ پس اللہ تعالیٰ کا ذکر بھلا کس طرح سے بدون عظمت و خشوع کے مقبول ہوگا۔ ذاکرین کے لئے یہ واقعہ تازیانۂ عبرت ہے۔ ذکر خواہ لسان ہی سے ہو قلب کی اتنی شرکت تو بہرحال اس میں ضروری ہے کہ اللہ تعالےٰ کا نام خشوع اور تعظیم کے ساتھ لیا جائے اور خشوع و تعظیم قلب کی کیفیت کا نام ہے۔ اس طرح پر دونوں عضو ذکر میں شریک ہوجائیں گے۔ باقی قلب کی شرکت کے یہ معنی نہیں کہ قلب سے کوئی آواز آنے لگے۔ بس تنہا ذکر لسانی وہ معتبر نہیں ہے جس میں قلب کی مطلقاً شرکت نہ ہو بلکہ ظاہر کے خلاف قلب کے اندر موجود جیسے کافر یا منافق کلمے کا اجرا اپنی زبان سے کرتا ہے اور دل میں اس کے بالکل خلاف یا انکار لئے رہتا ہے تو اس کا اعتبار نہیں۔

چنانچہ بخاری کی حدیث شریف میں جو یہ آتا ہے کہ مَا مِنْ اَحَدٍ یَّشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ صِدْقًا مِّنْ قَلْبِہٖ اِلَّا حَرَّمَہُ اللّٰہُ عَلَی النَّارِ۔

یعنی کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ صدقِ دل سے اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اُس کو دوزخ پر حرام فرمادیں گے۔ تو اس میں صدقاً کی تشریح کرتے ہوئے صاحب فتح الباری فرماتے ہیں کہ فِیْہِ اِحْتِرَازٌ مِّنْ شَھَادَۃِ الْمُنَافِقِ یعنی صدقاً من قلبہ کی قید لگا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کے اقرار سے احتراز فرمایا یعنی اسکا محض لسانی اقرار کافی نہیں ہے اس لئے کہ اس کے قلب میں انکار موجود ہوتا ہے اور مومن کا قلب چونکہ مصدق ہوتا ہے اس لئے اسکا تنہا اقرار لسانی اُس کے قلب کے خلاف نہیں ہوتا اس لئے وہ معتبر ہے گو کہ اس کی غفلت کافر و منافق کی طرح نہیں ہوتی۔

یہاں اس موقعہ پر صاحب فتح الباری نے ایک اشکال نقل کیا ہے اور پھر اُس کے متعدد جوابات دئے ہیں۔ اشکال کا حاصل یہ ہے کہ اس حدیث کے ظاہر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ تصدیق قلبی کے ساتھ کہہ لیگا اللہ تعالیٰ اُس پر نارِ جہنم حرام فرمادیں گے۔ لیکن اہل سنت

حدیث میں صدقاً من قلبہ اقرار منافق سے احتراز کے لئے ہے

والجماعت کے نزدیک دلائل قطعیہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ گنہگار مومنین کو عذاب ہوگا پھر اُس کے بعد شفاعت کے ذریعہ وہ لوگ دوزخ سے نکال لئے جائیں گے۔ ان دونوں باتوں میں صریح تعارض معلوم ہوتا ہے۔

آگے خود صاحب فتح الباری نے اسکے بہت سے جوابات نقل فرمائے ہیں:۔

(۱) منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ یہاں ایک قید اور شرط محذوف ہے یعنی جو شخص لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا بشرطیکہ اعمال صالحہ بھی اختیار کرے۔

(۲) دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ جس نے اپنے سابق دین سے توبہ کرتے ہوئے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اور پھر اُسی حالت میں اسکا انتقال ہو گیا وہ جنت میں جائے گا۔

(۳) اور ایک جواب یہ دیا ہے کہ یہ فرائض اور احکام کے نازل ہونے سے پہلے کی بات ہے۔

(۴) اور ایک جواب یہ دیا ہے کہ یہ غالب حالات کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے کیونکہ ایک موحد کا غالب حال یہی ہوتا ہے کہ وہ طاعت پر عمل کریگا اور معصیت سے اجتناب کریگا۔

(۵) اور ایک جواب یہ دیا ہے کہ دوزخ پر حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسکا خلود حرام ہوگا۔ یعنی خلود کی نفی ہے دخول کی نہیں پس ہو سکتا ہے کہ کوئی گنہگار کلمہ گو کفارۂ سیئات کے لئے نار میں داخل کیا جائے اور پھر تطہیر کے بعد جنت میں داخل کر دیا جائے۔

(۶) اور ایک جواب یہ دیا ہے کہ جہنم کے کئی طبقے ہیں ایک طبقہ عُصاۃ مُومنین کے لئے ہے اور ایک طبقہ کافرین کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ پس یہاں تحریم نار سے مراد نار کا وہ طبقہ ہے جو کفار کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ وہ قائل لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پر حرام ہوگا۔

(۷) ایک جواب یہ دیا ہے کہ مراد نار پر حرام ہونے سے اُس کا فی الجملہ حرام ہونا ہے یعنی اس کلمہ کے قائل کا پورا جسم نہیں بلکہ فی الجملہ جسم حرام ہوگا کیونکہ اُس کے بعض اعضا نار پر حرام ہونگے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ سارا ہی جسم حرام ہو چنانچہ یہ ثابت ہے کہ آگ مومن کے اعضاء سجود کو نہیں کھائے گی جیسا کہ حدیث شفاعت سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح سے اس کی زبان بھی جلنے سے محفوظ رہیگی کیونکہ وہ دنیا میں ناطق بالتوحید رہ چکی ہے۔

حدیث شریف میں شفاعت کے بیان میں آیا ہے کہ بہت سے لوگ دوزخ میں ایسے ہونگے کہ آگ اُنکے

۱۴ الحجر ۳

اعضاء سجود اور زبان پر کچھ اثر نہ کرے گی اور ان کے یہ اعضاء چمکتے ہونگے اسی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں پہچان لیں گے اور انکی سفارش فرمائیں گے۔ پس اس حدیث میں لسان کے متعلق جو یہ معلوم ہوا کہ وہ جلنے سے مستثنیٰ ہوگی تو یہ اثر ذکر لسانی ہی کا تو ہوا اب اس سے بڑھ کر ذکر لسانی کی اور کیا فضیلت ہو سکتی ہے۔

بہر حال ذکر لسانی بھی معتبر ہے اور حق تعالیٰ کا اسم پاک زبان پر آجانا ہی بڑی دولت ہے اسکے مقابلہ میں دوسری نعمتیں ہیچ ہیں اس کے ہوتے ہوئے کسی اور شے کی جانب توجہ کرنا ظلم ہے چنانچہ خواص کا یہی حال ہوتا ہے اُس وقت اسی حالت کا غلبہ ہوتا تھا جو آپ نے سنا ہوگا کہ حضرت رابعہ بصریہؒ ایک مرتبہ ایک ہاتھ میں آگ لئے اور دوسرے میں پانی لئے چلی جارہی تھیں کسی نے دریافت کیا کہ حضرت آپ کہاں جارہی ہیں اور یہ آگ و پانی کیسا ہے۔ فرمایا کہ جارہی ہوں دوزخ کو بجھانے اور جنت کو آگ لگانے اس لئے کہ لوگ میرے پروردگار کی عبادت جنت اور دوزخ کی وجہ سے کرتے ہیں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ اسکے قصہ ہی کو ختم کردوں ؎

يَعْبُدُوْنَ اللهَ خَوْفاً مِّنْ لَظٰى فَلَظٰى قَدْ عَبَدُوْا لَا رَبَّنَا
وَلِدَارِ الْخُلْدِ صَلَّوْا لَا لَهٗ شِبْهَ قَوْمٍ يَعْبُدُوْنَ الْوَثَنَا

یعنی لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں دوزخ کے ڈر سے یہ تو دوزخ کی پرستش ہوئی میرے رب کی تو عبادت نہیں ہوئی اور حصول جنت کی خاطر نماز پڑھتے ہیں خدا کے لئے نہیں یہ تو ایسا ہوا جیسے کوئی قوم بت پرستی کرے یعنی غیر اللہ کو اپنا مقصود بنائے۔

غرض بزرگان دین تو یہ لکھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا صرف نام انسان کی زبان پر جاری ہوجانا نعمت عظیمہ ہے تو یہ ذکر لسانی ہی کے بارے میں فرما رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نام کو محض زبان پر آجانے کی قدر نکو کرار ہے ہیں۔

آپ سے کہتا ہوں کہ حدیث شریف میں ذکر کے متعلق صاف آتا ہے کہ یہ لسان کی صفت ہے۔ سنئے :۔

عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَعْضِ أَسْفَارِهٖ

وَقَالَ بَعْضُ اَصْحَابِہٖ نَزَلَتْ فِی الذَّھَبِ وَالْفِضَّةِ لَوْعَلِمْنَا اَیُّ الْمَالِ خَیْرٌ فَنَتَّخِذُہٗ فَقَالَ اَفْضَلُہٗ لِسَانٌ ذَاکِرٌ وَّقَلْبٌ شَاکِرٌ وَّزَوْجَةٌ مُّؤْمِنَةٌ تُعِیْنُہٗ عَلٰی اِیْمَانِہٖ۔

(مشکوٰۃ شریف ص۱۷۹)

خیر الاعمال لسان ذاکر اور قلب شاکر

حضرت ثوبانؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ جب آیت وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّةَ نازل ہوئی تو اس کے بعد ہم ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر میں تھے بعض صحابہ نے عرض کیا کہ سونے اور چاندی کے بارے میں تو یہ آیت نازل ہو گئی جس سے ہم نے انکا حکم اور انکی مذمت کو تو پہچان لیا لیکن اگر کاش ہمیں یہ معلوم ہو جاتا کہ بہترین مال کونسا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل مال لسان ذاکر اور قلب شاکر اور وہ مومنہ بیوی ہے جو اس کے دین پر اسکی معین ہو یعنی انسان کو نماز روزہ یاد دلاوے اور عبادات وخیرات کی ترغیب دے اور زنا اور جملہ محرمات سے اس کو باز رکھے۔

علامہ طیبی کی شرح

صاحب مرقاۃ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ طیبی کے سامنے جو نسخہ تھا اس میں قلب شاکر لسان ذاکر پر مقدم آیا ہے چنانچہ طیبی اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ قلب شاکر کے افضل مال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ سے مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ کو مستثنیٰ فرمایا ہے اور قلب جب آفات سے سالم ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے پس وہ شکر زبان کی طرف سرایت کر جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ حمد وثنا کرتا ہے اور یہ سب امور بدون فراغ قلب اور معاونت رفیق کے حاصل نہیں ہوتے اس لئے تیسری چیز زوجہ مومنہ تعینہ علیٰ ایمانہ کو فرما دیا۔

صاحب مرقات کی شرح

صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں کہ اور جس نسخہ میں لسان ذاکر مقدم ہے وہاں یوں تقریر کی جائیگی کہ جب انسان زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کریگا تو یہ زبان ہی تک محدود نہیں رہیگا بلکہ قلب میں بھی سرایت کر جائے گا پس بندہ اللہ تعالیٰ کے احسان پر شکر ادا کریگا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک مونس مقرر فرما دیں گے جو اس کے ایمان پر اس کی اعانت کرتا ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ یہی مریدین کا طریقہ ہے اور اکثر سالکین کا مسلک ہے اور طیبی نے جو بیان کیا ہے وہ مرادین اور اہل جذب کا طریقہ ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَقَلِیْلٌ مَّا ھُمْ (لہ) اور فرمایا ہے کہ وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ (عہ)۔

[illegible]

بہرحال مجھے اس حدیث سے یہاں صرف یہی بیان کرنا تھا کہ دیکھئے یہاں ذکر کو لسان کا وظیفہ قرار دیا ہے اور قلب کا وظیفہ شکر کو قرار دیا ہے اور ذاکر حقیقتاً لسان ہی ہوتی ہے پس ذکر لسانی کو کس طرح درمیان سے ساقط کیا جاسکتا ہے خاص کر جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک امر کی تشریع فرمارہے ہیں اور زیادہ لوگ ایسے ہی ہیں جن کے ذکر کی ابتدا لسان ہی سے ہوتی ہے جیسا کہ صاحب مرقاۃ نے فرمایا ہے کہ قلبی ذکر والے بہت کم ہیں وقلیل ماھم اور سنئے۔

افضل الکلام اربع

حضرت سمرۃ بن جندبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

اَفْضَلُ الْکَلَامِ اَرْبَعٌ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اَحَبُّ الْکَلَامِ اِلَی اللّٰہِ اَرْبَعٌ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ

اور ایک روایت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ لوں یہ مجھے ان تمام اشیاء سے زیادہ پسند ہے جن پر سورج نکلتا ہے۔ دیکھئے پہلی دونوں روایات میں کلام کا لفظ اختیار فرمایا اور آخری روایت میں قول کا لفظ لائے ہیں

اذکار کی تعداد ذکر لسانی کا وظیفہ ہے

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضل وثواب ذکر لسانی ہی کا بیان فرمانا مقصود ہے کیونکہ کلام بھی زبان سے کیا جاتا ہے اور قول بھی زبان ہی کے فعل کا نام ہے۔

اسی طرح سے ایک اور روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے صبح کے وقت اور شام کے وقت سبحان اللہ وبحمدہ سو سو مرتبہ کہہ لیا تو قیامت میں اس سے فضل عمل کسی کا نہ ہوگا۔ بجز اس شخص کے جس نے اتنے ہی بار یا اس سے زیادہ اس کلمہ کو کہا ہوگا۔

دیکھئے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کلمہ کے پڑھنے کی تعداد بیان فرمائی اور یہ ظاہر ہے کہ یہ تعداد الفاظ ولسان ہی کے اعتبار سے ہوتی ہے قلبی یاد کو عدد اور تعداد سے کیا تعلق۔

الغرض احادیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تسبیح وتحمید وتہلیل وتکبیر کی ترغیب اور فضائل بیان کرتے ہوئے اعداد کا بھی لحاظ رکھا ہے جو اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ ان کو لسان سے

ادا کرنا بھی مطلوب ہے۔ پھر اب ان تصریحات کے بعد ذکر لسانی کی مشروعیت اور اس کی مطلوبیت بلکہ محبوبیت میں کیا کلام رہ جاتا ہے۔

اور سنیئے۔

حدیث ریاض الجنۃ

حضرت انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم جنت کی کیاریوں کے پاس سے گذرا کرو تو وہاں چر لیا کرو۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ جنت کی کیاریاں کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ذکر کے حلقے۔ صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں کہ ذکر اور مکان ذکر مطلق بیان کیا گیا ہے اور مراد اس سے وہی ہے جو دوسری روایت میں آیا ہے وہ یہ کہ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم ریاض جنت سے گذرو تو چر لو میں نے عرض کیا کہ ریاض جنت کونسی جگہ ہے آپ نے فرمایا کہ مساجد۔ پھر میں نے عرض کیا کہ وہاں چرنے سے کیا مراد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہی سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ کہنا۔

دیکھئے اس حدیث میں بھی ان کلمات کو زبان سے کہنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے پھر ذکر لسانی کو لغو و بیکار کیسے کہہ سکتے ہیں۔

صاحب مرقاۃ نے اس کے تحت علامہ نوویؒ کا قول نقل کیا ہے کہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح سے ذکر مستحب ہے اسی طرح سے ذاکرین کے حلقے میں بیٹھنا بھی مستحب ہے۔ آگے ذکر کی قدرے توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

لوگوں کے خوف سے ذکر لسانی کو ترک نہ کرے

وَهُوَ قَدْ يَكُوْنُ بِالْقَلْبِ وَقَدْ يَكُوْنُ بِاللِّسَانِ جَمِيْعًا فَاِنِ اقْتَصَرَ عَلٰى اَحَدِهِمَا فَالْقَلْبُ اَفْضَلُ وَيَنْبَغِيْ اَنْ لَّا يَتْرُكَ الذِّكْرَ بِاللِّسَانِ مَعَ الْقَلْبِ بِالْاِخْلَاصِ خَوْفًا مِّنْ اَنْ يُّظَنَّ بِهِ الرِّيَاءُ وَقَدْ نُقِلَ عَنِ الْفُضَيْلِ تَرْكُ الْعَمَلِ لِاَجْلِ النَّاسِ رِيَاءٌ وَالْعَمَلُ لِاَجْلِ النَّاسِ شِرْكٌ وَالْاِخْلَاصُ اَنْ يُّخَلِّصَكَ اللّٰهُ مِنْهُمَا لٰكِنْ لَّوْ فَتَحَ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَابَ مُلَاحَظَةِ النَّاسِ وَالْاِحْتِرَازِ عَنْ طُرُقِ ظُنُوْنِهِمُ الْبَاطِلَةِ لَانْسَدَّ عَلَيْهِ اَكْثَرُ اَبْوَابِ الْخَيْرِ۔ (مرقاۃ ص ۱۱۴)

فرماتے ہیں کہ ذکر کبھی قلب سے ہوتا ہے کبھی لسان سے لیکن افضل ان دونوں سے وہ ہے جو قلب و

دوسروں کے خیال سے عمل کرنا شرک ترک عمل ریاء

لسان دونوں سے ہو اور اگر صرف ایک ہی پر اقتصار کرنا چاہتا ہے تو پھر ذکر قلبی افضل ہے لیکن مناسب ہے کہ ذکر قلبی کے ساتھ ساتھ اخلاص کے ساتھ ذکر لسانی بھی کیا کرے اور ریاء کے اندیشہ سے اس کو نہ چھوڑ دے۔ اس لئے کہ حضرت فضیلؒ سے منقول ہے کہ جس طرح سے لوگوں کی خاطر عمل کرنا شرک ہے اسی طرح سے لوگوں کے ڈر سے ترک عمل بھی ریاء ہی ہے اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں سے تمہیں نکال دے۔ یعنی نہ تو مخلوق کی خاطر عمل ہو اور نہ ان کے ڈر سے ترک عمل۔ اس لئے کہ اگر انسان اپنے اوپر لوگوں کے لحاظ کا دروازہ کھولے گا اور انکے ظنون باطلہ سے بچنے کی فکر میں رہیگا تو اپنے اوپر اکثر و بیشتر خیر کا دروازہ ہی بند کر لیگا۔ آگے صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں کہ:-

وَرُوِيَ اَنَّ بَعْضَ الْمُرِيْدِيْنَ قَالَ لِشَيْخِهٖ اَنَا اَذْكُرُ اللّٰهَ وَقَلْبِيْ غَافِلٌ فَقَالَ لَهٗ اُذْكُرْ وَاشْكُرْ اَنْ شَغَلَ عُضْوًا مِّنْكَ بِذِكْرِهٖ وَاسْئَلْهُ اَنْ يُّحْضِرَ قَلْبَكَ۔　　(مرقاۃ ص۱۲ ج۳)

ایک مرید کا کہنا ہے کہ میں ذکر کرتا ہوں اور قلب میرا غافل رہتا ہے

فرماتے ہیں کہ منقول ہے کہ کسی مُرید نے اپنے شیخ سے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہوں مگر میرا قلب غافل رہتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اسی طرح سے ذکر کئے جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمھارے ایک عضو کو تو اپنی یاد میں مشغول کر رکھا ہے اور اس کی دُعا کرو کہ تمہیں حضور قلب بھی نصیب ہو جائے۔

میں کہتا ہوں کہ هٰذَا هُوَ الْمَعْرِفَةُ فِيْ هٰذَا الْمَقَامِ وہ بزرگ بھی کوئی عارف تھے، حقیقت سے واقف تھے جانتے تھے کہ ذکر قلبی تک پہونچنے کا ذریعہ یہی ذکر لسانی ہے اس لئے اس کی بھی قدر کرائی مگر اس پر قانع بھی نہیں ہونے دیا۔

اور سنئے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ لوگوں میں سب سے بہتر کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا کہ خوشخبری ہو اس کے لئے کہ جس کی عمر زیادہ ہو اور اعمال اچھے ہوں۔ پھر اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ سب سے اچھا عمل کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم دنیا کو اس حال میں چھوڑو کہ تمھاری زبان ذکر اللہ سے تر ہو۔

دیکھئے یہاں بھی ذکر کی نسبت زبان ہی کی جانب کی گئی ہے۔ یعنی آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ تمھارے دل میں خدا کی یاد بھی ہو اگرچہ ذکر سے زبان کے تر ہونے کے لئے قلب میں یاد کا ہونا ضروری ہے۔

ذکر لسانی اگر غفلت کیساتھ بھی ہو تو ثواب ہے | ذکر و تلاوت میں نیت شرط نہیں

اِن نصوص اور علماء کی اِن تصریحات سے معلوم ہوا کہ ذکر لسانی کی توفیق بھی بسا غنیمت ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ذکر کا اعلیٰ فرد یہی ہے کہ ذکر لسانی اس طرح کیا جائے کہ اس میں قلب بھی شریک ہو کیونکہ مجرد ذکر لسانی جو غفلت کے ساتھ ہو اگرچہ بیکار وہ بھی نہیں ہے اس لئے کہ اذکار وادعیہ اور تلاوت کی صحت نیت پر موقوف نہیں ہے تاہم اگر ذکر لسانی سے مقصد تقرب الی اللہ ہو اور اس کو عظمت و خشوع کے ساتھ کیا جاوے تو اسکا ثواب یقیناً زیادہ ہوتا ہے اور نفع بھی اس کا کثیر ہے. چنانچہ فتح الباری میں ہے کہ :-

اَلنِّيَّةُ إِنَّمَا تُشْتَرَطُ فِي الْعِبَادَةِ الَّتِي لَا تَتَمَيَّزُ بِنَفْسِهَا وَأَمَّا مَا يَتَمَيَّزُ بِنَفْسِهٖ فَإِنَّهٗ يَنْصَرِفُ بِصُوْرَتِهٖ إِلٰى مَا وُضِعَ لَهٗ كَالْأَذْكَارِ وَالْأَدْعِيَةِ وَالتِّلَاوَةِ لِأَنَّهَا لَا تَتَرَدَّدُ بَيْنَ الْعِبَادَةِ وَالْعَادَةِ .. .. وَمَعَ ذٰلِكَ فَلَوْ قَصَدَ بِالذِّكْرِ الْقُرْبَةَ إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى لَكَانَ أَكْثَرَ ثَوَابًا۔

وَمِنْ ثَمَّ قَالَ الْغَزَالِيُّ حَرَكَةُ اللِّسَانِ بِالذِّكْرِ مَعَ الْغَفْلَةِ عَنْهُ تُحَصِّلُ الثَّوَابَ لِأَنَّهٗ خَيْرٌ مِّنْ حَرَكَةِ اللِّسَانِ بِالْغِيْبَةِ بَلْ هُوَ خَيْرٌ مِّنَ السُّكُوْتِ مُطْلَقًا أَيِ الْمُجَرَّدِ عَنِ التَّفَكُّرِ قَالَ وَإِنَّمَا هُوَ نَاقِصٌ بِالنِّسْبَةِ إِلٰى أَمْرِ الْقَلْبِ انْتَهٰى۔

(فتح الباری ص ۱ ج ۱)

یعنی نیت اِن عبادات میں شرط ہے جو بذاتِ خود عادات سے متمیز نہیں ہیں اور جو کہ متمیز ہیں تو اس کی صورت ہی سے اسکا موضوع لہ مراد ہوتا ہے جیسے اذکار. ادعیہ اور تلاوت. اس لئے کہ یہ اُمور عبادت اور عادت میں دائر نہیں ہیں بلکہ عبادت ہی کے لئے موضوع ہیں بایں ہمہ اگر ذکر سے تقرب الی اللہ کی نیت کی تو اسکا ثواب اور نفع اور زیادہ بڑھ جائے گا۔

اسی لئے امام غزالی نے فرمایا ہے کہ صرف زبان کا حرکت کرنا ذکر کے ساتھ باوجودیکہ قلب اس سے غافل ہو موجب ثواب ہے کہ وہ زبان پر غیبت وغیرہ کے الفاظ لانے سے تو بہتر ہی ہے بلکہ غفلت آمیز ذکر لسانی مطلق سکوت سے یعنی جو سکوت کہ تفکر سے خالی ہو اس سے بھی بہتر ہے اور یہ کہا کہ ہاں

یہ ضرور ہے کہ ذکر لسانی عمل قلب سے یقیناً درجہ میں کم ہے۔
دیکھئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فن کے امام ہیں اور محققین میں انکا شمار ہے وہ تو یہ فرمارہے ہیں کہ ذکر لسانی سے غفلت قلبی کے باوجود ثواب ملتا ہے۔ امام کا یہ ارشاد حجت ہے ان لوگوں پر جو یہ کہتے ہیں کہ ذکر لسانی میں کوئی ثواب نہیں ہے جیسا کہ صاحب روح المعانی نے وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى کے تحت لکھا ہے کہ :-

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ اَیْ بِلِسَانِهِ وَقَلْبِهِ لَا بِلِسَانِهِ مَعَ غَفْلَةِ الْقَلْبِ اِذْ مِثْلُ ذَالِكَ لَا ثَوَابَ فِيْهِ فَلَا يَنْبَغِیْ اَنْ يَّدْخُلَ فِيْمَا يَتَرَتَّبُ عَلَيْهِ الْفَلَاحُ (روح المعانی پ ۳۰)

یعنی اپنے رب کا نام لیا زبان سے بھی اور قلب سے بھی نہ یہ کہ صرف زبان سے اور قلبی غفلت کے ساتھ اس لئے کہ اس جیسے ذکر میں کوئی ثواب نہیں پس نہیں مناسب ہے کہ یہ ان امور میں شمار کیا جاوے جن پر فلاح مرتب ہوتی ہے۔
اسی طرح سے وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً ط کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ :-

قَالَ الْاِمَامُ اَلْمُرَادُ بِالذِّكْرِ فِیْ نَفْسِهٖ اَنْ يَّكُوْنَ عَارِفًا بِمَعْنَى الْاَذْكَارِ الَّتِیْ يَقُوْلُهَا بِلِسَانِهٖ مُسْتَحْضِرًا لِصِفَاتِ الْكَمَالِ وَالْعِزِّ وَالْعَظَمَةِ وَالْجَلَالِ وَذَالِكَ لِاَنَّ الذِّكْرَ بِاللِّسَانِ عَارِيًا عَنِ الذِّكْرِ بِالْقَلْبِ كَاَنَّهٗ عَدِيْمُ الْفَائِدَةِ بَلْ ذَكَرَ جَمْعٌ اَنَّ الذِّكْرَ اللِّسَانِیَّ السَّاذَجَ لَا ثَوَابَ فِيْهِ اَصْلًا۔

(حوالہ بالا)

امام فرماتے ہیں کہ مراد ذکر فی نفسہ سے یہ ہے کہ جن اذکار کو زبان سے کہہ رہا ہے انکے معانی کو سمجھتا بھی ہو اور اللہ تعالیٰ کی صفات کمالیہ اور عزت اور عظمت وجلال کا استحضار رکھنے والا ہو اور یہ اس لئے کہ وہ ذکر لسانی جو ذکر قلبی سے عاری ہو تقریباً غیر مفید سا ہے بلکہ ایک جماعت نے تو یہ بیان کیا ہے کہ مجرد ذکر لسانی میں کوئی ثواب ہی نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ غفلت بُری چیز ہے اور بہت بُری ہے۔ کافر کی صفت ہے مومن کے شایان شان نہیں۔ اُس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے قلب سے اسکو دور کرے لیکن اگر کسی کے اندر غفلت کا کچھ حصہ موجود ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وہ قلبی توجہ کے بغیر محض زبان سے خدا کا نام لیتا ہے تو آپ نے دیکھا کہ اس کے متعلق ایک فریق نے تو یہ کہا کہ اسمیں مطلقاً ثواب ہی نہیں اور علماء محققین کی ایک جماعت نے اسے بھی سراہا ہے جن میں امام غزالیؒ اور صاحب مرقاۃ اور صاحب فتح الباری جیسے حضرات بھی ہیں نیز اسی جماعت میں مولانا دہلویؒ بھی ہیں جنھوں نے یہ فرمایا تھا کہ "صرف جریانِ نامِ خدا بر زبان انسان لغتے است فخیم" اور اسی جماعت کا خیال صحیح ہے چنانچہ ہر زمانہ میں محققین نے سالکین کو ذکر لسانی پر ابھارا اور آمادہ کیا ہے اور ذکر قلبی کی ترغیب دی ہے مگر اُسکا ذریعہ ذکر لسانی ہی کو قرار دیا ہے اور یہ بالکل صحیح مسلک ہے اسلئے کہ ذکر قلبی حاصل کر لینا فوری طور پر انسان کے اختیار میں نہیں ہے مگر اسکا ذریعہ یعنی ذکر لسانی کرنا یہ البتہ انسان کے اختیار میں ہے کیونکہ ذکر کے معنی ہیں یاد کے اور قلبی کے معنی ہیں دل کے پس ذکر قلبی کے معنی ہوئے دلی یاد۔ یعنی جس طرح سے آپ کے کسی دوست یا عزیز کی یاد آپ کے قلب میں ہوتی ہے۔ یعنی زبان سے آپ کچھ نہیں کہتے مگر دل میں اس کی یاد بسی ہوتی ہے اسی طرح سے اللہ والوں کو اللہ تعالیٰ کا نام زبان سے لیتے لیتے اس کی یاد قلب میں بس جاتی ہے اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قلب اور زبان میں ایک تعلق رکھا ہے پس جس طرح سے کہ زبان قلب کی ترجمان ہوتی ہے یعنی قلب سے زبان پر کلام آتا ہے اسی طرح سے اگر کوئی شخص ہزاروں ہزار بار اللہ تعالیٰ کا نام زبان سے لیگا تو نہیں ہو سکتا کہ وہ صرف زبان ہی تک محدود رہ جائے اور اس کا قلب ذرا بھی متاثر نہ ہو۔

زبان کا اثر قلب پر ضرور پڑتا ہے اور اس کا اقل درجہ یہ ہے کہ اللہ والوں کو اس کے ذریعہ قدرے سکون اور ایک گونہ تسلی حاصل ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا نام تو بڑی چیز ہے۔ عشاق مجازی نے تو اپنے محبوب کے نام لکھ لکھ کر اس سے تسلی حاصل کی ہے چنانچہ مجنوں کا واقعہ لکھا ہے کہ ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد　　در بیاباں غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم　　می نوشتے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنون شیدا چیست ایں　　می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلےٰ میکنم　　خاطر خود را تسلی می دہم

یعنی کسی صحرا سے گذرنے والے نے مجنوں کو دیکھا کہ اپنے غم کے بیابان میں تنہا بیٹھا ہوا اور ریت کو کاغذ اور اپنی انگلیوں کو قلم بنائے ہوئے کسی کے نام خط لکھ رہا تھا۔ اس جانے والے نے پوچھا کہ اے مجنون شیدا یہ کیا ہو رہا ہے اور کس کے نام یہ خط لکھا جا رہا ہے؟

اس نے کہا کہ خط وط نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر کے اپنے قلب حزین کو تسکین دے رہا ہوں۔

تو دیکھئے جب عشاق مجازی کے لئے اس طرح سے محض ریت پر محبوب کا نام لکھنا موجب تسلی ہو سکتا ہے تو طالبین خدا کے لئے اس کا نام زبان پر جاری ہونا باعث تسلی کیوں نہ ہوگا۔ اور نہ صرف تسلی ہی۔ بلکہ مولانا رومؒ تو ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا نام محض زبان سے لینا رہبر وصال ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

از ہوا ھاکے رہی بے جام ہو اے زہو قانع شدہ بانام ہو
از صفت از نام چہ زاید خیال واں خیالش ہست دلالِ وصال

اوپر بیان فرمایا تھا کہ علم کسی وصول الی اللہ کا وسیلہ بنتا ہے ترک ہوئی اور ابتغاء رضا سے اسی کی شرح فرماتے ہیں کہ ——— ہوائے نفسانی سے بدون جام محبت حق نجات نہیں ہوتی اور تم صرف نام حق پر قناعت کئے ہوئے ہو یعنی صرف ذکر و طاعت ظاہری تصفیہ وصول کے لئے کافی نہیں جب تک محبت نہ ہو۔ لیکن اس سے ذکر لسانی اور طاعت ظاہری کو عبث مت سمجھ لینا کیونکہ قناعت کی شکایت کی گئی ہے نہ ذکر کی۔ ورنہ تو خود طریقۂ محبت یہی ذکر ہے۔ اس طرح سے کہ صفت اور اسم کے ذکر سے جبکہ بقصد اثر باطنی کیا جاوے۔ تصور اور خیال مذکور مسمیٰ و موصوف کا پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ تصور رہبر وصال بن جاتا ہے۔ اس طرح کہ زبان سے نام لینے سے شدہ شدہ وہ تصور غالب ہوتا جاتا ہے اور دوسرے تصورات کم ہوتے جاتے ہیں اور تصورات کی کمی سے تعلقات گھٹتے جاتے ہیں اور سب سے فصل ہوتا جاتا ہے یہی وصل ہے۔

سبحان اللہ مولانا رومؒ نے اسم کے ذکر (یعنی ذکر لسانی) کے نفع کو کیسا۔ بل بیان فرمایا ہے۔ اسی لئے محققین نے غفلت پر تو نکیر کی ہے مگر ذکر لسانی پر نکیر نہیں کی بلکہ اس پر شکر ادا کرنے کو فرمایا ہے کہ اس اتنے کی توفیق ہو جانا بھی خدا تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔ اس کے برخلاف جن لوگوں نے ذکر لسانی پر نکیر کیا ہے اور

اس کو شور و شغب. جسم کا ہلانا اور گردن کے جھٹکا رنے سے تعبیر کیا ہے۔ تو اس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ محقق نہیں ہیں اور طریق کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔

غافلین کو ذکر قلبی تک پہونچانا کوئی کھیل نہیں ہے۔ اب ہم لوگوں کو ذکر قلبی تک تو پہونچا نہ سکیں اور ذکر لسانی سے بھی انکو روک دیں اور یہ کہدیں کہ اس میں کچھ ثواب ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ اب انکے لئے کامیابی کی کیا سبیل ہے۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کا ذکر لسانی پر نکیر کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ آجکل دیکھا جاتا ہے کہ تلاوت قرآن کو بلا فہم معنی بیکار اور غیر نافع کہدیا کرتے ہیں تو اس کے متعلق بھی میں یہی کہتا ہوں کہ حقیقی تلاوت کرنے والے اور قرآن شریف کے کما حقہ سمجھنے والے اس زمانہ میں کتنے لوگ ہیں ہاں آپ فہم معنی تک بھی لوگوں کو نہ پہونچا سکیں اور زبانی تلاوت سے بھی انھیں یہ کہہ کر روک دیں کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے تو پھر اب مسلمانوں کو قرآن سے کیا تعلق رہ جائے گا؟

پس جس طرح سے تلاوت محض کو بیکار بتلا کر قرآن سے مسلمانوں کو بے تعلق کرنا ہوا۔ اسی طرح سے ذکر لسانی کو کوئی درجہ نہ دے کر اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ایک جم غفیر کو بے تعلق بنانا ہوا اسی لئے محققین نے ہر زمانہ میں ذکر لسانی کی ترغیب دی ہے اور اس کو سراہا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مکتوبات میں ارقام فرماتے ہیں کہ جس کا کچھ حصہ پہلے نقل کر چکا ہوں، پوری عبارت یہ ہے کہ:-

اور جس قدر ہو سکے اگرچہ قلیل ہو اس کو انھیں تشادیش سے مخلوط کر کے کرتا رہے اگر پریشانی خاطر ہے تو فقط لسانی ہی سہی کہ اگر لطیفۂ قلب معطل رہا وغافل ہوا تو زبان تو معطل وغافل نہیں۔ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ (جس چیز کو کل نہ پاسکے تو یہ بھی نہ کرے کہ اس کو بالکل ہی چھوڑ دے) ذکر ایسی شے ہے کہ اگر اس کو کرتا رہے اگرچہ بیہوشی خاطر و پریشانی تعلقات میں تحریک لسانی ہو نافع اور موجب نورانیت قلب کے ہوتا ہے۔

ہر چند ذکر قلبی ہی ہے اور ذکر کامل وہی ہے کہ تمام لطائف کو شاغل بنا دے مگر یہ نہ ہو تو فقط لسانی کو بھی کیوں بیکار کر دیوے۔ یہ محض لسانی غفلت کا ذکر کشاں کشاں قلب تک پہنچا دیتا ہے۔ عضو لسان اگر جنت میں جائیگا تو

کیا دیگر جملہ اعضاء محل نار ہو سکتے ہیں۔ ذکر وہ شے ہے کہ اگر کسی جزو انسانی سے متصل ہوگا۔ تمام جسد کو اپنی طرف کھینچ لے گا۔ (مکتوبات رشیدیہ ص۴)

دیکھئے حضرت مولانا گنگوہیؒ صاف فرمارہے ہیں کہ ذکر لسانی صرف لسان ہی تک محدود نہیں رہیگا بلکہ وہ قلبی بھی ہو جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر لسانی ہی سہی اس کی بھی توفیق بسا غنیمت ہے۔ باقی اس میں تو کلام ہی نہیں کہ جب اس لسانی کے ساتھ ذکر قلبی بھی پایا جائے گا تو سبحان اللہ کیا کہنا وہ تو عین مطلوب اور مقصود ہی ہے اور نور علیٰ نور کا مصداق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مدح فرمائی ہے جو قلب و لسان دونوں کے وظیفے پر عامل ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں :-

اَلَّذِیْنَ آتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ۔

یعنی جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت اس طرح کرتے رہے جس طرح تلاوت کا حق ہے کہ قوت علمیہ کو فہم مضامین میں صرف کیا اور قوت ارادیہ کو عزم اتباع حق میں استعمال کیا ایسے لوگ البتہ آپ کے اس دین حق اور علم وحی پر ایمان لے آتے ہیں۔ (بیان القرآن ص۶۷)

دیکھئے یہاں حق تلاوت پر منصفین اہل کتاب کی مدح فرمائی ہے اور حق تلاوت اس کو فرمایا کہ لسان کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اپنی قوت علمیہ کو فہم مضامین میں صرف کرتے ہیں اور قوت ارادیہ کے ذریعہ عزم کرتے ہیں کہ اس پر عمل بھی کریں گے۔ پس حق تلاوت میں صرف قلبی تدبر کو نہیں فرمایا بلکہ لسانی کو بھی لیا ہے۔ صاحب روح المعانی حق تلاوت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ :- حق تلاوت کی شرح روح المعانی سے

(یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ) ای یقرأونه حق قراءته وهی قراءة تاخذ بمجامع القلب فیراعی فیها ضبط اللفظ وحق الامر والنهی۔

(روح المعانی ص۳۳۷ ج۱)

نہایت عمدہ شرح فرمائی، فرماتے ہیں کہ وہ لوگ اس کو تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے اور حق قراءت یہ ہے جو کہ مجموعہ قلب سے ہو یعنی قلب کا گوشہ گوشہ اس میں شریک ہو اور ہمہ تن متوجہ ہو۔ آگے اس کی مزید شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس قلبی قراءت کا یہ مطلب نہیں کہ زبان کا اس میں کوئی حصہ

نہ ہو اور محض تصور معنی ہوں ایسا نہیں بلکہ لفظوں کی پوری پوری رعایت ہو معنی کا تامل اور تدبر ہو اور امر و نہی کا جو حق اور تقاضا ہے یعنی اتباع و امتثال اسکا پورا عزم ہو، یہ ہے حق تلاوت۔

اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جس ذکر اللہ کی یہاں مدح فرمائی ہے اور اس کے فضائل و مراتب بیان فرمائے ہیں کہ وہ خیر اعمال اور انفاق ذہب و فضہ سے بھی بہتر اور جہاد فی سبیل اللہ سے بڑھ کر ہے اس سے مراد وہی ذکر ہے جو مجامع قلب سے ہو یعنی جس میں لسان و قلب دونوں کو شاغل بنایا جائے باقی انسان جب مشاغل دنیویہ میں منہمک رہتا ہے تو اس کے لئے اپنے قلب کو فوراً فارغ کر لینا اور خدا کی یاد کو اس میں بسا لینا آسان نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے کچھ کرنا پڑتا ہے اب آدمی عمل تو نہ کرے اور ذریعہ کو نہ اختیار کرے اور منتہی تک پہونچنا چاہے یہ کیسے ہو سکتا ہے اسکا نام ہوس ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے باب بیان شروط الارادۃ میں بعض سیاحین کا قول نقل کیا ہے انھوں نے کہا کہ میں نے بعض ابدال سے جو مخلوق سے منقطع ہو چکے تھے دریافت کیا کہ کیف الطریق الی التحقیق۔ یعنی حقیقت تک رسائی کی کیا سبیل ہے اور کبھی یہ کہا کہ میں نے ان سے سوال کیا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جس کی وجہ سے میں اپنے قلبی تعلق کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ علی الدوام پاؤں۔ انھوں نے فرمایا کہ ہاں اس کے لئے عمل ہے وہ یہ کہ تم مخلوق کی طرف نظر نہ کرو اس لئے کہ انکی طرف نظر کرنا ظلمت ہے میں نے کہا کہ یہ تو بہت مشکل ہے۔ فرمایا کہ اچھا تو پھر انکا کلام نہ سنو اس لئے کہ انکا کلام موجب قسوت ہے میں نے کہا کہ یہ بھی مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ فرمایا کہ اچھا تو انکے ساتھ کوئی معاملہ نہ کرو اس لئے کہ انکے ساتھ کوئی معاملہ کرنا سبب وحشت ہے۔ میں نے کہا کہ میرا تو انھیں کے ساتھ رہنا سہنا ہے اس لئے معاملہ تو ناگزیر ہے۔ فرمایا کہ اچھا اتنا تو کرو کہ ان سے مل کر تسکین قلبی اور سکون روحانی نہ حاصل کرو اس لئے کہ پھر مخلوق سے سکون حاصل کرنا باعث ہلاکت ہے۔

سائل نے یہ سن کر کہا کہ ہاں بس بس معلوم ہو گیا یہی علت ہے۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ بندۂ خدا خیال تو کر غافلین کی جانب تو نظر کرے۔ جاہلین کے کلام کی طرف تو کان لگا دے اور بطالین کے ساتھ تو معاملہ رکھے اور پھر یہ بھی چاہے کہ تجھے ذکر قلبی حاصل ہو جائے یعنی تیرا تعلق قلبی اللہ تعالیٰ کے ساتھ دائمی ہو جائے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

(احیاء ۳۸۰ ص ۳۴)

اسی موقعہ کے لئے کہا گیا ہے ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ صرف موٹے موٹے الفاظ بولنے سے کام نہیں چلے گا۔ اور بزرگوں کی اصطلاح اور اُنکے الفاظ یاد کرنے سے حقیقت حاصل نہ ہوجائے گی۔ اگر ذکر قلبی کے تحصیل کا شوق ہے تو اسکا طریقہ اختیار کرو۔ تمام مشائخ اور محققین علماء کہتے چلے آئے ہیں کہ اسکا ذریعہ ذکر لسانی ہے اور اس ذکر لسانی میں اتنا تو ضروری ہے کہ قلبی تعظیم و خشوع کے ساتھ ہو باقی یہ کہ اللہ تعالیٰ کی یاد قلب کا حال ہوجائے اور ذکر اس میں رچ جائے اور بس جائے تو یہ تو کچھ دنوں کے بعد ہی ہوگا۔ یعنی ابتداء میں تو زبان ہی سے ذکر کرنا ہوگا اسی کو ذکر لسانی کہتے ہیں باقی اسی طرح کرتے کرتے قلب کو خدا کی یاد کا ایک ملکہ ہوجائے گا۔ اسکا نام ذکر قلبی ہے۔ ذکر ایک شے ہے دو مختلف محل کے اعتبار سے اس کے دو نام الگ الگ ہوگئے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آیۃ اَفَلَا یَتُوْبُوْنَ اِلَی اللّٰهِ وَیَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ط کے تحت توبہ و استغفار کے متعلق فرمایا ہے کہ۔

اَلتَّوْبَةُ مِنْ اَفْعَالِ الْقَلْبِ فِی الْاَصْلِ وَالْاِسْتِغْفَارُ مِنْ اَفْعَالِ اللِّسَانِ وَبِهٰذَا ظَهَرَ وَجْهُ الْجَمْعِ بَيْنَهُمَا فَنِسْبَةُ الْاِسْتِغْفَارِ اِلَی التَّوْبَةِ لِنِسْبَةِ الْاِقْرَارِ اِلَی التَّصْدِيْقِ وَكِلَاهُمَا وَاجِبٌ۔

(بیان القرآن ص۲۹ ج ۳)

یعنی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ کیا پھر بھی یہ لوگ خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ نہیں کرتے اور اس سے معافی نہیں چاہتے تو یہاں توبہ و استغفار دونوں کا ذکر ہے اور فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ توبہ در اصل قلب کا فعل ہے اور استغفار فعل ہے لسان کا اسی سے دونوں کے جمع ہونے کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ پس استغفار کو توبہ کے ساتھ وہی نسبت ہے جو اقرار کو تصدیق کے ساتھ ہے۔ یعنی جس طرح سے ایمان میں ایک تو اقرار کا درجہ ہوتا ہے اور ایک تصدیق قلبی ہوتی ہے اسی طرح سے استغفار تو بمنزلہ اقرار کے ہے اور توبہ کی حیثیت تصدیق کی سی ہے اور واجب دونوں ہیں اقرار بھی اور تصدیق بھی

چنانچہ درمختار میں ہے کہ

(اَلْاِیْمَانُ) وَھُوَ تَصْدِیْقُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ جَمِیْعِ مَاجَاءَ بِہٖ عَنِ اللّٰہِ تَعَالٰی مِمَّا عُلِمَ مَجِیْئُہٗ ضَرُوْرَۃً وَھَلْ ھُوَ فَقَطْ اَوْ ھُوَ مَعَ الْاِقْرَارِ قَوْلَانِ وَاَکْثَرُ الْحَنَفِیَّۃِ عَلَی الثَّانِیْ وَالْمُحَقِّقُوْنَ عَلَی الْاَوَّلِ وَالْاِقْرَارُ شَرْطٌ لِاِجْرَاءِ الْاَحْکَامِ الدُّنْیَوِیَّۃِ بَعْدَ الْاِتِّفَاقِ عَلٰی اَنَّہٗ یَعْتَقِدُ مَتٰی طُوْلِبَ بِہٖ اَتٰی بِہٖ۔ فَاِنْ طُوْلِبَ بِہٖ فَلَمْ یُقِرَّ فَھُوَ کُفْرُ عِنَادٍ (شامی)

ایمان کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایمان نام ہے تصدیق قلبی کا یعنی ان تمام اُمور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دل سے تصدیق کرنا یعنی ان کو حق اور سچ جاننا اور دل سے ماننا جنھیں آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے لے آئے ہیں اور آپ کا انھیں لانا بداہۃً معلوم ہے ایمان کہلاتا ہے۔

پھر ائمہ کا اختلاف ہے کہ ایمان آیا صرف اسی تصدیق کا نام ہے (جو کہ فعل قلب ہے) یا فعل قلب اور فعل لسان کے مجموعہ کا نام ہے۔ یعنی اقرار بھی اس میں داخل ہے تو اکثر حنفیہ ثانی کے قائل ہیں یعنی یہ فرماتے ہیں کہ اقرار بھی جزو ایمان ہے یعنی تصدیق قلبی کے ساتھ ساتھ زبان سے اقرار کرنا بھی واجب ہے مگر محققین حنفیہ فرماتے ہیں کہ نہیں ایمان تو صرف تصدیق قلبی ہی کا نام ہے۔ رہا اقرار تو وہ احکام دنیویہ کے اجزاء کے لئے شرط ہے مثلاً اس کی نماز جنازہ پڑھنا یا اس کے پیچھے نماز پڑھنا یا مقابر مسلمین میں اسکا دفن کیا جانا وغیرہ۔

مگر یہ کہ جو حضرات اقرار باللسان کو جزو ایمان نہیں بھی مانتے وہ بھی اس کے قائل ہیں کہ یوں چاہے زبان سے اقرار نہ کرے مگر یہ اسکا اعتقاد رکھتا ہو کہ جب اس سے اظہار ایمان کا مطالبہ کیا جاویگا تو فوراً اقرار کرلے گا اس وقت اقرار واجب ہے اگر مطالبہ کے بعد بھی زبان سے اقرار نہ کیا تو کافر قرار دیا جائے گا اور اس کا یہ کفر کفر عناد ہوگا۔

بس دیکھئے ایک قول کی رو سے ایمان کے اندر بھی دو واجب ہوئے۔ تصدیق اور اقرار۔ اسی کے متعلق حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ استغفار تو بمنزلہ اقرار کے ہے اور توبہ بمنزلہ تصدیق کے دکلاھما واجب یعنی دونوں ہی واجب ہیں۔

اسی طرح میں یہاں کہتا ہوں کہ ذکر لسانی کو مانند اقرار اور استغفار کے سمجھو کہ وہ زبان کا وظیفہ ہے اور ذکر قلبی کو توبہ و تصدیق کی طرح جانو کہ وہ قلب کا وظیفہ ہے۔ علماء نے ذکر لسانی کو جو معتبر مانا ہے تو اسی لئے کہ وہ ذکر قلبی کا ذریعہ ہے۔ انسان ذکر قلبی تک ایک ہی دن میں نہیں پہونچ جاتا بلکہ سالکین کو یہ درجہ اور یہ مقام بہت محنت اور مجاہدہ کے بعد حاصل ہوتا ہے اس لئے کہ ذکر اول ہی دن قلب میں راسخ نہیں ہوجاتا بلکہ ابتدا میں وہ صرف لسانی ہی ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ قلب کی شرکت ہونے لگتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یہی ذکر قلب کا حال بن جاتا ہے یعنی لسان ساکت بھی ہوجاتی ہے تب بھی قلب اپنا کام کرتا رہتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہی ذکر قلبی طریق کی اصل ہے اور اس راہ میں جتنے بھی مراتب و مدارج کسی کو حاصل ہوتے وہ اسی سے حاصل ہوتے ہیں باقی یہ کہ ذکر قلبی کیا ہے اور قلب کس طرح ذکر کرتا ہے تو اس کے متعلق یہ سمجھئے کہ انسان کا قلب اس طرح سے ذکر کرنے لگ جائے جس طرح اس کی زبان کرتی ہے تو یہ مقام تو کسی کسی اللہ کے بندے کو حاصل ہوتا ہوگا باقی یہ کہ قلب میں ذکر کے معنی کا یا حق تعالیٰ کی صفات کمالیہ کا استحضار ہوجائے یہی ذکر قلبی کا عام مفہوم ہے جیسا کہ صاحب روح المعانی نے وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی کے تحت لکھا ہے کہ

اَیْ بِلِسَانِهٖ وَقَلْبِهٖ لَا بِلِسَانِهٖ مَعَ غَفْلَةِ الْقَلْبِ۔

پھر اس کے ذرا آگے لکھتے ہیں کہ

وَالذِّكْرُ الْقَلْبِیُّ بِاسْتِحْضَارِ اِسْمِهٖ تَعَالٰی فِی الْقَلْبِ وَاِنْ كَانَ حَمْدُوْحًا بِلَا شُبْهَةٍ اِلَّا اَنَّ اِرَادَتَهٗ بِخُصُوْصِهٖ مِمَّا ذَكَرَ خِلَافُ الظَّاهِرِ۔

(روح ص۱۰۹ پ ۳۰)

اس میں اس امر کی تصریح ہے کہ ذکر قلبی اللہ تعالیٰ کے نام کو قلب میں مستحضر رکھنے کو کہتے ہیں اسی طرح سے اُذْكُرْ رَبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

وَقَالَ الْاِمَامُ اَلْمُرَادُ بِالذِّكْرِ فِیْ نَفْسِهٖ اَنْ يَّكُوْنَ عَارِفًا بِمَعَانِی الْاَذْكَارِ الَّتِیْ يَقُوْلُهَا بِلِسَانِهٖ مُسْتَحْضِرًا لِصِفَاتِ الْكَمَالِ وَالْعِزِّ وَالْعَظَمَةِ وَالْجَلَالِ (روح ص۱۳۵ پ ۹)

یہاں ذکر فی النفس یعنی ذکر قلبی سے مراد یہ فرماتے ہیں کہ جن اذکار کو زبان سے کہہ رہا ہے انکے

معانی کو سمجھنے والا ہو اور حق تعالےٰ کی صفات کمالیہ اور عزت وجلال کو قلب میں مستحضر رکھنے والا ہو۔
ذکر قلبی کا یہ مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب یہ سمجھئے کہ جس طرح سے یہ قاعدہ ہے کہ من احب شیئاً اکثر ذکرہٗ یعنی جو شخص کسی چیز سے محبت کرتا ہے تو اسکو اکثر یاد کیا کرتا ہے۔ اسی طرح سے یہ بھی اصول ہے کہ جو شخص کسی کو کثرت سے یاد کرتا ہے تو اس سے اسکو محبت بھی ہو جاتی ہے یعنی ذکر اور یاد جس طرح سے کہ محبت کا اثر اور ثمرہ ہے اسی طرح سے اس کا سبب اور ذریعہ بھی ہے۔ اس لحاظ سے جب بندہ اللہ تعالیٰ کا ذکر زبان سے بکثرت کرتا ہے تو اس سے اسکو ایک قسم کا لگاؤ اور تعلق ہو جاتا ہے جسکو اصطلاح صوفیہ میں نسبت کہتے ہیں۔ جب یہ نسبت حاصل ہو جاتی ہے تو قلب میں اسکے بعض آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک اثر یادداشت بھی ہے یعنی تکثیر ذکر کیوجہ سے اللہ تعالیٰ کی یاد کا ایک ایسا ملکہ راسخہ سالک کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے کہ جس کے سبب سے وہ اپنے کو ہمیشہ مالک حقیقی کے روبرو حاضر اور موجود پاتا ہے یعنی دوام حضور اسکو حاصل ہو جاتا ہے اسی کا نام ذکر قلبی ہے اور اسی کا نام احسان ہے اس کے متعلق اکابر فن کے ارشادات سنئے :۔

۱۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ القول الجمیل میں شیخ کی تیسری شرط یہ بیان فرماتے ہیں کہ :۔

"اَنْ یَّکُوْنَ زَاهِدًا فِی الدُّنْیَا رَاغِبًا فِی الْاٰخِرَةِ مُوَاظِبًا عَلَی الطَّاعَاتِ الْمُؤَکَّدَةِ وَالْاَذْکَارِ الْمَاثُوْرَةِ الْمَذْکُوْرَةِ فِیْ صِحَاحِ الْاَحَادِیْثِ مُوَاظِبًا عَلٰی تَعَلُّقِ الْقَلْبِ بِاللّٰهِ سُبْحَانَهٗ وَکَانَ یَادْ دَاشْت لَهٗ مَلَکَةً رَاسِخَةً" (شفاء العلیل صـ۳)

یعنی تیسری شرط بیعت لینے والے کی یہ ہے کہ وہ دنیا کا تارک ہو۔ آخرت کا راغب ہو طاعات مؤکدہ پر محافظ ہو اور اذکار منقولہ پر جو صحیح حدیثوں میں مذکور ہیں مداوم ہو اللہ تعالیٰ سے قلبی تعلق رکھتا ہو اور یادداشت اس کا ملکہ بن چکا ہو۔
یادداشت ترجمہ اسی ذکر قلبی ہی کا ہے اسکو حضرت شاہ صاحب شیخ کیلئے شرط قرار دے رہے ہیں۔ اور سنئے!

۲۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مکتوبات میں ارشاد فرماتے ہیں کہ
"اور وہ کیفیت کہ روبرو مالک معبود کے جانے اور شرم و حیا طاری ہو جاوے اس کا

نام حضور اور یاد داشت ہے اسی کو لسان شرع میں احسان کہتے ہیں اور یہی نسبت معتبرہ ہے کہ مسلسل چلی آتی ہے جب اس کا خوب ملکہ ہو جاوے تو یہی امر ہے کہ قابل اجازت تلقین کے بناتی ہے اور اس کا ہی نام ذکر قلبی ہے اور اس کے پہلے سب مقدمات اس کے ہیں۔"

(مکاتیب رشیدیہ صفحہ ۹۵)

دیکھئے اس میں تو حضرت نے صراحۃً ہی فرمادیا کہ یادداشت احسان نسبت معتبرہ اور ذکر قلبی یہ سب ایک ہی مُعَنْوَن کے مختلف عنوان ہیں۔ اور سنیئے:۔

۴۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ قصد السبیل میں فرماتے ہیں کہ:۔

"علامت حصول نسبت باطنی کے دو امر ہیں۔ ایک یہ کہ ذکر یادداشت کا ایسا ملکہ ہو جائے کہ کسی وقت ذہول نہ ہو اور اس میں ذرا تکلف نہ کرنا پڑے دوسرے یہ کہ اطاعت حق یعنی اتباع احکام شرعیہ کی عبادۃً و معاملۃً و خلقاً و اقوالاً و افعالاً اسکو ایسی رغبت اور منہیات و مخالفات سے ایسی نفرت ہو جائے جیسی مرغوبات و مکروہات طبعیہ سے ہوتی ہے۔ اور حرص دنیا کی قلب سے نکل جائے۔ کان خلقہ القرآن اس کی شان بنجائے یہی درجہ یاد داشت اور فرمانبرداری کا جو علامت ہے نسبت باطنی کی حاصل ہے محبت حق کا۔ (قصد السبیل صفحہ ۱۸)

دیکھئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اور حضرت مولانا تھانوی رحمہ یہ سب حضرات ایک ہی بات فرما رہے ہیں، وہ یہ کہ ذکر قلبی وہی چیز ہے جسے حضرات صوفیہ اپنی اصطلاح میں یاد داشت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور سنیئے:۔

۵۔ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"اوقات خود را بعد ادائے فرائض و واجبات و سنن در شغل باطن گذارند و بر زیادتی نوافل و اوراد نپردازد بلکہ مشغولی باطن را فرض دائمی داند گاہے غافل نہ شود و چوں ذوق و لذت بدل یابد شکر الہٰی بجا آورد و داند گم را لبسیار شمارد۔

(قصد السبیل صفحہ ۳)

یعنی فرماتے ہیں کہ فرائض واجبات وسنن کی ادائیگی کے بعد اپنے اوقات کو شغل باطن میں گذاریں اور

کثرت نوافل و دیگر اوراد کے درپے نہ ہوں بلکہ مشغولیٔ باطن کو اپنا دائمی وظیفہ جانیں اور کبھی اس سے غافل نہ ہوں۔ اور جب اس کی لذت اور اس کا ذوق پادیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں اور اسکی تھوڑی مقدار کو بھی بہت جانیں۔

دیکھئے یہاں حضرت حاجی صاحبؒ اسی یاد داشت کو شغل باطن سے تعبیر فرمارہے ہیں اور اس کو فرض قرار دے رہے ہیں اور نوافل سے زیادہ نافع فرمارہے ہیں۔ اور سنیئے :۔

۵۔ اسی مضمون کو صاحب رسالہ قشیریہ یوں بیان فرماتے ہیں کہ :۔

وَلَیْسَ مِنْ آدَابِ الْمُرِیْدِیْنَ کَثْرَۃُ الْاَوْرَادِ بِالظَّاهِرِ فَاِنَّ الْقَوْمَ فِیْ مُکَابَدَۃِ اِخْلَاءِ خَوَاطِرِهِمْ وَمُعَالَجَۃِ اِخْلَاقِهِمْ وَنَفْیِ الْغَفْلَۃِ عَنْ قُلُوْبِهِمْ لَا فِیْ تَکْثِیْرِ اَعْمَالِ الْبِرِّ۔ اَلَّذِیْ لَابُدَّ لَهُمْ مِنْهُ اِقَامَۃُ الْفَرَائِضِ وَالسُّنَنِ الرَّاتِبَۃِ فَاَمَّا الزِّیَادَاتُ مِنَ الصَّلٰوۃِ النَّافِلَۃِ فَاسْتِدَامَۃُ الذِّکْرِ بِالْقَلْبِ اَتَمُّ لَهُمْ۔ (قشیریہ صہ)

یعنی مریدین کے آداب میں سے ظاہری اوراد کی کثرت نہیں ہے اس لئے کہ یہ قوم تو صرف تین ہی چیزوں کے درپے ہے۔ اولاً قلب کو وساوس و خواطر ردیہ سے خالی کرنا۔ ثانیاً اپنے اخلاق کو درست کرنا۔ ثالثاً اپنے قلب سے غفلت کو زائل کرنا نہ کہ اعمال بِر کی تکثیر کیونکہ جو چیز ان کے لئے ضروری ہے وہ صرف فرائض کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا اور سنن مؤکدہ کا ادا کرنا ہے۔ رہیں اور چیزیں مثلاً نوافل وغیرہ تو اپنے قلب میں ذکر کو دائمی طور پر قائم کرنا یہ ان کے لئے سب چیزوں سے زیادہ نافع ہے۔

دیکھئے یہ بھی وہی فرمارہے ہیں جو حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا تھا مگر حضرت حاجی صاحبؒ نے شغل باطن کا لفظ فرمایا تھا اور انھوں نے اسکو استدامۃ ذکر سے تعبیر کیا ہے۔

الحاصل ہیں یہ سب وہی چیز جسے اہل طریق یاد داشت کہتے ہیں اسکی تعریف حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحؒ یہ فرماتے ہیں کہ :۔

وَاَمَّا یَادْ دَاشْتْ فَعِبَارَۃٌ عَنِ التَّوَجُّہِ الصِّرْفِ الْمُجَرَّدِ عَنِ الْاَلْفَاظِ وَالتَّخَیُّلَاتِ اِلٰی حَقِیْقَۃِ وَاجِبِ الْوُجُوْدِ الْحَقِّ الَّذِیْ لَا یَسْتَقِیْمُ اِلَّا بَعْدَ الْفَنَاءِ التَّامِّ وَالْبَقَاءِ السَّابِغِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ ٥

(شفاء العلیل صہ)

دوام ذکر

آداب مریدین

یاد داشت کے معنی

یعنی یادداشت عبارت ہے واجب الوجود کے حقیقت کی طرف ایسی خالص توجہ کرنے سے جو کہ الفاظ وتخیلات سے خالی ہو اور اس میں شک نہیں کہ ایسی توجہ استقامت اور مداومت کیساتھ حاصل نہیں ہوتی مگر فنا تام اور بقائے کامل کے بعد۔

(دولت یادداشت منتہی کو حاصل ہوتی ہے)

مترجم کہتے ہیں کہ حاصل یہ کہ یادداشت ذات مقدس کے دھیان کا نام ہے جو بلا واسطہ الفاظ وتخیلات کے ہو اور یہ دولت منتہیان ولایت کو حاصل ہوتی ہے جَعَلَنَا اللّٰہُ مِنْھُمْ بِرَحْمَتِہٖ الْوَسِیْعَۃِ۔ آمین انتہی۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ ذکر قلبی منتہیوں کا وظیفہ ہے اور بڑی اہم اور عظیم الشان چیز ہے اور مشکل سے حاصل ہوا کرتی ہے۔ علماء اور اہل فن تو یہ فرمارہے ہیں اور اس زمانے میں دیکھا جاتا ہے کہ بس ذکر قلبی کی تحقیق کے پیچھے پڑے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ دوام ذکر اور حضور دائم کے تو خواب دیکھو اور ذکر لسانی تک کا بھی التزام نہ کرو اسی کا نام ہوس ہے انسان کو اپنے درجہ ہی پر رہنا چاہیئے۔ علماء نے تصریح کی ہے کہ ذکر قلبی تک پہونچنے کا ذریعہ بھی ذکر لسانی ہے۔ چنانچہ رسالہ قشیریہ میں ہے۔

(بدون دوام ذکر کے کوئی خدا تک نہیں پہونچتا)

قَالَ الْاُسْتَاذُ (اَبُوْعَلِیْ دَقَّاقُ) اَلذِّکْرُ رُکْنٌ قَوِیٌّ فِیْ طَرِیْقِ الْحَقِّ سُبْحَانَہٗ تَعَالٰی بَلْ ھُوَالْعُمْدَۃُ فِیْ ھٰذَا الطَّرِیْقِ وَلَا یَصِلُ اَحَدٌ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی اِلَّا بِدَوَامِ الذِّکْرِ وَالذِّکْرُ عَلٰی ضَرْبَیْنِ ذِکْرُ اللِّسَانِ وَذِکْرُ الْقَلْبِ وَالتَّاثِیْرُ لِذِکْرِ الْقَلْبِ فَاِذَا کَانَ الْعَبْدُ ذَاکِرًا بِلِسَانِہٖ وَقَلْبِہٖ فَھُوَالْکَامِلُ۔

(قشیریہ ص۱۰)

استاد ابو علی دقاق نے فرمایا کہ اللہ تعالی کے راستہ میں ذکر ایک رکن قوی ہے بلکہ طریق میں سب سے اعلیٰ اور عمدہ چیز یہی ہے اور کوئی شخص اللہ تعالی تک دوام ذکر کرکے بغیر نہیں پہونچ سکتا۔ اور ذکر کی دو قسمیں ہیں۔ ذکر لسانی اور ذکر قلبی اور ذکر لسانی ہی کے ذریعہ بندہ ذکر قلب کے دوام اور ذکر مؤثر فی القلب تک پہونچتا ہے پھر جب سالک کی زبان اور اس کا قلب دونوں ذاکر ہوجائیں تو یہ شخص اپنے وصف میں کامل ہے۔

اسی طرح حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کسی طالب کو لکھتے ہیں کہ:۔

"در احوال مشار الیہ نوشتہ اند کہ بے تعلقی دل بہم رسیدہ است وخطرہ ماسوی

بدل نمی گذرد بسے شریف است ومُعتبر است بفنائے قلب وقدم اول است در اطوار ولایت۔ (مکتوبات معصومیہ صفحہ ۲۵)

فنائے قلب

یعنی آپ نے اپنے حالات کے سلسلے میں لکھا ہے کہ دل کی بے تعلقی بخوبی حاصل ہوگئی ہے اور اب دل میں ماسوا کا خطرہ تک نہیں گذرتا (الحمد للہ) یہ حال نہایت ہی عمدہ ہے اسی کو صوفیہ فنا قلب کہتے ہیں اور یہی مدارج ولایت میں پہلا قدم ہے۔

اسی طرح سے ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ:۔

فنائے نفس

ایں کوہ الوند یہ کلمہ کلمہ طیبہ از بیخ وبن برکندہ شود وانانیت معاداۃ کہ بمولائے خود دارد منفی شود ایں حالت معبر بفنائے نفس است وقدم ثانی است درایں راہ۔ (حوالہ بالا)

یعنی اس کوہ الوند کو (مراد اس سے اپنا نفس ہے) کلمہ طیبہ لاالہ الا اللہ کے تیشہ سے بیخ وبُن سے اکھاڑ پھینکا جاسکتا ہے اور اسی کے ذریعہ انسان کی انانیت اور عداوت جو وہ اپنے مولائے حقیقی کیساتھ رکھتا ہے۔ نیست ونابود ہوجاتی ہے اور اس حالت کو فنا نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہی اس طریق کا دوسرا قدم ہے۔

نفس کے مارنے کا بڑا ذریعہ ذکر ہی ہے

اکابر کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ دوام ذکر جس حالت کا نام ہے وہ بدون فنا نفس کے نہیں حاصل ہوتی اب لوگ ذکر قلبی تک تو پہونچنا چاہتے ہیں اور نفس میں ذرا ہاتھ نہیں لگاتے نفس ان کا اسی طرح زندہ رہتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکر نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ نے نفس کے مارنے کا بڑا ذریعہ ذکر ہی کو بنایا ہے اور نفس کے مارنے میں ذکر کو بڑا دخل اس لئے ہے کہ نفس کی صفت غفلت ہے اور ذکر غفلت کی ضد ہے جس قلب میں ذکر آجاتا ہے وہاں سے غفلت زائل ہوجاتی ہے۔ ع ہر جا کہ سلطان خیمہ زد غوغا نماند عام را۔

اس مضمون کو خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت ہی عمدہ بیان فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

باید دانست کہ صورت ایمان چنانچہ موقوف است بر نفی آلہہ آفاقی کہ اصنام وسائر معبودات کفرہ است حقیقت ایمان موقوف است بر نفی آلہہ انفسی کہ عبارت از ہوائے نفسانی است وگرفتاری است بماسوائے حق جل وعلا آیتہ

کریمہ اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ ۝ شاہد ایں معنی است۔ بزرگان گفتہ اند کہ ہرچہ مقصود تست معبود تست پس طالب حق را جل و علا از تکرار آں چارہ نیست لہذا اہل اللہ ایں کلمہ طیبہ را برائے سلوک و تسلیک اختیار فرمودہ اند تا سالک بتکرار ایں کلمہ از ہواہائے نفسانی و ساوس شیطانی و مقاصد انسانی بتمام برآید و مقصود و معبود و محبوب او غیر از ذات منزہ نماند و فنا حاصل شود۔ بیت ؎

ہیچکس را تا نگردد او فنا　　نیست رہ در بارگاہ کبریا

.... آرے اسم ذات جذب محبت می آرد و قسمے از فنا می بخشد و لیکن کلمہ نفی و اثبات برائے سلوک در رفع علائق ناگزیر است تا فنائے حقیقی حاصل شود و حجبت تمام مرتفع گردد ؎

تا بجاروب لا نروبی راہ　　نرسی در سرائے الا اللہ

(مکتوبات معصومیہ صہ ۲۱)

فرماتے ہیں کہ جاننا چاہیئے کہ جس طرح صورت ایمان آلہہ آفاقی یعنی اصنام اور کفار کے تمام معبودات کے نفی کرنے پر موقوف ہے اسی طرح سے حقیقت ایمان انفسی معبودات کی نفی پر موقوف ہے اور نفس کے معبودات سے مراد نفسانی خواہشات اور غیر حق کے ساتھ قلب کا لگاؤ ہے چنانچہ آیۃ قرآنیہ اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ۔ یعنی کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا کہ اپنا معبود اپنی خواہشات کو بنا رکھا ہے اس معنی پر شاہد عدل ہے (کہ اس میں بھی ھوی کو الٰہ فرمایا گیا ہے) بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جو تمہارا مقصود ہے وہی تمہارا معبود ہے پس طالب حق کو اس کلمہ کے تکرار سے چارہ نہیں ہے اسی واسطے اہل اللہ نے اس کلمہ کو خاصکر سلوک و تسلیک کیلئے منتخب فرمالیا ہے تاکہ سالک اسکے تکرار کے ذریعہ ہوائے نفسانی وساوس شیطانی اور مقاصد انسانی سے بالکلیہ نکل جائے اور اس کا مقصود و معبود اور محبوب سوائے ذات باری تعالی کے اور کچھ نہ رہ جائے اور اسکو فنائے تام حاصل ہوجائے ؎

کسی شخص کو جب تک کہ وہ فانی نہ ہوجائے بارگاہ کبریا میں رسائی نہیں ہوتی۔

پھر ذرا آگے فرماتے ہیں کہ بلا شبہہ اسم ذات جذب محبت کا باعث ہوتا ہے اور ایک قسم کا فنا بھی بخشتا ہے لیکن کلمہ نفی و اثبات سلوک کیلئے اور ازالہ علائق کے لئے ناگزیر ہے تاکہ فنائے حقیقی حاصل ہو

اور حجابات بالکلیہ مرتفع ہو جائیں کسی نے خوب کہا ہے۔

جب تک کہ لا کے جھاڑو سے راستہ کو صاف نہ کرو گے الا اللہ کے سرائے میں داخل نہ ہو سکو گے۔

اصل میں تو آدمی واصل ہوتا ہے حق تعالیٰ کے جذب فرمانے سے لیکن یہ جذب مرتب ہوتا ہے نفس کے فنا کر دینے پر جس کا طریق ذکر ہے اسی کو مولانا روم فرماتے ہیں ؎

بے فنائے خویش و بے جذب قوی　　　کے حریم وصل را محرم شوی

یعنی بغیر اپنے کو فنا کئے ہوئے اور بدون ادھر ہی سے جذب قوی کے آئے ہوئے تم حریم وصل کے محرم یعنی واصل بمحبوب حقیقی کب ہو سکتے ہو۔

میں نے جو حدیث شروع میں بیان کی ہے اَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِخَیْرِ اَعْمَالِکُمْ الحدیث تو اب اسکی شرح مرقات سے بیان کرتا ہوں۔ صاحب مرقاۃ نے ابن ملک کا قول نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حدیث شریف میں جو ذکر اللہ آیا ہے تو

اَلْمُرَادُ الذِّکْرُ الْقَلْبِیُّ فَاِنَّہٗ ھُوَ الَّذِیْ لَہُ الْمَنْزِلَۃُ الزَّائِدَۃُ عَلٰی بَذْلِ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ لِاَنَّہٗ عَمَلٌ نَفْسِیٌّ وَفِعْلُ الْقَلْبِ الَّذِیْ ھُوَ اَشَقُّ مِنْ عَمَلِ الْجَوَارِحِ بَلْ ھُوَ الْجِھَادُ الْاَکْبَرُ لَا الذِّکْرُ بِاللِّسَانِ الْمُشْتَمِلُ عَلٰی صِیَاحٍ وَّانْزِعَاجٍ وَّشِدَّۃِ تَحْرِیْکِ الْعُنُقِ وَاعْوِجَاجٍ کَمَا یَفْعَلُہٗ بَعْضُ النَّاسِ زَاعِمِیْنَ اَنَّ ذٰلِکَ جَالِبٌ لِلْحُضُوْرِ وَمُوْجِبٌ لِلسُّرُوْرِ وَحَاشَا لِلّٰہِ بَلْ سَبَبُ الْغَیْبَۃِ وَالْغُرُوْرِ۔

(مرقاۃ ص۱۲ ج۳)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ذکر اللہ کو جو خیر العمل فرمایا تو مراد اس سے ذکر قلبی ہے اس لئے کہ بذل اموال اور بذل انفس سے وہی مرتبہ میں بڑھا ہوا ہے کیونکہ وہ نفس کا عمل اور قلب کا فعل ہے جو کہ عمل جوارح سے زیادہ دشوار ہوتا ہے بلکہ وہ تو جہاد اکبر ہے ذکر لسانی مراد نہیں ہے جو کہ مشتمل ہوتا ہے چیخ و پکار پر بدن کے اینٹھنے اور گردن کو زور زور سے ہلانے اور ٹیڑھا کرنے پر جیسا کہ بعض لوگ کیا کرتے ہیں اور اپنے زعم میں یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حضور کیلئے معین اور سرور کا موجب ہے خدا اس جہل سے بچائے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ تو ان کے لئے اور زیادہ بُعد اور غرور کا سبب ہو جاتا ہے۔ انتہی

ابن ملک کے اس قول سے یہ معلوم ہوا کہ ذکر قلبی سراپا محمود و مقبول اور ذکر لسانی قطعاً مذموم اور ناقابل التفات چیز ہے۔ صاحب مرقاۃ اس کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

حجابات ظلمانی و نورانی [illegible]

ثبوت ذکر قلبی [illegible]

ثُمَّ ثَبَتَ اَنَّ الذِّکْرَ یُطْلَقُ عَلَی الْجَنَانِیْ وَعَلَی اللِّسَانِیْ وَاَنَّ الْمَدَارَ عَلَی الْقَلْبِ الَّذِیْ یَتَقَلَّبُ بِسَبَبِ ذِکْرِ الْمَذْکُوْرِ مِنَ الْغَیْبَۃِ اِلَی الْحُضُوْرِ وَاِنَّمَا اللَّفْظِیْ وَسِیْلَۃٌ لِحُصُوْلِ الْوُصُوْلِ وَصِلَۃٌ وَاخْتَلَفَ الْمَشَائِخُ فِیْ اَیِّہِمَا اَفْضَلُ بِالنِّسْبَۃِ اِلَی الذِّکْرِ الْقَلْبِیْ وَاَمَّا الْاُمُوْرُ الْبِدْعِیَّۃُ وَالْاَغْرَاضُ الدُّنْیَوِیَّۃُ فَخَارِجَۃٌ عَنِ الْاَنْوَاعِ الذِّکْرِیَّۃِ وَلَا رَیْبَ اَنَّ الْجَمْعَ بَیْنَہُمَا اَکْمَلُ وَفِیْ تَحْصِیْلِ الْمَثُوْبَۃِ اَفْضَلُ وَالظَّاہِرُ اَنَّہُ الْمُرَادُ ھٰہُنَا۔ (حوالہ بالا)

یعنی بلاشبہ ذکر کا اطلاق جنانی اور لسانی دونوں پر کیا جاتا ہے لیکن اعتبار اور مدار قلب ہی کا ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اس کی وجہ سے غیبت سے حضور کیجانب لوٹ آتا ہے۔ رہا لفظی ذکر تو یہ وصول کے حصول کے لئے ذریعہ اور وسیلہ بنتا ہے (اس لئے اس کا بھی اپنی جگہ پر ایک درجہ ہے)

آگے فرماتے ہیں کہ مشائخ کا باہم اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ مبتدی کیلئے کونسا ذکر افضل وبہتر ہے۔ لفظی یا قلبی تاہم اس پر اتفاق ہے کہ منتہی کے ذکر کی انتہا قلبی ہی پر ہوتی ہے۔ باقی ذکر لسانی ہو یا قلبی کسی میں اگر امور بدعیہ اور اغراض دنیویہ کی آمیزش ہوجائیگی تو وہ انواع ذکر ہی سے خارج شمار ہوگا۔ اور اس میں تو کلام ہی نہیں کہ دونوں ذکروں کا جمع کرلینا کمال اور اکمل حال ہے اور تحصیل ثواب میں افضل ہے۔ اور ظاہر یہی ہے کہ یہاں یہی مراد ہے۔ آگے اسکی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ اس لئے کہ مجاہدہ مذکور اور مقاتلہ مشکور جنکا ذکر حدیث میں گذرا ہے وہ ذکر قلبی سے خالی نہیں ہوتا مگر یہ کہ حدیث کی تقریر یوں کیجائے کہ ایسے شخص کا ذکر قلبی جوکہ ایک جہاد باطنی ہے اسی کے جہاد ظاہری سے افضل ہے۔ پس اس حدیث کا مضمون ایسا ہوگیا جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک دوسرا ارشاد ہے کہ ایک شخص اپنے دامن میں درھم بھرے ہوئے اسکو تقسیم کررہا ہے دوسرا شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر کررہا ہے تو یہ ذکر کرنے والا اس صدقہ کرنے والے سے افضل ہوگا۔

آگے فرماتے ہیں کہ اس توجیہہ نے ابن حجرؒ کے تحیر کو بھی ختم کردیا کیونکہ وہ بہت پریشان تھے۔ کہ ذکر میں اگر قرآن کو بھی شامل کرلیا جاوے تب تو وہ بلاشبہ دیگر اعمال لسانیہ سے افضل ہے لیکن دوسری انواع عبادات مثلاً انفاق مال اور بذل النفس وغیرہ سے اس کا افضل ہونا محل نظر ہے کیونکہ ہمارے ائمہ کے کلام سے اس کے خلاف کا پتہ چلتا ہے۔ (انتہی کلامہ)

ملا علی قاریؒ کا دوران ذکر

دونوں ذکروں کا جمع کرلینا اکمل حال ہے

ابن حجرؒ کا تحیر

شیخ الاسلام کا جواب

اسکے جواب میں شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام نے فرمایا کہ یہاں حدیث سے یہ نہیں معلوم ہو رہا ہے کہ کسی عبادت کا ثواب بقدر تعب و مشقت کے ملا کرتا ہے یہاں تو صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی امر قلیل پر اجر جزیل عطا فرما دیتے ہیں اور یہ تفاوت ثواب عبادت کے شرف مراتب کے تفاوت پر مرتب ہوتا ہے صاحب فتح الباری فرماتے ہیں کہ شیخ الاسلام نے یہ بات بالکل صحیح فرمائی۔

ابن حجر کا اشکال

آگے صاحب مرقاۃ لکھتے ہیں کہ ابن حجر نے ایک اور عجیب بات کہی وہ یہ کہ انفاق مال... سے تو بخل کا رذیلہ دور ہوتا ہے اور بذل نفس سے ازالہ جبن ہوتا ہے رہا ذکر اللہ تو اس سے مقصود کی یاد ضرور تازہ ہو جاتی ہے مگر بخل اور جبن جیسے رذائل کے ازالہ میں (جن سے بڑھکر کوئی رذیلہ نہیں) اسے کوئی دخل نہیں ہے۔ انتہی۔

صاحب مرقاۃ کا جواب

صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں کہ ابن حجر کا یہ کہنا ذکر کے معنی اور اسکی حقیقت سے ناواقفیت پر مبنی ہے ورنہ تو انسان کی ظاہری اور باطنی جتنی بھی بیماریاں ہیں سب کا مداوا ذکر اللہ ہے مگر ہاں ایسا ذکر جو قلب غافل سے نہ ہو بلکہ قلب میں جو کہ سلطان الاعضا اور امیر البدن ہے اثر کرنیوالا ہو تو اسی کیوجہ سے قلب میں بذل مال اور بذل نفس کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور اسمیں اخلاص آتا ہے ورنہ بدون اسکے بذل مال خسارہ مالی سے زیادہ کچھ نہیں اور بذل نفس ضیاع نفس کا مصداق ہے کیونکہ جب کوئی عمل خدا کیلئے نہ ہوگا تو ظاہر ہے نفع سے بھی خالی ہوگا۔

ذکر اللہ کی خیریت اور ارفعیت کیوجہ

اسی وجہ سے ایک اور شارح نے اس مقام پر یہ لکھا ہے کہ۔

وَلَعَلَّ الْخَيْرِيَّةَ وَالْأَرْفَعِيَّةَ فِي الذِّكْرِ لِأَجْلِ أَنَّ سَائِرَ الْعِبَادَاتِ مِنْ إِنْفَاقِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَمِنْ مُلَاقَاتِ الْعَدُوِّ وَالْمُقَاتَلَةِ مَعَهُمْ إِنَّمَا هِيَ وَسَائِلُ وَوَسَائِطُ يَتَقَرَّبُ الْعِبَادُ بِهَا إِلَى اللّٰهِ تَعَالَى وَالذِّكْرُ إِنَّمَا هُوَ الْمَقْصُودُ الْأَسْنَى وَالْمَطْلُوبُ الْأَعْلَى۔

(مرقاۃ ص۱۳ ج ۳)

فرماتے ہیں کہ شاید کہ ذکر کا خیر ہونا اور ارفع ہونا اور ازکی ہونا اسوجہ سے ہو کہ اور دیگر عبادات مثلاً انفاق مال اور ملاقات عدو اور مقاتلہ کفار وغیرہ یہ سب وسائل اور وسائط ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے اور ذکر اللہ تو مقصود اصلی اور مطلوب اعلیٰ ہے۔

(اسکے بعد صاحب مرقاۃ نے ذکر کی فضیلت بیان کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ:)۔

وَنَاهِيكَ عَنْ فَضِيلَةِ الذِّكْرِ قَوْلُهُ تَعَالَى فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَأَنَا جَلِيسُ مَنْ ذَكَرَنِي وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي (الحدیث)

وَلِذَا قَالَ الْغَزَالِيُّ بَعْدَ مَا دَخَلَ فِي مَقَامِ الذِّكْرِ ضَيَّعْتُ قِطْعَةً مِّنَ الْعُمْرِ فِي الْوَجِيزِ وَالْوَسِيطِ وَالْبَسِيطِ بَلْ يَعُدُّونَ الْعَارِفُونَ الْغَفْلَةَ مِنْ أَنْوَاعِ الرِّدَّةِ وَلَوْ خَطْرَةً عَلَى سَبِيلِ الْمُبَالَغَةِ كَمَا قَالَ شه

وَلَوْ خَطَرَتْ لِي فِي سِوَاكَ إِرَادَةٌ عَلَى خَاطِرِي سَهْوًا حَكَمْتُ بِرِدَّتِي

یعنی اور کافی ہے تمہارے لئے ذکر کی فضیلت کے بیان میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ یعنی تم مجھے یاد کرو میں تمھیں یاد کرونگا اور یہ ارشاد کہ انا جلیس من ذکرنی یعنی میں اپنی یاد کرنیوالے کا ہمنشین ہوں اور یہ ارشاد کہ انا معہ اذا ذکرنی یعنی میں ذکر کرنیوالے کا ساتھی ہوں جبکہ وہ مجھے یاد کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث شریف أَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي کے بعد یہ الفاظ آئے ہیں فَإِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي وَإِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَأٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَأٍ خَيْرٍ مِنْهُ اسکے ماتحت صاحب مرقاۃ لکھتے ہیں کہ میں اسکے ساتھ ہوں یعنی توفیق کے ساتھ اور حفاظت اور معونت کے ساتھ یا ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے میں سنتا ہوں یا یہ کہ اسکے حقیقت حال سے واقف ہوں اور اسکی کوئی بات مجھ پر مخفی نہیں اور جب وہ مجھے یاد کرتا ہے یعنی قلب و لسان دونوں سے چنانچہ جب وہ مجھے اپنے نفس میں یاد کرتا ہے یعنی خفیہ اور پوشیدہ طور پر یا مطلب یہ ہے کہ صدق اور اخلاص کے ساتھ تو میں بھی اپنے نفس میں اسکو یاد کرتا ہوں یعنی اسکے ثواب کو مخفی رکھتا ہوں جیسا کہ اس نے اپنے عمل کو مخفی رکھا یا یہ کہ اسکے ثواب دینے کا خود متولی ہوتا ہوں کسی دوسرے کے حوالہ اسے نہیں کرتا اور اگر وہ مجھکو مجمع میں یاد کرتا ہے یعنی مومنین کی جماعت کے ساتھ یا انکے مجمع میں تو میں اسکو ثنا جمیل کے ساتھ یا اجر جزیل کے ساتھ اور حسن قبول اور توفیق وصول کے ساتھ ایک ایسے مجمع میں یاد کرتا ہوں جو اس کے مجمع سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے اسلئے کہ وہ فرشتوں کا مجمع ہوتا ہے اور وہ معصوم ہوتے ہیں اور انھیں طاعت کی بڑی قوت حاصل ہوتی ہے اور اسرار الٰہیہ پر انھیں کامل اطلاع ہوتی ہے اور انوار ملکوتیت کے وہ لوگ مشاہدہ کرنے والے ہوتے ہیں۔

طیبیؒ نے کہا ہے کہ وہ مجمع ہوتا ہے ملائکہ مقربین کا اور ارواح مرسلین کا اور ظاہر ہے کہ یہ مجمع انسانوں کے مجمع سے بہتر ہی ہے۔ (مرقاۃ صہ ج ۳)

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا کسی کو یاد فرمانا اسکے لئے کسقدر فخر و شرف کی بات ہے چنانچہ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے ذکر پر اسی قول نے ابھارا کہ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ کیونکہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو وہ ذاکر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ مذکور ہوتے ہیں لیکن اسکے ذکر کرنے کیوجہ سے جب اللہ تعالیٰ اسکا ذکر فرماتے ہیں تو بندہ مذکور اور اللہ تعالیٰ ذاکر ہو جاتے ہیں۔ سبحان اللہ ذاکرین کے لئے کتنی بڑی خوشخبری ہے۔

ع۔ بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

اسی کو کسی شاعر نے یوں کہا ہے کہ ؎

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

غرض اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اسکا اجر دونوں لذیذ ہیں چنانچہ علماء ظاہر نے جب ذکر کے مقام میں قدم رکھا ہے اور اس سے لذت آشنا ہوئے ہیں تب انھیں اسکی قدر ہوئی ہے اور پھر اپنی سابق زندگی پر جو کہ اس سے خالی گذری تھی بہت افسوس کیا بلکہ اپنی اس عمر کو انھوں نے ضائع سمجھا جیسا کہ صاحب مرقاۃ آگے امام غزالیؒ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ اسی واسطے امام غزالیؒ نے مقام ذکر میں داخل ہونے کے بعد فرمایا کہ افسوس میں نے اپنی عمر کا ایک معتد بہ حصہ وجیز۔ وسیط اور بسیط کے لکھنے میں ضائع کیا (کہ ذکر کے فضائل و کمالات سے عاری رہا) بلکہ عارفین نے تو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت کو ایک قسم کی ردّت شمار کیا ہے اور غفلت تو الگ رہی غفلت کے خطور کو بھی مبالغۃً ردّت ہی جانا ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ اگر میرے دل میں تیرے علاوہ کسی غیر کا خطرہ بھی گذرے تو میں اپنے پر مرتد ہونے کا حکم لگاؤں۔ (مرقاۃ حوالۂ بالا)

میں کہتا ہوں کہ اللہ والوں کو دار دنیا ہی میں اپنی غفلت اور ترک ذکر پر جب اسقدر قلق ہوتا ہے تو اسی سے تصدیق ہو گئی اس مضمون کی جو حدیث میں آتا ہے اور مشائخ بھی بیان کرتے ہیں مثلاً ارشاد الطالبین میں ہے کہ

ہر صوفی لازم است کہ اوقات خود را بذکر الٰہی معمور دارند و در بطالت نہ گذارند۔ در حدیث آمدہ کہ اہل جنت حسرت نکنند مگر بر ساعتے کہ ذکر خدا نکردہ باشند۔ (ارشاد الطالبین صہ ۳۶)

ذکر اللہ تعالیٰ کا بندہ کو یاد فرمانا

اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اسکا اجر دونوں لذیذ ہیں

اہل جنت کو حسرت

فرماتے ہیں کہ سالکِ راہ خدا پر لازم ہے کہ اپنے اوقات کو ذکر الٰہی سے معمور رکھے اور بیکاری میں اپنا وقت نہ گذارے اسلئے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنت میں کسی چیز پر اہل جنت کو حسرت نہ ہوگی بجز اسوقت کے ضیاع پر کہ دنیا میں جسمیں اللہ تعالیٰ کو یاد نہ کیا ہوگا اسپر وہ حسرت و افسوس کرینگے۔

مطلق ذکر کی فضیلت بیان کرنے کے بعد آگے صاحب مرقاۃ افضل الذکر کے فضائل و برکات خواص اور آثار بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ :-

ثُمَّ لَا ارْتِيَابَ اَنَّ اَفْضَلَ الذِّكْرِ قَوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَهِيَ الْقَاعِدَةُ الَّتِيْ يُبْنٰى عَلَيْهَا اَرْكَانُ الدِّيْنِ وَهِيَ الْكَلِمَةُ الْعُلْيَا وَهِيَ الْقُطْبُ الَّذِيْ يَدُوْرُ عَلَيْهَا رَحَى الْاِسْلَامِ وَهِيَ الشُّعْبَةُ الَّتِيْ اَعْلٰى شُعَبِ الْاِيْمَانِ قَالَ الطِّيْبِيُّ بَلْ هُوَ الْكُلُّ وَلَيْسَ غَيْرُهٗ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ اِذِ الْوَحْيُ مَقْصُوْرٌ عَلَى اسْتِيْثَارِ اللهِ تَعَالٰى بِالْوَحْدَانِيَّةِ لِاَنَّ الْمَقْصُوْدَ الْاَعْظَمَ مِنَ الْوَحْيِ هُوَ التَّوْحِيْدُ وَسَائِرُ التَّكَالِيْفِ مُتَفَرِّعٌ عَلَيْهِ۔

ثُمَّ قَالَ وَكَلَامُ مَاتَجِدُ الْعَارِفِيْنَ وَاَرْبَابُ الْقُلُوْبِ وَالْيَقِيْنِ يَسْتَأْثِرُوْنَهَا عَلٰى سَائِرِ الْاَذْكَارِ بِمَا رَاَوْا فِيْهَا خَوَاصَّ لَيْسَ الطَّرِيْقُ اِلٰى مَعْرِفَتِهَا اِلَّا الْوِجْدَانُ وَالذَّوْقُ (مرقاۃ صہ ۳۶ ج ۲)

فرماتے ہیں کہ اسمیں شک نہیں کہ سب ذکروں سے بڑھکر ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے اور یہ بمنزلہ اس بنیاد کے ہے جس پر ارکان دین کی بنا رکھی گئی ہے اور یہی وہ بلند کلمہ اور قطب ہے جس پر اسلام کی چکی گھومتی ہے نیز یہی کلمہ اسلام کے شعبوں میں سے سب سے بڑا شعبہ ہے اور علامہ طیبیؒ کہتے ہیں بڑا شعبہ کیا بلکہ یہی کل ہے اسکے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں (اور اسکی دلیل میں یہ آیت پڑھی) قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰى اِلَيَّ اِنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ یعنی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امر فرمایا کہ آپ فرما دیجئے کہ مجھ پر وحی کیگئی کہ جز ایں نیست کہ تمہارا معبود اللہ وحدہٗ لا شریک ہے تو دیکھو کہ اسمیں وحی کو منحصر کردیا توحید یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک جاننے میں اسلئے کہ وحی کا مقصود اعظم توحید ہی ہے اور دیگر تکالیف شرعیہ اسی پر متفرع ہوتی ہیں اور کلمہ طیبہ میں توحید ہی بیان کی گئی ہے۔ پس کہہ سکتے ہیں کہ اجمالی طور پر گویا کل دین توحید ہی میں ہے۔ اس سے بھی کلمہ کی فضیلت ثابت ہوئی

میں یہ کہتا ہوں کہ علامہ طیبیؒ نے یہ جو فرمایا کہ بَلْ هُوَ الْكُلُّ وَلَيْسَ غَيْرُهٗ بالکل صحیح فرمایا

اسی بات کو ایک دوسرے عنوان سے یوں سمجھئے کہ:-

ارباب طریق میں یہ امر منقول چلا آرہا ہے کہ ان کے یہاں چار چیزیں ہیں۔ شریعت طریقت۔ حقیقت اور معرفت تو اسی کلمہ لاالٰہ الا اللہ میں یہ سب موجود ہیں۔ دیکھئے قرآن شریف میں یہ کلمہ مذکور ہے حدیث شریف میں اسکا ذکر آیا ہے اسلئے تو یہ شریعت ہوئی اور ذاکر اپنے قلب سے رذائل کے تخلیہ یعنی غیر اللہ کو اپنے قلب سے نفی کرنے کے لئے اسکا پیہم ذکر کرتا ہے تو اسکا نام طریقت ہوا کیونکہ طریقت کہتے ہیں شریعت پر چلنے کو۔ اور پھر اس نفی کے بعد قلب سے غیر اللہ کا انتفاء ہو جاتا ہے یہ حقیقت ہے اور گو اس مرتبہ کا حصول سالک کے لئے غیر اختیاری ہے تاہم حسب وعدہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا حق تعالیٰ اپنے فضل سے نفی پر اس انتفاء کو مرتب فرما دیتے ہیں۔ پس جب سالک پر حقیقت منکشف ہوگی تو پھر اسکے لئے معرفت کا حصول بھی لازم ہو جاتا ہے اسلئے کہ تحصیل حقیقت اور حصول معرفت میں تلازم ہے اسطرح سے اسی ایک کلمہ میں شریعت۔ طریقت۔ حقیقت اور معرفت سب ہی کچھ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عارفین نے ہر زمانہ میں اسکا اہتمام فرمایا ہے اور تمام اذکار پر اسکو ترجیح دی ہے جیسا کہ خود صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں کہ

آخر کوئی بات تو ہے کہ تم عارفین کو اور ارباب قلوب و یقین کو دیکھتے ہو کہ تمام اذکار پر اسکو ترجیح دیتے ہیں اسلئے کہ انھوں نے اسکے اندر ایسے خواص دیکھے ہیں کہ جنکے پہچاننے کا بجز وجدان اور ذوق کے اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حضرات اس کلمہ کے ذکر کی کثرت سے وجدان اور ذوق تک پہنچے ہیں اور پھر وجدان اور ذوق کے ذریعہ سے اسکی برکات کا ان پر انکشاف ہوا اب اگر میں اس پر یہ شعر پڑھوں تو کچھ بیجا نہ ہوگا ؎

تو نہ دیدی گہے سلیماں را | چہ شناسی زبانِ مرغاں را

ظاہر ہے کہ اب اس صورت میں علم ہونیکا ذریعہ یہی ہے کہ یا تو خود انسان ایسا وجدان اور ذوق اپنے اندر پیدا کرے اور اسکی وجہ سے خواص و برکات کا خود مشاہدہ کرلیوے اور اگر اتنی ہمت نہیں تو پھر جو لوگ کہ اہل ذوق اور اہل وجدان ہیں یعنی جنھوں نے کہ ذوق و وجدان کو اپنے اندر پیدا کیا ہے اور اسکے بعد اسکے ذریعہ سے انکے قلب پر انکشاف ہوا اور انھوں نے

ذوق و وجدان کا ماحصل کثرت ذکر ہے

اسکی خبر دی ہے اسکی تصدیق کرے اور اگر خود بھی حاصل نہیں کیا اور نہ حاصل کرنیوالوں کی تصدیق کی تو پھر اس چیز کے ان تک پہونچنے کی کوئی صورت نہیں۔

علماء نے محسوسات میں اسکی ایک مثال دی ہے کہ جیسے ثبوت ہلال کی ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان خود اسکا مشاہدہ کرے اور اگر انسان ضعیف البصر اور فاقد البصر ہے تو خود چاند نہیں دیکھ سکتا تو اب اسکے لئے متعین ہے کہ جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے انکی رویت کی تصدیق کرے لیکن اگر کوئی شخص نہ تو خود چاند دیکھ سکتا ہو اور نہ دیکھنے والوں کی تصدیق کرے تو ظاہر ہے اسکے لئے رویت ہلال کی کوئی صورت نہیں ہے۔

پس جب عارفین اور ارباب قلوب ویقین فرمارہے ہیں کہ ہم نے کلمۂ طیبہ کے ذکر میں کچھ خواص دیکھے ہیں اور کچھ برکات دیکھے ہیں جو دیگر اذکار میں نہیں ہیں اور اسی لئے ان حضرات نے اس کلمۂ شریف کو سلوک وتسلیک کیلئے تجویز فرمایا ہے تو اور لوگوں کو اسکی تصدیق کرنی چاہیئے۔

آگے صاحب مرقاۃ کلمۂ طیبہ کے خواص وبرکات کو ایک واقعہ سے واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

سید علی بن میمون کا واقعہ

وَمِمَّا يُوضِحُ لَكَ ذَالِكَ اَنَّ السَّيِّدَ عَلِيَّ ابْنَ مَيْمُوْنِ الْمَغْرِبِيْ لَمَّا تَصَرَّفَ فِي الشَّيْخِ عُلْوَانِ الْحَمَوِيْ وَهُوَ كَانَ مُفْتِيًا مُدَرِّسًا فَنَهَاهُ عَنِ الْكُلِّ وَاَشْغَلَهُ بِالذِّكْرِ فَطَعَنَ الْجُهَّالُ فِيْهِ بِاَنَّهُ اَضَلَّ شَيْخَ الْاِسْلَامِ وَمَنَعَهُ عَنْ نَفْعِ الْاَنَامِ ثُمَّ بَلَغَ السَّيِّدَ اَنَّهُ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ اَحْيَانًا فَمَنَعَهُ مِنْهُ فَقَالَ النَّاسُ اِنَّهُ زِنْدِيْقٌ يَمْنَعُ مِنْ تِلَاوَةِ الْقُرْآنِ الَّذِيْ هُوَ قُطْبُ الْاِيْمَانِ وَغَوْثُ الْاِيْقَانِ لٰكِنْ طَاوَعَهُ الْمُرِيْدُ اِلٰى اَنْ حَصَلَ لَهُ الْمَزِيْدُ وَانْجَلَتْ مِرْاٰةُ قَلْبِهٖ وَحَصَلَ لَهُ مُشَاهَدَةُ رَبِّهٖ فَاَذِنَ لَهُ فِيْ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ فَلَمَّا فَتَحَ الْمُصْحَفَ فُتِحَ عَلَيْهِ الْفُتُوْحَاتُ الْاَزَلِيَّةُ وَالْاَبَدِيَّةُ وَظَهَرَ لَهُ كُنُوْزُ الْمَعَارِفِ وَالْعَوَارِفِ الظَّاهِرَةِ وَالْبَاطِنِيَّةِ فَقَالَ السَّيِّدُ اَنَا مَا كُنْتُ اَمْنَعُكَ عَنِ الْقُرْآنِ وَاِنَّمَا كُنْتُ اَمْنَعُكَ عَنْ لَقْلَقَةِ اللِّسَانِ وَالْغَفْلَةِ عَمَّا فِيْهِ مِنَ الْبَيَانِ فِيْ هٰذَا الشَّاْنِ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ۔

فرماتے ہیں کہ اور تمھارے لئے کلمۂ طیبہ کے خواص اور آثار ظاہر کرنیوالے واقعات کے منجملہ ایک

واقعہ یہ ہے کہ سید علیؒ بن میمون مغربی نے جب شیخ علوانؒ حموی میں تصرف کیا جسوقت کہ وہ مفتی اور مدرس تھے تو انھیں سب مشاغل سے روکدیا اور ذکر میں انکو لگا دیا (میں کہتا ہوں کہ سیاق و سباق سے ظاہر یہی ہے کہ شیخ نے انکے لئے نفی و اثبات ہی کا ذکر تجویز فرمایا ہوگا) اس پر جاہل عوام نے شور مچایا اور اعتراض کیا کہ سید علی بن میمون نے تو شیخ الاسلام کو گمراہ کردیا اور خلق خدا کو نفع پہونچانے سے انکو روکدیا کچھ دنوں بعد سید علیؒ کو یہ اطلاع ملی کہ شیخ علوان کبھی کبھی تلاوت قرآن بھی کیا کرتے ہیں پس اس سے بھی روکدیا۔ اب تو جاہلوں کو اور موقع ملا اور آپسمیں چرچا کیا کہ سید علی تو زندیق ہوگیا اسلئے کہ قرآن جو کہ قطب الایمان اور غوث الایقان ہے انکی تلاوت سے بھی منع کرتا ہے۔ غرض ادہر لوگ اعتراض کرتے رہے مگر مرید رشید نے شیخ کا انقیاد کیا اور انکی تعلیم کا اتباع کیا یہاں تک کہ انھیں بڑے بڑے مراتب ملے اور انکے قلب کا آئینہ منور ہوگیا اور رب کا مشاہدہ حاصل ہوا اسکے بعد شیخ نے تلاوت قرآن کی اجازت دیدی چنانچہ اب جو مصحف کھولا تو اپنے اوپر فتوحات ازلیہ و ابدیہ کا ظہور دیکھا اور ظاہری و باطنی عوارف اور معارف کے خزانوں کو کھلا ہوا پایا اس وقت سید علیؒ نے کہا کہ اب تو تمھاری بھی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ میں نے تم کو تلاوت قرآن سے نہیں روکا بلکہ یہ پسند نہیں تھا کہ تم اسکو محض زبان سے پڑھو اور اسمیں جو مضامین عالیشان بیان فرمائے گئے ہیں اس سے تمھارا قلب غافل رہے۔ اسی سے تم کو نکالنا تھا اب (الحمد للہ) تم اس سے نکل گئے جاؤ اب خوب تلاوت کرو۔

آپ نے دیکھا کہ ذکر اللہ کی برکت سے شیخ علوان حموی کتنے بڑے عقبہ سے نکل گئے اسی کے متعلق فرمارہے ہیں کہ ذکر اللہ کے لئے خواص و برکات ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ وہ برکت یہی ہے کہ ذکر اللہ کی کثرت سے قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے اور عشق و محبت کا خاصہ ہی یہ ہے کہ جب وہ کسی قلب میں جاگزیں ہوجاتی ہے تو وہاں سے رذائل کا خاتمہ ہوجاتا ہے مولینا رومؒ مثنوی میں فرماتے ہیں کہ ؎

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد	او زحرص و عیب کلّی پاک شد
شاد باش اے عشق خوش سودائے ما	اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما	اے تو افلاطون و جالینوس ما

یعنی عشق حاصل ہوجانے کے بعد آدمی حرص اور جمیع نقائص اور اخلاق ذمیمہ سے بالکل پاک ہوجاتا ہے آگے مولینا عشق کو مجازاً مخاطب کرکے فرمارہے ہیں کہ اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات

ازالۂ رذائل کی محبت کا خاصہ ہے

درست ہو جاتے ہیں اور تجھ سے سب امراض کا علاج ہو جاتا ہے اور نخوت و ناموس کا دفعیہ ہوتا ہے کیونکہ عشق کیلئے ذلت لازم ہے۔ اور ذلت و ناموس جمع نہیں ہوتے ایک کے غلبہ سے دوسرا جاتا رہتا ہے آگے عشق کی کار فرمائی کو بعض واقعات سے بیان کرتے ہیں ؎

جسم خاک از عشق بر افلاک شد کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جان طور آمد عاشقا طور مست و خر موسیٰ صاعقا

جسم خاک سے مراد جسد مبارک ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور افلاک پر جانے سے مراد معراج ہے اور کوہ کا رقص میں آنا اشارہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ خواہش دیدار کی طرف مطلب یہ کہ آپ کا معراج میں تشریف لیجانا بوجہ عشق ہی کے ہوا کیونکہ آپ محبوب تھے اور محبوب کو قرب و عروج عطا ہی ہوتا ہے اسی طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ دیدار بھی بدولت عشق ہی کے ہوا۔ کیونکہ اس واقعہ میں آپ محب تھے اسی کی وجہ سے آپ نے دیدار کی درخواست کی جس سے تجلی ہوئی اور پہاڑ حرکت میں آگیا جس کو یہاں مجازاً مستی سے تعبیر کیا ہے اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے۔ غرض ایک اثر محبوبیت کا تھا اور دوسرا محبیت کا اسمیں بھی عشق کی مدح کرنا مقصود ہے (کلید مثنوی ج ۱ ص)

یہ حضرات عشق و محبت کی مدح اسلئے کرتے ہیں تاکہ انسان کو اس سے محبت ہو جائے اور وہ اسکی تحصیل کی فکر میں لگ جائے کیونکہ محبت کارفرما ہوتی ہے اور ما سوائے محبوب ہر شئے کو قلب سے نکالدیتی ہے اسی کو مولانا رومؒ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ ؎

عشق آں شعلاست کوچوں بر فروخت ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

یعنی عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہو جاتا ہے تو پھر علاوہ معشوق کے سب چیزوں کو خاکستر کر کے رکھدیتا ہے۔ جن میں رذائل بھی داخل ہیں۔ پس جب قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت آجاتی ہے تو رذائل سب فنا ہو جاتے ہیں۔

یہاں تو مولینا رومؒ نے یہ فرمایا ہے اور ایک دوسرے مقام پر ذکر اللہ کا ازالۂ رذائل کا سبب ہونا ایک دوسری جہت سے بیان فرمایا ہے اور اسمیں شک نہیں کہ بہت خوب فرمایا ہے فرماتے ہیں کہ ؎

ذکر حق پاک است وچوں پاکی رسید رخت بر بندد برون آید پلید
یہ چوں بر آید نام پاک اندر دہاں نے پلیدی ماند و نے آں دہاں

یعنی حق تعالیٰ کا ذکر ایک پاک چیز ہے اور جب کسی جگہ پاکی پہونچ جاتی ہے تو پھر وہاں سے پلیدی اپنا بوریہ بستر باندھکر رخصت ہو جاتی ہے - جب حق تعالیٰ کا پاک نام منھ میں آجاتا ہے یعنی زبان پر جاری ہوکر قلب تک پہونچ جاتا ہے تو پھر نہ وہاں پلیدی ہی رہجاتی ہے اور نہ اب وہ منھ ہی پہلے جیسا باقی رہ جاتا ہے -

سبحان اللہ کیا عمدہ بات بیان فرمائی ہے اور کیسی مثل بیان فرمائی ہے - پس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ جو ذکر کہ موثر فی القلب ہو وہ رذائل کا ازالہ کر دیتا ہے اور یہ کہنا کہ ذکر اللہ کو ازالۂ رذائل میں کوئی دخل نہیں بلاشبہ ذکر کے معنی اور اسکی حقیقت سے ناواقفیت ہی پر مبنی ہے - چنانچہ ہو سکتا ہے ابن حجرؒ کا یہ قول بھی مقام ذکر میں قدم رکھنے سے پہلے کا ہو اس لئے کہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے طریق میں قدم بعد میں رکھا - اس سلسلہ میں انکا ایک واقعہ علامہ شعرانی نے الیواقیت والجواہر میں نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ

وَقَدْ شَرَحَ الْحَافِظُ ابْنُ حَجَرٍ بَعْضَ اَبْيَاتٍ مِنْ تَائِيَّةِ ابْنِ الْفَارِضِ وَقَدَّمَهَا اِلٰى سَيِّدِي الشَّيْخِ مَدْيَنَ لِيَكْتُبَ لَهٗ عَلَيْهِمَا اِجَازَةً فَكَتَبَ لَهٗ عَلٰى ظَهْرِهَا مَا اَحْسَنَ مَا قَالَ بَعْضُهُمْ ؎

سَارَتْ مُشَرِّقَةً وَسِرْتُ مُغَرِّبًا شَتَّانَ بَيْنَ مُشَرِّقٍ وَمُغَرِّبِ

ثُمَّ اَرْسَلَهَا اِلَى الْحَافِظِ فَتَنَبَّهَ لِاَمْرٍ كَانَ عَنْهُ غَافِلًا ثُمَّ اَذْعَنَ لِاَهْلِ الطَّرِيْقِ وَصَحِبَ سَيِّدِي مَدْيَنَ اِلٰى اَنْ مَاتَ -

(الیواقیت صـ ۱۵)

اوپر سے صاحب یواقیت یہ فرماتے چلے آرہے ہیں کہ کسی کے کلام کی شرح کرنے کے لئے اسکی مراد سے واقفیت ضروری ہے چنانچہ جو شخص صوفیہ کی مراد سے ناواقف ہوگا وہ انکے کلام کی شرح نہیں کر سکتا اسی پر یہ واقعہ لکھا ہے کہ علامہ ابن حجرؒ نے ابن فارضؒ کے قصیدہ تائیہ کے چند اشعار کی شرح لکھکر اسکو شیخ مدینؒ کی خدمت میں تصدیق اور تقریظ کیلئے پیش کیا تو انھوں نے اسی کے سرورق پر یہ لکھکر حافظ ابن حجر کو واپس کر دیا کہ

کسی نے کیا خوب بات کہی ہے کہ محبوبہ نے تو مشرق کا رخ کیا اور میں مغرب کی جانب چلدیا - پس مشرق اور مغرب کے جانیوالوں میں کتنا فاصلہ ہو جاتا ہے

مطلب شیخ مدینؒ کا یہ تھا کہ آپ علوم ظاہر کے ماہر ہیں چنانچہ حدیث کی شرح آپنے لکھدی لیکن امور باطن سے

صحیح ہے کہ ذکر موثر فی القلب رذائل کو زائل کر دیتا ہے ذکر اللہ کو ازالۂ رذائل میں دخل ہے

مقصود شیخ مدین

آپکو مناسبت نہیں ہے اسلئے اسمیں دخل نہ دیجئے اور ان چیزوں کو جو اسکے اہل ہیں انھیں کیلئے رہنے دیجئے چنانچہ انکی اس تحریر سے ابن حجر کو تنبہ ہوا اور اپنی خامی کو سمجھ گئے اور طریق اور اہل طریق کی تصدیق کی اور انھیں شیخ مدین کی صحبت میں رہ پڑے اور انھیں کی صحبت میں زندگی گذار دی دیکھئے اسمیں تصریح ہے کہ حافظ ابن حجر کا ابتدائی دور طریق سے غفلت میں گذرا بالآخر ایک شیخ وقت نے انھیں ٹھیک کیا جس طرح کہ شیخ علوان حموی کو شیخ علی بن میمون نے درست کیا تھا۔

خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ ذکر اللہ کی کثرت سے قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت تمام چیزوں سے بڑھکر ہے اور مومن کے لئے اسکی تحصیل فرض ہے یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں ذکر اللہ کو خیر اعمال یعنی افضل اعمال اور ازکی عمل یعنی انمیٰ اور انقی عمل اور انفاق ذہب و ورق سے بھی بڑھکر اور بذل النفس فی سبیل اللہ سے بڑھکر فرمایا گیا ہے کیونکہ یہ مورث محبت ہوتا ہے اور کسی چیز کے ذریعہ وسبب کا بھی وہی درجہ ہوتا ہے جو اس چیز کا ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دنیا و ما فیہا سے بڑھکر ہے تو اسکے متعلق تو خود نص میں آتا ہے۔

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآءُکُمْ وَاَبْنَآءُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝

آپ ان سے کہدیجئے کہ اگر تمھارے باپ تمھارے بیٹے تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جسمیں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن میں رہنے کو تم پسند کرتے ہو اگر یہ سب چیزیں تم کو اللہ سے اور اسکے رسول سے اور اسکی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجیں اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنے والوں کو انکے مقصود تک نہیں پہونچاتے۔

(بیان القرآن صـ۱۰ پ۱)

دیکھئے اس آیت میں ان امور دنیویہ کی اجنبیت پر نکیر ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کو غیر اللہ کی محبت پر غالب کرنے کی ترغیب اور اسکے ترک پر سخت وعید ہے۔

اور ابھی مفصل بیان کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا سبب عادی ذکر اللہ ہے اسلئے

یہاں حدیث میں ذکر کو جملہ طاعات سے اور انفاق مال اور بذل نفس سے افضل فرمایا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت سب کی اصل ہے اور ذکر اسکا سبب ہے اور سبب کا بھی وہی درجہ ہوتا ہے جو مسبب کا ہوتا ہے۔ اسلئے ذکر اللہ کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔

حضرت سیدنا رفاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

بزرگو! ذکر اللہ کی پابندی کرو کیونکہ ذکر وصال حق کا مقناطیس ہے۔
قرب کا ذریعہ ہے۔ جو اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اللہ سے مانوس ہو جاتا ہے اور
جو اللہ سے مانوس ہوا وہ اللہ تک پہونچ گیا۔

(البنیان المشید)

دیکھئے سیدنا رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کی کیسی ترغیب دی ہے اور اسکو وصال حق کا مقناطیس فرما رہے ہیں یعنی جس طرح مقناطیس میں اثر ہوتا ہے کہ اپنی طرف کشش کر لیتا ہے اسی طرح ذکر اہل ذکر کو کھینچ کر اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت سیدنا معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

وصال حق طلبی ہم نشین نامش باش ‏ ‏ ‏ ‏ ببیں وصال خدا در وصالِ نام خدا

یعنی اگر تم حق تعالیٰ کا وصال چاہتے ہو تو اسکے نام کی ہمنشینی اختیار کرو پھر حق تعالیٰ کا وصال نام کے وصال میں دیکھو۔ اس سے معلوم ہوا کہ نام خدا سے وصال ہی عین وصال حق ہے۔

ذکر کی فضیلت کے بیان کے بعد اب آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اذکار مسنونہ بیان کر دیئے جائیں تاکہ طالبین کو انتخاب میں سہولت ہو اور غیر مسنونہ اذکار کی جانب توجہ نہ کریں کیونکہ شیطان کی اس زمانہ میں یہ بھی ایک رہزنی ہے کہ اس نے عوام کو اذکار مسنونہ سے غیر مسنونہ اوراد میں لگا دیا ہے۔ جیسا کہ صاحب مرقاۃ لکھتے ہیں کہ

وَالْعَوَامُ يَتْرُكُوْنَهَا وَيَتَّبِعُوْنَ مُوَاظَبَةَ الْاَسْمَاءِ الْغَرِيْبَةِ
وَالدَّعَوَاتِ الْعَجِيْبَةِ الَّتِيْ غَالِبُهَا لَا اَصْلَ لَهَا فِي الْكِتَابِ
وَالسُّنَّةِ۔

یعنی عوام اوراد مسنونہ کو تو ترک کر دیتے ہیں اور ایسے اسماء غریبہ اور دعوات عجیبہ کا اتباع کرتے ہیں جن میں اکثر و بیشتر ایسے ہوتے ہیں کہ کتاب و سنت میں انکی کوئی اصل نہیں ہوتی۔

پھر اذکار مسنونہ بھی کتاب و سنت میں بیشمار آئے ہیں۔ اتنے ہیں کہ اگر آپ ان سب کا احاطہ کرنا چاہیں گے تو پریشان ہو جائیں گے اور یہ سمجھ ہی میں نہ آئیگا کہ کس کو لیں اور کس کو نہ لیں جیسا کہ ایک

صحابیؓ کا واقعہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ شرائع اسلام کی کثرت سے گھبرا کر انھوں نے یہ عرض کیا

یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ شَرَائِعَ الْاِسْلَامِ قَدْ کَثُرَتْ عَلَیَّ فَاَخْبِرْنِیْ بِشَیْءٍ اَتَشَبَّثُ بِہٖ قَالَ لَا یَزَالُ لِسَانُکَ رَطْبًا مِّنْ ذِکْرِ اللّٰہِ۔

یعنی یارسول اللہ اسلام کے اعمال مشروعہ مجھ پر بہت زیادہ ہو گئے ہیں لہٰذا آپ مجھے کوئی ایسی چیز تعلیم فرمائیے کہ جس کو میں مضبوطی کے ساتھ پکڑلوں (اور کامیاب ہو جاؤں) آپ نے فرمایا کہ بس اسکا لحاظ رکھو کہ تمھاری زبان ہر وقت ذکر اللہ سے تر رہے۔

اس پر صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں کہ

قَوْلُہٗ شَرَائِعَ الْاِسْلَامِ اَلْمُرَادُ مَا شَرَعَ اللّٰہُ وَ ظَہَرَہٗ لِعِبَادِہٖ مِنَ الْفَرَائِضِ وَالسُّنَنِ وَالظَّاہِرُ اَنَّ الْمُرَادَ ہٰہُنَا النَّوَافِلُ قَدْ کَثُرَتْ عَلَیَّ اَیْ غَلَبَتْ عَلَیَّ بِالْکَثْرَۃِ حَتّٰی عَجِزْتُ عَنْہَا لِضُعْفِیْ بِشَیْءٍ اَیْ بِشَیْءٍ قَلِیْلٍ مُوْجِبٍ لِجَزَاءٍ جَزِیْلٍ اَسْتَغْنِیْ بِہٖ عَمَّا یَغْلِبُنِیْ وَلَیَشُقُّ عَلَیَّ۔ قَالَ الطِّیْبِیُّ مَعْنَاہُ اَخْبِرْنِیْ بِشَیْءٍ یَسِیْرٍ مُسْتَجْلِبٍ لِثَوَابٍ کَثِیْرٍ (اَتَشَبَّثُ بِہٖ) مِنْ عِبَادَۃٍ جَامِعَۃٍ غَیْرِ شَاقَّۃٍ مَانِعَۃٍ فِیْ مَکَانٍ دُوْنَ مَکَانٍ وَّزَمَانٍ دُوْنَ زَمَانٍ وَحَالٍ دُوْنَ حَالٍ مِنْ قِیَامٍ وَقُعُوْدٍ وَاَکْلٍ وَشُرْبٍ وَمُخَالَطَۃٍ وَاِعْتِزَالٍ وَشَبَابٍ وَہَرَمٍ وَغَیْرِ ذَالِکَ وَیَکُوْنُ جَابِرًا عَنْ بَقِیَّتِہَا مُشْتَمِلًا عَلٰی کُلِّیَّتِہَا۔

یعنی شرائع اسلام سے مراد وہ فرائض اور سنن ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے مشروع فرمایا ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ مراد یہاں اس سے نوافل ہیں یعنی امور نافلہ اس قدر کثیر ہیں کہ اپنی کثرت کی وجہ سے گویا وہ مجھ پر غالب آگئے ہیں اور میں اپنے ضعف کے سبب ان کے کرنے سے عاجز اور مغلوب ہو گیا ہوں لہٰذا مجھے کوئی ایسی مختصر سی چیز بتلا دیجئے جو عملاً تو قلیل ہو مگر ثواب کے اعتبار سے جزیل ہو اور جملہ نوافل سے بے نیاز کر دینے والی ہو۔ طیبی فرماتے ہیں کہ ایسی کوئی شے موجود تو یسیر ہو لیکن ثواب اسکا کثیر ہو یعنی ایسی کوئی عبادت ہو جو جامع بھی ہو نفس پر شاق بھی نہ ہو اور ایسی نہ ہو جو کسی جگہ یا کسی زمانہ میں ہو سکے اور کہیں نہ ہو سکے یا ایک حال میں تو کی جا سکے اور دوسرے حال میں اسکو نہ کر سکیں۔ یعنی قیام و قعود، اکل و شرب، خلوت و جلوت، جوانی اور بڑھاپے وغیرہ۔ غرض کہ سب حالات میں وہ کیجا سکے اور دوسری بقیہ جو

ترک ہو جائیں گی انکے ترک کا اس سے جبر بھی ہو جائے اور ایسی کلی عبادت ہو کہ سب جزئیات پر مشتمل ہو۔

دیکھئے یہاں ان صحابی کے حسب حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو اللہ اللہ کرنے کی تلقین فرمادی حالانکہ وہ شرائع اسلام کی کثرت کیوجہ سے پریشان ہو گئے تھے۔ اسی طرح سے کہیں آپؐ نے فرمایا کہ افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ اور کہیں فرمایا کہ افضل الکلام اربع سبحان اللہ و الحمد للہ و لا الٰہ الا اللہ و اللہ اکبر۔ اور کہیں سبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم کی فضیلت بیان فرمادی اور کہیں لا حول ولا قوۃ الا باللہ کو جنت کا خزانہ فرمایا۔ غرضیکہ ذکر کی تو بہت سی صورتیں قرآن وحدیث میں وارد ہیں لیکن روایات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سب سے سہل اللہ اللہ کہنا ہے اور سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ ہے اور تلاوتِ قرآن کہ وہ بھی ذکر ہی ہے وہ افضل ہونے کے ساتھ ساتھ ذرا مشکل بھی ہے اس لئے وہ خواص اور منتہیوں کا ذکر ہے۔ کیونکہ تلاوت وہ زیادہ مفید ہے جو باطنی تأثر کے ساتھ ہو۔ جیسا کہ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ کی تفسیر میں ابھی بیان کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ قلب کو شریک کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور نہ ہر شخص کے بس کی بات ہے۔ کوئی کوئی اللہ تعالیٰ کا بندہ ایسا ہوتا ہے جس کو اس سے مناسبت تامہ حاصل ہوتی ہے اور قلبی لگاؤ ہو جاتا ہے۔ وہی تو جب قرآن کو پڑھتا ہے تو دل سے پڑھتا ہے باقی عوام اور مبتدی لوگ تو انکے لئے قلب کا شریک کرنا اور تدبر وتفکر فی المعنی تو بجائے خود رہے صرف اسکا تلفظ ہی دشوار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ۔ سبحان اللہ۔ الحمد للہ۔ اللہ اللہ۔ کہنا انکے لئے بہ نسبت ایک آیت قرآنیہ کی تلاوت کے آسان ہوتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف کے ہوتے ہوئے اور اسکے افضل الذکر ہونے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مختلف اذکار کی تعلیم بھی امت کو فرمائی تاکہ ہر شخص اپنی سہولت کا لحاظ کرتے ہوئے ان میں سے جس ذکر کو اپنے مناسب حال سمجھے اختیار کرے۔ نیز تاکہ ذاکرین کیلئے ذریعہ تفنن رہے کہ ایک ذکر کرکے کچھ کلال و ملال ہوا تو دوسرا ذکر شروع کر دیا دوسرے میں ہوا تو تیسرا شروع کر دیا اسیطرح کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ ہونیکی وجہ سے ہمیشہ انکی طبیعت میں نشاط اور انشراح بھی رہیگا اور انکا زیادہ وقت ذکر میں بھی گذر سکیگا۔

سبحان اللہ کیا شان کریمی ہے کہ امت کے ضعفاء اور اقویاء سب ہی کی رعایت فرمائی کہ خواص کیلئے تلاوت قرآن کو اگر سکون قلب اور طمانینت باطن کا ذریعہ بنایا تو عوام کے لئے

اللہ اللہ ہی کہنے کو سبب تسلی بنا دیا۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ محبوب کے نام کی تکرار سے بھی محب کو تسلی ہوتی ہے۔

حدیث شریف میں تو یہ آتا ہے کہ آپؐ فرماتے ہیں کہ "افضل الذکر لا الہ الا اللہ" یعنی لا الہ الا اللہ افضل الذکر ہے لیکن دیکھا جاتا ہے کہ اسکی قدر لوگوں کو نہیں اسکو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ جب کسی چیز کے ساتھ ہمارا اعتقاد ہی درست نہ ہوگا تو اسکا فیض ہمکو کیا ملیگا۔ انکار کا انجام خسران ہے۔

حالانکہ اس کلمہ کی فضیلت کے لیے یہی کیا کم ہے کہ اسکے ذریعہ سے انسان کفر سے نکلکر اسلام میں داخل ہوتا ہے اور جس طرح سے اسکے ذریعہ سے کفر ظاہری سے انسان نکلتا ہے اسی طرح سے کفر باطنی سے نکلنے کا ذریعہ بھی یہی کلمہ ہے۔

قاضی ثناء اللہ صاحبؒ پانی پتی ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں:۔

پیش از فنائے نفس بکثرت نوافل وتلاوت قرآن ترقی در قرب دست ندہد حق تعالیٰ می فرماید لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ یعنی قرآن را بدون پاکی مس نہ کنند۔ چنانچہ طہارت ظاہری شرط نماز است۔ بدون طہارت از رذائل نفس برکات نماز وتلاوت حاصل نتواں کرد۔ چنانچہ در ظاہر ازالۂ کفر بکلمۂ لا الہ الا اللہ است۔ ہم چنیں ازالۂ کفر باطنی از کلمۂ لا الہ الا اللہ می شود۔ رسولؐ کریم می فرماید جددوا ایمانکم یعنی ایمان خود را تازہ کنید۔ مردم پرسیدند چہ گونہ ایمان را تازہ کنیم؟ فرمود بہ تکرار لا الہ الا اللہ۔ جمیع مشائخ سلاسل برائے مریدان ذکر لا اِلٰہ اِلَّا اللہ مقرر داشتہ۔

(ارشاد الطالبین ص۳۶)

فرماتے ہیں کہ نفس کو فنا کرنے سے پہلے کثرت نوافل اور تلاوت قرآن سے قرب الٰہی میں ترقی نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ یعنی ہاتھ نہ لگائیں اسکو مگر طہارت والے لوگ چنانچہ طہارت ظاہری نماز کی شرط ہے اور رذائل نفس سے پاک ہوئے بغیر نماز و تلاوت کی برکتیں حاصل نہیں کیجاسکتیں۔

جس طرح ظاہر میں کفر کا ازالہ کلمۂ لا الہ الا اللہ سے ہوتا ہے اسی طرح باطنی کفر کا ازالہ بھی لا الہ الا اللہ ہی سے ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جددوا ایمانکم

یعنی اپنے ایمان کو تازہ کرو۔ صحابہؓ نے دریافت کیا ایمان کو کس طرح تازہ کریں؟ فرمایا کہ بار بار کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کے پڑھنے سے۔

چنانچہ تمام سلسلوں کے مشائخ نے اپنے مریدوں کے لئے اسی کلمہ لا الہ الا اللہ کا ذکر مقرر کیا ہے (بعض جہراً کرتے ہیں بعض سراً)

میں کہتا ہوں کہ سلاسل اربعہ میں اسی ذکر کا خاص معمول ہے چنانچہ بزرگان دین نے اسکے متعلق جو کچھ بیان فرمایا ہے اسکے دیکھنے سننے کے بعد ایک عجیب حقیقت کا انکشاف ہوجاتا ہے وہ یہ کہ اسکے تکرار سے جس طرح آدمی موحد ہوکر شرک سے بری ہوجاتا ہے اسی طرح تمام درجات سلوک تک رسائی بھی اسی سے ہوتی ہے۔ شرط اخلاص ہے۔

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اس کلمہ کی عظمت کے ظہور کے لئے اسکے کہنے والے کے قلب میں اسکی عظمت کا ہونا ضروری ہے جس درجہ عظمت اسکے کہنے میں ہوگی اسی قدر عظمت و برکت کا بھی ظہور ہوگا۔

اس علم کے بعد اپنے حرمان کی وجہ بھی معلوم ہوجاتی ہے اور طالبین راہ جو بھٹکتے پھرتے ہیں وہ راہ پر بھی لگ سکتے ہیں۔

اس کلمہ کی فضیلت کے سلسلے میں ایک اور حدیث سنئے:۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَفْضَلُ الدُّعَاءِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔

(رواہ الترمذی)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ افضل الذکر لا الہ الا اللہ ہے اور سب سے بہتر دعا الحمد للہ ہے۔

اسکے تحت صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں

وَفِيْ رِوَايَةٍ هِيَ اَفْضَلُ الْحَسَنَاتِ رَوَاهُ اَحْمَدُ لِاَنَّهٗ لَا يَصِحُّ الْاِيْمَانُ اِلَّا بِهٖ قَالَ الطِّيْبِيُّ ذَكَرَ بَعْضُ الْمُحَقِّقِيْنَ اِنَّهٗ اِنَّمَا جَعَلَ التَّهْلِيْلَ اَفْضَلَ الذِّكْرِ لِاَنَّ لِلتَّهْلِيْلِ تَاثِيْرًا فِيْ تَطْهِيْرِ الْبَاطِنِ عَنِ الْاَوْصَافِ الذَّمِيْمَةِ الَّتِيْ هِيَ مَعْبُوْدَاتٌ فِيْ بَاطِنِ الذَّاكِرِ قَالَ تَعَالٰى اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ فَيُفِيْدُ نَفْيَ عُمُوْمِ الْاِلٰهِيَّةِ بِقَوْلِهٖ لَا اِلٰهَ وَيُثْبِتُ الْوَاحِدَ بِقَوْلِهٖ اِلَّا اللّٰهُ وَيَعُوْدُ الذِّكْرُ مِنْ ظَاهِرِ

لِسَانِهٖ اِلٰی بَاطِنِ قَلْبِهٖ فَیَتَمَکَّنُ فِیْهِ وَیَسْتَوْلِیْ عَلٰی جَوَارِحِهٖ وَجَدَ حَلَاوَةَ هٰذَا مَنْ ذَاقَ۔

(مرقات ۵۲ ج ۲۸)

یعنی امام احمد کی روایت میں بجائے افضل الذکر کے افضل الحسنات آیا ہے اور اسکے افضل الذکر یا افضل الحسنات ہونیکی وجہ یہ ہے کہ ایمان کی صحت بدون اسکے نہیں ہوتی۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ بعض محققین نے فرمایا ہے کہ لا الہ الا اللہ کو افضل الذکر اسلئے کہا گیا ہے کہ تہلیل کے لئے باطن کی تطہیر میں خاص تاثیر ہے یعنی ذاکر کے باطن کو اوصاف ذمیمہ سے جو کہ اسکے باطن میں معبودات ہیں بالکل پاک وصاف کردیتا ہے (پس یہ اپنے ذات کے اعتبار سے تو ذکر ہے اور اثر کے اعتبار سے مطہر ہے باطن کا) اللہ تعالٰی ارشاد فرماتے ہیں کہ کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے اپنے ہوائے نفسانی کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔

پس مومن لا الٰہ کہکر تو تمام معبودان باطل کی نفی کرتا ہے اور الّا اللہ کہکر ایک ذات وحدہٗ لاشریک کا اثبات کرتا ہے (اسی لئے اصطلاح میں اسکو ذکر نفی و اثبات کہتے ہیں) اور ذکر سالک کے ظاہر لسان سے باطن قلب کی جانب لوٹتا ہے اور اسمیں متمکن ہوجاتا ہے پھر اسکے جوارح پر مستولی ہوجاتا ہے۔ اور اسکی حلاوت تو وہی پائیگا جو اسکو چکھے گا۔ (وَمَنْ لَّمْ یَذُقْ لَمْ یَدْرِ اور جس نے نہیں چکھا وہ اسکی لذت کو کیا سمجھ سکتا ہے)۔

ایک اور حدیث سنئے:۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مُوْسٰی عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ یَا رَبِّ عَلِّمْنِیْ شَیْئًا اَذْکُرُکَ بِهٖ اَوْ اَدْعُوْکَ فَقَالَ یَا مُوْسٰی قُلْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَقَالَ یَا رَبِّ کُلُّ عِبَادِکَ یَقُوْلُ هٰذَا اِنَّمَا اُرِیْدُ شَیْئًا تَخُصُّنِیْ بِهٖ قَالَ یَا مُوْسٰی لَوْ اَنَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ وَعَامِرَهُنَّ غَیْرِیْ وَالْاَرْضِیْنَ السَّبْعَ وُضِعْنَ فِیْ کِفَّةٍ وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فِیْ کِفَّةٍ لَمَالَتْ بِهِنَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔

(مرقاۃ ۵۲ ج ۲)

حدیث شریف کا ترجمہ یہ ہے

یہ حدیث مشکوٰۃ شریف کی ہے صاحب مشکوٰۃ نقل کرتے ہیں کہ

حضرت ابو سعید خدریؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اے میرے رب! مجھ کو کوئی ذکر تعلیم فرمائیے جس کے ذریعہ آپ کو یاد کیا کروں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ لا الٰہ الا اللّٰہ کہو۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ عرض کیا کہ اے میرے رب! اس کو تو آپ کے سب ہی بندے کہتے ہیں۔ میں ایسی چیز چاہتا ہوں کہ مجھ ہی کو آپ اس کے ساتھ خاص فرمائیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور اس کے آباد کرنے والے سوا میرے اور ساتوں زمین اور اس کے بسنے والے ایک پلڑ میں رکھے جائیں اور لا الٰہ الا اللّٰہ دوسرے پلڑ میں تو البتہ انکے مقابلہ میں لا الٰہ الا اللّٰہ کا پلڑ جھک جائے گا۔ (مشکوٰۃ شریف)

اس کی شرح کرتے ہوئے صاحب مرقات فرماتے ہیں کہ ——— یہ جو فرمایا کہ اے موسیٰ لا الٰہ الا اللّٰہ کہو تو یہ اس لئے کہ یہ اپنے علاوہ ہر ذکر اور ہر دعا کو متضمن ہے بلکہ مع شئی زائد ہے اور وہ یہ کہ اس میں توحید ذات کا بھی بیان ہے اور حق تعالیٰ کی صفات کا بھی تذکرہ ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم یہ کہو کہ حضرت موسیٰ نے تو ایسی چیز طلب فرمائی جس سے کہ دوسروں پر فائق ہو جائیں (اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لا الٰہ الا اللّٰہ کہو جو کہ ایک عام ذکر تھا) تو سوال وجواب میں مطابقت کیا ہوئی؟ تو میں کہوں گا کہ مطابقت تو ظاہر ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے گویا یہ جواب دیا کہ اے موسیٰ تم نے ایک محال شے طلب کی ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر تو کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ لیکن موسیٰ اس کو نہ سمجھے تھے اس لئے عرض کیا کہ یارب یہ تو کوئی خاص ذکر نہیں اس کو تو آپ کے سب ہی موحدین بندے کرتے ہیں اس لئے مجھے ایسی کوئی شے بتلائیے جس کے ساتھ آپ مجھے منجملہ اور بندوں کے خاص فرمالیں (رہی یہ بات کہ حضرت موسیٰ نے ایسا کیوں فرمایا؟ حالانکہ وہ خود اولوالعزم پیغمبر اور صاحب وحی تھے اور سب سے پہلی وحی آپ پر یہی آچکی تھی کہ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ——— تو اس کو یوں سمجھو کہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ اس کو خوشی تام اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ کوئی چیز صرف اسی کے پاس ہے اور کسی دوسرے کے پاس نہیں ہے جیسا کہ جب کسی کے پاس کوئی گوہر ایسا ہو کہ ویسا کسی کے پاس نہ ہو یا اسماء یا دعوات یا علوم غریبہ ہوں یا ایسا فن اور ایسی صنعت اس کو حاصل ہو جو دوسرے کو نہ آتی ہو تو اس پر انسان خوش ہوتا ہے (یہ تو انسانی فطرت ہے) لیکن عادۃ اللہ یہ جاری

ہے اور اسکا منشا اس کی رحمت شاملہ اور رأفت کاملہ ہے کہ جو شئے جس قدر مرغوب، پسندیدہ اور ضرورت کی ہوتی ہے اس کا وجود دنیا میں زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے گھاس، نمک اور پانی کہ ہر جگہ دستیاب ہوتا ہے۔ بخلاف موتی، یاقوت اور زعفران کے کہ انسان کو اس کی زیادہ حاجت نہیں۔ یا مثلاً قرآن شریف کو دیکھئے کہ وہ سب کتب سے بڑھ کر محبوب ہے اور بکثرت ملتا ہے اور بہت سستا ہدیہ ہوتا ہے۔ بخلاف علم کیمیا یا اسی قسم کے دوسرے علوم کہ وہ بالکل ہی مہمل اور خیالات فاسدہ ہوتے ہیں اور حال یہ ہے کہ ان کا صاحب اپنے جہل کی وجہ سے ان سے اتنا خوش ہوتا ہے کہ قرأت وسنت کے علم پر بھی اتنا خوش نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے دیکھو کہ حجر اسود جو گویا اللہ تعالیٰ کی زمین میں اللہ تعالیٰ کا یمین (یعنی داہنا ہاتھ) ہے جس سے اس کے بندے مصافحہ کرتے ہیں، وہ مقام ابراہیم سے (یعنی اس پتھر سے جس پر کھڑے ہو کر سیدنا ابراہیم نے تعمیر کعبہ کیا تھا اور اس پر آپ کے قدم کے نشان بھی بن گئے تھے اس سے) کہیں افضل ہے مگر عوام کا حال یہ ہے کہ انھوں نے افضل کو مفضول اور مفضول کو افضل کر رکھا ہے۔ چنانچہ جس قدر خوشی ان کو مقام ابراہیم کی زیارت سے ہوتی ہے اتنی حجر اسود کو بوسہ دینے میں نہیں ہوتی۔

جب یہ بات ذہن نشین ہو گئی تو اب سمجھو کہ اسی قبیل سے کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت بھی ہے کہ وہ اشرف الکلمات ہے، انفس العبادات افضل الاذکار اور اکمل الحسنات ہے۔ وجود میں اکثر ہے حصول میں الیسر ہے مگر عوام ہیں کہ اس کو ترک کئے ہوئے ہیں اور مواظبت اور اتباع ایسے ایسے اسماء غریبہ اور دعوات عجیبہ کی کئے ہوئے ہیں جن کی کتاب وسنت میں کوئی اصل نہیں۔

بہرحال لا الٰہ الا اللہ کی فضیلت حضرت موسیٰؑ پر پہلے سے بھی کچھ مخفی نہ تھی مگر پھر جو حضرت موسیٰؑ نے سوال کیا تو اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ہی نے سیدنا کلیمؑ کی زبان پر اس سوال کو جاری فرمایا تاکہ رب عظیم کی جانب سے جواب کا ذریعہ اور سبب ہو جائے اور پھر اس جواب سے اس کلمہ کی جلالت ہر خاص و عام پر ظاہر ہو جائے تاکہ ہر زمانہ میں لوگ اپنے مقصد اور مرام کے حاصل کرنے میں اس کلمہ کا اعتقاد کریں اور یہ سب اس لئے ہوا کہ یہ کلمہ دائرۂ اذکار کا قطب تھا اور نقطۂ اسرار کا مرکز تھا۔ اسی لئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کے لئے حق تعالیٰ سے وصال میں پھر کوئی حجاب نہیں رہ جاتا۔ یعنی یہ اپنے قائل کو حق تعالیٰ تک پہنچا کر رہتا ہے قال یاموسیٰ لو ان السموات السبع، یہ حق تعالیٰ کا جواب ہے جس کا حاصل بقول علامہ طیبی یہ ہے کہ اے موسیٰ تم نے اپنے لئے کوئی مخصوص ذکر جو کہ سب اذکار سے بڑھ کر ہو طلب کیا ہے تو جاننا کہ یہ ایک امر محال ہے اس لئے کہ یہ کلمہ جملہ کائنات یعنی آسمان اور اس کے سکان سے زمین اور اس کے بسنے والوں سے بڑھا ہوا ہے اس لئے اس سے افضل دوسرا کوئی کلمہ

متصور ہی نہیں۔

صاحب مرقات کہتے ہیں کہ اظہر یہ ہے کہ حاصل جواب کے بیان میں یہ کہا جائے کہ یہ کلمہ افضل الذکر ہے جیسا کہ پہلی حدیث میں آیا ہے باقی خواص کو جو خصوصیت حاصل ہوتی ہے تو اس کے معنی کے فہم اور اس کے الفاظ کی درستگی اور پختگی اور اس کے مفہوم کے ساتھ تحقق اور اس کے متعلقات کے ساتھ متخلق ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے یعنی اس کے حق کی ادائیگی اس کے پڑھنے میں اخلاص اس پر مداومت اس کے ساتھ محبت اور میلان اس سے تلذذ و سرور اس کے صاحب کا مراقبہ اسکا حضور اور مشاہدہ وغیرہ اور دیگر امور جس شخص میں جس قدر زیادہ پائے جاتے ہیں اسی قدر اس شخص کو خصوصیت حاصل ہوتی ہے اور اس حدیث میں نہایت ہی واضح اور صریح دلیل ہے کہ لا الٰہ الا اللہ افضل الذکر ہے اس لئے کہ اسکا ثواب سب اذکار سے بڑھ کر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اسکا حاصل یہ ہوا کہ یہ کلمہ عام بھی ہے اور خاص بھی۔ یعنی اپنے لفظ اور ذات کے اعتبار سے تو یہ عام ہے کہ ہر شخص اس کو پڑھتا ہے مگر اپنے آثار خاصہ اور ثمرات مخصوصہ کے اعتبار سے یہی کلمہ خاص بھی ہے اور ان آثار کا حاصل کرنا خود ذاکر کے اختیار میں ہوتا ہے۔ جس قدر خلوص اور توجہ باطنی کے ساتھ وہ اس کلمہ کا ذکر کرے گا اسی درجہ کی خصوصیت حق تعالیٰ کے ساتھ اس کو حاصل ہوگی اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کیونکہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز عام ہو مگر اثر اور نفع اس کا مختلف اشخاص کے اعتبار سے مختلف ہو۔

مثلاً نماز روزہ ہی کو دیکھئے کہ اس کو ہم لوگ بھی پڑھتے پڑھاتے ہیں اور اسی کو اولیاء اللہ صحابہ اور انبیاء نے بھی پڑھا ہے مگر ان حضرات کو اس سے کیا کیا برکات ملیں اس کا اندازہ لگانا بھی بہت مشکل ہے۔

حضرت مولانا دہلوی لکھتے ہیں کہ!

ہمیں صلوٰۃ و صوم و تلاوت و اذکار و جہاد و زکوٰۃ و حج است
کہ در ادای آں مراتب صدیق و فاروق و امثالہما بسبب تفاوت عزائم
و ارادات متبدل شد۔ (ص۹۳ صراط مستقیم)

یہی نماز روزہ۔ تلاوت و اذکار۔ جہاد۔ زکوٰۃ اور حج وغیرہ ہے کہ ان کی ادائیگی میں صدیقؓ اور فاروقؓ وغیرہ کو مختلف مراتب جو ملے تو وہ عزم اور ارادہ کے تفاوت سے مختلف ہوئے۔

اور سنئے اس کلمہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے حضرت مجدد صاحبؒ فرماتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، لا الٰہ الا اللہ ہیچ چیز در تسکین غضب رب جل سلطانہ' از یں کلمۂ طیبہ نافع تر نیست ہرگاہ ایں کلمۂ طیبہ تسکین غضب دخول نار فرماید غضبہائے دیگر کہ خود دون اوست بطریق اولیٰ تسکین آنہا نماید چرا تسکین نہ نماید کہ بندہ بہ تکرار ایں کلمہ نفی ماسوا نمودہ از ہمہ رو گردانیدہ است و قبلۂ توجہ بہ معبود برحق را ساختہ منشاء غضب توجہات شتّیٰ بودہ کہ بندہ بآں مبتلا گشتہ بود ولیس فلیس۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے غضب کی تسکین کے لئے کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ سے بڑھ کر کوئی چیز نافع نہیں کیونکہ جب یہ کلمہ طیبہ دخولِ نار کے غصہ کی تسکین کرتا ہے تو جو غصے کہ اس سے درجہ میں کم ہیں ان کے لئے تو بدرجہ اولیٰ باعثِ تسکین ہوگا اور کیونکر ایسا نہ ہو جب کہ بندہ اس کلمہ طیبہ کے تکرار سے ماسوا اللہ کی نفی کرکے ہر طرف سے رخ پھیر لیتا ہے اور اپنا قبلۂ مقصود معبود برحق کو بنا لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کا تو منشا یہی ہوتا ہے کہ بندہ خدا کو چھوڑ کر اپنی توجہات مختلف جانب کئے رہتا ہے اور جب یہی نہیں رہا جو کہ غضب کا منشا تھا تو پھر غضب بھی نہ ہوگا۔

اس کے بعد کچھ دور آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:۔

وایں کلمۂ طیبہ را کلید خزینۂ نُوْدُونُہ رحمت کہ برائے آخرت ذخیرہ فرمودہ است می یابد و می داند کہ شفیع ترے او برائے دفع ظلمات کفر و کدورات شرک از یں کلمۂ طیبہ دیگرے نیست کسے کہ تصدیق بایں کلمہ کردہ باشد و ذرۂ ایمان حاصل نمودہ مع ذالک اگر برسوم کفر و رذائل شرک مبتلی گشتہ است امید است کہ بہ شفاعت ایں کلمۂ طیبہ از عذاب بیروں آید و از خلود دوزخ نجات یابد۔ چنانچہ در دفع عقوبات سائر کبائر ایں امت شفاعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انفع وادخل است۔

اور یہ فقیر کلمہ طیبہ کو ننانوے رحمت کے خزانہ کی جسے آخرت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ذخیرہ بنا رکھا ہے۔ کنجی سمجھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ کفر کی ظلمات اور شرک کی کدورات کے دور کرنے کے لئے اس کلمۂ طیبہ سے بڑھ کر کوئی اور سفارشی نہیں۔ جس شخص نے اس کلمہ کی تصدیق کی ہوگی اور ایمان کا ایک

ذرہ بھی حاصل کیا ہوگا۔ اس کے ساتھ اگر کفر کے رسوم اور شرک کے رذائل میں بھی مبتلا ہوگا تو اُمید ہے کہ اس کلمہ کی سفارش سے عذاب سے نجات پا جائے گا اور دوزخ میں ہمیشہ ہمیش رہنے سے خلاصی پا جائے گا۔ جیسا کہ اس امت کے تمام گناہ کبیرہ کی سزا کو دور کرانے میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سب سے زیادہ نافع اور کارآمد ہے۔

پھر آگے فرماتے ہیں کہ:-

ہلاک می گشت ایں امت پُر گناہ اگر مثل کلمہ طیبہ شفیع ایشاں نمی بود ومثل خاتم الرسل علیہ وعلیہم الصلوٰۃ التسلیمات والتحیات شفاعت شان نمی نمود اُمَّۃٌ مُذْنِبَۃٌ وَرَبٌّ غَفُوْرٌ۔

آن قدر عفو وغفران حق جل وعلا کہ در شان ایں امت بکار خواہد رفت معلوم نیست کہ ایشان جمیع امم ماضیہ بکار رود۔ ونو دونہ رحمت را گویا برائے ایں امت پر ذنوب ذخیرہ ساختہ اند ع

گر مستحق کرامت گناہکار انند

دچوں حق سبحانہ وتعالیٰ عفو ومغفرت را دوست می دارد دہیچ پارہ از برائے عفو ومغفرت برابر ایں اُمت پُر تقصیر نیست لا جرم ایں اُمت خیر الامم گشت۔ وکلمہ طیبہ کہ شفاعت کنندہ ایشان ست افضل الاذکار آمد وپیغمبر شفیع ایشان سید الانبیاء خطاب یافت علیہ وعلیہم الصلوات والتحیات۔

اُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

بے ارحم الراحمین چنیں باشد کرم الاکرمین چنیں بود باکریماں کارہا دشوار نیست۔ وکان ذالک علی اللہ یسیراً۔

"یعنی یہ امت پر گناہ تو ہلاک ہی ہوجاتی اگر کلمہ طیبہ انکا شفیع نہ ہوتا اور خاتم الرسل علیہ الصلوات والتسلیمات انکی شفاعت نہ فرماتے امت محمدیہ ایسی امت ہے جو گنہگار ہے اور اس کا پروردگار غفور اور آمرزگار ہے۔ اللہ جل وعلا کی مغفرت اور عفو جس قدر اس امت پُر تقصیر کے حق میں کام آئے گی معلوم نہیں تمام امم ماضیہ کی شان میں بھی کام آئے گی یا نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ننانوے رحمت گویا اسی اُمت پر ان کے ذنوب کے لئے ذخیرہ کر رکھا ہے اس لئے کہ کرم کے مستحق تو گنہگار ہی ہیں۔

اور چونکہ حق تعالیٰ عفو و مغفرت کو پسند کرتے ہیں اور عفو و مغفرت کا کوئی محل اس امت پُر تقصیر کے برابر نہیں ہے اس کی وجہ سے یہ امت خیر الامم ہوئی اور کلمۂ طیبہ جو اس اُمت کا شفیع ہے اس کو افضل الذکر ہونے کا درجہ ملا اور وہ پیغمبر جو اس اُمت کے شفیع ہیں ان کو سید الانبیا کا خطاب ملا علیہ و علیہم الصلوات والتحیات۔

یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی سیات کو حسنات سے بدل دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے۔

بیشک ارحم الراحمین اور اکرم الاکرمین ایسا ہی ہوتا ہے واقعی کریم لوگوں کے لئے کوئی کام دشوار نہیں ہے اور یہ اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے۔

پھر ذرا آگے فرماتے ہیں کہ

ونیز از فضائل ایں کلمہ بشنو

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ کوتاہ نظران ایں تعجب دارند کہ بیک گفتن لا الٰہ الا اللہ چگونہ دخول جنت میسر شود۔ از برکات ایں کلمۂ طیبہ واقف نیستند۔

محسوس ایں فقیر شدہ است کہ اگر تمام عالم را بیک گفتنی ایں کلمہ طیبہ بخشند و بہشت فرستند گنجائش دارد و مشہود می گردد کہ برکات ایں کلمہ مقدسہ را اگر تمام عالم را قسمت کنند تا ابد الآباد ہمہ را کفایت کند و ہمہ را سیراب گرداند خصوص کہ ایں کلمہ طیبہ کلمہ مقدسہ محمد الرسول اللہ جمع شود و تبلیغ بہ توحید انتظام یابد و رسالت با ولایت قرین گردد۔ مجموعۂ ایں دو کلمہ جامع کمالات ولایت و نبوت است۔ وہادی سبیل ایں ہر دو سعادت　　　. کہ ولایت را از ظلمات ظلال پاک سازد۔ و نبوت را بدرجہ علیا رساند۔

اس کلمہ کے اور فضائل سنو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہدے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ کوتاہ نظر لوگ تعجب کرتے ہیں کہ محض ایک دو دفعہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ

کے کہدینے سے دخول جنت کیسے نصیب ہوجائے گا۔

درحقیقت یہ لوگ کلمۂ طیبہ کے برکات سے واقف نہیں ہیں اس لئے ایسی بات سمجھتے ہیں۔

اس فقیر کو خود اس کلمہ کے برکات اس درجہ محسوس ہوتے ہیں اگر تمام عالم کو محض ایک بار اس کلمہ طیبہ کے کہہ لینے سے بخش دیں اور جنت میں داخل کردیں تو اس کی گنجائش ہے۔

نیز اس فقیر کو مشاہد ہوا ہے کہ اگر اس کلمہ مقدسہ کے برکات کو تمام عالم پر تقسیم کریں تو سب کے لئے ہمیشہ ہمیش کو کفایت کرے اور سب کو سیراب کردے۔

تو کیا حال ہوگا جب کہ اس کلمہ طیبہ کے ساتھ کلمہ مقدسہ محمد رسول اللہ بھی جمع ہوجائے اور تبلیغ توحید کے ساتھ شامل ہوجائے اور ولایت رسالت کے ساتھ مقارن ہوجائے ان دونوں کلموں کا مجموعہ ولایت و نبوت کے کمالات کا جامع ہے اور دونوں سعادتوں کی تحصیل کا پیشوا رہبر ہے اس لئے کہ ولایت کو ظلال کی ظلمات سے پاک کرتا ہے اور نبوت کو درجہ عُلیا تک پہونچاتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا مِنْ بَرَكَاتِ هٰذِهِ الْكَلِمَةِ الطَّيِّبَةِ وَثَبِّتْنَا عَلَيْهَا وَاَمِتْنَا عَلٰى تَصْدِيْقِهَا وَاحْشُرْنَا مَعَ الْمُصَدِّقِيْنَ لَهَا وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ بِحُرْمَتِهَا وَبِحُرْمَةِ مُبَلِّغِيْهَا عَلَيْهِمُ الصَّلٰوٰتُ وَالتَّسْلِيْمَاتُ وَالْبَرَكَاتُ۔

یا اللہ اس کلمہ طیبہ کے برکات سے ہم کو محروم نہ کیجئے اور اسی پر ہم کو ثابت رکھئے اور اسی کی تصدیق پر ہم کو موت دیجئے اور اسی کلمہ کی تصدیق کرنیوالوں کے ساتھ ہمارا حشر کیجئے اور اس کلمۂ طیبہ کی حرمت کے طفیل ہم کو جنت میں داخل کیجئے ان پر صلوٰت و تسلیمات و تحیات و برکات نازل ہوں۔

پھر کچھ دور کے بعد فرماتے ہیں کہ۔

پس ازینجا فضیلت این ذکر را باید دریافت کہ تمام دنیا در جنب آں ہیچ مقدارے واحسابے نیست۔

کا نکہ حکم قطرہ میداشت نسبت بدریائے محیط۔

اس جگہ سے اس ذکر کی فضیلت معلوم کرلینا چاہیے کہ تمام دنیا اس کے مقابلہ میں بالکل ہیچ و نیست ہے۔ کاش اس کو دریائے محیط سے قطرے کی نسبت

ہوتی (مگر ایسا بھی نہیں ہے)۔

اور سب کے اخیر میں حضرت مجدد صاحب یہ فرماتے ہیں :۔

آرزوئے در دنیا معلوم نیست کہ برابرایں باشد کہ کسے در گوشہ خزیدہ باشد و بہ تکرار ایں کلمہ طیبہ متلذذ و محظوظ بود۔ اما چہ تواں کرد کہ جمیع آرزو ہا میسر نیست واز غفلت واختلاط خلق چارہ نہ۔

رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

کوئی آرزو دنیا میں اس کے برابر نہیں کہ آدمی کسی گوشہ میں تنہا بیٹھا ہو اور اس کلمہ طیبہ کے تکرار سے محظوظ و لطف اندوز ہو مگر کیا کیا جا سکتا ہے کہ تمام آرزوئیں میسر نہیں ہیں اور غفلت اور اختلاط مع الخلق سے چارہ نہیں۔

اے ہمارے رب ہمارے نور کا اتمام فرما۔ یقیناً تو ہر شے پر قادر ہے آپکا رب جو بڑی عظمت والا ہے۔ ان باتوں سے پاک ہے جو یہ کافر بیان کرتے ہیں۔ جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔

سبحان اللہ حضرت مجدد صاحبؒ کے کلام سے کلمۂ طیبہ کی کس قدر فضیلت معلوم ہوئی اور اس پر کیسی تحضیض و ترغیب نکلی۔ یہ حضرات بھلا اس کو کب چھوڑ سکتے ہیں اس لئے کہ سب سے بڑی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی کلمہ ہے۔

اور سنئے! اللہ والوں نے اسی کلمہ کو جب صدق و خلوص کے ساتھ پڑھا ہے خانۂ کعبہ نے اس کو اپنے پاس امانت رکھا جسے وہ قیامت میں اس کے صاحب کی خدمت میں پیش کرے گا چنانچہ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ میں نے جب کلمۂ توحید کو حجر اسود کا بوسہ لیتے وقت کعبہ شریف کے پاس امانت رکھا تو میرے تلفظ کے وقت وہ شہادت ایک فرشتہ کی صورت میں میرے منہ سے نکلی اور میں اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اس کے بعد حجر اسود میں طاق کے برابر ایک سوراخ ہو گیا چنانچہ مجھے حجر اسود کی گہرائی نظر آئی۔ پھر یہ دیکھا کہ وہ میری شہادت کعبہ کے ہمشکل ہو کر حجر اسود کی گہرائی میں مستقر ہو گئی اور حجر اسود اس پر بالکل ڈھک گیا اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سوراخ بند ہو گیا۔ جب یہ سب کچھ ہو گیا تو کعبہ نے مجھ سے کہا کہ یہ آپ کی امانت میرے پاس رکھی ہے اس کو میں قیامت کے دن آپ کی خدمت میں پیش کرونگا جب

میں نے یہ سنا تو اس پر اس کا شکر ادا کیا۔

دیکھا آپ نے کلمۂ طیبہ کا مرتبہ اور اس کی عظمت کہ کس طرح کعبہ نے اس کو اپنے اندر محفوظ کر لیا

کلمۂ طیبہ کی برکت پر ایک اور واقعہ سنئے :۔

ارواح ثلثہ میں ہے کہ مولوی محمد قاسم صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جب میں گنگوہ حاضر ہوا تو حضرت کی سہ دری میں ایک کورا بدھنا رکھا ہوا تھا میں نے اس کو اٹھا کر کنوئیں سے پانی کھینچا اور اس میں بھر کر پیا تو پانی کڑوا پایا۔ ظہر کی نماز کے وقت حضرت سے ملا اور یہ قصہ بھی بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کنوئیں کا پانی تو کڑوا نہیں ہے میٹھا ہے۔ میں نے وہ کورا بدھنا پیش کیا حضرت نے بھی چکھا تو بدستور تلخ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا اس کو رکھ دو نماز ظہر کے بعد حضرت نے سب نمازیوں سے فرمایا کہ کلمہ طیب جس قدر ہو سکے پڑھو اور حضرت نے بھی پڑھنا شروع کیا بعد میں حضرت نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا اور نہایت ہی خشوع و خضوع سے دعا مانگ کر ہاتھ منہ پر پھیر لئے اس کے بعد بدھنا اٹھا کر پانی پیا تو شیریں تھا اس وقت مسجد میں بھی جتنے نمازی تھے سب نے چکھا تو کسی قسم کی تلخی نہ تھی بعد میں حضرت نے فرمایا کہ اس بدھنے کی مٹی اس قبر کی ہے جس پر عذاب ہو رہا تھا۔ الحمد للہ کلمہ کی برکت سے عذاب رفع ہو گیا۔

دیکھئے کلمہ شریف کی برکت کہ اس کی وجہ سے اس میت سے عذاب قبر دور ہوا اور اس عذاب کا اثر مٹی میں اور اس کی وجہ سے لوٹے کے پانی میں جو آگیا تھا وہ زائل ہو گیا اور اس کے اس نفع کو ایک مجمع کثیر نے دیکھا۔

حدیث شریف میں لا الٰہ الا اللہ کو حصن فرمایا گیا ہے اور آپ نے یہ فرمایا ہے کہ جو شخص اسے پڑھیگا وہ حصن میں داخل ہو جائے گا اور جو حصن میں داخل ہو جائیگا عذاب سے مامون ہو جائیگا۔ میرے پاس ایک قلمی کتاب ہے اس میں ایک روایت دیکھی۔

وھی ھذہ :۔

قَالَ فِی الصَّوَاعِقِ لَمَّا دَخَلَ عَلَی الرِّضَا نَیْشَاپُوْرَ کَمَا فِیْ تَارِیْخِهَا وَشَقَّ سُوْقَهَا وَعَلَیْهِ مِظَلَّةٌ لَا یُصَاعُ مِنْ وَرَائِهَا تَعَرَّضَ لَهُ الْحَافِظَانِ اَبُوْ زُرْعَةَ الرَّازِیُّ وَالْجَدُّ بْنُ اَسْلَمَ الطُّوْسِیُّ وَمَعَهُمَا مِنْ طَلَبَةِ الْعِلْمِ وَالْحَدِیْثِ مَنْ لَا یُحْصٰی فَتَضَرَّعَا اَنْ یُّرِیَهُمْ وَجْهَهٗ وَیَرْوِیَ لَهُمْ حَدِیْثًا مِّنْ آبَائِهٖ فَاسْتَوْقَفَ الْبَغْلَةَ فَاَمَرَ الْغِلْمَانَ

بِكَشْفِ الْمِظَلَّةِ وَاَقَرَّ عُيُوْنَ الْخَلَائِقِ بِرُؤْيَةِ طَلْعَتِهِ الْمُبَارَكَةِ
وَكَانَتْ ذُوَائِبَتَانِ مُعَلَّقَتَانِ عَلٰى عَاتِقِهِ وَالنَّاسُ بَيْنَ صَارِخٍ وَبَاكٍ
وَمُتَمَرِّغٍ فِي التُّرَابِ وَمُقَبِّلٍ لِحَافِرِ بَغْلَتِهِ فَصَاحَتِ الْعُلَمَاءُ مَعَاشِرَ النَّاسِ
اَنْصِتُوْا فَاَنْصَتُوْا وَاسْتَمْلٰى مِنْهُ الْحَافِظَانِ الْمَذْكُوْرَانِ۔

صواعق میں ہے کہ جب حضرت علی رضا نیشاپور میں داخل ہوئے اور اس کے بازار سے گزرے تو آپکے چہرہ پر نقاب پڑی ہوئی تھی جس کے اندر سے وہ نظر نہیں آتے تھے لینے میں حافظ ابوزرعۃ رازی اور حافظ اسلم طوسی آگے بڑھے اور ان کے پیچھے پیچھے علم حدیث کے بہت سے طلبہ تھے ان دونوں نے نہایت ہی لجاجت کے ساتھ حضرت سے یہ درخواست کی کہ لوگوں کو اپنے چہرۂ انور کی زیارت کرادیں اور اپنے آباء کی سند سے کوئی حدیث سنادیں۔ یہ سن کر آپ نے سواری ٹھہرائی اور اپنے غلاموں سے ارشاد فرمایا کہ پردہ ہٹادو چنانچہ جتنے لوگ موجود تھے ان سب کی آنکھوں کو اپنے چہرہ مبارک کی زیارت سے ٹھنڈا کیا اور آپ کے دونوں گیسو آپ کے کاندھے پر لٹک رہے تھے اور لوگوں کا یہ حال تھا کہ کوئی تو چیخ رہا تھا اور کوئی زمین پر لوٹ رہا تھا اور کوئی آپ کی سواری کے پاؤں اور کھُر ہی کو بوسہ دے رہا تھا۔ علماء نے جب یہ شور وشغب دیکھا تو بلند آواز سے کہا کہ لوگو خاموش ہوجاؤ جب سب لوگ چپ ہوگئے تو ان دونوں حافظوں نے حضرت سے حدیث املا کرانے کی درخواست کی۔

فَقَالَ حَدَّثَنِيْ اَبِيْ مُوْسَى الْكَاظِمُ عَنْ اَبِيْهِ جَعْفَرِ الصَّادِقِ عَنْ اَبِيْهِ مُحَمَّدِ الْبَاقِرِ عَنْ اَبِيْهِ زَيْنِ الْعَابِدِيْنَ عَنْ اَبِيْهِ الْحُسَيْنِ عَنْ اَبِيْهِ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ قَالَ حَدَّثَنِيْ حَبِيْبِيْ وَقُرَّةُ عَيْنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حَدَّثَنِيْ جِبْرِيْلُ (قَالَ) سَمِعْتُ رَبَّ الْعِزَّةِ سُبْحَانَهٗ يَقُوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ حِصْنِيْ فَمَنْ قَالَهَا دَخَلَ حِصْنِيْ وَمَنْ دَخَلَ حِصْنِيْ اَمِنَ عَذَابِيْ ثُمَّ اَرْخَى السِّتْرَ وَسَارَ۔

آپ نے فرمایا کہ مجھ سے حدیث بیان کی میرے والد موسیٰ کاظم نے وہ اپنے والد جعفر صادق سے اور وہ اپنے والد محمد باقر سے اور وہ اپنے والد زین العابدین سے اور وہ اپنے والد حضرت حسین سے اور وہ اپنے والد ماجد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے انھوں نے فرمایا کہ مجھ سے حدیث بیان کی میرے حبیب اور محبوب اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ نے فرمایا کہ مجھ سے بیان کیا

حضرت جبریل علیہ السلام نے اور وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت رب العزت سبحانہ تعالیٰ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میرا قلعہ ہے جو شخص اس کلمہ کو کہہ لیگا وہ میرے قلعہ میں داخل ہوجائے گا اور جو میرے قلعہ میں داخل ہوگیا وہ میرے عذاب سے مامون ہوگیا۔ یہ فرمایا اور پردہ گرایا اور روانہ ہوگئے۔

(مضامین تصوف قلمی ص۶)

میں کہتا ہوں کہ دیکھئے حضرت نے حدیث بھی کیسی منتخب فرمائی. کتنی جامع اور موثر۔ ایک حدیث کیا سنائی کہ جنت کی کنجی ہی دیدی۔ حدیث شریف میں ذکر اللہ کو قلوب کے قفل کی کنجی ہی فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے اَللّٰھُمَّ افْتَحْ اَقْفَالَ قُلُوْبِنَا بِذِکْرِکَ وَاَتْمِمْ عَلَیْنَا نِعْمَتَکَ وَاَفِضْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلِکَ وَاجْعَلْنَا مِنْ عِبَادِکَ الصَّالِحِیْنَ۔ یعنی یا اللہ کھول دے قفل ہمارے دلوں کے اپنے ذکر سے اور پورا کرہم پر اپنی نعمت کو اور کامل کر ہم پر اپنا فضل اور کردے ہم کو اپنے نیک بندوں میں سے۔

اور ذکر جس طرح سے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے اسی طرح سے اللہ اللہ بھی ہے اس کے متعلق ابداع میں ہے کہ:۔

اِعْلَمْ اَنَّ ذِکْرَ الْاِسْمِ الْمُفْرَدِ الْمُعَظَّمِ مُجَرَّدًا عَنِ التَّرْکِیْبِ بِجُمْلَۃٍ وَھُوَ قَوْلُ اَللّٰہَ اَللّٰہَ مِمَّا تَوَارَثَ السَّادَاتُ الصُّوْفِیَّۃُ وَاسْتَعْلَوْ بَیْنَھُمْ اِلٰی اَنْ قَالَ وَفِی الصَّحِیْحِ لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی لَا یَبْقٰی مَنْ یَّقُوْلُ اَللّٰہَ اَللّٰہَ وَھُوَ شَاھِدٌ فِی الْجُمْلَۃِ بِذِکْرِ ھٰذَا الْاِسْمِ وَحْدَہٗ لَاسِیَّمَا عَلٰی رِوَایَۃِ النَّصَبِ وَلَا نِزَاعَ فِیْ جَوَازِ التَّلَفُّظِ بِاِسْمِ الْکَرِیْمِ وَحْدَہٗ۔

فَاَیُّ مَانِعٍ اَنْ یُّکَرِّرَہُ الْاِنْسَانُ مَرَّاتٍ کَثِیْرَاتٍ فَکَوْنُہٗ لَمْ یُنْقَلْ عَنِ السَّلَفِ لَا یَقْتَضِیْ مَنْعَہٗ وَلَا کَرَاھَۃً کَمْ اَشْیَاءَ لَمْ تَکُنْ فِیْ عَھْدِ السَّلَفِ مَعَ اَنَّھَا جَائِزَۃٌ اِلٰی اَنْ قَالَ وَلَا یَنْبَغِی التَّوَقُّفُ فِیْ ذٰلِکَ وَلَا التَّشْغِیْبُ بِاِنْکَارِہٖ۔

فرماتے ہیں کہ جانو اسم مفرد جو کہ ترکیب سے خالی ہو یعنی حرف اللہ اللہ تو اس کا ذکر سادات صوفیہ میں متوارث چلا آرہا ہے اور ان کے یہاں شائع وذائع ہے (اس کے متعلق یہ سمجھو کہ) حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جب تک زمین پر کوئی اللہ اللہ کہنے والا موجود رہیگا قیامت نہ آئے گی۔ یہ حدیث فی الجملہ شاہد

ہے کہ اسم ذات کے ساتھ تنہا ذکر جائز ہے خاص کر جب کہ اللہ اللہ کو بالنصب (زبر) پڑھا جائے اور لفظ اللہ کے تلفظ میں عدم جواز کی کوئی بات ہی نہیں ہے لہذا اگر کسی نے اس کو مکرر سہ کرر یعنی متعدد بار تکرار کیا تو اس میں حرج کی کون سی بات ہو گئی۔ باقی سلف سے اس کا منقول نہ ہونا اس سے یہ چیز نہ ممنوع ہو گی نہ مکروہ ہو گی چنانچہ کتنی ہی چیزیں ہیں کہ سلف کے زمانہ میں نہ تھیں اس کے باوجود وہ جائز ہیں لہذا اس کے جواز میں نہ توقف کرنا چاہئے اور نہ اس پر انکار کی آواز بلند کرنا چاہئے آگے فرماتے ہیں کہ

وَقَالَ الشَّيْخُ اَبُوالْعَبَّاسِ الْمَرْسِيُّ لِيَكُنْ ذِكْرُكَ اَللّٰهَ فَاِنَّ هٰذَا الْاِسْمَ سُلْطَانُ الْاَسْمَاءِ وَلَهٗ بِسَاطٌ وَثَمَرَةٌ فَبِسَاطُهُ الْعِلْمُ وَثَمَرَتُهُ النُّوْرُ وَلَيْسَ النُّوْرُ مَقْصُوْدًا لِذَاتِهٖ بَلْ لِمَا يَقَعُ بِهٖ مِنَ الْكَشْفِ وَالْعِيَانِ فَيَنْبَغِيْ الْاِكْثَارُ بِذِكْرِهٖ وَاخْتِيَارِهٖ عَلٰى سَائِرِ الْاَذْكَارِ لِتَضَمُّنِهٖ لِجَمِيْعِ مَا فِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مِنَ الْعَقَائِدِ وَالْعُلُوْمِ وَالْاٰدَابِ وَالْحُقُوْقِ فَاِنَّهٗ يَاْتِيْ فِيْ اَللّٰهُ وَفِيْ هُوَ مَا لَا يَاْتِيْ فِيْ غَيْرِهِمَا مِنَ الْاَذْكَارِ۔

قَالَ الشَّيْخُ زَرُّوْقٌ وَلِهٰذَا يَخْتَارُهُ الْمَشَائِخُ وَرَجَّحُوْهُ عَلٰى سَائِرِ الْاَذْكَارِ وَجَعَلُوْا اللّٰهَ خَلَوَاتٍ وَوَصَلُوْا بِهٖ اِلٰى اَعْلَى الْمَقَامَاتِ وَالْوِلَايَاتِ وَاِنْ كَانَ فِيْهِمْ مَنْ اِخْتَارَ فِي الْاِبْتِدَاءِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَفِي الْاِنْتِهَاءِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ۔

شیخ ابو العباس مرسی نے فرمایا ہے کہ چاہیے کہ تمہارا ذکر اللہ اللہ ہو اس لئے کہ یہ نام سلطان الاسماء ہے اور اس کے لئے ایک بساط ہے اور ایک ثمرہ ہے۔ بساط اس کا علم ہے اور ثمرہ اس کا نور ہے اور نور خود مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس لئے مطلوب ہے کہ کشف اور عیان کا ذریعہ بنتا ہے۔ پس مناسب ہے کہ اس اسم کی کثرت کی جائے اور جملہ اذکار پر اس کو ترجیح دینا چاہیے کیونکہ لا الٰہ الا اللہ میں جو عقائد، علوم، آداب اور حقوق آئے ہیں یہ ان سب کو متضمن ہے اس لئے کہ اللہ اور ہو میں ایسی ایسی چیزیں آگئی ہیں جو ان کے علاوہ اور دوسرے اذکار میں نہیں ہیں۔

شیخ زروق نے فرمایا ہے کہ اسی لئے مشائخ نے اس کو اختیار فرمایا ہے اور تمام اذکار پر اس کو ترجیح دی ہے اپنی خلوات میں اس کو جگہ دی ہے اور ولایت و مقامات عالیہ کی تحصیل کا اسی کو ذریعہ

بنایا ہے اور بعض حضرات نے یہ کیا ہے کہ ابتدا میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کو لیا ہے اور انتہا میں اللہ اللہ کو۔

قَالَ اِبْنُ حَجَرٍ فِی الْفَتَاوَی الْحَدِیْثِیَّۃِ ذِکْرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ اَفْضَلُ مِنْ ذِکْرِ الْجَلَالَۃِ مُطْلَقًا بِلِسَانِ اَھْلِ الظَّاھِرِ وَاَمَّا اَھْلُ الْبَاطِنِ فَالْحَالُ عِنْدَھُمْ یَخْتَلِفُ بِاِخْتِلَافِ حَالِ السَّالِکِ فَمَنْ ھُوَ فِی اِبْتِدَاءِ اَمْرِہٖ وَمُقَاسَاۃِ شُھُوْدِ الْاَغْیَارِ وَعَدَمِ اِنْفِکَاکِہٖ عَنِ التَّعَلُّقِ بِھَا یَحْتَاجُ اِلَی النَّفْیِ وَالْاِثْبَاتِ حَتّٰی یَسْتَوْلِیَ عَلَیْہِ سُلْطَانُ الذِّکْرِ فَاِذَا اسْتَوْلٰی عَلَیْہِ فَالْاَوْلٰی لَہٗ لُزُوْمُ الْاِثْبَاتِ اَعْنِیْ اَللہُ اَللہُ وَبِھٰذَا یَتَبَیَّنُ اَنَّ الذِّکْرَ بِالْاِسْمِ الْمُفْرَدِ لَا مَانِعَ مِنْہُ شَرْعًا اِذَا لَمْ یَرِدِ النَّھْیُ عَنْہُ مِنَ الشَّارِعِ یُفِیْدُ کَرَاھَتَہٗ اَوْ تَحْرِیْمَہٗ

(الابداع ص۳۱۵)

علامہ ابن حجر مکی نے فتاوی حدیثیہ میں لکھا ہے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا ذکر اسم ذات اللہ اللہ کے ذکر سے اہل ظاہر کے نزدیک مطلقاً افضل ہے اور اہل باطن کے نزدیک سالک کے اختلاف حالات کی بنا پر احکام مختلف ہوتے ہیں۔

پس جو شخص کہ ابتداء طریق میں ہو اور اغیار کے مشاہدہ کی مشقت جھیلنے سے ابھی نہ نکلا ہو اور نہ ماسوی اللہ کے تعلق سے ابھی اس کو خلاصی نصیب ہوئی ہو تو اس کو ذکر نفی و اثبات کی ضرورت ہے تاکہ سلطان الذکر اس پر مستولی ہو جائے اور جب سلطان الذکر اس پر مستولی ہو جائے تو اب اس کے لئے ذکر اثبات یعنی اللہ اللہ پر التزام مناسب ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ذکر مجرد یعنی اللہ اللہ میں شرعاً کوئی قباحت نہیں اس لئے کہ شارع کی اس باب میں ایسی کوئی نہی وارد نہیں ہے جس سے اس کی کراہت یا تحریم معلوم ہوتی ہو۔

غرض اس سے معلوم ہوا کہ تنہا اللہ اللہ کا ذکر بھی صحیح ہے اور بعض اعتبار سے ذکر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ سے بھی بڑھا ہوا ہے۔

علامہ شامی نے تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہی لفظ اللہ اسم اعظم ہے۔ ھٰذَا نَصُّہٗ۔

رَوٰی ھِشَامٌ عَنْ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ اَنَّہٗ اِسْمُ اللہِ

الْاَعْظَمِ وَبِهٖ قَالَ الطَّحَاوِیُ وَکَثِیْرًا مِنَ الْعُلَمَاءِ وَاَکْثَرُ الْعَارِفِیْنَ حَتّٰی اَنَّهٗ لَا ذِکْرَ عِنْدَهُمْ لِصَاحِبِ مَقَامٍ فَوْقَ الذِّکْرِ بِهٖ کَمَا فِیْ شَرْحِ التَّحْرِیْرِ لِابْنِ اَمِیْرِ حَاجٍّ۔ (شامی ص ج ۱)

ہشام نے امام محمد سے اور انھوں نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے کہ یہی لفظ اللہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ طحاوی کا بھی یہی قول ہے اور بہت سے علماء کا یہی ارشاد ہے اور اکثر عارفین کے نزدیک تو صاحب مقام کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا ذکر نہیں ہے۔ ابن امیر حاج نے شرح تحریر میں ایسا ہی فرمایا ہے۔

بہرحال لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ذکر کرے یا اللہ اللہ کا۔ علماء نے دونوں کے فوائد ومنافع لکھے ہیں لیکن اتنی بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ذکر کو حدِ شرعی سے متجاوز نہ ہونے دے کیونکہ ذکر اگر اپنی حد سے متجاوز ہوجائے گا تو پھر شرعاً وہ معتبر نہ ہوگا۔ الابداع میں ذکر شرعی کا بیان کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ

وہ ذکر جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے اور اللہ کے نیک بندے بھی جس کو پسند کرتے ہیں اور جس کے کرنے والے کو اجر دیا جائے گا۔ وہی ہے جو کتاب وسنت میں وارد ہے۔ اور معتبر ائمہ نے جس کو ضبط کیا ہے چنانچہ سیدی محمد منیر نے جو کہ امام حفنی کے خلیفہ ہیں تحفۃ السالکین میں لکھا ہے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ذکر کرنے میں لحن اور غلطی سے احتراز کرو اس لئے کہ یہ قرآنی الفاظ ہیں پس لَا کے لام کو بقدر ضرورت ہی کھینچو اور اس کے بعد جو ہمزہ آتا ہے اُسے صاف اور واضح طور سے ادا کرو اور اسکو بڑھاؤ نہیں اور اِلٰهَ کی ہاء پر خفیف سا زبر پڑھو اور لَا اِلٰهَ اور اِلَّا اللّٰهُ میں فصل نہ کرو کیونکہ اس صورت میں اِلٰهٌ کی مطلقاً نفی ہوجائے گی۔ (مکرر کہا جاتا ہے کہ دیکھو) اِلٰهَ کے ہمزہ کی ادائیگی میں تغافل نہ کرنا ورنہ تم اس کو بجائے ہمزہ کے یا پڑھوگے۔ اس طرح سے الا کے ہمزہ کا بھی خیال کرنا ورنہ تو لا یلاہ یلا اللہ ہوجائے گا جو بالکل غلط ہوگا اور اللہ کے آخر کو ساکن پڑھو یعنی اِلَّا اللّٰهْ کہو ــــــ اور ذکر کو بہت زیادہ کھینچنے سے بھی بچو اسطرح

بہت جلد بازی سے بھی بچو اس لئے کہ یہ اس کی حد سے اس کو خارج کر دیتا ہے۔ پس معیار اس باب میں یہ ہے کہ اس کو حد شرعی سے باہر نہ ہونے دو۔

اب آخر میں ذکر اللہ کی فضیلت سے متعلق دو حدیثیں اور بیان کر کے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو بھی فرائض مقرر فرمائے تو ان کی حدود بھی مقرر کر دی ہیں اور اہل عذر کو حالت عذر میں معاف رکھا ہے سوا ذکر کے کہ یہ فرض بھی ہے مگر اس میں یہ اصول جاری نہیں یعنی اس کے لئے نہ توحد ہے جس پر اس کی انتہا ہو اور نہ کسی حال میں اس کے ترک پر کسی کو معذور ہی رکھا گیا ہے مگر یہ کہ کوئی شخص مغلوب العقل ہی ہو تو یہ دوسری بات ہے۔ اس ذکر کا حکم ہر حالت میں دیا فقال فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ وَقَالَ اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا اَيْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَالصِّحَّةِ وَالسَّقَمِ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ۔

یعنی فرمایا کہ خدا کی یاد کرو کھڑے بھی بیٹھے بھی اور لیٹے ہوئے بھی نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بکثرت یاد کرو یعنی رات میں بھی، دن میں بھی، خشکی میں بھی تری میں بھی، صحت میں بھی اور مرض میں بھی، خفیہ بھی اور علانیہ طور سے بھی۔

دوسری حدیث سنئے:۔

عَنْ مَالِكٍ قَالَ بَلَغَنِيْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ ذَاكِرُ اللّٰهِ فِي الْغَافِلِيْنَ كَالْمُقَاتِلِ خَلْفَ الْفَارِّيْنَ وَذَاكِرُ اللّٰهِ فِي الْغَافِلِيْنَ كَغُصْنٍ شَجَرٍ اَخْضَرَ فِيْ شَجَرٍ يَابِسٍ وَذَاكِرُ اللّٰهِ فِي الْغَافِلِيْنَ مِثْلُ مِصْبَاحٍ فِيْ بَيْتٍ مُظْلِمٍ وَذَاكِرُ اللّٰهِ فِي الْغَافِلِيْنَ يُرِيْهِ اللّٰهُ مَقْعَدَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ وَهُوَ حَيٌّ وَذَاكِرُ اللّٰهِ فِي الْغَافِلِيْنَ يُغْفَرُ لَهٗ بِعَدَدِ كُلِّ فَصِيْحٍ وَّاَعْجَمَ وَالْفَصِيْحُ بَنُوْ آدَمَ وَالْاَعْجَمُ بَهَائِمُ۔

(مظہری ص ۳۰۶ پ ۲۲)

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہونچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ غافلین کے درمیان کوئی ذاکر موجود ہو تو وہ ایسا ہی ہے جیسے جہاد میں بھاگنے والوں کے پیچھے کوئی لڑنے والا موجود ہو۔ اسی طرح سے غافلین کے درمیان اللہ کو یاد کرنے والا ایسا ہے جیسے کسی پورے سوکھے درخت میں کوئی ایک ٹہنی سبز رہ گئی ہو۔ اسی طرح سے غافلین کے درمیان ذکر اللہ

کرنے والے کا وجود ایسا ہے جیسے تاریک کوٹھری میں کوئی چراغ جل رہا ہو۔ اسی طرح سے غافلین کے درمیان اگر کوئی ذاکر موجود ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ زندگی ہی میں اس کو اس کی جنت کا ٹھکانا دکھلا دیتے ہیں اور غافلین کے درمیان کوئی ذاکر جو رہتا ہے تو اس کے لئے تمام انسان اور تمام حیوان دعا کرتے ہیں۔

سبحان اللہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے کا کیا درجہ اور کیا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے ذکر سے ہم سب کے قلوب کا قفل کھول دے۔ بس اس دعا پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

اَللّٰھُمَّ افْتَحْ اَقْفَالَ قُلُوْبِنَا بِذِکْرِکَ وَاَتْمِمْ عَلَیْنَا نِعْمَتَکَ وَاَسْبِغْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلِکَ وَاجْعَلْنَا مِنْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ ○

اے اللہ اپنے ذکر سے ہمارے دلوں کے قفل کو کھول دے اور اپنی نعمتوں کو ہمارے اوپر تمام کر دے اور اپنا فضل ہمارے اوپر کامل کر دے اور ہم کو اپنے نیک بندوں میں سے بنا دے۔ آمین

اضافہ از مرتب عفی عنہ

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کا مضمون "وصیۃ الذکر" تو یہاں پر ختم ہوا باقی ذکر کی مناسبت سے حضرت فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ کی مشہور و معروف کتاب تنبیہ الغافلین سے بزرگوں کا ایک ارشاد نقل کرتا ہوں جو کہ اللہ تعالیٰ کی یاد قائم ہو جانے میں مددگار رہے اور اس کا ایک نہایت ہی آسان طریقہ ہے۔ امید کہ ناظرین برابر اس نسخہ کو اپنے استعمال میں رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق بخشے۔

آمین

اس ارشاد کو "کلمات سبعہ" کے عنوان سے آئندہ صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے۔

——— از جامی

کلماتِ سبعہ

حضرت فقیہہ ابو اللیث سمرقندی تنبیہ الغافلین میں فرماتے ہیں کہ بزرگوں کا ارشاد ہے کہ جو شخص سات کلمات پر مداومت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شریف و مکرم قرار پاتا ہے اور ملائکہ کے نزدیک بھی، اور اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کی مغفرت فرمادیتے ہیں اگرچہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہو اور وہ شخص طاعت کی لذت و حلاوت پاتا ہے اور اسکی حیات و ممات اسکے حق میں بہتر ہوجاتی ہے۔

(۱) اول کلمہ یہ ہے کہ ہر چیز کی ابتداء میں بِسمِ اللہ کہے (۲) دوسرا کلمہ یہ ہے کہ ہر چیز سے فارغ ہونے کے بعد اَلحَمدُ لِلّٰہ کہے (۳) تیسرا کلمہ یہ ہے کہ جب اس کی زبان پر لغو کلمہ جاری ہوجائے یا چھوٹا یا بڑا کوئی برا عمل سرزد ہوجائے تو اَستَغفِرُ اللہ کہے۔ (۴) چوتھا کلمہ یہ ہے کہ کسی کام کے متعلق جب یہ کہے کہ کل کرونگا تو اس کے بعد ہی اِنْ شَاءَ اللہ کہے (۵) پانچواں کلمہ یہ ہے کہ جب اسکو کوئی ناگوار امر پیش آتا نظر آئے تو لَاحَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ کہے (۶) چھٹا کلمہ یہ ہے کہ جب اسکے جان یا مال میں کوئی چھوٹی یا بڑی مصیبت پہونچے تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون کہے (۷) ساتواں یہ کہ ہمیشہ شب و روز کے اوقات میں اس کی زبان پر کلمہ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ جاری رہے۔

ان کلمات کو پڑھنے کی حضرت والا بہت ہی ترغیب دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ان کلمات کو پڑھنے کی تعلیم فرمائی ہے تو اس لئے کہ آدمی جب انکو یاد رکھیگا اور موقع موقع سے پڑھتا رہیگا تو اس کے کل اوقات ذکر اللہ میں مشغول ہوجائیں گے اور آدمی پورا ذاکر ہوجائے گا۔ ہم نے ان کلمات کی فضیلت ایک خاص موثر عنوان سے حضرت فقیہہ کے کلام میں پائی تو جی چاہا کہ ناظرین کے افادہ کے لئے نقل کردیں لہذا اسکا ترجمہ یہاں درج کردیا۔ والسلام

ذکر اللہ تعالیٰ

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب
نور اللہ مرقدہٗ

ناشر
دفتر: معرفت حق ۲۳ بخشی بازار۔ الہ آباد ۳

ذکر اللہ تعالیٰ

فرمایا کہ سنیئے :-

علامہ نووی کتاب الاذکار میں فرماتے ہیں۔ قال اللہ العظیم العزیز الحکیم (فاذکرونی اذکرکم) و قال تعالیٰ وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ بندے کا سب سے افضل و اعلیٰ حال یہ ہے کہ اللہ رب العالمین کے ذکر میں مشغول ہو اور اس کے بعد وہ حال ہے کہ ان اوراد میں مصروف ہو جو سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے وارد ہیں۔

سبحان اللہ کتنی عمدہ بات بیان فرمائی کہ عبد کا افضل حال ذکر اللہ میں اشتغال ہے۔ ہم لوگوں کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ ہمارا کونسا حال افضل ہے۔ یہ ہیں عالم۔ اب کے علماء ایسی باتیں بیان نہیں کرتے اس لئے جو حال بد ہے ظاہر ہے۔

آپ لوگ یہ سوچتے ہونگے کہ ذکر کی بحث کیوں چھیڑ دی اور اسکو کیوں بیان کر رہے ہیں تو بھائی آخر کیوں نہ بیان کروں۔ دنیا میں ہر چیز تو بیان کی جارہی ہے اور سبھی چیز چل رہی ہے تو آخر ذکر اللہ کے بیان کو کیوں چھوڑ دیا جائے اس کو بھی چلنے دیجئے آپ کا کیا حرج ہے۔

ذکر کی فضیلت کیلئے کیا یہ حدیث قدسی کافی نہیں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں کہ انا عند ظن عبدی بی وانا معہ اذ اذکرنی فان ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی وان ذکرنی فی ملاء ذکرتہ فی ملاء خیر منہم۔ متفق علیہ۔

(ترجمہ) میں اپنے عبد کے ظن کے پاس ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جبکہ وہ میرا ذکر کرتا ہے پس اگر وہ اپنے جی میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی اپنے نفس میں اس کا ذکر کرتا ہوں اور اگر جماعت میں ذکر کرتا ہے تو میں اسکا ذکر ایسی جماعت میں کرتا ہوں جو اس جماعت سے بہتر ہے (یعنی ملائکہ میں) ——

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اپنے ایک رسالہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ حدیث میں ہے :- فان ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی وان ذکرنی فی ملاء ذکرتہ فی ملاء خیر منہ - یہ باب ترقی سے ہے یعنی حال جمع وفنا سے فرق وبقا کی طرف اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے عبد کو جمع فرماتے ہیں اس طور پر کہ وہ تنہا ہو کر اپنے نفس میں ذکر کرے تو اس کو فنا کر دیتے ہیں پھر بعض لوگوں کو تو اسی مقام میں رہنے دیتے ہیں اور یہ مقام بھی کچھ کم نہیں ہے۔

اور یہ لوگ حقیقۃً اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ وہ حجابات جو بندے اور حق تعالیٰ کے درمیان ہیں مرتفع فرما دیتے ہیں اور اس پر اپنے ذکر کی تجلی فرماتے ہیں اور اس مقام میں عبد مذکور اور اللہ تعالیٰ ذاکر ہو جاتے ہیں ــــ سبحان اللہ کس قدر فضیلت ذکر کی اس سے مفہوم ہوتی ہے کہ کہاں تو عبد ذاکر تھا اور اللہ تعالیٰ مذکور اور اب اسی ذکر کی وجہ سے اللہ رب العالمین خود عبد کے ذاکر اور عبد مذکور ہو جاتا ہے۔ پس اسی وجہ سے علامہ نوویؒ نے فرمایا ہے کہ عبد کا افضل حال اشتغال بذکر اللہ تعالیٰ ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے ذکر میں فنا کرنے کے بعد بعض لوگوں کے لئے جب یہ ارادہ فرماتے ہیں کہ ان کو ہادی فرما دیں تو اس کو جماعت میں ذکر اللہ کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔ پس اس کی وجہ سے اس کو بقا کا مقام عطا فرماتے ہیں۔ پس جب عبد ذکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بہتر جماعت میں اس کا ذکر فرماتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ بہترین جماعت میں ذکر کرنے کا مطلب واللہ اعلم۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکا ذکر مثلاً ملائکہ اور اولیاء و انبیاء اور ان کے ازواج کی زبانوں پر جاری کر دیتے ہیں اور اس ذاکر کو مشاہدہ کرا دیتے ہیں۔ ظاہر تو یہ ہے کہ یہ حضرات اس کا ذکر کرتے ہیں مگر حقیقتاً اللہ تعالیٰ اس کے ذاکر ہیں۔

آپ لوگ خود غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کا ذکر فرما دیں گے تو کیسا کچھ ذکر ہوگا اور ذاکرین کے لئے کتنی فضیلت کی بات ہے۔ اسی موقع کے لئے یہ مصرع ہے ؎

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے جو اس محفل میں ہے

اب سنئے کہ بہت ہی تعجب کی بات تو ان لوگوں سے ہے جو ایسی جگہوں پر آمد و رفت رکھتے ہیں مگر صرف آنا ہی جانا ہے تعلیمات کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کیوں آتے ہیں جب کام کرنا مقصود نہیں ہے۔ محض بدن سے قریب ہونے بلکہ بدن پر بھر بھر اکر گر جانے ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں۔ یہ گمراہی نہیں تو اور کیا ہے؟

بات یہ ہے کہ جب اصلی چیز رخصت ہو جائیگی تو اس کی جگہ نقل آجائے گی جب اخلاص کو لوگ ترک کر دینگے تو اس کی جگہ تصنع و ریاکاری کا آجانا لازمی ہے۔ تو چونکہ ان لوگوں نے اخلاص و صدق کو چھوڑ دیا ہے اور اس کو اختیار کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے اس لئے ہم لوگوں کو خوش کرنے کے لئے قریب ہونا چاہتے ہیں مگر خود سوچو کہ اگر ہم خوش بھی ہو جائیں تو محض اس سے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو راضی ہو نہیں جائیں گے۔ وہ تو اسی وقت راضی ہوں گے جب کہ تم اخلاص و صدق اختیار کرو گے۔ علامہ نوویؒ نے اپنی کتاب الاذکار میں اخلاص و صدق کے متعلق اقوال نقل فرمائے ہیں ایک ان میں کا یہ ہے کہ روینا عن الاستاذ ابی علی الدقاق رضی اللہ عنہ۔ قال الاخلاص التوقی عن ملاحظۃ الخلق والصدق التنقی عن مطاوعۃ النفس۔ فالمخلص لاریاء لہ والصادق لا

اعجاب لہ — سبحان اللہ! کیا ہی عمدہ اخلاص وصدق کی تعریف فرمائی اور دونوں میں کیسا فرق فرمایا۔ ملاحظہ خلق سے بچنے کو تو اخلاص فرمایا۔ اور نفس کی مطاوعت ومتابعت سے احتراز کو صدق۔ پس اس تعریف کی بنا پر مخلص وہ ہوگا جس میں ریا نہ ہو اور صادق اس کو کہیں گے جس کے اندر عجب نہ ہو۔

ذکر کے فضائل احادیث میں کثرت سے وارد ہیں مگر ہمارے یہاں آنے والے ذکر میں مشغول نہیں ہوتے۔ کام کرتے کرتے تھک گیا مگر دیکھا کہ لوگوں کو جو فائدہ ہونا چاہیئے نہیں ہو رہا ہے۔ غور کیا کہ آخر نفع کیوں نہیں ہو رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے دل میں ڈالا کہ بات یہ ہے کہ یہ لوگ ذکر اللہ نہیں کرتے اس لئے فیض سے محروم ہیں۔

صحبت کی فرضیت مسلم ہے اس سے فیوض وبرکات حاصل ہوتے ہیں مگر اس سے ذکر کی ضرورت کیسے منتفی ہوگئی جیسے نماز فرض ہے تو اس سے زکوٰۃ کی اور حج کی فرضیت کیسے ساقط ہوسکتی ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ پر فرض ہیں۔ ایک کو اگر ترک کریگا تو دوسرا فریضہ اس کی تلافی نہیں کرسکتا۔ اسی طرح ذکر کو بھی سمجھ لیجئے جو طریق میں جو لوگ داخل ہیں ان کو ذکر کرنا لازم ہے۔ بغیر اس کے غفلت دور نہیں ہوگی۔ میں آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ ذکر کیجئے اور پھر اس کا نفع دیکھئے۔ (علماء سے مخاطب ہوکر فرمایا) کہ ذکر کی فضیلت احادیث میں کتنی وارد ہے مگر یہ لوگ اس کو بھولے ہوئے ہیں نہ خود عمل کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو بتلاتے ہیں۔ آخر کیوں جب احادیث میں فضیلت وارد ہے تو کیوں نہیں عمل کیا جاتا۔ چونکہ خود عمل نہیں کرتے اس لئے دوسروں کو کیا بتلادیں۔ سنئے آپ لوگ کتنے ہی علم پڑھ لیں مگر جو درجہ ولایت کا ذکر سے ملتا ہے وہ نہ ملیگا۔ جب محض علم ہی علم رہتا ہے تو عموماً یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز جہاں مانع وحائل ہوئی سب علم دھرا رہ جاتا ہے۔ اور جب ذکر دل میں رچا رہتا ہے اور اللہ رب العالمین کی محبت دل میں بسی رہتی ہے تو یہ دشوار سے دشوار مقام پر سنبھلے رہتی ہے۔ بھائی آخر کوئی بات اہم ہے جبھی تو اللہ تعالیٰ نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کی طرف ترغیب دی ہے اور تمام اہل اللہ نے اس کے فضائل بیان فرمائے ہیں اور اپنے متعلقین سے ذکر کرایا ہے۔ جسکی وجہ سے بڑے بڑے مراتب لوگوں نے حاصل کئے ہیں۔

کیا یونہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ افضل الذکر لا الہ الا اللہ۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو ذکر سے موسوم فرمایا ہے۔ نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ یہاں ذکر سے مراد قرآن ہے۔ پھر بھی حضور نے فرمایا کہ افضل الذکر لا الہ الا اللہ۔ بات یہ ہے کہ بیشک قرآن ذکر ہے اور سب سے بڑھ کر ذکر ہے مگر قرآن میں تفصیل ہے۔ اس ذکر سے بلندی کم استعدادوں کیلئے نفع اٹھانا دشوار تھا اس لئے کلمہ طیبہ کا ذکر تبلایا کہ اس سے دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کریں اور اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کریں پھر قرآن پاک سے بھی استعداد کے قوی ہوجانے کے بعد نفع ہوگا۔ چنانچہ ہر موقع کیلئے ذکر کی تعلیم فرمائی ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھو۔ نکلتے وقت یہ دعا پڑھو۔ سونے لگو تو ان اذکار کو کہہ لیا کرو اور جب بیدار ہو تو یہ پڑھ لیا کرو۔ اسی طرح پاخانہ میں داخل ہونے اور

نکلنے کی الگ الگ دعائیں ارشاد فرمادیں اور ان پر عمل کی لوگوں کو ترغیب دی یہ اسی لئے تاکہ کوئی وقت غفلت میں نہ گذرے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص ہمہ وقت تلاوت پر تو قادر نہیں ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختصر مختصر کلمات ذکر کے تعلیم فرمادیئے تاکہ لوگ آسانی سے کرسکیں۔

علماء نے ان تمام اوراد واذکار کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وارد ہیں جمع فرمایا ہے اور مستقل تصانیف فرمائی ہیں، علامہ نوویؒ نے بھی اس کتاب میں ہر موقع کے لئے دعاؤں کو مذکور فرمادیا ہے۔ کوئی دعا چھوڑی نہیں ہے بہت ہی عمدہ کتاب ہے۔ ایک مستقل فصل قائم فرمائی ہے کہ ذکر میں کیا کیا داخل ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جان لو کہ ذکر تسبیح و تہلیل ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طاعت جو بھی ہو اسکا عامل اللہ تعالیٰ کا ذاکر ہے۔ ایسے ہی سعید ابن جبیرؒ اور دوسرے علماء نے فرمایا کہ ــــــ

حضرت عطاءؒ نے فرمایا ہے کہ مجالس حلال و حرام کو کہ کیسے بیع و شرا کیجائے۔ کیسے نماز روزہ ادا کیا جائے کیسے نکاح و طلاق کے امور کو انجام دیا جائے یہ سب مجالس ذکر ہی ہیں۔

سبحان اللہ کیسی عمدہ بات بیان فرمائی کہ یہ مجالس وعظ و تلقین و تعلیم و تربیت ان سب کا شمار مجالس ذکر ہی میں ہے۔

صاحب کشافؒ اللہ تعالیٰ کے ارشاد والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

الذاکر اللہ کثیرا من لایکاد یخلو من ذکر اللہ بقلبہ اولسانہ اوبھما و قراءۃ القرآن والاشتغال بالعلم من الذکر۔ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من استیقظ من نومہ وایقظ امرأتہ فصلیا جمیعا رکعتین کتبا من الذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات	اللہ تعالیٰ کے کثیر ذکر کرنے والے وہ لوگ ہیں کہ کسی حال میں ذکر اللہ سے خالی نہیں رہتے محض قلب سے یا صرف لسان سے یا دونوں سے ذکر اللہ جاری رکھتے ہیں اور قراۃ قرآن اور اشتغال بالعلم بھی منجملہ ذکر کے ہے بلکہ اعلیٰ فرد ذکر کا ہے جبکہ غفلت کے ساتھ نہ ہو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بیدار ہوا اور اپنی بیوی کو بیدار کیا پس دونوں نے دو رکعت نماز پڑھی تو الذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات میں سے لکھ لئے جاتے ہیں۔ (کشاف ص۲۳۶ ج ۳)

دیکھئے صاحب کشاف نے ذکر کثیر کا مطلب یہ لکھا کہ ہمہ آن قلب یا لسان یا دونوں سے ذکر میں مشغول رہا جائے اشتغال بالعلم کو بھی ذکر فرمایا ہے تو اس کے متعلق سنیئے۔ بیشک یہ ذکر ہے۔ مگر جبکہ اس سے غفلت زائل ہوجائے، مقصود قلب سے غفلت کی نفی ہے اگر اشتغال بالعلم سے نفی غفلت ہوجاتی ہے تو سبحان اللہ کیا پوچھنا ہے مقصود حاصل ہے، ورنہ ان لوگوں کو یعنی مشتغلین بالعلم کو بھی مستقل ذکر کرنے کی ضرورت ہوگی اس لئے کہ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ یہ پڑھنے پڑھانے والے کورے کے کورے ہی رہ جاتے ہیں۔ قیل و قال کو زبان ہی پر جاری کرلیا

جاتا ہے قلب تک اس کا اثر نہیں اترتا تو یہ اشتغال بالعلم ذکر سے مستغنی نہیں کر سکتا۔ مشائخ نے علماء اعلام سے بھی ذکر کرایا ہے بلکہ کچھ مدت کے لئے درس و تدریس و وعظ و افتاء سے منع کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ تلاوت کلام اللہ سے روک دیا ہے اور ذکر میں مشغول کیا ہے۔ اسلئے کہ یہ مشاغل یعنی تعلیم و وعظ و افتا وغیرہ منتہوں کے ہیں اور یہ منصب انبیاء کا ہے اگر کوئی مبتدی ان کاموں کو انجام دینا چاہے تو انجام نہیں دے سکتا۔ بجائے نفع کے اس کو ضرر ہوگا اور ذکر چونکہ بسیط ہوتا ہے اس لئے اس کا اثر براہ راست قلب تک پہونچتا ہے ابھی اللہ اللہ تھوڑی دیر زبان پر جاری کیجئے اور دیکھئے کہ اس کا اثر قلب تک پہونچتا ہے یا نہیں۔ اور جب قلب متاثر ہو جاتا ہے تو اس کو درس و تدریس وغیرہ سے بھی نفع ہوتا ہے اور یہ موجب غفلت نہیں ہوتے۔ قرآن و حدیث اعلیٰ ذکر ہیں اس سے اثر لینے کے لئے استعداد درکار ہے پس ابتداء میں جب ذکر نفی اثبات یا مجرد ذکر سے اپنے قلب کو متاثر کرو گے تو قرآن و حدیث سے بھی پورا اثر ہوگا۔ خوب سمجھ لو۔

علامہ نوویؒ کتاب الاذکار میں فرماتے ہیں۔ جان لو کہ اس آیت کریمہ یعنی والذاکرین اللہ کثیراً والذاکرات کے مطلب میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پس امام ابوالحسن الواحدیؒ نے کہا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مراد ذاکرین سے وہ لوگ ہیں جو نمازوں کے بعد ذکر کرتے ہیں اور صبح و شام کے اوقات میں اور اپنے لیٹنے سونے کے مقامات میں اور جبکہ سو کر اٹھتے ہیں اور جبکہ صبح یا شام کو اپنے گھروں سے نکلتے ہیں تو اللہ جل شانہ کا ذکر کرتے ہیں۔

اور حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں الذاکرین اللہ کثیرا کا مصداق کوئی نہیں ہو سکتا جب تک کہ کھڑے ہونے اور بیٹھنے اور لیٹنے (گویا ہر حالت) میں ذکر اللہ نہ کرے۔ اور حضرت عطاؒ فرماتے ہیں جس نے پانچوں نماز ان کے حقوق کے ساتھ ادا کر لی تو وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات میں داخل ہے۔

اور شیخ امام ابوعمر و ابن صلاحؒ اس مقدار ذکر سے سوال کئے گئے جس کے کرنے کے بعد الذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات میں شمار کئے جائیں۔ تو فرمایا کہ جب ان اذکار پر جو صبح و شام کے اوقات اور مختلف احوال کیلئے شب و روز میں ماثور و منقول ہیں ان پر مواظبت کرے۔

دیکھئے علماء الذاکرین اللہ کثیرا کے کیسے کیسے مطلب بیان کر رہے ہیں۔ یہ سب سلف سے منقول ہے اسی کو بیان کر رہا ہوں مگر ان وظائف کی طرف التفات نہ کریں گے۔ ابھی اٹھیں گے تو کہیں گے کہ وظیفہ بتلا دو۔ آخر یہ سب جو بتلایا جاتا ہے وظیفہ نہیں تو اور کیا ہے۔ مگر ایک نہیں سنتے۔ جو اذکار حضورؐ سے منقول ہیں اس سے بڑھ کر کوئی وظیفہ ہو سکتا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب چیزیں تو بیان کیں اذکار و وظائف ہی جس سے اللہ تعالیٰ سے قرب پیدا ہوتا ہے اسی کو چھوڑ دیں گے۔

سنو! علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ محدث اور جنبی اور حائض و نفساء کے لئے بھی قلب و لسان سے ذکر جائز ہے اور ان کا ذکر تسبیح، تہلیل، تحمید و التکبیر و درود شریف اور دعا وغیرہ ہے لیکن قرأۃ قرآن جنبی اور حائض و نفساء

کے لئے حرام ہے۔ کثیر ہو یا قلیل یہانتک کہ بعض آیت بھی۔ ہاں قرآن کا اجرا اپنے قلب پر بغیر لفظ کے جائز ہے ایسے ہی قرآن پاک کی طرف نظر کرنا اور اس کا گذارنا قلب پر جائز ہے۔ ہمارے اصحاب نے یہ فرمایا کہ حائض وجنبی کو جب کوئی مصیبت پہونچے تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھنے کی اجازت ہے۔ اور سوار ہوتے وقت یہ دعا سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْن پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح دعا کے وقت رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ پڑھ سکتے ہیں مگر جبکہ اس سے قرأت قرآن کا قصد نہ ہو۔

سنئے! یہ جو حائض ونفساء کو تسبیح و درود شریف وغیرہ کی اجازت ہے اسی لئے کہ نماز قرأت قرآن تو کریں گی نہیں تو اتنی مدت بس پوری غافل ہو جائیں گی اور قلب ذکر اللہ سے کوسوں دور ہو جائیگا۔ اس لئے ان کو ان اذکار میں مشغول کیا گیا ہے۔

سنئے! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ذکر اللہ کی طرف اس طرح ترغیب وتخصیص فرمائی کہ "کیا میں تم کو ایسی بات کی خبر نہ دوں جو تمہارے اعمال میں سب سے بہتر اور تمہارے بادشاہ کے نزدیک پاکیزہ اور تمہارے درجات میں سب سے ارفع اور تمہارے لئے نفاق ذہب وفضہ سے خیر اور اس سے بھی بہتر کہ تم دشمن سے ملو اس طرح کہ تم ان کی گردنوں کو مارو اور وہ تمہاری گردنوں کو ماریں"؟ تو صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ضرور ارشاد فرمائیے تو آپ نے فرمایا کہ وہ ذکر اللہ ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

ایک دوسری حدیث یہ ہے۔ کہ ایک آدمی نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ شرائع اسلام مجھ پر کثیر (ثقیل) ہو گئے مجھے کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے جس کو میں مضبوطی سے اختیار کروں (یعنی اس کو ہر زماں ہر حال میں برابر کرتا رہوں) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری زبان ذکر اللہ سے تر رہے سبحان اللہ ان ارشادات گرامی سے کسقدر فضیلت ذکر کی مفہوم ہوئی۔

صاحب مرقاۃ ملا علی قاریؒ جو بہت ہی زبردست عالم ہیں مشکوٰۃ کی ان احادیث کی شرح کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ تمہارے لئے ذکر کی فضیلت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ اور انا جلیس من ذکرنی اور انا معہ اذا ذکرنی کافی وافی ہے۔ اسی واسطے امام غزالی مقام ذکر میں داخل ہونے کے بعد فرماتے تھے کہ میں نے اپنی عمر کا ایک حصہ وجیز ووسیط وبسیط کی تصنیف میں ضائع کر دیا۔

سنئے امام غزالیؒ جو سب کے نزدیک حجت ہیں یہ فرما رہے ہیں مطلب یہ ہے کہ اگرچہ پہلے بھی علمی مشاغل ہی میں رہے مگر قلب میں غفلت تھی غفلت کے ساتھ یہ سب کام ہوئے تو گویا کوئی کام ہوا ہی نہیں عمر ضائع ہوئی۔ امام کے اس بات سے ذکر ونفی غفلت کی اہمیت سب ہی کے لئے اگرچہ علماء ہوں کیسی مفہوم ہوئی۔

اسی لئے صوفیہ و بزرگان دین نے اپنے متعلقین و منتسبین سے ذکر کرایا ہے اور ان کو اپنے ارشادات سے اس کی ترغیب دی ہے۔ سیدنا رفاعیؒ تو ذکر کو وصال حق کا مقناطیس فرماتے ہیں۔ یعنی جس طرح مقناطیس میں اثر ہوتا ہے کہ اپنی طرف کشش کر لیتا ہے ایسے ہی ذکر اللہ تعالیٰ تک پہونچا دیتا ہے۔

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ بزرگو! ذکر اللہ کی پابندی کرو کیونکہ ذکر وصال حق کا مقناطیس ہے، قرب کا ذریعہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانوس ہوجاتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے مانوس ہوا وہ اللہ تعالیٰ تک پہونچ گیا۔ حضرت سیدنا معین الدین چشتیؒ کا کیا ہی عمدہ اسکے متعلق شعر ہے ؎

وصال حق طلبی ہم نشیں نامش باش

بہ بیں وصال خدا در وصال نام خدا

اسی طرح صاحب ترصیع الجواہر المکیہ نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ علماء طریق نے فرمایا ہے کہ قلب کو جلا کرنے میں ذکر کا وہ درجہ ہے جو تانبا کے صاف کرنے میں ریت و بالو کا ہے۔ اور تنویر قلب میں دیگر طاعات کی حیثیت ایسی ہے جیسے تانبے کی صفائی میں صابون کی۔

صاحب مرقاۃ تحریر فرماتے ہیں کہ لاترتفع جمیع العلل الظاھرۃ والباطنۃ الا بالذکر الموثر فی القلب الذی ھو سلطان الاعضاء ـــــ یعنی تمام علل ظاہرہ و باطنہ ذکر ہی سے مرتفع ہوتے ہیں جو کہ قلب میں موثر ہو اس لئے کہ یہی سلطان الاعضاء ہے۔

آج عام طور پر لوگ خطرات وساوس کے شکار ہیں اور آ کر کہتے بھی ہیں مگر جو علاج اصل ہے اسکو بتلایا جاتا ہے تو اس پر عمل نہیں کرتے پھر معلوم نہیں کیوں آتے ہیں اور کیوں پوچھتے ہیں جبکہ عمل نہیں کرنا ہوتا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہماری طرف سے سب شیخ کرے۔ یہ لوگ ہمکو تو متبرک سمجھتے ہیں مگر تعلیمات کو متبرک نہیں سمجھتے۔

عجیب حال ہے معلوم نہیں کس نے ان لوگوں سے یہ بتلادیا ہے کہ اگر کسی شیخ و مصلح کو پاؤ تو بس اس کے بدن پر بلا سمجھے گرو۔ یہی کل کامیابی ہے اور یہی دین ہے۔ تعلیمات کی طرف اصلاً التفات نہیں کرتے۔ اگر یہ لوگ سیکھیں تو بہت کچھ معلوم ہو جائے مگر سیکھنے کا قصد ہی نہیں کرتے۔ رسوم کا غلبہ ہو گیا ہے ظاہری آداب مشائخ کو کافی سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ منجملہ بدعات کے ایک یہ بھی بدعت ہے کہ ان لوگوں نے مشائخ کے قرب اور آداب رسمی کو دین سمجھ رکھا ہے۔

اب اپنے علماء کے ارشادات جو وساوس و خطرات کے بارے میں ہیں سنو!

علامہ محی الدین نوویؒ نے کتاب الاذکار میں ایک مستقل باب اس پر قائم کیا ہے کہ "باب مایقولہ

من بلی بالوسوسۃ "یعنی باب اس امر میں کہ جب کوئی وسوسہ میں مبتلا ہو تو اس کو کیا کہنا چاہیئے۔

اس باب میں علامہ نوویؒ نے اس روایت کو نقل فرمایا ہے کہ ابو زمیل نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ کچھ اپنے سینہ میں پاتا ہوں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا وہ کونسی شے ہے۔ تو انھوں نے کہا ایسی شے ہے کہ زبان پر نہیں لاسکتا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ کیا کچھ شک کے قبیل سے ہے اور ہنسے اور فرمایا کہ اس سے کسی نے نجات نہیں پائی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نازل فرمایا (فان کنت فی شك مما انزلنا الیك الآیۃ) یعنی اگر آپ شک میں ہوں اس سے جو ہم نے نازل کیا آپ کی طرف الخ) پھر حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ جب اپنے نفس میں اس قسم کی کوئی چیز پاؤ تو یہ پڑھ لیا کرو (هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ)

پھر تحریر فرماتے ہیں:۔

وقال بعض العلماء یستحب قول لا الہ الا اللہ لمن ابتلی بالوسوسۃ فی الوضوء او فی الصلوٰۃ او فی شبھہما فان الشیطان اذا سمع الذکر خنس ای تاخر و بعد۔ ولا الہ الا اللہ راس الذکر ولذلك اختار السادات الاجلۃ من صفوۃ ھذہ الامۃ اھل تربیۃ السالکین وتادیب المریدین قول لا الہ الا اللہ لاھل الخلوۃ وامروھم بالمداومۃ علیھا۔ وقالوا انفع علاج فی دفع الوسوسۃ الاقبال علی ذکر اللہ تعالیٰ والاکثار منہ	بعض علماء نے فرمایا ہے لا الہ الا اللہ کہنا اس شخص کے لئے جو وضو یا نماز یا ان کے مثلیہ اور کسی شے میں وسوسہ میں مبتلا ہو مستحب ہے۔ اسلئے کہ جب شیطان ذکر سنتا ہے تو وہاں سے کھسک جاتا ہے اور دور ہو جاتا ہے۔ لا الہ الا اللہ راس الذکر ہے۔ اسی وجہ سے سادات اجلہ نے جو اس امت کے صفوہ ہیں اور تربیت سالکین اور تادیب مریدین کے اہل ہیں اس کلمہ لا الہ الا اللہ کو اہل خلوت کے لئے پسند فرمایا ہے۔ اور ان کو مداومت کا امر فرمایا ہے۔ اور ان حضرات نے یہ فرمایا ہے دفع وسوسہ کا سب سے نافع علاج ذکر اللہ کی طرف اقبال اور اس کا اکثار ہے۔

دیکھئے فرما رہے ہیں سادات اجلہ جو اس امت کے صفوۃ ہیں اور سالکین و مریدین کی تربیت کے اہل ہیں ان لوگوں نے اہل خلوت کیلئے ذکر اللہ تعالیٰ کلمہ لا الہ الا اللہ کو منتخب و مختار فرمایا ہے۔ سنئے اہل خلوت فرما رہے ہیں آپ لوگوں کو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ خلوت کیا چیز ہے، اور لا الہ الا اللہ کو راس الذکر فرما رہے ہیں جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ یہی وہ قاعدہ ہے جس پر ارکان دین کی بنا قائم ہے اور یہی کلمہ علیا ہے اور یہی وہ قطب ہے جس پر اسلام کی چکی گھوم رہی ہے اور یہی ایمان کے شعبوں میں سب سے اعلیٰ شعبہ ہے اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ بلکہ یہی کل ہے اس کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔ اور حضرت مجدد صاحبؒ

نے اس کلمہ کے بہت بہت فضائل بیان فرمائے ہیں اس کے بعد فرماتے ہیں اَللّٰھُمَّ لَا تَحْرِمْنَا مِنْ بَرَکَاتِ هٰذِهِ الْكَلِمَةِ الطَّيِّبَةِ وَثَبِّتْنَا عَلَيْهَا وَاَمِتْنَا عَلٰى تَصْدِيْقِهَا وَاحْشُرْنَا مَعَ الْمُصَدِّقِيْنَ لَهَا وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ بِحُرْمَتِهَا وَبِحُرْمَةِ مُبَلِّغِيْهَا عَلَيْهِمُ الصَّلَوٰتُ وَالتَّسْلِيْمَاتُ وَالتَّحِيَّاتُ وَالْبَرَكَاتُ۔

علامہ نووی تحریر فرمارہے ہیں سب لوگوں نے اجماع کیا ہے کہ ذکر اللہ سے بڑھ کر وساوس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

چنانچہ صاحب مرقاۃ من نفس عن مومن کربۃ من کرب الدنیا نفس اللہ عنہ کربۃ من کرب یوم القیامۃ ومن یسر علی معسر یسر اللہ علیہ فی الدنیا والآخرۃ۔ الحدیث کے تحت فرماتے ہیں کہ:

قال بعض العارفین لا یخفی ان المعسر وصاحب الکربۃ ھو المرید فی وادی الغربۃ المحتاج الی قطع العقبات النفسانیۃ و المنازل الظلمانیۃ والنورانیۃ کما اشتھر عن الکتانی من ان بین العبد والحق الف مقام من نور وظلمۃ ویتلقاہ الوساوس والھواجس فعلی شیخہ ان ینفس کربۃ الوساوس عنہ بامرہ بترک المبالاۃ بھا والتامل فی الحجج العقلیۃ والادلۃ النقلیۃ ان استاھلہ وادامۃ الذکر والابتھال عن المولیٰ ویسھل علیہ سواء الطریق ویذیقہ حلاوۃ التحقیق حتی یسطع فی قلبہ انوار القلوب و یطلع فی سرہ شموس الوصول الی المحبوب

بعض عارفین نے فرمایا ہے کہ معسر اور صاحب کربۃ وہ مرید ہے جو غربت (مسافرت) کی وادی میں ہے اور عقبات نفسانیہ اور منازل ظلمانیہ اور نورانیہ کے قطع کرنے کا محتاج ہے۔ جیسا کہ کتانی سے مشہور ہے کہ انھوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ظلمت اور نور کے ایک ہزار مقام ہیں۔ اس کو (اسکے طے کرنے میں) وساوس و ہواجس پیش آتے ہیں۔ اس کے شیخ کے لئے لازم ہے کہ اس کو وساوس کی کربت سے نکالے اس طرح کہ اسکو امر کرے کہ اس کی طرف التفات مت کرو اور اگر اہل ہو تو حجج عقلیہ اور نقلیہ میں غور کرنے کا حکم کرے۔ اور اس کو ادامۃ ذکر اور اللہ تعالیٰ سے گریہ وزاری کا امر کرے (اور شیخ کے لئے ضروری ہے) کہ اس پر سواء طریق کو آسان کرے اور تحقیق کی حلاوت چکھاوے۔ یہاں تک کہ اس کے قلب میں انوار قلوب روشن ہوجائیں اور وصول الی المحبوب کے آفتاب اسکے باطن میں طلوع ہوجائیں۔

مرقاۃ ص ۲۲۱ ج ۱

سبحان اللہ کیسی عمدہ بات فرمائی کہ مرید بھی صاحب کربت ہے۔ قطع مسافت میں شیخ کی دستگیری کا محتاج ہے۔ شیخ کے لئے لازم ہے کہ اس کو کربت سے نکالے۔ اور شیخ کو اس کربۃ عظیمہ سے نکالنے کا ظاہری کربت سے نکالنے سے کہیں زیادہ آخرت میں اجر و ثواب ملے گا۔ اور اسکا یہ طریق ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی

وساوس و ہواجس میں مبتلا ہے تو اسکو عدم التفات کا امر کرے اور ذکر پر مداومت کرائے۔حلاوت تحقیق کی چکھاوے یہاں تک کہ اس کے باطن میں انوار وآفتاب طلوع ہو جائیں ـــــ اب یہ سب چیزیں رخصت ہوگئیں طریق ہی ختم ہو گیا۔ دیکھئے کیا فرمارہے ہیں کہ ترک التفات کے ساتھ ساتھ مداومت ذکر کو بھی فرمارہے ہیں۔اور یہ بہت ہی ضروری ہے بغیر اس کے وساوس کا ازالہ ہوگا نہیں جیساکہ علامہ نوویؒ نے تحریر فرمایاکہ بالاتفاق سب سادات صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ذکر اللہ سے بڑھ کر نافع علاج وساوس کا نہیں ہے۔جب ذکر قلب میں آجائیگا تو پھر وساوس کا قلع قمع کردے گا۔

سنو وساوس کا معاملہ بھی نہایت مہتم بالشان ہے۔کبھی وساوس اعتقادیات میں آتے ہیں اگر ذرا بھی اس میں اختیار کو دخل ہوا تو کفر ہو جائیگا اور ایمان جاتا رہے گا۔اور کبھی اعمال میں طرح طرح کے وساوس آتے ہیں اس پر عمل کرکے آدمی گمراہ ہو جاتا ہے۔اور یہ عموماً ہوتا ہے اس لئے کہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک وقت میں آدمی صوم صلوٰۃ ذکر واذکار کا پابند ہوتا ہے پھر اس کو ترک کر دیتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہوتی ہے اس قسم کے وساوس باربار آتے ہیں کہ اتنے دنوں سے یہ اعمال کر رہے ہو کچھ حاصل نہ ہوا۔اسکی وجہ سے سب ترک کر دیتا ہے۔

یہ کوئی معمولی شئے نہیں ہے اس کے علاج کی طرف جلد متوجہ ہونا چاہئیے۔علماء فرماتے ہیں کہ خواطر کا معاملہ بڑا مہتم بالشان ہے کہ شقاوت وسعادت کا سارا مدار ہی انھیں پر ہے اور فرشتہ اور شیطان اور نفس کے تابع ہیں بہتیرے خواطر ہیں کہ انسان کو اسفل السافلین میں پہونچا دیتے ہیں اور اچھے خواطر مقتضائے روح ہیں کہ طاہر چیز ہے اور گندگی خواطر ذات انسانی اور خواہشات نفسانی کے مقتضائے طبعی ہیں پس ان میں فرق کرنا کتنا ضروری امر ٹھہرا۔

صاحب رسالہ قشیریہ نے منجملہ فرائض سالک کے اخلاء خواطر کو بھی تحریر فرمایا ہے۔چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں لیس من آداب المریدین کثرۃ الاوراد بالظاهر فان القوم فی مکابدۃ اخلاء خواطرهم و معالجۃ اخلاقهم ونفی الغفلۃ عن قلوبهم۔الخ

یعنی مریدین کو تین چیز کا کرنا ضروری ہے۔ایک تو یہ ہے کہ خواطر ردیہ سے اپنے کو خالی کرے۔دوسرے یہ کہ اخلاق رذیلہ کی اصلاح کرے اور ثالثاً یہ کہ قلب سے غفلت کو دور کرے۔اور یہ بھی تبلایا کہ فرائض اور سنن کے ادا کے بعد ذکر کی استدامت کرنا جو قلب کی توجہ کے ساتھ ہو۔صلوات نافلہ کی کثرت سے بڑھ کر اس کے لئے اتم و مفید ہے۔

اس سے اخلاء خواطر کی اہمیت کس قدر مفہوم ہوئی کہ سالک　منجملہ وظائف وفرائض کے اخلاء خواطر بھی ہے اور اس کا علاج واحد بس استدامت علی الذکر ہے۔چنانچہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کسی طالب کے خط کے جواب میں یہ تحریر فرماتے ہیں کہ سلطان الاذکار حقیقی کے بعد خطرات سوء کی گنجائش نہیں رہتی مگر ہاں خیالی

سلطان الاذکار ہوگا۔ اب اس کی تدبیر کثرت ذکر ہے کہ بیخ ذکر قائم ہو کر بیخ خطرات کو قطع کردے۔ ع

ہر گہ کہ سلطان خیمہ زد غوغا نماند عام را

نیز ایک دوسری جگہ کسی طالب کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

شاہ صاحب کے مرید کا جو حال لکھا ہے ان کے خیال میں انفعال ہے قلب میں ذکر راسخ نہیں ہوا۔ ان کو ذکر کرنا لازم ہے خطرات رفع نہیں ہوتے جب تک قلب میں ذکر نہ قائم ہووے۔

سبحان اللہ یہ ہیں کامل اہل اللہ۔ ایسی تربیت ہوا کرتی تھی جس سے لوگوں کی تکمیل ہوا کرتی تھی اب چونکہ ان کی سی تربیت نہیں ہے اس لئے سب نقصان ہی نقصان نظر آرہا ہے ــــ حضرت نے کیا ہی عمدہ بات ارشاد فرمائی کہ اب اس کی تدبیر کثرت ذکر ہے کہ بیخ ذکر قائم ہو کر بیخ خطرات کو قطع کردے۔ اسی طرح یہ فرمایا کہ خطرات رفع نہیں ہوتے جب تک قلب میں ذکر نہ قائم ہووے

ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ ذکر اور وساوس ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اس لئے کہ وساوس شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں اور ذکر رحمٰن کا ہے کیا مجال ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو وہاں شیطان کے وساوس کی گنجائش ہو۔ اور جب یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شیطان دور ہو جاتا ہے تو جس دل میں ذکر متمکن ہو اس کے پاس شیطان کیسے پھٹک سکتا ہے۔ اور جس کے قلب پر ذکر اللہ کا تسلط ہے اس پر شیطان کا داؤ کیسے چل سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں ؎

آسکے غیر سرے خانۂ دل میں کیسے　　کہ خیال رخ دلدار ہے درباں اپنا

ذاکر کے متعلق یہ ارشاد ہے انا جلیس من ذکرنی وانا معہ اذا ذکرنی (یعنی میں اپنے ذاکر کے پاس ہوں اور اس کا جلیس ہوں) کیسے آسکتا ہے۔ جناب اللہ اس کی حفاظت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ مومنین کی صفات میں سے فرما رہے ہیں انہ لیس لہ سلطان علی الذین امنوا وعلی ربھم یتوکلون الآیۃ۔ یقیناً اس کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

اذا مسھم طائف من الشیطان تذکروا۔ یعنی جب انکو شیطان (کے وسوسہ) کا کچھ اثر لگ جاتا ہے تو وہ خدا کو یاد کرنے لگتے ہیں۔

ــــ علامہ شامی نے ... حدیث ... ایک شخص ... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم میں کا ایک آدمی اپنے دل میں ایسی بات ... [illegible] ... الحمد للہ الذی رد کیدہ الی الوسوسۃ ... [illegible] ... آمنت باللہ کہے۔

... [illegible] ... اللھم اجعل ... [illegible] ... ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

... [illegible] ... دعاء تلقین فرمائی۔ ۱۲

اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مذمت فرمارہے ہیں جو کہ ذکر اللہ سے اعراض کرتے ہیں ان پر عقوبۃً شیطان کو مقرر کر دیتے ہیں۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اندھا بن جاوے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں سو وہ اس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ اس کو راستے سے روکتا رہتا ہے، اور یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ راہ پر ہیں۔

علامہ نودی، اسی باب یعنی باب مایقول من بلی بالوسوسہ میں فرماتے ہیں کہ سید الجلیل احمد ابن ابی الجواریؒ نے فرمایا کہ میں نے ابو سلیمان الدارانیؒ سے وسواس کی شکایت کی تو فرمایا کہ اگر تم اس کے انقطاع کا ارادہ کرتے ہو تو یہ کرو کہ جس وقت وسوسہ محسوس کرو تو خوش ہو۔ اس لئے کہ جب تم خوش ہوگے تو تم سے وسوسہ منقطع ہوجائے گا۔ کیونکہ شیطان کو مومن کے سرور سے بڑھ کر مبغوض شے کوئی نہیں ہے اور اگر اس سے غمگین ہوگے تو اور زیادہ تم کو وسوسہ میں مبتلا کردے گا۔ مصنف فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ یہ بات اس قول کی موید ہے جس کو بعض ائمہ نے کہا ہے کہ "وسواس میں وہی لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو کامل الایمان ہوتے ہیں، اسوجہ سے کہ چور خانہ ویراں کا قصد نہیں کرتا۔ (یعنی جہاں مال ہوتا ہے وہیں جاتا ہے

حضرت مولانا تھانوی رحؒ بھی یہی فرمایا کرتے تھے یہاں سے اس کی تائید ہوگئی۔ اور اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جس کے دل میں ایمان ہوتا ہے پریشان کرنے کے لئے شیطان اس کے دل میں وساوس ڈالتا ہے تاکہ وہ محزون ہو اور اس کو تکلیف ہو کفار کو اس قسم کے وساوس نہیں ڈالتا اس لئے کہ ان لوگوں کی طرف سے وہ فارغ ہوچکا ہے اور ان سے مطمئن ہو کر ان کو چھوڑ دیا ہے اور مسلمانوں کی طرف گمراہ کرنے اور پریشان کرنے کے لئے اپنی پوری قوت سے متوجہ ہے۔ مگر میں ایک بات یہ بیان کرتا ہوں سنئے کہ کہ جس طرح چور بیت ویران دخالی کا قصد نہیں کرتا ویسے ہی اس آباد مکان کا قصد نہیں کرتا جہاں سمجھتا ہے کہ سپاہی و دربان مسلح اس کی حفاظت کے لئے مقرر ہیں اسی طرح شیطان جیسے کفار کی طرف جن کے قلوب ایمان و اسلام سے خالی ہیں ان کا قصد نہیں کرتا ویسے ہی اس مومن کامل کی طرف بھی توجہ نہیں کرتا جس کو سمجھتا ہے کہ ذکر اس کے قلب میں راسخ ہے اور فرشتے اس کے قلب کی نگہبانی کررہے ہیں تو پھر ڈر کے مارے وہاں جاتا نہیں اور نہ اس کی وہاں گنجائش ہے ذکر اس کے قلب کا احاطہ کئے رہتا ہے کوئی دروازہ اور سوراخ نہیں ہے کہ اس سے وہ داخل ہوسکے۔ اسی کو حضرت حاجی صاحبؒ فرمارہے ہیں ؎

آسکے غیر مرے خانۂ دل میں کیسے + کہ خیال رُخ دلدار ہے درباں اپنا

ایک مرتبہ حضرت مولانا تھانوی ؒ سے کسی نے پوچھا کہ جب وسوسہ نہیں آتا تو کیا قلب میں ایمان نہیں تو حضرت ؒ نے فرمایا کہ نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ وجہ نہ آنے کی یہ ہے کہ شیطان ناامید ہوگیا ہے۔ بیکار وقت کیوں ضائع کرے اور مقصود تو بہکانا ہے۔ دوسرے بہت ہیں ان کو بہکاوے اس کے پیچھے کیوں پڑے۔

پس حاصل یہ ہوا کہ خطرات کا معاملہ مشکل ہے۔ اس کو سمجھنا چاہئے کہ آیا اس میں اختیار کا تو دخل نہیں ہے۔ ہرگز ہرگز اختیار کو دخل نہ دے اور اس پر عمل نہ کرے۔ اگر عمل نہ کرے گا تو یہی علامت اس کے غیراختیاری ہونے کی ہوگی۔ اور ایسے مبتلا کو چاہئے کہ ذکر اللہ کی کثرت کرے تاکہ بیخ ذکر قائم ہو کر بیخ خطرات کو قطع کردے۔ جیسا کہ حضرت مولانا گنگوہی ؒ نے فرمایا ہے۔

اضافہ — اشرف اقل

مناجات

پادشاہا جرم ما را درگذر — ما گنہگاریم و تو آمرزگار
تو نکوکاری و ما بد کردہ ایم — جرم بے اندازہ بیحد کردہ ایم
سالہا در بند عصیاں گشتہ ایم — آخر از کردہ پشیماں گشتہ ایم
دائما در فسق و عصیاں ماندہ ایم — ہم قرین نفس و شیطاں ماندہ ایم
روز و شب اندر معاصی بودہ ایم — غافل از امر و نواہی بودہ ایم
بے گنہ نگذشت بر من ساعتے — با حضور دل نہ کردم طاعتے
بر در آمد بندۂ بگریختہ — آبروئے خود ز عصیاں ریختہ
مغفرت دارم امید از لطف تو — زانکہ خود فرمودۂ لا تقنطوا
بحر الطاف تو بے پایاں بود — ناامید از رحمتت شیطاں بود
نفس و شیطاں زد کریما راہ من — رحمتت باشد شفاعت خواہ من
چشم دارم کز گنہ پاکم کنی — پیش ازاں کاندر لحد خاکم کنی

اندر آں دم کز بدن جانم بری
از جہاں با نور ایمانم بری

قال اللہ تعالیٰ

فذکر بالقرآن من یخاف وعید

الحمد للہ والمنۃ

"ایک مضمون نافع ومفید برائے اہل ایمان"

(مسمّیٰ بہ)

التذکیر بالقرآن

یعنی

مصلح الامۃ عارف باللہ حضرت مولانا ومقتدانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ

باھتمام:- دفتر معرفت حق

۲۳ بخشی بازار الہ آباد طبع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"التذکیر بالقرآن"

(مصلح الامۃ عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ
کا وہ مکتوب گرامی جو ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ
میں شائع ہوا)

رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی گذشتہ مہینہ الہ آباد تشریف لے گئے تھے جہاں انکو ایک تقریر کرنی تھی، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب مدظلہٗ کچھ عرصہ سے الہ آباد ہی میں مقیم ہیں، موصوف حضرت ممدوح کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ اس صحبت میں حضرت ممدوح نے وعظ و تقریر کے متعلق کچھ ارشاد فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سب سے زیادہ مؤثر تذکیر بالقرآن ہے۔ لیکن اب اسکا رواج بہت کم ہو گیا ہے مولانا ندوی نے استدعا کی اس مضمون کو حضرت قلمبند فرما دیں ـــــ چند روز کے بعد حضرت مولانا کا ایک گرامی نامہ مولانا ندوی کے نام آیا۔ اس کی اصل حیثیت مضمون یا مقالے کی نہیں، بلکہ مکتوب کی تھی۔ مولانا ندوی نے اس کی اشاعت کیلئے درخواست کی تو حضرت مولانا نے اس کو قبول فرمالیا اور اسمیں کچھ اضافات کرکے اس کی افادیت میں اور اضافہ فرما دیا۔ وہی مکتوب ذیل میں شروع کے چند سطریں حذف کرکے جنکا تعلق مضمون سے نہیں ہے) درج کیا جا رہا ہے۔ نعمانی]

مکرمی زاد اللہ عرفانکم   اَلسَّلامُ علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حسن اتفاق سے جس مضمون کو میں پیش کرنا چاہتا تھا وہ نہایت عمدہ اور بلیغ عنوان سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے کلام میں مل گیا اس لئے بعینہٖ

ارسال خدمت ہے، اُمید ہے کہ نہایت محظوظ ہوں گے۔ وھوھذا

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ الفوز الکبیر کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ

نعم الٰہی در بارۂ ایں بندۂ ضعیف بیشمار اند و اجل آنہا توفیق فہم قرآن عظیم ست۔

و منن حضرت رسالت پناہ علیہ الصلوٰۃ والسلام بر کمترین امتیان بسیار ند و اعظم آنہا تبلیغ فرقان کریم است۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن را تلقین فرمود بقرن اول تا ایشان بقرن ثانی رسانیدند و ہکذا و ہکذا تا آنکہ ایں در ماندہ را نیز از روایت و درایت آں حصہ رسید اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی ھٰذَا النبی الکریم سیدنا و مولانا و شفیعنا افضل صلواتک وایمن برکاتک وعلٰی آلہٖ و اصحابہٖ وعلماء اُمتہٖ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین

(الفوز الکبیر ص۲)

ترجمہ:- حق تعالیٰ کے انعامات اس بندۂ ضعیف و ناتواں پر بیشمار ہیں۔ لیکن اُن سب سے بڑھ کر نعمت قرآن شریف کے سمجھنے کی توفیق ہے۔

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احسانات اپنے اس کمترین امت پر بہت زیادہ ہیں، مگر ان میں سب سے بڑا احسان آپ کا یہ ہے کہ آپ نے قرآن حکیم کو ہم تک پہونچایا (وہ اس طرح سے کہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام کو قرآن کریم مرحمت فرمایا اور پھر صحابہؓ نے تابعینؒ کو پہونچایا اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اس عاجز کو بھی اس کی روایت اور درایت (یعنی تلاوت اور فہم معانی) سے حصہ ملا۔ اے اللہ تو رحمت و برکت بھیج ایسے نبی کریم پر جو ہمارے سید ہیں اور ہمارے مولیٰ ہیں اور محشر میں ہمارے شفیع ہیں، اپنی افضل ترین رحمت اور مبارک ترین برکت اُن پر بھی اور اُنکے جملہ اصحاب پر بھی اور ان کی اُمت کے تمام علماء پر بھی برحمتک یا ارحم الراحمین۔

پھر کچھ دور بعد فرماتے ہیں۔

ومقاصد ایں رسالہ منحصر است در پنج باب۔ (باب اول) در بیان علوم پنجگانہ کہ قرآن عظیم بطریق تنصیص بر آنہا دلالت فرمودہ است وگویا نزول قرآن بالاصالۃ برائے آں بودہ است (باب دوم) در بیان وجوہ خفاء نظم قرآں بہ نسبت اذہان اہل زمان وعلاج آں وجوہ باوضح بیان (باب سوئم) در بیان لطائف نظم قرآن وشرح اسلوب بدیع آں بقدر طاقت وامکان (باب چہارم) در بیان فنون تفسیر وحل اختلاف واقع در تفسیر صحابہ وتابعین (باب پنجم) در ذکر جملہ صالحہ از شرح غریب قرآن واسباب نزول آں کہ مفسر را حفظ آں مقدار ضروراست و خوض در تفسیر بدون ضبط آں ممنوع ومحظور۔

(الفوز الکبیر ص۳)

ترجمہ۔ اس رسالہ کے مقاصد پانچ بابوں میں منحصر ہیں، باب اول ان پانچ علوم کے بیان میں کہ قرآن شریف نے بطور تصریح کے ان پر دلالت فرمائی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قرآن کریم کا نزول ہی گویا دراصل انھیں کے بیان کے لئے ہوا ہے۔ (باب دوئم) نظم قرآن کے خفا کے وجوہ کے بیان میں جو اہل زمانہ کے بعض اذہان کے اعتبار سے ہیں اور ان وجوہ کا علاج واضح بیان کے ساتھ (باب سوم) نظم قرآنی کے لطائف اور خوبیوں کا بیان اور بقدر طاقت وامکان اس کے اسلوب بدیع کی تشریح کے بیان میں (باب چہارم) فنون تفسیر کے بیان میں اور صحابہ وتابعین کی تفسیر میں واقع شدہ اختلافات کا حل، (باب پنجم) غرائب القرآن اور اس کے شان نزول سے متعلق اسقدر کلام کہ ہر مفسر کے لئے اس مقدار کا یاد ہونا ضروری ہے اور علم تفسیر میں بدون اس کے حفظ وضبط کے خوض کرنا منع ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

باب اول در بیان علوم پنجگانہ کہ قرآن عظیم بطریق تنصیص بیان آں فرمودہ است۔

باید دانست کہ معانی منظومۂ قرآن خارج از پنج علم نیست، علم احکام از واجب و مندوب و مباح و مکروہ و حرام خواہ از قسم عبادات باشد یا معاملات یا تدبیر منزل یا سیاسیات مدینہ و تفصیل این ذمہ فقیہ است وعلم مخاصمہ با چہار فرقہ ضالہ یہود و نصاریٰ و مشرکین و منافقین و تفریع بریں علم ذمہ متکلم ست وعلم تذکیر بالاء اللہ از بیان خلق آسمان و زمین و الہام بندگان بانچہ ایشان را درمی بایست و از بیان صفات کاملہ او تبارک و تعالیٰ وعلم تذکیر بایام اللہ یعنی بیان وقائع کہ آں را خدائے تعالیٰ ایجاد فرمودہ است از جنس انعام مطیعین و تعذیب مجرمین وعلم تذکیر بموت و ما بعد آں از حشر و نشر و حساب و میزان و جنت و نار و حفظ تفاصیل ایں علوم و الحاق احادیث و آثار مناسبہ آں وظیفۂ واعظ و مذکر ست۔

(الفوز الکبیر فی اصول التفسیر صـ۳)

ترجمہ:۔ پہلا باب ان علوم پنجگانہ کے بیان میں کہ قرآن حکیم نے بطور تنصیص وتصریح کے انکو بیان فرمایا ہے۔

جاننا چاہیئے کہ معانی قرآن ان پانچ علوم سے خارج نہیں ہیں۔ علم احکام یعنی واجب و مستحب و مباح اور مکروہ و حرام خواہ عبادات کی قسم سے ہوں یا معاملات کی جنس سے ہوں یا تدبیر منزل کی قسم سے ہوں یا سیاست مدینہ کے قبیل سے ہوں بہرحال اس علم کی تفصیلات کا بیان فقیہ کے ذمہ ہے اور دوسرا علم مخاصمہ اور مناظرہ ہے۔ ان چار گمراہ فرقوں کے ساتھ یعنی یہود و نصاریٰ و مشرکین اور منافقین اور اس علم کے مسائل کا بیان کرنا متکلم کا کام ہے۔ اور تیسرا علم تذکیر بالاء اللہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان کرنا۔ مثلاً آسمان اور زمین کی تخلیق کا بیان اور اللہ تعالیٰ کا بندوں کو انکی تمام ضروریات کا الہام فرمانا نیز حق تعالیٰ شانہ کی صفات کاملہ کا بیان۔

اور چوتھا علم تذکیر بایّام اللہ ہے یعنی ان واقعات کا بیان کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جنھیں واقع فرمایا جو کہ از قبیل انعام مطیعین اور تعذیب مجرمین کے ہیں اور پانچواں علم تذکیر بموت و ما بعد آں ہے یعنی موت اور اس کے بعد پیش آنے والے حالات کا ذکر کرنا مثلاً حشر و نشر، حساب و میزان جنت و دوزخ وغیرہ اور ان علوم ثلثہ کے تفاصیل کا محفوظ کرنا اور بیان کرنا اور اس کے ساتھ اسکے مناسب احادیث و آثار کو بھی ملا لینا یہ واعظ اور مذکر کا وظیفہ ہے۔

دیکھئے حضرت شاہ صاحب نے خطبہ میں حمد و نعت کو کس قدر موثر اور بلیغ انداز سے ادا فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام (اپنے اوپر) توفیق فہم قرآن اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا احسان تبلیغ فرقان کو فرمایا۔

پھر اپنے اس رسالہ کے مضامین کو جن پانچ ابواب میں منقسم فرمایا ہے، ان میں سے پہلے باب میں قرآن عظیم کے ان علوم خمسہ کو بیان کیا ہے جن کے لئے گویا نزول قرآن ہی بالاصالۃ ہوا ہے۔ یعنی علم احکام، علم مخاصمہ با فرق ضالہ، علم تذکیر بآلاء اللہ، علم تذکیر بایام اللہ، علم تذکیر بموت و ما بعد آں اور پھر ان علوم خمسہ مذکورہ میں سے اول کو وظیفۂ فقیہ۔ ثانی کو وظیفۂ متکلم اور بقیہ ثلثہ یعنی تذکیر بآلاء اللہ، بایام اللہ اور بموت و ما بعد آں کو وظیفۂ واعظ و مذکر قرار دیا ہے۔

اب آپ خود غور فرمایئے کہ ہمارے واعظین اور مذکرین فی زمانہ کہاں تک اپنے اس وظیفہ پر عامل ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ لوگوں کی مناسبت دینی آج اس درجہ ضعیف ہو چکی ہے کہ اگر آپ اس بات کو سمجھانا چاہیں کہ واعظ اور مذکر کا کیا وظیفہ ہے تو لوگ اس کو مشکل سے سمجھیں گے کیونکہ وظیفہ کا مفہوم انکے ذہن میں کچھ اور ہے اس کو کوئی وظیفہ سمجھنے اور کہنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

میں اسی بات کو آپ سے ذرا تفصیل سے عرض کرنا چاہتا تھا، پھر یہ خیال ہوا کہ بجائے اس کے کہ اپنے لفظوں میں کہوں حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے الفاظ نقل کر دوں کہ ان میں برکت بھی ہے اور یہ حضرات تھوڑے سے لفظوں میں معانی کے دریا بہا دیتے ہیں۔

پس جیسا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ "حفظ تفاصیل ایں علوم و الحاق

احادیث و آثار مناسبۂ آں وظیفۂ واعظ و مذکر ست" اصل منصب واعظ و مذکر کا تو یہی ہے کہ ان امور کو قرآن شریف ہی سے بیان کرے۔ کیونکہ ان سب مضامین کا ذکر قرآن کریم میں ہے اور اللہ تعالیٰ جس مضمون کو بیان فرما دیں گے تو ظاہر ہے کہ اس سے عمدہ اور اس سے زیادہ مؤثر کس کا بیان ہو سکتا ہے؛ اور جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے ہی متاثر نہ ہوگا تو پھر وہ کسی اور کے کلام سے کیا متاثر ہوگا؛ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ہاں اس کی اجازت ہے کہ وہ اپنے اصل مضامین قرآنیہ کی وضاحت اور تشریح کے لئے اس میں احادیث اور آثار کا بھی الحاق کرلے تو کرسکتا ہے باقی صرف احادیث اور آثار تو یہ قرآن شریف سے ہم کو مستغنی نہیں کرسکتے۔

میں آپ سے یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ لوگوں نے اس زمانہ میں قرآن مجید کو جو کہ ہدایت ہی کے لئے آیا تھا اور ہدایت کا خدائی ذریعہ اور طریق تجویز ہوا تھا اسکو تو چھوڑ رکھا ہے اور اس کے بدلہ میں دوسری کتابوں کو لے رکھا ہے، بزرگوں کا کلام دیکھتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کے کلام سے شغف نہیں رہا۔ جب یہ حال ہو تو پھر ہدایت کیسے ہو سکتی ہے اور مسلمانوں کی حالت کیونکر درست ہو سکتی ہے۔ جو قوم قرآن پر ایمان نہ لاوے گی وہ غیر قرآن سے ایمان کیسے حاصل کرسکتی ہے۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ اس سلسلہ کی ایک روایت بھی یاد آئی۔ سنئے:۔

منتخب کنز العمال میں ہے کہ:۔

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَنَّ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ کَتَبُوْا کِتَابًا فَاتَّبَعُوْهُ وَتَرَکُوا التَّوْرَاةَ۔
(منتخب کنز العمال)

ترجمہ۔ حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک کتاب لکھی اور اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی توراۃ کو چھوڑ دیا۔

شامی میں ایک حکایت حضرت امام شافعیؒ کی لکھی ہے کہ

قال المزنی قرأت کتاب الرسالۃ علی الشافعیؒ ثمانین مرۃ فما من مرۃ الا وکان یقف علی خطاء فقال الشافعی هیه ابی الله ان یکونه کتاباً صحیحاً غیر کتابه۔

(شامی صفحہ ۲۰ ج ۱)

ترجمہ۔ مزنیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کتاب الرسالۃ کو حضرت امام شافعیؒ پر اسّی بار پڑھا مگر ہر بار ایک نہ ایک غلطی کا پتہ چلتا۔ پس حضرت شافعی نے فرمایا کہ ہٹاؤ جی اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہی نہیں کہ ان کی کتاب کے علاوہ کوئی اور کتاب بالکل صحیح ہو۔

اسی سلسلہ میں ایک بات اور کہنا چاہتا تھا۔ وہ یہ کہ قرآن کریم تاثر اور تاثیر کے لئے نازل ہوا ہے اور لوگ اس سے خود بھی متاثر ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی متاثر کیا ہے۔

چنانچہ روح المعانی میں ہے کہ:۔

قرأ تمیم الداری سورۃ الجاثیہ فلما اتی علی قوله تعالیٰ ام حسب الذین الآیۃ لم یزل یکررها ویبکی حتی اصبح وهو عند المقام۔ عن بشیر مولی الربیع بن خیثم ان الربیع کان یصلی الفجر بهذه الآیۃ ام حسب الذین الخ فلم یزل یرددها حتی اصبح وکان الفضیل بن عیاض یقول لنفسه اذا قرأها لیت شعری من ای الفریقین انت؟

(روح المعانی۔ ج ۲۵)

ترجمہ۔ حضرت تمیم داریؓ نے مقام ابراہیم کے پاس سورۂ جاثیہ تلاوت فرمائی اور جب آیت ام حسب الذین اجترحوا السیات پر پہونچے تو اسکو بار بار پڑھتے رہے اور روتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ حضرت بشیر جو ربیع بن خیثم کے غلام ہیں کہتے ہیں کہ ربیع نماز پڑھ رہے تھے اور جب اس آیت ام حسب الذین پر گذرے تو اسی کو بار بار صبح تک تلاوت فرماتے رہے۔ حضرت فضیل بن عیاض

جب اس آیت کو پڑھتے تو اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتے کہ کاش اے نفس میں یہ جانتا ہوتا کہ ان دونوں فریقوں میں سے تو کس میں سے ہے؟

چنانچہ اس آیت کو اسلاف مبکاۃ العابدین کے لقب سے ملقب فرماتے تھے۔ کیونکہ بہت سے عُبّاد اس کی تلاوت کر کر کے روتے تھے ــــــ لیکن دوسروں کو وہی لوگ متاثر کر سکتے تھے جو پہلے خود اس سے متاثر ہوں۔ آج دوسرے لوگوں پر آیات کا بھی اثر نہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ خود ہی متاثر نہیں ہوتے اسلئے دوسروں کو بھی متاثر نہیں کر پاتے۔ اور جب غیر متاثر قلب دوسروں کو بذریعہ قرآن متاثر نہیں کر سکتا تو ایسا شخص غیر قرآن سے تو بدرجۂ اولیٰ قوم میں کچھ تاثر نہیں پیدا کر سکتا۔ پس یہی وجہ ہے آج اثر کے ختم ہونے کی۔ ورنہ خیال فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہمارے اندر موجود ہو اور پھر گمراہی؟ کس قدر تعجب کی بات ہے۔

آپ نے حدیث شریف کی کتاب کا ترجمہ کرنے کا ذکر فرمایا تھا اسی پر جی چاہا کہ آپ سے اس سلسلہ میں جو کچھ خود سمجھا ہوا ہوں عرض کردوں اس لئے مختصراً کچھ پہلے لکھ چکا ہوں اور بعض باتیں لکھنے کا وعدہ جو کیا تھا وہ اب عرض کر رہا ہوں ورنہ یہ مقصد نہیں کہ ہم حدیث سے یا اس کے ترجمہ سے معاذاللہ مستغنی ہیں اور نہ اس کی وجہ سے قرآن شریف ہی سے مستغنی ہو سکتے ہیں اور نہ قرآن شریف کو لے کر علماء سے مستغنی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ قوم کو علماء کی بھی حاجت ہے۔ حدیث کی بھی قوم محتاج ہے۔ اور قرآن کریم سے تو کسی درجہ میں بھی استغنیٰ نہیں ہے لیکن جہاں یہ سب ہے وہاں یہ بھی سمجھئے کہ علماء کے لئے بھی دوسروں پر اثر ڈالنے کے لئے صرف حدیث و قرآن کا پڑھ دینا بھی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے خود انکا قلب ان مضامین سے پورا پورا متاثر ہو چکا ہو۔ اب اس وقت اگر وہ صرف قرآن شریف کا ایک رکوع یا واعظ اور مذکر اپنے وظیفہ کے مضامین میں کی ایک آیت ہی پڑھ دیگا اور زیادہ تفصیل نہ سہی صرف اسکا ترجمہ ہی

کرکے عوام الناس کو سنا دیگا تو مجھے یہ یقین ہے کہ اسکا صرف اتنا بیان بھی غیر متاثر القلب کے لئے بھی تقریروں سے زیادہ نافع ہوگا۔ اور فائدہ اسکا لازم بھی ہوگا اور متعدی بھی۔ یعنی اس کا دوسروں پر بھی اثر ہوگا اور خود اس کو بھی اجر ملے گا۔

نمونہ کے طور پر قرآن کریم کی چند آیات آپ کے سامنے تلاوت کرتا ہوں اور آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ بتائیے قلوب کو متاثر کرنے کے لئے یہ بیان کچھ کم ہے۔

سنئے! اللہ تعالیٰ ایک جگہ دوزخیوں کا اور دوزخ میں ان کے کھانے وغیرہ کا کیا ذکر فرماتے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ۝ طَعَامُ الْأَثِيمِ ۝ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ۝ خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۝ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ ۝ ذُقْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ۝ إِنَّ هَٰذَا مَا كُنتُم بِهِ تَمْتَرُونَ ۝

(سورہ دخان ۲۵)

ترجمہ:۔ بیشک زقوم کا درخت بڑے مجرم (یعنی کافر) کا کھانا ہوگا جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا اور پیٹ میں ایسا کھولے گا جیسا تیز گرم پانی کھولتا ہے (اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) اس کو پکڑو، پھر گھسیٹتے ہوئے دوزخ کے بیچوں بیچ تک لے جاؤ پھر اس کے سر پر تکلیف دینے والا گرم پانی چھوڑو (اور اس سے استہزا کیا جاویگا کہ) لے چکھ تو بڑا معزز مکرم ہے (اور دوزخیوں سے کہا جائے گا کہ) یہ وہی چیز ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے۔

ملاحظہ فرمایا آپنے کلام کی شوکت اور اس کا اثر۔ اسی کو کہتا ہوں کہ آج صرف قرآن کو دل سے تلاوت کیجئے تو لوگ متاثر ہو جائیں۔

اور پھر اس کے بعد جنتیوں کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ يَلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ۝ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ۝

(سورہ دخان)

بیشک خدا سے ڈرنے والے امن کی جگہ میں ہونگے۔ یعنی باغوں میں اور نہروں میں وہ لباس پہنیں گے باریک اور دبیز ریشم کا۔ آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ بات اسی طرح ہے اور ہم انکا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں سے بیاہ کردیں گے۔ اور وہاں وہ اطمینان سے ہر قسم کے میوے منگلتے ہونگے اور وہاں بجز اس موت کے جو دنیا میں آچکی تھی اور موت کا ذائقہ بھی نہ چکھیں گے اور اللہ تعالیٰ انکو دوزخ سے بچا لیگا یہ سب کچھ آپ کے رب کے فضل سے ہوگا۔ بڑی کامیابی یہی ہے۔ سو ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان میں آسان کردیا ہے تاکہ یہ نصیحت قبول کریں تو آپ منتظر رہیے یہ لوگ بھی منتظر ہیں۔

(بیان القرآن)

سبحان اللہ کلام کی شوکت اور شان ملاحظہ فرمائیے، کوئی اہل دل اگر صرف ان آیات کو تلاوت ہی کردے اور صرف ترجمہ ہی کردے تب بھی اہل ایمان کے قلوب ہل جائیں اور بدن میں کپکپی ہونے لگے۔ یہی مطلب میرا تھا کہ اصلاح کے لئے لوگ قرآن شریف کا وعظ کیوں نہیں کہتے۔ صرف قرآن بھی اصلاح کے لئے کافی ہے اور اسمیں بھی جو تفصیل جنت و دوزخ اور آخرت حشر نشر کی بیان کی گئی ہے وہ احادیث کے مقابلہ میں گو کم سہی تاہم فی نفسہٖ وہ بھی بہت ہے۔

اور سنئے!

ایک اور مقام پر مسیئین اور محسنین کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَن نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝

(سورۂ دخان)

یہ لوگ جو برے برے کام کرتے ہیں کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انکو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جنھوں نے ایمان اور عمل صالح اختیار کیا کہ اُن سب کا جینا اور مرنا یکساں ہو جاوے۔ یہ بُرا حکم لگاتے ہیں۔

(بیان القرآن)

اس کے شانِ نزول کے متعلق صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ

والآية وان كانت في الكفار على ما نقل عن البحر وهو ظاهر ماروى عن الكلبي من ان عتبة وشيبة والوليد ابن عتبة قالوا لعلى كرم الله وجهه وحمزة رضی اللہ عنہ والمؤمنين والله ما انتم على شيء ولئن كان ما تقولون حقاً لحالنا افضل من حالكم في الآخرة كما هو افضل في الدنيا فنزلت الآية أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ وهي متضمنة للرد عليهم على جميع اوجهها كما يعرف بادنى تدبر ويستنبط منها تباين حالي المومن الطائع والمؤمن العاصي وبهذا كان كثير من العباد يبكون عند تلاوتها حتى انها تسمى مبكاة العابدين

(روح المعانی پ ۲۵ ص ۱۳۶)

اور یہ آیت اگرچہ کفار کے متعلق ہے جیسا کہ بحر سے منقول ہے اور یہی کلبی کی اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عتبہ وشیبہ اور ولید بن عتبہ نے حضرت علیؓ حضرت حمزہؓ اور دیگر مومنین سے کہا، خدا کی قسم! تمھارا دین تو کچھ بھی نہیں ہے، اور اگر بالفرض دنیا میں تم لوگوں کی باتیں حق بھی ہوں تب بھی ہمارا حال جس طرح

سے کہ دنیا میں تم سے بہتر ہے اسی طرح آخرت میں بھی بہتر ہوگا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اور یہ ان لوگوں پر تمام وجوہ سے رد کو متضمن ہے جیسا کہ ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتا ہے اس سے یہ بھی مستنبط ہوا کہ مومن مطیع اور مومن عاصی کے احوال بھی متبائن ہوتے ہیں۔ اسی لئے بہت سے عُبّاد اس کو تلاوت کر کرکے روتے تھے۔ چنانچہ اس آیت کا لقب بھی مبکاۃ العابدین (یعنی عابدوں کو رلانے والی) ہوگیا۔

دیکھئے جس زمانہ میں لوگوں میں قرآن شریف کی تلاوت اور اس سے اثر لینے کا معمول تھا تو لوگ صرف اسی ایک آیت سے کیسا کیسا اثر قبول کرتے تھے اور دل ہی جب اثر سے خالی ہو تو پھر ایک آیۃ کیا سارا قرآن بھی اسکے لئے ناکافی ہے۔ انسان جب اس مرتبہ پر پہونچ جاتا ہے تو اسکا مصداق ہو جاتا ہے کہ

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔

(سورۂ محمد)

توکیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔

(بیان القرآن)

اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔ باقی عام قفل کا تو یہ قاعدہ ہے کہ وہ کنجی سے کھل بھی جاتا ہے لیکن قلب پر جب قفل پڑجاتا ہے تو پھر بڑی مشکل سے کھلتا ہے۔ اسی لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث شریف میں یہ دعا مانگی ہے۔

اَللّٰهُمَّ افْتَحْ اَقْفَالَ قُلُوْبِنَا بِذِكْرِكَ وَاَتْمِمْ عَلَيْنَا نِعْمَتَكَ وَاَسْبِغْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلِكَ وَاجْعَلْنَا مِنْ عِبَادِكَ الصَّالِحِيْنَ۔

(مناجات مقبول ص۵۲)

یا اللہ کھول دے قفل ہمارے دلوں کے اپنے ذکر سے اور پورا کر ہم پر اپنی نعمت کو اور کامل کر ہم پر اپنا فضل اور کردے ہمیں اپنے نیک بندوں میں سے۔

ایک اور جگہ قیامت کا کیسا نقشہ کھینچتے ہیں، سنئے فرماتے ہیں:-

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىٕذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَ تَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ وَ اِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ السَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۝ وَ بَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ وَ قِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّ غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَ لَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(سورہ جاثیہ)

اور اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور جس روز قیامت قائم ہوگی اس روز اہل باطل خسارہ میں پڑیں گے اور آپ ہر فرقہ کو دیکھیں گے کہ زانو کے بل گر پڑیں گے ہر فرقہ اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلایا جائیگا۔ آج تم کو تمہارے کئے کا بدلہ ملے گا۔ یہ ہمارا دفتر ہے جو تمہارے مقابلہ میں ٹھیک ٹھیک بول رہا ہے، ہم تمہارے اعمال کو لکھواتے جاتے تھے۔ جو لوگ ایمان لائے تھے اور انھوں نے اچھے کام کئے تو انکو ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور یہ صریح کامیابی ہے۔

اور جو لوگ کافر تھے (ان سے کہا جاوے گا کہ) کیا میری آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں سو تم نے تکبر کیا تھا اور تم بڑے مجرم تھے اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں ہے تو تم کہا کرتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا چیز ہے۔ محض ایک خیال سا تو ہم کو بھی ہوتا ہے۔ اور ہم کو یقین نہیں اور انکو اپنے تمام برے اعمال ظاہر ہو جائیں گے اور جس کے ساتھ وہ استہزا کیا کرتے تھے وہ انکو آگھیرے گا اور کہا جاوے گا کہ آج ہم تم کو بھلائے دیتے ہیں جیسا تم نے اپنے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا اور تمہارا ٹھکانا جہنم ہے اور کوئی تمہارا مددگار نہیں۔ یہ اسوجہ سے ہے کہ تم نے خدائے تعالیٰ کی آیتوں کی ہنسی اڑائی تھی اور تم کو دنیوی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا سو آج نہ تو یہ لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے خدا کی خفگی کا تدارک چاہا جائے گا۔ سو تمام خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں جو پروردگار ہے آسمانوں کا اور پروردگار ہے زمین کا۔ پروردگار ہے تمام عالم کا اور اسی کو بڑائی ہے آسمان اور زمین میں اور وہی زبردست ہے حکمت والا ہے۔

(بیان القرآن)

دیکھئے ان آیات میں قیامت کا کیسا منظر سامنے کر دیا اثر ڈالنے کے لئے یہ مضمون اور یہ آیتیں کچھ کم ہیں۔ اگر کوئی اس سے متاثر نہ ہوگا تو وہ دوسری اور کتابوں سے بدرجہ اولیٰ نہ ہوگا۔ مگر جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اثر ڈالنے کے لئے بیان کرنیوالے کا خود بھی متاثر ہونا شرط ہے۔

ایک اور جگہ جنت اور دوزخ کی کیفیت بیان کر کے جنت کی ترغیب اور جہنم سے ترہیب کس عنوان سے فرما رہے ہیں سنئے۔

ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ أُكُلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوا وَّعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ ۝

اور جس جنت کا متقیوں سے (یعنی شرک و کفر سے بچنے والوں سے) وعدہ کیا گیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس (کی عمارات اور اشجار) کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی اس کا پھل اور اس کا سایہ دائم رہے گا۔ یہ تو انجام ہوگا متقیوں کا اور کافروں کا انجام دوزخ ہوگا۔

(بیان القرآن)

ایک اور جگہ عذاب کفار کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ؕ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۙ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ۝ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۝ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ؕ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۚ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۙ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْۤا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

(سورۃ ابراہیم)

اور (اے مخاطب جو کچھ یہ ظالم لوگ کر رہے ہیں ان سے خدا تعالیٰ کو بے خبر مت سمجھ ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے جس میں ان لوگوں کی نگاہیں

پھٹی رہ جائیں گی۔ دوڑتے ہونگے اپنے سر اوپر اُٹھا رکھے ہوں گے ان کی نظر انکی طرف ہٹ کر نہ آوے گی اور انکے دل بالکل بدحواس ہوں گے اور آپ ان لوگوں کو اس دن سے ڈرائیے جس دن ان پر عذاب آپڑیگا پھر یہ ظالم لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ایک مدت قلیل تک ہم کو مہلت دیجیے (اور دنیا میں پھر بھیجدیجئے) ہم آپ کا سب کہنا مان لیں گے اور پیغمبروں کا اتباع کریں گے (جواب میں ارشاد ہوگا) کیا ہم نے دنیا میں تم کو مہلت طویلہ نہ دی تھی) اور کیا تم نے (اس مہلت کے طول ہی کے سبب) اس کے قبل (دنیا میں) قسمیں نہ کھائی تھیں کہ تم کو کہیں جانا ہی نہیں ہے۔ حالانکہ تم ان لوگوں کے رہنے کی جگہوں میں رہتے تھے جنھوں نے اپنی ذات کا نقصان کیا تھا اور تم کو یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیونکر معاملہ کیا تھا۔ اور ہم نے تم سے مثالیں بیان کیں اور ان لوگوں نے اپنی سی بہت بڑی بڑی تدبیریں کی تھیں اور ان کی تدبیریں اللہ کے سامنے تھیں اور واقعی ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جاویں۔

پس اللہ تعالیٰ کو اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرنے والا نہ سمجھنا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑا زبردست پورا بدلہ لینے والا ہے۔ جس روز دوسری زمین بدل دیجاویگی اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی اور سب کے سب ایک زبردست اللہ کے روبرو پیش ہونگے۔ اور تو مجرموں کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھے گا۔ انکے کرتے قطران (تارکول) کے ہوں گے اور آگ ان کے چہروں پر لپٹی ہوئی ہوگی" تاکہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کے کئے کی سزا دے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بڑی جلد حساب لینے والا ہے۔ یہ لوگوں کے لئے احکام کا پہونچانا ہے اور تاکہ اس کے ذریعہ سے ڈرائے جاویں اور تاکہ اس بات کا یقین کرلیں کہ وہی ایک معبود برحق ہے۔ اور تاکہ دانشمند لوگ نصیحت حاصل کریں۔

بیان القرآن

اور سنئے۔ اور اگر ایک ہی آیت آپ لوگ سُن لیں تو کام بن جائے۔

ایک اور مقام پر مخالفت اور معصیت سے ترہیب کے لئے پچھلی اُمتوں کے واقعات کا کیا ذکر فرماتے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں:-

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ
وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ۝ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا
أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ
الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ۝ إِنْ
أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ
لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا
مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ۝ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ ۚ وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا
جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ۝ (بنی اسرائیل)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یہ بات بتلادی تھی کہ تم سرزمین میں دوبار خرابی کروگے اور بڑا زور چلانے لگوگے۔ پھر جب ان دوبار میں سے پہلی بار کی میعاد آوے گی تو ہم تم پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کریں گے جو بڑے جنگجو ہوں گے پھر وہ گھروں میں گھس پڑیں گے اور یہ ایک وعدہ ہے جو ضرور ہو کر رہے گا۔ پھر (جب تم نادم و تائب ہوگے تو پھر) ان پر تمھارا غلبہ کردیں گے اور مال اور بیٹوں سے تمہاری جماعت بڑھادیں گے۔ اگر اچھے کام کرتے رہوگے تو اپنے نفع کے لئے اچھے کام کروگے اور اگر تم برے کام کروگے تو بھی اپنے ہی لئے۔ پھر جب پچھلی بار کی میعاد آوے گی تو ہم پھر دوسروں کو مسلط کریں گے تاکہ تمھارے منہ بگاڑ دیں اور جس طرح وہ لوگ مسجد میں گھسے تھے یہ لوگ بھی اس میں گھس پڑیں اور جس جس چیز پر ان کا زور چلے سب کو برباد کرڈالیں۔

اس کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگراس بعثِ ثانی کے بعد جب دورہ شریعت محمدیہ کا ہو تم مخالفت و معصیت سے باز آکر شریعت محمدیہ کا اتباع کرلو تو) عجب نہیں کہ تمھارا رب تم پر رحم فرمادے اور اگر تم پھر وہی کروگے تو ہم بھی پھر وہی کریں گے۔

اور ہم نے جہنم کافروں کا جیل خانہ بنا رکھا ہے۔ (بیان القرآن)

اسی طرح سے ایک موقعہ پر اول تو شاہانہ استغنا کیساتھ کلام شروع فرمایا، پھر اس کے بعد نافرمانوں کو حاکمانہ انداز سے تنبیہ فرمائی اور مطیعین پر اپنی انتہائی شفقت کا اظہار فرمایا، ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ○

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ○ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِئِيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ○ (سورۂ کہف)

اور آپ کہدیجئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے سو جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کافر رہے۔ بیشک ہم نے ایسے ظالموں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے کہ آگ کی قناتیں انکو گھیرے ہونگی اور اگر فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی فریاد رسی کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا۔ مونہوں کو بھون ڈالیگا کیا ہی برا پانی ہوگا۔ اور وہ دوزخ کیا ہی بری جگہ ہوگی۔

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے تو ہم ایسوں کا اجر ضائع نہ کریں گے جو اچھی طرح کام کو کرے۔ ایسے لوگوں کے لئے ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں۔ انکے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سبز رنگ کے کپڑے باریک اور دبیز ریشم کے پہنیں گے۔ وہاں مسہریوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔

کیا ہی اچھا صلہ ہے اور کیسا ہی اچھی جگہ ہے۔ (بیان القرآن)

ایک جگہ حق تعالیٰ کے سامنے مجرمین کی پیشی اور وہاں ان کی بیکسی اور بے بسی کا نقشہ کیسا کھینچا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ۝

(سورہ ابراہیم)

اور خدا کے سامنے سب پیش ہوں گے۔ پھر چھوٹے درجہ کے لوگ بڑے درجہ کے لوگوں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے تابع تھے تو کیا تم خدا کے عذاب کا کچھ جزو ہم سے ہٹا سکتے ہو۔ وہ کہیں گے کہ اگر اللہ ہم کو راہ بتلاتا تو ہم تم کو بھی بتلا دیتے۔ ہم سب کے حق میں دونوں صورتیں برابر ہیں خواہ ہم پریشان ہوں خواہ ضبط کریں۔ ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ (بیان القرآن)

بعض روایات میں ہے کہ یہ لوگ پانچسو برس تک جزع فزع کرینگے اور پھر پانچ سو برس تک صبر کریں گے مگر سب بیکار ہوگا۔

قال مقاتل یقولون فی النار تعالوا نجزع فیجزعون خمس مائة عام فلا ینفعھم الجزع فیقولون تعالوا نصبر فیصبرون خمس مائة عام فلا ینفعھم الصبر فحینئذ یقولون سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ۝ منقول از تفسیر مظہری صـ ۱۳ پ ۱۳

حضرت مقاتل فرماتے ہیں کہ وہ لوگ دوزخ میں آپس میں کہیں گے کہ آؤ فریاد کریں، پس وہ لوگ پانچسو سال تک جزع فزع کریں گے۔ لیکن کچھ نفع نہ ہوگا۔ پھر کہیں گے کہ آؤ اب صبر ہی کر کے دیکھیں۔ چنانچہ پانچسو سال تک صبر کریں گے۔ مگر صبر سے بھی نفع نہ ہوگا۔ اس وقت کہیں گے کہ ہم سب کے حق میں دونوں صورتیں برابر ہیں خواہ ہم پریشان ہوں خواہ ضبط کریں۔ ہمارے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔

ایک جگہ جنت اور اہل جنت کا ذکر کر کے کس مؤثر عنوان سے اس کی جانب ترغیب اور تشویق فرمائی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ۝ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۝ يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ۝ خِتَامُهُ مِسْكٌ ۚ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۝ وَمِزَاجُهُ مِن تَسْنِيمٍ ۝ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ۝

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ۝ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ۝ وَإِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انقَلَبُوا فَكِهِينَ ۝ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ۝ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ ۝ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۝ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ۝ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ (سورۃ التطفیف)

نیک لوگ بڑی آسائش میں ہونگے۔ مسہریوں پر بیٹھے بہشت کے عجائبات دیکھتے ہونگے۔ اے مخاطب تو انکے چہروں سے آسائش کی بشاشت پہچانے گا۔ ان کو پینے کے لئے شراب خالص سربمہر جس پر مشک کی مہر ہوگی ملے گی اور حرص کرنے والوں کو ایسی ہی چیز کی حرص کرنا چاہئے اور اس کی آمیزش تسنیم سے ہوگی یعنی ایک ایسا چشمہ جس سے مقرب بندے پئیں گے۔

جو لوگ مجرم تھے وہ ایمان والوں سے ہنسا کرتے تھے اور جب ان کے سامنے سے ہو کر گذرتے تھے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے اور جب اپنے گھروں کو جاتے تھے تو دل لگیاں کرتے اور جب ان کو دیکھتے تو یوں کہا کرتے کہ یہ لوگ یقیناً غلطی میں ہیں حالانکہ یہ لوگ ان پر نگرانی کرنے والے کر کے نہیں بھیجے گئے۔ سو آج ایمان والے کافروں پر ہنستے ہونگے مسہریوں پر (بیٹھے ان کا حال) دیکھ رہے ہوں گے۔ واقعی کافروں کو ان کے کئے کا خوب بدلہ ملا۔ (بیان القرآن)

ایک جگہ منکرین کی تعذیب کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح پُرشوکت انداز میں کلام

فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے کہ:۔

وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝ وَاللَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۝ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۝ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۝ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝

(سورۃ الفجر)

قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی اور رات کی جب وہ چلنے لگے۔ کیونکہ اس میں عقلمند کے واسطے کافی قسم بھی ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے پروردگار نے قوم عاد یعنی قوم ارم کے ساتھ کیا معاملہ کیا جن کے قد و قامت ستون جیسے تھے جن کے برابر شہروں میں کوئی شخص نہیں پیدا کیا گیا۔ اور قوم ثمود کے ساتھ جو وادی القریٰ میں پتھروں کو تراشا کرتے تھے اور میخوں والے فرعون کے ساتھ جنھوں نے شہروں میں سر اٹھا رکھا تھا اور ان میں فساد مچا رکھا تھا، سو آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ بیشک آپکا رب گھات میں ہے۔　　　(بیان القرآن)

میں یہی آپ سے کہنا چاہتا تھا، کہ واعظ اور مذکر کا جو وظیفہ ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کو علی وجہ لا مزید علیہ بیان فرمادیا ہے۔ انھیں چیزوں کی کچھ تفصیل حدیث شریف میں آئی ہے۔ مثلاً قرآن شریف میں حوض کوثر، نہر، باغ، محل وغیرہ کا ذکر ہے اور حدیث میں اس کی وسعت اس کے دروازے جنت کے برتنوں اور پیالوں کی تعداد وغیرہ کا بیان ہے جس سے مزید معلومات تو ضرور ہوجاتی ہیں۔ لیکن یہ سب مقاصد قرآن نہیں ہیں۔ جتنا حصہ بیان سے مقاصد قرآن میں سے تھا وہ پورا پورا قرآن شریف میں مذکور ہے اور یہ اس لئے کہ قرآن کریم شاہی قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور بادشاہوں کا کلام مجمل ہی ہوتا

ہے. اس کی شرح وزراء فرماتے ہیں.

میں کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن شریف سے وعظ کہنا اور اس کا وعظ کہنا آج لوگوں نے بالکل چھوڑ ہی دیا ہے. حالانکہ سلف صالحین اس کی ایک ایک آیۃ سے متاثر ہوتے تھے اور دوسروں کو متاثر کرتے تھے اور لوگ شب کی تنہائی میں جس چیز سے اپنا غم غلط کرتے تھے وہ تلاوت قرآن ہی ہوتی تھی. صحابۂ کرام تہجد کی فرضیت منسوخ ہوجانے کے بعد بھی شب کو اٹھتے تھے اور ذکر و تلاوت میں مشغول ہوتے تھے. اس کے متعلق چند آیتیں سنئے اور پھر اس کی تفسیر بھی سنئے.

ارشاد فرماتے ہیں کہ:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ○ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ○ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○

اور آپ خدائے قادر رحیم پر توکل رکھئے جو آپ کو جس وقت آپ کھڑے ہوتے ہیں اور نمازیوں کے ساتھ آپ کی نشست و برخاست کو دیکھتا ہے وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے. (بیان القرآن)

اس کے تحت صاحب کشاف لکھتے ہیں:

(عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ) على الذی یقہر اعداءك بعزته و ینصرك علیهم برحمته. ثم اتبع کونه رحیما علی رسوله ما هو من اسباب الرحمة وهو ذکر ما کان یفعله فی جوف اللیل من قیامه للتهجد وتقلبه فی تصفح احوال المتهجدین من اصحابه یطلع علیهم من حیث لا یشعرون و یستبطن اسرارهم وکیف یعبدون الله وکیف یعملون لآخرتهم کما یحکی انه حین نسخ فرض قیام اللیل طاف تلك اللیلة ببیوت اصحابه لینظر ما یصنعون لحرصه علیهم وعلی ما یوجد منهم من فعل الطاعات وتکثر الحسنات فوجدها کبیوت الزنابیر لما سمع منها من دندنتهم بذکر الله والتلاوة (کشاف ص۱۳۰ ج ۳)

آپ توکل کیجئے عزیز رحیم پر۔ یعنی اس ذات پر جس نے کہ آپ کو عزت دے کر آپ کے دشمنوں کو مقہور ومغلوب کر دیا اور اپنی رحمت سے آپ کی ان کے مقابلہ میں نصرت فرمائی، اپنے رسول پر اپنا رحیم ہونا بیان کر کے پھر اسباب رحمت کو بیان فرمایا۔ یعنی اس چیز کا ذکر فرمایا جو آپ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی عادت شریفہ تھی یعنی تہجد کے لئے آپ کا شب میں قیام فرمانا اور اپنے تہجد پڑھنے والے اصحاب کے تفتیش احوال کے لئے ادھر اُدھر آنا جانا" تاکہ وہ تو نہ جانیں اور آپ ان کے (ظاہری حالات سے ان کے) قلبی حالات اور کیفیت عبادت معلوم فرمالیں نیز یہ دیکھیں کہ یہ لوگ خدا اور آخرت کے لئے کیا عمل کرتے ہیں جیسا کہ مروی ہے کہ جب کہ قیام لیل کی فرضیت منسوخ ہوگئی تو اسی شب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے حجروں اور اُنکے گھروں کا چکر لگایا" تاکہ آپ دیکھیں اب یہ لوگ کیا کرتے ہیں (یعنی فرضیت تہجد منسوخ ہونے کی وجہ سے اب اس کو ترک کر دیتے ہیں یا اللہ تعالیٰ سے تعلق اور محبت نیز ذکر اللہ سے اُنس ہو جانے کی وجہ سے اب بھی پڑھتے ہیں) اور یہ اسلئے کہ آپ اِن سب پر، ان کے طاعات کرنے پر اور ان کی تکثیر حسنات پر حریص تھے (چاہتے تھے کہ لوگ یہ سب کام زیادہ سے زیادہ کریں) چنانچہ آپ نے ان کے حجروں اور گھروں کو بھڑوں کے چھتوں کے مانند پایا۔ یعنی یہ کہ ان میں سے آہستہ آہستہ ذکر اللہ اور قرآن کی تلاوت کرنے کی وجہ سے آواز کی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی جو بھڑوں کی بھنبھناہٹ کے مشابہ تھی۔

نیز اس کے آگے کی آیتیں سنیئے، ارشاد فرماتے ہیں:۔

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ۝ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ۝ وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۝ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۝ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَانتَصَرُوا مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا ۗ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ۝

کیا میں تم کو بتلاؤں کہ کس پر شیاطین اُترا کرتے ہیں۔ ایسے شخصوں پر اُترا کرتے ہیں جو دروغ گفتار بدکردار ہوں اور جو کان لگاتے ہیں اور بکثرت جھوٹ بولتے ہیں اور شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ چلا کرتے ہیں، اے مخاطب کیا تم کو معلوم نہیں کہ وہ ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں اور زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہاں مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے اور انھوں نے کثرت سے اللہ کا ذکر کیا اور انھوں نے بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہوچکا ہے بدلہ لیا اور عنقریب ان لوگوں کو معلوم ہوجائے گا جنھوں نے ظلم کر رکھا ہے کہ کیسی جگہ انکو لوٹ کر جانا ہے۔ (بیان القرآن)

اس آخری آیت کے متعلق کشاف میں ہے کہ۔

ومعناها ان الذین ظلموا یطمعون ان ینفلتوا من عذاب اللہ وسیعلمون ان لیس لھم وجہ من وجوہ الانفلات وھوا لنجاۃ اللھم اجعلنا ممن جعل ھذہ الآیۃ بین عینیہ فلم یغفل عنھا۔

معنی اس کے یہ ہیں کہ وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا ہے ان کی خواہش تو یہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھوٹ جائیں حالانکہ عنقریب وہ لوگ جان لیں گے کہ چھٹکارے اور نجات کے اسباب میں سے ان کے پاس کوئی بھی سبب نہ ہوگا۔ اے اللہ تو ہمیں بھی ان لوگوں میں سے کردے جنھوں نے اس آیت کو اس طرح سے اپنی نگاہوں کے سامنے رکھ لیا ہے کہ ذرا دیر کے لئے بھی اس سے غافل نہیں ہوتے۔

نیز لکھتے ہیں:۔

ختم السورۃ بآیۃ ناطقۃ بما لا شئی اھیب منہ واھول ولا انکی لقلوب المتاملین ولا اصدع لاکباد المتدبرین وذلک قولہ (وسیعلم) ومافیہ من الوعید البلیغ وقولہ

(الذین ظلموا) واطلاقه وقوله (ای منقلب ینقلبون) وابهامه وقد تلاها ابوبکر لعمرؓ حین عهد الیه وکان السلف الصالح یتواعظون بها ویتناذرون شدتها۔

(کشاف ص۱۳۱ ج ۳)

پھر اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کو ایسی آیت پر ختم کیا جس کا مضمون ایسا ہے کہ کوئی شے اس سے بڑھ کر ہول اور خوف کی نہیں ہے اور نہ غور و فکر اور تدبر کرنے والوں کے قلب و جگر کو رنج و الم دینے والی، بلکہ اس کو پاش پاش کرنے والی ہے اور اس مضمون کو سیعلم کے وعید بلیغ اور الذین ظلموا کے اطلاق اور ای منقلب ینقلبون کے ابہام کے ذریعہ ادا فرمایا گیا ہے اور اسی آیت کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بوقت سپردگی خلافت حضرت عمرؓ کے روبرو تلاوت فرمائی تھا اور سلف صالحین کا اس کے ذریعہ سے باہم وعظ فرمانا اور ایک دوسرے کو ڈرانا ہمیشہ سے معمول رہا ہے۔

دیکھئے اس آیۃ کو مصنفؒ تمام آیات سے زیادہ اہیب۔ اہول۔ انکی لقلوب المتاملین اور اصدع للاکباد المتدبرین فرما رہے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ اسلاف اسی کا وعظ کہتے تھے اور اس کی شدت سے ایک دوسرے کو ڈراتے تھے، چنانچہ حضرت عمرؓ جیسے متقی شخص کو حضرت صدیقؓ نے خلافت سپرد فرمائی ہے تو اسوقت یہ آیت بھی تلاوت فرمائی۔

میں نے بھی جب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب میں دیکھا کہ ایک شاگرد خاص نور اللہ نامی کی اولاً بہت تعریف فرمائی چنانچہ یہ فرمایا ؎

لقد بلوتك فی سلم وفی عتب　　فما وجدتك الا الخالص الذهب

ولم تسم بنور الله الا لانه　　عما قلیل تکون النور فارتقب

تحقیق میں نے تم کو صلح اور نرمی میں بھی آزمایا اور غصہ اور عتاب میں بھی آزمایا لیکن بہر حال تم کو خالص سونا ہی پایا یعنی ہر امتحان میں تم پورے اُترے

اور تمھارا نام جو نور اللہ ہے تو یہ اسی لئے ہے کہ
عنقریب تم نور ہو جاؤ گے (انشاء اللہ) وقت کا انتظار کرو۔
(تفہیمات۔ ج ۱)

اور پھر انکو اجازت بھی دی لیکن آخر میں یہ بھی فرما دیا کہ۔
فان و فی بالشرط فذلك ظنی به وان نکث فَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ (تفہیمات ج ۱)

پس اگر انھوں نے سب شرائط کو پورا کیا تو (سبحان اللہ) اور مجھے ان سے یہی توقع بھی ہے اور اگر (خدانخواستہ) میرے عہد کو توڑا تو عنقریب انکو معلوم ہو جائے گا جنھوں نے ظلم کر رکھا ہے کہ کیسی جگہ انکو لوٹ کر جانا ہے۔
تو مجھے تعجب ہوا کہ ایسے شخص کے بارے میں شاہ صاحب یہ کیا فرما رہے ہیں۔ مگر اس روایت کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ سنت صدیقی ہے۔
بہرحال سلف صالحین کے نزدیک جو آیت اس درجہ اہتمام کی تھی اور وہ حضرات اسکا اتنا اثر لیتے تھے۔ آج ہم اس پر سے کس طرح گذر جاتے ہیں۔ ہم بھی اسکو پڑھتے ہیں، مگر قلب پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ بس اسی کی ضرورت ہے کہ پہلے حضرات اہلِ علم آیات قرآنیہ سے خود متاثر ہوں اور اس کی تلاوت کو اپنا وظیفہ بنائیں اس کے بعد جب دوسروں کو سنائیں گے تب ان پر بھی اثر ہوگا۔ مگر اپنی اس خامی کو یہ لوگ محسوس کرتے ہیں۔ اسی لئے جب اپنی تقریر کا دوسروں پر اثر ہوتا نہیں دیکھتے تو اشعار وغیرہ پڑھ کر اس کو مؤثر بنانا چاہتے ہیں۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کے قلب میں قرآن شریف سے اثر قبول کرنے کی استعداد اور اس کا مادہ پیدا فرما دے تو اس کا آیات قرآنیہ کا سیدھا سادا پڑھ دینا وعظ سننے والوں میں اثر پیدا کر دے جیسا کہ ہونا چاہئے۔
اسی طرح موت اور مابعد الموت کے بیان میں ایک حدیث نقل کرتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں ایسے ہی مضامین کے بیان کرنے کی

ضرورت ہے۔

(عن ابی سعید الخدریؓ) کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول اذا وضعت الجنازۃ فاحتملھا الرجال علی اعناقھم فان کانت صالحۃ قالت قدمونی وان کانت غیر ذالک قالت لاھلھا یا ویلھا این یذھبون بھا یسمع صوتھا کل شیئ الا الانسان ولو سمع الانسان لصعق۔ (رواہ البخاری)

(باب قول المیت وھو علی الجنازۃ قدمونی)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جب میت کو تابوت میں رکھا جاتا ہے اور لوگ اس کو کاندھوں پر اٹھا کر (قبرستان کی جانب) لے چلتے ہیں تو اگر وہ مردہ صالح ہوا تو کہتا ہے کہ مجھے جلدی لے چلو، اور اگر ایسا نہ ہوا تو اپنے رشتہ داروں سے کہتا ہے، ہلاکت ہو میرے لئے یہ تم لوگ مجھ کو کہاں لئے جارہے ہو (اور) اس کی اس آواز کو تمام چیزیں سنتی ہیں، سوا انسان کے اور اگر انسان بھی کہیں سن لے تو بیہوش ہو کر گرجائے۔

آخر میں جی چاہتا ہے کہ علم اور علماء کی فضیلت سے متعلق بخاری شریف کا ایک ترجمۃ الباب اور فتح الباری سے اس کے بعض حصص کی شرح لکھدوں جو مضمون ہذا سے غیر مربوط بھی نہیں ہے اس لئے اسکا بیان بے محل نہ ہوگا۔ وھو ہذا۔

باب العلم قبل القول والعمل لقول اللہ تعالیٰ فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فبدأ بالعلم وان العلماء ورثۃ الانبیاء ورثوا العلم من اخذہ اخذ بحظ وافر ومن سلک طریقا یطلب بہ علما سھل اللہ لہ طریقا الی الجنۃ۔ وقال جل ذکرہ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا وقال سا یَعْقِلُھَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ وَقَالُوْا لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ وقال ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ

فی الدین و انما العلم بالتعلم۔ الخ (بخاری شریف ج ۱)

باب اسمیں کہ علم قول اور عمل سے پہلے ہوتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ فاعلم انہ لا الٰہ الا اللہ اور اس میں ابتداء علم ہی سے فرمائی ہے اور یہ کہ علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں اور یہ کہ انبیاء علم ہی کا وارث بنا تے ہیں سو جس شخص نے اسکو لیا اس نے بڑا حصہ پایا۔ اور یہ کہ جو شخص کسی ایسے راستہ پر چلا جس کے ذریعہ سے علم طلب کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ سہل فرمادیں گے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے علماء ہی اس سے خشیت رکھتے ہیں اور فرمایا کہ انکو نہیں سمجھ سکتے مگر علماء۔ اور فرمایا کہ یہ کفار کہیں گے کہ اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم اہل دوزخ میں سے نہ ہوتے، نیز فرمایا کہ کیا برابر ہیں وہ لوگ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے۔ اور فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو دین میں تفقہ مرحمت فرمادیتے ہیں اور علم تو تعلم یعنی سیکھنے ہی سے حاصل ہوتا ہے ــــــ آگے فتح الباری سے اس کی تشریح ملاحظ فرمائی جائے

(قوله باب العلم قبل القول والعمل) قال ابن المنیر اراد به ان العلم شرط فی صحة القول والعمل ولا یعتبران الا به فهو متقدم علیهما لانه مصحح للنیة المصححة للعمل فنبه المصنف علی ذلك حتی لا یسبق الی الذهن من قولهم ان العلم لا ینفع الا بالعمل تهوین امر العلم والتساهل فی طلبه۔

(قوله وما یعقلها) ای الامثال المضروبة (قوله لو كنا نسمع) ای سمع من یعی ویفهم (قوله او نعقل) عقل من یمیز وهذه اوصاف اهل العلم فالمعنی لو كنا من اهل العلم لعلمنا ما یجب علینا فعملنا به فنجونا۔ (فتح الباری ص۱۱۱ ج ۱)

مصنفؒ نے یہ جو فرمایا کہ علم کا درجہ قول اور عمل سے پہلے ہے۔ تو ابن منیرؒ فرماتے ہیں کہ بخاریؒ کی مراد اس سے یہ ہے کہ قول اور عمل کی صحت کے لئے علم شرط ہے۔ یعنی یہ

دونوں بدون اس کے معتبر ہی نہیں ہیں لہذا علم ان دونوں سے مقدم ہوا اس لئے کہ وہی نیت کو صحیح کرنے والا ہے جو کہ عمل کو درست کرنے والی ہے۔ پس مصنفؒ نے اس پر اس لئے تنبیہ فرمائی کہ مبادا لوگوں کے اس مقولہ سے کہ علم بدون عمل کے نافع ہی نہیں ہوتا۔ علم کی ناقدری یا اسکے طلب میں سستی کا خیال کسی کے ذہن میں راہ نہ پا جائے۔

اور نہیں سمجھتے ان کو یعنی ان امثال کو جو کہ بیان کی جاتی ہیں۔ "کاش کہ ہم سنتے" یعنی سن کر بات کو اسکو سمجھنے اور محفوظ رکھنے والوں کا سا سننا سنتے۔ اور یہ جو فرمایا کہ "کاش ہم سمجھتے" یعنی سمجھنا اس شخص جیسا جو اشیاء کے نیک و بد کی تمیز بھی کرتا ہو اور یہ دونوں چونکہ اہل علم کے اوصاف میں سے ہیں لہذا مطلب یہ ہوا کہ کاش ہم بھی اہل علم میں سے ہوتے تو اپنے ذمہ جو امور واجب تھے ان کو جانتے اور عمل کرتے تاکہ نجات پاتے۔

حضرت بخاریؒ نے تو یہاں صرف سورہ ملک کی ایک ہی آیت لی ہے۔

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ

یعنی اور کہیں گے کہ اگر ہم سنتے اور سمجھتے تو ہم اہل دوزخ میں سے نہ ہوتے۔

لیکن اس کے آگے فرماتے ہیں کہ:۔

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ

یعنی۔غرض اپنے جرم کا اقرار کریں گے سو اہل دوزخ پر لعنت ہے۔

ان میں دوزخیوں کا بیان ہے کہ دوزخ میں جا کر اقرار کریں گے کہ دنیا میں ہم نے سماع قبول نہیں کیا تھا اور عقل و فہم سے کام نہیں لیا تھا اور اب یہاں اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے اور وہاں اپنے کئے پر نادم ہوں گے۔ حیث لا ینفعہم الندم۔

اس کے بعد والی آیت میں مومنین کا بیان ہے کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ

یعنی۔بے شک جو لوگ اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

اس میں انکی جزا، یعنی مغفرت اور اجر کبیر کو ان کی دنیاوی خشیت پر مرتب فرمایا

ہے۔ یعنی آخرت میں انکو مغفرت اور اجر کبیر اس لئے ملیگا کہ وہ دنیا میں خشیت خداوندی کے ساتھ متصف تھے۔ یہ تو فریقین کا الگ الگ حال بیان ہوا۔ یہاں سے میں یہ کہتا ہوں کہ قرینۂ تقابل سے معلوم ہوا کہ کفار نے جس طرح سے دنیا میں سمع اور عقل سے کام نہیں لیا تھا، اسی طرح انکو دنیا میں خشیت بھی نہ تھی اور اسی کے نہ ہونے کی وجہ سے اعتراف بالذنب بھی ان کو نہ تھا اور مومن کو چونکہ دنیا میں خشیت حاصل ہوتی ہے اسلئے وہ اسکے مقدمات یعنی سمع وعقل سے بھی متصف ہوتے ہیں اور ان کو دنیا ہی میں اعتراف بالذنب بھی حاصل ہوتا ہے۔

اب ان دونوں آیتوں کو ملانے سے مومن کامل کے اوصاف معلوم ہوئے کہ سمع وعقل، خشیت اور اعتراف بالذنب یہ سب مومن کی صفات ہیں۔

اسی طرح سے ایک اور جگہ اہل دنیا اور اہل علم کے اوصاف کا ذکر اس طرح سے فرمایا ہے۔ سورۂ قصص میں قارون کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ:۔

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا
یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۝ (سورۂ قصص)

پھر وہ اپنی آرائش سے اپنی برادری کے سامنے نکلا۔ جو لوگ دنیا کے طالب تھے کہنے لگے کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ ساز وسامان ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے۔ واقعی وہ بڑا صاحب نصیب ہے۔ (بیان القرآن)

یہ تو دنیا داروں کا قول نقل فرمایا جس سے انکا وصف معلوم ہوا کہ دوسرے کی نعمت عاجلہ دیکھ کر ریجھ پڑتے ہیں اور اس کے بعد اہل علم کا جواب نقل فرماتے ہیں۔ سنئے! فرماتے ہیں:۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ
صَالِحًا وَّلَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝ (سورۂ قصص)

اور جن کو فہم عطا ہوئی تھی وہ کہنے لگے، ارے تمہارا ناس ہو اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب ہزار درجہ بہتر ہے۔ جو ایسے شخص کو ملتا ہے کہ ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور وہ ان ہی کو

دیا جاتا ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔ (بیان القرآن)

اس سے معلوم ہوا کہ اہل علم کی یہ شان ہے کہ ہر وقت ان کی نظر اللہ تعالیٰ کے ثواب پر اور آخرت پر ہوتی ہے۔ یہ بھی عالم کا ایک مخصوص وصف ہے۔

عالم کے جن اوصاف کا یہاں تک ذکر ہوا یعنی سماع، عقل، خشیت، اعتراف بذنبہم، اور نظر بر ثواب آخرت ان سب کے ذکر کی حیثیت تو ترغیب کی سی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب بعض امور بطور ترہیب کے بھی بیان کر دئے جائیں تاکہ ترغیب اور ترہیب دونوں کے مجموعہ سے تاثر قوی پیدا ہو کہ یہی مقصود بیان ہے۔

اس سلسلہ میں ترمذی شریف کے ابواب الزہد کی ایک روایت نقل کرتا ہوں۔

حدثنا سوید بن نصر قال حدثنا عبد اللہ بن المبارک نا حیوۃ بن شریح نا الولید بن ابی الولید ابو عثمان المدائنی ان عقبۃ بن مسلم حدثہ انہ دخل المدینۃ فاذا ھو برجل قد اجتمع علیہ الناس فقال من ھذا فقالوا ابو ھریرۃ فدنوت منہ حتی قعدت بین یدیہ وھو یحدث الناس فلما سکت وخلا قلت لہ اسئلک بحق وبحق لما حدثتنی حدیثا سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عقلتہ وعلمتہ فقال ابو ھریرۃ افعل لاحدثنک حدیثا حدثنیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عقلتہ وعلمتہ ثم نشغ ابو ھریرۃ نشغۃ فمکث قلیلا ثم افاق فقال لاحدثنک حدیثا حدثنیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذا البیت ما معنا احد غیری وغیرہ ثم نشغ ابو ھریرۃ نشغۃ شدیدۃ ثم افاق ومسح وجہہ وقال افعل لاحدثنک حدیثا حدثنیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انا وھو فی ھذا البیت ما معنا احد غیری وغیرہ ثم نشغ نشغۃ شدیدۃ ثم مال خارا علی وجہہ فاسندتہ طویلا ثم افاق فقال حدثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تعالیٰ اذا کان یوم القیامۃ ینزل

الی العباد نیقضی بینہم وکل امۃ جاثیۃ فاول من ید عوب رجل
جمع القرآن ورجل قتل فی سبیل اللہ ورجل کثیر المال فیقول اللہ
للقاری الم اعلمک ما انزلت علی رسولی قال بلی یارب قال فماذا
عملت فیما علمت قال کنت اقوم بہ اناء اللیل وآناء النہار فیقول اللہ
لہ کذبت وتقول الملائکۃ لہ کذبت ویقول اللہ لہ بل اردت ان
یقال فلان قاری۔

ویؤتی لصاحب المال فیقول اللہ لہ الم اوسع علیک حتی لم
ادعک تحتاج الی احد قال بلی یارب قال فماذا عملت فیما آتیتک قال
کنت اصل الرحم واتصدق فیقول اللہ لہ کذبت وتقول الملائکۃ
کذبت ویقول اللہ بل اردت ان یقال فلان جواد وقد
قیل ذالک۔

ویؤتی بالذی قتل فی سبیل اللہ فیقول اللہ لہ فیما ذا قتلت
فیقول امرت بالجہاد فی سبیلک فقاتلت حتی قتلت فیقول اللہ لہ
کذبت وتقول الملائکۃ کذبت ویقول اللہ بل اردت ان یقال
فلان جریئ فقد قیل ذلک۔

ثم ضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی رکبتی فقال
یا ابا ھریرۃ اولئک الثلاثۃ اول خلق اللہ لتسعر بہم النار
یوم القیامۃ۔

قال الولید ابو عثمان المدائنی فاخبرنی عقبۃ ان شفیا ھو الذی
دخل علی معاویۃ فاخبرہ بھذا قال ابو عثمان وحدثنی العلاء بن
ابی حکیم انہ کان سیافا لمعاویۃ قال فدخل علیہ فاخبرہ بھذا عن
ابی ھریرۃ فقال معاویہ قد فعل بھولاء ھذا فکیف بمن بقی من الناس
ثم بکی معاویۃ بکاءً شدیداً حتی ظننا انہ ھالک وقلنا قد جاءنا

هذا الرجل لبشر ثم افاق معاوية ومسح عن وجهه وقال صدق الله ورسوله مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ أُولٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۔ هذا الحديث حسن غريب

(ترمذی شریف ۲۱ ج ۲)

حدیث بیان کی ہم سے سوید بن نصر نے کہا حدیث بیان فرمائی ہم سے عبد اللہ بن مبارک نے انھوں نے فرمایا کہ حدیث بیان کی ہم سے شریح نے انھوں نے فرمایا کہ ہم سے بیان کیا ولید بن ابی الولید ابوعثمان مدائنی نے کہ عقبہ بن مسلم نے ان سے بیان کیا کہ جب وہ مدینہ میں داخل ہوئے تو وہاں دیکھا کہ ایک بزرگ بیٹھے ہیں اور انکے ارد گرد لوگوں کا ایک مجمع ہے حضرت عقبہ بن مسلم نے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں ؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ حضرت ابوہریرہؓ ہیں (کہتے ہیں کہ) پھر میں انکے قریب گیا وہ لوگوں سے حدیث بیان فرما رہے تھے ، میں بھی ان کے سامنے جاکر بیٹھ گیا جب وہ خاموش ہوئے اور تنہا رہ گئے تو میں نے عرض کیا کہ آپ سے حق کے واسطے اور پھر حق کے واسطہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھ سے ضرور بالضرور ایک ایسی حدیث بیان فرمائیں جس کو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو اور سمجھا ہو اور سیکھا ہو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں ایسا کروں گا اور تم سے ضرور ایسی ہی حدیث بیان کروں گا جو مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے اور میں نے اُسے سیکھا اور سمجھا ہے ۔

یہ کہہ کر ابوہریرہ بیہوش ہوگئے اور تھوڑی دیر کے بعد جب افاقہ ہوا تو پھر فرمایا کہ میں تم سے ایسی ہی حدیث بیان کروں گا جو مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حجرہ میں بیان فرمائی تھی کہ میں تھا اور حضورؐ تھے اور ہمارے علاوہ کوئی تیسرا نہ تھا یہ کہا اور پھر (دوبارہ) سخت بیہوش ہوگئے ۔ پھر جب ہوش آیا تو اپنا چہرہ وغیرہ صاف کرکے فرمایا کہ میں یہ کام کروں گا یعنی تم سے ایسی حدیث ضرور بیان کروں گا جس کو مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا تھا دراں حالیکہ میں اور آپؐ اسی گھر میں تھے جس میں کہ

اور ہمارے ساتھ کوئی اور نہ تھا (تیسری بار) پھر سخت دورہ غشی کا پڑا اور منہ کے بل گرنے لگے تو میں نے اپنی گود میں آپ کو ٹیک لیا پھر جب بہت دیر کے بعد افاقہ ہوا تو پھر ارشاد فرمایا کہ حدیث بیان فرمائی مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بروز قیامت جب اللہ تبارک و تعالیٰ بندوں کا فیصلہ فرمانے کے لئے نزول فرمائیں گے اور سب کے سب لوگ زانو کے بل پڑے ہوں گے تو سب سے پہلے جن کو بلایا جائے گا (وہ تین قسم کے لوگ ہوں گے) ایک تو وہ ہوگا جو قاری یعنی عالم بالقرآن ہوگا۔ دوسرا وہ ہوگا جس نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کیا ہوگا اور تیسرا وہ شخص ہوگا جو دنیا میں مالدار ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ اس عالم قرآن سے سوال فرمائیں گے کہ کیا میں نے تجھ کو اس کتاب کا عالم نہیں بنایا تھا جو میں نے اپنے رسول پر نازل فرمایا تھا؟

وہ کہے گا بیشک اے میرے پروردگار ایسا ہی تھا' ارشاد ہوگا کہ پھر تو نے اپنے علم پر کیا عمل کیا؟ کہے گا میں اس کی رات اور دن کی گھڑیوں میں تلاوت کرتا تھا اللہ تعالیٰ اس سے کہیں گے کہ تو جھوٹا ہے اور فرشتے بھی اس سے کہیں گے کہ تو جھوٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ تو یہ چاہتا تھا کہ تجھ کو قاری اور عالم کہہ کر پکارا جائے (سو دنیا میں تو کہا جا چکا)۔

اسی طرح صاحب مال لایا جائے گا۔ اللہ اس سے بھی فرمائیں گے کہ کیا میں نے تجھ پر وسعت نہیں کی تھی؟ یہاں تک کہ دنیا میں تجھ کو کسی کا محتاج نہیں رکھا تھا۔

وہ کہے گا کہ بیشک اے میرے پروردگار ایسا ہی تھا' فرمائیں گے کہ پھر میری اس نعمت کو پاکر تو نے کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا کہ میں صلہ رحمی کرتا تھا۔ صدقہ و خیرات دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ یہ سن کر فرمائیں گے کہ تو جھوٹا ہے اور فرشتے بھی کہیں گے کہ تو جھوٹا ہے اور اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ بات نہیں تھی بلکہ تو نے یہ سب اس لئے کیا تھا کہ کہا جائے کہ فلاں شخص بڑا سخی ہے سو دنیا میں یہ کہا جا چکا۔

پھر شہید کو پیش کیا جائیگا اور اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو کیوں اور کس سلسلہ میں مارا گیا۔ وہ عرض کریگا کہ یارب آپنے اپنی راہ میں جہاد کا حکم فرمایا تھا اس لئے میں نے قتال کیا یہاں تک کہ تیری راہ میں کام آگیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو جھوٹا ہے اور فرشتے بھی کہیں گے

کہ تو جھوٹا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ تو نے اسلئے قتال کیا تھا کہ لوگ کہیں کہ فلاں شخص بڑا جری اور بہادر ہے۔ چنانچہ تیرے متعلق یہ خوب کہا جاچکا۔

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے زانو پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ اے ابوہریرہ یہی ہیں وہ تین شخص کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے پہلے جہنم میں یہی لوگ ڈالے جائیں گے اور دوزخ انھیں سے روشن کی جائیگی۔

حضرت ولید ابوعثمان مدائنی کہتے ہیں کہ مجھ کو عقبہ نے یہ خبر دی کہ شفیا ہی وہ شخص ہیں جو کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان کو اس حدیث کی خبر دی۔

ابوعثمان کہتے ہیں کہ علاء ابن ابی حکیم نے یہ بھی فرمایا کہ وہ حضرت معاویہ کے سیّاف تھے تو جب وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کو اس حدیث کی خبر دی کہ ابوہریرہؓ ایسا ایسا بیان فرماتے ہیں۔ تو حضرت معاویہ نے فرمایا کہ ان مذکورہ اشخاص کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوگا پھر ان کے علاوہ اور جو لوگ ہونگے ان کا کیا حشر ہوگا؛ یہ کہہ کر حضرت معاویہ بہت روئے یہاں تک کہ ہم لوگوں نے یہ سمجھا کہ ان کی جان ہی نکل جائے گی اور ہم نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ کہاں سے یہ برا شخص یہ خبر لایا۔ جب پھر حضرت معاویہ کو افاقہ ہوا تو انھوں نے اپنا چہرہ وغیرہ صاف کیا اور فرمایا کہ سچ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے۔ (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) جو شخص محض حیات دنیوی اور اس کی رونق چاہتا ہے تو ہم ان لوگوں کے اعمال ان کو دنیا ہی میں پورے طور پر بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لئے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ نہیں اور انھوں نے جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب ناکارہ ہوگا اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ بے اثر ہے۔		(یہ حدیث حسن غریب ہے)

نیز ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے کہ:۔

عن جابر بن عبد اللہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تعلموا العلم لتباھوا بہ العلماء ولا لتماروا بہ السفھاء ولا تخیروا المجالس فمن فعل ذلک فالنار النار		(ابن ماجہ صــ۲۲)

حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم اس لئے نہ سیکھو کہ اس کے ذریعہ سے علماء پر بڑائی چاہو اور نہ اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے بے وقوفوں سے جھگڑا کیا کرو اور نہ اس لئے کہ مجلس میں اس کی وجہ سے صدر مقام حاصل کرو پس جس شخص نے ایسا کیا وہ جہنم سے ڈرے اور دوزخ کا خوف کرے۔

قولہ ولا تخیزوا کے تحت حاشیہ میں حضرت مولانا شاہ عبد الغنی صاحب محدث دہلویؒ نے نقل فرمایا ہے کہ

والتحیز التمکن والتقرر المراد منہ لا تمکنوا فی قلوب الناس لتکونوا اصدر المجالس فانہ من اشد اغراض الدنیا الاعن آخر ما یخرج من قلوب الصدیقین حب الجاہ وھذہ عقبۃ کئودۃ للعلماء لا ینجومنہ الا المخلصون۔ انتہی (حاشیہ ابن ماجہ شریف)

تحیز کے معنی تمکن اور تقرر کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ علم سے یہ نہ مقصود ہو کہ لوگوں کے دل میں جگہ حاصل کرو تاکہ ہر جگہ صدر مقام ہی پر بٹھائے جاؤ۔ (اور یہ اس لئے بُرا ہے کہ) یہ چیز اغراض دنیویہ میں سب سے سخت ترین ہے کیونکہ صدیقین کے قلوب سے سب سے آخر میں جو شے نکلتی ہے وہ حب جاہ ہی ہے اور علماء کے لئے یہ ایک سخت اور دشوار گذار گھاٹی ہے جس سے مخلصین ہی نجات پاتے ہیں۔

دیکھئے ترمذی شریف کی اُس حدیث میں اور ابن ماجہ شریف کی اس حدیث اور اسکی شرح میں جو حاشیہ پر ہے کس قدر مؤثر ترہیب ہے۔ علماء کے لئے کہ اگر آج اسی قسم کی احادیث ہمارے پیش نظر ہو جائیں تو اخلاص پیدا کرنے کے لئے یہی اتنا کافی ہے۔ اہل علم کے ایک مجمع میں یہ بات آئی کہ آج علماء میں جو غفلت ہے اسکا سبب ان کا پڑھنا پڑھانا ہے۔ چنانچہ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں ان میں غفلت ہو جاتی ہے۔ پھر کسی نے کہا کہ بھائی حدیث کی کتابوں میں کتاب الرقاق اور کتاب الزہد بھی تو ہے (جن میں ایسی ایسی روایات بھی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں) پس غفلت کا سبب تعلیم و تعلم نہیں ہے بلکہ ان ابواب کا پیش نظر نہ ہونا ہے لہذا ضرورت ہے کہ آج علماء ان ابواب کو اور اس قسم کی روایات کو پیش نظر رکھیں اس سے

غفلت زائل ہوگی. بس اسی پر مضمون کو ختم کرتا ہوں. اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بخشے۔

والسلام

حضرت مصلح الامۃؒ کا مضمون "وعظ بالقرآن" جو بصورت خط حضرت علی میاں صاحب ندوی مدظلہ کے نام گیا تھا ختم ہوا. اس کے جواب میں مولانا علی میاں صاحب نے جن تاثرات کا اظہار فرمایا تھا وہ مضمون سے قبل والے ان کے خط میں ناظرین ملاحظہ فرما چکے ہیں لکھا تھا کہ ——— مضمون کی تکمیل ہوگئی. حقیقۃً مضمون باوجود عبارت آرائی اور تکلفات سے دور ہونے کے نہایت موثر اور مفید ہے۔ انتہیٰ

اس کے بعد ایک مرتبہ مولانا ندوی مدظلہ الہ آباد، جلسۂ اصلاح المسلمین میں تشریف لائے لیکن قیام حضرتؒ ہی کے یہاں فرمایا. اور یہ فرمایا کہ آجکل کے ان رسمی جلسوں میں شرکت تقریباً ختم کر دی ہے لیکن یہاں کی حاضری اس لالچ سے منظور کرلی کہ حضرت سے ملاقات ہو جائیگی چنانچہ یہیں اترا ہوں یہیں سے جلسہ گاہ جاؤں گا اور واپس ہو کر یہیں سے روانگی ہوگی. واپس جاکر حضرت والا کے نام یہ عریضہ لکھا۔

(حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کا خط)

مشفق محترم مخدوم و معظم دامت برکاتہ'

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ حضرت والا کے مزاج گرامی بخیر ہونگے. جناب والا سے رخصت ہوکر اور جلسہ سے فراغت کر کے بخیریت و براحت اپنے وطن رائے بریلی آیا. راستہ بھر جناب کی شفقتوں اور ارشادات عالیہ کا مزہ لیتا رہا اور التفات خاص سے اپنے شکستہ دل کو تسلی دیتا رہا. متعنا اللہ بفیوضکم چند رسائل گرامی ساتھ لایا تھا ان کے مطالعہ کا موقعہ ملا. جی چاہا کہ جناب والا کی خدمت میں عرض کروں کہ وصیۃ الاخلاص کے نام سے بھی ایک رسالہ تحریر فرمایا جاوے خاص طور پر بخیال اسکا داعی اور محرک ہے کہ مدارس عربیہ میں پڑھنے پڑھانے والوں کی

بڑی تعداد اخلاص فی التعلیم واخلاص فی التعلم سے نہ صرف بے بہرہ بلکہ بے حس ہے اسکا نتیجہ ہے کہ اس کے روحانی واخلاقی ثمرات مرتب نہیں ہو رہے ہیں اور اندیشہ ہے کہ آخرت میں سخت مایوسی اور شرمندگی ہوگی اگر تعلیم وتعلم کے فضائل احادیث صحیحہ سے اور اُس کے متعلق اپنی تشریحات وتطبیقات قلمبند فرمادی جائیں تو ہم اہل مدارس کے لئے بہت نافع ہوں گی۔

شوال کا مہینہ مدارس دینیہ عربیہ کے افتتاح کا ہوتا ہے اُس وقت اس رسالہ کی اشاعت نہایت مفید ہوگی۔ اگر یہ معروضات ناپسند نہ فرمائی جائیں تو ضرور اس اہم موضوع کی طرف توجہ فرمائی جاوے اور التذکیر بالقرآن کی صورت میں ہو یا مستقل رسالہ ہو انشاءاللہ مفید اور نہایت باعث برکت ہوگا۔ واللہ الموفق المستعان۔ والسلام

طالب دعا وتوجہ

ابوالحسن علی

(جواب حضرت مصلح الامتؒ)

حبی ومحبی سلمکم اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عنایت نامہ موجب مسرت ہوا آپ کے تاثرات اور موجب مسرت ہوئے جس امر کا آپ نے مشورہ دیا ہے۔ ہے تو میری حیثیت سے باہر۔ مگر آپ کی توجہ اور خلوص سے شاید کچھ کام ہو سکے اور اس موضوع پر قلم اُٹھا سکوں۔ خاص کر اہل علم حضرات سے تخاطب اور پھر اخلاص کی بحث اور اُن سے اخلاص کا مطالبہ اور اُن کو اس کی ترغیب وتشویق اور اُس کے خلاف سے ترہیب وتنفیر بڑا مشکل کام اور پُرخطر امر ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ جس پر آسان کرے اُس پر آسان ہے ؎

بے عنایات حق وخاصان حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

بہرحال جس موضوع پر کچھ لکھنے کے لئے خواہش ظاہر فرمائی گئی ہے وہ تو میرا موضوع بحث ہی ہے اور اب آپ نے بھی توجہ فرمائی ہے تو ارادہ میں مزید تقویت

ہوگئی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی تو ضرور کچھ لکھوں گا مگر اس کے ساتھ ساتھ آپ سے بھی یہ درخواست ہے کہ اس معاملہ میں دعا سے میری مدد فرمائیں۔

والسلام خیر ختام
وصی اللہ عفی عنہٗ

تلاوتِ قرآن

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

ناشر

دفتر ماہنامہ معرفت حق ۲۳ بخشی بازار - الہ آباد ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اَمّا بعدُ۔ اہل اللہ کے ملفوظات اور ان کے ارشادات گرامی میں آج بھی وہ اثر ہے جو مردہ دلوں میں زندگی کی ایک نئی رُوح پھونک دیتا ہے اور قلب میں آتشِ محبت کی ایسی چنگاری روشن کر دیتا ہے جس سے خدا اور رسول صلعم کی صحیح محبت اور عمل صالح کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور ان کے کلمات طیبات کے ذریعہ نہ صرف قرآن وحدیث کی عظمت دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے بلکہ قرآن و حدیث کے بہت سے حقائق ومعارف قلب پر منکشف ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

بزرگوں ہی کی ذات بابرکات ہے کہ جب ان کے ارشادات صفحۂ دل پر منقش ہوتے ہیں تو قلب کا رنگ کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔ باطنی احساسات وکیفیات کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ انوار وتجلیات سے مالامال ہو جاتے ہیں۔ اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہی حقائق ومعارف درجۂ کمال کو پہونچ جاتے ہیں اور ان کی اُن متبرک تحریروں کی برکت سے یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ اللہ ورسول کے ارشادات۔ دعوت وسلوک تزکیۂ نفس۔ اور ذکر اللہ کیا ہے۔

چنانچہ مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولٰینا شاہ وصی اللہ صاحب مدظلہٗ العالی کے ارشادات گرامی اور ملفوظات کا سلسلہ جب سے رسالہ "معرفت حق" میں شروع کیا گیا ہے لوگوں کو معتدبہ نفع پہونچا ہے۔ الحمد للہ جگہ جگہ سے لوگوں کے خطوط برابر چلے آرہے ہیں جس میں مختلف عنوانات سے اپنے اپنے جذبات واحساسات کا لوگ اظہار فرما رہے ہیں۔ یہ خطوط اپنے تاثرات کے اعتبار سے خاصے اہم ہیں۔ جو کسی آیندہ شمارے میں شائع کئے جائیں گے۔ اس شمارے میں حضرت والا کی مجالس کے وہ مضامین شائع کئے گئے ہیں جس میں قرآن حکیم کی تلاوت اور اس کے آداب وفضائل بیان کئے گئے ہیں جس سے قرآن پاک کی صحیح

عظمت کا پتہ چلتا ہے کہ قرآن کیا ہے۔ اور اس کی تلاوت پر مداومت کے بعد قلب میں کیسے کیسے انوار و برکات پیدا ہوتے ہیں یہ مضامین ہر دور کے مسلمانوں کے لئے مشعل راہ اور شمع ہدایت ہیں۔ خداوند تعالیٰ کی ذات اعلیٰ صفات سے قوی امید ہے کہ یہ شمارہ تلاوت قرآن تمام مسلمانوں کی صلاح و فلاح کا ذریعہ ہوگا

ملفوظات گرامی کے علاوہ حضرت مصلح الامت دامت برکاتہم نے بطور خلاصہ ایک نہایت جامع مختصر مضمون علیحدہ سے قلمبند فرمادیا ہے اس کو بھی یہاں بعینہٖ نقل کرتا ہوں تاکہ ناظرین کرام کو ضبط کرنے اور تلاوت کے وقت مستحضر رکھنے میں آسانی ہو۔ وَھُوَ ھٰذَا

میں نے عرض کیا تھا کہ تلاوت قرآن کریم کے متعلق اپنے قلم سے لکھ کر حاضر خدمت کروں گا سو عرض ہے سنئے :۔

ہمارے ایک بزرگ عہ یہاں تشریف لائے تھے یہاں سے جاکر جو تحریر فرمایا اس کا ایک جزو جو میرے مقصد سے تعلق رکھتا ہے عرض کرتا ہوں۔

" صبح کی جو مجلس وعظ ایک خاصے بڑے مجمع کے سامنے ہوئی اس میں شروع سے اخیر تک زور بس تلاوت کلام پاک پر اور مروجہ اذکار و اشغال سے زائد قرآن مجید سے رابطہ پیدا کرنے پر تھا " ماشاء اللہ تعالیٰ تبارک اللہ میرے مقصد کو خوب واضح طور پر اور دل نشین پیرائے میں دل نشیں فرمادیا۔ اس سے زیادہ اس مضمون کو کس طرح بیان کیا جاسکتا ہے اب موضوع میرے بیان کا ثابت ہوگیا۔ تلاوت قرآن مجید قرآن کریم سے رابطہ پیدا کرتی ہے۔ اس رابطہ کے آثار میں سے یہ بھی ہے کہ یہ دو طرفہ ہوتا ہے جب ایک طرف ہوتا ہے تو دوسری طرف بھی ہوجاتا ہے لہٰذا جس شخص کو قرآن کریم سے رابطہ ہوگا قرآن کو بھی اس سے رابطہ ہوگا۔ اس دار میں اس رابطہ کا یہ اثر ہوگا کہ اس کو تلاوت اور عمل کی توفیق زیادہ ہوگی اور اُس دار میں یہ اسکی شفاعت کرے گا۔

یہ ربط فقط قرآن کریم ہی کے ساتھ محدود و منحصر نہیں رہے گا بلکہ ربط باری تعالیٰ کا موجب بنے گا اور اس ربط کو قرب بھی کہتے ہیں اور قرب وجدانی شے ہے یعنی مدرک بالوجدان ہوتا ہے جیسا کہ سارے وجدانیات کا یہی حال ہے اور یہ قرب معنی کے سمجھنے پر موقوف نہیں۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم سے شغف و محبت بواسطہ تلاوت کے عین تعلق بحق ہے۔ اب یہ مضمون عقلی طور پر بھی مبرہن و مدلل ہوگیا الحمدللہ کہ میرے بزرگوں نے اس مضمون کو خوب سمجھا ھنیاً لھم العلم والعمل۔

عہ مراد اس سے حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہٗ ہیں ۱۲

اب رہی یہ بات کہ تلاوت کس طرح کیجائے کہ قرآن کریم سے رابطہ پیدا ہو تو سنئے:۔
حضرت امام نووی شارح مسلم شریف نے اپنی کتاب اذکار میں اس کو خوب بیان فرمایا ہے۔ ایک فصل انھوں نے اس کے آداب و مسائل کے بیان میں مستقل قائم فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

" اوّل چیز جس کا قاری اپنی قرأت میں مامور ہے وہ اخلاص ہے اور اخلاص یہ ہے کہ قرأت سے اللہ تعالیٰ سبحانہٗ مراد ہوں اور سوائے اس کے اور کسی چیز تک پہونچنے کا قصد نہ کرے اور قرآن کے ساتھ مؤدب ہو اور ذہن میں یہ حاضر کرے کہ اللہ سبحانہٗ سے مناجات کر رہا ہے اور اس کی کتاب کی تلاوت کر رہا ہے اور قرأت ایسے حال پر کرے جیسے اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہیں دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہے ہیں "

حضرت امامؒ نے یہ بیان فرما کر امت پر احسان عظیم فرمایا کہ تلاوت حقیقی سکھلادی۔ اور عبادات میں تو اس حدیث کو لوگ لاتے ہیں اور تلاوت میں نہیں لاتے۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء واحسنہ
انتہیٰ کلامہٗ

احقر ڈاکٹر صلاح الدین احمد صدیقی



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تلاوت قرآن

مقدمہ

الحمد للہ الذی انزل القرآن وشرفنا بحفظہ وتلاوتہ وتعبدنا بتدبرہ ودراستہ وجعل ذلک من اعظم عبادتہ واشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ، دلت علی وجودہ المصنوعات وشہدت بجمالہ وکمالہ وجلالہ وعظمتہ الآیات البینات، واشہد ان سیدنا محمداً رسول اللہ القائل فیما یرویہ عن رب العالمین (من شغلہ القرآن وذکری عن مسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین) صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ الذین حاذوا الدرجۃ العلیا فی حفظ القرآن والعمل بشروطہ وآدابہ:-

امابعد۔ کمترین خدام عرض پرداز ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دور میں ایسے علماء ومصلحین امت محمدیہ میں پیدا فرماتے رہیں گے جو لوگوں کے اعمال واحوال کو شریعت مقدسہ کی میزان پر وزن کریں گے۔ اور کتاب وسنت کے معیار پر منطبق کریں گے۔ اگر موافق پائیں گے تو اس کو قبول کریں گے۔ اور اس کے حق وصواب ہونے کا فتویٰ دیں گے۔ اور اگر مطابق نہ پائیں گے تو اس کو رد فرمادیں گے، اس پر نکیر کریں گے، بیشک یہی لوگ ورثاء انبیاء علیہم السلام اور حفاظ شریعت ہوں گے۔ اور انھیں حضرات کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے العلماء ورثۃ الانبیاء　(رواہ احمد وابوداؤد والترمذی)

یہی حضرات اللہ کے دین کو غیر دین کے اختلاط سے محفوظ رکھیں گے، سنت وبدعت کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھیں گے، نوازل وحوادث کا حکم قواعد شرعیہ سے استنباط کریں گے، امت کو اس بات سے آگاہ کریں گے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اخلاق تھے اور اب ان اخلاق نبویہ کے بالکل برعکس اخلاق اختیار کرلئے گئے ہیں، جو آداب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سکھلائے تھے، ہم نے ان کے خلاف اپنا طریقہ بنالیا ہے، پھر بھی اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ ہے تو یہ بلادلیل بلکہ خلاف دلیل ہے

نعصی الرسول وانت تظهر حبه — هذا العمری فی الفعال بدیع
لوکان حبک صادقا لاطعته — ان المحب لمن یحب یطیع

جو لوگ اس شان کے ہوتے ہیں زمین میں یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہوتے ہیں چنانچہ روایت ہے کہ :-

عن الحسن انہ قال لن یزال للہ نصحاء فی الارض من عبادہ یعرضون اعمال العباد علی کتاب اللہ فاذا وافقوہ حمدوا اللہ واذا خالفوہ عرفوا بکتاب اللہ ضلالۃ من ضل وھدیٰ من اھتدیٰ فاولئک خلفاء اللہ -

حضرت حسنؒ نے فرمایا کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کچھ ایسے ناصحین برابر ہوتے رہیں گے جو بندگان خدا کے اعمال کو کتاب اللہ پر پیش فرماتے رہیں گے جب کتاب اللہ کے موافق پائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی حمد کریں گے اور جب مخالف پائیں گے تو ضالین کی ضلالت اور مہتدین کی ہدایت کو کتاب اللہ ہی سے پہچانیں گے اور یہی لوگ خلفاء اللہ ہوں گے -

حضرت مصلح الامت، محی السنت، مرشد الانام الی الطریق القویم وہادی الخواص والعوام الی الصراط المستقیم مخدومنا ومقتدانا حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب دامت برکاتہم وعمت فیوضہم کی تعلیمات جو عین کتاب وسنت کے مطابق ہیں ان کو دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیشک آپ خلیفۃ اللہ فی الارض اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے نائب ہیں - اور دین متین کے صحیح معنوں میں خادم اور شرع شریف کے ترجمان ہیں -

یوں تو ہر ہی دور میں دین کی خدمت دشوار رہی ہے - اور اس میدان کے مرد کم ہی لوگ ہوئے ہیں - خصوصاً اس صدی میں جبکہ زمانہ عہد نبوی سے بہت ہی بعید ہوگیا ہے دین کا کام کرنا نہایت مشکل و دشوار ہوگیا ہے اس لئے کہ حال یہ ہوگیا ہے کہ غیر دین کو دین سمجھ لیا گیا ہے - سنت و بدعت کا امتیاز اٹھ چکا ہے - راہ ہدایت و ضلالت باہم مخلوط ہوگئی - مکر و خداع کو ہنر و ہوشیاری - نفاق و چالبازی کو حسن و محمود سمجھ لیا گیا ہے تو ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ دین کا نام لینا اور اخلاص و صدق کی طرف دعوت دینا ہی ایک اہم امر اور دشوار مسئلہ ہے اور جان بوجھ کر اپنے ہاتھ میں دہکتا ہوا شعلہ لینا ہے - مگر حضرت مولانا و مرشدنا دامت برکاتہم بلا پروائے لومۃ لائم حقیقی دین کی دعوت دے رہے ہیں - اخلاص و نفاق پہ نہایت بسط سے کلام فرما رہے ہیں - کتاب و سنت اور اکابر امت کے کلام سے نفاق کی مذمت اور قباحت کو بیان فرماتے رہتے ہیں - کہ یہ ایسا قلبی مرض ہے کہ صحابہ کرام رضی باوجودیکہ ان حضرات میں اس مرض کا شائبہ اور

اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا مگر وہ اپنے کو اس مرض سے مامون نہیں سمجھتے تھے ڈرتے ہی رہتے تھے۔ اور اب یہ حال ہے کہ سب علامات نفاق پائی جاتی ہیں، تمام اخلاق و اعمال منافقین کے اختیار کر لئے گئے ہیں، نہ مسلمانوں کے اخلاق ہیں اور ان کے جیسے اعمال و اقوال۔ پھر بھی اپنے کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہی جیسا سمجھ رہے ہیں۔ پہلے کے لوگوں کو تو اخلاص و صدق بہت دنوں کے بعد حاصل ہوتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ ابتداء ہی سے اپنی کو مخلص سمجھتے ہیں۔ یہ ضلالت نہیں تو اور کیا ہے؟

حضرت مولانا دامت برکاتہم اس مرض میں عام ابتلاء دیکھکر شد و مد سے اخلاص و نفاق کے مفہوم و علامات کو واضح فرما رہے ہیں۔ اور یقیناً اس زمانہ میں دین کے اہم شعبہ بلکہ اصل شعبہ کی تجدید و احیاء فرما رہے ہیں۔ اگر کسی کو اخلاص و نفاق پر مفصل مضمون دیکھنا ہو تو تحذیر العلماء و وصیۃ الاحسان اور وصیۃ الاخلاص کا مطالعہ کرے۔

حضرت والا کی دعوت و تبلیغ کی یہ خصوصیت ہے کہ ایسا طرز، موقع کے موافق اختیار فرماتے ہیں گویا ارشاد باری تعالیٰ اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ کی عملاً تفسیر فرما رہے ہیں۔ اور الحمد للہ اس ارشاد کے مطابق عمل کرنے کے برکات بھی نمایاں ہو رہے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو دین سے ناآشنا بلکہ معاند و منکر تھے اور اپنے پروردگار سے رشتہ توڑ چکے تھے بفضلہ تعالیٰ دین و ایمان سے وابستہ اور فائز ہو رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ان کا تعلق درست ہو رہا ہے اور یہ کسی اہل دیانت و فہم و فراست پر مخفی نہیں ہے چنانچہ ایک صاحب (جو ماشاء اللہ فہیم اور شاعر ہیں) حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو الٰہ آباد میں فیوض عامہ کو دیکھکر اپنے تاثرات کا ایک شعر میں اظہار فرمایا ؎

اب الٰہ آباد میں ساماں ہیں بہبود کے　　رشتے جوڑے جاتے ہیں یاں عبد اور معبود کے

حضرت مولٰینا دامت برکاتہم کی تعلیمات و اصلاحات میں سے ایک اہم تعلیم و اصلاح یہ ہے کہ فرائض کا خاص اہتمام کرنا اور اس کو نفل سے افضل سمجھنا چاہئے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنا قرب فرائض میں رکھا ہے دوسرے اذکار و نوافل میں نہیں رکھا۔ اب یہ بدعت اعتقادی ہوگئی ہے کہ فرائض میں ولایت اور قرب خداوندی اس قدر نہیں سمجھتے جتنا اس سے کم درجہ کی عبادات میں حالانکہ یہ بات حدیث قدسی مَا تَقَرَّبَ عَبْدِی اِلَیَّ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ (الحدیث) کے صریح مخالف ہے۔ مصلحین امت نے اس مسئلہ کو اپنے اپنے زمانہ میں چھیڑا ہے اور لوگوں کو اس بدعقیدگی سے تحذیر فرمائی ہے۔

چنانچہ حضرت سیدنا عبد القادر جیلانیؒ حجۃ الاسلام ابو حامد غزالیؒ اور حضرت مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی جیسے مصلحین نے اس بدعت کی خوب خوب تردید فرمائی ہے تو آخر ان حضرات کے عہد میں بھی یہ ضلالت رہی

ہوگی جبھی تو ان کو اس پر کلام کرنے کی ضرورت پڑی۔ حالانکہ عہد نبوت سے وہ دور قریب تر تھا۔ سنت سے اس قدر بعد نہیں ہوا تھا۔ تاہم یہ جہالت وضلالت آچکی تھی تو اس زمانے میں تو جو کچھ بھی نہ ہو جائے کم ہی ہے اس لئے حضرت مصلح الامت دامت برکاتہم نے بھی اس بدعقیدگی کی پوری قوت سے تردید فرمائی۔ اور حقیقت مسئلہ کی توضیح فرمائی۔ اور ایک مستقل مضمون بھی اس پر تحریر فرمایا۔ جو رسالہ معرفت حق شعبان ۱۳۸۳ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کو ضرور ملاحظہ فرمالیا جائے۔ انشاء اللہ بصیرت افروز اور نفع بخش پائیں گے۔

حضرت مولینا دامت برکاتہم کی اہم تعلیم یہ بھی ہے کہ کلام اللہ تعالیٰ کی تلاوت کثرت سے کرنی چاہئے۔ تلاوت کے لئے اس کی فہم شرط نہیں بلا فہم بھی موجب قرب ہے اور یہ بھی اجر و ثواب کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ خیال کہ "ہم معانی نہیں سمجھتے اس لئے تلاوت سے کیا فائدہ" یہ زبردست ضلالت اور ایک بڑی نعمت سے حرمان ہے۔ غرض حضرت مولینا نے تلاوت کی اہمیت اور عظمت کو اس طرح بیان فرمایا کہ سامعین کے قلوب اس کی عظمت سے بھر گئے۔

نیز تلاوت کے شرائط و آداب کو اس مؤثر انداز سے پیش فرمایا کہ لوگوں نے ان آداب کی رعایت کے ساتھ تلاوت شروع کر دی۔ اور اب عام طور پر عوام و خواص کو اس کی وجہ سے نفع ہو رہا ہے جس کا اظہار حضرت مولینا مدظلہ، کی خدمت میں کیا کرتے ہیں۔ نیز دوسری عبادات پر بھی اس کا اثر ہو رہا ہے چنانچہ بعض حضرات نے صراحت سے یہ فرمایا کہ "جب سے تلاوت کا اہتمام کیا ہے نماز کی بھی اصلاح ہو رہی ہے" ظاہر ہے کہ جب نماز کی اصلاح ہو جائیگی تو انشاء اللہ پھر سارا دین ہی درست ہو جائے گا۔ اور منکرات و منہیات سے اجتناب بھی اس کو آسان ہو جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ط

حضرت مولینا دامت برکاتہم یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ مسلمانوں سے جو عمل نہیں ہو رہا ہے تو اس کی وجہ ایمان میں نقصان ہے اور ایمان کامل ہو نہیں سکتا جب تک کہ تلاوت کلام اللہ نہ کی جائے۔ اسلئے کہ تلاوت کلام اللہ میں ازدیاد ایمان کا خاصہ ہے جب تلاوت کی جائے گی ایمان ضرور ترقی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا جب ان کے سامنے اللہ کے کتاب کی آئیتیں تلاوت کیجاتی ہیں تو ان آیات سے ان کا ایمان ترقی کرتا ہے۔

مگر تلاوت اللہ تعالیٰ پر کامل اعتقاد اور کلام اللہ کی عظمت و منزلت کے استحضار کے ساتھ کرنی چاہئے۔ قبل تلاوت اور اثنائے تلاوت میں ایمان و تصدیق قلب میں حاضر کرنا چاہیئے کہ یہ خدا کا کلام ہے اور اسمیں جتنے احکام و قصص درج ہیں سب حق ہیں۔ جب اس طرح تلاوت کی جائے گی تو یہ تلاوت

ایمان سے ناشی ہوگی پھر اس کے ثمرات ونتائج بھی مرتب ہوں گے اس لئے کہ اعتقاد فی نفسہٖ خود کمال ہے اور جملہ کمالات کا موجب بھی ہے۔ اعتقاد ہی اصل اور زبردست کارفرما ہے۔ جملہ اعمال اس کے تابع اور ماتحت ہیں۔

مگر شومیٔ قسمت کہ آج مسلمانوں سے اعتقاد ہی رخصت ہو گیا، اخلاص کا نام ونشان ہی نہیں رہ گیا اگر کچھ تلاوت کرتے بھی ہیں تو سالہاسال محض سرسری کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے اس کا صاف اعتراف کر لیا اور لکھا کہ "ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ تلاوت نہ کی ہو مگر ہاں محض لسانی اور سرسری کرتا رہا۔ جس کی وجہ سے ابتک محروم رہا"۔ اس پر حضرت والا نے فرمایا کس قدر افسوس کی بات ہے کہ خدا کے کلام کی تلاوت اور سرسری! یہ تو نفاقی تلاوت ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو اس کی کوئی وقعت نہیں۔

یہی دیکھ لیجئے کہ اسی قرآن سے کتنے کافروں کو ہدایت ہوئی اور مسلمانوں کو اسی قرآن سے بڑے بڑے مراتب ودرجات ملے۔ کیسی کچھ عزت وعظمت ملی۔ مگر آج جو ہم ذلیل وخوار ہیں اور ضلالت میں مبتلا ہیں تو اس کی وجہ لامحالہ یہی تجویز کی جائے گی کہ ظاہراً تو کلام اللہ سے اظہار تعلق کرتے ہیں اور اس کی تلاوت بھی کرتے ہیں مگر دل میں جو اعتقاد وتعظیم ہونی چاہئے نہیں رہ گئی ہے۔ باطنی رشتہ اس سے منقطع سا ہو چکا ہے اسی لئے یہ روز بد دیکھنا پڑ رہا ہے اور آخرت میں جو وبال وعذاب ہوگا اس کا کسی کو کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب کہ خود قرآن اپنے نبذ وترک کی نالش وشکایت اللہ تعالیٰ کی جناب میں کرے گا۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا وَاَعِذْنَا مِنْھَا وَارْزُقْنَا شَفَاعَتَہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔

آپ کے منجملہ ارشادات کے یہ بھی ہے کہ عوام کو ہم پڑھے لکھوں سے زیادہ مخلص سمجھتے ہیں یہ بیچارے اپنی بساط کے موافق خدمت دین کی کر رہے ہیں۔ مدرسوں کی امداد کرتے ہیں مدرسے قائم کرتے ہیں مگر ہم پڑھے لکھے لوگ اپنی بساط بھر بھی خدمت نہیں کرتے ہم بھی مخلص ہوں تو بہت کچھ کام ہو جائے۔

قرآن کریم کے برکات دین ودنیا دونوں میں آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اسی قرآن کی بدولت روٹی کھاتے ہیں اور اسی کی وجہ سے عزت ملتی ہے پھر بھی اس کی طرف سے غافل ہیں۔ بہتیرے ایسے ہیں کہ تلاوت بھی نہیں کرتے۔ یہ کس قدر حق تلفی اور بے انصافی کی بات ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

سچ ہے آج کل جو گمراہی ہے تو اس کی وجہ ہمارا ہی قصور اور ہماری ہی کوتاہی ہے۔ ہم عوام کے سامنے قرآن وحدیث کب پیش ہی کرتے ہیں جس سے ان کا ایمان تازہ ہو اور ان کو کام کی باتیں معلوم

ہوں۔ ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث پر تو مسلمانوں کا ایمان ہے اس کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں تو کتاب و سنت ہی پیش کر کے ان کو محجوج کیا جا سکتا ہے۔ اور اسی سے ان پر اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ اسی سے ان کے امراض کا علاج اور ضلالت کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ دوسرے کلام خواہ وہ کتنے ہی اچھے ہوں اور مؤثر بھی ہوں لیکن ان پر ایمان تو نہیں اور نہ وہ فصاحت و بلاغت اور تاثیر ہی میں خدا کے کلام کے برابر ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ہدایت و اصلاح دوسرے کلام سے نہیں ہو سکتی۔ ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو نازل فرمایا ہے۔ قرآن ہی کے متعلق یہ ارشاد ہے۔ هُدًى لِلنَّاسِ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ۔ تو جیسے آپ کی رسالت کافۂ ناس کے لئے ہے ویسے ہی آپ کی کتاب منزل بھی کافۂ ناس کے لئے اور قیامت تک کے لئے ہے۔ کتاب اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ ہے اور اسی سے آپ کی نبوت کا احقاق و اثبات ہوا۔ اب اس کتاب کے بعد کوئی دوسری کتاب نازل نہ ہوگی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس میں جیسے اصل مقاصد کو نہایت بسط سے بیان فرمادیا ویسے ہی ان کے طرق و وسائل کو بھی واضح فرمادیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل اور حال کتاب اللہ کا ترجمان اور شرح ہے وکان خلقہ القرآن اس لئے اب بعد میں کتاب و سنت کے خلاف کوئی جدید مقصد یا نیا وسیلہ و طریقہ اختیار کیا جائے گا تو وہ بدعت و ضلالت ہوگی۔ اس کا کسی کو اختیار نہیں کہ کتاب و سنت سے سرِ مو تجاوز کرے۔ پس جب قرآن چھوڑ دیا گیا اور اس کے اصول کو ترک کر دیا گیا تو پھر ہدایت کہاں رہی ؂

چوں ترک قرآں کردہ آخر مسلمانی کجا　　خود شمع ایماں کشتہ پس نور ایمانی کجا

خود غور فرمایئے کہ جب طلباء مدارس میں طالبعلمی کی حالت میں قرآن پاک سمجھ کر نہ پڑھیں گے اس سے ذوق و مناسبت نہ پیدا کریں گے تو بعد میں ان سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے۔ کہ یہ لوگ سمجھیں گے اور دوسروں کو سمجھائیں گے۔

آج جو قوم کا بیڑا ہو رہا ہے تو اسی لئے کہ ہمارے طلبہ قرآن پاک کی طرف اصلا التفات نہیں کرتے اور نہ اس سے ربط و ضبط پیدا کرتے ہیں۔ ان کا مذاق ہی بدل گیا ہے۔ ان کی یہ نیت ہی نہیں ہوتی کہ ہم قرآن سے تعلق پیدا کریں اور خدا کے کلام کی مراد کو سمجھیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے فیوض و برکات اور علوم و معارف کو ان پر بند کر رکھا ہے۔ ذرا بھی قرآن کے معانی ان پر منکشف نہیں ہونے دیتا۔ تو ایسے لوگوں سے بھلا کیا ہدایت ہوگی؟

حضرت مولینا دامت برکاتہم نے اسی کے متعلق ایک نہایت ذی استعداد عالم سے استفسار فرمایا تو انھوں نے یہ جواب میں تحریر فرمایا (یہ بالکل حقیقت ہے کہ عربی مدارس میں قرآن پاک اور اسکی تفسیر کا اہتمام نہیں ہے یہ مجھ پر خود بیت چکی ہے۔ اس لئے حضرت والا کی اس کوشش کی دل سے قدر ہوئی ہے کہ نہایت اہم موضوع کی طرف متوجہ فرما رہے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے پورا نفع اٹھانے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین)

اس میں شک نہیں کہ حضرت مولینا دامت برکاتہم کو قرآن پاک سے ایک خاص ذوق حاصل ہے شب و روز اسی کا شغل رہتا ہے اور آپ کے اکثر بیانات آیات قرآنیہ ہی کی تفسیر و تشریح میں ہوا کرتے ہیں۔ معتبر و مسلم تفاسیر مثلاً روح المعانی، تفسیر مظہری، ابن کثیر۔ بیضاوی، تفسیر کشاف کی کثرت سے مراجعت فرماتے رہتے ہیں اور الحمد للہ غایتِ مناسبت کی بنا پر علوم و نکات مستحضر بھی رہتے ہیں۔ اس لئے اکثر ہر مسئلہ وحادثہ کا حکم کتاب و سنت ہی سے بیان فرماتے ہیں۔ ہاں اس کی تشریح و توضیح میں اپنے اکابر کے ارشادات وحکایات اور ان کی سیرت کو بھی کثرت سے پیش فرماتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کا درجہ اصل جیسا نہیں ہونے پاتا۔ اکثر کسی بزرگ کا قول و فعل اصول شرعیہ کے مزاحم معلوم ہوا تو اس کی تطبیق اور لطیف عنوان سے توجیہ فرما دیتے ہیں، اس لئے کہ کسی کا قول و فعل کتاب و سنت پر حجت نہیں۔ کتاب و سنت ہی علی الاطلاق سب پر حجت ہے ان سے کسی کو بھی مجال خلاف نہیں۔ اور یہ آپ کے اصلاح و تربیت کی خصوصیت ہے۔ فللہ الحمد۔ اور اس کا نفع بھی ظاہر ہے۔

چنانچہ ایک بڑے عالم نے جو الہ آباد تشریف لائے تھے واپسی کے بعد ایک صاحب سے یہ فرمایا کہ (میری حاضری کے وقت حضرت کسی جگہ تشریف لے گئے تھے اس لئے زیارت تو نہ ہو سکی مگر وہاں کے طلبہ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کے چہروں میں وہ نورانیت دیکھی جو کہیں نظر نہ آئی" اور یہ بھی کہہ رہے تھے کہ حضرت کا طریق اصلاح جلد ہی ہمہ گیر ہو جائے گا۔ میں نے الہ آباد میں کافی تغیر اور میلان الی الدین دیکھا جو حضرت کے وجود کی برکت معلوم ہوتی ہے۔)

حاصل کلام یہ ہے کہ حضرت مولانا دامت برکاتہم نے جب یہ ملاحظہ فرمایا کہ ہر طبقہ میں کسی نہ کسی درجہ میں کلام اللہ کے فہم و تلاوت اور اس کے شرائط و آداب کی رعایت میں کوتاہی ہو رہی ہے تو آپ نے عوام و خواص سب کو اس کی طرف متوجہ فرمایا اور شد و مد سے اس موضوع پر کلام فرمایا لوگوں کو ان کی علمی اور اعتقادی کمزوریوں پر آگاہ فرمایا جس سے لوگوں کو بہت نفع ہوا۔ اور اب بھی حضرت مولانا نئے نئے انداز و مختلف عنوان سے بیان فرماتے ہی رہتے ہیں اور ایسا دلکش و دلچسپ کلام

ہوتا ہے کہ نہ طبیعت سننے سے اکتاتی ہے اور نہ وہ بیان فرسودہ معلوم ہوتا ہے ؎

وہی اک بات جو سو بار گذری ہو نگاہوں سے زبان شیخ پر آکر نئی معلوم ہوتی ہے

بلکہ ہر مرتبہ تازگی محسوس ہوتی ہے اور عمل کا جوش اور شوق پیدا ہوتا ہے۔ بیشک اہل اللہ کا کلام ایسا ہی ہوتا ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ (اہل اللہ کا کلام نامرد کو مرد اور مرد کو شیر مرد بنا دیتا ہے) خصوصاً وہ کلام جو کلام اللہ ہی کے بارے میں ہو جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لا یشبع منہ العلماء ولا یخلق عن کثرۃ الرد ولا تنقضی عجائبہٗ (اہل علم کو اس سے سیری نہ ہوگی یہ بار بار لوٹانے اور دُہرانے سے پرانا نہ ہوگا اور اس کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے)

حضرت والا دامت برکاتہم کے ملفوظات وارشادات ایسے اثر انداز اور پرکیف ہوتے ہیں کہ سُنکر بے اختیار خواجہ صاحبؒ کا یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

تا ابد جاری رہے یوں ہی سبیل میکشی ساقیا یوں ہی رہے آباد میخانہ ترا

اخیر میں یہ عرض ہے کہ حضرت مولانا ومقتدانا دامت برکاتہم نے تلاوت کلام اللہ کی عظمت واہمیت اور اس کے آداب وشرائط کو کتاب وسنت اور اکابر امت کے آثار واقوال سے مختلف اوقات میں اور مختلف عنوان سے بیان فرماکر اور اس رسالہ میں جمع کرکے امت مرحومہ پر احسان عظیم فرمایا ہے انشاء اللہ تعالیٰ یہ رسالہ طالبین راہ خدا کے لئے نافع ثابت ہوگا۔ اور تلاوت کلام اللہ کا اور اس سے قلبی تعلق پیدا کرنے کا ایک نیا باب مفتوح ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے صحیح رابطہ پیدا ہوگا۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کو نفع ہوا جس کا اظہار بھی ان حضرات نے کیا۔ نمونہ کے طور پر چند خطوط نقل کئے جاتے ہیں تاکہ ان کے تاثرات وحالات کے ملاحظہ سے ناظرین کرام کو مزید بصیرت ونصیحت حاصل ہو۔

مکتوب حسب ہدایت حضرت والا مدظلہٗ تلاوت کلام اللہ شریف کا معمول تنہائی میں حتی المقدور استحضار قلب کے ساتھ بنالیا ہے اور تلاوت شروع کرنے سے پہلے استغفار وتجدید ایمان اور اس بات کی تصدیق واقرار کرلیتا ہوں کہ یا اللہ یہ کلام آپ کا ہے اور برحق ہے اس پر ہمارا ایمان ہے اسمیں جو کچھ ہے سب حق ہے اس کی معرفت باخلاص عطا فرمایئے اور اس کے مطابق ہماری زندگی بنا دیجئے اور اس کے جملہ اوامر پر عمل اور جملہ مناہی سے اجتناب کی توفیق دیجئے اور اس کے برکات وثمرات سے نواز دیجئے آپ کی ہی رحمت کے سہارے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت شیخ کے وسیلہ سے یہ درخواست ہے۔ قبول فرمالیجئے اور اس میں اخلاص وترقی عنایت فرمایئے۔"

مکتوب ۲۔ "حسب ہدایت حضرت والا مدظلہ، تلاوت قرآن شریف کا معمول تنہائی میں حتی المقدور استحضار قلب کے ساتھ حضرت والا مدظلہ کی دعا و توجہ کی برکت سے ابتک نبھا جارہا ہے اور بیحد نفع معلوم ہوتا ہے۔ دل کا حال ہی کچھ دوسرا ہونیوالا نظر آتا ہے۔ اور اس کی جھلک نماز اور دیگر معاشرے میں بھی نظر آتی ہے۔ حضرت والا مدظلہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اخلاص و قبول عطا فرمائیں۔ اسپر استقامت دائمی عطا فرمائیں اور اپنے کلام برحق کی معرفت اس گنہگار و روسیہ کو بھی عطا فرمائیں اور اسی کے مطابق پوری زندگی ڈھال دیں۔"

مکتوب ۳۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بخیریت ہوں۔ سایۂ عاطفت آنمخدوم اللہ تعالیٰ ہمیشہ قائم رکھیں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا بڑا احسان ہے کہ حضرت والا مدظلہ کی دعا و توجہ کی بدولت اس دفعہ کی صحبت میں یہ سئی الفہم فاقد الاستعداد بھی ہمیشہ سے زیادہ متاثر رہا۔ مضمون تلاوت کلام پاک نے دل کو پکڑ لیا ہے۔ تجدید ایمان و تصدیق اور دعا کر کے تلاوت کا آغاز کرتا ہوں۔ حضور قلب اور خشوع کی پوری سعی کرتا ہوں۔ بجائے کم کے کیف کی زیادتی کی فکر رہتی ہے۔ اگر کبھی کچھ آیتیں غفلت کے ساتھ سرسری طور پر پڑھی گئیں تو پھر از سر نو ان کو حضور قلب کے ساتھ اعادہ کرتا ہوں۔

الحمد للہ اب قلب کا حال بدلا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا "اللّٰھم اجعل القرآن ربیع قلبی" کا اکثر استحضار ہوتا ہے۔ پہلے دیگر اذکار مثلاً ذکر اسم ذات و ذکر نفی و اثبات میں جو کیفیت ہوتی تھی وہ تلاوت میں نہ ہوتی تھی مگر اب حالت بدل گئی ہے۔ تلاوت کی لذت و حلاوت دیگر اذکار سے کہیں بڑھ کر معلوم ہوتی ہے۔"

کلام اللہ شریف کے الفاظ اس کے معانی اس کے نقوش سبھی دل لبھانے والے ہیں۔ اس کے نقوش کے دیکھنے سے بھی دل میں نور اور ایک سرور پیدا ہوتا ہے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ توفیق بخشیں کہ ان کے کلام کی تلاوت عظمت کے ساتھ نصیب ہو۔"

مکتوب ۴۔ عرض ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کے سلسلے میں اس زمانہ میں بڑی کوتاہی اور غفلت ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صرف الفاظ قرآنی کی تلاوت بلا فہم معانی کچھ سودمند اور نفع بخش نہیں ہے۔ حضرت والا نے ان دنوں بڑے شد و مد سے اس نظریہ کی تردید فرمائی اور تلاوت قرآن کے برکات اور اس کے منافع کو واضح فرمایا۔ حضرت والا کے ارشادات سے یہ بات اچھی طرح منکشف ہوگئی کہ قرآن پاک کی تلاوت ہی سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔ بار بار کی تلاوت ہی سے الفاظ قرآنی محفوظ رہ سکیں گے اور اسی کے تکرار سے معانی

کا بھی انکشاف ہوگا۔ جیسا کہ علامہ بیضاوی نے اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتَابِ الآیہ کے تحت اس کی تصریح کی ہے۔ جب قرآن بار بار پڑھا جائے گا تو اس سے فہم معانی کا بھی داعیہ پیدا ہوگا۔ صرف الفاظ قرآن کو بیکار سمجھنا ایک بڑی گمراہی ہے۔ تلاوت ایک الگ شئے ہے اور معانی و مطالب کا سمجھنا الگ بات ہے معانی و مطالب کا سمجھنا تو صرف ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں باقی عام لوگوں کے لئے تو یہی تلاوت الفاظ قرآن ہی وصول الی اللہ اور قرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ یہی حَبْلُ اللہِ ہے جو بندوں کو اللہ تک پہونچانے کے لئے دنیا میں اُتاری گئی ہے جس کو جو کچھ ملا ہے، کلام اللہ کی تلاوت ہی سے ملا ہے اس لئے ہم خواہ معانی سمجھیں یا نہ سمجھیں ہم کو تلاوت کلام پاک ہی سے قرب حق ہوگا اس لئے ہم کو اس کا معمول بنانا چاہئے پھر دیکھیں یہ کلام الٰہی دل پر کیسا کچھ اثر ڈالتا ہے جب انسان کے کلام کی تاثیر مسلّم ہے تو کلام الٰہی میں کیسا کچھ اثر ہوگا۔

(حکایت) ایک مریض کو دیکھنے کے لئے بوعلی سینا بلایا گیا۔ وہاں ایک بزرگ تھے جو اس مریض کو دم کر رہے تھے بوعلی سینا نے کہا کہ اس پھونکنے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ تو مادہ فاسد ہے جب تک اس کا اخراج نہ ہوگا فائدہ نہ ہوگا۔ اثنائے کلام میں ان بزرگ نے کچھ ایسی بات قصداً کہدی جس سے بوعلی سینا کو غصہ آگیا۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں غصہ سے سُرخ ہوگئیں۔ اس پر ان بزرگ نے فرمایا کہ "میں نے تم کو مارا نہیں صرف ایک بات کہی ہے جس سے تم پر ایسا اثر ہوا کہ چہرہ اور آنکھیں سُرخ ہوگئیں مخلوق کا کلام تو موثر ہو اور خالق کے کلام میں اثر نہ ہوگا"۔ یہ سنکر بوعلی سینا لاجواب ہوگیا اور چپ ہی رہ گیا۔

حضرت والا بات سمجھ میں واضح طور پر آگئی۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس سیہ کار کو بھی تلاوت کی توفیق بخشیں اور اس کے برکات سے نوازیں۔

مکتوب ۵۔ محبوب کا کلام بھی محبوب ہوتا ہے۔ بمصداق آیۂ کریمہ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ۔ اللہ عزوجل ہی مؤمن کے نزدیک بدرجہ غایت محبوب ہوتے ہیں اور فطرتاً محبوب کے بار بار ذکر کرنے سے دل اس کی محبت سے لبریز ہو جاتا ہے اور یہی ذکر، روز افزوں ازدیاد محبت کا سبب بھی ہوتا رہتا ہے جو محبت کا اصلی مقصود ہے اور اسی محبت پر نعمائے الٰہیہ مبنی ہوتی ہیں۔ محب دوران ذکر میں کسی اجر و ثواب کا طلبگار نہیں ہوتا بلکہ غلبہ محبت اس کا سبب ہوتا ہے اور محبت ہی مطلوب بھی ہوتی ہے ؎

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ   ھو المسک ما کررتہ یتضوع

حضرت والا تلاوت قرآن کے کمال عظمت اور کثیر المنفعۃ اور بدرجہ غایت اہم ہونے کے بارے میں جس دل نشین پیرایہ میں بیان فرماتے ہیں وہ دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ذات اقدس جل سلطانہٗ کا یہ خصوصی فضل و کرم ہے کہ اس نے حضرت والا کے واسطہ سے ہم جیسے خواب غفلت میں پڑے ہوئے مسلمانوں کو صرف چونکا ہی نہیں دیا بلکہ مکمل طور پر بیدار فرما دیا۔ کاش دوسرے علماء دین بھی اس اہم مسئلہ کی طرف سے غفلت نہ برتتے۔ بلکہ مسلمانوں کو قرآن پاک کی تلاوت کی اہمیت کی جانب متوجہ فرماتے رہتے۔ تو آج مسلمانوں کی دینی حالت اس قدر پست نہ ہوئی ہوتی بلکہ کہیں زیادہ بہتر ہوتی۔

الغرض محب (مومن) کی نگاہ میں اللہ عزوجل اور اس کی باتوں سے زیادہ پرکشش اور محبوب کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی اور نہ ہونی چاہئے۔ اس لئے جملہ اوراد و وظائف پر تلاوت قرآن پاک کو خصوصی شرف حاصل ہے۔

مکتوب ۱۱۔ عرض یہ ہے کہ حضرت والا دامت برکاتہم ایک عرصہ سے تلاوت کلام اللہ کی اہمیت مختلف عنوانات سے بیان فرما رہے اور اسکی طرف نہایت شد و مد سے رغبت دلا رہے ہیں جس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ قرآن پاک کی تلاوت بغیر فہم معانی کے بھی قرب الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ بلکہ قرب کے جتنے مراتب ہیں بدون تلاوت کلام اللہ کے حاصل ہو ہی نہیں سکتے مگر بشرطیکہ اعتقاد و عظمت کے ساتھ دل سے تلاوت کی جائے۔ اس لئے کہ اعتقاد خود بھی کمال ہے اور بہت سے کمالات کا موجب ہے۔ قرآن سے اعتقاد یہ خود اعلیٰ درجہ کا کمال ہے۔ اور تلاوت اگر دل سے کیجائے تو اسی سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور معرفت اور تمام مراتب قرب حاصل ہوں گے۔ اہل اللہ نے اسی سے قرب خداوندی حاصل کیا ہے اور یہ قرب ایک وجدانی شئے ہے جو مدرک بالوجدان ہوتی ہے جیسے بھوک اور پیاس وجدان سے مدرک ہوتی ہے۔ اسی طرح جو لوگ کلام اللہ کی تلاوت عظمت و اعتقاد کیساتھ کرتے رہتے ہیں تو بتدریج ان کو کیفیت وجدانیہ حاصل ہوتی جاتی ہے اور تلاوت کی حلاوت اور لذت بڑھتی جاتی ہے محبت اور ذوق و شوق زیادہ ہوتا جاتا ہے اور اس تلاوت کی بالکل وہی تاثیر ہوتی ہے جیسا کسی نے کہا ہے :" چونے کی سی کا لکری جب چھڑ کوں تب آگ "!

یہ تلاوت محبت سے ناشی ہوتی ہے اور محبت کی موجب بھی ہوتی ہے اور مومن کی تلاوت ایمان سے ناشی ہوتی ہے اور ایمان کی مورث بنتی ہے۔

اب تلاوت سے جو یہ کیفیات نہیں حاصل ہوتیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ تحصیل کمالات کے بارے میں ہمارا اعتقاد ہی قرآن پاک کے ساتھ درست نہیں ہے۔ عامۃ الناس کا یہ حال ہے کہ جو اوراد و اشغال صوفیاء کرام نے مقرر فرما دیئے ہیں ان میں جتنا قرب و نفع سمجھتے ہیں اتنا قرب

ونفع کلام اللہ میں نہیں سمجھتے۔ اسی وجہ سے جتنا اہتمام اور دوسرے اذکار کا کرتے ہیں اتنا تلاوت کا نہیں کرتے یا بس سرسری کرتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ جب تلاوت کی ہی نہیں جائے گی یا اگر کیجائے تو اس بداعتقادی کے ساتھ۔ تو وہ سرسری تلاوت موجب کیفیات اور مثمر برکات کیا بن سکتی ہے؟ بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے نہایت غضب وسخط کا ہی موجب بنے گی۔

ہمارا کام بس یہیں سے بگڑا ہے کہ جو چیز تقرب الی اللہ کا ذریعہ تھی اس کو تو چھوڑ دیا اور دوسری چیزوں میں لپٹ گئے۔ اس میں اذکار مسنونہ کا انکار نہیں ہے کیونکہ وہ تو احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں بلکہ حضرت نے یہ سمجھانا چاہا ہے کہ فرق مراتب بہت ضروری ہے جو چیز جس درجہ کی ہے اس کے ساتھ جب تک اسی درجہ کا اعتقاد نہ کیا جاوے گا اس وقت تک اس سے نفع اس درجہ کا نہیں ہوسکتا۔ دوسرے اذکار سے جو قرب ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ قرب تلاوت قرآن سے ہوتا ہے اور دیگر اذکار سے کہیں بڑھ کر اور الطف کیفیت تلاوت سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ سب چیزیں بتدریج حاصل ہوتی ہیں ایک دو دن میں نہیں حاصل ہوتیں۔ جب کچھ دنوں تک برابر عقیدت وعظمت کے ساتھ دل سے تلاوت کی جائے گی تب کہیں جا کر یہ ثمرات مرتب ہوں گے۔ اور تلاوت کا صحیح ذوق پیدا ہوگا۔ بے شک ہماری تلاوت محض رسمی ہے اور قرب خداوندی تلاوت حقیقی سے حاصل ہوتا ہے۔ تو پھر ہم کو قرب الٰہی کیسے حاصل ہو۔ رسمی اور حقیقی تلاوت میں بون بعید ہے اسی کو حضرت والا نے فرمایا کہ ؎ ع

"زرسم تا بحقیقت ہزار فرسنگ است"

تلاوت کا جو طریقہ حضرت والا نے تعلیم فرمایا ہے کہ تلاوت شروع کرنے سے پہلے قرآن پاک کی عظمت کا استحضار کیا جائے۔ اور استغفار اور تجدید ایمان اور اس بات کی تصدیق کر لیا کرے کہ یا اللہ یہ کلام آپ کا ہے اور برحق ہے اس پر ہمارا ایمان ہے اسمیں جو کچھ ہے سب حق ہے اور یہ دعا کرے کہ یا اللہ اس کی معرفت اور تلاوت با اخلاص عطا فرمائیے۔ اور اس کے مطابق ہماری زندگی بنا دیجئے اور اس کے جملہ اوامر پر عمل اور نواہی سے اجتناب کی توفیق دیجئے۔ اور اس کے ثمرات وبرکات سے نواز دیجئے۔

الحمد للہ اسی طریقہ سے تلاوت کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب بصد عجز ونیاز یہ درخواست ہے کہ حضرت والا دعا فرما دیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں میری دعاؤں کو قبول فرما دیں اور تلاوت وذکر کے برکات وثمرات سے نوازیں اور قرآن کے

ذریعہ ہم کو اپنے خالق و مالک سے صحیح نسبت حاصل ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی عنایت ہماری طرف متوجہ ہو اور تلاوت کلام اللہ سے صحیح ذوق نصیب ہو۔ والسلام مع الاکرام ۔ یکے از خدام عفی عنہ،

طالبین کے اس قسم کے خطوط کثرت سے حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں آئے جن سے معلوم ہوا کہ اب قرآن پاک سے صحیح تعلق و رابطہ پیدا ہوا۔ اور قرآن پاک کی برکت سے راستہ کھلا۔ اور اللہ تعالیٰ سے قرب محسوس ہوا۔

حضرت مولانا دامت برکاتہم نہایت تعجب اور درد و دلسوزی سے برابر فرمایا کرتے ہیں کہ خدا کا کلام موجود اور گمراہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سے رشتہ منقطع کر لیا گیا ہے اس لئے گمراہ ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر راستہ مسدود فرما دیا ہے۔ دین کیا ملے گا دنیوی فلاح کھو چکے ہیں ہیں۔ اگر آج مسلمان عظمت و احترام سے تلاوت کریں اور عمل کریں تو اب بھی اللہ تعالیٰ نظر عنایت مبذول ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت ہماری طرف متوجہ ہو۔ اور پھر سارا عالم ہی منور ہو جائے۔ کیا خوب کسی نے یہ شعر کہا ہے ؎

نبی بھی نور اور قرآں ملا نور نہ ہو پھر ملکے کیوں نورٌ علیٰ نور

پس ناظرین سے بصد الحاح و زاری عرض ہے کہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولینا دامت برکاتہم کو صحت و عافیت عطا فرمائیں اور تادیر اس چشمۂ فیض کو جاری رکھیں اور ہم کو حسن عقیدت اور کامل محبت و مناسبت عطا فرمائیں کہ آپ کے فیوض سے مستفیض اور آپ کے افادات سے مستفید ہوں۔

اَللّٰهُمَّ افْتَحْ اَقْفَالَ قُلُوْبِنَا بِذِكْرِكَ وَاَتْمِمْ عَلَيْنَا نِعْمَتَكَ وَاَسْبِغْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلِكَ وَاجْعَلْنَا مِنْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ۔ اٰمِيْنَ يَارَبَّ الْعٰلَمِيْنَ

احقر الخدام

قمر الزمان عفی عنہ

رمضان المبارک ۱۳۹۳ھ ۔ الہ آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تلاوت قرآن

نعمت‌ہائے الٰہی در بارۂ ایں بندۂ ضعیف بے شمار اند۔ واجل آنہا توفیق فہم قرآن عظیم است ومنن حضرت رسالت پناہ علیہ الصلوٰۃ والسلام بر کمترین امتیاں بسیار اند۔ واعظم آنہا تبلیغ[عہ] فرقان کریم ست۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن را تلقین فرمود بقرن اول تا ایشاں بقرن ثانی رسانید ند ہکذا و ہکذا تا آنکہ ایں درماندہ را نیز از روایت و درایت آں حصہ رسید۔

کلام اللہ کی تلاوت کے فضائل احادیث و آثار میں کثرت سے وارد ہیں جن کا استیعاب تو نہایت ہی دشوار امر ہے تاہم ارادہ ہے کہ کچھ روایات و آثار جو تلاوت کلام اللہ کے متعلق ہیں پیش کروں۔ اور علمائے کرام کی مصنفات سے تلاوت کے آداب اور ان حضرات کے معمولات کو لکھوں تاکہ معلوم ہو کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلف صالحین کو کلام اللہ سے کس قدر شغف تھا اور ان حضرات کو تلاوت کا کتنا اہتمام تھا۔ پھر اپنے حال کو آپ دیکھیں کہ ہم میں اور سلف رحمہم اللہ میں کتنا فرق ہو گیا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

قبل ازیں کہ روایات و آثار پیش کروں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جس تلاوت کی فضیلت نصوص میں اکثر آئی ہے وہ، وہ تلاوت ہے جو ایمان و تصدیق کے ساتھ ہو، تعظیم و توقیر کے ساتھ ہو، اور یہ سب قلب کی صفات ہیں۔ جب تک قلب میں تصدیق و توقیر نہ ہوگی، محض ظاہری تعظیم و تکریم کا کچھ اعتبار نہ ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص قرآن پاک کو چوم لے، آنکھوں سے لگائے، اس کو حریر و دیباج اور ریشمی کپڑوں کے جزدانوں میں رکھے اور کبھی دل چاہا تو جی خوش کرنے کے لئے زبان سے تلاوت بھی کر لے محض اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے دل میں بھی اس کی تصدیق و تعظیم موجود ہے۔ ایسا تو بہت

عہ یہ مضمون چونکہ کلام اللہ سے متعلق ہے اسلئے مناسب معلوم ہوا کہ اس کا افتتاح حجۃ اللہ مولانا شاہ ولی اللہ مفسر و محدث دہلوی رح کے کلام سے کروں چنانچہ الفوز الکبیر میں انھوں نے جو خطبہ لکھا ہے بہت پسند آیا برکت کیلئے اسی کو اپنی اس تالیف میں خطبہ بناتا ہوں ۱۲
عہ (قولہ تبلیغ فرقان کریم ست) اس سے معلوم ہوا کہ فہم قرآن کی دولت کا ملنا تو خیر بڑی چیز ہے۔ محض تبلیغ قرآن بھی کچھ کم چیز نہیں ہے کیونکہ اسکو بھی اعظم منن فرما رہے ہیں۔ ۱۲ منہ

ہوتا ہے کہ دل میں ایک بات نہیں ہوتی اور اس کے خلاف ظاہر کیا جاتا ہے۔ قلب میں تعظیم نہیں ہوتی اور اظہار تعظیم کیا جاتا ہے۔ یہود و نصاریٰ کا حال یہی تھا جیسا کہ علامہ جار اللہ زمخشری نے کشاف میں یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ :۔

عن سفیان ادرجوہ فی الدیباج والحریر وحلوہ بالذهب ولم یحلوا حلالہ ولم یحرموا حرامہ۔ (کشاف ص۸۵ ج۱)	حضرت سفیان سے روایت ہے کہ (یہود و نصاریٰ) اپنی کتاب کو حریر و دیباج کے جزدانوں میں رکھا اور اسکو سونے سے مزین کیا، مگر نہ تو اسکے حلال کو حلال سمجھا اور نہ اس کے حرام کو حرام جانا۔

نعوذ باللہ کس قدر بد باطن تھے کہ ظاہری عمل تو ایسا کہ اس کو ریشمی جزدانوں میں رکھتے تھے، سونے کے پانی سے لکھواتے تھے اور باطنی عمل یہ کہ بالکل بد اعتقاد ہو گئے تھے نہ اس کے حلال کو حلال سمجھتے تھے اور نہ اس کے محرمات کو حرام سمجھتے تھے۔

اس روایت سے صاف طور پر یہ معلوم ہوا کہ ہو سکتا ہے کہ معاملہ عظمت کا کیا جاوے، محبت کا برتاؤ کیا جاوے اور دل میں ذرا بھی عظمت و محبت نہ ہو۔

اب ہم لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ بس کسی طرح تلاوت کر لینا خواہ دل حاضر ہو یا نہ ہو، قلب میں عظمت ہو یا نہ ہو، کافی ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ ہمارے سلف نے عظمت و عقیدت کے ساتھ تلاوت کی تھی۔ تب ان کو اس کے فیوض و برکات اور اس کی وجہ سے ان کو بڑے بڑے درجات نصیب ہوئے تھے۔ اور ایسی ہی تلاوت مطلوب و مامور بہا ہے۔ اب ایسی تلاوت تو کرتے نہیں محض رسمی اور سرسری کرتے ہیں۔ اس پر طرفہ یہ ہے کہ اپنی اس تلاوت کو صحابہ کرام اور اکابر عظام جیسی تلاوت سمجھتے ہیں اور اس پر ان ثمرات و نتائج کے متمنی ہیں جو پہلے لوگوں کو حاصل ہوئے۔

یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے ہر عمل کا یہی حال ہو گیا ہے۔ رسم و تصنع کا استیلاء ہو گیا ہے۔ محض ظاہرداری کو کافی سمجھتے ہیں۔ اہل اللہ کی خدمت میں بھی جاتے ہیں تو اسی ظاہرداری کو اختیار کئے رہتے ہیں اور اس کو کامیابی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ کے ساتھ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ لوگ کچھ سمجھتے بوجھتے نہیں ہماری چاپلوسی اور ظاہرداری سے خوش ہو کر مراتب دیدینگے حالانکہ یہ لوگ نہیں جانتے کہ جو لوگ واقعی اہل اللہ ہیں۔ ان کو اللہ کی طرف سے کام سپرد ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے فہم و فراست بھی عطا فرماتے ہیں۔ جس سے یہ حضرات سچے جھوٹے اور مخلص و غیر مخلص میں تمیز کرتے ہیں۔ حاطب لیل کی طرح نہیں ہوتے۔ خوب سمجھتے ہیں کہ کون خلوص سے آتا ہے

اور کون محض رسماً آتا جاتا ہے کون اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے آتا ہے اور کون محض ہماری رضا جوئی کرتا ہے۔

مگر اب عجیب حال دیکھتا ہوں کہ اعتقاد میں تیزی سے انحطاط آتا جارہا ہے اعمال ہو رہے ہیں مگر اعتقاد ندارد، تصدیق کا پتہ نہیں۔ بزرگوں کی خدمت میں بھی آمد و رفت جاری ہے مگر دل میں ذرا انکسار پیدا نہیں کرتے۔ ظاہر میں تو جھکاؤ ہے لیکن باطن میں نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب باطن کو جھکانا نہیں ہے، اس کی اصلاح نہیں کرنی ہے تو پھر آتے ہی کیوں ہیں۔ اس قسم کا ایک آدمی آیا، دوسرا آیا، تیسرا آیا۔ اسی طرح ایسے لوگوں کی ایک جماعت بنجاتی ہے کہ ظاہر سے کہیں ہیں اور باطن سے بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی اصلاح کی جگہیں فاسد ہو گئیں۔ کوئی کام کا نہیں نکلتا۔ ایسی جگہوں کا فساد یہی ہے کہ جس مقصد کی خاطر یہ جگہیں موضوع ہوئی ہیں وہ مقصد پورا نہ ہو۔

اسی کو کہا کرتا ہوں کہ جب اپنے گھر کو اپنی بد اخلاقیوں کی وجہ سے فاسد کر لیتے ہیں تو اتنے پر صبر نہیں ہوتا کہتے ہیں کہ گھر کو یا بازار کو فاسد کر دینا کیا کمال ہے۔ کمال تو یہ ہے اصلاح کی جگہوں کو فاسد اور تہس نہس کر دیا جائے تاکہ اصلاح کا کام ہی ختم ہو جائے اور ہم کو فساد کا کامل وبال ملے

اگر صدق و خلوص سے کہیں آ دیں جاویں تو ان کو فائدہ ضرور حاصل ہوگا مگر ظالم ویسے ہی آتے جاتے ہیں۔ ان کو اتنا نہیں معلوم کہ مرید کا اول قدم صدق پر ہونا چاہئے اَوّلُ قدمٍ للمریدِ فی هٰذہ الطریقۃ ینبغی ان یکون علی الصدق۔

اور حضرت فرید الدین عطارؒ فرماتے ہیں ؎

در ارادت باش صادق اے فرید تا بیابی گنج عرفاں را کلید

اور یہ صدق و ارادت آپ کے زبان کی صفت نہیں ہے کہ زبان سے صدق و ارادت کا تکلم ہو جائے بس یہ کافی ہو بلکہ یہ دل کی صفت ہے اور اسی کا فعل ہے دل ہی اصل ہے اور وہی کارفرما ہے۔ دوسرے اعضاء اس کے تابع ہیں۔ جب قلب میں صدق و ارادت، عقیدت و محبت ہوگی جبھی ظاہری اعمال کا بھی اعتبار ہوگا۔ بغیر اس کے عند اللہ اس کا کوئی اعتبار نہیں اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ الحدیث

مگر آج کل تو ہم لوگوں نے قلب کو بالکل نسیاً منسیاً کر دیا ہے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی وظیفہ ہی نہیں اور نہ منجانب اللہ کوئی مطالبہ ہے بلکہ مطلق العنان چھوڑے ہوئے ہیں۔ اہل اللہ خون

ع اس قسم کے جملے بطور طنز و ملیح کے حضرت مولانا دامت برکاتہم اکثر فرماتے ہیں (از ناقل ۱۲)

کے آنسو رو رہے ہیں کہ ہائے اہل زمانہ نے دل کو بالکل مہمل ومعطل کر رکھا ہے۔ سارا دین زبان اور جسم پر آگیا ہے۔ قلب بالکل خالی ہے اور قلب کو متاثر کرنا تو درکنار سرے سے قلب و باطن کی اصلاح ہی کے منکر ہو گئے ہیں۔

بات یہ ہے کہ بچپن ہی سے دنیوی مشاغل اور لہو و لعب میں قلب کو ایسا مشغول کر دیتے ہیں کہ پھر دوسری چیز کی اس میں گنجائش باقی ہی نہیں رہتی۔ ملکات فاسد کر چکے ہوتے ہیں۔ اپنے قلب و دماغ کو اغیار کے ہاتھوں فروخت کر چکے ہوتے ہیں تو جب دل ہی کھو بیٹھے پھر ان سے اب کس خیر کی توقع کی جائے اور کس حیات کی تمنا کی جائے۔ اب ان لوگوں سے جو کچھ نہ ہو جائے کم ہی ہے۔

سنئے! آپ کہیں چلے جائیے زیارت بیت اللہ شریف کے لئے تشریف لیجائیے۔ مسجد میں داخل ہو جائیے۔ کسی بزرگ کی خدمت میں حاضری دے لیجئے لیکن جب تک عقیدت وعظمت نہ ہو گی ہرگز ہرگز کچھ حاصل نہ ہو گا۔ کامیابی کا مدار اخلاص و سچائی پر ہے بغیر اس کے کہیں سالہا سال آیئے جایئے کچھ نفع نہیں ہو گا۔ اب ایسا آنا جانا بہت ہے کہ آمد و رفت بھی رکھتے ہیں جس معلوم ہوتا ہے کہ تعلق ہے جبھی تو محنت برداشت کر رہے ہیں۔ مگر دل ہی میں بداعتقادی چھپائے رکھتے ہیں۔ بہت دنوں کے بعد اس کا اظہار ہوتا ہے جس سے سخت تعجب ہوتا ہے۔

یہ رسم و تصنع و نفاق کا زمانہ ہے۔ ظاہر و باطن میں تخالف کا زمانہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی تعلق وعقیدت ظاہر کر رہا ہو تو دل میں بھی تعلق وعقیدت ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کے پاس کچھ لوگ حاضر ہوئے ان میں سے ایک کو حضرت مولاناؒ نے ڈانٹا اور اپنے پاس بیٹھنے نہ دیا اور دوسرے انھیں کے ساتھیوں کو نہایت شفقت و محبت سے بٹھلایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جس کو پاس بیٹھنے نہ دیا تھا وہ راستہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم اس لباس خاص میں ان کے پاس اس لئے جارہے ہیں کہ ان کو دیکھ کر ایذا ہو (نعوذ باللہ) دوسرے اصحاب نے کہا نہیں بھائی ہم لوگ تو حضرت مولانا کی زیارت کے لئے جارہے ہیں۔ حضرتؒ پر دونوں کی نیت منکشف ہو گئی اور نیت کے مطابق معاملہ فرمایا۔

اس قسم کے واقعات رسالہ قشیریہ میں بھی مذکور ہیں۔ چنانچہ صاحب رسالہ قشیریہ تحریر فرماتے ہیں:۔

سمعت الاستاذ ابا علی یقول وصف	میں نے اپنے استاذ ابو علی دقاقؒ کو فرماتے ہوئے سنا کہ
سھل ابن عبد اللہ رجلاً بالولایۃ خبازاً	سہل ابن عبد اللہ نے ایک شخص کے بزرگی کی تعریف کی جو نصرہ

بالبصرة فسمع رجل من اصحاب سہل ابن عبد اللّٰہ ذلک فاشتاق الیہ فخرج الی البصرة فاتی حانوت الخباز فرأہ یخبز و قد تنقب لمحاسنہ علی عادة الخبازین فقال فی نفسہ وکان ھذا ولیا لم یحترق شعرة بغیر نقاب ثم انہ سلم علیہ وسألہ شیئا فقال الرجل انک استصغرتنی فلا تنتفع بکلامی وابی ان یکلمہ۔

رسالہ قشیریہ

میں نانبائی تھے۔ اس تعریف کو سہل ابن عبد اللہ کے اصحاب میں سے ایک شخص نے سنا تو انکی زیارت کا شتاق ہوا چنانچہ ملاقات کے لئے بصرہ پہونچکر ان نانبائی کی دکان پر گیا تو ان بزرگ کو روٹی پکاتے دیکھا۔ اس حال میں کہ نانبائیوں کی عادت کے مطابق اپنی داڑھی پر کپڑا باندھے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر اس نے اپنے دل میں کہا کہ اگر یہ ولی ہوتے تو بغیر نقاب کے بھی ان کا بال نہ جلتا یہ خیال دل میں لانے کے بعد سلام کیا اور کوئی بات دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ تم نے مجھ کو چھوٹا سمجھا اس لئے تم میرے کلام سے منتفع نہیں ہوسکتے اور اس سے کلام کرنے سے انکار کر دیا۔

دوسرا واقعہ سنئے:-

سمعت الشیخ ابا عبد الرحمن السلمی یقول سمع عبد الرحمن الرازی اباعثمان الحیری یصف محمد بن الفضل البلخی ویمدحہ فاشتاق الیہ فخرج الی زیارتہ فلم یقع لقلبہ من محمد ابن الفضل ما اعتقد فرجع الی ابی عثمان وسألہ فقال کیف وجدتہ فقال لم اجدہ کما ظننت فقال لانک استصغرتہ وما استصغر احد احدا الا حرم فائدتہ ارجع الیہ بالحرمة فرجع الیہ فانتفع بزیارتہ۔

(رسالہ قشیریہ صفحہ ۱۶۵)

میں نے شیخ ابو عبد الرحمن سلمی کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ عبد الرحمن رازی نے ابوعثمان حیری سے سنا کہ محمد ابن فضل بلخی کا وصف بیان فرما رہے ہیں اور انکی تعریف کر رہے ہیں یہ سنکر عبد الرحمن رازی کو محمد بن فضل کی ملاقات کا اشتیاق ہوا چنانچہ انکی زیارت کیلئے گئے لیکن محمد ابن فضل کے متعلق جیسا اعتقاد لیکر گئے تھے اس درجہ کی وقعت ان کے قلب میں نہ ہوئی۔ جب ابوعثمان حیری کے پاس لوٹ کر آئے تو انھوں نے پوچھا کہ تم نے انکو کیسا پایا تو کہا کہ جیسا خیال تھا ویسا نہیں پایا۔ یہ سنکر ابوعثمان نے کہا بات یہ ہے کہ تم نے انکو چھوٹا سمجھا اور نہیں چھوٹا سمجھا کسی نے کسی کو مگر یہ کہ اسکے فائدہ سے محروم ہوجاتا ہے۔ لہذا تم پھر انکی خدمت میں حرمت کیساتھ جاؤ۔ (تو دیکھو نفع ہوتا ہے یا نہیں) چنانچہ عبد اللہ لوٹ کر انکی خدمت میں گئے اور انکی زیارت سے منتفع ہوئے۔

اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں جو آئے دن پیش آتے رہتے ہیں برابر تجربات و مشاہدات ہوتے

رہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قلب خراب ہو گیا ہے جو چیز دل میں نہ ہو اس کے اظہار کرنے میں ذرا باک نہیں ہے۔ اسکی مذمت ہی دل سے رخصت ہو چکی ہے۔ اسی طرح نماز، روزہ ہی کو لے لیجئے جب تک کہ ایمان سے اور اعتقاد سے ادا نہ کیا جائے گا اس وقت تک اس پر اجر و ثواب کیا ملے گا اور فیوض و برکات کیسے حاصل ہوں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :۔

من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ۔ یعنی جو رمضان کے روزے اس طور پر رکھے کہ اس کی فرضیت کی تصدیق کرتا ہو اور اس سے اجر و ثواب کا طالب ہو۔ ریاء، وسمعہ کی نیت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے پہلے کے گناہوں کو معاف فرما دیں گے۔

دیکھئے حضورؐ نے مغفرت کے لئے ایمان واحتساب کو شرط قرار دیا یہی حال نماز کا بھی ہے اور یہی حال تلاوت کلام اللہ کا بھی ہے کہ تلاوت کے وقت ایمان لائے کہ یہ رب العالمین کا کلام ہے جس کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا ہے۔ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ اس کو وہی چھوتے ہیں جو پاک بنائے گئے ہیں یعنی ملائکہ۔ اور یہ بھی ترجمہ ہو سکتا ہے کہ اس قرآن کو نہیں چھوتے مگر پاک لوگ یعنی جو صاف دل اور پاک اخلاق رکھتے ہیں وہی لوگ اس کے علوم و حقائق تک ٹھیک ٹھیک رسائی پا سکتے ہیں۔

اور اسی کلام کی عظمت و وقعت کے بیان میں یہ آیت بھی ہے کہ :۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔	اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تو اس کو دیکھتا کہ وہ خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔

یعنی قرآن فی نفسہ ایسا مؤثر و قوی ہے۔ مگر انسان میں بوجہ غلبۂ شہوت کے قابلیت فاسد ہو گئی جس کے سبب تأثر نہیں ہوتا۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں :۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝	یعنی ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی۔ سو انھوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کیا۔ اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اپنے ذمہ لے لیا وہ ظالم ہے جاہل ہے۔

یعنی جو بوجھ آسمان زمین اور پہاڑوں سے نہیں اٹھ سکتا تھا اس کو انسان نادان نے اٹھالیا ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

دیکھئے اس سے احکام الٰہیہ اور قرآن پاک کی کیسی عظمت معلوم ہوتی ہے مگر ان سب باتوں کے معلوم کرنے کی فرصت ہی کب ہے جس حال میں ہیں اس کو کافی سمجھتے ہیں۔ چونکہ لسان سے ایک پارہ یا دو پارہ یا اس سے زیادہ منزل دو منزل پڑھ لینا آسان معلوم ہوتا ہے اور عظمت وجلالت کلام اللہ کے استحضار کے ساتھ تھوڑی مقدار بھی تلاوت کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے اس لئے آسان کو لے لیا اور اعتقاد کرلیا کہ یہی وہ تلاوت ہے جس کو صحابہ وسلف کرتے تھے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ کیا ہمارے سلف ایسے تھے کہ محض لسان سے تلاوت کرتے تھے۔ دل میں اس کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا؟ دل اس کی عظمت ومحبت وعقیدت سے خالی ہوتا تھا؟ نہیں یہ حضرات دل سے قرات کرتے تھے۔ ظاہر سے زیادہ باطن کی اصلاح وتعمیر کا اہتمام کرتے تھے۔

یہ اب کے لوگوں کا دین ومذہب ہے کہ ظاہر پر مقصور ہوگیا ہے اور دل کو بالکل مہمل ومعطل کر چھوڑا ہے۔ یہ دین نہ خدا کو پسند ہے اور نہ اس کے رسول کو یہ تو منافقین کا دین ہے کہ ان کے ظاہر وباطن میں مطابقت نہ تھی۔

اہل اللہ نے جتنا قرب اور اللہ تعالیٰ کی رضا تلاوت کلام اللہ سے حاصل کی کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں کی اسی سے ان کو ولایت وبزرگی ملی مگر وہ حضرات محض طرف لسان سے تلاوت نہیں کرتے تھے، دل کو شریک کرتے تھے اور اب کے لوگ اولاً تو تلاوت کلام اللہ کرتے نہیں اور اگر کرتے ہیں تو محض سرسری ولسانی جس کا اثر قلب تک بالکل نہیں پہونچتا۔ اور اعتقاد میں یہ فساد پیدا ہوگیا ہے کہ اس میں ولایت سمجھتے ہی نہیں۔ خود تو دل سے تلاوت کرتے نہیں اور اسکی عظمت و احترام کا استحضار کرتے نہیں۔ پھر جب تلاوت کلام اللہ کے فیوض وبرکات نہیں ملتے۔ تو یہ خیال کرلیتے ہیں کہ قرآن کی تلاوت سے ولایت وبزرگی مل ہی نہیں سکتی۔

یہ ضلالت نہیں تو اور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو مخلوق پر اس لئے نازل ہی فرمایا ہے کہ اس سے تعلق وقرب حاصل کریں اب اسی کے لوگ معتقد نہ رہیں تو کس قدر موجب سخط و ناراضی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ناراض ہیں، اللہ تعالیٰ کا کلام ناراض ہے تو پھر لاکھ چاہو کہ دوسرے ذرائع سے ولایت حاصل کرلو۔ حاصل نہیں ہوسکتی۔

سنئے! اہل اللہ میں سے جس نے جس قدر کلام اللہ کی طرف توجہ کی اور اس سے ذوق ومناسبت

پیدا کی اور اس کی عظمت و توقیر کا لحاظ کیا اسی درجہ کا احترام و توقیر اللہ تعالیٰ نے اس کی زمین پر نازل فرمائی اور اسی اعتبار سے مخلوق نے اس کی تعظیم و توقیر کی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمان تلاوت نہیں کرتے۔ تلاوت تو کم و بیش ہو رہی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ نمازِ فجر کے بعد چھوٹے بڑے تلاوت کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔ لوگ اپنے بچوں کو قرآن پڑھانے کے لئے مکاتیب کا اہتمام کرتے ہیں اس کے اخراجات برداشت کرتے ہیں تو بھلا کیسے کہا جاسکتا ہے کہ تلاوت کلام اللہ کو چھوڑ دیا ہے۔ تاہم یہ ضرور کہتا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ تلاوت کا سلسلہ جاری ہو اور قلب اس کی عظمت سے دور اور اس کے احترام سے خالی ہو۔

بزرگوں نے تصریح فرمائی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ علم ہو اور عمل نہ ہو اور عمل ہو اخلاص نہ ہو اور اہل اللہ کی صحبت نصیب ہو اور ان کا احترام قلب میں نہ ہو۔ چنانچہ رسالہ قشیریہ میں ہے کہ:۔

يقول كتب ابو عثمان الحيرى الى محمد ابن الفضل يسأله ما علامة الشقاوة فقال ثلاثة اشياء يرزق العلم و يحرم العمل، و يرزق العمل و يحرم الاخلاص و يرزق صحبة الصلحين ولا يحترم له۔	ابو عثمان حیری نے محمد ابن فضل سے لکھ کر یہ سوال کیا کہ شقاوت کی علامت کیا ہے تو انھوں نے فرمایا کہ تین چیز ہے ایک تو یہ کہ علم دیا جائے اور عمل سے محروم کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ عمل کی توفیق دیا جائے مگر اخلاص سے محروم رکھا جائے اور تیسرے یہ کہ صحبت صالحین میسر ہو مگر ان حضرات کا احترام نہ کرے۔

اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ علم کے لئے عمل ضروری نہیں اور عمل ہو تو اس میں اخلاص بھی ہو یہ لازم نہیں۔ اور کسی کی خدمت میں رہے تو وہ مخلص ہی ہو صرف ظاہراً نہ رہتا ہو اس کا اطمینان نہیں اور اب تو ایسا بہت ہے۔ بلکہ اس زمانہ میں اس نفاق کو ہنر و کمال سمجھا جاتا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے منافقین کے احوال اسی قسم کے تھے۔ تلاوت بھی کرتے تھے۔ ظاہراً صوم و صلوٰۃ کے بھی پابند تھے حتیٰ کہ جہاد میں بھی شریک ہوتے تھے مگر دل سے ان سب چیزوں کا انکار و جحود کرتے تھے۔ بے ایمان تھے۔ مسلمان کی تلواروں کے خوف سے اپنے کفر کو پوشیدہ رکھتے اور زبان سے اسلام ظاہر کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے احوال و اخلاق کو قرآن میں خوب خوب بیان فرمایا ہے۔ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں نہایت ذلیل و رسوا ہوگئے اخیر میں ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ ان پر جنازہ کی نماز نہیں پڑھی جاتی تھی۔ اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کئے جاتے تھے ہاں البتہ ان کی جان و مال محفوظ تھے

حاصل کلام یہ کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی عمل کیا جاوے۔ مثلاً تلاوت ہی کیجاوے اور اسکی عظمت قلب میں نہ ہو یا اس سے غفلت ہو اسی کو بتلانا چاہتا ہوں کہ جب تلاوت کر رہے ہو تو عظمت و احترام کے مراقبہ کے ساتھ تلاوت کرو۔ یہ کیا کہ کر بھی رہے ہو اور دل پر اس کا ذرا اثر نہ ہو اسمیں اخلاص نہ ہو یہ تو بہت ہی بڑی بات ہے۔ مومن کی تلاوت ایسی نہیں ہونی چاہئے یہ تو نفاقی تلاوت ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکیر فرمائی ہے اور اسکی مثال ریحانہ (تلسی) سے دی ہے کہ خوشبو تو اچھی مگر اس کا مزا نہایت ہی تلخ ہوتا ہے۔ اور جو شخص ایمان و تصدیق کے ساتھ تلاوت کرتا ہے اس کی مثال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نارنگی سے دی ہے جس کی خوشبو بھی اچھی ہوتی ہے اور رنگ بھی اچھا اور مزہ بھی نہایت لطیف و خوشگوار ہوتا ہے۔ تو پھر ایسی تلاوت کیوں نہ کیجائے جس کی مثال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نارنگی سے دی ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کلام اللہ سے اتنی بے اعتنائی کیوں ہے۔ جس طرح بیت کی نسبت اللہ کی طرف ہونے سے وہ محترم و مکرم ہوگیا اسی طرح کلام اللہ کی نسبت بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے۔ پھر اس کی تعظیم و توقیر کیوں نہیں کی جاتی۔ بیت اللہ شریف کی زیارت کے لئے طرح طرح کی مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔ رقمیں صرف کرتے ہیں اس کے ادب و احترام کو فرض جانتے ہیں اس کی جانب پیر کرنے کو اور اس رُخ استنجا کرنے کو مکروہ سمجھتے ہیں تو اسی طرح اس نسبت کی وجہ سے کلام اللہ کا ادب و احترام فرض ہے۔ اس کو سب کلاموں سے اعظم سمجھنا فرض ہے اس لئے کہ رب العالمین و احکم الحاکمین کا کلام ہے اور یہ مقولہ ہے کہ کلام الملوک ملوک الکلام یعنی بادشاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ:۔

فضل کلام اللہ علی سائر الکلام کفضل اللہ علی خلقہ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام کو دوسرے کلاموں پر وہی شرف حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر۔ پس وجہ اس بے اعتنائی و بے وقعتی کی میں یہ سمجھتا ہوں کہ چونکہ بچپن سے سب کے ہاتھوں میں قرآن پاک آجاتا ہے اسکی قرأت کرنے لگتے ہیں۔ اور سب کو آسانی سے مل جاتا ہے۔ ہر شخص بسہولت اس کا مالک ہوجاتا ہے تو بجائے اسکے کہ تعلق و مناسبت قرآن سے زیادہ ہو الٹے اس کی قدر و حرمت اذہان و قلوب سے کم ہوجاتی ہے۔

اے گراں جاں خوار دیدستی مرا   زاں کہ بس ارزاں خریدستی مرا
ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد   گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

حالانکہ لوگوں کو نہیں معلوم کہ عادۃ اللہ یوں ہی جاری ہے کہ جو چیزیں عزیز ترین ہیں اور ان

کی ضرورت عام طور پر پڑا کرتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ و رأفت کاملہ کے سبب زیادہ پائی جاتی ہیں۔ مثلاً گھاس، نمک، پانی، ہوا، نہ کہ موتی اور یاقوت و زعفران وغیرہ کیونکہ ان کی ضرورت خاص خاص ہی مواقع پر پڑا کرتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو عام نہیں فرمایا۔ اسی طرح قرآن پاک جو اعزّ الکتب ہے۔ کثرت سے پایا جاتا ہے اور دوسری کتابوں سے کم قیمت میں دستیاب بھی ہو جاتا ہے مگر لوگوں کی ذہنیت بالکل بدل گئی ہے کہ کتاب و سنت کے علم سے اس قدر خوش نہیں ہوتے جتنا دوسرے علوم سے۔

(اس مضمون کو ملا علی قاریؒ نے مرقات میں ایک حدیث کی شرح کے تحت بیان فرمایا ہے) اللہ تعالیٰ نے جب قرآن کو عزیز و عظیم بنایا ہے تو سب پر فرض ہے کہ اس کی افضلیت کا اعتقاد کریں اس کے سامنے ہر چیز کو کمتر اور ہیچ سمجھیں۔ قرآن پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے اعلیٰ و اعظم معجزہ ہے اللہ تعالیٰ نے بطور امتنان کے حضور کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ:۔

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ۝ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ ہم نے آپ کو ایک بڑی بھاری نعمت یعنی (سات آیتیں دیں جو (نماز میں مکرر پڑھی جاتی ہیں اور وہ (بوجہ جامع مضامین عظیم ہونے کے اس قابل ہیں کہ اس کے دینے کو یوں کہا جائے کہ) قرآن عظیم دیا (مراد اس سے سورہ فاتحہ ہے جو بوجہ عظیم ہونے کے ام القرآن سے ملقب ہے پس اس نعمت و منعم کی طرف نگاہ رکھئے کہ موجب فرح و سرور ہو ان لوگوں (کفار) کے عناد و خلاف کی طرف التفات نہ کیجئے اور) اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس چیز کو نہ دیکھئے (نہ تاسفاً نہ غیظاً) جو کہ ہم نے مختلف قسم کے کافروں (مثلاً یہود و نصاریٰ مجوس و مشرکین) کو برتنے کے لئے دے رکھی ہیں (اور بہت جلد ان سے جدا ہو جائے گی اور ان (کی حالت کفر) پر (کچھ) غم نہ کیجئے اور مسلمانوں پر شفقت کیجئے۔

چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر شدید الاحتیاط ہو گئے کہ دنیوی نعمتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے بھی نہ تھے۔ آپ کے غنا و توکل کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ آپ کے اصحاب کا یہ حال ہوا کہ سب چیزوں سے منہ موڑ کر قرآن کو اختیار کر لیا اور اپنے شعر و شاعری کو ترک کر کے بس قرآن ہی کے ساتھ مترنم ہو گئے۔ اس سے بڑھ کر کوئی نعمت و دولت نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس آیت کے تحت صاحب روح المعانی نے اس روایت کو نقل فرمایا ہے کہ:۔

عن ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ

عنہ من اوتی القرآن فرأی ان احداً اوتی من الدنیا افضل مما اوتی فقد صغّر عظیماً وعظّم صغیراً۔

جو شخص قرآن (جیسی عظیم نعمت) دیا گیا پھر بھی اس نے یہ خیال کیا کہ کوئی شخص دنیا کی نعمتوں میں سے کوئی نعمت (اسکے قرآن کی نعمت سے) افضل دیا گیا ہے تو اسنے شئ عظیم کی تصغیر کی اور چھوٹی چیز کی تعظیم کی۔

ظاہر ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کس قدر ناراضی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کی توقیر کی اسکی تحقیر کر رہا ہے اور جس کی تعظیم کی اس کی توہین کر رہا ہے۔

صاحب روح المعانی نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ خبر مروی تو ضرور ہے مگر یہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے مروی ہے میں اس پر واقف نہیں ہوا۔ اس حدیث کو قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں حضرت عبداللہ ابن عمرو العاصؓ سے روایت کیا ہے۔ اور امام غزالیؒ بھی اس حدیث کو لائے ہیں۔ بہر حال اس روایت کی صحت میں کچھ کلام نہیں ہے۔

ایک اور حدیث سنئے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود قرآن پاک کے بہت سے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔

عن الحارث الاعورؓ قال مررت فی المسجد فاذا الناس یخوضون فی الاحادیث فدخلت علی علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فاخبرتہ۔ فقال او قد فعلوھا قلت نعم اما انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الا انھا ستکون فتنۃ قلت ما المخرج منھا یا رسول اللہ؟ قال کتاب اللہ۔ فیہ نباء ما قبلکم وخبر ما بعدکم و حکم ما بینکم ھو الفصل لیس بالھزل من ترکہ من جبار قصمہ اللہ ومن ابتغی الھدیٰ فی غیرہ اضلہ اللہ ھو حبل اللہ المتین وھو الذکر

حضرت حارث اعورؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میرا گذر مسجد میں ہوا دیکھا کہ لوگ ادھر اُدھر کی بیکار باتوں میں مشغول ہیں یہ منظر دیکھکر میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسکی اطلاع کی تو فرمایا کہ کیا واقعی لوگ ایسا کر رہے ہیں میں نے کہا ہاں۔ فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ لوگو! عنقریب فتنۂ عظیم ہونے والا ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس وقت فتنہ سے نجات کا کیا ذریعہ ہوگا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کی کتاب (اس لئے کہ) اس کے اندر پہلے لوگوں کے احوال کا ذکر ہے اور آئندہ ہونے والے امور کی خبریں ہیں وہ تمہارے آپس کے اختلاف کا حل و فیصلہ ہے۔ وہ حق و باطل کے درمیان فاصل ہے وہ کوئی ہزل (مذاق) نہیں ہے (بلکہ وہ سب حق ہے)، جو جابر اسکو چھوڑیگا اللہ تعالیٰ اسکو ہلاک کریگے اور جو شخص ہدایت کو قرآن

الحکیم وھو الصراط المستقیم ھو الذی لا یزیغ بہ الاھواء ولا تلتبس بہ الالسنۃ ولا یشبع منہ العلماء ولا یخلق عن کثرۃ الرد ولا تنقضی عجائبہ ھو الذی لم تنتہ الجن اذا سمعتہ حتیٰ قالوا انا سمعنا قرآنا عجبا یھدی الی الرشد فامنا بہ من قال بہ صدق ومن عمل بہ اجر ومن حکم بہ عدل ومن دعا الیہ ھدی الی صراط مستقیم

(مشکوٰۃ شریف)

کے غیر میں تلاش کرے گا اللہ تعالیٰ اسکو گمراہ کر دیں گے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک مستحکم رسی ہے، اور ذکر حکیم ہے اور وہی صراط مستقیم ہے۔ اور ایسی چیز ہے کہ اہواء اسکی موافقت کی وجہ سے حق سے علیحدہ نہیں ہوتیں اور (اسکی قرأت میں) زبانوں کو دشواری نہیں ہوتی۔ اور علماء کو اس سے سیری نہیں ہوتی۔ اور یہ قرآن کثرت تکرار سے پرانا نہیں ہوتا (کہ پڑھنے یا سننے سے جی اکتانے لگے) اور اسکے عجائبات بھی ختم ہونیوالے نہیں ہیں۔ یہی وہ کلام ہے جسکو سنکر جن بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست کی ہدایت کرتا ہے سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے اور جس نے قرآن کیوا سطے سے کوئی بات کہی تو سچی بات کہی اور جس نے اسپر عمل کیا وہ ماجور ہوا اور جس نے اس کے ذریعہ کوئی فیصلہ کیا اس نے انصاف کیا اور جس نے اسکی جانب مخلوق کو دعوت دی وہ لوگ سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کئے گئے۔

سبحان اللہ سبحان اللہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے کیا کیا اوصاف بیان کئے ہیں۔ آپ سے زیادہ کون بیان ہی کر سکتا ہے۔ آپ پر نازل ہوا ہے۔ آپ سے زیادہ اس کے اوصاف وعلوم ومعارف کو کون سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا ہی حدیث کو ملاحظہ فرمایئے کہ کوئی قرآن کی تعریف ان الفاظ میں کر سکتا ہے؟ ہمارے اسلاف نے اس کو ایسا ہی سمجھا اور اس کی قدر ومنزلت کی جس کے صلہ میں ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی معزز ومکرم فرمایا۔ آج ہم نے اسلاف کا یہ سبق بھلا دیا اس لئے اللہ تعالیٰ کی نظر اعتبار سے ساقط ہوگئے۔ اور ان لوگوں کی نظروں میں بھی ذلیل وخوار ہوگئے۔

چنانچہ مشکوٰۃ میں یہ حدیث آئی ہے کہ:۔

عن عمر بن الخطاب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما ویضع بہ آخرین

(مشکوٰۃ)

حضرت عمر ابن الخطابؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب یعنی (قرآن) کے ذریعہ بہت سی قوموں کو رفعت وبلندی بخشیں گے اور کتنی قوموں کو اسی کی وجہ سے پست فرمادیں گے۔

اس کے تحت صاحب مرقاۃ لکھتے ہیں کہ :-

(بھٰذا لکتاب) ای بالایمان بہ وتعظیم شانہ والعلم بہ والمراد بالکتاب القرآن البالغ فی الشرف وظھور البرھان (اقواما) ای درجۃ جماعۃ کثیرۃ فی الدنیا والاٰخرۃ بان یحییھم حیاۃ طیبۃ فی الدنیا ویجعلھم من الذین انعم اللّٰہ علیھم فی العقبیٰ (ویضع بہ اٰخرین) ای الذین کانوا ذالک عن مراتب الکاملین الیٰ اسفل السافلین قال تعالیٰ (یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا) فھوماء للمحبوبین ودماء للمحجوبین وقال عزوجل وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا ھُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ وَلَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا ۔ وقال الطیبی فمن قرأہٗ وعمل بہ مخلصا رفعہ اللّٰہ ومن قرأہٗ مرائیا غیر عامل بہ وضعہ اللّٰہ ۔

(مرقات صفحہ ج ۲)

(اس کتاب کے ذریعہ) یعنی اسپر ایمان لانے اسکی تعظیم وتکریم کرنے اور اس کے احکام پر عمل کرنیکی وجہ سے ۔ اور کتاب سے مراد قرآن شریف ہے جو شرف وکرامت اور ظہور برہان کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہے ۔ (اقوام کو رفعت بخشیں گے) یعنی کثیر جماعت کو اسکی وجہ سے دین ودنیا میں درجات عطا فرمائیں گے ۔ اس طرح کہ دنیا میں ان کو حیات طیبہ عطا فرمادیں گے اور آخرت میں ان حضرات کے زمرہ میں شامل فرمادینگے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ۔ اور جو لوگ ایسے نہ ہوں گے ان کو کاملین کے مراتب سے اتار کر اسفل سافلین میں گرادیں گے ۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ اس کے ذریعہ سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت بخشتا ہے الغرض یہ قرآن محبوبوں کے لئے تو (میٹھا) پانی ہے (کہ اس سے سیرابی حاصل کرتے ہیں) اور محجوبوں کے لئے خون ہے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم قرآن میں ایسی چیز نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں تو شفاء ورحمت ہے اور ناانصافوں کو اس سے الٹا نقصان بڑھتا ہے ۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ جس شخص نے اسکو پڑھا اور اسپر اخلاص کے ساتھ عمل کیا اللہ تعالیٰ اسکو رفعت بخشیں گے اور جو محض ریاکاری کے لئے تلاوت کرے گا اور عمل نہ کریگا اس کو پست فرمادیں گے ۔

دیکھئے اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک کی دونوں ہی صفت ہے ۔ جیسے اس پر ایمان لانے اور اس کی تعظیم وتکریم کرنے اور اس کی تلاوت کرنے سے عزت ورفعت ملتی ہے ۔ ویسے ہی یہ بھی ہے کہ اس پر ایمان نہ لانے اسکی تعظیم وتوقیر نہ کرنے اور اس کی تلاوت نہ کرنے سے ذلت وپستی بھی ملتی ہے ۔ چنانچہ آج ہم لوگ جو ذلیل وخوار ہیں ۔ دنیا میں ساقط الاعتبار ہیں اس کی وجہ اغیار نہیں ہیں بلکہ اس کے سبب خود ہم لوگ ہیں کہ ہم نے کتاب اللہ سے تعلق کو قطع کردیا ۔ اس کی تعظیم و

توقیر سے، اس کی تلاوت اور اس کے احکام پر عمل کرنے سے استغناء وبے اعتنائی برتی تو کلام اللہ بھی ناراض ہوگیا۔ اس نے اپنے فیوض و برکات سے محروم کر دیا۔ ہمارے اس استغناء کی نحوست کی وجہ سے ذلت و رسوائی نازل ہوئی۔

سنئے! قرآن کے نبذ و ترک، کا یہ دنیا میں انجام بد ہے اس سے بڑھ کر عذاب و نکال آخرت میں ہوگا۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ:۔

عن بریدة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قرأ القرآن یتأکل بہ الناس جاء یوم القیامة ووجهه عظم لیس علیہ لحم۔ (مشکوۃ شریف)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے قرآن کو اس لئے پڑھا کہ لوگوں سے اس کے ذریعہ تاکل کرے (یعنی ذریعہ معاش بنائے) قیامت کے دن اس حال میں آویگا کہ اسکا چہرہ ہڈی ہی ہوگا جس پر گوشت نہ ہوگا۔

اس کی وجہ صاحب مرقاۃ نے بہت عمدہ بیان فرمائی ہے۔ سنئے فرماتے ہیں کہ:۔

لما جعل اشرف الاشیاء واعظم الاعضاء وسیلة الی ادناها وذریعة اردئها جاء یوم القیامة فی اقبح صورة واسوء حالة

جبکہ اس شخص نے اشرف الاشیاء (یعنی قرآن پاک) اور اعلیٰ ترین عضو (یعنی چہرہ) کو ادنیٰ اور انتہائی ردی شے کی تحصیل کا ذریعہ بنایا تو قیامت میں وہ نہایت قبیح صورت اور بدترین حالت میں آئے گا۔

قال بعض العلماء استجرار الجیفة بالمعازف اهون من استجرارها بالمصاحف وفی الاخبار من طلب بالعلم المال کان کمن مسح اسفل مداسه ونعله بمحاسنه لینظفه (مرقات ج۲ ص۶۲۵)

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ مردار کا کھینچنا آلات لہو و لعب سے آہون ہے اس سے کہ اسکو مصاحف سے کھینچا جاوے (یعنی دنیا کو گا بجا کر حاصل کرنا اتنا برا نہیں ہے جتنا قرآن پاک کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنایا جائے) اور اخبار میں ہے کہ جس شخص نے علم کے ذریعہ مال کمایا اسکی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی اپنے جوتے کے تلے کو صاف کرنے کے لئے اپنی داڑھی سے پونچھے۔

ان احادیث سے قرآن عظیم کا مرتبہ کتنا اعلیٰ معلوم ہوتا ہے کہ جس کو بھی دارین میں عزت و رفعت ملتی ہے اسی قرآن کے ذریعہ ملتی ہے اور جس کو بھی دارین میں ذلت و پستی ملتی ہے اسی قرآن کے ترک سے ملتی ہے (جیسا کہ کفار کو ملی) چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کی شکایت ان الفاظ میں فرماویں گے۔

یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا۔ اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو بالکل نظر انداز کر رکھا تھا۔ نیز ایسے لوگوں سے قرآن بھی محاجہ کرے گا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ من قرأ فی لیلۃ مائۃ اٰیۃ لم یحاجہ القرآن۔ یعنی جو شخص رات میں سو آیت پڑھ لیگا تو اس سے قرآن محاجہ نہ کرے گا۔ اس کے تحت صاحب مجمع البحار فرماتے ہیں کہ دل علی لزوم قرأتہ علی کل احد وان لم یقرأ خاصمہ یعنی اس حدیث نے اس بات پر دلالت کی کہ ہر شخص پر اس قدر قرأت لازم ہے ورنہ اس سے قرآن مخاصمہ و محاجہ کریگا۔

یہ کس قدر ڈرنے کی بات ہے کہ بعض صورتیں ایسی بھی قیامت میں پیش آئیں گی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پاک بجائے شفاعت کے محاجہ کریں گے۔ پھر بتلایئے اس وقت نجات کی کیا صورت ہوگی۔ اعاذنا اللہ منہا۔

اب کس قدر افسوس کی بات ہے کہ کتاب اللہ کے فضائل سے کتب احادیث پر ہیں۔ شارحین نے ان احادیث کی خوب خوب شرحیں کی ہیں اور عجیب عجیب مطالب بیان فرمائے ہیں کہ اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو قرآن کی عظمت قلب میں پیوست ہو جائے مگر عوام تو عوام علماء کے اذہان و قلوب ان مضامین سے خالی ہیں۔ اور جب علم ہی نہیں پھر "تا بہ عمل چہ رسد" اور جب علماء ہی اس سے عاری ہیں۔ پس تا بہ عوام چہ رسد۔

اب علماء کو قرآن پاک کے مضامین سے ذوق نہیں رہا۔ اور نہ ان مضامین سے ان کو حظ باقی رہا۔ الا ماشاء اللہ۔ یہ حضرات خود تلاوت میں تقصیر کرتے ہیں اور دوسرے اعمال میں جنہیں ان کو حظ ہے بہت ہی شوق سے امتثال کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ کلام اللہ کی تلاوت کیجئے اور مسلمانوں کو اس کی ترغیب دیجئے جس سے مسلمانوں کا تعلق کلام اللہ سے پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ سے صحیح نسبت حاصل ہو تو اس کے لئے ہرگز ہرگز آمادہ نہیں ہوتے۔

بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے بھی اس کو پرانی کتاب سمجھ لیا ہے۔ اس کے مضامین کو دیرینہ خیال کر لیا ہے۔ سمجھتے ہیں کہ پہلے لوگوں نے جو کچھ اس کے متعلق کہا یا کتابوں میں لکھ دیا وہ کافی ہے۔ اب ہم کو ان مضامین کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہم کو بس ایسی نئی نئی باتیں بیان کرنی چاہیے جس سے لوگ واہ واہ کریں اور بس جب یہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے تو قرآن پاک کے مضامین میں مزید تدبر و تفکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔

اب بھی اگر اصولی اور بنیادی باتیں بیان کی جائیں اور مسلمانوں کے سامنے اصلی دین پیش

کیا جائے اور کتاب وسنت کو واضح طور پر احوال زمانہ کے مطابق پیش کیا جائے تو اب بھی مسلمان کتنے ہی گئے گذرے سہی ان باتوں کو مانیں گے اور عمل کریں گے اس لیے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہے۔ جب کتاب وسنت کی بات آتی ہے تو ضرور ایمان میں حرکت پیدا ہوتی ہے مسلمان اس کی طرف اقبال کرتے ہیں، اس کو قبول کرتے ہیں۔ مگر کوتاہی وقصور رہیں لوگوں کا ہے کہ صحیح طور پر دین پہونچایا نہیں جا رہا ہے۔ مثلاً تلاوت کلام اللہ ہی ہے اس کے فضائل جو احادیث میں مذکور ہیں اگر ان کو پیش کیا جائے کہ تمھارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشاد ہیں، دیکھو اس میں تلاوت کی کتنی فضیلت اور اس کی طرف کتنی ترغیب ہے اور کس کس طرح تحضیض فرمائی ہے اور اس کے چھوڑنے پر کتنی تہدید فرمائی ہے اور کس قدر وعیدوں کا ذکر فرمایا ہے۔ تو کیا کوئی مسلمان ایسا بھی ہوگا جس کے دل پر اثر نہ ہوگا؟ کیا اس کو تلاوت کی طرف رغبت نہ ہوگی اور ترک کی صورت میں اس کو خوف نہ ہوگا؟ اگر نہ ہو تو وہ مسلمان ہی کیا ہے وہ تو خالص منافق ہے۔ اور یہ بیان نہ کرنے ہی کا کرشمہ ہے کہ عام طور پر اذہان میں یہ خیال راسخ ہوگیا ہے کہ اشغال واوراد مروجہ کا اللہ تعالیٰ سے نسبت اور ولایت کی تحصیل میں جو درجہ ہے وہ تلاوت قرآن کا نہیں ہے۔

اسی طرح نوافل کی اہمیت فرائض سے کہیں زیادہ سمجھتے ہیں۔ یوں فرض فرض زبان سے کہتے تو ہیں مگر ان کے حال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اعتقاد ہی نہیں ہے کہ فرائض سے اللہ تعالیٰ کا زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ حدیث میں تصریح ہے کہ سب سے زیادہ قرب اللہ تعالیٰ کا فرائض کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح تلاوت کلام اللہ کی نسبت بھی اکابر کی تصریح ہے کہ سب اذکار سے بڑھ کر تلاوت کلام اللہ ہے۔

چنانچہ منجملہ ملفوظات حضرت خواجہ بابا فرید گنج رحؒ کے (جن کو سلطان نظام الدین اولیاءؒ نے جمع فرمایا ہے) یہ کہ کوئی ذکر کلام اللہ سے بڑھ کر نہیں ہے۔ مناسب ہے کہ اس کی تلاوت کیا کریں۔ اور اس کا نتیجہ کل طاعتوں سے بڑھ کر ہے۔

دیکھئے یہ بابا فرید شکر گنج رحؒ کا تو ملفوظ ہی ہے جس کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے نقل فرمایا ہے پھر حضرت مولانا تھانویؒ نے اپنے رسالہ میں درج فرمایا تو اس مضمون پر تین بزرگوں کا اتفاق ہوگیا۔ نیز حدیث شریف میں ہے کہ میری امت کی عبادات میں سب سے افضل تلاوت قرآن ہے۔ پس جب فرائض اور تلاوت قرآن کی افضلیت پر نص وارد ہے اور اہل اللہ کا بھی یہی دستور رہا ہے کہ فرائض وتلاوت کلام اللہ کی طرف ترغیب دیتے آئے ہیں تو پھر آپ کون ہوتے ہیں کہ ان کے درجے کو کم سمجھیں

اور دوسرے اشغال و وظائف کو عظیم سمجھیں اللہ تعالیٰ نے جس کو جو درجہ عطا فرمایا ہے اسکو ویسا ہی اعتقاد کرنا چاہیئے اور مراتب میں اسی اعتبار سے فرق کرنا چاہیئے۔ فرائض کا مرتبہ نوافل سے زیادہ سمجھنا چاہیئے۔ اس میں قرب زیادہ محسوس کرنا چاہیئے۔ اس کے اثرات کو نفل کے اثرات سے بالاتر یقین کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ فریضہ ہی اصل ہے۔ نوافل تو تکمیل فرائض کے لئے مشروع ہوئی ہیں۔ فرع کو اصل کا درجہ دینا یا اس سے افضل سمجھنا کس قدر خلاف عقل اور ضلالت کی بات ہے اور اللہ تعالےٰ کی کتنی ناراضی کی چیز ہے۔

اسی طرح تلاوت کلام اللہ کو بھی سمجھئے کہ جملہ اذکار سے یہ افضل ہے۔ قرب الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ دوسرے اذکار اس سے ادنیٰ و کمتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے کلام کی تلاوت سے جتنی خوشی ہوتی ہے دوسرے کلام سے نہیں۔ یہ سب آپ کو اعتقاد کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ سب نصوص میں وارد ہیں ؏ گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

آج کل اعتقاد میں فساد آگیا ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اعمال میں اتنا بگاڑ نہیں آیا ہے جتنا اعتقاد میں بگاڑ ہوگیا ہے۔ چنانچہ بطور رسم سب اعمال کچھ نہ کچھ جاری ہیں مگر ان کے احوال سے اندازہ لگتا ہے کہ اعتقادات چوپٹ ہوگئے ہیں۔

اسی کو دیکھ لیجئے۔ اب بھی لوگ اہل اللہ کی خدمت میں آمد و رفت رکھتے ہیں سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی باطنی دولت ہے جو سینہ بسینہ چلی آرہی ہیں۔ اسی کو حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں مگر جب ان سے بتلایا جاتا ہے کہ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ شریعت کی پابندی ہے یعنی نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، تلاوت کلام اللہ کرنا وغیرہ وغیرہ تو تسلیم نہیں کرتے۔ سمجھتے ہیں کہ اصل طریقہ ہم سے چھپایا جارہا ہے۔ اس طرح بدظن ہوجاتے ہیں۔

آپ لوگ خود بتلائیے کہ یہ بد اعتقادی ہے یا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو فرض کیا۔ اور سب سے زیادہ اس میں قرب رکھا اور تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ بنایا کسی کی کیا مجال ہے کہ اس کے خلاف سمجھے۔ اور میں کہتا ہوں کہ آج کل جو محرومی ہے اس کی واحد وجہ یہی بد اعتقادی ہے فرائض کے فیوض و برکات سے تو اس طرح محروم رہے کہ اس کے فیوض و برکات کے معتقد ہی نہیں اور نوافل سے اس طرح کہ اتنی فرصت ہی نہیں کہ نوافل میں مشغول ہوں۔ اگر نوافل پڑھیں بھی تو ایسی سخت بد اعتقادی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو کب گوارا ہوگا کہ اپنے خاص انعامات سے نوازیں۔ یہ ایک اہم مغالطہ ہے جس میں عوام و خواص سبھی مبتلا ہیں اس لئے میں نے اس پر ذرا تفصیل سے کلام کیا ہے۔ امید ہے کہ نفع ہوگا۔ انشاء اللہ۔

ذکر اللہ کی فضیلت احادیث صحیحہ سے ثابت ہے بلکہ اس کی کثرت سے تاکید ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم پر شرائع اسلام کثیر ہو گئے ہیں کوئی ایسی چیز بتلایئے جس کو مضبوطی سے پکڑ لوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا لا یزال لسانك رطبًا من ذکر اللہ (رواہ ترمذی وابن ماجہ) یعنی تمہاری زبان ہمیشہ ذکر اللہ سے تر رہنی چاہیئے۔

سادات صوفیہ نے اس کو سلوک و تسلیک کے لئے اختیار کیا ہے اور اس کے منافع و نتائج بھی مرتب ہوئے ہیں اور ذاکرین کو نسبت مع اللہ حاصل ہوئی ہے تو اس کا کوئی شخص کیسے انکار کر سکتا ہے۔

پس ذکر اللہ ضرور کرنا چاہئے اس میں خاصہ ہے توجہ کے ایک مرکز پر مجتمع ہو جانے کا اور اس کا یہ موضوع ہے اس لئے مبتدی کو یہ بتلایا جاتا ہے۔ جب توجہ ایک مرکز پر مجتمع ہو جاتی ہے پھر یہی ذکر مسنون کرایا جاتا ہے کیونکہ ہر ذکر کا ایک خاص اثر ہوتا ہے وہ سب بھی حاصل ہوں اور قرآن پاک کی تلاوت بھی کریں اس لئے کہ کلام پاک تمام اثرات کا حاوی و جامع ہے وہ بھی آہستہ آہستہ حاصل کرتے ہیں اور قرآن پاک سے مناسبت بڑھتی ہے۔ چونکہ قرآن میں مختلف الفاظ اور مختلف مضامین پر گذر ہوتا ہے اس کی وجہ سے یکسوئی جلدی نہیں معلوم ہوتی۔ تشتت رہتا ہے اور توجہ ایک مرکز پر مجتمع نہیں ہوتی اس لئے ابتداء میں ذکر کی کثرت بتلائی جاتی ہے۔ اور میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس کا بھی (تلاوت قرآن کا) اثر ہوتا ہے اور کیفیت ملتی ہے اور ایسی لطیف ہوتی ہے کہ ابتداء میں محسوس نہیں ہوتی۔ جب آدمی تلاوت برابر کرتا رہتا ہے تو مناسبت بڑھتی رہتی ہے اور کچھ دنوں کے بعد نفع محسوس بھی ہونے لگتا ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تلاوت سے ابتداءً نفع نہیں ہوتا۔ ہوتا ابتداءً ہی سے ہے مگر احساس عرصہ کے بعد ہوتا ہے۔

اب رہا یہ کہ جو قاضی ثناء اللہ صاحبؒ اور حضرت مجدد صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا ہے اس کا مطلب بیان کرتا ہوں — قاضی ثناء اللہ صاحبؒ ارشاد الطالبین میں ارشاد فرماتے ہیں:

"نفس کو فنا کرنے سے پہلے کثرتِ نوافل اور تلاوت قرآن سے قرب الٰہی میں ترقی نہیں ہوتی۔"

(تحفۃ السالکین ترجمہ ارشاد الطالبین ص۱۱)

اور مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

ان الصوفی لا یجد برکات القرآن الا بعد فناء نفسه و تطهرہ من الرزائل و اما قبل الفنا فقراءۃ القرآن له دخل فی عمل الابرار و بعد فناء	یقیناً صوفی قرآن کے برکات کو حاصل ہی نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کا نفس رذائل سے پاک و صاف ہو کر فنا نہ ہو جائے۔ اور قبل فنا تو قرأت قرآن اعمال ابرار میں سے ہے۔ اور فنائے نفس اور اس کے اثر دعین کے زوال کے بعد

النفس و زوالها و عینها و اثرها فمراتب القرب الی الله سبحانه منوط بتلاوة القرآن۔

قرب الی اللہ کے تمام مراتب تلاوت قرآن ہی سے مربوط و وابستہ ہیں۔

(تفسیر مظہری صـ۱۰۳ ج ۲)

توان حضرات کا مطلب یہ ہے کہ نفس جب تک فنا نہیں ہوتا اور اس کے اثرات زائل نہیں ہوئے ہوتے اس وقت تک وہ اللہ تعالیٰ کے قرب سے مانع بنا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ و بندے کے درمیان حجاب رہتا ہے جب یہ حجاب مرتفع ہوتا ہے تو قرب کے خاص خاص مراتب حاصل ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو قرب فنائِ نفس پر موقوف ہے وہ اس سے پہلے کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ جب نفس کو فنا کیا جا گا جبھی وہ قرب حاصل ہوگا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ نوافل و قرآن کی قرأت کا فنائے نفس سے پہلے کوئی نفع ہی نہیں بلکہ اس سے نفع ہوتا ہے۔ ثواب ملتا ہے۔ چنانچہ خود مجدد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ فنائے نفس سے پہلے کی قرأت عمل ابرار میں داخل ہے تو کیا یہ کم مرتبہ ہے؟

اور میں کہتا ہوں کہ قرأت قرآن کا نفس کے فنا میں دخل عظیم ہے۔ اگر تلاوت قاعدہ سے کیجاوے تو اسی سے نفس بھی فنا ہو جائے گا پھر اسی قرأت سے مراتب قرب بھی حاصل ہوں گے۔ آخر ذکر تو اسی لئے بتلایا جاتا ہے کہ فنائے نفس حاصل ہو پھر ذکر سے بھی تو فوراً ہی فنا حاصل نہیں ہوتا بلکہ عرصہ تک کرتے رہنے سے نفس مرتا ہے اسی طرح تلاوت سے بھی کچھ دنوں کے بعد فنا حاصل ہوگا اور جیسے ذکر میں کوئی مدت و مقدار مقرر نہیں طالب کی استعداد پر ہے جیسی استعداد ہوگی اتنے ہی مدت لگے گی۔ یہی حال تلاوت کا بھی ہے کہ اگر استعداد قوی ہے تو فنائے نفس جلدی اور اگر ضعیف ہے تو دیر میں حاصل ہوگا۔

اور یہ بھی صوفیہ فرماتے ہیں کہ فقط ذکر اللہ سے نفس فنا نہیں ہوتا جب تک اللہ تعالیٰ کی تجلّی نہ ہو اور ظاہر ہے کہ کلام سے بڑھ کر کس چیز میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات ہوں گی۔ جب اور اذکار میں نفس کے فنا کر دینے کی استعداد ہے تو اللہ تعالیٰ کے کلام سے بدرجہ اولیٰ فنائِ نفس حاصل ہوگا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں جملہ اذکار سے زیادہ قوت و تاثیر رکھی ہے۔ پس ذکر کی طرف جتنی توجہ کرنے سے فنا حاصل ہوتا ہے اتنی ہی بلکہ اس سے کم ہی تلاوت کی طرف توجہ کیجاوے تو ضرور فنائے نفس حاصل ہوگا۔

اور دیکھئے مجدد صاحبؒ نے کتنی عمدہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ مراتب قرب تلاوت پر منوط ہیں

یہی میں بھی کہہ رہا ہوں۔ یہ تو میرے مقصود کے بالکل مطابق ہے کہ جو مرتبہ بھی ملتا ہے وہ تلاوت قرآن ہی سے ملتا ہے۔ جس درجہ کی تلاوت ویسا ہی قرب و مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ یعنی اگر تلاوت فناء نفس سے پہلے ہے تو یہ منجملہ اعمال ابرار کے ہے۔ اور اگر فنائے نفس کے بعد ہے تو مقربین کے اعمال سے ہے۔ واللہ اعلم

پس اگر یہ کہا جائے کہ مبتدیوں کو اس سے نفع نہیں ہوتا تو کوئی تلاوت کرے گا ہی نہیں اور انتہا تک شاید ہی کسی کی رسائی ہو۔ یہاں تک کہ موت آجائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس حالت میں وفات ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے ذرا ذوق و حظ حاصل نہ ہوگا۔ اور اس حال میں اپنے پروردگار سے ملاقی ہوگا کہ دل میں کلام اللہ سے ذرا تعلق و مناسبت نہ رکھے گا۔ بس یہ کتنا بڑا حرمان ہوگا۔

ہاں یہ بات ضرور ہے کہ مصلح و مرشد کو چاہئے کہ بار بار اس سے یہ کہتا رہے کہ تلاوت دل سے کرو محض سرسری اور لسانی مت کرو۔ سرسری تلاوت پر جو وعیدیں ہیں اس کو سناتا رہے۔ اور اس سے احتراز کا امر کرتا رہے تو ضرور نفع ہوگا اور کیوں نہ ہوگا۔ قرآن کسی خاص طبقہ کے لئے تو نازل نہیں ہوا ہے، امت میں تو ہر قسم کے لوگ ہیں، جوان، بچے، بوڑھے بھی، مبتدی بھی متوسط اور منتہی بھی۔ تو پھر کسی خاص طبقہ کے ساتھ مخصوص کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ تالی کی استعداد کے مطابق فائدہ ہوگا۔ مبتدی کو اس کی استعداد کے مطابق اور منتہی و متوسط کو ان کی استعداد کے موافق۔ مگر فائدہ سب کو ہوگا۔ پس سب لوگ تلاوت کے مکلف ہیں کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔

اور وہ قصہ جس کو مرقاۃ میں ملا علی قاریؒ نے ذکر کلمہ طیبہ کی فضیلت ثابت کرنے کیلئے نقل فرمایا ہے کہ :-

ان السید علی بن میمون المغربی لما تصرف فی الشیخ علوان الحموی وھو کان مفتیاً مدرساً فنھاہ عن الکل واشغلہ بالذکر فطعن الجھال فیہ بانہ اضل شیخ الاسلام ومنعہ عن نفع الانام ثم بلغ السید انہ یقرأ القرآن احیاناً فمنعہ منہ فقال الناس انہ زندیق یمنع من تلاوۃ القرآن

سید علی ابن میمون مغربی نے جب شیخ علوان حموی میں تصرف فرمایا جو کہ مفتی اور مدرس تھے تو ان کو افتاء و تدریس کے تمام کاموں سے منع فرمایا اور ذکر اللہ میں مشغول فرمادیا تو جہلا نے سید علی ابن میمون کے بارے میں زبانِ طعن دراز کی۔ اور کہنے لگے کہ انھوں نے تو شیخ الاسلام کو گمراہ کر دیا اور مخلوق کو جو نفع ان سے ہو رہا تھا اس کو روک دیا۔ پھر سید علی ابن میمون کو یہ بات معلوم ہوئی کہ شیخ علوان حموی کبھی کبھی تلاوت قرآن کر لیتے ہیں تو اس سے بھی منع فرمادیا۔ تب ان کے

الذی ھو قطب الایمان و غوث الایقان لکن طاوعہ المرید الی ان حصل لہ المزید وانجلت مرآۃ قلبہ و حصل مشاھدۃ ربہ فأذن لہ فی قراءۃ القرآن فلما فتح المصحف فتح علیہ الفتوحات الازلیۃ والابدیۃ وظھر لہ کنوز المعارف و العوارف فقال السید انما کنت امنعک عن القرآن و انما کنت امنعک عن لقلقۃ اللسان والغفلۃ عما فیہ من البیان فی ھذا الشان۔

واللہ المستعان

(مرقات

ص۱۳ج۳)

متعلق لوگ کہنے لگے کہ یہ تو زندیق ہے کہ تلاوت قرآن سے بھی جو کہ ایمان کا قطب اور ایقان کا غوث ہے منع کرتا ہے۔ لیکن مرید (یعنی شیخ علوان) نے (بلا خوف لومۃ لائم) اپنے شیخ کی اطاعت کی یہانتک کہ انکو بہت سی نئی چیزیں حاصل ہوئیں اور ان کے قلب کا آئینہ روشن ہوگیا اور اپنے رب کا مشاہدہ حاصل ہوگیا اسوقت انکو شیخ نے قرأت قرآن کی اجازت مرحمت فرمائی پھر انھوں نے جب قرآن پاک کو کھولا تو فتوحات ازلیہ وابدیہ منکشف ومفتوح ہوئے اور انکے لئے معارف وعوارف کے خزانے ظاہر ہوئے۔ اسکے بعد سید علی ابن میمونؒ نے ان سے فرمایا کہ میں تم کو قرآن پاک کی تلاوت سے نہیں منع کرتا تھا۔ بلکہ زبان کے لقلقہ سے منع کرتا تھا اور اس شان (لقلقہ لسان اور تلاوت مع غفلت) میں جو وعیدیں آئی ہیں ان سے غفلت کو منع کرتا تھا۔ واللہ المستعان

تو اس کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ:۔

سید علی ابن میمونؒ شیخ کامل تھے ان پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ان عالم کے حال کے مناسب شیخ نے یہی سمجھا ہو کہ ان کو کچھ دنوں کے لئے قرأت سے روکدیا جائے۔ جب ذکر اللہ کر کے کچھ نسبت مع اللہ اور توجہ الی اللہ ہو جائے اس کے بعد تلاوت کا امر کیا جاوے لہٰذا ایک خاص طریقہ ایک مخصوص شخص کے ساتھ تھا جو قاعدہ کلیہ نہیں بن سکتا۔ بلکہ یہ خصوص واقعہ لا عموم لہا کے قبیل سے ہے۔

پس عام طور پر یہی کہا جائے گا کہ ذکر اللہ کی پابندی کے ساتھ ساتھ کلام اللہ کی تلاوت کرو اور جی لگا کر کرو، دل پر اثر لے کر کرو، اس سے قلب میں صفائی بھی ہوگی، جلا و نور بھی حاصل ہوگا، مگر کچھ دنوں تک مداومت سے کرنیکی ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہ چند دن کیا پھر چھوڑ دیا۔ اس سے نفع نہیں ہوتا یہ غلط طریقہ ہے۔ اور ایسا بہت ہوتا ہے کہ لوگ چند یوم ایک کام کرتے ہیں پھر اسکو ترک کر دیتے ہیں۔ مواظبت نہیں کرتے تو بھائی اس سے نفع نہیں ہوگا۔ لوگ دنیوی امور و علوم کی تحصیل کے لئے مدتوں مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔ ہم سے کامیابی کے لئے دعا بھی کرانے آتے ہیں

ہیں۔ اس لئے رقمیں صرف کرتے ہیں تب کہیں جاکر کامیابی ہوتی ہے اور سند ملتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کا قرب اور ان کی رضا اور جنت ہی کیوں اتنی سستی ہوگئی کہ چند دن عمل کیا وہ بھی دل سے نہیں بلکہ رسماً کیا اور سب درجات عالیہ کے متمنی اور منتظر ہوگئے۔ یہ کب قرین قیاس و انصاف ہے۔

حاصل کلام یہ کہ تلاوت کلام اللہ سے قلب کی صفائی ہوتی ہے بلکہ بہ نسبت اور اذکار کے جلد ہی ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قلب کی صفائی کے لئے موت کے یاد رکھنے اور تلاوت قرآن ہی کو فرمایا ہے اور کسی چیز کو نہیں فرمایا۔ چنانچہ

عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ھٰذا القلوب تصدأ کما یصدأ الحدید اذا اصابہ الماء۔ قیل یا رسول اللہ وما جلاءھا قال کثرۃ ذکر الموت وتلاوۃ القرآن۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ قلوب زنگ آلود ہوجاتے ہیں جیسے کہ پانی لگ جانے سے لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ پھر اسکی صفائی کا کیا ذریعہ ہے۔ فرمایا کہ موت کو کثرت سے یاد کرنا۔ اور قرآن کی تلاوت کرنا۔

دیکھئے یہ صریح حدیث ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ تلاوت کلام اللہ کرو اسی سے جلاء قلب حاصل ہوجائے گا تو ہرگز نہ مانیں گے۔ یہ صریح ضلالت اور کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ علماء کو بلاتے ہیں ان سے وعظ کہلاتے ہیں۔ مگر تعلیمات کی طرف اصلاً التفات نہیں کرتے۔

اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اور اعمال میں روح نہیں رہ گئی ہے اسی طرح اس کا بھی رسم سے زیادہ درجہ نہیں ہے بلکہ اگر کہدیا جائے کہ اس کا منشا نام ونمود وحظ نفس ہے۔ تو مضائقہ نہیں۔ اور یہ کہنا برمحل ہوگا۔

تلاوت مع التصدیق والتوقیر کا طریقہ

میں نے شروع ہی میں یہ بیان کیا ہے کہ تلاوت مع التصدیق والتعظیم مطلوب اور مامور بہا ہے اسی تلاوت کی فضیلت کثرت سے احادیث میں وارد ہے اب اس طرح تلاوت کرنے کا طریقہ بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب تلاوت کا ارادہ کرے اور قرآن لیکر بیٹھے تو یہ مراقبہ کرے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ کسی مخلوق کا کلام نہیں۔ یا کسی شاعر کا دیوان نہیں۔ اسی طرح خوب اپنے دل میں کلام اللہ

کی عظمت کا استحضار کرے اور اس پر ایمان و تصدیق کو بار بار دل میں لاوے۔ جب خوب اعتقاد و تصدیق ہو جائے تو تلاوت شروع کرے۔ یہ تلاوت ایمان سے ناشی ہوگی اور اس کا تعلق قلب سے ہوگا۔ یہ تلاوت ایمانی و قلبی ہوگی۔ لسانی و رسمی نہ ہوگی اور جب تلاوت ایمان و اعتقاد سے ہوگی تو چونکہ اعتقاد و ایمان خود کمال ہے اور جملہ کمالات کا موجب بھی تو اسی تلاوت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت اور تمام مراتب قرب حاصل ہو جائیں گے اور یہ قرب ایک وجدانی شے ہے جو مدرک بالوجدان ہوتی ہے جیسے بھوک و پیاس۔ جو لوگ اعتقاد سے تلاوت کرتے رہتے ہیں بتدریج ان کو کیفیت وجدانیہ حاصل ہوتی جاتی ہے اور تلاوت کی حلاوت و لذت بڑھتی جاتی ہے۔ محبت و ذوق بڑھتا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق قوی ہوتا جاتا ہے۔ مگر شرط وہی ہے کہ کلام اللہ کی تعظیم کے ساتھ تلاوت کیجائے اعتقاد سے کی جائے ادب و احترام کے ساتھ کیجائے۔

چنانچہ حجۃ الاسلام امام غزالی رح نے احیاء العلوم میں تحریر فرمایا ہے کہ

فالقاری عند البدایۃ بتلاوۃ القرآن ینبغی ان یحضر فی قلبہ عظمۃ المتکلم و یعلم ان ما یقرأہ لیس من کلام البشر وان فی تلاوۃ کلام اللہ عزوجل غایۃ الخطر فانہ تعالیٰ قال لا یمسّہ الا المطہرون وکما ان ظاہر جلد المصحف و ورقہ محروس من ظاہر بشرۃ اللامس الا اذا کان مطہراً فباطن معناہ ایضاً بحکم عزہ وجلالہ محجوب عن باطن القلب الا اذا کان مطہرا عن کل رجس مستنیرا بنور التعظیم و التوقیر وکما لا یصلح للمس جلد المصحف کل ید فلا یصلح لتلاوۃ حروفہ کل لسان ولا لنیل معانیہ کل قلب۔

پس قاری کو چاہئے کہ قرآن کی تلاوت کرنے سے پہلے اپنے قلب میں متکلم کی عظمت کا خوب استحضار کرے اور یہ سمجھے کہ جس کلام کی وہ قرأت کرنے جا رہا ہے۔ وہ کسی بشر کا کلام نہیں ہے اور یہ بھی جانے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی تلاوت میں نہایت اہمیت ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے (کلام اللہ کے بارے میں) ارشاد فرمایا ہے کہ اس کو وہی لوگ چھوتے ہیں جو پاک بنائے گئے ہیں اور جس طرح کہ قرآن شریف کی ظاہری جلد اور اسکے ورق کو انسان کے ظاہری جسم سے بچایا گیا ہے مگر جب کہ طاہر ہو۔ اسی طرح اس کے باطن معنی کو بوجہ اس کی عزت اور جلالت شان کے قلب کے باطن سے محجوب رکھا گیا ہے مگر جبکہ وہ قلب ہر نجاست سے پاک اور نور تعظیم و توقیر سے منور ہو۔ اور جس طرح سے کہ جلد قرآن کو چھونے کی ہر ہاتھ صلاحیت نہیں رکھتا ویسے ہی اسکے حروف کی تلاوت کیلئے ہر زبان اہلیت نہیں رکھتی اور اسیطرح ہر قلب اسکے معانی و معارف کو پانے کے لائق نہیں ہے۔

حضرت امام غزالیؒ نے جو تحریر فرمایا آپ نے سمجھ لیا۔ ایک بات امام ہی برکت سے عرض کرتا ہوں کہ امام نے جو یہ تحریر فرمایا کہ ہر ہاتھ اس کو چھونے کی صلاحیت نہیں رکھتا اسی طرح ہر زبان اس کے حروف کی تلاوت کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اور ہر قلب اس کے حقائق کو حاصل کرنے کے قابل نہیں ہے تو ٹھیک ہے۔ مگر میں اس کو اس عنوان سے بیان کرتا ہوں کہ ہر ہاتھ اس کو چھونے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر جب کہ با وضو ہو اور اسی طرح ہر زبان اس کے تلاوت کی اہلیت رکھتی ہے مگر جبکہ دل میں ایمان ہو منافقین کی طرح نہیں کہ زبان سے تو تلاوت کرتے تھے مگر دل میں ایمان نہ تھا اسکی تکذیب کرتے تھے۔ ایسی تلاوت کا اعتبار نہیں۔ اور ہر قلب میں اللہ تعالیٰ نے معانی حاصل کرنے کی استعداد رکھی ہے مگر جبکہ مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہو۔ ماسوی اللہ کوئی شئی مطلوب نہ ہو یعنی نیت خالص ہو۔ اسی طرح تلاوت ہی سے قلب میں جو نجاست و پلیدگی ہوگی وہ زائل ہو جائے گی اور پاکی نصیب ہوگی اس لئے کہ ؎

ذکر حق پاک است چوں پاکی رسید رخت بر بندد بروں آید پلید

چوں برآمد نام پاک اندر جہاں نے پلیدی ماند و نے آں دہاں

تلاوت کلام اللہ سے قبل پاکی کا مطالبہ ایسا ہی ہے جیسے کسی نجس شخص سے کہا جائے کہ پاک ہو کر دریا میں داخل ہو اس سے پہلے نہیں تو جب قرآن پاک قلب کی صفائی اور اسکو ہر نجاست سے پاک کرنے ہی کے لئے نازل ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے اور دلوں میں جو روگ ہیں ان کے لئے شفا ہے اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کیلئے ___ تو بغیر تلاوت ہی کے کیسے شفا اور پاکی حاصل ہو سکتی ہے اور اس سے پہلے نجاسات سے پاکی کا اور امراض قلب سے شفا کا مطالبہ کرنا کب مناسب ہو سکتا ہے۔

آگے امام فرماتے ہیں کہ:-

ولمثل هذا التعظيم كان عكرمة رضـ ابن ابى جهل اذا نشر المصحف غشى عليه ويقول هو كلام ربى هو كلام ربى - فتعظيم الكلام تعظيم المتكلم ولن	اور اسی قسم کی تعظیم کی وجہ سے حضرت عکرمہ ابن ابی جہل رضی اللہ عنہ جب قرآن پاک کھولتے تھے تو آپ پر غشی طاری ہو جاتی تھی اور بار بار یہ فرماتے تھے کہ یہ میرے پروردگار کا کلام ہے یہ میرے پروردگار کا کلام ہے۔ پس کلام کی تعظیم در

تحضرہ عظمۃ المتکلم مالم یتفکر فی صفاتہ وجلالہ و افعالہ ۔ (احیاء العلوم ص۲۵۳ ج ۱)

اصل متکلم کی تعظیم ہے (یعنی متکلم کی تعظیم سے کلام میں تعظیم پیدا ہو جاتی ہے) اور متکلم کی تعظیم کا استحضار ہو نہیں سکتا جب تک کہ اسکے صفات اور جلال و افعال میں تفکر نہ کیا جائے ۔

ف:۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ بغیر صفات و افعال میں تفکر کے متکلم کی عظمت کا استحضار نہیں ہو سکتا ۔ میں کہتا ہوں کہ تلاوت کلام اللہ بنود التعظیم و التوقیر سب مدارج کے حصول و تحصیل کا موجب ہے ۔ تفکر کی صفت بھی اسی سے پیدا ہو جاتی ہے ۔ خوب سمجھ لیجئے ۔

قرآن پاک کی عظمت اور جلالت کو تقریب فہم کے لئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض عارفین کا کلام نقل کیا ہے کہ کلام اللہ کا ہر حرف لوح محفوظ میں جبل قاف سے اعظم ہے ۔ اگر تمام ملائکہ جمع ہو کر کسی ایک حرف کو اٹھانا چاہیں تو اٹھانے پر قادر نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ اسرافیل علیہ السلام جو ملک اللوح ہیں آتے ہیں اور آکر اس کو اللہ تعالیٰ کے اذن و رحمت اور انھیں کی قوت و طاقت سے اٹھا لیتے ہیں ۔

اس سے قرآن کی کس قدر عظمت معلوم ہوئی کہ اس قرآن کا عالم ملکوت میں یہ درجہ ہے کہ اسکا ہر حرف کوہ قاف سے بھی بڑا ہے ۔ یہ ایک محسوس مثال ہے جس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور کلام اللہ کی عظمت کا قدرے اندازہ لگا سکتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ فہم عطا فرمائے ۔ آمین ۔

عالم ربانی شیخ الاسلام والمسلمین امام محی الدین نووی اپنی کتاب الاذکار میں فرماتے ہیں کہ :۔

"فصل فی مسائل و آداب ینبغی للقاری الاعتناء بہا وھی کثیرۃ جداً نذکر منہا اطرافا فاول مایؤمر بہ الاخلاص فی قرأتہ ان یرید بہا اللہ سبحانہ وتعالیٰ وان لایقصد بہا توصلا الی شیئ سوی ذلک ۔ وان یتادب مع القرآن ویستحضر فی ذھنہ انہ یناجی اللہ سبحانہ وتعالیٰ ویتلو کتابہ فیقرأ علی حال من یری اللہ فانہ ان لم یرہ فان اللہ تعالیٰ یراہ (الاذکار للنووی)

یہ فصل ان مسائل و آداب میں ہے جن کی طرف قاری کو اعتنا کرنا چاہئے اور یہ بہت زیادہ ہیں ان کے بعض کو ہم ذکر کرتے ہیں پس اول شئی جس کا قاری قرآن مامور ہے وہ قرأت میں اخلاص ہے اور یہ کہ اس سے (خالص) اللہ تعالیٰ کا ارادہ کرے ۔ اور اللہ تعالیٰ کے سوئی کسی دوسری شئ کے حاصل کرنیکا قصد نہ کرے ۔ اور یہ کہ قرآن پاک کے ساتھ ادب و احترام کا معاملہ کرے اور (قرأت قرآن کے وقت) اس بات کا اپنے ذہن میں استحضار کرے کہ اللہ تعالیٰ سے مناجات کر رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے کتاب کی تلاوت کر رہا ہوں پس قرأت کے وقت ایسا حال پیدا کرے جس سے یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے ۔ جب یہ حال نہ پیدا ہو تو یہ تو ہو سکتا ہے (کہ سمجھے) کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں

امام غزالیؒ کا کلام بہت ہی خوب تھا مگر علامہ نوویؒ کا مضمون بھی کچھ کم نہیں۔ امام نوویؒ نے یہ فرمایا کہ تلاوت قرآن سے پہلے جس کا تالی مامور ہے وہ قرأت میں اخلاص ہے اور اخلاص یہ ہے کہ قرأت سے اللہ تعالیٰ مقصود ہوں اور اس کے سوا کسی دوسری شئی یعنی اغراض دنیویہ کا قصد نہ کرے اور قرآن کے ساتھ مؤدب ہو اور ذہن میں یہ حاضر کرے کہ اللہ تعالیٰ سے مناجات کر رہا ہے اور اسکے کتاب کی تلاوت کر رہا ہے پس حال اس کا یہ ہو کہ گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کو وہ نہیں دیکھ رہا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں۔ یہ احسان کہلاتا ہے۔ صلوٰۃ کے ساتھ احسان کو مختص سمجھا جاتا ہے مگر قرآن شریف کی تلاوت میں بھی امام نے اس کو خوب چسپاں کیا جزاھم اللہ تعالیٰ۔

تقریب فہم کے لئے یہ بات بیان کرتا ہوں کہ حضرت مولانا تھانویؒ فرماتے تھے کہ مجلس میں بعض لوگ اس طرح بیٹھتے ہیں کہ ان کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی جب ایک مخلوق کی مجلس میں یہ حال ہو سکتا ہے تو اسی سے اندازہ کیجئے کہ جو لوگ احسان و اخلاص کے ساتھ تلاوت کرتے ہوں گے ان کا کیا حال ہوتا ہوگا۔

حضرت امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اور علامہ نوویؒ نے کتاب الاذکار اور البیان فی آداب حملۃ القرآن میں اس کے علاوہ اور بہت سے آداب تلاوت بیان فرمائے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ ان سب کو مستقل طور پر بیان کروں گا۔

اس اتنے بیان سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ علمائے امت کو اعمال میں اخلاص و صدق کا کس قدر اہتمام تھا کہ جس طرح احکام ظاہری کو مفصل بیان فرمایا ہے ویسے ہی آداب باطنی کو بھی تحریر فرمایا ہے تاکہ امت محض ظاہری آداب پر اکتفا نہ کرے اور صرف رسوم ہی تک نہ رہ جائے بلکہ حقیقت اور رُوح تک پہونچے۔ علمائے آخرت نے ان آداب و مسائل کو بیان کرنے میں بڑی کاوش و جانفشانی کی ہے جس طرح فقہا نے کتاب و سنت سے احکام و مسائل کو مستنبط فرما کر کتب میں مدون فرمایا۔ اور امت پر احسان عظیم فرمایا ورنہ ہم لوگوں کو براہ راست کتاب و سنت سے مسائل معلوم کرنا بڑا ہی دشوار ہوتا اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے ان حضرات نے اس امر کو انجام دیا۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء۔

اسی طرح علمائے باطن نے ہر عمل کے آداب باطنی کو بیان فرمایا۔ اور خوب خوب بیان فرمایا چنانچہ امام غزالیؒ نے نماز۔ روزہ کے آداب باطنی بیان فرمائے۔ حج کے آداب باطنی بیان فرمائے اسی طرح تلاوت و دعا کے آداب باطنی بیان فرمائے ہیں اور اسی کا ثمرہ تھا کہ لوگ حقائق سے آشنا تھے۔ آداب باطنی کے عارف تھے۔ اب چونکہ یہ آداب بیان نہیں کئے جاتے اسلئے عام طور پر لوگ جاہل ہو گئے ہیں جانتے ہی نہیں کہ ان ظاہری آداب کے علاوہ قلب سے متعلق بھی آداب ہیں اسی بنا پر اگر کوئی مصلح

اس کی طرف توجہ دلاتا ہے تو مخالفت پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ وہ رسوم سے نکالکر حقیقت تک پہونچانا چاہتا ہے۔ چونکہ عوام نے رسوم ہی کو دین سمجھ لیا ہے اسلئے انکو ناگوار ہوتا ہے۔ تو ناگوار ہوا کرے اس کی وجہ سے کوئی محقق و مصلح اپنا کام ترک نہ کردے گا۔ ایسے لوگوں کی تائید اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ ایسوں سے جس نے بھی مقابلہ کیا مغلوب ہی ہوا ہے۔ اور اگر ایسے حضرات کو یہ مفسد ختم کرنا چاہیں تو ہرگز قادر نہیں ہوسکتے۔ ہمیشہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے دین کی خدمت کرتے رہیں گے اور ہر زمانہ میں ناصحین کی ایک جماعت باقی رہیگی جیسا کہ ابداع میں ہے کہ:-

عن الحسن انہ قال لن یزال للہ نصحاء فی الارض من عبادہ یعرضون اعمال العباد علے کتاب اللہ فاذا وافقوہ حمدوا اللہ واذا خالفوہ عرفوا بکتاب اللہ ضلالۃ من ضل وھدی من اھتدیٰ فاولئک خلفاء اللہ

الابداع فی مضار الابتداع ص ۲۳

یعنی حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہمیشہ بندگا خدا میں سے زمین میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو کہ نصیحت کرتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کے اعمال کو کتاب اللہ پر پیش کرتے رہیں گے جب کتاب اللہ سے ان کے اعمال کے موافق پائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی حمد کریں گے اور جب مخالف پائیں گے تو کتاب اللہ کے ذریعہ گمراہوں کی ضلالت کو اور ہدایت پانیوالوں کی ہدایت کو پہچان لیں گے۔ یہی لوگ اللہ کے خلفاء ہوں گے۔

اور بخاری شریف میں یہ حدیث وارد ہے کہ:-

لایزال طائفۃ من امتی منصورین علے الحق لا یضرھم من خذلھم ولا من عاداھم

میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہیگی جن کی دمنجاب اللہ، نصرت ہوگی جو لوگ ان کی نصرت کو ترک کردیں گے اور ان سے عداوت کریں گے انکو مضر ثابت نہ ہوگی۔

اب سنئے امام غزالیؒ نے نماز کے ہر ہر رکن کے آداب بیان فرمائے ہیں ان میں کے بعض کو نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ:-

"جب نماز کے لئے کھڑے ہو تو اللہ کی عظمت وجلالت کو اپنے دل میں لاؤ اور سوچو کہ کس ذات جلیل الشان سے مناجات کر رہے ہو اور یہ دیکھو کہ کس کیفیت میں مناجات کر رہے ہو اور اپنے پروردگار سے کیا چیز طلب کر رہے ہو۔ اس وقت چاہئے کہ تمہاری پیشانی پر شرمندگی سے پسینہ آجائے اور تمہارے فرائصؒ ہیبت کی وجہ سے کانپنے لگیں۔ اور تمہارا چہرہ شدت خوف کی وجہ سے زرد پڑجائے اور جب اللہ اکبر کہو تو اس

؏ فرائص۔ پستان اور مونڈھے کے درمیان کا گوشت جو خوف کے وقت اچھلنے لگتا ہے۔ ۱۲ (مصباح)

طرح زبان سے کہو کہ قلب اس کی تکذیب نہ کرے یعنی جس طرح زبان سے اللہ تعالیٰ کو بڑا کہہ رہے ہو دل میں بھی یہ حال ہو کہ اللہ تعالیٰ کو ہر شئی سے بڑا سمجھ رہے ہو اور اگر تمہارے دل میں کوئی شئے اللہ تعالیٰ سے اکبر ہے تو اللہ تعالیٰ شہادت دیتے ہیں کہ تم کاذب ہو۔ اگرچہ یہ کلام یعنی اللہ اکبر صادق ہے جیسا کہ منافقین کے انك لرسول الله کہنے میں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کاذب ہونے کی شہادت دی ہے۔ (اس لئے کہ یہ قول اگرچہ صحیح ہے مگر اسکے مطابق اعتقاد نہیں رکھتے تھے قلب میں رسول اللہ ہونے کا انکار و جحود کرتے تھے۔ اسلئے ان کو کاذب فرمایا گیا۔ م)

اسی طرح جب اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم کہو تو یہ سمجھو کہ وہ شیطان تمہارا دشمن ہے اور اس گھات میں لگا ہے کہ تمہارا دل اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھیر دے اور یہ اس لئے کرتا ہے کہ جب تم کو دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مناجات و سرگوشی کر رہے ہو اور اس کے حضور میں سجدہ کر رہے ہو تو اس کو حسد ہوتا ہے کہ میں اسی ایک سجدے کے نہ کرنے کی وجہ سے ملعون و مردود ہوگیا۔ (اور سنو) تمہارا استعاذہ اس طور پر ہونا چاہئے کہ شیطان کے مالوفات و محبوبات کو ترک کرکے اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو اختیار کرو۔ ورنہ محض زبان سے شیطان سے پناہ مانگنا (اور اسکے مرضی کے مطابق عمل کرنا) ایسا ہی ہے کہ کسی کے پیچھے درندہ ہو جو اس کو چیر پھاڑ کر ہلاک کردینا چاہتا ہو اور وہ شخص زبان سے یہ کہے کہ میں تجھ سے بھاگ کر فلاں مضبوط قلعہ میں پناہ لینا چاہتا ہوں اور خود اسی جگہ پر کھڑا رہے تو محض یہ قول اس کو ہرگز نفع نہ دیگا جب تک کہ اپنی جگہ سے علحدہ ہوکر قلعہ میں داخل نہ ہوجائے۔

اسی طرح جو شخص اپنی شہوات کا جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہیں اور شیطان کو پسندیدہ ہیں اتباع کرتا ہے تو محض اس کا قول۔ (اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم) کچھ نفع نہ دے گا۔ پس چاہئے کہ اس کے کہنے کے وقت یہ عزم ہو کہ شیطان کے شر سے نکل کر اللہ کے حصن (قلعہ ۱۲) میں پناہ لوں گا اور سنو اللہ تعالیٰ کا حصن کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ ہے اس لئے کہ اللہ جل جلالہٗ نے فرمایا جیسا کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ لا الٰہ الا اللہ حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی۔ یعنی لا الٰہ الا اللہ میرا حصن ہے جو شخص میرے حصن میں داخل ہوجائے گا وہ میرے عذاب سے مامون ہوجا(ئےگا)۔

اور اس کلمہ کو حصن بنانے والا وہی شخص ہوسکتا ہے جس کا معبود اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہ ہو۔ اور جس نے اپنی خواہش ہی کو معبود بنالیا تو وہ شیطان کے میدان میں ہے۔ نہ کہ اللہ تعالیٰ کے قلعہ میں۔

اسی طرح رکوع و سجود و قراءت سب کے آداب بیان فرمائے ہیں اگر آپ چاہیں تو احیاء العلوم میں مطالعہ کریں۔ اسی ضمن میں امامؒ نے قرأت کے اعتبار سے لوگوں کی تین قسم بیان فرمائی ہے وھو ھذا

فاما القرأة فالناس فيها ثلثة رجل يتحرك لسانه وقلبه غافل۔ ورجل يتحرك لسانه وقلبه يتبع اللسان فيفهم ويسمع منه كانه يسمعه من غيره وهو درجة اصحاب اليمين۔ ورجل يسبق قلبه الى المعاني اولاً ثم يخدم اللسان القلب فيترجمه ففرق بين ان يكون اللسان ترجمان القلب او يكون معلم القلب۔ والمقربون لسانهم ترجمان يتبع القلب ولا يتبعه القلب۔

بہرحال قرأت تو اسمیں تین قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جسکی زبان تو چل رہی ہے مگر قلب غافل ہے۔ اور ایک وہ ہے کہ اسکی لسان حرکت کرتی ہے اور قلب اسکی اتباع کرتا ہے پس قلب سمجھتا ہے اور اس طرح سنتا ہے جیسے کسی دوسرے سے سنتا ہے اور یہ اصحاب الیمین کا درجہ ہے۔ اور ایک وہ رجل ہے کہ اس کا قلب معانی کی طرف سبقت کرتا ہے پھر زبان قلب کی خادم بنکر قلب کی ترجمانی کرتی ہے تو اسمیں کہ لسان قلب کی ترجمان ہو۔ اور یہ کہ لسان قلب کی معلم ہو بہت ہی عظیم فرق ہے۔ اور مقربین کی زبان انکے قلب کی ترجمان اور اس کے تابع ہوتی ہے ایسا نہیں کہ ان کا قلب لسان کے تابع ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ مومنین کو جو درجات عالیہ ملتے ہیں وہ اسی قرأت سے ملتے ہیں جس کی جس درجہ کی قرأت ہوتی ہے اسی کے موافق اس کا درجہ عنداللہ ہوتا ہے اور اسی درجہ کا قرب اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ مجدد الف ثانیؒ نے ارشاد فرمایا ہے مراتب القرب الی اللہ منوط بتلاوۃ القرآن یعنی قرب کے مراتب کا مدار تلاوت قرآن پر ہے۔

دیکھئے پہلے قسم کے لوگ جو محض لسان سے قرأت کرتے ہیں دل غافل ہوتا ہے ان کی قرأت لا یعبأ بہ کے درجہ میں ہے۔ اس سے ان کو کوئی درجہ نہ ملا۔ بلکہ مومن کی شان سے یہ بہت ہی بعید ہے کہ ایسی قرأت کرے۔ جس کا دل پر کوئی اثر نہ ہو۔ اور دوسرے قسم کے لوگ جو کہ زبان سے قرأت کرتے ہیں اور دل بھی حاضر رہتا ہے ان کو لسان شرع میں اصحاب الیمین کہا گیا ہے اور اس درجہ سے بڑا درجہ مقربین کا ہے وہ درجہ اس وقت ملتا ہے کہ پہلے قلب معانی کے سمجھنے کی طرف سبقت کرتا ہے پھر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ زبان قرأت کرنے لگتی ہے اور قلب کی ترجمانی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی قرأت کی توفیق عطا فرمادیں اور زمرۂ مقربین میں داخل فرمادیں۔

ابتدائے کلام میں ہم نے یہ عرض کیا تھا کہ آگے احادیث و آثار پیش کریں گے تو اگرچہ ضمناً بہت سی گذر چکیں

آگئیں تاہم احیاء العلوم اور مشکوٰۃ اور تبیان سے بھی مزید روایات نقل کرتے ہیں تاکہ قرآن پاک اور حاملین قرآن کی مزید فضیلت معلوم ہو جائے۔ نیز ایسی روایات بھی نقل کیجائیں گی جنہیں (تلاوت میں) تقصیر کرنے والوں کی مذمت وارد ہے۔

الاحادیث الشریفه فی فضل القرآن واهله

یعنی وہ ارشادات نبویہ جو قرآن اور اہل قرآن کی فضیلت میں وارد ہیں۔

(۱) قال صلی الله علیه وسلم من قرأ القرآن ثم رائی ان احداً اوتی افضل مما اوتی فقد استصغر ما عظمه الله تعالیٰ۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے قرآن کو پڑھا پھر بھی اس نے کسی کے متعلق یہ سمجھا کہ اس سے افضل چیز دیا گیا ہے تو اس نے چھوٹا سمجھا ایسی شے کو جس کو اللہ تعالیٰ نے معظم بنایا ہے۔

ف :۔ اس سے کس قدر عظمت قرآن پاک کی معلوم ہوئی۔ مگر افسوس دناءت وخساست ان لوگوں کی ہے کہ قرآن پاکر بھی دنیا کی حقیر اشیاء کو افضل سمجھتے ہیں اور اس کی تحصیل میں نہ قرآن پاک کی پروا کرتے ہیں اور نہ اس کے احکام کی۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو قرآن کے فیوض وبرکات سے کچھ حصہ ملا نہیں ہے اور ذرا بھی معرفت حاصل نہیں ہوئی ہے چونکہ ابتدا ہی سے نیت فاسد ہوتی ہے اور اللہ کی رضا مقصود ہوتی ہی نہیں۔ اسی لئے ان لوگوں کی بھی نہ کوئی عزت ہے اور نہ قدر و منزلت۔

(۲) وقال صلی الله علیه وسلم ما من شفیع افضل منزلة عند الله تعالیٰ من القرآن لا نبی ولا ملك ولا غیرہ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قرآن سے افضل از روئے مرتبہ کے کوئی دوسرا شفیع نہیں ہے۔ نہ نبی نہ فرشتہ اور نہ کوئی ان کے علاوہ۔

(احیاء العلوم)

ف :۔ اس حدیث شریف سے بھی قرآن پاک کی انتہائی عظمت وجلالت معلوم ہوئی کہ سب سے بڑا شفیع قرآن پاک ہے اور یہ اس لئے کہ کلام صفت ہے اللہ تعالیٰ کی لہٰذا اس کی شفاعت درحقیقت ارحم الراحمین ہی کی شفاعت ہے اس لئے سب سے بڑھ کر اسی کا مرتبہ ہوگا۔

(۳) وقال صلی الله علیه وسلم افضل عبادة امتی تلاوة القرآن۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کی سب سے افضل عبادت قرآن پاک کی تلاوت ہے۔

(احیاء العلوم)

ف:- اور رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ تو وہ تلاوت کلام اللہ کے علاوہ اذکار کے اعتبار سے ہے۔ پس کلام اللہ کی تلاوت کی فضیلت حقیقی ہے اور کلمہ طیبہ کی اضافی چنانچہ علامہ نووی التبیان میں تحریر فرماتے ہیں کہ

واعلم ان مذھب الصحیح المختار الذی علیہ من یعتمد من العلماء ان قراءۃ القرآن افضل من التسبیح والتھلیل وغیرھما من الاذکار۔ فقد تظاھرت الادلۃ علی ذلک واللہ اعلم

جان لو کہ مذہب صحیح اور مختار جس پر علماء اعتماد کرتے ہیں یہ ہے کہ قرات قرآن تسبیح تہلیل اور اس کے علاوہ جملہ اذکار سے افضل ہے اور اس پر دلائل بکثرت وارد ہیں جو ایک دوسرے کو تقویت پہونچا رہے ہیں

---

(۴) وقال صلی اللہ علیہ وسلم ایضاً ان اللہ عز وجل قرأ طٰہٰ ویٰسین قبل ان یخلق الخلق بالف عام فلما سمعت الملائکۃ القرآن قالت طوبیٰ لامۃ ینزل علیھم ھذا وطوبیٰ لاجواف تحمل ھذا وطوبیٰ لالسنۃ تنطق بھذا

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے ایک ہزار سال پہلے (سورہ) طٰہٰ ویٰسین کی قراءت فرمائی جب فرشتوں نے قرآن سنا تو کہا مبارکباد ہو اس امت کیلئے جس پر یہ کلام نازل ہوگا۔ اور خوشخبری ہے ان زبانوں کے لئے جو اس کے ساتھ ناطق ہوں گی۔

---

(۵) وقال صلی اللہ علیہ وسلم خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کا بہترین وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور سکھلایا

(۶) عن ابی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یقول اللہ سبحانہ تعالیٰ من شغلہ القرآن وذکری عن مسألتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین وفضل کلام اللہ سبحانہ وتعالیٰ علی سائر الکلام کفضل اللہ علی خلقہ رواہ الترمذی وقال حدیث حسن

حضرت ابوسعید خدری حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ جس شخص کو قرآن (کی قراءت) اور میرے ذکر نے مجھ سے سوال کرنے سے باز رکھا تو میں اس کو ایسی چیز دوں گا جو افضل ہوگی اس شی سے جو سائلین کو دیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے کلام کا فضل دوسرے کلام پر ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق پر فضل ہے۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے)

(۷) وعن ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنهما قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان الذی لیس فی جوفه شیء من القرآن کالبیت الخرب

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص جس کے قلب میں قرآن کا کوئی حصہ نہیں ہے وہ مثل ویران گھر کے ہے۔

(مشکوٰۃ)

صاحب مرقات اس کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ ویرانی اس لئے ہے کہ قلوب کی آبادی ایمان اور تلاوت قرآن کی وجہ سے ہوتی ہے اور باطن کی رونق اعتقادات حقہ اور اللہ تعالٰی کی نعمتوں میں تفکر کرنے سے ہوتی ہے اور قلب کا ان امور سے خالی ہونا ظاہر ہے کہ ویرانی و بے رونقی ہے۔

(۸) عن معاذ ابن انس رضی اللہ تعالٰی عنه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال من قرأ القرآن وعمل بما فیه البس الله والدیه تاجا یوم القیامة ضوءه احسن من ضوء الشمس فی بیوت الدنیا فما ظنکم بالذی عمل بهذا

(رواه ابوداؤد)

حضرت معاذ ابن انس رضی اللہ تعالٰی عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا تو اللہ تعالٰی اس کے والدین کو قیامت کے دن ایسا تاج پہنائیں گے کہ اس کی روشنی اس دار دنیا کے آفتاب سے بہتر ہوگی (جب اسکے والدین کو ایسا تاج اور رتبہ ملیگا) تو تمہارا کیا خیال ہے اس شخص کے بارے میں جسنے قرآن پر عمل کیا (یعنی اسکو کتنا چمکدار تاج پہنایا جائیگا اور کیسا کچھ مرتبہ ملیگا)

(۹) عن عبد الله ابن مسعود رضی الله تعالٰی عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال اقرءوا القرآن فان الله تعالٰی لا یعذب قلبا وعی القرآن وان هذا القرآن مأدبة الله فمن دخل فیه فهو آمن۔ ومن احب القرآن فلیبشر۔

(التبیان)

عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالٰی عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن پڑھتے جاؤ اس لئے کہ اللہ تعالٰی اس قلب کو عذاب نہ دیں گے جس نے قرآن کو محفوظ کر لیا۔ (اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ) یہ قرآن اللہ تعالٰی کا خوان ہے جو شخص اس میں داخل ہوا پس وہ مامون ہے اور جسنے قرآن سے محبت کی تو چاہئے کہ بشارت حاصل کرے۔

(۱۰) عن عبد الله ابن عمر ابن العاص

حضرت عبد اللہ ابن عمر ابن العاص رضی اللہ تعالٰی عنہ

رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یقال لصاحب القرآن اقرأ وارتق ورتل کما کنت ترتل فی الدنیا فان منزلتک عند آخر آیۃ تقرأها۔

سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صاحب قرآن سے کہا جائیگا کہ قرآن پڑھتا جا اور چڑھتا جا اور ترتیل کے ساتھ پڑھ جیسا کہ تو ترتیل کے ساتھ دنیا میں پڑھتا تھا۔ اس لئے اور تمہارا مقام وہیں ہے جہاں آخری آیت پڑھ کر فارغ ہوگے۔

قال صاحب المرقاۃ (یقال لصاحب القرآن) ای من یلازمہ بالتلاوۃ والعمل لا من یقرأ وھو یلعنہ

(مرقات ص ۵۰۹ ج ۴)

صاحب مرقاۃ نے فرمایا کہ صاحب قرآن سے مراد وہ شخص ہے جو اسکی تلاوت برابر کرتا ہو اور اس پر عامل ہو نہ وہ شخص جو قرآن کو اس طور پر پڑھتا ہو کہ خود قرآن اس پر لعنت کرتا ہو۔

(۱۱) قال صلی اللہ علیہ وسلم اھل القرآن اھل اللہ وخاصتہ۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اہل قرآن اہل اللہ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے خواص ہیں۔

(احیاء العلوم)

ف:۔ دیکھئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ ارشاد فرمایا کہ اہل قرآن اللہ والے اور ان کے خواص ہیں مگر آپ اپنے اعتقاد کا جائزہ لیجئے۔ کیا آپ کا بھی یہی اعتقاد ہے؟ عام طور پر تو ولایت اور بزرگی کا ایک خاص نقشہ اذہان میں راسخ ہو گیا ہے اور ایک خاص قسم کے لوگوں کے ساتھ اس کو مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ علماء و اہل قرآن سے تو ولایت و بزرگی کا دور کا بھی واسطہ نہیں سمجھا جاتا علامہ نووی نے "التبیان" میں یہ روایت نقل کی ہے کہ

عن الامامین الجلیلین ابی حنیفۃ والشافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال ان لم یکن العلماء اولیاء فلیس للہ ولی

حضرت امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ اگر علماء (عاملین) ہی اولیاء اللہ نہیں ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کا کوئی ولی ہے ہی نہیں۔

(۱۲) عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یجیئ صاحب القرآن یوم القیامۃ فیقول یارب حلہ فیلبس تاج الکرامۃ ثم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کا پڑھنے والا قیامت کے روز آئیگا تو قرآن یوں کہے گا کہ اے پروردگار اسکو جوڑا پہنا دیجئے پس اسکو عزت کا

يقول يارب زده فيلبس حلة الكرامة ثم يقول يارب ارض عنه فيرضى عنه فيقال له اقرأ وارق ويزاد بكل آية حسنة، هذا حديث صحيح (ترمذی، صـ۱۱۵ ج ۲)

تاج پہنا دیا جائے گا۔ پھر کہے گا اے پروردگار اور زیادہ پہنا دیجئے پس اسکو عزت کا جوڑا پہنا دیا جائیگا۔ پھر کہے گا اے پروردگار اس سے خوش ہوجایئے پس اس سے اللہ تعالیٰ خوش ہوجائینگے۔ پھر اس سے کہا جائیگا کہ قرآن پڑھتا جا اور چڑھتا جاؤ ہر آیت کے بدلے ایک نیکی بڑھتی جائے گی۔

ف :- اس حدیث شریف سے قرآن کی کتنی زبردست شفاعت اپنے قراءت کرنے والے کی معلوم ہوتی ہے۔ (اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا شَفَاعَتَهٗ يوم القيامة)

(۱۳) وقال صلى الله عليه وسلم لله اشد اذنا الى قارى القرآن من صاحب القنيه الى قنيته۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ البتہ اللہ تعالیٰ قاری قرآن کی طرف کان لگاتے ہیں اس شخص سے بھی زیادہ جو اپنی گانے والی عورت کیطرف کان لگاتا ہے

ف :- ہر متکلم کو اپنے کلام کی طرف دوسروں کی رغبت و توجہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک شخص کو دیکھا کہ جہاد اکبر لوگوں کو سنا رہے ہیں۔ اور سمجھا رہے ہیں تو اس سے بہت خوش ہوئے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو اپنے کلام کی تلاوت اور اس کی طرف توجہ و رغبت کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔

(۱۴) قال صلى الله عليه وسلم القرآن هو الدواء۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن دوا ہے۔

(الجامع الصغیر)

فیض القدیر جو الجامع الصغیر کی نہایت عمدہ اور معتبر شرح ہے اس سے اس حدیث کی بقدر ضرورت شرح لکھتا ہوں۔

(القرآن هو الدواء) اى من الامراض الروحانية كالاعتقادات الفاسدة فى الالهيات والنبوة والمعاد وكالاخلاق المذمومة ففيه اوضح بيان لانواعها وحث على اجتنابها۔

(قرآن دوا ہے) امراض روحانیہ کیلئے مثلاً الہیات و نبوت اور معاد کے بارے میں فاسد اعتقادات اور جیسے اخلاق مذمومہ اور اس قرآن میں امراض روحانیہ کے تمام اقسام کا واضح بیان ہے۔ اور ان سے بچنے پر حث اور تحضیض ہے۔

ومن الامراض الجسمانية

اسی طرح سے یہ قرآن امراض جسمانیہ کی بھی دوا

بالتبرك لقراءة عليها لكن مع الاخلاص
وفراغ القلب من الاغيار واقباله
على الله بكليته وعدم تناول الحرام
وعدم آثام واستيلاء الغفلة على
القلب فقراءة من هذا حاله مبرئ
الامراض وان اعيت الاطباء و
لهذا قال بعض الائمة متى تخلف
الشفاء فهو اما لضعف تاثير الفاعل
او لعدم قبول المحل المنفعل. او
لمانع قوى يمنع تخلفه ان ينجع فيه
الدواء كما تكون في الادوية الحسية
شفاء لما في الصدور ونُنزل من
القرآن ما هو شفاء، قال الاكثر من
جنسية لا تبعيضية القرآن هو
الشفاء التام من جميع الادواء القلبية
والبدنية لكن لا يحسن التداوي الا
الا الموفقون ولله حكمة بالغة في اخفاء
سر التداوي به عن نفوس اكثر العالمين
كما له حكمة بالغة في اخفاء كنوز الارض
عنهم

(فیض القدیر ص۵۶۳ ج ۴)

ہے، بایں طور کہ اس کو پڑھ کر کے ان امراض پر دم کر دیا جائے اور اس سے برکت حاصل کی جائے لیکن شرط یہ ہے کہ اخلاص سے ہو یعنی اغیار سے دل خالی کر کے ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف پورے طور پر توجہ کے ساتھ ہو۔ حرام کا تناول اور معاصی میں ابتلاء اور قلب پر غفلت کا غلبہ نہ ہو جس شخص کا یہ حال ہوگا اس کی قرأت جملہ امراض سے شفا بخشنے والی ہے اگرچہ ان امراض کے علاج سے اطباء عاجز ہو چکے ہوں۔

اسی لئے بعض اماموں نے فرمایا ہے کہ جب کبھی شفا نہ ہو تو اسکی وجہ یا تو یہ ہوگی کہ فاعل کی تاثیر میں ضعف ہے یا خود تاثیر قبول کرنیوالے میں قبولیت کی صلاحیت مفقود ہے۔ یا پھر اور کوئی بڑا مانع ہے جسکی وجہ سے دوا اثر نہیں کر رہی ہے جیسا کہ حسی ادویہ میں ہوا کرتا ہے۔ یہ قرآن سینوں (کے امراض) کیلئے شفا ہے نیز اور ہم ایسی ایسی آیات نازل کر رہے ہیں جو شفا ہیں نیز اکثر علماء کہتے ہیں کہ اس آیت میں مِن کا لفظ تبعیضیہ نہیں ہے (یعنی یہ بعضیت کے معنی نہیں دیتا) بلکہ جنس کے معنی میں ہے (پس مطلب یہ ہوگا کہ) قرآن تمام امراض قلبیہ وجسمانیہ کیلئے کامل شفا ہے مگر قرآن سے علاج کرنا انھیں لوگوں کو راس آتا ہے جو موفق ہیں۔ اکثر اہل دنیا سے اس قرآن کے ذریعہ علاج کے راز کو مخفی کر دینے میں اللہ تعالیٰ کی بہت زبردست حکمت ہے جیسا کہ زمین کے خزانوں کو ان سے مخفی رکھنے میں حکمت بالغہ و کاملہ ہے۔

سبحان اللہ کیا خوب حدیث شریف ہے اور علامہ عبد الرؤف مناوی نے کیسی عمدہ شرح فرمائی کہ قرآن پاک کی تلاوت جملہ امراض قلبیہ وجسمانیہ کے لئے شفا دیتی ہے مگر جبکہ اخلاص سے ہو اغیار سے دل خالی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف پوری توجہ ہو۔ اگر آج اس طرح تلاوت کرنے کا اہتمام کیا جاوے تو دیکھئے کامیابی ہوتی ہے یا نہیں؟ احادیث میں جو وعدے ہیں وہ سب درست ہیں قصور ہمارا ہی ہے۔ ہمارے

ہی اعتقاد و اخلاص میں بہت کمی ہوگئی ہے اس لئے کچھ ملتا نہیں نعوذ باللہ من سوء الاعتقاد

(۵) عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الماھر بالقرآن مع السفرۃ الکرام البررۃ والذی یقرأ القرآن ویتعتع فیہ وھو علیہ شاق لہ اجران

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ماہر بالقرآن ہے وہ رسل و ملائکہ کے ساتھ ہوگا اور جو شخص قرآن اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور اسکو پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے۔

(مشکوٰۃ)

دیکھئے اس حدیث سے قرأت قرآن کی کیسی فضیلت ثابت ہوئی کہ اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور اس کو اس طرح پڑھنا دشوار معلوم ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ ایک اجر کے بجائے دو اجر عطا فرماتے ہیں اور جو تجوید کے ساتھ پڑھتا ہے اور اس کے علوم کا عالم ہے اس کا تو پوچھنا ہی کیا ہے وہ تو انبیاء مرسلین و ملائکہ مقربین کی سلک میں منسلک ہوگا۔ اور ان حضرات کے زمرہ میں محشور ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح حضرات انبیاء و ملائکہ علیہم الصلوٰۃ والسلام نے احکام الٰہیہ اور آیات قرآنیہ کو مؤمنین تک پہونچایا اسی طرح ماہر بالقرآن بھی کرتا ہے کہ اسمیں مہارت حاصل کرکے اور اسکی تلاوت کرکے دوسروں کو بھی مستفید کرتا ہے۔

ماہر بالقرآن کے متعلق علامہ طیبی وغیرہ سے صاحب مرقات نے بہت عمدہ کلام نقل فرمایا ہے اس کو بعینہٖ درج کرتا ہوں۔

(قال الطیبی وھوالکامل الحفظ الذی لا یتوقف فی القرأۃ ولا یشق علیہ قال الجعبری فی وصف ائمۃ القرأۃ کالماھر المتقن حفظ القرآن وادمن درسہ واحکم تجوید الفاظہ وعلم مبادیہ ومقاطعہ وضبط روایتہ وقراءتہ وفھم وجوہ اعرابہ ولغاتہ ووقف حقیقۃ اشتقاقہ وتصریفہ ورسخ فی ناسخہ ومنسوخہ واخذ حظاً وافراً

علامہ طیبی کہتے ہیں کہ ماہر اس کو کہتے ہیں جو حفظ میں کامل ہو اور قرأت میں رکتا اور اٹکتا نہ ہو۔ اور نہ یہ اس پر دشوار ہو (یعنی بے تکلف قرأت کرتا ہو) علامہ جعبری ائمہ قرأت کے وصف میں فرماتے ہیں کہ ماہر وہ شخص ہے جس نے حفظ کو نہایت مستحکم کرلیا اور اسکی تلاوت پر مداوم ہو اس کے الفاظ کی تجوید کو خوب درست کئے ہوئے ہو۔ اس کے مبادی و مقاطع کا علم رکھتا ہو (یعنی کہاں سے ابتدا ہو اور کہاں وقف کیا جائے ان سب کو بخوبی جانتا ہو) اسکی قرأت کی روایت سے واقف ہو وجوہ اعراب اور اختلاف لغات کو خوب سمجھتا ہو حقیقت

من تفسیرہ وتاویلہ وصان نقلہ عن الرای وتجافی عن مقائس العربیۃ وسعتہ السنۃ وجللہ الوقار وغمرہ الحیاء وکان عدلاً متیقظاً ورعاً معرضاً عن الدنیا مقبلاً الی الاخرۃ قریباً من اللہ فہو الامام الذی یرجع الیہ ویعول علیہ ویقتدی باقوالہ ویہتدی بافعالہ

(مرقاۃ ص۵۷۶ ج ۲)

(۱۶۱) عن ابی موسیٰ الاشعری عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال مثل الذی یقرأ القرآن کالاترجۃ طعمہا طیب وریحہا طیب۔ والذی لایقرأ القرآن کالتمرۃ طعمہا طیب ولاریح لہا۔ ومثل الفاجر (وفی روایۃ مثل المنافق) الذی یقرأ القرآن کمثل الریحانۃ ریحہا طیب وطعمہا مر۔ ومثل الفاجر (وفی روایۃ المنافق) الذی لایقرأ القرآن کمثل الحنظلۃ طعمہا مر ولاریح لہا وفی روایۃ المؤمن الذی یقرأ القرآن ویعمل بہ کالاترجۃ والمؤمن الذی لایقرأ القرآن ویعمل بہ کالتمرۃ۔ رواہ الشیخان وابوداؤد والترمذی والنسائی۔

اشتقاق اور کلمات کی تصریفات کو جانتا ہو اور اس کے ناسخ و منسوخ کا بھی خوب علم ہو، نیز آیات قرآنیہ کی تفسیر اور تاویل سے اسکو حظ وافر حاصل ہو، اسکی نقل رائے سے محفوظ ہو عربیت کے قیاسیات سے بعید ہو اور سنت اسکا احاطہ کئے ہوئے ہو، اور حیا کی چادر اور وقار کا جھول اسپر پڑا ہوا ہو۔ عادل ہو، متیقظ و بیدار مغز ہو اور پرہیزگار ہو، دنیا سے اعراض کرنیوالا ہو اور آخرت کیجانب توجہ کرنیوالا ہو۔ پس (جو ان صفات سے متصف ہو) وہ ایسا امام ہے کہ اسکی طرف رجوع اور اسپر اعتماد کیا جاتا ہے اور ایسے ہی شخص کے اقوال کی اقتدا اور اسکے افعال سے ہدایت حاصل کیجاتی ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس شخص کی مثال جو قرآن کی تلاوت کرتا ہے مانند نارنگی کے ہے جسکا مزہ بھی شیریں اور خوشبو بھی عمدہ ہے اور جو قرآن پاک کی تلاوت نہیں کرتا اسکی مثال تمرہ (چھوہارے) جیسی ہے کہ اس کا مزہ تو شیریں ہے مگر خوشبو اس میں مطلقاً نہیں۔ اور اس فاجر کی مثال (اور ایک روایت میں رو سے اس منافق کی مثال) جو قرآن شریف پڑھتا ہے مانند ریحانہ کے ہے کہ خوشبو اگرچہ اسمیں ہوتی ہے مگر مزہ نہایت کڑوا ہوتا ہے۔ اور اس فاجر کی مثال (اور ایک روایت کے اعتبار سے اس منافق کی) جو قرآن نہیں پڑھتا مانند حنظلہ (اندرائن) کے ہے جسکا مزہ بھی تلخ خوشبو بھی نہیں ہوتی۔ اور ایک روایت میں (جیسا کہ مشکوۃ میں ہے) کہ وہ مومن جو قرآن کی قراءت کرتا ہے اور اسپر عمل بھی کرتا ہے (اسکی مثال نارنگی جیسی ہے۔) اور جو مومن قراءت نہیں کرتا مگر اسکے احکام پر عمل کرتا ہے (تو اسکی مثال تمرہ کی ہے)

(الادب النبوی)

صاحب مرقات نے تحریر فرمایا ہے کہ اترج، والترجہ، ترنج، و ترنجہ :۔ مشہور پھل ہے (یعنی نارنگی) اور پھلوں میں عرب کے نزدیک یہ سب سے عمدہ پھل ہے اس لئے کہ اس کا ظاہری رنگ بھی نہایت خوشنما یعنی تیز زرد (تسر الناظرین) دیکھنے والوں کو سرور بخشتا ہے (اور یہ جو فرمایا کہ خوشبو بھی نہایت عمدہ اور مزہ بھی نہایت لطیف) تو ابن ملک کہتے ہیں کہ نارنگی کی خوبی اور عمدگی یہ ہے کہ منہ کو خوشبو دار کر دیتی ہے۔ معدہ میں صفائی پیدا کرتی ہے اور قوت ہاضمہ بڑھاتی ہے۔ ان فوائد کے علاوہ بھی بہت سے فوائد ہیں جو کتب طب میں مذکور ہیں۔

حدیث شریف کی شرح فرمانے کے بعد صاحب مرقاۃ تحریر فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ جس مکان میں نارنگی ہوتی ہے وہاں جن کا گذر نہیں ہوتا تو اس سے قاری قرآن کو نارنگی سے تشبیہ دینے کی حکمت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی جس طرح گھر میں نارنگی کے رہنے سے جن اس گھر میں نہیں ٹھہر سکتے اسی طرح جو قرات قرآن کرتا ہے اس کے قریب بھی جن وغیرہ نہیں جا سکتے اور جس گھر میں قرات قرآن ہوتی ہے اس میں بھی جنوں کا داخلہ نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ جس گھر میں قرآن پاک کی تلاوت کیجاتی ہے وہ گھر اس کے اہل پر وسیع ہو جاتا ہے اور خیر و برکت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ملائکہ اس گھر میں داخل ہو جاتے ہیں اور شیاطین نکل جاتے ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قرات کرنے اور نہ کرنے کے اعتبار سے پھلوں سے جو تشبیہ دی ہے وہ نہایت ہی بلیغ ہے ایسی کہ اس سے بہتر تشبیہ نہیں ہو سکتی اور نبی کے علاوہ کوئی ایسی تشبیہ و تمثیل پر قادر ہی نہیں ہو سکتا۔

اب سنئے :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث شریف میں تلاوت کے اعتبار سے انسانوں کے چار درجے قائم فرمائے ہیں۔

پہلا درجہ تو اس مومن باعمل کا ہے جو تلاوت کلام اللہ کرتا ہے اور اسکی قرات ظاہر سے بھی ہوتی ہے اور باطن سے بھی۔ یعنی یہ شخص لسان سے تو قراءت کرتا ہی ہے دل سے اس کے مضامین واحکام کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے کلام اللہ ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے۔ یہی اسکی باطنی تلاوت ہے اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ مومن کے لئے جس طرح ایک زبان منہ میں ہوتی ہے اسی طرح ایک زبان اس کے قلب میں بھی ہوتی ہے۔ اور اس کی یہ ظاہری لسان اسی قلبی لسان کی ترجمان ہوتی ہے۔ بخلاف منافق کے کہ اس کا قلب زبان پر ہوتا ہے (یعنی اس کے بس زبان ہی زبان

ہوتی ہے دل گویا ہوتا ہی نہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مومن قاری کی تشبیہ نارنگی سے دی ہے جس کا ظاہر بھی خوش رنگ اور خوشبو دار ہوتا ہے اور باطن بھی نہایت خوش ذائقہ۔ گویا اپنے مزے اور رنگ کے اعتبار سے خود کامل ہے اور اپنی خوشبو کا فیض چونکہ دوسروں کو بھی پہونچاتا ہے اس لئے مکمل ہے۔

دوسرا درجہ اس مؤمن عامل کا ہے جو تلاوت کلام اللہ نہیں کرتا تو اس کو حدیث شریف میں تمرہ سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی مزہ تو اس کا شیریں ہے مگر خوشبو اس میں کچھ نہیں۔ تمرہ سے مثال دینے میں اسکی مدح بھی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس کے ایک نقص کا بھی بیان ہے اس طور پر کہ اگرچہ اس نے اپنے باطن کو قرآن کے احکام پر عمل کر کے آراستہ کر رکھا ہے جس کی وجہ اس کو عمل کی حلاوت اور لذت تو نصیب ہے مگر تلاوت نہ کرنے کی وجہ سے قرآن شریف کی خوشبو سے وہ محروم ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مؤمن کی تشبیہ تمرہ سے دی کہ باطن کے اعتبار سے تو طیب ہے مگر خوشبو سے جو کہ تلاوت ہی سے ملا کرتی ہے خالی ہے۔

قاری قرآن میں خوشبو کا ہونا اور غیر قاری کا اس سے محروم رہنا بایں وجہ ہے کہ خوشبو تلاوت ہی کا اثر و برکت ہے اور اسی کا ثمرہ و نتیجہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو ثمرہ مخصوص کسی شئے کا ہوتا ہے وہ بدون اس شئے کے کیسے حاصل ہو سکتا ہے ؟ جو برکت جس عمل کی ہوگی ظاہر ہے کہ جب وہ عمل نہ کیا جائیگا تو وہ برکت کیسے نصیب ہوگی ؟

جیسے نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کے جو برکات ہیں وہ ان اعمال کے کرنے ہی سے حاصل ہوں گی اسی طرح تلاوت کے بھی برکات ہیں جو تلاوت کرنے والے ہی کو نصیب ہوتے ہیں اور وہ لوگ محسوس کرتے ہیں اس باب میں انھیں حضرات کا قول معتبر ہے سب کا نہیں۔ مَنْ لَمْ یَذُقْ لَمْ یَدْرِ

غرض جو مؤمن احکام قرآن پر تو عامل ہے مگر اس کی تلاوت کا تارک ہے تو وہ اس اعتبار سے بلاشبہ پہلے درجہ والے سے کم ہے اور اس نقص و کمی کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہلے درجہ والا شخص کامل تو ہے ہی مکمل بھی ہے۔ اور دوسرے درجہ والا کامل تو ہے مگر مکمل نہیں اور اسکی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی مشک کا ڈبہ ہو مگر اس پر ڈاٹ خوب مضبوط لگی ہو مہر بند ہو تو وہ خوشبو کی چیز سے تو لبریز ہے مگر منہ کے بند ہونے کی وجہ سے دوسروں کو اس خوشبو نہیں پہونچتی بخلاف اس مومن عامل کے جو کہ قاری قرآن بھی ہے کہ اس کی مثال اس ڈبہ جیسی ہے جو مشک سے بھرا ہو اور منہ بھی اس کا کھلا ہوا ہو جس کی وجہ سے اسکی خوشبو پھوٹتی ہو اور دوسروں

تک پہونچتی ہو. چنانچہ حدیث شریف میں ایسے دو شخصوں کی یہی مثال آئی ہے ہم یہاں وہ حدیث اور اس کی شرح مرقاۃ سے نقل کرتے ہیں

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم تعلموا القرآن فاقرأوه فان مثل القرآن لمن تعلم فقرأ وقام به کمثل جراب محشو مسکاً تفوح ریحه کل مکان ومثل من تعلمه فرقد وهو فی جوفه کمثل جراب اوکی علی مسك	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن سیکھو اور اسکی تلاوت کرو اس لئے کہ قرآن کی مثال اس شخص کے اعتبار سے جو اس کو سیکھے اور نماز میں اسکو پڑھے اور اس پر عمل کرے ایسی ہے جیسے کوئی مشکیزہ مشک سے پُر ہو جس سے اس کی خوشبو نکل نکل کر تمام جگہ کو معطر کر رہی ہو. اور اس شخص کی مثال جس نے قرآن سیکھا تو ہے مگر اپنے سینہ میں لیکر اسکو سو رہا (یعنی اسکی تلاوت دن و رات کے اوقات میں نہ کی) ایسی ہے جیسے مشک سے بھرا تھیلا ہو اور اوپر سے باندھ دیا گیا ہو (ظاہر ہے کہ اسکی خوشبو باہر کیسے پھیل سکتی ہے؟
(مرقات)	

اس قول کی وضاحت فرماتے ہوئے علامہ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ :-

من قرأ یصل برکته منه الی بیته والی السامعین ویحصل استراحة والی حیث یصل صوته فهو کجراب مملو من المسك اذا فتح راسه تصل رائحته الی کل مکان حوله. ومن تعلم القرآن ولم یقرأ لم یصل برکته منه لا الی نفسه ولا الی غیره فیکون کجراب مشدود راسه فیه مسك فلا یصل رائحته منه الی احدٍ.	مطلب یہ ہے کہ جو شخص قرآن کی قرأت کرتا ہے اسکی برکت قاری سے متجاوز ہو کر اس کے گھر اور سامعین کو پہونچتی ہے اور جہاں تک اسکی آواز جاتی ہے اس سے استراحت اور ثواب حاصل ہوتا ہے. پس وہ اس مشکیزہ کے مثل ہے جو کہ مشک سے بھرا ہوا ہو کہ جب اس کا منہ کھولا جاتا ہے تو اس کی خوشبو ارد گرد تمام پہونچتی ہے اور جس نے کہ قرآن سیکھا اور قراءت نہ کی اسکی برکت نہ تو اس کے نفس کو پہونچتی ہے اور نہ ہی اس کے غیر کو. وہ مثل بند مشکیزے کے ہے جسمیں مشک ہو کہ اسکی خوشبو سے کوئی منتفع نہیں ہو پاتا.

(مرقاۃ صـ ۵۹۹ جـ ۲)

دیکھئے کس قدر وضاحت کے ساتھ ان دونوں کا فرق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ذہن نشین فرمایا کہ قرآن کو مشک سے تشبیہ دی اور مؤمن کو اس ڈبہ اور مشکیزہ سے جو مشک سے پُر ہو اور اس کی قراءت کو مشک والے مشکیزہ کے منہ کھلنے سے تشبیہ دی. اور یہ بھی

فرمایا کہ تلاوت جو کرے گا تو اس کی برکتیں خود اس کو بھی ملیں گی اور دوسرے بھی اس سے فیضیاب ہوں گے۔ اور اگر نہ کرے گا تو خود بھی خوشبو سے محروم رہے گا اور دوسروں کو بھی محروم رکھے گا۔ اور میں شک نہیں کہ قاری جب تلاوت کرتا ہے تو خود بھی محظوظ ہوتا ہے اور دوسرے سننے والے کو بھی بے خود بنا دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے ہیں ؎

نغمۂ سرمدی سنا کے ہمیں مست و بیخود بنا دیا کس نے

بلاشبہ کلام اللہ نغمۂ سرمدی ہی ہے اور اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں کی وجہ سے اس کا مصداق ہے کہ ؎

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را ببوار باب معنی را

اور جیسا کہ کسی شاعر نے اپنے ممدوح کے متعلق کہا ہے کہ ؎

کانکم شجر الاترج طاب معاً حملاً و نوراً وطاب العود والورق

یعنی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نارنگی کے درخت ہو جو سرتاپا اچھا ہی اچھا ہے کہ پھل بھی اس کا خوبصورت کلیاں بھی اس کی بارونق، حتیٰ کہ لکڑی اور پتے بھی اس کے نہایت ہی حسین ہوتے ہیں۔ اسی طرح کلام پاک کے الفاظ، اس کے معانی و نقوش سبھی دل کے لئے جاذب اور لبھانے والے ہیں اس کے نقوش کو دیکھنے ہی سے دل میں نور و سرور پیدا ہوتا ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

بہرحال مذکورہ بالا بیان سے یہ معلوم ہوا کہ تلاوت کا شریعت میں ایک بڑا رتبہ اور یہ مومن کی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ خوب سمجھ لیجئے۔

اب میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی حدیث کی شرح ایک مصری عالم مولانا عبدالعزیز خولیؒ کی کتاب الادب النبوی سے نقل کرتا ہوں تاکہ مزید علم و بصیرت کا موجب ہو۔ وھو ھذا

ولقد مثل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذ الحدیث لاربعۃ اصناف من الناس لھم صلۃ بالقرآن وباعتبارہ کتاباً ینتمون الیہ یؤمنون بہ ولو ایماناً ظاھراً فاولھم شخص او فریق ملأ الایمان قلبہ و فاض علیٰ جوارحہ	جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ان چار قسم کے لوگوں کی مثالیں بیان فرمائی ہیں جن کا تعلق قرآن شریف سے ہے اور جو اس کتاب کو مانتے ہیں اور اسکی وجہ سے اسکی جانب منسوب کئے جاتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں اگرچہ ظاہری طور پر سہی۔ انہیں سے پہلا وہ شخص یا جماعت ہے جس کا قلب ایمان سے لبریز ہو یہانتک کہ اس کا فیضان جوارح

فهو بالله موقن وبرسوله مؤمن
وبكتابه مصدق وبدينه عامل
جعل لنفسه حظاً من القرآن يتلوه
آناء الليل في تهجده ومضجعه او
جالساً على فراشه او مكتبه . ويتلوه
في ساعات النهار قائماً وقاعداً
وراكعاً وساجداً كلما سنحت له فرصة
لقرأته انتهزها حتى لا يغفل قلبه
عن ذكر الله فتخطفه الشياطين
وتضله عن سواء السبيل وليست
قرأته من طرف لسانه وشفته
وشدقه وحنجرته بل قلبه الذي
يقرأ ولبه الذي يردد ولذلك
اثمرت الخشية والهداية وانتجت
العمل والاستقامة فهذا مثله
الرسول صلى الله عليه وسلم
بالاترجة ذات الطعم اللذيذ
والرائحة الطيبة فان بلوته و
اختبرته وعاشرته وعاملته
لم تجد الا امرأً وفياً براً تقياً
يقدس الحق تقديساً ويشناء الباطل
مشناءً وان شممته فرائحته طيبة
ذكية عبقة تحي القلوب وتنعش
النفوس وتزكي العقول وكيف لايكون
كذالك وهي نفحة القرآن ومسكه الذي

پر بھی ہوگیا ہو (یعنی اندر سے باہر بھی آگیا ہو) پس وہ اللہ
تعالیٰ پر یقین رکھتا ہے اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے، اسکی
کتاب کی تصدیق کرتا ہے اور اسکے دین پر عامل ہے اس نے
اپنے لئے قرآن شریف سے بھی ایک حصہ مقرر کرلیا ہے جسکو اپنے
تہجد میں رات کی ساعات میں تلاوت کرتا ہے۔ یا خوابگاہ میں پڑھا
کرتا ہے۔ گھر پر مدرسہ میں بیٹھے بیٹھے پڑھا کرتا ہے نیز اسکو دن کے
اوقات میں بھی کھڑے بیٹھے اور رکوع وسجدہ کی حالت میں
غرضکہ جب اس کو موقع ملتا ہے اسکی تلاوت کو غنیمت شمار
کرتا ہے تاکہ اس کا قلب اللہ کے ذکر سے غافل نہ ہونے پائے
کہ شیاطین اسکو اچک لیں اور سیدھی راہ سے گمراہ کردیں پھر
یہ کہ اسکی یہ قرأت محض زبان کے کنارہ اور ہونٹوں اور جبڑوں
اور صرف حلق ہی سے نہیں ہوتی بلکہ اس کا قلب پڑھتا ہے اور
اسکی عقل اس کا تکرار کرتی ہے اس لئے وہ خشیت اور ہدایت
کی مثمر اور عمل اور استقامت کی منتج (نتیجہ دینے والی) ہوتی ہے
یہی وہ قراءت ہے جس کی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے نارنگی سے دی ہے جو کہ مزہ میں لذیذ اور خوشبو میں نہایت
نفیس ہوتی ہے۔ اگر تم اس شخص کو (جو ایسی تلاوت کرتا ہے) آزماؤ
اور اس کے ساتھ معاشرت رکھو اور معاملہ کرو تو اس
کو ایک مرد وفاشعار نیک ومتقی اور حق کو حق اور باطل
کو باطل سمجھنے والا پاؤگے اور سونگھو گے تو نہایت عمدہ
اور بہترین خوشبو والا پاؤ گے (ایسی خوشبو) جو کہ قلب کو
زندہ کردے اور نفوس کو حیات بخشے اور عقول
کو ذکی بنادے۔ اور کیوں نہ ہو یہ ہے بھی تو قرآن
کریم کی خوشبو اور اس کا وہ مشک جو ایسے شخص
کی زبان سے نکلا ہے جو تر اور معطر ہے اور اس کے

انبعث من لسانه الرطب المعطر وقلبه الحي المطهر

ایسے قلب سے جو زندہ اور مطہر ہے۔

وثانيهم شخص او فريق بالقرآن مومن وباحكامه عامل وبارشاده مهتد وباخلاقه متخلق ولكن لم يؤت القرآن تلاوة وحفظا وان اوتيه تطبيقا وعملا فهذا كالتمرة حلو الطعم لذيذة طيب الخلق جميلة صادق النية حسن الطوية اما الرائحة فمفقودة اذ لم يتطيب بمسك القرآن وان غسل قلبه بماء السلسبيل ومثله في عمله الجميل

دوسرا انہیں سے وہ شخص یا فریق ہے جو قرآن شریف پر ایمان بھی رکھتا ہے اور اس کے احکام پر عامل بھی ہے اور اس کی رہنمائی سے ہدایت یافتہ بھی ہے اور اسکے اخلاق سے متخلق بھی ہے لیکن نہ تو قرآن کی تلاوت اُسے نصیب ہے اور نہ اس کا حفظ ہی اسکو نصیب ہے (یعنی نہ تو قرآن ہی اس کو حفظ ہے اور نہ وہ اسکی تلاوت ہی کرتا ہے) اگرچہ اسکی آیت کی تطبیق اور اسپر عمل کرنا اسکو نصیب ہے (یعنی اسکو اس امر کی توفیق حاصل ہے کہ وہ اپنے جمیع احوال کو قرآن کریم سے مطابق کئے ہوئے ہے یعنی اپنے عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق سب چیزوں کو قرآن شریف کی تعلیم کے مطابق اور موافق رکھتا ہے اسطرح پر گویا اس کا پورا عامل ہے) پس یہ شخص تو مزے میں مثل تمرہ (چھوہارے) کے ہے کہ شیریں اور لذیذ ہے نہایت پاکیزہ اور عمدہ اخلاق والا ہے صادق النیۃ اور باطن کا نہایت اچھا ہے مگر خوشبو اسکے اندر مطلقاً نہیں ہے یہ اسلئے کہ قرآن کی خوشبو (یعنی تلاوت) کے ساتھ وہ معطر نہیں ہوا۔ اگرچہ اس نے اپنے قلب کو قرآن کے ماء سلسبیل سے دھویا ہے اور اسکو اپنے عمل جمیل میں اس کو معمول بھی بنالیا ہے

وثالثهم فاجر او منافق ليس له من الايمان الا اسمه ولا من الدين الا رسمه يقرأ القرآن وقد يجيد حفظه ويتقن طرقه ويعرف قراءته وتوقيع الفاظه ونغماته ولكن لا تجاوز التلاوة حنجرته ولا تعد وترقوته فان بلوته

تیسرا انہیں سے وہ فاجر یا منافق ہے جسمیں ایمان کا صرف نام ہی نام ہے دینی امور سے سوائے رسوم کے اسکے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے اسکو خوب پختہ یاد کئے ہوئے ہے اور جملہ طرق کی مشق کئے ہوئے ہے اور اسکی قراتوں سے واقف ہے اسکے الفاظ کی توقیع یعنی خوب جما کر پڑھنے کو اور اسکے لہجوں کو بخوبی جانتا ہے مگر تلاوت اسکے گلے اور حلق کے

تكشف لك عن قلب اسود وفؤاد مظلم وخلق مر وعمل ضر وهذا مثله الرسول صلى الله عليه وسلم بالريحانة وان شممت فرائحة ذكية وان ذقت فمرارته لذاعة كذلك هذا يقرأ القرآن فتستريح له النفوس كما تستريح للروائح العطرة ولكن قلبه ونفسه منطويان على السوء تذوق مرارته وتحس تذاذته ان عاشرته وعاملته ومثل هذا لا اثر للقرآن في نفسه لان فجوره ونفاقه ختم على قلبه تؤثر فيه نصيحة ولا تنجح معه موعظة۔

نیچے نہیں اترتی۔ اگر تم اس کا امتحان لو تو تم کو سیاہ دل تاریک قلب بُرے اخلاق، موذی اعمال ظاہر ہوں گے اس کی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریحانہ سے دی ہے جو نہایت عمدہ خوشبو والی اور چکھو تو ایسی کڑواہٹ جس سے زبان ہی اینٹھ جائے۔ اسی طرح یہ شخص ہے کہ قرآن پڑھتا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو لطف تو حاصل ہوتا ہے جس طرح سے کہ عمدہ خوشبو سے راحت ملتی ہے لیکن اس کا قلب اور نفس دونوں برائیوں میں لپٹے ہوئے ہیں جس کی کڑواہٹ تم اس سے معاملہ کرنے یا معاشرت رکھنے پر چکھ سکتے ہو۔ اور اس جیسے شخص کے نفس میں قرآن کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اس کا فسق و نفاق اس کے قلب پر مہر لگا دیتا ہے پس نہ تو کوئی نصیحت کارگر ہوتی ہے اور نہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی وعظ ہی نافع ہوتا ہے۔

ورابعهم منافق او فاجر لا صلة له بالقرآن لا علماً ولا عملاً ولا تلاوة وحفظاً وهذا شبهه الرسول صلى الله عليه وسلم بالحنظلة لا ريح لها وطعمها مر بشع كذالك هذا يحمل نفسا خلقت من الفجور ونبتت في النفاق ان تذوقها الناس آذت السنتهم ودنست نفوسهم ولا يشم منه خير اذ حرم من طيب الطيوب وعطر العطور كتاب الله جلاء العيون وشرح الصدور وحيات النفوس

اور چوتھا وہ شخص منافق یا فاجر ہے جس کا تعلق قرآن شریف سے مطلقاً نہ ہو۔ نہ علماً نہ عملاً نہ تلاوۃً نہ حفظاً۔ اس شخص کی تشبیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنظل سے دی ہے کہ نہ تو اس میں خوشبو ہے اور مزا بھی اس کا نہایت بھکٹا ہوتا ہے۔ یہی حال اس شخص کا ہے کہ یہ ایک ایسا نفس رکھتا ہے جو فسق و فجور کا مجسمہ ہے اور نفاق میں بڑھا اور پلا ہے۔ اگر لوگ اسکو چکھیں تو انکی زبانیں تکلیف محسوس کریں، ان کے نفوس خراب ہو جائیں اس سے کسی قسم کی بھلائی نہیں دیکھی اور سونگھی جا سکتی ہے اس لئے کہ سب خوشبوؤں سے بڑھکر جو خوشبو ہے اور سارے عطروں کا جو عطر ہے یہ شخص اسی سے محروم ہے (یعنی اللہ تعالی کی کتاب جو آنکھوں کی روشنی اور

وطیب القلوب وشنف الآذان وسراج الالباب تلک هی الاصناف الاربعة التی تعرض لها الرسول صلی اللہ علیه وسلم بالبیان والتمثیل فیا تری فی ایها وضعت نفسک ظنی ان تکون المؤمن المخلص والقاری المتدبر العامل الورع (الادب النبوی ص ۲۴۳)

سینوں کا انشراح نفوس کی حیات قلوب کی تازگی کانوں کا زیور اور عقول کا چراغ ہے۔ یہی کل چار قسمیں ہیں جن کے بیان اور تمثیل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعرض فرمایا ہے۔ پس اے مخاطب کاش تم دیکھتے کہ تم نے اپنے کو ان چاروں صنفوں میں سے کس میں داخل کیا ہے میرا تو یہ خیال ہے کہ تم مومن مخلص قاری متدبر اور عامل پرہیزگار ہوگے۔

(الآثار الواردة فی فضل القرآن واهله)

یعنی وہ آثار جو قرآن اور اہل قرآن کے فضل میں وارد ہیں

(۱) قال ابوامامة الباهلی اقرأوا القرآن ولا تغرنکم هذه المصاحف المعلقة فان اللہ لا یعذب قلبا هو وعاء القرآن۔

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن پاک کی قراءت کیا کرو یہ مصاحف جو معلق ہیں تم کو ہرگز دھوکہ میں نہ ڈالیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس قلب کو عذاب نہ دیں گے جو کہ قرآن کا ظرف ہوگا۔

(۲) وقال ابن مسعودؓ اذا اردتم العلم فاثروا القرآن فان فیه علم الاولین والآخرین۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تم علم حاصل کرنے کا ارادہ کرو تو قرآن پاک کا نشر کرو۔ اس لئے کہ اس میں اولین وآخرین سب کا علم ہے۔ تلاوت ۱۲

(۳) وقال ایضا لا یسأل احدکم عن نفسه الا القرآن فان کان یحب القرآن ویعجبه فهو یحب اللہ سبحانه ورسوله صلی اللہ علیه وسلم وان کان یبغض القرآن فهو یبغض اللہ سبحانه ورسول اللہ۔

نیز فرمایا کہ تم میں کا کوئی اپنے نفس سے سوائے قرآن کے اور کسی چیز کا سوال نہ کرے۔ پس اگر قرآن سے محبت کرتا ہے اور اس کو پسند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے۔ اور اگر قرآن کو مبغوض رکھتا ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بغض رکھتا ہے۔

(۴) وقال عمرو بن العاص رض كل آية في القرآن درجة في الجنة ومصباح في بيوتكم

حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے فرمایا کہ قرآن کی ہر آیت کا جنت میں ایک درجہ ہے اور وہ تمہارے گھروں میں گویا ایک چراغ ہے

(احیاء العلوم)

(۵) وقال ایضاً من قرأ القرآن فقد ادرجت النبوة بين جنبيه الا انه لا يوحى اليه ۔

(احیاء العلوم)

نیز فرمایا کہ جس نے قرآن کی قراءت کی اس نے اپنے دونوں پہلوؤں کے درمیان نبوت کو داخل کر لیا مگر یہ کہ اسکی طرف وحی نہیں آئیگی اس لئے کہ اسکا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے ۔

(۶) وقال ابوهريرة ان البيت الذى يتلى فيه القرآن اتسع باهله وكثر خيره وحضرته الملائكة وخرجت منه الشياطين وان البيت الذى لا يتلى فيه كتاب الله عز وجل ضاق باهله وقل خيره وخرجت منه الملائكة وحضرته الشياطين

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس گھر میں قرآن پاک کی تلاوت کیجاتی ہے وہ گھر اس کے اہل پر وسیع ہوجاتا ہے اسمیں خیر کثیر ہوجاتا ہے اور فرشتے داخل ہوتے ہیں اور شیاطین نکل جاتے ہیں ۔ اور وہ گھر جسمیں کتاب اللہ کی تلاوت نہیں کیجاتی ہے تو وہ اپنے اہل پر تنگ ہوجاتا ہے اور خیر کم ہوجاتا ہے ۔ ملائکہ نکل جاتے ہیں اور شیاطین کی کی آمد و رفت ہوجاتی ہے ۔

(احیاء العلوم)

ف :- آج عام طور پر لوگ آسیب وجنات کی شکایت کرتے ہیں ۔ روزانہ خطوط آتے ہیں کہ فلاں کو آسیب لگا ہے اور فلاں پر جن سوار ہے اور ہمارے گھروں پر شیاطین کا تسلط ہے ۔ پریشان ہیں مگر ان تعلیمات کی طرف توجہ نہیں کرتے کہ جس گھر میں تلاوت کلام اللہ ہوتی ہے اسمیں شیاطین کا گذر نہیں ہوسکتا گھر میں وسعت وخیر وبرکت ہوتی ہے ۔ جانتے ہیں ؟ یہ لوگ کیوں تعلیمات کو نہیں لیتے وجہ یہ ہے کہ بڑے ہوشیار لوگ ہیں سمجھتے ہیں کہ یہ سب کرنے میں محنت ومشقت برداشت کرنی ہوگی ۔ تقویٰ وطہارت کا اہتمام کرنا ہوگا ۔ کون ان سب امور میں مشغول ہو ۔ لاؤ پیر سے تعویذ لے لو وہی سب کام بنادے گی ۔ یہ لوگ پیر اس لئے نہیں بناتے ہیں کہ دین سیکھیں اور اللہ تعالیٰ کا طریق معلوم کریں اور احکام الٰہیہ پر عمل کریں بلکہ اس لئے اسکے دنیوی امور میں ہماری مدد کریں آسیب اتاریں ۔ جنات نکالیں ۔ نیز اور جس کام میں عاجز ہوتے ہیں تو وہ سب پیر صاحب کریں ۔ جب میں نے یہ دیکھا تو اب لکھ دیتا ہوں کہ میں تعویذ گنڈہ نہیں جانتا کسی دوسرے کے

میاں رجوع کرو۔ یہ اس لئے کرتا ہوں کہ جب یہ لوگ بد اعتقاد ہو گئے۔ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو نہیں مانتے تو پھر ان کی رعایت ہمارے ذمہ لازم نہیں رہی۔ یہ جب خدا کے اور رسول کے نہیں تو ہم کو ان سے کیا واسطہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کا اتباع کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں پھر جب کوئی مصیبت آئے تو ہم دل وجان سے شریک ہیں اور جو بھی ممکن صورت سہولت کی ہوگی ہم اختیار کریں گے تاکہ پریشانی دور ہو۔

(۷) وقال احمد ابن حنبل رأيت الله في المنام فقلت يارب ما افضل ما تقرب به المتقربون اليك قال بكلامي يا احمد قال قلت يارب بفهم او بغير فهم قال بفهم او بغير فهم۔

حضرت امام احمد ابن حنبلؒ نے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا عرض کیا کہ یارب جن چیزوں سے مقربین نے آپ کا قرب حاصل کیا ہے۔ انمیں سب سے افضل کونسی چیز ہے ارشاد فرمایا کہ اے احمد وہ میرا کلام ہے۔ میں نے کہا سمجھ کر یا بلا سمجھے تو فرمایا کہ سمجھ کر ہو یا بلا سمجھے۔

(۸) قال محمد بن كعب القرظي اذا سمع الناس القرآن من الله عزوجل يوم القيامة فكانهم لم يسمعوه فقط

محمد ابن کعب قرظیؒ نے فرمایا کہ جب لوگ اللہ تعالیٰ سے قرآن کو قیامت کے روز سنیں گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا قرآن پاک کو کبھی سنا ہی نہیں تھا

(۹) قال الفضيل بن عياض ينبغي لحامل القرآن ان لا يكون له الى احد حاجة ولا الى الخلفاء فمن دونهم فينبغي ان تكون حوائج الخلق اليه۔

حضرت فضیل ابن عیاض نے فرمایا کہ حامل قرآن کے لئے مناسب ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ نہ تو خلفاء کا اور نہ ان کے غیر کا بلکہ ہونا تو یہ چاہئے کہ لوگوں کی ضروریات خود حامل قرآن کے ساتھ متعلق ہوں۔

(۱۰) وقال ايضاً حامل القرآن حامل راية الاسلام فلا ينبغي ان يلهو مع من يلهو ولا يسهو مع من يسهو ولا يلغو مع من يلغو تعظيما لحق القرآن۔

اور حضرت فضیل ابن عیاض ہی نے یہ بھی فرمایا کہ قرآن کا حامل اسلام کا علمبردار ہے اسکے لئے حق قرآن کی تعظیم کی وجہ سے کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ لہو ولعب کرنیوالوں کے ساتھ لہو ولعب میں مشغول ہوں سہو (غفلت) کرنیوالوں کے ساتھ وہ بھی سہو کرے اور جن لغویات میں مشغول ہیں وہ بھی مشغول ہو۔

(۱۱) وقال سفيان الثوري اذا قرأ الرجل القرآن قبله الملك بين عينيه

حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ جب آدمی قرأت قرآن کرتا ہے تو فرشتے اسکے دونوں آنکھوں کے درمیان (پیشانی کو) بوسہ دیتے ہیں۔

(۱۲) وقال عمر ابن میمون رح من نشر مصحفا حین یصلی الصبح فقرأ منه مائة آية رفع الله عزوجل له عمل جمیع اهل الدنیا۔

حضرت عمر ابن میمونؒ نے فرمایا کہ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد جو شخص نے قرآن پاک کھولا اور سنو آیت کی تلاوت کی تو تمام اہل دنیا کے عمل کے برابر اللہ تعالیٰ اس کے لئے عمل کو رفع فرمائیں گے۔

(۱۳) یروی ان خالد ابن عقبة جاء الی رسول الله صلی الله علیه وسلم وقال اقرأ علیّ القرآن فقرأ علیه (ان الله یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ الآیة) فقال له اعد فاعاد. فقال له والله ان له حلاوة وان علیه لطلاوة وان اسفله لمورق وان اعلاه لمثمر وما یقول هذا بشر۔

(احیاء العلوم)

مروی ہے کہ خالد ابن عقبہ رضؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ مجھ پر قرآن کی تلاوت کیجئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی الآیۃ) پوری آیت کو پڑھا تو خالد ابن عقبہ نے کہا کہ پھر اس کو پڑھ دیجئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ قرأت فرمادی حضرت خالد نے سن کر کہا کہ بیشک اس کے لئے بڑی مٹھاس ہے اور اس کا نچلا حصہ پتوں والا اور اوپر کا حصہ پھلدار ہے۔ اور اس کا کلام کو کوئی بشر نہیں کہہ سکتا۔

ف:۔ دیکھئے خالد ابن عقبہ کیسا ذوق رکھتے تھے کہ ایک ایک آیت کو سنکر یہ فیصلہ کر دیا کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہوسکتا۔ اور کوئی بشر قادر نہیں ہے کہ ایسا کلام کر سکے بیشک یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

(۱۴) وقال القاسم ابن عبد الرحمٰن قلت لبعض النساك ما ههنا احد تستانس به فمد یده الی المصحف و وضعه علی حجره وقال هذا

قاسم ابن عبد الرحمٰن نے کہا کہ میں نے ایک عابد سے کہا کہ یہاں کوئی ایسا نہیں ہے جس سے آپ انس حاصل کریں تو انھوں نے اپنا ہاتھ قرآن پاک کی جانب بڑھادیا اور اپنی گود میں اسکو رکھ کر فرمایا کہ (میرا مونس تو) یہ ہے جس سے انس حاصل کرتا ہوں)

ف:۔ سبحان اللہ کیا عمدہ جواب دیا۔ قاری قرآن خدا سے ہمکلام ہوتا ہے اور رب العالمین سے مناجات کرتا ہے تو پھر اس سے بڑھ کر انس کی کیا چیز ہو سکتی ہے۔

(۱۵) وقال علی ابن طالب رضی الله عنه ثلاث یزدن فی الحفظ ویذهبن البلغم۔ السواك۔ والصیام وقرأة القرآن

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو حفظ کو زیادہ کرتی ہیں اور بلغم کو زائل کرتی ہیں مسواک کرنا۔ روزہ رکھنا۔ قرآن کی قرأت کرنا۔

(احیاء العلوم ۱ج)

ان احادیث وآثار سے قرآن پاک کی قرأت کی کس قدر فضیلت معلوم ہوئی مگر یہ سب فضائل اسی صورت میں ہیں جبکہ تلاوت ایمان واعتقاد سے ہو اور اخلاص سے ہو۔ نفاق سے اور سرسری نہ ہو۔ اس لئے کہ اگر تلاوت محض لسان سے ہے قلب پر اس کا ذرا اثر نہیں۔ اور اسکے احکام پر عمل نہیں تو ایسی قرأت کرنے والا ہرگز ان فضائل کے پانے کا مستحق نہیں ہے بلکہ ایسی قرأت کرنے والے کی مذمت احادیث وآثار میں کثرت سے وارد ہے جیسا کہ پہلے ضمناً معلوم ہوچکا ہے۔ مگر اب اور روایات نقل کی جاتی ہیں تاکہ مزید علم کا موجب ہو۔

الاحادیث والاٰثار فی ذم تلاوۃ الغافلین

(وہ احادیث وآثار جو تلاوت غافلین کی مذمت کے بارے میں وارد ہیں)

عن جابر قال خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن نقرأ القرآن وفینا الاعرابی والعجمی فقال اقرأوا فکل حسن وسیجیٔ اقوام یقیمونہ کما یقام القدح ویتعجلونہ ولا یتاجلونہ۔

(مشکوٰۃ شریف)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں ہمارے پاس تشریف لائے کہ ہم سب لوگ قرآن کی تلاوت کررہے تھے اور ہم میں دیہاتی لوگ اور اہل عجم بھی تھے (جو کہ اپنے اپنے لہجوں میں قرأت کررہے تھے) آپ نے فرمایا کہ پڑھے جاؤ سب ٹھیک ہے عنقریب ایک قوم ایسی آئیگی جو اسکے الفاظ کو اس طرح درست کریگی جسطرح تیر سیدھا کیا جاتا ہے (اور انکا یہ حال یہ ہوگا) کہ اس سے نفع دنیوی چاہینگے اور آخرت کے ثواب کا قصد نہ کرینگے۔

اس حدیث کی شرح فرماتے ہوئے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

(فقال اقرأوا فکل حسن) ای فکل واحدۃ من قرأتکم حسنۃ مرجوۃ للثواب اذا آثرتم الآجلۃ علی العاجلۃ ولا علیکم ان لا تقیموا السنتکم اقامۃ القدح وھو السھم قبل ان یراش (و سیجیٔ اقوام یقیمونہ) ای یصلحون

(فکل حسن) یعنی تم میں سے ہر ایک کی قرأت ٹھیک ہے سب پر ثواب کی امید ہے مگر جب آخرت کو دنیا پر ترجیح دو (یعنی مقصود قرأت سے آخرت کا ثواب ہو دنیا مقصود نہ ہو) اور اگر تم لوگ اپنی زبان کو تیر کی طرح سیدھی نہ کرو تو کچھ ملامت نہیں ہے۔ اور قدح تیر کی لکڑی کو کہتے ہیں جس میں ابھی پر نہ لگا ہو۔

(وسیجیٔ اقوام یقیمونہ) کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اسکے الفاظ

الفاظه وکلماته ویتکلفون فی مراعاة مخارجه وصفاته (کما یقام القدح) ای یبالغون فی عمل القراءة کمال المبالغة لاجل الریاء والسمعة والمباهاة والشهرة۔

اور کلمات کی اصلاح کریں گے اور مخارج وصفات کی رعایت اسطرح تکلف سے کریں گے جیسا کہ تیر سیدھا کیا جاتا ہے۔ یعنی قرأت میں انتہائی مبالغہ کریں گے اور غرض ان تمام سے، ریاء وسمعہ اور مباہات (یعنی دکھانا سنانا اور فخر کرنا) اور شہرت ہوگی۔

قال الطیبی وفی الحدیث رفع الحرج وبناء الامر علی المساهلة فی الظاهر وتحری الحسبة والاخلاص فی العمل والتفکر فی معانی القرآن والخوض فی عجائب امره

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ حدیث میں یہ فوائد ہیں کہ امت سے حرج مرفوع ہے اور امر کی بناء ظاہر میں سہولت پر ہے اور عمل میں ثواب کی طلب اور اخلاص ہونا چاہئے۔ قرآن کے معانی میں تفکر اور اس کے عجائب میں غور وخوض کرنا چاہئے۔

(یتعجلونه) ای ثوابه فی الدنیا ولا یتأجلون) بطلب الاجر فی العقبیٰ بل یؤثرون العاجلة علی الآجلة ویتأکلون ولا یتوکلون۔

(یتعجلونہ) اس سے مراد یہ ہے کہ اس کا بدلہ دنیا ہی میں چاہیں گے آخرت میں اس کے اجر وثواب کو طلب نہ کریں گے۔ بلکہ دنیا ہی کو آخرت پر ترجیح دیں گے۔ اس سے تاکل کریں گے (یعنی ذریعہ معاش بنالیں گے، توکل نہ اختیار کریں گے۔

(مرقاۃ ص۲۱۷ ج ۲)

اس حدیث سے کس قدر مذمت ان قراء کی معلوم ہوئی جو کہ اغراض دنیویہ کی تحصیل کے لئے قرأت کرتے ہیں اور اسی نیت سے تجوید و تصحیح حروف کرتے ہیں۔ یہ لوگ مخلص نہیں ہیں اور اس مرتبہ عظمیٰ کے پانے کے مستحق نہیں ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں تصحیح حروف اور تجوید کلمات کی مذمت نہیں فرمائی۔ بلکہ اس پر مذمت فرمائی کہ ان لوگوں نے امر مہم یعنی آخرت کے اجر وثواب کو ترک کردیا اور ظاہر ہی کو کافی سمجھ لیا۔ ایسے لوگ اب بہت ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ کے لوگوں کا حال حضور نے بطور پیشین گوئی کے فرمایا وہ یہی زمانہ تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

دوسری حدیث سنئے:۔

اکثر منافقی امتی قراؤها۔

یعنی میری امت کے اکثر منافقین قرآء ہوں گے۔

صاحب مجمع البحار فرماتے ہیں کہ:۔

ای انهم یحفظون القرآن نفیا للتهمة

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اپنی ذات سے تہمت

عن المسهم وهم معتقدون ضياعه

کی نفی کے لئے قرآن پاک کا حفظ کریں گے اور ان کا یہ حال ہوگا کہ قرآن کے ضائع کر دینے کے معتقد ہوں گے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین اسی قسم کے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث شریف میں منافقین سے مراد اعتقادی ہی نہیں ہیں بلکہ منافقین عملی بھی ہیں۔ ان لوگوں کی شان یہ ہوگی کہ قرآن کی قرأت نہایت خوش الحانی سے کریں گے اور تجوید کلمات سے بھی واقف ہوں گے۔ مگر حال یہ ہوگا کہ ان کی قرأت گلے سے تجاوز نہ کرے گی اور دل پر ذرا اثر نہ ہوگا اور نہ اثر لینے کا ارادہ ہی کریں گے بلکہ ان کی غرض محض ریا و سمعہ اور شہرت ہوگی۔ اسی کو ذریعۂ معاش بنالیں گے۔ آخرت کے ثواب کی نیت ہی نہ ہوگی۔ ایسے ہی قراء کی مثال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے زیجاً سے دی ہے۔ اور ایسی قرأت کرنے والے کو منافق فرمایا ہے۔

اس زمانہ میں اس قسم کے لوگ کثرت سے موجود ہیں ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں کہ محض علم تجوید حاصل کر لینے اور زبان کو درست کر لینے کو کافی سمجھتے ہیں۔ خشوع وخضوع اور تاثر کا ذرا ارادہ نہیں کرتے۔

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب الفوز الکبیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

یعنی ایک عارف نے کہا ہے کہ جب سے لوگوں نے تجوید کے قواعد کو یاد کر لیا اسی وقت سے تلاوت میں خشوع کو چھوڑ دیا۔

(۳) شر الناس فاسق قرأ كتاب الله وتفقه في دين الله ثم بذل نفسه لفاجر اذا نشط تفكه بقراءته ومحادثته فيطبع الله تعالىٰ على قلب القارى والمستمع۔

لوگوں میں سے بدترین شخص وہ فاسق ہے کہ کتاب اللہ کو پڑھا اور اللہ کے دین میں تفقہ حاصل کیا پھر اس نے اپنے نفس کو اغراض دنیویہ کی خاطر، فاجر کے ہاتھ بیچ دیا جب فاسق کو نشاط ہوتا ہے تو اس کی قرأت اور اس کے کلام سے تفکہ حاصل کرتا ہے (جیسے کہ اغنیا کھانا کھانے کے بعد پھل فروٹ سے تفکہ کرتے ہیں اور ادھر ادھر کی باتوں سے دل بہلاتے ہیں) تو اللہ تعالیٰ ایسے قاری اور سامع دونوں کے قلب پر مہر لگا دیتے ہیں، اور پھر اثر نہیں ہوتا)

(طحطاوی علی الدر ص۳۵۱ ج۱)

قال انس ابن مالك رب تال للقرآن والقرآن يلعنه۔

حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بہت سے قرآن کی تلاوت کرنے والے ایسے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت کرتا ہے

(۴) قال ميسرة الغريب هو القرآن في جوف الفاجر۔

حضرت میسرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن فاجر کے قلب میں غریب ہے یعنی اجنبی اور مسافر ہے

(۵) قال بعض العلماء ان العبد ليتلو القرآن فيلعن نفسه وهو لا يعلم. يقول الا لعنة الله على الظالمين. وهو ظالم نفسه. الا لعنة الله على الكاذبين وهو منهم

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ بندہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے اور اپنے نفس پر لعنت بھیجتا ہے اور اس کو وہ جانتا بھی نہیں (مثلاً کہتا ہے کہ ظالمین پر خدا کی لعنت ہے) اور وہ خود ظالم ہوتا ہے (اسی طرح یہ کہتا ہے کہ کاذبین پر خدا کی لعنت ہے اور وہ خود کاذب ہوتا ہے) اس طرح وہ اپنے نفس پر لعنت کرتا ہے

(۶) قال الحسن اتخذتم قراءة القرآن مراحل وجعلتم الليل جملا فانتم تركبونه فتقطعون به مراحله وان من كان قبلكم رأوه رسائل من ربهم فكانوا يتدبرونها بالليل وينفذونها بالنهار۔

حضرت حسنؒ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے قرأت قرآن کو مراحل بنالیا ہے اور رات کو اونٹ بنالیا ہے پس اسپر سوار ہو کر مراحل کو طے کرتے ہو اور تم سے پہلے کے لوگ (ایسے نہیں تھے) وہ قرآن کو اپنے پروردگار کی جانب سے رسائل سمجھتے تھے تو اس کو رات میں سمجھتے تھے اور دن میں اس کو نافذ کرتے تھے۔ (یعنی عمل کرتے تھے)

(۷) قال ابن مسعودؓ انزل القرآن عليهم ليعملوا به فاتخذوا دراسته عملا ان احدكم ليقرأ القرآن من فاتحته الى خاتمته ما يسقط منه حرفا وقد اسقط العمل به۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ قرآن اس لئے نازل ہوا ہے کہ لوگ اسپر عمل کریں۔ پس ان لوگوں نے یہ کیا کہ اس کے پڑھنے پڑھانے ہی کو عمل کے قائم مقام قرار دے لیا۔ اور اب یہ حال ہے کہ تم میں کا ایک شخص شروع سے آخر تک قرآن اس طرح پڑھ جاتا ہے کہ ایک حرف بھی نہیں چھوڑتا لیکن عمل کو بالکل ہی چھوڑے رہتا ہے۔

(۸) وفي حديث ابن عمر وحديث جندب رضي الله عنهما عشنا دهرا طويلا واحدنا يؤتى الايمان قبل القرآن فتنزل السورة على محمد صلى الله عليه وسلم فيتعلم حلالها وحرامها وآمرها وزاجرها وما ينبغي ان يقف عندها منها ثم لقد رأيت رجالا يؤتى احدهم القرآن قبل الايمان فيقرأ

حضرت ابن عمرؓ اور حضرت جندب رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ ہم نے ایک مدت اس حال میں گذاری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک شخص کو قرآن سے پہلے ایمان ملتا تھا پھر کوئی سورۃ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی تھی تب وہ (ایمان کے تقاضے سے) اس سورت کے حلال وحرام کو معلوم کرتا تھا اور اسکے اوامر و نواہی معلوم کرتا تھا۔ اور یہ بھی معلوم کرتا تھا کہ کہاں توقف کرنا مناسب ہے۔ اب میں ایسے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جن کو ایمان تو ابھی نہیں ملا لیکن قرآن مل گیا

بما بین فاتحۃ الکتاب الی خاتمتہ لایدری ما آمرہ ولا زاجرہ ولا ما ینبغی ان یقف عندہ منہ ینثرہ نثر الدقل

تو ایک شخص سورہ فاتحہ سے لیکر ختم قرآن تک پڑھ جاتا ہے مگر اُسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ قرآن اسے کس بات کا حکم کر رہا ہے۔ اور نہ یہ خبر ہوتی ہے کہ کہاں توقف کرنا چاہئے بس قرآن کو ردی کھجوروں کی طرح بکھیرتا چلا جاتا ہے۔

یعنی جس طرح ردی کھجور کو آدمی دیر تک منہ میں نہیں لئے رہتا اس لئے کہ اسمیں کوئی مزہ و مٹھاس نہیں پاتا۔ اسی طرح قرآن سے ذرا لطف وحظ جس کے قلب کو نہیں ملا رہتا اور دل میں کچھ تاثر نہیں رہتا وہ زبان سے فرفر پڑھتا چلا جاتا ہے۔ ذرا غور نہیں کرتا کہ کس کے کلام کی تلاوت کر رہا ہے۔ اس لئے اسکی قرأت نہایت پھیکی اور بے لطف معلوم ہوتی ہے۔ نہ خود اس کو کوئی حلاوت ملتی ہے اور نہ سامعین ہی کو۔

ذرا اس پر غور فرمائیے کہ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت جندبؓ اپنا مشاہدہ بیان فرما رہے ہیں کہ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں کہ شروع سے آخر تک قرآن پڑھ جاتے ہیں اور اس کے احکام پر اصلا غور نہیں کرتے۔ اور یہ بھی فرما رہے ہیں کہ یہ لوگ قرآن ایمان سے پہلے ہی دیدیئے گئے ہیں قرات کر رہے ہیں مگر ایمان ندارد یہ کتنی بڑی بات فرمائی۔ حالانکہ حضورؐ کے عہد مبارک سے بہت ہی قریب کا زمانہ تھا تاہم اس قدر تفاوت احوال میں ہو گیا تھا۔ تو اب کے زمانہ کے لوگوں کے حال کا پوچھنا ہی کیا ہے۔

میں لوگوں کے حالات دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں کہ اگرچہ قراءت وغیرہ کر رہے ہیں مگر ایمان ضعیف اور تصدیق نہایت کمزور معلوم ہوتی ہے ورنہ تلاوت انھیں کہاں سے کہاں پہونچا دیتی۔ ضرور بالضرور ان لوگوں کی تلاوت نفاقی اور سرسری ہوتی ہے۔ اب حضرت ابن عمر وجندب رضی اللہ عنہما کے فرمانے سے تقویت ہوئی اور بات خوب سمجھ میں آئی۔ اور اب علی الاعلان اس بات کو کہہ سکتا ہوں۔

(۹) وقد ورد فی التوراۃ یا عبدی اما تستحیی منی یاتیک کتاب من بعض اخوانک وانت فی الطریق تمشی فتعدل عن الطریق وتقعد لاجلہ وتقراہ وتتدبرہ حرفا حرفا حتی لا یفوتک شئی منہ وھذا کتابی انزلتہ الیک انظر کم فصلت لک فیہ من القول وکم کررت علیک فیہ لتتامل طولہ وعرضہ

توراۃ میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے میرے بندے! کیا تم مجھ سے شرم نہیں کرتے کہ جب تمہارے کسی بھائی کا کوئی خط تمھیں راستہ چلتے ہوئے ملتا ہے تو تم راستہ سے کنارے ہو جاتے ہو اور اس کے لئے بیٹھ جاتے ہو اور پڑھتے ہو۔ اس کے ہر حرف میں تدبر کرتے ہو کہ کہیں کوئی چیز تمہارے پڑھنے سے چھوٹ نہ جائے۔ اور یہ میری کتاب ہے جس کو میں نے تم پر نازل کیا ہے۔ دیکھو کس قدر میں نے اسمیں تفصیل اور توضیح کی ہے اور کتنا تمہارے لئے تکرار کیا ہے تاکہ تم اسکے طول و

ثم انت معرض عنه اکنت اھون علیك من بعض اخوانك۔

یا عبدی یقعد الیك بعض اخوانك فتقبل علیه بکل وجهك فتصغی الی حدیثه بکل قلبك فان تکلم متکلم او شغلك شاغل عن حدیثه اومأت الیه ان کف وھا انا مقبل علیك ومحدث بك وانت معرض بقلبك عنی افجعلتنی اھون عندك من بعض اخوانك

(احیاء العلوم)

عرض میں تامل کرو۔ لیکن (تمہارا یہ حال ہے) کہ تم اس سے اعراض کرتے ہو۔ کیا میں تمہارے کسی بھائی سے بھی کمتر ہوں۔

اے میرے بندے تمہارا کوئی بھائی جب تمہارے پاس بیٹھا رہتا ہے تو تم کامل طور پر اسکی طرف متوجہ رہتے ہو اور اسکی گفتگو کی طرف ہمہ تن گوش بنجاتے ہو اگر کوئی درمیان میں بولنے لگتا ہے یا کوئی شاغل تم کو اسکے کلام سے روکتا ہے تو تم اشارہ کرتے ہو کہ ٹھہرو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ (کس قدر افسوس کی بات ہے) کہ میں تو تمہاری جانب متوجہ ہوں اور تم سے ہمکلام ہوں اور تمہارا قلب مجھ سے اعراض کر رہا ہے کیا تم نے مجھکو اپنے ادنی بھائی سے بھی کمتر سمجھ لیا ہے۔

دیکھا آپ نے اللہ رب العالمین اپنے بندوں سے یہ فرما رہے ہیں کہ ہماری کتاب کے ساتھ ایسی بے اعتنائی اور بے وقعتی کا برتاؤ۔ گویا اس کی تمہارے نزدیک کوئی وقعت و عظمت ہی نہیں اس سے کہیں زیادہ تو تم اپنے دوست واحباب کے خطوط کی جانب توجہ کرتے ہو اور اس میں غور و خوض کرتے ہو کہ کوئی حرف بلا پڑھے اور سمجھے نہ رہ جائے۔ کیا میں تمہارے دوست سے بھی کمتر ہوں۔ اور میرا کلام تمہارے نزدیک تمہارے دوست کے مکتوب سے بھی بے وقعت ہے۔

یہ کلام کس قدر غیرت دلانے والا ہے ظاہر ہے مومن کا دل تو یہ سن کر موم ہی ہو جانا چاہیئے اور قرآن کی طرف کامل توجہ اور اعتنا ہونا چاہیئے اور کسی کلام کو اس پر فوقیت نہ دینا چاہیئے۔ اگر اب بھی جمود ہی رہے تو یہ مومن مخلص کی شان سے نہایت بعید امر ہے۔

ان احادیث و آثار سے بھی قرآن پاک کی کس قدر عظمت معلوم ہوتی ہے۔ اس کی قراءت اور اس پر عمل کی کتنی تاکید ظاہر ہوتی ہے اس کی قراءت میں کوتاہی اور اس کی طرف سے بے اعتنائی پر کتنی تہدید اور وعید مفہوم ہوتی ہے۔

قرآن پاک کی تلاوت کے متعلق احادیث و آثار کثیر ہیں مگر جتنی نقل کی گئی ہیں طالبین کے لئے یہی کافی وافی ہیں اگر کسی کو تفصیل دیکھنا ہو تو مطولات کا مطالعہ کرے۔

تلاوت کلام اللہ بلا فہم معنی بھی مفید اور موجب ثواب ہے

اس مسئلہ پر بھی سلف نے مفصل کلام فرمایا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جملہ مسائل پر تو شافی کلام کریں اور اسی بحث سے پہلو تہی کر جائیں جس پر دین کی بنیاد ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے نسبت اور تعلق کا اہم و اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔ اگر یہ خیال ہے کہ سلف نے اس مسئلہ پر کلام نہیں کیا ہے یا واضح طور پر بیان نہیں فرمایا ہے تو یہ ان حضرات قدسیہ کے ساتھ صریح بدظنی اور بداعتقادی ہے جو نہایت مذموم اور منکر ہے۔ اس لئے جن حضرات نے اس قدر جانفشانی اور مشقتوں کو برداشت کرکے دین کی حفاظت کی اور ہم تک انھیں کے ذریعہ سے دین پہونچا انھیں کی تقصیر کا اعتقاد کیا جائے۔ نعوذ باللہ۔

سنئے! کام کرنے والوں کے لئے لازم ہے کہ پہلے لوگوں کی سیرت کو پیش نظر رکھیں اور اس کے مطابق کام کریں۔ جبھی کچھ کام کی توقع ہے ورنہ سوائے دوڑ، دھوپ اور محنت و مشقت کے کچھ نتیجہ نیک میسر نہ ہوگا۔ وہ حضرات کتاب و سنت کے ہم سے کہیں زیادہ عالم تھے اس لئے کہ ان کا زمانہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تھا خیر و صلاح زیادہ تھی۔ دین و تقویٰ لوگوں میں زیادہ تھا۔ اب وہ بات نہیں ہے اور روز بروز انحطاط ہوتا ہی جائیگا جب اپنی عقل و رائے سے کام کیا جائیگا تو ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔

سلف نے جو طریقہ اختیار کیا اس کے ثمرات حسنہ ظاہر و باہر ہیں کہ کتنے لوگوں کی اصلاح ہوئی اور واصل الی اللہ ہوئے بخلاف اب کے کہ کام ہو رہا ہے مگر چونکہ سلف کے طریقہ پر نہیں ہے اس لئے کامیابی نہیں ہو رہی ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے۔

حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے تعلیم الدین میں شیخ قوام الدینؒ کے اس قول کو نقل فرمایا ہے کہ اے درویش محک و معیار این کار کتاب و سنت است و سیر سلف کہ اہل اقتدا بودند، یعنی اے درویش اس کام کی کسوٹی اور معیار کتاب و سنت اور ان اسلاف کی سیرت ہے جو کہ مقتدا تھے۔

دیکھئے شیخ قوام الدین جو کہ بہت بڑے شخص ہیں فرماتے ہیں کہ کتاب و سنت کے علاوہ سلفؒ کی سیرت بھی اس کام کا معیار ہے اس لئے کہ اگر ان کی سیرت کو مستحضر نہ رکھا جائیگا تو فہم و عقل بھی دشوار ہو جائے گی ان حضرات کی سیرت کو دیکھ کر ہی عمل کرنے کا ڈھنگ و شعور حاصل ہوتا ہے۔ نیز عمل کی طرف رغبت و شوق پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ اگر امت کا تعامل نہ ہوتا تو نماز کتاب دیکھ کر کسی کو رکوع و سجدہ کرنا بھی نہ آتا۔

چنانچہ ان حضرات کی سیرت تلاوت کلام اللہ کے بارے میں ملاحظہ فرمائیے :۔

علامہ شعرانیؒ تنبیہ المغترین میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے کہ پہلے جب کوئی شخص رات میں قرآن پڑھتا تھا تو صبح کے وقت لوگ اس کا اثر یعنی تغیر اور زردی رنگ اور دبلاپن اس کے چہرے میں محسوس کرتے تھے۔ اور اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ رات میں اگر پورا قرآن بھی پڑھتا ہے تو صبح کے وقت اس کے چہرے پر اس کا کوئی اثر دکھلائی نہیں دیتا اور اس کا قرآن پڑھ لینا ایسا معمولی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ چادر اٹھا لینا۔

اب آپ لوگ اپنے سلفؒ کے حال میں غور کیجئے اور سوچئے کہ آپ کا حال اپنے پروردگار کے کلام کی تلاوت اور اس کے سماع کے وقت یہی ہوتا ہے؟ آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ ہمارے اور سلفؒ کے احوال میں کس قدر تفاوت ہوگیا ہے۔

مثال کے طور پر سیدنا امام ابوحنیفہؒ کا ایک واقعہ سنئے :۔

ایک مرتبہ عشاء کی نماز میں امام نے سورہ اِذَا زُلْزِلَتْ کی قرارت کی جب سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے تو امام اعظم رحمۃ اللہ اپنی داڑھی پکڑ کر مسجد ہی میں کھڑے ہوگئے اور صبح تک یہ فرماتے رہے کہ اے وہ ذات جو ایک ذرّہ خیر کی جزا خیر کے ساتھ اور ایک ذرہ شر کی جزا شر کے ساتھ دے گا اپنے اس بندہ نعمان کو جہنم سے پناہ دیدیجئے۔

سبحان اللہ! یہ حال تھا ہمارے امام صاحبؒ کا بھلا اس سے بڑھ کر کیا حال ہوسکتا ہے۔ یہ حال قرآن سے تھا قیامت کا خوف غالب تھا وہاں کا منظر پیش نظر تھا اس لئے وہاں کے حساب وکتاب سے لرزتے رہتے تھے۔ آپ اس قدر روتے تھے کہ پڑوسیوں کو رحم آجاتا تھا اور دعا کرتے تھے کہ اے اللہ تعالیٰ ان کے قلب میں رجاء کی کیفیت پیدا فرما دیجئے کہ بکاء کم ہوجائے۔

اب ہم لوگ امام صاحبؒ کو محض احکام ظاہری میں تو اپنا پیشوا و مقتداء مانتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ آپ کی سیرتِ باطنی اور قلبی حال کس قدر زبردست تھا۔ آپ کو قرآن پاک سے کیسا تعلق وشغف تھا اور اس سے آپ پر کیسا حال طاری ہوتا تھا کہ رات رات بھر ایک ہی آیت کا تکرار کرتے رہجاتے تھے۔

بھائی بات یہ ہے کہ امام صاحبؒ تابعی تھے۔ آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو دیکھے ہوئے تھے۔ ان حضرات کے خوف وخشیت اور قرآن الٰہی سے تعلق اور نسبت کو ملاحظہ فرمائے ہوئے تھے۔ اور صحابہؓ کے شاگرد اور ان سے نورِ باطن اخذ کئے ہوئے تھے۔ اس لئے امت کے سامنے صحابہ کا نقشہ کھینچ دیتے تھے کہ قرآن پر اس درجہ کا ایمان وایقان تھا اور قیامت کا اتنا استحضار تھا کہ کسی کل ان کو چین نہیں ملتا تھا

امام صاحبؒ کا کمال تو دیکھئے کہ انہوں نے سمجھا کہ میرے استنباط کئے ہوئے ظاہری احکام و مسائل کی لوگ اقتدا کریں گے اور میرے اقوال کو سند و حجت بنائیں گے تو بس اس پر اکتفا نہ فرمایا بلکہ احوال و کیفیات کو بھی پیش کیا کہ اس میں بھی ہماری اقتدا ہونی چاہئے۔ اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں جس سے سلفؒ کا قرآن کے ساتھ انتہائی شغف و ذوق اور انتہائی خشوع و خضوع معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ علامہ نوویؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ سلف میں اکثر لوگ ایسے تھے کہ ایک ہی آیت کی رات رات بھر تلاوت اور اس میں تدبر کرتے رہجاتے تھے۔ بہت سے حضرات تلاوت کے وقت بیہوش ہوجاتے تھے۔ اور کتنے تو قرآن کی آیتوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی وفات ہی ہوگئی۔

جب سلفؒ کو اس قدر تعلق قرآن سے تھا تو کیا وہ اس کے متعلق کوئی گوشہ چھوڑ دیں گے کہ بعد والوں کو اس میں تحقیق کرنے کی ضرورت پڑے۔ چنانچہ اب میں سلفؒ کے اقوال نقل کرتا ہوں جس سے یہ مسئلہ کہ بغیر فہم معنی بھی تلاوت قرآن مفید ہے واضح ہوجائے گا۔

قال اللہ تعالیٰ اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتَابِ۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کتاب آپ پر وحی کی گئی ہے آپ اس کو پڑھا کیجئے۔

قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو

تقربا الی اللہ تعالیٰ بقراءتہ وتحفظا لالفاظہ واستکشافا لمعانیہ فان القاری المتأمل قد ینکشف لہ بالتکرار ما لم ینکشف لہ اول ما قرع سمعہ انتہی

(تلاوت قرآن کا امر اس لئے ہے کہ) اللہ تعالیٰ کا قرب اسکی تلاوت سے حاصل ہو اور اس کے الفاظ محفوظ ہوجائیں اور اس کے معانی منکشف ہوں کیونکہ غور سے پڑھنے والے شخص پر بعض دفعہ تکرار سے ایسے مضامین منکشف ہوتے ہیں جو پہلی بار سننے سے نہیں کھلے

اس میں تصریح ہے کہ نفس قراءت سے تقرب الی اللہ حاصل ہوتا ہے اور کثرت قراءت سے تدبر کی کیفیت اور معانی کا انکشاف بھی ہوتا ہے۔ نفس تلاوت خود مامور بہا ہے۔ اور عبادت ہے جیسے نماز۔ تو جس طرح نماز بلا فہم معنی کے صحیح ہوجاتی ہے اور موجب قرب ہے اسی طرح قراءت بلا فہم معنی صحیح ہے اور موجب قرب ہے۔ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے ذکر اللہ فرمایا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ اور ذکر اللہ کے لئے فہم شرط نہیں جیسا کہ جمعہ اور عیدین کے خطبوں کے متعلق علماء نے یہی فرمایا ہے کہ چونکہ یہ ذکر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ پس اس کے لئے فہم ضروری نہیں ہے اس لئے عربی ہی میں ہونا چاہئے۔ غیر عربی میں جائز نہیں۔ اگر فہم ضروری ہوتا تو صحابہ رضی اللہ عنہم ہم سے زیادہ جانتے تھے اور روم و فارس ان کے زمانہ میں فتح ہوچکا تھا اور حضرات صحابہؓ کا گذر عجم پر ہوا جب بھی ان کی زبانوں میں ترجمہ

نہیں کیا بلکہ عربی ہی میں خطبہ دیتے رہے حالانکہ ان زبانوں کے جاننے والے موجود تھے۔ یہ صریح دلیل ہے کہ جو ذکر اللہ ہو اس کا تلفظ خود عبادت ہے اس کے عبادت ہونے کے لئے فہم معنی شرط نہیں خوب سمجھ لیجئے۔ چنانچہ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ :۔

وقال ابن حجر اما الثواب علی قرأته فهو حاصل لمن فهمه ولمن لم یفهمه بالكلیة للتعبد بلفظه بخلاف غیره من الاذكار فانه لا یثاب علیه الا من فهمه ولو بوجه ما۔ وفیه نظر لان نفی الثواب یحتاج الی نقل من حدیث او كتاب والقیاس ان لا فرق بینهما فی اصل الثواب وان كان یتفاوت بین القرآن وبین من فهم ومن لا یفهم۔

ابن حجر نے بیان کیا ہے کہ قرآن کی قراءت پر تو ثواب حاصل ہی ہے جو سمجھے اسے بھی اور جو نہ سمجھے اسے بھی کیونکہ وہ قرآن کے الفاظ تو زبان سے ادا کر ہی رہا ہے اور اس کا تلفظ عبادت ہے برخلاف قرآن کے علاوہ دوسرے اذکار کے کہ ان کا یہ حال نہیں۔ کیونکہ ان کو جب تک نہ سمجھے ثواب نہیں ملتا اگرچہ سمجھنا کسی درجہ کا ہو۔ مگر یہ بات قابل غور ہے کیونکہ (عام اذکار پر بلا فہم) ثواب کی نفی کرنے کے لئے کتاب و سنت سے کوئی نص و سند درکار ہے ورنہ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ قرآن اور عام اذکار میں نفس ثواب کے اعتبار سے کوئی تفاوت نہ ہو اگرچہ قرآن و غیر قرآن میں اور سمجھ کر پڑھنے والے اور بلا سمجھے پڑھنے والے کے اعتبار سے ثواب میں کمی و زیادتی ہو جائے۔

(مرقات)

علامہ ابن حجرؒ بہت ہی محقق شخص ہیں علماء ان کے اقوال کو سند بناتے ہیں اور ان کو اپنی کتابوں میں نقل فرماتے ہیں جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے نقل فرمایا ہے اور اس پر کچھ نقض بھی وارد نہیں فرمایا ورنہ تو عموماً ان کے اقوال کو نقل فرما کر رد کر دیتے ہیں مگر اس قول کو سالم رکھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ملا علی قاریؒ کی بھی یہی رائے ہے کہ نفس تلاوت کلام اللہ سے ثواب ملتا ہے۔ اگرچہ بلا سمجھے ہی ہو۔ ہاں یہ بات دوسری ہے کہ سمجھ کر تلاوت کرنے میں ثواب زیادہ ملے گا۔ مگر نفس ثواب کا انکار کب جائز ہو سکتا ہے۔

اور ابن حجرؒ نے جو یہ فرمایا کہ قرآن کے علاوہ اذکار میں بغیر فہم کے ثواب نہ ملے گا تو اس میں ملا علی قاریؒ نے کلام فرمایا ہے کہ نفی ثواب کے لئے نقل کی ضرورت ہے تو یہ ٹھیک ہے مگر ذاکر کو اتنا تو سمجھنا ہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا نام لے رہا ہوں کسی مخلوق کا نام نہیں لے رہا ہوں ایسی غفلت اور جہالت نہ ہو کہ کچھ کا کچھ کہتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہوں۔ یہ بہت ہی بُرا ہے۔ اور جاہلوں سے یہ کوئی بعید نہیں ہے کہ ایسا کر ڈالیں اس لئے کہ ایک شخص دعا میں یہ کہتا تھا کہ "اے اللہ صدق و کذب سے پناہ دیجئے" میں نے سُن کر ایک دو بار تو تاویل کی کہ بھلا کوئی مسلمان صدق سے پناہ مانگے گا۔ مگر جب کئی بار سُنا تو اُس سے

دریافت کیا تو بات صحیح نکلی واقعی صدق ہی سے پناہ مانگتا تھا۔ میں نے منع کیا کہ ایسا مت کرو ورنہ دعا قبول ہو جائے گی۔ تو کبھی صدق و سچائی نصیب نہ ہوگی۔

اب ہم تلاوت کلام اللہ بلا فہم معنی کے مفید اور موجب قرب ہونے کی تائید میں طبقات کبریٰ کی عبارت پیش کرتے ہیں۔ وھو ھٰذا۔

کان رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ یقول فی معنی قول الامام احمد ابن حنبل رض حین رأی رب العزت جل جلالہ فی منامہ فقال یا رب بما یتقرب الیک المتقربون قال بکلامی یا احمد قال قلت یا رب بفہم او بغیر فہم فقال یا احمد بفہم و بغیر فہم۔ المراد بفہم بما یتعلق بعلماء الشریعۃ و بغیر فہم بما یتعلق بعلماء الحقیقۃ فان العلماء ما لہم آلۃ بفہم کلام اللّٰہ تعالیٰ الا بالفکر والنظر واما العارفون فطریقہم الی فہمہ الکشف و التعریف الالٰہی و ذالک لا یحتاج الی تفہم۔ فقیل لہ ما تقول فی من یقرءہ من العوام من غیر فہم فقال قد صح ان لہ بکل حرف عشر حسنات فتحت قولہ و بغیر فہم مسئلتان۔ (طبقات کبریٰ للشعرانی صفحہ ۱۶۹ جز ۲)

سید علی دمیری رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام احمد ابن حنبل رض کے اس ارشاد کے بیان میں فرماتے ہیں جبکہ انھوں نے (امام احمد نے) اللہ جل شانہ کو خواب میں دیکھا تھا۔ اور یہ فرمایا تھا کہ آپ کا قرب پانے والوں نے سب سے زیادہ قرب کس چیز سے حاصل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے احمد میرے کلام کی تلاوت سے انھوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب تلاوت سمجھ کر ہو یا بلا سمجھے۔ ارشاد ہوا جیسے بھی ہو سمجھ کر ہو یا بلا سمجھے" مراد بفہم سے (یعنی سمجھ کر تلاوت کرنا) تو اس کا تعلق علماء شریعت سے ہے۔ اور بغیر فہم کا تعلق علماء حقیقت سے ہے۔ اس لئے کہ کلام اللہ کے سمجھنے کا کوئی آلہ علماء شریعت کے پاس بجز غور و فکر کے نہیں ہے اور رہے عارفین تو ان کے لئے کلام اللہ کے سمجھنے کا طریقہ کشف اور تفہیم الٰہی ہے اور یہ سمجھنے اور نظر کرنے کے محتاج نہیں ہیں پھر ان بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ اچھا عوام کی تلاوت کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو کہ بلا فہم تلاوت کرتے ہیں تو فرمایا کہ یہ تو حدیث صحیح ہے کہ ہر حرف پر دس نیکی ملتی ہے پس امام کے قول بغیر فہم کے تحت دو مسئلے ہیں (ایک تو عوام کی قراءت دوسرے عارفین کی)

یہی حدیث تمام علماء کی مستدل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بغیر فہم معنی کے بھی ثواب ملتا ہے کیونکہ اسی حدیث میں ہے کہ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے میم ایک حرف ہے۔ اس طرح اس کو تیس نیکی ملتی ہے۔ حالانکہ کوئی بھی اسکا مطلب نہیں سمجھتا

امام احمد ابن حنبل کے خواب کو امام غزالیؒ نے بھی احیاء العلوم میں نقل فرمایا اور علامہ شعرانی نے بھی اس کتاب میں نقل فرمایا نیز اور بزرگان دین سے بھی سنا ہے تو گویا اس کی صحت پر سب کا اتفاق ہے پس اس کو سند میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

حضرت سید علی دمیریؒ نے اس کا خوب ہی مطلب بیان فرمایا ہے کہ بفہم کا تعلق علمائے شریعت سے ہے اس لئے کہ کلام اللہ کے سمجھنے کے لئے ان حضرات کو نظر و فکر کرنا ضروری ہے اس لئے کہ اس کے علاوہ کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے جس سے معانی تک رسائی ہو سکے۔ اور بغیر فہم کو علمائے حقیقت کے ساتھ متعلق فرمایا اس لئے کہ ان نفوس قدسیہ کو نظر و فکر کی ضرورت ہی نہیں ہے اللہ تعالیٰ ان کو خود سمجھاتے ہیں وہ جیسے جیسے تلاوت کرتے جاتے ہیں معانی منکشف فرماتے جاتے ہیں تو بھلا پھر ان کو نظر و فکر کرنے کی ضرورت ہی بلکہ یہ حضرات تو نظر و فکر کو اپنے اور خدا کے درمیان حجاب سمجھتے ہیں۔

رہے عوام تو ان کے متعلق فرمایا کہ بلا فہم کے معنی بھی نفس تلاوت سے ثواب ملتا ہے اس کے متعلق صریح حدیث ہے کہ ایک حرف کی قراءت پر دس نیکی ملتی ہے جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نظر و فکر اور تدبر علماء کے لئے ہے۔ عوام اور عارفین کے لئے نظر و فکر ضروری نہیں ہے صرف تلاوت ضروری ہے اسی سے اور مراتب کی توقع کی جاتی ہے۔

عن عبد الله ابن مسعود رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من قرأ حرفاً من کتاب الله فله حسنة والحسنة بعشر امثالها لا اقول الم حرف ولکن الف حرف ولام حرف ومیم حرف رواه ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے کتاب اللہ سے ایک حرف پڑھا اس کے لئے ایک نیکی ہے اور ایک نیکی دس گنا کر کے دیجاتی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ (لفظ) الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے (یعنی الم تین حروف ہیں جس پر تیس نیکیاں ملتی ہیں) امام ترمذی نے اس حدیث کو روایت کر کے حسن اور صحیح کہا ہے۔

(التبیان)

دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حرف کی قراءت پر دس نیکی کو فرمایا ظاہر ہے کہ حرف کے معنی تو کوئی بھی نہیں سمجھتا پھر بھی ثواب ملتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ بغیر فہم معنی کے بھی ثواب ملتا ہے۔

حضرت مولانا شاہ اہل اللہ صاحب دہلویؒ اپنے رسالہ چہار باب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

فضیلت تلاوت قرآن و قراءت آن نیک

(تلاوت قرآن پاک کی فضیلت، قرآن پاک کی تلاوت عمدہ

ترین عبادت است کہ رسول علیہ الصلوۃ والسلام فرمودہ است کہ ہر حرف کہ از قرآن مجید بخواند ثواب آں یک حسنہ بیابد۔ ثواب آں رادہ چند کردہ دہند نہ پندارند کہ الٓم یک حرف است بلکہ الف یک حرف است ولام یک حرف است ومیم یک حرف است وفرمود کہ می خوانید قرآن راروز قیامت شفاعت خواہد کرد۔ اصحاب وقاریان خود را۔

وفرمود کہ روز قیامت خوانندۂ قرآن رابگویند کہ قرآن را بترتیل بخواں ودر درجات بہشت ترقی کن مکان تو آنجاست کہ تمام کنی قرأت آں را۔

وفرمود کہ خواندن قرآن شریف بہتر است از تکبیر وتسبیح وصوم وصدقہ پس لازم بر ہر مسلمان است کہ ہر روز قدرے بترتیل وتجوید بخواند وورد خود گیرد کہ فضیلت آں در احادیث صحاح بسیار وارد شدہ۔

اگر مطلع باشد وبفہمد معانی آں پس بہتر است والا در وقت تلاوت ایں قدر داند کہ کلام خدا است وآنچہ در آں امر ونہی وقصص ذکر کردہ است راست ودرست است ایمان آوردم بداں۔

(چہار باب ص۳۰)

ترین عبادت ہے کیونکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرآن مجید کے ایک حرف کی تلاوت پر جو ثواب ملتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دس گنا کرکے عنایت فرماتے ہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ الٓم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ قرآن شریف پڑھا کرو اس لئے کہ یہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کی شفاعت کرے گا۔

اور یہ بھی فرمایا کہ قیامت کے دن قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا کہ قرآن مجید ترتیل کے ساتھ پڑھتے جاؤ اور بہشت کے درجات میں ترقی کرتے جاؤ جہاں قرات ختم ہوگی وہیں تمہارا مقام ہوگا۔

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ قرآن شریف کی تلاوت تکبیر اور تسبیح، صوم وصدقہ سے افضل ہے لہٰذا ہر مسلمان کے لئے لازم ہے کہ ہر روز کچھ قرآن ترتیل اور تجوید کے ساتھ پڑھتا رہے اور اپنا معمول بنائے۔ کیونکہ اس کی فضیلت صحیح حدیثوں میں بکثرت وارد ہے۔

اگر معنی سمجھ سکے اور اس پر مطلع ہوسکے تو بہتر ہے ورنہ تلاوت قرآن پاک کے وقت اس کا استحضار رکھے کہ خدائے تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں جن باتوں کا حکم ہے اور جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے اور جو قصص وحکایات بیان کئے گئے ہیں سب سچ اور درست ہیں ان سب پر ایمان لاتا ہوں۔

دیکھئے حضرت شاہ صاحبؒ نے کس قدر تفصیل سے اس مسئلہ پر کلام فرمایا ہے کہ جو شخص معانی کو

سمجھتا ہے اس کے لئے تو سمجھ کر تلاوت کرنا بہتر ہے اور جو لوگ اس کے اہل نہیں ان کو چاہئے کہ بلا فہم ہی تلاوت کریں مگر اس استحضار کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور جو کچھ اوامر و مناہی و قصص اس کتاب میں ہیں درست و راست ہیں۔ یہ تلاوت اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر اور مقبول ہے۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ خشوع و خضوع کی وجہ سے ایسی تلاوت سمجھ کر تلاوت کرنے والوں کی تلاوت سے بڑھ جائے۔ چنانچہ مولانا عبدالرؤف صاحب دانا پوری اصح السیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"نماز میں اگر آیات قرآنی کو سمجھ کر پڑھے تو اسکی بہتری میں کلام نہیں لیکن نہ سمجھے تاہم نفس نماز میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی۔ نماز ایک عبادت ہے اور اس سے مقصود اصل خشوع وخضوع پیدا کرنا ہے اور وہ آیات کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوسکتا ہے۔ ایک بے علم جو آیات کو کلام اللہ کو سمجھ کر پڑھ لیتا ہے۔ دل سے خدا کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ خشوع وخضوع اس پر غالب رہتا ہے اس کی نماز اس عالم کی نماز سے ہزار درجہ بہتر ہے جو آیات کو پڑھ کر معانی کی تحقیق اور مسائل کے انتخراج میں پھنس جاتا ہے اور عبادت کے وقت علمی تحقیقات کرنے لگتا ہے۔" (اصح السیر ص۳)

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ تلاوت کلام اللہ میں خشوع وخضوع فہم معانی پر موقوف نہیں بلکہ بغیر اس کے بھی پیدا ہوسکتا ہے۔

چنانچہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا قصہ مذکور ہوا کہ تلاوت سے پہلے ہی آپ پر غشی طاری ہوجاتی تھی اور ھذا کلام ربی۔ ھذا کلام ربی (یہ میرے رب کا کلام ہے۔ یہ میرے رب کا کلام ہے) بار بار فرمانے لگتے تھے ــــ سبحان اللہ! کس قدر عظمت وجلالت کلام اللہ کی صحابہ کے قلوب میں راسخ تھی۔ یہ سوچ کر کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے بے ہوش ہوجاتے تھے۔ تو کیا اب ہر شخص تلاوت سے پہلے یہ سوچ نہیں سکتا۔ اور کیا اس سے اثر نہیں لے سکتا؟

اس میں تو پڑھے۔ بے پڑھے۔ عربی۔ عجمی سب برابر ہیں۔ پس ہر شخص پر لازم ہے کہ کلام اللہ کی عظمت وجلالت کے استحضار کے ساتھ تلاوت کرے۔

اور یہ بھی سنئے! عمل کا تعلق فہم سے نہیں ہے بلکہ ایمان سے ہے۔ عمل ایمان سے ہوتا ہے فہم سے نہیں۔ اگر فہم سے تعلق ہوتا تو جتنے عالم ہیں سب عامل ہوجاتے اور جتنے یہودی، نصرانی عربی جانتے ہیں مسائل اسلامیہ پڑھتے پڑھاتے ہیں سب عمل کرنے لگتے اور ایمان لے آتے مگر سب کافر کے کافر ہی ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عمل کا تعلق فہم اور عربی دانی سے نہیں بلکہ اس کا تعلق محض ایمان سے ہے جس درجہ کا

ایمان اسی درجہ کا عمل ہوتا ہے اور اس کا مدار توفیق خداوندی پر ہے۔ اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ ایمان کسبی تلاوت سے پیدا ہوتا ہے۔ تلاوت ایمان کی مورث اور ازدیاد ایمان کا ذریعہ وموجب ہے۔ جب تلاوت ہوگی ایمان میں اضافہ ہوگا۔ پھر ایمان کے خیرات وبرکات بھی حاصل ہوں گے اور سب سے بڑا فیض وخیر نماز ہے جس کی نماز درست ہوجائے گی بقیہ اعمال بھی کامل طور پر ادا ہونے لگیں گے۔

تلاوت سے ایمان بڑھنے پر نصوص وارد ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝	پس ایمان والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے قلوب ڈر جاتے ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی آیات ان پر پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ لوگ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں

صاحب روح المعانی نے اس آیت کے تحت ایک بہت عمدہ بات تحریر فرمائی ہے اسکو نقل کرتا ہوں

(الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم) ای فزعت استعظاماً لشانہ الجلیل وتھیبا منہ جل وعلا والاطمینان المذکور فی قولہ سبحانہ تعالیٰ (الا بذکر اللہ تطمئن القلوب) لاینافی الوجل والخوف لانہ عبارۃ من ثلج الفواد وشرح الصدر بنور المعرفۃ والتوحید وھو یجامع الخوف۔	یعنی مومنین کے قلوب اللہ کے ذکر سے ان کی ہیبت اور شان جلیل کی عظمت کے استحضار سے ڈر جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا قول (خبردار ہو جاؤ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے قلوب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے) میں جو اطمینان مذکور ہے تو وہ وجل اور خوف کے منافی نہیں ہے اس لئے کہ اطمینان سے مراد قلب کی ٹھنڈک اور شرح صدر ہے جو نور معرفت اور توحید سے حاصل ہوتا ہے اور یہ خوف کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔

(پ ۹ صفحہ ۱۳۶)

الحاصل تلاوت قرآن بلافہم کے متعلق ہمارے اکابر کی یہ تصریحات ہیں جو صراحۃً دلالت کرتی ہیں کہ تلاوت بلافہم بھی مفید اور موجب قرب ہے۔ پھر بھلا ان علمائے محققین کے اقوال وارشادات کو کیونکر نسیاً منسیاً کیا جا سکتا ہے ہر مسئلہ میں تو ان کے ارشادات کو حجت اور سند بنایا جائے پھر آخر اسی مسئلہ میں کیوں ساقط الاعتبار قرار دیا جائے۔

خود سوچئے کہ آج تلاوت کلام اللہ کو غیر ضروری قرار دیا جائے۔ کل کو کسی دوسرے امر دین کو غیر ضروری کہدیا جائے تو اس طرح سارا دین ہی ختم ہو جائے گا اور دین کا کوئی رکن سالم نہ رہ جائے گا۔

اس لئے میں کہتا ہوں کہ بلافہم بھی تلاوت کرنی چاہئے اس فکر میں رہنا کہ ہم میں فہم پیدا ہو جائیگی

اور عربیت سے بخوبی واقف ہوجائیں گے تب تلاوت کریں گے یہ دھوکا ہے اور نفس و شیطان کا کید ہے اس کی طرف اصلا التفات نہ کرنا چاہئے۔ اگر فہم کو شرط قرار دیا جائے تو بہت سے مسلمان اس تلاوت کی نعمت عظمیٰ سے محروم ہوجائیں گے اس لئے کہ اکثریت تو بے سمجھوں ہی ہے ہے جب تک سمجھ پیدا کریں گے عمر کا ایک کثیر حصہ ختم ہوچکے گا اور اکثر تو مر ہی جائیں گے تو نہ سمجھ ہی پیدا ہوگی اور نہ تلاوت ہی کے برکات سے حصہ ملے گا خالی کے خالی ہی رہ جائیں گے اور تلاوت کے ذریعہ جو رشتہ اور تعلق اللہ سے جڑتا ہے وہ منقطع ہوجائے گا تو یہ کس قدر حرمان اور خسارہ کی چیز ہوگی۔ خوب سمجھ لیجئے۔

اور یہ بھی سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہر طرح سے اعجاز رکھا ہے۔ الفاظ کے اعتبار سے بھی اور معانی کے اعتبار سے بھی۔ چنانچہ عرب فصاحت، بلاغت میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ کئی کئی سو شعر فی البدیہہ کہہ دیتے تھے مگر قرآن کی ایک چھوٹی سورہ کے برابر بھی نہ لا سکے۔

اسی طرح اس کے معانی کے سمجھنے میں اعجاز ہے۔ حضرت مولانا قاسم صاحبؒ فرماتے تھے کہ کتنی ہی کتب تفاسیر دیکھ لی جائیں۔ مگر قرآن کے مطالب و معانی محفوظ نہیں رہتے۔ تو آخر کیا بات ہے بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ معنی میں اس قدر وسعت ہے کہ احاطہ نہیں ہو پاتا۔ عقل حیران ہوجاتی ہے۔ ایک ہی آیت میں مفسرین کے مختلف اقوال ہوتے ہیں سب کا مستحضر رکھنا بہت دشوار امر ہے۔ بار بار مراجعت کی ضرورت پڑتی ہے۔

قرآن پاک کے الفاظ ہی کا یاد کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے چونکہ حفاظت کا ذمہ لیا ہے اس لئے حفاظ پر اس کے حفظ کو آسان فرما دیتے ہیں ورنہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ یاد رکھ سکے۔

پس اگر ہر شخص کو فہم کا مکلف کر دیا جائے تو بہت ہی دشواری ہوجائیگی۔ جیسے کوئی انگریزی اور ہندی نہ جانتا ہو ایسے شخص سے کہا جائے کہ اس میں تدبر کرو تو بھلا کیسے تدبر کر سکتا ہے ظاہر ہے کہ یہ امر تکلیف مالایطاق کے قبیل سے ہوگا۔

سنئے! میں تدبر و تفکر اور فہم قرآن کو منع نہیں کرتا۔ سب لوگ عالم ہوجائیں اور تفکر فی القرآن کرنے لگیں تو اس سے بڑھ کر خوشی کی کیا بات ہوسکتی ہے۔ مگر تلاوت کا اس کو موقوف علیہ ٹھہرانا البتہ خلاف نقل و عقل ہے اور بزرگوں کی تصریحات کے مزاحم ہے۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "التبیان" سے حامل قرآن کے آداب نقل کر دیئے جائیں جو نہایت ہی ضروری اور قابل رعایت ہیں۔ اس کے بعد انشاء اللہ تلاوت قرآن کے آداب بیان کئے جائیںگے۔

حاملِ قرآن کے آداب

حامل قرآن کو جن آداب سے مؤدب اور جن صفات سے متصف ہونا چاہیئے وہ بہت ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ اس کے حالات نہایت ہی عمدہ اور خصال بہت ہی بہتر ہونی چاہیئیں نیز قرآن کریم کی تعظیم اور اس کے اجلال کی خاطر اس کو چاہیئے کہ اپنے نفس کو ان تمام چیزوں سے دور رکھے جن سے قرآن شریف نے منع فرمایا ہے۔ نیز اسے چاہیئے کہ رذیل کمائی سے احتراز کرے شریف النفس ہو اور اہل دنیا جو ظالم اور جابر ہیں ان سے استغناء و ترفع برتے اور جو لوگ اہل خیر اور صالحین یا مساکین ہیں ان سے غایت تواضع کے ساتھ پیش آئے۔ نیز حامل قرآن کو چاہیئے کہ صاحب خشوع ہو اور صاحب وقار و اہل سکینہ ہو۔

حضرت عمر بن الخطاب رضؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اے قراء کی جماعت اپنے سروں کو اٹھاؤ دیکھو! تمہارے لئے راستہ واضح ہے لہٰذا نیکی میں سبقت کرنے والے ہو اور لوگوں پر بار نہ ہو۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جس کے سینے میں قرآن ہو اس کو ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی رات سے پہچانا جائے جس وقت کہ سب لوگ سو رہے ہوں اور اپنے دن سے پہچانا جائے جبکہ لوگ کھا پی رہے ہوں (یعنی روزہ رکھے ہوئے ہو) اور اپنے حزن و غم سے پہچانا جائے جس وقت کہ سب لوگ خوشیاں منا رہے ہوں اور اپنے گریہ و زاری سے پہچانا جائے جبکہ لوگ ہنس بول رہے ہوں اور اپنی خاموشی و سکوت سے پہچانا جائے جبکہ سب لوگ ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے ہوں اور بکواس میں مشغول ہوں۔ اسی طرح اپنی مسکنت و تواضع سے پہچانا جائے جس وقت کہ سب لوگ فخر و غرور کی باتوں میں لگے ہوئے ہوں۔

حضرت حسن بن علیؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ تھے ان کی حالت یہ تھی کہ قرآن کو اپنے رب کے پاس سے آیا ہوا مکتوب سمجھتے تھے چنانچہ رات کو اس میں تدبر کرتے تھے اور دن میں اپنے پر اس کو نافذ کرتے تھے یعنی اس کے احکام پر عمل کرتے تھے۔

حضرت فضیل بن عیاض فرماتے ہیں کہ حامل قرآن کو اپنی کوئی حاجت خلفاء کے پاس اور دوسرے کسی اعیان سلطنت کے پاس نہیں لیجانا چاہیئے۔ انھیں سے یہ بھی منقول ہے کہ حامل قرآن گویا پرچم اسلام

کا حامل ہے لہذا اس کی شان سب سے الگ ہونی چاہئے یعنی نہ تو کسی لہو کرنے والے کے ساتھ لہو کرے اور نہ کسی سہو کرنے والے کے ساتھ سہو کرے اور نہ کسی لغو کام کرنے والے کے ساتھ ہو کر لغو میں پڑے حق قرآن کے اجلال اور اس کی تعظیم کا یہی تقاضا ہے۔

فصل۔ حامل قرآن کو جن امور کا حکم کیا جائے گا ان میں سے ایک اہم شئے یہ بھی ہے کہ قرآن کریم کو ذریعہ معاش اور کمائی بنانے سے بہت ہی زیادہ حذر کرے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن بن شبیل رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

"قرآن کو پڑھو مگر اس کو کھانا نہ بناؤ۔ نہ اس پر ظلم و جفا کرو کہ سیکھو ہی نہیں اور نہ اس میں غلو کرو کہ محض آواز درست کرنے اور حروف نکالنے ہی کے درپے رہو۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قرآن کو اس سے پہلے پہلے پڑھ لو کہ ایک ایسی قوم آوے جو اس کو تیر کے مانند سیدھا کرے گی اور دنیا ہی میں اس کا صلہ چاہے گی (یعنی تعریف و شہرت اور مال وغیرہ) اور آخرت اس کو مقصود نہ ہوگی۔

حضرت فضیل بن عمرو رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی میں سے دو شخص کسی مسجد میں گئے نماز کے بعد جب امام نے سلام پھیرا تو کوئی شخص کھڑا ہوا اور قرآن شریف کی چند آیتیں تلاوت کیں پھر لوگوں سے سوال کیا۔ یہ دیکھ کر ان دونوں صحابیوں میں سے ایک نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا اور پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ عنقریب ایک قوم ایسی آئے گی جو قرآن پڑھ کر لوگوں سے سوال کرے گی سو جو شخص قرآن کے ذریعہ سوال کرے اس کو مت دو۔

معمولاتِ سلف

فصل۔ مناسب ہے کہ تلاوت قرآن پر محافظت کیجائے اور اس کا زیادہ سے زیادہ معمول دکھاجائے چنانچہ اسلاف کا معمول ختم قرآن کے مقدار کے باب میں مختلف تھا۔ بعض سلف کا تو یہ معمول تھا کہ وہ دو ماہ میں ایک ختم کرتے تھے اور بعض ہر مہینہ میں ایک ختم۔ اور بعض ہر عشرہ میں ایک بار یعنی ایک ماہ میں تین ختم کرتے تھے۔ اور بعض ہر ہفتہ میں ایک ختم کرتے تھے۔ اور ایسے تو بہت گذرے ہیں جو ہفتہ میں ایک ختم کرتے تھے۔ بعض چھ دن میں اور پانچ دن میں۔ بعض چار دن میں قرآن شریف

ختم کرتے تھے۔ اور بہت سے لوگوں کا معمول تین دن میں ختم کرنے کا تھا۔ بعضے دو ہی دن میں ختم کرتے تھے۔ بعض شبانہ روز میں ختم کرتے تھے۔ اور بعض حضرات ایک دن میں دو ختم فرماتے تھے۔ بعضے حضرات تین ختم فرماتے تھے۔ بعضوں سے رات دن میں آٹھ آٹھ ختم منقول ہے۔ چار دن میں اور چار رات میں۔

چنانچہ حضرت سیدنا عثمان رضؓ تمیم داری رضؓ سعید بن جبیرؒ مجاہدؒ اور حضرت امام شافعیؒ ان لوگوں میں سے ہیں جن کا معمول ایک دن رات میں سارا قرآن ختم کرنے کا تھا۔ اور جن لوگوں نے ایک دن رات میں تین تین ختم کیا ہے ان میں سے ایک حضرت سلیم بن عمر رضؓ ہیں جو خلافت معاویہ رضؓ کے دور میں مصر کے قاضی تھے اور ابوبکر بن داؤد کے بیان کے مطابق تو وہ ایک شب میں چار ختم فرمایا کرتے تھے۔

اور ایک بزرگ ہیں ابن الکاتب ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دن میں چار ختم کرتے تھے اور پھر چار ہی ختم رات کو بھی فرمایا کرتے تھے۔ اور یہی سب سے زیادہ مقدار ہے جو اس باب میں ہم تک پہونچی ہے یعنی روزانہ آٹھ ختم سے زائد کسی کے متعلق روایت نہیں پہونچی رہا یہ کہ قرآن شریف کا ختم کم سے کم کتنے وقت میں کیا گیا تو اس کے متعلق سنئے!

حضرت منصور بن زاذان جو عُبّاد تابعین میں شمار کئے جاتے ہیں وہ رمضان شریف میں روزانہ دو ختم فرماتے تھے ایک ظہر اور عصر کے مابین اور دوسرا مغرب وعشاء کے درمیان۔

نیز ابوداؤد کی روایت ہے کہ مجاہدؒ مغرب اور عشاء کے مابین قرآن ختم فرمایا کرتے تھے۔ منصور کہتے ہیں کہ علی ازدیؒ رمضان شریف میں مابین مغرب وعشاء ایک قرآن ختم کیا کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم بن سعدؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد حبوہ باندھ کر بیٹھتے تھے اور اپنے حبوہ کو کھولتے نہ تھے یہاں تک کہ قرآن ختم فرمالیتے تھے۔

(**احتباء**:- یہ ایک طریقہ نشست ہے کہ اس میں بیٹھ اور پنڈلیوں کو کسی رومال یا چادر وغیرہ سے باندھ لیتے تھے جس کی وجہ سے بیٹھنے میں راحت ملتی ہے اور اس کپڑے کو جس سے باندھتے ہیں حبوہ کہتے ہیں۔)

اور وہ حضرات جنھوں نے ایک رکعت میں ختم قرآن کیا ہے تو وہ بھی بیشمار ہیں۔ چنانچہ متقدمین میں سے حضرت عثمان رضؓ تمیم داری رضؓ سعید بن جبیر رضؓ اسی فہرست میں ہیں۔

اسی طرح جو حضرات ہفتہ میں ایک دفعہ قرآن شریف ختم فرماتے تھے وہ بھی بکثرت ہیں۔ چنانچہ صحابہ میں سے حضرت عثمان رضؓ۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ حضرت زید بن ثابت رضؓ حضرت ابی بن کعب رضؓ اور تابعین میں سے حضرت عبدالرحمٰن بن یزیدؒ حضرت علقمہؒ حضرت ابراہیمؒ وغیرہم کا یہی معمول تھا۔

یہی معمول "فمی بشوق" کہلاتا ہے۔ اس میں قرآن شریف کی سات منزلوں کی طرف اشارہ ہے

اس طرح کہ ہر منزل کی اول سورہ کا نام پہلے حرف سے مراد ہے۔ یعنی فاؔ سے فاتحہ۔ میمؔ سے مائدہ۔ یاؔ سے یونس۔ باؔ سے بنی اسرائیل۔ شینؔ سے شعرا۔ واؔو سے والصّٰفّٰت۔ اور قافؔ سے سورہ قٓ

یہی ہمارے بزرگوں یعنی حضرت حاجی صاحبؒ و حضرت مولانا تھانویؒ کا بھی معمول تھا۔ اسلاف کا معمول تلاوت کے باب میں جو تھا آپ نے ملاحظہ فرمایا اب سنئے کہ قول فیصل اس باب میں یہ ہے کہ یہ مقدار اشخاص کے اختلاف سے مختلف ہے۔ چنانچہ جس شخص کے لئے دقیق ذکر سے لطائف و معارف قرآنیہ ظاہر ہوں اس کو چاہیے کہ اتنی مقدار پڑھے کہ جس سے اپنے پڑھے ہوئے کو کامل طور سے سمجھ بھی سکے اور جو شخص اشاعت علم دین یا اسی طرح کے اور دوسرے مہمات دین اور مصالح عامۂ مسلمین میں مشغول ہو تو اس کو چاہئے کہ تلاوت میں اتنی ہی مقدار پر اکتفا کرے جس سے اس کے مقصد میں خلل واقع نہ ہو اور اگر ان لوگوں میں سے نہیں ہے تو پھر جس قدر زیادہ تلاوت کر سکے کرے بس اس کا خیال رکھے کہ اتنی تکثیر نہ کرے جو موجب کلال و ملال ہو جائے یا جلدی ختم کرنے کے لئے تیز تیز پڑھنے لگے جیسے گھاس کاٹ رہا ہو معاذ اللہ۔

فصل۔ (ایک ادب حامل قرآن کا یہ ہے کہ) اس کو چاہیے کہ قرآن شریف کی تلاوت شب کے اوقات میں زیادہ کرے۔ بالخصوص تہجد کی نماز میں۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ

یہ سب برابر نہیں ان اہل کتاب میں سے ایک جماعت وہ بھی ہے جو قائم ہیں اللہ کی آیتیں اوقات شب میں پڑھتے ہیں۔ اور وہ نماز بھی پڑھتے ہیں۔ اللہ پر اور قیامت والے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور نیک کام بتلاتے ہیں۔ اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔ اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں۔ اور یہ لوگ شائستہ لوگوں میں ہیں۔

نیز صحیح روایتوں میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبد اللہ بہت ہی خوب آدمی ہیں کاش وہ رات میں بھی نمازیں پڑھتے۔ دوسری صحیح حدیث میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عبد اللہ اس شخص کے مانند مت ہو جانا کہ وہ رات کو اٹھا کرتا تھا پھر اٹھنا ترک کر دیا۔

حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کا شرف قیام لیل میں ہے

احادیث و آثار اس باب میں بہت ہیں۔ چنانچہ ابو الاحوص جشمی کہتے ہیں کہ ایک شخص لوگوں کے خیموں کے

درمیان سے شب میں گذرتا اور اس کے رہنے والوں کی آواز ایسی سنتا تھا جیسے کہ شہد کے مکھی کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے تو یہ سن کر ترحما کہتا تھا کہ کیا صورت ہو کہ یہ لوگ جس چیز سے خوف کر رہے ہیں (جیسا کہ انکی آواز سے ظاہر ہو رہا ہے) اس سے مطمئن اور بے خوف ہو جائیں۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ شب میں قرآن شریف ضرور پڑھا کرو چاہے تھوڑی ہی دیر سہی۔ مثلاً اتنی ہی دیر جتنا بکری دوہنے میں لگتا ہے۔ حضرت یزید رقاشیؒ فرماتے ہیں کہ جب میں شب میں سو رہوں اور آخر شب میں آنکھ کھلے (تو بھی نہ اٹھوں اور پھر سو جاؤں تو خدا کرے کہ میری آنکھوں کو کبھی سونا نصیب نہ ہو (شب بیداری کی دولت پاکر پھر اس سے متمتع نہ ہونے کے قلق کو اس عنوان سے ظاہر کرتے تھے)

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ میں نے صلوٰۃ لیل اور اس میں تلاوت کی فضیلت اس لئے بیان کی اور اس کو راجح اس لئے کہا کہ اس وقت جو تلاوت ہوتی ہے وہ قلب کی جمعیت کے ساتھ ہوتی ہے۔ دیگر مشاغل لہو ولعب اور ضروریات وحوائج کی فکر سے خالی ہوتی ہے۔ ریا سے پاک ہوتی ہے۔ اور دوسری محبطات اجر سے محفوظ ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں شریعت میں رات کے جو فضائل وارد ہیں۔ مثلاً یہ کہ خیرات وبرکات کا ایجاد رات ہی میں ہوتا ہے۔ وہ سب تالی کو حاصل ہونگی۔

دیکھو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معراج ہوئی وہ شب ہی میں ہوئی۔ اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ تمہارا رب ہر شب نصف رات گذرنے کے بعد سمائے دنیا پر نزول فرماتا ہے اور اعلان فرمایا جاتا ہے کہ ہے کوئی دعا کرنے والا جس کے دعا کی اجابت کروں الحدیث (تو دیکھو یہ بھی رات ہی میں ہوتا ہے) اور سنو! حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر رات میں ایک ساعت ایسی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت کی دعا قبول فرماتا ہے۔

پھر یہ سمجھو کہ قیام لیل کی فضیلت اور اسمیں قرات کا شرف قلیل مقدار اور کثیر مقدار سب سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جس قدر زیادہ مقدار ہوگی اتنی ہی بہتر ہوگی۔ باقی ساری رات کو گھیر لینا تو اگر کبھی کبھی ہو تو مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ صحت کے لئے مضر نہ ہو۔ لیکن اس پر دوام برتنا مکروہ ہے۔ اور جو کہا گیا ہے کہ فضیلت قیام لیل سے بھی حاصل ہوتی - تو اس کی دلیل سنو!

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے شب میں دس آیتیں نماز میں پڑھیں تو وہ غافلین میں سے نہیں شمار ہوگا۔ اور جو شخص سو آیتیں پڑھیگا اس کا شمار قانتین میں ہوگا اور جو ایک ہزار آیتیں پڑھ لیگا وہ مقنطین میں شمار ہوگا۔

حضرت ثعلبیؒ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جس شخص نے رات میں صرف دو رکعتیں بھی پڑھ لیں تو گویا اس نے ساری رات اللہ کے آگے رکوع اور سجدے میں گزاری۔

فصل ۔ ایک ادب حامل قرآن کا یہ ہے کہ وہ اپنے پڑھے ہوئے کو یاد بھی رکھے بھولنے نہ دے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس قرآن کی اچھی طرح سے حفاظت کرو اور نگرانی رکھو قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے۔ یہ قرآن اس اونٹ سے بھی زیادہ بھاگ نکلنے والا ہے جس کی ٹانگیں رسی میں بندھی ہوں۔

حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صاحب قرآن کی مثال ایسی ہے جیسے کہ صاحب ابل جس نے اس کی ٹانگ باندھ رکھی ہو اب اگر اس نے اس کا خیال رکھا تب تو اونٹ پر اس کا قابو رہ سکے گا اور اگر کھول دیا تو اونٹ نکل بھاگے گا۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ پر میری امت کے اعمال کے اجور پیش کئے گئے یہانتک کہ اگر کسی شخص نے مسجد سے خس و خاشاک کو دور کیا تھا تو وہ بھی پیش ہوا۔ اسی طرح میری امت کے ذنوب بھی پیش کئے گئے۔ مجھے ان میں کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں نظر آیا کہ کسی انسان کو قرآن شریف کی کوئی سورۃ یا کوئی آیت یاد ہو اور پھر اس نے اس کو بھلا دیا ہو۔

حضرت سعد بن عبادہؓ سے مروی ہے کہ جس شخص نے قرآن شریف کو پڑھا پھر اس کو بھلا دیا تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کے بدن پر جذام ہوگا۔

فصل ۔ حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو شخص شب میں اپنے ورد وغیرہ سے سو جائے پھر اس کو صبح، فجر اور ظہر کے درمیانی وقت میں ادا کرے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ اس نے شب ہی میں ادا کیا ہو۔ حضرت سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ میں ایک شب اپنے ورد کو نہ پڑھ سکا اور میرا ورد سورہ بقرہ کی تلاوت کا تھا جب صبح کو اٹھا تو میں نے "انا للہ و انا الیہ راجعون" پڑھا اسی رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بقرہ (یعنی گائے) ہے جو مجھ کو اپنے سینگ سے مار رہی ہے۔ ابن ابی الدنیا نے کسی حافظ قرآن کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شب وہ سو گئے اور اپنے معمول کو نہ ادا کر سکے۔ شب کو انھوں نے خواب دیکھا کہ کوئی کہنے والا ان سے کہہ رہا ہے کہ "بڑے افسوس اور تعجب کی بات ہے کہ ایسا تن و توش اور ایسی صحت رکھنے والا جوان تو صبح تک پڑا سوتا رہے یعنی اس قدر غافل ہو۔ اور موت کا یہ حال ہے کہ اس کے جھپٹنے سے رات کی تاریکی میں امن نہیں ہے۔ (اس کا تو تقاضا تھا کہ انسان اس طرح سے غافل نہ سوتا۔

آداب تلاوت قرآن

میں نے شروع میں وعدہ کیا تھا کہ آداب تلاوت مستقل طور پر بیان کروں گا اس لئے بیان کرتا ہوں بعض آداب پہلے بیان ہو چکے ہیں تاہم ثانیاً لکھتا ہوں تاکہ سب یکجا ہو جائیں۔ وَهُوَ هٰذَا

کتاب الاذکار میں ہے کہ

سب سے پہلی چیز جس کا قاری اپنی قرأت میں مامور ہے وہ اخلاص ہے۔ اور قرآن پاک کے آداب کی رعایت ہے۔ پس اس کو چاہئے کہ اپنے نفس میں یہ استحضار کرے کہ اللہ تعالیٰ سے مناجات کر رہا ہے۔ اور قرأت ایسے حال پر کرے گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اگر یہ نہیں دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ تو دیکھتے ہیں۔

احیاء العلوم میں ہے کہ

تلاوت کرنے والے کو چاہئے کہ کلام کی عظمت کو سمجھے اور ابتداءِ تلاوت ہی میں متکلم کی تعظیم کو مستحضر کرے اور یہ سوچے کہ جس کلام کی تلاوت کرنے جا رہا ہے وہ کسی بشر کا کلام نہیں ہے بلکہ اللہ جل شانہٗ کا کلام ہے۔

نیز احیاء العلوم میں ہے کہ

قاری کے لئے مناسب ہے کہ باوضو ہو۔ وقار اور سکون کی ہیئت میں ہو۔ قبلہ رو ہو۔ اس کا بیٹھنا تکبر کے طور پر نہ ہو بلکہ اس کا جلوس خلوت میں اس طور پر ہو جیسے ایک شاگرد رشید اپنے استاد محترم کے سامنے بیٹھتا ہے۔ اور افضل احوال یہ ہے کہ نماز میں کھڑے ہو کر پڑھے اور اگر وہ مسجد میں ہو تو یہ افضل الاعمال ہے اور اگر بلا وضو کے لیٹ کر قرأت کرے تب بھی فضیلت ہے مگر پہلی قرأت سے اسکی افضلیت کم ہے۔

کتاب الاذکار میں ہے کہ

(**فصل**) قاری کی شان یہ ہونی چاہئے کہ اس کی قرأت میں خشوع و تدبر اور خضوع ہو اور یہی مطلوب و مقصود ہے اسی سے سینوں میں انشراح اور قلوب میں نور پیدا ہوتا ہے چنانچہ سلف کے کچھ لوگ ایک آیت کی تلاوت رات رات بھر کرتے رہ جاتے تھے۔ اور رات کے اکثر حصہ کو تدبر کرنے میں گذار دیتے تھے۔ اور ایک جماعت تو قرأت کے وقت بیہوش ہو گئی اور کتنے لوگ مر بھی گئے اور مستحب یہ ہے کہ قرأت کے وقت

روئے اگر رونے پر قادر نہ ہو تو رونے کی صورت بنادے۔ اس لئے کہ قرأت کے وقت بکاء عارفین کی عادت اور اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں کا طریقہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا الآیہ اور ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں روتے ہوئے، اور یہ قرآن ان کا خشوع اور بڑھا دیتا ہے۔

صاحب روح المعانی اس آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ

وقد جاء فی مدح البکاء من خشیۃ تعالیٰ اخبار کثیرۃ اخرج الحکیم الترمذی عن النضر ابن سعد قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو ان عبداً بکی فی امۃ لانجی اللہ تعالیٰ تلک الامۃ من النار ببکاء ذالک العبد۔

اور اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے کی مدح میں بہت کثرت سے روایات آئی ہیں چنانچہ حکیم ترمذی نے نضر بن سعد سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی بندہ کسی قوم میں (اللہ تعالیٰ کے خوف سے) روتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پوری امت کو (اس ایک بندہ کے رونے کے سبب) نار جہنم سے رہائی نصیب فرما دیتے ہیں۔

وما عمل الا لہ وزن وثواب الا الدمعۃ فانھا تطفی بحوراً من النار وما اغرورقت عین بماءھا من خشیۃ اللہ تعالیٰ الا حرم اللہ تعالیٰ جسدھا علی النار فان فاضت علی خدہ لم یرھق وجھہ قتر ولا ذلۃ۔

اور ہر عمل کے لئے ایک خاص وزن اور ثواب ہوتا ہے بجز آنسو کے کہ وہ آگ کے بہت سے سمندروں کو بجھا دیتا ہے اور کوئی آنکھ ایسی نہیں ہے جسمیں خدا کے خوف سے آنسو ڈبڈبا آئے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدن کو دوزخ پر حرام فرمائیں گے اور اگر وہ آنسو اس کے رخسارہ پر گر جائے تو اس کے چہرہ کو ذرا بھی نہ دھواں پہونچے گا نہ ذلت۔

واخرج ایضا عن ابن عباس قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول عینان لا تمسھما النار عین بکت من خشیۃ اللہ وعین تحرس فی سبیل اللہ

اسی طرح حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ دو آنکھیں ایسی ہیں کہ نار جہنم ان کو نہ چھوئیگی ایک تو وہ جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئی ہو۔ اور دوسری وہ جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں حفاظت کے لئے جاگی ہو۔

واخرج ھو والنسائی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یلج النار رجل بکی من خشیۃ اللہ تعالیٰ حتی یعود اللبن فی الضرع ولا اجتمع علی عبد غبار فی

اسی طرح نسائی وغیرہ نے تخریج کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص جو کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے رویا ہو اس وقت تک دوزخ میں داخل نہ ہوگا جب تک کہ دودھ تھن میں نہ لوٹ جائے (یہ تعلیق بالمحال ہے یعنی نہ یہ ہوگا اور نہ وہ ہوگا) اور یہ فرمایا

سبیل اللہ تعالیٰ ودخان جھنم رواہ النسائی فی سننه ومسلم ابدًا ۔ وینبغی ان یکون ذالک حال العلماء فقد اخرج ابن جریر وابن المنذر وغیرهما عن عبد الاعلی التیمی انه قال ان من اوتی من العلم ما لا یبکیه لخلیق ان لا یکون اوتی من العلم ما ینفعه لان اللہ تعالیٰ نعت اهل العلم فقال ویخرون للاذقان یبکون ۔

کہ کسی انسان کے نتھنوں میں اللہ تعالیٰ کے رستہ کی گرد اور دوزخ کا دھواں یہ دونوں چیزیں ہرگز جمع نہیں ہوسکتیں (یعنی دنیا میں جب اللہ کے راستہ میں گرد کھائی ہے تو آخرت میں عذاب جہنم سے محفوظ رہے گا) اور لائق ہے کہ یہی حال علما کا بھی ہو۔ اسلئے کہ ابن جریر وغیرہ نے عبدالاعلی تیمی سے تخریج کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ایسا علم دیا گیا جو اس کو نہ رلائے تو حق ہے کہ کہا جائے کہ وہ ایسا علم دیا گیا جو اس کے حق میں نافع نہیں ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے علم کے وصف میں یہ فرمایا ہے کہ اپنے منہ کے بل گر پڑتے ہیں اور روتے ہیں (پس جو عالم خدا کے خوف سے رویا نہیں وہ کیا عالم ہوا)

فصل ۔ قرآن دیکھ کر پڑھنا افضل ہے زبانی پڑھنے سے یہی ہمارے اصحاب نے کہا ہے اور سلف سے بھی منقول ہے مگر یہ علی الاطلاق نہیں بلکہ اگر قاری کا حال یہ ہے کہ زبانی پڑھنے میں اس کو زیادہ تدبر وتفکر اور جمعیت قلب حاصل ہوتی ہے تو اس صورت میں اس کے لئے یہی افضل ہے اور دونوں میں تدبر وتفکر یکساں ہے تو پھر قرآن دیکھ کر ہی پڑھنا افضل ہے اور یہی سلف کی مراد ہے

فصل ۔ قراءت میں رفع صوت کے بارے میں احادیث آئی ہیں اور اسرار (پوشیدہ پڑھنا) کی فضیلت میں بھی بہت سی آئی وارد ہیں ان دونوں میں تطبیق اور جمع کی صورت یہ ہے کہ اسرار ریاء سے بہت بعید ہے تو جن لوگوں کو اس کا خوف ہو ان لوگوں کے حق میں اسرار ہی افضل ہے اور اگر ریاء کا خوف نہ ہو تو جہر افضل ہے بشرطیکہ اس سے کسی نماز پڑھنے والے یا سونے والے کو اذیت نہ ہو۔

جہر کے افضل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں عمل بڑا ہے اور اس کا نفع غیروں کو بھی پہونچتا ہے اور جہر قاری کے قلب کو بیدار کر دیتا ہے۔ اس کے خیال کو غور وفکر کی طرف جمع کر دیتا ہے۔ اس کے کان کو اس کی طرف پھیر دیتا ہے۔ نیند کو ختم کر دیتا ہے۔ نشاط کو زیادہ کرتا ہے۔ دوسری نائمین وغافلین کو بیدار کرکے ان میں نشاط پیدا کر دیتا ہے۔ پس اگر جہر سے ان مذکورہ اشیاء میں سے کوئی شے مقصود ومطلوب ہو تو جہر افضل ہے

فصل ۔ قراءت میں تحسین صورت اور اس کی تزئین مستحب ہے مگر جبکہ حد سے تجاوز نہ ہو جائے پس اگر کسی حرف کو زیادہ کر دے یا کم کر دے تو یہ حرام ہے۔ اور الحان سے قراءت کرنے میں اگر افراط نہ ہو تو

جائز ہے ورنہ حرام ہے۔

فصل۔ قاری کو چاہیئے کہ ایسی جگہ سے قرات شروع کرے اور ایسی جگہ پر وقف کرے کہ معنی مربوط رہیں۔ اب اس امر میں بہت کوتاہی ہو رہی ہے اس لئے ہرگز ہرگز اس میں لوگوں کی تقلید نہ کرنی چاہیئے۔ بلکہ سید جلیل ابو علی فضیل ابن عیاض کے مقولہ کو اپنا لائحہ عمل بنانا چاہیے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

لا تستوحش طرق الهدى لقلة اهلها ولا تغتر بكثرة الهالكين	ہدایت کے راستوں سے اس بنا پر کہ ان پر چلنے والے کم ہیں متوحش نہ ہو اور کثرت ہالکین سے دھوکہ میں نہ پڑو (یعنی انکی کثرت کو دیکھکر تم بھی انکی اتباع کرنے لگو اور ہلاکت میں پڑ جاؤ۔

(یہ سب آداب کتاب الاذکار للنووی سے ماخوذ ہیں)

پس اگر ان آداب مذکورہ کا لحاظ کر کے تلاوت کی جائے تو ضرور تلاوت کے فیوض و برکات حاصل ہوں گے اور تلاوت کی لذت و حلاوت ملے گی اور جس کو تلاوت میں لذت و حلاوت ملجائے گی اس کو کبھی بھی تلاوت سے سیری نہ ہوگی۔ چنانچہ صحابہ کو قرآن پاک میں ایسی حلاوت حاصل تھی کہ ان کو کسی دوسری چیز میں ایسی حلاوت ملتی ہی نہ تھی۔

روایت ہے کہ جب صلوٰۃ خمس فرض ہوئیں تو صلوٰۃ تہجد کی فرضیت ساقط ہو گئی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال ہوا کہ تہجد کی فرضیت کے ساقط ہو جانے کے بعد دیکھیں صحابہ کا کیا حال ہے۔ آخر شب میں تلاوت کلام اللہ کرتے ہیں یا نہیں چنانچہ آپ صحابہ کے حجروں سے گذرے تو شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناہٹ سُنی۔ یعنی بدستور سابق لوگ قرات قرآن میں مشغول تھے۔ بھلا وہ کیسے چھوڑ سکتے تھے ان کے گوشت و پوست، سمع، بصر، دل و دماغ میں قرآن رچ بس گیا تھا۔ اور پوری طرح سرایت کر گیا تھا ان کا جزو لاینفک ہو گیا تھا۔ اس لئے فرضیت تہجد رہے نہ رہے ہر حال میں تلاوت کرنے پر مجبور تھے ان کو قرآن پاک سے تعلق ہو گیا تھا اور اس بابرکت وقت سے تعلق ہو گیا تھا ان کو اسوقت کی برکت و حلاوت مل چکی تھی تو پھر کیسے اس سے غافل ہو سکتے تھے۔

ایک صحابی قرآن پاک کی قرات نہایت خوش الحانی سے کر رہے تھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ سنا تو فرمایا کہ فلاں شخص تو لحن داؤد دیئے گئے ہیں۔ انھوں نے یہ سنکر کہا کہ اگر میں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سُن رہے ہیں تو اور زیادہ خوش الحانی سے پڑھتا

ایک مرتبہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کی طبیعت رمضان شریف میں ناساز ہوئی امام صاحب سے لوگوں نے کہدیا کہ حضرت حاجی صاحبؒ کو کچھ نقاہت ہے لہٰذا تراویح میں قرآن پاک معمول

سے کم پڑھا جائے چنانچہ امام صاحب نے ایسا ہی کیا جب امام صاحب فارغ ہوئے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے ارشاد فرمایا کہئے امام صاحب مزاج تو اچھا ہے؟ کیوں کم پڑھا۔ امام صاحب نے کہا کہ حضرت کی طبیعت ناساز تھی اس لئے کم پڑھا تب حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ نہیں۔ میرا تو حال یہ ہے کہ جب قرآن شریف کوئی پڑھتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ سنتا ہی چلا جاؤں ـــــ اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ اور اکابر کو قرآن پاک سے انتہائی مناسبت تھی اور اس کی تلاوت سے ان حضرات کو حظ و حلاوت ایسی ملتی تھی جس کی وجہ سے بس قراءت کرتے اور سنتے ہی چلے جاتے تھے ذرا تکان و ملال محسوس نہ فرماتے تھے۔

سنئے! بات یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو معجزات عطا فرمائے اور یہی معجزات ان کی نبوت و رسالت کے لئے حجت اور دلیل بنتے ہیں اور اولیاء کو انبیاء کی وراثت میں کرامت عطا فرماتے ہیں تاکہ منکرین کو زیر کریں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں نہایت زبردست کشش اور تاثیر عطا فرمائی ہے جسکی وجہ سے وہ بڑے بڑے منکر و معاند کو مغلوب و مجوج کر دیتا ہے۔ آخر کوئی بات ہے جبھی تو عرب کے لوگ اسکی فصاحت و بلاغت کو دیکھ کر منہ کے بل گر پڑے اور قرآن کی فصاحت و بلاغت کا اقرار کیا حالانکہ وہ لوگ اپنے سامنے کسی دوسرے کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ بیشک یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے کوئی بشر ایسے کلام پر قادر نہیں ہوسکتا۔ اس بات کو تو دل میں سب مان گئے مگر جن کی قسمت میں سعادت تھی وہ ایمان لائے اور جو شقی تھے وہ اپنے کفر و عناد ہی پر ڈٹے رہے

ایک بات اور سنئے! مختصر المعانی میں گھوڑوں کی تعریف میں یہ مصرع آیا ہے :-

ع "سبوح لہا منہا علیہا شواہد"

یعنی ایسے گھوڑے ہیں کہ ان کے لئے انھیں سے ان پر شواہد ہیں۔ یعنی خارج سے ان کی خوبیوں کے لئے دلائل و شواہد کی ضرورت نہیں ہے اس مصرع کو میں قرآن پاک پر پڑھتا ہوں اور بیشک قرآن ہی ایسا ہے کہ اس پر یہ مصرع پڑھا جاوے کہ قرآن کے فضائل اور اس کی خوبیوں پر خود قرآن پاک ہی شاہد ہے ع "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"

بس اب اخیر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو نازل فرما کر فیوض و برکات کے ابواب کو مفتوح فرما دیا ہے اور اپنے سے رشتہ و تعلق جوڑنے کے لئے اعلیٰ ترین ذریعہ ہم میں چھوڑ رکھا ہے۔ اب ہم اگر اس کی قدر نہ کریں بلکہ اس کے علاوہ کلام و اشعار سے ذوق و حال پیدا کریں اور کلام اللہ میں تدبر و تفکر تو درکنار تلاوت کے بھی روادار نہ ہوں تو بہت ہی خسران اور حرمان ہے اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی ناراضی کا موجب ہے۔

سنئے! اگر آپ لوگ اللہ تعالیٰ کی رأفت و عنایت کو مبذول کرانا چاہتے ہیں تو بس کلام اللہ کی طرف توجہ کیجئے اور اپنا رشتہ کلام اللہ سے جوڑیئے اور قوی تعلق پیدا کیجئے پھر دیکھئے اللہ تعالیٰ کی عنایت متوجہ ہوتی ہے یا نہیں۔

آخرت میں جو عزت و شرف و کرامت ملیگی اس کا تو پوچھنا ہی کیا دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اس کی کفالت فرمائیں گے چنانچہ حدیث شریف میں مذکور ہے کہ جس کو قرآن کی قراءت اور ذکر نے مجھ سے سوال کرنے سے باز رکھا تو سائلین کو جو کچھ دیتا ہوں اس سے افضل شئے اس کو دوں گا۔

اب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ادعیہ پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

وَاَسْأَلُکَ بِکُلِّ اِسْمٍ هُوَ لَکَ سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَکَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ کِتَابِکَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِکَ اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ بَصَرِیْ وَجِلَاءَ حُزْنِیْ وَذَهَابَ هَمِّیْ۔ یعنی سوال کرتا ہوں میں تجھ سے بحق ہر اس نام کے جو تیرا ہے کہ تو نے جس کے ساتھ اپنی ذات کو موسوم کیا ہے یا اس کو اپنی کتاب میں اُتارا ہے یا اُسے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے یا علم غیب ہی میں اسکو رہنے دیا ہے یہ کہ کر دے قرآن عظیم کو بہار میرے دل کی اور نور میری آنکھ کا اور کشائش میرے غم کی اور دفعیہ میرے فکر کا" ـــــــــ دیکھئے یہاں قرآن کو قلب کی ربیع و بہار فرما رہے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ قرآن سے قلب میں بہار آجاتی ہے تو کوئی شئے ہے جبھی تو یہ دعا فرما رہے ہیں۔

اسی طرح کی دوسری دعائیں سنئے:۔

اَسْأَلُکَ بِاسْمِکَ الَّذِیْ اسْتَقَرَّ بِهٖ عَرْشُکَ وَاَسْأَلُکَ بِاسْمِکَ الطَّاهِرِ الْمُطَهَّرِ الْمُنَزَّلِ فِیْ کِتَابِکَ مِنْ لَّدُنْکَ وَبِاسْمِکَ الَّذِیْ وَضَعْتَهٗ عَلَی النَّهَارِ فَاسْتَنَارَ وَعَلَی اللَّیْلِ فَاَظْلَمَ وَبِعَظَمَتِکَ وَکِبْرِیَائِکَ وَبِنُوْرِ وَجْهِکَ اَنْ تَرْزُقَنِیَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ وَتُخَلِّطَهٗ بِلَحْمِیْ وَدَمِیْ وَسَمْعِیْ وَبَصَرِیْ وَتَسْتَعْمِلَ بِهٖ جَسَدِیْ بِحَوْلِکَ وَقُوَّتِکَ فَاِنَّهٗ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِکَ۔

قرآن پاک ہی کے متعلق حضورؐ نے یہ دعا بھی فرمائی۔

اَللّٰهُمَّ اٰنِسْ وَحْشَتِیْ فِیْ قَبْرِیْ۔ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ وَاجْعَلْهُ لِیْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًی وَّرَحْمَةً۔ اَللّٰهُمَّ ذَکِّرْنِیْ مِنْهُ مَا نَسِیْتُ وَعَلِّمْنِیْ مِنْهُ مَا جَهِلْتُ وَارْزُقْنِیْ تِلَاوَتَهٗ اٰنَاءَ اللَّیْلِ وَاٰنَاءَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لِیْ حُجَّةً یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

تمت بالخیر

رسالہ تلاوت قرآن سے متعلق بعض مشائخ کے تاثرات

حال۔ ایک حافظ صاحب نے جو حضرت والا کے مخصوص خدام میں سے تھے لکھا کہ:۔

معرفت حق کے پرچے محرم اور صفر کے ایک ساتھ آئے شوق کے ہاتھوں لیکر دیکھنا شروع کیا حضرت بلا اختیار بار بار زبان سے نکلا ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ✤ کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

سبحان اللہ! عجب مضامین ہیں (اور اسکے بعد دو تین رسالوں کی تعریف تھی) حضرت والا نے اپنے منصب اصلاح کے پیش نظر کہ لوگ صرف زبان سے مجھے خوش کرنے پر اکتفا نہ کریں بلکہ دل سے اثر لیں اور کام کریں ان مولوی صاحب کو تحریر فرمایا اور اسی میں ایک بزرگ کے جذبات و تاثرات کا بھی حوالہ دیا مجھے یہاں بس اسی کا بیان کرنا مقصود تھا۔ حضرت نے حاضرین میں سے کسی سے لکھوایا کہ

تحقیق۔ آپ نے رسالہ معرفت حق کی خوب خوب تعریف فرمائی ہے ہم لوگ بھی اس سے محظوظ ہوئے لیکن حضرت والا نے فرمایا ہے کہ پرتاپگڈھ کے ایک مولوی صاحب ہیں محمد احمد صاحب (مراد اس سے مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی مدظلہ ہیں) وہ کہتے تھے کہ میں نے آپ کے مضامین بالخصوص تلاوت قرآن سے متعلق جو کلام ہے اس کی اشاعت کو زندگی کا ایک مقصد بنا لیا ہے طریق سے متعلق بڑی گمراہی میں لوگ مبتلا تھے آپ نے راستہ اتنا صاف اور ایسا آسان کر دیا ہے کہ میں ضعیف الہمت کو بھی دین دار بننے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق کی ہمت ہو گئی ہے۔

واقعی تلاوت کا حق ہم لوگ پہچانتے ہی نہ تھے۔ حضرت والا نے ہی اس کا عارف بنایا"۔ یہ انکے تاثرات ہیں اور صرف تاثر ہی نہیں ہے اس کے مطابق عمل بھی کرنا شروع کر دیا ہے (جیسا کہ مولانا کے اس فرمانے سے کہ اس کی اشاعت کو زندگی کا ایک مقصد بنا لیا ہے، ظاہر ہے) تو آپ سے پوچھتا ہوں کہ حافظ جی! آپ بنا صرف تاثر ہی لکھتے ہیں یا کچھ کام بھی کر رہے ہیں یا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس کے بارے میں کچھ فرمایئے؟۔ (رجسٹر نقل خطوط ع۱۷ ع۱۵۱)

مجھے یاد ہے کہ جس وقت مولانا پرتاپگڈھی مدظلہ نے اپنے ان تاثرات کو حضرت اقدس کے سامنے ظاہر فرمایا تو حضرت والا اس سے بہت متاثر ہوئے اور چند حضرات کو طلب فرمایا (جن میں حقیر بھی تھا) اور فرمایا کہ سنو دیکھو مولانا کیا کہہ رہے ہیں۔ مولانا پرتاپگڈھی نے اپنی بات کو دہراتے ہوئے فرمایا کہ ابھی میں نے حضرت سے یہ عرض کیا تھا کہ حضرت کے رسالہ تلاوت قرآن کے مطالعہ کے بعد میں نے تو اور دوسرے موضوع پر وعظ کہنا تقریباً بند ہی کر دیا ہے بس اسی کا وعظ کہتا ہوں اور میرا یہی موضوع بیان ہوتا ہے (انتہی)، بہر حال اللہ تعالیٰ اپنے ہم سب کو قرآن کریم سے انس اور تلاوت قرآن کی توفیق عطا فرما دے اور اس سے بچائے کہ ہم دوسروں کے لئے تو سامان ہدایت فراہم کر دیں اور خود اس سے محروم رہیں۔

ونعوذ باللہ من الحور بعد الکور۔ (از ناکارہ جامی)

وصیۃ الصلاۃ

از افاضات

مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

ناشر

دفتر ماہنامہ معرفت حق ۲۳ بخشی بازار الہ آباد ۳

تعارف

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اَمّا بعد! حضرت مصلح الامت مولانا و مرشدنا نور اللہ مرقدہٗ جیسی شخصیت کی طرف کسی مضمون کے انتساب کے بعد پھر اس مضمون کی اہمیت و خصوصیت بیان کرنے کی چنداں حاجت باقی نہیں رہ جاتی بلکہ اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ حضرت والا کے ارشادات و ملفوظات ہیں تاہم بعض امور کے پیش نظر اس خاص مضمون کے متعلق چند کلمات لکھ دینا مناسب معلوم ہوا۔ امید کہ ناظرین کرام کے لئے بصیرت کا سبب ہوگا۔

حضرت اقدس رحمہ نے بعض خصوصی حضرات کے بار بار اصرار کے بعد اکتوبر ۱۹۶۳ء میں بمبئی کا سفر فرمایا اور یہ سفر اعلاء کلمۃ اللہ و اشاعت دین کی غرض سے پہلا سفر تھا اور وہاں جاکر شہر ہی کے علاقہ بیں کلیر روڈ پر دس گیارہ روز تک قیام فرمایا۔ اثناء قیام میں شہر کے مختلف مقامات پر متعدد مواعظ ہوئے جنکو وہیں کے بعض احباب نے ٹیپ ریکارڈر میں ضبط کر لیا تھا پھر اسے الہ آباد لاکر دوسرے ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کر لیا گیا اور وقتاً فوقتاً اسے نقل کر کے اس کی تبییض و ترتیب ہوتی رہی یہاں تک کہ اس سے نقل کئے ہوئے پانچ مواعظ پر حضرت والا نے نظر ثانی بھی فرمائی اور اسکے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ ان کو مستقلاً کتابی شکل میں طبع کرایا جائے اور جلد از جلد لوگوں تک پہونچایا جائے تاکہ لوگ اس سے منتفع ہو سکیں۔ مگر افسوس صد افسوس کہ حضرت کی حیات میں یہ کام انجام کو نہ پہونچ سکا اور اسباب کے نامساعد ہونے کی وجہ سے ان کی حیات میں یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ کتابت شروع کی جا چکی تھی لیکن اس کے طباعت کی نوبت نہ آئی۔

اب بعد میں ارباب ادارہ کے مشورہ سے ان مواعظ کے اشاعت کی یہ صورت تجویز ہوئی کہ رسالہ معرفت حق ہی میں ان مواعظ کا مجموعہ ایک ہی قسط میں شائع کر دیا جائے تاکہ ان کی کتابی شکل بھی ہو جائے اور سب قارئین رسالہ کو یہ مضامین پہونچ بھی جائیں۔ اس طور پر اسکا نفع عام

ہوجائے گا۔ ورنہ اگر کتاب علیحدہ مستقلاً طبع بھی کرالی جائے تب بھی حالات وتجربات کے پیش نظر یہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ چھاپنے کے بعد ان کی حفاظت ہی کرنی ہوگی۔

اسی بنا پر یہ خیال ہوا کہ ماہ محرم وصفر کے دونوں رسالے یکجا کرکے محرم ہی میں شائع کردیئے جائیں تاکہ یہ سب مضامین ایک جگہ ہوجائیں اور اس کے انتظامات بھی شروع کردیئے گئے لیکن اچانک کاتب صاحب کی علالت کیوجہ سے رسالہ کو مؤخر کرنا پڑا۔ آپ حضرات کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی اسے معاف فرمائیں۔

چونکہ اس سلسلہ میں حضرت اقدسؒ کا بمبئی کے لئے یہ پہلا سفر تھا اس لئے پہلے ہی وعظ میں حضرت والاؒ نے اہل بمبئی سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ جو حضرات یہاں تشریف لایا کرتے ہیں ان میں سے نہیں ہوں یعنی میں اپنی کوئی غرض لیکر آپ کے یہاں نہیں آیا ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست   می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

یعنی حق تعالیٰ نے میری گردن میں ایک قلاوہ ڈالدیا ہے۔ جب جہاں چاہتے ہیں لیجاتے ہیں۔

پھر اس کے بعد استفادہ واستفاضہ کے ظاہری وباطنی موانع کو بیان فرمایا تاکہ ان کا انسداد کرکے عقیدت کے ساتھ باتوں کو سنا جائے، کیونکہ وعظ وتذکیر اسی وقت مفید ومؤثر ہوتی ہے جبکہ عقیدت کے ساتھ سماع قبول سے ان کو سنا جائے ورنہ انکار وبدعقیدگی اتنا بڑا مانع ہے کہ نبی کے فیض کو بھی نہیں آنے دیتا تا بہ اولیا چہ رسد۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ ؎

گر ہزاراں طالبند ویک ملول   از رسالت باز می ماند رسول

اور اس سلسلہ میں حضرت اقدسؒ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ الآیۃ اور پانچ روز تک روزانہ شروع وعظ میں خطبہ مسنونہ کے بعد اسی آیت کی تلاوت فرماکر اس کی توضیح وتشریح فرماتے اس کے بعد دوسرا مضمون بیان فرماتے تھے۔ پہلا وعظ تو صرف اسی پر تھا اور دوسرے روز سے مقصود اصلی اور اس کے طرق واسباب کا بیان بھی شروع فرمادیا اور دس روز تک مسلسل پوری جد وجہد سے اس کو بیان فرماتے رہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اس دار دنیا میں آپکا مقصود اصلی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور ان کا قرب حاصل کیا جائے اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ اور قریب ترراستہ اعتقاد وتصدیق کے ساتھ کلام اللہ کی تلاوت کا التزام ہے۔ اور زیادہ زور تلاوت کلام اللہ پر ہی دیا۔ چنانچہ اخیر کے پانچ مواعظ تو صرف اسی آیت کے بیان میں ہوئے اُتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ اس آیت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ جس کتاب کی وحی آپ کی

طرف کی گئی ہے اس کی تلاوت کیا کیجئے۔ اور اس میں شک نہیں کہ عجیب و غریب انداز سے نہایت دل نشین پیرایہ میں اسکو بیان فرمایا ہے اور مختلف عنوانات سے تلاوت کلام اللہ پر امت کو ابھارا ہے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یہ مضمون خود آپ اپنی مثال ہے تو کچھ بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

یوں تو حضرت والا کی ایک کتاب تلاوت قرآن پہلے بھی اس موضوع پر تصنیف ہوکر شائع ہو چکی ہے لیکن اس کی شان الگ ہے اور اس کی شان الگ ہے۔ اس کتاب کا نام حضرت اقدس کی اور دیگر تصنیفات کی مناسبت سے وصیۃ التلاوۃ تجویز کیا گیا ہے اور یہ پانچ مواعظ پر مشتمل اس کا حصہ اول ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ وصیۃ التلاوۃ حصہ ثانی اخیر کے پانچ مواعظ پر مشتمل ہوکر ملاحظہ سے گزرے گا۔ اب مواعظ عالیہ ملاحظہ فرمائیں اور ان کی افادیت و تاثیر کا اندازہ خود اپنے مطالعہ و تأثر سے کریں۔ اور اس ناکارہ کے حق میں اور تمام ارباب ادارہ کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقیقی و ایمانی تلاوت اور تلاوت کلام اللہ کی حلاوت سے بہرہ ور فرمائے۔ اور ان مضامین عالیہ سے ہم سب کو اور حضرت اقدس کے جملہ متوسلین کو اور تمام مسلمانوں کو مستفیض فرمائے اور حضرت اقدس کی روح کو اس سے خوش فرمائے اور ہم سب کی طرف سے حضرت اقدس کو اجر جزیل مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین

والسلام

یکے از خدام عفی عنہ ۲۵ محرم الحرام ۱۳۸۹ھ

آستانۂ عالیہ حضرت مصلح الامۃ عارف باللہ مولانا و مرشدنا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ

۲۳ - بخشی بازار - الہ آباد ۳

پہلا وعظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّا بَعْدُ:- فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَشَرَوْہُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاھِمَ مَعْدُوْدَۃٍ ۚ وَکَانُوْا فِیْہِ مِنَ الزّٰھِدِیْنَ ۝

یعنی یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انکو بہت ہی کم قیمت میں بیچ ڈالا یعنی گنتی کے چند درہم کے عوض اور وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ لوگ انکے قدرداں تو تھے ہی نہیں کہ انکو متاع نفیس کی طرح مال کثیر کی تحصیل کا آلہ بناتے۔ اس آیت کے متعلق تو میں بعد میں عرض کروں گا ابھی یہ سنیئے کہ:-

جو حضرات یہاں تشریف لایا کرتے ہیں میں ان میں سے نہیں ہوں میری زندگی کے حالات شاید آپ لوگوں کو معلوم نہیں۔ اس کے متعلق اتنا عرض کرتا ہوں کہ زمانہ کے فتن اور حوادث سے جیسا کہ آپ گھبراتے ہیں میں بھی گھبراتا ہوں۔ اس لئے گھر سے باہر نکلنا بھی پسند نہیں کرتا لیکن مسجد جانا چونکہ ضروری ہے اس لئے وہاں تک چلا جاتا ہوں۔ پھر بھی ظاہری و باطنی فتنوں کی وجہ سے ڈرتا ہی رہتا ہوں اور خاص کر اُن فتنوں سے جو ہم لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں طبیعت میں ہر وقت ایک خوف و ہراس سا رہتا ہے۔ اور انہیں فتنوں کے خوف سے کہیں جانے کی ہمت نہیں پڑتی اور نہ کہیں آتا جاتا ہوں۔ مگر اسکی وجہ آپ لوگ خود سمجھ لے کہ آخر یہاں کیوں آگیا ہوں۔ یعنی جو آدمی کہیں جانا نہ چاہتا ہو بلکہ گھر کے باہر نکلنے سے بھی گھبراتا ہو وہ یہاں اتنی دور دراز کا سفر کر کے کیسے آگیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کچھ بھید ہو گا۔ بس یوں سمجھئے کہ ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

دوست یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک قلادہ میری گردن میں ڈال رکھا ہے جہاں چاہتے ہیں لیجاتے ہیں۔

لیکن آپ کے یہاں آنے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ ہم اکیلے ہیں اور آپ کی کثرت ہے کیا آپ ہماری بات کو رلا دینگے؟ ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اگرچہ آپ بہت ہیں لیکن اللہ تعالے یہ فرما رہے ہیں کہ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؕ یعنی کیا بہت سے ارباب بہتر ہیں یا صرف اللہ واحد قہار۔

میں نے یہ مضمون اسلئے شروع کیا ہے کہ زمانہ کے فساد کی وجہ سے طبیعت میں ایک ہول وہراس سما گیا ہے مگر اس کو ہم اچھا بھی سمجھتے ہیں۔ اسلئے کہ اسکی وجہ سے ہم ہر وقت اس سے چوکنا و ہشیار رہیں گے تو یک دم سے کھل کر کوئی اقدام نہ کرینگے بلکہ ڈرتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ سے ہر وقت یہ دعا کرتے رہیں گے کہ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ یعنی یا اللہ ہم ظاہری و باطنی فتنوں سے آپ کی پناہ چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ جب ڈر سمایا ہوا ہے تو اس سے نکلنے کی بجز اس کے اور کوئی صورت نہیں ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ مانگے۔ یہ سنت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ لہذا جو شخص دین کے کام کے لئے تیار ہو اور کچھ کام کرنا چاہتا ہو اسکو وہ سب باتیں پیش نظر رکھنی ہوں گی جو انبیاء علیہم السلام نے اصلاح امت کے سلسلہ میں اختیار فرمائیں۔ جب تک بالکل اسی طریقہ کو نہ اپنائے گا کچھ کام نہ کر سکے گا۔ لہذا جسطرح فتن سے احتراز کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے اسی طرح انکے متبعین کو بھی کرنا ہوگا۔

اور ہمارے ساتھ ان فتنوں کا ہونا بھی ضروری ہے اس لئے کہ ہمارے متعلق جو فتنے ہیں اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ ۔ یعنی اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت شیطان پیدا کئے تھے کچھ آدمی اور کچھ جن۔

قرآن شریف میں شیاطین الانس اور شیاطین الجن دونوں گروہوں کو بیان فرما رہے ہیں۔ ان میں سے شیاطین الجن شیاطین الانس کو اغواء کرتا ہے اور طرح طرح

کی باتیں ان کے قلوب میں ڈالتا رہتا ہے یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ط

چنانچہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ شیاطین الانس وہ لوگ ہیں جو شیاطین الجن کے اغواء اور وسوسے کو بیداری وخواب میں قبول کرتے ہیں۔

سنیئے جس طرح ہم لوگ پڑھاتے لکھاتے ہیں اسی طرح شیطان نے بہتوں کو پڑھادیا ہے اور اس کے بہت سے شاگرد ہو گئے ہیں۔ اس نے اپنے شاگردوں کو لوگوں کے اغوار کے لئے چھوڑ دیا ہے اور خود سامنے نہیں آتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے علماء جو اپنے وقت کے امام تھے انکی تصانیف آپ نے بھی دیکھی ہوں گی اور ان کے احوال کا مطالعہ فرمایا ہوگا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انکی زندگی اسوۂ حسنہ تھی اور ان کے قلب میں (ہاتھوں سے اشارہ کرکے فرمایا کہ) اتنے اتنے انوار تھے مگر بجائے اسکے کہ ان کے زمانہ کے لوگ ایسے حضرات کے وجود کو غنیمت شمار کرتے اور ان کی طرف رجوع ہوتے اور ان سے نور ایمان وعرفان حاصل کرتے۔ مخالفت ہی پر کمربستہ رہے اور ان کی وفات کے بعد یہ دیکھا کہ ان کو بری طرح سے کریہہ الفاظ میں یاد کرتے ہیں حالانکہ خود ان لوگوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ دین کا کچھ زیادہ احساس نہیں ہے چنانچہ میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ اسی دنیا میں ہم بھی رہتے ہیں پھر ہماری رائے کیوں معتبر نہیں ہے آخر ہم بھی تو عقل رائے رکھتے ہیں۔ آنکھ رکھتے ہیں۔ تجربہ رکھتے ہیں تو پھر ہمارے مشاہدات وتجربات کا اعتبار کیوں نہیں ہے؟ ہم تو آپ کو دیکھتے ہیں کہ آپ میں کچھ بھی دین نہیں ہے اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو لوگ کامل بلکہ اکمل دین رکھتے ہیں اور حقیقی متبع سنت ہیں انکے متعلق آپ بدگمانی رکھتے ہیں اور انکے متعلق ناشائستہ کلمات استعمال کرتے ہیں۔ العیاذ باللہ!

کیا یہی دین ہے کہ اپنے اکابر کو برا کہا جائے۔ اب اس کو کیا کہا جائے۔ بس اسی آیۃ کو بار بار پڑھتا ہوں۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝

یعنی جس طرح آپ کے دشمن ہیں اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیاطین الانس اور شیاطین الجن میں سے بنائے جن میں سے بعضے دوسرے بعضوں کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ ان کو دھوکہ میں ڈالدے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ ایسے کام نہ کر سکتے سو ان لوگوں کو اور جو کچھ یہ افترا پردازی کر رہے ہیں اسکو آپ رہنے دیجئے یعنی انکی فکر وغم میں نہ پڑیئے ہم

خود متعین وقت پر مناسب سزا دیں گے۔

اور اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کے دشمن اسواسطے بنائے کہ عداوت سے بہت کام ہوتا ہے کیونکہ یہ دنیا دار الابتلاء ہے۔ چنانچہ ابتلا ہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے شیطان اور نفس کو پیدا فرمایا مگر یہ ابتلا اس وقت تک تام نہیں ہوتا جب تک کہ اچھی طرح دشمنی نہ کی جائے۔ اسلئے شیاطین الانس کو بھی پیدا فرمایا اور وہ یہی کفار اور فساق و فجار ہیں جو دین کو ناپسند کرتے ہیں اور دراصل یہ شیطان کے اولیا، اور شیطان ہی کے مقرب ہیں اسکی باتوں کو سنتے اور کان لگاتے ہیں۔ اور ہر نبی کے لئے اس کا ہونا ضروری ہے اسلئے کہ نبی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتا ہے۔ تو جب تک اس کے بالمقابل کوئی ضلالت کا پھیلانے والا نہ ہو یہ ابتلاء کیونکر کامل ہو سکتا ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے طریقے پر ہیں اور اس کام کو کر رہے ہیں ان کے دشمن بھی شیاطین الجن اور شیاطین الانس ہوں اس واسطے ہم ان لوگوں سے کہتے ہیں کہ تم جو ہم سے عداوت کرتے ہو تو یہ انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور اس میں ہمارا فائدہ ہے۔ لہٰذا اب تم بھی کوشش کرو اور ہم بھی کوشش کرینگے اور جس طرح شیاطین الانس اپنی کوشش کرکے تھک گئے مگر انبیاء برابر آتے رہے اسلام کا چرچا ہوتا رہا لوگ اس کو قبول کرتے رہے اسی طرح ہوتا رہے گا چنانچہ اب بھی اسلام باقی ہے تو اس عداوت سے کچھ بھی نقصان نہیں بلکہ نفع ہی ہوا۔ اسلئے کہ عداوت کی وجہ سے حضرات انبیاء، اور ان کے تابعین پورے طور سے ان دشمنوں کے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف ظاہر و باطن میں رجوع ہو جاتے ہیں اور اپنی دعوت و تبلیغ میں خوب اچھی طرح مستعد ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں کہ ان لوگوں کی عداوت اور ضرر سے بچائے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بڑی قدرت ہے۔ پس جس طرح ادھر شیاطین ہیں تو اُدھر فرشتے ہیں۔ ہر طرح کی نصرت اور تائید ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور یہ دشمن کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور جب یہ حضرات اللہ تعالیٰ پر کامل توکل رکھتے ہیں تو ان کو خاطر میں کب لاتے ہیں کہ یہ کس کھیت کے بتھوے ہیں۔

آپ کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کہ میں یہ کیوں کہہ رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ خود بھگتا ہوا ہوں اس لئے کہہ رہا ہوں۔ جہاں بھی رہتا ہوں کسی سے کچھ غرض نہیں کرتا اور پھر سنتا ہوں کہ

کوئی یہاں کچھ کہہ رہا ہے۔ کوئی وہاں کچھ کہہ رہا ہے۔ اسی وجہ سے کہیں جاتا نہیں ہوں مگر معلوم نہیں کس طرح یہاں آ گیا ہوں۔

عام طور پر لوگوں کے حالات سے جہاں تک تجربہ ہوا ہے یہی کہ نہ تو ان کے پاس قرآن ہے نہ حدیث نہ کچھ عقل ہے نہ فہم۔ نہ سمجھ ہے نہ دین۔ نہ سنت جانتے ہیں نہ فرض مگر علماء کرام کی نسبت بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسرے سلسلہ کے لوگ ہیں۔ یعنی شیاطین الانس جو شاگرد ہیں شیاطین الجن کے۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ جب قرآن شریف میں شیاطین الانس کا بھی ذکر ہے تو اس کا وجود ماننا ہوگا شیطان الجن کی تفسیر تو آپ جانتے ہوں گے کہ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ (وہ جنوں میں سے تھا پس اپنے رب کے حکم سے عدول کیا) اسی طرح شیطان الانس کو بھی معلوم کرنا ہوگا کہ کسے کہتے ہیں اسکے متعلق میں عرض کرچکا ہوں کہ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رح فرماتے ہیں کہ:۔

"شیطان الانس وہ لوگ ہیں جو شیطان الجن کے اغوا کو بیداری اور خواب میں قبول کرتے ہیں جس طرح سے شیطان الانس انبیاء علیہم السلام کے دشمن تھے اور ان کی طرح طرح سے شکایت کرنے اور ضرر پہچانے میں رات دن ان کی سعی صرف ہوتی تھی۔ اسی طرح اب انکے نائبین کے ساتھ ان کا برتاؤ ہوتا ہے کیونکہ دونوں سلسلے اُس وقت سے ابتک برابر چلے آرہے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہم لوگ جو کر رہے ہیں یہ شیاطین الانس جو شیطان الجن کے شاگرد ہیں ان کا کام ہے اور یہ حقیقت ان کی سمجھ میں آجاوے کہ ہم لوگوں کا شمار اس سلسلہ میں ہے تو اپنی حرکات سے باز آجائیں مگر ان لوگوں کے حال سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ ایک بہت بڑا کام کر رہے ہیں کہ جتنے بڑے بڑے درجہ کے لوگ ہیں سب کو سمجھ لیتے ہیں کہ بڑے سے بڑا ولی بھی کچھ نہیں ہے۔ تو میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ آپ اپنے کو بھی سمجھتے ہیں کہ آپ کون ہیں؟ اگر آپ نے بڑے بڑے لوگوں پر اعتراض کر دیا اور سب کو ذلیل کر دیا تو اس سے کیا ہوا؟ اور اگر آپ نے اکابر اولیاء اور علماء کا عیب نکال دیا تو کیا آپ کامل ہو گئے؟ ہاں اگر آپ اپنا عیب نکالیں گے تو البتہ کامل ہو سکتے ہیں۔ دوسرے کا عیب نکالنے سے کوئی کامل نہیں ہوتا۔ بلکہ آدمی اپنی اصلاح کرنے سے کامل ہوتا ہے۔ دوسروں کی عیب جوئی سے نہیں۔ البتہ دوسروں کی اصلاح وہ شخص کر سکتا ہے جو خود صالح ہو چکا ہو۔ کہاں تک

پہونچ چکا ہو۔ ایسا شخص جب دوسروں کی اصلاح کریگا اور ان کے متعلق کچھ کہے گا تو اس سے ان لوگوں کو نفع ہوگا اور اسکی وجہ سے اس شخص کے درجات میں بھی ترقی ہوتی رہے گی اور عنداللہ قرب وقبول حاصل کریگا۔ مگر آپ کو تو ہم اس مرتبہ پر دیکھتے نہیں بلکہ ہم تو بجائے اس کے اب کے لوگوں کا یہ حال دیکھ رہے ہیں کہ فساد میں خود بھی مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی مبتلا کر دیتے ہیں۔ خود یہ لوگ فتنہ کرتے ہیں اور دوسروں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں کا کوئی گھر بھی فتنہ سے خالی نہیں بلکہ کوئی آدمی فتنہ سے خالی نہیں۔ ان لوگوں کو دیکھ دیکھ کر طبیعت گھبراتی ہے۔ اگر ان لوگوں سے یہ کہدوں کہ تم اپنے گھر رہو ہم اپنے گھر تو اس پر بھی راضی نہیں ہوتے اور کہتا ہوں کہ آتے ہو تو اصلاح کرو۔ یہ بھی نہیں کرتے۔

جن فتنوں میں لوگ مبتلا ہیں انھیں میں سے ایک فتنہ یہ بھی ہے کہ علماء دین کو اور اکابر ملت کو جنھوں نے دین کی بہت سی خدمات کیں اور دین کی گاڑی چلائی ان کی غیبت شکایت کی جاتی ہے حالانکہ آپ کے ذمہ ہے کہ ان کا ہاتھ بٹایئے ان کی نصرت کیجئے نہ یہ کہ بجائے اسکے ان کی غیبت شکایت کیجئے۔ دین کو نقصان جو پہنچا ہے وہ اسی وجہ سے کہ کوئی آدمی اگر کام کو اٹھاتا ہے اور کچھ دین کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو یہی لوگ ان کے ساتھ وہ کام کرتے ہیں جو شیطان کا ہے یعنی لوگوں کو بہکاتے ہیں۔ چنانچہ مجھ کو برابر ایسا ہی پیش آیا ہے جب میں نے عام طور پر لوگوں کا یہی حال دیکھا تو یہ سوچا کہ کام تو مجھ کو کرنا ہی ہے اور یہ لوگ مانیں گے نہیں آوینگے بھی اور شکایت بھی کرینگے تو میں نے بھی کہا کہ اچھا پھر آؤ ہم وہ آیت یاد کریں گے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ الآیۃ پھر ہم نے کہدیا کہ اگر آپ کو یہی کام کرنا ہے تو ہم کو دوسرا کام کرنا ہے۔ اسلئے کہ کام کے دو سلسلے ہیں ایک ہدایت کا سلسلہ ہے جسمیں انبیاء علیہم السلام ہیں اور دوسرا سلسلہ ضلالت کا ہے جس میں شیاطین الجن والانس ہیں تو جب انبیاء علیہم السلام کو یہ منصب سپرد ہوا ہے اور یہ حضرات اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و نصرت ان کے ساتھ ہے تو پھر ان لوگوں کی پرواکیوں کریں کہ یہ کس کھیت کے بتھوے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے شیاطین الانس والجن کو ان حضرات کا دشمن بنایا ہے تو اس میں ضرور حکمت ہے اور وہ یہی ہے کہ جب کسی کا کوئی مقابل و دشمن ہوتا ہے تو وہ اپنے اس

دشمن کے مقابلہ میں خوب اچھی طرح سے مستعد اور تیار ہو جاتا ہے۔ پھر دونوں طرف سے پورا مقابلہ ہوتا ہے وہ اپنی کوشش کرتا ہے یہ اپنی کوشش کرتا ہے۔ مگر سنئے یہاں انجام کار یہ ہوتا ہے وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ یعنی غلبہ متقیوں کا ہوتا ہے۔ یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین کا۔ یہ دشمن لوگ باوجود اپنی کثرت کے ان کے مقابلے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے اس لئے کہ ان کی دشمنی دین کی وجہ سے ہے تو جو شخص دین کا دشمن اور خدا کا مخالف ہو وہ بھلا کیسے کامیاب ہو سکتا ہے۔

پس اگر ہم لوگ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہم خدا کے دین کا کام کر رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ خدا کی نصرت و تائید ہے اور جو لوگ اس میں روڑا اٹکا رہے ہیں وہ دین کے مخالف ہیں۔ خدا کے مخالف ہیں تو پھر ہمکو ان لوگوں کی پرواہ نہ ہو۔ چنانچہ اسی کو سمجھانے کے لئے میں نے یہ آیت پڑھی تھی۔ ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ یعنی کیا بہت سے متفرق ارباب بہتر ہیں یا اللہ واحد قہار۔

اور یہ شعر بھی پڑھ چکا ہوں ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اس سے ممکن ہے کہ آپ کو کچھ تنبہ ہوا ہو یا مجھ کو تنبہ ہوا ہو جس طرح شیخ مدین کی خدمت میں جا کر ایک عالم کو تنبہ ہوا تھا جنہوں نے اپنی ساری عمر علم حدیث کی خدمت میں صرف کی تھی۔ پھر انھوں نے ایک بزرگ کے چند اشعار کی شرح کی اور اسکو شیخ مدین کی خدمت میں بھیجا انھوں نے اسکے سرورق یہ شعر لکھ کر واپس فرما دیا ؎

سَارَتْ مُشَرِّقَةً وَسِرْتُ مُغَرِّبًا شَتَّانَ بَيْنَ مُشَرِّقٍ وَمُغَرِّبِ

یعنی میری محبوبہ تو مشرق کی جانب چلی گئی اور میں مغرب کی طرف کو چلا (تو اب دونوں میں ملاقات کیونکر ہو اسلئے کہ) مشرق و مغرب دو مخالف رخ پر چلنے والوں میں تو بون بعید ہے۔

اس سے اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ آپ کو بزرگوں کے اقوال اور ان کے احوال سے کیا سروکار اور آپ ان کے کلام کی کیا شرح کر سکتے ہیں اسلئے کہ آپ نے تو ابھی اس راہ میں قدم ہی نہیں رکھا فَتَنَبَّهَ لِمَا كَانَ عَنْهُ غَافِلًا وَاَذْعَنَ لِاَهْلِ الطَّرِيْقِ یعنی ان کو تنبہ ہوا اور غفلت سے بیدار ہوئے اور اہل طریق کا اذعان کیا یعنی یہ سمجھے کہ ہم اگرچہ عالم ہیں مگر ابھی تک اہل طریق کے حالات سے غافل ہیں۔

پس جس طرح ان عالم کو تنبہ ہوا اسی طرح میں کہہ رہا ہوں کہ شاید آپ کو تنبہ ہوا ہو یا مجھکو ہوا ہو۔ یا

دونوں کو ہوا ہو۔ یہ تنبہ بہت بڑی چیز ہے کہ خدائے تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے کے لئے تنبہ ہو۔ مگر ہم لوگوں کا زیادہ وقت اس میں صرف نہیں ہو رہا ہے۔ حالانکہ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ جس چیز سے غافل ہیں اس کی طرف متوجہ ہوں اس لئے کہ ہم نرغے میں ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہمارا وجود ہی ناگوار ہے مگر ہم کس کو سمجھائیں اور کون سمجھنا چاہتا ہے۔ آپ کو تو ان کاموں کی فرصت ہی نہیں ہے بلکہ میں تو یہ بھی کہا کرتا ہوں کہ آپ لوگوں سے دنیا کا کام تو پڑتا نہیں دین کا کام کیا کریں گے۔

ہاں آپ سے ایک کام ہو سکتا ہے یعنی جھگڑا اور فساد۔ ابھی اگر جھگڑا ہو تو ہزاروں ہزار آدمی جمع ہو جائیں۔ برابر سنتا ہوں کہ باہر شور وغل ہو رہا ہے۔ پوچھتا ہوں کہ کیسا شور و غل ہو رہا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ جھگڑا ہو رہا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہی ایک کام ایسا ہے جو سب سے آسان ہے۔ بلکہ جتنے بُرے کام ہیں وہ سب آسان معلوم ہوتے ہیں لیکن جس چیز کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے اور جن امور سے دینی اور دنیاوی نفع متعلق ہے وہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔

لوگوں سے برابر کہتا ہوں کہ اگر آپ سے دین کا کام نہیں ہوتا تو دنیا ہی کا کام کر لیجئے اور اگر مرد ہیں تو اسی کو کر دکھائیے آخر سب لوگ کر ہی رہے ہیں تو جیسے ان کے ہاتھ پیر ہیں ویسے ہی آپ کے پاس بھی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ آپ سے نہ ہو سکے۔ مگر ان کو جھگڑے فساد اور بد اخلاقی سے فرصت ہی کب ہے کہ دوسرے کام میں مشغول ہوں۔ یہ یاد رکھئے کہ جو آدمی بد اخلاق ہوگا اسے دنیا بھی حاصل نہیں ہو سکتی اسلئے کہ جب تک لوگوں سے میل ملاپ نہ ہوگا اور آپس کے تعلقات خوشگوار نہ ہوں گے اسوقت تک کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ ابنائے زمانہ کا عموماً یہی حال ہے اور اسکے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ جب ہم جیسے لوگوں کو دیکھتے ہیں تو معلوم نہیں ان کو کیا خیال ہو جاتا ہے کہ اسکے گرد جمع ہو جاتے ہیں لیکن محض اتنے سے کیا کام چل سکتا ہے یعنی اگر کوئی آدمی ایسا مل جائے تو اس کے پاس ہزاروں ہزار کی تعداد میں دو چار دن یا دس دن یا ایک مہینہ جمع ہو جائیں تو کیا اس سے کچھ کشود کار ہوگا؟ اور آدمی بس اسی اتنے سے کامل ہو جائیگا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ آدمی جب اصلاح کی طرف توجہ کریگا اور باتوں کو غور سے سُنے گا اور سمجھے گا تب کچھ اصلاح کی امید ہو سکتی ہے۔ مگر اب جو لوگ ہمارے پاس آتے ہیں: تو سنتے ہیں اور نہ بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں پھر عمل کیا کریں گے۔ اس لئے

کہ عمل تو اسی کی فرع ہے۔

اور ان لوگوں کو یہ بھی احسان معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی آدمی ایسا ہو جس سے اصلاح ہو سکتی ہو تو اسکے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں جسکی وجہ سے وہ سمجھے کہ یہ لوگ ہم کو مانتے ہیں۔ اسواسطے اب ہم لوگوں کو اس میں بڑا دھوکہ ہو رہا ہے کیونکہ ہم لوگ اپنے بارے میں یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جب اتنے اتنے آدمی ہمارے پاس آرہے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ کچھ ہو گئے ہیں (یعنی درجۂ کمال تک پہونچ گئے ہیں) ہاں اگر یہ خیال ہو جائے کہ ہماری طرف مسلمانوں کا رجوع ہمارے لئے فال نیک ہے شاید انھیں کے حسن ظن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہم کو بخش دیں تو البتہ ایک اچھی بات ہے۔

حضرت مولانا رح فرماتے تھے کہ میں بعض لوگوں کو اس واسطے اجازت دے دیتا ہوں کہ جب سب کو خبر ہوگی کہ ان کو مولانا کی طرف سے اجازت ہے تو لوگوں کو ان کی طرف سے حسن ظن ہوگا اور جب لوگوں کو حسن ظن ہو جائیگا تو اللہ تعالیٰ بہت سے مسلمانوں کے حسن ظن کو ضائع نہیں فرمائینگے۔ اور اس کی حالت کو ٹھیک کر دیں گے۔ اسواسطے کہ جب کسی کے ساتھ بہت سے لوگوں کا حسن ظن متعلق ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی ان کے حسن ظن کے مطابق اس سے معاملہ فرماتے ہیں۔ یہ تو الگ بات ہے۔ لیکن یہ کہ صرف آپ کے اس اجتماع سے ہم غرہ میں آویں کہ اس میں کچھ حقیقت ہے۔ تو یہ مناسب نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ اجتماع نہ تو ہمارے کمال کی دلیل ہے اور نہ آپ کے کمال کی۔ آج کل کا وقت ایسا نہیں ہے۔ ذرا غور سے سنئے کیا کہہ رہا ہوں۔

حقیقت دین کی تو بہت دنوں سے مٹا چکے ہو اور مٹتی ہی چلی جارہی ہے۔ اور خال خال لوگ ایسے ہیں جنکو اس کی فکر ہے آپ کو تو فکر بھی نہیں کہ ہم کس دور میں ہیں اور ہمارا کیا حال ہے۔ یہ آپ کو تو نہیں معلوم لیکن اسی دور میں اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جنکو فکر ہوگی۔ حالات کو دیکھتے ہوں گے اور دل ہی دل میں کڑھتے ہوں گے۔ اور رہی صورت دین کی۔ یعنی یہ کہ آپ لوگ جو یہ جمع ہیں تو اسکو مٹا دینا آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ ہمارے جیسا کوئی آدمی آوے اور آپ اسپر خالی ڈھیلا برسانے لگیں تو یہ بہت دنوں تک نہیں ہوگا۔

یہ نہیں ہو سکتا کہ اس ظاہری اجتماع کو بھی ختم کر دیں۔ بلکہ دونوں چیزیں چلتی رہیں گی اس لئے کہ یہ دین اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود ہی گردن پکڑ کر لوگوں کو اس کی جانب جھکا دیتے ہیں اور دین کی جگہ پہونچا دیتے ہیں

تاکہ سب پر حجت قائم ہو جائے اور قیامت میں یہ عذر نہ کرسکیں کہ ہم کو دین نہیں پہنچا یہ اسواسطے کہہ رہا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ آپ لوگوں کا یہ اجتماع ہمارے یا آپ کے کمال کی دلیل نہیں ہے بلکہ دین الٰہی کی دلیل ہے۔ جس نے دین بھیجا ہے وہ خود اس کی حفاظت کا کفیل اور اس کی نصرت کا ذمہ دار ہے۔ لہٰذا علماء و مشائخ برابر پیدا ہوتے رہیں گے اور ان کے ذریعہ سے یہ دین قیامت تک باقی رہے گا چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ۔ لَا یَضُرُّھُمْ مَنْ خَذَلَھُمْ وَلَا مَنْ عَادَاھُمْ۔ یعنی میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی اور اس کی منجانب اللہ نصرت ہوتی رہے گی اور لوگوں کا ساتھ چھوڑ دینا اور ان سے عداوت کرنا ان کو کچھ بھی مضر نہ ہوگا۔

یہ بخاری شریف کی حدیث ہے اس میں صاف تصریح موجود ہے کہ یہ دین بھی ہمیشہ رہے گا اور تا قیامت ایک جماعت اسکی حامل و محافظ ہر دور میں رہے گی اور اس کی نصرت برابر ہوتی رہیگی۔ اب اگر کوئی چاہے کہ اسکو مٹائے تو اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ یوں دشمن تو یہی چاہے گا اور وہ اسی لئے پیدا ہی کیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمایا ہے کہ ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے۔ اور وہ ان کی ذات کے افعال و اقوال کے اور تعلیمات کے دشمن ہوتے ہیں۔ اسلئے کہ کسی آدمی کی ذات کا آدمی دشمن نہیں ہوتا۔ بلکہ دشمن جو ہوتا ہے تو اسکے اوصاف کی وجہ سے۔ چنانچہ کفار و فساق جو انبیاء علیہم السلام کے دشمن ہوئے ہیں تو ان کی تعلیمات اور احوال و افعال نیز تقویٰ و دیانت سکھلانے کی وجہ سے۔ اس لئے کہ یہ لوگ آزادی چاہتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام تقویٰ وطہارت دین و دیانت سکھلانے کے واسطے اور تمام احکامات کو بتلانے کے واسطے آتے ہیں۔ جو لوگ آزاد ہوتے ہیں اور آزاد رہنا چاہتے ہیں یہ سب چیزیں ان کی طبیعت اور مقصد کے خلاف ہوتی ہیں۔ اسلئے ان حضرات کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ نبوت سے پہلے دشمن نہیں ہوتے۔ بس جہاں تعلیم شروع کی اور ان کو عداوت ہوئی اور مخالفت کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ تو یہ لوگ درحقیقت اللہ سے عداوت کرتے ہیں مگر یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ سے عداوت کرنے والا کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس قسم کے لوگ عداوت ظاہر کرتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا یعنی اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے۔

پس جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کے کرنے والے ہوں تو وہ کیسے وجود میں نہ آئے گی مگر جس طرح ان کو دشمن بنایا ہے اسی طرح نبی کو دین کی اشاعت کے لئے مامور فرمایا ہے۔ جیسا کہ فرماتے ہیں:۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ

یعنی وہی وہ ذات ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو اللہ کی آیتیں اُن پر پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور انکو کتاب اور دانشمندی سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔

پس یہ دونوں سلسلے چل رہے ہیں اور ان دونوں سلسلوں میں ایک زبردست مڈ بھیڑ اور جنگ ہے اور زبردست تصادم ہے مگر یہ کہ یہ حق و باطل میں تصادم ہے۔ ان میں ایک حق ہے اور ایک باطل۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ یعنی بلکہ ہم حق بات کو باطل پر پھینک مارتے ہیں سو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے۔ سو وہ دفعۃً جاتا رہتا ہے۔

آپ لوگوں سے یہ کہتا ہوں کہ تعلیمات کو صحیح طریقہ پر سمجھئے گا تب کچھ ہوگا یا محض رسمی دین سے دوسروں پر غالب ہونا چاہتے ہیں۔ حقیقی دین کی اور اصلاح کی اور اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق کی فکر کرنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ سنتا ہوں کہ وعظ و نصیحت کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ قرآن و حدیث پڑھا جاتا ہے۔ مگر اس کا اثر یہ جو ہو رہا ہے کہ لوگ کچھ بہکی بہکی سی باتیں کرتے ہیں اور ہمارے ہی سامنے آکر کہتے ہیں۔ یہ تو نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ اس کے اثرات دوسرے ہونے چاہئیں خاصکر ایسے حالات میں جبکہ آپ سمجھ رہے ہیں کہ نازک حالات ہیں اور ہم لوگ نرغے میں ہیں۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالے کو یہ منظور ہے کہ دونوں سلسلے حق و باطل کے رہیں۔ تو جو دشمن ہے وہ عداوت کرے گا ہی۔ مگر اتنا نہیں کر سکتا کہ آپ کا استیصال کر دے یعنی بالکل جڑ سے اکھیڑ دے۔ اس بارے میں قرآن شریف کی بہت سی آیتیں ہیں اور اس کی تفاسیر موجود ہیں کہ یہ لوگ استیصال نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ؎

چراغے راکہ ایزد بر فروزد ہر آنکو تف زند ریشش بسوزد

(یعنی جس چراغ کو اللہ تعالیٰ روشن کرتے ہیں اسکو اگر کوئی اپنی پھونک سے بجھانا چاہے تو

اس کی داڑھی جل جائے گی۔)

اگر گیتی سراسر باد گیرد   چراغ مقبلاں ہرگز نہ میرد

(یعنی اگر تمام عالم میں آندھی ہی چلنے لگے (تو ظاہر ہے کہ سب چراغ بجھ جائیں گے مگر) جو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں ان کا چراغ ہرگز نہیں بجھ سکتا۔)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ :-

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ۝

یعنی یہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منھ سے بجھا دیں حالانکہ اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہیگا گو کافر کیسے ہی ناخوش ہوں۔

اور

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ۝

یعنی وہ ایسا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دیکر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے۔ گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔

اس آیت میں خوب مضمون ہے وہ یہ کہ :-

ایک طرف تو اللہ کا ارادہ ہے اور دوسری طرف کفار کا۔ پس اگر اللہ کے ارادے کے خلاف سارا عالم ملکر کوئی ارادہ کرے اور اپنی پوری کوشش کرے تب بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسلئے کہ وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ یعنی اللہ اپنے امر پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ حقیقت پیدا کیجائے۔ اپنی اصلاح کی جائے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کیا جائے اسکو راضی کیا جائے اسکے لئے سچا ایمان لانا ہوگا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس لئے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں پر جب کبھی مصیبت آئی ہے اور کوئی سخت وقت ان پر پڑا ہے تو انھوں نے اپنے ایمان کو خوب مضبوط کیا ہے اور اسی سے غالب ہوئے ہیں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس وقت جو یہاں آنا ہوا ہے تو اس لئے نہیں کہ آپ کے بلانے کی وجہ سے آگیا ہوں۔ اتنی کمزوری نہیں ہے۔ یوں بظاہر دیکھنے میں آپ کمزور پاتے ہونگے مگر یہ کہ اتنا کمزور نہیں ہوں۔ بلکہ یہ سوچا کہ اگر کچھ کام ہی کرنا ہے تو کسی دوسری جگہ دو چار

روز کے لئے چلکر دیکھ لوں۔ یوں مسلمانوں کے حالات سے طبیعت بہت مرجھائی ہوئی رہتی ہے اور کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ لہٰذا آپ یہ مت سمجھئے گا کہ یہاں کسی اور کام کے لئے آئے ہیں بس یہی سمجھ لیجئے کہ بمبئی دیکھنے کے واسطے آئے ہیں یعنی جس طرح آپ ہم لوگوں کو دیکھنا چاہتے ہیں ہم بھی آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اب آپ ہم کو دیکھئے اور ہم آپ کو دیکھیں کہ آپ نے ہم سے کتنا تاثر لیا ہے اور کیا کچھ کام کرنا چاہتے ہیں۔ بہت دن سے بمبئی کا شور سنتے تھے۔ یوں بہت زمانہ ہوا اس سے پہلے بھی یہاں آچکے ہیں مگر یہ کہ انقلابات ہوتے ہی رہتے ہیں ؎

دہر میں کیا کیا ہوئے ہیں انقلابات عظیم
آسماں بدلا زمیں بدلی نہ بدلی خوئے دوست

اسواسطے ہم نے سوچا کہ چلکر دیکھیں کہ لوگ کیا کر رہے ہیں یعنی کچھ بدلے ہیں یا پہلے ہی کی طرح ہیں۔ یوں تو جہاں بھی رہتا ہوں وہیں جگہ جگہ سے لوگ پہنچ جاتے ہیں اس کے متعلق ابھی کہہ چکا ہوں کہ اگر آپ چاہیں کہ ہم لوگوں کے اس سلسلے کو بھی ختم کردیں تو اس پر آپ لوگ قادر نہیں ہوسکتے یعنی یہ کہ آپ سارے مدرسوں کو بند کردیں اور قفل لگادیں اور سب مولویوں کو ختم کردیں اور ان سے بائیکاٹ کرلیں یا اگر کوئی مولوی آپ کے یہاں آوے تو اس سے ملاقات نہ کریں اس پر آپ قادر نہیں ہیں۔ اسلئے کہ یہ خدائی انتظام ہے۔ علما ابھی رہیں گے اور یہ سب چیزیں رہیں گی اور آپ چونکہ مسلمان ہیں اسلئے اللہ تعالیٰ آپ کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا کرینگے کہ آپ احترام کریں مولویوں کا۔ احترام کریں مشائخ کا۔ احترام کریں اہل دین کا۔ احترام کریں اہل اللہ کا۔ اگر یہ چیزیں آپ کے اندر پیدا ہوجائیں تو آج آپ کا کام بن جائے۔

ہم آپ کے یہاں آگئے ہیں اسواسطے آپ سے کہتے ہیں کہ یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ خواب غفلت میں سوتے رہیں بلکہ آپ کو چاہئیے کہ غافل نہ ہوں اور جو کام کرنے کا ہے اسکو کریں خواہ دنیا کا کام کیجئے یا دین کا اس میں اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ کیجئے اور اسی پر اپنی نظر رکھئے۔

بعض لوگ ہم کو بھی ڈراتے ہیں اور ادھر ادھر کی باتیں کہتے ہیں۔ تو ہم نے ان سے کہا کہ بھائی ویسے ڈر کی چیزیں تو بہت سی ہیں لیکن ہم کس کس سے ڈریں۔ بس ایک ہی سے ڈرینگے اور صرف اسی ایک ہی سے ڈرنا بھی چاہئیے۔ اسلئے کہ وہ ایک ایسا ہے کہ اس کے اختیار میں سب کچھ ہے اور اسی کو یہ قدرت ہے کہ سب کے خوف کو امن سے بدل دے اسوجہ سے اس قسم کی باتوں کا سننا بھی برا معلوم

ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی باتیں کرنے والوں سے کہہ دیتا ہوں کہ باہر آپس میں جو کہنا ہو کہو سنو۔ لیکن یہاں آکر ہم کو یہ سب مت سکھاؤ۔ یہاں آنا ہو تو سیکھو اور سمجھو کہ طریقہ کیا ہے۔ سنو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ ۝ إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا ۝

یعنی اے لوگو اللہ کا وعدہ ضرور سچا ہے سو ایسا نہ ہو کہ یہ دنیوی زندگی تمکو دھوکہ میں ڈالے رکھے اور ایسا نہ ہو کہ تمکو دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکہ میں ڈالدے۔ یہ شیطان بیشک تمہارا دشمن ہے سو تم اسکو دشمن سمجھتے رہو۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا۔ میں تو شیاطین الانس والجن کے عدو ہونے کی خبر دی ہے اور یہاں امر ہے کہ فاتخذوہ عدوا یعنی شیطان کو اپنا دشمن بنا لو۔ یعنی جس طرح کسی آدمی کو کوئی شخص دوست بناتا ہے یا استاد اور شیخ بناتا ہے اسی طرح تم شیطان کو دشمن بنالو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لئے فرمایا کہ شیطان چونکہ خود دوزخی ہے اسلئے تم کو بھی دوزخی بنانے کے لئے بہکاتا ہے تاکہ اپنی ایک جماعت تیار کرے اور تنہا دوزخ میں نہ جائے بلکہ تم کو بھی اپنے ساتھ لے جائے۔ اس لئے اس کا پورا مقابلہ کرو۔ اللہ تعالےٰ سے دعا کرو اور انبیاء کی اطاعت کرو۔ نیز اس کی عداوت کا دل میں ہونا اسلئے ضروری ہے کہ اگر عداوت نہ ہوگی تو ہو سکتا ہے کہ آدمی دھوکہ میں آکر اسکو دوست سمجھ لے اور غلطی میں پڑ کر اس کا اتباع کرلے اسلئے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ اس کے ساتھ معاملہ دشمنی کا کرو۔ تاکہ گمراہی کا سد باب ہو جائے۔

میں نے ابتداء میں ایک عالم کے تنبہ کا واقعہ ذکر کیا تھا۔ وہ علامہ ابن حجر کا واقعہ ہے انھوں نے شیخ ابن فارض کے بعض ابیات تائیہ کی شرح کی تھی اور اسکو شیخ مدین کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے اسکے سرورق پر یہ شعر لکھ کر واپس فرمادیا ؎

سَارَتْ مُشَرِّقَةً وَسِرْتُ مُغَرِّبًا — شَتَّانَ بَيْنَ مُشَرِّقٍ وَمُغَرِّبِ

یعنی وہ تو مشرق کی طرف چلی گئی اور میں مغرب کی طرف کو چلا۔ اور مشرق و مغرب دو مخالف رخ پر چلنے والوں میں تو بون بعید ہے پھر دونوں میں ملاقات کیونکر ہو۔

شیخ مدین نے اس میں یہ بتلایا کہ آپ تو دوسرے کام میں ہیں یعنی علم میں رہے ہیں اور اسکی کچھ خدمت کی ہے تو اس میں آپ کو مہارت ہو گئی ہوگی مگر اس راستہ میں تو آپ نے ابھی قدم رکھا نہیں تو اس میں آپ کی بات کیسے معتبر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ راستہ ہی دوسرا ہے اور اہل اللہ اسکو قطع کر رہے ہیں۔ لہذا اگر ہم لوگ بزرگوں کے کلام کی شرح کرتے تو ہم کو حق ہے اور ہماری

بات معتبر ہوتی اور جبکہ آپ ابھی غفلت میں ہیں تو کیا ہم ہی سے اپنے غفلت کی تصدیق کرانا چاہتے ہیں؟

اس سے وہ سمجھے کہ شیخ مدین ہماری حالت کو پسند نہیں فرما رہے ہیں اور متنبہ ہوئے کہ اہل طریق کے حالات کچھ اور ہیں اور اسکی طرف متوجہ ہوئے یعنی شیخ مدین کی خدمت میں آئے اور انھیں کے پاس رہے پھر بہت کچھ اصلاح ہوئی اور شیخ کی خدمت میں رہ پڑے اور وہیں وفات پائی رحمہ اللہ

دراصل یہ ان کے خدمت حدیث کی برکت تھی، چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ کی شرح اور توضیح میں ساری عمر گذاری تھی اس لئے اللہ تعالی کی غیرت کو یہ گوارا نہ ہوا کہ یہ میرے حبیب کے کلام کا شارح یونہی خالی رہ جائے۔ اس لئے اللہ تعالے نے ایسے اسباب فرما دیئے کہ ان کا کام بن گیا۔ سچ ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ +

یہ اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ علماء کرام نے اہل طریق کا اذعان کیا ہے۔ دیکھئے یہ اتنے بڑے عالم تھے جو شہرۂ آفاق اور دین کے علمبردار تھے۔ ہزاروں ہزار ان کے شاگرد تھے۔ یہ بخاری کے شارح ہیں۔ مگر جب شیخ مدین نے ان کو اللہ تعالے کے راستہ میں لاکر ڈالا اور اہل طریق کے حالات میں آئے تب جاکر ان کی تکمیل ہوئی اور ان کی وجہ سے بہت مخلوق کی اصلاح ہوئی۔ اس لئے کہ لوگوں نے دیکھا اور ان کو معلوم ہوا کہ اتنے بڑے بڑے لوگ جو دین کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں ان کو بھی بزرگوں کی طرف رجوع ہونے کی ضرورت ہوئی۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ اگر ایک عالم کی اصلاح ہو جائے تو ہزار ہا ہزار آدمی درست ہو جائیں کیونکہ عالم کی اصلاح سے عالَم کی اصلاح ہے۔

اسی طرح سے ایک اور عالم تھے۔ ان کے رجوع کرنے کا واقعہ بھی عجیب و غریب اور نہایت عبرتناک اور سبق آموز ہے۔ طبقات کبریٰ میں موجود ہے وہ یہ کہ شیخ عبادہ سادات مالکیہ میں سے ایک ممتاز عالم تھے اور اپنے ہم عصر شیخ مدین پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ یوں کہتے تھے کہ یہ طریق جس پر یہ لوگ اپنے کو کہتے ہیں (یعنی تصوف) کیا بلا ہے؟ ہم تو صرف شریعت کو جانتے ہیں اس کے علاوہ سب ڈھکوسلا ہے۔ ان کو شیخ مدین کا انکار تو تھا ہی اس میں مزید اضافہ اس سے ہو گیا کہ شیخ عبادہ کے درس کو چھوڑ چھوڑ کر لوگ شیخ مدین کی

مجلس میں آنے لگے۔ ایک مرتبہ شیخ مدین نے ان کی دعوت کہلا بھیجی اور پھر شیخ مدین نے اپنے اصحاب سے تاکید کر دی کہ جب شیخ عبادہ آویں تو خبردار کوئی شخص اپنی جگہ سے جنبش نہ کرے اور نہ ان کی تعظیم کے لئے کوئی شخص کھڑا ہو اور نہ مجلس میں ان کے لئے جگہ ہی کشادہ کی جائے چنانچہ شیخ عبادہ آئے تو آکر خانقاہ کے صحن میں کھڑے ہو گئے اور سب لوگ حتیٰ کہ شیخ مدین بھی گردن جھکائے بیٹھے رہے یہ منظر دیکھ کر ان کو بہت رنج ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غصہ کی وجہ سے پاش پاش ہو جائیں گے اور قریب تھا کہ کچھ کہہ دیں۔ کیونکہ عالم جب خفا ہوتا ہے تو کم از کم فسق کا درجہ کفر کا فتویٰ صادر کر دیتا ہے۔ جب اس حالت پر کچھ دیر گذر گئی تو سید مدین نے سر اٹھا کر حاضرین سے فرمایا کہ بھائی شیخ عبادہ کے لئے راستہ کشادہ کر دو اور ان سے فرمایا کہ تفضل یا شیخ یعنی تشریف لایئے۔ جب وہ پاس آکر بیٹھ گئے تو ان سے فرمایا کہ ابھی ایک سوال ذہن میں آگیا اجازت ہو تو عرض کر دوں) شیخ عبادہ نے جواب دیا کہ ہاں سوال کیجئے۔ کہا کہ آیا آپ کے نزدیک مشرکین کی تعظیم کے لئے قیام جائز ہے باوجودیکہ ان کی جانب سے کسی قسم کے شر کا خوف نہ ہو۔ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ سید مدین نے فرمایا کہ اچھا تو آپ کو خدا کی قسم دیکر پوچھتا ہوں کہ جب آپ یہاں تشریف لائے تھے اور کوئی کھڑا نہ ہوا تو آپ کو یہ فعل کچھ ناگوار خاطر ہوا تھا یا نہیں۔ شیخ عبادہ نے کہا کہ ہاں بے شک ناگوار ہوا تھا۔ اس کے بعد پھر سید مدین نے ان سے دوسرا سوال یہ کیا کہ اچھا یہ بتلایئے کہ اگر آپ سے کوئی شخص یہ کہے کہ میں آپ سے اسوقت تک راضی نہ ہونگا جب تک کہ آپ میری ایسی تعظیم نہ کریں جیسی کہ اپنے رب کی تعظیم کرتے ہیں تو آپ اس شخص سے کیا فرمائیں گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں اس سے یہ کہونگا کہ اے شخص تو کافر ہو گیا۔ پھر کچھ دیر تک سلسلۂ کلام جاری رہا۔ (میرا یہ خیال ہے کہ شیخ مدین نے ان مقدمات کو تسلیم کرانے کے بعد ان کا انطباق فرمایا ہوگا کہ یہی حال آپ کا بھی ہے کہ ہم سے بھی آپ اپنی تعظیم ایسی ہی چاہتے ہیں جیسی خدا اپنے بندوں سے چاہتا ہے۔ اس کے متعلق کبھی تو حکم لگایئے کہ یہ کیا ہے؟ غرض شیخ عبادہ کی سمجھ میں بات آگئی) تا آنکہ انھوں نے کھڑے ہو کر اسی بھرے مجمع میں اعلان کیا کہ آپ سب لوگ گواہ رہئے کہ میں آج سیدی مدین کے ہاتھ پر مسلمان ہوتا ہوں اور دین اسلام میں صحیح طور پر داخلہ کا آج میرا پہلا دن ہے۔ پھر تا زیست ان کی خدمت میں رہے۔ حتیٰ کہ وہیں انتقال ہوا اور مقابر فقراء میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالےٰ۔

اس واقعہ سے جس طرح شیخ مدین کی کرامت اور اصلاح و تربیت کے معاملہ میں ان کے کمال اور تصرف کا پتہ چلتا ہے اسی طرح شیخ عبادہ کے بھی کمال خلوص کا اندازہ ہوتا ہے کہ جب ان کو اپنے حال کی معرفت ہو گئی اور بات سمجھ میں آگئی تو فوراً تائب ہو گئے۔ کہاں تو طریق و اہل طریق کے منکر اور شیخ مدین پر معترض تھے اور کہاں سب کے سامنے یہ کہہ رہے ہیں کہ میں آج حلقہ بگوش اسلام ہوتا ہوں۔ سبحان اللہ کس قدر بے نفسی اور تواضع کی بات ہے۔ آخر تھے تو عالم ہی کتاب و سنت کے علم نے ان کے قلب پر اثر کیا تھا۔ ان میں اخلاص تھا۔ اسی کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت فرمائی۔ (اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ)

(یعنے اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کے اجر کو ضایع نہیں فرماتے)

یہ واقعات آپ کو اس لئے سنا رہا ہوں کہ جب اتنے بڑے بڑے علماء و فضلاء کو بھی اہل طریق کا اذعان کرنے کی اور ان کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہوئی تو آپ جو کہ کچھ نہیں ہیں نہ تو ظاہری علم ہے نہ باطنی علم و عمل پھر بھی اہل طریق کو کچھ نہ سمجھیں تو کیا اصلاح ہوگی۔

سنئے! جب تک بزرگان دین کو جو اصلی بزرگ ہیں ان کو نہیں پکڑیں گے اور اصلاح میں قدم نہیں رکھیں گے کچھ کشود کار نہ ہوگا لہٰذا آپ لوگوں کو چاہیئے کہ اپنی اصلاح کریں اور اسکے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اکابر دین کو پہچانیں اور ان کی طرف توجہ کریں اسلئے کہ دین و دنیا دونوں کا حصول ان کی اتباع میں منحصر ہے۔ کیونکہ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصور ہوتے ہیں تو جو شخص ان کا ساتھ پکڑے گا وہ بھی منصور من اللہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت اسکے ساتھ ہوگی۔ اس مضمون کو بہت بیان کرنا چاہتا ہوں گویا یہ سمجھ لیجئے کہ شاید اسی کے کہنے کے لئے آگیا ہوں۔ مگر یہ کہ اس آجانے کو مہمل اور عبث نہ ہونے دیجئے گا۔ کہ مجھ کو تو آپ نے اپنی جگہ سے سرکا دیا اور آپ خود اپنی جگہ سے نہ سرکیں۔ یہ اچھا نہیں ہے۔ آپ کو بھی اپنی جگہ سے کھسکنا ہوگا لہٰذا آپ اپنا مرکز چھوڑیئے اور جس کو کہتا ہوں اس چیز کی طرف آئیے یعنی اپنی زندگی کا نصب العین آخرت کو بنایئے۔

آپ نے مجھ کو کہنے کی اجازت دی ہی ہے۔ اس مضمون کو پھر بیان کروں گا۔ اسوقت جو آیت میں نے شروع میں پڑھی تھی اس کے متعلق مختصراً کچھ کہتا ہوں۔ تفصیلی بیان انشاء اللہ پھر کروں گا۔ اس آیت میں یوسف علیہ السلام کا ذکر ہے۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ ۝ یعنی یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انکو بہت کم قیمت میں یعنی گنتی کے چند درہم کے عوض بیچ ڈالا سو جتنے وہ لوگ انکے کچھ قدرداں تو تھے ہی نہیں۔

سورۂ یوسف میں اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں اسکے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا تو بھی ان کا سب دُکھ مٹ جاتا کہ اس طرح اللہ تعالیٰ تسلی فرما رہے ہیں۔ کہاں تو یوسف علیہ السلام اولوالعزم پیغمبر نیز کس قدر خوبصورت تھے اور پھر یہ کہ بھائی تھے۔ لیکن ان سب کے باوجود بھائیوں نے ان کی ایسی بے قدری کی کہ چند دراہم میں ان کو بیچ دیا اور ان کے بارے میں زاہد تھے۔ اور یہ چاہتے تھے کہ یہ دنیا سے نکل جائیں۔

اس کے متعلق پھر کہونگا کہ یہ آیتہ میں نے اسوقت کیوں پڑھی ہے۔ یہی سمجھ لیجئے کہ آپکے لئے پڑھی ہے کہ آپ دراھم معدودہ یعنی دنیا میں پڑکر خدا کو بھولے ہوئے ہیں اور دین حاصل نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ اکثر لوگوں کو تو دنیا بھی حاصل نہیں لیکن اس کے باوجود فکر دنیا میں پڑکر آخرت کو بھولے ہوئے ہیں۔ اور زیادہ تعجب تو ان لوگوں سے ہے جن کا تعلق کسی اہل اللہ سے ہے اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے کسی کا وقت پایا ہے پھر بھی اس طرف التفات نہیں کرتے۔ بالکل اس کا مصداق ہیں سے

زمزم بھی پیا پر نہ بجھی آگ جگر کی کعبے بھی گئے پر نہ گیا عشق بتوں کا

اہل اللہ سے تعلق بھی رکھتے ہیں اور پھر بھی محروم ہیں۔ اگر ایک آدمی سیکھ لے اور دین حاصل کرنے لگے تو اسکو دیکھ کر دوسرا اور پھر تیسرا سیکھنے لگے۔ اسی طرح دنیا میں یہ خیر خیرات بڑھ جائے۔ اور دین کی اشاعت عام ہونے لگے۔ لیکن جب ایک آدمی آیا اس نے کچھ نہیں کیا دوسرا آیا وہ بھی کام پر نہیں لگا اسی طرح بہت سے لوگ جمع ہو گئے تو عوام الناس دیکھتے ہیں کہ فلاں جگہ جانے والے لوگوں میں سے ایک آدمی کو بھی کچھ حاصل نہیں ہوا تو سمجھتے ہیں کہ وہاں جانے سے کیا فائدہ۔ دنیا میں اہل اللہ جو بدنام ہوتے ہیں تو انھیں مریدوں کی وجہ سے کہ یہ لوگ آنے جانے کے باوجود سچے نہیں ہوتے۔ اگر یہ دین سیکھیں اور صدق وخلوص اختیار کریں اپنی اصلاح پر لگ جائیں تو بہت سے لوگوں کو نفع ہو۔

اب آپ سے کہتا ہوں کہ جو چیزیں میں بیان کیا کرتا ہوں ان سب کو چند روز میں آپ سے بیان کر دوں گا اور کوشش کروں گا کہ آپ کو سمجھا دوں۔ یوں تو یہ بات اللہ کے

ہی کے اختیار میں ہے کہ آپ لوگوں کے کان میں صحیح طور پر بات پہنچے اور آپ لوگ صحیح طور پر اسکو سمجھیں۔ ہمارے اختیار میں محض یہ ہے کہ ہم خلوص اختیار کریں اور حق بات کہنے کا عزم کریں اور سچی بات آپ سے کہیں۔

لہذا ہم جو کہنا چاہتے ہیں اسکو اچھی طرح سمجھئے کہ کیا مقصد ہے اور کیا کہنا چاہتے ہیں ہملوگوں کو تبرک نہ بنائیے۔ اسلئے کہ تبرک بنانے کا وقت نہیں ہے۔ اب یہی ہو گیا ہے کہ جو مشائخ اچھے اچھے اور بڑے درجے کے ہوتے ہیں ان کو عوام الناس تبرک بنا لیتے ہیں اور ان کا ہاتھ چومتے ہیں تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ اور بس۔ خیر بزرگوں کی تعظیم و تکریم تو اچھی چیز ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسکو چھوڑ دیجئے لیکن محض اتنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ ان کی تعلیمات کو اپنانا چاہئیے اور انکے اعمال کو اخلاق کو لینا چاہئیے۔ ان کی باتوں کو سمجھنا چاہئیے کہ کیا کہتے ہیں ورنہ اگر ایک دن گیا دوسرا دن گیا تیسرا دن گذرا تو اسی طرح کل وقت گذر جائیگا۔ یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بڑے بڑے فاضل اور کامل لوگ جو بہت سے انوار و برکات کے حامل تھے اسی دور میں رہے ہیں مگر یہ کہ لوگوں کو ان سے جتنا فائدہ اٹھانا چاہئیے تھا نہیں اٹھایا۔ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ ایسے بلند درجے کے ہیں تو ٹوٹ پڑتے۔

اسواسطے کہ: ہم کہ وقت کی قدر کرنی چاہئیے اور فکر سے کام کرنا چاہئیے۔ جو باتیں کام کی ہوتی ہیں وہ جلدی سمجھ میں نہیں آتیں دیر لگتی ہے۔ سن لینا تو پھر بھی آسان ہے مگر اسکو سمجھنا اور جیسا کہ حق ہے سمجھنے کا ویسا سمجھنا ذرا دشوار ہوتا ہے۔ اسلئے اگر آدمی نہ سمجھے تو دوسرے کسی سمجھدار سے پوچھنا چاہئیے کہ کیا کہہ رہے تھے اور کس بات پر زیادہ زور دیتے تھے۔ یہ بہت ضروری ہے اسلئے کہ ہم لوگوں کی سمجھ کم ہو گئی ہے ورنہ ہمارے وعظ اور جلسے بہت ہوتے ہیں۔ اگر اس طرح سمجھنے کے ارادے سے اور عمل کرنے کے لئے اتنے اتنے آدمی وعظ میں شریک ہوں تو ہم لوگ معلوم نہیں کیا کرلیں اور کتنا کام ہو جائے۔ مگر بات یہ ہے کہ وعظوں اور جلسوں میں عوام الناس تبرکاً ہی شریک ہوتے ہیں یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ برکت کی چیز ہے۔ عمل کرنے کے لئے اور اصل چیز کو حاصل کرنے کے لئے نہیں شریک ہوتے۔ ورنہ یہ وقت ایسا نہیں رہتا جسکی ہم اور آپ شکایت کر رہے ہیں۔ بلکہ بہت کچھ کام ہو جاتا۔ انشاء اللہ کل پھر کہوں گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دوسرا وعظ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم

اما بعد۔ فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۚ وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ مَا فَعَلُوْہُ فَذَرْھُمْ وَمَا یَفْتَرُوْنَ ۝

اس آیۃ میں اللہ تعالے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرما رہے ہیں کہ جس طرح کفار آپ کے دشمن ہیں اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان پیدا کئے تھے کچھ آدمی اور کچھ جن جن میں سے بعضے دوسرے بعضوں کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ ان کو دھوکہ میں ڈالدیں۔ اور اگر اللہ تعالی چاہتا تو یہ ایسے کام نہ کر سکتے۔ سو ان لوگوں کو اور جو کچھ یہ افترا پردازی کر رہے ہیں اسکو آپ رہنے دیجئے:۔

میں اس مضمون کی توضیح کرنا چاہتا ہوں گو آپ لوگوں کو ذرا مشکل سے سمجھ میں آئے گا۔ لیکن جو مضمون مشکل ہونے کے باوجود ضروری ہو اگر اسی کو چھوڑ دیا جائے تو مضمون ہی ناتمام رہ جائیگا۔

اس لئے اس قسم کے مضامین کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلے ربط کیلئے ماقبل کی آیتیں پڑھتا ہوں پھر آیت متلوہ کی توضیح کروں گا۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ لَئِنْ جَآءَتْھُمْ اٰیَۃٌ لَّیُؤْمِنُنَّ بِھَا قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ وَمَا یُشْعِرُکُمْ اَنَّھَآ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ○

یعنی قرآن شریف کے نازل ہونے سے پہلے ان منکر لوگوں نے قسموں میں زور لگا کر اللہ کی قسم کھائی کہ اگر ان کے پاس کوئی نشان آجاوے تو وہ ضرور ہی اس پر ایمان لے آوینگے (یعنی نزول قرآن سے پہلے کفار قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ اگر ہمارے پاس کوئی آیۃ آجائیگی تو ہم اس پر ایمان لے آئیں گے، تو اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ان لوگوں سے) آپ کہہ دیجئے کہ نشان سب خدائے تعالیٰ کی قبضہ میں ہیں اور (اے مسلمانو) تمکو اس کی کیا خبر کہ وہ نشان جس وقت ظہور میں آجاویں گے تو یہ لوگ (غایت عناد سے) جب بھی ایمان نہ لاوینگے۔ پھر آگے فرماتے ہیں۔

وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَھُمْ وَاَبْصَارَھُمْ کَمَا لَمْ یُؤْمِنُوْا بِہٖٓ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّنَذَرُھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ ○

یعنی اور (ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے ہم بھی ان کے دلوں کو (حق طلبی کے قصد سے) اور ان کی نگاہوں کو (حق بینی کی نظر سے) پھیر دینگے (یعنی ان کے دلوں پر اور ان کی آنکھوں پر ایسا تصرف کردینگے کہ اسی میں حیران وسرگرداں رہیں گے۔ اور ایمان کی توفیق ان کو نہ ہوگی اور ان کا یہ ایمان نہ لانا ایسا ہے) جیساکہ یہ لوگ اس (قرآن) پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے اور ہم ان کو ان کی سرکشی (اور کفر) میں حیران (وسرگرداں) رہنے دینگے۔

دیکھئے اللہ تعالیٰ یہ شیاطین الانس کا حال بیان فرمارہے ہیں کہ یہ لوگ جو انبیاء کے مقابل میں لشکر بنکر سامنے آتے ہیں تو پھر اپنے منہ کی کھاتے ہیں۔ اسلئے کہ ہم اس کی سزا میں ان کے دلوں پر اور ان کی آنکھوں پر ایسا تصرف کرتے ہیں کہ ان کی بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور طغیان میں ان کو چھوڑ دیا ہے کہ یہ اسی میں سرگرداں اور متحیر رہیں اور اسی بناپر طرح طرح کے بیجا سوالات کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہتے ہیں کہ

وَلَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا یعنی ہم پر ملائکہ کیوں نہیں نازل ہوتے یا ہم اپنے رب کو کیوں نہیں دیکھ لیتے یا یہ کہتے ہیں کہ ہم سے مردے زندہ ہوکر باتیں کیوں نہیں کرنے لگتے اور یہ کہ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا یعنی اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کو ہمارے روبرو لا دیے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ۝

یعنی ان کے عناد کی تو یہ کیفیت ہے اور یہ ایسے ہٹ دھرم ہیں کہ اگر ہم ان کے پاس فرشتوں کو بھیج دیتے اور ان سے مردے زندہ ہوکر باتیں کرنے لگتے (بلکہ) ہم تمام موجودات غیبیہ) کو ان کے پاس ان کی آنکھوں کے روبرو لاکر جمع کردیتے (کہ یہ سب کو کھلم کھلا دیکھ لیتے) تب بھی یہ لوگ ہرگز ایمان نہ لاتے۔ ہاں مگر خدا ہی چاہے تو اور بات ہے۔ لیکن ان میں زیادہ لوگ جہالت کی باتیں کرتے ہیں:

اس کے بعد بطور قاعدہ کلیہ کے بیان فرماتے ہیں کہ:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ الآیۃ

اب اس کی توضیح کرتا ہوں سنیئے۔

سب سے زیادہ برگزیدہ اور پسندیدہ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق رکھنے والی جماعت اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کی ہے اور ان میں بھی سب سے افضل اور محبوب تر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ ان سے اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ ہم نے جس طرح ہر نبی کو نبی بنایا اسی طرح ہم ہی نے شیاطین الانس اور شیاطین الجن کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے۔ پس جس طرح دنیا میں نبی کا مبعوث ہونا حکمت ہے اسی طرح ان کے دشمنوں کے ہونے میں بھی حکمت ہے اور جب اللہ تعالیٰ ہی ان کے دشمن بنانے کے جاعل ہیں تو اس میں اہمیت بھی ہے۔ اس بات کو انبیاء علیہم السلام نے سمجھا اور اسی بناء پر اللہ تعالیٰ کی جناب میں استغاثہ اور استعاذہ پیش فرمایا۔

نیز جس طرح نبی کا وجود ایک رحمت ہے اسی طرح ان کے دشمنوں کا وجود ایک قہر ہے اور جس طرح نبی اللہ تعالیٰ کے اسم ہادی کا مظہر ہے اسی طرح شیطان بھی اسم مضل کا مظہر ہے

ان دونوں میں پورا مقابلہ اور زبردست جنگ ہے اور دونوں طرف سے پوری قوت صرف ہوتی ہے۔ درحقیقت کامل مقابلہ اور قوت کا اندازہ تو اسی وقت ہوتا ہے جب جانبین میں برابر کی قوت ہو۔ ورنہ اگر کوئی پہلوان کسی بچّے سے لڑجائے اور وہ بچہ بری طرح گرجائے تو یہ کوئی تعریف کی بات نہیں۔ بلکہ تعریف تو جب ہے کہ دوسری طرف سے بھی کوئی پہلوان ہی ہو اور ایک قوت دوسری قوت سے ٹکرائے اور دونوں میں مڈبھیڑ ہو تب اسکی قوت کا پتہ چلتا ہے۔

اسی سے سمجھئے کہ شیاطین کا گروہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ پوری قوت سے ٹکراتا ہے اس لئے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے اسم مضل کا پورا مظہر ہے۔ نیز وہ اپنی قوت بڑھانے کے لئے شیاطین الانس کو بھی اپنا شاگرد بنالیتا ہے۔ جیساکہ نص قرآنی بتلارہی ہے کہ شیطان کی دو قسمیں ہیں، ایک شیطٰن الانس دوسرے شیطٰن الجن۔ اور ان میں سے بعض دوسرے بعضوں کو وسوسہ ڈالتے رہتے ہیں۔ یعنی جس طرح انبیاء کے پاس وحی آتی ہے اسی طرح بالکل اسکے مدمقابل شیطان لوگوں کے قلوب پر میٹھا بھونکتا رہتا ہے۔ اور جو اس کے شاگرد ہیں وہ اس کے وسوسوں کو قبول کرتے ہیں اور شیطان انھیں کو انبیاء کے مقابلے میں سکھا پڑھا کر لاکھڑا کرتا ہے۔ خود سامنے نہیں آتا۔ وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ ؕ اور اگر اللہ تعالے چاہتے تو یہ ایسا نہ کرسکتے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں اور ان کی مشیّت کے خلاف کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ دونوں سلسلے ساتھ ساتھ رہیں ہدایت کا سلسلہ بھی رہے، اور ضلالت کا بھی تاکہ جس کا جی چاہے جہنم کا راستہ اختیار کرے اور جس کا جی چاہے وہ دوسرے سلسلہ میں داخل ہوجائے اور کتاب وشریعت اس لئے نازل کی گئی ہے۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ؕ یعنی تاکہ جو زندہ رہے (اور مسلمان ہو) وہ بعد بیّنہ کے زندہ رہے اور جو ہلاک ہو وہ بعد بینہ کے ہلاک ہو تاکہ اس پر حجت قائم ہوجائے اور وہ کوئی عذر قیامت میں پیش نہ کرسکے۔ یہ حکمت ہے کتاب کے نزول میں۔ اسی لئے آگے فرماتے ہیں کہ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ آپ ان کو اور ان کی افتراء پردازی کو چھوڑ دیجئے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ یہ بھی رہیں اور ان کا افتراء بھی رہے۔

ان دونوں سلسلوں کے باقی رکھنے میں حکمت یہ ہے کہ یہ دنیا دارالابتلاء ہے اور یہاں جتنی چیزیں ہیں سب ابتلاء ہی کے لئے ہیں۔ چنانچہ انسان کی پیدائش بھی اسی لئے ہوئی ہے

جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝ اور فرماتے ہیں کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ یعنی ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے پھر ہم اس کو پستی کی حالت والوں سے بھی پست کر دیتے ہیں۔

اور فرماتے ہیں وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمُونِ ۝ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ۝

یعنی اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں میں ان سے رزق رسانی کی درخواست نہیں کرتا۔ اور نہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلایا کریں۔ اللہ خود ہی سب کو رزق پہونچانے والا ہے۔

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے موت اور حیات کو اسی طرح جن اور انسان کو ابتلاء ہی کے لئے پیدا فرمایا ہے چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور ان کے ساتھ احکام خداوندی کا نزول یہ تمام عالم والوں کے لئے سخت ابتلاء ہے پھر یہ ابتلاء مخلوق کے حق میں نعمت بھی ہے اور نقمت بھی۔ اس طور پر کہ جو شخص انبیاء کی تصدیق کریگا اور احکام خداوندی کا اتباع کریگا اس کے حق میں یہ ابتلاء نعمت ہے اور جو انبیاء کی تکذیب کریگا احکام کی خلاف ورزی کرے گا اور نفس و شیطان کا اتباع کرے گا اسکے حق میں نقمت ہے۔ آدمی کا نفس اور شیطان بھی ابتلاء خداوندی ہے بلکہ اس کی وجہ سے مجاہدہ اور بڑھ جاتا ہے کیونکہ نفس و شیطان بالکل شرع کے مزاحم ہوتے ہیں تو اگر صرف انبیاء تشریف لاتے اور محض ان کی تعلیمات ہوتیں اور کوئی چیز اس کے مزاحم اور خلاف نہ ہوتی اسوقت لوگوں کا ان تعلیمات کو قبول کر لینا اتنا کمال نہ ہوتا جتنا کہ اس حالت میں ہے کہ انبیاء کی تعلیمات کے بالمقابل نفس شریر بھی موجود ہے اور شیطان کا القاء اور وسوسہ بھی موجود ہے۔ یعنی جس طرح انبیاء کے پاس وحی آتی ہے اسی طرح شیطان لوگوں کے قلوب پر بیٹھا ہوا پھونکتا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ان سب دشمنوں کا مقابلہ نہایت دشوار ہو جاتا ہے مگر جو لوگ موفق من اللہ ہوتے ہیں وہ سب ابتلاآت کے مقابلے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ دنیا کا بھی مقابلہ کرتے ہیں اور نفس و شیطان کا بھی مقابلہ کرتے ہیں۔ گویا زبان حال یہ کہتے ہیں ؎

ف یعنی اللہ تعالیٰ نے موت اور حیات کو اسلئے پیدا فرمایا ہے تاکہ تم کو آزمائے کہ عمل کے اعتبار سے کون اچھا ہے۔ ۱۲

گر دو صد زنجیر آری بگسلم
غیر زلفِ آں نگار مقبلم

یعنی اگر دو سو زنجیریں اور بیڑیاں ڈالو گے تو سب کو توڑ پھینکوں گا۔ البتہ اس محبوب حقیقی کی زلف میں لپٹا چلا آؤں گا۔

ان کی نظر اللہ تعالیٰ پر ہو جاتی ہے اور ان کو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ قیامت آنیوالی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور یہ دنیا کی زندگی ایک خیالی زندگی ہے جو آخرت کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس زندگی کا کچھ نتیجہ مرتب نہ ہوگا اور یہ اسی طرح ختم ہو جائیگی۔ اسلئے کہ اسی زندگی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ؕ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ یونہی مہمل (مفت سفت) چھوڑ دیا جاوے گا۔ اور اس زندگی کا کچھ نتیجہ مرتب نہ ہوگا۔

آدمی کا نفس بہت شریر و سرکش ہوتا ہے لیکن جب انبیاء علیہم السلام کی صحبت کے برکات اس پر پڑتے ہیں تو وہ مطمئنہ ہو جاتا ہے اور پھر انبیاء کے اتباع پر چلنے لگتا ہے اور پہلے جس نیک کام کو نہیں کر سکتا تھا یا اس کا کرنا دشوار معلوم ہوتا تھا اور اس میں حظ و لطف نہیں آتا تھا اسی کو اب خوشی خوشی اور آسانی کے ساتھ کرنے لگتا ہے اور اس میں لذت و حلاوت محسوس کرتا ہے

انبیاء علیہم السلام اسی کام کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اور یہ منصب انکو منجانب اللہ سپرد ہوتا ہے اس وجہ سے ان سے یہ کام انجام پاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی نصرت اور مدد ہوتی ہے اور شیطان چونکہ دوسرے کام کے لئے پیدا ہوا ہے اسلئے وہ اپنا کام کرتا ہے مگر سوائے بُرے بُرے وسوسہ ڈالنے کے ہمکو کسی فعل پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اسی بنا پر قیامت کے دن اپنے شاگردوں سے کہے گا کہ وَمَا کَانَ لِیَ عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُکُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَکُمْ۔ یعنی میں تم پر حاکم نہیں مقرر ہوا میں نے تو تم کو دعوت دی اور تم نے مان لیا تو مجھ پر ملامت مت کرو بلکہ اپنے اوپر ملامت کرو۔

آپ دیکھتے ہیں کہ آخرت میں چلکر شیطان یہ فیصلہ کریگا کہ خالی مجھ کو ملامت کا نشانہ کیوں بناتے ہو۔ میں تو وسوسہ ڈالکر الگ ہو جاتا تھا۔ البتہ تمھارا نفس تمھارے ساتھ تھا اور تمھارے سامنے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات موجود تھیں تم ان کو نہیں لیتے تھے اور ہمارے وسوسوں کو

خوشی خوشی قبول کرتے تھے تو اب میں بھی بھگت رہا ہوں اور جہنم میں جارہا ہوں تم بھی بھگتو اور اسی گرم جگہ میں تم بھی رہو۔

شیطان سے جس قدر عداوت اور نفرت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تھی وہ کسی دوسرے کو نہیں تھی۔ حتیٰ کہ شیطان بھی سمجھتا تھا کہ یہ اللہ کے امر میں بہت سخت ہیں اس لئے ان سے بہت ڈرتا تھا چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عمرؓ جس گلی سے گذر جاتے ہیں شیطان اس گلی کو چھوڑ کر دوسرے راستہ سے جاتا ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ انبیا علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے دوسری زندگی کے لئے پیدا کیا ہے۔ تاکہ وہ لوگوں کو آخرت یاد دلائیں اور یہ سمجھائیں کہ یہ زندگی ناپائدار اور فانی ہے اس میں چند روز ہی رہنا ہے اور یہ کسی مقصد کے لئے پیدا ہوئی ہے اور سب سے بڑا مقصد اس سے یہ ہے کہ آدمی اس دار دنیا میں آکر اللہ تعالیٰ کو پہچانے آخرت کو پہچانے اور جنت اور دوزخ کو پہچانے وہاں کے قرب و رضا کو پہچانے اور یہ سمجھے کہ آخرت باقی اور ہمیشہ رہنے والی ہے اور دنیا فانی و ناپائدار ہے۔ یہ منصب بہت بڑا ہے اور انبیا علیہم السلام کو انتخاب خداوندی سے ملتا ہے۔ پھر وہ خدا کی طرف سے یہاں کی زندگانی میں تصرفات کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو بتلاتے ہیں اور ایسے با اخلاق ہوتے ہیں کہ ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جس سے دنیا والوں کو ذرا بھی نفرت اور انقباض ہو۔

بخاری شریف میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ صحابہ غزوات میں ہر طرف جایا کرتے تھے۔ لیکن ایک مقام ایسا تھا جہاں نہیں جاتے تھے وہاں کے لوگوں نے خود آپس میں غور کیا کہ آخر کیا بات ہے کہ یہ لوگ ہر طرف جاتے ہیں اور یہاں نہیں آتے۔ حالانکہ ہم قریب ہیں اور یہیں سے ہوکر یہ لوگ گذرتے ہیں تو ایک شخص نے بتایا کہ یہاں کے ایک آدمی نے ان کو پانی پلایا ہے اسلئے اس کا احسان مانتے ہیں۔ تمہارے یہاں غزوے کے لئے کبھی نہیں آوینگے اس کا اثر ان لوگوں پر یہ ہوا کہ وہ سب لوگ حضور کی خدمت میں حاضر ہوکر برضا و رغبت مسلمان ہو گئے۔

سبحان اللہ یہ ہیں نبی کے اخلاق۔ سب سے زیادہ عمل کرنے والے اور سب سے زیادہ احسان ماننے والے انبیا علیہم السلام ہی ہوتے ہیں۔ جس کا یہ اچھا اثر ہوتا ہے۔

انبیا علیہم السلام چونکہ احکام کی تعلیم فرماتے ہیں یعنی اوامر کا حکم دیتے ہیں اور مناہی

سے روکتے ہیں تو یہ سب قیود آزادی کے خلاف ہوتی ہیں اور نفس کو ناگوار ہوتی ہیں اسلئے لوگ ابتدا میں بھناتے ہیں اسواسطے انبیاء کے دشمن ہو جاتے ہیں لیکن جب ان کے اخلاق سے متاثر ہو کر ایمان لاتے ہیں اور آخرت قلب میں آجاتی ہے تو ان سے بڑھ کر کوئی دوست نہیں ہوتا۔ چنانچہ جس قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ مانتے تھے بعد میں بڑے بڑے اولیاء اللہ ہوئے ہیں مگر مانتے میں ان کے عشر عشیر بھی نہیں ہوئے اس وجہ سے کہ صحابہ کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف رکھتے تھے اور وہ آپ کے فیوض و برکات کا مشاہدہ کرتے تھے اور جتنی جس کی استعداد تھی وہاں تک حضور نے ہر ایک کو پہنچایا جو دولت وصول الی اللہ کی انبیاء کے ذریعہ سے ملتی ہے وہ کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اسکے مقابلے میں ایسی ہزاروں دنیا کو ٹھکرا دیں اور کچھ نہ سمجھیں۔

صحابہ رض ایک مرتبہ فارس تشریف لے گئے جب وہاں دربار میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ریشم کے فرش بچھے ہوئے ہیں ان کو نیزوں سے ہٹانے لگے اور فرمایا کہ نھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الحریر والدیباج او کما قال۔ یعنی ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ ان لوگوں کو اس سے بہت تعجب ہوا کہ یہ عجیب لوگ ہیں نھانا رسول اللہ کہتے ہیں وہ بیچارے اس کو کیا سمجھتے۔ اسکو تو وہی سمجھ سکتا ہے جس کے قلب میں آخرت آچکی ہے اور اللہ و رسول کی محبت سما چکی ہو۔ اس چیز سے جسکو جسقدر حصہ ملتا ہے اسی قدر وہ دنیا سے مستغنی ہو جاتا ہے چنانچہ صحابہ کو یہ چیز حاصل تھی اور آخرت پیش نظر تھی اسلئے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے لئے یہ سب ریشم وغیرہ آخرت میں اور جنت میں ہیں وہ دنیا سے بالکل مستغنی تھے لیکن اسکے باوجود سب سے زیادہ دنیا انھیں کو ملی اور جس قدر فتوحات صحابہ پر ہوئیں بعد میں نہیں ہوئیں اور جو عزت ان کو ملی بعد والوں کو نہیں مل سکی۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ یعنی اللہ کے لئے عزت ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مومنین کے لئے لیکن منافق لوگ جانتے نہیں اور فرماتے ہیں۔ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ اور اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کے خزانے ہیں لیکن منافقین سمجھتے نہیں۔

تو صحابہ سے زیادہ نہ کسی کو عزت ملی نہ دولت مگر باوجود اس کے اس امر پر سب کا اتفاق

ہے کہ بعد والے ایمان میں صحابہ کے پاسنگ بھی نہیں ہوئے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ آسمان و زمین کے خزانے ان کے لئے کردیئے مگر انھوں نے دنیا کو منہ نہیں لگایا اور ان کے قلوب میں دنیا کا گذر نہیں ہوا۔

سنئے دنیا وہ مذموم ہے جو کہ قلب میں ہو اور اگر قلب سے باہر جیب میں اور صندوق میں ہو تو کیا برا ہے۔ بلکہ اچھی چیز ہے کہ قوام زندگی اس سے متعلق ہے اور اسکو آدمی ذریعہ آخرت بنا سکتا ہے۔

ایک جگہ میں نے اس مضمون کو بیان کیا تھا تو لوگ بہت محظوظ تھے اور خوش ہو ہو کر بازاروں میں کہتے پھرے میں نے سوچا کہ یہ بات چونکہ لوگوں کے نفس کے موافق ہے اسلئے خوش ہو رہے ہیں اور جب ان کے نفس کے خلاف کوئی بات آئیگی تو یہی لوگ گالی دینے لگیں گے۔

یہ بات بہت مشکل ہے کہ روپیہ جیب میں یا صندوق میں ہو اور دل میں نہ رہے یہ صحابہ ہی کا مقام تھا اور انھیں کی یہ شان تھی کہ فتوحات پر فتوحات ہوتی چلی جاتی تھیں مگر ان کی توجہ ایک ساعت کے لئے بھی خدا کی طرف سے نہیں ہٹی۔ بلکہ وہ دین میں بڑھتے ہی رہے۔ اس واسطے کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے ایمان کی اور قرب کی دولت پائی تھی اور دنیا و آخرت کو پہچانا تھا اور دونوں کا تقابل بھی ان کو خوب اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا اسلئے جنت اور لذات جنت کے سامنے دنیا کی طرف ان کی نظر التفات ذرا بھی نہیں ہوئی۔ بلکہ دنیا اور لذات دنیا کی قیمت ان کے نزدیک ایک مینگنی سے بھی کم تھی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ دل میں ایمان ہو اور آخرت کا اعتقاد جازم اور راسخ ہو اور اسکے ساتھ دنیا کی طرف التفات باقی رہ جائے۔ اسلئے کہ آخرت کے ساتھ دنیا کو وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ کو سمندر کے ساتھ ہے۔ کیونکہ قطرہ اور سمندر دونوں فانی ہیں تو فانی کو فانی کے ساتھ کچھ نسبت ہو سکتی ہے لیکن آخرت باقی اور دنیا فانی تو ان دونوں میں کچھ بھی نسبت نہیں۔ کیونکہ باقی کو فانی سے کیا نسبت۔

جس ذات نے ان چیزوں کو بتلایا ہے اور عقائد حقہ و اخلاق فاضلہ کو مخلوق تک پہنچایا ہے اس کا وجود کیسا با برکت تھا۔ یہ صحابہ ہی سے پوچھ سکتے ہیں کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیسی محبت تھی۔ ان میں مرد و عورت سب کے سب حضور کی محبت میں بالکل چور تھے اور ان کے سویدائے دل میں آپ کی محبت گھر کئے تھی۔ صحابہؓ کے لئے جہاد وغیرہ بڑے بڑے اعمال تھے لیکن انکا سب سے بڑا عمل یہی محبت تھی اور یہی ان کے لئے اللہ تعالے کے عذاب سے نجات کا ذریعہ ہے

اور حضور تمام امت کے لئے شفیع ہیں اور آپ کی شفاعت کے لئے سب سے بڑی چیز آپ سے محبت ہے۔ تو جو ذات کہ اس منصب پر ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کا فریضہ ادا کرے اور اللہ کی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے وہ کیسی کچھ ہوگی۔ حضرت حسان فرماتے ہیں کہ:۔

لَهٗ هِمَمٌ لَا مُنْتَهٰى لِكِبَارِهَا وَهِمَّتُهُ الصُّغْرٰى اَجَلُّ مِنَ الدَّهْرِ

حضور کی نسبت فرماتے ہیں کہ آپ کے لئے بہت سی ہمتیں ہیں ان میں سے بڑی ہمت کی کوئی انتہا نہیں۔ یعنی وہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی سیر کرتی ہے جو غیر متناہی ہے۔ اس لئے اس کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ آپ کی چھوٹی ہمت بھی دہر سے زیادہ بڑی ہے۔

تو جو ذات ایسی عظیم الشان ہو اسکے ساتھ محبت کا اور عقیدت کا کیسا کچھ تعلق ہوگا اسکو ہم بیان نہیں کر سکتے۔ اور اگر اسکو مثال کے طور پر کچھ سمجھایا جا سکتا ہے تو اس طرح کہ جو لوگ مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور ان سے تھوڑی بہت محبت ان کو ہوئی ہے اور ان کی صحبت سے خدائے تعالیٰ کی معرفت اور محبت کا کچھ حصہ ملا ہے اور ایمان قلب میں آیا ہے اور اس کی وجہ سے مشائخ سے محبت ہو گئی ہے اسی سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیسا تعلق اور کتنی محبت رہی ہوگی۔ مگر محبت کامل ہونے کے باوجود صحابہ سب کے سب باہوش تھے۔ یہ صحابہ کا انتہائی کمال تھا۔ بعد والوں میں تو کچھ بے خودی بھی ہو جاتی ہے۔ کسی کو کسی حال کا غلبہ ہو جاتا ہے اور کسی پر کسی کیفیت کا غلبہ رہتا ہے۔ چنانچہ بڑے پیر صاحب پر قضا و قدر کا غلبہ رہتا تھا۔ کسی نے ان کی خدمت میں چینی آئینہ پیش کیا انھوں نے خادم کو دے دیا اور یہ فرما دیا کہ کبھی کبھی لاکر دیدیا کرنا اس میں چہرہ دیکھ لیں گے۔ ایک دفعہ اتفاقاً وہ آئینہ خادم کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور ٹوٹ گیا۔ وہ بہت خائف ہوا کہ اب تو حضرت خفا ہونگے۔ مگر چونکہ وہ جانتا تھا کہ شیخ پر قضا و قدر کا غلبہ رہتا ہے اسلئے اسی کے مناسب الفاظ سوچ کر خدمت میں جاکر عرض کیا کہ "از قضا آئینہ چینی شکست"۔ یعنی بحکم قضا، آئینہ چینی ٹوٹ گیا۔ حضرت نے یہ سنکر برجستہ یہ فرمایا کہ "خوب شد اسباب خود بینی شکست"۔ یعنی بہت اچھا ہوا کہ خود بینی کا ذریعہ ٹوٹ گیا۔

جن چیزوں سے خود بینی وغیرہ پیدا ہوتی ہے ان کو یہ حضرات توڑ دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ محبت جب قلب میں ہوتی ہے تو سب چیزوں کو توڑ دیتی ہے اور تمام تعلقات کو ختم کر دیتی ہے

اور اس محبت میں کبھی کبھی جذب بھی ہوتا ہے جیسا کہ میں نے حضرت مولانا کے یہاں دیکھا کہ ایک آدمی مدراس کے مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سب لوگ بھی بیٹھے تھے کہ یکایک ان پر کوئی کیفیت طاری ہوئی وہ اپنی جگہ سے جست کر کے حضرت کی گود میں جا گرے۔ حضرت کا قلمدان الٹ گیا سیاہی وغیرہ سب گر گئی لیکن حضرت نے کچھ نہیں فرمایا۔ کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ محبت ہے اور اس میں یہ مغلوب ہو گئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہاں سے جست کیا اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ ہم کو بہت اچھا معلوم ہوا اور اپنے دل میں سوچا کہ یہ کام یہاں ہوتا ہے۔ ع

این کار از تو آید و مردان چنیں کنند

اب یہیں سے میں ایک مسئلہ بیان کرتا ہوں سنئے :۔

یہ صاحب جو اپنی جگہ سے جست لگا کر حضرت مولانا کے پاس پہونچے تو یہ جذب تھا اور اگر قدم سے چل کر وہاں تک جاتے تو یہ سلوک ہوتا۔

اب یہ سمجھئے کہ ہر جذب کے لئے سلوک شرط ہے۔ عادۃ اللہ یونہی جاری ہے۔ اسکو مثال سے واضح کرتا ہوں۔

بزرگوں سے ایک حکایت سنی ہے کہ ایک بزرگ اپنے مریدین کے ساتھ ایک دن شاہی محل کے نیچے سے گذر رہے تھے بادشاہ بالاخانہ پر بیٹھا ہوا تھا اس نے اوپر سے کمند لٹکا دی اور ان کو اپنے پاس بلا لیا۔ جب وہ اوپر پہنچے تو بادشاہ نے ان سے سوال کیا کہ بتایئے آپ اللہ تعالیٰ تک کیسے پہنچے؟ انھوں نے فرمایا کہ اسی طرح پہنچے جیسے آپ تک۔ یعنی اگر میں خود آپ تک پہنچنا چاہتا تو میرے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ کیونکہ اگر میں سارے محل کا چکر لگا کر دروازہ پر پہنچتا بھی تو وہاں دربان مجھے روکتے اور اندر نہ جانے دیتے لیکن جب آپ ہی نے مجھے بلانا چاہا تو کمند کے ذریعہ اپنے پاس بلا لیا۔ یہی حال بندہ کے حق تعالیٰ تک پہنچنے کا ہے جب وہ چاہتے ہیں کمند لگا کر بلا لیتے ہیں اور اسی کو تصوف میں جذب کہا جاتا ہے۔ انتھیٰ

جو حضرات بھی اس قصہ کو بیان فرماتے ہیں تو اخیر بات کی طرف زیادہ توجہ دلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتے ہیں تو بندے کو جذب فرما لیتے ہیں اور جو اس سے پہلے کی بات ہے اسکی طرف غور نہیں کرتے کہ آخر وہ بزرگ اپنے شہر سے چلکر بادشاہ کے محل کے گرد تک از خود گئے تھے اسکے بعد بادشاہ کو توجہ ہوئی اور کمند لٹکا کر کھینچ لیا۔ تو وہ بزرگ جو از خود چلکر گئے تھے وہ سلوک تھا اور

جو بادشاہ نے کھینچ لیا وہ جذب تھا۔ اگر اپنے گھر ہی بیٹھے رہتے تو بادشاہ ان کے گھر میں کمند لٹکا کر تھوڑا ہی کھینچتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جذب سے پہلے سلوک لازم ہے۔ اس کی طرف بھی توجہ دلانا چاہیئے۔ اسلئے کہ عادت اللہ یونہی جاری ہے کہ جب کوئی سلوک اختیار کرتا ہے تب ہی جذب فرماتے ہیں اور شواذ و نوادر پر حکم کلی نہیں لگایا جا سکتا اور نہ اس پر اعتماد و اتکال کر کے بیٹھا جا سکتا ہے۔ پس سلوک کو شروع کرو اور اپنے قدرت و اختیار سے جتنا کر سکتے ہو کرو۔ جذب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ اپنے سلوک سے بغیر جذب کے وصول ناممکن ہے مگر سلوک شرط ہے۔

اسی حکایت کے مناسب ایک دوسرا واقعہ بھی سنیئے :۔

انبیٹھہ میں ایک بزرگ گذرے ہیں شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب سہارنپور تشریف لے گئے اور اتفاق سے گھر پر کچھ خرچ وغیرہ کا انتظام کر کے نہیں گئے تھے جب وہاں پہنچے تو ان کے خادم جنکا نام بھیک تھا انھوں نے رات کو سونے کے وقت جب شاہ صاحب کو چارپائی پر لٹا دیا اور وہ سو گئے تو صاحب خانہ سے جاکر چپکے سے کہا کہ حضرت یہاں تشریف لائے ہیں اور گھر پر بچے فاقے سے ہوں گے وہاں کوئی انتظام نہیں ہے۔ چونکہ سہارنپور سے انبیٹھہ کی مسافت بارہ کوس کی تھی اسلئے لوگوں نے کہا پھر کیا صورت کی جائے کہ حضرت کے گھر کھانا پہنچایا جاسکے تو شاہ بھیک نے کہا کہ میں لیجا کر پہنچا آؤنگا۔ چنانچہ ان لوگوں نے فوراً کھانا ان کے حوالے کیا جب رات کو حضرت شاہ صاحب سو گئے تو شاہ بھیک کھانا لیکر دوڑتے دوڑتے انبیٹھہ پہنچے اور دروازہ کھلا کر وہاں کھانا دیا اور فوراً سہارنپور کیلئے واپس ہو گئے۔ رات میں تہجد کے وقت سہارنپور پہنچ کر حضرت شاہ صاحب کو وضو کرایا۔ غالباً بیس روز تک وہاں قیام رہا اور شاہ بھیک روزانہ رات میں اسی طرح کھانا لیکر انبیٹھہ جاتے اور تہجد کے وقت تک واپس آکر حضرت کو وضو کراتے تھے۔ پھر جب حضرت شاہ ابوالمعالی رح مکان واپس تشریف لائے تو بچوں سے فرمانے لگے کہ میں تو وہاں خوب عمدہ عمدہ کھانے کھاتا تھا خدا معلوم تم لوگوں پر کیا گذری۔ ان لوگوں نے کہا کہ نہیں ہم لوگوں کو بھی بھیک بھائی روزانہ رات کو اچھے اچھے کھانے لاکر پہنچا جایا کرتے تھے اور ہم لوگ خوب آسودہ ہو کر کھاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس سے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کو کس قدر مسرت ہوئی ہوگی اور ان مخلص

مرید کی کیسی کچھ قدر آپ کے قلب میں ہوئی ہوگی۔

اب انھیں شیخ و مرید کا ایک دوسرا واقعہ سنئے اس کے بعد بطور نتیجہ کے کچھ بیان کرونگا۔

قصہ یہ ہے کہ :۔

ایک مرتبہ حضرت ابوالمعالی رح کسی بات پر ناراض ہوئے اور شاہ بھیک کو اپنے پاس سے ہٹا دیا وہ باہر ادھر ادھر جنگلوں میں رہا کرتے تھے۔ جب بارش کا زمانہ ہوا تو مکان کی چھت ٹپکنے لگی تو حضرت کی اہلیہ نے کہا کہ ایک ہی تو آدمی تھا جو اس قسم کا کام کر دیا کرتا تھا۔ اس کو بھی آپ نے نکال دیا۔ اب چھت ٹپک رہی ہے اسکو کون بنائے اور یہ جو مولوی مولانا ہیں یہ لوگ ہمارے کام کے نہیں ہیں، حضرت نے فرمایا کہ میں نے نہ نکالا ہے تم نے تو نکالا نہیں اس سے انھوں نے اشارہ پایا کہ میں بلا سکتی ہوں۔ پس انھوں نے بلا کر ان سے کہا کہ چھت ٹپک رہی ہے اسکو بنا دو۔ چنانچہ وہ جنگل سے لکڑی لائے مٹی وغیرہ جمع کیا چھت پر چڑھ گئے اور اسکی مرمت کرنے لگے۔ جب کھانے کا وقت ہوا اور حضرت شاہ صاحب کھانے بیٹھے تو دریافت کیا کہ چھت کوٹنے کی آواز آرہی ہے اوپر کون ہے تو اہلیہ نے بتایا کہ شاہ بھیک ہیں بس حضرت کو جوش آگیا اور ہاتھ میں جو لقمہ اٹھائے ہوئے تھے اسی کو لیکر صحن میں تشریف لائے اور فرمایا کہ لو لو۔ بس یہ سنتے ہی بغیر زینے کے وہ چھت سے کود پڑے اور شاہ صاحب نے اس لقمہ کو ان کو کھلا دیا۔ اس کا کھانا تھا کہ ان کے قلب کی کیفیت بدل گئی اور وہ انوار سے بھر گیا اور ان کو نسبت حاصل ہوگئی۔ شیخ کو جو کچھ دینا تھا اسی ایک لقمہ میں دے دیا۔ اس وقت شاہ بھیک نے ہندی کے دو بیت پڑھے ؎

مائی پر واریاں پل میں سو سو بار
کاگا سے ہنس کیا اور کرت نہ لاگی بار

شاہ بھیک کے اس دوسرے واقعہ کو اکثر حضرات نقل فرماتے ہیں اور اس بات پر نہایت شد و مد سے زور دیتے ہیں کہ حضرت شاہ ابوالمعالی رح نے صرف ایک لقمہ میں پہنچا دیا، مگر ان کے پہلے کے واقعات کی طرف توجہ نہیں ہوتی کہ انھوں نے اس سے پہلے کتنے مجاہدات کئے ہوں گے اور کیسا کچھ خلوص و تعلق مع الشیخ کا ثبوت دیا ہوگا۔ مثال کے طور پر یہی ایک واقعہ جو نقل کیا گیا ہے ملاحظہ فرمایئے کہ سہارنپور سے انبیٹھہ تک رات ہی رات جاتے اور واپس آکر حسب معمول وظیفہ

خدمت انجام دیتے تھے لیکن اپنی اس دوڑ دھوپ کا اظہار کبھی بھی شیخ سے نہ کیا اور نہ اولاد ہی سے اشارۃً کنایۃً کہا کہ اس کو شاہ صاحب پر ظاہر کریں مگر اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کے قلب میں یہ بات ڈال دی کہ بطور افسوس و حسرت اس قسم کے کلمات اپنی اولاد سے کہیں جس سے یہ حقیقت ظاہر ہو جائے اور جو امر صیغۂ راز میں ہے وہ فاش ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ورنہ شاہ بھیک کے تو گوشۂ خیال میں بھی ہرگز نہ رہا ہوگا کہ ایسی صورت اس بات کے ظہور کی نمودار ہوگی۔ انھوں نے تو خلوص سے محض شیخ اور شیخ کی اولاد سے محبت میں اس قدر جانفشانی و مشقت برداشت کی تھی جس کا ثمرہ یہ ہوا کہ شیخ پر بھی ظاہر ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس قصہ کو طشت از بام کر دیا تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ مخلصین ایسے ہوتے ہیں جو اپنے پیر و مرشد اور ان کی اولاد سے ایسا تعلق رکھتے ہیں۔ اور تاکہ ان کے اس قصہ کو ہمیشہ ہمیش بطور مثال کے بیان کیا جائے۔ اور ان کے صدق و خلوص کا چرچا برابر ہوتا رہے۔

اب سنئے! کہ ان کے یہ سب مجاہدات جو انھوں نے اپنے خلوص سے اختیار کئے تھے وہ سب سلوک تھے اور شیخ کا ایک لقمہ کھلا کر ان کو اللہ تعالیٰ تک پہنچا دینا یہ جذب تھا۔ اسی کو میں نے کہا تھا کہ ہر جذب سے پہلے سلوک لازم ہے۔ عادت اللہ یونہی جاری ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی ارشاد فرمایا کہ:- وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ میرے راستہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم ضرور بالضرور ان کو اپنے راستوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مجاہدہ کو بندوں کی طرف منسوب فرمایا ہے اور ہدایت کو اپنی طرف سے اس مجاہدہ پر مرتب فرمایا ہے۔

پس اس سے معلوم ہوا کہ مجاہدہ شرط ہے اور ہدایت اس کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ اس لئے کہ مجاہدہ کو مقدم فرمایا ہے اور ہدایت کو اس پر مرتب فرمایا ہے۔ ان دونوں میں سے مجاہدہ تو بندوں کی طرف سے ہوتا ہے جس کو سلوک کہتے ہیں اور ہدایت اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر مرتب ہوتی ہے اسی کو صوفیائے کرام جذب سے تعبیر فرماتے ہیں اور ان حضرات کی کتب میں اس جذب و سلوک کی بھی مستقل بحث موجود ہے۔ چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ارشاد الطالبین میں جذب کے اقسام اور اس کے اسباب کو مفصل بیان فرمایا ہے۔ ہم اس کو نقل کر کے اس پر کچھ کلام کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا غور سے سنئے۔

قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ جاننا چاہئے کہ قرب الٰہی کا سبب جذب یعنی خدائے تعالیٰ کا اپنے بندوں کو اپنی طرف کھینچنا ہے۔ یہ جذب کبھی بلا واسطے کے ہوتا ہے۔ اسکو اجتباء کہتے ہیں۔

اور اکثر کسی امر کے توسط سے ہوتا ہے۔ اور وہ متوسط بحکم استقراء دو چیزیں ہو سکتی ہیں۔ ایک عبادت دوسرے انسان کامل کی صحبت۔ اس لئے جذب الٰہی جو عبادت کے توسط سے ہو اسکو عبادت کا ثمرہ کہتے ہیں۔ اور جو صحبت کے توسط سے ہو اسکو تاثیر شیخ کہتے ہیں۔

پھر اس بحث کے اخیر میں فائدہ کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ جب یہ مذکور ہو چکا کہ قرب کی ترقی تین چیزوں سے ہوتی ہے۔

(۱) برکات عبادات (۲) تاثیر شیخ (۳) جذب مطلق

پس جاننا چاہیئے کہ عبادات کی برکت سے قوت و وسعت و اقربیت حاصل ہوتی ہے لیکن ایک ہی مقام میں۔ اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک یعنی ولایت صغریٰ سے ولایت کبریٰ تک پھر ولایت علیا تک اور اس سے کمالات نبوت تک ترقی نہیں ہو سکتی۔ اور تاثیر صحبت سے ایک مقام سے دوسرے مقام میں مقام شیخ تک ترقی ہو سکتی ہے۔ اور جذب مطلق سے مقام بہ مقام برابر ترقیات حاصل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جہاں تک خدا کو منظور ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قاضی صاحب کا کلام آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرب الٰہی جس کو وصول بھی کہتے ہیں اس کا سبب اصلی جذب ہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو اپنی طرف بلا واسطہ یا با واسطہ کھینچ لینا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جذب الٰہی کا واسطہ جو چیز بنتی ہے وہ یا تو عبادت ہے یا تاثیر شیخ ہے یعنی عبادت کے ذریعہ اور اسی طرح تاثیر صحبت شیخ کی برکت سے قرب الٰہی حاصل بھی ہوتا ہے اور اس میں ترقی بھی ہوتی ہے۔ لیکن ان دونوں کا قرب ایک خاص مقام ہی تک مقصور ہوتا ہے اسلئے کہ ہر عبادت کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک خاص مقام ہے وہ عبادت بندے کو اس خاص مقام تک پہنچا دیتی ہے۔ اس سے آگے وہ ترقی نہیں کرتا۔ اسی طرح تاثیر شیخ سے جو قرب ہوتا ہے وہ بھی ایک خاص مقام ہی تک ہوتا ہے اور اس کی بھی ایک حد ہے لیکن جذب مطلق سے جو قرب ہوتا ہے اسکے لئے کوئی انتہا نہیں ہے بلکہ اس سے مقام بمقام ترقیات حاصل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور جہاں تک خدا کو منظور ہوتا ہے اسکو قرب عطا فرما دیتے ہیں۔ حاصل یہ کہ سب سے بڑا ذریعہ قرب خداوندی کا جذب خداوندی ہوا۔ مگر اس جذب کے مرتب ہونے کے لئے بھی سلوک یعنی اسباب قرب کو اختیار کرنا ضروری و لازم ہے۔

آیت وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا اس کی شاہد ہے جیسا کہ میں ابھی آپ حضرات سے اس کے متعلق بیان کر چکا ہوں جس کا حاصل یہ ہے کہ مجاہدہ ہی پر ہدایت مرتب ہوتی ہے جب آپ مجاہدہ کرینگے اور اعمال قرب اختیار کرینگے تب ہی اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہوگی۔ پس [illegible] ہمارا کام ہے اور قرب و وصول عطا فرما دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اس لئے

اسی پر جذب الٰہی مرتب ہوگا جس کا ذکر اس وقت کر رہا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اپنے تک پہونچانے کے لئے جو کمند لٹکائی ہے وہ یہی قرآن پاک ہے جسکو حبل اللہ (اللہ کی رسی) خود حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا یعنی تم سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے پکڑنے میں یہ بھی داخل ہے اور اعتصام بحبل اللہ کا ایک درجہ یہ بھی ہے کہ اس کی تلاوت حضور و مراقبہ کے ساتھ کیجائے۔ حضور یہ کہ تلاوت کے وقت قرآن کی عظمت کا استحضار کیا جائے کہ یہ میرے رب کا کلام ہے۔ اور مراقبہ یہ کہ قلب میں حاضر کیا جائے کہ ہم حق تعالیٰ کے سامنے ان کا کلام ان کو سنا رہے ہیں۔ اور وہ ہماری تلاوت سن رہے ہیں۔ اگر اس طریقہ سے تلاوت کیجائے گی تو انشاء اللہ ضرور قرب کی موجب ہوگی۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اسی لئے نازل ہی فرمایا ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کی معرفت اور قرب و وصول کا ذریعہ بنایا جائے اور اس کمند کے واسطے سے خدا تک پہونچا جائے۔ یہ خدا کی مضبوط رسی ہے اس کا ایک سرا تو خود حق تعالیٰ کے دست مبارک میں ہے اور دوسرا بندوں کے ہاتھ میں جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ اَبْشِرُوْا فَاِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ طَرَفُہٗ بِیَدِ اللّٰہِ وَطَرَفُہٗ بِاَیْدِیْکُمْ لَنْ تَھْلِکُوْا اَوْ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ۔ طبرانی (منتخب کنز العمال ص۶)

یعنی خوش ہو جاؤ کہ اس قرآن کا ایک سرا تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھوں میں ہے پس اسکو مضبوط پکڑ لو تو پھر تم اس کے بعد کبھی ہلاک نہ ہوگے یا یہ فرمایا کہ ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ سبحان اللہ! حق تعالیٰ کو اپنے بندوں کے ساتھ کس قدر شفقت اور ان کے حال پر کیسی عنایت ہے کہ محض اپنے فضل و کرم سے اتنا بڑا شرف بخشا کہ خود اپنا کلام ان پر اس لئے نازل فرمایا کہ اس کے واسطے سے اپنے دربار عظیم تک بلاویں اور ان کو حضوری کا شرف بخشیں اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے قرب کو کس قدر آسان فرما دیا۔ اب اگر ہم اسکو بھی اختیار نہ کریں اور اس سے اعراض و لاپرواہی برتیں بلکہ اس میں قرب کا اعتقاد ہی نہ کریں تو بڑے ہی افسوس کی بات ہے۔ اس سے بڑھ کر وبال و محرومی کی چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔

چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج کل سب سے زیادہ بے اعتنائی اسی کی طرف سے ہو رہی ہے اور اسکے ساتھ شغف اور اس کے بارہ میں قرب کا اعتقاد تو کجا لوگوں کے حال سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تلاوت قرآن کو قرب کا ذریعہ ہی نہیں جانتے اور اس کا قرب میں کوئی دخل نہیں سمجھتے اس لئے کہ اس کے ساتھ کوئی برتاؤ بھی عقیدت و محبت کا نہیں کرتے۔ حالانکہ کلام اللہ کی تلاوت ہی کیا۔ اس کا دیکھنا، اس کا چومنا، اس سے برکت حاصل کرنا، اس کے وسیلہ سے دعا مانگنا، ان سب کو قرب الٰہی میں دخل ہے اور

اسباب قرب کو معلوم کرنا اور ان کو اختیار کرنا ضروری ہوا۔ نیز یہ بھی معلوم کرنا لازم ہے کہ کونسی چیزیں قرب میں زیادہ دخل رکھتی ہیں اور اس کے اختیار کرنے سے عنایت خداوندی جلد متوجہ ہوتی ہے تاکہ بآسانی قرب خداوندی کی دولت حاصل کیجا سکے۔ چنانچہ ان کی نشاندھی بھی ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے خاص بندے کرتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والے اعمال کو تبلاتے رہتے ہیں۔

اس کے متعلق بھی آپ کو کچھ سمجھانا چاہتا ہوں سنئے:۔

یوں تو قرب خداوندی کے اسباب اور اللہ تعالیٰ تک پہونچنے کے راستے بیشمار ہیں جیسا کہ حضرات اہل اللہ فرماتے ہیں کہ طُرُقُ الْوُصُوْلِ اِلَی اللّٰہِ بِعَدَدِ اَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ تک پہونچنے کے راستے اسقدر ہیں جتنی تمام مخلوقات کی سانس۔ مطلب یہ کہ ان طرق کا احصا نہیں کیا جا سکتا اور وہ شمار میں نہیں آسکتے تاہم اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وصول الی اللہ کے راستے بیشمار ہیں۔ کوئی کسی راستے سے خدا تک پہونچتا ہے۔ اور کوئی کسی راستہ سے۔ البتہ ان میں بعض راستے دشوار ہیں اور بہت سے سہل و آسان بھی ہیں۔ اب جو کاملین وقت ہوتے ہیں وہ قرب خداوندی کے سہل سے سہل تر طریقوں کو تبلاتے اور تعلیم فرماتے ہیں تاکہ ہر خاص وعام قرب و وصول کی دولت سے بآسانی مشرف ہو سکے اور حضرات اہل اللہ کی تو وضع ہی اسلئے ہوئی ہے کہ وہ کسی طرح مخلوق کو خالق سے ملا دیں اور خدا کے بندوں کو ان تک پہونچا دیں اور ان سے قریب کرنے والے راستوں کی طرف رہنمائی فرمائیں۔ اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت بھی اسی غرض کے لئے ہوتی ہے اس لئے انکی نیابت کا بھی یہی حق ہے جس کو ان کے سچے نائبین و وارثین ہر زمانہ میں اپنی اپنی استعداد کے بقدر ادا فرماتے رہتے ہیں اور اپنی اپنی فہم و بصیرت کے مطابق اس خدمت کو انجام دیتے ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ اپنے قرب و وصول کے نئے نئے ابواب مفتوح فرماتے ہیں جنکی وجہ سے وہ اس کام کو بآسانی انجام دیتے رہتے ہیں اس سلسلہ میں اولیاء امت اور علماء کرام نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کو انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے سامنے پیش کروں گا اور آپ کے شہر میں آگیا ہوں تو انشاء اللہ تعالیٰ ضرور کچھ آپ کی خدمت کر ہی کے جاؤں گا۔ ابھی اس وقت ایک خاص چیز کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ وصول الی اللہ کا سب سے بڑا ذریعہ کلام اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے بہت سے بندوں نے اسکی تلاوت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا ہے۔ یہ قرب بہت بڑی چیز ہے اس کے لئے لوگوں نے جان تک کی بازی لگا دی ہے اور اس دار دنیا میں اس کا حاصل کرنا مطلوب ہے اور اللہ و رسول کی عین مرضی ہے۔ اس لئے آپ سے کہتا ہوں کہ آپ بھی اس کی فکر کیجئے اور تلاوت کلام اللہ کو قرب کا ذریعہ بنائیے جب تلاوت کا التزام کریں گے اور کلام الٰہی کا تکرار صدق دل سے اور حسن نیت سے کرتے رہیں گے تو انشاء اللہ

ان میں سے ایک ایک چیز عبادت ہے اور حق تعالیٰ کی رحمت و عنایت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن آج مسلمانوں کا عام طور پر یہ حال ہے کہ ان سب سے بالکل مستغنی ہیں یعنی کلام اللہ کی تلاوت سے بھی استغناء ہے اسکے معنی سمجھنے سے بھی استغناء اور اس کے واسطے سے دعا کرنے اور حاجات مانگنے سے بھی استغناء اسی طرح اسے چومنے اور آنکھوں سے لگانے سے بھی استغناء ہے۔ پھر آپ خود فیصلہ کیجئے کہ جب یہ حال ہو جائے کہ جو چیز قرب ہی کیلئے موضوع ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسی لئے اسے نازل فرمایا ہو لوگ اس سے بالکل مستغنی ہو جائیں تو پھر حق تعالیٰ کی عنایت کیسے متوجہ ہوگی ؎

چوں ترک قرآں کردۂ آخر مسلمانی کجا　　　خود شمع ایماں کشتۂ پس نور ایمانی کجا

یعنی جب تم نے قرآن کو بالکل چھوڑ ہی دیا تو پھر تم مسلمان کہاں رہ گئے اور جب ایمان کی شمع کو تم نے خود ہی بجھا دیا تو پھر نور ایمانی کہاں سے آئے گا۔

اور اس سے کہیں زیادہ تعجب تو ان لوگوں سے ہے جو حافظ اور قاری بھی ہیں۔ اسی کی وجہ سے امامت بھی کرتے ہیں اس کے باوجود تلاوت کی برکات سے محروم ہیں اور قرآن کے ساتھ ان کی عقیدت درست نہیں ہے ان کے اس حال پر مجھے بے ساختہ یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

کعبے بھی گئے پر نہ گیا عشق بتوں کا　　　زمزم بھی پیا پر نہ بجھی آگ جگر کی

مطلب یہ کہ جس طرح کعبہ شریف جانے کے باوجود بتوں کا عشق باقی رہ جائے اور غیر اللہ سے قلب خالی نہ ہو جائے اسی طرح قرآن پاک پانے کے باوجود بھی اگر کوئی شخص اسکو قرب کا ذریعہ نہ بنائے نیز اس کے واسطے سے عقائد واخلاق کی پاکی اور خیالات کی پاکی اور نفس کی رذائل ملکات سے پاکی حاصل نہ کرے اور تلاوت قرآن نہ کرے اور اس کی حلاوت نہ چکھے تو اس پر بھی میں یہ شعر پڑھتا ہوں کہ ؎

کعبہ بھی گئے پر نہ گیا عشق بتوں کا　　　زمزم بھی پیا پر نہ بجھی آگ جگر کی

بزرگان دین نے سب سے زیادہ قرب کا ذریعہ قرآن ہی کو سمجھا ہے اور سب سے زیادہ اعتقاد اسی کیساتھ رکھا ہے اور سب سے بڑھ کر فلاح دارین کا موجب اسی کو جانا ہے اسی بنا پر سب سے زیادہ شغف اہل اللہ نے تلاوت قرآن ہی کیساتھ رکھا ہے چنانچہ اسکی وجہ سے انکو آخرت میں جو درجات عالیہ میسر ہوں گے وہ تو ہیں ہی اس دنیا میں بھی اسکی برکت سے ان کو حیات طیبہ نصیب ہوئی اور عنایت خداوندی انکے شامل حال رہی۔ اگر آپ بھی اللہ تعالیٰ کی عنایت و رحمت خاصہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں تو کلام اللہ کیساتھ اپنا اعتقاد درست کر کے اور اسکو قرب و وصول کا ذریعہ یقین کر کے اسکی تلاوت کیجئے انشاء اللہ چند ہی روز میں آپ اپنے کو وجداناً اللہ تعالیٰ سے قریب پادیں گے اور اپنے قلب کی کیفیت بدلی ہوئی محسوس کرینگے۔ ابھی تلاوت سے متعلق مفصل کلام کروں گا۔ مجلس کا وقت ختم ہوگیا اسلئے آج اتنے ہی پر بس کرتا ہوں۔

تیسرا وعظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّا بَعْد۔ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ مَا فَعَلُوْہُ فَذَرْھُمْ وَمَا یَفْتَرُوْنَ ○

اس مضمون کو میں کئی روز سے بیان کر رہا ہوں یہ بڑا اہم مضمون ہے۔ یہ مظہریت کا مسئلہ ہے اور ہدایت وضلالت کی بحث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس کو قرآن شریف میں بیان فرمایا ہے اور جگہ جگہ اس مضمون کو لائے ہیں چنانچہ ایک دوسری آیت میں ارشاد فرماتے ہیں، مَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَھُوَ الْمُھْتَدِ ۚ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ وَلِیًّا مُّرْشِدًا ○ یعنی جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پا سکتا ہے اور جسکو وہ بے راہ کر دیں تو آپ اسکے لئے کوئی مددگار راہ بتلانے والا نہ پا دیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت اور ضلالت اضلال اور ارشاد کا ایک مستقل مضمون ہے جسکو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں بیان فرمادیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اس کی تعلیم فرمائی ہے تو دوسرے لوگوں کیلئے بھی یہی راہ متعین ہے خواہ وہ خواص ہوں یا عوام سب کو وہی راستہ اختیار کرنا ہوگا جسکو قرآن نے بیان کیا ہے اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا ہے پس آپ کے متبعین کو اس سے سرمو تجاوز کرنا روا نہیں ہے۔ پس جس طرح قرآن شریف کے دیگر مضامین کو لیتے ہیں اس اضلال وارشاد کے مضمون کی طرف بھی توجہ ضروری ہے۔ اور بزرگان دین اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

چنانچہ آیت میں جو مضمون آیا ہے اسی کو شیخ سعدیؒ فرمارہے ہیں کہ آپ کے ہاتھ کے اوپر کوئی ہاتھ نہیں ہے اور جسکو آپ ہدایت کردیں اسی کو ہدایت ہے اور جسکی ہدایت نہ کریں وہ ہدایت یاب نہیں ہوسکتا۔

فرماتے ہیں ؎

از تو بجہ نالم کہ دگر داور نیست وز دست تو ہیچ دست بالا تر نیست

یعنی سوائے تیرے اور کس سے نالہ کروں اسلئے کہ کوئی دوسرا حاکم نہیں ہے اور کوئی ہاتھ تیرے ہاتھ سے بالا تر نہیں۔

آں را کہ تو رہی کسے گم نہ کند وآں را کہ تو گم کنی کسے رہبر نیست

یعنی جس کو آپ ہدایت عطا فرمائیں کوئی دوسرا اس کو گمراہ نہیں کر سکتا اور جسکو آپ ہی بے راہ کر دیں اسکو کوئی راستہ پر نہیں لا سکتا

نیز مولانا روم ؒ اسی کے ساتھ مترنم ہیں ؎

اے خدائے رازدان و خوش سخن عیب کار بد ز ما پنہاں مکن

یعنی اے راز جاننے والے اور اچھے کلام والے خدا بُرے کام کا عیب ہم سے پوشیدہ مت کیجئے

دیکھئے یہ ایسا مضمون ہے کہ اس کی طرف تمام عارفین متوجہ ہیں۔ شیخ سعدی ؒ نے بھی یہی فرمایا اور مولانا روم بھی اسی کو فرما رہے ہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت فرما کر یہ کہتے ہیں کہ جو بُرے کام ہیں ان کا عیب ہم سے پوشیدہ نہ فرمائیے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ جو بُرا کام ہے اسکو ہم اچھا سمجھنے لگیں۔ ایک طرف تو یہ فرمایا اور دوسری طرف یہ فرما رہے ہیں کہ ؎

عیب کار نیک را منما بما تا نہ گردیم از روش سر در ہوا

یعنی نیک کام کے عیب کو مجھے نہ دکھلائیے تاکہ کہیں ہم اپنے اس رویّہ سے پریشان اور سرگرداں نہ ہو جائیں۔

سبحان اللہ! انتہائی قرب میں مولانا روم یہ دعا فرما رہے ہیں اور اصل میں یہ توحید کی طرف راجع ہے اسکو یہ حضرات اگر نہیں سمجھیں گے تو دوسرا اور کون سمجھے گا۔ یہ دعا اسلئے فرما رہے ہیں کہ نیک کام اگر بُرا معلوم ہونے لگے گا تو نیک آدمی بھی بُرا معلوم ہونے لگے گا کیونکہ نیکی تو نیک آدمی ہی سے ہوتی ہے اور جب کسی کام کا عیب پوشیدہ ہو جائے گا تو بُرا کام اچھا معلوم ہونے لگے گا۔ اسی طرح جتنے بُرے لوگ ہیں سب اچھے معلوم ہونگے اور اچھے لوگ بُرے دکھائی دینگے۔ ظاہر ہے کہ یہ کھلی ہوئی گمراہی ہے۔

چنانچہ ہم نے دیکھا ہے کہ ایسے حضرات جن سے لوگوں کو عرفان و محبت حاصل ہوتی تھی اور وہ خود اعلیٰ درجہ کے عارف اور اعلیٰ درجہ کے محبّ اور عاشق صادق تھے انھیں کو دنیا بری نظر سے دیکھتی ہے۔ اور جو لوگ ظاہری نماز و روزہ کے بھی پابند نہیں۔ وہ ان کی شان میں بُرے بُرے الفاظ کہتے ہیں آج کی دنیا میں ہم یہی دیکھ رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہی گمراہی کا پھاٹک ہے اور کام یہیں سے بگڑا ہے کہ لوگوں کی مت بدل گئی ہے۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک شان ہے کہ آپ پر کوئی دوسری تجلی (اسم مضل کی) فرمادیں اور آپ اس تجلی میں آکر کچھ غلط سلط کام کرنے لگیں۔

یہ مضمون ذرا دقیق ہے لیکن بہت عمدہ مضمون ہے اور مولانا روم اسکو جگہ جگہ لاتے ہیں جس

کو تو اس کے بیان میں بہت لطف آرہا ہے شاید آپ کو لطف نہ آتا ہو اور آپ اپنے دل میں یہ کہتے ہوں کہ ہم تو دوسری چیز کے عاشق ہیں اسلئے کہ ان چیزوں سے مناسبت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ دیکھئے مولانا روم رح کیا فرما رہے ہیں ؎

اے خدا ایں بندہ را رسوا مکن گر بدم من سرّ من پیدا مکن

اے اللہ اس بندہ کو رسوا نہ کیجئے اور میں اگرچہ برا ہوں آپ میرے باطن کو ظاہر نہ فرمایئے

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

نالہ کردم کاے تو علام الغیوب زیر سنگ مکر بد ما را مکوب

یعنی اے علام الغیوب ہم آپ ہی سے فریاد وزاری کرتے ہیں کہ مکر بد کے پتھر کے نیچے ہم کو مت کچلئے (یعنی ہم کو بری تدبیروں کے پتھر سے نہ ماریئے)

یا کریم العفو ستار العیوب انتقام از ما مکش اندر ذنوب

یعنی اے مہربانی سے معاف کرنے والے عیب چھپانے والے ہم سے گناہوں کے اندر انتقام نہ لیجئے۔

اللہ تعالیٰ کا انتقام کبھی کبھی اس طرح سے ہوتا ہے کہ گناہوں کے اندر مبتلا فرما دیتے ہیں۔ اسلئے کہ تمام عالم اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا مظہر ہے اور سب پر کوئی نہ کوئی تجلی ہو رہی ہے اسی وجہ سے کوئی کچھ کہہ رہا ہے، کوئی کچھ کر رہا ہے۔ حضرات اہل اللہ نے جب یہ دیکھا تو انھوں نے اپنے لئے یہی اختیار کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ سے فریاد وزاری کریں۔ کیونکہ جب ہم یہ کرینگے تو ہمارے معتقدین اسی راہ پر چلیں گے۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے دربار میں تضرع اور فریاد وزاری کا ایک سلسلہ جاری رہے گا جو اللہ تعالیٰ کو نہایت محبوب و پسندیدہ ہے۔

چنانچہ مولانا روم رح نے یہ مضمون بیان کر کے نہ جانے کتنے لوگوں کو جگا دیا اور بہتوں کے ہاتھ خدا کی طرف اٹھ گئے۔

آگے فرماتے ہیں ؎

آنچہ در کون است زاشیاء آنچہ ہست وانما جاں را بہر حالت کہ ہست

یعنی دنیا میں جو کچھ اور جتنی چیزیں ہیں میری روح کو اسی طرح دکھایئے جیسی وہ در اصل ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے کہ:۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهٗ وَالْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ۔ یعنی یا اللہ ہمکو حق کو حق دکھایئے اور اس کے اتباع کی توفیق عطا فرمایئے اور باطل کو باطل دکھایئے اور اس سے اجتناب کی توفیق عطا فرمایئے۔

مولانا روم رح اسی حدیث کا ترجمہ اوپر کے شعر میں فرما رہے ہیں۔ یہ حضور کا ارشاد ہے اور آپ

کے اولیاء یہ دعا کرتے ہیں۔ اور آپ کا یہ حال ہے کہ نہ تو آپ کو دعا یاد ہے اور نہ کچھ معرفت ہی ہے اور نہ اس کے لئے آپ کو فرصت ہی ہے تو پھر آپ راستہ پر ہیں کیسے؟ اور جب راستہ پر نہیں ہیں تو ہو سکتا ہے کہ بُری چیز اچھی معلوم ہو۔ اور اچھی چیز بری معلوم ہو۔ اسی طرح بُرا آدمی اچھا معلوم ہو اور اچھے آدمی کو بُرا سمجھتے ہوں۔ آج کل لوگوں کا یہی حال ہے۔

چنانچہ ایک ولی کامل سفر حج میں جارہے تھے۔ بادبانی جہاز میں سوار تھے۔ اتفاقاً ہوا مخالف ہو گئی اور جہاز اِدھر اُدھر چکر کھانے لگا۔ حج کا زمانہ قریب آگیا۔ کھانے پینے کا سامان ختم ہونے لگا اور لوگوں کی تشویش بڑھنے لگی تو آپس میں ایک دوسرے سے انھیں بزرگ کے متعلق کہنا شروع کیا کہ ہم لوگ جو اس مصیبت میں گرفتار ہوئے ہیں یہ اسی آدمی کی نحوست ہے۔ جو لوگ ان بزرگ کو جانتے تھے انھوں نے کہا کہ یہ کیا واہیات خیال کر رہے ہو یہ بہت بڑے شخص اور اولیاء کاملین میں سے ہیں تم لوگوں کو ان سے بدگمانی ہے اسی کی نحوست کی وجہ سے طوفان میں گرفتار ہوئے ہو۔ جلدی اس سے توبہ کرو اور ان سے معافی مانگو اور دعا کی درخواست کرو۔ لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ حضرت دعا فرما دیجئے ان میں ذرا ظرافت تھی فرمایا کہ ہماری دعا بغیر مٹھائی کے نہیں چپکتی۔ اس پر کسی امیر نے کچھ وعدہ کیا۔ آپ نے سب لوگوں کے ساتھ ملکر دعا کی اور ہوا موافق ہو گئی۔ جہاز کا لنگر کھولدیا گیا اور جتنے دنوں میں اچھی ہوا کی حالت میں جہاز جدہ پہونچتا تھا اس سے نصف دنوں میں پہونچگیا۔ اس سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ جہاز والوں کے پاس پانی بالکل ختم ہو گیا۔ سب لوگ نہایت پریشان ہوئے اور وہ سب لوگ آئے اور مولانا سے دعا کی درخواست کی مولانا نے فرمایا کہ تم سب دعا کرو میں بھی دعا کروں گا۔ مگر میری دعا تو مٹھائی کے بغیر چپکتی نہیں۔ اس پر ایک شخص نے وعدہ کیا کہ سب جہاز والوں کو مقطی حلوا کھلاوں گا۔ اس کی مقدار مجھے یاد نہیں رہی مگر اتنا یاد ہے کہ کئی کس پاؤ بھر سے زیادہ تھا۔ اس پر آپ نے دوسرے لوگوں کے ساتھ ملکر دعا کی جس کا اثر اسی وقت ظاہر ہوا اور چشمۂ شیریں پانی کا جو لمبائی چوڑائی میں دو بڑی چارپائیوں کے برابر ہوگا۔ دوڑتا ہوا آیا اور جہاز کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ مولانا نے اسکو دیکھ کر فرمایا کہ اس پانی کو تو دیکھو کیسا ہے لوگوں نے جو چکھا تو نہایت ٹھنڈا اور شیریں تھا۔ اس پر سب لوگوں نے اپنے اپنے برتن بھر لئے اور جہاز والوں نے بھی اپنے ظروف خوب بھر لئے۔ جب سب بھر چکے تو وہ پانی غائب ہو گیا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک نواب صاحب جو بہت دیندار تھے ان کے متعلق ایک دوسرے نواب نے اپنے مصاحبین سے کہا کہ چلو ان کو بنایا جائے۔ اپنے ذہن میں کچھ مضمون سوچکر آئے تھے۔ جیسے ہی آکر نواب صاحب کے پاس بیٹھے تو انھوں نے ان کے بارہ میں فرمایا کہ میرا ظاہر ایسا ہی اچھا ہے جیسا ان کا باطن اچھا ہے۔ اور میرا باطن ایسا ہی خراب ہے جیسا کہ ان کا ظاہر خراب ہے۔

یہ سنکر وہ سٹ پٹا گئے اسلئے کہ یہی مضمون وہ اپنے دل میں سوچکر آئے تھے اب کیا کہتے۔ تھوڑی دیر بیٹھے رہے پھر اٹھ کر چلدیئے۔

دیکھا آپ نے یہی حال ہوگیا ہے کہ لوگ نیک لوگوں کو برا کہیں اور ان کے متعلق بدگمانی رکھیں اور برے کو اچھا سمجھیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ایسے ہی لوگ آپ میں داخل ہوجائیں تو آپ کا کل کارخانہ ہی درہم برہم ہوجائے بلکہ ہو ہی گیا۔ یہی ایک قصہ نہیں ہے بلکہ اس قسم کے بہت سے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب میرے پاس آتے ہیں ان کو دین کا کچھ خیال ہوا تو انھوں نے داڑھی بھی رکھ لی پھر ان کا ایک دوست ان سے مذاق کرنے لگا اور ان کو شیطان کہنے لگا۔ انھوں نے اس سے کہا کہ پہلے ہم سنتے تھے کہ "ولی را ولی می شناسد"۔ یعنی ولی کو ولی ہی پہچانتا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ "شیطان را شیطان می شناسد"۔ یعنی شیطان کو شیطان پہچانتا ہے۔ مطلب یہ کہ آپ شیطان ہوں گے اسی وجہ سے مجھے پہچانتے ہیں۔ میں نے جب سنا تو کہا کہ خوب جواب دیا۔

اصل میں بات یہ ہے کہ آدمی کو جب بصیرت ہوتی ہے اور آئینہ صاف ہوتا ہے تو صاف نظر آتا ہے ورنہ پاس ہی میں انبیاء علیہم السلام موجود ہوتے ہیں اور آدمی ان کو عدم بصیرت کیوجہ سے نہیں پہچانتا ؎

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است

یعنی کسقدر تعجب کی بات ہے کہ حسن بصرہ رحؒ سے آکر اور بلالؓ حبشہ سے اور صہیبؓ روم سے آکر حلقہ بگوش اسلام ہوجائیں اور سرزمین مکہ ہی میں ابوجہل کافر و بے ایمان رہ جائے۔

آگے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

گر سگی کردیم اے شیر آفریں شیر را مگمار بر ما زیں کمیں

یعنی اے شیر کو پیدا کرنے والے اگر ہم نے کتوں کے سے کام کئے تو اس گھات رو چہ، سے ہم پر شیر کو مسلط نہ کردیجئے۔

آب خوش را صورت آتش مدہ اندر آتش صورت آبی مدہ

یعنی بہتر پانی کو آپ مجھے پانی ہی دکھائے۔ آگ بنا کر نہ دکھایئے اور آگ کو پانی کی شکل نہ دیجئے۔

از شراب قہر چوں مستی دہی نیستہا را صورت ہستی دہی

یعنی تو اپنے قہر و ناراضگی کی شراب سے اگر کسی کو مست کردے تو اس کی نظروں میں نیست یعنی بری اور غلط چیزیں ہست یعنی اچھی معلوم ہونے لگیں۔ اور آدمی اسوقت بداخلاقی کو اچھا سمجھنے لگے اور حسن خلق کو برا جانتے لگے۔

تو زدن یا ربنا آب طہور تا شود ایں نار عالم جملہ نور

یعنی اے ہمارے رب ذرا آب طہور کا ایک چھینٹا ڈال دیجئے تاکہ عالم کی یہ ساری آگ نور ہی نور بنجائے۔

مولانا روم اس مضمون میں مظہریت کے مسئلہ کو بیان فرما رہے ہیں اگر کسی کو ساری عمر میں تھوڑا سا حصہ بھی ملجائے تو بہت ہے۔ مگر یہ بہت مشکل سے ملتا ہے۔ جب اللہ تعالی دوسری تجلی فرمادیتے ہیں۔ یعنی اسم مضل کی تو آدمی بُرے بُرے کام کرنے لگتا ہے۔ ایک بزرگ تھے ان پر اللہ تعالی نے کوئی اسی قسم کی تجلی فرمادی تھی بہت دنوں تک اس میں رہے اس کے بعد پھر دوسری تجلی ہوئی تب ان کو حقیقت نظر آنے لگی اور کہا کہ ہائے میں کس حالت میں تھا اور پھر سنبھلے۔ ان تجلیات کو سمجھانے کے لئے ایک مثال بیان کرتا ہوں۔

ہم نے یہاں بھی اور الہ آباد میں بھی راستہ گذرتے ہوئے دیکھا کہ چوراہوں پر ایک سپاہی کھڑا رہتا ہے اور جس طرف وہ اشارہ کرتا ہے اسی طرف موٹر اور دوسری سواریاں جاتی ہیں۔ اسی سے سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالے کی جانب سے بھی اسی طرح اشارات ہوتے رہتے ہیں اور اللہ تعالی برابر تجلیات فرماتے رہتے ہیں۔ اب جو لوگ اسکو سمجھنے والے ہوتے ہیں وہ سمجھ لیتے ہیں۔

یہ تجلی سب پر ہوتی ہے۔ ہم پر بھی ہوتی ہے اور آپ پر بھی۔ اور اتنا تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں کہ اس وقت برا کام بہتر معلوم ہوتا ہے اور اچھا کام عیب سمجھا جاتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو سب لوگ صراط مستقیم ہی پر ہوجائیں اور آدمی کو اگر صراط مستقیم نظر آوے تو اس پر چلنے لگے۔ لیکن اس کے لئے جس طرح علم دین کی ضرورت ہے اور اس پر عمل لازم ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالی سے ایسی فریاد وزاری کرے اور ایسا گڑگڑائے کہ اس سے اللہ تعالی کو اس کے حال پر رحم آجائے۔

یہ مضمون میں نے اس لئے اختیار کیا ہے تاکہ آپ کو بتلاؤں کہ بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ آدمی معاصی کو اور بُرے کاموں کو اچھا سمجھنے لگتا ہے چنانچہ اللہ تعالی فرماتے ہیں اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا۔ یعنی کیا جس کے لئے اس کا بُرا عمل مزین کردیا گیا ہے۔ پس وہ اسکو اچھا سمجھتا ہے۔ دوسرا مضمون محذوف ہے یعنی اور وہ شخص جسکو اچھا عمل اچھا کردیا گیا ہے یعنی ایمان اور عمل صالح اس کی نظر میں اچھے معلوم ہوتے ہیں تو کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ یعنی ایک شخص تو ایسا ہے کہ واقعی جو چیز اچھی ہے اسکو اچھا سمجھ رہا ہے اور دوسرا شخص جو چیز بری ہے اسکو اچھا سمجھے یہ انتہائی ضلال ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جو چیز کھانے کی نہ ہو اسکو غذا سمجھے چنانچہ جو چیزیں نجاست میں پیدا ہوتی ہیں اور اسی میں رہتی ہیں وہ اسی کو غذا سمجھتی ہیں۔ اسی طرح سوء عمل حسن عمل معلوم ہو اور حسن عمل برا معلوم ہو یہ کھلی ہوئی گمراہی ہے۔

جب آدمی سے کوئی اچھا کام چھوٹتا ہے تو بس اتنا ہی نہیں ہوتا بلکہ ہوتے ہوتے اسکی اچھائی ذہن سے نکل جاتی ہے۔ اسی طرح کوئی برا کام کر رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھ رہا ہے کہ یہ کام

بُرا ہے تو یہ پھر بھی غنیمت ہے مگر یہ اتنے پر باقی نہیں رہتا بلکہ رفتہ رفتہ اس کام کی برائی ذہن سے جاتی رہتی ہے اور بُرے کام کو اچھا سمجھنے لگتا ہے ایسا شخص پورا گمراہ اور حق تعالیٰ کے ارشاد اَفَمَنْ زُیِّنَ لَہٗ سُوْٓءُ عَمَلِہٖ کا پورا مصداق ہے اور یہ خاصی تزئین اور شیطان کی رہزنی اور شیطانی کام ہے۔ امید کہ اب آپ لوگوں کی سمجھ میں یہ مضمون اچھی طرح آگیا ہوگا کہ اللہ کے نبی کے اور دین کے نیز صالحین کے دشمن یہ شیطان ہیں اور یہ بھی کہ اس میں ہمارے لئے حکمت ہی ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکتے ہیں اسلئے کہ اگر نفس و شیطان دشمن نہ ہوتے تو ہم اس طرح گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔ جب آدمی پریشان ہوتا ہے اور کوئی مقدمہ وغیرہ میں پھنس جاتا ہے تو پریشان ہو کر ہم لوگوں کے پاس دعا کرانے آتا ہے۔ اسی طرح صالحین جب شیطان کے مقابلہ سے عاجز ہوجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر مناجات کرتے ہیں کہ یا اللہ یہ آپ ہی کا ہے اگر آپ اس کی کوک ذرا سی اینٹھ دیں تو ہماری طرف نہ آئے اسی طرح دعا کرتے کرتے پھر ایسی قوت آجاتی ہے کہ شیطان پاس نہیں پھٹکتا۔ اسلئے کہ جب اللہ تعالیٰ مغلوب کردیتے ہیں تو اس کی ایک نہیں چلتی پھر سوچتا ہے کہ یہ تو مانتے نہیں چلیں اب دوسرے لوگوں کو بہکا دیں۔ اس طرح اس سے پناہ اور نجات مل جاتی ہے۔

یہ مضمون کل کے مضمون کے مناسب تھا۔ اب دوسرا مضمون شروع کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ۔ اس آیت کا ربط ماقبل سے یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اس طرح پر پیدا کیا کہ اس سے مقصد حق ہے یعنی اس سے باطل کا قصد نہیں فرمایا ہے بلکہ مقصود بالذات ان کے خلق سے خیر کا افاضہ ہے اور اپنی ذات اور صفات پر دلالت کرنا ہے۔ جیسا کہ آگے اس طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ یقیناً اس میں مومنین کیلئے نشانی ہے اسلئے کہ مومنین ہی اس سے منتفع ہوتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ۔ یعنی جو کتاب آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کیجئے۔ ان دونوں آیتوں کو ملا لیجئے تو ان کا ربط ظاہر ہوجاتا ہے۔ اس طور پر کہ آسمان اور زمین کو عبث نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ اس سے مقصود ذات و صفات پر دلالت کرنا اور لوگوں کو خیر پہونچانا ہے اور اس کا نفع مومنین کو پہونچتا ہے اور اسی کیلئے کتاب اللہ بھی نازل ہوئی اور اسکی تلاوت سے بھی یہی مقصود ہے۔ چنانچہ تلاوت کے امور بیان ہونے کی علت قاضی بیضاوی رحمہ یہ فرمارہے ہیں تَقَرُّبًا اِلَی اللّٰہِ تعالیٰ بقراءتہٖ وتحفظًا لالفاظہٖ واستکشافًا لمعانیہٖ یہ سب اُتْلُ کے مفعول لہٗ ہیں۔ تلاوت کا ایک سب سے بڑا فائدہ تقرب الی اللہ ہے یعنی قرآن کی قراءت اللہ تعالیٰ سے بندے کو قریب کرتی ہے اور دوسرے اس کے ذریعہ الفاظ کا

تحفظ۔ ہوتا ہے یہ بھی مقصود ہے جو لوگ تلاوت نہیں کرتے ان کو رمضان میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اور بہت مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ لوگ حافظ رمضانی کہلاتے ہیں۔ قرآن کے محافظت کی عجیب سے بصورت اختیار کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں یہ ڈال دیا کہ اپنے بچوں کو حفظ کرائیں چنانچہ ہمارے لڑکے حفظ کرتے ہیں اور دوسری کتب سماویہ کا یہ حال نہیں ہے کہ اس کا لفظ لفظ سب کو یاد ہو یہ قرآن ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کی حفاظت کا یہ خدائی انتظام ہے کہ بیشمار مکاتب اسی الفاظ کے تحفظ ہی کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔

میں نے ایک جگہ انگریزی دانوں سے کہا کہ آپ لوگوں کو اب بھی قرآن کا فیض سمجھ میں نہیں آیا؟ کیا یہ اس کی کرامت نہیں ہے کہ معلوم نہیں کتنوں کو رزق تقسیم کرتا ہے کتنے ایسے لوگ جو کہ عالم نہیں ہیں انکو اسی سے تنخواہ ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کو رزقاً للعباد بھی کر دیا ہے۔ مگر یہ کہ ابھی آپ کی سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر کس بات میں بھولے ہوئے ہیں؟ اور جو لوگ قرآن شریف پڑھتے ہیں ان کو کیوں کم سمجھتے ہو؟ میں کہتا ہوں کہ اگر اس کا ایک درجہ بھی حاصل کرلو گے یعنی الفاظ کا تحفظ تب بھی تم کو روزی مل جائیگی۔

بہرحال الفاظ کا تحفظ بھی مقاصد دین سے ہے اور اس کی طرف آپ کی توجہ بھی ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑا مقصد تقرب الی اللہ ہے جسکو آپ بھولے ہوئے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جتنا کان قاری قرآن کی طرف لگاتے ہیں کسی چیز کی طرف نہیں لگاتے یہی تقرب ہے اور قرب کی یہی صورت ہے۔

ایک بزرگ سمندر کے کنارے بیٹھ کر تلاوت کرتے تھے تو پانی ٹھہر جاتا تھا اور تمام طیور انکے گرد آکر بیٹھ جاتے تھے اور ان کی تلاوت کو سنتے رہتے تھے۔ یہ بھی تقرب ہے۔ نیز حضرت مولانا گنگوہیؒ کا واقعہ ہے کہ میرے سامنے ہی حضرت مولاناؒ وہاں تشریف لے گئے تھے تو صاحبزادے مولانا کو اندر لے گئے اور ایک جگہ لیجاکر دکھلایا کہ یہاں حضرت گنگوہیؒ بیٹھ کر تلاوت فرمایا کرتے تھے ایک چڑیا آکر ان کے پاس بیٹھ جاتی تھی اور جب تک تلاوت فرماتے رہتے وہ بیٹھی رہتی تھی۔

یہ تلاوت کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ یہ خدا کا کلام ہے۔ اس میں جذب ہے۔ اس میں مقناطیس سے بھی زیادہ کشش ہے۔ میں نے کسی مفسر کو اس آیت کے تحت ایسا کلام کرتے ہوئے نہیں دیکھا جیسا کہ اس بیچارے علامہ بیضاوی رحنے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے۔ میرے پاس کتابیں موجود ہیں ان سے آپ کو دکھلاؤں گا اور جب یہ بحث چھیڑی ہے تو پوری کرونگا۔ سنیئے تین دولتیں آپ کے پاس ہیں۔ ایک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ شریف میں۔ اور

دوسری خانۂ کعبہ مکہ شریف میں اور تیسری کلام اللہ ہر ایک کے پاس۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی ایسی تجلی ہوتی ہے جسکو عُرفاًا و کُملاً محسوس کرتے ہیں۔ یہ تجلی کیسی کچھ ہوگی۔

حضرت مولانا اس کو ایک مثال سے بیان فرماتے تھے۔حضرت کے وعظوں میں موجود ہے۔ وہ یہ کہ ایک دفعہ شاہ ایران کی زبان سے بے ساختہ ایک مصرع موزوں ہوگیا ؎

در ابلق کسے کم دیدہ موجود

اس پر بادشاہ نے دوسرا مصرع لگانا چاہا مگر نہ بن سکا تو اس نے دوسرے شعراء کو حکم دیا کہ اس پر مصرع لگاؤ سب حیرت میں رہ گئے۔ کیونکہ کوئی مضمون ہو تو اسکو پورا کیا جائے یہ کچھ مضمون ہی نہ تھا کہ چتکبرا موتی کسی نے کم دیکھا ہوگا۔ غرض شعراء ایران نے کہا کہ یہ مصرع بے تکا ہے۔ اس پر بے تکا مصرع لگ سکتا ہے۔ شاہ ایران کو یہ جواب ناگوار ہوا کہ ہمارے مصرع کی ان لوگوں نے بے قدری کی تو اس نے ہندوستان کے بادشاہ کو خط لکھا کہ وہاں کے شعراء سے اس پر دوسرا مصرع لگانے کی فرمائش کی جائے ایران کے شعراء اس سے عاجز ہوگئے ہیں۔ عالمگیر نے شعراء کو اس کی اطلاع کی۔ یہاں بھی سب کے سب حیران رہ گئے کہ اس بے تکے مضمون کو کون پورا کرے۔ عالمگیر کی لڑکی زیب النساء بھی شاعرہ تھی اسکو جو اس مصرع کی خبر پہنچی تو وہ بھی سوچ میں پڑ گئی کہ اس کو کس طرح پورا کیا جائے۔ اتفاقاً ایک دن صبح کو شہزادی سرمہ لگا رہی تھی وہ کسی قدر تیز لگا اور آنکھ سے ایک قطرہ آنسو ٹپکا جس میں سرمہ کی کچھ سیاہی بھی اور کچھ سفیدی۔ اور آنسو کو موتی سے تشبیہ دیا ہی کرتے ہیں تو فوراً اس کا ذہن شاہ ایران کے مصرع کی طرف گیا اور اس پر دوسرا مصرع لگا کر اس طرح شعر پورا کردیا ؎

در ابلق کسے کم دیدہ موجود مگر اشکِ بتانِ سرمہ آلود

یعنی کسی نے چتکبرا موتی کم دیکھا ہوگا بجز سرمہ آلود آنکھوں کے آنسو کے

شہزادی نے فوراً عالمگیر کو اطلاع کی عالمگیر بہت خوش ہوئے کہ جس مصرع کی تکمیل سے شعرائے ایران عاجز ہوگئے تھے خوشی کی بات ہے کہ شعرائے ہندوستان نے اس کو پورا کردیا اور ایسا پورا کیا کہ پہلا مصرع بھی جو بے معنی تھا بامعنی ہوگیا۔ عالمگیر نے شاہ ایران کو خط کے ذریعہ اس کی اطلاع دی وہ خوشی کے مارے اچھل پڑا کیونکہ اسے تو اپنے مصرع کے ناتمام رہ جانے سے رنج تھا خصوصاً جبکہ شعراء نے اسکو بے معنی قرار دیکر ٹھکرا دیا تھا۔ اب اس نے تمام شعراء ایران کو جمع کیا اور کہا کہ تم نے ہمارے مصرع کو بے معنی کہہ کر واپس کردیا تھا تو ہندوستان کے ایک شاعر نے اس کو پورا کردیا۔ پھر اس نے پورا شعر سنایا کہ ؎

در ابلق کسے کم دیدہ موجود مگر اشکِ بتانِ سرمہ آلود

شعرا سب کے سب محو حیرت ہو گئے کہ واقعی شاعر نے کمال کیا۔ اب سب نے درخواست کی کہ ہم اس شاعر کی زیارت کرنا چاہتے ہیں۔ شاہ ایران نے عالمگیر کے پاس شکریہ کا خط لکھا اور لکھا کہ شاعر کو ایران بھیج دیا جائے۔ یہاں سب اس کی زیارت کے مشتاق ہیں۔ عالمگیر وہ خط اور انعام لیکر زیب النساء کے پاس آئے کہ لو یہ بادشاہ کا خط ہے وہ تم کو بلاتے ہیں۔ اور شعر کہو۔ اب بتلاؤ میں بادشاہ کو کیا جواب دوں۔ شاہزادی نے کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ میری طرف سے ان کو جواب میں یہ شعر لکھ بھیجئے ؎

بلبل از گل بگزرد گر در چمن بیند مرا بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا

یعنی بلبل اگر مجھ کو دیکھ لیتی تو پھولوں کو چھوڑ دیتی اور اگر برہمن مجھ کو دیکھ لیتا تو پھر بت پرستی کیوں کرتا۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

میں اپنے کلام میں اس طرح مخفی ہوں جیسے پھول کی خوشبو اسکی پتیوں میں پنہاں ہوتی ہے۔ جو شخص میرے دیکھنے کی خواہش رکھتا ہو وہ میرے کلام میں مجھ کو دیکھے۔

زیب النساء کا تخلص بھی مخفی تھا اور اس شعر میں اس لفظ سے اپنے پردہ نشین ہونے کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔

عالمگیر نے یہی شعر لکھکر بھیجدیا جس سے شاہ ایران کو معلوم ہوگیا کہ شاعر پردہ نشین عورت ہے اسلئے آنے سے معذور ہے۔

یہاں میرا مقصود یہی آخری شعر ہے کہ جب ایک انسان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ۔ ع

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

تو حق تعالیٰ اگر اپنے کلام کے بارے میں یہ فرمائیں تو کیا تعجب کی بات ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ شعر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن ہی پر پڑھنا چاہیئے کہ ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

پس دنیا میں اگر کوئی حق تعالیٰ کو دیکھنا چاہے تو وہ قرآن میں حق تعالیٰ کی تجلی دیکھ لے۔ کلام اللہ میں حق تعالیٰ متجلی ہیں اور یہ تجلی ایسی ہے کہ تمام عالم کی تجلیات ایک طرف اور تنہا کلام اللہ کی تجلی ایک طرف کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ شعر کہا ہے کہ ؎

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یعنی یوسف علیہ السلام کا حسن، عیسیٰ علیہ السلام کی پھونک اور موسیٰ علیہ السلام کا ید بیضا یہ سب آپ رکھتے ہیں جو کچھ خوبیاں وہ سب الگ الگ رکھتے ہیں آپ تنہا ان سب کے حامل ہیں۔

اسی شعر کو میں قرآن شریف پر پڑھتا ہوں۔ اس لئے کہ قرآن میں ہر رنگ کی تجلی ہے اور یہ جملہ تجلیات کا جامع ہے اور اس تجلی کا حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کا مقصود ہے۔ اس تجلی کا حال امام احمد ابن

حسین ؒ سے تو پوچھو کہ اسی پر فدا ہو گئے ان پر یہ تجلی منکشف تھی اسی وجہ سے کلام اللہ کو قدیم فرماتے تھے اور اسی کی وجہ سے ان کو شہید کیا گیا۔

ایک صاحب مجھ سے بیان کرتے تھے کہ ایک بزرگ یہ فرماتے تھے کہ جس کسی کی نسبت ضعیف ہو وہ خانہ کعبہ کے انوار کی طرف متوجہ ہو اسکی تکمیل ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ جب بزرگان دین فرما رہے ہیں تو وہ کعبہ کے انوار کا مشاہدہ کرتے ہوں گے۔ مگر میں ایک دوسری بات کہتا ہوں کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کی ایسی تجلی ہے کہ جس کی نسبت میں ضعف ہو وہ اس کی طرف متوجہ ہو اور اپنی تکمیل کرے۔ یہاں تک تو تقرب پر گفتگو تھی۔ تلاوت کا تیسرا فائدہ معنی کا انکشاف ہے۔ یعنی عُرَفا جب تلاوت کرتے ہیں تو نفس تلاوت ہی کے وقت ادھر سے معانی کا القا ہوتا جاتا ہے یہ کہہ رہا ہوں کہ محض تلاوت کرنے سے تین چیزیں متعلق ہیں۔ الفاظ کا تحفظ۔ اللہ تعالیٰ کا تقرب اور معانی کا انکشاف۔ اس لئے آپ سے کہتا ہوں کہ احکام کو سمجھنے کے لئے دوسرا وقت مقرر کیجئے اور اس کے لئے الگ الگ مجلس منعقد کیجئے۔ یہ بھی ضروری ہے لیکن نفس تقرب معنی سمجھنے پر موقوف نہیں۔ بلکہ بلا فہم معنی بھی تلاوت موجب قرب ہوتی ہے۔

اب ہم تلاوت کلام اللہ بلا فہم معنی کے مفید اور موجب قرب ہونے کی تائید میں طبقات کبریٰ کی عبارت پیش کرتے ہیں۔ وہو ھذا۔

كان رضي الله عنه يقول في معنى قول الامام احمد ابن حنبل رضي الله عنه حين رأى رب العزة جل جلاله في منامه فقال يا رب بما يتقرب اليك المتقربون قال بكلامي يا احمد قال قلت يا رب بفهم او بغير فهم فقال يا احمد بفهم وبغير فهم۔

سید علی و میری رضی اللہ عنہ امام احمد ابن حنبل رضہ کے اس ارشاد کے بیان میں فرماتے تھے جبکہ انھوں نے (امام احمد رض) اللہ جل شانہ کو خواب میں دیکھا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ آپ کا قرب پانے والوں نے سب سے زیادہ قرب کس چیز سے حاصل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے احمد میرے کلام کی تلاوت سے۔ انھوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب تلاوت سمجھ کر ہو یا بلا سمجھے۔ ارشاد ہوا جیسے بھی ہو سمجھ کر ہو یا بلا سمجھے۔

المراد بفهم ما يتعلق بعلماء الشريعة وبغير فهم ما يتعلق بعلماء الحقيقة فان العلماء ما لهم آلة بفهم كلام الله تعالى الا بالفكر والنظر واما العارفون

مراد بفہم سے (یعنی سمجھ کر تلاوت کرنا) تو اس کا تعلق علماء شریعت سے ہے۔ اور بغیر فہم کا تعلق علماء حقیقت (عرفاء) سے ہے اسلئے کہ کلام اللہ کے سمجھنے کا کوئی آلہ علماء شریعت کے پاس بجز غور و فکر کے نہیں ہے اور یہ

فطریقھم الی فھمہ الکشف و التعریف الالٰھی وذلک لا یحتاج الی تفھم فقیل لہ ما تقول فیمن یقرأ من العوام من غیر فھم فقال قد صح ان لہ بکل حرف عشر حسنات فتحت قولہ وبغیر فھم مسئلتان۔ (طبقات کبریٰ للشعرانی) (ص ۱۶۹ ج ۲)

عارفین تو ان کے لئے کلام اللہ کے سمجھنے کا طریقہ کشف اور تفہیم آلٰہی ہے اور یہ حضرات سمجھنے اور نظر کرنے کے محتاج نہیں ہیں۔ پھر علامہ دمیری سے کسی نے پوچھا کہ اچھا عوام کی تلاوت کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو کہ بلا فہم تلاوت کرتے ہیں تو فرمایا کہ یہ تو حدیث صحیح ہے کہ ہر حرف پر دس نیکی ملتی ہے۔ پس امام کے قول بغیر فھم کے تحت دو مسئلے ہیں (ایک تو عوام کی قرأت اور دوسرے عارفین کی)

یہی حدیث تمام علماء کی مستدل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بغیر فہم معنی کے بھی تلاوت پر ثواب ملتا ہے کیونکہ اسی حدیث میں ہے کہ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ الٓم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے میم ایک حرف ہے اس طرح اسکو تیس نیکی ملتی ہے۔ حالانکہ کوئی بھی اس کا مطلب نہیں سمجھتا۔

امام احمد ابن حنبل کے خواب کو امام غزالی نے بھی احیاء العلوم میں نقل فرمایا اور علامہ شعرانی نے بھی اس کتاب میں نقل فرمایا۔ نیز اور بزرگان دین سے بھی سنا ہے تو گویا اس کی صحت پر سب کا اتفاق ہے۔ پس اس کو سند میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

سید علی دمیری رحمہ نے اس خواب کا خوب ہی مطلب بیان فرمایا ہے کہ بفھم کا تعلق علماء شریعت سے ہے اس لئے کہ کلام اللہ کو سمجھنے کے لئے ان حضرات کو نظر و تفکر کرنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ ان کے پاس اسکے علاوہ کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے جس سے معانی تک رسائی ہو سکے اور بغیر فھم کو علماء حقیقت کے ساتھ متعلق فرمایا اس لئے کہ ان نفوس قدسیہ کو نظر و فکر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ ان کو خود سمجھاتے ہیں وہ جیسے جیسے تلاوت کرتے جاتے ہیں معانی منکشف فرماتے جاتے ہیں تو بھلا پھر ان کو نظر و فکر کی ضرورت ہی کیا ہے بلکہ یہ حضرات تو نظر و فکر کو اور معانی کی طرف توجہ کو اپنے اور خدا کے درمیان حجاب سمجھتے ہیں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ تلاوت قرآن سے تین مقاصد کا ذکر علامہ بیضاوی نے فرمایا ہے ان میں سب سے اعلیٰ مقصد تقرب الی اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والی سب سے زیادہ تلاوت قرآن ہے۔ اس کی دلیل ہمارے پاس بزرگان دین کے ارشادات ہیں۔ ان کو آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

ذکر کے فضائل سے تو احادیث بھری پڑی ہیں۔ محدثین مستقل ابواب اس کے لئے قائم فرمارہے ہیں تو سب اذکار میں بڑھ کر قرآن شریف ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خود اسکو جگہ جگہ ذکر فرمارہے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمارہے ہیں:-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ٥ اور فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ٥

اور وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ الآية۔

یعنی بیشک ہم نے ذکر (قرآن) کو نازل کیا اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنیوالے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اہل ذکر سے سوال کرو اگر تم جانتے نہیں ہو۔ اور فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ پر قرآن اسلئے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کیلئے اس چیز کو صاف صاف بیان فرمادیں جو ان کی طرف نازل کیگئی ہے۔

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ قرآن خود ذکر ہے اور احادیث میں تصریح ہے کہ یہ افضل الذکر ہے۔

بہر حال سب سے زیادہ قرب کا موجب تلاوت کلام اللہ ہے مگر اس کے لئے تصحیح نیت کی ضرورت ہے جس عمل سے آدمی خدا کا قرب چاہے اس عمل میں تقرب کی نیت ضروری ہے۔ پس آپ سے کہتا ہوں کہ سب اذکار سے زیادہ تلاوت قرآن کا التزام کیجئے، جب اس کا التزام ہوگا تو آپ کو قرآن سے محبت بڑھیگی۔ اُنس پیدا ہوگا۔ اور مناسبت بڑھے گی اور جس قدر آپ کو قرآن سے اُنس ہوگا اسی قدر اللہ تعالیٰ کی عنایت آپ کی طرف ہوگی۔ اس مضمون کو پھر تفصیل سے کہوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر حضرت مرشدی رح کا تعلیم فرمودہ طریقہ تلاوت بھی نقل کردیا جائے۔ وہ یہ ہے کہ تلاوت شروع کرنے سے قبل قرآن پاک کی عظمت کا استحضار کیا جائے اور استغفار و تجدید ایمان اور اس بات کی تصدیق کرلیا کرے کہ یا اللہ یہ آپ کا کلام برحق ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے اسمیں جو کچھ ہے سب حق ہے۔ اور یہ دعا کرے کہ یا اللہ اس کلام کی معرفت اور اس کی تلاوت باخلاص عطا فرمائیے۔ اور اس کے مطابق ہماری زندگی بنادیجئے۔ اور اس کے جملہ اوامر کے امتثال اور نواہی سے اجتناب اور قصص سے انزجار و اعتبار کی توفیق دیجئے۔ اور اس کے ثمرات و برکات سے نواز دیجئے اور قرآن کے مطابق ہماری زندگی بنادیجئے۔ انتہیٰ

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کی توفیق عنایت فرمائیے۔

آمین ثم آمین !!

چوتھا وعظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّا بَعْدُ۔ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ مَا فَعَلُوْہُ فَذَرْھُمْ وَمَا یَفْتَرُوْنَ ۝ وَلِتَصْغٰۤی اِلَیْہِ اَفْـِٕدَۃُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ وَلِیَرْضَوْہُ وَلِیَقْتَرِفُوْا مَا ھُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ۝ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّھُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا ط

اس آیت میں کفار کی تکذیب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اور یہ لوگ جو آپ سے عداوت کرتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ جس طرح آپ سے عداوت رکھتے ہیں اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان پیدا کئے تھے کچھ آدمی اور کچھ جن۔ جنمیں سے بعضے دوسرے بعضوں کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ ان کو دھوکہ میں ڈالدیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ پھر ایسے کام نہ کر سکتے۔ سو ان لوگوں کو اور جو یہ افترا پردازی کر رہے ہیں اس کو آپ رہنے دیجئے (اور وہ شیاطین اس لئے وسوسہ میں ڈالتے تھے) تاکہ اس (فریب آمیز بات) کی طرف ان کے قلوب مائل ہو جائیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور تاکہ اسکو پسند کرلیں اور تاکہ مرتکب ہو جاویں ان امور کے جنکے وہ مرتکب ہوتے تھے (آپ کہدیجئے کہ) تو کیا اللہ کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں۔ حالانکہ وہ ایسا ہے کہ اس نے ایک کتاب کامل تمہارے پاس بھیجدی ہے۔ اس کی حالت یہ ہے کہ اس کے مضامین خوب صاف صاف بیان کئے گئے ہیں۔

کئی دن سے یہ مضمون بیان کر رہا ہوں بلکہ الہ آباد ہی سے اسکو شروع کر چکا ہوں جس مضمون کو ضروری سمجھتا ہوں اس کو مکرر سہ کرر بیان کرتا ہوں چنانچہ بعض دفعہ ایک ہی آیت کا بیان کئی کئی دن تک کرتا رہتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ لوگوں سے یہ بھی کہہ دیتا ہوں کہ مجھکو ایک چیز پسند ہوتی ہے اس کا ذکر کرتا ہوں خواہ آپ لوگوں کو پسند آوے یا نہ آوے آپ لوگوں کے لئے نہیں بیان کرتا ہوں۔ اور نہ آپ کو آپ کے گھر سے بلانے جاتا ہوں۔ آپ خود تشریف لاتے ہیں اسلئے کہتا ہوں۔ اب اگر آپ کا جی چاہے تو سنئے اور نہ چاہے تو جو چاہے کیجئے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ ؎

گرچہ در ناصح بود صد داعیہ پندرا اذنے بباید واعیہ

یعنی اگرچہ ناصح اور واعظ میں سو داعیہ موجود ہو لیکن اس کی نصیحت کارگر ہونے کے لئے محفوظ کرنیوالا کان بھی ہونا چاہئے۔

جس طرح کہنے کے لئے واعظ میں لسان کے ساتھ ساتھ داعیہ کی ضرورت ہوتی ہے ویسے ہی قبول کرنے کے لئے کان کی ضرورت ہے۔ چنانچہ لسّان اسے کہتے ہیں جو زیادہ بولنے والا ہو۔ یہ لسّان مبالغہ کا صیغہ ہے تو اسی طرح اس کے مقابل میں دوسرا مبالغہ بھی بنا لیجئے۔ سمّاع یعنی زیادہ سننے والا اب آپ لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ لسّان کی تو بہت فکر ہے اور بولنے کی ضرورت زیادہ سمجھتے ہیں اسلئے بڑے بڑے متکلم کو بلاتے ہیں کیونکہ ان کا بولنا آپ کو بہت پسند ہوتا ہے۔ مگر اس کا سننا اور سماع قبول سے سننا اس کی ضرورت نہیں سمجھتے بس یہ چاہتے ہیں کہ اگر کوئی بولنے والا ملے تو بغیر کان ہی کے ہم لوگ سنیں اور اگر کچھ سنیں بھی تو غلط معنی پر اسکو محمول کریں اور اس پر الزام قائم کرکے اس کو ذلیل کردیں لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

اصل ناصح تو انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں اور مومنین ان کی باتوں کو سنتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ صحابہ کی تعریف میں یہ فرما رہے ہیں کہ:۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ۝

یعنی اعتقاد رکھتے ہیں رسول اس چیز کا جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کیگئی ہے اور (دوسرے) مومنین بھی (اس کا اعتقاد رکھتے ہیں) سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتابوں کے ساتھ اور اس کے سب پیغمبروں کے ساتھ۔ (اور پیغمبروں پر اعتقاد رکھنا ان کا اس طور پر ہے کہ یہ کہتے ہیں) کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں

تفریق نہیں کرتے اور ان سب نے یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور اسکو خوشی سے مانا ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار اور آپ ہی کی طرف ہم سب کو لوٹنا ہے۔

یہاں صحابہ کی تعریف میں اللہ تعالیٰ اس کو لا رہے ہیں کہ انھوں نے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کہا اور یہ مدح اس لئے ہو رہی ہے کہ ان سے یہ کہا گیا تھا کہ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ یعنی اور جو باتیں از قسم عقائد فاسدہ واخلاق ذمیمہ و عزم معاصی) تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم (زبان وجوارح سے) ظاہر کرو گے یا کہ (دل ہی میں) پوشیدہ رکھو گے (دونوں حالت میں) حق تعالیٰ تم سے (مثل دیگر معاصی کے ان کا) حساب لیں گے پھر جسکے لئے بخشنا منظور ہوگا بخش دیں گے اور جس کو (سزا دینا) منظور ہوگا سزا دینگے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔

یہ آیت صحابہ پر اسقدر شکل ہوئی کہ آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرنے لگے کہ یا رسول اللہ اب تک تو ہم ایسے افعال کے مکلف تھے جو ہمارے طاقت واختیار میں تھے۔ جیسے نماز وروزہ اور زکوٰۃ وجہاد اب یہ آیت آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض وہ اعمال جو بے اختیار صادر ہوتے ہیں اور ولیں آتے ہیں ان پر بھی مواخذہ ہوگا۔ یہ تو ہماری طاقت سے خارج ہے تو کیا ان پر بھی مواخذہ ہوگا۔ اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ اہل کتاب کی طرح سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا کہو (یعنی انھوں نے یہ کہا کہ ہم نے سنا اور نہیں مانا) تو صحابہ نے کہا کہ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (یعنی ہم نے سنا اور اس کو مانا اور قبول کیا) پس چونکہ صحابہ نے ایسے حال میں سمعنا واطعنا کہا ہے اس پر اللہ تعالیٰ ان کی مدح فرما رہے ہیں۔

یہ آسان کام نہیں ہے صحابہ کا بال بال بیکا ہوگیا اور ان کی زبان لڑکھڑاتی تھی مگر سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کہتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم افعال اختیاریہ کو تو چھوڑتے ہی تھے معلوم نہیں کس طرح غیر اختیاری کو ترک کرتے تھے اس لئے کہ اس پر تو قدرت ہوتی نہیں مگر اس کے باوجود صحابہؓ نے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کہہ کر پہاڑ اٹھا لیا اور سال بھر تک ان کو اسی مجاہدہ میں رکھا گیا۔ معلوم نہیں کیا حال ہوا ہوگا۔ احیاء العلوم میں ہے کہ ایک سال کے بعد پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا لَہَا مَا کَسَبَتْ وَ عَلَیْہَا مَا اکْتَسَبَتْ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو اسکو ثواب بھی اسی کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے۔

اس سے گویا پہلا حکم منسوخ ہوا اور یہ بتایا گیا کہ یہ غیر اختیاری کے لئے نہیں تھا بلکہ اختیاری کیلئے تھا۔ یعنی جو چیز وسعت سے باہر ہے اس کا مکلف نہیں کیا گیا اور جس کے ساتھ قصد وارادہ متعلق نہیں اس کا نہ ثواب ہے نہ عقاب۔ اور وساوس طاقت سے خارج ہیں تو ان کے آنے کو حرام اور ان کے نہ آنے دینے کو واجب

نہیں کیا اور نہ ان پر عذاب رکھا۔

اور اسی سلسلہ میں مقام مدح میں ہی اس سے اوپر والی آیتیں بھی نازل ہوئی ہیں۔ یعنی اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ الآیۃ

غرض حکم خداوندی صحابہ کے اگرچہ خلاف تھا لیکن چون وچرا نہیں کرسکے۔ ایسے ماننے والے تھے کہ ان کے سمع اور اطاعت کی اور ایمان کی اللہ تعالے نے مدح فرمائی۔ ایک سمع تو یہ ہے جس کو سماع قبول کہتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالے کے احکام کو سُنے اور اس پر ایمان لائے اور اس کی اطاعت کرے اور دوسرا سمع وہ ہے جس کی نسبت کفار کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ج وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ بے شک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے ان کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لاوینگے۔ بند لگا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر۔ اور انکی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان کے لئے سزا بڑی ہے۔

چنانچہ کفار کو کان ہونے کے باوجود احکام خداوندی کو سننے کی اور اس کو قبول کرنیکی توفیق نہ ہوئی۔ اسکو سمع غیر قبول کہتے ہیں۔ یعنی کان ہے لیکن سنتے نہیں۔ مؤمنین کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ حکم ہوا کہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگاؤ اور خاموش رہو امید کہ تم پر رحم کیا جائیگا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی طرف کان لگانے کا امر فرمایا ہے۔ کفار نے جب یہ سنا تو اس کے مقابل میں انھوں نے یہ منصوبہ گانٹھا کہ اس کو ہرگز نہ سنا جائے اور اس سننے ہی کو بند کردیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے یہ کہا کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ یعنی یہ کفار یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو مت سنو بلکہ خوب شور وشغب مچاؤ شاید کہ تمھیں لوگ غالب آجاؤ۔

روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داہنی جانب اور بائیں جانب قبیلہ عبدالدار کے دو دو آدمی کھڑے ہو کر شور وشغب کرتے تھے اور تالی، سیٹی بجاتے تھے اور اشعار پڑھ پڑھ کر آپ پر قرآن پڑھنے کو خلط کردیتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہمیشہ کفار نے یہی کیا ہے اور اب بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ پس وہ لوگ بھی انھیں کے نقش قدم پر ہیں جو اس کام کو کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اچھا تم نہیں سنو گے تو مت سنو بہت سے سننے والے ہیں۔ انسان بھی سنیں گے اور جن بھی سنیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :۔

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْۤا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدِیْۤ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ - یعنی آپ کہدیجئے کہ میرے پاس اس بات کی وحی آئی ہے کہ جنات میں سے ایک جماعت نے قرآن سنا پھر اپنی قوم میں واپس جاکر کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست بتلاتا ہے سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے۔

انبیاء علیہم السلام کا کام کفار کے ان منصوبوں سے کبھی ختم نہیں ہو سکتا لوگ ان کی باتوں کو سنیں گے اور ایمان لاویں گے۔ ہاں اس کے ساتھ ساتھ یہ دوسرا سلسلہ بھی اعدا و مخالفین کا باقی رہے گا۔ جیسا کہ آجکل کے حالات دیکھ رہا ہوں کہ ایک طرف قرآن شریف پڑھا جاتا ہے اور دوسری طرف شور وغل مچایا جاتا ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر بات کرنے کو جی نہیں چاہتا اور یہ بالکل لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ کا مصداق ہے۔ ایک مرتبہ کانپور میں ایک مسجد کا کوئی واقعہ ہو گیا تھا جس میں کچھ لوگ پکڑے گئے تھے پھر جب چھوٹ کر آئے تو ان کی ہمدردی میں لوگوں نے ایک جلسہ کیا جس میں بہت سے وکیل وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ سو اتفاق سے میں بھی پہونچ گیا اس جلسہ میں انگریزوں کی مخالفت میں دھواں دھار تقریریں ہو رہی تھیں۔ جب جلسہ ختم ہوا تو اس کی کامیابی پر سب لوگوں نے تالیاں بجائیں میں نے بعض لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو لوگوں نے بتایا کہ انگریزوں کے یہاں یہ دستور ہے کہ خوشی اور کامیابی کے موقع پر تالیاں بجائی جاتی ہیں میں نے کہا لاحول ولا قوۃ الا باللہ انھیں کی مخالفت میں جلسہ ہوا اور ایسی دھواں دھار تقریریں ہوئیں اور پھر انھیں کی تقلید کر رہے ہیں اور ان کے طریقے کو اپنا رہے ہیں یہ خاتمہ بالخیر نہیں ہوا اور میں نے کہا کہ اس قسم کی تقریر کبھی نہیں سننی چاہئے۔ یہ سیاسی چیزیں ہیں مذہبی نہیں۔ آج کل سیاست اسی کو کہتے ہیں کہ غیر دینی سب چیزیں لے لی جائیں اور مذہب کو چھوڑ دیا جائے۔ سیاست اسلام میں بھی ہے مگر اس سیاست سے میل نہیں کھاتی اس لئے کہ اس میں ہر جگہ جائز و ناجائز کا سوال ہے اور اس سیاست میں سب جائز ہے کوئی چیز ناجائز نہیں خواہ عقلاً بھی خلاف ہی ہو۔ اور قبیح سے قبیح تر ہو۔ چنانچہ آپ نے دیکھا کہ جس چیز کی مخالفت میں جلسہ تھا اسی کو اپنا رہے تھے ع

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

اور اس تقریر کا خاتمہ بالخیر اس واسطے نہیں ہوا کہ اس کام کی ابتدا یہاں سے ہونی چاہئے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِیْنُهٗ الخ اور انتہا اس پر ہونی چاہئے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ تو اس کا شروع بھی بابرکت ہوتا اور خاتمہ بھی بالخیر ہوتا۔

اسی طرح ایک صاحب اور تقریر کر رہے تھے مجھ کو بھی وہاں لوگ لے گئے ان کی رعایت میں گیا

بھی جا کر بیٹھ گیا وہ مقرر صاحب بیان کرتے کرتے صحابہ کی شان میں کچھ بیجا کلمات کہنے لگے اسوقت مجھے رہا نہیں گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ کجا صحابہ رضی اللہ عنہم اور کجا آپ۔ صحابہ کو کچھ پہچانتے بھی ہو؟ ہم تو آپ کا کام بھی دیکھ رہے ہیں اور صحابہؓ کے حالات بھی کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ اور بزرگوں سے سنا ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیسی خدمات کی ہیں۔ تو ہمارا اور آپ کا منہ نہیں ہے کہ صحابہ کی شان میں کچھ لب کشائی کریں پھر میں نے یہ طے کر لیا کہ اب کسی جلسہ میں نہیں جاؤں گا۔

بات زیادہ طویل ہو گئی میں یہ کہہ رہا تھا کہ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

گرچہ ناصح را بود صد داعیہ　　پند را اذنے بباید واعیہ

یعنی جس طرح ناصح کے لئے داعیہ کی ضرورت ہے اسی طرح قبول کرنے کے لئے محفوظ کرنے والا کان ہونا چاہیئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَاعِيَةٌ۔ نصیحت کو محفوظ کرنے والے کان محفوظ کرتے ہیں۔

بعض مرتبہ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ یہ آلہ مکبر الصوت خراب ہو گیا ہے اس لئے سامعین تک آواز نہیں پہونچ رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسی طرح اولاً تو صحیح بولنا مشکل ہے اور اگر متکلم صحیح بھی ہو لیکن کان بگڑا ہوا ہو تو آدمی نہیں سن سکتا۔ زبان کتنی ہی درست ہو لیکن اگر سب کان بگڑے ہوئے ہوں تو کوئی نصیحت نہیں پہونچے گی۔ کافروں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نہیں تھی اسلئے انھوں نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ دوسرا معاملہ کیا اسی کو مولانا روم رح فرمارہے ہیں کہ ؎

اشقیاء را دیدۂ بینا نہ بود　　نیک و بد در دیدشاں یکساں نمود

یعنی اشقیاء کو چونکہ بصیرت کی آنکھ نہیں تھی اسلئے اچھا اور برا سب ان کی نظروں میں یکساں ہی معلوم ہوتا تھا

نہایت عارفانہ کلام ہے مولانا روم رح مست ہو کر یہ اشعار فرمارہے ہیں بہت ہی عمدہ اشعار ہیں کہ نبی جو سراپا نور ہوتا ہے اس کے ساتھ ان کا یہ معاملہ تھا۔ نبی کے چہرہ میں ایسا نور ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر مسلم دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ کذاب کا چہرہ نہیں ہے۔

اس پر حضرت مولانا رح کا ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ حضرتؒ پنجاب سے گذر رہے تھے کچھ مخالف لوگ ایک اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے انھوں نے جب حضرت رح کا چہرہ دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے اور حضرت رح سے بار بار مصافحہ کرتے تھے لیکن تسلی نہیں ہوتی تھی حالانکہ حضرت رح کا کوئی کلام نہیں سنا تھا۔ بات یہ ہے کہ جو آدمی سلیم الفطرۃ ہوتا ہے وہ ایسے لوگوں کا چہرہ دیکھ کر پہچان لیتا ہے اور ایک آدمی ایسا ہوتا ہے کہ کلام بھی سنتا ہے مگر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اسی کے متعلق مولانا روم رح فرمارہے ہیں کہ ؎

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد | کم کسے زابدال حق آگاہ شد
اشقیاء را دیدۂ بینا نہ بود | نیک و بد در دیدشاں یکساں نمود
ہمسری با انبیاء برداشتند | اولیاء را ہمچو خود پنداشتند
گفت اینک ما بشر ایشاں بشر | ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور
ایں ندانستند ایشاں از عمیٰ | ہست فرقے درمیاں بے منتہیٰ

یعنی اکثر لوگ اسی وجہ سے خراب ہو گئے ہیں کہ اولیاء اللہ کے حالات سے کم واقف ہوتے ہیں۔ شقی لوگوں کو دیدۂ بینا میسر نہ ہوا اسلئے اچھے اور بُرے ان کی نظر میں یکساں نظر آتے ہیں اسی وجہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام سے ہمسری کا دعویٰ کیا۔ اولیاء کرام کو مثل اپنے سمجھا اور کہنے لگے کہ ہم بھی بشر ہیں یہ انبیاء بھی بشر ہیں اور یہ دونوں خواب و خورش کے مقید ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کے اقوال آئے ہیں۔ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا یعنی انبیاء علیہم السلام سے انھوں نے کہا کہ تم لوگ ہماری ہی طرح بشر ہو۔ اور مَا لِھٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ ۝ (یعنی اس رسول کو کیا ہو گیا ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔)

یہ ان کو کوری دل سے نظر نہ آیا کہ دونوں کے درمیان بے انتہا فرق ہے یعنی چونکہ یہ لوگ دل کے اندھے تھے اور جب دل اندھا ہو جاتا ہے تو آنکھ بھی غلط بیں ہو جاتی ہے۔ اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

خشم و شہوت مرد را احول کند | زاستقامت روح را مبدل کند
چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد | صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد
چوں دہد قاضی بدل رشوت قرار | کے شناسد ظالم از مظلوم زار

مطلب یہ کہ غضب و شہوت آدمی کو غلط بیں کر دیتے ہیں اور روح کو استقامت سے بدل دیتے ہیں کیونکہ ان دونوں کی وجہ سے غرض نفسانی غالب ہو جاتی ہے اور غرض ایسی چیز ہے کہ جہاں درمیان آئی ہے ہنر اور امر اصلی پوشیدہ ہوا۔ اور اول قلب پر اس سے حجاب واقع ہوتا ہے اور اس کا ادراک غلط ہو جاتا ہے اور چونکہ حواس اکثر آثار میں قلب کے تابع ہوتے ہیں اسلئے قلب سے آنکھ کیطرف حجاب آجاتا ہے یعنی ادراک حسی میں بھی غلطی ہونے لگتی ہے۔ مثلاً قاضی اپنے دل میں قرار دے لے کہ اس مقدمہ میں رشوت لونگا پھر ظالم و مظلوم کو ہرگز نہیں پہچان سکتا۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ غرض نفسانی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک کسی منفعت کا حاصل کرنا اس کو شہوت کہتے ہیں۔ دوسرے کسی مضرت کا دفع کرنا اس کو غضب کہتے ہیں۔ یہی دو وجہیں ہوتی ہیں بے انصافی کی۔ اور دوسرے کے نفع و نقصان کے رعایت نہ کرنے کی جب دوسرے کے نفع و نقصان

کی رعایت کا عزم نہ ہوگا تو حقیقت حال اور امر واقعی کو کیوں تحقیق کرے گا بلکہ بلا تحقیق بھی جو کچھ معلوم ہوگا اسکو اوروں سے پوشیدہ بھی کرے گا اور خود اپنے قلب سے نکالنے کی بھی کوشش کرے گا ایسی حالت میں قلب اور حواس اپنا پورا کام نہ دیں گے۔ یہ معنی ہیں قلب اور چشم پر حجاب آنے کے۔

(کلید مثنوی دفتر اول ص۹۵)

مولانا روم رح نے یہ جو فرمایا کہ ع

نیک و بد در دیدہ شاں یکساں نمود

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جو معجزے دکھلاتے ہیں ان کو لوگ سحر کہتے تھے اور نبی کو ساحر کہتے تھے حالانکہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے اور سحر ساحر کا دونوں میں بہت فرق ہے۔ معجزہ خیر ہے اور سحر بُری چیز ہے مگر ان لوگوں کی نظر میں دونوں یکساں معلوم ہوتے تھے۔ دراصل بات وہی ہے جو ابھی کہی گئی کہ جب دل غلط ہو جاتا ہے تو صحیح چیز بھی اسکی آنکھ میں غلط معلوم ہوتی ہے۔

اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں

ایک عورت کے شوہر ولی تھے لیکن وہ ان کی معتقد نہ تھی۔ ایک دن وہ بزرگ ہوا میں اُڑے اور مکان کی طرف سے گذرے سب لوگوں نے دیکھا اور ان کی بیوی نے بھی دیکھا کہ ایک بزرگ اُڑے چلے جا رہے ہیں جب گھر آئے تو بیوی نے کہا کہ آپ تو ناحق بزرگی کا دم بھرتے ہیں۔ ہم نے بزرگ آج دیکھا ہے کہ ہوا میں اُڑے چلے جا رہے تھے تو ان بزرگ نے کہا کہ اچھا کیا وہ ولی تھے؟ بیوی نے کہا ہاں انکی ولایت میں کیا شک ہے۔ انھوں نے پھر پوچھا کیا وہ واقعی بزرگ تھے؟ کہا ہاں صاحب ان کی بزرگی میں کیا کلام ہے جب اس طرح اس کا اقرار کرالیا تو کہا کہ وہ میں ہی تو تھا۔ بیوی نے یہ سنکر کہا اچھا آپ ہی تھے جب ہی ٹیڑھے ٹیڑھے اُڑ رہے تھے۔

دیکھا آپ نے اُڑنا بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک ہی اڑنا دوسروں کے لئے سیدھا ہوتا ہے تو بیوی کے لئے وہی ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ سب لوگوں نے تو ان بزرگ کے اُڑنے کو ان کی کرامت شمار کیا کیونکہ معتقد تھے اور بیوی چونکہ غیر معتقد تھی اس لئے اس نے اسی میں ایک عیب لگا دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب آدمی کسی کو نہیں مانتا تو کوئی نہ کوئی شوشہ نکال ہی دیتا ہے۔

میں یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ جو فصاحت و بلاغت کا اور تکلم کا اور ہمارے واعظ اور متکلم ہونے کا ہم سے مطالبہ کرتے ہیں گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہتے ہیں کہ اس میدان میں سنبھل کے آؤ نہیں تو اگر ہم کو پسند نہ ہوگا تو ہم لوگ قتل کر دینگے۔ تو میں کہتا ہوں کہ آخر اب ہم جیسے لوگ کہاں جائیں اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ محض بولنے سے کام نہیں چلتا کیونکہ اگر ہماری زبان گویا بھی ہوئی اور با اثر بھی ہوئی لیکن کان سننے

والے نہ ہوں تو ہم بول کر کریں گے کیا؟ تاثیر قبول کرنے کے لئے دل کا کان ہونا چاہیئے۔ آپ جو یہ سمجھتے ہیں کہ جتنا بڑا قوال ہوگا اتنا ہی اثر زیادہ ہوگا۔ یہ غلط خیال ہے۔ بڑے بڑے قوال ہوئے ہیں لیکن ضرورت اس سے زیادہ فعال کی ہے۔

حضرت عثمان رضؓ جب خلیفہ ہوئے تو ممبر پر بیٹھ کر کچھ زیادہ بولے نہیں۔ یہ فرمایا کہ اَنْتُمْ اِلٰی اِمَامٍ فَعَّالٍ اَحْوَجُ مِنْکُمْ اِلٰی اِمَامٍ قَوَّالٍ یعنی تمھیں امام قوال سے زیادہ امام فعال کی ضرورت ہے مطلب یہ کہ بولنے والے سے زیادہ کام کرنے والے کی ضرورت ہے۔

اتنا فرمایا اور خاموش ہو گئے۔ عصر تک خاموش بیٹھے رہے لیکن کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ اٹھ کر چلا جائے۔ مولانا روم رح نے مثنوی میں لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضؓ خاموش تو تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ در و دیوار سے نور کی بارش ہو رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے ان سے اسی کی توقع تھی۔ خلیفہ کا کام نور پاشی ہی کرنا ہے۔ چنانچہ صحابہ رضؓ نے ان کی خاموشی سے یہ سمجھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا حق ادا کر رہے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضؓ جب اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو اپنی جانشینی کے لئے چھ اشخاص نامزد فرما دیئے۔ حضرت عثمان رضؓ، حضرت علی رضؓ، حضرت طلحہ رضؓ، حضرت جبیر رضؓ اور حضرت عبدالرحمن ابن عوف رضؓ حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ چنانچہ حضرت عمر رضؓ کی تدفین کے بعد یہ حضرات جمع ہوئے اور کچھ گفتگو کے بعد ان سب کی طرف سے حضرت عبدالرحمن بن عوف کو یہ اختیار دیدیا گیا کہ وہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضؓ میں سے جسکو چاہیں منتخب فرمادیں۔ حضرت عبدالرحمنؓ نے خفیہ طور پر ہر مسلمان مرد و عورت کی رائے لی وہ فرماتے ہیں کہ دو شخص بھی ایسے نہ ملے جو حضرت علی رضؓ کو حضرت عثمان رضؓ پر ترجیح دیتے ہوں۔ حضرت عثمان رضؓ نہایت باحیا اور شرمیلے تھے چنانچہ جب سب لوگ جمع ہوئے تو حضرت علی رضؓ آگے ہی آکر بیٹھے اور حضرت عثمان رضؓ سب سے پیچھے کسی گوشہ میں بیٹھ رہے۔ پھر حضرت عبدالرحمن بن عوف نے پوچھا کہ عثمان کہاں ہیں وہ آئے تو ہاتھ پکڑ کر بیعت کی۔ چنانچہ بغیر کسی نزاع واختلاف کے حضرت عثمان رضؓ کا انتخاب ہوگیا اور سب مردوں اور عورتوں نے ان کے دست مبارک پر بیعت کی۔ پھر برسر ممبر تشریف لائے اور سب سے بالائی حصہ پر جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھا کرتے تھے اس جگہ بیٹھے۔ اس ممبر کے تین درجے تھے۔ سب سے بالائی والے پر حضور ؐ خطبہ دیتے تھے اس کے بعد والے پر حضرت صدیق تشریف رکھا کرتے تھے۔ پھر حضرت عمرؓ اس کے بعد والے پر آکر خطبہ دیا کرتے تھے۔ اور حضرت عثمان رضؓ کا جب وقت آیا تو انھوں نے شیخین کی جگہ سے اوپر جو حضور ؐ کی جگہ تھی وہاں جاکر بیٹھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی شریف سے اس واقعہ کو بعینہٖ نقل کردیا جائے۔

مولانا روم رحؒ فرماتے ہیں کہ ؎

قصۂ عثمان رضؓ کہ بر ممبر برفت چوں خلافت یافت بشتابید تفت

ممبر مہتر کہ سہ پایہ بدست رفت بوبکر و دوم پایہ نشست

بر سوم پایہ عمر در دور خویش از برائے حرمت اسلام و کیش

دور عثماں آمد او بالائے تخت بر شد و بنشست آں مسعود بخت

پس سوالش کرد مردے بوالفضول کاں دو ننشستند بر جائے رسول

پس تو چوں جستی از ایشاں برتری چوں برتبت تو از ایشاں کمتری

گفت اگر پایہ سوم را بسپرم وہم آید کہ مثال عمرم

در دوم پایہ شوم من جائے جو گوئیم مثل ابوبکرست او

ہست ایں بالا مقامِ مصطفےٰؐ وہم مثلے نیست با آں شہ مرا

حضرت عثمان رضؓ نے جب خلافت پائی تو تشریف لائے اور اس ممبر پر جاکر بیٹھے جو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ اس کے تین درجے تھے جب حضرت ابوبکر رضؓ خلیفہ ہوئے تو وہ دوسرے درجے پر بیٹھے۔ اور جب حضرت عمر رضؓ کا وقت آیا تو تیسرے درجے پر جو سب سے نیچے والا تھا بیٹھ کر خطبہ فرمایا۔ اور ان دونوں حضرات نے بمقتضائے ادب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ چھوڑ دی (بلکہ حضرت عمر رضؓ نے حضرت ابوبکر رضؓ کی بھی) تاکہ دین واسلام کی حرمت بڑھے۔ اور جب حضرت عثمان رضؓ کا دور ہوا تو یہ مسعود بخت بالائے تخت یعنی سب سے اوپر والے درجہ پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تھا اور اس پر آپ خطبہ فرمایا کرتے تھے تشریف فرما ہوئے۔ یہ دیکھ کر ایک شخص بوالفضول نے آپ سے پوچھا کہ حضرات شیخین رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ پر نہیں بیٹھے تھے پھر آپ نے اپنے کو ان سے برتر کیسے سمجھا باوجودیکہ آپ رتبہ میں ان سے کمتر ہیں۔ حضرت عثمان رضؓ نے فرمایا کہ بھائی اگر میں تیسرے درجہ پر بیٹھتا تو لوگ سمجھتے کہ حضرت عمر رضؓ کی برابری کرنا چاہتا ہوں۔ اور دوسرے درجہ پر بیٹھتا تو تم حضرت صدیق رضؓ کے ساتھ مساوات کا گمان کرتے۔ لیکن جب سب سے اوپر والے درجہ پر بیٹھا تو اب اس کا احتمال ہی نہ تھا کہ یہ گمان کیا جاتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برابری کرنا چاہتے ہیں۔ اسلئے کہ کوئی امتی نبی کے برابر بھلا کہاں ہوسکتا ہے۔

اس کے بعد مولانا روم رحؒ حضرت عثمان رضؓ کے خطبہ کے متعلق فرماتے ہیں جس میں حضرت نے یہ فرمایا تھا کہ انتم الی امام فعال احوج منکم الی امام قوال یعنی تمھیں امام قوال سے زیادہ امام فعال کی ضرورت ہے۔

بعد ازاں برجائے خطبہ آں وَدود　　تا بقربِ عصر لب خاموش بود
زہرہ نے کس را کہ گوید ہیں بخواں　　تا بروں آید زمسجد آں زماں
ہیبتے بنشستہ بُد ہر خاص و عام　　پرشد از نورِ خدا آں صحن و بام
ہر کہ بینا ناظرِ نورش بُدے　　کور ازاں خورشید ہم گرم آمدے
پس زگرمی فہم کردے چشمِ کور　　کہ برآمد آفتاب بے فتور
لیک ایں گرمی کشاید دیدہ را　　تا ببیند عینِ ہر بشنیدہ را
گرمیش را ضجرتے و حالتے　　زاں تپش دل را کشاید فسحتے
کور چوں شد گرم از نورِ قدم　　از فرح گوید کہ من بینا شدم
سخت خوش مستی ولے اے بوالحسن　　پارۂ راہ است تا بینا شدن

پھر اس کے بعد وہ ودود (حضرت عثمان رض) خطبہ کی جگہ پر عصر کے قریب تک خاموش لب بستہ رہے لیکن نہ تو کسی کی یہ ہمت تھی کہ ان سے یہ کہتا کہ کچھ فرمائیے اور نہ یہی مجال تھی کہ مسجد سے نکل کر باہر چلا جاتا۔ اور ایک عجیب منظر تھا کہ ہر خاص و عام پر ایک ہیبت اور رعب طاری تھا (اور نور کی ایسی بارش ہو رہی تھی) کہ مسجد کا صحن و بام یعنی سب در و دیوار نورِ الٰہی سے پُر تھا۔ جو کہ بینا تھا وہ تو اس نور کو دیکھ رہا تھا اور جو نابینا تھا وہ بھی اس خورشید سے گرم ہو گیا تھا۔ پس اس گرمی سے نابینا بھی یہ سمجھتا تھا کہ تمتمات روشن آفتاب نکل آیا ہے۔ لیکن یہ گرمی آنکھ کی پٹی کھول دیتی ہے تاکہ آنکھ ہر سنے ہوئے کو دیکھے۔
گرمی میں ایک تنگی اور ایک حالت ہوتی ہے۔ اس تپش سے دل کو ایک وسعت کشادہ ہوتی ہے۔ نابینا جب نورِ قدم سے گرم ہو جاتا ہے تو فرح سے کہتا ہے کہ میں بینا ہو گیا۔ اے بوالحسن تم بہت سخت مست ہو لیکن بینا ہونے تک ابھی ایک بڑا ٹکڑا باقی ہے جس کو قطع کرنا باقی ہے

شرح جب محبت کی گرمی پہونچتی ہے تو دل میں ایک وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ فرح بطرے مدعی ہوتا ہے کہ میں بینا ہو گیا اور میرا سلوک تمام ہو گیا اور میں واصل ہو گیا۔ اس میں ایک عقبۂ باطنیہ کی طرف اشارہ ہے۔ جو اکثر اہلِ سلوک کو پیش آتا ہے کہ قبل کمال کمال کے مدعی ہو جاتے ہیں۔ اسکا منشا کا حصول ہوتا ہے۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ آفتاب نکلنے کے وقت دو کیفیتیں ملتی ہیں۔ ایک گرمی دوسرے نور کور کو صرف گرمی ملتی ہے۔ اسی طرح توے کو بھی صرف گرمی ہی ملتی ہے۔ اور جو قلوب مصفّیٰ ہیں اور جو اجسام صیقل ہیں گرمی کے ساتھ ان کو نور بھی ملتا ہے۔
اسی کو مولانا گنگوہی رح فرماتے ہیں کہ ولایت نظری کے یہ معنی ہیں کہ بعض وقت بدون اختیار عارف کے ایسا آجاتا ہے کہ عارف کے نظر میں اور توجہ ہی میں اثر ہوتا ہے کہ جس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس

پر ایک اثر پڑتا ہے جس سے وہ ملون ہو جاتا ہے مثل آفتاب کے کہ جب وہ نمایاں ہوتا ہے تو ہر شے پر اس کی شعاع ہوتی ہے مگر جو طبع مصفا قابل ہوتی ہے تو انوار کا عکس آتا ہے اور نہیں تو حرارت کا اثر ہوتا ہے اس میں بھی تفاوت استعداد ہے آئینہ پر نور زیادہ اور ساج پر کم پتھر پر گرمی زیادہ اور گارے پر کم۔ اسی کو مولانا روم رح فرماتے ہیں کہ ؎

سخت خوش مستی ولے اے بوالحسن پارۂ راہ است تا بینا شدن

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ گرمی سے بینا ہونے تک بہت بڑی مسافت باقی ہے۔ جب تک وہ طے نہ ہوگی نور نہیں ملے گا۔

دیکھئے مولانا روم رح تو یہ فرما رہے ہیں اور ابھی آپ فصاحت و بلاغت کی تلاش کر رہے ہیں تو سن لیجئے کہ جب تک نور قلب میں نہ ہو کسی کا کلام کافی نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا فصیح و بلیغ ہو۔ ہم نے بھی بڑے بڑے فصیح و بلیغ دیکھے ہیں لوگوں کو اس کی کوئی نہ کوئی بات ناپسند ضرور ہوگی۔ اس لئے ضرورت ہے کہ متکلم کے اندر تاثیر کا داعیہ ہو اور پھر اس کے ساتھ ساتھ سننے والوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ ارادت و عقیدت کے ساتھ بیٹھیں۔ شیخ سعدی رح فرماتے ہیں ؎

وسعت میدان ارادت بیار تا بزند مرد سخن گوئے گوئے

یعنی اے مخاطب ارادت کے میدان کی وسعت پیش کر تاکہ اسکے اندر متکلم گیند پھینک سکے مطلب یہ کہ جب سننے والا ارادت و عقیدت کے ساتھ بیٹھے گا تو متکلم انشراح قلب سے بیان کرے گا ورنہ نہیں۔

اسی کو مولانا روم رح فرماتے ہیں کہ ؎

گر ہزاراں طالب اند و یک ملول از رسالت بازمی ماند رسول

یعنی اگر ہزاروں طالب ہوں اور ان میں ایک شخص بد دل ہو تو رسول اپنی رسالت پہونچانے سے باز رہتا ہے

دیکھئے شیخ سعدی رح اور مولانا روم رح دونوں اپنے وقت کے امام مانے گئے ہیں۔ اگر آپ ان کو نہیں تسلیم کریں گے تو تمام اولیاء اللہ ناخوش ہو جائیں گے۔

یہ حضرات فرما رہے ہیں کہ جب ارادت و عقیدت ہوتی ہے اور اسی نیت سے آدمی آتا ہے تو فیض پہونچتا ہے ورنہ نہیں۔ پس جس درجہ کی ارادت ہوگی اسی قدر فیض پہونچے گا۔ یعنی اگر ارادت کامل ہے تو فیض بھی کامل ہوگا اور اگر ارادت ناقص ہوگی تو فیض بھی ناتمام ہوگا۔ اس لئے آدمی کو چاہیئے کہ ارادت و عقیدت پیدا کرے اور حسن نیت سے آئے ورنہ بد عقیدگی اور انکار اتنا بڑا مانع ہے کہ کسی کے فیض کو آنے نہیں دیتا۔ حتی کہ نبی کے فیض کو بھی رد کر دیتا ہے ؎

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم
ز خاک مکہ ابو جہل ایں چہ بوالعجبی ست

یعنی حسنؓ بصرہ سے اور بلالؓ حبشہ سے اور صہیبؓ روم سے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فیضیاب ہوجائیں اور ابوجہل مکہ ہی میں رہنے کے باوجود محروم رہ جائے کیسے تعجب کی بات ہے۔

مرید جب پیر کے پاس جائے اور وہیں غافل اور بداعتقاد رہے تو کیا فیض ہوگا اسلئے کہ جب شیخ مجلس میں بیٹھتا ہے تو اسی لئے کہ عام لوگوں کو فیض پہونچائے۔ لہذا فیض حاصل کرنے کا وہی وقت ہوتا ہے۔ پس اگر اسی میں اعتقاد حاضر نہ کرے اور شک وشبہہ میں پڑا رہے تو پھر کیا گھر جانے کے بعد فیض ہوگا؟ آج جو آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہزارہا ہزار آدمی وعظوں میں شریک ہوتے ہیں مگر ان کو فیض نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہی اعتقاد کی کمی ہے۔ کافروں کو اسی انکار کی وجہ سے انبیاء کا فیض نہیں پہونچ سکا اور انھوں نے اپنے انکار کی نحوست دنیا میں تو دیکھی آخرت میں بھی دیکھیں گے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا حال بیان فرماتے ہیں:۔

وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ○ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ○ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ○ أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ○ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِينَ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَلَعِبًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ نَنْسَاهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَٰذَا وَمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ○

اور اعراف کے اوپر بہت سے آدمی ہوں گے وہ لوگ ہر ایک کو ان کے قیافہ سے پہچانیں گے اور یہ اہل اعراف اہل جنت کو پکار کر کہیں گے السلام علیکم۔ ابھی یہ اہل اعراف جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور اس کے امیدوار ہوں گے۔ اور جب ان کی نگاہیں اہل دوزخ کی طرف جا پڑینگی تو (اس وقت ہول کھا کر) کہیں گے اے ہمارے رب ہم کو ان ظالم لوگوں کے ساتھ عذاب میں) شامل نہ کیجئے اور اہل اعراف (دوزخیوں میں سے) بہت سے آدمیوں کو جن کو کہ ان کے قیافہ سے پہچانیں گے (کہ یہ کافر ہیں) پکارینگے اور کہیں گے کہ تمھاری جماعت اور تمھارا اپنے کو بڑا سمجھنا (اور انبیاء کا اتباع نہ کرنا) تمھارے کچھ کام نہ آیا۔ کیا یہ مسلمان وہی ہیں جن کی نسبت تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے۔ کہ ان پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت نہ کریگا (لو ان پر تو اتنی بڑی رحمت ہوئی کہ)

ان کو یہ حکم ہو گیا کہ جاؤ جنت میں۔ تم پر نہ کچھ اندیشہ ہے اور نہ تم مغموم ہو گے۔
دیکھتے ہیں آپ! کفار غایت تکبر کی وجہ سے دنیا میں مسلمانوں کو حقیر سمجھتے تھے اور قسمیں کھا کھا کر یہ کہا کرتے تھے کہ یہ بیچارے کیا مستحق فضل و کرم ہوتے جیسا أَهٰؤُلَاۤءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا سے بھی یہ مضمون مفہوم ہوتا ہے اور یہ بھی کہتے تھے کہ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ یعنی ان پر اللہ تعالیٰ رحمت نہ کریگا اور اسی قسم کی بہت سی متکبرانہ باتیں کہا کرتے تھے۔ اب آخرت میں چل کر اہل اعراف ان کو بھی یاد دلادینگے کہ یہ وہی مسلمان ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ ان پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت نہ کریگا۔ ان مسلمانوں کو اب تو دیکھو کہ ان پر کتنی بڑی رحمت ہوئی اور یہ جنت میں کس طرح عیش کر رہے ہیں۔

جنت اور دوزخ کے مابین کچھ ایسا سلسلہ رہے گا کہ اہل جنت اور اہل دوزخ باہم گفتگو کرینگے چنانچہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ وَنَادٰۤى أَصْحٰبُ النَّارِ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ یعنی دوزخ والے جنت والوں کو پکارینگے کہ (اب مارے بھوک اور پیاس اور گرمی کے بے دم ہوئے جاتے ہیں خدا کے واسطے) ہمارے اوپر تھوڑا پانی ہی ڈالدو (شاید کچھ تسکین ہی ہو جائے) یا اور ہی کچھ دیدو جو اللہ تعالیٰ نے تم کو دے رکھا ہے جنت والے جواب دیں گے۔ قَالُوۤا إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِينَ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا یعنی کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں چیزوں کی (یعنی جنت کے کھانے اور پانی کی) کافروں کے لئے بندش کر رکھی ہے۔ جنھوں نے دنیا میں اپنے دین کو لہو لعب بنا رکھا تھا اور جن کو دنیاوی زندگی نے دھوکہ اور غفلت میں ڈال رکھا تھا۔

اس لئے دین کی کچھ پرواہ ہی نہ کی اور یہ وارالجزاء ہے جب دین نہیں تو اس کا ثمرہ کہاں آگے حق تعالیٰ اہل جنت کے اس جواب کی تصدیق وتائید میں فرماتے ہیں فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا وَمَا كَانُوا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُونَ ۝ یعنی جب ان کی دنیا میں یہ یہ حالت تھی تو ہم بھی آج (قیامت) کے روز ان کا نام نہ لیں گے (اور کھانا پینا خاک نہ دینگے) جیسا انھوں نے اس (عظیم الشان) دین کا نام تک نہ لیا اور جیسا یہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب آدمی کسی چیز کا انکار کرتا ہے اور معتقد نہیں ہوتا تو اس سے مشرف بھی نہیں ہوتا۔ دنیا میں کفار جنت اور نعمائے جنت کا انکار کرتے تھے اور اس کے معتقد نہیں تھے اس لئے وہاں محروم رہیں گے۔ نیز مزید برآں یہ بھی کہتے تھے کہ اگر بالفرض قیامت ہوئی تو بھی جس

طرح ہم دنیا میں تم سے اچھے ہیں اسی طرح وہاں بھی اچھے رہیں گے اور جنت اور حسنیٰ ہمارے لئے ہے۔ بات یہ ہے کہ جب آدمی کو کھانا ملتا ہے تو اسی قسم کی سوجھتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ مومنین کیلئے فرماتے ہیں کہ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰی وَزِیَادَۃٌ۔ یعنی جن لوگوں نے نیکی کی ہے (یعنی ایمان لائے ہیں) ان کے واسطے خوبی (یعنی جنت) ہے اور مزید برآں (خدا کا دیدار بھی)

سنئے جنت میں ایسے ایسے کھانے ملیں گے اور ایسی نعمتیں ہونگی کہ آپ بھی یاد کرینگے اور پھر دنیا کی تمام لذتوں اور کھانوں کو بھول جائیں گے بلکہ پھر کوئی کھانا اچھا ہی نہ معلوم ہوگا۔ وہاں کی ہر چیز ایسی ہی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا تو ان کو اس میں اس قدر لذت حاصل ہوئی کہ پھر کسی دوسرے کا کلام ان کو اچھا ہی نہیں معلوم ہوتا تھا۔

کل میں نے تلاوت قرآن کے متعلق کچھ بیان کیا تھا اور مزید تفصیل کا وعدہ کیا تھا۔ اس سلسلہ میں علماء کرام کی تصریحات آپ کے سامنے موجود ہیں آج اس پر مزید کچھ اور کہنا چاہتا ہوں غور سے سنئے۔

اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ۔ یعنی جو کتاب آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کیجئے۔ اولاً ماقبل سے اس کا ربط بیان کرتا ہوں پھر مزید کلام کروں گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝ اور اس سے پہلے بعض قوموں پر عذاب کا ذکر فرمایا ہے اور دور سے یہ مضمون چلا آرہا ہے۔ عذاب کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کا مطلب قاضی بیضاوی یہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں و زمین کے خلق سے حق کا ارادہ فرمایا ہے باطل کا قصد نہیں کیا۔ یعنی ان کے پیدا کرنے میں ذعبث نہیں ہیں کہ یونہی عبث اور مہمل کام کردیا۔ بلکہ ان کے پیدا کرنے میں حکمت ہے اور اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ خدا کی ذات وصفات پر دلالت کریں۔ چنانچہ مفسر فرماتے ہیں کہ فَاِنَّ الۡمَقۡصُوۡدَ بِالذَّاتِ مِنۡ خَلۡقِھِمَا اِفَاضَۃُ الۡخَیۡرِ وَالدَّلَالَۃُ عَلٰی ذَاتِہٖ وَصِفَاتِہٖ کَمَا اَشَارَ اِلَیۡہِ بِقَوۡلِہٖ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ لِاَنَّھُمُ الۡمُنۡتَفِعُوۡنَ بِھَا۔ یعنی ان کے خلق سے مقصود بالذات خیر کا اضافہ اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر دلالت کرنا ہے جیسا کہ اسکی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ یقیناً اس میں مومنین کے لئے نشانی ہے اس لئے کہ وہی لوگ اس سے منتفع ہوتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آسمان وزمین کے پیدا کرنے سے اور دوسری چیزیں تو مقصود بالغیر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر دلالت اور اس کی معرفت مقصود بالذات ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات مخفی ہے ان پر یہ آسمان وزمین سب کے سب دال ہیں جس طرح آثار قدم

چلنے والے پر اور راستہ میں پڑی ہوئی مینگنی جانور کے گذرنے پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح آسمان و زمین اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر دلالت کرتے ہیں چنانچہ بزرگوں نے لکھا ہے کہ عارف جب آسمان و زمین کو دیکھتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی ہے بلکہ جملہ مصنوعات سے صانع کی معرفت ہوتی ہے۔ یہ تمام عالم اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مظہر ہے ہر ہر شے میں اللہ تعالیٰ کی تجلی موجود ہے اور اہل اللہ اس کا مشاہدہ برابر کرتے ہیں۔ جیسا کہ کسی نے خوب کہا ہے ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار　　ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

یعنی عارف کی نظر میں سبز درختوں کی ایک ایک پتی حق تعالیٰ کی معرفت کا بے پایاں دفتر ہے مگر وہ دوسرے لوگ تھے جنکو ہر چیز سے اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی تھی۔ ہمکو اور آپ کو ان سب چیزوں سے کہاں معرفت ہوتی ہے۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ آپ عجائب خانہ کو دیکھتے ہیں اور سمندر کو دیکھتے ہیں اور عجیب سے عجیب تر مخلوق کو دیکھتے ہیں مگر کچھ معرفت اللہ تعالیٰ کی آپ کو نہیں ہوتی۔ حالانکہ اللہ کے بندوں نے انھیں چیزوں سے معرفت حاصل کی ہے۔

ایک عالم تفسیر پڑھا رہے تھے انھوں نے سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ کا ترجمہ کیا تو یہ کہا کہ یہاں فِیْ عَلٰی کے معنی میں ہے۔ اور آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ زمین کے اوپر سیر کرو اسلئے کہ سیر زمین کے اوپر ہوتی ہے زمین کے اندر نہیں اور فی اندر کے معنی میں آتا ہے۔ ایک دوسرے آدمی وہاں بیٹھے ہوئے تھے وہ عارف تھے انھوں نے کہا کہ مولانا آپ قرآن میں کیوں تاویل کرتے ہیں آپ یں تاویل کیجئے یہاں فی اپنے ہی معنی میں ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ زمین کے اندر سیر کرو۔ یہ کہہ کر زمین کی طرف اشارہ کیا وہ شق ہوگئی اور وہ بزرگ اس کے اندر اتر گئے اور کچھ دور جا کر پھر اوپر نکل آئے اور ان سے فرمایا کہ یہ ہے سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ۔ ان مفسر صاحب کو بڑی ندامت ہوئی۔

اسی کو حضرت مولانا روم ؒ ان لفظوں میں ادا فرما رہے ہیں۔ کہ ؎

تازہ کن ایماں نہ از قول زباں　　اے ہوا را تازہ کردہ در نہاں

یعنی اے وہ شخص جو باطن میں ہوائے نفسانی کو تازہ کئے ہوئے ہے ایمان کو تازہ کرو مگر زبان سے نہیں بلکہ دل سے ایمان کو تازہ کرو اسلئے کہ

تا ہوا تازہ است ایماں تازہ نیست　　کیں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست

یعنی جب تک ہوائے نفسانی تازہ رہتی ہے یعنی نفس زندہ رہتا ہے اس وقت تک ایمان تازہ نہیں ہوتا اس لئے کہ ہوائے نفسانی ایمان کے دروازے کا قفل ہے۔

اسکے بعد فرماتے ہیں کہ ؎

کردہ تاویل لفظ بکر را | خویش را تاویل کن نے ذکر را
فکر تو تاویل کردہ ذکر را | ذکر را مان و بگرداں فکر را
بر ہوا تاویل قرآں می کنی | پست و کج شد از تو معنی سنی

یعنی تم قرآن و حدیث کے محفوظ الفاظ میں تاویلیں کرتے ہو؟ تم کو چاہیئے کہ اپنی تاویل کرو۔ الفاظ قرآن کی تاویل مت کرو۔ تمہاری قوت فکریہ نے لفظ قرآنی کی تاویل کر رکھی ہے تم کو چاہیئے کہ قرآن کو تو اسکی اصلی حقیقت پر رہنے دو اور اپنی قوت فکریہ کو بدلو۔ تم محض ہوائے نفسانی پر قرآن کی تاویل کرتے ہو جس سے تمہاری تاویل کی وجہ سے قرآن کے روشن و صاف معنی کج اور متغیر ہو گئے۔

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ مصنوعات سے معرفت اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے خدائے تعالیٰ نے خود فرمایا ہے اور بزرگان دین نے لکھا ہے تو اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ میں نے خود ہی بیان کیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو معرفت ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ گھڑی لیکر رات بھر اسکو دیکھتے ہی رہ گئے۔ اللہ جانے ان کے قلب میں کیا چیز آگئی تھی کہ ساری رات اسکو دیکھتے ہی رہ گئے اور اسی میں صبح ہو گئی۔ اور تعجب معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اس گھڑی کو ایجاد کرنے والے ہیں ان کو ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے زیادہ غافل وہی لوگ ہیں اور جو لوگ عارف ہیں انھوں نے اسی گھڑی سے کیسی کیسی معرفت حاصل کی ہے۔ ایک معرفت یہ بھی ہے کہ آپ کا قلب گھڑی ہے اور اس میں جو کوک دیجاتی ہے وہ ذکر اللہ ہے۔ اللہ والے اس میں برابر کوک دیتے رہتے ہیں جب اس میں کمی دیکھتے ہیں تو بھر دیتے ہیں۔ الغرض اہل اللہ نے مصنوعات سے بھی صانع کی معرفت حاصل کی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی مصنوعات سے معرفت حاصل کرنا بہت مشکل ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کا سہل ذریعہ تعلیم فرمایا کہ اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتَابِ اس سے زمین کی بھی معرفت ہو گی، آسمان کی بھی ہو گی، خدا کی ذات کی اور صفات کی ان سب کی معرفت اسی سے ہو گی۔ قرآن شریف میں صراط مستقیم کا بیان، بعث و نشر کا بیان، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا بیان موجود ہے بلکہ تمام علم اولین و آخرین قرآن میں ہے۔ حضرت سے سنا ہے جب آدمی تلاوت کرنے والا اس سے گذرتا ہے تو اس کو ان سب کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور مختلف اوقات میں اس کی تفصیلی نظر ان چیزوں پر ہو جاتی ہے اور پھر اس سے ذات و صفات کی طرف عروج ہوتا ہے۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لئے جو چیز موضوع ہے وہ قرآن ہے اور اس کے حاصل کرنے کا ذریعہ تلاوت ہے۔ جس کا امر اس آیت میں ہے کہ جو کتاب آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کیجئے۔

قاضی بیضاوی رحنے تلاوت کے مامور بہا ہونے کی علت اور غرض جو بیان فرمائی ہے کل

میں نے اس کو نقل کیا تھا کہ:۔

تَقَرُّبًا إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى بِقِرَاءَتِهٖ وَتَحَفُّظًا لِأَلْفَاظِهٖ وَاسْتِكْشَافًا لِمَعَانِيْهِ

آج اسی کی توضیح کرنا چاہتا ہوں۔

"تلاوت کی ایک غرض تقرب الی اللہ کو فرما رہے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ قاری قرآن قرأت کرتا جاتا ہے اور اس کو قرب اللہ تعالیٰ کا ہوتا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان جو حجابات ہیں وہ سب مرتفع ہوتے جاتے ہیں۔

تھانہ بھون میں ایک آدمی کو میں نے دیکھا کہ تلاوت کر رہے تھے کہ یکایک حضرت مولانا کی سہ دری میں قرآن شریف لیکر پہونچے اور حضرت کے پاس پہونچکر کہا کہ خُذْ یَا شَیْخ وہ عالم نہیں تھے لیکن عربی بولنے لگے۔ حضرت مولانا نے قرآن شریف ان کے ہاتھ سے لے لیا اور ان کو اپنے پاس بٹھایا اور پانی منگا کر اس پر دم کر کے ان کو دیا کہ اس کو پی لو۔ کچھ دیر کے بعد ان کی وہ کیفیت ختم ہوئی تو حضرت مولانا نے ان سے پوچھا کہ کیا کیفیت تھی انھوں نے کہا کہ حضرت فلاں آیت نے پکڑ لیا تھا آگے بڑھنے نہیں پایا۔

دیکھا آپ نے! آیت جسکو پکڑتی ہے وہی جانتا ہے۔ آپ کی سمجھ میں بھی کچھ آتا ہے؟ بھائی سمجھنا بہت مشکل ہے۔ آپ کے یہاں آگیا ہوں تو کہتا ہوں کہ یہ وعظ وغیرہ کھیل نہیں ہے۔ ہر آدمی کو کھیل مت بناؤ اور تماشائی کی طرح میرے گرد جمع مت رہو بلکہ سمجھو کہ کیا کہہ رہا ہوں۔

اب دوسرا واقعہ سنئے:۔

دہلی میں ایک آدمی نماز پڑھا رہے تھے اس میں سورۂ قیامہ کی تلاوت کر رہے تھے جب ان آیات پر پہونچے فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۝ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ ثُمَّ ذَهَبَ إِلٰى أَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ۝ أَوْلٰى لَكَ فَأَوْلٰى ۝ ثُمَّ أَوْلٰى لَكَ فَأَوْلٰى ۝ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں کافر کا حال بیان فرمایا ہے اور ایسا ڈانٹا ہے کہ اس نے نہ تو تصدیق کی تھی اور نہ نماز پڑھی تھی لیکن خدا اور رسول کی تکذیب کی تھی، اور احکام سے منہ موڑا تھا۔ اور ناز کرتا ہوا اپنے گھر چل دیتا تھا۔ ایسے شخص سے کہا جاویگا کہ تیری کمبختی پر کمبختی آنے والی ہے۔ پھر تیری کمبختی پر کمبختی آنے والی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ ایسا پڑھا کہ سب عرب مسلمان ہو گئے۔ اور ان پر اسی لئے پڑھا ہی گیا تھا تاکہ کفر کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوں اور أَوْلٰى لَكَ فَأَوْلٰى ۝ ثُمَّ أَوْلٰى لَكَ فَأَوْلٰى دو مرتبہ اس لئے فرمایا کہ حشر دو مرتبہ ہوگا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ یعنی کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مفت سفت چھوڑ دیا

جائیگا۔ کیا وہ منی کا نطفہ نہیں تھا جو رحم میں بہایا جاتا ہے۔

جب وہ امام صاحب اس جگہ پر پہونچے ہیں تو زور سے ایک جست لگائی اور محراب سے باہر آگئے پھر باہر سے جست کی اور محراب میں آگئے اسی طرح کئی مرتبہ جست لگائی پھر ٹھہر گئے۔ وہ کامل شخص تھے اسلئے سنبھل گئے ورنہ کوئی دوسرا ہوتا تو برداشت نہ کرسکتا اور گر جاتا۔ اسلئے کہ یہ ایسا حال تھا کہ پہاڑ بھی متحمل نہیں ہوسکتا تھا لیکن انھوں نے برداشت کرلیا۔ اسی موقعہ پر یہ کہا جاتا ہے۔ ع

کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجا است

جب کوئی آیت کسی کو لطف دے جاتی ہے اور اس کی حلاوت وہ پاجاتا ہے تو اسکو وہی جانتا ہے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

جب آپ کے یہاں آگیا ہوں تو آخر کیا بیان کروں کیا غیبت شکایت کروں؟ یا کوئی کام کی بات کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تلاوت سے اللہ تعالیٰ کا تقرب ہوتا ہے چنانچہ اسوقت جو واقعات میں نے نقل کئے اس میں ان تلاوت کرنے والوں کو قرات قرآن میں سے تقرب ہوا چنانچہ انھوں نے کہا کہ آیت نے مجھے پکڑ لیا۔

یہ تو آپ نے سنا کہ تلاوت قرآن سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اسکے بعد قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ تحفظاً لِاَلْفَاظِہٖ یعنی تلاوت کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے الفاظ قرآن کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس کے متعلق میں کل عرض کرچکا ہوں کہ اسی تحفظ کے لئے تمام مدارس کھلے ہوئے ہیں اور یہ اس کی حفاظت کا خدائی انتظام ہے۔ پس قاضی بیضاوی رحؒ نے جو فرمایا کہ تلاوت سے اللہ تعالیٰ کا تقرب ہوتا ہے۔ اور جب تلاوت کی جائے گی تو الفاظ قرآن کے محفوظ رہیں گے۔ یہ بالکل صحیح و درست ہے۔ لیکن میں یہاں اتنی بات اور کہتا ہوں کہ تَلَذُّذًا بِاَلْفَاظِہٖ وَتَسَلِّیًا بِالْمَعْشُوْقِ الْحَقِیْقِیِّ مِنْ کَلَامِہٖ یعنی تلاوت کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ قرآن کے الفاظ سے تلذذ حاصل کیا جائے اور معشوق حقیقی سے تسلی اس کے کلام کے ذریعہ کی جائے۔

قرآن شریف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے عشاق کے لئے اس دار دنیا میں بجز کلام اللہ کے اور کوئی چیز تسلی کی نہیں ہے اللہ تعالیٰ تو مخفی ہیں اس لئے وہ خود تو نظر آتے نہیں۔ لہذا اب ان کے عشاق کے لئے اگر تسلی کا کوئی ذریعہ ہے تو یہی کلام اللہ ہے وہ اسی سے تلذذ حاصل کرتے ہیں۔

مثنوی میں مولانا رومؒ نے مجنوں کا ایک واقعہ لکھا ہے ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد — در بیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود و انگشتاں قلم — می نمودے بہر کس نامہ رقم

گفت اے مجنون شیدا چیست ایں می نویسی نامہ بہر کیست ایں

یعنی ایک مسافر نے مجنوں کو اپنے غم کے بیابان میں تنہا بیٹھا ہوا دیکھا اور آنحالیکہ ریت کا غذ تھی اور انگلیاں قلم یعنی وہ اپنی انگلیوں سے ریت پر کچھ لکھ رہا تھا تو اس نے کہا کہ اے عاشق مجنوں یہ کیا ہے اور کس کے نام خط لکھ رہے ہو ؟

گفت مشق نام لیلیٰ می کنم خاطر خود را تسلی می دہم

اس نے کہا کہ اپنے لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اپنے دل کو اسی سے تسلی دے رہا ہوں۔

اور حضرات تو اس واقعہ کو اس بات پر لاتے ہیں کہ جس طرح مجنوں لیلیٰ لیلیٰ لکھ کر اپنے دل کو تسلی دیتا تھا اسی طرح اللہ والے ذکر اللہ سے اور اللہ اللہ سے تسلی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن میں اس واقعہ کو اس پر لا رہا ہوں کہ معشوق حقیقی سے ان کے عشاق کو تسلی کلام اللہ کی تلاوت ہی سے ہوتی ہے اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تجلی ہے۔ پس جتنی تجلی اور نشاط اور جس قدر لذت وحلاوت ان کو تلاوت سے حاصل ہوتی ہے کسی اور چیز سے نہیں۔

جب عارف تلاوت کرتا ہے تو اس کا رُواں رُواں اس سے لذت حاصل کرتا ہے۔ کان بھی سنتا ہے اور تمام بدن سننے لگتا ہے گویا تمام بدن ہی کان بنجاتا ہے۔ اور تلاوت کلام اللہ اس کے رگ وریشہ میں سرایت کر جاتی ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ فرماتے ہیں کہ ذکر جب تمام بدن میں سرایت کر جاتا ہے تب سستی بدن کی دور ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر تمام بدن میں سرایت کرتا ہے۔

ذکر جس طرح دل میں ہوتا ہے اسی طرح تمام بدن اس سے ذاکر ہو جاتا ہے اور جب قرآن شریف کی لذت قلب میں آجاتی ہے تو دنیا کی کوئی لذت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اس لئے کہ دنیوی لذتیں جسمانی ہیں اور یہ لذت روحانی ہے جو خداوندی لذت ہے اس کے سامنے کوئی لذت بھی باقی نہیں رہتی۔ جس طرح عمدہ اور میٹھی چیز کھانے سے زبان کو لذت ملتی ہے اسی طرح تلاوت سے زبان کو بھی ایک لذت وحلاوت ملتی ہے اور اس میں آدمی ایسا محو ہو جاتا ہے کہ تمام بدن ہی زبان بنجاتا ہے اور نعمائے جنت کی حلاوت سے بھی یہ حلاوت کہیں بڑھ کر ہے۔ کیونکہ وہ حلاوت بھی جسمانی ہوگی اور یہ حلاوت روحانی ہے

اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر اہل کتاب کی مذمت کے بعد پھر ان میں سے جو مسلمان ہو گئے تھے ان کی مدح میں فرماتے ہیں کہ لَيْسُوا سَوَاءً ط مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ○ یعنی یہ اہل کتاب سب برابر نہیں بلکہ انہی اہل کتاب میں سے ایک جماعت وہ بھی ہے جو دین حق پر قائم ہے اور اللہ کی آیتیں (یعنی قرآن) اوقات

شب میں پڑھتی ہے اور وہ لوگ نماز بھی پڑھتے ہیں۔

اس آیت میں عبداللہ ابن سلام وغیرہ جو اہل کتاب میں سے تھے پھر ایمان لائے اور مومن مخلص ہو گئے ان کی مدح اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ اگر ان کی مدح نہ فرماتے اور اہل کتاب کی مذمت عام رہ جاتی تو یہ لوگ جو مخلص تھے وہ ختم ہی ہو جاتے۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے ان کی تسلی کے لئے آیت نازل فرمادی۔

اور ان کے اوصاف میں خصوصیت کے ساتھ یہی ذکر فرمایا کہ شب کے اوقات میں آیات اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور رات کی تخصیص اسلئے فرمائی کہ رات ہی کو عشق ستاتا ہے اور اسی وقت تسلی کا سبب اختیار کیا جاتا ہے تو اس سے تسلی ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اہل اللہ کے لئے رات کا یہی عمل ہے کہ وہ رات کی ساعات میں اللہ تعالیٰ کی آیات تلاوت کرتے ہیں اور اسی سے تسلی اور تلذذ حاصل کرتے ہیں۔

اور تلاوت کا تیسرا فائدہ قاضی بیضاوی رح نے یہ فرمایا کہ اِسْتِکْشَافُ الْمَعَانِیْہِ یعنی تلاوت ہی سے معانی کا انکشاف بھی ہوتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی تلاوت کرتا جاتا ہے اور اسی تلاوت ہی کی وجہ سے اسکو قرآن سے مناسبت بڑھتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ ایسی مناسبت ہو جاتی ہے کہ خود بخود معانی قرآن کا القاء اس کے قلب پر ہونے لگتا ہے اور آیات کے معانی اس پر منکشف ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ کتابوں میں لکھا ہے کہ بعضے بزرگ ایسے بھی گذرے ہیں جنکو تین چار آیتیں بھی یاد نہیں تھیں۔ لیکن بڑے بڑے علماء آیات کے مطالب دریافت کرنے کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور وہ قرآن کے معانی بیان فرمایا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی مراد بتلاتے تھے کبھی کبھی یہ بھی فرمادیتے تھے کہ اس آیت کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کر کل بتادوں گا۔ پھر حضورؐ کی روحانیت کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور دریافت کرکے دوسرے روز اس کو بیان فرمادیتے تھے۔

اب اگر آپ یہ کہیں کہ ہم تو جاہل ہیں قرآن کو کیسے سمجھیں؟ تو ہم آپ سے یہ کہیں گے کہ قرآن شریف اسی لئے اُتارا گیا ہے کہ آپ کا جہل دور ہو۔ علماء لکھ رہے ہیں کہ مومن کو علم تلاوت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں میں نے طبقات کبریٰ سے امام احمد بن حنبل کا واقعہ نقل کیا تھا جس سے معلوم ہوا کہ تلاوت سے جو تقرب ہوتا ہے وہ فہم معنیٰ پر موقوف نہیں بلکہ تلاوت خواہ بفہم ہو یا بغیر فہم موجب قرب ہوتی ہے اور علامہ سید علی دمیری نے اس کا خوب ہی مطلب بیان فرمایا ہے کہ بفہم کا تعلق علمائے شریعت سے ہے اس لئے کہ کلام اللہ کو سمجھنے کے لئے ان کو نظر و فکر

کرنا ضروری ہے کیوں کہ ان کے پاس اس کے علاوہ دوسرا کوئی ذریعہ نہیں جس سے معانی تک رسائی ہو سکے۔ اور بغیر فہم کو علماء حقیقت کے ساتھ متعلق فرمایا ہے۔ اسلئے کہ ان نفوس قدسیہ کو نظر و فکر کی ضرورت ہی نہیں اللہ تعالیٰ ان کو خود سمجھاتے ہیں اور وہ جیسے جیسے تلاوت کرتے جاتے ہیں ان پر معانی منکشف فرماتے جاتے ہیں پھر ان کو نظر و فکر کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بلکہ یہ حضرات تو نظر و فکر کو اور معانی کی طرف توجہ کو اپنے اور خدا کے درمیان حجاب سمجھتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ تلاوت ہی تقرب الی اللہ کا بھی ذریعہ ہے اور اسی سے معانی بھی منکشف ہوتے ہیں۔ لہذا آپ سے کہتا ہوں کہ بزرگوں نے اس کو کیا ہے اور اسی سے ان کو قرب حاصل ہوا اور ان پر معانی بھی منکشف ہوئے تو یہ بزرگوں کا آزمایا ہوا نسخہ ہے اس لئے اس میں شبہ کی کوئی بات نہیں رہی۔ آپ بھی آزمائیے اور تلاوت شروع کیجئے جس قدر زیادہ تلاوت ہوگی اسی قدر زیادہ مناسبت قرآن سے ہوگی اور جتنی زیادہ مناسبت ہوگی اتنا ہی معانی کا انکشاف ہوگا اور تلاوت کی لذت و حلاوت روز بروز بڑھتی جائے گی۔

جب سے میں نے تلاوت قرآن پر بحث کی ہے اور اس پر زیادہ زور دینا شروع کیا ہے کہ تلاوت سے قرب فہم معنی پر موقوف نہیں بلکہ تلاوت ہی سے معانی بھی منکشف ہونے لگتے ہیں اور اس سلسلہ میں مستقل ایک کتاب لکھدی ہے[1] تو لوگوں نے اس کی طرف توجہ کی اور اب میرے پاس برابر خطوط آرہے ہیں کہ جب سے یہ مضمون دیکھا ہے تلاوت کی شان بدل گئی ہے اور تلاوت سے فائدہ محسوس ہو رہا ہے۔ پس یہ صالحین کا تجربہ ہے اب آپ اسکو کیوں نہیں تسلیم کیجئے گا؟ آپ بھی عمل کر کے دیکھ لیجئے اور اگر تقرب اللہ تعالیٰ کا چاہتے ہیں تو ذرا اپنی نیت کی تصحیح کیجئے اور توبہ و استغفار کر کے تجدید ایمان اور قرآن شریف کی عظمت کے استحضار کے ساتھ تلاوت کیجئے۔ دیکھئے آپ کو کچھ دنوں کے بعد اس کی لذت و حلاوت ملتی ہے یا نہیں اور قرب حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر آپ اس طرح تصحیح نیت و تجدید ایمان اور عظمت کے استحضار کے ساتھ دل سے کلام اللہ کی تلاوت کریں گے تو انشاء اللہ بہت جلد اس کا نفع پائیں گے اور اللہ تعالیٰ سے وجداناً قرب محسوس کریں گے۔

میں نے بہت کچھ کہدیا امید کہ آپ لوگوں نے سنا ہوگا اور سماع قبول سے سنا ہوگا اسلئے کہ

پند را اذنے بباید واعیہ

اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے!

اخیر میں ایک بات اور سن لیجئے۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ جس کو خدا کی طرف سے بولنے کا اذن ہوتا ہے

[1] یہ کتاب تلاوت قرآن کے نام سے شایع ہو چکی ہے۔ بے نظیر تصنیف ہے۔ ۱۲

وہ اس زبان سے نہیں بولتا بلکہ اس کے بولنے کے لئے دوسری زبان ہوتی ہے اور وہ دوسری زبان سے بولتا ہے اور جس طرح وہ نطق میں ماذون من اللہ ہوتا ہے اسی طرح اس کی بات سننے کے لئے دوسرا کان ہوتا ہے جو سامع باذن اللہ ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح اس کو زبان ملتی ہے اسی طرح شاگرد بھی سننے والے ملتے ہیں۔

مولانا روم ؒ ساری مثنوی میں اپنے شاگرد ضیاء الحق حسام الدین کو مخاطب بناتے ہیں وہ لکھنے کے لئے بیٹھ جاتے تھے اور مولانا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے پھر وہ ایک ایک لفظ لکھتے جاتے تھے اور مولانا روم ؒ سمجھتے تھے کہ میں انہی کے لئے کلام کر رہا ہوں۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص ناطق باذن اللہ ہو اور اسکو ایسا کان جو سامع باذن اللہ ہو نہ ملے اور چونکہ وہ منجانب اللہ بولتا ہے اس لئے اولاً خود اس کا کان بھی سامع باذن اللہ ہوتا ہے اور وہ خود بھی سنتا ہے پھر دوسرے لوگ بھی سنتے ہیں بجز اس کے جسکو اُدھر سے کچھ سمع وارادت ہی نہ ملے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کر لیجئے:۔

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ اَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُلُوْبِنَا وَاَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَاجْعَلْنَا شَاكِرِيْنَ لِنِعْمَتِكَ مُثْنِيْنَ بِهَا قَابِلِيْهَا وَاَتِمَّهَا عَلَيْنَا۔ اٰمِيْنَ ثُمَّ اٰمِيْنَ۔

(اے اللہ برکت عطا فرما ہمارے کانوں میں اور ہماری آنکھوں میں اور ہمارے قلوب میں اور ہماری بیبیوں میں اور ہماری اولادیں، اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بیشک آپ توبہ کو بہت قبول کرنے والے رحم فرمانے والے ہیں اور ہمکو کر دیجئے اپنی نعمتوں کا شکر کرنے والا اور ان کو منعطف کرنے والا اور ان کو قبول کرنے والا اور اپنی تمام نعمتیں ہم کو عطا فرما۔ آمین)

پانچواں وعظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّا بَعْدُ! میں کئی دن سے ایک آیت کے متعلق بیان کر رہا ہوں جسے آپ نے سُنا ہوگا۔ اسی سلسلہ میں آج بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں سنئے!

اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں:۔ وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْہُ اثْنَتَا عَشْرَۃَ عَیْنًا قَدْ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَھُمْ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰہِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ؁

یعنی اور وہ زمانہ یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کی دعا مانگی اپنی قوم کیواسطے اس پر ہم نے حکم دیا کہ اپنے اس عصا کو فلاں پتھر پر مارو بس فوراً اس سے پھوٹ نکلے بارہ چشمے (اور بارہ ہی خاندان تھے بنی اسرائیل کے چنانچہ) معلوم کرلیا ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع (اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ) کھاؤ اور پیو اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حد سے مت نکلو فساد کرتے ہوئے سرزمین میں۔

چونکہ بنی اسرائیل کے بارہ خاندان تھے اور احتمال تھا کہ پانی پینے کے بارہ میں وہ آپس میں لڑ جائیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے بارہ چشمے جاری کردیئے تاکہ ہر قبیلہ کے لئے ایک چشمہ ہو جائے اور اسی پر بس نہ فرمایا بلکہ ہر قبیلہ کیلئے چشمہ الگ الگ تقسیم فرمادیا۔ تاکہ ہر ایک اپنا مشرب جان لے اور آپس میں منازعت نہ ہو۔

مجھ کو دوسرا مضمون بیان کرنا ہے لیکن یہ آیتیں سامنے آ گئی ہیں تو ان پر بھی کچھ کلام کرتا ہوں۔ بنی اسرائیل نے یہ بھی کہا تھا جسکو اللہ تعالیٰ اسکے بعد فرما رہے ہیں:۔

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا۔ یعنی وہ زمانہ یاد کرو جب تم لوگوں نے یوں کہا کہ اے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے (یعنی من وسلویٰ پر) آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اگا کرتی ہیں۔ ساگ ہوا، ککڑی ہوئی، گیہوں ہوا، مسور ہوئی، پیاز ہوا۔ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ط یعنی آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو۔ ادنیٰ درجے کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے۔

اس موقع پر ایک بات ذہن میں آ گئی وہ یہ کہ علم کی مثال ایسی ہے جیسے من وسلویٰ اسلئے کہ علم بھی آسمان ہی سے نازل ہوا ہے اور من وسلویٰ بھی آسمان ہی سے اترتا تھا۔ پس جس طرح من وسلویٰ کی تبدیل لہسن اور پیاز سے مذموم اور نہایت ناپسند ہوئی اسی طرح علم جو کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب اور مراتب عالیہ کی تحصیل کے لئے ہے۔ اب اگر اسکو جاہ و مال کا ذریعہ بنایا جائے تو نہایت مذموم و قبیح شے ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا موجب ہے اسلئے کہ ایک اعلیٰ و ارفع شے سے ادنیٰ چیز حاصل کی جا رہی ہے۔ یہ برابر بیان کیا کرتا ہوں مگر اسکو سنتا کون ہے اور اسی نہ سننے کا نتیجہ یہ ہے کہ آپس میں فساد اور تصادم ہے جتنا تصادم ہم لوگوں میں یعنی علماء میں ہے عوام میں نہیں ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ فتنہ انھیں سے اٹھے گا اور انھیں میں لوٹے گا۔ عوام گھبرا کر چھوڑ دینگے مگر یہ لوگ فتنہ و فساد اور اختلاف کو نہیں چھوڑینگے۔ اسی پر متنبہ کرنے کے لئے کہا کرتا ہوں کہ جب تک گرم جگہ نہیں جاؤ گے تمہاری سمجھ میں اسکی مذمت اور برائی پوری طرح آوے گی نہیں۔ وہاں چلو گے تب پتہ چلے گا۔

مشکوٰۃ شریف میں یہ حدیث آئی ہے:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ النَّاسِ یُقْضٰی عَلَیْهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ رَجُلٌ اُسْتُشْهِدَ فَاُتِیَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعْمَتَهٗ فَعَرَفَهَا فَقَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِیْهَا فَقَالَ قَاتَلْتُ

حضرت ابو ہریرہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلا شخص جس کا قیامت کے دن فیصلہ کیا جائیگا وہ ہوگا جو شہید کیا گیا ہوگا۔ پس وہ لایا جائیگا تو اللہ تعالیٰ اسکو اپنی نعمت یاد دلائیں گے وہ اس کا اقرار کریگا پھر اللہ تعالیٰ اس سے سوال فرمائیں گے کہ تم نے

فِيْكَ حَتّٰى اُسْتُشْهِدْتُ قَالَ كَذَبْتَ
وَلٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِاَنْ يُّقَالَ جَرِيْءٌ فَقَدْ
قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ
حَتّٰى اُلْقِيَ فِي النَّارِ۔ وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ
الْعِلْمَ وَعَلَّمَهٗ وَقَرَأَ الْقُرْاٰنَ فَاُتِيَ
بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعْمَتَهٗ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا
عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُهٗ
وَقَرَأْتُ فِيْكَ الْقُرْاٰنَ قَالَ كَذَبْتَ وَ
لٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ اِنَّكَ عَالِمٌ
وَقَرَأْتَ لِيُقَالَ هُوَ قَارِئٌ فَقَدْ قِيْلَ
ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ
حَتّٰى اُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَاَعْطَاهُ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهٖ
فَاُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهٗ نِعَمَهٗ فَعَرَفَهَا قَالَ فَمَا
عَمِلْتَ فِيْهَا قَالَ مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِيْلٍ تُحِبُّ
اَنْ يُّنْفَقَ فِيْهَا اِلَّا اَنْفَقْتُ فِيْهَا لَكَ قَالَ
كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ هُوَ جَوَادٌ
فَقَدْ قِيْلَ ثُمَّ اُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ
ثُمَّ اُلْقِيَ فِي النَّارِ۔

(رواہ مسلم)

(مشکوٰۃ کتاب العلم)

اس نعمت کا کیا حق ادا کیا؟ وہ کہے گا کہ یا اللہ تعالیٰ میں نے آپ کی راہ میں جہاد کیا حتیٰ کہ شہید کردیا گیا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو جھوٹا ہے تونے تو اس لئے قتال کیا تھا کہ تجھ کو بہادر کہا جائے چنانچہ تجھ کو دنیا میں بہادر کہا جاچکا۔ پھر اسکے بارہ میں حکم دیدیا جائیگا اور وہ چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائیگا۔ اور دوسرا شخص جس کا قیامت میں فیصلہ کیا جائے گا وہ ہوگا جس نے علم حاصل کیا ہوگا اور دوسرے کو علم سکھایا ہوگا اور قرآن بھی پڑھا ہوگا۔ چنانچہ وہ دربار خداوندی میں لایا جائیگا۔ پس اللہ تعالیٰ اپنی نعمت اسکو یاد دلائیں گے اور وہ اس کا اقرار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے سوال فرمائیں گے کہ تم نے اس کا کیا حق ادا کیا وہ جواب دیگا کہ میں نے خود علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا اور آپ کے لئے قرآن پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم جھوٹے ہو بلکہ تم نے تو علم اسلئے حاصل کیا تھا تاکہ تم کو عالم کہا جائے اور قرآن اسلئے پڑھا تھا تاکہ تمکو قاری کہا جائے سو دنیا میں تمکو عالم اور قاری وغیرہ کہا جاچکا۔ پھر اسکے حق میں بھی حکم دیدیا جائیگا اور وہ چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائیگا۔ اور تیسرا شخص جو فیصلہ کیلئے قیامت میں پیش ہوگا وہ وہ شخص ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مال کثیر عطا فرمایا ہوگا اور مال کی ہر نوع سے اسکو حصہ دیا ہوگا جب وہ لایا جائیگا تو اللہ تعالیٰ اسکو اپنی نعمتیں یاد دلائیں گے وہ اقرار کرے گا۔ پھر سوال فرمائیں گے کہ تم نے ان نعمتوں کا کیا حق ادا کیا۔ وہ جواب دے گا کہ میں نے آپکے لئے ہر اس راستہ میں خرچ کیا جسمیں خرچ کرنیکو آپ پسند فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم جھوٹ کہتے ہو بلکہ تم نے تو اس لئے خرچ کیا تھا تاکہ تم کو سخی کہا جائے سو تم کو دنیا میں کہا جاچکا پھر اس کے بارہ میں حکم صادر ہوجائے گا اور وہ بھی چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

(اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)

اس حدیث میں تین اشخاص کا قصہ جو بیان کیا گیا ہے یہ منجملہ اخبار بالغیب کے ہے۔ اور مقصود بالبیان یہ ہے کہ کچھ لوگ اپنی نیات فاسدہ کی وجہ سے معتوب و مغضوب ہوں گے۔ لہذا اس سے سب کو خوف پیدا ہونا چاہیے کہ ہم جو مقاتلہ یا تعلیم و تعلم یا انفاق فی الخیر کر رہے ہیں۔ اپنی نیات فاسدہ کی وجہ سے کہیں عذاب خداوندی میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ اس سے نیت کی تصحیح کا مسئلہ ثابت ہوا نیز یہ کہ علم میں بھی نیت کی تصحیح ضروری ہوئی جیسا کہ اور عبادات میں ضروری ہے۔

سنئے میں آپ کے شہر میں اس لئے نہیں آیا ہوں کہ آپ کی بیجا رعایت کروں اور محض آپکی یا اپنی رعایت کی بنا پر حق بات نہ کہوں۔ لہذا صاف صاف کہتا ہوں کہ جن کے پاس دولت ہے وہ زبان حال سے یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو علماء کو خرید لیا ہے۔ تو میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ بس اب پیر لوگ باقی رہ گئے ہیں ان کو بھی خرید لو۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ جن کو خرید سکتے تھے ان کو تو خرید ہی لیا ہے ہر ایک کو نہیں خرید سکتے ہو۔

دہلی میں ایک بزرگ تھے بادشاہ وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اگر آپ ہمارے وہاں آکر نماز پڑھا دیا کریں تو بڑی عنایت ہو۔ ان بزرگ کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔ اور فرمایا کہ ہم سے اور کچھ عمل تو ہوتا نہیں بس ایک نماز ہی باقی رہ گئی ہے۔ اب اس کو بھی خرید لو۔ جاؤ ہم نہیں جاتے۔

دیکھا آپ نے کسی زمانہ میں ایسے ایسے لوگ بھی موجود تھے۔ اگر ان میں کا ایک بھی اسوقت موجود ہوتا تو آپ سب کو راہ راست پر کر دیتا۔ اب ہم لوگ چونکہ اس درجہ کے نہیں ہیں اور اسکو آپ بھی خوب پہچانتے ہیں کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔ اس لئے ہم کو خریدنے کی جرات کی ہے۔ بلکہ خرید ہی لیا ہے۔

بھائی سنو۔ دین بڑی مشکل چیز ہے۔ اس کو چلانے والے اور پھیلانے والے دوسرے قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کو حطام دنیا لبھا نہیں سکتا۔ وہ لوگ اس دار دنیا میں روز بروز اللہ تعالیٰ کی رضا و قرب اور طاعات کے لطف اور ثمرات سے واقف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور دنیا میں رہتے ہوئے بھی وہ دنیا سے بالکل نکل چکے ہوتے ہیں گویا وہ دنیا کو قے کر چکے ہوتے ہیں۔ تو پھر آپ کے لالچ دلانے کی وجہ سے جس چیز کو وہ قے کر چکے ہیں اس کی طرف رجوع نہیں ہو سکتے۔ اور یہ مت سمجھئے گا کہ اب ایسے لوگ کہاں ہو سکتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ایسے لوگوں سے دنیا کبھی خالی نہیں ہو سکتی مگر آپ نہ ان کو پہچانتے ہیں اور نہ ان کو تلاش ہی کرتے ہیں۔ اس لئے کہ جو چیز اس پر مجبور کرتی ہے وہ خدا کی طلب ہے۔ اور اس زمانہ میں اسی کا فقدان ہو رہا ہے۔ نیز ان کو پہچاننے کے لئے دوسری نظر ہونی چاہئے کیونکہ ایک ہی شخص کسی کی نظر میں انتہائی محبوب ہوتا ہے اور وہی شخص دوسروں کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں

رکھتا. اس کی مثال سنئے:۔

مثنوی شریف میں مولانا روم رح یہ واقعہ لا رہے ہیں کہ خلیفۂ وقت نے ایک مرتبہ لیلیٰ کو دیکھا تو وہ کچھ زیادہ حسین وجمیل نہیں تھی اسکو بہت تعجب ہوا کہ آخر کس وجہ سے مجنوں اس پر عاشق ہے یہ تو کوئی ایسی خوبصورت بھی نہیں چنانچہ ازراہ تعجب اس سے کہا کہ تیری ہی وجہ سے مجنوں اس قدر حیران و سرگرداں ہے؟ جیسا کہ مولانا روم فرمارہے ہیں کہ ؎

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی کز تو مجنوں شد پریشان وغوی

لیلیٰ سے خلیفۂ وقت نے کہا کہ کیا تو ہی وہ ہے جسکی وجہ سے مجنوں حیران و پریشان ہوگیا ہے۔

از دگر خوباں تو افزوں نیستی گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی

دوسرے خوبصورت لوگوں سے تو زیادہ اچھی تو نہیں ہے لیلیٰ نے اسکی اس بات کے جواب میں کہا کہ جب تم مجنوں نہیں ہو تو خاموش رہو۔

دیدۂ مجنوں اگر بودے ترا ہر دو عالم بے خطر بودے ترا

اگر مجنوں کی آنکھ تمکو ہوتی تو میرے مقابل میں دونوں عالم تمھاری نظر میں ہیچ معلوم ہوتے

باخودی تو لیک مجنوں بیخود است در طریق عشق بیداری بد است

تم خودی میں ہو لیکن مجنوں بے خود ہے اسلئے کہ طریق عشق میں بیداری بُری چیز سمجھی جاتی ہے۔ محبت عقل وخرد کے تابع نہیں ہوا کرتی۔

اس واقعہ کو مولانا روم رح اس پر لا رہے ہیں کہ ہر طالب اپنے مطلوب کو پہچانتا ہے اور اس کی قدر جانتا ہے۔ نیز اس کے پہچاننے کے لئے یہ آنکھ نہیں ہوتی بلکہ دیدۂ بصیرت ہونی چاہیئے۔ اور جو اللہ کا طالب ہوتا ہے اسکو دیدۂ بصیرت حاصل ہوتا ہے تب ہی آدمی کسی اللہ والے کو بھی پہچانتا ہے۔ جو کسی کا طالب ہوتا ہے جس طرح وہ اپنے مطلوب کی قدر جانتا ہے اسی طرح مطلوب بھی اپنے طالب کی قدر پہچانتا ہے۔ طالب کی طلب اس کو مجبور کر دیتی ہے۔ اس پر ایک واقعہ سنئے:۔

ایک بزرگ کی خدمت میں ایک شخص گئے انھوں نے ان سے فرمایا کہ ابھی یہاں سے چلے جاؤ چنانچہ وہ فوراً واپس چلے آئے کچھ دنوں بعد وہ پھر ان کی خدمت میں گئے تو فرمایا کچھ دیر ٹھہر جاؤ اور پھر واپس چلے جاؤ۔ چنانچہ کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد وہ حکم کے مطابق چلے گئے۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد حاضر خدمت ہوئے تو کچھ نہیں فرمایا۔ اس کے بعد ان سے فرمایا کہ میں اس مرتبہ بھی چاہتا تھا کہ تم سے کہدوں کہ چلے جاؤ۔ مگر میری زبان میرے اختیار میں نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے زبان کو پکڑ لیا۔ اور میں کہہ نہ سکا۔ اس سے میں نے سمجھا کہ تم طالب ہو اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہو مجھ سے تم

کو نفع پہونچے گا اور تمہارا حصہ نہیں ہے۔

دیکھا آپ نے وہ بزرگ ان کو نکالنا چاہتے تھے مگر نکال نہیں سکے اور ان کی زبان پکڑ لی گئی اس لئے کہ وہ شخص خدا کا طالب تھا اور اپنی طلب میں صادق تھا۔ اسی لئے باربار انکی خدمت میں باوجود نکالنے کے جاتا رہا بالآخر اس کی صدق طلب نے ان پر اثر ڈالا۔ اسی کو میں نے کہا تھا کہ طلب مجبور کرتی ہے۔ جب آدمی صدق طلب اور حسن عقیدت کے ساتھ کسی اللہ والے کے پاس جاتا ہے تو اس کو ضرور نفع پہنچتا ہے۔

ابتدا میں حضرت مولانا تھانوی رح مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادیؒ کے خدمت میں تشریف لے گئے تھے مگر چونکہ عقیدت سے گئے تھے اس لئے مولانا گنج مرادابادی نے جو کچھ فرمایا اس کا بالکل برا نہیں مانا۔ پھر اس کے بعد مولانا رح نے حضرت کے ساتھ بڑی مہربانی اور لطف فرمایا۔ اور لوگوں سے فرماتے تھے کہ یہ شخص ایسا ایسا ہونے والا ہے۔

مولانا سید سلیمان صاحبؒ کہتے تھے کہ میں نے مولانا تھانوی رح کے پاس جانے میں عجلت نہیں کی بلکہ ان کی تقریباً ایک ہزار کتابیں دیکھیں۔ میں نے کسی سے یہ بات سنی نہیں کہ کسی کے پاس جانے کیلئے فہم کی ضرورت ہے کہ پہلے آدمی کہیں جائے تو سمجھ بوجھ کر جائے وہ ہی فرماتے تھے کہ کسی بزرگ کے پاس جانے سے پہلے خوب اچھی طرح تحقیق کرلینا چاہیئے کہ بزرگ ہیں یا نہیں۔ اور جب تحقیق کو پہنچ جائے اور بزرگوں کی خدمت میں چلا جائے تو اس کے بعد پھر چون وچرا نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے میں نے تاخیر کی مگر جب میری سمجھ میں بات آگئی تو اب جو کچھ فرمادیں بجا ہے۔ بے چون وچرا قبول کروں گا۔

سبحان اللہ بہت عمدہ بات ہے۔ طالب کی شان ایسی ہی ہوتی ہے۔ بلا شبہ بعد تحقیق کے ہی کہیں جانا چاہیئے اور جب کہیں جائے تو تصحیح نیت کرلے تب جائے۔ اس لئے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِءٍ مَّا نَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِ امْرَاَۃٍ یَتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ۔ یعنی اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور آدمی کے لئے وہی ہے جسکی وہ نیت کرے پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہے اس کی ہجرت تو اللہ اور اس کے رسول ہی کی طرف ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا کے لئے ہو کہ وہ حاصل ہوجائے یا کسی عورت کے لئے ہو کہ اس سے نکاح ہوجائے تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف سمجھی جائیگی جسکی اس نے نیت کی۔

شراح حدیث فرماتے ہیں کہ یہ حدیث کتب حدیث کا طلیعہ ہے اور ابتداء کتاب میں تصحیح نیت کیلئے لائی جاتی ہے۔ لیکن اب ہمارے طلباء کو سمجھایا جاتا ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آخر تک ان کی

نیت صحیح نہیں ہوتی۔ اسکی اصل وجہ میرے نزدیک یہ معلوم ہوتی ہے کہ نیت کا مفہوم ہی واضح نہیں ہوتا یہ لوگ نیت کو لسان کا فعل سمجھتے ہیں حالانکہ نیت فعل ہے قلب کا اور اس کی تصحیح ہیں اور نیت کے سمجھنے اور سمجھانے میں بہت دیر لگتی ہے۔ یہ آسان کام نہیں ہے بہت مشکل ہے۔ بزرگوں نے اس پر زبردست بحث کی ہے۔ حضرت مولانا رح طلباء کے لئے فرماتے تھے کہ اگر کوئی تحصیل علم میں استعداد کی نیت کرے گا تو اس کو استعداد حاصل ہو جائے گی۔ لیکن علم سے جو اصل مقصود ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی رضاء و قرب وہ نہیں حاصل ہوگا۔ اور اگر یہ نیت کرے گا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور ان کا قرب علم کے ذریعہ سے حاصل کرے تو استعداد بھی ہو جائیگی اور رضاء و قرب بھی حاصل ہوگا۔

اس سلسلے میں امام غزالیؒ کے ابتداء تعلیم کا ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ بادشاہ وقت بھیس بدلکر مدرسہ نظامیہ میں گیا تاکہ کوئی پہچان نہ سکے۔ اسی مدرسہ میں امام غزالی بھی پڑھتے تھے۔ اور جا کر الگ الگ طلباء سے دریافت کرنا شروع کیا کہ علم سے تمہارا کیا مقصود ہے۔ سب نے مختلف جوابات دیئے۔ کسی نے منصب قضا اور کسی نے منصب افتاء کے لئے اپنی نیت بتائی۔ جب امام غزالی سے پوچھا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کا وجود اور وحدانیت بدلیل عقل و نقل ثابت کیا۔ اس لئے کہ سوچا ہوگا کہ یہ شخص کہیں منکر نہ ہو۔ پھر اس کے بعد فرمایا کہ میں علم اس لئے پڑھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات کو معلوم کروں اور مرضی الٰہی کے مطابق عمل کروں۔ بادشاہ ان کے اس جواب سے بہت خوش ہوا اور اس نے ظاہر کر دیا کہ میں بادشاہ ہوں اور میں نے اور لوگوں کے جوابات سے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ آج سے اس مدرسہ ہی کو بند کر دوں اس لئے کہ کوئی بھی اللہ کے لئے علم حاصل کرنے والا نہیں روپیہ فضول ضائع ہو رہا ہے مگر آپ جیسے طالب علم جب اس مدرسہ میں موجود ہیں تو میری محنت وصول ہو گئی۔ اب آپ کی وجہ سے اس مدرسہ کو باقی رکھونگا۔

دیکھئے امام غزالیؒ کے اس واقعہ سے تحصیل علم کے باب میں نیت کی تصحیح کا مسئلہ کیسا واضح ہوا۔ اور ان کے حسن نیت کی برکت کیسی ظاہر ہوئی کہ انہی کی وجہ سے بادشاہ نے مدرسہ کو باقی رکھا ورنہ اس نے طے کر لیا تھا کہ مدرسہ ہی کو بند کر دے۔ یہاں یہ بات بھی ظاہر ہے کہ امام غزالی رح کا وہ زمانہ ابتداء تعلیم کا تھا کہ انکو اس وقت کوئی بھی نظر میں نہیں لاتا ہوگا۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کی شخصیت کو تمام عالم نے تسلیم کیا۔ اور اتنے بڑے شہرۂ آفاق امام ہوئے۔

اسی طرح ہم بھی جب مدرسہ میں پڑھتے تھے تو ایک طالب علم ہملوگوں کا مذاق اڑاتا تھا اسکی یہ عادت تھی کہ صوفیوں کا بھی مذاق اڑاتا تھا اور علماء کا بھی مذاق اڑایا کرتا تھا۔ تو ہم اپنے دل میں یہ کہتے تھے کہ ہملوگ جب ایسے ہیں تب ہی تو ایسا کر رہے ہو۔ مگر ہو سکتا ہے کہ اسی میں کوئی شخص ایسا بھی

نکل آئے جس طرح اس پورے مدرسہ میں امام غزالیؒ نکل آئے۔ چنانچہ آپ یہ جانتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام تمام مخلوق سے افضل اور سب انبیاء میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم افضل ہیں اور باوجود اس کے بشر بھی ہیں اور مخلوق ہی میں رہتے ہیں اسی طرح کوئی اللہ کا بندہ جو اللہ کا دوست اور ولی ہو وہ بھی انہی لوگوں میں رہتا ہوگا۔ اسی لئے کہا گیا ہے ؎

خاکساران جہاں را بحقارت منگر　　　تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

یعنی خاکساروں کو بنظر حقارت مت دیکھو تم کو کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ اس گرد میں کوئی سوار ہو۔

چنانچہ جو لوگ کہ ہنستے تھے ان کا حال بعد میں کچھ اچھا نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں اب وہ بیچارہ کہاں ہے ورنہ اس سے پوچھتے کہ اب کیا رائے ہے؟ ایک طالب علم جو ہمارے ساتھی تھے اس شخص کے بارے میں کہنے لگے کہ فلاں آدمی کو میں نے دیکھا کہ نماز بھی ٹھیک سے نہیں پڑھتا تو میں نے کہا کہ تم کو یاد نہیں وہ ہم لوگوں پر ہنستا تھا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہی حال مل گیا اور عمل کی توفیق نہیں ہوئی۔ یہ استہزاء و مذاق اڑانا کفار و منافقین کی صفت ہے۔ وہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اسی طرح پیش آتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ یٰحَسْرَۃً عَلَی الْعِبَادِ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ افسوس بندوں کے حال پر کبھی ان کے پاس کوئی رسول نہیں آیا جسکی انھوں نے ہنسی نہ اڑائی ہو۔

ایسے لوگ اسی خصلت بد کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوتے ہم نے بزرگوں کے یہاں خود دیکھا ہے کہ ان کی خدمت میں بہت لوگ جاتے ہیں مگر جو آدمی ان میں سے کچھ ہونے والا ہوتا ہے اسی کو ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں۔ بعضے لوگ بعد میں مجھ سے کہتے تھے کہ آپ تھانہ بھون میں بولتے نہیں تھے؟ میں نے کہا کہ بھائی میں وہاں سننے کے لئے گیا تھا بولنے کے لئے نہیں۔ جب کوئی قرأۃ کرے تو سامعین کو چاہیئے کہ سنیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ یعنی جب قرآن کی قرات کیجائے تو اس کی طرف کان لگاؤ اور خاموش رہو امید کہ تم پر رحم کیا جاویگا۔

اس آیت سے یہ مسئلہ ثابت کیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص مقتدی ہو تو اسکو ساکت و صامت رہنا چاہیئے پھر وہی مقتدی جب مقتدا اور امام ہو جائیگا تب قرأۃ کرے گا جب تک مقتدی ہے اس وقت تک اس کے لئے استماع و انصات لازم ہے۔ اسی کو مولانا روم فرمارہے ہیں کہ جو حالت مقتدی کی امام کے پیچھے ہوتی ہے بالکل اسی طرح ان لوگوں کی حالت ہونی چاہیئے جو بزرگوں کے پاس رہتے ہیں یعنی ان کو چاہیئے کہ باتوں کو سنیں اور بولیں نہیں۔ پھر جب یہ کام خود اس کو سپرد ہوگا۔

اور اصلاح وارشاد کے لئے خود وہ بیٹھے گا اس وقت اس کے لئے بولنا ضروری ہوگا۔ اور اگر اب نہیں بولے گا تو اس میں نقص سمجھا جائیگا۔ چنانچہ ایک بزرگ تھے جو بولتے نہیں تھے۔ ان کے مریدوں نے حضرت حاجی صاحب رحؒ سے شکایت کی کہ ہمارے پیر بولتے نہیں ہیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ ان کے پاس تشریف لائے اور ان کا سر پکڑ کر فرمایا کہ پیر کو لسان ہونا چاہیئے اور مرید کو کان، اور یہ بھی فرمایا کہ بھائی بولو۔ تمہارے مرید تمہارے بولنے کے مشتاق ہیں۔

سبحان اللہ حضرت حاجی صاحبؒ نے کیسی عمدہ بات ارشاد فرمائی کہ شیخ کو لسان ہونا چاہیئے اور مرید کو کان، اسلئے کہ شیخ ایسے مقام میں ہوتا ہے کہ اس کے لئے تکلم ضروری ہے اگر نہیں بولے گا تو طریق واضح نہیں ہوگا۔ لہذا نہ بولنا گویا شیخ کے لئے عیب ہے اور مرید کے لئے سکوت لازم ہے۔ اسلئے کہ اگر وہ خاموش نہیں رہے گا تو پھر شیخ کی باتوں کو نہ سن سکتا ہے اور نہ سمجھ سکتا ہے ویسے ہی بالکل کورا رہ جائیگا۔ لہذا مرید کے لئے شیخ کے سامنے بولنا عیب کی بات ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تکلم اور سکوت کے مواقع ہوتے ہیں ہر ایک اپنے موقعہ اور محل میں مناسب اور بے محل نامناسب ہوتا ہے۔

چنانچہ علامہ قشیری رحؒ جو تصوف میں امام سمجھے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اَلسُّکُوْتُ فِیْ وَقْتِہٖ صِفَۃُ الرِّجَالِ کَمَا اَنَّ النُّطْقَ فِیْ مَوْضِعِہٖ اَشْرَفُ الْخِصَالِ۔ یعنی سکوت اپنے وقت میں رجال کی صفت ہے جیسے کہ نطق اپنے محل میں اشرف خصال ہے۔

جو بات علامہ قشیری رحؒ نے فرمائی ہے یہی بات حضرت حاجی صاحبؒ نے بھی فرمائی۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ طریق کا نچوڑ ہے۔

جب کوئی شخص خطاب کرے تو مخاطب کو خاموش ہی رہنا اور اس کی طرف کان لگائے رکھنا ضروری ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ جب جبرئیل علیہ السلام وحی لیکر آتے تھے اور اس کی تلاوت حضورؐ کے سامنے شروع کرتے تو حضورؐ بھی ساتھ ساتھ پڑھتے تھے جس کی وجہ سے دوہرا تعب ہوتا تھا۔ ایک تو سننے کا دوسرے یاد رکھنے کا تو آیت نازل ہوئی کہ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝ یعنی اے پیغمبر آپ (قبل وحی کے ختم ہو چکنے کے) قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے تاکہ آپ اس کو جلدی جلدی لیں کیونکہ ہمارے ذمہ ہے (آپ کے قلب میں) اس کا جمع کر دینا اور (آپ کی زبان سے) اس کا پڑھوا دینا۔ تو جب ہم اسکو پڑھنے لگا کریں (یعنی ہمارا فرشتہ پڑھنے لگا کرے) تو آپ (اپنے ذہن سے اور فکر سے ہمہ تن) اس کے تابع ہو جایا کیجئے۔ پھر آپ کی زبان سے لوگوں کے سامنے اس کا بیان کرا دینا بھی

ہمارے ذمہ ہے۔ یعنی آپ کو یاد کرا دینا اور آپ کی زبان پر جاری کرا دینا پھر تبلیغ کے وقت بھی اس کا یاد رکھوانا اور لوگوں کے سامنے پڑھوا دینا یہ سب ہمارے ذمہ ہے۔

یہ مضمون استطراداً آگیا تھا۔ بات اس پر چلی تھی کہ حضرت مولانا تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ جب استعداد کی نیت سے علم حاصل کرے گا۔ تو استعداد ہو جائے گی۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ اگر وہ نیت نہ بدلے تو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جائے۔ بلکہ رضا فوت رہے گی۔ اور اگر کوئی شخص رضا کا طالب ہو تو استعداد بھی ہوگی اور رضا بھی حاصل ہوگی۔ لہذا علم سے رضا ہی مطلوب ہونی چاہیئے اور مقصود اصلی اسی کو بنانا چاہیئے جب اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں گے تو علم بھی دیدینگے۔ مگر ابنائے زمانہ کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے کہ ان کی نیت درست ہی نہیں ہوتی۔ اور بعضے تو اخیر وقت تک اسی بدنیتی میں رہ جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں حضرت مولاناؒ کے یہاں جا رہا تھا۔ ایک آدمی میرے ساتھ ہو گیا۔ راستہ بھر میری ہی خدمت کرتا رہا۔ جب کوئی اسٹیشن آتا تھا تو وہ فوراً اتر کر پانی لاتا اور مجھے وضو کراتا تھا۔ اسی طرح راستہ بھر معاملہ رہا جب سہارن پور پہنچا اور وہ مجھ سے رخصت ہونے لگا اس کو معلوم ہوا تھا کہ میں حج کو جا رہا ہوں تو کہا کہ آپ وہاں جا رہے ہیں، میرے لئے دعا کیجئے گا کہ میں مقرر ہو جاؤں۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر اسکو دعا ہی کرانی تھی تو اس بات کی دعا کراتا کہ علم آجائے۔ اس پر عمل کی توفیق ہو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔ خیر۔ چونکہ اس نے میرے ساتھ احسان کیا تھا اس لئے میں چپ رہا اور وہاں پہنچنے کے بعد اس کے لئے دعا کر دی۔ پھر بعد میں معلوم ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں بعد مقرر ہونے سے پہلے اس کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اصل میں فتور نیت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عام طور پر یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ جو شخص مقرر ہوتا ہے۔ اور اسکو بولنے کی مشق ہو جاتی ہے وہ بہت سے لوگوں کو اپنی تقریر سے گھیر لیتا ہے۔ بس اسی کو مقصود سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ احادیث میں اس پر سخت سخت وعیدیں آئی ہیں۔ چنانچہ ابن ماجہ میں ہے عَنْ اِبْنِ عُمَرَؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ اَوْ لِيُبَاهِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ اَوْ لِيَصْرِفَ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ فَهُوَ فِي النَّارِ۔ یعنی ابن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص علم اس لئے حاصل کرے کہ سفہاء سے جدال کرے گا یا علماء کے ساتھ مباہات و تفاخر کرے گا یا لوگوں کے چہروں کو اپنی طرف پھیرے گا تو وہ جہنم میں ہوگا۔

اسی طرح دوسری روایت میں ہے کہ۔ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ لِتُبَاهُوْا بِہٖ الْعُلَمَاءَ وَلَا لِتُمَارُوْا بِہٖ السُّفَھَاءَ وَلَا تَخَیَّرُوْا بِہٖ الْمَجَالِسَ فَمَنْ فَعَلَ ذَالِكَ فَالنَّارُ النَّارُ (ابن ماجہ صفحہ ۲۲)

یعنی حضرت جابر ابن عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ علم اس لئے مت سیکھو تاکہ علماء سے تفاخر کرو اور نہ اس لئے تاکہ سفہاء سے جدال کرو اور نہ اس لئے تاکہ اس کے ذریعہ مجالس کو جمع کرو بس جو شخص ایسا کریگا اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور میں پھر کہتا ہوں کہ اسکا ٹھکانا جہنم ہے۔

اب چونکہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی رضا چھوڑ دی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ناراض ہو کر ان کے رخ کو بدل دیا ہے اور ہم لوگوں کی برائی آپ کے دلوں میں ڈالدی ہے۔ چنانچہ عالموں کی درپیروں کی سب سے زیادہ برائی میں نے اپنے کانوں سے سنی ہے اس سے ہم یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب ہم نے اللہ تعالیٰ کی ناراضی اختیار کی ہے تب ہی تو تم کہہ رہے ہو اور ہمارا مطمح نظر جب آپ لوگ ہیں تب ہی تو آپ کا رخ بدل گیا ہے؟ ورنہ لوگوں نے بادشاہوں کی بھی پرواہ نہیں کی بلکہ ان کو ڈانٹ تک دیا ہے تم کو کیا سمجھتے کہ تم کس کھیت کے بتھوے ہو اور تمہاری کیا مجال تھی کہ تم ذرا بھی لب کشائی کرتے لیکن بات یہ ہے کہ چونکہ مخلوق کے لئے ہم نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہم سے مخلوق کو ناراض کر دیا اور یہ شعر بالکل صادق آرہا ہے ؎

سو میرے ہوئے سارے دنیا کے لئے ۔۔۔ میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے

یہ گفتگو درمیان میں طویل ہو گئی اور یہ مضمون استطرادی تھا۔ اب مضمون سابق کی طرف عود کرتا ہوں۔ جو آیتیں میں نے آپ کے سامنے اس وقت پڑھی ہیں ان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے لئے پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے کوئی بڑا پتھر رہا ہوگا اس میں بارہ گھاٹ ہو گئے۔ اس آیت میں مشرب کا ذکر ہے۔ اسی پر کچھ کہنا چاہتا ہوں پھر تلاوت کے متعلق کلام کروں گا۔ اور جب اس مضمون کو چھیڑا ہے تو آپ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت ایک گھاٹ سے پانی پلانا چاہتا ہوں۔

سنئے! قرآن میں مشرب کا ذکر بھی آیا ہے اور اس کی جمع مشارب آتی ہے اس کا بھی ذکر آیا ہے۔ چنانچہ جہاں اللہ تعالیٰ نے جانوروں کا ذکر فرمایا ہے اس کے بعد فرماتے ہیں کہ وَلَکُمْ فِیْھَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ یعنی جس طرح جانوروں سے بہت سے منافع ہیں مثلاً گوشت، کھال، اون اور اس قسم کے دیگر منافع اسی طرح مشارب یعنی پینے کی چیز ان سے حاصل ہوتی ہے جیسے دودھ۔ گھی وغیرہ۔ یہ بھی ایک خاص منفعت ہے اور مشرب کے لغت میں یہی معنیٰ ہیں۔ یعنی پینے کی جگہ اور ایک معنیٰ مشرب کے وہ بھی ہیں جسکو عرف میں مشرب سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ فلاں حنفی المشرب یا شافعی المشرب

ہے تو آپ بس اتنا ہی جانتے ہوں گے۔ لیکن صوفیا کرام بھی ایک مشرب رکھتے ہیں اور اسی سے اللہ والے معرفت کا پانی پیتے ہیں۔ میں اس وقت آپ کو اسی کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ جس طرح بنی اسرائیل کیلئے بارہ مشارب تھے اور ان کے بارہ قبیلے کے سرداروں نے اپنے لوگوں کو اپنا اپنا مشرب بتلا دیا تھا جس سے ہر آدمی نے اپنا اپنا مشرب جان لیا۔ اس سے میں یہ استدلال کر رہا ہوں کہ وہاں تو بارہ گھاٹ تھے اور ان کے مختلف مشرب تھے اسلئے ان میں بہت اختلاف ہوا لیکن ہمارا مشرب ایک ہے ہم سب کے سب محمدی المشرب ہیں ہم ایک گھاٹ سے پانی پی رہے ہیں اور وہ مشربؐ ہی ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیتے ہیں یعنی توحید کا مشرب۔ سب سے بڑی توحید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور اسی سے آپ سیراب ہیں تو پھر جب ہم حضور کے مشرب سے سیکھیں گے تو وہی مشرب ہمارا بھی ہوگا یعنی ہم کو بھی توحید حاصل ہوگی اور چونکہ وہی آپ کا بھی مشرب ہے اس لئے رسالت بھی اسی میں آگئی یعنی ہمارا مشرب توحید رسالت دونوں ہی ہیں اور یہی دونوں اصل ہیں جب ان دونوں کو چھوڑ دوگے تو دین بس نام ہی نام کو رہ جائیگا جیسا کہ اس وقت دیکھ رہا ہوں کہ شریعت موجود اور پھر اختلافات موجود آخر یہ اختلاف آیا کہاں سے ہے؟ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ قوم اپنے مشرب سے ہٹی ہوئی ہے اور جب سب کا ایک گھاٹ نہیں رہے گا تو اختلاف دھرا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝

یعنی بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جُدا جُدا کر دیا اور گروہ گروہ بنگئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ بس ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔ پھر ان کو ان کا کیا ہوا جتلا دیں گے۔

جب ساری امت محمدی المشرب ہے تو سب کو ایک ہی گھاٹ سے پینا چاہیئے جب مختلف مشارب ہوں گے تو اس کا لازمی نتیجہ اختلاف ہے۔ یہ کہہ رہا ہوں کہ حضورؐ نے تو ایک مشرب بنایا بنایا ہے لیکن تم اسپر آنا نہیں چاہتے ہو اس لئے کہ یہ مشکل ہے۔ کیونکہ اس کے لئے بڑی طلب کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ سمجھ کی ضرورت ہے اور سب سے بڑھ کر مرشد کامل کے رہبری کی ضرورت ہے۔ بات تو صاف ہے مگر چونکہ روش بدل گئی ہے اسلئے سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ جب کام بگڑ جاتا ہے اور مختلف طریقے ہو جاتے ہیں اور قوم اپنے مرکز سے دور ہو چکی ہوتی ہے تو پھر سب کو ایک مرکز پر لانا دشوار ہو جاتا ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی تائید شامل حال نہ ہو اس وقت تک سب کو ایک مرکز پر جمع کرنا بڑا مشکل ہے۔ یہ کام نہ تو عقل سے ہو سکتا ہے نہ فہم اور ظاہری تدبیر سے۔ دنیا میں محض اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور توفیق ہی سے راستہ ملتا ہے ورنہ جب تک اللہ تعالیٰ کی ہدایت نہ ہو اور توفیق شامل حال نہ ہو تو طغیان میں بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَفِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ یعنی وہ لوگ

اپنے طغیان میں بھٹکتے ہی رہتے ہیں اسلئے اللہ تعالیٰ ہی سے ہدایت اور توفیق بھی طلب کرنا چاہیئے اور صحیح راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔

اب میں تلاوت سے متعلق کلام شروع کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتَابِ۔ اس آیت میں حضورؐ کو ارشاد ہو رہا ہے کہ آپ اس کتاب کی تلاوت کیجئے جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے۔ اُتْلُ یہ امر کا صیغہ ہے اور اس سے خطاب حضور کو کیا جا رہا ہے اور اس کے مخاطب اولیٰ تو آپ ہی ہیں لیکن بالواسطہ تمام امت کو خطاب ہے اس لئے سب کے لئے تلاوت کلام اللہ مامور بہا ہوئی اور اس کا امر اسلئے کیا گیا ہے کہ اس سے تقرب الی اللہ ہوتا ہے بلکہ سب سے بڑا ذریعہ قرب خداوندی کا تلاوت ہی ہے۔ چنانچہ قاضی بیضاوی کی عبارت تقرباً الی اللہ تعالیٰ بقرأته وتحفظا لالفاظه واستکشافاً لمعانیه کی توضیح و تشریح آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں آج اس پر مزید کلام کرتا ہوں سنیئے۔

ملفوظات حضرت خواجہ فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ میں ہے :-

"فرمایا کہ جو مرید اور پیر موافق کتاب و سنت نہ ہو وہ پیر بھی رہزن اور مرید بھی۔ اور کوئی ذکر کلام اللہ سے بڑھ کر نہیں۔ مناسب ہے کہ اس کی تلاوت کیا کرے کہ اس کا نتیجہ سب طاعتوں سے بڑھ کر ہے۔"

یہ اس لئے فرمایا کہ قرآن میں سب چیزوں کا ذکر ہے جنت کا بھی ذکر ہے اور دوزخ کا بھی اور قرب و رضا کا بھی۔ اور قراءۃ قرآن سے خدا کے ساتھ مناسبت بڑھتی جاتی ہے۔ آپ نے تقرب کا لفظ بہت سنا ہوگا میں کئی روز سے اسی کی تشریح کر رہا ہوں اور اس کا مطلب بیان کر رہا ہوں اور اسکا حاصل اللہ تعالیٰ سے نسبت اور ان کی معیت ہے۔ حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ یعنی جو میرا ذکر کرتا ہے میں اس کا جلیس ہوتا ہوں اور فرماتے ہیں کہ اَنَا مَعَهٗ اِذَا ذَکَرَنِیْ یعنی میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے۔ آپ لوگوں میں بہت سے لوگ حافظ بھی ہیں ان سے خصوصیت سے کہتا ہوں کہ حفظ تو تم نے کرلیا لیکن اللہ تعالیٰ سے مناسبت کب پیدا کروگے؟ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے تعلق کے لئے نماز اتاری ہے اسی طرح قرآن بھی اتارا ہے اسلئے اب اس سے بہتر چیز اپنے تک پہونچانے کے لئے اور کونسی گوارا فرمائیں گے۔ یا آپ کے اعتقاد کے لئے کیسے جائز رکھیں گے کہ آپ کسی دوسرے چیز کو اس سے بڑھ کر تقرب کا ذریعہ سمجھیں۔ یہیں سے گمراہی آئی ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کے قرب میں سب سے زیادہ دخل رکھتی ہے اسی میں قرب کا اعتقاد نہیں رہا۔ اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہی کہنے کے لئے میں الٰہ آباد سے آپ کے پاس آگیا ہوں۔ اور اس مضمون

کو وہاں بھی بہت شد و مد سے برابر بیان کرتا رہا ہوں۔

چنانچہ ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ جب سے آپ نے اس چیز کی طرف توجہ دلائی میں نے سب چھوڑ دیا اور اب صرف قرآن شریف ہی کو لے لیا ہے اور لوگوں سے اسی کی بحث کرتا ہوں اور یہ بھی کہا کہ اگر آج سب علماء ملکر یہی کرنے لگیں تو ہندوستان میں اجالا ہو جائے۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کا بھلا کرے ورنہ ہم تو بالکل جان توڑ رہے ہیں کوئی پوچھتا ہی نہیں اور یہ جو ہمارے پاس اتنی اتنی کثیر تعداد میں لوگ آتے ہیں اس آنے کو ہم خاطر میں نہیں لاتے۔ اسلئے کہ صرف آنے جانے سے کیا ہوتا ہے۔ مگر یہ آنا جانا ختم بھی نہیں ہو سکتا چنانچہ اس کے متعلق آپ سے کہہ چکے ہیں کہ دین کی حقیقت اور اصل دین تو بہت دن ہوئے مٹ چکی اور یہ لوگوں کا آنا جانا یہ ظاہری صورت ہے دین کی اسکو آپ مٹا نہیں سکتے۔ اگر آپ چاہیں کہ صورت دین کو بھی ختم کردیں تو یہ نہیں ہو سکتا۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ یعنی اگر تم لوگ تولّی اور اعراض کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم کو بدل دینگے لیکن یہ سلسلہ قیامت تک باقی رہے گا اور جو لوگ اس کے برعکس کہتے ہیں ان کا خیال غلط ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف ہے۔ یہ گاڑی ابتک علماء چلاتے آئے ہیں اب تم اس کے خلاف کرنا چاہو گے تو اُدھر سے پکڑ ہو جائیگی۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ زبردست سلسلہ ہے اللہ و رسولؐ کی طرف سے اسکی نصرت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ عُلَمَاءُ امتی کانبیاء بنی اسرائیل یعنی جس طرح بنی اسرائیل میں انبیاء کا سلسلہ قائم رہا اسی طرح میری امت کے علماء برابر اس کام کو انجام دیتے رہیں گے۔

اور فرماتے ہیں :-

لَایَزَالُ طَائِفَۃٌ مِّنْ اُمَّتِیْ مَنْصُوْرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ ۔ یعنی ہمیشہ ہماری امت کی ایک جماعت حق پر قائم رہے گی اور ان کی منجانب اللہ نصرت ہوتی رہے گی۔ لوگوں کا ان کی نصرت چھوڑ دینا اور ان کی مخالفت کرنا ان کو کچھ نقصان نہیں پہونچا سکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سلسلہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ اب جو لوگ ان کے خلاف ادھر اُدھر کی باتیں کہتے ہیں وہ خود اپنے پیروں میں کلہاڑی مارتے ہیں۔ اور اللہ و رسول کی مرضی کے خلاف یہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے جب اپنی کتاب اتاری ہے تو اس سے بہتر اور اس سے بڑھ کر کون سی چیز موصل الی اللہ ہو سکتی ہے۔ معانی اور مطالب کا سمجھنا علماء کے ذمہ ہے اور ایک جماعت ایسی بھی

ہونی ضروری ہے جو قرآن کے معانی کا علم رکھتی ہو۔ کیونکہ یہ فرض کفایہ ہے۔ اگر ساری امت اسکو چھوڑ دیگی توسب گنہگار ہوں گے۔ لیکن تلاوت کا تو ہر شخص مکلف ہے اور اس کی فضیلت احادیث میں بکثرت وارد ہے اور ترک تلاوت پر وعید شدید آئی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص قرآن کی کوئی آیت دیا گیا اور اسکو اس نے بھلا دیا تو قیامت میں وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اجزم حاضر ہوگا یعنی اس کے چہرے سے گوشت کٹ کٹ کر گر جائیگا۔

دیکھئے اس میں قرآن کے بھلا دینے پر کس قدر وعید آئی ہے۔

یوں تو ذکر کی فضیلت بھی احادیث میں آئی ہے اور بزرگوں نے بھی ذکر کیا ہے۔ مگر میں یہ کہہ رہا ہوں کہ قرآن کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ٥ اس میں ذکر سے مراد قرآن ہی ہے۔ تو اب آپ کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کم ہے۔ یا موصل الی اللہ نہیں ہے۔ یہ کیسی گمراہی کی بات ہے کہ قرآن تو اسی کے لئے نازل ہوا ہے اور اس کے بارے میں آدمی یہ سمجھے کہ وصول الی اللہ کا ذریعہ نہیں ہے اور کوئی اس کو پڑھے گا تو پاوے گا نہیں۔ اس سلسلے میں قاضی بیضاوی کا کلام نقل کر چکا ہوں۔ انھوں نے خوب بات فرمائی اور میں نے اس کی شرح بھی آپ کے سامنے کی ہے اور انھوں نے جو یہ فرمایا کہ تَقَرُّبًا اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى بِقِرَاءَتِهٖ یعنی تلاوت قرآن سے مقصد اولی اللہ کا تقرب حاصل کرنا ہے۔

آپ کو سمجھانے کے لئے اسی بات کو میں ان لفظوں میں کہتا ہوں کہ قرآن موصل الی اللہ ہے یعنی اس کی قرات بندے کو اللہ تعالیٰ تک پہنچاتی ہے۔ اب اگر آپ یہ کہیں کہ ہم کو تو نہیں پہنچاتی تو ہم کہیں گے کہ آپ کو نہ سہی لیکن بہت سے لوگوں کو پہنچاتی ہے۔ جس طرح آپ کو ولایت کے درجات عالیہ حاصل نہیں ہیں لیکن ایمان کی وجہ سے ہم کہیں گے اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی اللہ مومنین کا ولی ہے اس سے معلوم ہوا۔ کہ ہر مومن اللہ کا ولی ہوتا ہے تو گو نفس ولایت آپ کو بھی حاصل ہے لیکن ولایت کے اور بہت سے درجات ہیں جو آپ کو منکشف نہیں ہوئے مگر اس منکشف نہ ہونے کی وجہ سے آپ ان درجات کا انکار نہیں کر سکتے اسلئے کہ بہت سے لوگوں کو منکشف ہوئے ہیں اور ان مراتب علیا پر وہ حضرات فائز ہوئے ہیں اسی طرح اس بات کو بھی سمجھئے کہ بہت سے لوگوں پر یہ بھی منکشف ہوا ہے کہ تلاوت کلام اللہ سب سے بڑھ کر موصل الی اللہ ہے۔ ان کو اپنے وجدان سے محسوس ہوتا ہے کہ جب وہ تلاوت کرتے ہیں تو ان کی روح اور وجدان دوسرے ہی قسم کا ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس میں مست ہو جاتے ہیں اور وہ خود بھی دوسرے ہی طرح کے ہو جاتے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرات صحابہؓ جب نماز پڑھ کر آتے تھے تو ان کا چہرہ ایسا بدل جاتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ دوسرے قسم کے ہو گئے ہیں یعنی ان کے چہروں سے ایسے آثار نمایاں ہوتے تھے کہ دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ یہ اس وقت اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرکے آرہے ہیں۔

سبحان اللہ کیا شان تھی ان حضرات کی اور کیسا اثر تھا ان کے نماز کا اور کیسے کچھ ہوتے تھے ان کے احوال۔

اسی طرح حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنت میں ایک دن ایسا ہوگا کہ اہل جنت پر اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص تجلی ہوگی۔ جس سے ان کے چہرے بدل جائیں گے۔ جب وہ اپنے محلوں میں واپس آئیں گے تو حوریں ان کو دیکھ کر کہیں گی کہ ہم تمہارا چہرہ بدلا ہوا پاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ تم وہ نہیں ہو تو وہ لوگ جواب دینگے کہ نہیں ہم تو تمہارے ہی ہیں اور ہم پر اللہ تعالیٰ کی تجلی ہوئی ہے جس کے اثر سے تم بدلا ہوا دیکھتی ہو۔

پس جس طرح نماز سے قرب ہوتا ہے اور اس کے آثار نمازی کے چہرے سے نمایاں ہوتے ہیں اسی طرح تلاوت سے بھی قرب ہوتا ہے اور تالی اسکو وجداناً محسوس کرتا ہے اور اس کے چہرے سے بھی کچھ دوسرے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ لیکن اب آپ یہ سمجھتے ہیں کہ نماز و تلاوت وغیرہ سے ولایت نہیں ملتی بلکہ جو کپڑا تک اتارے پھرتے ہیں اور بالکل ننگے ہو جاتے ہیں ان میں ولایت اور بزرگی یقیناً جانتے ہیں۔ اب ہم اسکو کیا کہیں آپ کو تو کچھ کہتے نہیں لیکن اپنا سر البتہ پیٹ لیں گے کہ ایسا وقت آگیا کہ صحیح بات سمجھانا مشکل ہو گیا ہے۔

اس سر پیٹنے پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک عالم نے کسی جگہ مسئلہ بتایا اور وہ عالم وہاں پر مسلّم تھے۔ لوگ ان کے مسئلے کو مانتے نہیں تھے۔ بس وہ بیچارے دونوں ہاتھوں سے اپنے رخساروں کو پیٹتے تھے۔ یہ سوچکر کہ میں ہی تو یہاں کا مولوی ہوں اور ان کو حکم شرعی بتلا رہا ہوں مگر مانتے نہیں چاند کا شرعی ثبوت ہو چکا تھا۔ مگر وہ لوگ اس لئے اختلاف کرتے تھے اور اس کو مانتے نہیں تھے کہ درزی اور دھوبی نے کپڑے نہیں دیئے تھے تو عید کیسے ہوتی۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

ایک آدمی تو دلیل شرعی سے کہہ رہا ہے اور دوسرا آدمی محض کپڑا نہ تیار ہونے کی وجہ سے اسکو نہیں مانتا اور یہ کہتا ہے کہ بغیر کپڑے کے ہماری عید کیسے ہوگی؟ ایک درزی نے اس کا خوب ہی جواب دیا کہ آپ کی عید تو ہو جائیگی لیکن آپ کے کپڑے کی عید نہیں ہوگی اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ جو کپڑا پہنے ہوئے ہیں باوجودیکہ وہ پرانا ہے مگر بقدر ضرورت ستر پوشی کے لئے کافی ہے۔ اسلئے اس سے نماز تو ہو ہی جائیگی۔

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ آپ جو سمجھے ہوئے ہیں کہ قرآن موصل الی اللہ نہیں ہے یہ غلط خیال ہے اور بزرگوں سے جو سلسلہ چلا آرہا ہے اس کے خلاف ہے۔

اور علامہ بیضاوی رحؒ نے جو تَحَفُّظاً لِّاَلْفَاظِہٖ کہا ہے۔ یعنی تلاوت قرآن کے مامور بہا ہونیکی دوسری وجہ اس کے الفاظ کی حفاظت ہے۔ میں نے اس کو اور واضح کیا کہ تَحْصِیْلاً لِّحَلَاوَتِہٖ یعنی قرآن کے جو الفاظ ہیں تلاوت کے ذریعہ ان کا تحفظ تو ہوتا ہی ہے لیکن بار بار پڑھنے سے ایک خاص حلاوت ملتی ہے۔ جس طرح سماع وغیرہ میں کسی شعر کو جو بار بار پڑھا جاتا ہے تو اسی لئے کہ اس میں کوئی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے شاعر ایک شعر کو بار بار تکرار کرتا ہے۔ حتّٰی کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ایک شعر آدھ آدھ گھنٹہ تک پڑھتا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح قاری قرآن جو تلاوت کرتا ہے تو بار بار کرنے سے اسکو ایسی کیفیت اور حلاوت اور خاص قسم کی مٹھاس حاصل ہوتی ہے یہانتک کہ ہوتے ہوتے اس سے محبت کامل ہوجاتی ہے۔ کل تو یہ کہہ رہا تھا کہ تلاوت ذریعہ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ سے محبت کا اور جب عشق سنا تا ہے تو اہل محبت کو اسی سے تسلی ہوتی ہے۔ لیکن آج یہ کہہ رہا ہوں کہ تلاوت کرنے سے خود اسی سے عشق ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عشق تو جب وہاں جائے گا تب ہوگا۔ وہ اُس دار کی چیز ہے۔ اور یہاں دار دنیا میں قرآن ہی سے عشق ہوجاتا ہے اور اس درجہ عشق ہوجاتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے بھی اس سے جدائی کسی طرح گوارا نہیں۔ اور بالکل وہ کیفیت ہوجاتی ہے جیسے مچھلی پانی سے باہر خشکی پر آجائے تو لوٹنے لگتی ہے۔ اسی طرح قرآن شریف کی تلاوت سے اگر کچھ بھی حصہ ملا ہے تو وہ چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ مگر افسوس اس بات پر ہے کہ آپ لوگوں میں بہت سے قاری بھی ہیں اور امام بھی۔ تلاوت بھی کرتے ہیں لیکن ابھی یہ درجہ تلاوت کا حاصل نہیں ہوا۔ قرآن شریف سے عشق و محبت عین خدا سے عشق ہے۔ قرآن شریف سے مناسبت اور وصول ہوتا جاتا ہے تو حلاوت بڑھتی جاتی ہے اور پھر اس حلاوت کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ قاضی بیضاویؒ نے جو کچھ فرمایا ان کے الفاظ بھی صحیح ہیں۔ مگر میں دوسری بات کہہ رہا ہوں یعنی یہ کہ الفاظ میں مٹھاس ہوتی ہے اور لذت ہوتی ہے اور کلام اللہ کے تکرار سے وہ لذت برابر بڑھتی جاتی ہے حتّٰی کہ دنیا کی کوئی لذت اور مٹھاس طلب میں باقی نہیں جاتی۔ قرآن کے نزول سے مقصد ذاتی اور غرض اصلی بھی ہے۔ پھر علماء مشائخ کیلئے انکشاف معانی بھی ہوتا ہے اور اس کا ذریعہ بھی تلاوت ہی ہے یعنی وہ تلاوت کرتے جاتے ہیں اور معانی ان پر منکشف ہوتے جاتے ہیں انکی کتاب یہی ہے وہ اسی میں غرق رہتے ہیں اور وہ اپنی کتاب اسکو کیوں نہ بناویں جبکہ یہ مکتوب رب العالمین ہے اور اس کی طرف اعتناء عین حق تعالیٰ کی طرف اعتناء ہے اور اس کے ساتھ شغف عین حق تعالیٰ کے ساتھ مشغولی ہے۔ اسی طرح اس سے اعراض و بے اعتنائی حق تعالیٰ کو کسی طرح بھی گوارا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی ہے۔

"چنانچہ توریت میں وارد ہے کہ (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) اے میرے بندو! کیا تم مجھ سے شرم نہیں کرتے کہ جب تمہارے کسی بھائی کا کوئی خط تمہیں راستہ چلتے ہوئے ملتا ہے تو تم راستہ سے کنارے ہو جاتے ہو اور اس کے لئے بیٹھ جاتے ہو اور اس کے ایک ایک حرف کو غور سے پڑھتے ہو کہ کہیں کوئی چیز تمہارے پڑھنے سے چھوٹ نہ جائے۔ اور یہ میری کتاب ہے جسکو میں نے تم پر نازل کیا ہے۔ دیکھو کس قدر میں نے اس میں تفصیل اور توضیح کی ہے۔ اور کتنا تمہارے لئے تکرار کیا ہے تاکہ تم اس کے طول وعرض میں تأمل کرو۔ لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ تم اس سے اعراض کرتے ہو کیا میں تمہارے ایک بھائی سے بھی کمتر ہوں

اور فرماتے ہیں کہ اے میرے بندو! تمہارا کوئی بھائی جب تمہارے پاس بیٹھا رہتا ہے تو تم کامل طور پر اسکی طرف متوجہ رہتے ہو اور اس کی گفتگو کی طرف ہمہ تن گوش بنجاتے ہو۔ اگر کوئی درمیان میں بولنے لگتا ہے یا کوئی شاغل تمکو اس کے کلام سے روکتا ہے تو تم اشارہ سے کہتے ہو کہ ٹھہرو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ میں تو تمہاری جانب متوجہ ہوں اور تم سے ہم کلام ہوں اور تمہارا قلب مجھ سے اعراض کر رہا ہے۔ کیا تم نے مجھ کو اپنے ادنیٰ بھائی سے بھی کمتر سمجھ لیا ہے"

(احیاء العلوم)

دیکھا آپ نے اللہ رب العالمین اپنے بندوں سے یہ فرما رہے ہیں کہ ہماری کتاب کیساتھ ایسی بے اعتنائی اور بے وقعتی کا برتاؤ کرتے ہو؟ گویا اسکی تمہارے نزدیک کوئی وقعت وعظمت ہی نہیں اس سے کہیں زیادہ تم اپنے دوست و احباب کے خطوط کی جانب توجہ کرتے ہو۔ اور اس میں غور وخوض کرتے ہو کہ کوئی حرف بلا پڑھے اور بغیر سمجھے نہ رہ جائے۔ کیا میں تمہارے دوست سے بھی کمتر ہوں؟ اور میرا کلام تمہارے دوست کے مکتوب سے بھی بے وقعت ہے؟

یہ کلام کس قدر غیرت دلانے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ مومن کا دل تو یہ سنکر موم ہی ہو جانا چاہئے اور قرآن کی طرف کامل توجہ اور اعتنا ہونا چاہئے اور کسی کلام کو اس پر فوقیت نہ دینا چاہئے۔ اگر اب بھی یہ بود ہی رہے تو یہ مومن مخلص کی شان سے نہایت بعید امر ہے۔

الغرض اللہ کے کچھ خاص بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جنکو سب سے زیادہ شغف خدا ہی کے کلام سے ہوتا ہے حتیٰ کہ قرآن ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتا ہے پھر انکو کیسی کچھ لذت و حلاوت ملتی ہے اسکو وہی جانتے ہیں دوسرا کوئی اسکا صحیح اندازہ بھی نہیں کرسکتا۔ اور بعضے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں بلکہ ترقی کرکے کہا جاسکتا ہے کہ اب تو زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں کہ اگر پورا قرآن بھی پڑھ جائیں تو نہ خود ان پر اس تلاوت کا کوئی اثر ہوتا ہے اور نہ سننے والوں ہی پر ہوتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو صحابی حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کا اور پھر اسکے بعد کا حال

بیان فرماتے ہیں سنئے۔

"حضرت ابن عمر اور حضرت جندب رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے (کہ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا) کہ ہم نے ایک مدت اس حال میں گذاری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو قرآن سے پہلے ایمان ملتا تھا پھر کوئی سورۃ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی تھی تب وہ ایمان کے تقاضے سے اس سورۃ کے حلال وحرام کو معلوم کرتا تھا اور اسکے اوامر ونواہی کو معلوم کرتا تھا اور یہ بھی معلوم کرتا تھا کہ کہاں توقف کرنا مناسب ہے لیکن اب میں ایسے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جنکو ایمان تو ابھی نہیں ملا لیکن قرآن مل گیا چنانچہ ایک شخص سورۃ فاتحہ سے ختم قرآن تک پڑھ جاتا ہے مگر اسکو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ قرآن اسے کس بات کا حکم کر رہا ہے اور نہ یہ خبر ہوتی ہے کہ کہاں توقف کرنا چاہیے۔ بس قرآن کو ردی کھجوروں کی طرح بکھیرتا چلا جاتا ہے"

مطلب یہ کہ جسطرح ردی کھجور کو آدمی دیر تک منہ میں نہیں لئے رہتا اسلئے کہ اسمیں کوئی مزہ دمٹھاس نہیں پاتا اسی طرح قرآن سے ذرا لطف وحظ جسکے قلب کو نہیں ملا ہوتا ہے اور دل میں کچھ بھی تاثر نہیں ہتا وہ صرف زبان سے فرفر فر پڑھتا چلا جاتا ہے۔ ذرا بھی غور نہیں کرتا کہ کس کے کلام کی تلاوت کر رہا ہے اسلئے اسکی قرات نہایت پھیکی اور بے لطف معلوم ہوتی ہے۔ نہ تو خود اس کو کوئی حلاوت ملتی ہے اور نہ سامعین کو۔

ذرا اس پر غور فرمائیے کہ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت جندبؓ اپنا مشاہدہ بیان فرما رہے ہیں کہ ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں کہ شروع سے اخیر تک قرآن پڑھ جاتے ہیں اور اس کے احکام پر اصلا غور نہیں کرتے۔ اور یہ بھی فرما رہے ہیں کہ یہ لوگ ایمان سے پہلے ہی قرآن دیدیئے گئے ہیں۔ قرات کر رہے ہیں مگر ایمان ندارد۔ یہ کتنی بڑی بات فرمائی۔ حالانکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے بہت ہی قریب کا زمانہ تھا پھر بھی احوال میں اسقدر تفاوت ہوگیا تھا تو اب جبکہ زمانہ عہد نبوی سے بہت ہی دور ہو چکا ہے اس زمانہ کے لوگوں کا حال تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ میں اپنا زمانہ کے حالات کو دیکھ دیکھ کر کہتا تھا کہ اگرچہ یہ لوگ قرات وغیرہ کر رہے ہیں مگر ان کا ایمان ضعیف اور تصدیق نہایت کمزور معلوم ہوتی ہے ورنہ تلاوت ان کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتی ہے۔ جب ان پر کوئی اثر تلاوت کا نہیں ہوتا تو یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ضرور بالضرور ان لوگوں کی تلاوت نفاقی اور سرسری ہوتی ہے۔ اور اب تو حضرت ابن عمر وجندب رضی اللہ عنہما کے فرمانے سے اور تقویت ہوئی اور بات خوب سمجھ میں آئی لہذا اب تو علی الاعلان اس بات کو کہتا ہوں کہ تلاوت کرنیکے باوجود باطنی حالات جو نہیں بدل رہے ہیں اسکی اصل وجہ یہی ہے کہ تلاوت بالکل سرسری اور صرف لسانی یعنی زبان ہی سے کی جاتی ہے ورنہ اگر ایمانی تلاوت کیجائے تو ضرور قلب پر اثر ہوگا اور اس تلاوت کا دوسرا ہی رنگ ہوگا۔ یعنی اسمیں ایک لذت وحلاوت ہوگی اور روز بروز بڑھتی ہوئی معلوم ہوگی۔

ابھی تلاوت پر مزید کلام کروں گا اور جب بحث چھیڑی ہے تو پوری کروں گا جو کچھ کہا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالی اپنے کلام کی تلاوت اور تلاوت کی حلاوت نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

ذکر اللہ عزوجل

از افاضات

مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب
نور اللہ مرقدہ

ناشر
دفتر: معرفت حق - ۲۳ بخشی بازار - الہ آباد ۳

ذِکرُ اللّٰہ عزّ و جلّ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

امابعد ـــــ تلاوت قرآن شریف سے متعلق مفصل کلام کر چکا ہوں جو شائع بھی ہو گیا ہے اور الحمد للہ کہ خواص و عوام سبھی نے اُسے پسند کیا۔ چنانچہ بہت سے حضرات نے خود مجھ سے اور میرے بعض احباب سے تحریراً و تقریراً اسکا مفید ہونا بیان کیا۔ ابھی چند ہی روز ہوتے ہیں کہ ایک صاحب نے جن کا میں خود بھی بہت احترام کرتا ہوں نہایت جذبہ اور جوش کے ساتھ اپنے تاثرات کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا کہ میں بھی متاثر ہو گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ قرآن شریف کا مضمون بیان کر کے آپ نے اُمت پر احسان عظیم فرمایا۔ کچھ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ اس بددینی کے زمانہ میں لوگوں کو دین پر کس طرح لگایا جائے۔ حضرت والا نے راستہ نہایت صاف اور آسان فرما دیا۔ حضرت کے ارشاد فرمانے سے سمجھ میں آیا کہ آج ہماری تباہی کی اصل وجہ یہی ہے کہ ہم نے اپنا رشتہ کلام اللہ سے منقطع کر لیا ہے۔

غرض اس قدر کثرت سے لوگوں نے اس کی تائید و تحسین کی کہ مجھے بھی اتنی توقع نہ تھی۔ یہ تو سمجھتا تھا کہ آج ہماری خرابی کی وجہ کلام اللہ کا ترک اور حق تعالیٰ سے بے تعلقی ہے لیکن یہ بھی سمجھتا تھا کہ لوگ اس زمانہ میں دین سے اسقدر دور ہو گئے ہیں کہ اُن کو راہ پر لگانا مشکل کام ہے لیکن حالات و تجربات نے بتایا کہ مسلمان دین سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو جائے اللہ تعالیٰ سے اس کو صبر نہیں

ہوسکتا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اس کو صحیح طریق نہ معلوم ہو اس لئے اس کی طلب غلط جگہ صرف ہو رہی ہو لیکن کوئی شخص اگر صحیح راہ دکھلانے والا موجود ہو اور کتاب و سنت کو اُن کے سامنے تبدریج پیش کرے تو پھر بہت سے اللہ کے بندے اس زمانہ میں بھی اس کی دعوت پر لبیک کہنے والے نکل آئیں گے۔ تلاوت کلام اللہ کے مضمون کا جو تاثر لوگوں میں دیکھا اُس سے مجھے اسکا پورا اندازہ ہوگیا اس لئے جی چاہتا ہے کہ انہی مضامین کو مسلمانوں کے سامنے بار بار بیان کیا جائے اس لئے کہ یہ اللہ اور رسول کی باتیں ہیں جن میں خاصہ مشک کا سا ہے کہ جس قدر اس کو رگڑا جاتا ہے اتنی ہی اُس سے خوشبو پھوٹتی ہے۔ امام شافعیؒ نے تو امام ابوحنیفہؒ کے متعلق فرمایا تھا کہ ؎

اعد ذکر نعمانٍ لنا ان ذکرہٗ هو المسک ما کررتہ یتضوع

یعنی نعمان بن ثابت کا ذکر ہمارے سامنے بار بار کرو اسلئے کہ انکا ذکر مشک کے مانند ہے جتنا اس کو رگڑو گے اتنا ہی خوشبو دیگا۔

میں کہتا ہوں کہ کیا قرآن شریف کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ع

هو المسک ما کررتہ یتضوع

بیشک کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ایسی خوشبو ہے کہ جس سے بڑھ کر دوسری کوئی خوشبو نہیں۔ لہٰذا میں تو اب اسی پر آگیا ہوں کہ اس زمانہ میں سب سے ضروری کام جو مسلمانوں کے کرنے کا ہے وہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق استوار کریں اور اسکا سب سے بڑا ذریعہ تلاوت قرآن اور ذکر اللہ ہے۔ آج اگر ہم اسی کو لے کر اپنے کو درست کرلیں تو بہت جلد حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوسکتی ہے اور ہمیں فلاح دارین میسر آسکتی ہے اسلئے میں تو یہی کہتا ہوں کہ ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

میری نظر میں تو یہی مصلحت معلوم ہوتی ہے کہ احباب تمام لغویات کو چھوڑ کر یار کی جانب ہمہ تن متوجہ ہوجائیں۔ اسی خیال کے پیشِ نظر تلاوت کلام اللہ پر معتد بہ کلام

کر چکنے کے بعد اب ذکر اللہ کا مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یوں قرآن شریف بھی گو ذکر ہی کا فرد ہے لیکن حدیث شریف میں چونکہ فضائل قرآن کا باب الگ بیان کیا گیا ہے اور ذکر اللہ عزوجل کے عنوان سے علیحدہ باب قائم کیا گیا ہے اس لئے میں نے بھی دونوں کا بیان الگ ہی الگ مناسب سمجھا۔ اگرچہ ان دونوں میں شدت اتحاد کے سبب سے ایک کے بیان میں دوسرے کا ذکر آجانا ناگزیر ہے۔ چنانچہ تلاوت قرآن کے مضمون میں بھی ذکر اللہ سے متعلق کچھ باتیں آپ کی نظر سے گذری ہونگی اسی طرح سے یہاں مقصود بیان تو دیگر اذکار مسنونہ ہیں لیکن تلاوت قرآن پر بھی ضمناً کچھ کلام ہو جائیگا۔ چنانچہ سنئے۔

تلاوت قرآن کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُن کے ذکر کے کچھ اور طریقے بھی ہیں۔ اس وقت انھیں کو بیان کرنا چاہتا ہوں اور مقصود یہ ہے کہ آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عموم رسالت کی بنا پر اس شعبہ کی بھی تکمیل باتم وجہ فرمادی اور یہ کیسے نہ ہو بھی سکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہی جس مقصد کے لئے ہوئی ہو یعنی عبد کا معبود کے ساتھ ارتباط اور تعلق قائم کرنا اسی کے طرق کی تفصیلات آپ نہ بیان فرماتے اور اُسکو بعد والوں کے لئے چھوڑ جاتے تو سنئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو بھی نہایت آسان کرکے بیان فرمایا ہے اور آپ جب کسی چیز کو بیان فرمائیں گے تو سبحان اللہ وہ کیسا کچھ بیان ہوگا۔ آپ نے ایک ایک دُعا ایسی تعلیم فرمائی ہے کہ اُس کے ذریعہ گنہگار بندے کو اپنے خالق سے واصل ہی فرمادیا ہے۔

(شیطان کی ایک رہزنی کہ اُس نے اذکار مسنونہ سے لوگوں کو ہٹادیا *)

روایات اور اُن سے متعلق علماء کی تشریحات کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دین میں شیطان کی جہاں اور بہت سی رہزنیاں ہوئی ہیں انھی میں سے ایک بڑی رہزنی یہ بھی ہے کہ اُس نے سبز باغ دکھا کر ایک طرف تو اُمت کو تلاوت سے ہٹاکر اللہ تعالیٰ سے اسکا رشتہ منقطع کردیا اُسی طرح سے دوسری جانب اذکار مسنونہ سے پھیر کر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بے تعلق کر دیا۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ آج مشائخ کے تبلائے ہوئے وظیفوں پر تو لوگ جمے ہوئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد فرمائے ہوئے اوراد و وظائف کی جانب اصلا التفات نہیں ہے۔ اور صرف یہی نہیں کہ عملاً ہی اس کو ترک کئے ہوئے ہیں بلکہ اپنی بدعقیدگی، جہالت اور اغواءِ شیطانی کی وجہ سے یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ان دعاؤں میں کوئی تاثیر ہی نہیں ہے۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ آج اسی بدعقیدگی کی وجہ سے لوگ محروم ہیں اور یہ بات یونہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہی کام کرتا ہوں لوگوں کے حالات میرے سامنے ہیں برابر اس قسم کے مضمون کے خطوط آتے رہتے ہیں کہ وظیفہ پڑھا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا اب اس جہالت کا کیا علاج کہ لوگ جب اس درجہ بدفہم ہو جائیں اور یہ بھی نہ سمجھیں کہ کوئی بھی کام ہو دین کا یا دنیا کا اس کے لئے کچھ وقت درکار ہوتا ہے چنانچہ مشہور ہے کہ دوستو دل صاف ہونے کو زمانہ چاہئیے اور ہم تو نہیں دیکھتے کہ دنیا کا بھی کوئی کام دفعتاً ہو جاتا ہو۔ خود انسان ہی کو لیجئے کہ ایک وقت میں چھوٹا بچہ ہوتا ہے پھر کتنے دنوں میں جوان ہوتا ہے اور پہلے جاہل ہوتا ہے پھر کتنی مدت میں علم حاصل کرتا ہے۔ یہی حال ذکر کا بھی ہے کہ لسان سے قلب میں اترنے تک کچھ زمانہ لگتا ہی ہے۔ عجلت بازی سے تو کام نہیں چلا کرتا بلکہ ثمرات کے حصول میں تو عجلت کرنے کو مشائخ طریق نے وصول سے مانع قرار دیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دعا میں تقاضا اور عجلت کو پسند نہیں فرمایا۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔ یستجاب لاحدکم مالم یعجل۔ یعنی تم میں سے ہر شخص کی دعا قبول ہوتی ہے۔ بشرطیکہ وہ جلد بازی سے کام نہ لے۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ نے ہر زمانہ میں سالکین کو اس سے منع فرمایا ہے اور طرح طرح سے اُنکو تسلی دے کر طریق میں اُن کے انتظار کی کلفت کو اُن سے دور کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ ؎

دور ہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن
قرنہا باید کہ تا یک کودکے از لطف طبع عاقلے کامل شود یا فاضلے صاحب سخن

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

ماہ ہا باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میش
صوفیے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن

ہفتہا باید کہ تا یک پنبۂ از آب و گل
شاہدے را حلہ گردد یا شہیدے را کفن

روزہا باید کشیدن انتظار بے شمار
تاکہ در جوف صدف باراں شود درِ عدن

عہ صدق و اخلاص و درستی باید و عمرِ دراز
تا قرانِ حق شود صاحبقرانے در قرن

ان اشعار میں یہ مضمون ذہن نشین کرایا ہے کہ کوئی بھی کمال جو حاصل ہوتا ہے اُس میں دیر لگتی ہے اور اس کی کئی مثالیں بیان فرمائیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ دیکھو بہت زمانہ چاہیئے تب جاکر کوئی مردِ حق پیدا ہوتا ہے مثلاً خراسان میں حضرت بایزیدؒ پیدا ہوں یا قرن میں حضرت اویسؒ قرنی پیدا ہوں۔ اسی طرح سے عرصہ دراز چاہیئے۔ اس بات کے لئے کہ کوئی بچہ اپنی ذہانت کی بدولت عاقل کامل ہوجائے یا فاضل متکلم بن جائے۔ آگے فرماتے ہیں کہ سالہا سال کے بعد ایک اچھی ذات کا پتھر ملک بدخشاں میں لعل بنتا ہے اور سرزمین یمن میں عقیق بنتا ہے۔ اسی طرح مہینوں چاہیئے اس کام کے لئے کہ بھیڑ کی پشت کے ایک مشت اُون کے ذریعہ سی صوفی کی گدڑی تیار ہوسکے یا کسی گدھے کے لئے رسّی بٹی جاسکے۔ آگے کہتے ہیں کہ ہفتوں درکار ہیں اس امر کے لئے کہ پانی اور مٹی سے اُگا ہوا کپاس کا ایک رخت ذریعہ بن سکے کسی محبوب کے لباس کا یا کسی شہید کے کفن کا۔ اسی طرح بہت بہت دن درکار ہیں اور بے شمار انتظار چاہیئے تاکہ سیپیوں کے منہ میں بارش کا قطرہ پڑکر موتی بن سکے اور پھر وہ درِ عدن کہلائے

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ کبھی مقصود حاصل ہونے میں ہفتوں۔ مہینوں سالوں اور قرنوں لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ بارش کا کوئی خاص قطرہ سیپ کے منہ میں بہت دنوں رہنے کے بعد درِ عدن بنتا ہے اور شاہی تاج پر اس کو جگہ ملتی ہے۔ جب ایسا ہے تو پھر ذکر اللہ ہی کو آپ نے کھیل کیوں سمجھ رکھا ہے کہ زبان سے قلب میں اُتارنے کے لئے چند روز کی بھی پابندی شاق ہے اور یہ حکم اُس شخص کا ہے جو اذکار مسنونہ ادا کرتا ہو اور طریقہ سے کام کرتا ہو اور اگر ان امور کا

عہ یہ شعر بعد میں اضافہ ہوا ترجمہ یہ ہے۔ سچائی۔ اخلاص درستی اور ایک عمر دراز درکار ہے اس امر کے لئے کہ کسی زمانہ میں کوئی صاحبقرانِ حق تعالیٰ کا عارف کامل بن سکے۔

اہتمام نہ رکھا جائے تو پھر تو نتیجہ اور بھی بعید ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آج جو لوگوں کو نفع نہیں ہو رہا ہے تو اسکی وجہ یہی ہے کہ اذکار مسنونہ کی جانب لوگوں کی توجہ نہیں ہے اور غیر مسنونہ کو حرز جان بنائے ہوئے ہیں جیسا کہ صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں کہ

والعوام یترکونها ویتبعون مواظبة الاسماء الغریبة والدعوات العجیبة التی غالبها لااصل لها فی الکتاب والسنة۔

ترجمہ: اور عوام نے ان اوراد مسنونہ کو ترک کر کے ایسے ایسے اسماء غریبہ اور دعوات عجیبہ کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے دیا ہے جن کا کتاب و سنت میں کہیں بھی ثبوت نہیں ہے۔

غرض ذکر اللہ ہو یا تلاوت قرآن دونوں اپنی جگہ نافع اور مفید ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ انکو قاعدہ سے کیا جائے اور قاعدہ سے میری مراد یہاں یہی ہے کہ صحت الفاظ کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کا کلام اور خدا کا ذکر سمجھ کر ادا کیا جائے باقی نفع کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی ان کے معانی کو بھی سمجھتا ہو۔ مضمون تلاوت قرآن میں میں نے اسپر مفصل گفتگو کی ہے اور علماء محققین کے اقوال سے ثابت کیا ہے کہ تلاوت کا ثواب اور نفع فہم معنی پر موقوف نہیں۔ چنانچہ صاحب مرقات نے بھی ابن حجرؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے لفظ کا پڑھنا بھی تعبد ہے یعنی فہم معنی اور تدبر میں تو ثواب اور نفع ہے ہی لیکن قرآن شریف کے محض الفاظ کی تلاوت بھی ثواب سے خالی نہیں چنانچہ انکے الفاظ یہ ہیں:۔

قال ابن حجرؒ اما الثواب علی قراءته فهو حاصل لمن فهم ولمن لم یفهم بالکلیه للتعبد بلفظه بخلاف غیره من الاذکار فانه لایثاب علیه الا لمن فهم ولو بوجه ما۔

(مرقاۃ ص۲۱۵ ج ۲)

یعنی علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ تلاوت قرآن پر ثواب تو بہر حال ملیگا خواہ اُسکو

سمجھیں یا بالکل نہ سمجھیں اس لئے کہ اس کے الفاظ کی ادائیگی بھی عبادت ہے۔ بخلاف دیگر اذکار کے جو قرآن کے علاوہ ہیں کہ ان کے کہنے میں ثواب اُسی شخص کو ملتا ہے جو اُسے سمجھتا بھی ہو اگرچہ فی الجملہ سہی۔

میں کہتا ہوں کہ صاحب مرقاۃ نے صحیح فرمایا ہے۔ آپ خود خیال فرمائیے کہ شریعت میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں صرف ذکر لسانی ہی معتبر ہے یعنی محض قلبی ذکر کافی نہیں مثلاً نماز میں جو قرأت فرض ہے یا ذبح کے وقت جو اللہ اکبر کہنا ضروری ہے تو انکی ادائیگی اسی وقت صحیح ہوگی جب ان چیزوں کا زبان سے تلفظ کرے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص زبان سے تو کلمات نہ ادا کرے لیکن دل میں کامل اخلاص کے ساتھ انکا تصور رکھے تو یہ عند الشرع کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح سے طلاق۔ عتاق۔ نذر۔ یمین۔ نکاح اور بیع وشراء وغیرہ جتنے اُمور ہیں یہ سب زبان سے کلمات کہنے پر موقوف ہیں محض دل میں اور نیت میں ہونا انکی صحت کے لئے کافی نہیں ہے۔ بس اسی طرح سے تلاوت کو بھی سمجھئے کہ وہ زبان کا وظیفہ ہے اور شریعت میں اسکا حکم ہے اور اس پر ثواب کا وعدہ ہے۔ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص نے کلام اللہ سے ایک حرف پڑھا اس کو ایک نیکی ملتی ہے۔ اور ہر نیکی دس نیکیوں کے برابر ہوتی ہے اور میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے بس الم کہنے میں تیس نیکیاں ملیں گی۔ دیکھئے یہ نیکیاں الم کہنے پر ملیں حالانکہ وہ مقطعات میں سے ہے جس کے معنی بھی معلوم نہیں باقی ابن حجر نے ذکر میں اور تلاوت میں جو فرق کیا ہے کہ تلاوت بلا فہم بھی تعبد ہے اور ذکر میں فہم معنیٰ ضروری ہے تو اس کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ جس قدر اذکار مسنونہ احادیث میں وارد ہیں وہ یا لفظاً یا بمدلولاً تمہا قرآن شریف میں بھی موجود ہیں لہذا وہ بھی قرآن ہی ہوئے بس وجہ فرق کچھ سمجھ میں نہ آئی لہذا یہی کہنا مناسب ہوگا کہ ذکر میں بھی بلا فہم معنیٰ ثواب ملتا ہے۔ البتہ اتنا ضروری ہے کہ اسکے الفاظ صحیح ہوں غلط تلفظ کرکے اس میں تصحیف نہ

کردے کہ اس پر البتہ ثواب نہ ملیگا۔ اور عجب نہیں کہ سبب گناہ ہو جائے۔ چنانچہ ابن حجر کا قول نقل کر کے صاحب مرقاۃ بھی لکھتے ہیں کہ

وفیہ نظر لان نفی الثواب یحتاج علی نقل من حدیث او کتاب والقیاس ان لا فرق بینھا فی اصل الثواب وان کان یتفاوت بین القرآن وغیرہ وبین من فھم ومن لم یفھم وعلیہ عمل الصلحاء من جعل الادعیۃ والاذکار الواردۃ وغیرھا اوراداً ویواظبون علیھا وما حسن المسلمون فھو عند اللہ حسن وفضل اللہ واسعٌ

(مرقاۃ ص۲۱۵ ج ۲)

یعنی علامہ ابن حجرؒ کے اس فرق کرنے میں مجھے کلام ہے اس لئے کہ دعاؤں میں بدون فہم معنی کے ثواب کا نہ ملنا محتاج نقل ہے اس بارے میں کوئی حدیث یا کتاب اللہ کی آیت پیش کرنی چاہیئے باقی قیاس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نفس ثواب ہونے میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اگرچہ قرآن کی تلاوت کے ثواب اور غیر قرآن کے ثواب میں اسی طرح سے سمجھنے والے کے ثواب میں اور نہ سمجھنے والے کے ثواب میں تفاوت ہے چنانچہ اسی پر صلحائے امت کا عمل ہے کہ وہ ان ادعیہ اور اذکار کو جو وارد ہیں اسی طرح اور دوسری ادعیہ کو اپنا وظیفہ بناتے ہیں اور اس پر مواظبت کرتے ہیں اسی پر خلفاً عن سلف سب مسلمانوں کا عمل ہے اور جس کو سب مسلمان اچھا سمجھیں وہ عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی مستحسن ہے اور اللہ تعالیٰ کا فضل بہت وسیع ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح سے شیطان کی ایک رہزنی یہ تھی کہ اس نے ذکر و تلاوت میں حصول نفع کے باب میں جلد بازی کا خیال دلوں میں ڈالا اسی طرح سے یہ اسکی دوسری رہزنی ہے کہ اس نے فائدہ اور نفع کو فہم معنی پر موقوف بتا کر نہ معلوم کتنے اللہ کے بندوں کو حق تعالیٰ کے تعلق ہی سے محروم کردیا حالانکہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ دنیا میں بندوں کی ہدایت کے لیئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو چیز آئی ہے وہ قرآن ہے اور اس میں کسی عالم یا جاہل کی تخصیص نہیں ہے بلکہ سبھی کے لئے اس میں ہدایت کا سامان

موجود ہے۔ اب خیال فرمائیے کہ عالم تو فہم معنی کے ذریعہ اور تدبر فی القرآن کے واسطہ سے اس سے منتفع ہو جائے مگر عوام کے لئے کلام اللہ سے منتفع ہونے کے لئے بجز تلاوت کے اور کیا ذریعہ تھا ظاہر ہے کہ سارے انسانوں کا عالم ہو جانا اگر محال نہیں تو دشوار ضرور تھا اسلئے عوام بیچارے اُس کے فیض سے محروم ہی رہ جاتے لہذا اللہ تعالیٰ نے تلاوت مشروع فرمائی اور اسکو باعث ثواب اور سبب اجر قرار دیا۔ چنانچہ اسی کے ذریعہ سے لوگوں نے اپنے ایمان میں ترقی حاصل کی یعنی پہلے ایمان سبب تلاوت بنا اور پھر مزید تلاوت باعث ترقی ایمان بن گئی یہی وجہ ہے کہ مومن کو جو لطف کلام اللہ کی تلاوت میں آتا ہے وہ کسی دوسری چیز میں نہیں آتا اور یہ بالکل ظاہر ہے۔ حضرات صحابہؓ تابعین اور دیگر بزرگان دین کے حالات اس پر شاہد ہیں۔ خیر القرون کا تو کہنا ہی کیا کتابوں میں ماضی قریب کے ایک بزرگ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ کہیں سفر سے تشریف لا رہے تھے شام ہو گئی۔ کسی غیر مسلم دیہاتی کا چھپر نظر آیا اسکے اندر تشریف لے گئے دیکھا کہ کچھ گڑ وغیرہ بن رہا ہے اور ایک بڈھا شخص موجود ہے اُس سے کہا کہ مجھے دور جانا ہے دیر ہو گئی اجازت دو رات تمھارے یہاں بسر کرلیں اس نے کہا کہ نہایت خوشی سے اجازت ہے اور چھپر میں ایک جگہ سونے کے لئے بنا دی اور وضو وغیرہ کے لئے پانی رکھدیا وہ بزرگ آخر شب میں اُٹھے اور حسب معمول نماز میں تلاوتِ قرآن کرنا شروع کیا اور کچھ اس درد سے پڑھا کہ وہ غیر مسلم بڈھا سُن کر بلبلا اُٹھا رات تو جیسے تیسے گذاری صبح ہی اُٹھ کر اُن سے کہا کہ آپ رات جو پڑھ رہے تھے وہ مجھے بھی پڑھا دیجئے۔ انھوں نے کہا کہ بھائی میں تو قرآن شریف پڑھ رہا تھا تمہیں ایسے کیسے پڑھا دوں اس کے کچھ شرائط ہیں مگر بڈھے کا دل تو زخمی ہو چکا تھا۔ نہا دھو کر آیا اور فوراً اسلام قبول کر لیا اور اپنے سبھی گھر والوں کو مسلمان کرا دیا۔

سبحان اللہ کیسی تاثیر ہے کلام اللہ کی۔ آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہاں اس بڈھے کو کہاں فہم و تدبر حاصل تھا پھر اُس پر جو اثر پڑا تو الفاظ ہی کا تو پڑا اور وہ مولانا کی تلاوت ہی سے تو متاثر ہوا؟

پس قرآن شریف کی تلاوت ہو یا ذکر و اذکار ہوں فہم معنیٰ کی قید کو انکی برکات سے محرومی کے مرادف سمجھتا ہوں کیونکہ میں تو نہیں دیکھتا کہ فہم معنیٰ کی شرط لگانے کیوجہ سے قرآن کا فہم کچھ عام ہو گیا ہو بلکہ یہ دیکھ رہا ہوں کہ مشکل اور دشوار ہونے کی وجہ سے فہم کا حوصلہ تو لوگوں میں پیدا ہوا نہیں بلکہ تلاوت بلا فہم سے بھی لوگوں کو ہٹا دیا یعنی نہ تو تلاوت بفہم کی ہمت پیدا ہو سکی اور نہ تلاوت بلا فہم ہی کی وقعت قلب میں باقی رہ گئی نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں سے محروم ہو گئے۔ نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے۔ سنئے تلاوت مومن کی زبان سے ادا ہوتی ہے اس لئے زبان اس سے منور اور معطر ہوتی ہے اور کان اسکو سنتا ہے اس لئے وہ بھی منور اور معطر ہوتا ہے علیٰ ہذا ظاہری قراءت کا اثر تمام جوارح پر پڑتا ہے اور جوارح اس کے حسن و خوبی سے مزین اور آراستہ ہو جاتے ہیں اور ہر ہر عضو میں اسکا اثر ہو جاتا ہے اور قراءت جو جہر سے ہوتی ہے تو اسکا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے اور یہی قرأت قلب کی تعمیر کا بتدریج ذریعہ بنتی ہے یہ اسکا حسن ظاہری ہے اسی طرف یہ حدیث شریف مشیر ہے کہ اُس مومن کی مثال جو تلاوتِ قرآن کرتا ہو (اور اس پر عامل بھی ہو) نارنگی کی سی ہے جس کا حال یہ ہوتا ہے کہ باطنی لذت کے ساتھ ساتھ وہ حسن المنظر بھی ہوتی ہے اور خوشبو بھی اس کی نہایت ہی عمدہ اور پاکیزہ ہوتی ہے اس طور پر گویا اس کے اوصاف ثلثہ ہی اچھے ہوتے ہیں اور وہ مومن جو تلاوت نہیں کرتا (اگرچہ اس کے احکام پر عامل ہو) اس کی مثال تمرہ کی آئی ہے جس میں مزا تو ہوتا ہے یہ اُسکا ایمان ہے جو مزہ دار ہے مگر رنگ و بو کچھ بھی نہیں۔ ظاہر اسکا کچھ نہیں ہے نہ رنگ ہے نہ بو۔ صرف تلاوت نہ کرنے کی وجہ سے وہ شخص تلاوت والے سے درجہ میں کم ہو گیا کہ ترقی مومن کی تلاوت پر ہے اس سے تلاوت کا فضل معلوم ہوا اور یہی اس کی ظاہری اور باطنی تعمیر ہے کیونکہ فرمایا گیا ہے کہ

ان الذی لیس فی جوفہ شیٔ من القرآن کالبیت الخرب۔

چنانچہ صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں اور کیا خوب فرمایا ہے کہ

لان عمارة القلوب بالایمان وقراءة القرآن وزینة الباطن بالاعتقادات الحقه والتفکر فی نعماء اللہ تعالیٰ۔

(مرقات ص۵۹)

یعنی اس لئے کہ قلب کی آبادی کا ذریعہ ایمان اور تلاوتِ قرآن ہے اور باطن کی رونق اعتقادات حقہ اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں تفکر کرنا ہے۔

اور سب سے بڑا نفع تلاوت کا یہ ہوتا ہے کہ اس پر مداومت کرنے سے قلب میں ایک وجدان اور ذوق پیدا ہو جاتا ہے اور پھر وہ ذوق ہی سبب بن جاتا ہے قرآن فہمی کا۔ اور یوں بدون قلبی ذوق کے حصول کے گو لغوی اعتبار سے کوئی قرآن کو کچھ حل کرلے مگر مراد الٰہی اس کے لئے سربمہر اور اسکا حقیقی مفہوم اس پر بند ہی رہتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس راز کو آپ کے ایک شاعر نے سمجھ لیا جس کے سمجھنے سے بہت سے اہل علم بھی قاصر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ؎

تمہارے قلب پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

یوں تو اکبر الہ آبادی نے بھی قرآن کی عظمت کو نہایت ہی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہتے ہیں کہ ؎

صوم ہے ایمان سے ایمان رخصت صوم گم
قوم ہے قرآن سے قرآن رخصت قوم گم

لیکن اقبال مرحوم کا کلام اس سے کہیں بڑھ گیا چنانچہ قلب پر نزول کتاب کا مطلب نزول معانی کتاب ہے جو کہ منجانب اللہ بلاواسطہ کتب قلب پر وارد ہوتے ہیں۔ بلکہ کتاب وتفسیر بھی اسی کی وجہ سے سمجھ میں آتی ہے ورنہ تو نزول کتاب قلب مبارک حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا ہے۔ کسی دوسرے کے قلب پر اسکے نزول کا کیا مطلب؟ اسی کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اس سے یہی ذوق و وجدان مراد ہے جو قرآن کا مومن کے قلب میں ہوتا ہے اور ذریعہ بنتا ہے قرآن فہمی کا

جس کے متعلق میں کہہ رہا ہوں کہ اس کے حصول کا ذریعہ تلاوتِ کلام اللہ پر مداومت ہے۔

ایک صاحب کہتے تھے کہ ایک صاحب جو برکات تلاوت کے منکر تھے اُن سے میں نے کہا کہ تلاوت کا فائدہ تو اس سے ہی ظاہر ہے کہ حافظ کو کلام اللہ حفظ نہیں ہوتا جب تک کہ ایک ایک لفظ کو کئی کئی بار زبان سے نہیں کہہ لیتا اور جب بار بار زبان سے کہتا ہے تو پھر وہی لفظ اس کے ذہن و قلب میں منقش ہو جاتا ہے۔ اب اگر زبان و قلب میں باہم کوئی ربط اور تعلق نہیں ہے تو پھر زبان سے کہا ہوا قلب تک کیسے پہونچ جاتا ہے اور ذہن میں کیسے چھپ جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قلب تک کسی چیز کے پہونچانے کا ذریعہ زبان سے اس کا بار بار تکرار کرنا ہی ہے۔

میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ علامہ شعرانی نے طبقات کبریٰ میں امام احمد کا خواب نقل کیا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ آپ کے تقرب کا اقرب طرق کیا ہے۔ فرمایا کہ میرے کلام کی تلاوت۔ عرض کیا کہ سمجھ کر کے یا بغیر سمجھے؟ ارشاد فرمایا کہ سمجھ کر کے ہو یا بلا سمجھے۔ اس کی شرح کرتے ہوئے سید علی وسیرحی فرماتے ہیں کہ بفہم کا تو تعلق علماء شریعت سے ہے کہ یہی حضرات اسکے معانی و مطالب سمجھتے ہیں اور فہم کلام اللہ کے لئے اُن کے پاس کوئی ذریعہ علاوہ نظر و فکر کے نہیں ہے اور بغیر فہم کا تعلق علماء حقیقت سے ہے کیونکہ انکو فہم قرآن بواسطہ کشف اور تعریف الٰہی کے نصیب ہوتا ہے اس میں تفہم کی احتیاج ہی نہیں پڑتی، بلکہ یہ حضرات تو بوقت تلاوت فہم میں توجہ کو موجب خلل اور خلاف اخلاص سمجھتے ہیں چنانچہ دیکھئے نماز میں تلاوت ہی کا حکم ہے اگر کوئی شخص تدبر فی الآیات کرنے لگے تو عجب نہیں کہ بھول ہی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مرتبہ ایک عامی جاہل کی نماز درجہ میں ایک عالم فاضل کی نماز سے بڑھ جاتی ہے کیونکہ عامی تو اخلاص اور توجہ سے اس میں تلاوتِ قرآن کرتا ہے اور عالم کا علم اس کے لئے توجہ الی الحق سے حاجب اور مانع بن جاتا ہے۔

بہرحال تلاوت بفہم اور تدبر فی القرآن بھی مطلوب شرعی ہے خارج نماز میں اور تلاوت سے الگ۔ اس سے انکار نہیں ہے مگر نفس تلاوت کا بھی کوئی درجہ اور مقام ہے۔ اس وقت اسی کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ حضرات صحابہ کرام نے اسکا کس درجہ اعتنا کیا اور ان حضرات کو قرآن سے کسقدر شغف تھا اس پر انکے حالات شاہد ہیں۔ یہاں ترغیب کے لئے چند واقعات بیان کرتا ہوں۔

ا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے امر فرمایا ہے کہ میں تم کو قرآن سناؤں۔ یہ سن کر حضرت ابیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ سے میرا نام لے کر فرمایا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اور کیا اس پر پھر انھوں نے عرض کیا کہ کیا رب العالمین کے یہاں میرا تذکرہ ہوا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں جی۔ یہ سن کر حضرت ابی ابن کعبؓ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

یہ سن کے ہوئے جاری آنکھوں سے مری آنسو قسمت ہے محبت میں رونا جسے آجائے

شراح حدیث لکھتے ہیں کہ یہ رونا سرور... خوشی کی وجہ سے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قرأت قرآن کے سلسلہ میں تمام حضرات کے ہوتے ہوئے مجھے تجویز کیا یا یہ بھی وجہ ہوسکتی ہے کہ حق تعالیٰ کی اس قدر دانی کے شکر سے خود کو عاجز پاکر رو پڑے ہوں باقی ان کی تخصیص کیوجہ یہ تھی کہ انھوں نے حفظ قرآن میں بڑی ہی مشقت اٹھائی تھی جس کا صلا آخرت میں تو جو ملیگا وہ ملیگا ہی دنیا میں بھی یہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے انکا نام ذکر فرمایا۔ سچ ہے ؎

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے جو اُس محفل میں ہے

۲۔ حدیث شریف میں ہے کہ زَیِّنُوا الْقُرْآنَ بِاَصْوَاتِکُمْ علماء نے اسکا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ قرآن کو ترتیل۔ تجوید اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرو اور ظاہر ہے کہ یہ سب اُمور الفاظ قرآن سے متعلق ہیں چنانچہ بعض روایات میں آتا ہے کہ اَلصَّوْتُ الْحَسَنُ یَزِیْدُ الْقُرْآنَ حُسْناً یعنی حسن صوت قرآن کے حُسن کو دوبالا کردیتا ہے۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ لِکُلِّ شَیْءٍ حِلْیَۃٌ وَحِلْیَۃُ الْقُرْآنِ

اَلصَّوْتُ الْحَسَنُ۔ یعنی ہر شے کا ایک زیور ہوتا ہے اور قرآن کا زیور حُسنِ صوت ہے۔ غرض حُسنِ صوت اور تلاوت قرآن میں کچھ ایسا تعلق ہے کہ جس طرح صوت حسن کو قرآن کا زیور کہا گیا ہے اسی طرح سے روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ حسن صوت والے کے لئے قرآن کا پڑھنا ہی زیب دیتا ہے یعنی تلاوت قرآن سے بڑھ کر حسن صوت کا کوئی دوسرا مصرف نہیں۔ اس موقعہ پر صاحب مرقات نے حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب غنیۃ الطالبین سے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ ایک دن کوفہ میں کسی جانب تشریف لیجا رہے تھے کہ ایک شخص کے مکان میں فساق کا مجمع تھا۔ شراب و کباب کی محفل گرم تھی اور ایک گانے والا شخص زاذان نامی لکڑی کے باجہ پر نہایت خوش الحانی سے گا رہا تھا۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ نے جب اس کی آواز سنی تو فرمایا کہ کیا ہی عمدہ یہ آواز ہے کاش کہ یہ تلاوتِ قرآن میں صرف ہوتی۔ یہ کہہ کر اپنی چادر کو اپنے سر پر رکھا اور وہاں سے گذر گئے۔ انکی آواز زاذان نے بھی سُن لی۔ اپنے مصاحبین سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں لوگوں نے کہا کہ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی۔ پوچھا کیا فرما رہے تھے؟ لوگوں نے کہا کہ تمھارے متعلق کہہ رہے ہیں کہ کس قدر اچھی آواز ہے کاش کہ یہ تلاوتِ قرآن میں صرف ہوتی تو اسکا حسن اور دوبالا ہو جاتا۔ اس بات کے سننے سے زاذان کے قلب میں ایک دھکا سا لگا اور حق کی ہیبت اسکے دلمیں بیٹھ گئی۔ فوراً مجلس سے اُٹھا لکڑی کے باجہ کو توزمین پر ٹپک کر توڑ دیا اور لپک کر عبد اللہ ابن مسعود کے قریب پہونچا۔ اپنا رومال گلے میں ڈالکر انکے سامنے رونے لگا۔ عبد اللہ ابن مسعود نے بھی اسکو گلے سے لگالیا اور پھر دونوں مل کر خوب روئے۔ عبد اللہ ابن مسعود نے فرمایا کہ بھلا میں ایسے شخص سے کیوں نہ محبت کروں جو اللہ سے محبت کرتا ہے۔ پھر اُس نے اُن کے ہاتھ پر گانے بجانے سے توبہ کی اور ان ہی کی خدمت میں رہنے لگا۔ اُن سے قرآن سیکھا اور علم دین حاصل کیا اور اس میں ماہر ہوکر امام وقت ہوگیا۔ (سبحان اللہ! عجیب واقعہ ہے۔ ایمان تازہ کردینے والا۔ اس زمانہ کے اہل فسق کے ایمان کا یہ حال تھا اللہ تعالے اس جیسے ایمان سے ہمیں بھی حصہ عطا فرمادے۔)

۳۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰؓ سے فرمایا کہ اجی تم تو گویا آلِ داؤد کے مزامیر میں سے ایک مزمار دیے گئے ہو یعنی تمھاری آواز نہایت عمدہ اور لہجہ بہت ہی دلکش ہے۔ ایک دفعہ اُن سے فرمایا کہ میں شب گذشتہ تمھارا قرآن پڑھنا سن رہا تھا۔ تمہیں بھی کچھ خبر ہوئی حضرت ابوموسیٰ نے عرض کیا کہ نہیں یارسول اللہ اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ سن رہے ہیں تو اور اچھی طرح سے پڑھتا۔

دیکھئے قرآن کی زینت جس صوت حسن سے ہوتی ہے اور جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزمار آلِ داؤد فرمایا ہے اس کا تعلق نہ تو فہم معنیٰ سے ہے اور نہ تدبر فی القرآن سے بلکہ صرف تلاوت اور قراءت سے ہے پھر جب اسکی تحسین مطلوب ہے تو پھر تلاوت ایک امر لغو کیسے ہو سکتی ہے بلکہ حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح خود تلاوت کرنا مطلوب ہے اسی طرح سے دوسروں کی تلاوت کا استماع بھی امر مستحسن ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ کی قراءت کی جانب کان لگایا اور اس لئے لگایا کہ اس کی جانب خود حق تعالیٰ کان لگاتے ہیں جیساکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:۔

للہ اشد اذناً الی اقبالاً الی الرجل الحسن الصوت بالقراءۃ من اصحاب القینۃ الی قینتھم (ابن ماجہ)

یعنی اللہ تعالیٰ اُس شخص کی جانب جو عمدہ آواز کے ساتھ قرآن کی تلاوت کر رہا ہو اس سے زیادہ توجہ فرماتے ہیں جتنی کہ کوئی شخص اپنے گانے والی کسی باندی کی جانب توجہ کرتا ہے۔

سبحان اللہ کس قدر مبارک ہیں وہ لوگ جن کی قراءت اور تلاوت کی جانب اللہ تعالیٰ کان لگا دیں پس جس کی ایک تلاوت بھی مقبول ہوگئی وہ کامیاب ہی ہوگیا۔

(راقم عرض کرتا ہے کہ اسی کے مناسب حضرت ذوالنون مصری کا ایک واقعہ الروض الفائق میں دیکھا جس کو پیش کرتا ہوں اور اُمید کہ ناظرین اس سے محظوظ ہوں گے وھو ھذا؛

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن گھر میں میری طبیعت بہت گھبرائی۔ قلب میں ایک بےچینی اور گھٹن سی ہونے لگی۔ دل بہلانے کے خیال سے میں دریائے نیل کے کنارے تفریح کرنے کے لئے چلا گیا۔ وہاں پہونچ کر یک بیک جی چاہا کہ اُس پار چلوں چنانچہ کشتی میں سوار ہوگیا اور لوگ بھی موجود تھے لیکن میں اپنی قلبی پریشانی کی وجہ سے ایک کنارے اکڑو کرکڑو بیٹھ گیا اور اپنا سر اپنے دونوں گھٹنوں کے درمیان میں رکھ لیا کشتی روانہ ہوئی۔ میں نے سر اسوقت اوپر اُٹھایا جب کہ کشتی بیچ دریا میں پہونچ چکی تھی۔ لیکن جب میں نے سر اُٹھایا تو عجیب منظر دیکھا۔ یہ دیکھا کہ ایک گانے بجانے والی جوان عورت نہایت ہی حسین وجمیل میری داہنی جانب بیٹھی ہوئی ہے اور اس کی گود میں آلات لہو ولعب یعنی ستار وسارنگی ہے اور سامنے جام وسبو دھرا ہے اور بائیں جانب ایک نہایت خوبصورت جوان بہت ہی بیش قیمت لباس زیب تن کئے ہوئے بیٹھا ہوا ہے۔

مجلس کا یہ رنگ دیکھ کر میں نے کہا الٰہی توبہ! اور اپنے نفس کو دل ہی دل میں یوں ملامت کرنے لگا کہ واہ میاں واہ! بوڑھے ہوگئے ہو اور ستر سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے بعد آج اس نوبت کو پہونچے ہو کہ شرابیوں کا مجمع ہے اور اللہ تعالیٰ کی کھلم کھلا نافرمانی کرنے والوں کا ساتھ ہے (اسی مبارک مجلس کی شرکت کے لئے یہ سب بےچینی تھی کیا؟ ارے نفس تجھے خدا سمجھے) اسی طرح میں اپنے نفس کو لعنت ملامت کر ہی رہا تھا کہ اتنے میں اس عورت نے میری جانب رخ کیا اور شوخی کے ساتھ کہا کہ یا شیخ! شراب حاضر ہے شوق فرمایئے۔ میں نے کہا اگر میرا مالک ہی مجھے پلائے گا تو ضرور پیوں گا (شیخ کا یہ فرمانا کچھ شراب نوشی پر رضا اور اس کی دعوت کو قبول کرنے کے قبیل سے نہ تھا بلکہ چونکہ ان حضرات پر قضا وقدر کا غلبہ ہوتا ہے اور خود کو یہ حضرات مسخر سمجھتے ہیں اسلئے جانتے ہیں کہ جو بھی اُدھر سے پیش آئیگا انجام کے لحاظ سے خیر ہی ہوگا۔ چنانچہ یہاں بھی اچانک دل کا مضطر ہوجانا، اور سیر دریا کو دل چاہنا، پھر پار جانے کی خواہش ہونا اور پھر کشتی میں ان سب اسباب کا مجتمع ہوجانا، اس کو حضرت نے جانا کہ یہ سب بلاوجہ نہیں ہے۔

اس میں کچھ راز ہے اس لئے یہ جواب بطور رضا و تسلیم بامر الخالق کے دیا جس کو اس نے اجازت شراب نوشی جانا اور ساتھ والے مرد سے کہا کہ او بھائی ایک جام بھر کر شیخ کو بھی دو۔ چنانچہ اس نے ایک پیالہ شراب سے لبریز مجھے بھی دیا۔

میں نے شراب کا پیالہ لینے کو تو ہاتھ میں لے لیا لیکن اسکو لیتے ہی مجھ پر ایک عجیب وغریب کیفیت طاری ہوگئی اور میں ہاتھ میں پیالہ لئے دیر تک خاموش سوچتا رہا۔ یہ دیکھ کر اس عورت نے پھر کہا کہ یا شیخ کیا ہماری شراب پینے سے آپ کو انکار ہے؟ فرمایئے تو سہی کہ اب انتظار کیسا؟ کیا اسکا تو انتظار نہیں کہ میں گانا شروع کروں تب آپ پینا شروع کریں۔ یا یہ خیال تو نہیں ہے کہ آپ ہی کچھ سنانا چاہتے ہیں تاکہ پینے کی ابتدا پہلے ہم کریں۔ اس لئے یہ توقف ہے؟

میں نے کہا کہ ہاں یہی بات ہے، میں ہی کچھ سنانا چاہتا ہوں۔ پہلے اس کو سُن لو پھر پینا پلانا اس نے یہ سن کر کہا' بہت بہتر آپ ہی کچھ سنائیں۔ پہلے ہم آپ کے اشعار سن لیں گے پھر اپنا کام کرینگے چنانچہ میں یوں مترنم ہوا ؎

(۱) ما احسن مِن قَنيةٍ وَمِنْ مَارٍ
فی ظلمةِ اللیل نغمةٌ ۱ لقاری

(۲) یا حسنہٗ والجلیلُ یسمعہٗ
بحسن صوتٍ و دمعُہٗ جاری

(۳) وخدُّہٗ فی ۲ التُّراب عفرةٌ
وقلبہٗ فی محبّةِ الباری

۱۔ یعنی گانے بجانے والیوں سے کہیں زیادہ حسین اور کیف آور شب تاریک میں کسی قاری کا قرآن پڑھنا ہوتا ہے۔

۲۔ سبحان اللہ! اس کی خوبی کا کیا پوچھنا کہ رب جلیل جس کو سن رہا ہو اور اس کے پڑھنے کی کیفیت یہ ہو کہ نہایت خوش الحانی کے ساتھ دل سے پڑھ رہا ہو اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوں۔ چہرہ اور رخسار خاک آلود ہو اور قلب میں باری تعالیٰ کی

محبت موجزن ہو۔

يَقُولُ يَا سَيِّدِي وَيَا أَمَلِي　　أَشغَلَنِي عَنكَ ثِقلُ أَوزَارِي
اِغفِرْ ذُنُوبِي لِأَنَّهَا عَظُمَتْ　　وَلَمْ تَزَلْ يَا جَلِيلُ غَفَّارِي
ذَاكَ غَدًا فِي الجِنَانِ مَسْكَنُهُ　　بِدَارِ قُدْسٍ بِقُربِ جَبَّارِي
لِيَسكُنُ مَعَ زَوجَةٍ تُشَاكِلُهُ
يَا حُسْنَ مُختَارَةٍ لِمُختَارِ

اسی حال میں یوں دعا کر رہا ہو، کہ اے میرے آقا اور اے میری امید گاہ مجھ کو میرے گناہوں کے انبار نے آپ کی اطاعت سے ہٹائے رکھا پس گو میرے گناہ بہت ہی زیادہ ہیں لیکن آپ سے بخشش کی توقع ہے اسلئے کہ آپ میرے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ ایسا قرآن کا پڑھنے والا اور اپنے خالق سے مناجات کرنے والا کل کو جنت میں داخل کیا جائے گا اور ملک جبار کے قریب ہی دار قدس اسکا جائے قیام ہوگا اور صورت و سیرت میں اسی کے ہمشکل اس کو نہایت حسین بیوی ملے گی۔ کیا کہنے اس حسین کے اور کیا کہنے اس حسینہ کے۔

آپ کی تنشیط طبع کے لئے اس نظم کا ترجمہ نظم میں بھی پیش کرتا ہوں ؎

گانے والی کی راگنی سے کہیں　　بڑھ کے دلکش ہے نغمۂ قاری
شب تاریک میں وہ خوش الحاں　　دل سے پڑھتا ہو اشک ہوں جاری
اس تلاوت کا حسن کیا کہنا　　سن رہا ہو جسے مرا باری
ظاہری حال بھی یہ اس کا ہو　　خوف خالق سے گریہ ہو طاری
رکھ دیا ہو زمین پہ رخسار　　حب حق دل میں جاری وساری
کہہ رہا ہو کہ اے مرے آقا　　اے مری آرزو اے مرے باری
تجھ سے میری جدائی کا باعث　　معصیت میری اور خطا کاری
ہے گذارش تو بخشدے مجھ کو　　جرم ہلکا نہیں بہت بھاری

پرتری ذات ہے کریم اے رب　　شانِ مولا تری ہے غفاری
بخش دے جرم اور دے جنت　　نوری فرما مجھے نہ کر ناری
اس طرح روئے. دل ہلا ڈالے　　اپنا بھی غیر کا بھی وہ قاری
ایسا قاری قرآن کل ہوگا　　خلد میں میہمانِ سرکاری
اس کو جوڑا ملے گا اس جیسا　　حورِ جنت۔ جو حسن ہی ساری

سب کہیں گے تجھے مبارک ہو
یہ حسین تحفہ رب کا اے قاری

اس گانے والی عورت نے جب ان اشعار کو سُنا تو بیہوش ہوکر گر پڑی۔ جب افاقہ ہوا تو اُٹھی اور ریشم و دیباج کا لباس جو پہنے ہوئے تھی اُسے اُتار کر معمولی لباس پہن لیا اور ستار و سارنگی کو توڑ ڈالا اور شراب کو سمندر میں پھینک دیا اور مجھ سے کہا کہ یا حضرت میں بھی اگر اپنے مالک حقیقی سے توبہ کروں تو کیا وہ مجھ جیسی گنہگار کو قبول کرے گا۔ میں نے کہا۔ ہاں ہاں اسکے یہاں کسی کے لئے رکاوٹ نہیں ہے۔ اس نے تو اپنی کتاب حکیم میں فرمایا ہے کہ ھُوَ الَّذِی یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ۔

"یعنی خدا ہی وہ ذات ہے جو اپنے بندوں کی توبہ کو قبول کرتا ہے اور انکی لغزشوں کو معاف کرتا ہے"

یہ سنتے ہی اس نے اپنے چہرہ سے نقاب سرکایا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا اور کہا کہ مجھ میں اور میرے آقا میں مصالحت کا واسطہ چونکہ آپ ہوئے ہیں لہذا ایک بار پھر میرے لئے سفارش فرمادیجئے کہ وہ میرے سابقہ گناہوں اور گذشتہ کوتاہیوں کو معاف فرمادے اور مجھے بخش دے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ اتنے میں کشتی دریا کے اس پار پہونچ گئی اور ہم سب اُتر گئے۔ ان لوگوں نے اپنی راہ لی اور میں نے اپنی راہ لی۔ پھر اس کے بعد بہت دنوں تک نہ تو میں نے اس عورت کو دیکھا اور نہ مجھے اسکا کچھ حال ہی

معلوم ہوا۔ عرصہ گذرنے کے بعد ایک سال میں حج کو گیا۔ ایک مرتبہ بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا تو دیکھا کہ ایک جوان عورت پراگندہ حال کعبہ کا غلاف پکڑے رو رہی ہے اور یوں فریاد کر رہی ہے کہ اے میرے مالک رات آپ نے جس نشہ میں مخمور رکھا اور جس شراب سے مجھے لطف اندوز فرمایا اسکا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ میرے گناہ کو بخش دیجئے۔ میں نے جب شراب و خمار سنا تو یہ سمجھ کر کہ کوئی کھانے پینے والی عورت معلوم ہوتی ہے اس کو منع کیا اور کہا کہ ارے جب بھی رہ ایسے مقدس مقام میں بھی وہی شراب و خمار کی باتیں۔ یہ سن کر وہ بولی کہ ذوالنون چلو ہٹو اپنا کام کرو، میرے معاملہ میں دخل نہ دو۔ تم کیا جانو کہ میں کس چیز کا واسطہ دے رہی ہوں (بغیر سمجھے ہی اعتراض کر بیٹھے۔ سنو بات یہ ہے کہ) گذشتہ شب میری ایسی مبارک گذری ہے کہ کچھ کہنے کو نہیں۔ تمام رات میں اپنے مولا کی محبت کے جام سے مسرور تھی اور صبح ہوگی تو اس حال میں کہ انکی شراب محبت سے مخمور تھی یہ دونوں اوقات میرے مقدر سے چونکہ عمدہ گذر گئے اس لئے میں نے انھیں کا واسطہ دے کر اسوقت دعا کی ہے۔

حضرت ذوالنونؒ فرماتے ہیں (کہ مجھے اپنی بدگمانی پر بڑی ندامت ہوئی اور اس سے بڑھکر یہ کہ اس کی زبان سے اپنا نام سن کر حیرت بھی ہوئی) میں نے کہا کہ اللہ کی بندی تجھے میرا نام کیسے معلوم ہوگیا۔ اس نے کہا کہ آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔ میں وہی لونڈی ہوں جس نے دریائے نیل میں کشتی پر آپ کے ہاتھ پر توبہ کی تھی۔ میں نے کہا ارے تو وہ ہے یہ تو بتا تیرا وہ حسن و جمال کیا ہوا۔ اس کے جواب میں اس نے یہ اشعار پڑھے:۔

ذَهَبَتْ لَذَّةُ الصِّبَا فِي الْمَعَاصِي ۔۔۔ وَبَقِيْ بَعْدَ ذَاكَ اَخْذُ النَّوَاصِي

نوجوانی اور شباب کی اُمنگ تو گناہ میں گذر گئی۔ اب اس کے بعد چوٹی پکڑ کر مالک کے سامنے پیش کیا جانا ہی باقی ہے۔

وَمَضَى الْحُسْنُ وَالْجَمَالُ وَصَالِيْ ۔۔۔ عَمَلٌ اَسْتَجِيْهِ يَوْمَ الْخَلَاصِ

اپنا حسن و جمال تو سب رخصت ہوگیا اور اب یہ فکر دامنگیر ہے کہ میرے پلے تو کوئی ایسا عمل ہے نہیں کہ جس کی وجہ سے قیامت میں خلاصی کی اُمید وار ہوسکوں۔

غَيْرَ ظَنِّي بِاللّٰهِ وَهُوَ جَمِيْلٌ فِيْهِ أَخْلَصْتُ غَايَةَ الْإِخْلَاصِ

ہاں البتہ ایک چیز کا سہارا ضرور ہے اور وہ ہے اپنے مولا کے ساتھ میرا حُسنِ ظن اس لئے کہ وہ بڑا ہی مہربان اور عمدہ خلق والا ہے۔ بس اس چیز کو تو میں نے انتہائی اخلاص کے ساتھ پکڑ رکھا ہے۔

یہ کہہ کر مجھ سے کہا کہ آپ ذرا ٹھہرئے۔ میں ابھی آتی ہوں۔ اس کے بعد وہ ایک طرف کو گئی اور فوراً ہی واپس آئی اور ایک طباق ساتھ لائی جس میں کچھ تازہ کھجوریں انجیر اور انگور تھے۔ (حالانکہ ان چیزوں کا موسم نہیں تھا) لاکر میرے سامنے رکھدیا۔ میرے دل میں یہ خیال گذرا کہ دیکھو ذوالنون ستّر سال تک عبادت کرتے کے بعد بھی تم اِس مقام تک نہ پہونچ سکے۔ جہاں یہ اللہ کی بندی چند دنوں میں پہونچ گئی۔ مجھے یہ خیال ہوا ہی تھا کہ وہ بولی یا شیخ جانتے ہیں کہ کیا بات ہے؟ بات یہ ہے کہ میں نے جب صدق دل سے اپنے آقا اور مولا کی جانب توبہ کی اور دلی ندامت کے ساتھ اپنے گناہوں کا اعتراف کیا تو اس نے بھی مجھے صادق توکل کی دولت سے نوازا اور پھر اس نے یہ اشعار پڑھے:

عِشْ غَرِيْباً وَلَا تَذَلَّ لِخَلْقٍ وَاطْلُبِ الرِّزْقَ فِيْ بِلَادِ الْحَبِيْبِ
ثُمَّ سِرْ فِي الْبِلَادِ شَرْقاً وَغَرْباً وَتَوَكَّلْ عَلَى الْقَرِيْبِ الْمُجِيْبِ
فَعَسَىٰ أَنْ تَنَالَ مَا تَرْتَجِيْهِ بِيَدِ اللُّطْفِ مِنْ مَكَانٍ قَرِيْبِ

یعنی غریب اور اجنبی ہوکر زندگی بسر کرو اور کسی مخلوق کے آگے ذلت کے ساتھ ہاتھ نہ پھیلاؤ رہی روزی سو اس کو دیارِ حبیب میں تلاش کرو۔

پھر خدا کی زمین میں شرقاً وغرباً جہاں چاہو خوب گھومو پھرو اور توکل اس ذات پر کرو جو قریب بھی ہے اور مجیب بھی۔

عجب نہیں کہ تم اپنی اُمید کو پہونچ جاؤ اور لطف الٰہی کے ہاتھوں تمہاری خواہش بہت ہی قریبی جگہ سے پوری ہو جائے۔

حضرت ذوالنونؒ فرماتے ہیں کہ میں سر جھکائے اسکی باتوں کو سن رہا تھا۔ اس کے بعد

میں نے سر جو اٹھا کر دیکھا تو اس کو غائب پایا۔
مؤلف فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ مقربین کے یہی حالات ہوا کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ اے مخاطب سُن ! دیکھ خدا کے دربار سے ہٹنا مت۔ اگرچہ تجھے دھتکار دیا جائے اور اسکے در سے ٹلنا مت۔ اگرچہ دروازہ بند کر دیا جائے۔
مترجم عرض کرتا ہے اسی کو ہمارے خواجہ صاحبؒ یوں فرماتے ہیں کہ ؎

ضربیں کسی کے نام کی دل پہ یونہی لگائے جا
گو نہ ملے جواب کچھ در یونہی کھٹکھٹائے جا
کھولیں وہ یا نہ کھولیں در اسپہ ہو کیوں تری نظر
تو تو بس اپنا کام کر یعنی صدا لگائے جا (انتہی از ناقل)

غرض بکثرت نصوص ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت کا شریعت میں ایک خاص مقام ہے اور بہت سے فضائل ایسے ہیں جو تلاوت ہی پر موقوف ہیں۔ چنانچہ ترغیب کے لئے میں نے ابھی چند واقعات ذکر کئے ہیں اب اس کے متعلق شریعت میں جو ترہیب آئی ہیں اس کو بھی سنئے۔
حضرت سعد بن عبادہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص قرآن شریف پڑھ کر اسکو بھلادے تو قیامت میں اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کریگا کہ وہ اجذم ہوگا۔ (مشکوٰۃ شریف)
صاحب مرقاۃ نے اجذم کے کئی معنیٰ بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ ساقط الاسنان ہوگا یعنی پوپلا۔ اس کے منہ میں دانت ہی نہ ہونگے اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا شخص کیسا بدنما معلوم ہوتا ہے یا یہ معنی ہیں کہ ہیئت مجذوم پر ہوگا یعنی جیسے کوئی جذامی یعنی کوڑھ والا ہو اس صورت میں اللہ تعالیٰ سے ملیگا۔ یا مطلب یہ ہے کہ اس کے ہاتھ ہی نہ ہونگے یا مراد یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی جس کو وہ نسیان کے عذر میں پیش کر سکے یا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سامنے ان کے کلام کریم اور کتاب عظیم کے نسیان پر نادم و خجل ہو کر حق تعالیٰ کے سامنے سرنگوں ہوگا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اجذم کے معنی بے خیرے کے ہیں

یعنی ہر قسم کی خیر سے اسکا ہاتھ خالی ہوگا۔

دیکھئے کس قدر وعید شدید بیان فرمائی ہے قرآن کریم کے نسیان پر اور نسیان کی شرح علماء یہ بیان فرماتے ہیں کہ زبانی پڑھنا بھول جائے اور یہ بھی قول ہے کہ دیکھکر بھی نہ پڑھ سکے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کی قراءت چھوڑ دے خواہ بھول گیا ہو یا نہ بھولا ہو۔ پس اس میں تصریح ہے کہ ترک تلاوت کی وجہ سے اتنے بڑے عذاب میں مبتلا کیا گیا کہ محشر میں جہاں سب اولین و آخرین جمع ہونگے یہ شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اس فعل شنیع پر اسقدر نادم ہوگا اور اس کو ایسی حیا دامنگیر ہوگی کہ چہرے کا گوشت بھی ختم ہو جائیگا۔ اس وعید کی شدت پر نظر کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تلاوت منجملہ مقاصد شرعیہ کے ہے اس لئے کہ جب اسکا نسیان اتنا بڑا گناہ ہے تو اس کی تلاوت کرنا اور اسکا یاد رکھنا اتنی ہی بڑی طاعت بھی ہوگی اسی طرح سے تدبر فی القرآن اور اس کے معنیٰ کا سمجھنا بھی مقاصد شرع میں سے ہے کیونکہ نصوص میں اسکا بھی حکم ہے چنانچہ جگہ جگہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ کہیں فرماتے ہیں ذَالِكُمْ وَصّٰكُم لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ذَالِكُمْ وَصّٰكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ اور ایک جگہ ارشاد ہے ذَالِكُمْ وَصّٰكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○

ان سب نصوص سے معلوم ہوا کہ قرآن شریف سے الفاظ و تذکر تفہیم معنیٰ اور تدبر یہ سب مطلوب ہیں۔ اسکا کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے۔ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ بلاشبہ قرآن شریف کے نزول سے مقصود اس کی آیات میں فکر اور تدبر کرنا بھی ہے لیکن اس کی آیات کو تلاوت کرنا اگرچہ بغیر فہم ہو یہ بھی تعبد ہے اور بہت سے کمالات کا ذریعہ ہے اور فی نفسہٖ مثمر برکات و حسنات ہے۔ اس مسئلہ پر ایک دوسرے مضمون میں مفصل کلام کر چکا ہوں۔ چنانچہ سب سے زیادہ صریح اور میرے مقصود پر اول قاضی بیضاوی کی وہ عبارت ہے جو انھوں نے اتل ما اوحی الیک کی تفسیر میں تحریر فرمائی ہے لکھتے ہیں کہ

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتَابِ ای تقرباً الی اللہ تعالیٰ بقرأتہ تحفظاً لالفاظہ واستکشافاً لمعانیہ فان القاری المتامل قد ینکشف لہ بالتکرار مالم ینکشف لہ اول ما قرع سمعہ انتہٰی (تفسیر بیضاوی)

ترجمہ۔ آپ پر جو کتاب وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کیجئے۔ تاکہ اس کی تلاوت سے قرب خداوندی حاصل ہو اور اس کے الفاظ کی حفاظت ہو سکے اور اس کے معانی آپ پر کھل سکیں اس لئے کہ ایک قاری جب تامل اور تدبر کے ساتھ تلاوت کرتا ہے تو بسا اوقات بار بار پڑھنے کی وجہ سے اسکے لئے قرآن کے ایسے معنی کھلتے ہیں جو پہلی بار (کی تلاوت یا سماعت میں) اس کے ذہن میں نہ آسکے تھے۔

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ تلاوت سے تقرب الی اللہ ہوتا ہے۔ نیز الفاظ کے تحفظ کا بھی یہی ذریعہ ہے نیز اس سے معنی کا انکشاف ہوتا ہے۔ بس قاضی صاحب کی تفسیر کی رو سے یہ آیت ہمارے اس مدعا میں نص ہے کہ نفس تلاوت سے بھی قرب ہوتا ہے اور یہ اس لئے کہ جس طرح صلوٰۃ عبادت ہے تلاوت بھی عبادت ہے کیونکہ دونوں ذکر اللہ کے افراد ہیں۔ دیکھئے قرآن شریف میں قرآن کو بھی ذکر کہا گیا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ اور صلوٰۃ کو بھی ذکر اللہ فرمایا گیا ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ لہٰذا جب دونوں ذکر ہوئے تو جس طرح صلوٰۃ بلا فہم معنی صحیح ہے اور موجب قرب ہوتی ہے اسی طرح سے تلاوت بھی بلا فہم معنی صحیح ہوگی اور موجب قرب ہوگی۔

یہاں قاضی بیضاویؒ نے نزول کتاب کے تین مقاصد جو بیان فرمائے ہیں۔ اُن میں سے پہلا تقرب الی اللہ تعالیٰ بقرأتہ تھا یعنی اس کی تلاوت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا تو اس کے متعلق کہتا ہوں کہ یہ تقرب فہم معنی پر تو موقوف نہیں ہے لیکن نیت پر ضرور موقوف ہے اور نیت کا حال یہ ہے کہ وہ فوراً درست نہیں ہوجاتی بلکہ ہوتے ہوتے ہوتی ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ مقاصد ثلٰثہ میں سے تقرب اور تحفظ الفاظ یہی دونوں اصل ہیں رہا استکشاف معانی تو وہ تلاوت

سے نہیں ہوتا بلکہ تلاوت کی وجہ سے جب قرب حاصل ہو جاتا ہے تو پھر معانی کلام اللہ اور اس کے رموز و اسرار تعالیٰ ، بر خود بخود کھلنے لگتے ہیں ۔ پس تلاوت سے اسکا تعلق بالواسطہ ہوا اور ترتیب یوں ٹھہری کہ تلاوت سے قرب ہوتا ہے اور قرب سے کشف معنیٰ ۔ اسی کو ایک صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ تلاوت سے ذوق حاصل ہوتا ہے اور ذوق سے قرآن فہمی پیدا ہوتی ہے ۔

یوں تدبر اور تفکر سے بھی انکشاف معنیٰ ہوتے ہیں مگر ایسے نہیں جیسے کہ تلاوت سے ۔ پھر ان دونوں میں بھی اصل الاصول تقرب ہے جس کی لذت مومن کو اتنی ہوتی ہے کہ کسی دوسری چیز کی نہیں ہوتی ۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو کہ اللہ تعالیٰ تلاوت کرنے والے کی تلاوت کی جانب کان لگاتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں گذرا اور اللہ تعالیٰ کا یہی اقبال فرمانا ہی تقرب ہے ۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جنت میں مومن کو جتنی مسرت حق تعالیٰ کے وصال سے ہوگی اتنی اور کسی چیز سے نہ ہوگی اور کافر کو جہنم کا جو عذاب ہوگا وہ تو ہوگا ہی سب سے بڑھ کر عذاب اس کو محبوب کی ناراضگی اور اس کے فراق کا ہوگا ۔

غرض قاضی بیضاوی کی تشریح سے معلوم ہوا کہ تلاوت قرآن کا ایک اہم فائدہ حق تعالیٰ کے قرب کا حصول ہے تو اس کے متعلق یہ سمجھئے کہ مشائخ فرماتے ہیں کہ قرب کے تین اسباب ہیں ۔ برکات عبادت ۔ تاثیر شیخ اور جذب مطلق جس کو اجتباء بھی کہتے ہیں پس جس طرح سے صحبت شیخ اور دیگر عبادات کی وجہ سے انسان حق تعالیٰ کیجانب جذب ہو جاتا ہے اسی طرح سے تلاوت قرآن میں (کہ وہ بھی ایک عبادت ہی ہے) یہ خاصہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی جانب سالک کو جذب کر لیتا ہے بلکہ اس باب میں سب سے زیادہ یہی موثر ہے ایک تو اس لئے کہ اسمیں حق تعالیٰ کی جیسی تجلی موجود ہے کسی اور چیز میں نہیں ہے کیونکہ یہ حق تعالیٰ کا کلام ہے اور ہر کلام میں متکلم کی تجلی موجود ہوتی ہے ۔ اس پر ایک واقعہ سنئے ۔

زیب النساء مخفی نے شاہ ایران کے پیش کردہ مصرع

"دُرِ ابلق کسے کم دیدہ موجود"

پر جب دوسرا مصرع لگایا اور شعر کو یوں پورا کیا ؎

دُرِ ابلق کسے کم دیدہ موجود مگر اشکِ بتانِ سُرمہ آلود

یعنی چتکبرا موتی کسی نے کم دیکھا ہوگا اور اگر وہ کہیں موجود ہے تو کسی محبوب کے سرمہ لگے ہوئے آنکھ کے آنسو کی شکل میں موجود ہے۔ نہایت عمدہ جوڑ لگایا اور یہ شعر ایران بھیجا گیا۔ تو شاہ ایران نے شاعر کا نام معلوم کرنا چاہا اور اس کو اپنے یہاں طلب کیا۔ اس کے جواب میں زیب النساء نے پھر دو شعر اور کہے اور انھیں شاہ ایران کے پاس بھیجدئے وہ شعر یہ ہیں کہ ؎

بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

مطلب یہ کہ میں وہ ذات ہوں کہ بلبل بھی جو کہ عاشقِ گل مشہور ہے اگر مجھے چمن میں دیکھ لے تو پھول سے دستبردار ہوجائے اور برہمن اگر مجھے دیکھ لے تو بت پرستی سے باز آجائے اور میں اپنے کلام میں اے مخفی اس طرح سے پوشیدہ ہوں جیسے پھول کی خوشبو پھول میں ہوتی ہے۔ لہذا جو شخص مجھے دیکھنے کی خواہش رکھتا ہو وہ میرے کلام میں مجھے دیکھے عرفاء نے اس جواب کی لطافت کو بہت پسند فرمایا ہے اور میں اسی کو کلام اللہ پر پڑھتا ہوں یعنی حق تعالیٰ کی جانب سے بھی گویا یہ ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

یعنی حق تعالیٰ بھی گویا یہ فرمارہے ہیں کہ میں اپنے کلام یعنی قرآن شریف میں اس طرح سے مخفی ہوں جس طرح سے کہ پھول کی خوشبو پھول میں موجود ہوتی ہے لہذا جس کسی کو میری معرفت منظور ہو وہ میرے کلام میں مجھے دیکھے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جتنی تجلّی اس میں موجود ہے کسی اور چیز میں نہیں ہے

کسی نے خوب کہا ہے ؎

چیست قرآں اے کلام حق شناس
رو نمائے رب ناس آمد بہ ناس

دوسری وجہ اس کے زیادتیٔ تاثیر کی یہ ہے کہ اس کی مثال اس کمند کی سی ہے جو بندوں کو حق تعالیٰ کی جانب کھینچنے کے لئے لٹکائی گئی ہو ظاہر ہے کہ اب اس سے زیادہ اسہل اور اقرب دوسرا اور کونسا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

غرض کتاب و سنت اور اکابر امت کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ تلاوت کا بھی کوئی مقام و درجہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ عام امت کا آج جو معاملہ ہے اس کو دیکھ کر مجھے یہ خیال گذرتا تھا کہ کہیں یہ کلام اللہ کا بُند نہ ہو اور اس کے ساتھ ظلم نہ ہوتا ہو اور وہ معاملہ یہی کہ دیکھتا تھا کہ لوگ جس قدر اہتمام اس زمانہ میں مشائخ کی تصنیفات اور انکے ارشادات و ملفوظات کا کرتے ہیں اور جتنا اعتنا، ان چیزوں کا ہے کتاب و سنت کے ساتھ اتنا نہیں ہے۔ قرآن کی نہ تو تلاوت ہے اور نہ اس کے معنی ہی پر وقوف کی فکر ہے لیکن بزرگوں کے کلام پر عکوف کئے ہوئے بیٹھے ہیں۔ مجھے یہ طرز کلام اللہ کے ساتھ کھلتا تھا لیکن کچھ کہنے کی بھی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کیونکہ اس کی جانب سے بے اعتنائی عام دیکھی یعنی علاوہ عوام کے خواص کا معاملہ بھی اس کے ساتھ یہی تھا۔ چنانچہ میں جانتا ہوں کہ بہت سے ایسے لوگ جنکا مشغلہ ہی پڑھنا پڑھانا تھا اور رات و دن جنھیں قرآن و حدیث ہی سے شغف رہتا تھا لیکن وہ اس کی تلاوت بھی نہیں کرتے تھے۔ میں نے اس مضمون کو ایک مرتبہ ایک اہل علم۔ اہل قلم اور تفسیر قرآن سے خاص شغف رکھنے والے ایک بزرگ کے سامنے بیان کیا۔ انھوں نے یہاں سے جانے کے بعد اپنے ایک دوست کو لکھا کہ میرا تو چور ہی پکڑ لیا۔ مجھ ہی کو کہتے تھے۔ حالانکہ میں نے ایک عام بات کہی تھی۔ اُنکا حال مجھے معلوم بھی نہیں تھا۔

غرض جب خواص کا یہ معاملہ اس کے ساتھ ہے تو پھر ظاہر ہے کہ عوام کا تعلق

اس کے ساتھ کس طرح ہو سکتا ہے۔ آج اس سے بے تعلقی کی وجہ یہی ہے کہ خواص نے بھی تعلق کم کر لیا ہے اور انکو کوئی کہنے والا نہیں۔ پس جب کوئی بات کہی ہی نہ جائے گی تو لوگوں کو اس کی جانب توجہ خود بخود کیسے ہو جائیگی لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا تعلق ہی کلام اللہ سے ختم ہو گیا۔

یوں میں اس چیز کو محسوس تو بہت دنوں سے کر رہا ہوں کہ ہم لوگوں سے قرآن کے باب میں بہت زیادہ کوتاہی ہو رہی ہے اور ایسی ہو رہی ہے کہ قیامت میں عجب نہیں کہ اس پر سخت سوال ہو جاوے مگر کچھ کہتے ہوئے رکتا تھا۔ لیکن حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام نظر سے گذرا جس سے بڑی تقویت ہوئی اور اس سے اطمینان ہوا کہ قلب میں جو بات آ رہی تھی الحمد للہ وہ ٹھیک تھی۔ شاہ صاحب اپنی کتاب فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن کے مقدمہ میں اپنے ترجمہ قرآن کرنے کے دواعی اور فوائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک فائدہ یہ ہوگا کہ

تشبیہے کردہ باشند باصحابہ کرام کہ بہمی دستور حلقہ حلقہ می نشستند وقاری ایشان قرات می کرد ایں قدر فرق است کہ صحابہ کرام بسلیقہ خود زبان عربی فہم می کردند وایں جماعت بتوسط ترجمۂ فارسیہ۔

وچناں کہ یاراں سعادت مند مثنوی مولانا جلال الدین وگلستان شیخ سعدی ومنطق الطیر شیخ فریدالدین عطار وقصص فارابی ونفحات مولانا عبدالرحمٰن جامی وامثال آن نقل مجلس دارند چہ باشد اگر ایں ترجمہ را بہماں اسلوب درمیان آرند وحصہ از نقل خاطر بہ ادراک آں گمارند اگر آں شغل با کلام اولیاء اللہ است ایں شغل بہ کلام اللہ است واگر آں مواعظ حکیمان است ایں مواعظ احکم الحاکمین است واگر آں مکتوب عزیزاں ست ایں مکتوب رب العزت است شتان بین المرتبتین۔

لوگ اسکے ساتھ شغف رکھیں گے تو اس کی وجہ سے صحابہ کرام کے ساتھ مشابہت ہو جائیگی اس لئے کہ اُن حضرات کا بھی طریقہ یہی تھا کہ وہ لوگ حلقہ بنا بنا کر بیٹھ جاتے تھے اور ایک

قاری تلاوت کرتا تھا اور سب لوگ سنتے تھے بس اتنا فرق ہو گیا ہے کہ صحابہ کرام اپنی ذاتی لیاقت کیوجہ سے عربی زبان سمجھ لیتے تھے اور یہ جماعت موجودہ فارسی ترجمہ کے واسطہ سے مفہوم قرآن سمجھتے ہیں اور جب یہ ہمارے احباب سعادتمند مثنوی مولانائے روم. گلستانِ سعدی. شیخ فریدالدین عطار کی منطق الطیر. فارابی کے قصص اور مولانا عبدالرحمٰن جامی کی نفحات اور اسیطرح کی دوسری کتب کو نقل مجلس بنائے ہوئے ہیں تو کیا مضائقہ تھا اگر اس (فارسی ترجمہ) کو بھی اسی طرح سے اپنے درمیان رکھتے اور اسکو بھی پڑھنے پڑھانے کے لئے کچھ حصہ اسکا مقرر کر لیتے. یہ مانا کہ وہ اولیاء اللہ کے کلام کے ساتھ مشغلہ تھا تو یہ بھی تو کلام اللہ کے ساتھ شغل ہوتا اور اگر وہ اہل حکمت کے پند و نصائح ہیں تو یہ بھی تو احکم الحاکمین کے مواعظ ہیں. اور اگر وہ عزیزوں کے مکتوبات ہیں تو یہ بھی تو رب العزت کا مکتوب ہے اور ان دونوں کے تفاوت کا تو پوچھنا ہی کیا۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحبؒ اسوقت کے لوگوں کے اُس شغف کو جو اولیاء اللہ کے کلام کے ساتھ انکو ہو گیا تھا اور اسطور سے ہو گیا تھا کہ کلام اللہ کے ساتھ شغل کو گویا انھوں نے ترک ہی کر دیا گیا تھا ناپسند فرمایا کیونکہ یہ بات اللہ کو ناپسند ہے اور رسول کو ناپسند ہے پس بات اسی سے صاف ہو گئی کہ کتاب و سنت کو ترک کر کے کسی دوسرے کے کلام کے ساتھ ایسا اہتمام روا رکھنا جو مستلزم ہو اسکے نبذ و ترک کو یہ تو بنص قرآن منع اور حرام ہے۔

یہاں نبذ کے متعلق کچھ تفصیل روح المعانی سے لکھتا ہوں. حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:-

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

(ترجمہ. اور جب ان کے پاس ایک پیغمبر آئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تصدیق بھی کر رہے ہیں اس کتاب کی جو ان لوگوں کے پاس ہے تو ان اہل کتاب میں کے ایک فریق نے خود اس کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیا جیسے ان کو گویا اصلاً علم ہی نہیں)۔

اہل توراۃ کا حال بیان فرمایا ہے یعنی ان یہودیوں کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں تھے کہ انھوں نے بھی کتاب اللہ (یعنی توراۃ) کو پس پشت ڈالدیا تھا۔ چنانچہ سُدی سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے تو ان لوگوں نے آپ کا مقابلہ توراۃ سے کیا مگر توراۃ اور قرآن یکساں ثابت ہوئے تو انھوں نے (اس ضد میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ماننا پڑے) توریت ہی کا انکار کردیا اور اس کو ترک کردیا اور اس کے بدلہ میں آصف کی کتاب اور ہاروت و ماروت کا سحر لے لیا جو کہ قرآن کے خلاف تھا۔ اور توراۃ کے نبذ کردینے کا مطلب یہ تھا کہ انھوں نے اس کے احکام کو ترک کردیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف اس میں بیان کئے گئے تھے اسکا انکار کردیا۔

وراء ظھورھم یہ کنایہ ہے قلت مبالاۃ اور عدم التفات سے اس لئے کہ انکے کتاب اللہ کے ترک اور اس سے اعراض کو اس شے کی حالت سے تشبیہ دی ہے جو کہ پس پشت پھینک دی جائے اور وجہ شبہہ قلت مبالات ہے۔

کانھم لا یعلمون یعنی اس طریقے سے پس پشت ڈالدیا جیسے کہ جانتے ہی نہیں کہ یہ کتاب اللہ ہے۔

یہ تھا کتاب اللہ کا نبذ جس پر قرآن نے نکیر کی ہے۔ اب دیکھ لیجئے کہ آج کیا ہمارا معاملہ قرآن شریف کیساتھ ایسا ہی نہیں ہوگیا جو دیگر اہل کتاب کا اپنی کتابوں کے ساتھ تھا۔ العیاذ باللہ۔ اسوقت بھی لوگوں کا معاملہ کچھ اسی قسم کا دیکھا ہوگا اس لئے شاہ صاحب نے اس پر نکیر فرمائی۔

لیکن اگر ہر ایک کے کلام کو اس کے مرتبہ پر رکھا جائے تو پھر کلام اللہ کے ساتھ ساتھ بزرگوں کا کلام بھی لیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ہم علماء اور حکماء اُمت کی جانب بھی علم و معرفت کے لئے رجوع کرنے کے محتاج ہیں۔ چنانچہ گلستاں۔ بوستاں کی جانب بھی رجوع کیا جاسکتا ہے۔ اور مثنوی مولانا روم سے بھی معرفت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس لئے کہ یہ لوگ اس علم و معرفت میں ہم سے سابق ہیں۔ اسلئے کہ

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ اس آیت کی رو سے ہر متاخر متقدم کی اتباع کا مامور ہے۔

نیز حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيْمٌ۔ یعنی ہر جاننے والے سے بڑھ کر کوئی جاننے والا ہوتا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ۔ یعنی جہل کی بیماری کا علاج دریافت کرنا ہے۔

نیز ارشاد فرماتے ہیں کہ اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا۔ یعنی حکمت کی بات مومن کا گمشدہ سرمایہ ہے جہاں بھی ملے وہی اسکا زیادہ مستحق ہے۔

اِن نصوص میں تصریح ہے کہ منیبین کی اتباع کی جائے گی اور یہ کہ ہر جاننے والے سے بڑھ کر کوئی جاننے والا ہوتا ہے نیز یہ کہ نہ جاننے والے کے مرض کی دوا یہی ہے کہ وہ دوسروں سے سوال کرے اور یہ کہ حکمت مومن کی گمشدہ پونجی ہے جہاں سے مل جائے حاصل کرنے کیونکہ اسکا اصل مستحق وہی ہے جب ان نصوص سے یہ معلوم ہوا کہ نہ جاننے والوں کے لئے علماء اور مشائخ کا انقیاد کرنا اور انکی اتباع کرنا متعین ہے تو اپنے سے زیادہ جاننے والے سے علم و معرفت حاصل کرنے کے ہم محتاج ہوئے اسلئے انکا کلام بھی ضرور لیا جائے گا۔ میں اکثر بیان کیا کرتا ہوں کہ ہم لوگ دین کے باب میں جسطرح کتاب وسنت کے محتاج ہیں اسی طرح سے بزرگان دین کے اقوال وافعال اور احوال جاننے کے بھی محتاج ہیں کسی ایک کو لے کر دوسرے سے ہم مستغنی نہیں ہو سکتے اسی کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا کرتا ہوں کہ کتاب وسنت کے ساتھ ساتھ ہمارے لئے سیر سلف کا بھی جاننا ضروری ہے کیونکہ ان حضرات کے کلام اور بیان میں حق تعالیٰ کی جانب جذب کرنے کی قوی تاثیر پائی جاتی ہے یعنی سالک اپنے طور پر کتنا ہی کچھ مجاہدہ کیوں نہ کرے اُس سے اتنا کشود کار نہیں ہوتا جتنا کہ کسی بزرگ کے کلام سے تاثر حاصل ہوتا ہے اور راستہ کھل جاتا ہے اور یہ اس لئے کہ ان حضرات کا تعلق اللہ تعالیٰ

کے ساتھ صحیح ہوتا ہے اور انکا قلب نور سے معمور ہوتا ہے اسلئے جو کلام بھی ایسے قلب سے نکلتا ہے وہ نورانی ہوتا ہے اور سالک کے قلب پر بھی نور پاشی کر دیتا ہے اسی کو مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

شیخ نورانی زرہ آگہ کند ✻ باسخن ہم نور را ہمرہ کند

یعنی شیخ کامل راہ سے بھی آگاہ کرتا ہے اور اپنے کلام کے ساتھ ساتھ نور بھی بخشتا رہتا ہے جس کی وجہ سے سالک کے لئے سلوک طریق آسان ہو جاتا ہے کیونکہ راہ بھی ملتی ہے اور نور بھی۔

یہاں سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ لوگوں نے جو مشائخ کی تصنیفات پر عکوف کیا اور ان کے ملفوظات اور ارشادات کو جو تلقی بالقبول کیا تو کچھ اس لئے نہیں کہ وہ مثلاً مولانا جلال الدین رومی کا کلام تھا یا وہ مصلح الدین سعدی شیرازی کے ملفوظات تھے یا شیخ فریدالدین عطار کا کلام تھا یا عبدالرحمٰن جامی کے ارشادات تھے۔ پھر نہ صرف ان ہی حضرات کو بلکہ سبھی بزرگوں کو جو لوگوں نے مانا ہے تو اس لئے کہ ان حضرات نے بھولے بھٹکوں کو خدا کی راہ دکھلائی ہے اور ان کو حق تعالیٰ کی معرفت سکھلائی ہے۔

چنانچہ ان مشائخ کے ارشادات درحقیقت کتاب وسنت کی شرح اور اس کی تفسیر ہی ہیں۔ پس اس جہت سے انکو ماننا گویا کتاب وسنت ہی کا ماننا ہوا جو ہر مسلمان کے لئے لازم اور ضروری ہے ہاں اگر اس کو اپنے درجہ سے بڑھا دیا جائے یعنی بزرگوں ہی کے کلام کو لیا جائے اور کتاب وسنت کی جانب اصلا التفات نہ کیا جائے یا بے توجہی برتی جائے تو بلاشبہ یہ اسلام میں ایک بدترین بدعت ہوگی اس لئے کہ اصل کو ترک کر کے فرع کو اختیار کر لیا گیا ہے اس لئے سخت نکیر کا یہ عمل مستحق ہے۔

چنانچہ مصلحین امت نے جب بھی لوگوں کا رخ اس جانب مڑتے دیکھا ہے بروقت اس کی اصلاح فرمائی ہے جیسا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے کلام میں آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا اور اگر کبھی معاملہ اس کے برعکس ہو جائے یعنی لوگ اس خیال کے ہو جائیں کہ بس

کتاب وسنت ہی کافی ہے ان کے بعد پھر کسی اور کے کلام کی حاجت نہیں اور مقصد اس قول سے اسلاف کی خدمات کو یک قلم ختم کرنا اور ان کے احسانات کو یکسر فراموش کردینا ہو تو اہل انصاف اس کو بھی پسند نہیں کریں گے اور یہی کہا جائیگا کہ پہلے طبقہ نے کتاب وسنت کے بارے میں اگر تفریط سے کام لیا تھا تو اس دوسرے گروہ نے افراط سے کام لیا حالانکہ جس طرح تفریط مذموم ہے افراط بھی مذموم ہے پس اعدل الاقوال یہ ہے کہ ہم کتاب وسنت کے بھی محتاج ہیں اور سیر سلف سے بھی مستغنی نہیں ہیں بلکہ اپنے سلوک وتسلیک میں ان دونوں ہی کے محتاج ہیں۔

اب ہم اپنے اس دعوے کے ثبوت کے لئے بزرگوں کے کچھ معارف بیان کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ بزرگوں کے کلام سے بھی فائدہ ہوتا ہے اور طریق کھلتا ہے، دین کا ذوق پیدا ہوتا ہے اور بعض مرتبہ تو انکی ایک ہی بات سے آدمی کہیں سے کہیں پہونچ جاتا ہے۔ ان معارف کا مفصل بیان تو ہم نے اپنے ایک علیحدہ مستقل مضمون میں کیا ہے تاہم یہاں چند باتیں بطور نمونہ عرض کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ جس جماعت نے اپنے کلام سے اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ سے اسقدر قریب کرنے کی سعی کی ہو اس کے کلام کو کلام اللہ اور کلام رسول کے بالکل مقابل ٹھہرا کر اس کی جانب سے بے التفاتی برتنا اس کلام پر بلکہ ان بزرگوں پر بلکہ خود اپنے نفس پر ظلم ہے۔ کیونکہ انکا کلام کوئی مستقل کلام نہ تھا بلکہ کتاب وسنت ہی کی شرح اور اسکا بیان تھا اور ان کے کلام کو موصل الی اللہ ہی سمجھ کر مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا تھا کہ ؎

مثنوئ مولوئ معنوی ہست قرآں در زبان پہلوی

چنانچہ میں نے حضرتؒ کو خود دیکھا کہ حضرتؒ کے سرہانے مثنوی شریف رکھی رہتی تھی۔ اسی طرح سے حضرت حاجی صاحبؒ کے متعلق سنا کہ مثنوی برابر دیکھا

کرتے تھے۔ حضرت مولانا قاسمؒ بھی مثنوی مولانا روم سے شغف رکھتے تھے چنانچہ فرماتے تھے کہ تین کتابیں البیلی ہیں۔ قرآن شریف۔ بخاری شریف اور مثنوی شریف اور حضرت مولانا گنگوہیؒ کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ مکتوبات قدسیہ کو ہمیشہ مطالعہ میں رکھتے تھے۔

مجھے خیال یہ ہوتا تھا کہ یہ سب حضرات تو متبع سنت بزرگ گذرے ہیں ان کے عمل میں اور نصوص سے کتاب و سنت کا جو درجہ معلوم ہوتا ہے اُن میں آخر کیا تطبیق ہے تو اس کے متعلق ایک بات تو خود اپنی سمجھ میں آئی کہ جیسا پہلے کہا گیا ہے کہ قرآن شریف کی تلاوت میں لطف جو آتا ہے تو اسی وقت جب کہ وہ ذوق کے ساتھ کی جائے اور اسمیں شک نہیں کہ ذوق صاحب ذوق کی صحبت یا اسکے کلام کے دیکھنے ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ پس یہ اکابر جو مشائخ کے کلاموں سے تعلق رکھتے تھے تو نہ اس لئے کہ اس سے اُنکا مقصود اس کا تعبد تھا بلکہ اس لئے کہ اس کے ذریعہ اپنے ذوق کی تجدید فرماتے تھے تاکہ اس کے ذریعہ سے قلب میں نشاط و حلاوت اور علوم و معارف حاصل کریں۔

اب وہ معارف سنئے:۔

۱۔ مثلاً اس مسئلہ کو سمجھاتے ہوئے کہ توحید ایک حالی شے ہے قالی نہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ؎

از ساحتِ دل غبارِ کثرت رفتن   خوشتر کہ بہرزہ دُرِ وحدت سُفتن
مغرور سخن مشو کہ توحید خدا   واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

یعنی دل کے صحن سے کثرت کا غبار دور کرنا کہیں بہتر ہے اس سے کہ محض ڈینگ کے ذریعہ وحدت کا موتی پرو دیا جائے بات کے دھوکہ میں مت آؤ اس لئے کہ خدا کی توحید خدا کو ایک جاننے کا نام ہے ایک کہنے کا نام نہیں اور یہ بالکل ظاہر بھی ہے کیونکہ اگر صرف زبان ہی سے خدا کو ایک کہنے کا نام توحید ہو جائے تو اس طرح سے تو سبھی لوگ موحد ہو جائیں گے۔

۲۔ اسی طرح سے ایک اور بزرگ فرماتے ہیں کہ ؎

نہ بہ نقش بستہ مشوشم نہ بحرف ساختہ سرخوشم
نفسے بیاد تو می کشم چہ عبارت و چہ معانیم

میں نہ تو بنائے ہوئے نقش پر پراگندہ خاطر ہوں اور نہ گڑھے ہوئے حروف ہی پرخوش ہوں بلکہ ایک سانس جو تیری یاد میں کھینچ لوں وہی میرے لئے سرمایۂ حیات ہے۔ عبارت کیا چیز ہے اور معنی کیا ہوتے ہیں۔

سبحان اللہ نفسے بیاد تو می کشم میں کس قدر صدق توجہ الی اللہ کا بیان ہے۔

۳- ایک اور بزرگ فرماتے ہیں ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درآ

یعنی بڑے ستم کی بات ہے اگر تمہاری خواہش تمہیں اس بات پر مجبور کرے کہ چلو باغ میں سرو چنبیلی کی سیر کرو۔ اس لئے کہ تم خود ہی کب پھول سے کم ہو اپنے دل کا دروازہ کھولو اور چمن میں آجاؤ۔ اسی کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یوں فرماتے ہیں کہ ؎

وسعتِ دل کی کیا کرتے ہیں سیر اے امداد
کہ یہی باغ ہے اپنا یہی میدان اپنا

سبحان اللہ کیا خوب مضمون ہے ان بزرگوں نے اپنے اپنے ارشادات میں ترجمانی کی ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اس لئے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ :- ایمان جب مومن کے قلب میں داخل ہوجاتا ہے تو وہ کشادہ ہوجاتا ہے۔

اَلْاِیْمَانُ اِذَا دَخَلَ فِیْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ اِنْفَسَحَ لَہٗ (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

میں اسی قسم کی معارف کے متعلق عرض کر رہا ہوں کہ ایسے ایسے بیشمار معارف کتب قوم میں مذکور ہیں اور ان کے مطالعہ کو محققین نے ضروری سمجھا ہے۔ کیوں کہ یہ بزرگوں کی سوانح ہے۔ جو کہ نہ صرف قرطاس پر بلکہ قلوب پر ہر دور میں ثبت رہے ہیں۔ ع "ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما" کا یہی مطلب ہے۔ اور سنئے۔

۴۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں ؎

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی
بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی
در رہِ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بجاں
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

یعنی اے دل تیرے لئے یہ حالت کہیں بہتر ہے کہ مے گلگوں میں تو اپنے آپ کو خراب اور برباد کرلے (مے گلگوں سے یہاں مراد عشق الٰہی کی شراب ہے) اور پھر بغیر مال و دولت کے ہی تو جاہ و حشم میں قارون سے بھی بڑھ جائے۔ دیکھ لیلیٰ کی منزل تک پہنچنے کے لئے راستہ میں جانی خطرات تک موجود ہیں لیکن اسکی اولین شرط یہ ہے کہ تو پہلے مجنون ہوجائے (پھر اس کے بعد راستہ بالکل آسان ہے)۔

دیکھئے ان بزرگ نے اپنے اس کلام کے ذریعہ راہ کی صعوبتوں کو کسقدر آسان کردیا اس طرح سے کہ انسان میں غیرت اور طلب پیدا کرکے تلخیوں کے برداشت کرنے پر اسکو اُبھارا ہے کہ بڑے افسوس کی بات ہے جب کہ عشق مجازی میں مجنوں جیسا انسان اپنا سب کچھ تج سکتا ہے تو پھر عشق حقیقی تو کہیں زیادہ مستحق ہے کہ آدمی اس میں اپنے سر و جان کی بازی لگا دے اور اگر کسی کو اس کی ہمت نہیں ہے تو پھر اپنے آپکو عشاق کے زمرے میں شمار کرنے سے اس کو شرمانا چاہئے۔ کسی سوؔدا نے خوب کہا ہے کہ ؎

سوؔدا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن | بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز | اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

ظاہر ہے کہ اس کے سننے کے بعد انسان کو کتنی غیرت آنی چاہئے اور ایک کم ہمت شخص کو بھی سلوک کیلئے کمرِ ہمت کس لینا چاہئے، اسی غیرت پیدا کرنے کے لئے مولانا رومؒ نے فرمایا تھا کہ ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود | گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

اور یہی مطلب ہے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کا کہ ———— بزرگوں کا کلام نامرد کو مرد اور مرد کو شیر مرد بنا دیتا ہے۔

علامہ شعرانیؒ فرماتے ہیں کہ— بزرگوں کا کلام ان کے بعد انکا نائب وخلیفہ ہوتا ہے کیونکہ انکے کلام سے انکی صحبت یاد آتی ہے اور پھر انکا کلام بھی وہی کام کرتا ہے جو انکی صحبت کرتی ہے۔ یعنی اس سے بھی قلب سالک ذاکر ہوتا ہے اس لئے اُس کو تو اپنا وظیفہ ہی بنا لینا چاہیئے۔

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ مشائخ کے کلام میں کسقدر تاثیر ہوتی ہے اور انمیں یا تو کتاب وسنت ہی کے علوم ومعارف ہوتے ہیں یا انکی جانب رہنمائی ہوتی ہے چنانچہ مشائخ کے ارشادات بھی مانند نہروں کے ہیں جن کا منبع ومرجع کتاب وسنت ہوتا ہے۔

۵۔ منجملہ ان علوم ومعارف کے جنھیں صوفیہ نے بیان فرمائے ہیں ایک یہ ہے کہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں شہوت دنیا کی عجیب وغریب مثال بیان فرمائی ہے فرماتے ہیں کہ ؎

شہوتِ دنیا مثال گلخن است کہ ازو حمام تقویٰ روشن است

یعنی شہوت جو انسان کے اندر پائی جاتی ہے اُس کی مثال حمام کی بھٹی کی سی ہے کہ بظاہر تو وہ کوڑا کرکٹ اُپلے لکڑی وغیرہ جیسی بے حقیقت بلکہ بعض نجس چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ پانی کے گرم کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ اسی طرح سے شہوتِ انسانی ہے تو بظاہر ایک مذموم شے مگر تقویٰ کا بازار بھی اسی کی ذات سے گرم ہے۔ اگر انسان میں شہوت کا مادہ نہ ہوتا جس کی مخالفت کا وہ شرعاً مامور ہوتا تو وہ متقی ہی نہ کہلاتا۔ اس لئے کہ گناہ کا مادہ یعنی شہوت ہی ان میں موجود نہ ہوتی دیکھئے فرشتوں اور دیوار کو کوئی بھی متقی نہیں کہتا باقی کمال کی حالت یہی ہے کہ معصیت کا منشاء وداعیہ موجود ہو لیکن آدمی اس کے تقاضہ پر عمل نہ کرے۔

اب دیکھئے محض اس مثال کے سن لینے سے شہوت کی کیسی معرفت ہوئی اور آدمی کو اس کے استعمال کا طور معلوم ہوگیا اور یہ معلوم ہوگیا کہ ہماری باطنی ترقیات میں اس کو کس قدر دخل ہے۔ تقویٰ اور تقرب الی اللہ کا یہی ذریعہ اور واسطہ ہے۔

۶۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

جز یاد دوست ہرچہ کنی عمر ضائع است جز سر عشق ہرچہ بخوانی بطالت است
سعدی بشوئے لوح دل از نقش غیر حق علمے کہ رہ بحق ننماید جہالت است

سبحان اللہ کیا عمدہ معرفت کی بات فرمائی ہے۔ اسمیں طالبین کو اخلاص سکھلایا اور علم وجہل کا کیا معیار عطا فرمایا اور ہر جانب سے طبیعت کو ہٹا کر خالق کی جانب یکسو اور متوجہ کردیا۔

غرض بزرگوں کے اس قسم کے کلام کا احاطہ ممکن نہیں اس کے لئے تو دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہیں۔ مجھے تو یہاں بالذات انکا بیان بھی مقصود نہیں تھا بلکہ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ مشائخ اور صوفیا کو جو لوگوں نے پکڑا ہے اور ان کی تصانیف پر جو عکوف کیا ہے تو یونہی نہیں کر لیا۔ بلکہ ان کی خدمات اور ان کے اخلاص نے ان کو منوایا ہے۔

جب یہ امر ذہن نشین ہوگیا تو اب آپ سے کہتا ہوں کہ خیال فرمایئے کہ جب اولیاء اللہ کے کلام میں یہ جذب یہ قوت اور ایسی تاثیر موجود ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے کلام میں کیسی کچھ تاثیر موجود ہوگی؟

پس یہی مطلب ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کا کہ

اگر آں شغل با کلام اولیاء اللہ است ایں شغل بہ کلام اللہ است! واگر آں مواعظ حکیمان است ایں مواعظ احکم الحاکمین است۔ واگر آں مکتوب عزیزانست ایں مکتوب رب العزت است۔ وشتان بین المرتبتین۔

جس کا حاصل یہ ہوا کہ قوت و تاثیر میں کلام اللہ دیگر سب کلاموں سے بڑھا ہوا ہے اور دونوں کے درمیان فرق عظیم ہے۔ اور اس فرق کا اعتقاد ضروری ہے۔

باقی شاہ صاحبؒ کا مقصد اس عبارت سے ہرگز یہ نہیں ہے کہ مشائخ کے کلام اور اُنکے ملفوظات بالکل بیکار، عبث اور بے اثر ہیں اور انکا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے اور شاہ صاحبؒ ایسا کیسے فرما بھی سکتے ہیں جب کہ انکی تمام تصانیف مشائخ وصوفیہ کی ضرورت اور انکی نصرت سے پُر ہیں۔ چنانچہ تفہیمات الٰہیہ میں لکھتے ہیں کہ

محک ومعیار ایں کار کتاب وسنت وسیر سلف است۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ

حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعثت سے مقصود تین بڑے بڑے امور کے قائم کرنے کی دعوت دینی تھی۔ ایک تو مبداء اور معاد جزا اور سزا کے متعلق عقائد کی تصحیح کرنا۔ چنانچہ اس فن کے اشاعت کی کفالت علماء امت میں سے حضرات متکلمین نے فرمائی۔ اور دوسری چیز عمل کی تصحیح کرنا اس شعبہ کی خدمت حضرات فقہاء نے فرمائی اور تیسرے اخلاص واحسان کی تصحیح کرنا۔ جس کے متکفل حضرات صوفیہ ہوئے ہیں اسکے متعلق شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ

والذی نفسی بیدہ ھذا الثالث ادق المقاصد الشرعیہ ماخذا واعمقھا محتدا بالنسبۃ الی سائر الشرائع بمنزلۃ المعنی من اللفظ وتکفل بہا الصوفیۃ رضوان اللہ علیھم فاھتدوا واھدوا واستقوا وسقوا وفازوا بالسعادۃ القصوی وحازوا السھم الاعلی فللہ درھم ما اعم نفعھم واتم نورھم۔

(التفہیمات صـ۱۳ ج ۱)

اور قسم ہے اس ذات کی کہ میری جان جس کے قبضہ میں ہے کہ یہ تیسری قسم جملہ مقاصد شرعیہ سے ادق ہے ماخذ کے اعتبار سے اور از روئے اصل کے سبب سے زیادہ گہری ہے اور تمام شرائع کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے معنی لفظ کے مقابلہ میں اور اس فن کی کفالت فرمائی ہے حضرات صوفیہ نے۔ چنانچہ یہ حضرات پہلے خود مہتدی ہوئے اور پھر ہادی بنے۔

خود ہدایت حاصل کی۔ اور دوسروں کو ہدایت کی۔ خود پیا اور دوسروں کو پلایا اور بلند سعادت پر فائز ہوئے اور بڑے حصہ کو سمیٹا۔ پس اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے اور انکی خوبی اور کیا ہی عام ہے انکا نفع اور کیسا تام ہے انکا نور۔

دیکھئے یہاں شاہ صاحب حضرات صوفیہ کے متعلق یہ فرما رہے ہیں کہ مقاصد شرعیہ کی جو اصل ہے اس کے یہ لوگ حامل ہیں پس کتاب و سنت کے متعلق انھیں حضرات کی توضیح و تشریح معتبر ہوگی انکا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ حق معتبر ہے نہ کہ رجال لیکن یہ بات بھی ماننی پڑیگی کہ حق بھی بدون تفصیل رجال کے نہیں پہچانا جا سکتا یہ مضمون نہایت ضروری اور یاد رکھنے کے قابل ہے اس لئے کہ کتاب و سنت کے اتباع کے زعم میں کبھی غلو ہوکر رجال معتبرین کا بھی انکار کر دیا جاتا ہے جو کہ صحیح نہیں بلکہ بہت سی گمراہیاں اس باب سے بھی داخل ہو جاتی ہیں فالحق ھو التوسط۔

اسی لئے میں یہ بھی کہا کرتا ہوں کہ واتبع سبیل من اناب الی سے جو بزرگوں کی اتباع کا حکم معلوم ہوتا ہے تو اسکا بھی یہ مطلب نہیں کہ ایسی اتباع کی جائے کہ وہ مرادف ہو جائے کتاب اللہ کے نبذ کے' ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی اس سے یہ مراد کیسے ہو سکتی ہے کہ کسی ایسی چیز کا حکم فرمائیں کہ لوگ اسکو لے کر حق تعالیٰ کی کتاب ہی کو ترک کر دیں۔

اس موقعہ پر ایک صاحب نے خوب بات کہی کہ اللہ تعالیٰ کی ان نصوص (یعنی وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ اور فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ) کا یہ مطلب لینا تو صحیح نہیں کہ اس میں علماء و مشائخ سے جو نکہ رجوع کرنے کا حکم ہے لہذا اسی کو لیا جائے گا چاہے کتاب و سنت ترک ہی کیوں نہ ہو جائے۔ کیونکہ یہ سمجھنا تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شیخ کامل اپنے کسی مرید کو دوسرے کسی شیخ کے پاس آنے جانے اور انکی صحبت سے مستفید ہونے کی اجازت دیدے تو کیا اسکا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ ان بزرگ سے جاکر مرید ہی ہو جائے اور اپنے اصل شیخ سے اصلا تعلق نہ رکھے۔ اگر کوئی اسکا یہ مطلب سمجھتا ہے تو احمق ہے۔ بس اسی طرح سے وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ کا

بھی یہ مطلب نہیں کہ کتاب وسنت کو ترک کر کے کسی دوسرے کلام پر انسان عکوف کرلے اصالۃً تو مطاع جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چنانچہ ہم اپنے اقوال وافعال کو کتاب وسنت پر پیش کر کے انکو اس کے مطابق کرنے کے مکلف بھی ہیں اس لئے کتاب وسنت سے تو کسی وقت بھی ہم مستغنی نہیں ہوسکتے لیکن علماء ومشائخ پر چونکہ اس کے معانی مکشوف ہوتے ہیں اس لئے ان کے سمجھنے کے لئے ہم ان حضرات کے بھی محتاج ہیں۔

اور سچ تو یہ ہے کہ کتاب اللہ کی حقیقی عظمت اور کامل معرفت بھی ہم کو بزرگوں ہی کے بتلانے اور سمجھانے سے ہوسکتی ہے۔ یہ حضرات نہ بتائیں تو ہمارے قلوب میں قرآن کی بھی عظمت نہ پیدا ہو اور اس کے نزول کا مقصد بھی نہ معلوم ہو مثلاً شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ گلستاں میں فرماتے ہیں کہ۔ مراد از نزول قرآن تحصیل سیرت خوب است نہ ترتیل سُورِ مکتوب۔ مقصود قرآن سے تحصیل سیرت خوب ہے نہ کہ محض تلاوت

سبحان اللہ کسقدر ایمان افروز مضمون ہے اور یہی وہ مضمون ہے جو حدیث شریف میں ان لفظوں میں آیا ہے وکان خلقہ القرآن یہاں خلق کا جو لفظ ہے اسکا مفہوم اور سیرت کا مفہوم قریب قریب ایک ہی ہے۔ دیکھئے اسمیں کسقدر ترغیب ہے۔ قرآن شریف کی جانب توجہ کرنے کی کیونکہ تحصیلِ سیرتِ خوب کا یہی واحد ذریعہ ہے۔

یہاں یہ خیال نہ گذرے کہ جب کہ نزول قرآن کا مقصد حسن سیرت کی تحصیل ہے تو ظاہر ہے کہ یہ اس کے سمجھنے پر موقوف ہوگی۔ کیونکہ جو اس کو سمجھے گا نہیں وہ اس پر عمل کیا کرسکے گا اور جب عمل ممکن نہیں تو سیرت خوب اسمیں کیوں کر حاصل ہو جائے گی۔ تو گویا دوسرے لفظوں میں اسکا مطلب یہ ہوا کہ نزول قرآن کے مقصد کو صرف علماء ہی پورا کرسکتے ہیں اور رہے بیچارے عوام تو وہ اس سے قاصر ہی ہیں لہذا قرآن شریف سے عوام کے نفع اُٹھانے کی کوئی صورت ہی نہیں رہی۔ اگر یہاں یہ شبہہ ہو۔

تو اس کے متعلق یہ سمجھئے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ قرآن شریف سے انتفاع عام ہے۔ اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق عامی اور عالم ہر ایک اس سے نفع اٹھا سکتا ہے۔

کیونکہ تحصیل سیرت خوب کے یہ معنی نہیں کہ اس میں جو امور بیان کئے گئے ہیں انسان اُن سب سے بیک وقت متصف ہی ہو جائے اور سب کچھ سمجھ کر اُس پر عامل ہو جائے۔ کیونکہ یہ بات تو کسی عامی ہی کو کیا بڑے بڑے عالم تک کو حاصل نہیں ہوتی چنانچہ اس کی بہت سی آیات کے معنی علماء پر بھی دشوار ہو جاتے ہیں بلکہ مطلب اسکا یہ ہے کہ مقصود تحصیل ہے سیرت خوب کی علماء کو بلا واسطہ اور عوام کو بواسطہ علما کے حسب استعداد اور حسب مراتب سب کو اس سے نفع ہوتا ہے۔ مثلاً عامی شخص کو، گو اس سے عقائد فقہ اور سلوک کی جزئیات کا خود علم نہ ہو سکے مگر بواسطہ مشائخ اور علماء کے تدریج ہوتا رہتا ہے اور ایمان جو کہ ان سب کی اصل ہے وہ تو حاصل ہو ہی جاتا ہے اور اس کی تلاوت سے اسمیں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے واذا تلیت علیھم آیاتہ زادتھم ایمانا لیکن وہ تلاوت جو ایمان کی ثمر ہے وہی ہے جس میں قلب بھی شامل ہو چنانچہ ہم اپنے اس مدعا کی تائید میں حضرت شاہ اہل اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ برادر معظم حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام پیش کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

(فضیلت) تلاوتِ قرآن و قراءت آں نیک ترین انواع عبادت است کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمودہ است کہ ہر کہ یک حرف از قرآن مجید بخواند ثواب آں یک حسنہ بیابد۔ ثواب آں حسنہ را دہ چند کردہ دہند۔ نہ پندارند کہ الم تمام یک حرف است بلکہ الف یک حرف است ولام یکحرف است و میم یک حرف است و فرمود کہ بخوانید قرآن را کہ۔ بروز قیامت شفاعت خواہد کرد اصحاب و قاریان خود را و فرمود کہ روز قیامت خوانندۂ قرآن را بگویند کہ قرآن را بہ ترتیل بخواں و درجات بہشت

ترقی کن مکانِ تو آنجا است کہ تمام کنی قرأت آں را و فرمود کہ خواندن قرآن شریف بہتر است از تکبیر و تسبیح و صوم و صلوٰۃ۔

ترجمہ۔ قرآن شریف پڑھنا اور اس کی تلاوت کرنا ایک بہترین عبادت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے کلام مجید کا ایک حرف پڑھا تو اسکو ایک نیکی ملے گی اور پھر اس حسنہ کو دس گنا کر کے اس کو دیں گے اور یہ نہ سمجھیں کہ الم کل کا کل ایک حرف ہے۔ نہیں بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔

نیز فرمایا کہ قرآن شریف پڑھو کہ وہ قیامت کے دن اپنے اصحاب اور اپنے پڑھنے والوں کی شفاعت کرے گا۔

نیز فرمایا کہ قیامت کے دن قرآن پڑھنے والوں سے کہا جائیگا کہ قرآن کو ترتیل کے ساتھ پڑھتے جاؤ اور جنت کے درجات پر چڑھتے جاؤ تمھارا جائے قیام وہی مقام ہوگا جہاں تمھاری قرأت ختم ہو۔

نیز فرمایا کہ قرآن شریف کا پڑھنا تکبیر و تسبیح اور روزہ و صدقہ سے بہتر ہے۔ (چہار باب)

دیکھئے حضرت شاہ صاحبؒ نے تلاوت کی کتنی فضیلت یہاں بیان فرمائی۔ یہ سب احادیث کے مضامین ہیں جس میں دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔ چنانچہ اسی کی اتباع میں مشائخ بھی یہی فرماتے آئے ہیں۔ حضرت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں ہے کہ ــــــ پھر آپ نے اسی کے متعلق یہ حکایت فرمائی کہ کوئی ذکر کلام اللہ سے بڑھ کر نہیں۔ مناسب ہے کہ اس کی تلاوت کیا کریں کہ اسکا نتیجہ کل طاعتوں سے بڑھ کر ہے۔

(السنۃ الجلیلہ ص۲)

غرض اب یہاں اگر یہ خیال ہو کہ یہ فضیلت تو اس تلاوت کی ہے جو فہم معنی کے ساتھ ہو تو اولاً تو حدیث شریف میں آئی ہوئی مثال اس کی تردید کے لیے کافی ہے کیونکہ اس میں مقطعات کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ اسکے معنی کسی کو نہیں معلوم ہیں نیز خود شاہ

صاحب بھی اس کے آگے فرماتے ہیں۔ کہ

پس لازم بر ہر مسلمان است کہ ہر روز قدرے بہ ترتیل و تجوید بخواندن ورد خود گیرد کہ فضیلت آں از احادیث صحاح بسیار وارد شدہ اگر مطلع باشد و بفہمد معانی آں پس بہتر است و اِلّا در وقت تلاوت ایں قدر داند کہ کلام خدا است و آں چہ در آن از امر و نہی و قصص ذکر کردہ است راست و درست است ایمان آوردم بداں۔ (چہار باب ص۳۰)

لہٰذا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ روزانہ کچھ مقدار ترتیل اور تجوید کے ساتھ پڑھنے کو اپنا وظیفہ بنا لے، کہ اس کی فضیلت صحاح کی احادیث میں بہت زیادہ آئی ہے۔ پھر اگر معنی بھی سمجھیں تو کیا کہنا۔ اور اگر معنی نہ سمجھیں تو تلاوت کے وقت اتنا تو یقین ہی رکھے کہ یہ حق تعالیٰ کا کلام ہے اور جو امر و نہی اور قصص وغیرہ اس میں مذکور ہوئے ہیں وہ بالکل صحیح اور درست ہیں میں ان سب پر ایمان لاتا ہوں۔

اسمیں حضرت شاہ صاحب نے عالم اور عامی دونوں کے لئے تلاوت کا طریقہ بیان فرمایا ہے یعنی عالم جو معانی سمجھتا ہے وہ تو خیر سمجھ کر بھی تلاوت کرے۔ لیکن عامی، جو مطلب نہیں سمجھتا۔ چاہیئے کہ جب آیات کی تلاوت کرے تو دل ہی دل میں کہتا جاوے کہ یہ سب صحیح و حق ہے۔ میں اس پر ایمان لاتا ہوں۔ اس طرح جب تلاوت کرے گا تو یقیناً اسکا ایمان بھی بڑھیگا اور اس کو الفاظ یاد ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب بھی حاصل ہوگا اور اگر عالم ہے تو تلاوت کا مزید فائدہ یہ ہوگا کہ اس پر ان معانی کا انکشاف ہوگا جو کہ ایک دو بار کی تلاوت میں اس کو حاصل نہ ہوئے تھے جیسا کہ ابھی ہم نے قاضی بیضاوی کا کلام نقل کیا ہے کہ تلاوت سے تقرب الی اللہ ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب ہوتا ہے اور تحفظ الفاظ ہوتا ہے اور استکشاف معانی ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض مرتبہ تکرارِ تلاوت سے قاری پر ایسے ایسے معانی کھلتے ہیں جو اس پر اس سے پہلے نہیں کھلے تھے۔ رہا عقائد، احکام اور اخلاق وغیرہ کا علم قرآن پر عمل کرنے کے لئے اس کو چاہیئے کہ اہلِ عقائد یعنی متکلمین اور اہلِ احکام یعنی فقہاء اور اہلِ اخلاق یعنی بزرگانِ دین سے

دریافت کرے اور ان حضرات سے معلوم کر کے عمل کرنا بعینہٖ قرآن شریف پر ہی عمل کرنا ہے۔

نیز دیکھا جاتا ہے کہ جس کو دین اور قرآن سے مناسبت ہو جاتی ہے تو جاہل اور عامی ہونے کے باوجود جب وہ جنت دوزخ۔ عذاب۔ ثواب وغیرہ کی آیتوں پر سے گذرتا ہے تو اجمالاً اس کو سمجھتا بھی ہے اور اتنا فہم قرآن عالم ہونے پر موقوف نہیں ہے اس کے لئے ایمان ہی کافی ہے۔

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ قرآن شریف میں یہ جو آیا ہے کہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ ۔ ہم نے قرآن کو ذکر کے لئے آسان کر دیا ہے۔

تو اسکا مطلب یہ ہے کہ اس میں جو حصہ ذکر و تذکیر سے متعلق ہے وہ نہایت آسان ہے۔ باقی جو مسائل اجتہادیہ اس میں آئے ہیں اسکو کیسے آسان کہا جا سکتا ہے۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ علماء پر بھی انکا فہم آسان نہیں۔ پس قرآن شریف کے آسان ہونے کا مطلب یہ ہوا۔ کہ اس سے جنت و دوزخ کا شوق و خوف۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کا پیدا ہونا اور آخرت پر ایمان ہونا۔ یہ سب باتیں سمجھنا آسان ہے۔ جو کہ تلاوت سے بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔ اور اس سے خواص کے ساتھ ساتھ عوام بھی منتفع ہو سکتے ہیں۔ لہذا قرآن سے سیرتِ خوب حسب مراتب سبھی حاصل کر سکتے ہیں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ سیرتِ خوب سے کیا مراد ہے سب سے بڑی سیرت جو تمام انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام میں بطور قدر مشترک کے پائی جاتی ہے وہ تواضع ہے۔ چنانچہ نزول قرآن اور تلاوتِ قرآن سے اصل مقصود یہی ہے کہ انسان سب سے پہلے اپنی حقیقت کو پہچانے۔ یعنی یہ کہ وہ ایک عاجز اور مسکین بندہ ہے کبر و تعلی اس کے شایانِ شان نہیں ہے اور یہ کہ وہ عبداللہ ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس پر لازم ہے۔ اس کے لئے اپنے قلب کی تعمیر اخلاق حسنہ سے اور رذائل سے اس کی صفائی بھی

ضروری ہے۔ چنانچہ ایمان۔ اخلاص. خشیت اور محبت وغیرہ کے ساتھ متصف ہونے اور کفر و نفاق۔ بغض و عناد۔ کبر و حسد وغیرہ سے قلب میں نفرت پیدا ہونے کا آسان ذریعہ اور خدائی نسخہ یہی قرآن کریم ہے۔ چنانچہ اسی کی تلاوت کے ذریعہ اسلاف نے سیرت خوب حاصل کی تھی اور اس باب میں جسقدر موثر عنوان سے قرآن شریف کسی چیز کی معرفت کراتا ہے کسی دوسرے ذریعہ سے وہ ممکن ہی نہیں ہے۔ مثلاً انسان کی تخلیق اور اس کے ذریعہ سے بعث پر استدلال فرماتے ہوئے بیان فرماتے ہیں کہ۔

اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ٥

کیا اس آدمی کو جو بعث کا انکار کرتا ہے یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اسکو ایک حقیر نطفہ سے پیدا کیا۔ جس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اپنی اس ابتدائی حالت کو یاد کر کے اولاً بوجہ اپنی حقارت اور خالق کی عظمت کے جرأت انکار و گستاخی اعتراض سے طبعاً شرماتا۔ ثانیاً خود اس حالت سے صحت بعث پر عقلاً استدلال کرتا تو اس نے ایسا نہ کیا بلکہ علانیہ اعتراض کرنے لگا۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ۔

یعنی اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا اور اپنی اصل کو بھول گیا۔ عجیب اس لئے کہ اس سے انکار قدرت لازم آتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہڈیوں کو خصوصاً جب کہ وہ بوسیدہ ہوگئی ہوں کون زندہ کردیگا۔ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُ ۔

آپ جواب دیجئے انکو وہ زندہ کریگا جس نے اول بار ان کو پیدا کیا اور وہ سب طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے۔ ابداً بھی اعادہ بھی۔ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ٥

یعنی وہ ایسا قادر مطلق ہے کہ بعض ہرے درخت سے تمہارے لئے آگ پیدا کردیتا ہے۔ پھر تم اس سے اور آگ سلگا لیتے ہو۔ اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ٥

اور جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے ہیں کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے آدمیوں کو دوبارہ پیدا کر دے ضرور قادر ہے اور وہ بڑا پیدا کرنے والا خوب جاننے والا ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

یعنی جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اسکا معمول تو یہ ہے کہ اس چیز کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے تو اس کی پاک ذات ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا پورا اختیار ہے۔ اور تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

سبحان اللہ کس قدر پُرشوکت کلام ہے۔ انسان میں اس پر گذرنے کے بعد کبر تو باقی رہ سکتا ہی نہیں۔ انسان کی بے بنیاد حقیقت اور پھر اہلِ کفر کا انکار بعث کر کے انکے اظہار حماقت پر کیسا مدلل کلام فرمایا ہے۔

اسی طرح سے ایک اور مقام پر جنت کی معرفت کرا کے اس کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

۱۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ۝

اسی طرح سے ایک جگہ قیامت کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

۲۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۣ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۣ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝

۳۔ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ

مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَلَهُ الْكِبْرِيَاۗءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

ترجمہ۔ اور جس جنت کا متقیوں سے یعنی شرک اور کفر سے بچنے والوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس کی عمارات اور اشجار کے نیچے سے نہریں جاری ہونگی اس کا پھل اور اس کا سایہ دائم رہے گا۔ یہ تو انجام ہوگا متقیوں کا اور کافروں کا انجام دوزخ ہوگا۔ (بیان القرآن)

اور اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور جس روز قیامت قائم ہوگی اُس روز اہلِ باطل خسارے میں پڑیں گے اور آپ ہر فرقہ کو دیکھیں گے کہ زانو کے بل گر پڑیں گے۔ ہر فرقہ اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلایا جائے گا۔ آج تم کو تمھارے کئے کا بدلہ ملیگا۔ یہ ہمارا دفتر ہے۔ جو تمھارے مقابلہ میں ٹھیک ٹھیک بول رہا ہے۔ ہم تمھارے اعمال کو لکھواتے جاتے تھے۔ جو لوگ ایمان لائے تھے اور انھوں نے اچھے کام کئے تو ان کو انکا رب اپنی رحمت میں داخل کریگا اور یہ صریح کامیابی ہے اور جو لوگ کافر تھے ان سے کہا جاوے گا کہ کیا میری آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں سو تم نے تکبر کیا تھا اور تم بڑے مجرم تھے۔

اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں ہے تو تم کہا کرتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا چیز ہے۔ محض ایک خیال سا تو ہم کو بھی ہوتا ہے اور ہم کو یقین نہیں۔ اور انکو اپنے تمام بُرے اعمال ظاہر ہو جائیں گے اور جس کے ساتھ وہ استہزاء کیا کرتے تھے وہ ان کو آگھیرے گا اور کہا جاوے گا کہ آج ہم تم کو بھلائے دیتے ہیں جیسا کہ تم نے اپنے اس دن کے آنے کو بُھلا رکھا تھا۔ اور تمھارا ٹھکانا جہنم ہے اور کوئی تمھارا مددگار نہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ تم نے خدا تعالیٰ کی آیتوں کی

ہنسی اڑائی تھی اور تم کو دنیوی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا سو آج نہ تو یہ لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے خدا کی خفگی کا تدارک چاہا جائے گا۔ سو تمام خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں جو پروردگار ہے آسمانوں کا اور پروردگار ہے زمین کا۔ پروردگار تمام عالم کا اور اسی کو بڑائی ہے آسمان اور زمین میں اور وہی زبردست ہے۔ حکمت والا ہے۔ (بیان القرآن)

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن کے بیان سے عمدہ اور بہتر کس کا بیان ہو سکتا ہے۔ وہ جب کسی مضمون کو بیان کرتا ہے تو گویا اس کو بالکل دل ہی میں اُتار ہی دیتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے اُوپر کے چند بیانات سے معلوم کیا۔

اور جیسا کہ شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے۔ کہ

مراد از نزولِ قرآں تحصیل سیرت خوب است

بلاشبہ حسن سیرت اور مکارم اخلاق کی تحصیل کا بہترین ذریعہ تلاوت قرآن ہے اللہ تعالیٰ ہم کو اس کی تلاوت بالترتیل اور اس سے سیرتِ خوب کی تحصیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

نوٹ:

ان شاء اللہ تعالیٰ تالیفات کا حصہ چہارم حسب ذیل کتب کا مجموعہ ہوگا۔

وصیۃ الاحسان۔ وصیۃ الاخلاق۔ وصیۃ الاخلاص اور تصوف اور نسبت صوفیہ کامل۔

مضمون تہجد
اور
مسنون دُعائیں

از افاضات

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب
نور اللہ مرقدہ

ناشر

دفتر ماہنامہ معرفت حق ۲۳۔ بخشی بازار۔ الہ آباد ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مضمون تہجد

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم

ان دنوں تہجد کے متعلق حضرت والا دامت برکاتہم نے آیات و روایات اور بزرگان دین کے حالات سے بہت کافی مواد جمع فرمادیا ہے جو ان لوگوں کے لئے نہایت ہی نافع اور موثر ثابت ہوا جو اس دولت کے خواہشمند تو ہیں لیکن اس کی تحصیل میں ابھی تک پورے طور پر کامیاب نہیں ہو رہے ہیں۔ اسی طرح ان حضرات نے بھی اس سے بہت فائدہ اُٹھایا جو بحمد للہ تعالیٰ پہلے سے اس کے پابند ہیں لیکن وہ اب جو حالات اپنے لکھتے ہیں اس میں اور ان کے پہلے حالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ (از ناقل)

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَعَارَّ مِنَ اللَّيْلِ فَقَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ أَوْ دَعَا اُسْتُجِيْبَ فَإِنْ تَوَضَّأَ وَصَلّٰى قُبِلَتْ صَلٰوتُهٗ۔

ترجمہ۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص رات کو بیدار ہو پھر یہ کہے کہ اللہ صرف ایک ہے اکیلا اسکا کوئی شریک نہیں ہے۔ تمام ملک اسی کا ہے اور جملہ تعریفیں اسی کو لائق ہیں اور وہ ہر اس کام پر (جس کو وہ چاہے) قدرت رکھنے والا ہے۔ جملہ تعریفیں اللہ ہی کو زیبا ہیں اور وہ تمام برائیوں سے پاک ہے اور

اللہ ہی سب سے بڑا ہے اور نیک کام کرنے کی طاقت اور برے کام سے باز رہنے کی قوت اسی کی طرف سے ملتی ہے۔ پھر کہے کہ اے اللہ مجھ کو بخش دیجئے۔ یا اور کوئی دعا کرے تو وہ دعا سن لی جاتی ہے۔ پھر اگر وضو کرے اور نماز پڑھے تو مقبول ہوتی ہے۔

اس حدیث شریف کے ذیل میں علامہ ابن حجر علیہ الرحمۃ نے فتح الباری میں ابن بطال کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جس کو یہ حدیث پہونچے وہ اس پر عمل کرنے کو غنیمت سمجھے اور اپنے رب کے ساتھ اپنی نیت کو خالص کرلے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

امام غزالی علیہ الرحمۃ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ قیام لیل عام طور پر شاق ہے، بجز ان لوگوں کے جنھیں شب میں اٹھنے کی توفیق دیجاتی ہے اسوجہ سے کہ وہ لوگ قیام کو آسان کرنے والے ظاہری اور باطنی اسباب کو اختیار کرتے ہیں لہذا تہجد میں اٹھنے کی توفیق جس کسی کو ہو گی اس کو ان اسباب کے کرنے کی توفیق پہلے ہو گی۔

اسباب ظاہری یہ ہیں:۔ کم کھانا۔ دن میں مشقت کم کرنا۔ گناہوں سے اجتناب رکھنا۔ قیلولہ کرنا۔

اسباب باطنی یہ ہیں:۔ مسلمانوں سے کینہ نہ ہونا۔ نیز بدعات و ہموم دنیا سے قلب کا فارغ ہونا۔ فکر و خوف آخرت کا ہونا۔ فضائل تہجد کا پیش نظر ہونا۔ اللہ تعالیٰ کی محبت ہونا اور ایمان کا قوی ہونا۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب میں قیام (یعنی نماز تہجد) کو لازم کرلو کیونکہ یہ تم سے پہلے کے تمام انبیاء و اولیاء کی سیرت قدیمہ ہے۔ (لہذا اس کی حفاظت کرو اور اس کا ابقاء تمھارے ذمہ لازم ہے۔ اگر تم اس پر عمل نہ کروگے تو یہ سنت دنیا سے اٹھ جائے گی جس کے باعث تم ہوگے۔

نیز اس میں اشارہ ہے کہ جو شخص تہجد گذار نہیں ہے وہ پورا صالح نہیں صرف اس کا ظاہر اچھا ہے باطن نہیں) اور تمھارے لئے اپنے مولیٰ سے قرب و محبت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے

جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے کہ
لَا یَزَالُ الْعَبْدُ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ۔ یعنی بندہ برابر بذریعہ نوافل مجھ سے قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو میں اپنا محبوب بنا لیتا ہوں) اور پچھلے گناہوں کے لئے ساتر اور عیوب کے لئے ماحی ہے۔ جیسا کہ نص قرآنی میں ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ یعنی بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ اور آئندہ کے لئے انسان کو گناہ سے روکنے والی بھی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ یعنی بیشک نماز بیحیائی اور برائی کی باتوں سے روک دیتی ہے۔

ایک دوسری روایت میں اتنا اور ہے کہ مَطْرَدَۃٌ لِلدَّاءِ مِنَ الْجَسَدِ یعنی بدن سے بیماریوں کو دفع کرنے والی ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلاشبہ رات میں ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ کوئی مسلمان اس وقت میں اللہ تعالیٰ سے کسی دنیاوی یا دینی خیر کا سوال نہیں کرتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو وہ عطا فرما دیتے ہیں یعنی اس گھڑی میں مسلمان جو کچھ مانگتا ہے وہ اس کو مل جاتی ہے۔ اس حدیث سے رات کی فضیلت دن پر علماء نے ثابت کی ہے مگر آجکل کے یہ نیک جو ہیں ان کو کچھ خبر نہیں نہ یہ معلوم کہ رات کی کیا حیثیت ہے اور نہ یہ معلوم کہ تہجد کے کیا فضائل ہیں۔

امام ابو العباس فرماتے ہیں کہ رِجَالُ اللَّیْلِ هُمُ الرِّجَالُ (یعنی شب بیداری کرنے والے لوگ ہی حقیقت میں مرد ہیں۔

نیز عربی کا ایک شعر ہے ؎

وَاللَّیْلُ لِلْعَاشِقِیْنَ سِتْرٌ	یَا لَیْتَ اَوْقَاتَهَا تَدُوْمُ
رات عاشقوں کے لئے پردہ ہے	کاش اس کے اوقات ہمیشہ رہتے

اور کسی نے خوب کہا ہے ؎

گر روز نیابی ز غوغائے عرب	شب محرم عاشقانست تنہاش طلب

یعنی اگر لوگوں کے شور وغوغا کی وجہ سے تم اس کو دن میں نہ پاسکو تو اس کو رات میں طلب کیا کرو اس لئے کہ رات عاشقوں کی محرم ہے۔

کسی کا اردو میں ایک شعر ہے ؎

غورِ نہار چھپے رات میں بلا انکار دوں کا مہر نہ غائب رکھیو لیل و نہار

(ہمارے حضرت نے فرمایا کہ جس کی تہجد اچھی اس کی رات اچھی اور جس کی رات اچھی اسکا دن اچھا۔ لوگ اچھے اچھے حالات کے خواہشمند تو ہیں لیکن نہ اپنی رات کو اچھی بنانے کی فکر ہے اور نہ دن کو اچھا بنانا چاہتے ہیں حالانکہ حال درست ہوتا ہے عمل سے، احوال عمل کے تابع ہوتے ہیں، باقی فاسقوں کا سا عمل اور اس کے ساتھ اہل اللہ جیسے حالات کی تمنا بجز خام خیالی کے کچھ نہیں اور عمل بھی صرف ظاہری کافی نہیں ہے بلکہ باطنی عمل کی ضرورت ہے ورنہ تو صرف ظاہری ہی پر قناعت کبھی اس کے بھی ترک کا سبب بن جاتی ہے۔ جیسا صاحب روح المعانی نے آیت مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا کے تحت لکھا ہے کہ یہ آیت اس شخص کی بھی مثال ہے جو اولیا اللہ کے طریقے میں بلا تحقیق محض تقلید کے طور پر داخل ہوا اور صرف عمل ظاہری کئے۔ چنانچہ اس کے کرنے سے کوئی ایمانی حلاوت اس کو نہ ملی۔ پس احوال کو نہ پاکر ان ظاہری اعمال کو بھی چھوڑ بیٹھا۔

(روح المعانی صـ ۱۵۶ ج ۱)

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان تم میں سے ہر ایک کی گدی پر تین گرہیں (جب کہ وہ سوتا ہے) لگا دیتا ہے اور ہر گرہ پر یہ کہتے ہوئے ضرب لگاتا ہے کہ ابھی رات بہت زیادہ ہے سو رہو، پس اگر انسان اُٹھ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کر لیتا ہے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے پھر اگر وضو بھی کر لیتا ہے تو دوسری کھل جاتی ہے اور اگر نماز پڑھ لیتا ہے تو تیسری گرہ بھی کھل جاتی ہے۔ پس انسان نشاط والا اور طیب النفس ہو کر صبح کر لیتا ہے ورنہ سارا دن خبیث النفس اور کسلمند ہی رہتا ہے۔ (بخاری شریف)

حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر نزول فرماتے

ہیں جبکہ ایک تہائی شب باقی رہتی ہے اور یہ فرماتے ہیں کہ کون مجھے پکارتا ہے کہ میں اسکی اجابت کروں (اس کو جواب دوں) کون مجھ سے کچھ سوال کرتا ہے کہ میں اسکو وہ چیز دوں اور کون مجھ سے مغفرت طلب کرتا ہے کہ میں اسکو بخشدوں۔

اسی کو کسی نے کہا ہے ؎

ہر رات کے پچھلے حصہ میں کچھ دولت لٹتی ہوتی ہے ۔۔۔ جو سوتا ہے سو کھوتا ہے جو جاگتا ہے وہ پاتا ہے

فتح الباری میں ہے کہ جس کا معمول کسی فرض یا تہجد وغیرہ کا ہو اور کسی دن اس کی آنکھ لگ جائے اور وہ نہ اُٹھ سکے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس نماز کا ثواب دیں گے اور اس کی یہ نیند اس پر صدقہ ہے۔

ریاض الصالحین میں بخاری و مسلم کی روایت سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ جو شخص رات کو سو جانے کی وجہ سے اپنے معمول کو ادا نہیں کر سکا پھر اس کو نماز فجر اور نماز ظہر کے درمیان پڑھ لیا تو اسکے لئے ایسا ہی ثواب لکھا جائیگا گویا اس نے رات ہی کو پڑھا۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ لیل (نماز تہجد) کا حکم فرمایا ہے اگرچہ ایک ہی رکعت ہو یعنی چاہے آخر وقت میں اُٹھ کر پڑھے کہ ایک رکعت تو تہجد کے وقت میں ادا ہو اور دوسری صبح صادق کے بعد۔ تو چاہیے کہ ایسی صورت میں دو رکعت پوری کرلے۔ اور ان دونوں کا شمار تہجد ہی میں ہوگا۔ لیکن چونکہ ایک رکعت رات میں (صبح صادق سے پہلے) پڑھی ہے اسی کو حدیث شریف میں اگرچہ ایک ہی رکعت فرمایا گیا ہے ورنہ تو ایک رکعت کی کوئی نماز نہیں ہوتی۔

روح المعانی میں ہے کہ سلف صالحین قیام لیل (نماز تہجد) پر ایسی مواظبت (ہمیشگی اور دوام) فرماتے تھے جیسی کہ فریضۂ اسلام پر کیجاتی ہے اور یہ اس لئے کہ اس میں محبوب کے ساتھ خلوت اور اُنس کا انکو موقعہ ملتا تھا اور محبوب ان کے پاس بدون کسی رقیب کے ہوتا تھا۔ اسی کو حضرت خواجہ صاحب علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

کب رات ہو کب ان سے ہوں خلوت میں پھر بہم ۔۔۔ رہتی ہے دھن یہی ہمیں دن بھر لگی ہوئی

مسنون دعائیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّىْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

اَمَّا بَعْدُ:۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اللہ تعالی سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا صحیح تعلق قائم کریں، اسی میں انکی دینی اور دنیوی فلاح مضمر ہے اور یہی ان کے مصائب کا علاج ہے۔

اللہ تعالی سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ نماز اور تلاوت کلام اللہ شریف ہے نماز کا اہتمام کریں اور کامل عظمت اور پورے رعایت آداب کے ساتھ قلب کو شریک کرکے قرآن شریف کی تلاوت کریں

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح نسبت اور سچا رشتہ جوڑنے کی صورت یہ ہے کہ آپ کی سنت کا اتباع کریں اور اپنا ہر قول وعمل سنت کے مطابق رکھنے کی کوشش کریں اسی میں یہ بھی داخل ہے کہ آپ کی ان دعاؤں کو اپنا وظیفہ بنائیں جو خاص خاص موقعوں پر آپ سے ثابت ہیں۔

اسوقت قرآن وحدیث میں آئی ہوئی چند دعائیں نقل کرتا ہوں، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگی ہوئی مقبول دعائیں ہیں جن کا پڑھنا موجب صلاح وفلاح ہے۔ نیز توسل کر ان ادعیۂ مبارکہ سے جناب باری عزاسمہٗ میں اس لئے مسلمانوں کو لازم ہے کہ انکو اپنا معمول اور ورد بنالیں اور چلتے پھرتے انکو دل اور زبان سے دہراتے رہیں۔ بہتر تو یہی ہے کہ ان

تمام ارشادات نبوی کو آہستہ آہستہ حفظ کر لیں۔ اور وقتاً فوقتاً پڑھا کریں، تاہم اگر سب کو یاد کرنے کی ہمت نہ ہو تو ان میں سے چند ہی کو یاد کر لیں اور انھیں ہی پڑھا کریں، آسانی کے لئے بعض دعاؤں کا انتخاب بھی کر دیا گیا ہے، ان پر نشان ص لگا دیا گیا ہے۔

آج ہم لوگ عبادت وغیرہ تو خیر کچھ کر بھی لیتے ہیں مگر دعائی جانب ہماری توجہ بہت ہی کم ہے۔ حالانکہ عبادت کے ساتھ ساتھ ایک معتد بہ حصہ دعا کا بھی ہونا ضروری ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ تسنن ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ادعیہ سے، دوسرے اس لئے بھی کہ اس زمانہ میں آفات ارضی وسماوی اور نئے نئے واقعات وحوادث صبح وشام جو دیکھنے اور سننے میں آرہے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی کا کچھ ٹھیک نہیں کہ کون کس وقت کس آزمائش میں گرفتار ہو جائے یا کن مصائب وآلام کا شکار ہو جائے لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر توکل کیا جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص اوقات میں شر اور ضرر سے تحفظ کے لئے جو ادعیہ تعلیم فرمائی ہیں۔ مسلمان انھیں کے ذریعہ تحفظ حاصل کریں اور ہر قسم کے شر سے بچنے کے لئے انھیں کو اپنا سپر بنائیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دل خراش
آزموں را یک زمانہ خاک باش

دعائیں آگے صفحہ پر ملاحظہ ہوں:۔

وہ دعائیں یہ ہیں:۔

۱ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا
اے رب ہمارے دے ہمیں دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی اور بچا
عَذَابَ النَّارِ ○
ہم کو دوزخ کے عذاب سے۔

۲ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَۃً لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا اِنَّکَ
اے رب ہمارے نہ کر ہمیں کشمکش کافر لوگوں کا اور بخش دے ہمیں اے رب ہمارے
اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ○
کیونکہ تو ہی زبردست حکمت والا ہے۔

۳ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَۃً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ○
اے رب ہمارے مت کیجیو ہمیں ستم سہنے والا ظالم لوگوں کا۔

۴ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ
اے پیدا کرنے والے آسمانوں اور زمینوں کے تو ہی رفیق ہے میرا دنیا
تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ○
اور آخرت میں اٹھا تا مجھ کو مسلمان اور شامل کرنا مجھے صالحین کے ساتھ۔

۵ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ اَوَّلَ ھٰذَا النَّھَارِ صَلَاحًا وَّ اَوْسَطَہٗ فَلَاحًا وَّ
یا اللہ کردے اس دن کے اول حصہ کو بہتری اور اس کے اوسط حصہ کو فلاح اور
آخِرَہٗ نَجَاحًا ○
اسکے آخر دور کو کامیابی

۶ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ خَیْرَ ھٰذَا الْیَوْمِ وَفَتْحَہٗ وَنَصْرَہٗ وَنُوْرَہٗ
یا اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے بھلائی اس دن کی اور فتح اور ظفر اس کی اور نور
وَبَرَکَتَہٗ وَھُدَاہُ ○
اسکا اور برکت اسکی اور ہدایت اسکی۔

ص ۷ اَللّٰھُمَّ عَافِنَا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ۝

یا اللہ عافیت دے ہم کو دنیا اور آخرت میں۔

۸ اَللّٰھُمَّ لَا تُھْلِکْنَا فُجَاءَۃً وَّلَا تَاْخُذْنَا بَغْتَۃً وَّلَا تُغْفِلْنَا عَنْ

یا اللہ مت ہلاک کرنا ہم کو ناگہاں اور نہ پکڑنا ہم کو اچانک اور نہ غافل کرنا ہمیں کسی

حَقٍّ وَّلَا وَصِیَّۃٍ ۝

حق سے اور نہ کسی وصیت سے۔

۹ اَللّٰھُمَّ وَاقِیَۃً کَوَاقِیَۃِ الْوَلِیْدِ ۝

یا اللہ میں چاہتا ہوں نگہبانی مثل نگہبانی بچہ کے۔

ص ۱۰ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِیْشَۃً نَّقِیَّۃً وَّمِیْتَۃً سَوِیَّۃً وَّمَرَدًّا غَیْرَ

یا اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے زندگی صاف اور موت ڈھنگ کی اور انتقال جس میں رسوائی

مُخْزٍ وَّلَا فَاضِحٍ ۝

اور فضیحت نہ ہو۔

۱۱ اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَّصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

یا اللہ مدد کر اس کی جو مدد کرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی اور ہم کو

وَاجْعَلْنَا مِنْھُمْ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

انھیں میں سے کردے اور رسوا کر اس کو جو رسوا کرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو

وَسَلَّمَ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنْھُمْ ۝

اور ہمیں ان میں سے مت کر۔

۱۲ اَللّٰھُمَّ انْصُرِ الْاِسْلَامَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَاَعِزَّ الْاِسْلَامَ وَالْمُسْلِمِیْنَ ۝

یا اللہ مدد کر اسلام کی اور مسلمانوں کی اور عزت دے اسلام کو اور مسلمانوں کو۔

۱۳ اَللّٰھُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ وَاَنْصَارَہٗ وَاَذِلَّ الشِّرْکَ وَاَشْرَارَہٗ ۝

یا اللہ عزت دے اسلام کو اور اسکے مددگاروں کو اور ذلت دے شرک کو اور اسکے اشرار کو۔

۱۴ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَجِیْرُکَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْتَ وَاَحْتَرِسُ

یا اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیرے ذریعہ ہر اس چیز سے جو تونے پیدا کیا اور حفاظت

بِكَ مِنْهُنَّ ○

چاہتا ہوں تیرے ہی ذریعہ ان سے۔

۱۵ اَللّٰهُمَّ عَافِنِيْ وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيَّ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ بِشَيْءٍ لَا

یا اللہ عافیت دے مجھ کو اور مت غلبہ دے مجھ پر کسی کو اپنی مخلوق میں سے ذرا بھی کہ جس کے دفعیہ کی

طَاقَةَ لِيْ بِهٖ ○

مجھ میں طاقت نہ ہو۔

۱۶ رَبِّ اَعِنِّيْ وَلَا تُعِنْ عَلَيَّ وَانْصُرْنِيْ وَلَا تَنْصُرْ عَلَيَّ وَامْكُرْ لِيْ

اے رب مدد کر میری اور میرے مقابلہ میں کسی کی مدد نہ کر اور فتح دے مجھے اور میرے اوپر

وَلَا تَمْكُرْ عَلَيَّ وَاهْدِنِيْ وَيَسِّرِ الْهُدٰى لِيْ وَانْصُرْنِيْ

کسی کو فتح مت دے اور تدبیر کر میرے لئے اور میرے اوپر کسی کی تدبیر نہ چلا اور ہدایت کر مجھے اور آسان کر ہدایت کو میرے

عَلٰى مَنْ بَغٰى عَلَيَّ ○

لئے اور مجھ کو مدد دے اس پر جو مجھ پر زیادتی کرے۔

۱۷ اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَ

اے اللہ حصہ دے ہمیں اپنے خوف سے اتنا کہ حائل ہو جائے ہم میں اور تیرے گناہوں میں

بَيْنَ مَعَاصِيْكَ وَمِنْ طَاعَتِكَ مَا تُبَلِّغُنَا بِهٖ جَنَّتَكَ وَمِنَ

اور اپنی عبادت سے اتنا کہ پہنچا دے تو ہمیں بذریعہ اس کے اپنی جنت میں اور

الْيَقِيْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهٖ عَلَيْنَا مَصَائِبَ الدُّنْيَا وَمَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا

یقین سے اتنا کہ سہل کر دے اس سے ہم پر دنیا کی مصیبتیں اور کارآمد رکھ

وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا اَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ

ہماری شنوائیاں اور ہماری قوت جب تک ہمیں زندہ رکھے اور رکھنا

ثَارَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلٰى مَنْ عَادَانَا وَلَا تَجْعَلْ

اس چیز کو باقی بعد ہمارے اور ہمارا انتقام لے اس سے جو ہم پر ظلم کرے اور مدد دے ہمیں اس پر

مُصِيْبَتَنَا فِيْ دِيْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا

جو ہم سے دشمنی کرے اور مت کر ہماری مصیبت ہمارے دین میں اور مت کر دنیا کو مقصود اعظم ہمارا اور نہ

وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَرْحَمُنَا ۝

انتہا ہمارے معلومات کی اور نہ انتہا ہمارے رغبت کی اور نہ مسلط کر ہم پر اس کو جو ہم پر رحم نہ کرے۔

۱۸ اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَاَعْطِنَا وَلَا

یا اللہ ہمیں زیادہ دے اور گھٹا مت اور آبرو دے ہمیں اور ہمیں رسوا نہ کر اور عطیہ دے ہمیں

تَحْرِمْنَا وَاٰثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا وَاَرْضِنَا وَارْضَ عَنَّا ۝

اور محروم نہ کر اور ہمیں بڑھائے رکھ اور اوروں کو ہم پر نہ بڑھا اور ہمیں خوش کر اور ہم سے راضی ہو جا۔

۱۹ اَللّٰهُمَّ زَيِّنَّا بِزِيْنَةِ الْاِيْمَانِ وَاجْعَلْنَا هُدَاةً

اے اللہ ہم کو مزین کر ایمان کی زینت سے اور کر دے ہم کو ہدایت دینے والا

مُهْتَدِيْنَ ۝

ہدایت یافتہ۔

۲۰ اَللّٰهُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْاُمُوْرِ كُلِّهَا وَاَجِرْنَا مِنْ

اے اللہ اچھا کر ہمارے انجام کو تمام کاموں میں اور پناہ دے ہم کو دنیا کی

خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْاٰخِرَةِ ۝

رسوائی اور آخرت کے عذاب سے۔

۲۱ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِيْ بِالْاِسْلَامِ قَائِمًا وَّاحْفَظْنِيْ بِالْاِسْلَامِ

یا اللہ اسلام کے ساتھ نگاہ رکھ مجھے کھڑے ہوئے اور اسلام کے ساتھ نگاہ رکھ

قَاعِدًا وَّاحْفَظْنِيْ بِالْاِسْلَامِ رَاقِدًا وَّلَا تُشْمِتْ بِيْ عَدُوًّا وَّلَا

مجھے بیٹھے ہوئے اور اسلام کے ساتھ نگاہ رکھ مجھے لیٹے ہوئے اور نہ طعنہ کا موقع دے مجھ پر کسی دشمن

حَاسِدًا ۝

کو اور نہ کسی حاسد کو۔

۲۲ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِيْ دِيْنِيْ وَدُنْيَايَ

یا اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے معافی اور عافیت اس اپنے دین میں اور اپنی دنیا میں

وَاَهْلِيْ وَمَالِيْ ۝

اور اپنے اہل و عیال و مال میں۔

۲۳ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَتِيْ وَاٰمِنْ رَوْعَتِيْ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِيْ مِنْ بَيْنِ

یا اللہ ڈھانک دے عیب میرا اور امن سے بدل دے میرے خوف کو یا اللہ حفاظت کر میری

يَدَيَّ وَمِنْ خَلْفِيْ وَعَنْ يَمِيْنِيْ وَعَنْ شِمَالِيْ وَمِنْ فَوْقِيْ وَاَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ

میرے آگے سے اور میرے پیچھے سے اور میرے داہنے سے اور میرے بائیں سے اور میرے اوپر سے اور پناہ چاہتا ہوں

اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِيْ ۝

بوسیلہ تیری عظمت کے اس سے کہ ناگہاں پکڑ لیا جاؤں اپنے نیچے سے۔

۲۴ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ اَصْلِحْ لِيْ شَاْنِيْ كُلَّهٗ وَلَا تَكِلْنِيْ

اے حی اے قیوم تیری رحمت کی طرف فریاد لاتا ہوں درست کر دے میرے تمام احوال کو اور نہ سونپ

اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ ۝

مجھے میرے نفس کی طرف ایک لمحہ بھر۔

۲۵ اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَمَا اَظَلَّتْ وَرَبَّ الْاَرَضِيْنَ وَمَا

یا اللہ پروردگار ساتوں آسمانوں کے اور اس چیز کے جس پر انکا سایہ ہے اور پروردگار زمینوں

اَقَلَّتْ وَرَبَّ الشَّيَاطِيْنِ وَمَا اَضَلَّتْ كُنْ لِيْ جَارًا مِنْ شَرِّ خَلْقِكَ

کے اور اس چیز کے جس کو زمین اٹھائے ہوئے ہے اور پروردگار شیطانوں کے اور اس چیز کے جن کو اس نے

اَجْمَعِيْنَ اَنْ يَفْرُطَ عَلَيَّ اَحَدٌ مِنْهُمْ اَوْ اَنْ يَطْغٰى عَزَّ جَارُكَ وَتَبَارَكَ

گمراہ کیا ہو نا میرا نگہبان اپنی تمام مخلوق کی برائی سے اس سے کہ ظلم کرے کوئی مجھ پر یا سرکشی کرے

اسْمُكَ ۝

محفوظ ہے پناہ دیا ہوا تیرا اور بابرکت ہے تیرا نام۔

۲۶ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ

یا اللہ میں تیری پناہ پکڑتا ہوں ناپسندیدہ اخلاق اور اعمال سے اور نفسانی خواہشوں

وَالْاَهْوَاءِ وَالْاَدْوَاءِ نَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَ مِنْهُ نَبِيُّكَ

اور بیماریوں سے پناہ چاہتے ہیں ہم تیری ان بری چیزوں سے جن سے پناہ مانگی ہے تیرے نبی محمد صلی اللہ

مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمِنْ جَارِ السُّوْءِ فِيْ دَارِ الْمُقَامَةِ

علیہ وسلم نے اور برے پڑوسی سے قیام کی جگہ میں کیونکہ سفر کا ساتھی تو چل ہی دیتا ہے اور دشمن کے

فَاِنَّ جَارَ الْبَادِيَةِ يَتَحَوَّلُ وَغَلَبَةِ الْعَدُوِّ وَشَمَاتَةِ الْاَعْدَآءِ

غلبہ سے اور مخالفین کے طعنہ سے اور بھوک سے کہ وہ برا ہم خواب ہے اور خیانت سے کہ وہ برا ہم

وَمِنَ الْجُوْعِ فَاِنَّهٗ بِئْسَ الضَّجِيْعُ وَمِنَ الْخِيَانَةِ فَبِئْسَ الْبِطَانَةُ

راز ہے اور اس سے کہ پچھلے پیروں لوٹیں ہم یا اپنے دین سے الگ ہوکر فتنہ میں پڑیں ہم اور تمام

اَنْ نَّرْجِعَ عَلٰى اَعْقَابِنَا اَوْ نُفْتَنَ عَنْ دِيْنِنَا وَمِنَ الْفِتَنِ عَنْ دِيْنِنَا

فتنوں سے جو ظاہری ہیں ان میں اور جو باطنی ہیں اور برے دن

وَمِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَمِنْ يَوْمِ السُّوْٓءِ وَمِنْ

سے اور بری رات سے اور بری گھڑی سے اور برے

لَيْلَةِ السُّوْٓءِ وَمِنْ سَاعَةِ السُّوْٓءِ وَمِنْ صَاحِبِ السُّوْٓءِ ۝

ساتھی سے۔

۲۷ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْۤ اَسْئَلُكَ مِنْ فُجَآءَةِ الْخَيْرِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فُجَآءَةِ الشَّرِّ

یا اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے غیر مترقبہ بھلائی اور پناہ چاہتا ہوں تیری ناگہانی برائی سے

۲۸ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْۤ اَسْئَلُكَ الْفَوْزَ فِى الْقَضَآءِ وَنُزُلَ الشُّهَدَآءِ وَعَيْشَ

یا اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے کامیابی قسمت میں اور مہمانی شہداء کی سی

السُّعَدَآءِ وَمُرَافَقَةَ الْاَنْبِيَآءِ وَالنَّصْرَ عَلَى الْاَعْدَآءِ اِنَّكَ سَمِيْعُ

اور عیش نیک بختوں کا سا اور ساتھ انبیاء علیہم السلام کا فتح دشمنوں پر کیونکہ تو

الدُّعَآءِ ۝

سننے والا ہے دعا کا۔

۲۹ يَا غَفَّارُ اغْفِرْلِیْ يَا تَوَّابُ تُبْ عَلَیَّ يَا رَحْمٰنُ ارْحَمْنِیْ يَا عَفُوُّ

اے غفار بخش دے اے تواب توبہ قبول کر میری اے رحمٰن رحم کر مجھ پر اے عفو درگزر کر

اُعْفُ عَنِّیْ يَا رَءُوْفُ ارْءَفْ بِیْ يَا رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ

مجھ سے اے رؤف مہربان ہو جا مجھ پر اے پروردگار نصیب کر مجھے کہ شکر کروں تیری نعمت کا جو تو نے مجھ پر

الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَطَوِّقْنِیْ حُسْنَ عِبَادَتِكَ يَا رَبِّ اَسْئَلُكَ مِنَ الْخَيْرِ

کی ہے اور طاقت دے مجھے اپنی عبادت کے اچھی طرح کرنے کی اے رب میں مانگتا ہوں تجھ سے بھلائی

كُلِّهٖ يَا رَبِّ افْتَحْ لِيْ بِخَيْرٍ وَّاخْتِمْ لِيْ بِخَيْرٍ وَّقِنِي السَّيِّئَاتِ وَمَنْ

سب کی اے رب آغاز کر خیر کے ساتھ اور خاتمہ کر میرا خیر کے ساتھ اور بچا مجھے برائیوں سے

تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔

اور جس کو تو بچائے اس دن برائیوں سے تو بیشک تو نے اسپر رحم کیا اور یہی تو ہے بڑی کامیابی۔

۳۰ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كُلُّهٗ وَلَكَ الشُّكْرُ كُلُّهٗ وَلَكَ الْمُلْكُ كُلُّهٗ

یا اللہ تیرے ہی لئے ہے تعریف سب کی سب اور تیرے ہی لئے ہے شکر سب کا سب اور تیرا ہی ہے

وَلَكَ الْخَلْقُ كُلُّهٗ بِيَدِكَ الْخَيْرُ كُلُّهٗ وَاِلَيْكَ يَرْجِعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ

ملک سب کا سب اور تیری ہی ہے مخلوق سب کی سب، سب کی سب بھلائی تیرے ہی قبضہ میں ہے

اَسْئَلُكَ الْخَيْرَ كُلَّهٗ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهٖ بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِيْ

اور تیرے ہی طرف رجوع ہوتے ہیں سب کے سب کام میں مانگتا ہوں بھلائی تجھ سے سب کی سب اور تیری پناہ

لَا اِلٰهَ غَيْرُهٗ ۝

چاہتا ہوں سب سب برائیوں سے نام لیتا ہوں اس اللہ کا جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

ص ۳۱ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ

یا اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیری رضا کے ساتھ تیری ناخوشی سے اور تیرے عفو کے

مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا اُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا

ساتھ تیری سزا سے اور پناہ چاہتا ہوں تیری تجھ سے نہیں کر سکتا ہوں میں تیری تعریف

اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ۔

تو اسی تعریف کے لائق ہے جو خود کی ہے اپنی ذات کے لئے۔

۳۲ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ نَزِلَّ اَوْ نُزَلَّ اَوْ نَضِلَّ اَوْ نُضِلَّ

یا اللہ ہم پناہ چاہتے ہیں تیری اس سے کہ ہم ڈگ جائیں یا کسی کو ڈگائیں یا ہم گمراہ

اَوْ نَظْلِمَ اَوْ نُظْلَمَ عَلَيْنَا اَوْ نَجْهَلَ اَوْ يُجْهَلَ عَلَيْنَا اَوْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ

ہو جائیں یا کسی کو گمراہ کریں یا ہم کسی پر ظلم کریں یا ہم پر ظلم کیا جائے یا ہم جہالت کریں یا ہم پر جہالت کیجائے یا گمراہ ہوں

اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الْكَرِيْمِ الَّذِيْ اَضَاءَتْ لَهُ السَّمٰوٰتُ وَاَشْرَقَتْ

میں یا گمراہ کیا جاؤں چاہتا ہوں میں پناہ تیری ذات گرامی کے نور سے جس سے روشن ہیں آسمان اور چمک رہی ہیں

لَهُ الظُّلُمٰتُ وَصَلُحَ عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اَنْ تُحِلَّ عَلَيَّ غَضَبَكَ

ظلمتیں اور درست ہیں اس سے امر دنیا اور آخرت کے اس سے کہ اتارے تو مجھ پر اپنا غصہ

وَتُنْزِلَ عَلَيَّ سَخَطَكَ وَلَكَ الْعُتْبٰى حَتّٰى تَرْضٰى وَلَا حَوْلَ

اور نازل کرے مجھ پر ناخوشی اپنی اور میرا حق ہے تجھ کو منانا یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے اور نہیں ہے پھرنا گناہ

وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ ۝

سے اور نہ طاقت عبادت کی مگر تیری مدد سے۔

۳۳ اَللّٰهُمَّ احْرُسْنِيْ بِعَيْنِكَ الَّتِيْ لَا تَنَامُ وَاكْنُفْنِيْ بِرُكْنِكَ الَّذِيْ

اے اللہ نگہبانی کر میری اپنی اس آنکھ سے جو کبھی سوتی نہیں اور آڑ میں لے مجھے اپنی اس قوت کے

لَا يُرَامُ وَارْحَمْنِيْ بِقُدْرَتِكَ عَلَيَّ فَلَا اَهْلِكُ وَاَنْتَ رَجَائِيْ

جس کے پاس کوئی پھٹک نہیں سکتا اور رحم کر مجھ پر بوجہ اپنی قدرت کے جو تجھ کو مجھ پر حاصل ہے کہ میں پھر ہلاک

فَكَمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ اَنْعَمْتَ بِهَا عَلَيَّ قَلَّ لَكَ بِهَا شُكْرِيْ وَكَمْ مِّنْ

نہ ہوں اور تو ہی میری امیدگاہ ہے بہتیری ایسی نعمتیں ہیں کہ تو نے دیں مجھے اور کم رہا میرا شکر اور بہت سی ایسی

بَلِيَّةٍ ابْتَلَيْتَنِيْ بِهَا قَلَّ لَكَ بِهَا ...... صَبْرِيْ فَيَا مَنْ

مصیبتیں ہیں کہ مبتلا کیا تو نے مجھے انمیں اور کم رہا ان پر صبر میرا بس اے وہ کہ کم رہا اسکی نعمت کے وقت

قَلَّ عِنْدَ نِعْمَتِهٖ شُكْرِيْ فَلَمْ يَحْرِمْنِيْ وَيَا مَنْ قَلَّ عِنْدَ بَلِيَّتِهٖ

شکر میرا پس نہ محروم کیا مجھ کو اور اے وہ کہ کم ہوا اس کی مصیبت کے وقت

صَبْرِيْ فَلَمْ يَخْذُلْنِيْ وَيَا مَنْ رَاٰنِيْ عَلَى الْخَطَايَا فَلَمْ يَفْضَحْنِيْ

صبر میرا پھر بھی ساتھ نہ چھوڑا میرا اور اے وہ کہ دیکھا مجھے گناہوں پر پھر بھی فضیحت نہ کیا مجھے

يَا ذَا الْمَعْرُوْفِ الَّذِيْ لَا يَنْقَضِيْ اَبَدًا وَّيَا ذَا النَّعْمَاءِ الَّتِيْ لَا تُحْصٰى

اے اتنے احسان والے کہ کبھی ختم نہ ہو اور ایسی نعمتوں والے کہ کبھی شمار نہ ہو سکیں

اَبَدًا اَسْئَلُكَ اَنْ تُصَلِّيَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبِكَ

سوال کرتا ہوں تجھ سے کہ رحمت کاملہ نازل کرے تو حضرت محمدؐ پر اور حضرت کی آل پر اور تیرا ہی زور

اَدْرَاُ فِيْ نُحُوْرِ الْاَعْدَاءِ وَالْجَبَابِرَةِ ۝

چاہتا ہوں دشمنوں اور زور آوروں کے مقابلہ میں۔

۳۴ اَللّٰهُمَّ اَحْسَنْتَ خَلْقِيْ فَاَحْسِنْ خُلُقِيْ وَاَذْهِبْ غَيْظَ قَلْبِيْ
یا اللہ اچھی بنائی ہے تو نے صورت میری بس اچھی کر دے سیرت میری اور دور کر دے میرے دل
وَاَجِرْنِيْ مِنْ مُضِلَّاتِ الْفِتَنِ مَا اَحْيَيْتَنَا۔
کا غصہ اور بچائے رکھ مجھے گمراہ کرنے والے فتنوں سے جبتک تو ہمیں زندہ رکھے۔

۳۵ اَللّٰهُمَّ الْطُفْ بِيْ فِيْ تَيْسِيْرِ كُلِّ عَسِيْرٍ فَاِنَّ تَيْسِيْرَ كُلِّ عَسِيْرٍ
یا اللہ کرم و احسان کر میرے ساتھ سہل کر دینے میں ہر دشواری کے کیونکہ سہل کر دینا ہر دشوار کا
عَلَيْكَ يَسِيْرٌ وَاَسْئَلُكَ الْيُسْرَ وَالْمُعَافَاةَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ
تجھ پر آسان ہے اور مانگتا ہوں میں تجھ سے سہولت اور معافی دنیا اور آخرت میں۔

۳۶ اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِيْ اِيْمَانًا لَا يَرْتَدُّ وَيَقِيْنًا لَيْسَ بَعْدَهٗ كُفْرٌ وَّرَحْمَةً
یا اللہ دے مجھے ایسا ایمان کہ پھر نہ پھرے اور ایسا یقین کہ اس کے بعد کفر نہ ہو
اَنَالُ بِهَا شَرَفَ كَرَامَتِكَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔
اور ایسی رحمت کہ پاؤں میں بذریعہ اسکے شرف تیرے یہاں کی عزت کا دنیا اور آخرۃ میں۔

۳۷ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَمِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ
یا اللہ میں تیری پناہ پکڑتا ہوں برص سے اور ضدا ضدی سے اور نفاق سے
وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ ٥
اور برے اخلاق سے۔

۳۸ اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ مِنْ عِنْدِكَ وَاَفِضْ عَلَيَّ مِنْ فَضْلِكَ وَاَسْبِغْ
اے اللہ ہدایت دے ہم کو اپنے پاس سے اور بہادے مجھ پر اپنا فضل اور کامل کر مجھ پر
عَلَيَّ مِنْ رَحْمَتِكَ وَاَنْزِلْ عَلَيَّ مِنْ بَرَكَاتِكَ ٥
اپنی رحمت اور نازل کر مجھ پر اپنی برکتیں۔

۳۹ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ تَعْجِيْلَ عَافِيَتِكَ وَدَفْعَ بَلَائِكَ وَخُرُوْجًا
یا اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے عافیت عاجلہ اور تیری بلاء کا دفعیہ اور نکلنا دنیا سے
مِنَ الدُّنْيَا اِلٰى رَحْمَتِكَ يَا مَنْ يَكْفِيْ عَنْ كُلِّ اَحَدٍ وَّلَا يَكْفِيْ مِنْهُ اَحَدٌ
تیری رحمت کی طرف اے وہ کہ کافی ہے سب کے عوض اور نہیں کافی ہے اسکے عوض

يَا أَحَدَ مَنْ لَا أَحَدَ لَهُ، يَا سَنَدَ مَنْ لَا سَنَدَ لَهُ، انْقَطَعَ الرَّجَاءُ إِلَّا

ہیں کوئی اے کس بے کسوں کے اے سہارے بے سہاروں کے قطع ہوگئی اُمید مگر تجھ سے

مِنْكَ نَجِّنِي مِمَّا أَنَا فِيهِ وَأَعِنِّي عَلَى مَا أَنَا عَلَيْهِ مِمَّا نَزَلَ بِي بِجَاهِ

نجات دے مجھے اس حال سے کہ میں اس حال میں ہوں اور مدد کر میری بلا نازل شدہ پر صدقہ اپنی ذات

وَجْهِكَ الْكَرِيمِ وَبِحَقِّ مُحَمَّدٍ عَلَيْكَ آمِيْنَ ۝

پاک کا اور بطفیل حق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جو تجھ پر ہے۔ آمین

۴۰ اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ خَلِيلٍ مَاكِرٍ عَيْنَاهُ تَرَيَانِي وَقَلْبُهُ

یا اللہ میں پناہ چاہتا ہوں تیری مکار دوست سے کہ آنکھیں تو اس کی مجھے دیکھتی ہوں اور دل

يَرْعَانِي إِنْ رَأَى حَسَنَةً دَفَنَهَا وَإِنْ رَأَى سَيِّئَةً أَذَاعَهَا ۝

اسکا مجھے چیرے لیتا ہو اگر دیکھے بھلائی تو دبا دے اور اگر دیکھے برائی تو فاش کرے۔

۴۱ اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ كُلِّ عَمَلٍ يُخْزِينِي وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ كُلِّ

یا اللہ میں پناہ چاہتا ہوں ہر اس عمل سے جو رسوا کردے مجھے اور پناہ چاہتا ہوں

غِنًى يُطْغِينِي اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ مَوْتِ الْهَمِّ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ

میں تیری ہر اس مالداری سے کہ دماغ چلا دے میرا یا اللہ میں پناہ چاہتا ہوں فکر کی موت سے اور

مَوْتِ الْغَمِّ ۝

پناہ چاہتا ہوں تیری غم کی موت سے۔

۴۲ اَللّٰهُمَّ اكْفِنِي كُلَّ مُهِمٍّ مِنْ حَيْثُ شِئْتَ وَمِنْ أَيْنَ شِئْتَ

یا اللہ کفایت کر میری ہر بڑے کاموں میں جہاں چاہے اور جیسے چاہے کافی ہے

حَسْبِيَ اللّٰهُ لِدِينِي حَسْبِيَ اللّٰهُ لِدُنْيَايَ حَسْبِيَ اللّٰهُ لِمَنْ بَغَى

میرا اللہ میرے دین کے لئے کافی ہے میرا اللہ میری دنیا کے لئے کافی ہے میرا اللہ ہر اس چیز کے لئے

عَلَيَّ حَسْبِيَ اللّٰهُ لِمَنْ حَسَدَنِي حَسْبِيَ اللّٰهُ لِمَنْ كَادَنِي بِسُوءٍ

جو مجھے غم میں ڈالدے کافی ہے میرا اللہ ہر اس شخص کے لئے جو مجھ سے حسد کرے کافی ہے میرا اللہ

حَسْبِيَ اللّٰهُ عِنْدَ الْمَوْتِ حَسْبِيَ اللّٰهُ عِنْدَ الْمَسْأَلَةِ فِي الْقَبْرِ

ہر اس شخص کے لئے جو مجھے برائی کے قریب کردے کافی ہے میرا اللہ موت کے وقت کافی ہے میرا اللہ قبر میں

حَسْبِيَ اللّٰهُ عِنْدَ الْمِيْزَانِ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ
سوال کے وقت کافی ہے میرا اللہ اعمال کے وزن ہونے کے وقت کافی ہے میرا اللہ اللہ کے سوا کوئی
تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝
معبود نہیں اسی پر بھروسہ کیا میں نے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔
۴۴ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝
اللہ بہترین حفاظت کرنے والا ہے اور وہ رحم کرنیوالوں میں سب سے زیادہ رحم کرنیوالا ہے۔

آخر میں ایک اور دعا بتاتا ہوں۔ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ جو خلیفہ تھے حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے۔ تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کی کثرت کو ہر دینی و دنیوی نفع کے حصول اور ضرر و نقصان کو دور ہونے کے لئے مفید اور مجرب فرماتے تھے اور کثرت سے مراد یہ ہے کہ روزانہ کم از کم پانچ سو بار اس کو پڑھ لیا جائے اس طرح سے کہ اول و آخر ایک ایک سو بار درود شریف بھی پڑھے۔

بس اسی پر مضمون کو ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے اور تمام مسلمانوں کو دنیا میں حفظ و امان میں اور اپنے دین متین پر ثابت قدم رکھے اور آخرت میں اپنی اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا و خوشنودی نصیب فرمائے آمین ثم آمین وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

وصی اللہ عفی عنہ

یوم عاشوراء ۱۳۸۴ھ

اب اس کے بعد حضرت مصلح الامۃ رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے آخری تصنیف وصیۃ السالکین ملاحظہ فرمائیے جس پر تیسرا حصہ تالیفات کا ختم ہے۔ اسکے بعد اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو چوتھا اور آخری حصہ بھی پیش کیا جائیگا اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرماویں اور اس حقیر خدمت کو قبول فرماویں۔ والسلام جامی

ضمیمہ

سَیِّدُ الْاِسْتِغْفَار

حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ اس کے پڑھنے کی بہت ترغیب دیتے تھے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُكَ

اے اللہ آپ ہی میرے رب ہیں آپ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ آپ ہی نے مجھ کو پیدا

وَاَنَا عَلٰی عَھْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ

کیا اور آپ ہی کا میں بندہ ہوں اور حتی المقدور آپ کے عہد و وعدہ پر قائم ہوں جو کچھ میں نے کیا

شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَیَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ

اس کے شر سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں آپ کے جو انعامات مجھ پر ہیں انکا اعتراف کرتا ہوں اور اپنے

فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ۔

گناہوں کا اقرار کرتا ہوں بس آپ میری مغفرت فرما دیں اسلئے کہ بجز آپ کے کوئی بھی گناہوں کا بخشنے والا نہیں۔

اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دن میں اس کو پڑھ لے اور اسی دن انتقال کر جائے تو جنتی ہوگا۔ اسی طرح جو شخص رات میں اس کو پڑھ لے اور اسی رات وفات پا جائے تو بھی جنتی ہوگا۔

رسالہ

وصیۃ السالکین

از افاضات

مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب

نور اللہ مرقدہ

ناشر

دفتر ماہنامہ معرفت حق ۲۳ بخشی بازار، الہ آباد ۳

وَصِیَّۃُ السَّالکین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

بیعت کا سلسلہ

اما بعد: میں باجازت بزرگان دین بیعت بھی لیا کرتا ہوں جبکہ طالبین اسکی درخواست کرتے ہیں لہٰذا عرض پرداز ہوں کہ آپ حضرات کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں چاروں سلسلوں میں بیعت لیتا ہوں یعنی چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ اور سہروردیہ میں کیونکہ یہ سب حضرات اہل حق اکابر اولیاء اللہ، صاحب سلسلہ نیز اکابر علماء رہے ہیں۔ ان اکابر کی خصوصیات میں سے طریقت اور شریعت کی جامعیت ہے چنانچہ اتباع سنت اور عمل بالشریعۃ میں ان حضرات کا قدم راسخ رہا ہے۔

بیعت کا مقصد

اس لئے حالات زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ان بزرگوں کی خصوصیات کو سمجھا جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت باطنی کو ان حضرات کے توسل سے حاصل کیا جائے اور اور انکی عقیدت و محبت کو حرز جان بنایا جائے اس لئے کہ یہ حضرات مقبولان حق ہیں اور مقبول اسی لئے ہیں کہ انھوں نے اتباع رسول میں خود کو فنا کردیا تھا۔ لہٰذا ہم کو جب ان سے محبت ہے تو انکے سارے اقوال و اعمال اور احوال سے بھی محبت ہونی چاہیئے اور انکے حالات میں سب سے نمایاں حال جو ان حضرات کا طغرائے امتیاز تھا اور یہ حضرات اس میں سب سے ممتاز تھے انکا یہی اعتصام بالسنۃ اور اتباع شریعت

تھا شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :-

"ہر یکے از اولیاء بر قدر علو درجۂ خویش در متابعت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم وے وقدمے دارد کہ یکے بدیگرے نرسد فہم آں او را نبود۔"

اتباع سنت کی وصیت

چنانچہ میں ان لوگوں کو جنھوں نے مجھ سے بیعت کی ہے خصوصاً اور ہر آمدو شد رکھنے والے کو عموماً یہ وصیت کرتا ہوں کہ ان مشائخ کے طریق کو لازم پکڑیں اور اتباع سنت نیز دیگر اعمال میں ان حضرات کی سیرت کو پیش نظر رکھیں اور جملہ صالحین کے حالات و ملفوظات کو عموماً اور ان سلاسل اربعہ کے مشائخ کے ملفوظات کو خصوصاً نقل مجلس بنائیں تاکہ صحیح علم ہوتا رہے اور ان سب حضرات کی جانب سے ہماری طرف سلسلۂ فیض جاری رہے

میرا شجرہ

حضرات مشائخ کا دستور ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو شجرہ مرحمت فرمایا کرتے ہیں پس جو لوگ کہ مجھ سے تعلق اور محبت رکھتے ہیں وہ میری اس وصیت کو بمنزلہ شجرہ ہی کے تصور کریں اور اسکو کبھی کبھی پڑھ لیا کریں تاکہ یہ مشائخ سے عقیدت و محبت تازہ ہو کر ان سے استجلاب فیض کا ذریعہ بنے۔

اصلی دستور العمل

جو لوگ مجھ سے بیعت ہوتے ہیں اور سلسلہ میں داخل ہوتے ہیں انکی یہ خواہش ہوتی ہے کہ انھیں کوئی دستور العمل یا نظام کار بتادیا جائے تاکہ آئندہ وہ اسی کے مطابق کام کریں تو اسکے لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے لئے تو دستور العمل یہی شریعت ہے جس کو اللہ تعالے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا میں بھیجا ہے اسی کا اتباع پہلے بھی ضروری تھا اور اب بیعت ہونے کے بعد بھی لازم ہے بلکہ بیعت کی غرض اپنے کو شریعت کے مطابق بنانا ہے شریعت کا اتباع تو ہر مسلمان پر فرض ہے مگر بیعت سے اسکا نیا اہتمام مقصود ہوتا ہے اور یہ سنت سے ثابت ہوتا ہے۔

بیعت کا حاصل

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے القول الجمیل میں اس پر نہایت محققانہ کلام فرمایا ہے ۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

"سنت اللہ یوں ہی جاری ہے کہ امور خفیہ جو نفوس میں پوشیدہ ہیں انکا ضبط افعال اور اقوال ظاہری سے ہو اور افعال و اقوال ان امور قلبیہ کے

قائم مقام ہوں۔ چنانچہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ اور قیامت (وغیرہ) کی تصدیق امر مخفی ہے تو اقرار ایمان کو تصدیق قلبی کے قائم مقام کیا گیا۔

اور جس طرح سے کہ رضامندی بائع اور مشتری کی قیمت اور مبیع کے دینے میں امر مخفی ہے تو ایجاب و قبول کو قائم مقام رضائے مخفی کے کردیا

فَکَذَالِکَ التَّوْبَۃُ وَالْعَزِیْمَۃُ عَلٰی تَرْکِ الْمَعَاصِیْ وَالتَّمَسُّکُ بِحَبْلِ التَّقْوٰی اَخْفٰی مُضْمَرٌ فَاُقِیْمَتِ الْبَیْعَۃُ مَقَامَھَا یعنی اسی طرح توبہ اور عزم کرنا ترک معاصی کا اور تقویٰ کی رسی کو مضبوط پکڑنا امر مخفی اور پوشیدہ ہے تو بیعت کو اسکے قائم مقام کردیا۔

(شفاء العلیل ۱۶)

اس سے معلوم ہوا کہ بیعت کا حاصل اپنے سابقہ گناہوں سے توبہ کرنا اور آئندہ کیلئے ترک معاصی کا عزم کرنا اور تقویٰ کی رسی کو مضبوط پکڑنا ہے۔

بیعت کی ضرورت

اور اصل اس میں تو یہی ہے کہ انسان خود ہی اپنے کو امر و نہی کرے اور خود ہی نیکیاں کرے اور برائیوں سے بچے لیکن عادت یونہی جاری ہے کہ خود انسان کا حکم اسکے نفس پر چلتا نہیں اسلئے ضرورت ہوئی کہ کسی مرد صالح عاقل عالم باعمل کو جو کہ واقف طریق ہو اپنے اوپر حاکم بنائے اور خود کو اسکے امر و نہی کے تحت داخل کردے اسکو اپنے اوپر مسلط کرلے اور اصلاح کے باب میں اسکی ہدایت کا پابند ہوجائے۔ چنانچہ اگر اس سے اس کو اعتقاد ہوا اور اسکی باتوں پر اور تعلیمات پر اعتماد کیا اور اپنے حالات کی اسکو اطلاع دیتا رہا اور اسکی ہدایات اور تعلیمات پر عمل کرتا رہا تو پھر انشاء اللہ کامیابی یقینی ہے کام کی ابتداء یوں کرے:۔

اصلاح کی ابتداء

(۱) فرض کی ادائیگی کا خاص اہتمام کرے خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد۔

(۲) اسی اہتمام میں یہ بھی داخل ہے کہ ان دونوں میں کے فوت شدہ حقوق کی قضا کرے یعنی بلوغ کے بعد سے لیکر اب تک جو نمازیں (فرض و واجب) قضا ہوگئی ہیں اسی طرح سے جو روزے رہ گئے ہیں انکو ادا کرے اور حقوق العباد (خواہ وہ حق عرضی ہو یا

مالی) انکو ادا کرے اور فرائض کے بعد اگر شوق اور موقع ہو تو نوافل کا اہتمام کرے کیونکہ یہ سب اعمال انسانوں ہی کے کرنے کیلئے ہیں فرشتے انکو کرنے کیلئے نہیں آئیں گے۔

(۳) سب سے زیادہ مفید اور بابرکت وظیفہ تلاوت قرآن ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ تلاوت محض لسانی نہ ہو بلکہ قلب کی شرکت کے ساتھ ہو اور قلب کی شرکت سے یہاں مراد فہم معنی نہیں ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ قلب غافل سے نہ ہو بلکہ تلاوت کے وقت یہ امر مستحضر ہو کہ یہ اللہ تعالےٰ کا کلام ہے اور دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہماری ہی ہدایت کے لئے بھیجا ہے اور یہ کہ بندہ جس وقت تلاوت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تلاوت کیطرف کان لگاتے ہیں۔

تلاوت کے آداب اور اسکے حقوق وفضائل میں نے اپنے ایک رسالہ تلاوت قرآن میں مفصل بیان کر دیا ہے وہاں دیکھ لیا جائے اور برابر دیکھا جائے۔

(۴) تلاوت کے بعد یا کسی اور فرصت کے وقت میں ایک منزل "مناجات مقبول" کی پڑھی جائے اور اسمیں بھی یہ استحضار رکھا جائے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبول دعائیں ہیں جن میں آپ نے دینی اور دنیوی ظاہری اور باطنی، حالی اور مالی تمام چیزوں کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی ہے اور ہر قسم کی مضر چیزوں سے استعاذہ فرمایا ہے ان دعاؤں کو ذوق کے ساتھ پڑھنے کے لئے میرا مضمون "وصیۃ السنۃ" دیکھ لیا جائے انشاء اللہ تعالےٰ دعاؤں کا ذوق پیدا ہو جائے گا اور پھر ان دعاؤں کو انسان ایک خاص کیف اور ذوق کے ساتھ پڑھے گا جو کہ اسکی اصل روح ہے۔

(۵) نفل نمازوں میں سے چاشت، اشراق، اوابین وغیرہ سب ہی کی پابندی ہونی چاہئے اسلئے کہ ہر ایک کی خاص خاص برکات اور مخصوص آثار ہیں لیکن مَا لَا یُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا یُتْرَكُ كُلُّهٗ اگر سب نہیں کر سکتا تو تھوڑے کو بھی ترک نہ کرے نماز تہجد کے متعلق حدیث شریف میں آیا ہے کہ یہ ہر زمانہ میں صالحین امت کا شعار رہا ہے اس لئے اس سے محرومی ایک بڑے خیر سے محرومی ہے اسکے متعلق میں نے کسی قدر مفصل کلام اپنے ایک مضمون "مضمون تہجد" میں کیا ہے۔ اگر مل جائے تو اسمیں دیکھ لیا جائے۔

(۶) قلب کی غفلت کا دور کرنا ضروری ہے بزرگوں کے تجربہ میں اس کے لئے ذکر سے بڑھکر کوئی چیز نہیں یہ اسکے لئے تریاق ہے۔ پہلے ذکر مفرد پھر مرکب بھی کراتے ہیں ذکر مفرد کو مبتدی کے لئے زیادہ نافع بتاتے ہیں۔ اس راہ میں انکا اتباع از بس ضروری ہے یہ لوگ اطبائے قلوب ہیں۔

مقصود باطن کی درستگی ہے

رسالہ قشیریہ میں امام ابوالقاسم قشیریؒ فرماتے ہیں:-

وَلَيْسَ مِنْ آدَابِ الْمُرِيْدِ كَثْرَةُ الْأَوْرَادِ بِالظَّاهِرَةِ فَإِنَّ الْقَوْمَ فِيْ مُكَابَدَةِ إِخْلَاءِ خَوَاطِرِهِمْ وَمُعَالَجَةِ أَخْلَاقِهِمْ وَنَفْيِ الْغَفْلَةِ عَنْ قُلُوْبِهِمْ لَا فِيْ تَكْثِيْرِ أَعْمَالِ الْبِرِّ الَّذِيْ لَا بُدَّ لَهُمْ مِنْهُ إِقَامَةُ الْفَرَائِضِ وَالسُّنَنِ الرَّاتِبَةِ فَأَمَّا الزِّيَادَاتُ مِنَ الصَّلَوَاتِ النَّافِلَةِ فَاسْتِدَامَةُ الذِّكْرِ بِالْقَلْبِ أَتَمُّ لَهُمْ (رسالہ قشیریہ ۱۰۳)

یعنی مریدین کے آداب میں سے اورادِ ظاہرہ کی کثرت نہیں ہے اسلئے کہ قوم صوفیہ تو صرف تین چیزوں کے درپے ہے خواطرِ ردیہ کو اپنے قلب سے دور کرنا اپنے اخلاق کی اصلاح کرنا اور لینے اور اپنے قلب سے غفلت کو دور کرنا ہی اعمال خیر کی کثرت تو یہ انکا وظیفہ نہیں ان کے لئے جو چیز ضروری ہے وہ فرائض کی ادائگی ہے اور سنن موکدات کا ادا کرنا ہے رہے اور دیگر نوافل تو ذکر قلبی پر مداومت انکے لئے نوافل کی مشغولی سے کہیں زیادہ نافع اور مفید ہوگی۔

اسی طرح شیخ العرب والعجم حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ

"اوقات خود را بعد ادائے فرائض واجبات وسنن در شغل باطن گذارد و بزیادتی نوافل نپردازد بلکہ مشغولی باطن را فرض داند وگاہے غافل نشود"

میں کہتا ہوں اسی مشغولی باطن کے (جسکو فرض فرما رہے ہیں) تحصیل کے لئے یہ ذکر مفرد اور مرکب ضروری ہے۔ چنانچہ یہ حضرات اس ذکر کو نوافل وغیرہ سے اس بارہ میں زیادہ نافع سمجھتے ہیں۔

ہر شخص کے حالات کے لحاظ سے اوراد و وظائف

لہٰذا اپنی دنیوی مشغولیتوں کے باوجود کچھ وقت اسکے لئے بھی نکالنا چاہیئے اس سلسلہ میں لوگوں کی فرصت اور مشاغل کو دیکھتے ہوئے

کسی کو دوازدہ تسبیح بتاتا ہوں کسی کو سُبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر دو دو تسبیح صبح وشام بتا دیتا ہوں اور کبھی صرف لا الٰہ الا اللہ کی دو یا چار تسبیح تجویز کرتا ہوں اسطرح پر کہ نو یا دس بار لا الٰہ الا اللہ کہنے کے بعد دسویں یا گیارھویں بار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ملا دیا جائے اور مقصد یہ ہے کہ گاہے گاہے پورا کلمہ پڑھ لیا جائے اسی طرح بزرگوں سے منقول چلا آرہا ہے۔

طریقہ دوازدہ تسبیح

اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قَلْبِیْ عَنْ غَیْرِكَ وَنَوِّرْ قَلْبِیْ بِنُوْرِ مَعْرِفَتِكَ

(اس دعا کو چند بار کہے تا آنکہ قلب ذکر کی طرف متوجہ ہوگا)

بعدہٗ

استغفار ۱۱ بار۔ درود شریف ۱۱ بار۔ لا الٰہ الا اللہ ۲۰۰ بار اسطرح سے کہ دس بار کہنے کے بعد گیارھویں بار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ملا لیا جائے۔ الا اللہ ۴۰۰ بار۔ اللہُ اللہُ ۶۰۰ بار۔ اللہ ۱۰۰ بار۔ درود شریف ۱۱ بار۔ استغفار ۱۱ بار (دعا مانگ کر ختم کرے)۔

مطالعہ کتب کی ضرورت منجملہ دیگر ضروریات کے اس زمانہ میں ایک ضروری عمل اسے سمجھتا ہوں کہ حضرت مولیناؒ کے مواعظ اور ملفوظات اور تصانیف کے مطالعہ کا اہتمام رکھیں اور میری کتابوں کو بھی برابر مطالعہ میں رکھیں۔ بالخصوص حیات المسلمین۔ جزاء الاعمال۔ تعلیم الدین۔ فروع الایمان۔ قصد السبیل اور بہشتی زیور۔ اسی طرح وصیۃ الاخلاق۔ وصیۃ الاحسان۔ وصیۃ الاخلاص۔ وصیۃ التلاوت۔ وصیۃ السنت عاقبۃ الانکار۔ تلاوت قرآن اور نسبت صوفیہ کا مطالعہ ضرور کریں۔ انشاء اللہ اس سے دین وطریق سے خاصی مناسبت بھی ہو جائیگی اور معتد بہ علم بھی حاصل ہو جائے گا۔

مشائخ کی کتابیں اس سلسلہ میں اتنی بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ علماء نے لکھا ہے کہ مشائخ کی کتابیں انکی غیر موجودگی حالت میں انکی

نائب اور خلیفہ ہوا کرتی ہیں لہٰذا ان کتابوں کے پڑھنے اور سننے سنانے کا سلسلہ ضرور ہونا چاہیئے۔ اپنے لوگوں کو اسپر زور دیتا ہوں اور یہ اسلئے کہ بہت سے لوگوں نے مجھے لکھا ہے کہ رسالہ "معرفت حق" کے مضامین سنکر دین اور اصلاح کی فکر پیدا ہوگئی ہے فالحمد للّٰہ علیٰ ذلک۔

اصلاح اخلاق

(۸) اصلاح کے سلسلہ میں یہ سمجھ لیجئے کہ سب سے زیادہ ضروری اور اہم اخلاق کی اصلاح ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ انسان اپنے سوء خُلق کی بنا پر جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں جائیگا حالانکہ وہ دنیا میں عابد ہوگا۔ اسی طرح سے وہ اپنے حسن خُلق کی بنا پر جنت کے اعلیٰ طبقہ میں داخل ہوگا حالانکہ اسکی عبادات کچھ زیادہ نہ ہونگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اخلاق کی شریعت میں خاص اہمیت ہے۔ اسلئے بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان دوسروں کے درپے ہونے کے بجائے خود اپنے نفس کے درپے ہو بلکہ یہ سمجھتا ہوں کہ دوسروں پر نظر ہوتی ہی اسوقت ہے جب کہ اپنے سے آنکھ بند ہوتی ہے اکبر مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

آوروں پہ معترض تھے لیکن جب آنکھ کھولی
اپنے ہی دل کو ہم نے گنج عیوب دیکھا

اسلئے اپنے اندر صدق و اخلاص اور تواضع پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور کبر و نفاق کے شائبہ سے بھی بچنا چاہئے اس سلسلہ میں میری کتاب "وصیۃ الاحسان" اور "تحذیر العلماء" کا مطالعہ مفید ہوگا۔

ادب و احترام شیخ

(۹) اصلاح نفس کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر شوق یا خوف پیدا کرے اصلاح کا ظاہری ذریعہ چونکہ شیخ ہوتا ہے اسلئے اسکا ادب و احترام اس سے محبت اور اسکے مواخذہ اور عتاب کا خوف سالک کے اندر ہونا چاہیئے اسلئے وقتاً فوقتاً شیخ کیخدمت میں حاضری دیتا رہے تاکہ تعلق بڑھتا ہے اور اسمیں اگر تاخیر ہو تو بذریعہ خط و کتابت تعلق قائم رکھے ورنہ دیکھا تو یہ جاتا ہے کہ اوروں کی دیکھا دیکھی لوگ بیعت تو ہوجاتے ہیں اور پھر برسہا برس تک خبر نہیں لیتے تو ایسا تعلق نہ توچنداں مفید ہی ہے اور نہ اسکا طریق میں کوئی

درجہ ہے۔ مجھے کسی کا یہ شعر بہت پسند آیا کہ ؎

اِبْدَاْ بِنَفْسِكَ فَانْهَهَا عَنْ غَيِّهَا
فَاِذَا انْتَهَتْ عَنْهُ فَاَنْتَ حَكِيْمٌ

اسلئے میرے نزدیک اصلاح کا طریق کار یہی ہے کہ انسان کام کی ابتدا اپنے نفس سے کرے اسکے بعد بڑھائے

اہل و عیال کی اصلاح

آیۃ "قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" اپنے گھر اور خاندان اور متعلقین کی اصلاح کی جانب متوجہ ہو اسی طرح ہر ہر شخص اگر کرنے لگ جائے تو دین عام ہو کر ایک صالح ماحول پیدا ہو جائے جس کا ہونا دینی ترقی اور دینی بقا کیلئے ضروری ہے ایسا ماحول اگر کسی کو نصیب ہو جائے یا کوئی خود بنالے تو دنیا اسکے لئے جنت کا نمونہ ہو جائے۔

قاضی صاحبؒ کا ارشاد

(۱۰) میری اس نصیحت کے مناسب قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کا یہ مضمون بھی ہے جسے انھوں نے ارشاد الطالبین میں خاتمہ کے عنوان سے بیان فرمایا ہے طالبین کے افادہ کیلئے یہاں اسکو بعینہٖ نقل کرتا ہوں فرماتے ہیں:۔

تمام مسلمانوں کو عموماً اور طریقۂ نقشبندیہ کے صوفیوں کو خصوصاً جنکے طریق کی بنا ہی اتباع سنت پر قائم ہے لازم ہے کہ فقہ اور حدیث کی خدمت کریں تاکہ لوگ فرائض واجبات، محرمات، مکروہات، مشتبہات، عبادات اور عادات میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت معلوم کریں اور جہاں تک ہو سکے اتباع سنت کی کوشش کریں خصوصاً فرائض و واجبات کے اتباع میں اور مکروہات و مشتبہات سے بچنے میں سنت کی رعایت کو محکم پکڑیں۔ بدن کپڑے اور جائے نماز کی طہارت اور تمام شرائط نماز میں پوری رعایت کریں لیکن ظاہری طہارت میں وسواس کی حد تک اپنے آپ کو نہ پہونچائیں کیونکہ یہ مذموم ہے اور پنجگانہ نماز مسجدوں میں جماعت کے ساتھ پڑھیں اسطرح کہ تکبیر تحریمہ اولیٰ فوت نہ ہو اور جماعت کی تعداد بڑھائیں اور اچھے آدمی کو امام بنانے کی کوشش کریں۔ حدیث شریف میں آیا ہے اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ یعنی مقتدی کی نماز امام کی نماز کی ضمانت میں ہے پس جس قدر امام کامل ہوگا اسی قدر اسکی نماز کامل ہوگی۔ جمعہ کی نماز

ہاتھ سے نہ جانے دیں اور تمام سنن اور آداب کی اچھی طرح رعایت کریں۔ نماز پورے اطمینان سے ادا کریں اور قرآن شریف کو صحت اور صفائی اور اچھی آواز سے، گانے کے طرز کے بغیر پڑھیں۔ نماز مستحب وقتوں میں پڑھیں اور سنن راتبہ کو جو بارہ رکعت ہیں اور تہجد کو جو سنت موکدہ ہے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ماہ رمضان کے روزے احتیاط سے ادا کریں۔ لغویات یا گناہ یا غیبت سے روزہ کا ثواب ضائع نہ کریں اور نماز تراویح، ختم قرآن شریف اور اعتکاف عشرۂ اخیرۂ رمضان لازم پکڑیں۔ لیلۃ القدر کی تلاش رکھیں ذکر کے اوقات کو معمور رکھیں۔ اگر نصاب نامی کے مالک ہوں تو زکواۃ کا ادا کرنا فرض ہے لیکن اس بارے میں سنت یہ ہے کہ حاجت ضروری سے زیادہ مال قبضہ میں نہ رکھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فتح خیبر کے بعد اپنی ازواج مطہرات میں سے ہر ایک کو چھ سو میر سالانہ جو اور خرما دیتے تھے اور اپنی ملکیت میں ایک درم بھی نہیں رکھتے تھے۔ اور کسب حلال سے کھاتے رہیں۔ خرید و فروخت وغیرہ معاملات میں مسائل فقہ کی رعایت رکھیں مشتبہات سے پرہیز رکھیں حقوق الناس اداکرنے میں سعی بلیغ کریں۔ اگر حقوق اللہ کی ادائیگی میں کوتاہی ہو گئی ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پیران عظام کی شفاعت سے مغفرت کی امید ہے لیکن حقوق العباد نہیں بخشے جاتے۔ نکاح پیغمبروں کی سنت ہے لیکن اگر ادا نہ کر سکے حقوق ادا نہ کرسکے اس خوف سے کہ اس سے فرائض و واجبات فوت ہو جائیں گے تو اس سے باز رہنا بہتر ہوگا۔ اس بارے میں مختصراً حکم دیا گیا ہے اسکی تفصیل کتب فقہ و حدیث میں تلاش کرنی چاہیے

فرائض و واجبات کی ادائیگی کے بعد صوفی پر لازم ہے کہ اپنے اوقات کو ذکر الٰہی سے معمور رکھیں اور بیہودگی میں وقت ضائع نہ کریں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اہل جنت کو جنت میں کوئی حسرت نہ ہوگی بجز دنیا کی اس گھڑی کے جس میں انھوں نے خدا کا ذکر نہ کیا ہوگا۔

فنائے نفس سے پہلے کثرت نوافل اور تلاوت قرآن سے قرب الٰہی میں ترقی[ف] نہیں ہوتی۔ دیکھو حق تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ لَا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الْمُطَہَّرُوْنَ (یعنی قرآن

ف تو ترقی نہیں ہوتی ... اقول یہ نفی ایک خاص چیز کی ہے باقی اس سے عام نفع کی نفی لازم نہیں یعنی اور دوسرے قسم کا فائدہ تلاوت سے ہوتا ہے یعنی ان سے مقصود قرب الٰہی ہو اور بسا اوقات فنائے نفس سے پہلے یہ چیزیں عجب وغیرہ کا سبب بن جاتی ہیں۔

کو نوک بغیر طہارت کے نہ چھوئیں) تو جس طرح سے کہ ظاہری طہارت نماز کیلئے شرط ہے اسی طرح سے رذائل نفس سے پاک ہوئے بغیر نماز و تلاوت کی برکات بھی حاصل ہوں گی۔

تجدید ایمان

اور جس طرح سے کہ ظاہری کفر کا ازالہ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے ہوجاتا ہے اسی طرح باطنی کفر کا ازالہ بھی اسی کلمہ سے ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جَدِّدُوْا اِیْمَانَکُمْ یعنی اپنے ایمان کو تازہ کرتے رہا کرو صحابہؓ نے عرض کیا کہ ایمان کو کیسے تازہ کیا کریں فرمایا کہ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے تکرار سے چنانچہ تمام سلاسل کے مشائخ نے مریدوں کیلئے اسی کلمہ کا ذکر تجویز کیا ہے بعض حضرات جہر سے پڑھنے کو کہتے ہیں اور اس طریقہ سے مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور حضرات نقشبند ذکر جہر کو بدعت قرار دیتے ہیں اور ذکر خفی پر اکتفا کرتے ہیں۔ پس فنائے قلب وغیرہ کے لئے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ذکر کو جس نفس کیساتھ مفید جانا ہے اور بوقت ذکر اس معنی کا لحاظ رکھتے ہیں کہ اس ذات پاک کے سوا کوئی مقصد نہیں یہ ذکر طاق عدد کی رعایت سے کرتے ہیں۔ نفس کے فنا کے لئے کلمہ طیبہ کا تکرار زبان سے جس کے ساتھ معنی کا کبھی پورا خیال ہو مفید ہے کیونکہ نفس عالم خلق سے ہے اور فنائے نفس کے بعد کمالات نبوت کے مقام میں اس سے اور تلاوت قرآن و کثرت نماز سے ترقی حاصل ہوتی ہے۔ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے التجا کی کہ مجھکو بہشت میں آپکی ہمسائیگی نصیب ہو۔ آپؐ نے فرمایا کہ کچھ اور مانگو۔ اس نے کہا مجھے تو بس یہی چاہیئے آپؐ نے فرمایا کہ اچھا تو پھر (نفس کے مارنے میں) کثرت سجود سے میری مدد کرو۔

صلحاء کی صحبت

پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں کہ ذکر و فکر اور فرائض و نوافل سے فارغ ہو کر اگر علماء و مفتیان اور صلحاء کی مصاحبت اور مکالمت میسر ہو تو غنیمت سمجھو بشرطیکہ علماء دنیاداروں کی صحبت سے باز رہنے والے ہوں اور اگر علماء و صلحا کی صحبت میں اثر نہ ہو تو تنہا بیٹھنا یا سو رہنا بہتر ہے۔

اَلْعُزْلَۃُ خَیْرٌ مِّنَ الْجَلِیْسِ السُّوْءِ — یعنی گوشہ نشینی برے ہمنشیں سے بہتر ہے
وَالْجَلِیْسُ الصَّالِحُ خَیْرٌ مِّنَ الْعُزْلَۃِ — اور نیک ہمنشیں گوشہ نشینی سے اچھا ہے

جاہلوں فاسقوں اور ان لوگوں کی صحبت اور ہمنشینی جو دنیا میں مستغرق رہتے ہیں

کارخانۂ باطن کو خراب کر دیتی ہے خصوصاً بتدی صوفیوں کے حق میں سخت مضر ہے جیسا تھوڑے پانی کو نجاست پلید کر دیتی ہے۔ صوفیوں، صاحب دلوں، ولیوں کی ہمنشینی اور صحبت اللہ کے ذکر اور عبادت سے بھی زیادہ مفید ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم باہم کہا کرتے تھے کہ اِجلِس بِنَا نُؤمِنُ سَاعَۃً یعنی ہمارے پاس بیٹھو تاکہ ہم آپس میں ایمان تازہ کریں مولانا روم فرماتے ہیں

یک زماں ہم صحبتت با اولیا　　بہتر از صد سال بودن در تقا

یعنی اولیاء کی صحبت میں تمھارا تھوڑی دیر بیٹھنا سو سال تقویٰ میں گذارنے سے بہتر ہے۔ حضرت خواجہ احرار فرماتے ہیں کہ

نماز را بحقیقت قضا بود لیکن　　نماز صحبت مارا قضا نخواہد بود

یعنی نماز اگر رہ جائے تو اسکی قضا کیجا سکتی ہے لیکن ہماری صحبت کی نماز ایسی ہے کہ اسکی کوئی قضا نہیں۔

ایک شخص نے کسی سے کہا کہ حضرت بایزیدؒ کی صحبت میں رہا کرو اس نے جواب دیا کہ میں خدا کی صحبت میں رہتا ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ بایزیدؒ کی صحبت میں رہنا خدا کی صحبت میں رہنے سے بہتر ہے۔ مطلب یہ تھا کہ تو بقدر اپنی نسبت اور حوصلے کے جناب الٰہی سے فیض حاصل کر سکتا ہے اور حضرت بایزیدؒ کی صحبت میں تجھکو انکے علوّ مرتبہ کے مطابق فیض حاصل ہوگا۔

مولانا روم مثنوی میں فرماتے ہیں

دور شو از اختلاط یار بد　　یار بد بدتر بود از مار بد
مار بد تنہا ہمی بر جاں زند　　یار بد بر جان و برایماں زند

یعنی برے لوگوں کی صحبت سے دور رہو کیونکہ برا دوست سانپ سے بھی بدتر ہوتا ہے سانپ تو صرف جان کو نقصان پہونچاتا ہے مگر برا دوست جان کے ساتھ ایمان کو بھی تباہ کر دیتا ہے۔

تالیفات مصلح الامتہ کا حصہ سوم ختم ہوا۔

طالب دعا ناچیز مرتب عبدالرحمٰن جامی عفی عنہ۔ شوال المکرم ۱۳۹۶ھ

ظاہری وباطنی اصلاح کا بہترین ذریعہ

مجموعہ

تالیفاتِ مصلح الامۃ

عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ

ناشر
مکتبہ اشرفیہ
محمد علی روڈ، ممبئی ۳ فون: ۲۳۴۷۳۱۰۹